

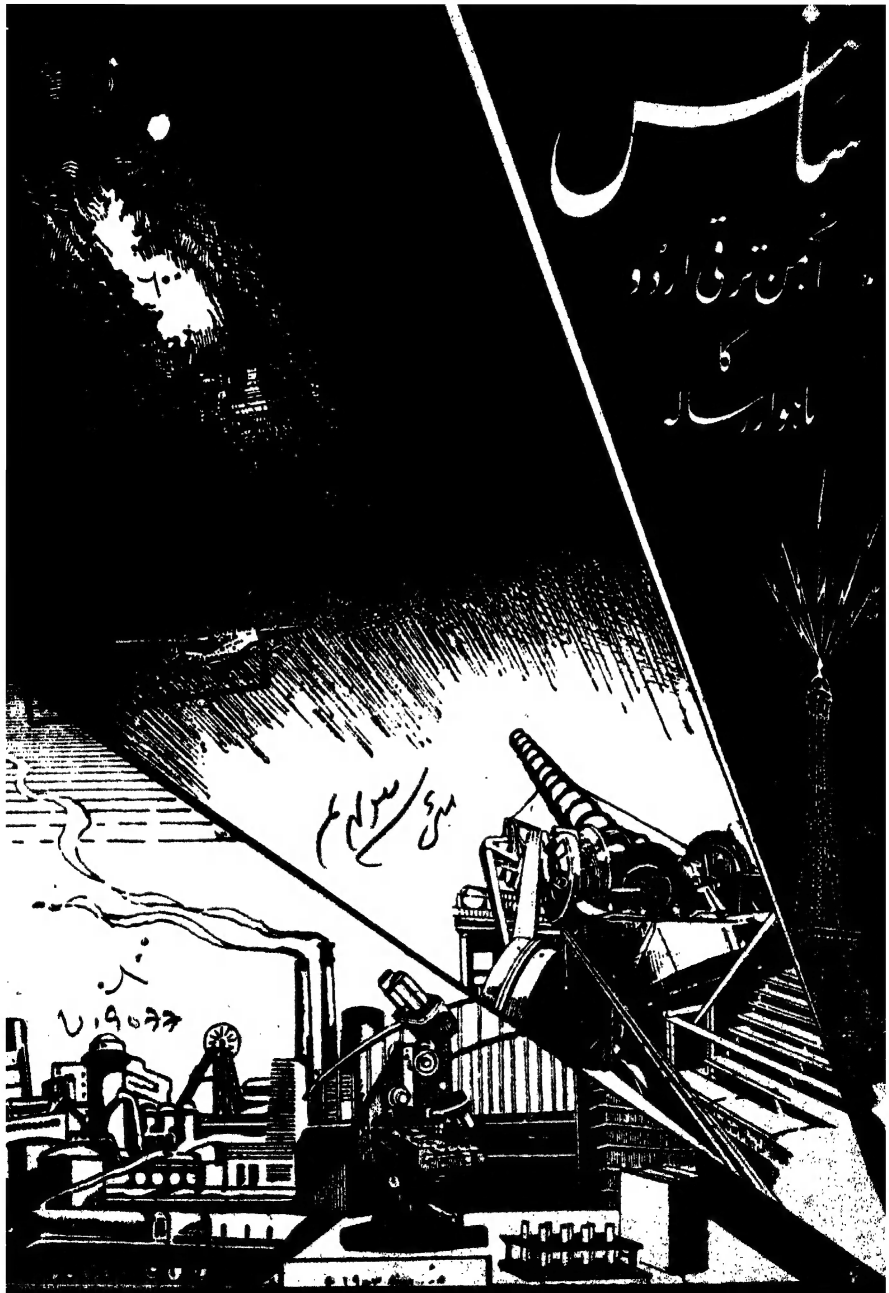
سائنس

انجمن ترقی اردو

کا
مبوریہ

میرزا سلیمان

۱۹۶۳



سائنس

انجمن ترقی اردو (ہند) کا ماہوار رسالہ

منظورہ سررشتہ تعلیمات حیدرآباد، صوبہ پنجاب، صوبہ بہار، صوبہ مدراس، میسور، صوبہ متوسط (سی۔ بی)، صوبہ سرحد، صوبہ سندھ، صوبہ دہلی، قیمت سالانہ محصول ڈاک وغیرہ ملا کر صرف پانچ روپے سکھ انگریزی (پانچ روپے ۱۴ آنے سکھ عثمانیہ)۔ غونے کی قیمت آٹھ آنے سکھ انگریزی (دس آنے سکھ عثمانیہ)

قواعد

- (۱) اشاعت کی غرض سے جملہ مضامین بنام مدیر اعلیٰ رسالہ سائنس جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن روانہ کئے جائیں۔
- (۲) مضمون کے ساتھ صاحب مضمون کا پورا نام مع ڈگری عہدہ وغیرہ درج ہونا چاہئے
- (۳) مضمون صرف ایک طرف اور صاف لکھے جائیں۔
- (۴) شکلیں سیاہ روشنائی سے علیحدہ کاغذ پر صاف کھینچ کر روانہ کی جائیں۔ تصاویر صاف ہونی چاہئیں۔ ہر شکل اور تصویر کے نیچے اس کا نمبر، نام اور مضمون پر اس کے مقام کا حوالہ درج کیا جائے۔
- (۵) مسودات کی حق الامکان حفاظت کی جائیگی لیکن ان کے اتفاقیہ تلف ہو جانے کی صورت میں کوئی ذمہ داری نہیں لی جاسکتی۔
- (۶) جو مضامین سائنس میں اشاعت کی غرض سے موصول ہوں، مدیر اعلیٰ کی اجازت کے بغیر دوسری جگہ شائع نہیں کئے جاسکتے۔
- (۷) کسی مضمون کو اگر سال فرمائے سے پیشتر مناسب ہوگا کہ صاحبان مضمون مدیر اعلیٰ کو اپنے مضمون کے عنوان، تعداد صفحات، تعداد اشکال و تصویر وغیرہ سے مطلع کر دین تا کہ معلوم ہو سکے کہ اسکے لئے پرچے میں جگہ نکل سکے گی یا نہیں۔ عام طور پر مضمون دس صفحہ (فلسفہ) سے زیادہ نہ ہونا چاہئے۔
- (۸) تنقید اور تبصرہ کے لئے کتابیں اور رسالے مدیر اعلیٰ کے نام روانہ کئے جائیں قیمت کا اندراج ضروری ہے۔
- (۹) انتظامی امور اور رسالے کی خریداری و اشتہارات وغیرہ کے متعلق جملہ مراسلت معتمد مجلس ادارت رسالہ سائنس حیدرآباد دکن سے ہونی چاہئے۔

سائنس

مئی ۱۹۴۳ء

نمبر

جلد

فہرست مضامین

صفحہ	مضمون نگار	مضمون	نمبر شمار
۲۴۷	سید محمد حسنی صاحب	» ہم «	۱
۲۵۶	محمد عجمی صاحب	صنعتی پیداوار	۲
۲۶۴	مترجم - محمد زکریا صاحب مائل	حسابی اعمال پر کیمیا فی تصرف	۳
۲۷۱	غلام جیلانی صاحب	دیاسلائی کی ایجاد اور اسکی ترقی	۴
۲۷۷	ریاض الحسن صاحب قریشی ایم۔ ایس۔ سی (شعبہ طبیعیات)	ہماری غذا	۵
۲۸۲	ادارہ	سوال و جواب	۶
۲۸۹	ادارہ	معلومات	۷
۲۹۹	ادارہ	سائنس کی دنیا	۸
۳۰۶	ادارہ	آسمان کی سیر	۹

مجلس ادارت رسالہ سائنس



- (۱) ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب معتمد انجمن ترقی آردو (ہند) صدر
- (۲) ڈاکٹر مظفر الدین قریشی صاحب - صدر شعبہ کیمیا جامعہ عثمانیہ مدیر اعلیٰ
- (۳) ڈاکٹر سر ایس - ایس بھٹناگر صاحب - ڈاکٹر بورڈ آف سائنٹیفک اینڈ انڈسٹریل ریسرچ گورنمنٹ آف انڈیا رکن
- (۴) ڈاکٹر رضی الدین صدیقی صاحب - پروفیسر ریاضی جامعہ عثمانیہ رکن
- (۵) ڈاکٹر بابر مرزا صاحب - صدر شعبہ حیوانیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ دکن
- (۶) محمود احمد خان صاحب - پروفیسر کیمیا جامعہ عثمانیہ رکن
- (۷) ڈاکٹر سلیم الزمان صدیقی صاحب - رکن
- (۸) ڈاکٹر محمد عثمان خان صاحب - رکن دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ رکن
- (۹) ڈاکٹر ڈی - ایس کوٹھاری صاحب - صدر شعبہ طبیعیات دہلی یونیورسٹی رکن
- (۱۰) آفتاب حسن صاحب - انسپکٹر تعلیم سائنس - سررشتہ تعلیمات سرکار عالی حیدرآباد دکن رکن
- (۱۱) محمد نصیر احمد صاحب عثمانی ریڈر طبیعیات جامعہ عثمانیہ (معتمد اعزازی)

”ہم“

(سید محمد حسنی صاحب)

یہ تھا کہ اکثر جہاز توپوں سے مار کر کرالے جایا کرتے تھے۔ لیکن آج کل کے بمبار جہاز اتنے زبردست ہیں کہ وہ ٹنوں وزن کے بم بہ آسانی ایک جگہ سے دوسری جگہ پھیک کر آسکتے ہیں۔ اس کے علاوہ ان کی رفتار، قوت اور بڑے فاصلے طے کرنے کی صلاحیت اس قدر بڑھ گئی ہے کہ وہ پندرہ سو میل کے فاصلے پر بم پھیک کر چند گھنٹوں میں اپنے اڈے پر واپس آسکتے ہیں۔ امریکہ کے جدید ترین جہاز جنکی رفتار ۳۰۰ سے زیادہ میل فی گھنٹہ بتاتی تھیں۔ مگر ان کے وزن کے بم بہ آسانی پھیک کر اپنے اڈوں پر ۱۰۰۰ میل کے فاصلے پر با آسانی آسکتے ہیں۔ اس کے علاوہ موجودہ بم پہلے کے مقابلہ میں زیادہ طاقتور، بڑے اور وزنی ہیں چنانچہ جرمنی کا سب سے بڑا بم ”شیطان“ ۲۲ ٹن وزن کا ہے اور یہ اتنا طاقتور ہے کہ بڑے سے بڑے جنکی جہاز کو نشانہ مار کر غرق کر سکتا ہے۔ شاید اس سے زیادہ وزنی بم اس لڑائی میں اور کوئی استعمال نہیں ہوا۔

جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے گذشتہ جنگ عظیم میں شہروں پر بم پھیکے گئے تھے اور

یہ جنگ گذشتہ جنگ عظیم سے بھی بہت زائد خطرناک ہے۔ انسان کا دماغ نئے نئے آلات ایجاد کرنے میں لگا ہوا ہے تاکہ انسانوں کو با آسانی موت کے گھاٹ اتارا جاسکے اور ان کی عمر بھر کی کاپی اور املاک کو مٹوں میں ملیا میٹ کر دیا جائے۔ جنگ کے زمانہ میں ایسی تباہی اور بربادی پھیلائی جائے کہ سطح زمین پر انسان کی زندگی مشکل اور دوبار ہو جائے۔ یوں تو تباہی کے لئے بہت سے آلات ایجاد ہو چکے ہیں اور رات دن ہورہے ہیں لیکن ان تباہ کن چیزوں میں جو مرتبہ بموں کو حاصل ہے وہ شاید کسی دوسری چیز کو نصیب نہیں ہے۔ وہ خوفناک حربہ ہے جس سے شہر، صنعتی مقامات، ریلیں، پل، جنگی جہاز مٹوں میں تباہ اور برباد کر دیے جاتے ہیں ہزاروں انسانوں کو سیکنڈوں میں موت کے آغوش میں ہمیشہ کو سلا دیا جاتا ہے۔

گذشتہ جنگ عظیم میں جرمن کے زہلیں جہاز لندن پر آ کر گولے برساتے تھے لیکن نہ تو وہ گولے اس قدر زبردست تھے اور نہ ان جہازوں کی رفتار ہی زیادہ تیز تھی۔ اس کا نتیجہ

ہیں۔ اس تبدیل کے وقت تین باتیں مشاہدہ میں آتی ہیں۔

(۱) حرارت کی پیدائش۔

(۲) کیمای مرکبات کی کیسوں میں تبدیل۔

(۳) اور ان پیدا شدہ کیسوں کا ایک دم غیر معمولی پھلاؤ۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ کونسے مرکبات ہیں جو یہ خوفناک اثرات پیدا کر سکتے ہیں۔ ابھی تک یقین کے ساتھ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ کون کون دھما کو ہیں جو ہٹوں میں استعمال ہو رہے ہیں۔ لیکن جہاں تک عام معلومات کا تعلق ہے یہ قرین قیاس ہے کہ حسب ذیل استعمال ہو رہے ہونگے نئے ایجاد شدہ دھما کو کا پوری پوری طرح علم جنگ ختم ہوئے سے قبل تقریباً ناممکن ہے۔

(۱) نائٹرو گلسرین (۶) نائٹرو ازانڈ

(۲) نائٹرو سیلو اوز (۷) ٹرائی نائٹرو ٹولوئین

(۳) نائٹروکن پاؤڈر (۸) ڈائٹائیٹ

(۴) نائٹرو ہائیڈر زین (۹) گلاکناٹ

(۵) نائٹرو ٹولینٹینک مرکری (۱۰) امٹول

اور سلور (ہلک پارہ (۱۱) امونل

اور چاندی)

دھما کو عموماً چار قسموں میں تقسیم کئے جاتے ہیں اور مختلف موقعوں پر مختلف دھما کو اپنی اپنی نوعیت کے اعتبار سے استعمال ہوتے ہیں۔

اس کو سب سے اول اہل جرمنی نے استعمال کیا تھا لیکن ہوائی جہازوں کے ذریعہ اس طرح بم بھینکنے کی ابتدا جس طرح کہ آج کل بھینکنے جاتے ہیں۔ اہل اسپین کا کارنامہ ہے۔ وہیں کے ایک جنرل نے اول اول ہٹوں کو مراکش کے ہتھے مسلمانوں پر استعمال کیا تھا۔ لیکن شاید اس کو یہ خبر نہ تھی کہ یہ ایجاد خود موجودین کے لئے عذاب ہو جائیگی۔ چنانچہ جس بے دردی سے اہل اطالیہ اور اہل جرمن نے ہٹوں کو میڈرڈ اور بارسیلونا کی تباہی کیلئے استعمال کیا ہے اس کی مثال ملنا مشکل ہے۔ جرمن اور اہل اطالیہ، ہسپانیہ کی خانہ جنگی میں اندرونی طور پر شریک تھے اور انہوں نے یہ بھی فیصلہ کر لیا تھا کہ ان کو ایک اور جنگ عظیم لڑنی ہے اس لئے نئے آلات کا امتحان کرنا ہے اس کا تجربہ ہسپانیہ میں کیوں نہ کر لیا جائے چنانچہ وہاں ان لوگوں کو ایک وسیع میدان اپنے تجربوں کے لئے ہاتھ آگیا اور ان کو وہ تمام باتیں بخوبی معلوم ہو گئیں جو مزید تحقیق کی محتاج تھیں۔ ان خوفناک تجربوں نے شروع شروع میں جرمن اور جاپان کو متحدرین کے مقابلے میں بعض کامیابیوں میں بڑی مدد دی۔

بم حقیقت میں ایک فولادی خول ہے جس میں دھما کہ سے بھٹنے والے کیمای مرکبات بھرے ہوتے ہیں۔ جب ان مرکبات کو صدمہ یا حرارت پہنچائی جاتی ہے تو وہ کیسوں میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ یہ کیس اس قدر مقدار میں پیدا ہوتی ہیں کہ خول کے ٹکڑے ہو جاتے ہیں اور یہ ٹکڑے فضا میں اڑنے لگتے

ہوتے ہیں اور ان میں مختلف کیمیائی مرکبات استعمال ہوتے ہیں۔ ان کی بیرونی ساخت بھی مختلف ہوتی ہے لیکن ایک اصول کے طور پر فوری جلنے والے بموں میں وہ کیل جو ٹنکر کھانے سے بھڑکنے والے مسالے رکھی ہے، ان کے آگے لگی ہوتی ہے تاکہ ٹنکر اترے ہی بم فوراً پھٹ جائے۔ لیکن وہ بم جن میں دیر میں پھٹنے والا فلیٹہ لگا ہوتا ہے ان میں کیلہ زیادہ تر نیچے ہوتا ہے تاکہ بم عمارت میں پوری طرح داخل ہونے کے بعد پھٹے اور تعمیر کو پوری طرح منہدم کر دے۔

اگر بموں کے خوفناک اثرات کو دیکھتے ہوئے ان کی تقسیم کی جائے تو یہ چار قسموں میں تقسیم کئے جاسکتے ہیں۔

- (۱) عمارتوں کو توڑنے والے بم
- (۲) ٹکڑے ٹکڑے کر دینے والے بم
- (۳) اسلحہ توڑ بم
- (۴) آگ لگانے والے بم

ان بموں کو مختلف موقعوں پر مختلف ضروریات کے لئے استعمال کیا جاسکتا ہے عمارتوں کی تباہی کے لئے پہلے قسم کے بم استعمال ہوتے ہیں۔ یہ بم بہت زور سے پھٹتے ہیں اور ان سے سخت دھماکہ پیدا ہوتا ہے۔ یہ دھماکہ عمارتوں کو ہلا کر مٹیوں میں تباہ و برباد کر دیتا ہے اور عمارتوں انسانوں کو ہلاک کر ڈالتا ہے اور جو مال و مناع بچ جاتا ہے اس کو آگ لگانے والے بم جلا کر خاک و سیاہ کر دیتے ہیں دوسری قسم کے بم زیادہ تر انسانوں کی

۱۔ محرك (Propellant) یہ دھماکو زائد ترکم رفتار کے دھماکے پیدا کرتے ہیں اس قسم کے خاص خاص دھماکو (۱) گن کاٹن Gun Cotton (۲) بالسٹائیٹ Ballistite (۳) کارڈائٹ Cardite ہیں۔

۲۔ متبدي (Initiators) یہ دھماکو بہت جلد آگ پکڑ لیتے ہیں اور فوراً جل اٹھتے ہیں اس قسم کے خاص دھماکو (۱) مرکزی نلہ خیت (Mercury fulminate) اور سیسے کا ازائیڈ (Lead Azides) ہے۔

۳۔ آتش بازی کی طرح چھوٹنے والے اور آگ لگانے والے یہ زائد تر (۱) دھوب کی چادر (۲) رنگین روشنی کے بان اور آگ لگانے والے بموں میں استعمال ہوتے ہیں۔

۴۔ توڑنے والے۔ یہ زائد تر چٹانوں، محفوظ مقامات اڑانے میں استعمال ہوتے ہیں اور دھماکے سے اطراف کی چیزوں کے ٹکڑے اڑا دیتے ہیں۔ اس ضمن کے خاص دھماکو (۱) مائع اکسیجن، کلکائیٹ اور ڈائنائٹ ہے۔

عام طور پر کسی مخصوص دھماکہ کو پسند کر لیا جاتا ہے اور اسکو بھر کر بم کے ذریعہ بھیجا جاتا ہے۔ لیکن بعض اوقات مختلف ضروریات کا خیال رکھتے ہوئے مختلف دھماکوں کا آمیزہ استعمال کیا جاتا ہے تاکہ مطلوبہ اثر پیدا کیا جاسکے۔ اس کے علاوہ مختلف ملکوں کے بم ایک دوسرے سے بالکل مختلف

عمار توں کو زاید سے زاید نقصان پہونچائیں ان کا وزن عموماً ۵۰ پونڈ سے لیکر ۱۰۰۰ پونڈ تک ہوتا ہے۔ ان کے پھنٹے سے ہزاروں فولادی ٹکڑے بکھر جاتے ہیں اور ہوا کا زبردست جھٹکا پیدا ہوتا ہے۔ اور یہ ہی ان کی کامیابی اور کثرت استعمال کا راز ہے۔ ان میں ابر میں چھوٹے والا خلیہ لگا ہوتا ہے۔

(۳) آبدو توڑ بم سے بہت زبردست موج پیدا ہوتی ہے بہ اکثر بندرگاہوں وغیرہ تباہی کے لئے استعمال کئے جاتے ہیں یہ مختلف وزن کے ہوتے ہیں اور ان میں اکثر دیر میں چھوٹے والا خلیہ لگا ہوتا ہے۔

(۴) آدم کش بم عام طور پر زاید وزنی نہیں ہوتے عموماً ان کا وزن ۲۰ پونڈ ہوتا ہے یہ بڑی تعداد میں ٹکڑے بکھر دیتے ہیں جو کہ فضا میں اڑ کر انسانوں کو ہلاک یا زخمی کر دیتے ہیں۔ کوشش یہ کی جا رہی ہے کہ اس بم کے ٹکڑے زمین کے بالکل متوازی اڑیں تاکہ کھڑے ہوئے انسانوں کو کھائل کیا جاسکے۔ اس معاملے میں سب سے زاید کامیابی اہل جاپان کو نصیب ہوئی ہے۔ ماہرین کا خیال ہے کہ ان کے آدم کش بموں کے ٹکڑے تقریباً ۲ فٹ سے لیکر ۶ فٹ کی بلندی تک زمین کے متوازی اڑتے ہیں۔ جب تک کہ کسی خندق یا تالی میں پناہ نہ لی جائے ان سے چھٹکارا مشکل ہے۔ ان بموں میں اکثر فوری جلنے والا خلیہ لگا ہوتا ہے۔

ہلاکت کے لئے مستعمل ہونے میں خاص کر کے فوج کے دستوں پر بکثرت پھینکے جاتے ہیں تاکہ بڑی سے بڑی تعداد کو بہ آسانی ہلاک کیا جاسکے۔ تیسری قسم کے بم عام طور پر بہت مضبوط اور مستحکم مقامات، جنگی جہاز اور قلعوں پر پھینکے جاتے ہیں جہاں معمولی اور کمزور بم کام نہیں دے سکتے ہیں یہ بم فولادی چادروں کو توڑ ڈالتے ہیں۔ اور استحکامات کو منہدم کر ڈالتے ہیں۔ اس قسم کے بم بہت بڑے ہوتے ہیں اور اس لئے سوائے مخصوص موقعوں کے کم استعمال ہوتے ہیں۔ لیکن بعض ماہرین فن اس قسم کی تقسیم سے مطمئن نہیں وہ اس کی تقسیم بم کے خول کے لحاظ سے کرتے ہیں ان کی تقسیم یہ ہے۔

(۱) بھاری خول والے

(۲) اوسط خول والے عام کام کے

(۳) ہلکے خول والے ابدوز توڑ

(۴) آدم کش

(۱) بھاری خول والے بم زاید ۲۵۰ پونڈ سے لیکر ۲۰۰۰ پونڈ تک وزن ہوتے ہیں اور مضبوط مقامات کی تباہی کے لئے استعمال کئے جاتے ہیں ان کو حقیقت میں اسلحہ توڑ بموں کا قائم مقام سمجھنا چاہئے۔ ان میں اکثر دیر میں چھوٹے والا خلیہ لگا ہوتا ہے۔

(۲) اوسط خول والے یہ بم بہت سے گاہوں

کے لئے بکثرت استعمال کئے جاتے ہیں۔ یہ شہروں پر پھینکے جاتے ہیں تاکہ جانوں اور

یہ ہم مختلف وزن اور جسامت کے ہوتے ہیں۔ ذیل کی جدول سے ان کی چند طبی خصوصیات کا بخوبی علم ہو سکیگا۔

نمبر	قسم ہم	لمبائی ٹھون میں	فطرائیجوں میں
۱	ہلکے خول والے ۲۰۰۰ پونڈ	۱۳۰۹	۲۳۰۹
۲	بھاری خول والے ۱۱۰۰ پونڈ	۵۰۹	۱۲۰۰
۳	اوسط خول والے ۵۵۰ پونڈ	۴۰۹	۱۴۰۹
۴	اوسط خول والے ۲۲۰ پونڈ	۳۰۵	۹۰۹
۵	اوسط خول والے ۱۰۰ پونڈ	۳۰۹	۸۰۹
۶	ادم کش ۲۰ پونڈ	۱۰۹	۴۰۹

ہمیں کی ساخت میں اس بات کا خاص طور پر خیال رکھا جانا ہے کہ ان کے وزن اور ان کے بارود کے وزن میں ایک خاص تعلق قیام رہے تاکہ دھماکو زائد خرچ نہ ہوں اور فائدہ پورا حاصل ہو۔ ہم ہر ملک کے اس قدر مختلف ہیں کہ ان کے متعلق صحیح اعداد و شمار ملنا مشکل ہیں ذیل میں جرمن ہوں کے متعلق اعداد و شمار پیش کئے جاتے ہیں ان کی مدد سے ایک عام اندازہ ہو سکے گا۔

قسم ہم	بارود کا وزن ہم کا وزن فیصدی	کل وزن
ادم کش	۱۶ سے لیکر ۲۱ تک	۲۰ پونڈ
ہلکے خول والے	۵۱ سے لیکر ۶۱ تک	۵۰ پونڈ سے لیکر ۳۰۰۰ پونڈ تک
اوسط خول والے	بہت معمولی	
بھاری خول والے	۲۶ سے لیکر ۴۱ تک	

ابھی تک ہم نے صرف یہ بیان کیا ہے کہ ہم کس قوت سے آکر ٹکراتا ہے۔ اب ہم دوسری بات کی طرف متوجہ ہوتے ہیں یعنی ہم کے ٹکرانے کے بعد کیا اثرات ہوتے ہیں۔ یہ ظاہر کہ جب ہم کس عمارت سے ٹکرائے گا تو اس میں جو دھماکو مرکبات بھرے ہوتے ہیں وہ فوراً آگے بکڑ لیجے اور وہاں کیمیائی تبدیلیاں واقع ہونگی۔ یعنی دھماکو فوراً کیسوں میں تبدیل ہو جائیگے اور یہ کیسے ہم کے بند خول میں پھیلنا چاہیں گی حقیقت میں کیسوں کا یہ پھیلاؤ اس قدر زبردست ہوتا ہے کہ ہم کا فولادی خول اپنے حجم سے تقریباً $\frac{1}{10}$ گنا پھیل جاتا ہے اس کے بعد دباؤ کی زیادتی کی وجہ سے پھٹ جاتا ہے اس وقت ان کیسوں کا دباؤ ۶۰۰ ٹن فی مربع انچ سے لیکر ۱۰۰ ٹن فی مربع انچ تک ہوتا ہے لیکن جیسے جیسے یہ کیس پھیلنے جاتی ہیں ان کا دباؤ تیزی کے ساتھ کم ہو جاتا ہے۔ چنانچہ ۵۰۰ پونڈ کے ہم کا دباؤ ۵۰ فٹ کے فاصلہ

ان اعداد و شمار کو دیکھنے کے بعد انسان خوفناک بموں کا اندازہ لگا سکتا ہے اندازہ لگایا گیا ہے کہ اگر ۲۰۰۰ فٹ کی باندی سے ایک ۱۰۰ پونڈ کا ہم کسی عمارت پر پھینکا جائے تو یہ ہم تقریباً ۶۰۰ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے آکر عمارت سے ٹکرائیگا اور عمارت کو ۶۵۰ فٹ ٹن حرکی توانائی کا صدمہ پہنچے گا۔ ظاہر کہ معمولی عمارتیں یہ صدمہ برداشت نہیں کر سکتیں اس لئے جیتک کہ ان کو خاص طور پر مستحکم نہ بنایا جائے وہ ہم کے لگنے ہی سمبار ہو جائیں گی۔ حساب لگایا گیا ہے کہ اگر ۵۰۰ پونڈ کا ہم جسکی تراشی کثافت (Sectional Density) پانچ پونڈ فی مربع انچ ہو تو وہ تقریباً ۸۲۵ پونڈ فی سکند کی رفتار سے آکر زمین پر ٹکرائے گا اور فٹوں زمین میں دھس جائیگا۔ ذیل میں ایک نقشہ دیا جاتا ہے جس سے قیاس ہو سکیگا کہ یہ ہم مختلف چیزوں میں کہاں تک ٹکرا کر بیوست ہو جائیگا۔

نام	کھراپی فٹوں میں	نام	کھراپی فٹوں میں
جونے کا پتھر	۳۰۱	ریشیل فی	۲۰۰۱
لوہا ملا ہوا کفریٹ	۲۰۲	اوسط مضبوطی کی زمین	۱۵۰۰
معمولی کنکریٹ	۳۰۳	نرم زمین	۳۴۰۰
پتھر کی جڑائی	۵۰۰	ہلکی زمین	۲۶۰۴
اینٹ کی جڑائی	۱۰۰۰	کاشت دار زمین	۲۳۰۰

معمولی کنکریٹ ۱۶
مٹی اور بالو ۳۱
ٹوٹے ہوئے پتھر ۲۵

چنانچہ وہ مقررہ وقت پر پہنچنے والا ہم جو سینٹ ہال پر پھیکا کیا تھا اتنا زبردست تھا کہ جس وقت کہ وہ پھوڑا گیا ہے تو اس نے ۱۰۰ فٹ چوڑا غار بنا دیا تھا۔ عام اندازہ یہ ہے کہ ۳۰۰ سے لیکر ۲۲۰۰ پونڈ تک کام ۱۰۰ فٹ سے لیکر ۱۰۰۰ فٹ تک مٹی کے گود دگر غار کے کناروں پر جمع کر دیتا ہے باغیا میں منتشر کر دیتا ہے اس کے علاوہ زمیں میں ایک زبردست زلزلہ پیدا کر دیتا ہے کہ مستحکم سے مستحکم عمارت کی بنا ہل جاتی ہے اور اگر وہ خاص طور پر مضبوط نہ بنائی گئی ہو تو فوراً عمارت منہدم ہو جاتی ہے۔

لیکن یہاں یہ یاد رکھنا چاہئے کہ ہم کے اثرات کا تعلق اسکے وزن کے علاوہ دیگر چیزوں سے بھی ہے۔ کامیاب نشانہ اندازہ اور زائد تباہی کیلئے یہ ضروری ہے کہ ہم زمین پر عمودی اکر کرے وہاں وہ جتنا عمود سے ہٹتا جائیگا، اس کی رفتار کم ہوتی جائیگی اور اس میں اس بات کا احتمال بڑھتا چلا جائیگا کہ ہم زمین پر لگ کر اچٹ جائے اور پوری پوری تباہی نہ پھیلا سکے۔ عام طور پر ہم اس طرح پھیکے جاتے ہیں کہ وہ عمود سے کم سے کم زاویہ بنائیں اکثر ہم ۱۵ سے لیکر ۳۰ تک زاویہ بناتے ہوئے زمیں سے ٹکراتے ہیں۔ ذیل کا دیا ہوا نقشہ اس کو بخوبی واضح کرتا ہے۔ یہ فرض کر لیا گیا ہے کہ جہاز تقریباً ۲۰۰ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے اڑ رہا ہے۔

پر صرف ۶ پونڈ فی مربع انچ رہ جاتا ہے۔ اس پھیلاؤ کے لئے ۱ سکند درکار ہوتے
۱۰۰۰۰

ہیں اور اس وقت کیس ایک دم ۲۰ سے لیکر ۲۵ فٹ کے نصف قطر کے کرہ میں پھیل جاتی ہے اور ان سے مثبت اور منفی لہریں پیدا ہوتی ہیں جسکی لمبائی ابتدا میں تقریباً ۲۰ فٹ ہوتی ہے اور ان کے درمیان ایک سکند کے پانچ ہزار دین حصے سے لیکر ۲۵ ہزار دین حصے تک کا وقفہ لگتا ہے۔ اور ہم کے ۳۰۰۰ سے لیکر ۶۰۰۰ ٹکڑے ہو جانے ہیں جن کا وزن تقریباً ایک اونس کے قریب قریب ہوتا ہے۔ یہ ٹکڑے نہایت تیزی سے فضا میں اڑتے ہیں۔ چنانچہ جس جگہ ہم پہنچا ہے وہاں سے تقریباً ۱۵ فٹ کے فاصلہ پر ان کی رفتار ۴۰۰۰ سے لیکر ۷۰۰۰ فٹ فی سکند تک ہوتی ہے۔ لیکن ۴ رفتار تیزی سے کم ہوتی چلی جاتی ہے چنانچہ ۵۰ فٹ کے فاصلہ پر صرف ۲۵۰۰ فٹ سے لیکر ۵۰۰۰ فٹ تک رہ جاتی ہے۔ یہ ٹکڑے بند مقامات پر ۵۰۰ فٹ تک بخوبی انسانوں کو ہلاک کر سکتے ہیں اور کھل ہوتی جگہ پر ۳۰۰ سے لیکر ۱۲۰۰ گز تک تباہی پھیلا سکتے ہیں۔ یہ ٹکڑے اتنی زور سے آکر لگتے ہیں کہ فولاد وغیرہ میں پیوست ہو جاتے ہیں ذیل کے نقشہ سے یہ بخوبی معلوم ہو سکیگا کہ یہ ٹکڑے مختلف چیزوں میں کہاں تک داخل ہو سکتے ہیں۔

کھراٹی انچوں میں

۱۶

۱۳

نام

ترم فولاد

ایسٹ کی ٹھوس جڑائی

بم پہنکتے وقت بلندی فٹوں میں	زمین سے ٹکرانے کا زاویہ	ٹکرانے کی ٹی رفتار سیکنڈ تقریباً
۱۰۰۰	۴۸	۴۰۰
۳۰۰۰	۳۵	۵۵۰
۵۰۰۰	۲۵	۶۲۵
۷۵۰۰	۲۰	۷۵۰
۱۰۰۰۰	۱۹	۸۰۰
۱۲۵۰۰	۱۷	۸۵۰
۱۵۰۰۰	۱۶	۹۵۱

سے فولادی شمشیر بم کے مرکز سے پڑے جھک جاتے ہیں لیکن اس کے بعد ہی جو کہہ بیچنے یا جذب کرنے والی موجیں آتی ہیں وہ ان شمشیروں کو بم کے مرکز کی طرف کھینچ لے جاتی ہیں۔ اور اکثر شکستہ شدہ عمارتوں کو بالکل ڈھیر کر دیتی ہیں۔

ابھی تک ہم نے بموں کا عام حال بیان کیا ہے اور ان کی ہلاکت خیزی کا مختصر ذکر کیا ہے لیکن دشمن تباہی کے علاوہ شہر میں دہشت اور بربادی بھی پھیلا چاہتا ہے چنانچہ جرمن کے بموں میں اس قسم کی سیٹیاں لگائی گئیں ہیں جن سے بہت زائد شور پیدا ہوتا ہے اور باشندے خیال کرتے ہیں کہ ہزاروں بم بیک وقت گر رہے ہیں۔ یہ بم اگرچہ نقصان تو صرف محدود و رقبہ کو پہنچا سکتے ہیں لیکن شہر کے امن و امان میں بہت بڑا خلل پیدا کر سکتے ہیں اس کے علاوہ بعض اوقات دوسری ترکیبیں بھی

ان باتوں کے علاوہ جو اوپر بیان کی گئی ہیں، تین باتیں بم کے پھٹنے وقت اور دیکھنے میں آتی ہیں۔ بم کے پھٹنے وقت آگے آگے فولادی ٹکڑوں کی ایک قوس ہوتی ہے اس کے پیچھے دھماکے سے پیدا شدہ گیسوں کا کرہ ہوتا ہے جو موجیں مارتا ہوا تیزی کے ساتھ آگے بڑھتا ہے اس کو ہم جھونکے کی موجیں یا جھٹکے کی موجیں کہہ سکتے ہیں یہ لمبریں اسقدر قوت کی حامل ہوتی ہیں کہ بہت کم وقفے میں بڑی بڑی عمارتوں کو کر ادیتی ہیں اور جانداروں کو بری طرح زخمی کرتی ہیں ان کے بعد کہہ بیچنے والی موجیں ہوتی ہیں جو کہ جھونکے والی موجوں کا لازمی نتیجہ ہیں۔ اکثر دیکھتے ہیں آیا ہے کہ بم سے شکستہ عمارتیں اگر اوہے اور کمتر کیٹ کی بنی ہوئی ہوں تو وہ بم کے مرکز کی طرف جھکی ہوتی پائی جاتی ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اول تو جھونکے والی موجوں کی وجہ

تقصان اٹھانا پڑتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ماہرین کا خیال ہے کہ جب تک کہ کوئی خاص مستحکم مقام کی تباہی منظور نہ ہو شہر یوں رہے گا۔ پونڈ سے زائد کے ہم کہی استعمال کئے جانگے بائکہ جھوٹے جھوٹے ہم بڑی تعداد میں مستعمل ہونگے۔ اس میں نظریہ کو پیش نظر رکھکر ”والو ٹوکا ٹوکرا“ ایجاد کیا گیا ہے۔ یہ روسیوں کی ایجاد ہے۔ اس کو حقیقت میں بہت بڑا ہم سمجھنا چاہئے جس کا طول تقریباً ۸ فٹ اور قطر تقریباً ۳ فٹ ہوتا ہے۔ یہ ہم دو حصوں میں تقسیم ہوتا ہے جو ایک دوسرے سے ملے ہوتے ہیں۔ جس وقت یہ ہم پھکا جاتا ہے اس کے دونوں حصے فضا میں علحدہ علحدہ ہو جاتے ہیں اور ان میں سے بہت سے جھوٹے جھوٹے ہم نکل کر منتشر ہو جاتے ہیں اور زمین کے ایک وسیع رقبہ پر گر کر تباہی اور بربادی پھیلاتے ہیں۔ ان کے علاوہ آگ لگانے والے ہم بھی ہوتے ہیں جو بہت زیادہ نقصان کے باعث ہوتے ہیں۔ ان کے لئے ایک علحدہ مضمون کی ضرورت ہے۔ فی الحال طوالت کے خیال سے ان کو نظر انداز کیا جاتا ہے۔

مستعمل ہوتی ہیں تاکہ بموں کو زائد سے زائد موثر بنایا جاسکے۔ مثلاً بموں میں زبردست دھماکوں کے ساتھ ساتھ زہریلی گیس بھی جاسکتی ہے۔ یا ان میں آگ لگانے والے مسالے رکھے جاسکتے ہیں تاکہ جو املاک تباہ ہو وہ فوراً جلا ہی دی جائے۔ چنانچہ وہ ہم جو جاپان نے رنگون میں استعمال کئے تھے ان کا وزن تقریباً ۱۳۰ کلوگرام تھا ان میں زبردست دھماکوں کے ساتھ ساتھ آگ لگانے والی گولیاں بھی تھیں جنہوں نے ان بموں کو اور زبردست خوفناک اور تباہ کن بنادیا تھا۔ مزید برآں یہ بات تجزیوں سے ثابت ہو چکی ہے کہ ایک ۲۰۰۰ پونڈ کے ہم سے اتنی تباہی نہیں پھیلائی جاسکتی جتنی کہ چار ۵۰۰ پونڈ کے بموں سے پھیلائی جاسکتی ہے۔ یا حتیٰ کے ۱۰۰ پونڈ کے بموں سے پھیلائی جاسکتی ہے اتنی ۵۰۰ پونڈ کے ایک ہم سے نہیں پھیلائی جاسکتی۔ اس کے علاوہ ہوائی جہاز پر سے ہم پھیک کر صحیح نشانہ لگانا جبکہ حمزہ ۲۰۰۰ فٹ کی بلندی پر ۳۰۰ میل کی رفتار سے اڑ رہا ہو تقریباً ناممکن ہے اسلئے اگر بڑا ہم اپنے نشانہ پر نہ لگے تو بجائے ناکامی کے انما



ضمنی پیداوار

(محمد حمیس صاحب)

اگر آپ نے آم کے آم اور کٹھلیوں کے دام والی مثل سنی ہے تو اس کو آسانی سے سمجھ جائینگے۔ ظاہر ہے کہ اون کے سلسلے میں کٹھلی خواہ غواہ کو ہاتھ لگتی ہے۔ اگر کسی طور پر کٹھلیاں کارآمد ثابت ہوں اور ان کے دام کھڑے ہو سکیں تو انسان کو کچھ خوشی نہ ہوگی۔ کٹھلیوں کا کارآمد ثابت ہونا کوئی بڑی بات نہیں ہے۔ لیکن فرض کیجئے کہ ایسا ہو بھی گیا تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کون شریف آدمی گھر گھر بھر کر دو دو چار چار کٹھلیاں جمع کرتا پھرے گا۔

بڑے بڑے کارخانوں میں یہ بات ہوتی ہے کہ ضمنی چیز بن بیک وقت کافی بڑی مقدار میں حاصل ہوتی ہیں، انی کہ ان بلاؤں سے چھٹکارا پانے میں بھی ایک دقت کا سامنا کرتا پڑتا ہے لیکن چونکہ بڑے بڑے کارخانے واؤن کے پاس روپیہ کافی ہوتا ہے اس لئے وہ کچھ سائنسدانوں کو اس بات کی تحقیق کرنے کے لئے بٹھا دیتے ہیں کہ ان فاضل اشیا سے کیا کیا کارآمد چیزیں بن سکتی ہیں۔ جب اس کا پتہ لگ

سائنس کی بڑھی ترقی کے ساتھ جب بڑے بڑے کارخانے قائم ہونے لگے تو سائنسدانوں کو ایک نئی دقت نے پریشان کرنا شروع کیا۔ وہ دقت ضمنی پیداوار کے استعمال کی تھی۔ اب ان کے ہاتھوں دار ضمنی پیداوار کا مطلب بھی سمجھ لیجئے۔ عام طور پر اس دنیا میں دیکھا گیا ہے کہ جب ہم کوئی چیز بنانے کی کوشش کرتے ہیں تو اس سلسلے میں اصلی چیز کے ساتھ ساتھ خواہ غواہ کی ہمیں دو تین چیزیں اور بھی حاصل ہوجاتی ہیں، جو بظاہر بالکل بے کار معلوم ہوتی ہیں۔ ان ہی بظاہر بیکار چیزوں کو ہم ضمنی پیداوار کہتے ہیں۔ اب آپ کہیں گے کہ جب دنیا کا ہمیشہ ہی سے دستور رہا ہے کہ ہر کام میں فاضل اشیا حاصل ہوں، تو پھر اس میں پریشانی کی کیا بات ہے؟ جو حشر ہمیشہ سے فاضل اشیا کا ہوتا چلا آرہا ہے وہی اب بھی ہونا چاہئے۔ تو اس کے جواب میں آپ کو میرا پہلا جملہ یاد کرنا چاہئے۔ میں نے اکھا ہے کہ یہ دقت بڑے بڑے کارخانوں کے قائم ہونے پر پیدا ہوئی۔ ایسے اب یہ دیکھنے کی کوشش کریں کہ ان بڑے بڑے کارخانوں کے قائم ہونے سے کیا خاص بات پیدا ہو گئی۔

یہ انعام جیت لے کیا۔ اس کے طریقے میں نمک پر سلیفروک ترشے کا عمل کیا جاتا ہے جس سے سوڈیم سلفیٹ اور ہائیڈروکلورک ترشہ کی کیس حاصل ہوتی ہے۔ سوڈیم سلفیٹ کو لکڑی کے کوئلے اور کھریا کے ساتھ گرم کیا جاتا ہے تو سوڈیم کاربونیٹ حاصل ہوتا ہے اور ایک بھاری ہیلے رنگ کی کیچڑ جیسی چیز بچ جاتی ہے۔

اب اس طریقے میں سوڈے کے ساتھ در ضمنی چیزیں یعنی ہائیڈروکلورک ترشہ اور کیچڑ جو حاصل ہوئیں وہ ابتدا میں سخت تکلیف دہ ثابت ہوئیں۔ ہائیڈروکلورک ترشہ کی کیس فضا میں پھیل جاتی تھی اور عوام کے صحت کے لحاظ سے سخت نقصان دہ تصور کی جاتی تھی۔ اگر کہیں سولوے کا طریقہ پہلے دریافت ہو چکا ہو تو پھر لبلانک کا طریقہ کبھی آ کے بڑھ نہیں سکتا تھا۔ لیکن غنیمت ہوا کے میدان ابتدا میں اس کے ہاتھ تھا۔ جب ان ضمنی بلاوں سے جان چھڑانی مشکل ہو گئی تو پھر اس کو کام میں لانے کی فکر لوگوں کو ہوئی۔ اس کو پھر اس طرح کام میں لایا گیا کہ اس سے جو چیزیں بنیں وہ سوڈے سے بھی زیادہ قیمتی ثابت ہوئیں۔ ہائیڈروکلورک ترشے سے رنگ کٹ سفوف وغیرہ حاصل کیا گیا اور کیچڑ بھی بہت بیش قیمت ثابت ہوئی اس کی بدبو کندھک کے سبب تھی ایک طریقہ ایسا دریافت کیا گیا جس سے پوری کی پوری کندھک اس سے نکالی گئی۔ ۱۸۷۲ تک سوڈا بنانے کا اور کوئی طریقہ معلوم نہ تھا اس لئے لبلانک کا طریقہ ہی ہر جگہ

جاتا ہے تو اصلی کارخانوں کے ساتھ ہی ان چیزوں کے چھوٹے چھوٹے کارخانے قائم ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ اجمل کارخانوں میں مشکل ہی سے کوئی چیز بیکار جانے دی جاتی ہے۔ سائنسدانوں کا محض یہی کام نہیں ہوتا کہ وہ دیکھیں کہ ضمنی چیز کئی مصرف میں لائی جاسکتی ہے یا نہیں بلکہ ان کو یہ بھی دیکھنا ہوتا ہے کہ ضمنی چیز سب سے بہتر کس مصرف میں لائی جاسکتی ہے۔

کہاں تو وہ دن تھے کہ لوگ ضمنی چیزوں سے بڑھ مانگتے تھے اور ان کو اپنے کارخانے کی بچتی شمار کرتے تھے اور اب یہ دن آ گیا ہے کہ بعض کارخانے اپنے ضمنی پیداوار ہی کے بل پر جاتے ہیں۔ کارخانہ قائم کرتے ہیں ایک چیز کے لئے، لیکن صحیح نفع اٹھاتے ہیں ان چیزوں سے جو کارخانے میں ضمنی طور پر حاصل ہوتی ہیں۔ اس کی سب سے بہتر مثال لبلانک کا طریقہ ہے۔ سوڈیم کاربونیٹ بنانے کے دو طریقے ہیں ایک لبلانک کا طریقہ اور دوسرا سولوے امونیا کا طریقہ کہلاتا ہے۔ سولوے کا طریقہ لبلانک کے طریقے سے بہت آسان اور سستا ہے لیکن لبلانک کے طریقے میں ضمنی طور پر رنگ کٹ سفوف اور کلورائیٹ وغیرہ حاصل ہو جاتے ہیں۔

سوڈا یعنی سوڈیم کاربونیٹ بہت اہم چیز ہے۔ ایک بار فرانسسیسی اکیڈمی نے یہ اعلان کیا کہ جو شخص نمک سے سوڈے کی تیاری کا کامیاب طریقہ دریافت کرے گا اس کو سو ہاونڈ انعام دیا جائیگا۔ لبلانک (۱۷۵۲-۱۸۰۶) میدان میں آیا اور

ان کارخانوں میں کوئلے سے جب گیس نکالی جاتی تھی تو ضمی طور پر ایک نہایت بدبودار، سیاہ، چکنی چیز نکلتی تھی جو تارکول کہلاتی تھی یہ بد بخت چیز اس قدر تکلیف دہ تھی کہ کارخانے والے اس سے پریشان رہتے تھے اس کو رکھنا اور پھینکا دونوں مشکل تھا۔ رکھی جائے تو بے کار چیز جگہ کہہ رہے ہوئے رہتی تھی پھینکی جائے جو جس جگہ ڈالی جائے اس کو بد بو سے خراب کر دے جس دریا یا تالاب میں گرائی جائے اس کے پانی کو ناقابل استعمال بنادے۔ اس لئے مجبوراً کارخانے والے اس کو آبی سے مت دور پھینکوانے تھے۔ اور اس سلسلے میں کافی نقصان اٹھاتے تھے۔ اس کے علاوہ ایک اور پانی جیسی چیز نکلتی تھی جس کو امونیاوی مائع کہا جاتا تھا کیونکہ اس کے اندر سے امونیا جیسی بو نکلتی رہتی تھی۔ یہ چیز بھی ایک آفت تھی۔ اس کو بھی پھینکوا یا جاتا تھا یا جرمائنگٹا تھا اس کو اونے پونے دے دیا جاتا تھا۔

غرض کہ کوئلے سے جب گیس نکالی جاتی تھی تو دو ضمی چیزیں حاصل ہوتی تھیں۔ تارکول اور امونیاوی پانی۔ اب کو کارخانے والے ایک خواہ مخواہ کی پریشانی تصور کرتے تھے۔ لیکن بے چارے کو کارخانے والوں کو معلوم نہ تھا کہ جس چیز کو وہ آفت سمجھ رہے تھے وہ ان کے لئے سب سے بڑی راحت کا سامان پیدا کرنے والی تھی۔ ان دونوں ضمی چیزوں پر کیمیا دانوں نے تجربے شروع کئے اور دنیا کو بتا دیا کہ جو چیزیں بے کار سمجھی جاتی

استعمال ہوتا رہا لیکن اس سال بلجیم کے مشہور کیمیا دان ارنسٹ سولوے نے ایک دوسرا طریقہ ایجاد کیا جو آج تک اسی کے نام سے مشہور ہے۔ غالباً سوڈا بنانے کا اس سے بہتر اور کوئی طریقہ نہیں ہے۔ اس میں لبلانک کے طریقے سے ادما ایندھن استعمال ہوتا ہے اور کوئی کیچڑ یا رسوب باقی نہیں بچتا۔ اس نئے طریقے کے ایجاد ہونے ہی لبلانک کے طریقے کو طبیعی موت مرجانا چاہئے تھی لیکن وہ زندہ رہا اور اب بھی زندہ ہے۔ اور جیسا کہ اوپر ذکر کیا جا چکا ہے بہت سے کارخانے والے سوڈا بنانے کے لئے لبلانک کے طریقے کو خاص کر اسی لئے استعمال کرتے ہیں کہ سوڈے کے ساتھ ساتھ اس میں زنگ کٹ، سفوف اور گندک وغیرہ بھی کو یا مفت ہی دستیاب ہو جاتا ہے۔

یہاں تک تو سوڈے کے متعلق ہوا اب کوئلے کو لیجئے کوئلے کو آج کل سیاہ سوڈا کہا جاتا ہے۔ اور صحیح معنی میں یہ اس قدر بیش قیمت چیز ہے کہ سوڈا اس کے ہاسنگ نہیں آسکتا۔ ایک زمانے میں کوئلے سے گیس نکالی جاتی تھی جس کو جلانے کے کام میں لایا جاتا تھا۔ اس کے بڑے بڑے کارخانے تھے۔ کوئلے کو بند بٹھیوں میں گرم کیا جاتا تھا اور اس سے جو گیس نکلتی تھی اس کو ٹائپ کے ذریعے مختلف جگہوں میں پہونچایا جاتا تھا اور پھر اس کو روشنی یا حرارت حاصل کرنے کے لئے استعمال کیا جاتا تھا۔ گیس نکل جانے کے بعد جو کوئلہ بچ جاتا تھا وہ ہلکا کوئلہ ہوتا تھا۔ جلانے کے لئے بہتر ہوتا تھا۔ کیونکہ اس میں دھواں نہ ہوتا تھا۔

سے امونیا نکال لی جاتی ہے اور اس سے امونیم سلفیٹ تیار کی جاتی ہے جو کاشتکاری میں کھاد کی حیثیت سے کثرت کے ساتھ استعمال ہوتی ہے۔

ایک بڑے لوہے کے کارخانے پر نگاہ ڈالئے تو اس میں ضمنی پیداوار کا تماشا نہایت خوبصورتی سے نظر آتا ہے۔ لوہے کی یکدھاتوں کو کونلے کے ساتھ جلایا جاتا ہے۔ لیکن کونلے کو اس میں استعمال کرنے سے پہلے ہلکا کر لیا جاتا ہے۔ یعنی اس کی ساری صعود پذیر اشیا کو نکال لیا جاتا ہے۔ اس کام کے لئے کونلے کی بڑی بڑی بند بھٹیاں ہوتی ہیں۔ پہلے بھٹیاں کھلی رہتی تھیں اور کونلے کا دھواں اڑ جایا کرتا تھا لیکن حب لوگوں کو معلوم ہوا کہ اس دھوین میں سیکڑوں بیش قیمت چیزیں پوشیدہ ہیں تو اس کو جمع کرنے کا انتظام کیا گیا۔ اور اب بھٹیوں کے اوپر بڑے بڑے نل لگے ہوئے ہیں جن کے ذریعے دھواں اور گیس کو محفوظ کر لیا جاتا ہے۔ گیس جو اس طرح حاصل ہوتی ہے اس کو پھر ان ہی بھٹیوں کو جلانے اور گرم رکھنے کے کام میں لایا جاتا ہے۔ لیکن جلانے سے قبل گیس اور دھوین میں جو کول تار، امونیا اور بڑول وغیرہ ہوتا ہے اس کو الگ کر لیا جاتا ہے۔ اور پھر ان سے، ساتھ کے کارخانوں میں، طرح طرح کی چیزیں بنائی جاتی ہیں۔

کونلے سے جو کچھ نکلتا تھا جب نکل چکتا ہے تو یہ مسام دار اور ہلکا ہو جاتا اور پھول جاتا ہے۔ اس کو اصطلاح میں کوک کہتے ہیں۔

تھیں وہ نہ صرف یہ کہ باکار تھیں بلکہ اس قدر بیش قیمت تھیں کہ ان کے مقابلے میں کونلے کی کیس کوئی حقیقت نہیں تھی۔

تارکول سے اس وقت تقریباً دو ہزار رنگ نکالے جاتے ہیں۔ اور ان کی خوبصورتی ایسی ہے کہ قوس قزح کے رنگ ان کے سامنے ماند پڑ جائے ہیں۔ دلچسپی کی خاطر آپ کو اتنا بتا دینا کافی ہوگا کہ ایک ٹن کونلے سے اتنا رنگ نکل سکتا ہے کہ اس سے اگر ایک ہون کز چوڑے نل لائن کے تھان کو رنگا جائے تو زرد رنگ سے دو میل، سرخ رنگ سے دیرھ میل، بنفشی سے پون میل، شوخ قرمزی سے چودہ سو فیٹ، رُک رڈ سے سات سو فیٹ، اور نارنجی سے تین سو ستر فیٹ لائے تھان رنگے جاسکتے ہیں۔

اور ایک رنگ بھی پر کیا، موقوف ہے تار کول کی جدید زمانے میں اتنی اہمیت ہے کہ ہماری روزانہ زندگی میں کام آنے والی شاید ہی کوئی چیز ہو جس میں تارکول سے نکلی ہوئی اشیا کسی نہ کسی طرح کام نہ آتی ہوں۔ رنگوں کے علاوہ تارکول کی کشید سے بڑول حاصل ہوتا ہے جسے موٹروں میں پٹرول کی جگہ چلایا جاسکتا ہے، بچ حاصل ہوتا ہے جسے سڑکوں پر بچھایا جاتا ہے۔ کریوسوٹ ایل حاصل ہوتا ہے جس سے نفٹیلین اور کاربولک ترشہ تیار ہوتا ہے۔

کاربولک ترشہ سے جراثیم کشی کے علاوہ پکڑک ایسڈ تیار کیا جاتا ہے جس سے زبردست دھماکو مسالے تیار ہوتے ہیں۔ امونیاوی پانی

پائپوں پر چڑھا دیا جاتا ہے جس کے سبب ان کی گرمی باہر جانے نہیں پاتی۔ بعض طریقوں کو کام میں لا کر اس کو روٹی کی طرح دھن دیا جاتا ہے اور پھر اس سے جو غیر موصل چیزیں بنائی جاتی ہیں وہ اسبسٹوس کی چیزوں سے بھی بہتر ہوتی ہیں۔

آپ نے دیکھ لیا کہ ایک لوہے کے کارخانے میں، جس کا صحیح مقصد صرف لوہا تیار کرنا ہونا چاہئے تھا، خواہ مخواہ کی متعدد ضمی چیزیں تیار ہوا کرتی ہیں، جو اپنی اہمیت کے سبب سے کارخانے والوں کو بہت فائدہ پہنچا دیتی ہیں۔ اسی طرح کسی کارخانے پر نظر ڈالئے تو اس کے ساتھ ساتھ متعدد کارخانے ایسے نظر آئینگے جو ضمی پیداوار کی خواطر قائم ہو گئے ہیں۔ ابھی حال حال کی بات ہے کہ ہندوستان میں شکر کی صنعت کو بہت ترقی ہو گئی ہے۔ شکر کی صفائی کے دوران میں ٹنوب شیرہ (Mollascas) ضمی پیداوار کے طور پر حاصل ہوتا ہے۔ لیکن اس سے کوئی خاص کام نہیں لیا جاتا اس کو سستے داموں بیچ دیا جاتا ہے۔ اور زیادہ سے زیادہ اس کا استعمال یہ ہوتا ہے کہ تمباکو بنانے والے اس کو تمباکو میں مٹھاس پیدا کرنے کے لئے ڈالتے ہیں۔ لیکن ضرورت ایجاد کی مان ہے۔ ہندوستان میں پٹرول نہیں ہے جو آتا ہے باہر سے آتا ہے۔ اب سوائے اس کے چارہ نہیں کہ مصنوعی طور پر پٹرول یا تو کوئلے سے بنایا جائے یا پھر شکر یا اس کے شرے سے الکوہل بنایا جائے جس سے گاڑیاں چل سکیں۔ شکر کا مصرف، ظاہر ہے کہ موثر

اس کوک کو لوہے کی یکدھات میں ملایا جاتا ہے اور اس کے ساتھ چونے کا پتھر بھی ہوتا ہے۔ جب اس امیزہ کو بھٹیوت میں ڈال کر جلایا جاتا ہے تو یہ سارا مادہ پگھل جاتا ہے۔ لوہا گلی کر الگ ہو جاتا ہے اور لوہے کی یکدھات میں جو کچھ لوٹ تھا وہ چونے سے مل کر ایک رقیق مادے کی حیثیت سے باہر نکل کر جم جاتا ہے۔ اسے کارخانے والے سلینگ کہتے ہیں۔ یہ بھی ایک ضمی چیز ہے۔ جس کو ابتدا میں بہت دور لے جا کر بھیکا جاتا تھا۔ اور اب بھی بعض کارخانوں میں ایسا ہی کیا جاتا ہے اور ان کے اطراف سلینگ کے بڑے بڑے پہاڑ کھڑے نظر آتے ہیں۔ لیکن اب اس چیز کو بھی ایک خاصی اہمیت ہو گئی ہے۔ جرمنی اور امریکہ میں اس سے نہایت اعلیٰ درجے کی سمٹ بنائی جاتی ہے۔ بسیمر کے طریقے پر لوہا بنانے میں جو سلینگ نکلتا ہے اس کو پیس کر کھاد کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ کیونکہ اس میں فاسفورس ہوتا ہے۔ فاسفورس لوہے کو خراب کرتا ہے لیکن سلینگ کو کھاد کی حیثیت سے مفید بناتا ہے۔ اس لئے لوہے کی جتنی صفائی کی جائے گی، اس سے جس قدر فاسفورس نکال کر باہر کر لیا جائیگا، اتنا ہی سلینگ بھی کھاد کے لحاظ سے اچھا ہوگا۔ سلینگ میں جتنی مقدار فاسفورس کی ہوتی ہے اسی لحاظ سے اس کی قیمت اٹھتی ہے۔

سلینگ کا کام یہیں پر ختم نہیں ہو جاتا ہے۔ اس سے نہایت اعلیٰ درجے کے حرارت کے غیر موصل غلاف بنائے جاتے ہیں جن کو اسٹیم

استعمال کرتے ہیں۔ ملاحظہ فرمائے۔

ہڈیوں، کھالوں اور انتوں سے جن کو ہم اور آپ بے کار سمجھتے ہیں وہ سریش اور جلیں جیسی کارآمد چیزیں تیار کرتے ہیں۔ دراصل جن بافتوں (Tissues) سے سریش اور جلیں بنتے ہیں وہ جانوروں کی ہڈیوں، آنتوں اور کھالوں ہی میں پائے جاتے ہیں۔ گرم پانی میں ان کو ابالنے سے سریش بنانے والی چیزیں کھل کر الگ ہو جاتی ہیں۔ اور پھر جب اس محلول کو تبخیر کرتے ہیں تو جیل قسم کی ایک چیز حاصل ہوتی ہے جس کو سریش یا جیلین کہتے ہیں۔ سریش دراصل جیلین کی غیر خالص شکل کو کہتے ہیں۔ جو کہ لکڑی کاغذ اور چمڑا وغیرہ چبکانے کے کام آتا ہے۔

جیلین ایک قسم کا پروٹین ہوتا ہے جس کے بدلت خود بے شمار فوائد ہیں۔ سب سے پہلے تو یہ بحیثیت پروٹین ہونے کے غذا کے کام میں آتا ہے۔ بچوں کو ہو گائے کا دودھ پلاتے ہیں اس میں ملا دینے سے معدے میں ایک قسم کی دھمی کے بڑے بڑے ٹکڑے ہیں بنتے جو کہ ولسے دودھ اور معدے کے اندر کے ترشوں کے ملنے سے بن جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ بیماری میں پھیر وں کی ہڈیوں سے نکلا ہوا جیلین آپ خود بھی نوش فرما سکتے ہیں۔ آسکریم کے کارخانوں میں بھی اس کی بے حد ضرورت پڑتی ہے۔ یہ برف کے بڑی بڑی قلبیں بننے سے روکنا ہے۔ دودھ کے شیرے (Emulsion) کو قائم رکھتا ہے اور آسکریم کو جسمیت بخشتا ہے۔ اس کے علاوہ دوا کی

میں ڈالنے سے بہتر، لوگوں کو معلوم ہے۔ اس لئے اب رہ گیا شیرہ جو اب تک ایک غیر اہم ضمنی حاصل تھا۔ اب اس کو کام میں لایا جانے لگا ہے۔ حیدرآباد میں بودھن شکر فیکٹری کے ساتھ اب ایک پاور الکھول کا کارخانہ قائم کیا گیا ہے جس میں اسی شیرے سے لاکھوں کیلی پاور الکھول تیار کیا جا چکا ہے اور برابر تیار ہو رہا ہے اس طرح جو چیز تقریباً بے کار جاتی تھی اب بہت کام کی ہو گئی ہے۔ کئی سے رس نکال لینے کے بعد صرف کھوٹیا (کھوجڑ) بچ جاتا ہے۔ اس کو ہندوستان میں تو عام طور پر جلا ڈالتے ہیں لیکن مغربی ممالک میں اس ضمنی چیز سے بھی پورا فائدہ اٹھایا جاتا ہے اور اس سے موٹا کاغذ اور دہی وغیرہ بنائی جاتی ہے۔

آپ نے ضمنی پیداوار کے متعلق بہت کچھ سن لیا لیکن اس سلسلے کی سب سے دلچسپ مثال غالباً شکار کو کی گوشت بھیجنے والی کمپنیاں ہیں۔ کیونکہ وہاں کی حالت یہ ہے کہ وہاں جو جانور گوشت کے لئے ذبح کئے جاتے ہیں ان کا ایک بال بھی ضائع نہیں ہونے دیا جاتا۔ اب سمٹے کہ کیسے۔

ہم آپ تو ایک جانور کی زیادہ سے زیادہ بھی قدر کر سکتے ہیں کہ گوشت کھا جائیں کھال بیچ دیں اور ہڈیاں اور دیگر لوازمات کتوں کو ڈال دیں چلتے فرصت ہو گئی۔ لیکن شکار کو کی گوشت بھیجنے والی کمپنیوں کے لوگ اس کے قابل نہیں وہ تو جانور کے ایک ایک جز کو

والوں کے حوالہ کیا جائے اس سے روغن پھوڑ لیتے ہیں۔ اس روغن سے صابون اور حسن و جمال کی آرائش کے لئے نوع نوع کے تیل اور عطریات اور دوسرے سامان بنتے ہیں۔
قبل حل گائے کا گوشت لرزہ میں طافت کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ یہ بہانے ہی سے مضمر شدہ اور گشت کی ایک مرکب شکل ہوتی ہے۔

آنتوں سے ساوسج کے، حوکہ ایسے گوشت سے بنائے جاتے ہیں جس کے ویسے بکھنے کی کوئی وجہ نہیں ہوتی، خول بنائے جاتے ہیں۔

الغرض اس کے علاوہ گلیسرین، منہ دھونے کا پوڈر، سینڈ پیپر، برش وغیرہ سب ہی چیزیں تیار ہوتی ہیں۔ حد تو یہ ہے کہ ایک لاکھ بھڑوں کے غدد جمع کر کے آدھ سپر اپرینال (Suprarenalin) تیار کی جاتی ہے۔ جو کہ نازک آپریشنوں کے لئے ایک بہت ہی کارآمد دوا ثابت ہوتی ہے۔ کوکن کے ساتھ اس کا انجکشن دینے سے آنکھ، ناک، اور دوسرے نازک اعضا کا بلا خون نکالے ہوئے آپریشن ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ جراحی کے صدمے کے سبب ہیکٹور و فارم کی وجہ سے حس مریض کے خون کا دباؤ کم ہونے لگتا ہے تو اس کا انجکشن اس دباؤ کو بڑھا کر جان بچا لیتا ہے۔

اس مثال سے اب آپ اچھی طرح اندازہ لگا سکتے ہیں کہ ضمی پیداوار کا استعمال کس حد تک ترقی کر چکا ہے۔

کولیوں پر چڑھانے اور کولیاں رکھنے کی جہل ڈیان (Capsules) بنانے میں بھی کام آتا ہے۔ جیلیٹن کے پوسٹم ڈائکرو ویت کے ساتھ روشنی میں ملنے سے ایک قسم کی جیلی بنتی ہے جو سوکھنے کے بعد کسی چیز میں نہیں کھلتی۔ اس خاصیت کو فوٹو کرافی میں استعمال کیا جاتا ہے۔ چنانچہ فوٹو کرافی کے لئے پلیٹ، فلم، اور کاغذ سب اسی اصول پر بنائے جاتے ہیں۔

یہ تو سریش اور جیلیٹن کا تذکرہ ہوا جو کھالوں، ہڈیوں اور آنتوں کو ابالنے سے حاصل ہوتے ہیں۔ اس کے بعد سینک، کھر اور ہڈیوں کا نمبر آتا ہے۔ جن سے ہٹن، پائپ، بالوں میں لگانے کا بن اور شکاری چاقوں کے ہینڈل وغیرہ بنائے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ بندوق بھی ہڈیوں کے کوئلہ ہی سے سخت کی جاتی ہے۔

خون میں الومن ہوتا ہے۔ اس سے کسی چیز میں تحلیل نہ ہونے والی ایک قسم کی چھاپنے کی روشنائی بنتی ہے۔ اس کے علاوہ چمڑے کی جھک اور شکر کی دل آویز سفیدی بھی اسی کا نتیجہ ہوتی ہے۔

خشک خون، ہڈیاں، زمیں پر کری بڑی بڑے کار بھری، کھر اور سینک بڑے براز ٹائروجن کھاد کا کام دیتے ہیں۔ اور اسی کھاد کو جب ہم ترشی فاسفیٹ کے ساتھ ملاتے ہیں تو اس یوں سمجھئے کہ ناکارہ زمیں بھی سونا لگنے لگتی ہے۔

اون سے کپڑے کل وغیرہ بنتے ہیں لیکن قبل اس کے کہ اون کپڑے کے کارخانے

آپ کو یہ سن کر تعجب ہوگا کہ کوڑے کرکٹ کو جلانے سے اتنی قوت حاصل کی جاسکتی ہے کہ اس سے شہر میں روشنی کی جائے اور گاڑیاں چلائی جائیں۔ بہت سے جدید شہروں میں کوڑے کرکٹ کو اہم ضمنی پیداوار سمجھا جاتا ہے۔ اور حالانکہ ایندھن کے نقطہ نگاہ سے کوڑے کرکٹ اور کوئلے میں کوئی مناسبت نہیں، ایک من کوئلہ جلانے سے جو بات حاصل ہوتی ہے اسی کے لئے پانچ سے پندرہ من کوڑا جلاتا بڑا ہے اور پھر یہ کہ یہ آسانی سے جل بھی نہیں سکتا، اس کے لئے خاص قسم کے چولہے بنائے جاتے ہیں، لیکن ان ساری دقتوں کے باوجود کوڑے کو جلایا جاتا ہے اور اسی کندی، بدبودار، جراثیم سے بھری ہوئی ناپاک چیز سے اتنی بجلی پیدا کی جاتی ہے کہ اس سے پورا شہر روشن کیا جاتا ہے اور جو بجلی بیچ رہی ہے اس سے گاڑیاں چلائی جاتی ہیں۔

اور کچھ کارخانوں پر ہی موقوف نہیں ہے خود آپ کا کپڑا، آپ کا شہر اس کے بازار اس کی سڑکیں اور گلیاں اسی جگہیں ہیں جہاں ہر وقت ضمنی پیداوار ہوتی رہتی ہے۔ کوڑا کرکٹ آپ نے ادھر ادھر پھینکا ہوا اور مختلف جگہوں میں جمع کیا ہوا دیکھا ہوگا۔ اور اسے محکمہ صفائی والوں کو گاڑیوں میں لاد لاد کر لے جاتے ہوئے اور شہر سے دور میدانوں میں ڈالتے ہوئے بھی دیکھا ہوگا۔ یہ چیزیں آپ کی روزانہ زندگی کے کارخانے کی ضمنی پیداوار ہیں جب تک آپ ہیں کوڑا کرکٹ بھی رہے گا اور روزانہ پیدا ہوتا رہے گا۔ اب یا تو آپ روپے خرچ کیجئے گاڑیوں میں لادے اور اسے شہر سے باہر پھینک دیجئے اور اس کے پہاڑ کے پہاڑ کھڑے کر دیجئے اور اچھی خاصی زمیں کے ایک بڑے رقبے کو برباد کر دیجئے یا پھر عقل سے کام لیجئے اور اس بے کار چیز کو باکار بنائے۔



دوست - (حیوانیات کے طالب علم سے) بتاؤ کونسی مچھلی کی آنکھیں قریب قریب ہوتی ہیں۔
طالب علم - مجھے تو کوئی ایسی خاص مچھلی نہیں معلوم۔
دوست - چھوٹی مچھلی کی۔

جسمانی اعمال پر کیمیائی تصرف

(ترجمہ از - محمد زکریا صاحب مائل)

کے طرز اور نمونے نظر انداز کر کے ان میں بے مقصد طور پر ادھر ادھر پھرنے پر قانع رہے گا۔ دوسری طرف، اگر شہر کی تاریخ ایسے موہنے اور لبھانے میں کامیاب ہوئی تو وہ بہت جلد لندن کے خاکے کا ایک ایسا صحیح اور صاف نقش قائم کر لے گا جسے ایک عالی و معمولی سیاح ہرگز پسند نہ کرے گا۔ فعلیات کا ماهر نقشہ کش یا جادو قبول کرنے والے سیاح سے مشابہ ہے۔ وہ عضویہ کی پیچیدہ فعلیتوں سے دلچسپی رکھتا ہے اور اسکے باوجود اسکی قابل مشاہدہ ساخت سے کوئی بڑا گہرا یا قریبی تعلق نہیں رکھتا۔ ماهر شکلیات (Morphologist) یا ہر تشریح کی مثال اس سیاح کی سی ہے جو (Baedeker) ہاتھ میں لئے ہوئے لگاتار اس تلاش میں رہتا ہو کہ اصولی طور پر اپنے آس پاس کی مشغول زندگی سے محفوظ تاریخی دلچسپی کے مناظر ڈھونڈ نکالے۔

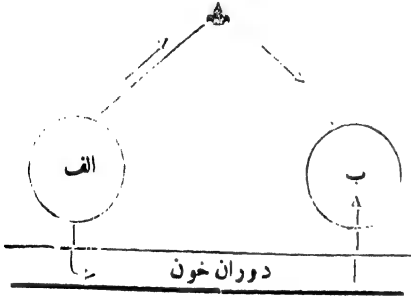
نغمز مائے کے مخصوص اعمال یا اسکی قومی و اہم صفات بھی ایسی ہی ہیں خواہ عضویہ کیسا ہی پیچیدہ یا سادہ ہو۔ سادہ ترین فرو محض خلیہ یعنی نغمز مائے کا ایک دقیق جو ایک تو وہ چھوٹے سے

مادہ حیات یا نغمز مایہ کو کسی نادر یا انوکھے کیمیائی عنصر پر مشتمل نہیں ہوتا تاہم وہ اسامی طور پر غیر ذی حیات مادے سے مختلف ہوتا ہے۔ یہ مادہ ہمیشہ مرتب و منظم ہوتا ہے۔ زندہ مادے کی وحدت سالہ نہیں بلکہ عضویہ ہے۔ مزید برآں عضویہ ہمیشہ پہلے سے موجود رہنے والے عضویوں سے وجود میں آتے ہیں۔ اسی وجہ سے نغمز مائے کی مرئی ساخت کا مطالعہ تاریخی مطالعے کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس صورت میں حیاتیات کا علم جو زندہ مادوں یا جسموں کے علم کا دوسرا نام ہے دو گونہ فرائض رکھتا ہے۔ (۱) نغمز مائے کے وظائف و فعلیات کا بیان کرنا اور (۲) عضویہ کی مختلف ساختوں کا انکی تاریخ یا ارتقا کی روشنی میں مطالعہ کرنا۔

اس مفہوم کو ایک تشبیہ سے زیادہ واضح کیا جاسکتا ہے۔ فرض کیجئے کہ ایک شخص اپنے آپ کو لندن میں پاتا ہے۔ اگر وہ نا تجربہ کار اور نا واقف قسم کا عالی شخص ہے تو وہاں کی چھوٹی اور پیچ در پیچ سڑکوں میں بری طرح کہو جائے گا۔ لیکن اگر اسے اپنے گرد و پیش کی زندگی سے پہلے سے دلچسپی ہے تو وہ سڑکوں

افعال ہیں۔ دوسرا کام یہ ہے کہ توازن عضوئے کے اندر اس غرض سے قائم رہے کہ وہ ماحول پر ایک اکائی کے طور پر اثر انداز ہوگا۔ اسی چیز کو دائرہ کے اندر کے متخالف تیروں سے ظاہر کیا گیا ہے۔ اعضا کو اپنے فرائض موزون و متوافق طور پر انجام دینا چاہئیں ان کے ایسا کرنے کا۔ مفہوم یہ ہوگا کہ ایک کی فعلیت دوسرے کی فعلیت پر اثر ڈالنے کے قابل ہے۔

اعصابی مرکز

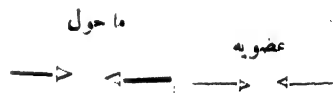


شکل نمبر (۲)

یہ کام دو صورتوں سے انجام پاتا ہے جو شکل نمبر (۲) میں ظاہر کی گئی ہیں۔ (الف) کی فعلیت اعصابی نظام کی وساطت سے (ب) کو متاثر کرتی ہے جو نراش پذیری اور ابصالی میں خصوصی مہارت رکھتا ہے۔ (الف) ایک عصبی حرکت (ایک کیمیائی تغیر) ترتیب دیتا ہے جو دماغ باحرام مغزین جہاں ایک دوسرا عصبی خیلہ واقع ہے عصبی دشتے پر عصبی مرکز تک فی ممکنڈ سوئف کی رفتار سے جاری رہتی ہے۔ اس خلیے میں ایک دوسری عصبی حرکت شروع ہو جاتی ہے جو خلیے سے متعلق عصبی دشتے پر روان و دوان

کردی جسم یا نواہ پر مشتمل ہے۔ ماہر کے لئے سب سے زیادہ دلچسپ چیز عضوے ہیں خواہ ہمارے اجسام کی طرح کتنے ہی پیچیدہ کیوں نہ ہوں کیونکہ ان اجسام کے اندر رحمت و مشقت یا انکے متعلقہ کام منقسم ہیں اور خلیوں کے گروہ خاص خاص اور اہم فرائض ادا کرنے میں خصوصی مہارت رکھتے ہیں مثلاً نراش پذیری ابصالی، حرکت یا تولید۔ خلیوں کے اسی قسم کے خصوصی مہارت یافتہ گروہ سے اعضاء عضلات، دماغ اور بھیہڑے وغیرہ وجود میں آئے ہیں۔

اب یہ معلوم ہونا چاہئے کہ عضویہ کی حسامت یا پیچیدہ کی خواہ کتنی اور کیسی ہی کیوں نہ ہو وہ دو کام ضرور کرتا ہے جنہیں شکل نمبر (۱) میں ظاہر کیا گیا ہے۔



شکل نمبر (۱)

ایک تو وہ اپنے ماحول کے ساتھ اپنا توازن برقرار رکھتا ہے جیسا کہ تیر کے نشانات سے عیاں ہے جن کے سرے دائرہ کی بیرونی سمت میں ایک دوسرے کی طرف نمایاں ہیں۔ اس کے مثالیں کھانے اور پانی کی تلاش، ہر طرف حرارت یا برورد کے ضرر سے بچنے کی کوشش وغیرہ۔

کا سبب بننے والے مادے کی ساخت عضوے میں تبدیلیاں رونما کرتی ہے جو اس مادے کی تباہی کا وسیلہ بنتی ہیں۔

زندہ خلیوں کے خصوصی کروہوں کے درمیان بعض کروہ ایسے بھی ہیں جو "افرازات"، نامی مادوں کو اتمام تک پہنچاتے ہیں۔ ان خلیوں کا ایک کروہ ایک غدہ ہے۔ اس غدے میں قنات یا نلکی موجود ہوتی ہے جس میں سے یہ افرازات گزر کر جسم کی سطح تک پہنچتے ہیں جیسا پسینے کی صورت میں واقع ہوتا ہے جو جلد کو نم کرتا ہے یا لعاب یا تھوک پیدا کرتا ہے جس سے منہ تر رہتا ہے۔ علم افعال اعضا یا فعلیات میں جو ترقیاں ہوتی ہیں ان میں نہایت دلچسپ چیز غدے کی ایک خاص شکل کی شناخت ہے جس میں کوئی قنات نہیں اور اس کے باوجود وہ اپنے افرازات کا ترشح براہ راست خون پر کرتا رہتا ہے۔ یہ غدہ اندرونی افراز کا یا درون افرازی عضو ہے۔ یہ خون کے اندر ایک ایسا مادہ پہنچاتا ہے جو غذا کی طرح توانائی کا منبع تو نہیں ہوتا مگر دوران خون میں داخل ہونے کا مخصوص فرض ادا کرتا ہے اور دوسرے اعضا تک پہنچ کر ان کی فعلیت کو درست و باقاعدہ بناتا ہے۔

غید قناتی غدود کی رطوبت

درون افرازی عضو سے جو رطوبت پیدا ہوتی ہے وہ ہارمون (اکسانے والا گاشتہ) کہلاتی ہے۔ ہارمون دوسری عضوی پیداواروں کے مقابلے میں کم سالماتی وزن

رہ کر (ب) کے اندر ایسی کیمیائی تبدیلیاں پیدا کرنے لگتی ہے جو اسکی فعلیت کو کھٹاتی یا بڑھاتی رہتی ہیں۔ اس نوع کی مطابقتیں جو اعصاب اور مراکز اعصاب پر مشتمل ہیں انعکاسی اعمال کہلاتی ہیں اور سرعت اور نہایت مختصر دوران ان کی نمایان خصوصیت ہے۔

اس موقع پر ہمیں (الف) کی (ب) پر مطابقت کے زیادہ سست اور زیادہ ابتدائی طرز پر غور کرنا ہے جو دوران خون میں واقع ہوتی ہے (الف) کی فعلیت کے نتیجے کے طور پر یکجہ مادہ اس قسم کا پیدا ہوتا ہے جو خون میں داخل ہوتا ہے اور دوران خون کے ذریعہ سے (ب) تک پہنچتا ہے۔ یہاں (ب) اسے جذب کرتی ہے اور نتیجتاً (ب) کی فعلیت میں کمی یا بیشی رونما ہوتی ہے مثال کے طور پر یوں سمجھئے کہ جب ورزش کی جاتی ہے تو عضلہ میں ایک ترشہ پیدا ہوتا ہے جسے لینی ترشہ یا لیکٹک ایسڈ کہتے ہیں اور خون کے دوران میں شامل ہو جاتا ہے۔ یہ ترشہ جو تھب و تکان کا موجب ہے دوسرے عضلات میں پہنچتا ہے جو اسے جذب کرنے ہیں اور ان سے عمل کٹے بغیر خستگی اور تھکن کی علامات ظاہر ہونے لگتی ہیں۔ پھر یہی ترشہ خون سے حصہ دماغ تک جاتا ہے جو نفس میں باقاعدگی پیدا کرتا ہے۔ یہاں مرکز نفس کے خلیے اسے جذب کرتے ہیں اور نفس کی سرعت اور گہرائی میں اضافہ ہو جاتا ہے تاکہ خون کو آکسیجن زیادہ مہیا ہو سکے اور آکسیجن کی ضرورت مادہ تکان دہنی لیکٹک ایسڈ کو تباہ کرنے کے لئے پیش آتی ہے۔ اس طرح تکان

انسولین کے انجکشن بار بار دئے جائیں تو قابو میں آسکتی ہے۔ جیسے ہی انسولین صناعی طور سے جسم میں پہنچتی ہے، باقیے ایک بار پھر شکر کو منبع توانائی ہونے کی حیثیت سے استعمال کرنے کے قابل ہو جاتے ہیں اور پہلے کی طرح اس غذا کی کثیر مقدار مہیا کر سکتے ہیں۔ مریض کا وزن بڑھنے لگتا ہے اور جب تک یہ علاج جاری رہتا ہے اس میں طاقت پیدا ہوتی رہتی ہے۔ اگر انسولین کا انجکشن ترک کر دیا جائے تو مرض بھر عود کر آتا ہے۔

یہاں یہ معلوم کرنا دلچسپی کا باعث ہو گا کہ مچھلی یا لگائے کے لبلبے سے تیار کی ہوئی انسولین انسانی ذیابیطس پر بھی قابو پاسکتی ہے۔ انسولین خواہ کسی ماخذ سے بنی ہو ایک ہی ہے۔ مچھلی کے خون میں جو انسولین ہے وہ بھی ایسا ہی کیمیائی مرکب ہے جیسا انسانی خون کی انسولین میں ہوتا ہے۔

ہارمونوں کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ وہ جسم کے اندر تیزی سے تباہ ہو جاتے ہیں۔ جیسے ہی وہ خون کے اندر پیدا ہو کر مختلف اعضا کی فعلیت میں تغیر و تبدل پیدا کر چکے ہیں ویسے ہی ان کی ضرورت ختم ہو جاتی ہے اور تباہی کا پیام آپہنچتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ اگر ہارمون منہ کے ذریعے جسم میں پہنچائے جائیں تو ایک استثنائی صورت کے سوا ان کا کوئی اثر نہیں ہوتا کیونکہ ہضم کرنے والے دس انہیں تیزی سے ضائع کر دیتے ہیں۔

والے سادہ کیمیائی مرکبات ہیں۔ اسی وجہ سے وہ خون کی رگوں (عروق دہویہ) کی دیواروں میں آسانی سے نفوذ کر سکتے ہیں اور زندہ خلیوں میں پہنچ کر ان کی فعلیت کو متاثر کر دیتے ہیں۔ اس سے بھی زیادہ خاص بات یہ ہے کہ جو ہارمون ایک حیوان کے درون افزائی کے عضو سے تیار ہوتا ہے اگر اسے دوسری جنس کے حیوان کے بدن میں پھکاری سے داخل کیا جائے تو اس پر بھی وہی عمل کرتا ہے جو پہلے حیوان پر کرتا تھا۔ انسولین جو ابلے کے اندرونی خلیوں کے چند کروہوں سے بنی ہے اس لئے درکار ہوتی ہے کہ جسم کے ہاتھوں کو شکر سے کام لینے کے قابل بنادے۔ یہی وہ خوراک ہے جو عضلاتی حرکت یا سمٹاؤ کے لئے توانائی کا سرچشمہ ہے۔ اگر ہارمون فی انسولین مفقود ہے تو اس کے نتیجے میں مرض ذیابیطس اٹھ کھڑا ہوتا ہے۔ اس مرض میں باقیے شکر کی نکسید (آکسیجن ملانا) نہیں کر سکتے اور دوسرے غذائی مادے، جبری، اور پروٹین (لحمیہ) اس کے نتیجے میں نامکمل طور پر استعمال میں آنے ہیں کیونکہ وہ شکر کی بہ نسبت کم سمولت سے جلتے ہیں۔ شکر جسے جسم جلانے سے قاصر رہتا ہے خون میں بافراط ظاہر ہوتی ہے اور اسے گردے نکال پھینکتے ہیں جب شکر کے ذخائر جگر اور عضلات میں ختم ہو جاتے ہیں تو باقیے خود ٹوٹ پھوٹ کر شکر بنانے لگتے ہیں جو پیشاب میں بھی نمودار ہونے لگتی ہے اور بالآخر مریض ضائع ہو جاتا ہے۔ لیکن یہ بیماری لا علاج نہیں ہے۔ اگر مریض کو

نشو و نما پید غدد در قیہ کا اثر

اگر کافی آہوڈین ہم نہ پہنچے تو درق غدے آہوڈین کی نا مناسب سربراہی سے تھاراکسین کی مقررہ مقدار حاصل کرنے کی سعی میں پھیل جاتے ہیں۔ انہی دو یا تین کی بنا پر جہاں کہیں کھیکھے کی پیاری پھیل ہو وہاں کے طلباء مدارس کو آہوڈین استعمال کرایا جاتا ہے۔

دنیا کے ان حصوں میں جو کھیکھے کے لگے مشہور ہیں خصوصیت سے ان یونوں کا نفرت انگیز نمونہ اکثر دیکھا جاتا ہے جو فی (شاہ دولہا کے چوہے) کہلاتے ہیں۔ یہ فی (Cretin) احمق ہوتے ہیں اور داغ کی طرح ان کے اجسام بھی غیر مکمل و غیر مرتب ہوتے ہیں۔ ان کے قد و خال بھدے اور کھانے ہوئے حرکت کمزور اور بے مصرف و ناموزوں ہوتی ہیں۔ اس قسم کے افراد تیس سے اوپر شاذ و نادر ہی عمر پاتے ہیں۔ ان کی موت کے وقت معائنہ سے معلوم ہوا کہ غدہ در قیہ سرے سے غائب ہے۔ یہ غدہ یا تو ان میں مکمل ہونے میں پایا یا انحطاط پذیر ہو گیا۔ اگر درق غدے کی کمی کی تشخیص چھپن ہی میں ہو جائے تو بچے کے خشک غدے کی کچھ مقدار باقاعدگی سے استعمال کرائے درق ہارمون پیدا کئے جاسکتے ہیں اور غدہ در قیہ اس عمل سے اپنی مقررہ نشو و نما کو پہنچ سکتا ہے۔ جیسا کہ اوپر بیان کیا چکا ہے درق ہارمون ہی ایک ایسا ہارمون علم میں آیا ہے جو ہضم کرنے والے رسوں کے عمل سے ضائع نہیں ہوتا۔ تھاراکسین کی

جو چیز صحیح طور سے انسانی ساخت کو متین کرتی ہے اس کا صحیح علم ہمیشہ سے حیرت و استعجاب کا موضوع رہا ہے۔ لوگ جس طرح ایک لمبے ٹرنکے دیو پیکر شخص کو تعجب سے دیکھتے ہیں اسی طرح پستہ قد اور بونے آدمی پر بھی ان کی نگاہیں بے اختیار اٹھ جاتی ہیں۔ گذشتہ چند برسوں کے اندر اس مسئلے سے متعلق صحیح معلومات فراہم ہوئی ہیں جن میں هنوز اضافہ جاری ہے۔ دراصل اب درق افرازی ریش کے دو عضوی یعنی غدہ در قیہ و غدہ نخامیہ کے ہارمونوں کی تبدیل و ترتیب کی بدولت انسان تجربی طور پر بونے یا طویل القامت ہو سکتے ہیں۔ غدہ در قیہ دو لختوں پر مشتمل ہے جو ہوا کی نالی کے دونوں سروں پر واقع ہیں۔ غدوی بافتوں کے یہ تودے جب بڑے ہو جاتے ہیں تو گردن کے پھول جانے کا باعث بنتے ہیں اور اس حالت کو کھیکھا کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ بعض علاقوں میں سے ایک امریکہ میں گرٹ لیکس (Great Lakes) کے کنارے واقع ہے یہ بیماری بہت عام ہے۔ باور کیا جاتا ہے کہ یہ کیفیت پانی میں آہوڈین کی کمی سے پیدا ہو جاتی ہے۔ غدہ در قیہ کی اندرونی رطوبت یعنی تھائیراکسین (Thyroxin) کا تجزیہ حال ہی میں صحیح طور سے کیا جا چکا ہے اور اب وہ تالیفی طور سے بھی تیار کی جا سکتی ہے۔ دریافت ہوا ہے کہ اس کی ترکیب میں آہوڈین ایک اساسی عنصر ہے۔ اسی لئے

یا بکریوں کی مدت حیات معمولاً صرف دو سال ہوتی ہے۔

بالیدگی پر غدہ درقیہ کی اس مصرط تاثر کا سبب نہایت سادہ اور غیر مبہم ہے۔ یہ غدہ زندہ جسم میں کیمیائی تغیرات کو ترقی دیتا ہے۔ جب درقی غدہ دوران خون میں تھراکسین داخل نہیں کرتا تو بافتوں کے اندر کیمیائی تغیرات کی شرح کم ہوجاتی ہے اور جوان جانور میں بالیدگی اور نمو دونوں رک جاتی ہیں۔ ناقص درقی رطوبت کی خاص علامت دیکھنا ہو تو اذنی ایچ مائی (Metabolism) کی شکل میں دیکھی جاسکتی ہے۔

غده 'نخامیہ اور اس کے هارمون

اندرونی رطوبت کا ایک اور غدود جو نشو و نما پر اثر انداز ہوتا ہے غده نخامیہ ہے۔ یہ غده اس بانٹے کا ایک چھوٹا تودہ ہے (انسان میں ہیزل نٹ (Hazel Nut) کے برابر پایا جاتا ہے) جو دماغ کی اندرونی جانب ایک چھوٹی ڈٹھل جیمی ساخت سے لٹکا ہوتا ہے۔ بصری اعصاب کے دماغ میں داخل ہوتے وقت جو چلیبا بتا ہے ٹھیک اس کے نیچے اس کا محل وقوع ہے۔ دراصل یہ ایک میں دو غده ہیں۔ اس جگہ ایک آگے کو نکلا ہوا لختہ ہے جو بالیدگی پر اثر کرنے والی رطوبت خارج کرتا ہے اور ایک پیچھے کی طرف ابھرا ہوا لختہ ہے جس کی اندرونی رطوبت متعدد اثرات پیدا کرتی ہے۔ مثلاً پیشاب کی ساخت میں تحریک، دودھ میں روانی اور رحم کا انقباض یا تنگی۔ آخر الذکر تاثر

جو مقدار مقررہ نشو و نما و قیام کے لئے ضروری ہے اتنی کم ہوتی ہے کہ کمی وقت بھی تلاش کی جائے جسم بھر میں صرف چند ملگرام (ایک کرام کا ہزارواں حصہ) مل سکتی ہے۔

فعلیات دان اپنے تجربات پورے کرنے کے لئے بیماری کے انتظار میں بیٹھنے کا عادی نہیں ہوتا۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ درقی هارمون کے افعال کی نسبت همارا علم جانوروں پر تجربات کی بدولت ترقی کر گیا ہے۔ مثال کے لئے نمو اور بالیدگی پر تھراکسین کے اثر سے متعلق هماری نہایت صحیح معلوات جو ان جانوروں کے درقی غده دور کرنے اور اسی عمر کے معمولی جانوروں سے ان کی نشو و نما کا مقابلہ و موازنہ کرنے حاصل ہوئی ہیں۔ مثال کے لئے تین بکروں کا ذکر مناسب ہے جن پر تجربات کئے جاسکے ہیں ان میں سے ایک معمولی قد کا تھا۔ اور باقی دونوں افسردہ (بازو مارے ہوئے) مجربی قی (شاہ دولہا کے چوہے) (Cretin) تھے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ جب یہ جانور نو ہر تھے اسوقت ایک مقامی مخدر دوا استعمال کر کے ایک غیر تکلیف دہ عملیے سے ان کا غده درقیہ نکال دیا گیا تھا۔ اس مثال سے واضح ہے کہ یست قد بکرے کو درقی رطوبت سے محروم کر کے ہونا نا دیا گیا اس عمل سے ہوئے بکروں کا خلیہ بھی نہایت مکروہ اور بھدا ہو گیا۔ ان بکروں کی نہ صرف ترقی ہی رک کئی بلکہ تکیل بھی۔ یہ اپنی ناقص جسامت کے علاوہ ہر اعتبار سے بچے نظر آنے لگے۔ اس نوع کی بھڑوں

بڑھا دیتی ہے۔ لختہ مقدم کی اندرونی رطوبت جس کیمیائی ترکیب سے بنی ہے اس کا حال بجز اس کے کچھ نہ معلوم ہو سکا کہ اس رطوبت کو تھراکین سے بالکل مختلف ہونا چاہئے۔

یہ معلوم کرنا موجب دلچسپی ہوگا کہ درون افزائی ریش کے یہ دو عضو جو نو پر متصرف ہیں باہم متعلق معلوم ہوتے ہیں۔ اگر غدہ درقبہ عاجدہ کر دیا جائے تو نغامی غدہ بڑھ جاتا ہے۔ انسانیات کے عالموں نے مختلف انسانی اقوام کی جسمانی خصوصیات مثلاً ساخت، خدو خال کی وضع و شکل، سر وغیرہ کا تعلق ان اندرونی رطوبت کے غدوں کی فعالیت سے بیان کرنے کی کوشش کی ہے جو ایسے حیرتناک طریقے سے نو اور بالیدگی پر اثر انداز ہیں۔

اب تک اس سلسلے میں جو کچھ کہا جا چکا ہے اس سے ظاہر ہے کہ نغز مائے کی فعالیتوں سے متعلق کسی قسم کی تحقیقات میں مجموعی حیثیت سے عضوئے کوہرگز نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اگر ہم کسی خاص عضو کو اپنا کام انجام دیتے ہوئے دیکھتے کی کوشش کریں تو بات یہیں تک حتم نہیں ہوتی بلکہ خود بخود بڑھ جاتی ہے اور ہم مجموعی طور پر عضوئے کے اندر عضو کے باہمی تعلقات کا مطالعہ کر کے اس کا اختتام کرتے ہیں۔ ہر خاص تحقیقات عضوئے کے اندر توازن کی ماہیت اور عضوئے اور اس کے ماحول کے درمیان ہزاری بصیرت کو عمیق و وسیع بنادیتی ہے۔

کی وجہ سے لختہ موحر کا ہارمون، یعنی نغامی مادہ (پیتوٹین Pituitrin) پچسے کی پیدائش میں سہولت پیدا کرنے کے لئے جسم میں پھکاری سے داخل کیا جاتا ہے۔

نغامی عضو کے لختہ موحر کا دور کر دینا مہلک نہیں ہوتا لیکن اگر غدے کا لختہ مقدم (آکے کو نکلا ہوا گوشہ) اکھاڑ بیٹھتا جائے تو نتیجہ ہمیشہ موت ہوتا ہے۔ اب یہ دریافت ہو چکا ہے کہ اگر جوان حیوان سے اس لختہ کا بیشتر حصہ علیحدہ کر لیا جائے تو بالیدگی رک جاتی ہے اور جانور بونا بن کر رہ جاتا ہے۔ دوسری طرف اگر نغامی عضو کے لختہ مقدم کے باقیے کا خلاصہ باقاعدہ وقفوں سے معمولی نشو و نما والے جانور میں انجکشن سے داخل کیا جائے تو وہ قد و قامت میں بڑھتے بڑھتے دیو بن جائے گا۔ اس کے تجربے کے لئے ایک ہی جھول کے دو چوہے چار سو دن کی عمر کے لئے گئے۔ ان میں سے ایک کو اصل حالت پر رکھا دوسرے چوہے کو نغامی عضو کے لختہ مقدم کا خلاصہ پھکاری سے دبائیا۔ نتیجہ اس کا قد غیر معمولی طور پر بڑھ گیا جس کا باعث جربی کا اجتماع نہیں بلکہ ڈھانچے یا قالب کے غیر معمولی بڑھاؤ کا ثمرہ تھا۔

اب یہ معلوم ہو چکا ہے کہ بہت سے انسانی دیو بڑھا ہوا نغامی عضو رکھتے ہیں اور اسی لئے اس عضو کے لختہ مقدم کے نمونہ ہارمونوں کی غیر معمولی مقدار ان کے قد و قامت کو

دیاسلائی کی صنعت

(غلام جیلانی صاحب)

دار کر لوہے کو پتھر پر مار کر، لکڑی کو لکڑی سے رکڑ کر آگ نکالا کرتے تھے۔ یہ آگ کافی محنت اور دقت سے نکلتی تھی اور جب ایک دفعہ آگ نکل جاتی اور کوئی چیز سلگ جاتی تو پتھر اس کو ہمیشہ روشن رکھنے کی کوشش کی جاتی تھی۔ آج بھی دیہات میں یہ نظارہ دیکھنے میں آتا ہے کہ ایک جگہ آگ سلگتی رہتی ہے اور جس کسی کو آگ جلانے کی ضرورت ہوتی ہے اسی آگ سے جلی ہوئی لکڑی یا کوئلہ لے جا کر کام چلاتا ہے۔

سب سے پہلے جو دیا-سلائی بنائی گئی وہ اس طرح کہ سلائیوں کو گرم موم میں ڈبا کر ان کے سرے پر پوٹاسیم کلورائیڈ اور شکر کا امیزہ لگا دیا جاتا تھا اور خشک ہونے پر ان پر گندک کا تیزاب لپکایا جاتا تھا جس کے سبب سلائی فوراً مشعل ہو جاتی تھی۔ لیکن ظاہر ہے کہ یہ طریقہ اطمینان بخش نہیں تھا۔ اور نہ اس میں سہولت تھی کیونکہ ہر شخص ان دیا-سلائیوں کو اپنے ساتھ رکھ نہیں سکتا تھا۔ جو لوگ رکھتے تھے ان کو سلائیوں کے ساتھ ساتھ گندک کے تیزاب کی شبیہ بھی ساتھ رکھنی پڑتی تھی۔

اس جنگ کے سبب جہاں اور بہت سی آفتیں ہندوستان پر آئی ہیں ان میں ایک یہ بھی ہے۔ کہ ہم بہت سی ضروری اشیاء سے محروم ہو گئے ہیں۔ اور جیسے جیسے وقت گزرتا ہے ہمیں یہ چیز نہایت وضاحت کے ساتھ معلوم ہوتی جاتی ہے کس طرح معمولی سے معمولی چیزوں کے لئے بھی غروں کے محتاج ہیں۔

دیا-سلائی ایک معمولی سی چیز ہے جس کی ضرورت ہر شہر، ہر گاؤں اور ہر گھر میں دن رات پڑتی ہے۔ لیکن یہ ضروری چیز بھی دن بدن کم ہوتی جا رہی ہے اور جو ملتی ہے وہ زیادہ قیمت پر۔ دیا-سلائی کو ہندوستان میں سسے ایکی ہے لیکن وہ اجڑا ہین پوٹاسیم کلورائیڈ اور سرخ فاسفورس وغیرہ جن پر دیا-سلائی کی تیاری کا دار مدار ہے باہر سے آیا کرتے تھے۔ ان کا اتنا آجکل بند ہو گیا ہے اور یہی سبب دیا-سلائی کی گرانی اور کمیابی کا ہے۔ ابھی تک ہندوستان میں ان کی تیاری کا کوئی انتظام نہیں کیا گیا ہے۔ اگر ہو گیا ہوتا تو پتھر ہر دقت پیش نہ آتی۔

دیا-سلائی کی بجاد سے پہلے لوگ آگ نکالنے میں کافی محنت سے کام لیتے تھے۔ پتھر کو پتھر پر

زرد فاسفورس، پٹاشیم بائیکرومیٹ، سفوف کالج اور زنگ اکسائیڈ کا مرکب لگا کر خشک کر لیا جاتا ہے اور ڈیہ کی سطح پر مریش لگا کر اس پر ریت چپکادی جاتی ہے تاکہ اس پر سلائیوں کو رگڑ کر خلا یا جاسکے۔

ان سلائیوں کو ڈیہ کی سطح کے علاوہ اگر کسی پتھر یا چوبی تختے یا کارڈ بورڈ پر محقی سے رگڑاجائے تو جل جاتی ہیں ان کے غیر محفوظ کمپلائیکا سبب یہ ہے کہ زرد فاسفورس کا دھواں انسانی صحت کیلئے بے حد مضر ہوتا ہے۔ جس زمانہ میں غیر محفوظ دیاسلائی عام طور پر کارخانوں میں بکثرت تیار کی جاتی تھی اسوقت کے اعداد و شمار سے پتہ چلا ہے کہ سیکڑوں، زرد جو دیاسلائی سازی کے کارخانوں میں کام کرتے تھے زرد فاسفورس کے دھوئیں سے امراض میں مبتلا ہو کر فوت ہو گئے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ برن میں ۱۹۰۶ء میں ایک بین القوامی کانفرنس میں یہ طے کیا گیا کہ زرد فاسفورس کو دیاسلائیوں میں بالکل استعمال نہ کیا جائے۔ اس کے علاوہ ماہرین دیاسلائی سے اس عظیم نقص کو دور کرنے کے لئے اور بھی تحقیقات کی اور آخر کار ایسی دیاسلائی بنانے میں کامیابی حاصل کر لی جس میں مندرجہ بالا نقص بالکل موجود نہیں ہے۔ کسی کھر دوری سطح پر رگڑنے سے حل اٹھنے والی دیاسلائی اب بھی بنتی ہیں لیکن ان میں زرد فاسفورس کی بجائے فاسفورس کاسٹکس سلفائیڈ استعمال کیا جاتا ہے۔ جس سے کوئی نقصان نہیں ہوتا۔ اس کے علاوہ ایک اور دیاسلائی ایجاد کی جو زمانہ موجودہ میں تقریباً ہر جگہ زیر استعمال ہے اور اس کو محفوظ دیاسلائی کہتے ہیں۔

چنانچہ سائنس دانوں نے دیاسلائی کو آسان بنانے کی کوشش جاری رکھی۔ اور یہ کوشش دراصل فاسفورس کے دریافت کے بعد ہی کامیاب ہو سکی۔

فاسفورس جیسا کہ آپ سمجھ جاتے ہیں دو قسم کا ہوتا ہے ایک سرخ ایک زرد۔ زرد کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ فوراً آگے پکڑ لیتا ہے۔ چنانچہ اس خصوصیت کو کام میں لا کر پہلے پہل دیاسلائی بنائی گئی۔

یوں تو ایک قسم کی دیاسلائی ایسی بنائی جا چکی تھی جو ایک حد تک کامیاب تھی لیکن اس کو جلانے میں بڑی دقت ہوتی تھی۔ اس کو رگڑ کی دیاسلائی یا موسمی فرکھا جاتا تھا۔ اس دیاسلائی کے سرے پر، شکر، پوٹاشیم کلورائیڈ اور بیول کے گوند کا امیزہ لگا دیا جاتا تھا۔ اس کو جلانے کا طریقہ یہ تھا کہ ان سلائیوں کو سینڈ پیپر کے درمیان ڈبا کر زور سے کھینچتے تھے۔ جن سے ان کو آگے لگن جاتی تھی۔ لیکن یہ طریقہ تکلیف دہ تھا اور ان میں مشکل سے آگے لگتی تھی۔ ضرورت اس بات کی تھی کہ ان سلائیوں میں ایسا مسالہ لگایا جائے جو فوراً آگے پکڑ لے۔ اس کی کو زرد فاسفورس نے پورا کیا۔ زرد فاسفورس سے جو دیاسلائی بنائی گئی اس کو غیر محفوظ دیاسلائی کہتے ہیں۔

غیر محفوظ دیاسلائی گندک کی دیا سلائی غیر محفوظ دیاسلائی کو کارخانوں کی اصطلاح میں کہا جاتا ہے۔ اس کی تیاری کا طریقہ یہ ہے کہ پہلے سلائیوں کے پانچ حصہ کو پگھلی ہوئی گندک میں ڈبا کر۔ ان کے سرون پر مریش، پٹاشیم کلورائیڈ

ہندوستان میں دیاسلائی سازی

کی ابتدا

انیسویں صدی کے اوائل میں ہندوستان میں اس صنعت کی ابتدا ہوئی ابتدا میں دیاسلائی کیلئے اکڑی جاپان یا سویڈن وغیرہ سے منگائی جاتی تھی لیکن بعد میں تحقیقات سے معلوم ہوا کہ ہندوستان میں اس اکڑی کی کمی نہیں ہے بلکہ کثیر مقدار میں موجود ہے۔ علاقہ جنوبی ملیار میں ملیار آسیاب (درخت) کثیر مقدار میں ہیں اسکی اکڑی دیا سلائی سازی کیلئے بہترین ثابت ہوئی ہے اس اکڑی کا رنگ سفید ہوتا ہے اور یہ ہلکی اور مضبوط ہوتی ہے دیاسلائی کیلئے اکڑی میں بھی صفات ہونا ضروری ہیں۔

ملیار آسیاب کے علاوہ دوسرے درجہ پر سیمل درخت کی اکڑی بھی دیاسلائی کیلئے کارآمد ثابت ہوئی ہے نیم کے درخت سے بھی سلائی بن سکتی ہیں لیکن یہ سلائی زیادہ مضبوط نہیں ہونگی۔ درخت چیر (دودھا) کی اکڑی بھی دیاسلائی کے لئے کارآمد ہوتی ہے یہ اکڑی ریاست میسور اور نیپال کے جنگلوں میں کثرت سے موجود ہے سخت کارڈ بورڈ کی بھی سلائی بنائی جاتی ہیں ان سلائیوں کا رواج انگلستان میں زیادہ ہے۔

کارخانوں میں دیاسلائی بنانے کا طریقہ درختوں کے ایسے تہے جو بالکل سیدھے اور ہموار ہوں اور انکی گولائی کم از کم دو ٹہ ہو جنگلوں سے فراہم کر لئے جاتے ہیں ان تنوں

محفوظ دیا سلائی

محفوظ دیاسلائی کے اجزائے ترکیبی میں پلاسٹیم کلورائیڈ، پلاسٹیم بائیکلو وائیٹ، زنک آکسائیڈ، سفوف کالج، گندک، منیکیز ڈائی آکسائیڈ، اور آرن آکسائیڈ شامل ہیں ان اجزاء کو پگھلاتے ہوئے سریش میں حل کر لیا جاتا ہے اور سلائیوں کو پہلے موم میں ڈبا کر یہ مرکب ان کے سروں پر لگایا جاتا ہے اور ڈبہ کی سطح پر سرخ فاسفورس، لانی، مونی سلفائیڈ پگھلاتے ہوئے سریش میں ملا کر لگایا جاتا ہے سرخ فاسفورس میں مضر صحت اثرات بالکل نہیں ہیں۔ ان دیاسلائیوں کی خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ جب تک ان کو سرخ فاسفورس سے تیار کی ہوئی محفوظ سطح پر رکھا نہ جائے یہ جل نہیں سکتیں اس کے علاوہ ایسا انتظام بھی کر لیا جاتا ہے کہ چلی ہوئی سلائیوں کے کرنے کا خطرہ کم سے کم ہو جائے کہ اس کام کے لئے راشیدہ سلائیوں کو پہلے ایک حوض میں ڈبایا جاتا ہے جسکے پانی میں امونیا یاوڈر اور فاسفورس ایسڈ حل کیا ہوا ہوتا ہے چند منٹ کے بعد حوض میں سے نکال کر سلائیوں کو دھوپ یا ہوا میں خشک کر لیا جاتا ہے یہ عمل کرنے کے بعد اگر سلائیوں حلائی جانیں تو راک نہیں بنتی بلکہ کونلے کی شکل اختیار کر لیتی ہیں سلائیوں کے راکہ بننے میں نقص یہ ہے کہ جلتے وقت ہاتھ سے ٹوٹ کر لباس یا فرش پر گر جاتی ہیں جس سے جانے کا خطرہ ہے اتفاقاً جانت لینے کے بعد اب مناسب ہو گا کہ ہندوستان میں دیاسلائی کی صنعت کے متعلق کچھ بیان کیا جائے۔

مواد طور پر کھڑی حالت میں جم جائیں اور ایک دوسرے سے فاصلہ پر رہیں تاکہ ان پر کیمیاوی عمل کرنے میں دقت پیش نہ آئے۔ جن فریموں میں سلائیاں بھری ہوئی ہیں ان کو لوہے کی پلیٹ پر یکے بعد دیگرے رکھ کر پریس کیا جاتا ہے تاکہ اونچی نیچی نہ رہیں اور پلیٹ آگے کے ذریعہ گرم ہوئی ہو تاکہ اگر سلائیاں پورے طور پر خشک نہ ہوئی ہو تو خشک ہو جائیں۔

اس کے بعد بگھلے ہوئے گرم موم کی سطح پر رکھ کر سلائیاں کا کچھ حصہ موم میں ڈبا دیا جاتا ہے۔ اگر یہ عمل نہ کیا جائے تو سلائیاں حلالے میں بڑی مشکل ہوگی کیوں کہ سلائیاں کو ڈیہ کی سطح پر رکڑنے سے جو شعلہ برآمد ہوتا ہے اس میں اتنی طاقت نہیں ہوتی کہ فوراً سلائی کو مشتعل کر دے اور وہ شعلہ دیر با بھی نہیں ہوتا فوراً بجھ جاتا ہے۔ لیکن موم فوراً اس شعلہ کو اپنی جانب منتقل کر لیتا ہے اور اس طرح سلائی گرم ہو کر جلنے لگتی ہے۔ سلائیاں پر موم کا عمل کرنے کے بعد مرکب میں جو پہلے سے تیار شدہ ڈینگ پلیٹ (مرکب لگانے کی میز) میں جو موحود ہوتا ہے ڈبا کر خشک کر لیا جاتا ہے۔ سلائیاں کا مرکب خشک ہونے کے لئے اگر موسم گرم ہو تو نصف گھنٹہ کافی ہوتا ہے لیکن موسم باران یا سردی میں زیادہ عرصہ لگتا ہے۔ ایسی صورت میں خاص طور پر گرم کرے بنائے جاتے ہیں جہاں آگ یا برقی طاقت سے حرارت پہنچائی جاتی ہے ان کمروں میں سلائیاں بہت جلد خشک ہو جاتی ہیں۔ خشک ہو جانے پر سلائیاں کو فریم سے

کو ایک ایک فٹ کے ٹکڑوں میں منتقل کر لیا جاتا ہے انکا پوسٹ علیحدہ کر کے مشین پر فٹ کر دیا جاتا ہے۔ مشین کی حرکت سے یہ ٹکڑا تیزی سے گھومنے لگتا ہے۔ اس کے قریب لوہے کی تیز چھریاں لگی ہوتی ہیں۔ مشین چلنے پر چھریاں لکڑی سے قریب ہوتی جاتی ہیں۔ جب لکڑی سے مل جاتی ہیں۔ تو باریک باریک پٹیاں ساڑ کے مطابق لکڑی سے اترنا شروع ہو جاتی ہیں۔ ان پٹیوں پر ساتھ ہی ساتھ لائن پڑتی جاتی ہے تاکہ جب انکو ہوا ڈال جائے تو ٹوٹ نہ جائیں ان تمام پٹیوں کو نہ بہ نہ جھاکر دوسری مشین پر رکھ کر چھوٹے چھوٹے ٹکڑے بنائے جاتے ہیں ان ٹکڑوں کو موٹر ڈبیاں بنائی جاتی ہیں۔ ڈبیاں مشین پر بنتی ہیں اور دستی طریقہ پر بھی بنائی جاتی ہیں۔ تراشیدہ پٹیوں پر صرف کاغذ چپکانا ہوتا ہے اگر مشین پر بنائی جائیں تو ایک دن میں ایک مشین سے تقریباً بیس ہزار ڈبیاں تیار ہو سکتی ہیں۔ اور دستی طریقہ پر ایک شخص جس کو اچھی مشق ہو پویمہ ۳ ہزار بنا سکتا ہے۔ سلائیاں بنانے کیلئے دیگر پٹیاں اتاری جاتی ہیں اور ان پٹیوں کو نہ بہ نہ مشین میں رکھ کر سلائیاں تراشی جاتی ہیں۔ فی منٹ دس ہونڈ سلائیاں ایک مشین تراش سکتی ہے تراشیدہ سلائیاں کو اس حوض میں ڈبا یا جاتا ہے جس کے پانی میں فاسفورس ایسڈ اور امونیا پوڈر حل کیا ہوا ہوتا ہے تاکہ جلتے وقت سلائیاں راکھ نہ بن سکیں بلکہ کوئلہ بن جائیں۔ اس عمل کے بعد سلائیاں کو ہوا یا دھوپ میں خشک کر کے مشینوں کے ذریعہ بکھا کر لیا جاتا ہے یعنی فریموں میں اس طور پر جمع لیا جاتا ہے کہ سلائیاں بالکل

امریکہ وغیرہ سے منگائی جاتی ہیں۔ موجودہ جنگ کے سبب ان کی درآمد تقریباً دو سال سے بند ہے پہلے کا ذخیرہ جو کچھ موجود ہے اسی پر کام چل رہا ہے اگر یہ ذخیرہ ختم ہو جائے تو ہندوستان میں دیا سلائی کے تمام کارخانے بند ہو جائیں گے۔ جن اجزاء سے پوٹاشیم کلورائیڈ اور فاسفورس بنائی جاتی ہیں وہ ہندوستان میں کافی مقدار میں مہیا ہو سکتے ہیں اگر حکومت ہند ان ضروری اجزاء کی تیاری کا انتظام ہندوستان میں کرتی تو فی زمانہ اس مفید صنعت کے ختم ہونے کا اندیشہ نہ ہوتا۔

اب سے دس سال پیشتر دیا سلائی سازی کا ایک معمولی کارخانہ جاری کرنے کے لئے تقریباً دو لاکھ کے سرمایہ کی ضرورت ہونی تھی گویا کم سرمایہ دار اس سے فائدہ نہیں اٹھا سکتے تھے لیکن موجودہ زمانہ میں دستی طریقہ پر بھی اس کام سے فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے کیونکہ تراشیدہ سلائیاں اور ڈیاں دوسرے کارخانوں مثلاً ساونہ، لبار سے مہیا ہو سکتی ہیں صرف ان پر کیمیائی عمل کرنا پڑتا ہے۔ دستی کارخانے میں مختصر مشینری کی مدد سے تقریباً ایک سو گز بومیہ دیا سلائی تیار ہو جاتی ہے۔ اسے کارخانے کے لئے ہندو ہزار کا سرمایہ کافی ہو سکتا ہے۔

دیا سلائی پر گورنمنٹ کی نگرانی

سنہ ۱۹۳۴ء میں دیا سلائی کے کارخانوں پر گورنمنٹ کی نگرانی قائم ہوئی اور دیا سلائی کیلئے ایک قانون مرتب کیا گیا۔ اس قانون کی رو سے بغیر حصول لائسنس کوئی شخص دیا سلائی تیار نہیں

علحدہ کر کے خانہ دار کشتی میں منتقل کر دیا جاتا ہے یہ کام بھی مشین کے ذریعہ ہوتا ہے۔ اب ان سلائیوں کو تیار شدہ ڈیبوں میں ہاتھ یا مشین کے ذریعے بھر دیا جاتا ہے اور ڈیبوں کی سطح پر برش کے ذریعہ مرکب لگا کر خشک کر دیا جاتا ہے۔ ان تمام کاموں کو انجام دینے کے لئے ایک معمولی کارخانے میں چار سو آدمی ہوتے ہیں ان سب کا رہنا یا نگرانکار صرف ایک آدمی ہوتا ہے جسکو کیسٹ (دوا ساز) کہا جاتا ہے یہ آدمی اکثر جاپانی یا جرمن ہوتا ہے۔ اسکا خاص کمرہ (کیکل روم) علحدہ ہوتا ہے اجرائے ترکیبی کا وزب کرنے وقت دوسرا کوئی شخص کمرے میں نہیں جاسکتا کیونکہ کیسٹ اجزاء کا صحیح تناسب پوشیدہ رکھتا ہے اسی لئے اس کو اپنی خدمات کا معقول معاوضہ ملتا ہے اگر اس کام کو دوسرے بھی سیکھ جائیں تو کیسٹ کی اہمیت باقی نہیں رہ سکتی۔ فی زمانہ بعض کارخانوں میں ہندوستان کیسٹ بھی دیکھے جاتے ہیں جو کسی نہ کسی طرح اس کام میں مہارت حاصل کر چکے ہیں۔ لیکن غیر ملکی ماہرین کے مقابلہ میں بہت کم معاوضہ اپنی خدمات کا پاتے ہیں۔

بعض اجزاء ہندوستان میں تیار

نہیں ہوتے

دیا سلائی سازی میں دو چیزیں بہت اہم ہیں پوٹاشیم کلورائیڈ اور سرخ فاسفورس اگر یہ چیزیں موجود نہ ہو تو دیا سلائی تیار کرنا ناممکن ہے۔ یہ دو چیزیں ابھی تک ہندوستان میں تیار نہیں ہوئیں۔ جاپان، سویڈن، جرمنی

دیا سلائی ارزاں فروخت ہوتی ہے کیونکہ کارخانوں کو کوئی ٹکس ادا کرنا نہیں پڑتا۔

ہندوستان میں دیا سلائی کا سب سے بڑا کارخانہ

ہندوستان میں سب سے بڑا اور مکمل کارخانہ دیا سلائی کا (و م کو) یعنی ویسٹرن انڈیا میاج کمپنی ہے یہ کارخانہ بمبئی سے تقریباً پچاس میل کے فاصلہ پر عنبر ناتھ میں ہے اس کارخانہ میں تقریباً چالیس لاکھ سرمایہ لگا ہوا ہے یہ کارخانہ سویڈن کے کارخانوں کی ایک شاخ ہے ہندوستان کے مختلف حصوں میں اسکی شاخیں موجود ہیں اور ہر بڑے شہر میں اسکی ایجنسیاں قائم ہیں اس کارخانے میں ہر ایک کام مشین کے ذریعہ کیا جاتا ہے یہی وجہ ہے کہ بمقابلہ دیگر کارخانوں کے اس کارخانے کی تیار شدہ دیا سلائی اچھی ہوتی ہے تقریباً دس ہزار کرز یومیہ دیا سلائی تیار ہوتی ہے۔ یعنی تقریباً بیس ہزار روپیہ یومیہ انڈیا اکسٹرن ڈیوٹی کی شکل میں اس کارخانے سے ادا کیا جاتا ہے۔

موجودہ زمانہ میں دیا سلائی کی صنعت تجارتی نقطہ نظر سے کافی منفعت بخش ہے اگر اسکے وہ اجزاء جو دوسرے ممالک سے تیار حالت میں منگائے جاتے ہیں ہندوستان میں ہی تیار ہونے لگیں تو یہ صنعت خالص ہندوستانی صنعت کہلانے کی مستحق ہو سکیگی۔

کر سکتا کیونکہ دیا سلائی انڈیا اکسٹرن ڈیوٹی قائم کی گئی ہے ہر دیا سلائی کی ڈیٹا پر انڈیا اکسٹرن کی علامت کے لئے ایک کاغذی رول جس پر سلائیوں کی تعداد اور ٹکس کی شرح درج ہوتی ہے چسپان کیا جاتا ہے جس ڈیہ پر چسپان نہ ہو وہ قابل گرفت ہے۔

اس ٹکس کی ادائیگی کا طریقہ یہ ہے کہ سرکاری خزانوں میں مطبوعہ بینڈ رولس جمع ہوتا ہے کارخانے والے حسب ضروری نقد قیمت ادا کر کے اسکو خرید لیتے ہیں اور ڈیہوں پر چسپان کر دیتے ہیں۔ اس قانون کی باقاعدہ تعمیل کی نگرانی کیلئے ہر کارخانے پر گورنمنٹ کے نمائندے مقرر ہیں جو اسکے حساب و کتاب کی نگرانی کرتے ہیں ہندوستانی ریاستوں کیلئے اس قانون میں ایک رعایت رکھی گئی تھی مثلاً ایسے کارخانے جو کسی ریاست کی حدود میں جاری ہیں ان پر انڈیا اکسٹرن ڈیوٹی (ٹکس) عائد کرنا یا نکرنا اس ریاست کی حکومت پر منحصر ہو گا اگر ٹکس عائد نہ کیا جائے۔ تو شرط یہ تھی کہ وہاں کی تیار شدہ دیا سلائی علاقہ برٹش گورنمنٹ میں نہ بھیجی جاسکیگی اس رعایت کے مدنظر چند ریاستوں نے مثلاً جو ناکڈہ اسٹیٹ (کالٹھیا واڑ) جام نکر اسٹیٹ، بہاؤ نکر اسٹیٹ وغیرہ نے برٹش گورنمنٹ سے معاہدہ کر لیا ہے کہ وہاں کی تیار شدہ دیا سلائی انگریزی علاقہ میں نہیں بھیجی جائیگی اسلئے وہاں کی دیا سلائی پر یہ ٹکس یا پابندی نہیں ہے ان ریاستوں میں

مہاری غذا

(ریاض الحسن قریشی صاحب)

کی جسمانی صحت خراب ہونے کی وجہ سے ان میں بیماریوں کے مقابلے کی قوت باقی نہیں رہتی جس کی ذمہ داری ایک بڑی حد تک نقص تغذیہ پر مبنی ہے۔ اگر غذا اچھی اور مختلف قسم کی ہو تو علاوہ اس کے اس سے لوگوں کی صحت میں ترقی ہوگی اور ان کی بیماریوں سے بچنے کی قوت بڑھ جائے گی۔ اس کا ایک نتیجہ یہ بھی نکلے گا کہ ملک کی پیداوار اور صرف دولت میں بہتر تناسب قائم ہو جائے گا۔

قوموں کی زندگی میں سب سے بڑا مسئلہ زندگی کا ہے۔ ہاپکنس کا قول ہے کہ غذا کی ضرورت اس کی مقدار اور نوعیت نے قوموں کی قسمتوں کے فیصلے میں بڑا حصہ لیا ہے تغذیہ کے علم نے گزشتہ چند سال میں بڑی سرعت سے ترقی کی ہے اور جو معلومات حاصل ہوتی ہیں ان کی بدولت صحت عامہ کی پانامی نئی کروٹ بدل رہی ہے۔ آج کل غذا کے مسئلہ پر حکومتیں زیادہ توجہ کر رہی ہیں۔

غذا کا مزیدار ہونا ضروری ہے۔ انسان کے خیال کا ہاضمہ کے فعل پر بہت اثر پڑتا ہے۔ اور یہ عام تجربہ ہے کہ بد مزہ کھانا جس سے طبیعت اکٹا جائے درمیان ہضم ہوتا ہے۔ یہ خلاف اس کے خوشگوار اور مزیدار کھانا جو خوبصورت برتنوں میں عمدہ طریقہ سے بھجا کر سامنے رکھا گیا ہو آسانی سے ہضم ہو جاتا ہے۔ اور جز و بدن ہو کر فائدہ بخشنا ہے طبیعت کا غم و غصہ یا فکر انکار سے خالی ہونا بھی غذا کو جلد ہضم کرنے اور جز و بدن بنانے میں بڑی مدد دیتا ہے۔

بین الاقوامی انجمن مزدوران جس کا مقصد قیام ہی یہ ہے کہ مزدوروں اور کاربگروں کو مشکلات اور فاقہ کشی سے بچائے اور انہیں کافی مزدوری دلا کر زندہ رہنے کے قابل بنائے۔ پورے طور پر اس امر کی کوشاں ہے کہ تمام دنیا میں غذا کا معیار علمی اور فنی اصولوں کی بنا پر رائج کرادے۔ آج کل عام لوگوں کو تغذیہ کے علمی اور فنی اصولوں کی تعلیم دی جا رہی ہے۔ یہ امر واقعہ ہے کہ کثرت سے لوگ بری غذاؤں کے استعمال سے روزمرہ مختلف بیماریوں کا شکار ہوتے رہتے ہیں۔ عام طور پر لوگوں

جربے سے حرارت خارج ہوتی ہے۔ یہ جسم میں بطور ذخیرہ جمع رہتی ہے۔

معمولی غذا میں مختلف قسم کے ٹک ہیں۔ اگر ان ٹکوں کی مقدار کم ہو تو صحت میں خرابی پیدا ہوتی ہے۔ کیلیم کے باعث ہڈیوں میں سختی قائم رہتی ہے۔ غذا میں مومولی ٹک (سوڈیم کلورائیڈ) کی سب سے زیادہ مقدار ہوتی ہے جس سے نہ صرف ذائقہ بہتر ہو جاتا ہے بلکہ جسم کی ضرورت بھی پوری ہو جاتی ہے۔ اس کے علاوہ فاسفورس، اواہ گندک ہر ایک اپنا اپنا فعل انجام دیتا ہے۔ ان کو ہم اکثر ترکیبوں سے حاصل کرتے ہیں۔

جو پانی جسم سے پسینہ وغیرہ کے ذریعہ خارج ہوتا ہے اس کی تلافی ضروری ہے۔ جسم کا بیشتر حصہ پانی سے بنا ہوا ہے۔ پانی غذائی نالی میں غذائی اشیا کو حل بھی کرتا ہے اور جب تک غذائی اشیا محلول کی شکل میں نہ ہوں آنتوں میں جذب نہیں ہوتیں۔ جسم کو کاربوہائیڈریٹس اور جربوں کی تکسید سے بھی پانی حاصل ہوتا ہے۔

آکسیجن زندگی کے لئے ضروری ہے۔ ہوا، سانس لینے سے پہنچنے والے ذریعہ جسم میں داخل ہوتی ہے۔ اس میں صرف آکسیجن ہی ایسی گیس ہے جو کیمیائی ترکیب میں حصہ لیتی ہے۔ خون آکسیجن کو جذب کرتا ہے۔ جس سے ہیمو گلوبن، آکسی ہیمو گلوبن میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ آکسیجن غذا کے ساتھ مل کر اس کو آکسائیڈس میں تبدیل کر دیتی ہے۔ غذا چونکہ زیادہ تو کاربن پر مشتمل ہوتی ہے

ہماری غذا کے حسب ذیل اجزاء ہیں۔
(۱) پروٹین (۲) کاربوہائیڈریٹس (۳) جربیاں (۴) ٹک (۵) پانی (۶) آکسیجن (۷) جاتین جسم کے ہانتوں کے ٹوکے لئے پروٹین کی سخت ضرورت ہے کیونکہ اس کے ذریعہ جسم کو ٹائروجن اور گندک مہیا ہوتی ہے۔ ٹائروجن یوریا اور دوسرے مرکبات کی شکل میں روزانہ خارج ہوتی رہتی ہے۔ اور اس خارج شدہ ٹائروجن کی تلافی کے لئے پروٹین کا استعمال ضروری ہے۔ پروٹین کی زیادہ مقدار گوشت، دودھ اور انڈے میں ہوتی ہے اس کے علاوہ بعض نباتی اشیا مثلاً، براؤ پھلیوں میں بھی اس کی کافی مقدار موجود رہتی ہے۔ آلو اور آٹے میں بھی اس کی کچھ مقدار موجود ہوتی ہے۔

جب تک جسم میں کاربوہائیڈریٹس کا مکمل احتراق نہ ہو اس وقت تک جربوں کا احتراق مکمل نہیں ہوتا۔ کاربوہائیڈریٹس جسم میں تحلیل ہو کر کاربن ڈائی آکسائیڈ اور پانی میں تبدیل ہو جاتے ہیں اگر جسم میں کاربوہائیڈریٹس کا احتراق کم ہو تو جربوں کی تکسید مکمل نہیں ہوتی۔ کاربوہائیڈریٹس چاول اور ٹماٹوں میں زیادہ مقدار میں ہوتے ہیں۔

جربیاں آنتوں میں تقریباً مکمل طور پر جذب ہو جاتی ہیں جربوں کا انجذاب، غذا استعمال کرنے کے پانچ یا چھ گھنٹوں کے بعد عمل میں آتا ہے۔ اگر غذا میں جربے نہ ہوں تو وہ بہت جلد جذب ہو جاتی ہے اور کھانے کے کچھ دیر بعد ہی بھوک محسوس ہونے لگتی ہے۔

ان کو حیاتین (وٹامنس) کے نام سے موسوم کیا گیا۔ ویٹا، زندگی کو کہتے ہیں۔

ابتداء جب حیاتین کے متعلق تحقیق جاری تھی تو علم کی کمی کی وجہ سے ان کو نام دینا مشکل تھا۔ مختلف حیاتین کو ان کے مختلف افعال کی بنا پر مختلف نام دئے جاتے تھے۔ لیکن بعد کو ان کے نام بطریق اجدد، ب، ج، د اور ہ وغیرہ رکھے گئے۔

حیاتین الف کا ماخذ پودے ہیں اور کلوروفل ان کا افرار کرتا ہے۔ حب جانور، ان پودوں کو کھاتے ہیں تو یہ چربی میں حل ہو کر حگر میں جمع ہو جاتے ہیں۔ یہ حیاتین دودھ، مکھن، بھلی کا تیل، انڈے کی زردی اور دوسری نباتی غذاؤں میں پائی جاتی ہے۔ گرم کرنے سے حیاتین الف کی تفسیہ ہوتی ہے۔ دودھ کو آبال دینے سے یہ ضائع ہو جاتی ہیں۔ حیاتین الف جانوروں کی بایڈگی قائم رکھتی ہے۔ اس کی کمی سے جانور ٹھڑ جاتا ہے۔ اور وزن کمٹنے لگتا ہے۔ جسم میں اس کے منقود ہونے سے جانور جراثیم کا با آسانی شکار ہو جاتا ہے۔ آنکھیں سرخ ہو جاتی ہیں اور جلنے لگتی ہیں۔ بالآخر بصارت حاتی رہتی ہے۔ اور جانور کی تولید میں بھی فرق رونما ہوتا ہے۔

حیاتین الف کثیر مقدار میں بھلی کے تیل اور بکرے کی کلیجی میں موجود ہوتا ہے۔ متوسط مقدار میں مکھن، بالائی چربی، مکئی، گیہوں، ہڈ، گاجر، پالک، موز، اناس، بیر، ٹائو دودھ اور انڈے کی زردی میں موجود ہے۔ لیکن مسود، انروٹ، بھول کوئی، آلو کھجور،

اس لئے کاربن ڈائی آکسائیڈ پیدا ہوتی ہے۔ سائنس جو باہر چھوڑی جاتی ہے اسی میں کاربن ڈائی آکسائیڈ اور آبی بخارات ہوتے ہیں۔ آبی بخارات کسی ایک صاف شیشے کی سطح پر سانس چھوڑنے سے نمایاں ہو سکتے ہیں۔ چونے کے پانی میں کچھ دیر تک پھونکنے سے کاربن ڈائی آکسائیڈ کی موجودگی کا ثبوت ملتا ہے۔

ان مرکبات کے علاوہ غذا میں دوسری نہایت اہم چیزیں بھی موجود ہیں جو صحت کے برقرار رکھنے میں مدد دیتی ہیں۔ سنہ ۱۹۰۶ ع سے سنہ ۱۹۱۲ ع تک کیمبرج میں بف۔ جی ہاپکنس نے مختلف تجربے کئے اور معلوم کیا کہ جن چوہوں کو ایسی مصنوعی غذا پر جن میں جملہ پروٹینی اجزاء چربی، کاربوہائیڈریٹ، نمک وغیرہ تھے پالتے کی کوشش کی گئی ان کا وزن کم ہو گیا اور وہ بالآخر مر گئے۔ برخلاف اس کے وہ چوہے جن کی غذا میں تازہ دودھ کے چند قطرے شامل کر دئے جاتے تھے تندرست رہے۔ ہاپکنس نے اس امر پر غور کرنا شروع کیا کہ تازہ دودھ میں ضرور کوئی ایسی شے موجود ہے جو اس فرق کا باعث ہے۔ قدیم زمانے میں جب سفر مہینوں تک جاری رہتا تھا مسافروں میں بعض امراض پھوٹ پڑتے تھے۔ ان میں اسکر یوٹ اور بری بری بہت مشہور امراض ہیں۔ تازہ میوہ استعمال کرنے سے یہ امراض نہیں پھیلتے تھے۔ اس سلسلہ میں تجربے کرنے پر عجیب و غریب چیزوں کا پتہ چلا جو خاص خاص اغذیہ میں رہتی ہیں اور جو زندگی قائم رکھنے کے لئے ضروری ہیں۔

حیاتین ج پانی میں حل پذیر ہے۔ سبز ترکاریوں اور تازہ میووں میں پائی جاتی ہے۔ اس کی کمی سے اسکر بوط اور پیری پیری کے امراض پھیلتے ہیں۔ گزشتہ جنگ میں انگریزی فوج عراق میں چند ماہ تک کھری رہی۔ اس عرصہ میں سپاہی اسکر بوط کے مرض میں مبتلا ہوئے اور اس کے ساتھ پیری پیری کا مرض بھی پھیل گیا۔ پیری پیری کی وجہ یہ بتلائی جاتی ہے کہ ہندوستانی فوج چاول کی پیچ استعمال کرتی تھی اور گودوں کو مصفا چاول دے جاتے تھے۔ جن میں حیاتین ج موجود نہیں ہوتی تھی۔ یہ حیاتین ہڈیوں اور دانتوں کے نشوونما میں بھی نمایاں حصہ لیتی ہے۔ اور دانتوں کو جلد ضائع ہونے سے روکتی ہے اس کی کمی سے جوڑوں کا درد ہوتا ہے۔ حیاتین ج خشک میوے میں نہیں پائی جاتی اور گرم کرنے اور خشک کرنے سے بہت جلد تباہ ہو جاتی ہے۔ متوسط مقدار میں ، پیاز ، آلو ، مولی ، شلجم ، سیب ، موز ، اناس میں موجود ہے لیکن کم مقدار میں بالائی ، مسور ، ناشپاتی ، شہد اور دودھ میں موجود ہے۔

حیاتین د نہایت اہم حیاتین ہے۔ اس حیاتین کی کمی سے ہڈیاں ٹوٹی ہو جاتی ہیں اس کے علاوہ قوت ہاضمہ میں بھی فرق آ جاتا ہے۔ حیاتین د پھلی کے تیل ، انڈے کی زردی ، مکھن اور دودھ میں ہوتی ہے۔ اس کی کمی سے دانت بہت جلد خراب ہو جاتے ہیں۔ جسم پر بالائی بنفشی شعاعیں ڈالنے سے حیاتین د پیدا ہوتی ہے۔

انجیر ، لیمون پیاز ، مولی میں کم مقدار میں موجود ہے۔

حیاتین ب ، ایک پیچیدہ شے ہے جو دو اجزا پر مشتمل ہے۔ حیاتین ب۱ پیچ کے بیرونی برت میں ہوتی ہے۔ چاول کا بھوسہ نکالنے سے اس کے ساتھ حیاتین ب بھی نکل جاتی ہے اور بعد میں کچھ بچا ہوا حصہ بھی پانی میں حل ہو جاتا ہے یہ ہضم کرنے کی قوت کوڑھاتی ہے اور ہضمی نظام کے افعال کو بحال رکھنے میں مدد دیتی ہے۔ حیاتین ب کی غیر موجودگی سے پیری پیری وغیرہ کے امراض پیدا ہوتے ہیں۔ حیاتین ب ۱ اور ب ۲ دونوں کا اثر بالیدگی پر ہوتا ہے۔ حیاتین ب ۱ کثیر مقدار میں جوار ، مکئی ، مین موجود ہوتی ہے۔ سیب ، مسور ، مٹر اور گوشت مین متوسط مقدار لیکن کم مقدار مین بادام ، پالک ، شلجم ، سیب ، آم ، موز ، ٹماٹو اور انڈے مین مین پائی جاتی ہے۔

حیاتین ب ۲ ان ہی اشیاء میں پائی جاتی ہے جن میں ب ۱ ہوتی ہے۔ لیکن یہ ب ۱ سے علاحدہ ہے کیونکہ ب ۲ الکوحل میں حل نہیں ہوتی لیکن ب ۱ آسانی حل ہو جاتی ہے۔ انڈے کی سفیدی اور انجیر میں ب ۲ زیادہ مقدار ہوتی ہے اس کی کمی سے آنکھوں میں جلن محسوس ہوتی ہے۔ ہاضمہ خراب ہو جاتا ہے۔ اور انسان نحیف و لاغر ہو جاتا ہے۔ ان کے علاوہ دماغ کمزور ہو کر نسیان یعنی بھول اور دوسری اعصابی کمزوریاں پیدا ہوتی ہیں۔ اس کی متوسط مقدار کبوں ، مٹر ، پالک ، گوشت اور انڈے میں ہوتی ہے لیکن کم مقدار مکئی ، جوار ، پیاز ، آلو ، سیب ، آم ، موز اور ٹماٹو میں موجود ہے۔

غذا میں ہر ایک کی موجودگی ضروری ہے۔ ایسی ہی غذا صحت کو برقرار رکھتی اور کارکردگی میں نمایاں حصہ لیتی ہے۔ صحت کو برقرار رکھنے کے لئے اگر ایک طرف مناسب لباس اور مکان کی ضرورت ہے تو دوسری طرف غذا کا مسئلہ نہایت اہمیت رکھتا ہے۔ صحت اور قوت کارکردگی کو بڑھانے یا برقرار رکھنے کے لئے متوازن قسم کی غذا کا استعمال ضروری ہے۔ ”متوازن غذا“، سے روزمرہ کی وہ مستعملہ غذا مراد ہے جس میں صحت اور قوت کارکردگی کو بڑھانے یا برقرار رکھنے والے جملہ اجزاء ایک موزوں تناسب میں پائے جاتیں۔

چربی، زیتون کے تیل، پالک میں کم مقدار میں ہوتی ہے۔

حیاتین چربیوں میں حل پذیر ہے۔ اس کا ماخذ نباتات ہے ڈاکٹر ہربرٹ اور ایم رپودانس نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ اگر چوہوں کو یہ حیاتین میسر نہ آئے تو ان میں ہانچین پیدا ہو جاتا ہے۔ یہ حیاتین، متوسط مقدار میں مکھن، خوبانی، گائے گوشت کلیجی اور انڈے کی زردی میں پائی جاتی ہے۔ زیتون کے تیل، چاول اور دودھ میں کم مقدار میں موجود ہے۔

غذا کے مختلف حصوں سے ظاہر ہے کہ ہر ایک جز کس قدر اہمیت رکھتی ہے۔ ہماری

سوال و جواب

نورسی کا آلہ بنایا جاتا ہے۔ اس میں ایک سولی لگی ہوتی ہے جو برقی رو سے متاثر ہوتی ہے جب رو زیادہ قوت کی ہوتی ہے تو سولی زیادہ حرکت کرتی ہے، کم قوت کی ہوتی ہے تو کم۔ اس آلے کے متعلق کچھ تفصیلات بھی دی گئی تھیں۔ خیال تھا کہ آپ اتنا ہی جاننا چاہتے ہیں لیکن اب معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو نور برقی خانوں پر ایک مستقل مضمون کی ضرورت ہے۔ ظاہر ہے کہ سوال و جواب کے باب میں مستقل مضامین کی گنجائش نہیں ہے۔

نور برقی خانوں کے متعلق اگر آپ مزید معلومات حاصل کرنا چاہتے ہیں تو پھر طبیعیات کی بڑی اور مستند کتاب میں نور برقی اثر (Photo electric effect) کا باب ملاحظہ فرمائیے۔ اس کے علاوہ انسائیکلو پیڈیا بریٹانیکا میں بھی یہ عنوان آپ کی معلومات میں کافی اضافہ کرے گا۔ دی بک آف پاپولر سائنس (The Book of Populer Science) (ایڈیٹر ڈی ایس کیمبال۔ ناشر کروئیر سوسائٹی نیو یارک) کی چوتھی جلد میں نور برقی خانوں پر ایک مضمون

سوال - دو آلہ نورپیا، کی نسبت میرے سوال کا جواب رسالہ سائنس کے مارچ سنہ ۳۳ ع نمبر میں طبع ہوا ہے، بہت بہت شکریہ۔ جواب غیر تشفی بخش ہے۔ مہربانی فرما کر اس کی پوری ساخت سے آگاہ فرمائیں تاکہ آلہ مذکور بنایا جاسکے۔ یا اس کی نسبت کسی کتاب کا حوالہ دین جس سے مقصد حاصل ہو سکے۔

مصدر سعید مسلم صاحب - کلکتہ

جواب - افسوس ہے کہ جواب سے آپ کی تشفی نہ ہو سکی۔ آپ نے یہ دریافت فرمایا تھا کہ نورپیا کس اصول پر کام کرتا ہے۔ جواب میں بتایا گیا تھا کہ اس اصول کو نور برقی اصول کہتے ہیں۔ بعض دھاتوں میں یہ خصوصیت ہوتی ہے کہ جب ان پر نور کی شعاعیں پڑتی ہیں تو ان سے برقیے نکلتا شروع ہوتے ہیں۔ روشنی جس قدر تیز ہوتی ہے اس لحاظ سے برقیوں کی تعداد بھی زیادہ ہوتی ہے۔ اسی اصول کو کام میں لا کر

کہ تیش بھاکی حرارت بڑھنے لگی۔ جس سے ثابت ہوا کہ کو سرخ کے بعد روشنی کی کوئی شعاع نظر نہیں آتی ہے۔ لیکن شعاع موجود ضرور ہے کیونکہ اس کے اثر سے پارہ اوپر چڑھ رہا ہے یعنی یہ بات معلوم ہوئی کہ اس شعاع میں خصوصیت کے ساتھ حرارتی اثرات زیادہ ہیں۔ اس شعاع کا نام پائین سرخ شعاع رکھا گیا۔ اس طرح بنفشی رنگ کے بازو میں فوٹوگرافی کا ایک کاغذ رکھا گیا تو وہ سیاہ پڑ گیا۔ جس سے معلوم ہوا کہ یہاں پر بھی کوئی شعاع بڑھ رہی ہے۔ جو آنکھ سے نظر نہیں آتی لیکن فوٹوگرافی کے کاغذ پر اسی طرح اثر کرتی ہے جس طرح معمولی روشنی کی شعاع اس شعاع کا نام بالائے بنفشی (Ultra Violet) شعاع رکھا گیا۔

ان تجربوں سے معلوم ہوا کہ سورج کے طیف میں دراصل بہت سی شعاعیں مگر انسانی آنکھ کی صلاحیت بہت محدود ہے وہ سرخ سے لابی طول موج کی بانفشی سے چھوٹی طول موج کی شعاع کو نہیں دیکھ سکتی۔ یہ شعاعیں آنکھوں پر پڑتی ضرور ہیں لیکن ان کا اثر کچھ نہیں ہوتا آنکھ کے لئے ان کا ہونا فائدہ ہونا ہر بار ہے۔

انسانی آنکھ ان کے لئے بیکار ضرورت ہے لیکن کیمرے کی آنکھ انسانی آنکھ سے زیادہ تیز ہوتی ہے اور فوٹو کی پلیٹس یا فلم ان دونوں شعاعوں کے اثر کو قبول کر سکتی ہیں۔ اور ان کے ذریعہ تصویریں لی جاسکتی ہیں۔

جواب۔ ہاں آپ کا یہ کہنا ٹھیک ہے کہ روشنی نہیں تو تصویر بھی نہیں لی جاسکتی۔ لیکن پائین سرخ شعاع خود روشنی کی شعاع ہے گو ہماری آنکھیں اس کو دیکھ نہیں سکتیں لیکن کیمرے کے آنکھ ہم سے زیادہ تیز اور اس کی فلم یا پلیٹ ہماری آنکھوں کے پردے سے زیادہ حساس ہوتی ہے۔ یہی سبب ہے جو شعاع ہماری آنکھوں پر اثر نہیں کرتی وہ کیمرے پر اثر کر جاتی ہے اور اس سے تصویریں لی جاسکتی ہیں۔

لیکن اس بیان کو آگے بڑھانے سے پہلے مناسب ہو گا کہ آپ پہلے یہ سمجھ لیں کہ پائین سرخ شعاع کیا چیز ہے اور اس کو پائین سرخ کیوں کہا جاتا ہے۔ یہ تو آپ جانتے ہونگے کہ سورج کی روشنی جو بظاہر سفید معلوم ہوتی ہے دراصل سات رنگوں کا مجموعہ ہے۔ اگر سورج کی روشنی کو کسی منشور (Prism) سے گزارا جائے تو سامنے دیوار یا پردے پر سات رنگوں کی ایک پٹی نظر آئے گی۔ جس کو سائنس کی زبان میں طیف کہتے ہیں۔ طیف میں ایک طرف سرخ اس کے بعد نارنجی، پھر پیلا، پھر سبز آسمانی، پھر بنفشی ہوتا ہے۔

پہلے لوگ سمجھا کرتے تھے کہ سورج کی روشنی میں بس اتنے ہی رنگ ہیں۔ لیکن ایک روز اتفاقاً سرولیم پرشل نے سرخ رنگ کے بازو میں جہاں پر کوئی روشنی پڑ نہیں رہی تھی ایک تیش بھا رکھا۔ تعجب انگیز بات یہ واقع ہوئی

پائیں سرخ سے متاثر ہونے والی پلیٹ ڈال کر آئینے کے سامنے رکھ دیا جائے تو آپ کی تصویر آجائیکی۔ تصویر میں وہ کرم چیز ایسی نظر آئیگی جیسی کہ کوئی روشن چیز ہوتی ہے۔ اس کام کے لئے خاص قسم کی پلیٹیں بنائی جاتی ہیں۔ ان پر پائیں سرخ شعاعوں کا خاص اثر ہوتا ہے۔ دن کے وقت ان پلیٹوں سے جب تصویر لی جاتی ہے تو ایک حیرت انگیز نقشہ دیکھنے والوں کے سامنے آتا ہے۔ تصویر میں بارہ پندرہ میل کے مناظر ایسے نظر آتے ہیں جیسے کے سامنے موجود ہیں اور گرد و غبار اور بادل باکھر وغیرہ کا نام تصویر میں نہیں رہتا۔ کو تصویر لیتے وقت فضا میں کتنا ہی گرد و غبار کیوں نہ ہو۔

پائیں سرخ میں سب سے بڑا کمال یہی ہے کہ اس پر بادل یا کھربا گرد و غبار کا اثر نہیں ہوتا۔ آپ کے سامنے کھربے سے کھربا کھربا کیوں نہ ہو! اگر آپ اسی شعاع سے تصویر لینگے تو کھربے کے اس پار کی چیز صاف تصویر میں آجائیکی۔ آجائیکل اس کا سب سے بڑا کام یہی ہے کہ دور دور کی چیزوں کی تصویر اس سے لی جاتی ہے۔ جو چیزیں معمولی آنکھ نہیں دیکھ سکتیں یہ دکھائی دیتی ہے۔

سوال۔ میرے ایک عزیز دوست بد قسمتی سے کوٹاہ قامت اور بد شکل واقع ہوئے ہیں۔ ان کا بیان ہے کہ انہوں نے اپنے قد کو بڑھانے کی کوشش کی اور دوا بیچ کے اضافے تک میں کامیاب

اگر ہماری آنکھوں میں ایسی قوت آجائے کہ ہم پائیں سرخ شعاعوں کو دیکھ سکیں تو پھر عجیب و غریب تماشہ نظر آئے۔ اندھیری رات میں کرم پانی کا ایک اوٹا ہمارے لئے وہ کام دے جو روشنی کا ایک لیمپ دے سکتا ہے وجہ اس کی یہ ہے کہ جو چیز کرم ہوتی ہے اس سے کثرت کے ساتھ پائیں سرخ شعاعیں نکلتی رہتی ہیں۔ اگر آپ کسی چیز کو کرم کرنا شروع کریں تو پہلے اس سے حرارتی شعاعیں مثلاً پائیں سرخ شعاعیں نکلتا شروع ہونگی آپ اس کی حرارت کو محسوس کر سکیں گے لیکن وہ شعاعیں نظر نہ آئیں گی۔ اور زیادہ کرم کیجئے۔ تو وہ چیز سرخ ہو جائیگی۔ حسن کا مطلب یہ ہوا کہ اب اس میں پائیں سرخ کے ساتھ ساتھ سرخ شعاع بھی نکلتا شروع ہوئی۔ سرخ شعاع آنکھ کو نظر آتی ہے اس لئے ہمیں وہ چیز سرخ دکھائی دیگی۔ جیسے جیسے آپ اس چیز کو کرم کرتے جائیں گے ویسے ویسے دوسری شعاعوں کا اضافہ ہوتا جائیگا۔ سرخ کے ساتھ نیلی پھر آسمانی پھر سبز پھر بنیلی وغیرہ ملینگی۔ یہاں تک کہ ساتوں شعاعیں نکلتے آئیں گی اور وہ چیز سفید ہو کر چمکنے لگے گی۔

کسی چیز کو سفید رنگ سے دھکانے کے لئے تو کافی حرارت کی ضرورت ہوتی ہے لیکن معمولی پائیں سرخ شعاع کے لئے تو بڑی حرارت بھی کافی ہے۔ کسی چیز کا کرم محسوس ہونا ہی اس بات کی علامت ہے کہ اس سے پائیں سرخ شعاعیں نکل رہی ہیں۔

اندھیرے کمرے میں کوئی کرم چیز آپ کے سامنے رکھ دی جائے اور کھربے میں ایک

کی جائے اور قد کو بڑھانے کی سوترکیبن ڈھونڈھی جائیں۔ اگر ہم آپ کے دوست کی جگہ ہوتے تو نہایت اطمینان کے ساتھ اسی چہرے کو لٹے ہوئے بازاروں اور سڑکوں پر گھومتے اور ذرہ برابر غم نہ کھاتے۔

آپ کہہ سکتے ہیں کہ آپ کا رسالہ سائنس کا ہے بجائے اخلاقیات پر لکچر دینے کے مناسب یہ ہوگا کہ سوال کا جواب دیجئے۔ اگر آپ ایسا کہیں گے تو ہمیں رنج ہوگا۔ ہم یہ ماننے کو تیار نہیں ہیں کہ سائنس والوں کو دل نہیں ہوتا۔ اور انہیں اس کا حق نہیں پہنچتا کہ دو جملے نصیحت کے ادھر ادھر بول سکیں۔

پھر حال جواب دینا چونکہ ضروری ہے اس لئے عرض ہے کہ جدید زمانے میں جراحی نے اس قدر ترقی کی ہے کہ چہرہ بدلا جاسکتا ہے۔ چینی ناک کی جگہ لابی اور خوبصورت ناک لگائی جاسکتی ہے۔ بڑے کان چھوٹے کئے جاسکتے ہیں۔ ہونٹوں کو بتلا اور دھانے کو کم کیا جاسکتا ہے جراحی کے اس کمال کے لئے بھی جنگ کو دعا دینی چاہئے۔ جنگ کے سبب ہزاروں لاکھوں انسانوں کے اعضا بری طرح زخمی اور مجروح ہو جاتے ہیں۔ چہرہ اس بری طرح کٹتا ہے اور ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتا ہے کہ اگر زخمی اچھا بھی ہو جائے تو وہ عوام کے سامنے جانے کے لائق نہ رہے۔ جدید جراحی ان کے لئے رحمت کا پیام لیکر آئی ہے۔ ہوشیار سرجن متعدد نشتر دے کر اور پیوند کاری کر کے چہرے میں ایسی تبدیلی کر دیتا ہے کہ زخم بھر جاتے ہیں۔ گوشت مل

ہوئے۔ لیکن افسوس ہے کہ چہرے کی بد صورتی میں کمی نہ ہو سکی۔ کیا آپ مجھے براہ کرم بالتفصیل بتا سکتے ہیں کہ عصر جدید کی سائنس میں ایسی ایجادات ہوتی ہیں جن سے بدھیتی اور کوتاہ قلمتی کو بدلا سکے۔

میں نے اکثر اخباروں میں پڑھا ہے کہ یورپ میں بیوٹی ٹریٹمنٹ کا علاج ہوتا ہے۔ مہربانی فرما کر ان دو اخانوں کے پتے اور مصارف سے مطلع فرمائیے تاکہ میں اپنے دوست کے لئے کچھ سبیل کرنے کی کوشش کروں۔

محمد عبدالقوی صاحب

محمد پور۔ سلم نظام آباد دکن

جواب۔ کوتاہ قلمتی کا تو پتہ چل گیا لیکن کاش کہ آپ اپنے دوست کی تصویر بھی بھیج دیتے تاکہ ہمیں ان کی بد صورتی کا صحیح اندازہ ہو سکتا۔ ویسے بغیر دیکھے ہوئے کچھ کہنا بہت مشکل ہے۔ آخر آپ کے دوست میں کیا عیب ہے۔ کیا ناک چبٹی ہے؟ کیا کان بڑے ہیں؟ کیا ہونٹ موٹے اور آگے کو نکلیے ہوئے ہیں؟ کیا رنگ خراب ہے۔ بات کیا ہے۔ جو آپ لوگوں کو اور خود ان کو اس قدر پریشانی ہے۔

بد صورت ہونا کچھ جرم نہیں ہے۔ اور مرد کے لئے خاص طور پر یہ ایسی چیز نہیں ہے کہ اسکے غم میں نڈھال رہا جائے۔ یا پھر شہر شہر اور دوکان دوکان افزائش حسن کی تلاش

تو اس زحمت میں وہی لوگ پڑتے ہیں جن کو اس کے بغیر چارہ نہیں ہے۔

یہ علاج زیادہ تر کاہیابی کے ساتھ یورپ اور امریکہ میں ہوتا ہے۔ بد قسمتی سے ہمارے پاس اس وقت اس قسم کے افزائش حسن کے اداروں کا پتہ نہیں ہے کیونکہ آپ کا اس قسم کا پہلا سوال ہے۔ میں اب تک صحیح طور پر اس کا اندازہ ہی نہیں ملا کہ کن سوالات کا جواب دینا ہے ورنہ اس کا سامان پہلے سے کر رکھتے۔ انراجات کا معمول تخمینہ پر سمجھنے کے یورپ یا امریکہ آنے کا خرچ اور پھر آب و ہوا کے لئے کم از کم پچاس ساٹھ ہزار روپے کوئی ایک لاکھ کے اندر علاج ہو جائے گا۔

کیا آپ اپنے دوست کے لئے اتنا خرچ برداشت کر سکیں گے؟ یا اگر آپ نے برداشت بھی کر لیا تو اس کا حاصل کیا ہوگا مان لیجئے کہ چہرہ درست بھی ہو گیا تو صرف بھی ہوگا انہیں تھوڑی سی تسکین حاصل ہو جائے گی۔ اندر سیہا کی پران تو ان کے سامنے سجدہ کرنے سے رہیں۔ کیونکہ بہت ہوا تو چہرہ پہلے سے کچھ ٹھیک ہو جائیگا۔ حسن یوسف اس میں آنے سے رہا۔ ہماری رائے اگر آپ مانیں تو بجائے علاج کرانے کے ان کو روپیے ہی دے ڈالئے تاکہ آرام و چین کی زندگی گزاریں۔ مگر آپ کے دوست کو چاہئے کہ اپنے چہرے کا خیال چھوڑ دیں۔ آئینہ دیکھنا ترک کر دیں۔ نہ دیکھیں گے

جاتا ہے۔ اور بعض صورتوں میں عمل جراحی کا نشان تک نہیں رہتا۔ مریض جب اسپتال سے باہر نکلتا ہے تو خدا کا شکر ادا کرتا ہے کہ آج سے وہ بیس سال پہلے زخمی نہ ہوا کیونکہ اس زمانے میں اس کے زخموں کا علاج ہو سکتا تھا۔ لیکن کوشش کی کمی کو پورا کرنا، زخموں کے داغ دھبوں کو دور کرنا اور غائب شدہ اعضا کو از سر نو لگانا ڈاکٹروں کے بس کی بات نہ تھی۔ یہ کام آج کل کا ہی ڈاکٹر کر سکتا ہے۔

اس گفتگو سے آپ کو اندازہ ہوا ہوگا اس قسم کی جراحی دراصل جنگ کے زخمیوں پر زیادہ کامیابی کے ساتھ کی گئی۔ اس کے بعد یہ چیز آہستہ آہستہ ہر جگہ پھیل گئی ہے۔ زخمی جنگ کے سبب ہو یا کسی دوسرے حادثے کے سبب سب کا علاج ہوتا ہے۔

ظاہر ہے کہ یہ علاج جمہوری کا علاج ہے حادثے کے بعد اس قسم کا علاج ضروری ہو جاتا ہے۔ لیکن بہت سے لوگ ایسے بھی ہیں جو پولیس اور قانون کے ڈر سے اپنا چہرہ بدلو لیتے ہیں۔ امریکہ کے بدمعاشوں کا قصہ پڑھئے تو اس قسم کے واقعات اکثر ملینگے۔

ایک بات یہ ان پر اور بتا دینی ضروری ہے کہ اس تبدیلی سے چہرہ تو یقیناً بدل جاتا ہے لیکن اس میں قدرتی خوبصورتی بھی آجاتی ہے یا نہیں یہ بالکل مریض کے پہلے چہرے اور ڈاکٹر کی ہوشیاری پر منحصر ہے۔ اور سچ ہو چہئے

ہے۔ کچھ معلوم ہو تو اسی حساب سے جواب دیا جائے۔ بہتر ہو گا کہ اس کے متعلق وہ ویڈیو روس بی ایم / ہائیٹ لندن ڈیلیو می کو لکھیں امید ہے کہ تین چار اچھوت کا اضافہ ہو جائیگا۔

(۵ - ح)

نہ خیال آئیگا۔ اور اگر کبھی غلطی سے خیال بھی اجائے تو یا قسمت کہہ یا نصیب کر خاموش بیٹھ جائیں۔ یہاں تک تو چہرے کے متعلق ہوا اب رہا قد کا سوال آپ نے یہ نہیں لکھا کہ آپ کے دوست کا قد کتنا ہے۔ دو انچ تو وہ بڑہ ہی چکے اب آگے کہاں تک پہنچنے کا ارادہ



معلومات

ہوائی جہازوں کی صنعت میں تازہ ترین
اصلاحیں

مستند اطلاعاتیں مظہر ہیں کہ روسیوں اور
برطانویوں دونوں نے پلائی وڈ (امریکن تختہ
یا ایک قسم کی پرت دار لکڑی) کے ڈھانچے
کے لڑاکو ہوائی جہاز بنائے اور استعمال کئے ہیں
ایک مدت سے اطالوی بھی میڈیٹرینین میں
استعمال کرنے کے لئے دو موٹر اور تین موٹر والے
پلائی وڈ کے ڈھانچے کے بمبار ہوائی جہاز کام
میں لارہے ہیں۔

ممالک متحدہ (امریکہ) میں فوجی حکام
اعلیٰ نے تربیتی اغراض کے لئے لکڑی کے
ہوائی جہازوں سے کام لیا ہے۔ حال ہی میں
کریٹس رائٹ نے فوجوں کے لئے ۴۰ فٹ کے
باربردار ہوائی جہاز بھی پہلی پلائی وڈ سے
تیار کرنا شروع کئے ہیں۔

”چند منافع“

فوج اور سامان لے جانے والے جہازوں
کی تمام قسموں میں لکڑی اچھا کام دے سکتی

ہے ایسے جہازوں کو تمام دھات سے بنے
ہوئے جہازوں پر چند وجوہ ترجیح حاصل ہیں۔
ہوائی جہازوں میں جو دھات مستعمل ہے
لکڑی اس کے مقابلہ میں دیرس اور زیادہ
آہستگی کے ساتھ جلتی ہے اور یہ بھی حقیقت
ہے کہ بہت سے حالات میں آگ کے خطرہ سے
زیادہ محفوظ رہتی ہے۔

لکڑی بم کے ٹکڑوں اور گولیوں کو بھی
بہتر طور سے جذب کر سکتی ہے۔ اسی لئے
بنظر احتیاط تمام دھات سے بنے ہوئے لڑاکو
اور بمباروں پر بھی لکڑی کی چادر چڑھا دی
جاتی ہے تاکہ گولیوں سے جو سوراخ ہو جاتے
ہیں لکڑی پر کر ان کے درمیان آجائے۔

جس وقت ہوائی جہاز دھاکے سے زمین
پر گرتا ہے تو اگر اس کا چوکٹھا یا ڈھانچہ
پلائی وڈ کا ہو تو صرف اس کے بیرونی حصہ
کو نقصان پہنچتا ہے اور کچھ ٹوٹ بھوٹ کی
کی شکایت پیدا ہو جاتی ہے لیکن اگر دھات کا
ہو تو وہی فریم آرکن باجس کی طرح تہ ہو جاتا
ہے اور ہوائی جہاز نشین سخت خطرہ میں

نیا دستی ریڈیو سٹ

جنگ کی بدولت ایک بیا تعجب خیز ریڈیو سٹ ایجاد ہوا ہے۔ یہ اتنا چھوٹا ہے کہ سپاہی کی پیٹھ پر بآسانی باندھا جاسکتا ہے اور اسے ہاتھ سے لانے لیجانے میں کوئی دشواری نہیں ہوتی اس سے پیغام بھیجنے اور وصول کرنے کے دونوں کام لگے جاسکتے ہیں۔

اس خاص سٹ کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ پیام بھیجنے والے کے پیام اس کی بدولت ہیڈ کوارٹس کو گلے کی حرکات سے واپس ارسال کئے جاتے ہیں۔

جب اس پر کام کرنے والا فوجی جاسوسی پر مستعد رہکر کوئی اہم بات دیکھتا یا سنتا ہے تو وہ کچھ بولکر خبر دسانی نہیں کرتا بلکہ صرف سرکوشی سی کرتا ہے۔ باقی کام یہ سٹ انجام دیتا ہے جو اس کے گلے میں بندھا ہوتا ہے۔ اس کی کھمر پھسر سے جو حرکات، اقع ہوتی ہیں انہیں آلہ جذب کر کے ہیڈ کوارٹس کو منتقل کر دیتا ہے۔ آج کل یہ دستی وائریس سٹ مشرق وسطیٰ میں استعمال ہو رہا ہے۔

جنگ میں حصہ لینے والی شہد کی مکھیاں

ممالک متحدہ (امریکہ) میں شہد کی مکھیاں ضروریات جنگ کے سلسلے میں اہم کام انجام دے رہی ہیں۔ لیکن یہ کام ان کے شہد سے نہیں بلکہ موم سے نکل رہا ہے جو چار سو سے زیادہ صنعتی اشیاء میں کارآمد ہیں۔ ان چیزوں میں دوائیں، اسلحہ، گولی بارود اور جنگی

پڑ جاتے ہیں۔ ایسی مثالیں بہت ملتی ہیں جن میں لکڑی کے ڈھانچے کی وجہ سے ایسے تصادم کے وقت بیٹھنے والے بغیر کسی ضرر کے جانبر ہو گئے۔

جب کبھی ہوائی جہاز بہت زیادہ پھوار اور ترشح کی زد میں آ جاتے ہیں اس وقت بھی لکڑی دھات سے کہیں زیادہ مستحکم ثابت ہوتی ہے۔

الحکمدار اور کھڑی ہوئی پلائی وڈ ہوائی جہاز کے بازو اور چوکھٹے کی چادر کیلئے بہت کارآمد اور مضبوط ثابت ہوتی ہے۔ پلائی وڈ کے بجائے مکھائی، پاپلار (درخت حور) اور دوسری قسم کی لکڑی بھی استعمال ہو سکتی ہے۔ پہلے کھڑائی یا ڈھلائی سرد دباؤ (Cold pressure) اور جنین (کسٹین) کے سریش یا گوند سے کی جاتی تھی اب میڈیسن، ممالک متحدہ کے جنگلاتی معمولوں میں جن نئے طریقوں کو رواج دیا گیا ہے ان میں کرم داب اور رال کے گوند سے کام لیا جا رہا ہے۔

رال لکڑی کو اتنا بوجھل کر دیتی ہے کہ اس سے بنا ہوا ڈھانچہ قوت اور پائیداری میں یوری طرح ایلومینیم کا مقابلہ کرتا ہے۔ اس طرز کے بنے ہوئے جہاز ممالک متحدہ میں حمل و نقل کا کام کافی مددگی سے انجام دے چکے ہیں جن کی بدولت توقع ہے کہ فوجی ہوائی پروگرام میں اس قسم کے بارردار ہوائی جہازوں کو وسیع تر مقام حاصل ہو جائیگا۔

آنکھ سے گرد نکالنے کے لئے زبان

کا استعمال

بریشی کے دور دراز گاؤںوں میں آنکھ سے گرد صاف کرنے کا ایک عجیب طریقہ رائج ہے۔ جب ایسی تکلیف دہ صورت پیش آتی ہے تو کسی دوست یا سنا سے کہا جاتا ہے کہ وہ اپنی زبان سے اسے نکال دے۔

یہ عمل قواعد حفظ صحت کے لحاظ سے شائد چنداں اصولی نہیں مگر مجرب و کارگر ضرور معلوم ہوتا ہے۔ زبان کا نرمی سے مس کرنا دیدے کو کوئی تکلیف نہیں دیتا اور گرد کے جو ذرے آنکھ میں گھس جاتے ہیں زبان کے تر ہونے کی وجہ سے ان میں لیس پیدا ہو جاتی ہے۔ وہاں زبان کا سرا آنکھ کے اندر دوا یا مرہم لگانے کے لئے بھی کام میں لایا جاتا ہے۔

غید مہلک بندوقین

سب بندوقین ہلاک کرنے ہی کے لئے نہیں بنتی ہیں ان کی بعض قسمیں صنعتی کاموں میں بھی کارآمد ہیں۔

بے شبہ دھماکا مادہ سپاہی کی رائفوں میں توانائی کا مجتمہ سرچشمہ ہے لیکن اسے اور طریقوں سے بھی کام میں لایا جاسکتا ہے۔ مثلاً آپ کو ایک آدھ انچ دبیز فولادی چادر میں انچ بھر گول سوراخ کرنے کی ضرورت پیش آسکتی ہے۔ ممکن ہے آپ یہ کام برص سے لینا چاہیں۔ لیکن اس میں دیر لگے گی۔ پینچ کا بھی خیال آسکتا ہے جس سے۔ ٹرام اور بس وغیرہ کے

طیارے سب شامل ہیں۔ شہد کی مکھیان پالنے والوں نے سنہ ۱۹۴۲ء میں (۳۳۸۰۰۰۰) پونڈ دودھ جمع کیا۔ ممالک متحدہ کی تاریخ میں ایک سال میں دودھ کے اتنے ذخیرے کی یہ بہترین مثال ہے۔

بچھڑوں کے لئے پر اسرار خوراک

آج کل جوان بچھڑوں کو ایک پر اسرار طریقے سے تیار کی ہوئی خوراک استعمال کرائی جا رہی ہے جس کا ادنیٰ کرشمہ یہ ہے کہ اس طرح کھلائے ہوئے ہر بچھڑے کی بدولت چالیس کیلن دودھ انسانی صرف کے لئے بچ رہتا ہے۔

یہ خوراک ایک مخفی نسخے سے بنائی جاتی ہے اس لئے اسکے اجزا تو نہیں بنائے جاسکتے مگر اتنا ضرور کہا جاسکتا ہے کہ عنقریب رسد میں کفایت پیدا کرے کے لئے بہت سے غذائی مرکز اسے تیار کرینگے۔ یہ مرکب خوراک بچھڑوں کو انکی پیدائش کے تیسرے ہفتے سے دلیسے بالپس کے طور پر بڑی مقدار میں شروع کرادی جاتی ہے اور جس مقدار میں انہیں فطری خوراک کے طور پر دودھ ملتا تھا اس میں اسی ماسب سے کمی کر دی جاتی ہے۔

اس مرکب خوراک کی تیاری وزارت اغذیہ و وزارت زراعت کے قریبی تعاون کا نتیجہ ہے اسٹانفورڈ شائر فارم انسٹی ٹیوٹ کی بچھڑوں کو اس پر پرورش کیا گیا تو ان سے دس پونڈ فی ہفتہ زیادہ دودھ حاصل ہوا۔

یہی قاعدہ اوزاروں میں بحری تار کائنسے کے لئے مستعمل ہے۔ دونوں والی کیلیں ایسے اوزاروں کی مدد سے گزادی جاسکتی ہیں جو آلہ ان کیلوں کو ہٹاتا ہے وہ ہاتھ کی گرفت میں رہتا ہے اور کیلون کے سرے پر سے ایک لمحہ پہنچ کر دبا کر اس شے سے علاحدہ کر لیا جاتا ہے جس میں سوراخ کرنا مطلوب ہے۔

ان اوزاروں میں سے بعض ایسے ہیں جن کو غوطہ خور اشخاص پانی کے اندر استعمال کرتے ہیں۔ ان کی وضع قطع معمولی بند وقوں سے ممتاز ہوتی ہے۔ ان کا اشارہ با پھیلی ہوئی کھل مندن (Piston) جو گو یا اسکی گولی ہے ان بند وقوں سے کبھی جدا نہیں ہوتی۔ اسکا یہ مطلب ہے کہ دھماکے سے جو کیسیں پھیلی ہیں وہ تالی میں رک جاتی ہیں۔ اس سے اتنا زیادہ شور نکلتا ہے جتنا گولی کے رائفل سے نکل چکنے کے بعد ہوتا ہے اور فراڈکسین پیچھے کی طرف دھکا دیتی ہیں۔

مشین سے تیل کے کنوئیں کیلونا

غالباً صنعتی بند وقیں مشین سے تیل کے کنوئیں کیلونا میں سب سے زیادہ مستعمل ہیں۔ بہت سے لوگ تیل کے کنوئیں کو بھی زمین کا معمولی سوراخ یا بل تصور کرتے ہیں۔ یہ کنوئیں اگرچہ کئی کئی میل تک اندر چلے جاتے ہیں مگر عموماً ان کی دیواروں پر سیمنٹ لگی رہتی ہے اور سیمنٹ کے اندر فولادی غلاف ہوتا ہے۔ بسا اوقات ان میں کئی مختلف طبقے ہوتے ہیں جن سے تیل حاصل کیا جاسکتا ہے

کنڈ کر اپنے ٹکٹوں میں سوراخ کیا کرتے ہیں مگر اس کے لئے تاروں اور فلکیوں کی ضرورت ہوگی جو اسے صحیح طریقے سے توانائی کے ایک بڑے سرچشمے سے وابستہ رکھیں۔

”فولاد میں سوراخ کاٹنا“

ان صورتوں کے علاوہ ایک شکل یہ بھی ہو سکتی ہے کہ آپ فولادی چادر کو بندوق کا نشانہ بنا کر مطلوبہ سوراخ بنالیں۔ شائد آپ کے خیال میں اس قسم کی بندوق آسانی سے نہ آئیگی۔ یہ بندوق بھی فولاد ہی سے بنتی ہے مگر اس کی وضع عام بند وقوں سے مختلف ہوتی ہے۔ شکل میں جلی خط میں لکھے ہوئے حرف (C) سے مشابہ ہوتی ہے۔ اس میں جو کارتوس رکھا جاتا ہے وہ ایک معمولی قسم کے سادہ کارتوس سے بہت چھوٹا ہوتا ہے۔ یہ جس وقت سر ہوتا ہے تو اس سے ایک لاکھ پونڈ کا دباؤ ڈالنے والی کیسین خارج ہوتی ہیں اور فولادی چادر میں سوراخ ہو جاتا ہے جو نہایت مکمل گول اور چمکا ہوتا ہے اور اسکیے دونوں طرف کمر نام کو نہیں ہوتی۔

اس بندوق کا وزن (۷۰) پونڈ ہوتا ہے۔ جو بندوقیں اس سے چھوٹی ہوتی ہیں ان میں (۲۷) پونڈ وزن کی بندوق (۷۰۰۰) پونڈ کا دباؤ ڈالتی ہے۔ اس قسم کی کسی بندوق سے کام لیا جائے تو لوہے کی ہیلوں (کڑرس) میں فی گھنٹہ تیس چاس میل کے حساب سے سوراخ کٹے جاسکتے ہیں۔

سے کام لینا مقصود ہوتا ہے۔ اس تار پیڈو کے اطراف بہت سے منہ ایسے بنے ہوئے ہیں جن میں بڑے جوز سے مشابہہ چیزیں اسکرو سے کسی ہوتی ہیں۔

یہ ”جوز نما“، چیزیں فائر کرنے والی اکائیاں ہیں اور ایک بندوق میں (۲۴) ٹک استعمال ہوتی ہیں۔ ہر اکائی بارود، نالی اور نوکدار فولادی گولی پر مشتمل ہوتی ہے۔ جب بندوق مناسب کھرائی کی طرف جھکا دی جاتی ہے اس وقت یہ اکائیاں ایک وقت میں ایک کے حساب سے برقی قوت سے فائر کرتی ہیں۔

چونکہ اس بندوق کی نالی بہت چھوٹی ہوتی ہے اس لئے اس کی گولی میں ضروری دباؤ پیدا کرنا بھی خاصہ اہم مسئلہ تھا۔ رافٹل کے اندر دھماکے سے جو کیسیں پھپھاتی ہیں جب تک گولی بندوق کے اندر چلتی رہتی ہے اس پر برابر اپنا دباؤ ڈالتی رہتی ہیں۔ مگر برمانے والی بندوق کی چھوٹی نالی اس کے لئے کم وقت دیتی ہے۔ جلد سلسلہ اٹھنے والی پستول کی بارود سے بھی گولی اتنی جلدی نکل جاتی ہے کہ اس میں ضروری توانائی پیدا ہونے کا بہت کم موقع رہتا ہے۔

اس مشکل پر قابو پانے کے لئے ایک کترا ہوا پتر (Shear dix) استعمال کیا جاتا ہے جو ایک دھات کا ہوتا ہے اور بندوق کی نالی اور بارود کے درمیان داخل کر دیا جاتا ہے۔ یہ پتر کیسوں کو اس وقت تک روکے رہتا ہے جب تک ان سے پورا دباؤ پیدا نہ ہو جائے۔ اب پتر ٹوٹتا ہے اور دھماکے کی قوت فوراً گولی پر پڑتی

اور کنواں کھودنے وقت یہ تیل بہت زیادہ کھرائی میں چلا جاتا ہے۔ یہ عمل اس لئے کیا جاتا ہے کہ اس میں کفایت زیادہ متصور ہے۔ جب برمانے یا کھودنے کے لئے سب انتظام ہو چکے ہیں تو ایک آدمی سیدھا کھرائی میں جا کر ایک طبقے میں سوراخ کر دیتا ہے، اس کے تھوڑی دیر بعد دوسرے طبقے میں اس سے زیادہ کھرا سوراخ کرتا ہے اور سارا کام آسانی سے انجام پا جاتا ہے۔

جب کنواں اچھی طرح تیار ہو جاتا ہے اور تمام راستے میں غلاف بچھ جاتا ہے اس وقت ضرورت ہوتی ہے کہ اس کے اندر شکاف یا سوراخ بنائے جائیں جن سے تیل بہ کر آسکے۔ سنہ ۱۹۰۳ ع میں ایک میکینیکی برمسے یا سوراخ کرنے والے آلے سے اس قسم کے دھانے بنانے کی ایک تدبیر پیش کرانی گئی تھی۔ اس آلے میں مسطح یا افقی نوکدار پن لگے ہوتے تھے جو غلاف کے درمیان سے باہر کی طرف اس طرح پھینکی جاتی تھی جس طرح پھر اوزار ڈھکیلی جاتی ہے۔ سنہ ۱۹۲۶ ع میں یہی کام ایک بندوق سے اپنے کی تدبیر پیش کی گئی جو دراصل کسی نہ کسی صورت میں سنہ ۱۹۰۳ ع ہی سے زیر کار تھی۔

ظاہر برمانے والی بندوق اور سپاہی کی رافٹل میں کوئی تعلق نظر نہ آئے گا۔ یہ بندوق بمقابلہ کسی اور ہتیار کے ایک نہایت پتلا تار پیڈو سے زیادہ مشابہہ معلوم ہوتی ہے۔ اس کا قطر تین انچ سے پانچ انچ تک ہوتا ہے اور یہ کنوئین کے سوراخ پر نصب ہوتی ہے جس میں اس

کہتے ہیں۔ اس کی ساخت میں یہ خیال کارفرما ہے کہ اس میں ایک تار ایسا رکھا جائے جو بارود میں سے ہو کر گزرے۔ اگر بار غیر معمولی ہو تو تار کرم ہوتا ہے، بارود بھڑکتی ہے اور دھماکا برقی رو کو توڑ دیتا ہے۔ اس ایجاد کی ایک شکل میں ایک سادہ کارٹوس روابط کو جدا کر دیتا ہے اور بیک وقت دباؤ تیل جیسے ایک حاجر سیال کو روابط کے درمیان سے علحدہ کر کے اثر انداز طریقے سے اس عراب کو قطع کر دیتا ہے جو ان کے مابین بن سکتی ہے۔ اس کی ہلکی، مرکب قدیر سے نہایت وزنی کرنٹ حاصل کیا جاسکتا ہے جسکے لئے پہلے قدیم نمونے کے بڑے پٹاخوں (Breakers) کی ضرورت ہوا کرتی تھی۔

جنگ اور سائنسی انکشافات

جنگ کی مقتضیات و ضروریات سے متاثر ہو کر سائنسدانوں نے عموماً کیمیا دانوں نے خصوصاً نہایت انقلاب آفرین چیزیں مواد اور ساخت و حکمت وغیرہ کے لحاظ سے نا ڈالی ہیں جن کی بدولت سنہ ۱۹۴۰ء کا زمانہ عہد کہن معلوم ہوتا ہے ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے مہینوں کی ایسی تکمیل مدت میں سمٹ آئی جس کے بروئے کار آنے کے لئے صدیاں درکار ہوتیں صرف دو برس پہلے جو چیزیں احاطہ خیال سے باہر تھیں وہی آج حقائق کی شکل میں جلوہ گر ہیں۔

تالیفی رپر کی صنعت میں ترقی دنیا بھر میں خام دہر کی پیداوار کو ترقی دینے میں تقریباً ایک صدی سے زیادہ مدت لگی

ہے، اسے باہر کی طرف نکال پھینکتی ہے اور اس عظیم الشان دباؤ پر قابو پالتی ہے کنواں میل دو میل کھرا ہو کر پانی سے بھر جاتا ہے۔ اس وقت کوئی کنوئیں کے غلاف میں کھس جاتی ہے اور بعض اوقات لوہے اور سیمنٹ کی پرتوں کو بھی اپنے دائرہ اثر میں لے لیتی ہے۔

جب کافی سوراخ کنوئیں کے خول میں بندوق سے بن چکتے ہیں تو بندوق اوپر کھینچ لی جاتی ہے اور تیل بہہ نکلتا ہے۔ جب یہ پرتیں کام آچکتی ہیں تو ان کے اوپر کنوئیں میں ایک ڈاٹ لگا دی جاتی ہے۔ اگر ایسا نہ ہو تو اوپر کی پرت میں سوراخ کرنے کی صورت میں تیل بجائے اوپر جڑھنے کے نیچے بہنے لگے۔ ڈاٹ لگانے وقت بھی دھماکا اشیاء سے مدد لی جاتی ہے۔

”ہیلیم برار بندوقیں“

بندوقوں سے جس طرح تیل نکالا جاتا ہے اسی طرح ہیلیم کیس بھی بندوقوں کی مدد سے فوجی و بحری جھوٹے ہوائی جہازوں میں بھری جاتی ہے۔ اس کے علاوہ بندوقوں سے ادویہ اور صنعت کے سلسلے میں اور بہت سے کام لائے جاتے ہیں مثلاً بعض خاص بندوقیں ان خوفناک اور مہیب اعطاف (bends) کو دور کرتی ہیں جو پانی کے اندر کام کرنے والوں اور غوطہ زنون کو متاثر کرتے ہیں۔ ہیلیم کے بڑے عالمی سرچشمے ٹیکساس کے کیسوں کے کنوین ہیں۔ صنعتی بندوق کا ایک اور نمونہ وہ ہے جسے دھماکا رو شکن (Explosive circuit breaker)

قدیم وسائل سے نئی دولت کا حصول

میگنیشیم وزن کے اعتبار سے ایلومینیم کے مقابلے میں تقریباً (۶۰) فیصدی ہے اور لوہے کے وزن کا تقریباً ۱/۲ وزن رکھتی ہے۔ سنہ ۱۹۱۵ء میں اس کی قیمت ۵ شلنگ فی پونڈ تھی اور چند سال قبل تک اسے ایک مصنوعی حیرت خیز چیز کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ آج کل یہی شے مربع فٹ سے فاپ کر ساڑھے بائیس سنٹ (سنٹ ۱/۲ ڈالر) فی پونڈ کے حساب سے فروخت ہوتی ہے اور ایلومینیم سے زیادہ ارزاں ہے جو (۱۵) سینٹ فی پونڈ کے حساب سے بکتی ہے۔ اوسطاً نصف ٹن میگنیشیم امریکہ کے ہراکو ہوائی جہاز کی تیاری میں کام آنے کے لئے چلا جاتا ہے۔ جنگ کے بعد صنعتی دھاتوں میں اس سب سے زیادہ ہائی دھات کی پیداوار و ساخت کی قابلیت قوم میں ایلومینیم کی مقدار پیداوار سنہ ۱۹۳۹ء کی دوکئی سے زیادہ ہوئی۔

ہوائی جہاز کے علاوہ میگنیشیم کی جو غالب مقدار صنعتی اغراض میں کارآمد ہے اس کا ماخذ بھی اتنا ہی اہم ہے۔ تاریخ میں پہلی مرتبہ ایک صنعتی دھات کیمیائی ترکیبوں سے سمندر سے حاصل کی جا رہی ہے۔ بڑے بڑے زبردست پمپ پیچیدہ ساخت کے آلات سے روزانہ (۳۰۰۰۰۰۰۰۰۰) ٹیس کروڑ کین پانی سمندر سے نکالنے میں مصروف ہیں۔ مردست میگنیشیم اور برومان ہی ایسے مادے ہیں جو شتابکاری سے سمندر سے نکالے جا رہے ہیں۔

جب کہیں اس کی مقدار پیداوار سالانہ دس لاکھ ٹن تک پہنچی۔ اب ممالک متحدہ امریکہ دو سال سے کم مدت میں اتنا ہی ٹن اکارناہہ پٹرولیم، الکحل، کوئلے اور چونے سنگریزوں سے کیمیاوی برتیا کر کے انجام دے رہے ہیں۔ اسی طرح ایلومینیم کی پیداوار کا حال ہے۔ ممالک متحدہ میں جتنی مقدار میں ایلومینیم ۱۹۳۹ء میں پچاس سال کی سخت تدریجی ترقی کے بعد پیدا ہوئی تھی ۱۹۴۳ء کے آخر میں اس کی مقدار سات گنی زیادہ ہو جائیگی۔ اسکے ساتھ جب سائنسی طریقے اور تدبیریں سمندر کے نمکین پانی اور دوسرے وسائل و ماخذ کے متعلق عالم آشکار ہونگی تو میگنیشیم جتنی مقدار میں ۱۹۳۹ء میں برآمد ہونی نہیں کم از کم اس سے سو گنی زیادہ حاصل ہو سکے گی۔ ۱۹۳۹ء میں میگنیشیم کی صنعت (۲۴) سال کی عمر پا چکی تھی اور اب صرف (۴) سال کے اندر اسکی پیداوار میں اتنا عظیم الشان اور حیرت انگیز اضافہ ہوگا۔

اب کی دنیا جب اس جنگ کے بھنور سے نکلے گی تو اس کا دامن پلاسٹک (ملائم شکل پذیر مادہ)، تالیفی سوت، نائٹریس، ہائڈروکاربن، ہائی آکسین کیسولین اور حقیقتاً بیسیوں دوسری کیمیائی اشیاء اور خام مواد کی پیداوار سے مالا مال ہوگا اور یہ سب چیزیں اتنے وسیع اور بہتر پیمانے پر اسکے پاس موجود ہونگی کہ صرف دو سال قبل ان کا تصور کرنا دشوار تھا۔

ہے۔ کوشش جاری ہے کہ اس کے تحفظ کے متعلق کوئی مناسب حل دریافت ہو جائے۔

موٹر کے ایندھن کا ارتقا

پٹرولیم پر بھی ہر حیثیت سے نظر رکھتے اس کا ارتقا بھی کہیں سے کہیں پہنچ جائے گا۔ چند سال پہلے لوگوں کو یقین تھا کہ موٹر کے ایندھن کی انتہائی حد طاقت میں کیسولین سے ملتی جلتی ایسی شے کی ایجاد ہوگی جو اپنی شور بند (Antiknock) خصوصیت و قوت میں خاص آئسو آکٹین (Iso-octane) کی نظیر ہو۔ آئسو آکٹین ان اعتبارات میں اتنا بڑھا ہوا ہے کہ اس کے لئے ہنگامی طور پر آکٹین نمبر (۱۰۰) کا نشان مختص کر دیا گیا جو کیسولین کے ارتقا کے لئے معیار قرار پایا۔

شاہی ہوائیہ نے (رائل ایر فورس) جو انگلستان کو بچانے کے لئے شدید حالات کا مقابلہ کرتے ہوئے ماہ بماء اپنی قوت میں اضافہ کیا وہ بھی دراصل بہتر ایندھن پیدا کرنے کے لئے کیمیا دان کی جدوجہد کا مظاہرہ ہے جس کی بدولت وہ ہوائی جہازوں کو زمانہ سابق کے مقابلے میں کم سے کم وقت میں تیز سے تیز رفتار سے طویل سے طویل مسافتی حلقوں میں پرواز کے قابل بنادے گا۔ سچ بوجھتے تو برطانیہ کی جنگ اس لحاظ سے ایک آزمائشی معاملہ بن گئی ہے جس میں ایک قوم کی صلاحیتیں اور جانیں اپنا دم خم دکھا رہی ہیں۔

اس برطانوی اور امریکی معاملہ میں جو کام ایک غیر معمولی تجربے کی حیثیت سے انجام

لیکن ظن غالب اور پورے امکان کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ جتنے عناصر زمین پر پائے جاتے ہیں ان میں سے ہر ایک عنصر کے آثار سمندر میں موجود ہیں۔ کیا عنقریب افسانوں کے تخیلات سے زیادہ والا اور جدید کیمیا کا میدان تیار ہونے والا ہے؟ توقعات کچھ ایسی ہی ہیں گو اب تک پورے یقین کے ساتھ اس کا جواب نہیں دیا جاسکتا۔

ادھر فولاد بھی اپنی نوبت پر دعوت مقابلہ دے رہا ہے۔ ادنیٰ قسم کی بھرت کا فولاد اور اعلیٰ قسم کی بھرت کا فولاد حال ہی میں معامل سے تازہ دم نکلا ہے اور پرواز کے کاموں میں یا جہاں بھی ہلکا پن اور مضبوطی ناگزیر طور پر درکار ہو اس کا استعمال روز افزوں ہے۔ آج کل ماهر کاریگروں کی باوثوق رائے کے مطابق دیو پیکر ہوائی جہازوں کا ذکر بہت آتا ہے جن میں زیادہ تر فولاد ہی کا دخل ہے۔ یہ نئے بھرت وزن میں ایلومینیم سے تین گنے اور میگنیشیم سے تقریباً پانچ گنے ہیں لیکن ان کی کھینچنے والی قوت مربع انچ میں (۱۹,۰۰۰) پونڈ کے لگ بھگ ہے۔ یہ خوبی حجم کو کھٹا کر اور غیر ضروری سہارے دور کر کے وزن کے کم ہونے کا موقع ہم پہنچاتی ہے۔

فولاد کے کیمیا دان کہتے ہیں کہ جیسے جیسے آئندہ ہوائی جہاز تعداد میں بڑھینگے نئے فولادی مرکبات کے استعمال کا رجحان ترقی کرتا جائے گا۔ ان مرکبات میں معمولی لوہے سے کم زنگ لگتا ہے، مگر گنے کا مادہ ایلومینیم سے زیادہ

استر، (Esters = الکحل اور ترشے کے اتحاد سے بنا ہوا مرکب) ترشے، محلات، خوشبوئیات، دوا سازی کے مواد اور ہر نمونے کے عضوی تالیفی مرکبات حاصل کئے جاسکتے ہیں۔ وہ عمل انگیز (Catalytic) (شقاقی) (Cracking) طریقہ عمل جن کو حال حال میں عمل پذیر ہی کے اعلیٰ درجہ پر پہونچایا گیا ہے۔ آج کل اسی منزل کی رہنمائی کر رہی ہیں اور پٹرولیمی کیمیا کو اس احاطے میں لپج رہی ہیں جو کبھی کولتاری کیمیا کے لئے مخصوص تھا۔

یہ تکمیل مرحلہ جسے سنہ ۱۹۳۹ء میں طے کرنے کی سعی جاری تھی اور جس کی حدود میں جنگی ضرورتوں نے عظیم الشان وسعت پیدا کر دی ہے موجودہ و مروجہ خیالات کی دسترس سے باہر ہے۔ تالیفی ربر جیسا کہ ہر

کیمیا داں واقف ہے ایک سرے سے ربر ہے ہی نہیں بلکہ ایک وسیع تر اور زیادہ اہمہ افزا کام آنے والا نیا کیمیاوی مرکب ہے جو ہیواڈین (Butadiene) اور اسٹیرین (Styrene) نامی مادوں سے حاصل کیا جا رہا ہے اور خود یہ مادے وہ ہیں جنہوں نے پٹرولیم سے تالیف پائی ہے۔ ٹولوین (Toluene) ٹولو اور تارکول (کامرب) جو نہایت اہم تیلے اعلیٰ دھماکو مادوں میں سے ایک کی اساس کی حیثیت سے بہت مشہور ہے اور ساتھ ہی کیمیا رنگ سازی اور بہت سی دوسری صنعتوں کا بھی نہایت ضروری جزو ہے آج کل پٹرولیم ہی کی پیداوار ہے۔

ہا چکا ہے اس نے موٹر کے ایندھن کی صنعت میں ایسی سرین اور فوری تبدیلیاں پیدا کی ہیں جن کی صدا صلح ہو جانے کے بعد بھی ایک مدت تک فضا میں گونجتی رہے گی۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ یہ ایندھن اب آکٹینی معیار سے بھی آکر بڑھ سکتا ہے۔ ان کے تخمینہ کردہ آکٹینی نشانات (۱۱۰) یا (۱۱۵) بلکہ اس سے بھی متجاوز ہیں۔ آکٹین ایندھن نمبر ۱۰۰ سے جتنی طاقت حاصل ہوسکتی ہے اس سے ڈیوڑھی ان سے حاصل ہوا کر یکی۔ جنگ کے بعد کے حالات کی جو علامات نمایاں ہیں ان پر نظر کرتے ہوئے پٹرولیم کا ماحر کیمیا آج کل کی موٹروں کو نکلی اور دقیاؤسی خیال کرتا ہے۔ اس کے نزدیک موٹر کے ایندھن میں جو کون کون جدتیں اور اصلاحیں ہوں گی موجودہ موٹروں میں ان کی گنجائش نہ ہوگی۔

تیل کے پیپے کی کرامات

اب پٹرولیم کی کیمیا کے ایک اور پہلو پر نظر کیجئے۔ تیل کے پیپے میں یوں تو معمولی سے تیل کے سوا کچھ نہیں لیکن غور کیجئے تو یہی پیپہ بلا مبالغہ ہزاروں کیمیاوی مرکبات کا خزانہ ہے۔ کیمیا داں مدت سے اس تیل کی ان صفات پر فریفتہ ہے اور اسے اس کا امکان نظر آتا ہے کہ سورج کے نیچے قریب قریب ہر چیز، ہائیڈروجن اور کاربن کے کیمیاوی سنگ تعمیر سے بنائی جاسکتی ہے۔ وہ محسوس کرتا ہے کہ مناسب ترکیب سے صرف آکسیجن اور دوسرے عناصر شامل کر کے تیل سے الکحل

تول سکتے ہیں۔ اس کی نمائش چند روز قبل ناپٹاؤن کے امریکی وفاق میں کی گئی تھی۔ اس آلہ کا خیال امریکہ کی ایک ناپٹا عورت ایویلی وائسن کو آیا تھا۔ اس کے اندر یہ خوبی دکھائی گئی ہے کہ اس کو تولنے کی ہر مشین میں لگایا جاسکتا ہے اور یہ مختلف وزن پر ایک علیحدہ آواز دیتا ہے۔ توقع ہے کہ اس آلے کی تکمیل کی بدولت جنگی صنعتوں کے بہت سے ابواب اندھوں کے لئے کھل جائیں گے۔

نیوگنڈی میں پہاڑی بونوں کا انکشاف

نیوگنڈی کے علاقے میں پہاڑی بونوں کے ایک عجیب قبیلے کا پتہ لگا ہے۔ یہ لوگ پہاڑی باغوں کی دکھوالی سے گزر بسر کرتے ہیں اور درختوں کی چھال سے تن ڈھانکتے ہیں۔ ان میں سے سب سے بڑے قد کا آدمی (۳۸) انچ سے کچھ اوپر ہے۔ زیادہ تعداد ایسے ہی لوگوں کی ہے جن کے قد (۳۶) انچ یا اس سے بھی کم ہیں۔

ان علاقوں میں بونوں کے متعلق گزشتہ زبانوں میں بھی خبریں کشت کر رہی ہیں مگر ان کے موجود ہونے کی یہ پہلی تصدیق ہے جو آسٹریلیا کے سپاہیوں کی بدولت حاصل ہوئی ہے۔ (م-م-ز)

پٹرولیم کا ماہر کیمیا تقریباً ساوی سہولت کے ساتھ ایک طرف ہیں ایتھیلین (Ethylene = الکحل کی ایک قسم) دے سکتا ہے، دوسری طرف بئرن۔ ساتھ ہی انہیں فاپ تول سے روزانہ سیکڑوں ٹن کی مقدار میں فراہم کر سکتا ہے۔ اس کارنامے کی مثال ایسی ہے جیسے ایک ہی پیسے یا خم سے شراب بھی نکالی جائے اور پانی بھی یا ایک ہی جانور سے گائے کا گوشت بھی برآمد کیا جائے اور سور کا بھی۔ بالکل یہی صورت ایتھیلین اور بئرن کی ہے جو بالکل کیمیاخانوادوں کے رکن ہیں باوجود اس کے کہ پٹرولیم سے دونوں حاصل ہوتے ہیں۔ عملی حیثیت سے دیکھتے تو ان سے بالکل مختلف کام لئے جاتے ہیں جیسے اسٹیرین پلاسٹک کی ساخت یا تالیفی ربر کے دونوں نمونے جو بنا (Buna) اور تھکول (Thickol) کہلاتے ہیں، دوائیں، رنگ اور نیلون (Nylon) کی تیاری۔

اندھوں کے لئے وزن کرنے کا آلہ

حال ہی میں ایک نیا آلہ ایجاد ہوا ہے جسے پیمانہ سماعت (Audio-scale) کہتے ہیں۔ یہ آلہ آواز کی مدد سے اندھوں کو اس قابل بنا دیتا ہے کہ وہ جھوٹی چیزیں بھی صحیح طریقے سے



سائنس کی دنیا

ہندوستان میں جیپسم کے ذخیرے

جیپسم کیلیم کا آئیدہ سلفیٹ $(CaSO_4, 2H_2O)$ ہے۔ یہ قدرت میں مختلف شکلوں میں پایا جاتا ہے مثلاً الیاسٹر جیپسم کے سفید باریک ذرات پر مشتمل ہوتا ہے سلینائٹ جیپسم کی قلمی شکل ہے اور دو سائز سپار، رشہ دار قسم ہے۔ جیپسم میں سختی نہیں ہوتی۔ ناخن سے اس پر خراش پڑہ جانا ہے تاہم یہ بلفم سے زیادہ سخت ہے یہ پانی سے $\frac{1}{2}$ گنا بھاری ہے۔ جیپسم پیرمی پلستر کی تیاری میں کام آتا ہے۔ جو نیم آبی کیلیم سلفیٹ $(CaSO_4, \frac{1}{2} H_2O)$ ہے جیپسم کو معتدل حرارت دے کر اس کا تین چوتھائی پانی خارج کرنے پر پلستر باقی رہتا ہے۔ اس میں پانی ملائے سے یہ آہستہ آہستہ سخت ہو جاتا ہے۔ ہستکی کے دوران میں حجم میں بھی تھوڑا سا پھیلتا ہے۔ اسی خاصیت کی بنا پر پیرمی پلستر کو سانچے بنانے میں اور تعمیرات میں دیوار کی استرکاری وغیرہ میں استعمال کرتے ہیں۔ پلستر کی تیاری کے علاوہ جیپسم سمٹ بنانے میں، ٹین

پلیٹ پر بالٹ کرنے اور بعض وقت زراعت میں کھاد کے طور پر بھی کام آتا ہے۔ نیز کاغذ، پنسل، پینٹ اور ربڑ کی صنعتوں میں بھی اس سے کام لیا جاتا ہے۔ بڑی خوشی کی بات ہے کہ ہندوستان میں جیپسم کے ذخیرے وسیع طور پر پائے جاتے ہیں۔ ان میں سے اہم حسب ذیل مقامات پر ملتے ہیں۔

- (۱) بلوچستان
- (۲) بھوٹان
- (۳) بمبئی
- (۴) وسط ہند
- (۵) مدراس
- (۶) صوبہ سرحد
- (۷) پنجاب
- (۸) راجپوتانہ
- (۹) سندھ
- (۱۰) صوبجات متحدہ

سنہ ۱۹۳۸ء میں ہندوستان میں مجموعی طور پر ۶۹۸۲۳ ٹن جیپسم نکالا گیا اور مختلف اغراض کے لئے استعمال کیا گیا۔ دوران جنگ کے صحیح اعداد ابھی تک شائع نہیں ہوئے۔

ہندوستان میں تیل کے بیجوں کی پیداوار اور ان سے استفادہ

ہندوستان کی زرعی دولت کا ایک بڑا حصہ تیل کے بیجوں پر مشتمل ہے۔ اندازہ ہے کہ ۳ ارب ایکڑ کے مجموعی زیر کاشت رقبہ میں سے ۲۵ فیصد زمین پر تیل کے بیجوں کی کاشت کی جاتی ہے۔ علاوہ ازیں ۹۰ کروڑ ایکڑ کے جنگلات سے بھی بعض اہم تیل یا بیج حاصل ہوتے ہیں۔ ذیل میں بکثرت اکٹے والے تیل کے بیجوں کا زیر کاشت رقبہ اور سالانہ پیداوار درج کی جاتی ہے۔

سنہ ۱۹۳۸ ع کے اعداد سے ظاہر ہے کہ ہندوستان کی مجموعی پیداوار کا ۹۸٪ حصہ حسب ذیل چار اہم مراکز سے حاصل ہوا۔ ضلع جھلم (پنجاب) ۰۰۰٪، ریسات پیکانیر (راجپوتانہ) ۲۸۰۶٪، ریاست جودھپور (راجپوتانہ) ۱۵۰۰٪، ضلع ترچناہلی (مدراس) ۱۳۰۴٪۔ ہندوستان میں جیسم کی پیداوار کو تاسانی بڑھایا جاسکتا ہے اور اس کی کھیت میں کوئی دقت نہ ہوگی۔ کیونکہ آرٹ اسکولوں میں بیسی بلسٹر کی طلب بڑھ گئی ہے نیز سمٹ کی صنعت بھی توسیع پا رہی ہے۔ زراعت کی ترقی کے ساتھ جیسم کا استعمال کھاد کے طور پر بڑھتا جائیگا علاوہ ازیں جیسم سے کدک بھی تیار کی جاسکتی ہے۔

بیج کی قسم	زیر کاشت رقبہ	سالانہ پیداوار
۱۔ بنہ	۲ کروڑ ۵۰ لاکھ ایکڑ	۲۰ لاکھ ٹن
۲۔ مونگ پھلی	۱ کروڑ	۳۳
۳۔ رائی	۵۰ لاکھ	۱۰
۴۔ المی	۵۰ لاکھ	۵
۵۔ کننگلی	۵۰ لاکھ	۶
۶۔ ارندھی	۲۰ لاکھ	۲
۷۔ کھوپرا	۱۴ لاکھ	۱۴
۸۔ خشخاش	۵ لاکھ	۲

ریڈ آئیل (۳) جلانے کے تیل مع موم بتیان۔
گلسرین اور دھماکو اشیاء - (۵) پینٹ، وارنش،
اور پلاسٹکس اور ر بڑ کے قائم مقام۔
(۶) جوتوں اور چڑوں کے صاف کرنے اور
پالش کرنے میں۔ (۷) سادہ اور مرکب چمکانے
والے تیل۔ (۸) لن اولیم اور آب روک کپڑے،
(۹) طبی تیل اور ادویاتی آمیزے۔ (۱۰) مختلف
قسم کے ہلکے کیمیائی اشیاء مع تالیفی خوشبوئیات
کے۔

تیلوں کے استعمال کے متعلق جو سائنسی
معلومات ہیں اس کے مقابلہ میں کھلی کے متعلق
نہایت سطحی معلومات ہیں۔ تیل کے مقابلہ میں
اس کی کھلی صناعی اور سائنسی اہمیت میں کم نہیں
ہے۔ بلکہ بعض صورتوں میں خوردنی اشیاء
موشیوں کے چارے اور کھاد کے طور پر ان
کی اہمیت بڑھ جاتی ہے۔ علاوہ ازیں کھلیوں سے
دھنی اشیاء، گلوکوسائیڈز، الکلائڈز، اور
بیروزیے جو دواؤں اور مصنی اشیاء کے طور
پر کام آتے ہیں حاصل کئے جاسکتے ہیں اور
لطف یہ کہ ان اشیاء کے نکالنے کے بعد کھلیوں
میں پروٹیز، کاربوہائیڈریٹس اور معدنی اجزاء
کی کمی واقع نہیں ہوتی۔ اس لئے کھلی پر باقاعدہ
سائنسی تحقیقات ضروری ہیں۔

بیجوں کے خول اور بھوسہ کے متعلق علمی
معلومات کا بالکل فقدان ہے۔ اور خیال ہے
کہ اس سے فنولز، فرفرال ڈی ہائیڈ
وغیرہ کی سی قیمتی اشیاء حاصل ہو سکتی ہیں
جو تالیفی پلاسٹکس کی تیاری میں بے حد ضروری
ہیں۔ علاوہ ازیں خول اور بھوسہ سے پوٹاش

علاوہ ازیں عصار، کک، چل ہوگرا،
نیم، ریٹا، کاجو، کسم، حشیش وغیرہ بھی کم مقداروں
میں پیدا ہوتے ہیں اور صناعی اہمیت رکھتے ہیں۔
ان تمام ذرائع سے مجموعی پیداوار ایک
کروڑ ٹن قرار دی جاسکتی ہے جس کی قیمت
تقریباً ایک ارب روپیہ ہوتی ہے۔ لیکن افسوس
کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ان بیجوں سے خاطر
خواہ فائدہ نہیں اٹھایا جا رہا ہے۔

تیل کے بیجوں سے خاطر خواہ استفادہ کے
لئے اس کے تینوں حصوں کا استعمال ضروری
ہے یعنی (۱) بیرونی خول اور بھوسہ۔ (۲) بیج
سے حاصل ہونے والے تیل۔ (۳) کھلی۔ ان اجزاء
میں سے صرف تیلوں کے باقاعدہ استعمال اور
فروخت کا انتظام ہے۔ دیگر اجزاء سے استفادہ
کی باقاعدہ کوشش نہیں کی گئی۔

اس ضمن میں یہ بتانا بے عمل نہ ہوگا کہ اب
تک ہندوستان میں ایک ہزار قسم کے مختلف
بیجوں کے بودوں کی جن کا تعلق ۱۲۵ گروہوں
سے ہے باقاعدہ تشریح کی گئی اور ان کے اندر
پائے جانے والے مرکبات کا امتحان اور ان سے
نکالنے والے تیلوں کے خواص کا مطالعہ کیا گیا
یہ دیکھا گیا کہ گروہ کے بودوں کے اندرونی مرکبات
اور تیلوں میں کافی مشابہت پائی جاتی ہے۔ تیلوں
کے نکالنے کے مختلف طریقوں اور مختلف صنعتوں
میں استعمال کے لئے تیلوں پر جو عمل کرنے پڑتے
ہیں ان کا ذکر ہاں غیر ضروری ہے۔ البتہ یہ
بتایا جاسکتا ہے کہ ان کا صناعی استعمال حسب ذیل
طریقوں پر ہو سکتا ہے۔ (۱) خوردنی تیل اور
نباتی گھی۔ (۲) مختلف قسم کے صابن مع رکی

قیام میں حصہ لیا۔ اس سرورس کا قیام اور تنظیم غالباً پروفیسر ڈنیکلف کا سب سے بڑا کارنامہ ہے۔

اپنی ملازمت کے ابتدائی زمانہ میں پروفیسر ڈنیکلف نے اس ضرورت کو شدت سے محسوس کر لیا کہ ہندوستان میں کیمیکل پروفیشن (کیمیائی پیشہ) کی تنظیم ہونی چاہئے اور اسے مستقل بنیادوں پر قائم ہونا چاہئے۔ سنہ ۱۹۱۸ء میں انہیں ہندوستانی اسامعہ کے بورڈ کے تحت کارڈائٹ فیکٹری (اروون کڈو) میں ورکس کیسٹ مقرر کیا گیا جب یہاں سے وہ سنہ ۱۹۲۱ء میں سبکدوش ہوئے تو ان کو لیوریٹری کے فاضل کی حیثیت حاصل تھی۔ اور انہوں نے اپنی مخصوص قابلیت سے کئی ایک کیمیائی تحقیقات انجام دیں جو اسامعہ کے نقطہ نظر سے بڑی اہم تھیں۔ حکومت ہند کے ایٹا پر پروفیسر و صوف نے سنہ ۱۹۲۸ء میں ہندوستان اور برما کی بڑی بندرگاہوں پر آزمائشی تجربہ خانوں (ٹسٹنگ لیوڈریز) کی ایک وسیع اسکیم بنائی۔ لیکن سنہ ۱۹۲۹ء میں خود اپنی اصلی خدمت پر (گورنمنٹ کالج لاہور) واپس ہو گئے۔ یہاں حکومت پنجاب کی منظوری سے گورنمنٹ کالج لاہور میں سنٹرل بورڈ آف زیونیو کا کیمیائی تجربہ خانہ میں قائم کر لیا۔ اس تجربہ خانہ مالیاتی کیمیا (زیونیو کیمسٹری) کا پورا کام انجام پاتا رہا اور بہت جلد اس میں توجہ ضروری ہو گئی۔ جس کی وجہ سے اسے ایک علیحدہ ادارہ کی حیثیت دینا ضروری ہو گیا۔ پروفیسر ڈنیکلف کی تحریک پر سنہ ۱۹۳۷ء میں سنٹرل زیونیوز کیمیکل

اور فاسفٹس بھی حاصل ہو سکتے ہیں جو قیمتی اشیاء ہیں۔ فی الحال بیجوں کے خول اور ہوسے کو جلانے میں یا کبھی کبھی مویشیوں کے چارے میں استعمال کیا جاتا ہے۔

مندرجہ بالا تفصیل سے واضح ہے کہ ہندوستان میں تیل کے بیجوں سے جو اس وقت صرف ایک ارب روپیے کی لاگت رکھتے ہیں سائنسی تحقیقات اور صنعتی استفادہ سے کم از کم پانچ ارب روپیہ آسانی حاصل کیا جاسکتا ہے۔

پروفیسر ایچ۔ بی۔ ڈنیکلف

یہ خبر افسوس سے سنی جائیگی کہ پروفیسر ڈنیکلف سنٹرل زیونیوز کیمیکل لیوریٹری کی چیف کیمسٹ کی خدمت سے بہت جلد سبکدوش ہو جائینگے۔ پروفیسر وریس برٹ ڈنیکلف کو گذشتہ تیس سال سے ہندوستان کے کیمیا دانوں میں ایک ممتاز درجہ حاصل رہا۔ لندن اور کیمبرج میں ممتاز جامعی زندگی گزارنے کے بعد آپ سنہ ۱۹۰۸ء میں ہندوستان آ گئے اور ایم۔ اے او۔ کالج (علی گڑھ) میں پروفیسر سائنس بن گئے سنہ ۱۹۱۳ء میں انہیں انڈین ایجوکیشنل سرورس کا رکن بنایا گیا۔ اور خالصہ کالج (امرتسر) میں پروفیسر کیمیا مقرر کیا گیا۔ سنہ ۱۹۱۷ء میں ان کی خدمات گورنمنٹ کالج لاہور منتقل کر دی گئیں جہاں یہ کچھ عرصہ تک پرنسپل بھی رہے۔ لاہور میں پروفیسر ڈنیکلف نے نہ صرف غیر نامیاتی اور تشریحی کیمیا میں تحقیقات کیں بلکہ ہندوستان کے لئے سنٹرل زیونیوز سرورس کے

(حیاتین الف) کی کمی سے ملیریا کے لئے حساسیت بڑھ جاتی ہے اور اس حیاتین کی مناسب مقدار ملیریا کے لئے مزاحمت بڑھا دیتی ہے۔ راک فیلر انسٹیٹوٹ کی طبی تحقیقات کے پرنسپل اسٹیشن ریڈاکٹر ولیم ٹریگر (W. Trager) نے مرغوں اور بطون پر تجربے کر کے متذکرہ نتیجہ اخذ کیا۔

اس انکشاف سے اب یہ راز پہلی دفعہ کھل گیا کہ بعض اشخاص کیوں ملیریا کے لئے زیادہ حساس ہوتے ہیں اور یہ بات بھی معلوم ہو گئی کہ ایک خاص حیاتین ایک خاص مرض سے بہت اہم تعلق رکھتا ہے۔ اس امر کی اہمیت اس واقعہ کے لئے نظر بہت بڑھ جاتی ہے کہ زیر بحث مرض دنیا کے لاکھوں انسانوں کی تکلیف اور موت کا باعث ہے۔ اس سے ملیریا کی روک تھام کے لئے ہمارے ہاتھ ایک نیا حربہ آجاتا ہے۔ کیونکہ بی اوٹین انڈے کے چھانکوں، جگر، دودھ وغیرہ میں پایا جاتا ہے جس سے ظاہر ہے کہ تغذیہ کی کمی اور متعدی بیماری کے لئے حساسیت میں خاص تعلق پایا جاتا ہے

کئی امراض کی دوا

آکسفورڈ کے پروفیسر اور مسز فلوری (Florey) نے رسالہ لانسٹ (Lancet) کی حالیہ اشاعت میں ایک نئی دوا پر وسیع تجربات کے نتائج بیان کیے ہیں۔ یہ دوا ”پنی سی لین“ (Penicillin) کہلاتی ہے اور توقع ہے کہ تاریخ طب میں یہ دور آفرین ثابت ہوگی۔ ”پنی سی لین“

مرویس کا قیام عمل میں آیا اور کلکتہ، بمبئی، مدراس، غازی پور، سامبر، اور دہلی میں تجربے خانے قائم کر دے گئے جن میں ۱۴ اعلیٰ عہدہ دار اور کئی ایک ماتحتین کیکل سرویس میں کام کرنے لگے۔ سنٹرل ریونیوز کیکل لیورڈی کا قیام سنہ ۱۹۳۹ ع میں ہوا اور پروفیسر ڈنیکلف اس کے چیف کیمسٹ بن گئے۔ پروفیسر ڈنیکلف کا نام ہمیشہ سنٹرل ریونیوز سرویس اور لیورڈی کے بانی اور تنظیم کنندہ کے طور ادب اور احترام سے یاد کیا جائے گا۔

پروفیسر ڈنیکلف نے غیر نامیاتی اور تشریحی کیمیا میں کئی ایک تحقیقی مقالے شائع کئے۔ انہوں نے حال میں کی ٹمک صنعت (سانٹ انڈسٹری) کے ضمنی حاصلوں پر جو تحقیقات کیں اسے ساری دنیا میں پسند کیا گیا۔ سنہ ۱۹۳۹ ع میں مرکزی حکومت اور پنجاب کے لئے ان کی خدمات کے صلہ میں سی۔ آئی۔ ای کا اعزاز عطا کیا گیا۔ بورڈ آف سائنٹفک اینڈ انڈسٹریل ریسرچ میں یہ قدرتی طور پر پائے جانے والے ٹمکوں کی کئی کے صدر ہیں اور حکومت ہند کے ادویہ کے مشاورتی بورڈ اور ادویہ کی رسد کی کئی کے رکن ہیں۔ ہماری دعا ہے کہ پروفیسر موصوف خدمت سے علیحدگی کے بعد ایک طویل اور پرسرگ زندگی بسر کریں۔

ملیریا اور بی اوٹین

رسالہ سائنس (امریکا) کی حالیہ اشاعت میں اس امر کا انکشاف کیا گیا کہ بی اوٹین

دوا و ام کے لئے قابل حصول نہیں۔ اس کی تھوڑی سی مقدار تیار کرنے میں طویل اور صبر آزما عملوں کی ضرورت ہے۔ لیکن توقع ہے کہ تحقیقات سے اس دقت پر قابو پایا جائے گا اور اس کی تالیف کے آسان طریقے ایجاد کئے جائیں گے۔

(ض۔ م)

سلفان ایمائیڈ دواؤں اور سلفاتھا ئیوزول کے مقابلہ میں سیکڑوں گنا طاقت ور ہے اور یہ نفعی بخار (منجائی ٹس)، سمیت خون (سپی میمیا) وغیرہ کا موثر علاج ہے حالانکہ سلفان ایمائیڈ دواؤں ان امراض میں بے کار ثابت ہوئیں۔

اس دوا کو کھا سکتے ہیں اور جسم کے متضرر حصوں پر لگا سکتے ہیں۔ لیکن ابھی یہ



آسمان کی سیر

جون سنہ ۱۹۴۳ء

۲۲ - جون سنہ ۱۹۴۳ء کو سورج برج سرطان میں داخل ہوگا۔
 عطارد صبح کا ستارہ ہے بتاریخ ۴ - جون ۴۳ء عطارد ساکن ہوگا اور اس کی اعظم تابین ۲۳۰° بجانب غرب بتاریخ ۱۸ جون واقع ہوگی۔ وہ ۳۰ - جون کو زحل کے ساتھ قریبی اقتران میں ہوگا۔
 زہرہ شام کا ستارہ ہے۔ اور جون ۲۸ ۴۳ء کو اس کی اعظم تابین ۵۰° بجانب مشرق واقع ہوگی۔
 واقع ہوگی۔
 مریخ صبح کا ستارہ ہے۔
 مشتری شام کا ستارہ ہے۔
 زحل ۷ جون کو سورج کے ساتھ اقتران میں ہوگا۔ یہ مہینے کے آخری دنوں میں صبح کا ستارہ ہو جائیگا۔
 (رصد گاہ نظامیہ)

فرہنگ اصطلاحات

جلد اول	اصطلاحات کیمیا	قیمت ایک روپیہ سکھ انگریزی
جلد دوم	معاشیات	” ایک روپیہ ”
جلد سوم	طبیعیات	” ایک روپیہ ”
ان فرہنگوں میں کیمیا، معاشیات اور طبیعیات کی تمام ضروری اصطلاحات آگئی ہیں۔ مترجموں کے لئے یہ فرہنگیں بہت کار آمد ہیں		
المشتر		

انجمن ترقی اردو (ہند)، دریا گنج دہلی

رسالہ سائنس میں اشتہار دیکر اپنی تجارت کو ترقی دیجئے

اطلاع

جملہ خریدار صاحبان کو اطلاع دیجاتی ہے کہ براہ کرم بوقت خط و کتابت
نشان خریداری کا حوالہ ضرور دیا جائے

”ادارہ“

رسالہ سائنس میں اشتہار دیکر اپنی تجارت میں ترقی کیجئے

مضمون نگار صاحبان ! مضمون صاف اور خوش خط لکھیں

اُردو ٹائپ کا واحد مرکز

”بنیادی ٹائپ“

ہر مرقع کے طباعت کے لئے نہایت موزوں ہے

انتظامی پریس عثمان کنگ ہدر آباد دکن

تین اہم کتابیں

۱۔ سیر کائنات۔ یہ کتاب نامور سائنس دانٹ سر جیمس جینس کی مشہور و معروف کتاب (Through Space and Time) کا ترجمہ ہے جس میں زمین، ہوا، آسمان، مہتاب، آفتاب سیاروں اور ستاروں وغیرہ پر نہایت بسط و تفصیل سے بحث کی گئی ہے۔ طرز تحریر نہایت دلچسپ اور سادہ ہے۔ اور ترجمہ میں اصطلاحات سے حتی الوسع اجتناب کیا گیا ہے۔ اسلئے خواص کے علاوہ عوام بھی بغیر کسی دقت کے اس سے استفادہ کر سکتے ہیں۔ ایہو کے متعدد نقشوں اور تصویروں کے علاوہ ہاف ٹون کی ۲۷ تصویریں بھی شامل ہیں۔ جن سے کتاب کی افادی حیثیت میں غیر معمولی اضافہ ہو گیا ہے کتابت و طباعت عمدہ اور جلد مضبوط اور گرد پوش خوبصورت۔ قیمت دو روپیے آٹھ آنے۔ مکتبہ جامعہ دہلی۔

۲۔ ہم کیسے پڑھائیں - از جناب سلامت اللہ صاحب ایم۔ اے۔ بی۔ ٹی۔ معلم استاد دون کا مدرسہ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی۔ یہ کتاب ٹریننگ اور نارمل اسکولوں کے زیر تربیت اساتذہ کی ضروریات، پڑھانے کے عام طریقوں، بچوں کی نفسیات ہندوستان کے مخصوص حالات اور استادوں کی عام مشکلات کو پیش نظر رکھ کر مرتب کی گئی ہے۔ اور ان تمام اصولوں کو موزوں متناوب کے ذریعہ واضح کیا گیا ہے۔ جو عام تعلیم کے طریقوں سے متعلق ہیں۔ قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے۔

تعلیمی خطبات - یہ مجموعہ ہے ڈاکٹر ذاکر حسین خان صاحب شیخ الجامعہ کے ان خطبوں کا جو وقتاً فوقتاً ملک کی مختلف کانفرنسوں میں پڑھے گئے۔ مثلاً کانٹی وڈیا بیٹھہ، بنارس، مسلم ایجوکیشنل کانفرنس، علی گڑھ۔ طبیہ کالج پٹنہ، بنیادی قومی تعلیمی کانفرنس جامعہ نگر وغیرہ۔ ان مضامین کا جو آل انڈیا ریڈیو کے ذریعے نشر ہوئے۔ مثلاً اچھا استاد، بچوں کی تربیت، بچہ اور مدرسہ وغیرہ۔

تعلیم کے تمام نقائص و حودہ تحریکوں، جدید رجحانات اور تعالیم و تربیت کے نئے اصولوں کو معلوم کرنے کے لئے اس کتاب کا مطالعہ نہایت مفید اور از بس ضروری ہے۔ قیمت ایک روپیہ چار آنے۔

مکتبہ جامعہ دہلی، قزلباغ

شاخیں۔ دہلی، لکھنؤ، بمبئی نمبر ۳

== ہماری زبان ==

انجمن ترقی اردو ہند کا پندرہ روزہ اخبار

ہر مہینہ کی پہلی اور سولہویں تاریخ کو شائع ہوتا ہے۔

چند سالانہ ایک روپیہ، فی پرچہ ایک آنہ

المشتر

منیجر انجمن ترقی اردو (ہند) دریا کنج۔ دہلی

مہربانی فرما کر اشتہارات کے متعلق خط و کتابت میں اس رسالہ کا ضرور حوالہ دیجئے

دی ایسٹینڈرڈ انگلش اردو ڈکشنری

انگلش اردو ڈکشنریوں میں سب سے زیادہ جامع اور مکمل

- چند خصوصیات:— (۱) انگریزی کے تقریباً تازہ ترین الفاظ شامل ہیں۔
 (۲) فنی اصطلاحات درج ہیں۔
 (۳) قدیم اور متروک الفاظ بھی دئے ہیں۔
 (۴) مشکل مفہوم والے الفاظ کو مثالوں سے واضح کیا ہے۔
 (۵) انگریزی محاوروں کے لئے اردو محاورے دئے ہیں۔
 ڈمائی سائر حجم ۱۰۳۶ صفحے قیمت مجلد سولہ روپیہ

دی ایسٹونٹس انگلش اردو ڈکشنری

یہ بڑی لغت کا اختصار ہے۔ طلبہ کی ضرورت کا خاص طور پر لحاظ رکھا گیا ہے۔
 تقطیع چھوٹی، حجم ۱۳۸۱ صفحے، مجلد پانچ روپے۔

المشتر۔ منیجر انجمن ترقی اردو (ہند) دریا کنج دہلی

شہرت یافتہ

اور

یونیورسٹیوں، کالجوں اور اسکولوں میں مقبول ترین
سائنس کے آلات اور متعلقہ سامان کے ماہرین

ایچ۔ ڈبلیو احمد اینڈ سنس

سہارنپور، (یو۔ پی)

کے پاس سے

حرارت، نور، آواز، مقناطیسیت، برق، ماسکونیات سپال، مکانیات
اور ہوائیات کے علاوہ کیمیائی، طبعیاتی، تحقیقی اور شکر کے تجربہ خانوں کے
تمام سامان مل سکتے ہیں۔

نمائندہ برائے مالک محروسہ سرکار عالی حیدرآباد دکن و برار

اسٹار ایجوکیشنل سپلائی کمپنی

، پاکستان، ڈاک خانہ کاروان حیدرآباد دکن

HARGOLAL & SONS,

The Science Apparatus Workshop.

AMBALA CANTT.



We are

STILL DELIVERING THE GOODS,

- War has inevitably brought in its train, all its handicaps.
- Still ingenuity is always at work busy in facing the difficulties. Over 90% of the articles, previously imported, are now being made in our factory and with remarkable success. War has created a marvellous opportunity for producing numerous range of Scientific Instruments here in India.
- Large labour and resources, helped by zealous research, are at constant work and today *we have stood against the odds with no small success.*
- Indian Research Laboratories, Schools Colleges and the Department of War Supply, Govt. of India, are having their requirements from us at very suitable prices.

You may sometime pay a visit to our Factory and Science Museum and watch us work. You will have occasion to appreciate the quality and approve of the prices of a wide range of articles we now turn out.

SOLE AGENT :

MANIAN & SONS

875, SULTAN BAZAR, HYDERABAD DN.

اُردو

انجمن ترقی اردو (ہند) کا سہ ماہی رسالہ

(جنوری، اپریل، جولائی اور اکتوبر میں شائع ہوتا ہے)

اس میں ادب اور زبان کے ہر پہلو پر بحث کی جاتی ہے۔ تنقید اور محققانہ مضامین خاص امتیاز رکھتے ہیں۔ اردو میں جو کتابیں شائع ہوتی ہیں ان پر تبصرے اس رسالے کی ایک خصوصیت ہے۔ اس کا حجم ڈیڑھ سو صفحے یا اس سے زیادہ ہوتا ہے۔ قیمت سالانہ محصول ڈاک وغیرہ ملا کر سات روپے سکھ انگریزی (آٹھ روپے سکھ عثمانیہ)۔ نمونہ کی قیمت ایک روپیہ بارہ آنے (دو روپے سکھ عثمانیہ)۔

نرخ نامہ اجرت اشتہارات ”سائنس“

۱ ماہ	۲ ماہ	۳ ماہ	۴ ماہ	۵ ماہ	۶ ماہ	۷ ماہ	۸ ماہ	۹ ماہ	۱۰ ماہ	۱۲ ماہ
۲۰ روپے	۳۰	۴۰	۵۰	۶۰	۷۰	۸۰	۹۰	۱۰۰	۱۱۰	۱۲۰
۸/۳	۱۳	۱۸	۲۳	۲۸	۳۳	۳۸	۴۳	۴۸	۵۳	۵۸
۲	۳	۴	۵	۶	۷	۸	۹	۱۰	۱۱	۱۲
۱۲	۳۰	۴۰	۵۰	۶۰	۷۰	۸۰	۹۰	۱۰۰	۱۱۰	۱۲۰
۶	۱۸	۲۳	۲۸	۳۳	۳۸	۴۳	۴۸	۵۳	۵۸	۶۳

جو اشتہار چار بار سے کم چھپوائے جائیں گے ان کی اجرت کا ہر حال میں پیشگی وصول ہونا ضروری ہے۔ البتہ جو اشتہار چار یا چار سے زیادہ بار چھپوایا جائے گا اس کے لئے یہ رعایت ہوگی کہ مشہر نصف اجرت پیشگی بھیج سکتا ہے اور نصف چاروں اشتہار چھپ جانے کے بعد۔ معتد کو یہ حق حاصل ہوگا کہ سبب بتائے بغیر کسی اشتہار کو شریک اشاعت نہ کرے یا اگر کوئی اشتہار چھپ رہا ہو تو اس کی اشاعت ملتوی یا بند کر دے۔

۴۔ مکالمات سائنس

مولفہ۔

پروفیسر محمد نصیر احمد صاحب عثمانی
ارتقاء انسانی کی تشریح سوال
جواب کے پیراے میں۔ نہایت
دلچسپ کتاب ہے۔

قیمت مجلد دو روپیہ

۵۔ حیوانی دنیا کے عجائبات

مولفہ عبدالصبر خان صاحب

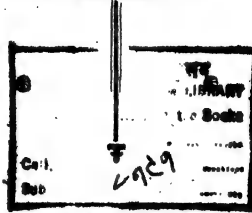
انسانی طرز کی چل کتاب ہے۔ بیشمار
چھوٹے بڑے جانوروں کے
اطوار و عادات نہایت دلچسپ
طریقے پر پیش کئے گئے ہیں۔
ایک سہ رنگی تصویر۔ متعدد
دوسری تصاویر قیمت مجلد دو
روپیہ ۶ آنے۔ بلا جلد دو روپیہ۔

۶۔ بیماری غذا

مولفہ۔ رابرٹ میکرسین مترجمہ
سید مبارز الدین احمد رفعت
اردو میں اپنی نوعیت کی چل
کتاب ہے۔ تمام غذاؤں پر تفصیل
نظر ڈالکر اس کی ماہیت، افادیت
پر بحث کی گئی ہے۔ کوئی کھرم
اس کتاب سے خالی نہ رہنا
چاہئے۔ قیمت مجلد ایک روپیہ
دس آنے بلا جلد ایک روپیہ
چار آنے۔

المشتر منیجر امین ترقی اردو (ہند)

دربار کنج دہلی



SCIENCE

The
Monthly Urdu Journal
of
SCIENCE

Published By

Anjuman-e-Taraqqi-e-Urdu (India)

DELHI



Printed at

The Intizami Press, Hyderabad-Deccan

سائنس کی چند
نادر کتابیں

۱۔ معلومات سائنس

مولفہ۔ آفتاب حسن، شیخ عبدالحمید
و جودھری عبدالرشید صاحبان
اس کتاب میں سائنس کے چند
نہایت اہم موضوعات مثلاً حیاتیں
جراثیم، لاسلکی، لاشعاعیں، ریڈیم
گرامونون وغیرہ پر نہایت دلچسپ
عام فہم زبان میں بحث کی گئی ہے۔
قیمت مجلد سہ روپہ رنگا جیکٹ
ایک روپیہ بارہ آنہ

۲۔ حیات کیا ہے؟

مولفہ۔ محشر عابدی صاحب۔
حیات پر سائنسی نقطہ کی کئی
نہایت دلچسپ کتاب ہے۔
قیمت مجلد ایک روپیہ دس آنہ

۳۔ انسانی فیت

مولفہ۔ ڈاکٹر رضی الدین صدیقی
سائنس کے مشہور مسئلہ انسانیت
کی تشریح نہایت سہل اور عام
فہم زبان میں کی گئی ہے۔ اردو
زبان میں اس قسم کی یہ واحد
کتاب ہے۔

قیمت مجلد ایک روپیہ چار آنہ



سب سے خوش نصیب انسان وہ ہے جو نئے معاشق کا انکشاف کرنا چاہے اور دوستوں سے پرہیز کرے جو پائے تعصبات کو کرنا



اطلاع

- (۱) اشاعت کی غرض سے جملہ مضامین اور تبصرے بلغم ایڈیٹر سائنس ۹۱۷، کلب روٹ، چادر گھاٹ حیدر آباد دکن روانہ کئے جانے چاہئیں —
- (۲) مضموں کے ساتھ صاحب مضموں کا پورا نام مع تذکرہ و عہدہ وغیرہ درج ہونا چاہئے تاکہ ان کی اشاعت کی جاسکے بشرطیکہ اس کے خلاف کوئی ہدایت نہ کی جائے —
- (۳) مضموں سات لکھے جائیں تاکہ ان کے کھپوز کرنے میں دقت واقع نہ ہو۔ دیگر یہ کہ مضموں صفحے کے ایک ہی کالم میں لکھے جائیں اور دوسرا کالم خالی چھوڑ دیا جائے — ایسی صورت میں وزن کے دونوں صفحے استعمال ہو سکتے ہیں —
- (۴) شکلوں اور تصویروں کے متعلق سہولت اس میں ہوگی کہ علحدہ کاغذ پر سات اور واضح شکلیں وغیرہ کھیلچ کر اس مقام پر چسپاں کر دی جائیں — ایسی صورت سے بلاں سازی میں سہولت ہوتی ہے —
- (۵) مسودات کی ہر ممکن طور سے حفاظت کی جائے گی — لیکن اُن کے اتفاقیہ تلف ہوجانے کی صورت میں کوئی ذمہ داری نہیں لی جاسکتی —
- (۶) جو مضامین سائنس میں اشاعت کی غرض سے موصول ہوں امید ہے کہ ایڈیٹر کی اجازت کے بغیر دوسری جگہ شائع نہ کئے جائیں گے —
- (۷) کسی مضموں کو ارسال فرمانے سے پیشتر مناسب ہوگا کہ صاحبان مضموں ایڈیٹر کو اپنے مضموں کے عنوان، تعداد صفحات تعداد اشکال و تصاویر سے مطلع کر دیں تاکہ معلوم ہو سکے کہ اس کے لئے پُرچہ میں جگہ نکل سکے گی یا نہیں۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک ہی مضموں پر دو اصحاب قلم اٹھاتے ہیں۔ اس لئے اس توارے پہنے کے لئے قبل از قبل اطلاع کر دینا مناسب ہوگا۔
- (۸) بالعموم ۱۵ صفحے کا مضموں سائنس کی اغراض کے لئے کافی ہوگا۔
- (۹) مطبوعات برائے نقد و تبصرے ایڈیٹر کے نام روانہ کی جانی چاہئیں — مطبوعات کی قیمت ضرور درج ہونی چاہئے —
- (۱۰) انتظامی امور و اشتہارات وغیرہ کے متعلق جملہ مراسلت منیجر انجین ترقی اردو اورنگ آباد دکن سے ہونی چاہئے —

جلد ۶ سائنس جولائی سنہ ۱۹۳۳ء

مرتبہ

مولوی محمد نصیر احمد صاحب عثمانی ام - اے - بی - ایس - سی -
(ہلیک) معلم طبیعیات کلیہ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن

فہرست مضامین

نمبر شمار	مضمون	مضمون نگار	صفحہ
۱	تخلیقِ انسان (۸)	پاپولر سائنس	۳۲۱
۲	ایوکیٹرو	جناب رفعت حسین صاحب صدیقی ام ایس سی ۳۴۰	
		ریسرچ انسٹیٹیوٹ طبیہ کالج دہلی	
۳	پترولیئم	جناب محمد عبدالعلی صاحب متعلم بی ایس ۳۳۷	
		سی الہ آباد یونیورسٹی	
۴	گرفت پر برقی حیثیت	جناب سید عبدالعظیم صاحب ایم ایس ۳۵۶	
	نظر	سی : ایل ٹی -	
۵	فنِ دباغت (۳)	حضرت " دباغ " سیولانوی	۳۶۸
۶	ہلم کیمیا کا انقلابی دور	جناب آتھا رام صاحب ام ایس سی ایمپرس ۳۸۸	
	اور آنسیجن کانکشن	وکتوریہ ریڈر شعبہ کیمیا الہ آباد یونیورسٹی	
۷	ابوالفابوز جانی العاصم	جناب محمد زکریا صاحب مایل	۴۰۷
۸	دلچسپ اقتباسات	ایڈیٹر و دیگر حضرات	۴۲۲
۹	دلچسپ معلومات	" " "	۴۳۸
۱۰	تبصرے	" " "	۴۴۶

تخلیق حیات و انسان

پر

ایک مکالمہ

(۸)

مصنف : عداوت ، اور خوف ہماری زندگی پر کھوں مسلط ہیں

نرت :- لاکھوں برس اُہر زندہ جیلی کے ایک ذلے ذلے سے ذرے سے وہ عجیب و غریب مفلوک جس کو " موجودہ انسان " کہتے ہیں ' عالم وجود میں آئی ' اور اپنی تمام محبتوں ' عداوتوں اور خوفوں کے ساتھ آئی ۔ ڈاکٹر ولیم کے گریگوری نے یہ سلسلہ داستان اسی مقام سے شروع کیا تھا ۔ اس کے بعد ڈاکٹر ہر ہرت روکس نے یہ بتلایا کہ انسان اپنی خصوصیات اپنی اولاد میں کیونکر منتقل کرتا ہے ۔ پچھلے نمبر میں ڈاکٹر روکس نے اندرون افرازی حدود کا حال بیان کیا تھا ۔ آج کی صحبت میں جا معہ کو لہبیا کے شعبہ نفسیات کے صدر ڈاکٹر اے ۔ ٹی ۔ پٹن ہر گر نے یہ بتلایا ہے کہ ہمارے اہمال و افعال پر ہمارے جذبات کہاں تک حاوی ہیں —

مسٹر ماک :- ڈاکٹر صاحب ۔ میں آپ کی خدمت میں جذبات کی داستان سلیے آیا تھا ۔ براہ کرم ارشاد فرمائیے کہ لوگ ایک دوسرے

تخلیق حیات و انسان سائنس جولائی ۱۹۳۳ء

عے محبت اور نفرت کیوں کرتے ہیں اور خوت کیوں کہا تے ہیں۔ اور خفا کیوں ہو جاتے ہیں۔ قصہ مختصر، یہ فرمائیے کہ جذبہ (Emotion) کس کو کہتے ہیں ؟

ڈاکٹر یفن بر کو :- عے اس سوال کے جواب عے شروع کرنے دیجیے جس عے ہر کس و فاکس دلچسپی رکھتا ہے ۔ لوگ ایک دوسرے عے محبت کرتے ہیں ۔ کیوں ؟ اس لیے کہ لاکھوں برس اُدھر بعض ننھی سی ابتدائی مخلوق، اپنے تکرے کرتے کرتے تھک گئی، آپ جانیے کہ توالد کا اصلی طریقہ یہی تھا، اور بالآخر تکثر کا صلفی طریقہ اختیار کر لیا گیا ۔ صنفوں کے درمیان کشش کی حیثیت عے محبت لاکھوں کروڑوں برس کے نشو و نما اور تغیر کی یادگار (Vestige) ہے ۔

مسٹر ماک :- میں تو سمجھا تھا کہ یادگار عے مطلب کسی انسان یا حیوان کا وہ حصہ یا وظیفہ ہے، جواب کار آمہ نہیں رہا مثال کے طور پر زائدہ (Appendix) کو دیکھ لیجئے ۔ میوں سمجھہ میں نہیں آتا کہ اس عضو میں اور جذبہ محبت میں کون سی قدر مشترک ہے ۔

ڈاکٹر یفن بر کو :- کوئی ضروری نہیں کہ کوئی عضو یا جذباتی جواب بالکل کار آمہ نہ رہنے ہی پر یادگار کہلاے ۔ وہ اس وقت یادگاری ہو جاتا ہے جب اس کی فائدہ مند و زائل ہونے لگتی ہے ۔

مسٹر ماک :- تو آپ کا مطلب یہ ہے کہ محبت کی فائدہ مند و کچھ زائل ہوگئی ہے ؟

ڈاکٹر یفن برگر :- بہت کچھ - اس میں شک نہیں کہ صنفی جذبہ اس پر اسرار تغیر کے لیے بہت ضروری تھا، جس کو ہم ارتقا کہتے ہیں۔ ہر منفرد نوع کے تحفظ کے لیے بھی اس کی ضرورت تھی۔ انسان کی صورت میں تو آج یہ خیال قریب قریب یقین کے درجے کو پہنچا ہوا ہے کہ اب اس کی ضرورت بہت کم رہ گئی ہے۔ ابتدائی زمانے میں بہت سے لوگوں کو پیدا ہونے کی ضرورت تھی تاکہ نسبتاً ایک چھوٹی تعداد زندہ رہے۔ اب درازی عمر کے وہ ذرائع استعمال کئے گئے ہیں کہ شرم اسوات میں کمی واقع ہوگئی ہے اور اس لیے اب اتنے لوگوں کے دنیا میں آنے کی ضرورت باقی نہیں رہی —

مسٹر ماک :- بایںہ یہ جذبات لطیف اب بھی ہم پر حکمراں ہیں — ڈاکٹر یفن برگر :- درست ہے۔ لیکن چونکہ اس جذبہ کی فائدہ مند و برابر گھٹ رہی ہے اس لیے ممکن ہے کہ اس جذبے سے متاثر ہونے کی قابلیت ہم میں کم ہوتی جائے۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسی ان اعضاء کی جو اس وقت غائب ہو جاتے ہیں جبکہ ان کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ لیکن اس کے وقوع کا امکان ایک لاکھ برس سے ادھر تو ہے نہیں اس لیے آپ پریشان نہ ہوں —

مسٹر ماک :- پریشانی کو مجھے کو نہیں۔ لیکن میں یہ دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ کیا صورت محبت ہی وہ جذبہ ہے جو یاد گاری ہے ؟

ڈاکٹر پفن برگر :- نہیں۔ اس تعبیر پر تو ہمارے پاس کہنا چاہیے کہ ایسے جذباتی جوابوں (Emotional Responses) کا پورا ایک مجموعہ ہے جو اپنی فائدہ مندی بہت کچھ کھو چکے ہیں۔ ان میں سے بعض تو قطعی طور پر مضرت رساں ہیں۔ لیکن ہم اپنی داستان سے آگے نکل گئے۔ اس پر بحث میں آگے چل کر کروں گا۔ پہلے میں آپ کو یہ بتانا چاہتا ہوں کہ ہمارے اساسی یا ابتدائی جذبات کیا ہیں —

مسٹر ماک :- وہ کون کون سے ہیں؟

ڈاکٹر پفن برگر :- مہمور ماهر نفسیات ڈاکٹر جان بی واٹسن جب جامعہ جانس ہاپکسن میں نفسیاتی تجربہ خانے کے ناظم تھے، تو انہوں نے چند گھنٹوں کے نوزائیدوں پر تجربے کیے تھے۔ ان کی آزمائشوں سے یہ پتہ چلا کہ طبعی حالات میں پیدائش کے فوراً بعد تمام بچے تین جذبوں سے متاثر ہوتے ہیں یعنی 'خوف' غصہ اور محبت سے —

مسٹر ماک :- نوزائیدہ کو محبت کا تجربہ کیوں کر ہوتا ہے؟

ڈاکٹر پفن برگر :- صورت موجودہ میں محبت سے سرائ جلد پر ہاتھ پھیرنے سے خوشگوار اثر کا محسوس ہونا ہے۔ بالفاظ دیگر بچہ اپنے وقت ولادت ہی سے چاہتا ہے کہ کوئی اس پر ہاتھ پھیرے اور پیار کرے۔ بقول ڈاکٹر واٹسن یہی اساس محبت ہے۔ ہر بالغ انسان کی جذباتی زندگی ان ہی تین اساسی ابتدائی جذبات پر مبنی ہے —

مسٹر ماک :- ڈاکٹر واٹسن کو یہ کیوں کو معلوم ہوا کہ نوزائیدہ ان تین

جذبوں کو محسوس کرتے ہیں؟

ڈاکٹر پفن برگر :- انہوں نے بچوں کو خاص خاص طریقوں سے بر انگیزتہ کیا، اور پھر ان کے بشرے اور حرکات سکلات پر نظر رکھی، انہوں نے اور ان کے جانشیلوں نے ان کی متحرک تصاویر لیں۔ ان تجربات سے یہ دلچسپ امر منکشف ہوا کہ بچوں میں دو طرح پر خور کے جذبہ کو بر انگیزتہ کیا جا سکتا ہے۔ اسی طرح دو طرح سے غصہ بھی د لایا جا سکتا ہے۔ —

مسٹر ماک :- بچے کن دو چیزوں سے تر تے ہیں؟

ڈاکٹر پفن برگر :- وہ یک باری زور کی آواز سے بہت تر تے ہیں اور پھر سہارے کے ہٹ جانے سے بھی وہ بہت گھبراتے ہیں یعنی وہ گرنے سے تر تے ہیں —

مسٹر ماک :- اس میں تو کوئی عجیب بات نہیں معلوم ہوتی۔ ان چیزوں سے تو ہم سب تر تے ہیں —

ڈاکٹر پفن برگر :- درست۔ لیکن عجب بات یہی ہے کہ بچے کسی اور چیز سے مطلقاً نہیں تر تے —

مسٹر ماک :- اچھا تو بچے کو غصہ میں لانے والی دو باتیں کون سی ہیں؟
ڈاکٹر پفن برگر :- اس کی حرکات کو روکنا، مثلاً ہاتھوں کو پھاڑ سے بالادہ دینا، اور بھوک۔ اس کے علاوہ کوئی چیز بچے کو ڈرانا نہیں کرتی۔ اثر مدد سے کو بر انگیزتہ کرنے کے لئے واتسی نے بھی معلوم کیا کہ آہستگی سے ہاتھ پھیر نے پر، بالخصوص جسم کے حساس حصوں میں، یہ کیفیت پیدا ہو سکتی ہے —

مسٹر ماک :- تجربوں میں یہ کیوں کر معلوم ہوا کہ بچے ہاتھ پھرنے کے لائق پیار کو پسند کرتے ہیں؟

ڈاکٹر پگن برگر :- انکی مسرت کے بے ساختہ اظہار سے ۔ جس کو آپ تبسم سمجھ سکتے ہیں ۔ بایںہمہ ان آزمائشوں میں وہ کامیابی نہیں ہوئی جو ان آزمائشوں میں ہوئی جن میں خوت اور غصہ کا اظہار ہوا ۔ ”محبت“ کے سلسلے میں بھی کچھ زیادہ کامیابی نہیں ہوئی، کیوں کہ بچوں سے ”کھیلنے“ کے خلاف ایک طرح کا قدیم اور بجا طور پر شدید تعصب ہے ۔

مسٹر ماک :- آپ نے فرمایا کہ ہر بالغ کی جذباتی زندگی خوت، غصہ اور محبت کے تین اساسی جذبات پر قائم ہے ۔ یہ کیوں کر ہوتا ہے؟

ڈاکٹر پگن برگر :- عمل تشریط [Conditioning process] —

مسٹر ماک :- اس سے آپ کا کیا مطلب ہے؟

ڈاکٹر پگن برگر :- یعنی عمل اختیار یا قدیم تجربوں کے ساتھ نئے تجربوں کا تطابق ۔ اس کی بہترین توضیح ایک سادہ سی مثال سے ہوسکتی ہے جس کو ڈاکٹر واتسن نے بیان کیا ہے ۔ نفسیات کے قدیم علما، بشمول مشہور و معروف ولیم جیمس کے، یہ سمجھتے تھے کہ بچے متعدد قسم کے خوفوں کو ساتھ لیے پیدا ہوتے ہیں ۔ مثلاً تاریکی کا خوف، بالدار جانوروں کا خوف وغیرہ ۔ واتسن کا دعویٰ یہ تھا کہ اس قسم کے تمام خوف ابتداً ہی شیر خوارگی میں لاحق ہو جاتے

ہیں۔ اس کے ثبوت کے لیے اس نے ہند مہینے کے ایک بچے کو لہا اور کھیلنے کے لیے اُسے ایک خرگوش دیا۔ بچہ بالکل اس سے نہ ترّا۔ پھر موصوت نے عمدّاً بچے کو خرگوش سے ترنا سکھایا۔

مسٹر ماک :- کہوں کر؟

ڈاکٹر پفن برگر :- ایک دن جب بچہ خرگوش سے کھیل رہا تھا تو واٹسن نے بچے کے کان کے پاس ایک دھاتی سلاخ بجاٹی۔ اس سے دفعتاً زور کی آواز پیدا ہوئی جس نے بچے میں تر پیدا کیا۔ اب کیا ہوا؟ بچے نے دماغ میں آواز خرگوش کی موجودگی سے وابستہ تھی؛ اس لیے اس کے بعد بچہ جانور سے ترنے لگا۔ اسی کو عکس تشریطی (Conditioned Reflex) کہتے ہیں۔ یعنی ایک عمل ہے جس سے کوئی جوابی عمل ایک نئے مہیج (Stimulus) کے ساتھ وابستہ ہو جاتا ہے جو ابتدائے اس مہیج کے ساتھ نہ ہوا تھا جس کی وجہ سے جوابی عمل وجود میں آیا۔ اس طرح اکثر لوگوں کے بچپن میں خوفوں کا ایک "خوفناک سبب" تیار ہو جاتا ہے۔

مسٹر ماک :- کیا خوت تاریکی کا اکتساب کسی دفعتاً زور کی آواز کے ذریعہ ہوا؟

ڈاکٹر پفن برگر :- جی ہاں۔ چھوٹا بچہ رات کے وقت تاریکی سے اس وقت ترسکتا ہے جب کہ ہادل کی گرج یا کھڑکھڑاہٹ وغیرہ سے اس کی آنکھ کھلے۔ بچہ کے لیے آواز کے ساتھ

جو کچھ بھی ہوتا ہے، بصورت موجودہ آواز، وہی آواز کا سبب بن جاتا ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ سانپ، چوہے، مکڑی اور دیگر حشرات کا خون بھی اسی طرح پیدا ہو جاتا ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ بہت سے لوگ اس خون کو دور نہیں کر سکتے۔

مسٹر ماک - مگر سانپ، چوہے اور مکڑیوں سے تو یکبارگی کوئی زور کی آواز نہیں نکلتی؟

ڈاکٹر پیٹن برگر :- آواز تو کوئی نہیں نکلتی۔ لیکن بچے کی ماں ان کو دیکھ کر چیخ اُٹھتی ہے۔ بچہ آواز سے تر جاتا ہے، سانپ، چوہے یا مکڑی کو دیکھتا ہے اور ان کو آواز کے ساتھ وابستہ کر دیتا ہے۔ ڈاکٹر واٹسن کے انکشافات کی اہمیت اسی سبب سے ہے کہ اس نے مطالعہ کرنے سے پیشتر کوئی ان باتوں کو جاننا نہ تھا۔ جیسے اور اس کے متبعین نے یہ دھوکے کیا کہ مثلاً پانچ یا سات برس کے بچے کی جذباتی زندگی فطری ہوتی ہے۔ یعنی اس عمر میں جن جذبات کا وہ اظہار کرتا ہے وہ پیدائش سے اس کے ساتھ ہوتے ہیں۔

مسٹر ماک :- جو چیز سب سے زیادہ مجھے تعجب میں ڈالتی ہے وہ یہ ہے کہ نورانیہ بچہ بھی ان گنتی کے جذبات کا اظہار کرتا ہے۔ میری ذہن میں تو یہ تھا کہ جذباتی حیثیت سے چند گھنٹوں کا بچہ بالکل معرا ہوتا ہے۔ اب مثلاً اس کا کہا سبب کہ ایسا بچہ بھی یکبارگی زور کی آواز سے

پریشان ہو جاتا ہے ۔

ڈاکٹر ہفن برگ :- میرے نزدیک تو اس کا سبب یہ ہے کہ قبل ولادت کی حالت میں تہیج قوی کوئی ہوتا ہی نہیں ۔ بالفاظ دیگر ولادت سے پیشتر کوئی بچہ بھی غالباً کبھی پریشان نہیں ہوتا ، اور نہ کسی چیز سے خاص طور پر خوش ہوتا ہے ۔ جہاں تک ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ ایسی جگہ ہوتا ہے ” کہ آنجا آزارے نبا شد “ ۔

مسٹر ماک :- کیا اکتسابی خوفوں کو بچہ سے دور کیا جاسکتا ہے ؟
ڈاکٹر ہفن برگ :- جی ہاں ۔ لیکن ذرا کارے دارد کا مضمون ہے ۔ ان خوفوں کو جائزیں کرنے کے لیے ایک ہی واقعہ کافی ہے ، لیکن کسی ایک خوف کو دور کرنے کے لیے درجنوں آزمائشیں کرنی پڑتی ہیں ۔ جب ایک مرتبہ وہ میکائیت سمجھ میں آجائے ، جس سے خوف کا انتساب عمل میں آتا ہے تو پھر تقریباً اسی عمل سے اس کو دور بھی کیا جاسکتا ہے ۔ اس عمل کو ہم عمل باز تشریط یا ضد تشریط (Reconditioning or deconditioning) کہتے ہیں ۔ مثال کے طور پر اس بچے کو لیجئے جو بالوں والے خرگوش سے ترستا ہے ۔ فرض کیجئے کہ اس بچے کو ناشتہ مہن کوئی خاص غذا مثلاً دلیا پسند ہے ۔ اب طریقہ یہ ہوگا کہ اس خوفناک شے کو بچے کے قرب میں لایا جائے جب کبھی وہ دلیا کھا رہا ہو ۔ لیکن اس عمل کو بتدریج کرنا چاہیے ۔ اگر بہت جلدی سے کام لیا جائے گا تو نتیجہ معکوس

ہوگا، یعنی ممکن ہے کہ بچہ دلیپے ہی سے ترلے لگے۔
 ایسی صورت میں ایک نشہ دو شدہ کا مضمون ہو جائے گا۔
 پس پہلی مرتبہ خرگوش کو بچہ کی کرسی سے فاصلے
 پر رکھنا ہوگا، اس کے بعد ہر مرتبہ اس کو نزدیک
 تر کرتے رہنا چاہئے۔ رفتہ رفتہ بچہ دلیپے کے خرگوشوار
 احساس کے ساتھ خرگوش کو وابستہ سمجھنے لگتا ہے۔
 اور اس طرح وہ خوت مغلوب ہو جاتا ہے۔

مسٹر راک :- کیا صبر والے لوگوں میں بھی غیر طبعی خوت اس
 طرح پیدا ہوتے ہیں۔

جی ہاں۔ عمر والوں میں بھی یہی مہکانیت کام کرتی
 ہے، اور بہت سے عصبی خلل اسی کا نتیجہ ہوتے ہیں۔
 جنگ عظیم میں گولوں کے پھٹنے سے جو مددات پہنچے
 ان سے یہ اسر بالکل واضح ہو گیا۔ ان آدمیوں کا علاج
 یوں ہی کیا گیا کہ شفا خانوں میں ان کو بالکل سکون
 اور خاموشی میں رکھا گیا۔ اس کی ضرورت بھی تھی،
 کیونکہ کتاب کے گرنے سے بھی ان میں ہیجان پیدا
 ہو جاتا تھا۔ اکثر ایسا بھی ہوا کہ جو مریض بہت کچھ
 اچھا ہو گیا تھا وہ دفعۃً پھر مبتلا ہو گیا، اور وہی
 ابتدائی علامات، پھیپھہ چھوٹنا، تشنچ اور عارضی فالج
 نمودار ہو گئیں۔ ابتدائے تو مرض کے عود کرنے کا سبب
 ایک راز بنا رہا، بعد میں معلوم ہوا کہ بیمارستان
 میں ایک شخص ورہی پھنے آ گیا تھا۔ اس سپاہی کا

محض نظر آجانا ہی مرض کے عود کا سبب بن گیا، کیونکہ مریض کا ابتدائی تجربہ وردی پوشوں ہی سے وابستہ تھا۔ بالفاظ دیگر مریض کا ایک بے ضرر سپاہی سے اس درجہ خوت زد ہونا عکس تشریطی تھا۔ اب آپ سمجھے کہ مریض میں اس وردی پوش کا جو خوت (جو ہرگز اس خوت کا سبب نہ تھا) پیدا ہوا تو اسی مہکانیت کی وجہ سے جس کی بدولت وائسن کے تجربے میں بچہ خرگوش سے ترا تھا، اگرچہ درحقیقت ایک شور نے نہ کہ خرگوش نے یہ خوت پیدا کیا تھا؟

مستور ماک :- جی ہاں۔ میں سمجھا - آپ نے ابھی فرمایا کہ گولوں کے اثر سے لوگوں میں تشنج اور عارضی فالج پیدا ہو گیا لیکن یہ تو ایک غیر طبعی صورت تھی۔ کیا طبعی جذبات بھی جسم پر اسی طرح عمل کرتے ہیں؟

ڈاکٹر پین برگر :- مجھے خوشی ہے کہ آپ نے یہ سوال کیا۔ کیونکہ اس سے مجھے خود جذبہ کی تشریح کا موقع مل گیا۔ جذبہ درحقیقت نام ہے ایک ہیجان، تہیج، یا تہوجی حرکت کا۔ اس کو احساس [Feeling] کے ساتھ ملتے نہیں نہ کیجئے۔ جذبہ کا خاصہ یہ ہے کہ اس میں ہیجان میں آنے کا تجربہ ہوتا ہے۔ مشہور امریکی نفسیاتی ولیم جیمس متوفی ۱۹۱۰ء کا قول ہے کہ جذبہ جسم کے اندر تغیرات کا شعوری تجربہ ہے۔ احساس میں یہ عکسیت (Reverberation) نہیں ہوتی۔ احساس غالباً جذبہ کی ایک ہلکی شکل ہے۔

اسی عکسیت کا ددم یا وجود فرق پیدا کر دیتا ہے —
 مسٹر ماک :- میں نہیں سمجھا کہ آپ نے "عکسیت" سے کیا مطلب
 لیا۔ یہ فرمائیے کہ جذبہ کی صورت میں کون سے جسمانی
 تغیرات واقع ہوتے ہیں ؟

ڈاکٹر پفن برگ :- کیا آپ کبھی شرمائے نہیں ؟ کیا محبوب کو دیکھ کر آپ
 کے قلب کی حرکت کبھی تیز نہیں ہوئی ؟ کیا استعان
 کے نتیجے کے انتظار میں آپ کا دل کبھی بیتھا نہیں ؟
 اس قسم کے مظاہر اس قدر عام ہیں کہ یہ سب باتیں اب
 روزمرہ میں داخل ہیں - ہاں ہم یہ سب نتیجے ہیں
 قالب کی حرکت یا تنفس کی شرح میں حقیقی تغیر کا
 خون کی تقسیم کا اور جسم کے مختلف حصوں میں
 عضلاتی تلمشوں کا - بقول جیہس کے ان اور ان
 جیسے دیگر طبیعی تعاملات میں سے گزرنا ہی جذبہ ہے -
 بالفاظ دیگر جب آپ خرت زدہ ہوتے ہیں تو آپ کے
 دماغ میں کوئی غیر محسوس چیز نہیں ہوتی بلکہ آپ
 کے جسم ہی میں چند تغیرات ہونے لگتے ہیں جن کا
 آپ کو احساس ہوتا ہے —

مسٹر ماک :- میں تو سمجھتا تھا کہ اس کے بالکل برعکس صحیح ہو گا
 یعنی طبیعی تعاملات جذبات ہی کا نتیجہ اور اثر ہوں
 گے - آپ کا کیا خیال ہے ؟

ڈاکٹر پفن برگ :- ذاتی طور پر تو میرا یہ خیال ہے کہ جیہس کا قول
 درست ہے - لیکن اس سے کسی امر کا اثبات نہیں ہوتا -

سائنس دانوں کے نزدیک اس نظریہ کی صداقت ابھی کھاتقہ ثابت نہیں ہوئی ۔ اس سلسلہ میں ہاروارڈ کے مدرسۂ طب کے معلم فعلیات ڈاکٹر والٹر کینن نے بہت کچھ غور و فکر اور مطالعہ کیا ہے ۔ انہوں نے جذبات کے دوران میں طبعی تغیرات کی پیمائش بہت احتیاط کے ساتھ کی ہے ۔ ان کا بیان ہے کہ وہ مختلف جذبات کے تحت طبعی تعاملات میں کوئی فرق نہ پاسکے ۔ مثلاً انہوں نے غصہ کی حالت میں ایک شخص کی نبض ، حرکت قلب ، اور تنفس کو دیکھا اور ساتھ ہی فشار خون (Blood Pressure) کی پیمائش کی اور دیگر وظائف مثلاً معدے کے اندر ہضمی حرکات کا مشاہدہ کیا ۔ پھر اس شخص کو خوت کی حالت میں دیکھا ۔ تو ہر دو صورتوں میں قریب قریب ایک ہی قسم کے برآمد ہوئے —

مسٹر ماک :- کیا یہ ممکن نہیں کہ خوت اور غصہ کے طبعی اثرات ایک ہی ہوں —

ڈاکٹر یفن برگ :- اگر جیہس کا نظریہ صحیح ہے تو ممکن نہیں ۔ اگر جذبہ جسمی تغیر کا شعوری وقوت ہے تو اس کے معلی یہ ہوے کہ مختلف جذبات مختلف جسمی تغیرات کا وقوت ہوں ۔ میرے نزدیک دشواری یہ واقع ہوئی ہے کہ بعض طبعی تغیرات ، جن میں شاید بعض کیمیاری بھی ہوں ، پیمائش بلکہ شناخت سے بھی رے کئے ۔ پھر حال مثلاً فہم کی حالت میں طبعی تغیر بہ حیثیت مجموعی پورے جسم

تخلیق حیات و انسان سائنس جولائی سنہ ۳۳ ع

کا تغیر پارہ عمل ہے۔ چنانچہ عضلات، جلد، خون، اعصاب، غدود، سب کے سب اس تغیر میں حصہ لیتے ہیں۔ ایسی پیچیدہ حالت میں بہت ممکن ہے کہ باوجود احتیاط کے کوئی جز پیمائش کرنے سے رہ جائے۔

مسٹر ماک :- تو کیا جذبات اور جسمانی تغیرات کے درمیان اس علاقہ

کی جانچ کا کوئی اور طریقہ نہیں؟

ڈاکٹر پفن برگ :- جی ہاں، ہیں۔ ان طبعی تغیرات کی تازہ ترین کوشش نفسی برقی عکس یعنی جلد کی برقی مزاحمت کے ذریعہ ان کی پیمائش ہے۔ اس برقی مزاحمت کی نسبت معلوم ہوا ہے کہ وہ تقریباً ہر قسم کے جذبہ کے تحت بہت کچھ کم ہو جاتی ہے۔ دو برتنوں میں نمک کا محلول ہوتا ہے۔ برتن برقی آلے سے ملے ہوتے ہیں۔ شخص زیر امتحان ایک ایک انگلی ہر برتن میں ڈالتا ہے۔ ایک برتن سے دوسرے برتن میں انگلیوں میں سے ہو کر ایک ہلکی برقی رو گزاری جاتی ہے۔ برقی آلے کے ذریعہ ان انگلیوں کی مزاحمت دریافت کی جاتی ہے۔ یہ آلہ اصلاً مشہور و معروف معیاری وہیتسٹون کا پل ہوتا ہے۔ اگر معمول یعنی شخص زیر امتحان مشتعل ہو، یا خوں زد ہو، یا کسی دوسرے کا اس کو قوت ہو تو یہ جلدی مزاحمت بہت کچھ کم ہو جاتی ہے۔ کبھی کبھی اس آزمائش کو "شلاخت کذب" کے لیے بھی استعمال کرتے ہیں لیکن اس غرض کے لیے یہ ترکیب کچھ زیادہ کارگر نہیں

ثابت ہوئی —

مسٹر ماک :- جذبات اور درون افرازی غدد کے درمیان کیا علاقہ ہے ؟
 ڈاکٹر پگن برگ :- آپ کو یاد ہو گا کہ گزشتہ صہبت میں ڈاکٹر روکس نے فرمایا تھا کہ اس کے متعلق بہت کم معلومات ہیں ! اگرچہ اس میں شک نہیں کہ ایسا علاقہ ہے ضرور۔ ڈاکٹر کینن نے اس علاقہ کو ایڈرینیلین [یعنی غدوہ فوق الکلیہ کا افرازی] اور کتے بلیوں کے غصے کے لیے ثابت کر دکھایا ہے۔ دلچسپ تجربوں کے ایک سلسلے میں انہوں نے ثابت کیا ہے کہ غصہ کے دوران میں خون میں ایڈرینیلین کا حقیقی اضافہ ہوتا ہے۔ یہ تجربے بہت دقیق ہیں۔ اور حقیقت تک پہنچنا بہت مشکل ہے، کیوں کہ بقول ڈاکٹر روکس کے درون افرازی غدد کی بیماریاں حیثیت سے توازن کی حالت میں ہیں —

مسٹر ماک :- تو ڈاکٹر کینن نے کیا کیا ؟

ڈاکٹر پگن برگ :- انہوں نے تجربہ خانے میں ایک بلی کو میز سے بائذہ دیا۔ بلی نے اس سے پہلے کھانا کھایا تھا۔ اس کے معدے کی حرکات کی پیمائشیں بہت احتیاط سے کی گئیں اور لاشعاعی تصویریں بھی لی گئیں۔ اس کا فشار خون معلوم کیا گیا۔ اس کے قلب کی حرکت اور تنفس کی مدت دیکھی گئی وغیرہ وغیرہ۔ بلی بالکل طبعی حالات میں اور سنجیدہ رہی۔ اب اس کے بعد کتا لایا گیا کتے نے دست و پا بستہ بلی پر بھرنکنا شروع کیا اور دائیں دکھائے لگا۔

بلی کو بالکل فطری طور پر غصہ آگیا۔ فوراً ہی نئی پیماٹشیں کی گئیں۔ جن سے معلوم ہوا کہ معدے کے ہضمی انقباضات فوراً رک گئے۔ خون کے دوران اور فشار میں ایسی تبدیلیاں واقع ہو گئی تھیں جنہوں نے بلی کو حملہ کے لئے بالکل تیار کر دیا۔ دوسرے دن تجربہ دہرایا گیا۔ بلی کو پھر کھانا کھلا کر میز سے باندھ دیا گیا۔ اور حملہ پیماٹشیں کی گئیں۔ لیکن اس مرتبہ تجربہ خالے میں کوئی کتا نہ لایا گیا۔ اس کی بجائے بلی کے اندر ایڈرینیلین کی ایک مقدار بذریعہ پچکاری پہنچادی گئی تو نتیجہ بالکل وہی نکلا۔ اس سے تو جیہس کے نظریہ کی تائید ہوتی ہے۔ بلی غصہ میں آگئی یا کم از کم اس نے علامات غصہ کا اظہار اس وجہ سے کیا کہ اس کے خون میں ایڈرینیلین کا اضافہ ہو گیا —

مسٹر ماک :-

ڈاکٹر پفن برگ :- بالکل درست۔ جذبات کے ان طبیعی جوابات کی ایک دلچسپ تعبیر یہ ہے کہ دوران ارتقاء ان کا بھی نشو و نما ہوتا رہا کیونکہ حفاظت کے لیے یہ سہہ تھے۔ چنانچہ غصہ کی حالت میں طبیعی جوابات نے حیوان کو حملہ کے لیے موزوں کر دیا اور خوت کے جوابات نے مدافعت کے لیے مستعد کر دیا۔ انتہائی خوت کی حالت میں یہی جوابات شل کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ اس کی بہترین مثال اوپوسم (Opossum) ہے جو ایک

چھوٹا سا نحیف الجٹہ جانور ہے، جو خوف کی حالت میں بالکل شل ہو جاتا ہے۔ اور اس بے حرکتی کی وجہ سے نظر میں نہیں آتا۔ اور اگر نظر میں آگیا تو اس کے دشمن اس کو مردہ سمجھ کر چھوڑ دیتے ہیں۔ میں اس سے پیشتر بھی عرض کر چکا ہوں کہ ہم میں اب بھی متعدد جذباتی جوابات یادگاری صورت میں موجود ہیں۔ لیکن بجائے مفید ہونے کے وہ ہمارے لئے اب مضر ہیں۔ مثلاً کسی سڑک پر موٹر یا لاری کو اپنے اوپر آنا دیکھ کر ہمارے اعضا عارضی طور پر شل ہو جاتے ہیں۔ تو ابتدائی زمانے میں یہ یقیناً مفید رہا ہو گا لیکن اب تو قطعی طور پر خطرناک ہے۔ اسی طرح غصہ کے جوابی تغیرات عہد فار باشی میں بہت کچھ مفید رہے ہوں گے لیکن اب تو ہماری راہ میں رکاوٹ ہی ہیں۔ متمدن معاشرہ (Society) میں عام طور پر غصہ کے اظہار کی بجائے اس کا اخفا بہتر سمجھا جاتا ہے۔ ممکن ہے کہ ایک دن ایسا آئے کہ یہ جوابی عمل ہم میں نہ پیدا ہوں۔ لیکن اس قسم کے حشو و زوائد کا دور کرنا بغایت بطلی العہل ہے۔ جیسا کہ میں نے محبت کے جوابی عمل کے سلسلہ میں کہا تھا، اس کا امکان دس لاکھ برس سے ادھر تو نہیں ہے۔

مستتر ماک :- یہ تو آپ نے ابتدائی جذبات خوت، غصہ اور محبت کی

داستان سنائی۔ اب فرمائیے کہ ہمارے دیگر احساسات کا کیا حال ہے ؟

ڈاکٹر پفن برگ :- ان تین ابتدائی جذبات کو تو آپ بلیاں قرار دیجئے۔ ان پر حافظہ، تخیل، اور قلازمہ کی مدد سے ایک پیچیدہ عمارت تیار ہوتی ہے جس کو حسیت (Sentiment) کہتے ہیں۔ جذبات کے مقابلے میں اوسط متمدن آدمی کے وقوت و تجربہ کو یہ حسیات زیادہ ظاہر کرتی ہیں۔ مثال کے طور پر محبت کی حسیت کو لیجئے۔ وہ ابتدائی جذبہ سے بہت کچھ دور ہو گئی ہے۔

مسٹر ماک :- میں ایک بات یہاں واضح کر لینا چاہتا ہوں۔ وہ یہ کہ محبت کا ابتدائی جذبہ کیا وہی ہے جس کو صنفی محرک (Sex Impulse) کہتے ہیں ؟

ڈاکٹر پفن برگ :- نہیں۔ محبت کا ابتدائی جذبہ وہ ہے جس سے صنفی محرک اور حسیت محبت دونوں نے نشوونما پائی ہے۔ وہ تو لذت کا ابتدائی وقوت ہے جس کو ڈاکٹر واٹسن نے نوژائیدہ بچوں میں معلوم کیا —

مسٹر ماک :- کیا نفرت ابتدائی جذبہ نہیں ہے ؟

ڈاکٹر پفن برگ :- نہیں نفرت تو ایک حسیت ہے۔ وہ غصہ کے جذبہ؛ مظالم کی یاد، ناکردہ مظالم کے خیال، اور آئندہ ہونے والے مظالم کی توقعات سے مرکب ہے۔

مسٹر ماک :- تو پھر خوشی اور غم، رونے اور ہلسنے کو کیا کہئے گا ؟

ڈاکٹر پفن برگ :- اس گفتگو میں میں نے ان ابتدائی جذبات کا نقشہ کھینچنے

کی کوشش کی ہے جو ہماری جذباتی زندگی کی بنیاد
 ہیں۔ لیکن ایک متہدن شخص ان جذبات کو جیسا چاہئے
 ظاہر نہیں کرسکتا۔ رسم و رواج، آداب معاشرہ،
 قانون اور تعلیم، سب کے سب اس میں مائع ہیں۔
 یہ امور جذبات کو ایک خاص رخ پر قائل دیتے ہیں۔
 لیکن اس پر ہم پھر کبھی گفتگو کریں گے۔



ایوو گیٹرو

از

(جناب رفعت حسین صاحب صدیقی - ایم۔ اس۔
سی۔ پی۔ ڈی۔ انسٹیٹیوٹ طبیبہ کالج دہلی)

”اشیا یا اجسام سے جواہر کی کیمت اضافی اور تقاضب ترکیبی معلوم کرنے کا طریقہ“ یہ اس مشہور و معروف مضمون کا عنوان ہے جو رسالہ طبیعیات سنہ ۱۹۱۱ ع (جلد ۷۳ صفحہ ۵۸ تا ۷۶) میں شایع ہوا اور اس میں ایوو گیٹرو (Avogadro) کے کلیہ کی اشاعت ہوئی۔ یہ دراصل اس کلیہ کی صد سالہ یادگار تھی اور ایک خوبصورت کتاب کی شکل میں منائی گئی تھی اسے ٹیورن (Turin) کی رائل اکاڈمی آف سائنس نے شائع کیا تھا۔ مقدمہ کتاب پروفیسر اچی لیوگواریشی (Ichilio Guareschi) کا لکھا ہوا ہے جس میں مصنف کے حالات بھی درج ہیں۔ ذیل میں اسی مقدمہ سے اس کے مختصر سوانح حیات سپرد قلم کئے جاتے ہیں —

ایوو گیٹرو کا پورا نام لارینزو رومانو امیدیو کارلو ایوو گیٹرو دی کو ارینا دی کریٹو (Lorenzo Romano Amedeo Avogadro di Quaregna e di Cerreto) تھا۔ ۹ اگست سنہ ۱۷۷۶ ع کو ٹیورن میں پیدا ہوا۔ خاندانی نام ایوو گیٹرو

غالباً تی ایڈوکیتس (De Advocatis) کا بگڑا ہوا ہے جو زبان کی تبدیلی سے رفتہ رفتہ ایڈوکیرائی (Advocarii) ایوو کیرائی (Avocarii) اور بالآخر ایووکیٹری (Avogadri) ہو گیا۔ یہ نام غالباً قانونی فرائض کی بنا پر ہوا جو زمانہ سابق میں اس خاندان کو اسور مذہبی کے سلسلے میں انجام دینا پڑتے تھے۔ بعد میں یہی نام خاندانی ہو گیا۔ خاندان کی دو شاخیں تھیں جن میں ایک کا سلسلہ ٹریویزے (Trevis) ہے اور دوسرے کا ورچیلی (Vercelli) ہے تھا —

ایوو کیٹرو کے باپ ' کیو یلیرو فلیپو ایوو کیٹرو (Cavaliere Philippo Avogadro) کا سلسلہ نسب ورچیلی سے ملتا ہے ' کیو یلیرو و فلیپو سنہ ۱۸۱۲ع میں فوت ہوا۔ ایوو کیٹرو کی ماں کا نام انا ورچیلونے (Anna Vercellone) تھا۔ یہ بیلا (Biella) کی رہنے والی تھی جو لمبارتی (Lombardy) میں ایک چھوٹا سا مقام ہے اور خاندان ایوو کیٹرو کی املاک جس جگہ تھی اس جگہ کے قریب ہے —

امیتڈیو ایوو کیٹرو نے سنہ ۱۷۸۹ع میں فلسفہ کی تدری حاصل کی اور سنہ ۱۷۹۲ع میں اصول قانون کی اور آخر میں قانون مذہبی میں تدری کی تدری سے سر فراز ہوا۔ کچھ مدت تک قانون پھشہ رہا مگر سنہ ۱۸۰۰ع میں نہایت سنجیدگی سے حساب و طبیعیات کو پڑھنا شروع کیا۔ سنہ ۱۸۰۹ع میں پروفیسر ورچیلی کے رائل کالج یا اکاڈمی میں طبیعیات کا پروفیسر مقرر ہوا۔ اس کا پہلا کام جس میں اس کا بھائی فیلپ (Felice) بھی شریک تھا، برق کے متعلق تھا جو تیورن کی سائنس اکاڈمی میں ۲۰ ستمبر سنہ ۱۸۰۳ع کو پیش ہوا —

سنہ ۱۸۲۰ع میں وکٹر ایما نوئل اول (Victor Emanuel I) نے جامعہ تیورن میں

ریاضیاتی طبیعیات کی جگہ قائم کی۔ اس جگہ پر ایوو گیترو سنہ ۱۸۲۱ ع کے اختتام تک مامور رہا۔ بعد ازاں سیاسی معاملات کی وجہ سے یہ عہدہ حذب کر دیا گیا۔ اب ایوو گیترو کو امپیریٹس (Emeritus) پروفیسر کا خطاب ملا اور چھ سو لیرے سالانہ تنخواہ ملنے لگی —

اس دوران میں ایوو گیترو طبیعیات و کیمیا کے خاص سائنٹفک مضامین میں مشغول رہا جن سے اسے بہت دلچسپی تھی۔ اور اپنی سرگزشت توڑک ایوو گیترو کے نام سے سنہ ۱۸۱۱-۲۱ ع کے درمیان شایع کی۔ اس کے بعد اس کی دوسری سرگزشت جو پہلی سے زیادہ دل چسپ تھی ۳۰ سال کی مدت میں شایع ہوئی —

سنہ ۱۸۳۲ ع میں ریاضیاتی طبیعیات کی پروفیسری کا عہدہ پھر قائم ہوا۔ لیکن اس مرتبہ اس جگہ فرانسیسی طبیعیات دان کوشی (Cauchy) کا انتخاب ہوا۔ دو سال بعد ایوو گیترو پھر اس عہدہ پر مقرر ہوا اور سنہ ۱۸۵۰ ع تک فائز رہا۔ بعد ازاں خود ہی سبکدوش ہو گیا اور اس کا شاگرد فلیچ چیو (Felice chio) اس کا جانشین ہوا —

ایوو گیترو کی شادی تونا فلیچیٹا مازی (Donno Felicita Mazzi) سے ہوئی۔ اسکے بطن سے چھ لڑکے ہوئے جن میں سے دو بڑے بڑے عہدوں پر فائز ہوئے۔ کاؤنٹ لوئگی (Count Luigi) اطالوی فوج میں جنرل ہوا اور ایڈوکیت فلیچ (Felice) عدالت مرافعہ کا صدر بنایا گیا —

ایوو گیترو کی زندگی بڑے انہماک کی تھی۔ وہ بہت سے عہدوں پر جنکا تعاقب قومی اعداد و شمار (Meteorology) 'ارزاق اور پیمائشوں' سے تھا مامور رہا۔ تعلیم عامہ کی مجلس اعلیٰ کا ممبر ہوا۔ اس کی زبان دانگی کا یہ عالم تھا کہ وہ صرف اطالوی زبان ہی کا ماهر نہ تھا بلکہ یونانی و لاطینی میں ادب دسترس ہونے کے

علاوہ انگریزی اور جرمن زبانوں سے بھی واقف تھا۔ وہ محنت اور حیا میں ڈالٹن و شیل (Scheele) سے ملتا جلتا تھا۔ اعلیٰ مراتب اور اعزازات کی مطلق پروا نہ کرتا تھا۔ اسی لئے سنہ ۱۸۳۰ ع میں ٹیورن میں جو سائنٹفک کانگریس منعقد ہوئی اس میں وہ صدر کا نائب بھی نہ ہوسکا۔ دراصل اس کی زندگی زمانہ سلف کے فلسفی کی طرح تھی۔ وہ ہمیشہ اپنے تعلیمی مشاغل میں محو رہتا تھا۔ لیکن اپنے فرائض جو شہری ہونے اور گھر کا مربی ہونے کی حیثیت سے اس پر عائد ہوتے تھے انہیں کبھی فراموش نہ کرتا تھا۔ جس کلیہ کی بنا پر اس کا نام مشہور ہے کہ تو اس سے فوراً اس کی قدر دانی ہوئی نہ وہ مقبول ہوا۔ خیال کرنے کی بات ہے کہ سنہ ۱۸۱۱ ع میں اس نے یہ دعویٰ پیش کیا تھا۔ اس وقت تک کیمیا داں نظریہ جواہر سے بھی بشوبی واقف نہ ہوئے تھے۔ بعد میں ڈالٹن اور اس کے معاونوں نے مشہور کیا۔ لفظ ساہمہ اس وقت سائنٹفک ادب میں مفقود تھا۔ مگر ایوو گیترو نے اپنے مضمون مطبوعہ رسالہ طبیعیات جولائی ۱۸۱۱ م میں کثرت سے اس کا استعمال کیا۔ اس مضمون سے قارئین کے دماغوں میں کچھ الجھن پیدا ہو گئی اور کہنے لگے کہ یہ ایک نیا الجھاوا ہے جو پہلے نہ تھا۔

یہ کچھ مناسب نہیں معلوم ہوتا کہ اس کے سنہ ۱۸۱۱ ع کے مضمون کو تھام و کھال دھرایا جائے جو انگریزی میں ازل سے آخر تک الہمک کلب ریپرنٹس (Alembic Club Reprints No. 4) میں شائع ہو چکا ہے اور جس کا لب لباب ہر ایک جدید کیمیائی کتاب میں موجود ہے۔ لیکن پروفیسر وائر (Walker) کے مناسب نرت کا تذکرہ کرنا ضروری ہے جو بالکل صحیح ہے اور ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

” ایوو کیڈرو پر یہ الزام لگایا گیا ہے کہ اس کے لفظ سالہ (مالیکول) کے استعمال میں مطابقت نہیں ہے لیکن اس کے مضمون کے عہدق مطالعہ سے صاف ظاہر ہے کہ اس نے اس لفظ کو مختلف جگہوں پر مختلف صفتوں کے ساتھ بیان کیا ہے۔ اس وجہ سے استعمال میں عدم مطابقت بالکل نہیں ہے۔ ذیل کی مثالوں سے یہ امر بالکل واضح ہو جاتا ہے —

” Mole'cule “ جس کا انگریزی ترجمہ مالیکول ہے۔ جدید کیپیاری اصطلاحات میں جہاں کہیں بغیر صفت کے استعمال کیا گیا ہے، وہاں اس سے یا جوہر مراد ہے یا سالہ —

” Molecule integrante “ ترجمہ انٹیگرل مالیکول (Integral Molecule) اس سے عام مالیکول مراد ہے لیکن اس کو صرف مرکبات کے واسطے استعمال کیا ہے —

” Molecule constituante “ ترجمہ کانستٹیوٹ مالیکول (Constituent molecule) عنصری شے کے سالہ کے لئے استعمال کیا ہے —

” Molecule Elementaire “ ترجمہ الیمینٹری مالیکول (Elementary Molecule)

سے مراد عنصری شے کا جوہر ہے —

ناظرین کو معلوم ہونا چاہئے کہ ایوو کیڈرو ہی وہ شخص تھا جس نے سب سے پہلے یہ بتایا کہ بہت سے عناصر کے سالہات ایک سے زیادہ جوہر سے بنے ہیں۔ اس لئے بہت سے تعاملات کی ترکیبی کیفیت دکھائی جاسکتی ہے۔ جیسا کہ فی زمانہ دھری تخریب یا تجزیہ (Double Decomposition) میں علامات کے ذریعہ سے ظاہر کیا جاتا ہے۔ اس وقت ہم صرف دو ترکیبی تعاملات کی طرف توجہ مبذول کرنا چاہتے ہیں۔ ایک میں ہائیڈروجن کلورین کے ساتھ ملی ہے اور دوسری میں آکسیجن سے متحد ہے۔ ان تعاملات کو حسب ذیل مساوات سے ظاہر کیا گیا ہے —



اس سے اور اسی قسم کی دوسری مثالوں سے معلوم ہوتا ہے کہ عنصر یا حاصل مرکب جب تک ایک ہی درجہ تپش اور دباؤ کے ایک ہی درجہ پر کیسی حالت میں رہتے ہیں ان کا حجم بھی ایک ہی ہوتا ہے —

یہ سوچ کر بہت افسوس ہوتا ہے کہ ایورگیٹرو اور اس کے انکشافات کے ساتھ ایک مدت تک کافی انصات نہیں ہوا۔ سنہ ۱۸۱۴ ع میں فرانسیسی طبیعیات دان امپیئرے (Ampe're) نے برتھولیت (Berthollet) کو ایک خط لکھا جس میں اس نے ایورگیٹرو ہی کے الفاظ استعمال کیے۔ حالانکہ اس کے یہ خیالات و الفاظ تین سال قبل شائع ہو چکے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ فرانسیسی ایک عرصہ تک اس دعویٰ یا کلیہ کو امپیئرے کے نام سے منسوب کرتے رہے۔ لیکن سنہ ۱۸۵۶ ع میں جب ایورگیٹرو وفات پا چکا تو کیمیاؤں دنیا، کئی زارو (Cannizzaro) کی تحریک پر اس کے ہم وطن کی ذمہ صرت خوبیاں اور اوصاف مافقیے پر بلکہ اس کا کلیہ با اصول بھی تسلیم کرنے پر مجبور ہوئی۔ ناظرین اگر ایورگیٹرو کے ان مختصر حالات کی تفصیل چاہتے ہوں تو کئی زارو کے اس مضمون کا مطالعہ کریں جو اس نے اسی سلسلہ میں قلمبند کیا ہے اور اس پر کچھ بحث بھی کی ہے —

ہرزلیس کی وفات کے بعد سنہ ۱۸۴۸ ع میں علمی کیمیا بڑی کشمکش کی حالت میں تھی جس سے نکلنے میں اس کو بیس سال لگے۔ مرکب اصلہ (Compound redical) کا نظریہ بنسن (Bunsen) کی کیکوٹائل (Cacodyle)

کی تصدیقات کی بنا پر اور لیبگ و ویر (Wohler) کے بنزوائل (Benzoyl) اصلہ کی وجہ سے مقبول ہو چکا تھا لیکن ساخت یعنی سالہ میں قریب جواہر کے خیالات بہت ہی پوچ و خام تھے۔ اور ہوتا بھی ایسا ہی چاہیے تھا کیونکہ عناصر کے ترکیبی قاعدے یا گرفت عناصر کے وہ اصول جس کی بنا پر وہ ایک دوسرے سے متحدہ ہوتے ہیں بالکل معدوم تھے۔ جہاں بلندی نظام نمونہ (Type system) کی بنا پر اپنے بھپن میں تھی۔ ولیمسن اور فرینکلینڈ کے کام کی اشاعت بغیر مزید ترقی کے نہیں ہوسکتی تھی۔ ایسے وقت میں اطالوی سائنس دان اسٹینسلاو کفی زارو (Stanislao Cannizzaro) نے ایوو وگیترو کے کلیہ کی تشریح کر کے بڑا کام کیا۔ اگرچہ یہ کام سائنٹفک دنیا کے سامنے سنہ ۱۸۵۸ ع میں شائع ہوا جب کہ اس کلیہ کے سوجہ ایوو وگیترو کے مضمون کی اشاعت کو نصف صدی گزر چکی تھی۔

دنیا میں بہت سے لوگ ایسے گزرے ہیں جنہوں نے اپنی زندگی میں شہرت و عزت کی مطلق خواہش نہ کی۔ نام و نمود سے ہمیشہ اجتناب کیا اور قلیل عرصہ حیات کو کسی نہ کسی بہتر کام میں صرف کرنے کی کوشش کی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا کام ان کی وفات کے بعد دنیا میں نمایاں ہوا۔ اپنی معنت کے اٹھارے سے وہ خود زندگی میں مستفید نہ ہوسکے۔ یہی حال ایوو وگیترو کا تھا جو سنہ ۱۸۵۶ ع میں انتقال کر گیا اور دنیا میں ایسا کلیہ یا قانون چھوڑ گیا جس سے اس کا نام فاسی اوراق تاریخ میں ہمیشہ جلی قلم سے درخشاں نظر آئے گا۔

پٹرولیم

اور اس سے حاصل شدہ اشیا

از

(محمد عبدالحی صاحب متعلم ہی، ایس، سی، الہ آباد یونیورسٹی)

پٹرولیم بھی قدرت کی ان بے بہا نعمتوں میں سے ہے جن کی قدر انسان نے بہت دیر میں جان لی۔ اور ابھی نہیں کہا جاسکتا آیا اب بھی وہ اس سے تمام اسکانی فائدہ اٹھا سکا ہے یا نہیں۔ پٹرولیم کے وجود کے علم کا پتہ تو بہت پرانے زمانے میں لگتا ہے۔ ہائل میں بھی اس کا ذکر متعدد جگہ ہے اور دیگر پرانی تصنیفات میں بھی اس کا حوالہ اکثر ملتا ہے۔ ہیروڈوٹس یونانی (Herodotus) نے اس کا ذکر اکثر کیا ہے اور اس کو ”بہت قیمتی ہو دینے والا“ لکھا ہے۔ اس نے بابل کے قریب تیل کے چشموں کا ذکر کیا ہے۔ ساتویں صدی میں جاپان میں اس کا نام ”جلنے والا پانی“ رکھا ہے۔ سترہویں صدی کے آخر میں مارکو پولو نے ہاکو کے قریب تیل کے چشموں کا ذکر کیا ہے۔ تیل کے چشموں کے قریب کچھ گھسیں بھی نکلا کرتی ہیں جو جلنے والی ہوتی ہیں۔ ہاکو میں ان ہمیشہ جلنے والے چشموں کے گرد آتش پرستوں کے معبد رہے ہیں اور اس کو آسمانی نور جان کر مدتوں تک مسجود بتایا گیا ہے۔ موجودہ استعمال میں آنے سے پہلے تقریباً

ایک ہزار سال قبل سے باکو پارس زائرین کا مرکز رہا ہے۔ برما کے دریاؤں میں انٹرو پتروولیم کا جزو ملا ہوا پایا جاتا ہے۔ اس دھنیت کو مدتوں تک وہاں کے باشندوں نے اس کو ان معتوبین کی چربی جانا ہے جو اپنے اھمال کی سزا میں دروزخ میں جلے اور جن کی جلی ہوئی ہڈیاں دریاؤں میں بہادی گئیں۔ ان تمام باتوں سے پتہ چلتا ہے کہ اس کے وجود کا علم بہت پرانا ہے مگر اس کو کام میں لانے اور اس سے ہزاروں ضروریات زندگی کو پورا کرنے کی ذہنت ابھی حال میں آئی ہے۔ قبل اس کے کہ ہم یہ بتائیں کہ کن کن ممالک میں اور کس کس طرح اس کے استعمال اور صنعت کو ترقی ہوئی ایک بڑی دلچسپ بات بیان کرتے ہیں۔ جو سائنس دانوں کے لیے اب تک ایک زبردست مہمٹ رہی ہے۔ سوال یہ ہے کہ آخر پتروولیم زمین کے اندر آیا کہاں ہے ؟

سب سے پہلے میلڈیف (Mendeleeff) نے اپنی رائے بیان کی۔ اس نے کہا کہ شاہد پتروولیم لوہے کے کاربائیڈ (Iron carbide) سے بنا ہے۔ یہ تو معلوم ہی ہے کہ لوہا اور کاربن زمین کے اندر بکثرت موجود ہیں۔ ان کی ترکیب سے لوہے کا کاربائیڈ بنا اور جب یرگرم بھاپ (Super - heated steam) نے اس کاربائیڈ پر اثر کیا تو پتروولیم بنا۔ میلڈیف نے تجربہ خانے میں اس تجربہ سے ایک چیز بنائی جو پتروولیم سے ملتی جلتی تھی۔

مگر اس رائے پر سائنس دانوں نے ایک اعتراض کیا کہ اگر پتروولیم بطور ارض میں غیر نامیاتی (Inorganic) اشیا (کاربائیڈ) سے بنا ہے تو اس کو مناظری طور پر عامل (Optically Active) نہ ہونا چاہیے مگر چون کہ وہ مناظری عامل ہے لہذا یہ خیال صحیح نہیں ہے۔

اس کے بعد اینگلر (Engler) نے اپنی رائے ظاہر کی۔ اس نے بتایا

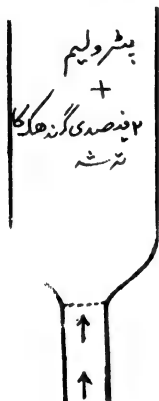
کہ یہ حیوانی مادہ کی کشیدہ فارق (Destructive Distillation) سے بنا ہے جو زمین کے اندر بڑے دباؤ کے ماتحت عمل میں آئی ہے ۔ اس نے بھی اس عمل کو تجربہ خانے میں کیا اور ایک چیز حاصل کی جو مثل پٹرولیم کے تھی اور مناظری حاصل بھی تھی ۔ مگر اب سوال یہ پیدا ہوا کہ اس قدر کثیر حیوانی مادہ ایک جگہ کیوں کر جمع ہو سکا ۔ اس کا جواب یہ دیا گیا کہ ممکن ہے کہ یہ جانور ہاتھی کی طرح بڑے ہوں اور ایک جگہ مل کر رہتے ہوں یا کھڑوں کی طرح ایک جگہ جمع ہوتے اور مرتے رہتے ہوں ۔ اس طرح ایک جگہ اس قدر حیوانی مادہ کا جمع ہونا کچھ نا ممکن نہیں ۔ دوسرا اعتراض اس رائے پر یہ ہوا کہ ہر حیوانی مادے میں فائٹروجن جزو لازم ہے مگر پٹرولیم میں اس کا پتہ نہیں ۔ آخر یہ فائٹروجن کہاں گئی ؟ اس کا کوئی اطمینان بخش جواب نہ ملا اور اس طرح یہ رائے بھی مسترد کر دی گئی —

اس کے بعد ہیفلر (Heffler) نے کہا کہ نباتاتی مادہ کی کشیدہ فارق کا نتیجہ ہے مگر نباتاتی مادہ کی خشک کشیدہ فارق میں کوئلہ لازمی طور پر پیدا ہوتا ہے لہذا پٹرولیم کے نزدیک کوئلہ پایا جانا چاہیے ۔ مگر صورت حال یہ ہے کہ تقریباً تمام پٹرولیم کے کنٹینر سے کوئلہ بہت دور پایا جاتا ہے ۔ اس کا جواب یہ دیا گیا کہ ممکن ہے کہ پٹرولیم زمین کے اندر اندر دور تک نکل گیا ہو اور کوئلہ سے دور ہو گیا ہو ۔ مگر دوسرے اعتراض کا کوئی جواب نہ دیا جاسکا ۔ وہ اعتراض یہ تھا کہ بالعموم نباتاتی مادہ میں گندھک کا جزو نہیں پایا جاتا مگر تقریباً ہر قسم کے پٹرولیم میں کم از کم ۲ فی صدی گندھک کا جزو ہوتا ہے ۔ یہ کہاں سے آیا ؟ اس کا کوئی جواب نہ دیا جاسکا اور یہ رائے بھی شبہ میں پڑ گئی ۔ آج تک یہ مسئلہ سائنس دانوں کے درمیان زیر بحث ہے —

پٹرولیم زمین کے اندر مختلف گہرائیوں پر پایا جاتا ہے۔ بعض مقامات پر یہ زمین کے اندر ایک بڑے دھاڑ کے ماتحت ہوتا ہے۔ چنانچہ جب اس کو نکالنے کے لیے زمین میں سوراخ کیا جاتا ہے تو یہ بغیر پمپ کئے ہوئے خود بخود بڑے زور سے فوارہ کی شکل میں نکلتی لگتا ہے۔ بعض اوقات یہ بہت دور تک پھیل جاتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ بہت سے ہائیڈرو کاربن (Hydro Carbon) گیس کی شکل میں نکلتے ہیں۔ زمین سے نکالنے کے لئے سخت چٹانوں میں سوراخ کرنا پڑتا ہے۔ اس سوراخ کا قطر ۴ فٹ سے لیکر ۱۲ فٹ تک ہوتا ہے اور چلند فٹ سے لیکر ۶ ہزار فٹ تک گہرا ہو سکتا ہے۔ سوراخ کرنے کے لئے برے کی قسم کا آلہ ہوتا ہے جو بھاپ کے انجن سے چلایا جاتا ہے۔ اس میں ایک تہبیر ایسی کی گئی ہے کہ اس کی دھار خود بخود تیز ہوتی رہے اور کام برابر جاری رہے۔ یہ ممکن ہے کہ دوران عمل اس آلہ کی نوک اس قدر گرم ہو جائے کہ پگھل جائے یا نرم ہو کر مڑ جائے یا زمین سے نکلتی ہوئی پٹرولیم کی گیسوں کو جلا دے۔ لہذا اس آلہ کو خول دار بنایا جاتا ہے اور ٹھنڈے پانی کی رو برابر اس کے اندر جاری رکھی جاتی ہے یا برت سے ٹھنڈا کیا ہوا گارا استعمال کیا جاتا ہے۔ سوراخ ہونے کے بعد یا تو پٹرولیم خود زمین کے اندر سے اُبلتا ہے یا مشینوں کے ذریعہ پمپ کر کے نکالا جاتا ہے۔

نکالنے کے بعد سب سے پہلا عمل اس کے صاف کرنے کے متعلق یہ کیا جاتا ہے کہ اس کو کشیدہ فارق کے ذریعہ مختلف ہائیڈرو کاربنوں میں علیحدہ کر لیا جاتا ہے۔ اس کی مفصل تشریح ابھی بیان کی جائے گی۔ صاف کرنے میں پانی کی کثرت سے ضرورت ہوتی ہے لہذا صاف کرنے

والی فیکٹریاں دریاؤں کے کناروں یا سمندر کے ساحلوں پر واقع ہوتی ہیں۔ جہاں اندرون ملک سے پترولیئم پائپ لائن کے ذریعہ لایا جاتا ہے۔ پترولیئم کو مخروطی شکل کے ظرف میں رکھا جاتا ہے اور ۲ فی صدی گندھک کا ترشہ ملا دیا جاتا ہے۔ بہت دباؤ والی ہوا کے



ذریعہ متحرک کیا جاتا ہے۔ پھر پانی سے بار بار دھوکر ۴۰ فی صدی کاسٹک سوتا (Sodium Hydroxide) ملایا جاتا ہے۔ اس طرح پترولیئم پہلے قلعوی اجزا اور پھر قرشتی اجزا سے پاک ہو جاتا ہے۔ اب پترولیئم کا رنگ سیاہ سے ہلکا بھورا ہو جاتا ہے۔ پہلے اس کو سفید کرنے کے لئے اتنے برتنوں میں بھر کر کانچ کی پتلی چادروں سے تھک دیا جاتا تھا

دباؤ والی ہوا حرکت دینے کے لئے

اور دھوپ میں رکھا رہنے دیا جاتا تھا۔ مگر اب

سفوت رنگ کت (Bleaching powder) استعمال کیا جاتا ہے۔ پترولیئم صاف کرنے والی فیکٹریوں کے قریب رنگ کت سفوت کی بھی فیکٹریاں قائم ہیں۔ صاف کرنے کے بعد پھر کشید فارق کا مہل ہوتا ہے اور اس طرح یہ عمل پورا ہو جاتا ہے۔ اس کشید فارق سے بہت سی مختلف الفوائد اشیا دستیاب ہوتی ہیں۔ قبل اس کے کہ ان اشیا کا مفصل حال بیان کیا جائے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ پترولیئم کی کیمیائی ماہیت کے متعلق کچھ بتا دیا جائے۔

پترولیئم میں خاص اجزا کاربن (C) اور ہائیڈروجن (H) ہیں۔

کچھ تھوڑی گندھک اور آئسین بھی پائی جاتی ہیں۔ خاص اجزا کے مرکبات کا اجمالی نام ہائیڈرو کاربن ہے اور دوسری چیزیں ملاوت

سمجھی جاتی ہیں۔ ہائیڈروکاربن مندرجہ ذیل تین اقسام کے پائے جاتے ہیں —

۱ - دھنیت والے (Aliphatic)

۲ - بو رکھنے والے (Aromatic)

۳ - بو رکھنے والے جن میں ہائیڈروجن کے جوہر کا تناسب زیادہ ہے -

Hydro-aromatic

۱ - دھنیت والے ہائیڈروکاربن میں مندرجہ ذیل اشیا شامل رہتی ہیں (۱) پیروان (Paraffine) جن کے سالمہ میں ہائیڈروجن کے جواہر کی تعداد زیادہ سے زیادہ ہوتی ہے - اور کسی مزید جوہر کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی - ان کا عام ضابطہ (General Formula) $(C_n H_{2n+2})$ ہوتا ہے - ان میں مندرجہ ذیل اشیا شامل ہیں

Methane

میٹھین

Ethane

ایٹھین

Propane

پروپین

وغیرہ

(ب) اولی فین (Olefin) جن کے سالمہ میں ہائیڈروجن کے جواہر کی تعداد پیروان کے مقابلہ میں کم ہوتی ہے اور جن کا عام ضابطہ $(C_n H_{2n})$ ہوتا ہے - ان میں مندرجہ ذیل اشیا شامل ہیں —

Ethylene

ایٹھیلین

Propylene

پروپیلین

Butylene

بیوٹیلین

وغیرہ

(۲) ہو رکھنے والے ہائیڈرو کاربن میں مندرجہ ذیل اشیا پائی جاتی ہیں

Benzine

بنزین

Toluene

ٹولوین

Naphthalene

نپتھالین

Anthracene

اینٹھراسین

۳ - ہو رکھنے والے جن میں ہائیڈروجن کے جوہر کا تناسب زیادہ ہے۔ اس

قسم میں مندرجہ ذیل نوعیت کے مرکبات پائے جاتے ہیں مثلاً ہائیڈروجن

کے ۶ جوہر زیادہ والی بنزین - Hexyhydrobenzine

یہ تمام ہائیڈرو کاربن مختلف قسم کی اشیا کی شکل میں پٹرولیم سے علیحدہ کیے جاتے ہیں۔ ان کو جدا جدا کرنے کے لیے جیسا کہ اوپر بیان ہوا کشیدہ فارق کا عمل کیا جاتا ہے۔ کشیدہ فارق سے ہمارا مطلب یہ ہے کہ اس صاف کیے ہوئے پٹرولیم کو پہلے دھیمی اور پھر رفتہ رفتہ تیز حرارت کے زیر اثر کشیدہ کیا جاتا ہے۔ درجہ حرارت کے اختلاف کے ساتھ ساتھ مختلف اشیا حاصل ہوتی ہیں جو مختلف کاموں میں لائی جاتی ہیں۔ ان کی تفصیل حسب ذیل ہے :-

صفر درجہ مٹی (سیلمٹی گریڈ) سے ۴۰ درجہ مٹی تک :-

اس تپش پر صرف گیسوں حاصل ہوتی ہیں۔ ہندوستان اور برما میں چونکہ موسم گرم ہوتا ہے اس وجہ سے یہ پہلے ہی خارج ہو جاتی ہیں۔ یہ گیسیں بڑے سازی میں کام آتی ہیں۔

۴۰ درجہ مٹی سے ۷۰ درجہ مٹی تک :-

پٹرولیم ایتھر حاصل ہوتا ہے جو رال، سوم، چربی، تیل وغیرہ کے

حل کرنے میں کام آتا ہے اور سورہ مالک میں پٹرول کے ساتھ ملا دیا جاتا

ہے تاکہ وہ جلد آگ پکڑ سکے —

۷۰ درجہ مٹی سے ۱۲۰ درجہ مٹی تک :-

پٹرول کشید کیا جاتا ہے جو موٹروں اور ہوائی جہازوں کے انجنوں

میں جلایا جاتا ہے —

۱۲۰ درجہ مٹی سے ۱۶۰ درجہ مٹی تک :-

ہلکا مٹی کا تیل حاصل ہوتا ہے جو اعلیٰ قسم کا ہوتا ہے (مثلاً

اشرفی یا ہاتھی مارکہ وغیرہ) یہ تیل لیپوں اور بعض بڑے انجنوں میں جلانے

کے کام آتا ہے —

۱۶۰ درجہ مٹی سے ۱۸۰ درجہ مٹی تک :-

اوسط درجہ کا مٹی کا تیل ملتا ہے جو کچھ بہورے رنگ کا ہوتا ہے

اور جلنے میں اتنا اچھا نہیں ہوتا جتنا کہ ہلکا تیل - یہ خاص قسم کے

لیپوں میں جلایا جاسکتا ہے - بہت بڑے انجنوں میں بھی جلایا جاتا ہے —

۱۸۰ درجہ مٹی سے ۲۲۰ درجہ مٹی تک :-

رنگین مٹی کا تیل ملتا ہے جو روشنی صاف نہیں دیتا ہے اور دقت

سے جلتا ہے - ریلوے کے سگنلوں وغیرہ میں استعمال ہوتا ہے - سستا ہونے کے باعث

اور لوگ بھی استعمال کرتے ہیں —

۲۲۰ درجہ مٹی سے ۲۶۰ درجہ مٹی تک :-

ہلکا تھ ہینٹی تیل (Lubricating oil) حاصل ہوتا ہے جو ہلکی مشینوں

کے پرزوں کی تھ ہیں میں کام آتا ہے - مثلاً چھوٹے انجنی ہائسکل - سپنے

کی مشین وغیرہ —

۲۶۰ درجہ مٹی سے ۳۰۰ درجہ مٹی تک —

اوسط درجہ کا تھ ہینٹی تیل ملتا ہے جو سیاہ رنگ کا ہوتا ہے اور

بڑے انجنوں کے پرزوں میں لگانے کے کام آتا ہے —

۳۰۰ درجہ مٹی سے ۴۵۰ درجہ مٹی تک —

"بھاری" تدهینی تیل ملتا ہے جو بہت بڑے بڑے انجنوں یا ریل گاڑی کے پمپوں کے دھروں کے چکنا کرنے میں کام آتا ہے۔ یہ بہت گاڑھا ہوتا ہے اور بھاری مشینوں میں کچھ ٹھہر سکتا ہے جہاں ہلکا تیل کام نہیں لے سکتا —

۴۵۰ درجہ مٹی سے ۶۰۰ درجہ مٹی تک —

ویسلین (Vaseline) دستیاب ہوتی ہے جو صابن اور خوشبو دار بنا کر بازار میں فروخت ہوتی ہے۔ یہ مختلف قسم کے مرہموں میں کام آتی ہے۔ اور بہت سی ادویات میں بھی استعمال ہوتی ہے۔ بذات خود اچھا مسہل ہے۔ اور کو زنگ سے محفوظ رکھنے کے لئے بھی استعمال ہوتی ہے —

۶۰۰ درجہ مٹی سے زیادہ —

پیرفن ویکس (Paraffin wax) حاصل ہوتا ہے۔ یہ سفید موم کی قسم کی ایک شے ہے۔ جس میں ۳ سے لے کر ۱۵ فی صدی تک اسٹیرک ترشہ (Stearic Acid) ملا کر موم بتیاں بنائی جاتی ہیں۔ اگر ویکس کچھ عرصہ تک ہلکے دباؤ کے تحت رکھا جائے تو اس کے ساتھ میں جواہر کی ترتیب میں فرق ہونے کی وجہ سے یہ شفات ہو جاتا ہے۔ مگر ذرا سی ٹھہس لگنے سے یہ ترتیب بگڑ جاتی ہے اور ویکس پھر اپنی اصلی صورت پر آ جاتا ہے —

اس کے بعد سیاہ کوئلہ یا Coke باقی رہ جاتا ہے —

گورنر پر برقی حیثیت سے نظر

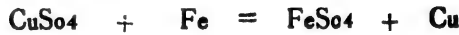
از

(جناب سید محمد الحکیم صاحب ایم ایس سی ' ایل ٹی)

ہرے سے ہرے اجرام فلکی اپنی ساخت میں کچھ وہی مشابہت رکھتے ہیں جو کائنات کے چھوٹے سے چھوٹے ذروں میں پائی جاتی ہے۔ ہماری سائنس آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہی ہے۔ مگر اس بحر بے بایاں میں باوجود اتنی مسافت نے جب نظر اُٹھتی ہے تو ساحل کی دوری کچھ ویسی ہی نظر آتی ہے جیسی پہلے تھی۔ ابھی زیادہ عرصہ نہیں گزرا کہ ایک دوسرے میں عناصر کی تبدیلی کے خیال کو سائنس کی مسئلہ ہستیوں نے ایک خیال سوہم سے زیادہ تصور نہ کیا تھا۔ مگر چند تابکار (Radio Active) عناصر (ریڈیم - ایکٹیو - پولونیم - یورے نیم اور تھوریم) کے انکشاف نے 'جو نہایت سرعت سے ایک دوسرے میں تبدیل ہو جاتے ہیں' اس بھولے ہوئے افسانے کو از سر نو تازہ کر دیا۔ انسانی دماغ اب اس جستجو میں پڑ گیا کہ کیا یہ ممکن ہے کہ قانبعے اور سیسے کے مثل کم قیمت دھاتیں سونے اور چاندی کی طرح قیمتی دھاتوں میں تبدیل ہو سکیں۔ دوسرے لفظوں میں کیا یہ ممکن ہے کہ عناصر کی قلب ماہیت ہو سکے۔ اپنے اس قیاس کو کامیاب بنانے کے واسطے

اُس نے یہ ضروری سمجھا کہ عناصر کے جزو لا یتجزا کی سادہیت کو کامل طور سے سمجھنے - لیکن جوہر کی اصل حقیقت کا پتہ اسی وقت سمجھ میں آتا ہے جب گرفت (Valency) کے پیچیدہ مسئلے کو حل کیا جاسکے - 'گرفت' سے مراد مادے کی وہ صفت ہے جو مختلف اشیا کو آپس میں ترکیب دینے کا باعث بنتی ہے - گرفت کے تشریم طلب معنی کو چند ہمای مثالوں سے سمجھا دینا نامناسب نہ ہوگا -

اگر نیلے تھوٹے (CuSo₄) کے محلول میں لوہے کا ایک ٹکڑا ڈال دیا جاتا ہے تو درجہ ذیل تبدیلی واقع ہوتی ہے -



تانبا کسپس لوہا نیلے تھوٹا

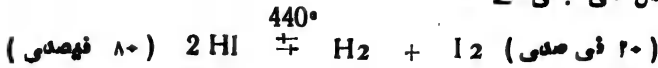
لوہا تانبے کی جگہ پر آ جاتا ہے اور تانبا علیحدہ ہو جاتا ہے - بجائے نیلے تھوٹے کے کسپس کا محلول بن جاتا ہے - اس صفت یا قوت کا نام جس نے لوہے کو اخذ کر کے تانبے کو آزاد کر دیا 'گرفت' ہے - اسی طرح پر سلور نائٹریٹ (AgNO₃) کا محلول معمولی نمک کے محلول سے ترکیب پانے پر سلور کلورائیڈ (AgCl) بناتا ہے -



سوتیم نائٹریٹ سلور کلورائیڈ نمک سلور نائٹریٹ

یہاں پر اس صفت کے تحت چاندی (Ag) اپنے قدیمی دوست (NO₃) کا ساتھ چھوڑ کر کلورین (Cl) کا ساتھ دیتی ہے - اور مجبوراً سوتیم (Na) اپنے اولین دوست کو خدا حافظ کہہ کر (NO₃) کے ساتھ رشتہ اتحاد جوڑتا ہے - اس قوت کا نام جس نے سوتیم کو کلورین سے اور چاندی کو (NO₃) سے جھا کر دیا اور نئے رشتہ اتحاد پیدا کر دئے 'گرفت' ہے - ایک

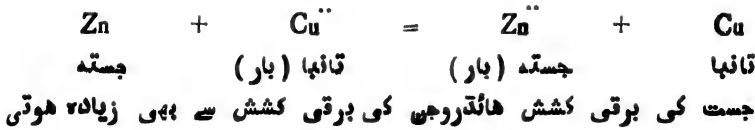
اور مثال دی جاتی ہے —



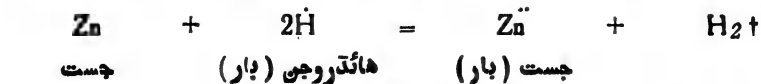
اس صورت میں جب ہائیڈروجن آئیڈائیڈ (HI) (۴۴۰°) کی تپش پر ہائیڈروجن اور آئیڈین میں منتشر ہوتی ہے تب یہ آخری دو عناصر پھر آپس میں مل جاتے ہیں اور ہائیڈروجن آئیڈائیڈ بنادیتے ہیں۔ ایک طرف (۴۴۰°) کی تپش ان دونوں عناصر کو منتشر کرتی ہے اور دوسری طرف ایک چھپی ہوئی کشش جس کا نام گرفت ہے ان دونوں کو پھر ملا دیتی ہے۔ اور نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ کبھی بھس فی صدی سے زیادہ ہائیڈروجن اور آئیڈین منتشر نہیں ہوتیں۔ ایسی ہی بے شمار مثالوں پر نظر ڈالنے سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا سبب ہے کہ کوئی سی دو یا ان سے زیادہ چیزیں کبھی تو آپس میں مل کر ایک نئی صورت پیدا کر لیتی ہیں اور کبھی دوسرے عناصر کی موجودگی میں یہ منتشر ہو کر نئے مرکبات یا عناصر پیدا کر دیتی ہیں۔ جستجو میں رہنے والے صاغ چھن سے نہیں بیٹھتے۔ مختلف خیالات آتے ہیں۔ کبھی تو یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ یہ کیمیاری کشش جو مختلف چیزوں کے درمیان میں رشتہ اتحاد پیدا کرتی ہے کہیں اُن جذبات سے تو مشابہ نہیں ہے جو دوست دوست میں یا دشمن دشمن میں پائے جاتے ہیں۔ وہ روم اور جسم کے پیچیدہ مسئلے پر غور کرتا ہے لیکن اس مشابہت سے بھی اُس کو تسلی نہیں ہوتی۔ وہ مقناطیسی کشش کے قوانین کی طرف فور کرتا ہے اور دیکھتا ہے کہ شمالی قطب اپنے مخالف قطب کو اپنے طرف کھینچتا ہے۔ لیکن کسی مقناطیس کے شمالی قطب سے کسی دوسرے مقناطیس کا شمالی قطب

دور ہٹ جاتا ہے۔ چونکہ یہ مقناطیسی کشش صرت فولاد کے مثل چند چیزوں کے واسطے مخصوص ہے اس خصوصیت نے اُس کے خیالات کو بھی محدود کر دیا اور وہ اب آگے بڑھتا ہے اور برق کی جانب متوجہ ہوتا ہے۔ مقناطیس کی طرح یہاں پر بھی اُس کو قوت برقی کی دو مخالف قسمیں ملتی ہیں لیکن ان کا دائرہ اثر مقناطیس کی طرح چند چیزوں پر محدود نہیں ہے۔ اب وہ اس فکر میں پڑتا ہے کہ گرفت کے مسئلے میں قوت برقی کس طرح ہر کام کرتی ہے۔ بیشمار پہلی تجربات کے بعد یہ اس پایہ ثبوت کو پہنچتا ہے کہ دنیا کی ہر چیز میں یہ دونوں متضاد برقی قوتیں مساوی طور پر موجود ہیں۔ اور ہر ایک کیمیائی تبدیلی دراصل اسی برقی قوت کے تحت بھی کام کرتی ہے۔ ہرزیلیس (Berzilius) فراتے (Fraday) اور دوسرے علما نے سائنس نے ایک سو برس قبل اس بات کو ثابت کر دیا تھا کہ تمام مرکبات اپنے محلول میں دو روانوں (ions) میں منتشر ہوجاتے ہیں اور ہر دو رواں علحدہ علحدہ ان ہی دو متضاد برقی قوتوں کے زیر اثر ہوتے ہیں۔ ایک رواں پر مثبت برق کا بار ہوتا ہے اور دوسرے پر منفی برق کا اثر ہوتا ہے۔ مثلاً نمک کے محلول میں سوڈیم اور کلورین روانوں کی ایک آمیزش ہوگی ($\text{NaCl} = \text{Na}^+ + \text{Cl}^-$) سوڈیم پر مثبت بار اور کلورین پر منفی بار ہوگا۔ یہ واضح رہے کہ سوڈیم اور کلورین کے جوہر برق کے زیر اثر معمولی سوڈیم اور کلورین کے جوہروں سے جو برق سے اثر پذیر نہیں رہتے اپنے اپنے خواص میں بالکل جدا ہوتے ہیں۔ برقیایا ہوا سوڈیم (Na^+) معمولی سوڈیم سے بالکل مختلف ہے اور جب تک یہ برقی قوت سے وابستہ ہے یہ اپنے حسب معمول خواص کا اظہار نہیں کرسکتا۔ یہ تسلیم کیا جاتا ہے کہ ان روانوں پر جو برقی بار موجود رہتے ہیں وہ مختلف عناصر میں مختلف تعداد میں معین رہتے ہیں۔ اور جس اُستواری اور مضبوطی سے یہ بار عناصر کے ساتھ وابستہ رہتے ہیں وہ بھی

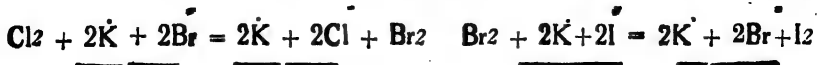
ہر صورت میں علعده + علعده ہے۔ پوٹاشیم (K) سوڈیم (Na) کلورین (Cl) وغیرہ ہر جو بار رھتے ہیں۔ وہ ان عناصر سے نہایت مضبوطی کے ساتھ وابستہ رھتے ہیں اور اس وجہ سے ان روانوں کو قوی روان (Strong ions) کہتے ہیں۔ برخلاف اس کے چاندی Ag, OH, Cy اپنے باروں کو آسانی کے ساتھ علعده کر دیتے ہیں۔ ان کو کم زور روان (Weak ions) کہتے ہیں۔ جس قوت سے کسی عنصر کا کوئی روان ان برقی بار کو اپنے سے وابستہ رکھتا ہے وہ قوت برقی کشش یا برقی گرفت (Electrical affinity) کہلاتی ہے۔ روانوں پر برقی کشش زیادہ رھتی ہے اس لئے اُن کو خالص حالت میں تیار کرنا مشکل ہوتا ہے۔ کیوں کہ وہ علعده ہوتے ہی فوراً دوسرے عناصر یا مرکبات سے مل جاتے ہیں۔ برخلاف اس کے کم زور روان آسانی سے تیار ہو جاتے ہیں۔ جب کسی قوی روان کا عنصر کسی کم زور روان کے عنصر سے ملتا ہے تو آخر الذکر روان کا برقی بار اول الذکر عنصر پر منتقل ہو جاتا ہے۔ مثال کے طور پر جست پر برقی کشش زیادہ تیز ہوتی ہے بمقابلہ تانبے کے۔ ایسی صورت میں اگر تانبے کے کسی ٹک کے محلول میں جست ڈال دیا جائے تو تانبا علعده ہو جائے گا اور تانبے کا برقی بار جست پر منتقل ہو جائے گا۔



ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جست ہائڈروجن کو ہلکے قرشے سے نکال دیتا ہے۔



اسی طرح پر کلورین برومین کو اور برومین آیوڈین کو ان عناصر کے نمکوں کے محلولوں سے علعده کر دے گا۔



اس برقی کشش کے استحکام کے لحاظ سے عناصر کی ایک فہرست حاشیہ پر دی جاتی ہے۔

ابھی تک کیٹھوٹی (Cathode) لیٹارڈی (Lenard)

اور رنٹگنی (Rontgen) شعاعوں کا انکشاف نہیں ہوا تھا۔

ان شعاعوں کے انکشاف پر برقیے کا ظہور وجود میں آنا

ہے۔ اور کیٹھوٹی شعاعوں کی نسبت یہ خیال کیا گیا کہ

وہ اس گیس کے چھوٹے چھوٹے ذرات پر

مشتمل ہیں جو نلی میں ملا پیدا کرنے کے بعد تھوڑی

سی باقی رہ جاتی ہے۔ اور ان ذرات پر منفی برق کا بار

ہے۔ لیکن یہ خیال غلط ثابت ہو گیا کیونکہ ان برقیوں

کا کوئی تعلق گیس کے ساتھ نہ تھا۔ جے۔ جے۔ تھا مسن

نے جلد صحیح رائے کا اظہار کر دیا۔ ان کے خیال کے

موجب یہ برقیے جوہر کے منتشر ہونے پر پیدا ہوتے

ہیں۔ ان پر منفی برق کا بار رہتا ہے اور اپنے وزن میں

ہائڈروجن کے جوہر سے تین ہزار گنا چھوٹے ہوتے ہیں۔

مختلف گیس سے جو برقیے بنے ان میں آپس میں

کوئی فرق نہیں ہوتا۔ اس بناء پر یہ خیال کیا گیا کہ

تمام گیسوں میں ایک ہی قسم کے برقیے مشعرک ہیں۔

مرطوب ہوائیں اس برقیوں کی ایک بار بار مارنے پر پانی

کے چھوٹے چھوٹے ذرات ہر برقیے کے چاروں طرف

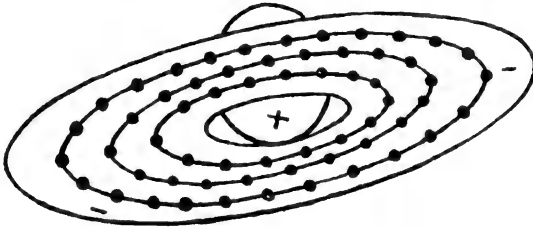
چمٹ جاتے ہیں اور پانی کی بوندیں برس پڑتی ہیں۔

امریکہ کے ماہرے سائنس نے آرتے بادلوں پر برقیوں

کی بار بار کر ہمگی طور سے پانی برسایا ہے۔

Elements	عناصر
Caesium	سیزیئم
Rubidium	رڈیڈیم
Potassium	پوٹاشیم
Sodium	سڈیم
Lithium	لیتھیم
Barium	باریم
Strantium	اسٹرانڈیم
Calcium	کیلشیم
Magnesium	مگنیشیم
Aluminium	الومینیم
Chromium	کرومیم
Manganese	مینگنیٹ
Zinc	جسٹ
Iron	لہوا
Cobalt	کوبلت
Nickel	نکل
Tin	رائگ
Lead	سیسہ
Hydrogen	ہائڈروجن
Antimony	انتی مونی
Bismuth	بسمت
Arsenic	آرسینک
Copper	تانبہ
Mercury	پارہ
Silver	چاندی
Palladium	پلیڈیم
Platinum	پلیٹینم
Gold	سونا
Iridium	ایرڈیم
Rhodium	روڈیم
Osmium	آسمیم
Silican	سلیکون
Carbon	کاربن
Boron	بورون
Nitrogen	نائٹروجن
Selenium	سلیمن
Phosphorus	فاسفورس
Sulphur	گندھک
Iodine	آیوڈین
Bromine	برومین
Chlorine	کلورین
Oxygen	اکسیجن
Fluorine	فلورین

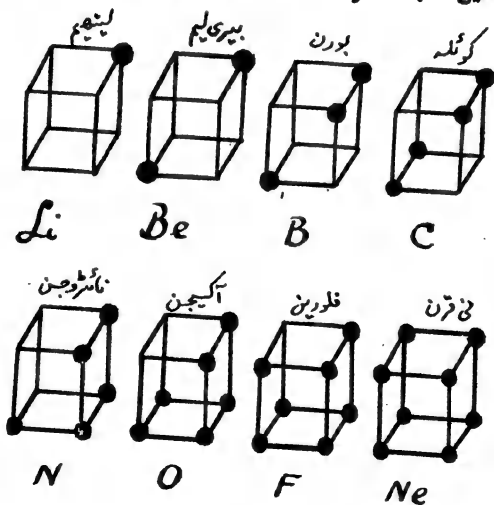
منفی برقیوں کے ساتھ ساتھ دوسری شعاعوں میں مثبت برقیے بھی دریافت ہوئے ہیں۔ مثبت برقیوں کا وزن منفی برقیوں سے قریب قریب سترہ سو گنا ہوتا ہے۔ اگرچہ مثبت برقیوں کی نسبت ابھی تک بہت کم معلومات حاصل کی گئی ہیں — اس نکتہ نظر سے عنصر ایسے ذروں کا مجموعہ ہوا جن کو جوہر کہتے ہیں اور ہر جوہر ذروں میں منقسم ہو سکتا ہے۔ ایک تو مرکز پر قائم رہنے والا حصہ جس کو مرکزہ (Nucleus) کہتے ہیں۔ اور دوسرا حصہ ان برقیوں کا جو مرکزہ کے چاروں طرف گردش کرتے ہیں اور ان پر منفی بار ہوتا ہے۔ مختلف عناصر میں برقیوں کی تعداد اور گردش کے راستے مختلف ہوتے ہیں۔ ان برقیوں کی نسبت خیال کیا جاتا ہے کہ وہ بڑی تیزی سے ایک گولے کے مرکز کے چاروں طرف ایک خاص ہم مرکز بیضوی راستوں پر گردش کرتے رہتے ہیں۔ چونکہ ان پر منفی بار رہتا ہے لہذا گردش کے دوران میں وہ ایک دوسرے کو ہٹاتے رہتے ہیں۔ اور چونکہ مرکزے پر مثبت بار رہتا ہے لہذا وہ ان برقیوں کو اپنی طرف کھینچتا ہے۔ مگر ان کی تیز رفتاری کی وجہ سے ان میں ایک قسم کی مرکز گریز قوت (Centrifugal Force)



جے جے تھامسن کے خیال کے بموجب ہر ذرے ایک گولے کے گرد جس پر مثبت بار ہے ہم مرکز بیضوی راستوں پر گردش کر رہے ہیں۔ اور یہ صورت مانند (زحل) سیارے کی ہے —

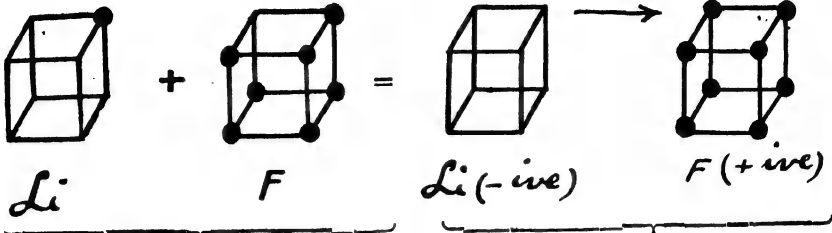
پیدا ہو جاتی ہے۔ جو ان کو مرکز سے ایک خاص فاصلے پر گردش میں رکھتی ہے۔ اوئی (Lewis) اور لانگ نیر (Longnair) اس مسئلے پر تبصرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ یہ برقیے متحرک نہیں ہیں بلکہ مرکزے کے اطراف مختلف ہم مرکز کھوکھلے مکعب کے گوشوں پر آویزاں رہتے ہیں۔ ان منفی بار دار برقیوں کی تعداد اتنی ہی ہوتی ہے جتنی مرکزے پر مثبت بار دار آراء

ہر قیے جن کو بدویہ (Proton) کہتے ہیں، ہوتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں یہ تعداد کسی عنصر کے جوہری عدد (Atomic Number) کے مساوی ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر ہیلیم پر دو ہر قیے رہتے ہیں اور اس کے مرکزے پر اس طرح دو مثبت بار والے بدویے آزاد ہوجاتے ہیں۔ اور یہی ہیلیم (He) کا جوہری عدد ہے۔ ان ہر قیوں کی نسبت خیال کیا جاتا ہے کہ وہ مرکزہ کی متضاد سمتوں میں آویزاں رہتے ہیں۔ جب بیرونی مکعب کے تمام گوشوں پر یہ ہر قیے آویزاں ہوجاتے ہیں اور کوئی گوشہ خالی نہیں رہتا تب اس کے اطراف دوسرے ہم مرکز مکعب کا وجود ہوتا ہے۔ اور اس نئے مکعب کے ہر گوشے تمام گوشے بالترتیب ایک ہر قیے سے لے کر آتھ ہر قیوں میں ہر ہوجاتے ہیں۔ جن جو یہ ہر قیے گوشوں پر لٹکتے جاتے ہیں اسی طرح نئے عناصر وجود میں آتے جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر ہیلیم (He) کے اوپر جو ہم مرکز مکعب کا خول چڑھتا ہے اور اس مکعب کے گوشوں پر ایک سے آتھ ہر قیے آویزاں ہوجاتے ہیں تب مندرجہ ذیل عناصر وجود میں آ جاتے ہیں —



ان عناصر کے جوہروں کا خالہ جو ہیلیم پر مکعبی خول چڑھنے پر پیدا ہوتے ہیں اور ان کے گوشوں پر ہر قیے آویزاں ہونے پر ہر مختلف عناصر میں تبدیل ہوجاتے ہیں —

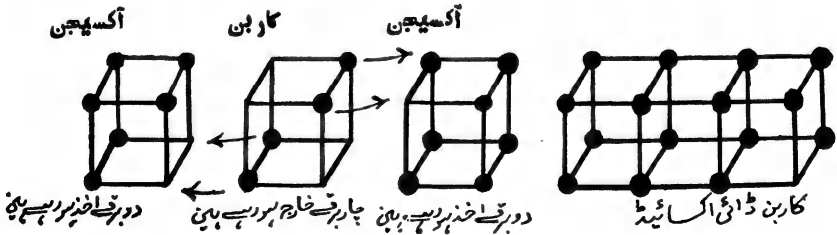
اس طرح پر لیتھیم سے ابتدا ہوتی ہے اور یہ سلسلہ نیاں پر جاکر ختم ہو جاتا ہے۔ اب ان پر تیسرا ہم مرکز مکعبی خول چڑھتا ہے اور دوسرے عناصر وجود میں آتے ہیں۔ پس اگر ہم کسی طرح ان مکعبی خولوں کے چڑھانے اور ان کے گوشوں پر برقیہ آویزاں کرنے پر قدرت حاصل کر لیں تو ہم عناصر کو بھی ایک دوسرے میں تبدیل کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ اور انسان نہایت آسانی سے تانبے یا سیسے کی مثل کم قیمت دھاتوں کو سونے یا چاندی کے مثل قیمتی دھاتوں میں تبدیل کر سکے گا۔ اور اپنے دیرینہ خیالات کو عملی جامہ دینے میں کامیاب ہو جائے گا۔ اس سمت میں سرتورز کوشش کی جا رہی ہے اور بہت کچھ کامیابی حاصل ہو چکی ہے۔ یہ معلوم ہو چکا ہے کہ ان برقیوں میں کمی یا زیادتی صرف ان برقیوں پر ہو سکتی ہے جو سب سے اوپر کے مکعبی خول پر آویزاں ہوتے ہیں۔ اگر کسی خول پر ایک برقیہ کی کمی ہو جاتی ہے تو اس کو برقی مثبت (Electro Positive) اور اگر زیادتی عمل میں آتی ہے تو برقی منفی (Electro Negative) کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ یہ مسئلہ مندرجہ ذیل مثالوں سے صاف ہو جاتا ہے۔ جب لیتھیم اور فلورین عناصر کے درمیان ترکیب کیمیاوی وقوع میں آتی ہے تب لیتھیم فلورائیڈ (Lif) کا مرکب اس طرح پر بنتا ہے کہ لیتھیم ایک برقیہ خارج کرتا ہے اور فلورین اس کو حاصل کرتا ہے۔ اب چونکہ لیتھیم کے جوہر سے ایک برقیہ خارج ہو جاتا ہے لہذا اس میں ایک بدویہ کی زیادتی ہو جاتی ہے (اولاً برقیہ اور بدویہ مساوی تعداد میں موجود تھے) اور اب اس جوہر پر مثبت برق کا اثر ظاہر ہو جاتا ہے۔ اس کے بالکل خلاف فلورین پر اثر پڑتا ہے۔ یعنی وہ منفی برق کا اثر ظاہر کرتا ہے۔ اور اسی وجہ سے برقی منفی کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ کیمیاوی تحریر میں یہ تبدیلی اس طرح پر ظاہر کی گئی ہے —



اس وقت دونوں عناصر بالکل تعدیلی (Neutral) ہیں یعنی ان پر منفی اور مثبت برق نے ایک دوسرے کے اثر کو بالکل زائل کر دیا ہے۔ چونکہ ہر جوہر میں مثبت اور منفی برقیے مساوی تعداد میں ہوتے ہیں۔

اب ایک پر منفی بار ہے اور دوسرے پر مثبت بار اور دونوں متضاد برق کی کشش سے متحد ہو کر نیچھیم فلورائیڈ (LiF) بناتے ہیں۔ اگرچہ بظاہر دونوں علیحدہ علیحدہ معلوم ہوتے ہیں۔

اور چونکہ ان دونوں عناصر میں صرف ایک برقیہ خارج کرنے یا حاصل کرنے کی صلاحیت ہے لہذا ان کو ایک گرفتہ عناصر کہتے ہیں۔ ایسی ہی دلیل کے تحت آکسیجن دو گرفتہ اور کاربن چار گرفتہ عناصر قرار پائے ہیں۔ مثال کے طور پر کاربن اور آکسیجن کی کیمیاوی ترکیب دکھائی جاتی ہے۔

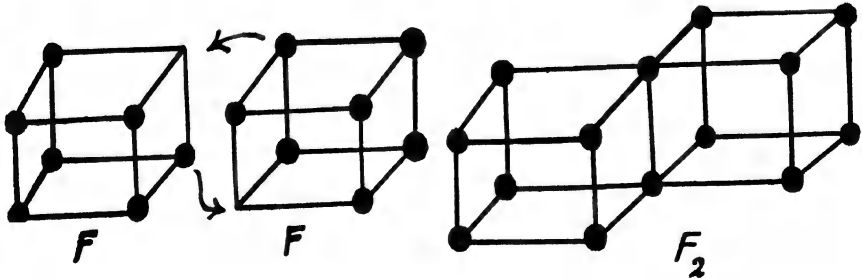


اوپر بیان کئے ہوئے دو عناصر میں کاربن اپنے سے چار برقیے خارج کرنے کی اور آکسیجن اپنے میں دو برقیوں کو اخذ کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ لہذا کاربن بہ نسبت آکسیجن کے برقی منفی ہے۔ آکسیجن دو گرفتہ

اور کاربن چہار گرفتہ ہوا۔ ذیل میں اپنی گرفت کے لحاظ سے چند مشہور
عناصر کی گرفت کی جدول دی جاتی ہے۔

یک گرفتہ	دو گرفتہ	سہ گرفتہ	چہار گرفتہ	پنج گرفتہ	شش گرفتہ	ہفت گرفتہ
لیتھیم	آکسیجن	بورن	کاربن	نائیٹروجن	گلدھک	کلورین
سوتیم	میگنیشیم	الہیم	قین	فسفورس		برونین فلورین
پوتیشیم	کیلشیم		سیسہ	اینٹی مٹی		
کلورین	جستہ					
فلورین	بیریم					
برونین	پارہ					
آئدین	سونا					
چاندی						

یہ بھی ممکن ہے کہ کسی عنصر کے دو جوہر جن کے متعین ہوں کے
گوشوں پر جبکہ خالی ہے آپس میں متحد ہو جائیں اور اس طرح اُس عنصر
کا مستحکم سالمہ بنا دیں۔



یہاں پر فلورین جوہر کے دونوں خالی گوشوں پر دو برقیہ مشترکہ

طور پر آریزاں ہو کر فلوریس کا مستحکم سالہ بنا رہے ہیں —
لوئی اور لانگ نیر کے خیالات ہے کہ بوقیے بیضوی ہم مرکز راستوں پر بڑی رفتار
سے گردش کر رہے ہیں۔ ہے۔ ہے تھامسن کے اصول کے تحت بہت سے دریافت
شد مسائل مثلاً کیمیائی ترکیب کیسے بدل میں آسکتی ہے 'گرفت' تابکاری
دھاتوں اور دھاتوں کی برقی گرفت کے لحاظ سے تقسیم وغیرہ نہایت
خوبی سے واضح ہو جاتے ہیں لیکن سینڈلیف کے کلیہ ادوار (Periodic Law)
کی وضاحت میں یہ اصول کام نہیں دیتا۔ تھامسن اس امر کی بھی خاطر خواہ
وضاحت نہ کر سکا کہ مثبت برق کا اجتماع کہاں پر ہوگا اور برقیوں کا
راستہ ہمیشہ ہم مرکز بیضویوں میں کیوں ہوگا۔ برخلاف اس کے لانگ نہرلوئی
کے اصول کے تحت برقیے متحرک نہیں ہیں بلکہ ساکن ہیں۔ کلیہ ادوار کی
وضاحت اس اصول کے تحت نہایت خوبی سے ہو جاتی ہے —

فن دباغت

(۳)

از

(حضرت دباغ سیلانی)

کچا چہڑا اور اس کی حفاظت

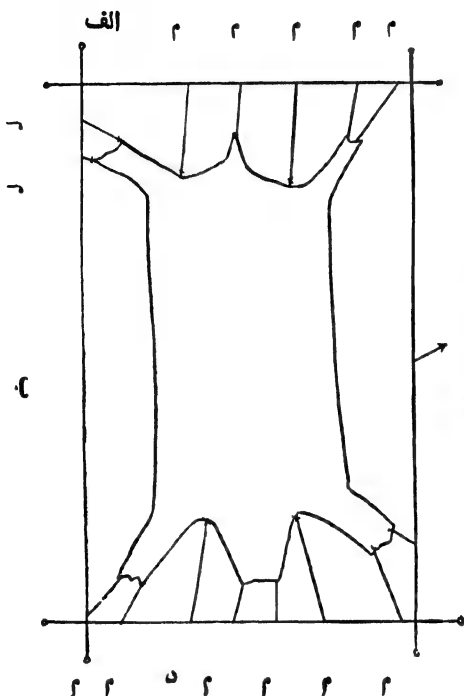
ایک زمانہ تھا جب کسی ملک یا سلطنت کی مالی حالت کا اندازہ اس کی فوج کی تعداد اور سپہ سالار کی شجاعت اور بہادری سے کیا جاتا تھا۔ لیکن موجودہ زمانے والے کہتے ہیں کہ تجارت سلطنت کی پیشوا ہے۔ اس لئے کسی ملک یا سلطنت کی مالی حالت کا اندازہ کرنا ہو تو سب سے پہلے یہ دیکھنا چاہئے کہ ملک کی خام پیداوار کیا ہے اور یہاں کے باشندے ان خام اشیا کو جو ان کے روزانہ کے استعمال سے بچ رہتی ہیں غیر ملک کے لئے مفید بنا کر باہر بھیج سکتے ہیں یا نہیں۔ اگر یہ ملک کی قدرتی پیداوار کا بجا استعمال کرتے ہیں اور ان کی چیزیں بناکر غیر ملک سے تجارت کرتے ہیں تو ان کو قابل سمجھا جاتا ہے اور اگر صرف خام اشیا دیگر ممالک کو بھیجتے ہیں اور جب انہیں خام اشیا سے بنی ہوئی چیزیں ان ممالک کی قیمت سے دیکھی، چونکہ قیمت دے کر خریدتے ہیں تو ان کو کم قابل سمجھا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر روئی، سن (Jute) گیہوں اور اسی وغیرہ پر غور کیجئے کہ یہ کس قیمت

سے فروخت کی جاتی ہیں اور ان سے جو مختلف اشیا مثلاً کپڑے، مصنوعی ریشم، بسکت، وارنش وغیرہ بن کر آتی ہیں ان کو کیا دام دے کر خریدتے ہیں تو اندازہ ہوگا کہ جیت میں کون رہا یا فائدے میں کون۔ اس لئے ہر ملک اور قوم کا فرض ہونا چاہئے کہ خدا کی دی ہوئی نعمتوں کا بجا استعمال کرے اور ملک قوم اور بادشاہ وقت کو اس طرح فائدہ پہنچائے —

قدرت کی دی ہوئی نعمتوں میں زمین کی پیداوار سونا، چاندی، لوہا، کوئلہ، درخت، پھل، پھول، گائے، بھینس، بکری، بھیڑ، وغیرہ وغیرہ بے شمار نعمتیں ہیں اور یہاں صرف ایک چیز یعنی خام چرم کا ذکر کیا جاتا ہے جو ہندوستان میں کثرت سے ہوتی ہے —

ہندوستان کے زراعتی ملک ہونے کی وجہ سے اس کے بیشتر باشندے زراعت کا کام کرتے ہیں اور بیل، بھینس، وغیرہ سے کاشت کا کام لیتے ہیں۔ مرنا، جینا، سب جاندار چیزوں کے ساتھ لگا ہوا ہے اس لئے ہر شہر موضع اور ہر چھوٹی سے چھوٹی آبادی میں چار کا آباد ہونا نہایت ضروری سمجھنا چاہئے۔ یہ غریب کاشتکاروں کی جوتیاں بناتا ہے۔ ان کی مرمت کرتا ہے اور ان کو آب پاشی کے لئے سوٹھہ، چرس، یا کوہر چھڑے کی بنا کر دیتا ہے جس سے کسان اپنی فصل کو پانی دے کر زیادہ فائدہ اٹھاتا ہے۔ جب گائے، بھینس، بھمار ہوتی ہے تو یہ مویشیوں کے تاکثر کا کام دیتا ہے اور جب ان میں سے کوئی مرجاتا ہے تو اس کو کسان کے مکان سے بیشتر اس سے کہ وہ بدبو دینے لگے لے جاتا ہے۔ اس کی کھال کھینچ کر کسانوں کی جوتی، سوٹھہ وغیرہ بناتا ہے۔ اور ہڈی، سینگ وغیرہ فروخت کر کے اپنی شکم پوری کرتا ہے۔ یہ

اُس زمانہ کا ذکر ہے جب کسان صاحب اور ان کے ساہوکار زمین دار صاحب اور وکیل صاحب یا پتواری صاحب سال میں صرف ایک جوتا استعمال کرتے تھے اور یہ سال بھر کے لئے ان کو بالکل کافی ہوتا تھا۔ مگر اب تو زمانہ بالکل بدل گیا ہے۔ وکیل صاحب اور پتواری صاحب وغیرہ کو ایک نہیں بلکہ دو دو بوت ایک سیاہ، ایک باداسی، اسی قدر شوز، سلیپر اور ہات سلیپر اور چمڑے کے صندوق وغیرہ وغیرہ کے بغیر کام ہی نہیں چلتا ہے۔ مگر غریب چمار کے لئے یہ ایک بہت بڑا کام ہو گیا۔ اس لئے ساتوں قومیں اس کا ہاتھ بٹانے لگی ہیں اور مستر این ایس۔ ٹی۔ چاری میسور کورم اور کلکتہ کورم ٹینڈک کے مشہور و معروف دباغ اور مستر پنڈت آت ایسٹرن انڈیا ٹینریز کمپنی بمبئی کے ناسور دباغ جو برہمنوں میں چوٹی کے برہمن مانے جاتے ہیں۔ ایسی ہستیاں بھی ان کی اسدا کرتے ہوئے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ غریب چمار کی چھوٹی سی تجارت ایک چھوٹے سے چھوٹے موضع سے چل کو بڑے بڑے شہروں میں آباد ہو گئی اور مقدس ہاتھوں میں پہنچ کر اس کو وہ فروغ ہوتا جاتا ہے کہ چمار چمار ہی رہا اور اب اس اکیلے کے کام کو ساتوں ذاتیں مل کر مشکل سے انجام دے رہی ہیں۔ موضع سے قصبہ اور قصبے سے شہر اور شہر سے ملک در ملک چمڑے کی تجارت ہونے لگی تو خام اشا (کھال) کی تلاش، تحقیق اور حفاظت کے مسئلہ پر غور کرنے کی ضرورت لاحق ہوئی اور اس نتیجہ کو پہنچے کہ ہندوستان سے خام چرم بیرون ملک سب سے پہلے تینہارک کے لوگوں نے سنہ ۱۶۴۴ ع میں روانہ کیا (ملاحظہ ہو اکبر تا اورنگ زیب از مورلینڈ) اور یہ تجارت دن بدن ترقی کرتی گئی۔ چنانچہ سنہ ۱۸۲۹ اور ۱۸۳۰ ع میں قریباً ۹۳۰۰۰ فرد قیامتی قریباً ایک لاکھ چھ ہزار روپیہ کی اور بکری



بانس کا چوکھٹا جس میں

کھال تان کر فرسہ بنا یا جاتا ہے

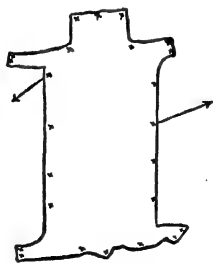
(الف - ب - ج - د)

م رسی جس سے کھال

فرسہ پر تانی جاتی ہے —



پتھر کی دھوڑی کھال



لکڑی کی کھونٹی یا لوہے

کی میخ سے کھال زمین

پر قائم

کی کھال قریباً ۲۷۰۰۰۰۰ فرد قیمتی قریباً (۹۴۰۰۰) روپیہ کی بیرون ملک روانہ کی گئی اور تقریباً سو برس پہلے ہندوستان کا کچھا چمڑا دوسری ولایتوں کو بھی جاتا تھا۔ ذیل میں ایک نقشہ درج کیا جاتا ہے جس سے معلوم ہوگا کہ سنہ ۱۸۵۱ ع ۱۸۵۲ ع میں ہندوستان سے کن کن ولایتوں کو کتنی کتنی تعداد میں اور کن کن جانوروں کی کھالیں کلاکتہ کی بندرگاہ سے روانہ کی گئیں (ملاحظہ ہو نقشہ نمبر ۱) —

نقشہ نمبر ۱ جس سے یہ معلوم ہوگا کہ ۱۸۵۱ - ۵۲ میں کس قدر کچھا چمڑا

دیگر ولایتوں کو ہندوستان سے بھیجا گیا —

نام ملک	کانے کا چمڑا		پھینس کا چمڑا		بکری کا چمڑا	
	تعداد فرد	قیمت	تعداد فرد	قیمت	تعداد فرد	قیمت
(۱) انگلستان	۱۸,۵۷,۶۸۱	۶,۲۹,۷۳۶	۲,۷۳۱	۹,۵۲۳	۱۸,۸۶۹
(۲) امریکہ	۱۵,۷۳,۸۰۳	۶,۸۶,۸۲۲	۲۸,۳۰۲	۳۹,۸۳۵	۹۹,۶۷۰
(۳) جفیرا	۱,۵۵,۵۶۳	۱,۳۷,۸۷۳
(۴) فرانس	۱,۱۶,۳۸۶	۹۱,۰۶۵
(۵) ہمپرک	۲۱,۳۴۳	۲۰,۷۲۳
(۶) ایٹ وروپ	۱۱,۳۰۳	۱۱,۳۰۳
(۷) ٹریسٹ	۲۹,۶۸۲	۲۹,۷۶۱
میزان	۳۷,۳۷,۲۸۰	۲۵,۷۷,۵۲۷	۶۰,۷۱۵	۶۰,۷۹۵	۱,۱۸,۵۳۹

نقشہ نمبر (۲) سنہ ۷۷ - ۱۸۷۶ ع یعنی ۲۵ سال بعد کا نقشہ

پائی آنکھ روزیہ	اوسط قیمت فی فرد	قیمت لاکھوں میں	تعداد فرد	
۲ ۸ ۰		۱,۳۵,۰۰۰۰۰	۵۱,۹۱,۷۶۲	گائے بھینس کا چمڑا
۰ ۱۲ ۰	" "	۱۶,۰۰,۰۰۰	۲۳,۱۳,۲۹۸	بکری بھیڑی کا چمڑا

سنہ ۷۳ - ۱۸۷۲ ع میں قحط ہونے کی وجہ سے قریباً اٹھاسی لاکھ چمڑے اور اس کے بعد سنہ ۱۹۰۰ ع کے قحط عظیم میں ایک کروڑ سے زیادہ چمڑے ہندوستان سے باہر ممالک کو روانہ کئے گئے۔ اوسطاً ساٹھ لاکھ سے اسی لاکھ فرد تک ممالک غیر کو ہندوستان سے بھیجا جاتا تھا۔ خیال کیا جاتا ہے کہ اب بھی کم و بیش اسی تعداد میں چمڑا بیرونی ممالک کو جاتا ہے۔ ان اعداد میں بھیڑی، بکری کی کھال شریک نہیں ہے جس کا کہیں اور ذکر کیا جائے گا۔

سنہ ۲۵ - ۱۹۲۴ ع میں گائے بھینس کا شمار کیا گیا تھا تو ہندوستان میں ان کی تعداد کا تخمینہ اُنیس کروڑ بتایا گیا تھا۔ پیداوار کے متعلق مبصرین کی رائے میں آہستہ آہستہ بہت اختلاف ہے۔ بعض کا کہنا ہے کہ کم از کم سالانہ پیدائش تین کروڑ ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ صرف دو کروڑ ہے لیکن ہر شخص اپنا اندازہ خود لگاتا ہے اس کے لیے نقشہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔ جس سے مویشی کی تعداد ان کی اوسط عمر سے پیدائش کا اندازہ ہر شخص کر سکتا ہے۔

نام مویشی تعداد اوسط عمر تخیلہ پیدائش

گائے بھینس اُنیس کروڑ ۱۴ سے ۶ سال تین سے چار کروڑ

بکری پانچ کروڑ ۳ سال ۱ سے ۱۴ کروڑ تک

بھیڑ ۳ کروڑ تین سال ۱ سے ۱۴ کروڑ

تحت سالہ جانوروں کی بیماری وغیرہ ایسے اسباب ہیں کہ بہتر سے بہتر تخیلہ بھی صحیح نہیں ہو سکتا لیکن اوپر جو کچھ بیان کیا گیا ہے اس سے اندازہ کیا گیا تو ہندوستان میں دو کروڑ سے تین کروڑ تک کی سالانہ پیدائش مویشی ہماری ضروریات کے لئے بالکل کافی سمجھنا چاہئے۔

بکری، بھینس کے متعلق یہ مانی ہوئی بات ہے کہ ہندوستان میں تمام دنیا جہاں سے بکری کی کھال زیادہ تعداد میں ہوتی ہے۔ مہک وائر صاحب اپنی کتاب ”ہلک کی تجارت پر تمصرہ“ میں فرماتے ہیں کہ دنیا بھر کی بکریوں کی کھالوں کا ایک تہائی حصہ ہندوستان میں ہوتا ہے۔ ارنالڈ صاحب کا قول ہے کہ بکری کی کھال کی پیداوار ہندوستان میں سب سے زیادہ ہوتی ہے۔ بکری کی کھالوں کی پیداوار ہندوستان میں تقریباً پونے تین کروڑ

اور بھینس کی تقریباً ایک کروڑ کے سمجھی جاتی ہے۔

اوپر جو کچھ بیان کیا گیا ہے اس سے تمام ہندوستان میں ریاستوں کو مستثنائی کر کے گائے، بھینس، بکری اور بھینس کی کھال کی پیداوار تقریباً بیس کروڑ روپیہ سالانہ کی ہے اور اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ ملک کی یہ کس قدر ضروری اور کیسی گراں قدر دولت ہے۔

نقشہ نمبر (۳) کس قدر چمڑا کن ممالک کو جاتا ہے

سنہ ۱۹۲۸-۲۹ ع	سنہ ۱۹۲۷-۲۸ ع	سنہ ۱۹۲۶-۲۷ ع	کائے کا کچا چمڑا
ٹن	ٹن	ٹن	
۱۲۷۸۳	۱۶۳۳۳	۹۶۵۰	(۱) جرمنی — — —
۳۷۹۶	۳۳۴۳	۵۲۲۳	(۲) اٹلی — — —
۲۰۴۳	۱۵۴۸	۲۵۸۱	(۳) اسپین — — —
۱۱۸۳	۲۸۳۵	۱۰۳۲	(۴) انگلستان — — —
۱۵۸۷	۵۵۵	۳۶۹	(۵) نیدر لینڈس — — —
۱۰۳۷	۲۷۹	۳۵۵	(۶) یونان — — —
۱۰۱۳	۲۳۰	۱۲۳	(۷) بلجیم — — —

ٹن	ٹن	ٹن	بکری کا چمڑا
۱۸,۶۱۶	۱۵,۶۸۹	۱۵,۵۸۲	(۱) امریکہ — — —
۸۸۰	۷۱۲	۱,۵۰۷	(۲) فرانس — — —
۶۳۱	۸۹۶	۱,۰۱۱	(۳) انگلستان — — —
۳۸۵	۶۵۷	۵۶۲	(۴) نیدر لینڈس — — —
۲۸۱	۳۹۸	۱۹۳	(۵) جرمنی — — —

نقشہ نمبر (۳) کس قدر چھڑا کن ممالک کو جاتا ہے

سنہ ۲۶ - ۲۷	سنہ ۲۸ - ۲۹	سنہ ۲۹ - ۳۰	بھینس کا چھڑا
ٹن	ٹن	ٹن	
۱,۵۵۱	۲,۵۲۸	۲,۲۷۱	(۱) جرمنی — — —
۶۲۳	۶۳۹	۱,۰۳۶	(۲) بلگیریا — — —
۵۵۰	۱,۹۷۲	۹۸۰	(۳) امریکا — — —
۳۶۷	۵۳۵	۶۲۵	(۴) ترکی — — —
۳۳۳	۸۷۹	۳۹۸	(۵) انگلستان — — —

نقشہ نمبر ۳ سے ثابت ہوا کہ کس تعداد میں ہندوستان سے سالانہ کھائیں

غیر ملکوں کو جاتی ہیں۔ اور باقی کے متعلق یہ سمجھنا چاہئے کہ یہ ملک

میں استعمال کے لیے یا مدراس اور بھٹائی اور ان کے قرب و جوار کی ریاستوں

میں مثلاً ریاست حیدرآباد، مہسور، بنگلور وغیرہ میں جہاں آنول، ترورما یا

آورم کے درخت کثرت سے ہوتے ہیں پختہ کر کے انگلستان، امریکا اور جرمنی

وغیرہ ملکوں کو روانہ کی جاتی ہے۔ نقشہ نمبر ۴ سے ظاہر ہوگا کہ پکا کیا نقشہ نمبر ۴

سنہ ۱۹۲۸-۲۹ ع	سنہ ۱۹۲۷-۲۸ ع	سنہ ۱۹۲۶-۲۷ ع	بچھیل (کٹے بچھڑکی کھال)		
ٹن	ٹن	ٹن			
۳۲۶	۲۹۳	۱۱۱	—	—	(۱) جرمنی
۲۷۸	۲۳۳	۲۲۱	—	—	(۲) اسپین
۲۸۲	۲۱۱	۱۰۸	—	—	(۳) اٹلی
۱۸	۲۲	۲۰	—	—	(۴) انگلستان

نقشہ نمبر ۵

ٹن	ٹن	ٹن	(بھیری کا چمڑا)		
ٹن	ٹن	ٹن			
۸۳۰	۱۲۳	۳۳	—	—	(۱) جرمنی
۱۱۸	۱۱۱	۲۰	—	—	(۲) اٹلی
۱۶۸	۷۳	۷	—	—	(۳) فرانس
۱۱۱	۳۶	۶	—	—	(۴) امریکا
۵۲	۲۲	۶۶	—	—	(۵) انگلستان

نوٹ۔ ٹن۔ ایک ٹن سٹائٹس من کا ہوتا ہے۔ اور ایک من تراسی پونڈ کا ہوتا ہے۔ ایک ٹن ۲۲۳۰ پونڈ کا ہوتا ہے۔
نقشہ سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ کس ملک کو ہندوستان کا کونسا چمڑا زیادہ تعداد میں جاتا ہے۔

ہوا چھڑا کس قدر بیرونی ممالک کو بھیجا جاتا ہے۔ کانپور پنجاب اور دیگر اضلاع کا پکا یا ہوا چھڑا ہندوستان کی ضرورت پوری کرتا ہے اور ملک سے بہت کم باہر جاتا ہے۔

بیس کروڑ روپیہ کے خام چھڑے کے متعلق یہ خیال کیا جاتا ہے کہ قریباً پچاس فی صدی اس میں کا مختلف ولایتوں کو کچا روانہ کیا جاتا ہے۔ اور باقی ماندہ ہندوستان میں پکا کر کے استعمال کیا جاتا ہے۔ جو نقشے جو درج کیے گئے ہیں ان سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ کچا اور پکا چھڑا کس قدر ہندوستان سے باہر جاتا ہے۔ اگر اس کی قیمت کو کل بیس کروڑ روپیہ میں سے کم کر دیا جائے تو ہندوستان کم و بیش دنیا کی ایک تہائی گالے اور بیہنس کے چھڑے کی ضرورت کو پورا کرتا ہے اور بکری بھیڑ اور خاص کر بکری کا چھڑا ایک تہائی سے بھی زیادہ دیگر ولایتوں کو بھیجتا ہے۔ ہندوستانی مال کچا یا پکا جیسا بھی اس وقت بھیجا جاتا ہے انگلستان جرمنی اور امریکہ میں اچھا سمجھا جاتا ہے۔ یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ پکا کیا ہوا چھڑا تقریباً کل صرت مدراس سے ولایت کو جاتا ہے اور بمبئی وغیرہ کا حصہ اس میں صرت ۱۰ یا ۱۲ فی صدی ہوتا ہے۔

کچا چھڑا ہندوستان کی ضرورت سے بہت زیادہ پیدا ہوتا ہے۔ یہ پہلے بیان کیا گیا ہے اور اس کا مطالب یوں سمجھنا چاہئے کہ ملک میں اس قدر چھڑا پکا کرنے کے کارخانہ نہیں ہیں جو سب کو پکا کر سکیں اس لیے باقی ماندہ چھڑے کو ہی ملک سے باہر روانہ کر دیا جاتا ہے۔ چھڑا خاص موسم کا اچھا سمجھا جاتا ہے مثلاً بارش کے بعد ستمبر سے لے کر آخر مارچ تک جو چھڑا آتا ہے وہ اور سردیوں سے بہت اچھا ہوتا ہے۔ اس لیے ولایت سے خریداری انہیں دنوں میں ہوتی ہے اور اپریل سے لے کر اکتوبر تک خرید بالکل بند رہتی ہے۔ وجہ یہ

معلوم ہوتی ہے کہ اس زمانہ میں جانور دبلے ہوتے ہیں اور سردی میں موتے نازے جس کا اثر کھال پر بھی ضرور پڑتا ہے۔ اس کے علاوہ نسل اور آب و ہوا کا چمڑے پر بہت بڑا اثر ہوتا ہے۔ مدراس بھبھئی وغیرہ (اس میں ریاست میسور کی مشہور نسل اور گجراتی نسل کو شریک نہ سمجھنا چاہئے) کے جانور پنجاب اور یوپی کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں ہوتے اور یہی حال آگرہ، میرٹھ، دہلی اور پشاور وغیرہ کی کھالوں کا ہے اور یہی وجہ ہے کہ مدراس اور بھبھئی وغیرہ میں بیشتر کچا چمڑا کانپور آگرہ، میرٹھ، انبالہ، لاہور کا خریدتے ہیں۔ کلکتہ میں جو خریداری ہوتی ہے، اس کی خاص وجہ یہ ہے کہ کچا چمڑا وہاں سے دیگر ممالک کو روانہ کیا جاتا ہے اس لئے ہندوستان کا کل چمڑا وہاں جمع ہو جاتا ہے۔

اس قدر زیادہ تعداد میں چمڑے فوری پختہ نہیں ہو سکتا اور نہ اس کی معقول حفاظت کرنے سے پیشتر اس کو ہر صہ تک کارخانہ میں رکھا جاسکتا ہے اور نہ باہر بھیجا جاسکتا ہے۔ اس لئے اس کو بگڑنے سے بچانے کی کئی صورتیں ہیں جو ذیل میں درج کی جاتی ہیں جس کی مدد سے یہ کئی ماہ بلکہ ایک سال تک محفوظ رہ سکتا ہے۔ ورنہ قانون فطرت کے مطابق ایک سو روز کے بعد خراب ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ اور ایسے خراب چمڑے سے جو چمڑا پکا کیا جائے گا بے کار ہوگا۔ اس کی حفاظت کے لئے زیادہ تر نمک طعام، کھاری نمک اور سنکھیا استعمال ہوتا ہے۔

۱۔ اقسام چرم میں سے کوکھ (گاڑے)، بھبھس، بھیر، بکری کے چمڑے زیادہ تر ہندوستان میں استعمال ہوتے ہیں اور ولایت اور دیگر ممالک کو جاتے ہیں۔

ان کی تیاری کی مختلف صورتیں ہیں اور ویسے ہی ان کے نام

رائج ہیں۔ چونکہ ہر شہر میں کھیلہ (یاکیل) خالہ نہیں ہوتا اس لئے ان کو محفوظ کر لینا کہتے ہیں تاکہ وہ ایک جگہ سے دوسری جگہ جانے کے قابل ہو جاوے۔ گوکھہ یعنی گالے کا چمڑا، ازل حالت جو کہ کیل خانہ میں جانور کو ذبح کرنے کے بعد ہوتی ہے اس کا نام گوکھہ کھیلہ یا حلالی عام طور سے مشہور ہے۔ دباغت والے اس چمڑے کو دباغت کے لئے بہت ہی اچھا سمجھتے ہیں اور اس سے پختہ چمڑا یعنی لیڈر نہایت عمدہ تیار ہوتا ہے۔ اُردو میں کچھا چمڑا (Hide) اور پکا چمڑا (Leather) بولا جاتا ہے۔ اور سہت کے اعتبار سے اس کے دو نام رائج ہیں۔ پورب اور پچھم۔ پورب کی طرف کا پورب اور پچھم کی طرف کا پچھم کہلاتا ہے۔ کھیلہ سے نکلنے کے بعد اس کی تیاری کے کئی طریقہ ہیں۔ سب سے سہل طریقہ یہ ہے کہ کھیلہ کے گوکھہ کو گوشت صاف کر کے فرمہ یعنی بانس کے چوکھتے میں تان دیا اور تاننے کے بعد پانی سے دونوں رخ سے دھو دیا اور دھوپ میں رکھ کر خشک کر لیا اب اس کا نام گوکھہ فرمہ (Frame) یا گوکھہ مصالحہ بولا جاوے گا۔

اگر اس کو ولایت روانہ کرنا ہے تو اس کو حوضوں میں سنکھیا کے پانی میں تہو کر خشک کر لیتے ہیں جس سے وہ عرصہ تک کپڑے وغیرہ سے محفوظ رہتا ہے۔ سنکھیا کا پانی اس طرح بناتے ہیں کہ سفید سنکھیا پندرہ سیر اور سوتا ساڑھے سات سیر تال کر ایک ہڑے کڑھاؤ میں آگ پر پکا لیتے ہیں۔ سوتا صرت سنکھیا کو گلا دینے کے لئے شامل کیا جاتا ہے۔ یہ دو ہزار فرد کے لئے کافی ہے۔ پھر سنکھیا کے پانی کو حوض کے پانی میں ملا دیتے ہیں کہ جس میں چمڑا توب جاوے۔ سنکھیا دیے ہوئے گوکھہ مصالحہ کو انگریزی میں (Arsenicated cow)

کہتے ہیں۔

۲ - دوسری صورت، کمپلے سے لانے کے بعد گوشت صاف کر کے اور پانی سے دھو کر، اس کو ایسی میز پر، جس کے دونوں سروے تھالو اور بیچ میں اونچا ہو بچھاتے ہیں۔ پھر دو آدمی ایک اس طرف دوسرا دوسری طرف کھڑا ہو کر اس میں سانپر نمک کم و بیش پانچ پونڈ جو چھوڑے کے ناپ پر منحصر ہے، تال کر خوب رگڑتے ہیں۔ دوسرے روز پھر دو پونڈ اور نمک تال کر ملتے ہیں تیسرے دن صحت ایک پونڈ جہاں پر ضرورت ہو لگا کر ملتے ہیں۔ اب یہ چھڑا محفوظ ہو گیا۔ صحت دوسرے تیسرے روز ہاتھ لگا کر ذرا دیر مل دیتے ہیں۔ یہ صورت صحت دیگر مہاک کے جانے والے چھڑوں کے لئے ہے۔ اس کو سانپر نمک کا گوکھ یا گوکھ سانپر (Table Salted or Green Salted) کہتے ہیں۔ روانگی کے وقت اس میں نصف پونڈ کھاری نمک لگادیتے ہیں۔ اس کے لگادینے سے چھڑے میں ذرا سختی آ جاتی ہے۔ صحت سانپر نمک کا گوکھا زائد عرصہ تک نہیں رہ سکتا، گل جانے کا اندیشہ رہتا ہے۔ یہ گوکھا پوروں میں روانہ کیا جاتا ہے —

۳ - تیسری صورت، جو چھڑا ہندوستان میں ایک شہر سے دوسرے شہر میں جاتا ہے اس کو زمیں میں بچھا کر سانپر نمک دیتے ہیں اور ترکیب وہی ہے۔ صحت میز کے بجائے زمیں میں نمک لگاتے ہیں اور یہ ایک کے اوپر ایک بچھاتے جاتے ہیں۔ نئے چھڑے اس کے اوپر بچھاتے جاتے ہیں اور جب روانہ کرنا چاہا گئی بنا کر روانہ کردیتے ہیں۔ ولایت والوں میں صفائی وغیرہ بہت زیادہ ہوتی ہے۔ اور ولایت کے جانے والے جو میز پر تیار کیے جاتے ہیں وہ کسی مندی میں تیار کیے جاتے ہیں۔ ہر شہر میں نہیں بنتے —

زمین پر بچھا کر نمک لگانے کا طریقہ گاؤں تک نہیں، جہاں چھڑے کا کام

ہوتا ہے ' جاری ہے۔ اس کو گیلا سانبر کا کوکھا (Wet Salted Sambhar) کہتے ہیں۔

۳ - چوتھی صورت وہ ہے جس میں کھاری نمک (جو مثل سبزی کے ہوتا ہے۔ اور زیادہ تر عہدہ اور مشہور مظفر پور میں تیار کیا جاتا ہے) استعمال کیا جاتا ہے۔ یہ ہندوستان میں ایک شہر سے دوسرے شہر میں جو چھڑے جاتے ہیں ان میں لکایا جاتا ہے اور ہندوستان سے باہر دیگر ممالک کو جو چھڑے جاتے ہیں ان میں بھی لکایا جاتا ہے۔ کھاری نمک کو لکڑی کے پیپوں میں یا لکڑی کی بڑی بالٹیوں میں جو اس کام کے لیے بھالی جاتی ہیں، گھول کر موتی بنالیتے ہیں۔ چھڑے کو زمین پر پھیلا کر یہ موتی اس پر تال کر ہاتھوں سے مل کر ان میں جذب کرتے ہیں۔ یہ ہلکی دھوپ میں کرتے ہیں۔ صبح سے دس بجے تک۔ اسی طرح کئی روز تک یہ عمل جاری رکھتے ہیں۔ جب ان میں تعداد کے مطابق کافی رس جذب ہو جاتا ہے تو اس کو سیٹ کر خشک کر دیتے ہیں۔ اس آخو خشک کرنے کا نام سیٹ دینا یا ستائی کرنا کہتے ہیں۔ یعنی ہاتھ کدہ (گلا گردن) یعنی سر کی طرف سے دم کی طرف لے جاتے ہیں کہ سطح بالکل چمکی ہو جاوے۔ اب یہ چھڑا خشک ہو کر سفید زردی مائل ہو جاتا ہے۔ اسی صورت میں روٹیں صاف کر کے یہ ولایت روانہ کیے جاتے ہیں۔ اس کو پتند کوکھا یا کھاری کا کوکھا (Dry Salted Khan) کہتے ہیں۔ اوپر جو قسمیں کوکھ کی ہیں ان کی کئی ہیں وہ صرف ان جانوروں کی کھالیں ہوتی ہیں جو ذبح کیے جاتے ہیں۔ سب سے اہم اعتبار سے یورپ سے بچھم کا کوکھا اچھا ہوتا ہے اور زائد قیمت سے فروخت ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ مردار (یا سگتی) کھال ہوتی ہے یعنی ان جانوروں کی جو خود مرجاتے ہیں خواہ کسی وجہ سے مرے ہوں جس طرح

ذبیحہ پورب کی اور پھم کی کھال ہوتی ہے ، اسی طرح اس کے ہر خلا مردار میں اوتر اور دکن مشہور ہے ۔ اوتر کا گوکھا اندر سے تر ہوتا ہے یعنی اس کی رطوبت اس کو بالکل خشک نہیں ہونے دیتی یا یوں سمجھنا چاہئے کہ چربی زائد ہوتی ہے جس سے کہ ان کی قدرتی رطوبت (Gelatine) باقی رہتی ہے ۔

دکن میں تری نہیں ہوتی اور وہ مثل لکڑی کے خشک ہوتی ہیں اور ایک جگہ سے دوسری جگہ جانے میں اکثر قوت جاتی یا چٹخ جاتی ہیں ۔ یہ ہندوستان میں ایک جگہ سے دوسری جگہ دھوپ سے خشک کی ہوئی ہی جاتی ہیں ۔ اور ولایت بھی روانہ کی جاتی ہیں ۔ جن کو مثل حلالی کے سنکھیا یعنی مصالحہ دے کر روانہ کرتے ہیں ۔ ان میں سوائے سنکھیا دینے کے اور کوئی صورت تیاری کی نہیں ہے ۔

بھینس کی کھال بھی مثل گوکھ کے تیار کی جاتی ہے ۔ گوکھ کی طرح مثل دوسری صورت کے یعنی میز پر بھینس کی کھال نہیں بنتی ۔ اس لیے کہ بھینس کو اس قدر ملایم رکھنے کی ضرورت نہیں ۔ کیوں کہ اس سے تالے اور مشین کے پتے وغیرہ کا کام لیتے ہیں ۔ گوکھ چونکہ زیادہ تر ملائم کام میں استعمال کیا جاتا ہے اور تازہ کھیلے نہ ملنے کے بعد گیلا سانبر لگا ہوا ملایم رہتا ہے اس لیے میز کا طریقہ رایج ہوا ۔ باقی اور سب صورتیں تیاری کی اس میں مثل گوکھ کے ہوتی ہیں ۔ لہک کی تعداد بھینس میں کم و بیش دوگنی کے برابر استعمال کی جاتی ہے ۔ اس میں بھی دوسہ مشہور ہیں وہ ہی پورب اور پھم ۔ ذبیحہ میں اور مردار (یا سکتی) میں اوتر اور دکن اور مثل مردار گوکھ کے اس کی بھی تیاری صرف سکھلا کر کی جاتی ہے ۔ اور کوئی طریقہ نہیں ہے ۔ اور یہ مردار (یا سکتی) بھینس (Buffalo Sukhte) کہلاتی ہے ۔

بھڑ ہندوستان میں بھی استعمال ہوتی ہے اور ولایت بھی جاتی ہے ۔

مگر اس کی روانگی کی صورت بیرون ممالک کو مثل گوکھ کے نہیں ہے —

یہ زیادہ تر پکی ہوئی یعنی لیدر کی صورت میں ولایت جاتی ہے ۔ کیل خانہ میں ذبح ہونے کے بعد اس کا نام کیل بھیڑی ہوتا ہے یا تو اس کو اسی طرح خشک کر لیتے ہیں ۔ اگر شہر کے شہر میں ٹینری یا دباغت والے خرید کرتے ہیں تو اُس سے بہت اچھا چمڑا قیام ہوتا ہے ۔ دیسی طور پر پکائی والے (دیسی سے مراد کھٹیک وغیرہ جو اوک ہندوستان میں عام طور پر فائدہ وغیرہ میں پکا کر لیتے ہیں) اس کی اُون رانہی سے اُکھار لیتے ہیں اور ٹینری والے کیلی خریدنے کے بعد اس کو چونہ کے ساتھ گوشت کی طرح سو دیم سلفائیڈ (Sodium Sulphide) لگا کر رات بھر رکھ دیتے ہیں اور صبح کو اُون بہت آسانی سے ہاتھ سے بغیر نوچے ہوئے نکل آتی ہے ۔ اُون الگ فروخت ہو جاتی ہے اور چمڑا پکا کر لیتے ہیں ۔ غرض کہ اُون دار اگر خرید کرتے ہیں تو اس کی اُون ضائع نہیں ہونے دیتے ۔ اگر ایک شہر سے دوسرے شہر روانہ کرنا ہوا تو اس میں سانپر نمک ایک پونڈ سے دیتے پونڈ تک اُسی طریقے پر جو گوکھ میں بیان کیا گیا ، لگاتے ہیں ۔ اس کو ایک پر ایک بچانے کے بجائے ایک ایک کی علیحدہ علیحدہ کٹی بڈا کر رکھتے ہیں اس لیے کہ اس کے روئیں میں نمک نہ لگے ورنہ اُون خراب ہو جائے گی ۔ جیسا کہ اوپر بتایا ہے کہ زائد تر پکی کی ہوئی کہااں ولایت جاتی ہیں ۔ بھیڑ یا بڑا اس کو کہتے ہیں کہ اس کو بعد اُون نکالنے کے نمک لگا کر خشک کر دیتے ہیں اور اس کی گانتھہ باندھ کر باہر ملکوں کو روانہ کرتے ہیں سوائے اس کے اور کوئی صورت نہیں ہے ۔ اول صورت پکی ہوئی جانے کی دوسری صورت پاہڑا جانے کی ہے —

بکری - بکری زیادہ تر بلکہ ستر اسی فی صدی ولایت جاتی ہے جس میں قریب ساٹھ فی صدی امریکہ جاتی ہے اور امریکہ میں ۵۰ مقام اس کے جانے کے لیے مشہور ہیں - نیویارک (New York) اور فیلڈلفیا (Philadelphia) - ان میں اس کی ٹینریاں ہیں - اور دنیا میں بکری کی کھال امریکہ سے بہتر کہیں نہیں پکی کی جاتی - اس لیے زیادہ تر امریکہ جاتی ہے اور کم تر بوسٹن (Boston) یا دوسری جگہ جاتی ہے - ہندوستان میں بکری کی کھالیں بہت کم پکا ئی جاتی ہیں جس کی وجہ خاص کر یہ سمجھی گئی ہے بلکہ تجربہ بتلاتا ہے کہ بکری کی کھال کو جھسا پکنا چاہیے ویسی تیار نہیں ہوتی آج تک اس میں کامیابی نہیں ہوئی —

بلکہ یہاں تک دیکھا گیا ہے کہ امریکہ کے دباغوں نے جو اس کو وہاں خصوصیت کے ساتھ بنانے میں مشہور ہیں ' ہندوستان میں آکر پختہ کیا مگر وہ بات پیدا نہ ہوئی - کوئی وجہ معلوم نہیں ہوتی کہ ہندوستان میں بکری سے گلیس کڈ (Glace Kid) نہ بن سکے - افسوس ہے کہ کلکتہ گلیس کڈ کمپنی (Calcutta Glace Kid Co. Ltd.) کا کارخانہ جو ہندوستان میں اپنی نظیر نہیں رکھتا - مالی دشواریوں کی وجہ سے بند ہو گیا - ورنہ چاری صاحب جگہوں نے کروڑ کا چمڑا ہندوستان میں بنا کر شہرت حاصل کی تھی ضرور گلیس کڈ بھی تیار کرنے میں کامیاب ہوتے —

بکری کے تیار کرنے کی دو تین صورتیں ہیں - اول بکری کھال سے لاکر اس کو صاف کر کے اس میں مائپر نمک لگاتے ہیں - ایک پونڈ سے تیز پونڈ تک پور اس کو گدی بنا کر رکھ دیتے ہیں -

دوسرے صبح پھر قدرے نمک تال کر ہاتھ ملتے ہیں۔ تیسرے دن پھر قدرے نمک تال کر ملتے ہیں۔ اسی طرح پر دو پوند نمک یا کم و بیش جو کھال کی ٹاپ پر منحصر ہے ' لگا یا جاتا ہے۔ چوتھے دن ان کی گدی تھ لگائی ہوئی ' ریڑھ پر سے دھرا کر کے تھاپ یا ٹھیکی لگا دیتے ہیں۔ ہندوستان میں ایک شہر سے دوسرے شہر بھجائے گئے لیے اس کو بوروں میں بھر کر روانہ کرتے ہیں — اور دیگر ممالک امریکہ وغیرہ روانہ کرنے کے لیے ان کو لکڑی کے پیپوں میں بھر کر روانہ کرتے ہیں۔ یہ لکڑی کے پیپے دوسری ولایت سے شراب تیل وغیرہ کے آتے ہیں جو یہاں خالی ہو کر اس کام کے لیے استعمال کیے جاتے ہیں۔ اس میں بکری ایک ایک ۸ فرد کی گدی بنا کر پیپے میں بھر دیتے ہیں۔ اس کو گیلی بکری (Wet Salted Goatskin) کہتے ہیں —

دوسری صورت دیہاتوں میں ' جہاں بنانے کے طریقہ جاری نہیں ہیں یہ ہے کہ وہاں قدرے نمک یا کھاری نمک لگا کر یا ویسے ہی زمین پر کھولتی لگا کر تان کر خشک کر دیتے ہیں اور بڑے شہروں میں فروخت کرنے کی فرض سے لے جاتے ہیں۔ اور بڑے شہر کے تیار کرنے والے اس کو گیلا کر کے بنا لیتے ہیں مگر خشک بناتے ہیں ' قر اس کی اچھی نہیں بنتی۔ اور ولایت بھی سوکھی (Brined) بکری جاتی ہے۔ تیسری صورت یہ ہے کہ کھیاہ سے لا کر کھاری سے تیار کرتے ہیں۔ کھاری کی تعریف اوپر ہو چکی ہے۔ اس کا رس بنا ہوا بکری پر تالتے ہیں لیکن عمدہ بنانے والے اس کو تختوں پر کیل سے جڑتے ہیں اور پھر اس پر رس تالتے ہیں اور ہاتھ سے جذب کرتے ہیں۔ دو تین روز اسی طرح کر کے پھر اس کو مٹل گوکھ کے لپیٹ دیتے ہیں۔

اور بہت سے لوگ اس کو بجائے تختوں کے زمین پر کیلوں سے تان دیتے ہیں اور رس دے کر آخر میں سیت دیتے ہیں۔ اب اس کو پتلہ بکری (Dry Salted Goats) کہتے ہیں۔ اس کی بہترین تیاری کے لیے پورنیہ بنگال مشہور ہے۔ اس کے بعد مظفر پور مشہور ہے جہاں کھاری نہک پیدا ہوتا ہے۔ اس کی کانتھہ باندھ کر بیرون مہالک کو روانہ کرتے ہیں —



علم کیمیا کا انقلابی دور اور آکسیجن کا انکشاف

از

(جناب آتما رام صاحب - ایم ایس سی - ایمپرس ویکٹوریہ
ریڈ، 'شعبہ کیمیا' جامعہ الہ آباد)

علم کیمیا کے پڑھنے والوں میں شاید ہی کوئی ایسا بشر ہوگا جو اس عجیب علم کی تاریخ سے کچھ نہ کچھ واقفیت نہ رکھتا ہو۔ یہ بات قریب قریب سب ہی کو معلوم ہے کہ کیمیائی دور سے قبل سائنس دانوں کا خاص مقصد ادنیٰ دھاتوں سے بہتر دھاتوں کا تیار کرنا تھا اور اُن کی خاص تشویش پارس پتھر (Philosopher's Stone) کی تلاش میں تھی۔ پارس پتھر اُس زمانہ میں ایک ایسی عجیب شے خیال کی جاتی تھی کہ جس کے چھو جانے سے لوہا وغیرہ جیسی ادنیٰ دھاتیں سونے میں تبدیل ہو سکیں۔ اس زمانہ کو عام طور پر الکیمیائی دور (Alchymical period) کہتے ہیں۔ اس دور کے بعد ایک دوسرا دور آیا جس کو طبی کیمیائی دور کہتے ہیں۔ اس وقت کے کیمیا دانوں کا خاص ملشا یہ تھا کہ علم کیمیا کو طب کے طریقہ پر پڑھا جائے۔ اس دور میں وان ہیلہمنٹ (Van Helmont) اور بیسل ویلنٹین

(Basil Valentine) کے ایسے عالم پیدا ہوئے۔ اس کے بعد ایک عجیب دور آیا جو فلوجستی دور (Philogiston period) کے نام سے مشہور ہے۔ اس وقت کے عالموں میں بیکر (Becker) اور اسٹال (Stahl) کے نام خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ ان دونوں کا قول تھا کہ جب کوئی شے جلتی ہے تو اُس میں سے نلو جسٹن نکل جاتا ہے جس ہم آج کل آکسائنڈ کے نام سے پکارتے ہیں۔ اسی طور پر اور بہت سی چیزوں کے کیمیاؤں عمل سمجھائے گئے۔ اس مضمون میں یہ بات دکھانے کی کوشش کی جائے گی کہ فلوجستی کے نظریہ کو کس طرح غلط ثابت کیا گیا اور ساتھ ہی ساتھ اُس وقت کے خاص عالموں کا کچھ حال بیان کیا جائے گا۔ اس زمانہ میں ہی جدید کیمیا کی بنیاد ڈالی گئی اور اسی وجہ سے اس کو کیمیا کا انقلابی دور کہتے ہیں۔

اس وقت کی دنیا کے کیمیا میں پانچ شخص سب میں پیش پیش رہے ہیں۔ بلیک، کیونڈش، پریسٹلی، شیل، اور لیواے (Black, Cavendish, Priestley, Scheele, Lavoisier)۔ ان عالموں کے سوانح حیات اور تحقیقات صحت صحت بتلانے کے لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اُن کا بیان الگ الگ کیا جائے۔

بلیک کی پیدائش سنہ ۱۷۲۸ ع میں جوزف بلیک (۱۷۲۸ - ۱۷۹۹) اسکات لینڈ میں ہوئی۔ پہلے وہ معمولی طور

پر عطاری کرتا تھا۔ بعد ازاں کلاسکو یونیورسٹی میں پروفیسر مقرر کیا گیا۔ اُس کی خاص تحقیق میگنیشیم کاربونات (Magnesium carbonate) کی بابت ہے۔ پہلے وہ فلوجستی نظریہ کا پیرو تھا مگر لیواے کے نئے نظریہ کے بعد وہ لیواے کی پیروی کرنے لگا اور اُس کی کافی مدد کی۔ یہ بات ہرمہ سے معلوم تھی کہ کالشیئم کاربونیٹ (Calcium Carbonate) کو

گرم کرنے سے کاوی قلی (Caustic alkali) بن جاتا ہے۔ پہلے عالموں کا یہ خیال تھا کہ جب کیلشیم کاربوناٹ کو گرم کرتے ہیں تو اُس میں آگ کے چھوٹے چھوٹے ریزے مل جاتے ہیں اور ان کے مل جانے سے اس میں تیزی دیا ہوا ہو جاتی ہے۔ اسی بنا پر اُس کو کاوی قلی کہنے لگے۔ لیکن سنہ ۱۷۵۵ع میں بلیک نے کاربوناٹ سے لوگوں کو یہ معلوم ہو گیا کہ ہلکے (Mild) قلی کو گرم کرنے سے کاوی قلی کیوں کر بن جاتا ہے۔

اس نے میگنیشیم کاربوناٹ (میگنیشیا ایلبا) (Magnesia alba) کو خوب جوش دیکر میگنیشیم آکسائیڈ (میگنیشیا آکسٹا) (Magnesia Usta) تیار کیا۔ اُس زمانہ میں عام طور پر کاربوناٹوں کو ہلکا قلی کہتے تھے اور آکسائیڈوں کے محلول کو کاوی قلی۔ اس تجربہ سے بلیک نے یہ دکھلایا کہ کس طرح کاربوناٹوں سے آکسائیڈ بنتے ہیں۔ اس تجربہ سے مندرجہ ذیل باتیں بھی ظہور میں آئیں:—

۱۔ میگنیشیم کاربوناٹ کا وزن گرم کرنے کے بعد نصف رہ جاتا ہے۔
 ۲۔ میگنیشیم ایلبا کو گندھک کے ترشہ (Acid) کے ساتھ گرم کرنے سے میگنیشیم سلفیٹ (Magnesium Sulphate) بنتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ ایک گیس بھی خارج ہوتی ہے (آج کل اس گیس کو کاربن ڈائی آکسائیڈ کہتے ہیں) —

۳۔ مگر میگنیشیم آکسائیڈ کو گندھک کے ترشہ کے ساتھ گرم کرنے سے بغیر کسی گیس کے خارج ہوئے ہی میگنیشیم سلفیٹ بن جاتا ہے —

۴۔ میگنیشیم سلفیٹ کے محلول میں جب پوٹاشیم کاربوناٹ (Potassium Carbonate) ڈالا جاتا ہے تو ایلبا یعنی میگنیشیم کاربوناٹ کا رسوب نیچے بیٹھ جاتا ہے —

ان تجربوں کے ملاحظہ سے یہ معلوم ہو جائے گا کہ ہلیک نے کس طرح ان سب باتوں کو ایک نئے اور دوست طریقہ پر سمجھایا۔ نمبر ۲ و ۳ کی مدد سے یہ بتلایا گیا کہ میگنیشیم ایلبا اور میگنیشیم اسٹا میں صرف یہی فرق ہے کہ ایلبا اور ترشہ کو ساتھ ساتھ گرم کرنے سے ثابت ہوا (Fixed air) (یہ کاربن ڈائی آکسائیڈ کا پرانا نام ہے) خارج ہوتی ہے۔ مگر میگنیشیا اسٹا کو ترشہ کے ساتھ گرم کرنے سے کوئی گیس خارج نہیں ہوتی اس لئے ایلبا میں ثابت ہوا ضرور شامل ہوگی جو ایلبا کو گرم کرنے سے خارج ہوتی ہے اور اسٹا باقی رہ جاتا ہے۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو ہمارے موجودہ خیالات اور ہلیک کے قول میں کچھ بھی فرق نہیں۔

(ہلیک) میگنیشیا اسٹا + کاربن ڈائی آکسائیڈ = میگنیشیا ایلبا (موجودہ) میگنیشیم آکسائیڈ + کاربن ڈائی آکسائیڈ = میگنیشیم کاربونیٹ

ہلیک نے ان سب تجربوں کو دہرایا اور انہیں تجربوں کو سنگ سر سے کے ساتھ بھی کیا۔ وہ ہر حالت میں اسی نتیجہ پر پہنچا۔ یہیں سے فلوجستی نظریہ کے خلاف بنیاد پڑنی شروع ہو گئی۔ اس وجہ سے بہت سے اسکاج (Scotch) مصنف ہلیک کو ہی موجودہ علم کیپیا کا بانی قرار دیتے ہیں۔ جب ایک مرتبہ لیواسیے نے فلوجستی نظریہ کو غلط ثابت کر دیا تو ہلیک نے فوراً ہی اس کو قبول کر لیا اور اس کی حتی الامکان مدد کی۔ اب میں ایک دوسرے عالم کا ذکر کروں گا جس کی تحقیقات سے فلوجستی نظریہ کو بہت مدد پہنچا۔

جوزف پریستلی پریستلی کی پیدائش ۱۳ مارچ سنہ ۱۷۳۳ ع کو یارکشائر کے (۱۷۳۳-۱۸۰۴) قریب بمقام فیلڈہیڈ ہوئی۔ اس کی تعلیم عموماً خراب رہتی تھی اور اسی وجہ سے وہ کسی اسکول میں تعلیم پانے سے

معہوم رہا مگر اس کے سنجیدہ والد نے ایک قابل معلم کو گھر ہی پر تعلیم دینے کے لئے مقرر کر دیا تھا۔ اس کی تعلیم میں بہت دقتیں پیش آئیں۔ مگر پھر بھی اس کو کتب پھنی کا بہت شوق تھا اور اس نے متعدد کتابیں ایسی پڑھیں جو فطرت اور اس کے رازوں پر کافی روشنی ڈالتی تھیں۔ اس کو وعظ دینے کا بہت زیادہ شوق تھا اور اسی وجہ سے وہ سنہ ۱۷۵۵ ع میں نیدرہیم کے گرجے کا پادری مقرر کیا گیا مگر وہ اپنی صحت کی وجہ سے مجبور رہتا تھا اور اسی وجہ سے وہ اس کام کو بخوبی انجام نہ دے سکا۔ اس دوران میں بھی پریستلے کیمیائی مضامین کا مطالعہ کرتا رہا کیونکہ اس کو کیمیائی باتوں سے سب سے زیادہ دلچسپی تھی اور اسی وجہ سے اس نے پادری کے عہدہ کو ترک کیا اور دنیاائے کیمیا میں قدم رہا۔ سنہ ۱۷۶۶ ع میں لندن کی رائل سوسائٹی نے ممبر منتخب کر کے اس کو عزت بخشی اور سنہ ۱۷۷۲ ع میں فرانس کے دبستان سائنس نے بھی اس کو اپنا ممبر بنایا۔ اس کے ایک ہی سال بعد وہ لارڈ شیلبرن کا ادبی سیکریٹری مقرر ہوا۔

پریستلے مختلف طرح کے علمی مشاغل میں مصروف رہتا تھا۔ اس نے فلسفہ پر بہت سی کتابیں تصنیف کیں مگر علم کیمیا پر اس کی تحریریں اور کتابیں نہایت مفید ہیں۔ مثلاً ”مختلف قسم کی ہواؤں پر تجربات“۔ اس کا خیال تھا کہ علمی انکشافات اتفاقاً ہوا کرتے ہیں اور اسی وجہ سے بہت سے مصنف اس کو ”اتفاق پرست“ کہتے ہیں۔ پریستلے کا سب سے نمایاں کار نامہ نیوماتک ٹروٹ (Neumatic trough) میں پانی کے بجائے ہارے کا استعمال تھا۔ اس کی مدد سے وہ بہت سی ایسی کیسوں تیار کرسکا جو عام طور پر پانی میں حل ہوجاتی تھیں۔ جیسے

نہک کا ترشہ (گیس) سلفر ڈائی آکسائیڈ (Sulphur dioxide) اور امونیا وغیرہ۔ اس نے نہک کے ترشے کا نام ترشتی ہوا رکھا اور ایہونیا کا نام اساسی ہوا (Basic air)۔ اس کا خیال تھا کہ دونوں کی آمیزش سے تعدیلی ہوا (Neutral air) بن جائے گی اور اس طریقہ سے اس نے ایہونیم کلورائیڈ (نوشادر) تیار کیا۔

اس نے ایہونیا سے ہوقی شرارہ (Electric spark) کے ذریعہ سے ہائڈروجن تیار کیا اور اس تجربہ سے اُس نے امونیا کی بناوت سمجھانے کی کوشش کی مگر اس میں اس کو کچھ زیادہ کامیابی حاصل نہ ہو سکی۔

پریستلی نے پودوں کے تنفس (Plant respiration) اور ہم احتراق (Combustion) میں مشابہت دکھانے کی کوشش کی اور سنہ ۱۷۷۲ ع میں ہی جب کہ اس نے آکسیجن کا انکشاف بھی نہ کیا تھا انسانی اور پودوں کی زندگی کا آپس میں مقابلہ کیا اور بتلایا کہ اگر ایک ہوا میں جس میں کہ سوم بتی جلتے جلتے بجھ جائے کسی پودے کو رکھا جائے تو پھر وہی ہوا انسانی زندگی کے لئے کار آمد ہو سکتی ہے۔ یعنی موجودہ نقطہ نظر سے یہ بات ظاہر ہوئی کہ پودے کی غذا کاربن ڈائی آکسائیڈ ہے اور یہ گیس پودے میں جذب ہونے کے بعد آکسیجن میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ اسی وجہ سے پودوں کی صفائی کلندہ کہا جاتا ہے۔ اس طرح پریستلی نے ضیائی تالیف (Photo Synthesis) کی بنیاد ڈالی۔

سنہ ۱۷۷۳ ع میں اُس کو اتفاقاً ایک بہت بڑا اور عرصہ عدسہ (Lens) ہاتھ لگ گیا۔ اور اس کی مدد سے اس نے قریب قریب ہر ایک چیز کو جو اس کو مل سکی گرم کرنا شروع کیا۔ اس طرح سے جو گیسیں تیار ہوتی تھیں ان کو اکٹھا کرنے کا شوق اُس کو دن بدن بڑھتا ہی گیا۔ یہ پہلے ہی

بتلایا جا چکا ہے کہ نیوسیتک تھرت میں پانی کے بجائے پارے کا استعمال پہلے اُس نے ہی شروع کیا تھا۔ ایک روز جب کہ پریستلے پارے کی سرخ آکسائیڈ (Lead Oxide of Mercury) کو اپنے عدسہ کی مدد سے گرم کر رہا تھا تو یکایک اُس کو ایک ایسی گیس ملی جس کا سانس لینے سے جسم بہت ہلکا اور طبیعت نہایت بشاہ معلوم ہونے لگی اور سب سے زیادہ حیرت انگیز بات تو یہ تھی کہ اگر اِس نئی گیس میں کسی چوہے کو رکھا جائے تو وہ اس گیس میں ہوا کی بہ نسبت زیادہ اچھی طرح رہ سکتا تھا۔ پریستلے نے اپنی کتاب میں اس نئی تحقیق کا حسب ذیل الفاظ میں

بیان کیا ہے۔

”اس آلہ کی مدد سے میں نے کافی تجربے کیے جن کا مختصر حال کسی دوسری جگہ بیان کروں گا۔ ۱ اگست سنہ ۱۷۷۴ ع کو میں نے پارے کے آکسائیڈ سے ایک نئی گیس نکالی جو اس عدسہ کی مدد سے نہایت سہولیت کے ساتھ تیار ہوتی ہے۔ اس گیس کو کافی مقدار میں تیار کر کے میں نے اس کو پانی میں حل کرنا چاہا مگر کیا دیکھا کہ یہ گیس پانی میں حل نہیں ہوتی۔ مگر ایک بات دیکھ کر مجھے بہت ہی زیادہ تعجب ہوا جس کا بیان کرنا میرے قابو سے باہر ہے اور وہ یہ کہ ایک سوم بتی نئی گیس میں بڑی چمک اور نہایت تیزی کے ساتھ جلنے لگی۔ ان سب باتوں کو سمجھانے کی کوشش میں میں بالکل نا کام ہوں“

پریستلے نے نئی گیس کا نام ”غیر فلوجستی (Dephlogistigated Air)“

رکھا۔ اس کا خیال تھا کہ جب کسی چیز کے گرم کرنے سے فلوجسٹن نکلتا ہے تو اس گیس میں مل جاتا ہے کیوں کہ اس میں فلوجسٹن نہیں

ہوتا ۔ اس خیال کی مضبوطی پر فائٹروجن کا نام ”فلوجستی ہوا“ رکھا ۔ اگر واقعی یہ بات درست ہے تو چیزوں کے جلنے پر فائٹروجن نمودار ہونی چاہئے مگر ایسا نہیں ہوتا اور نہ اس کو اس بات کا خیال ہی ہوا —

شیل کی طرح پریستلے بھی اپنی تحقیقاتوں کی اہمیت کو ٹھیک ٹھیک سمجھ نہ سکا ۔ اس کو فلوجستی نظریہ پر اتنا قوی یقین تھا کہ کبھی اُس کی مخالفت کا خیال بھی اُس کے دماغ میں نہ آیا اور نہ اس کو یہ ہی تھیک معلوم ہوتا تھا کہ چیزوں کے جلنے پر اُن سے کوئی چیز نکالنے کے بجائے ان میں کوئی چیز مل بھی سکتی ہے ۔ صرت اتنا ہی نہیں بلکہ وہ آخر تک ایوانس کے نظریہ کا سخت مخالف رہا اور فلوجستی نظریہ کی ہی تائید کرتا رہا —

پریستلے کو فرانس کے انقلابی جھگڑوں میں پڑ کر انگلستان سے امریکہ بھاگ جانا پڑا ۔ کیونکہ انگلستان میں مخالف گروہ کے حامیوں نے اُس کے مکان اور گرجے وغیرہ کو جلا کر خاک کر ڈالا تھا ۔ اس وجہ سے اس نے بھاگ کورناتھمپر لینڈ میں پناہ لی اور وہیں سکونت اختیار کر لی ۔ اسی جگہ ۱۴ فروری سنہ ۱۸۰۴ ع میں اُس کا انتقال ہوا ۔ پریستلے کی تحقیقات کو علم کیمیا کی بنیاد خیال کرنا چاہئے اور اس کے بعد ہی اس علم نے اپنی اصلی صورت اختیار کی ۔ اس لیے وہ بھی موجودہ علم کیمیا کا پیش رو خیال کیا جاتا ہے —

کیولتھ کی پیدائش سنہ ۱۷۳۱ ع میں نیس ہنری کیولتھ (۱۷۳۱-۱۸۱۰) | میں ہوئی ۔ یہ دیونشاہ کے تیسرے دیوک کا بھتیجا تھا ۔ سائنس کے میدان میں بہت سے ایسے اشخاص نے حصہ لیا ہے جو کافی دولت مند تھے مثلاً رابرٹ بائل (Robert Boyle) اپنے زمانہ میں

کیونٹش کا شمار بھی وہاں کے رؤساء میں تھا۔ مگر اس کو علم سے خاص دلچسپی تھی اور یہ دلچسپی اس حد تک بڑھ گئی تھی کہ اُس نے اپنے تمام عیش و آرام اور دولت کو ترک کر دیا اور نہ شادی ہی کی بلکہ اپنی تمام زندگی حق کی تلاش میں صرف کی —

اس کی سب سے اعلیٰ تحقیق ہائڈروجن کا معلوم کرنا ہے۔ حالانکہ اس گیس کے بارے میں پیراسلسس (Paracelsus) اور وان ہیلہمٹ کو بھی کچھ نہ کچھ واقفیت ضرور تھی مگر اس گیس کی کامل تحقیقات کا سہرا کیونٹش کے ہی سر ہے۔ اس نے ہائڈروجن کا نام ”جلنے والی ہوا“ رکھا کیونکہ یہ گیس آکسیجن کے ساتھ فوراً جلنے لگتی ہے۔ اس کا خیال تھا کہ شاید یہ ہی فلوجستی ہو۔ کیونکہ اگر کسی دھات میں فلوجستی شامل ہے تو ترشہ کے عمل سے اس سے فلوجستی نکلتی چاہیے۔ یہی وجہ ہے کہ جست پر ڈنڈھک کے ترشہ کے عمل سے ہائڈروجن پیدا ہوتی ہے —

پریستلے کے آکسیجن بنانے کے بعد کیونٹش نے سنہ ۱۷۸۳ ع میں آکسیجن اور ہائڈروجن کی ملانے کی کوشش کی۔ اس تجربہ میں اس کو برقی شرار کی ضرورت پڑی اور اس طرح اس نے ثابت کیا کہ پانی میں کون کون سے اجزا شامل ہیں۔ یعنی آکسیجن اور ہائڈروجن کے ملنے سے پانی بن جاتا ہے یعنی پانی میں صرف آکسیجن اور ہائڈروجن ہی شامل ہیں۔ اسی طرح سنہ ۱۷۸۵ ع میں ان تجربوں کے دوران میں اس کو معلوم ہوا کہ جب آکسیجن اور ہائڈروجن کی آمیزش پر برقی شرار کا عمل کرتے ہیں تو ان کے ملنے سے جو گیس ملتی ہے وہ فوراً پانی سے مل کر شور کا ترشہ پیدا کر دیتی ہے۔ یہ ایک بڑے تعجب کی بات ہے کہ جب کبھی اس نے ہوائی ہائڈروجن سے تجربہ کیا تو اس میں کچھ نہ کچھ گیس

ہیشہ باقی رہ جاتی تھی جو قریب قریب تمام حجم کا ایک سو بیسواں حصہ تھی۔ مگر تب بھی کیوندش بہت سی ایسی گیسوں کا پتہ نہ لگا سکا جو اس باقی ماندہ حصے میں شامل تھیں جیسے آرگن (Argon) وغیرہ۔ ان گیسوں کا پتا سو برس بعد سر ولیم ریمزے نے لگایا۔

گو کیوندش نے ہائیڈروجن کو تیار کیا مگر افسوس وہ بھی پریستلے کی طرح فلوجستی نظریہ کا دل دادہ تھا۔ اس نظریہ کو غلط ثابت کر دینے کے لیے اس کے پاس کافی سامان موجود تھا۔ پریستلے پہلے ہی سے آکسیجن کا نام ”غیر فلوجستی ہوا“ رکھ چکا تھا اور چونکہ ہائیڈروجن آکسیجن سے مل جاتی تھی اس لیے کیوندش کو کا مل یقین ہو گیا کہ ہائیڈروجن فلوجستی ہے۔ وہ پریستلے کے ہر خلاف ایوانیہ کے نظریہ کا مخالف نہیں تھا تاہم وہ فلوجستی نظریہ کی تائید کرتا تھا۔

کیوندش کا دوسرا قابل تعریف کارنامہ ہوا کی تشریح (Analysis) پر ہوا۔ اس نے اپنے تجربوں سے دکھلایا کہ ہوا کی آکسیجن اور نائٹروجن میں ۷۹.۶۱۴ : ۲۰.۶۸۶ کی نسبت ہے۔ ہارجودیکہ سائنس ائمے اونچے درجہ پر پہنچ چکی ہے اس نسبت میں کوئی خاص فرق نہیں آیا۔ موجودہ نسبت یہ ہے ۷۹.۶۰۴ : ۲۰.۶۹۶

کیوندش نے طبیعیات میں بھی اعلیٰ درجہ کی تحقیقاتیں کیں۔ اُس کا خاص کام زمین کی کثافت معلوم کرنا ہے اس کا یہ تجربہ اور اُس کا نتیجہ ابھی تک صحیح مانے جاتے ہیں۔ وہ ایک عجیب شخص تھا۔ وہ کسی سے ملاقات کرنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ اتنا شرمیلا تھا کہ زندگی بھر کسی مجلس میں نہیں بولا۔ رائل سوسائٹی کی مجلسوں میں اگر کوئی اُس سے تقریر کرنے کی درخواست کرتا تو وہ فوراً گھر چلا جاتا۔ اُس کو اپنے مشاغل نے سوا کسی اور چیز میں

دلچسپی نہ تھی اور اتنا دولت مند ہوکر بھی نہایت سادہ طریقہ پر زندگی بسر کرتا تھا۔ دنیا میں ایسے اعلیٰ خیالات کے شخص شاذ و نادر ہی پیدا ہوتے ہیں اور ہوتے ہیں تو ہمیشہ آئندہ نسلوں کے لیے ایک نفی مثال چھوڑ جاتے ہیں۔

کیونڈس کا انتقال ۱۸۱۰ میں ہوا۔ اس کی یادگار میں کیمبرج میں طبیعیات کا ایک نہایت عالی شان تجربہ خانہ قائم کیا گیا ہے۔ یہ تجربہ خانہ اپنی قسم کے تمام تجربہ خانوں میں اعلیٰ ہے اس کے صدر نلارک میکسویل لارڈ ریے، سر جوزف ڈامسن اور لارڈ رڈر فورٹ جیسے اشخاص ہوئے ہیں جن کی تحقیقاتوں نے دنیا میں ایک انقلاب پیدا کر دیا ہے۔ اس وقت لارڈ رڈر فورٹ اس کے صدر ہیں۔

کارل ولیم شیل دنیا میں شیل کے سرتپہ کے عالم بہت کم ہوئے ہیں (۱۷۶۲ - ۱۷۹۶) تجربہ اور مشاہدہ کرنے کی صلاحیت جتنی شیل میں تھی اتنی بہت کم عالموں میں پائی جاتی ہے۔ عام لوگوں کا خیال ہے کہ شیل اٹھارویں صدی عیسوی کا سب سے بڑا مکتشف تھا۔ اس کی پیدائش ۱۹ دسمبر سنہ ۱۷۴۲ ع کو اسٹرال سنڈ کے ایک غریب خاندان میں ہوئی۔ وہ ۱۴ برس کی عمر میں ایک حکم کے پاس نوکر ہو گیا۔ یہاں اس نے آٹھ سال تک کام کیا۔ بعد ازاں سنہ ۱۷۶۴ ع میں میل سویل کے پاس چلا گیا اور سنہ ۱۷۷۰ ع سے سنہ ۱۷۷۵ م تک اپسانہ میں رہا۔ پھر کوپنگ جانر ایک مکان خریدا اور اُسی میں اپنا ایک چھوٹا سا تجربہ خانہ بنا لیا اور یہیں پر آخر دم تک کیمیائی انکشافات میں مصروف رہا۔

۱۔ اول اس نے بیریم (Barium) اور میگنیز (Manganese) شیل کی تحقیقاتیں
۲۔ بنائے کا طریقہ بتلایا اور کلورین (Chlorine) و آکسیجن

کی تحقیق کی۔ اُس نے میلنگنز تائی آکسائیڈ سے کئی قسم کے مرکبات تیار کئے جو اب بھی خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ دراصل شیل آکسیجن کو پریستلے سے دو سال قبل تین یا چار طریقوں سے تیار کر چکا تھا مگر اُس کے تحقیقی کارنامے چوپ نہ سکے تھے۔ اسی وجہ سے یہ بات کہ آکسیجن پہلے کس نے تیار کی، مختلف فیہ ہے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اِس کا سہرا شیل کے سر ہے اور بعضوں کا قول ہے کہ نہیں آکسیجن کو اول اول پریستلے نے معلوم کیا۔

شیل نے ٹنگسٹن (Tungsten) اور مالب تینم (Molybdenum) دھاتوں کو معلوم کیا۔ جن معدنیات سے اُس نے نکالا وہ اُس وقت تک گریفائٹ (Graphite) خیال کی جاتی تھیں۔ اُس نے ان دونوں میں فرق بتلایا اور دکھلایا کہ گریفائٹ ایک قسم کی کاربن ہے۔ پہلے پہل ہائڈروجن سلفائیڈ (Hydrogen Sulphide) پر تشریح کے ساتھ اُسی کی تحقیقاتیں ہیں۔ آرسینک (Arsenic) پر تجربہ کرتے ہوئے اُسے ایک نئے رنگ کا پتہ چلا جو ”شیل کا ہوا رنگ“ کے نام سے مشہور ہے۔ آرسینک کا کم سے کم مقدار میں پتہ لگانے کے لیے اُس نے آرسین (Arsine) تیار کی۔

فاسفیاتی کیمیا کے میدان میں بھی اُس کے کارنامے کم نہیں ہیں۔ اُسی نے سب سے پہلے بولی قرشہ (Uric acid) اور گلیسرین (Glycerine) کو معلوم کیا اور فاسفیاتی ترشوں کے تیار اور صاف کرنے کا ایک طریقہ معلوم کیا جس پر اب تک عمل کیا جاتا ہے۔ وہ طریقہ یہ ہے کہ پہلے ان ترشوں کے کپاشیمی نمک بنائے جائیں اور ان نمکوں کو گندھک کے ترشے کے ساتھ گرم کیا جائے۔ اِس طرح سے فاسفیاتی ترشہ الگ ہو جائے گا۔ اِس طریقے سے اسلے آزیلیک، سٹرک، میلک، کھلک اور ٹارٹرک ترشے وغیرہ تیار کئے اور کہتے ہوئے سے لیکن تک قرشہ

Lactic acid بنایا —

اُس کے کارناسوں میں سے ایک خاص کام "پروشین نیل (Prussian Blue) کا تیار کرنا ہے کیوں کہ اسی سے ہائڈرو سیانک ترشہ تیار کیا گیا جس کی صفات کا ذکر اُس نے کافی تشریح کے ساتھ کیا ہے مثلاً اُس کی بو اور ذائقہ وغیرہ۔ مگر اس کی اہمیت سے وہ واقف نہ تھا۔ اِس کے مطالعہ سے یہ پتا چل جائے گا کہ شیل نے اِس قدر تھوڑے عرصہ میں کتنا زیادہ کام کیا —

سنہ ۱۷۷۷ ع میں اُس نے ایک کتاب تصنیف کی جس کا نام "آتش اور ہوا" رکھا۔ اِس کتاب میں اُس نے جلمے کی بابت اپنے خیالات کا پورا اظہار کیا ہے۔ شیل نے ایسے بہت سے تجربے کئے جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ہوا دو چیزوں سے مل کر بنی ہے۔ ان میں سے ایک جلمے میں مدد کرتی ہے جس کا نام "آتش ہوا" (Fire air) اور دوسری کا نام "خراب ہوا" (Impure air) رکھا۔ ہوا کے ایک معلوم شدہ حجم کے اندر کسی چیز کو جلا کر بچی ہوئی شے کا حجم معلوم کر کے اُس نے دونوں کی نسبت معلوم کی۔ بعد ازاں اُس نے احتراق کے نظریہ کو سمجھایا۔ آتش ہوا کیا ہوجاتی ہے؟ جب کوئی چیز جلتی ہے تو روشنی اور حرارت پیدا ہوتی ہے۔ اُس کا قول ہے کہ آتش ہوا فلوجستی سے مل کر روشنی اور حرارت کی شکل میں خارج ہوجاتی ہے۔ کیونکہ آتش ہوا پانی میں بھی حل نہیں ہوتی۔ فلوجستی نظریہ کو تھپک ثابت کرنے کے لیے اُس نے ایک اور تجربہ کیا اور وہ یہ کہ جب کاپر آکسائیڈ (Copper Oxide) کو (جس میں فلوجستن نہیں ہے) شوریہ کے ترشے میں ڈالتے ہیں تو کوئی گیس پیدا نہیں ہوتی کیوں کہ اس رد

عمل میں سرخ رنگ کا دھول نکلتا ہے۔ اس نے یہ بھی بتلایا کہ چاندی کے نمکوں پر یعنی سیلور کلورائیڈ پر روشنی کا کیا عمل ہے۔ اور اس عمل کو فلوجستی نظریہ سے ثابت کیا۔

شیل کی تحقیقاتوں کو اننی تھوڑی جگہ میں بیان کرنا ایک نہایت مشکل امر ہے۔ یہ تو صرف مشتے نمونہ از خروارے ہے۔ اس فہرست ہی کو دیکھ کر لوگوں کو یہ پتا لگ جائے گا کہ وہ کتنا بڑا عالم تھا۔ اُس کے دماغ سے اننی باتوں کا ظاہر ہونا اور خاص کر ایک ایسے وقت میں کہ جب دنیا نے کیہیا میں تاریکی چھائی ہوئی تھی کچھ کم اہمیت نہیں رکھتا۔ اگر اس کا مقابلہ کسی اور ہستی سے کیا جاسکتا ہے تو وہ ایپیل فیشر ہے۔ سنہ ۱۷۸۹ ع میں صرف ۴۴ برس کی عمر میں شیل کا انتقال ہو گیا۔

اینتوئین لورین لیواسیے | اس کی پیدائش ۲۶ اگست سنہ ۱۷۴۳ ع میں یہقام پیرس (۱۷۴۳-۱۷۹۴)

حاصل کی۔ اس کا خاص کام فلوجستی نظریہ کو غلط ثابت کر دینا ہے اور اس کی خاص وجہ کیہیائی تجربات میں توازن کا استعمال ہے۔ اگر لیواسیے نے توازن کا استعمال نہ کیا ہوتا تو شاید ہی اتنا کامیاب ہوتا کیونکہ بغیر توازن کی مدد کے یہ بات کس طرح ظہور میں آتی کہ جلنے پر چیزوں کا وزن بڑھ جاتا ہے نہ گھٹتا ہے جیسا کہ فلوجستی نظریہ کے حامیوں کا دعویٰ تھا۔

الکیہیائی دور کے عالموں کا خیال تھا کہ پانی سے متی بنی سکتی ہے۔ سب سے پہلے لیواسیے نے اس کی مخالفت کی۔ اس نے قریب قریب تین سو سال تک کانچ کے ایک برتن میں پانی گرم کیا۔ گرم کرنے سے پہلے

سب چیزوں کو تول لیا گیا اور اس بات کو مد نظر رکھا گیا کہ پانی اُڑنے نہ پائے۔ تجربہ کے بعد وزن کرنے سے معلوم ہوا کہ اس کے وزن میں کوئی فرق واقع نہیں ہوا ہے۔ پھر تمام پانی کو جلا دیا اور جو کچھ باقی بچا اس کو تول لیا گیا۔ پانی کا وزن پہلے ہی سے معلوم تھا۔ اس تجربہ سے یہ ثابت ہوا کہ پانی اور سفید شے (جو پانی کے جلنے سے بن گئی ہے) کا مجموعی وزن پانی کے وزن سے زیادہ ہے یعنی نئی چیز میں کوئی نہ کوئی چیز برتن سے خارج ہو کر مل گئی۔ پھر برتن کا وزن کیا گیا۔ برتن کا وزن اتنا ہی کم ہو گیا تھا جتنا کہ پانی اور سفید شے کے مجموعی وزن میں اضافہ ہوا تھا۔ اس سے ثابت ہوا کہ نئی چیز صحت پانی سے نہیں بلکہ پانی اور کانچ کے ملنے سے پیدا ہو گئی ہے۔ اس بات کو شیل نے بھی اسی طرح سمجھا یا تھا مگر چونکہ اس نے ترازو کا استعمال نہیں کیا تھا اس وجہ سے اس کی کوئی اہمیت نہیں دی جاتی۔

احتراق ہو لیو اسیے | ان تحقیقاتوں میں بھی اس نے ترازو کا استعمال کیا۔
کی تحقیقات

تھا۔ اور وزن کی ہی بنا پر اپنے خیالات ظاہر کرتا تھا۔ جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے یہ ہی اس کی کامیابی کی خاص وجہ تھی۔

لیو اسیے نے معلوم کیا کہ گندھک کا وزن جلنے کے بعد بجائے کم ہونے کے بڑھ جاتا ہے یعنی ایک پونڈ گندھک سے ایک پونڈ سے زیادہ گندھک کا ترشہ حاصل ہوتا ہے۔ اس وزن کے بڑھ جانے کی وجہ یہ ہے کہ جلتے وقت گندھک میں تھوڑی بہت ہوا بھی شامل ہو جاتی ہے۔ اس کے مطالعہ سے فوراً معلوم ہو جائے گا کہ کتنی صفائی اور عمدگی نے ساتھ

لیوواسیے اپنے خیالات کو ظاہر کرتا تھا۔ وہ لکھتا ہے "میرا خیال ہے کہ سب چیزوں کا وزن جلتے کے بعد بڑا جاتا ہے مثلاً گلدھک و فاسفورس وغیرہ دھاتوں کا بہس یا آکسائیڈ کا وزن بڑھنے کی بھی یہی وجہ ہے۔ میں نے ایک بند برتن میں سیسے کے سرخ آکسائیڈ کو خوب گرم کیا۔ گرم کرنے پر اس میں سے ایک قسم کی ہوا نکلی (پرانے زمانہ میں کیس کے لئے ہوا کا لفظ استعمال کیا جاتا تھا) جس کا حجم اس چیز سے ہزاروں گنا تھا اور سیسہ دھات پیدا ہو گئی۔

اوپر کے بیانات سے یہ صاف ظاہر ہے کہ لیوواسیے نے ان تجربوں کو کتنی ہوشیاری اور قابلیت سے انجام دیا۔ اب یکے بعد دیگرے تجربے ہونے لگے۔ سنہ ۱۷۷۳ ع میں اس نے رانگ کے جلتے کی بابت اپنی تحقیقات شائع کی۔ اُس نے دھات کا ایک مقررہ وزن کانچ کے ایک برتن میں بند کیا اور دونوں کا مجموعی وزن معلوم کیا۔ ان کو خوب گرم کرنے کے بعد پھر تولا مگر وزن میں کوئی فرق نہ معلوم ہوا۔ جب برتن کے منہ کو توڑا گیا تو یک بارگی ہوا برتن میں گھس گئی۔ اس تجربے سے یہ معلوم ہوا کہ اندر کی ہوا کا کچھ حصہ رانگ کے جلتے پر آکسائیڈ بننے پر صرف ہو گیا۔ اس نے یہ بھی دکھلایا کہ اگر زیادہ مقدار میں رانگ برتن کے اندر رکھا جائے تو اسے کتنا ہی گرم کیا جاوے پھر بھی کچھ نہ کچھ دھات باقی رہ جاتی ہے اور تمام ہوا صرف بھی نہیں ہوتی۔ اس سے یہ ثابت ہوا کہ ہوا کا تھوڑا ہی حصہ جلتے میں صرف ہوتا ہے۔ اُس نے پھر پارے کے ساتھ تجربے شروع کئے اور دکھلایا کہ جتنا وزن پارے کو ہوا کے ساتھ گرم کرنے سے بڑا جاتا ہے اتنا ہی سرخ آکسائیڈ کو گرم کرنے سے گھٹ جاتا ہے یعنی پارے کی سرخ آکسائیڈ پارے کے ہوا کے ساتھ ملنے سے بنتی ہے۔ سنہ ۱۷۷۷ ع میں اُس نے جلتے کے نظریہ

کو اس طرح پیش کیا —

۱ - ہر ایک چیز کے جلمے پر روشنی و حرارت پیدا ہوتی ہے —

۲ - چیزیں صرت خالص ہوا میں ہی جلتی ہیں۔ یہ آکسیجن کا پہلا نام تھا —

۳ - یہ ہوا جلمے میں صرت ہوتی ہے اور جلمے والی چیز کا وزن اتنا ہی بڑھ جاتا ہے جتنا کہ ہوا کا وزن کم ہو جاتا ہے —

۴ - جلمے والی چیزیں زیادہ تر جل کر بوسم یا آکسائیڈ میں تبدیل ہو جاتی ہیں —

گویواسیے اپنے خیالات کو ان تجربوں سے ثابت کر چکا تھا مگر پھر ایسے لوگ کم تھے جو اس کے خیالات سے متفق ہوتے۔ اس نے پانی کی ترکیب بھی معلوم کی۔ سنہ ۱۷۸۹ ع میں اس نے ایک کتاب تصنیف کی جس میں اس نے فلو جستی نظریہ کی پوری مخالفت کی اور اپنے نقطہ نظر کو سمجھا یا۔ لوگوں کے خیالات پر اس کتاب کا کافی اثر پڑا۔ اور اسی کو کیمیائی انقلاب کہتے ہیں کیوں کہ اس نے کیمیائی خیالات کو بالکل بدل دیا۔ اور اس وجہ سے لیواسیے کو موجودہ کیمیا کا بانی کہا جاتا ہے —

لیواسیے نے بقائے مادہ کے کلیہ (Law of the Conservation of mass)

کو معلوم کیا۔ یعنی اس نے بتلایا کہ مادہ نہ تو پیدا کیا جاسکتا ہے اور نہ ضایع۔ اور اسی اصول پر اس نے کیمیائی مساوات کا طریقہ نکالا جس سے علم کیمیا کو بے حد فائدہ پہنچا۔ فاسفاتی چیزوں کی تشریح میں وہ نہایت قابل اور مشاق تھا۔ کسی چیز میں کاربن اور ہائیڈروجن کے معلوم کرنے کا موجودہ طریقہ اسی کا نکالا ہوا ہے یعنی فاسفاتی چیز کو جلانا اور اس طرح

جلانے پر جو کاربن تائی آکسائیڈ اور پانی حاصل ہوتا ہے اس کا وزن معلوم کر کے ریاضی کی مدد سے چیز کی ترکیب معلوم ہوسکتی ہے —

مذکورہ بالا نمبر ۴ سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس کا خیال تھا کہ سب ترشوں میں آکسیجن ضرور ہونی چاہئے ۔ اس کو " ترشوں کا نظریہ آکسیجن " کہتے ہیں ۔ اسی وجہ سے اس ہوا کا نام پہلے ترشٹی ہوا پڑا تھا ۔ آکسیجن کا لفظ ہی ترشہ سے لیا گیا ہے اس کا مطلب ہے ترشہ پیدا کرنے والا ۔ حالانکہ یہ نام موجودہ زمانہ میں درست نہیں ہے کیوں کہ آج کل آکسیجن کے بجائے ہائیڈروجن ترشوں کا خاص جز ہے جیسا کہ تیوی نے بتلایا تھا ۔ پھر بھی لیوآسیے کے زمانہ میں یہ بالکل ٹھیک تھا —

لیوآسیے نے زندگی کے مظہر پر بھی نظر ڈالی ۔ اُس کا خیال تھا کہ زندگی بھی کیمیاائی عمل ہے یعنی جو غذا ہم کھاتے ہیں وہ پیت میں جا کر ہضم ہوجاتی ہے اور ہضم ہونے میں حرارت پیدا ہوتی ہے ۔ اسی توانائی پر زندگی کا دار مدار ہے —

اُس نے ملکی کاموں میں بھی کافی حصہ لیا اور بہت سی ملکی انجمنوں کا ممبر منتخب کیا گیا تھا ۔ جب فرانسیسی انقلاب شروع ہوا تو بہت سے فرانسیسی اُس کے خلاف ہو گئے اور اُس کا تجربہ خانہ جو کہ ساربن میں تھا جلا دیا ۔ جمہوری سلطنت قائم ہونے پر اس پر مقدمہ چلایا گیا اور اس کو قتل کی سزا تجویز ہوئی اور ۸ مئی ۱۷۹۴ ع کو قتل کر دیا گیا ۔ ایسا عالم کہ جس کے احسان سے دنیا اور خاص طور پر کیمیاائی دنیا کبھی سبکدوش نہیں ہوسکتی اس بے رحمی کے ساتھ ہمیشہ کے لئے اس ناپاک دنیا سے رخصت کر دیا گیا —

لیوآسیے کو تمام دنیا موجودہ علم کیمیا کا بانی مانتی ہے اور

اس میں کوئی شک بھی نہیں کہ اس نے ہی موجودہ کیمیا کی بنیاد
تالی - اس بے رحمی کی مخالفت میں لیگرینج (ایک فرانسیسی سائنس دان)
نے کہا تھا :

” گو اُس کا قتل کرنے میں ایک پل بھی صرت
نہ ہوا مگر اُس کا ثافی پیدا کرنے میں صدیاں
گذر جائیں گی “



ابوالوفا بوزجانی الکاسب

از

(جناب محمد زکریا صاحب مائل)

عرب علما کے غیر فانی علمی کارنامے دنیا کے لئے ہمیشہ مشعل ہدایت کا کام دیں گے۔ اور جب تک تہذیب و تمدن کا نام لینے والے موجود ہیں۔ یہ حقیقت بھی ثابت و قائم رہے گی کہ موجودہ عصر ترقی کی داغ بیل انہی عربوں کے آثار پر سہی ہے۔ مگر ساتھ ہی اس اثر کا اعتراض بھی ناگزیر ہے کہ مشرق نے اپنے ان باکمال اور بے نظیر عقل و دماغ والے ماہران فن کی یاد دل سے معو کر دی تھی اور اپنے جہود و غفلت یا بے مائگی و مجبوری کے بدولت اسات کے بے بہا علمی ذخیرے دوسروں کے ہاتھ میں دے دئے تھے۔ اس لئے ان کا ان علمی خزانوں سے معروم رہ جانا ایک قدرتی امر تھا۔ ان کے مقابل مغربی اقوام کو دیکھئے تو ان کے دامن اس نوع کے بے شمار جواہرات سے معور نظر آئیں گے اس لئے اب جو کچھ ہمیں اسات کے عظیم الشان اور شاندار آثار کے متعلق ملتا یا معلوم ہوتا ہے اس میں زیادہ حصہ مستشرقین کی سعی و عرق ریزی کا ثمرہ سمجھنا چاہئے۔

بوجود اس کے یہ دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ مستشرقین نے بہت

سے جلیل القدر عرب علما کے حالات پردہ خفا میں رکھے۔ نہ ان کا کسی انسائیکلو پیڈیا میں ذکر کیا نہ اور کسی تذکرہ یا مستقل کتاب میں ان کے حالات سے بحث کی۔ حالانکہ بعض یورپین علما کی مہتاز کتابیں ان کے افادات سے بھری ہوئی ہیں —

انہیں غیر معروف یا فراموش کردہ علما میں بعض علمائے ریاضی بھی ہیں جن کا ذکر 'ریاضیات کا سوسائے تاریخ بہت کم اور اس کے مآخذ نہایت مختصر ہونے کی وجہ سے ہمویت کے ساتھ جگہ نہ پاسکا اور دنیائے ریاضی اچھی طرح ان کے جلالت قدر اور مہارت فن کا اعتراف نہ کر سکی —

ریاضی میں عربوں کا فضل تقدم سب کو تسلیم ہے۔ آج ریاضی کے جن معرکہ آلا تحقیقاتی مباحث اور نظریوں نے مغرب کو ساری دنیا سے استقامت ملوایا ہے ان میں کمتر ایسے ہیں جو براہ راست یورپین ریاضی دانوں کے زائیدہ فکر ہیں۔ فرما (Fermat) کا مسئلہ جو مسئلہ فرما کے نام سے موسوم ہے یا دیکارت اور تھامس باکر (Descartes and Thomas Baker) کا مسئلہ + تیسرے درجہ کے معادلات متعلق یہ سب بظاہر نئے اور یورپ کے قائم کئے ہوئے مسئلے معلوم ہوتے ہیں مگر خود علمائے یورپ کی زبانوں ان کی نسبت اعتراف کر چکی ہیں کہ ان کا اکتشاف عربوں ہی کا رہیں منت ہے —

* الکلیدہ صفحہ ۲۶۷ مئی سنہ ۱۹۲۸ ع وہ نظریہ یہ ہے "در مکعب عددین کا مجموعہ عدد مکعب نہیں ہوتا"

+ گجوری تاریخ ریاضیات سنہ ۱۹۲۳ ع جلد ۷۷ صفحہ (۱۰۷)

اسی سلسلہ میں یہ بات بھی نظر انداز کئے جانے کے قابل نہیں کہ بعض یورورپین مصنفوں نے اکثر مسائل ریاضیہ پر کتابیں لکھیں مگر جن سے انہیں مرتب یا تالیف کیا ان کا کہیں ذکر نہیں کیا۔ اس طرز عمل سے ان کی نیت کا حال روشن ہے۔ وہ ان مولفات کو براہ راست اپنے ہی دماغ کی کارش کا فتنہ ظاہر کرنا چاہتے تھے اور دنیا کو یہ باور کرانے کے خواہشمند تھے کہ ریاضی کے کمال اور مہارت فن میں ہم کسی دوسری قوم کے معنون نہیں ہیں۔ ورنہ ماخذوں کا ذکر یا حوالہ کتاب میں ضرور درج کرتے۔ اس دھوے کے ثبوت میں لیونارڈ (Leonard of Pisa) جیسے ناسور ریاضی دان کا نام لیا جانا کافی ہے۔ لیونارڈ نے عالم جبر و ہندسہ پر جو کچھ لکھا ہے اس کے متعلق واضح ہو چکا ہے کہ اس موضوع کی کتابیں لکھتے وقت بہت سی عربی مولفات اس کے پیش نظر رہی ہیں۔

کارپنسکی (Karpinski) نے ثابت کیا ہے کہ لیونارڈ نے کتاب جبرابی کامل سے بہت کچھ اخذ کیا ہے۔ اسی طرح بعض علمائے انگلستان نے چودھویں صدی عیسوی کے اوائل میں جو بعض کتابیں مثلثات پر لکھی ہیں وہ بھی عربی کتابوں سے ماخوذ تھیں + —

یوحنا ملر (John Muller) کی بہت سی تصنیفات ریاضی کا بھی یہی حال ہے۔ یہ شخص ریجیو مونٹا نومس (Regiomantanus) کے نام سے زیادہ مشہور تھا اور اس نے پندرہویں صدی عیسوی کے وسط میں بہت سی کتابیں مغربی ادب میں منتقل کی تھیں۔ اس کی تصنیفات میں سب زیادہ اہم کتاب (De Triangulis)

ہے جسے ہم المثلثات کے نام سے موسوم کر سکتے ہیں۔ یہ کتاب پانچ بڑی بڑی فصلوں میں منقسم ہے۔ ان میں سے چار فصلیں مثلثات مستویہ کے متعلق ہیں اور ایک فصل مثلثات کرویہ کے متعلق۔ اب اگر کوئی یورپین اہل علم اس بات کا مدعی ہو کہ اس کتاب کے کل مسائل ملر ہی کی ایجاد ہیں تو یہ بداہتاً غلط ہوگا کیوں کہ ملر نے کتاب زیر بحث کی پانچویں فصل میں جن اصولوں کا اتباع کیا ہے یعنی مثلثات کرویہ کے اصول یہ بعینہ وہی اصول ہیں جو اس موضوع پر چوتھی صدی ہجری میں عربوں کے رہیں منت ہو چکے تھے * کروی مثلثات کے علاوہ مثلثات کے اور مسائل بھی جو ملر کی طرف منسوب ہیں حال ہی میں ان کے متعلق ثابت ہو چکا ہے کہ وہ ملر کے نہیں بلکہ عربوں کے وضع کئے ہوئے ہیں † جو ان مسائل پر بہت پہلے توجہ کر چکے ہیں ‡ —

عرب ریاضی دانوں میں جن علما کو ممتاز اور بلند علمی حیثیت حاصل ہے؛ انہی میں ایک سے اہم ہستی ابوالوفا بوزجانی کی بھی ہے۔ یہ العباس کے نام سے مشہور تھے۔ ان کا نام معہد تھا سنہ ۳۲۸ھ مطابق سنہ ۹۴۰ع میں بوزجان میں پیدا ہوئے تھے جو ہزارہ اور نیشاپور کے مابین ایک چھوٹا سا شہر ہے † —

ابوالوفا نے علم الاعداد و حساب کی تعلیم اپنے چچا ابو عمرو مغازلی اور اپنے ماموں ابو محمد اللہ معہد ابن عذیبہ سے پائی تھی۔ ابو عمرو مغازلی علم ہندسہ میں ابو یحییٰ ماوردی اور ابوالعلاء ابن کرنیپ کے شاگرد

* صالح زکی۔ آثار ہائے جلد اول صفحہ ۱۵۴۔ † کاجوری تاریخ الرہیات

صفحہ ۱۲۳۔ ‡ معجم البلدان جلد اول صفحہ ۳۰۲۔

تھے *۔ جب ابوالوفا بیس سال کے ہو گئے تو بوزجان ترک کر کے بغداد میں سکونت اختیار کی اور وہاں اکثر کتابیں تالیف کیں —

ابوالوفا کے تاریخ وفات میں اختلاف ہے * کتاب قاسوس الاعلام کی روایت سے ان کا سال وفات سنہ ۲۷۶ھ اور مدفن بوزجان معلوم ہوتا ہے اور کتاب آثار باقیہ میں سنہ وفات سنہ ۳۸۸ھ اور مقام وفات بغداد درج ہے۔ آخری روایت سے ابن قفطی نے بھی استناد کیا ہے اور اپنی کتاب اخبار العلماء باخبار الحکما میں لکھا ہے ”پھر ابوالوفا بغداد ہی میں مقیم رہا یہاں تک کہ ۳ رجب ۳۸۸ھ کو وفات پائی“†۔ اور ہمارے نزدیک بھی دونوں روایتوں میں سے دوسری ہی کو ترجیح ہے۔ جس کے کئی وجوہ ہیں۔ ابن خلکان نے وفیات الاعیان میں پہلی روایت کو لیا ہے مگر مقام وفات کا ذکر نہیں کیا۔ ابن ندیم نے کتاب الفہرست میں اس کے متعلق کچھ نہیں لکھا۔ کتاب الاعلام مولفہ خیرالدین زرکلی کی روایت ہے کہ ابوالوفا نے بغداد میں ۳۷۶ھ میں انتقال کیا مگر افہوں نے اس روایت کا ماخذ نہیں لکھا۔ ان کے سوا انگریزی و امریکی مورخین کو لیا جائے تو یہ دوسری روایت کے موافق ہیں لہذا ہم بھی عدم صحت اور عدم وثوق کی وجہ سے پہلی روایت کو نظر انداز کر کے دوسرے کو اختیار کرتے ہیں۔ اور اب نفس مضمون پر قلم اُٹھاتے ہیں —

ابوالوفا ان گنتی کے علما میں تھے جو فلکیات و ریاضیات کے

* ابن الندیم - الفہرست صفحہ ۳۹۵ —

† اخبار العلماء باخبار الحکما مطبوعہ سنہ ۱۳۲۶ھ صفحہ ۱۸۹ مولفہ

مجمع البحرین یا ان دونوں علوم کے مسلحہ و متبحر عالم تھے۔ انہوں نے ان علوم پر بلند پایہ کتابیں لکھیں جن کا ذکر مجملہ اس مضمون میں کسی جگہ درج کیا گیا ہے اور بعض کتابوں کے اہم حصوں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

یورپ کے بعض بلند رتبہ علمائے ریاضی نے ان کی نسبت اعتراف کیا ہے کہ یہ عالم ہندسہ کے فاضلوں میں سب سے زیادہ کامل الفی اور مشہور تھے۔ ابن خلکان نے ان کے حالات میں لکھا ہے کہ ”ابوالوفا نے علم ہندسہ میں عجیب و غریب مسائل کا استخراج کیا ہے جو اس سے پہلے کسی نے نہ کیا تھا اور اوتار (جہج و تر) کے استخراج میں بھی ایک نہایت عمدہ کتاب تالیف کی تھی *۔

بغداد میں ابوالوفا نے اپنی ساری زندگی تالیف و رصد و تدریس میں گزار دی۔ ان کا تمام وقت علمی مشاغل کے لیے وقف تھا۔ وہ تھوڑے ہی دنوں میں اپنی بے لوث علمی خدمت اور زبردست عالی دماغی کی بدولت بغداد کے ممتاز ترین علما میں شمار ہونے لگے اور ریاضی میں ان کی شخصیت نہایت اعلیٰ تسلیم کر لی گئی۔ اس کا اظہار اس طرح ہوا کہ ابوالوفا، رصد خانہ سوائے شرف الدولہ کے رکن بنائے گئے + جو شرف الدولہ نے خود بڑے اہتمام سے بنایا تھا۔ ابوالوفا کو اس کی رکنیت سنہ ۳۷۷ھ میں حاصل ہوئی۔

ابوالوفا کو سبھی مثلثات میں بہت شغف تھا، وہ بڑے انہماک و توجہ

* وفیات الاعیان جلد دوم صفحہ ۸۱ - † علاوہ وفیات الاعیان کے کتاب

آثار ہادیہ جلد اول صفحہ ۱۶۶ اور تاریخ ریاضیات صفحہ ۱۰۵ سے بھی اس راوی کی

کے ساتھ اس موضوع پر تحقیقات و اختراع میں مصروف رہتے تھے۔ ان کے اس انہماک کی بدولت اس شعبہ میں بہت سی نئی معلومات و اکتشافات کا اضافہ ہوا۔ جس سے نہ صرف انہوں نے بلکہ یورپ کے بیگانوں نے بھی خاطر خواہ استفادہ کیا۔ اور ابوالوفا کے علمی احسانات کا اعتراف کرتے ہوئے نسیم کیا کہ ابوالوفا پہلے ریاضی دان ہیں جنہوں نے سب سے پہلے مثلثات میں مہاس کو داخل کیا (*) —

اس بیان کے آخری جزو کے متعلق علامہ ابوریحان البیرونی کا قول ہے " اس شکل (شکل ظلی یا مہاس) کے استنباط میں سبقت بلا اختلاف ابوالوفا ہی کے حصہ میں آئی تھی + "۔ ابوالوفا کے متعلق یہ بھی مشہور ہے کہ انہوں نے مثلثوں اور زاویوں کے قیاس میں مہاس اور قواطع و نظائر وغیرہ کو سب سے پہلے استعمال کیا تھا۔ یورپ کے ایک ریاضی دان کا قول ہے کہ ابوالوفا نے کل اعداد، مثلثہ اور ریاضی جدولوں کے عمل کو مہاس اور نظیر مہاس کے قاعدہ میں داخل کر لیا تھا †۔

جیسی جداول ریاضیہ کے عمل کا طریقہ بھی ابوالوفا ہی کا ایجاد کیا ہوا ہے۔ اس میں انہیں اتنی کامیابی ہوئی کہ انہوں نے زاریے کے جیب کی صحیح قیمت نصف درجہ سے تقریباً نو درجہ اشاریہ تک دریافت کر کے اہل ریاضی کو حیران کر دیا §۔ ریاضیات کی انگریزی کتابوں میں شکل

* انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا بیان مثلثات (Trigonometry)

+ صالح زکی آثار باقیہ جلد اول صفحہ ۵۴

† بول - مختصر تاریخ الرياضیات سنہ ۱۸۸۱ ع صفحہ ۱۵۵

§ گجری - تاریخ الرياضیات صفحہ ۱۰۶

کے متعلق ابوالوفا کا ایک مقالہ عمل ہندسی (Geometric Construction) کے نام سے ملتا ہے جس کا اصل عربی نام اور ترقیم یا ہندسی بنا کا حال معلوم نہ ہو سکا ۔

ان مسلمات کی بنا پر اگر یہ استدلال کیا جائے کہ عرب دنیا کی پہلی قوم ہے جسے سطح کرہ پر شکل بنانے کا اصول معلوم ہوا تو یہ استدلال ذرا بھی بیجا اور نادرست نہ ہوگا اور اس کی شہادت تاریخ سے ملتی ہے کہ عربوں نے اس اصول کو معلوم کر کے سرسری نظر سے نہیں دیکھا اور اسے نظر انداز نہیں کیا بلکہ اس پر قابو پا کر اس میں نمایاں ترقی کی اور امتیازی سہارت پیدا کر کے اسام فن بن گئے ۔

حرکت قمر میں بعض قسم کے خلل معلوم کرنے کی سہم بھی عربوں ہی کی سر کی ہوئی ہے ، مگر اس کے منسوب کرنے میں اہل مغرب کو اختلاف رہا ہے ۔ بعض یورپین ریاضی دان اسے قیخوبراہی کی طرف منسوب کرتے تھے اور بعض ابوالوفا سے نسبت دیتے تھے ۔ شکر ہے کہ کچھ مدت پہلے یہ اختلاف بھی رفع ہو گیا اور یہ حقیقت واضح ہو گئی کہ اس اکتشاف کا سہرا فقط ابوالوفا کے سر ہے ۔

ابوالوفا کی سہارت ریاضی کا ایک کارنامہ یہ بھی قابل ذکر ہے کہ انہوں نے چوتھے درجہ کے معادلات کو بھی نہ چھوڑا اور دو معادلوں کا ہندسی حل کر دیا ۔

ابوالوفا نے دسویں صدی عیسوی کے نصف میں علم حساب میں ایک

* کاجری تاریخ الرياضیات صلیحہ ۱۰۶

+ فنڈیک - علم الہیئة صلیحہ ۱۲۷ + کاجری - تاریخ الرياضیات - صلیحہ ۱۰۵

کتاب لکھی جس میں ہندی رقمیں استعمال نہیں کیں *۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ رقمیں حررت سے لکھتے تھے مگر ایسا اہل علم عرب میں ابوالوفا نے سوا کسی نے نہیں کیا۔ اگر کیا بھی تو اس کی حیثیت الشاذ کا المعداد کی ہے۔ مثلاً ایک نام کرخی کا اور ملتا ہے جس نے ابوالوفا کی طرح ہندی رقمیں لکھنا چھوڑ دی تھیں۔

ایسا کیوں تھا، اس کی تشریح کانتور (Cantor) نے خوب کی ہے۔ وہ کہتا ہے اس زمانہ میں اعداد کی کتابت کے دو مختلف مذہب پائے جاتے تھے۔ ایک کے یہاں ہندی طریقہ رائج تھا دوسرا یونانی طریقے کا اتباع کرتا تھا۔ یہ دونوں یعنی ابوالوفا اور کرخی انہی لوگوں میں سے ہیں جو یونانی طریقے کے پیرو تھے +۔ بہر حال کانتور کے سوا اور علما کو ابوالوفا اور کرخی کے ہندی رقم ترک کرنے کا سبب معلوم نہ ہو سکا اسی لیے ہمیں عرب تذکرہ نویسوں کے یہاں اس خصوص میں کوئی بحث نہیں ملتی۔

ابوالوفا کی بعض کتابیں | ابوالوفا نے اپنی بے نظیر قابلیت اور خدا داد روشن دماغی سے کام لے کر قالیفات کی شکل میں جو غیر

فانی اور قادر علمی ذخیرہ فراہم کر دیا تھا وہ دنیاۓ علم کے لیے ہمیشہ فخر و قازے کا سرمایہ بنا رہے گا۔ اہل علم و فضل اس کی ان کوششوں کو کہوی فراموش نہ کریں گے جو اس نے ریاضیات کی کتھیوں کے سلجھانے میں کیں اور آئندہ نسلوں کے لیے قابل ذکر سہولتوں کا دروازہ کھول دیا۔

* کاجری تاریخ ریاضیات طبع قدیم ص ۱۰۷

+ کاجری تاریخ ریاضیات - طبع قدیم ص ۱۰۷

چوتھی صدی ہجری یا دسویں صدی عیسوی کا زمانہ وہ زمانہ تھا جس میں علمائے ریاضیات کی کوششیں بڑی حد تک عملی صورت میں عوام کے سامنے نہ آئی تھیں۔ ریاضی اور اس کے رموز و دقائق زیادہ تر علما تک محدود تھے۔ اس وقت تک یہ فن ہموں حیثیت سے سب کے لیے کار آمد نہ بن سکا تھا۔ ابوالوفا کی ضرورتوں نے اس وقت کو پالیا اور عوام کی رہنمائی کے لیے ایک کتاب الہمازل فی الحساب کے نام سے لکھی *۔ یہ کتاب اس دور کے لیے نہایت اہم اور بے حد ضروری تھی۔ لوگ ایسی کتاب کے لیے چھم ہوا۔ جو مشکلات حساب کے حل کرنے میں مدد دیتی اور وقت بے وقت پریشانی و سرگردانی سے بچاتی۔ جب ابوالوفا کی یہ کتاب مرتب ہو گئی تو سب نے اسے اپنی نوعیت کی پہلی اور مفید ترین کتاب سمجھ کر اس کی بیش از بیش قدر کی۔ اور اس سے کاتبوں اور ملشیوں کی بہت سی دشواریاں دور ہو گئیں۔ اس زمانہ کے سادھوکار اور لیں دین کرنے والے ہموں اسی کتاب سے مدد لیتے اور اسی کے اصول پر تمام معاملات کا دار و مدار رکھتے تھے۔ مولف کے بعد بھی بہت دن تک حساب پیشہ اہل خاص اسی کتاب کو شمع ہدایت بنائے رہے۔

”الہمازل فی الحساب“ سات بابوں پر تقسیم تھی اور ہر باب کا نام منزل رکھا تھا۔ یہ ابواب حسب ذیل تھے۔

پہلی منزل	نسبت کے بیان میں
دوسری منزل	ضرب و تقسیم کے بیان میں
تیسری منزل	مساحتوں کے بیان میں

چوتھی منزل	اخراج کے ہمال میں
پانچویں منزل	مقاسات کے اہمال میں
چھٹی منزل	حررت کے بہان میں
ساتویں منزل	معاملات تجارت میں *

یہ کتاب تو حساب کے لیے مخصوص تھی۔ اس کے دلاوہ فن جبر و مقابلہ میں بھی ابوالوفا کی دو کتابوں کا حال معلوم ہوا ہے۔ ایک کا نام تفسیر دیوفانتس (Diophantus) اور دوسری کا نام تفسیر ابرخس ہے۔

مولف کتاب آثار باقیہ نے دوسری کتاب کے نام کے متعلق لکھا ہے "ابوالوفا نے جس کتاب کی تفسیر لکھی ہے اس کے نام میں اختلاف ہے۔ فہرست العلوم کے بعض نسخوں میں ابرخس کا نام ابوحنس کی طرح + لکھا ہے اور تاریخ الکما کے بعض نسخوں میں ابوہیثم یا ابن یحییٰ درج ہے۔ ایک فہرست میں ابرخس پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے "ابرخس کی ایک علمی یادگار "کتاب التدریفات" کے نام سے مشہور ہے۔ اس کتاب کا ترجمہ و تصحیح ابوالوفا نے کی ہے اور بعض ہندسی دلائل سے اُس کی شرح بھی لکھی ہے۔"

اگر آخری قول کو تسلیم کر لیا جائے جس کے قرائن موجود ہیں تو ابوالوفا کی مذکورہ بالا تفسیر بعینہ کتاب ابرخس کی تفسیر ثابت ہوتی ہے۔ رہے ابوہیثم جن کا ذکر تاریخ الکما میں ابرخس کے بجائے آیا ہے تو یہ غالباً ابوہیثم ساوری ہوں گے جنہوں نے ابوالوفا کے استاد کو حساب و

* ابن النہیم الفہرست ص ۳۹۳ -
+ غالباً فہرست العلوم کے مولف نے ابرخس اور ابوحنس میں تشابہ کی وجہ سے غلطی کی ہے۔

ہندسہ کی تعلیم دی تھی مگر اس قول پر حصر دشوار ہے ۔
ابن ندیم کی کتاب الفہرست میں ابرخس کی نسبت لکھا ہے " اس
کی مصنفات میں ایک کتاب صناعة العبر (علم جبر و مقابلہ) کے متعلق ہے ۔
اس کتاب کی نقل و اصلاح ابوالوفا محمد ابن محمد العاسب نے کی اور
اس کی ایک شرح بھی لکھی جس میں ہندسی براہین و دلائل سے اصول
کتاب کی تفسیر و تعلیل درج کی ہے " † —

ابرخس کی اسی کتاب کو صاحب کشف الظنون نے ' ابوالوفا کے مصنفات
میں کتاب الحدود کے نام سے لکھ کر ظاہر کیا ہے کہ یہ کتاب حکیم ارسطیقوس
یونانی کی کتاب کا عربی ترجمہ ہے ' اسے کتاب العبر بھی کہتے ہیں ۔ ابوالوفا
نے ترجمہ کے علاوہ اس کی اصلاح اور تشریح و تعلیل بھی کی ہے ۔
صناعوں اور دستکاروں کے ابوالوفا کی مولفات میں اوپر منازل الحساب کا ذکر
لیے ایک مفید اور کتاب ہو چکا ہے جو انادیت کے نقطہ نظر سے اپنی قسم
کی پہلی کتاب تھی ۔ اب ایک اور مفید تالیف کا ذکر کیا جاتا ہے جو
ابوالوفا نے صناعوں اور دستکاروں کی سہولت اور ان کی فائدہ رسانی کے
خیال سے ہندسی اعمال کے موضوع پر لکھی تھی ۔ یہ کتاب بھی نہایت
کارآمد اور اچھی تھی ۔ اس کا زمانہ تالیف سنہ ۳۸۰ ھ اور سنہ ۳۸۸ ھ
کے مابین ہے ۔ اس کی تالیف میں بہاء الدواء کے ایما کو بھی دخل تھا
اور وہ چاہتا تھا کہ اہل صنعت کو جو دشواریاں بالعموم پیش آتی رہتی
ہیں وہ کسی ماہر فن ریاضی دان کی ہمت سے دور ہو جائیں ۔ چونکہ یہ
کتاب ایک طبقہ کے لیے مخصوص تھی اس لیے ابوالوفا نے اسے ریاضی دلائل

نے خالی رکھا۔ اس کا ایک نسخہ اب بھی جاسع ایا صوفیہ کے کتب خانہ میں محفوظ ہے —

اس کتاب کا نام صاحب کشف الظلمون نے کتاب الہند سے لکھا ہے اور ظاہر کیا ہے کہ اس میں مسطر ، کونیا اور پرکار اور اشکال هندسی کے طریقے بہت شرح و بسط سے لکھے ہیں اور کتاب کو تیسرا ابواب میں تقسیم کیا ہے — اس کتابوں کے علاوہ ابوالوفا نے اور مفید کتابیں بھی لکھی تھیں جن میں سے بعض کا ذکر ابن الدیم نے کتاب الفہرست میں کیا ہے ۔ ذیل میں اس کے نام درج کیے جاتے ہیں —

۱ - تفسیر کتاب الخوارزمی فن جبر و مقابلہ میں

۲ - کتاب الہدٰی للارثاء طیقی

۳ - ایک نامعلوم الاسم کتاب جو کتاب الہدٰی سے پہلے حفظ کرنے کے لیے لکھی تھی —

۴ - ایک نامعلوم الاسم کتاب جس میں دیوفنطس کے استعمال کیے ہوئے قضایا کے دلائل و براہین پر بحث کی ہے

۵ - کتاب معرفۃ الدائرۃ فلکیات میں۔

۶ - کتاب الکامل یہ کتاب تین مقالوں میں تقسیم ہے

(پہلا مقالہ) ان امور کے بیان میں جن کا جاننا حرکات کواکب کا علم حاصل کرنے سے پہلے ضروری ہے

(دوسرا مقالہ) حرکات کواکب کے بیان میں

(تیسرا مقالہ) ان امور کے بیان میں جو حرکات کواکب کو لاحق ہوتے ہیں

۷ - کتاب استخراج ضلع المکعب

ان کتابوں کے علاوہ ابوالوفا کی جن کتابوں کا حال کتاب ابن القفطی، کتاب اخبار العلماء، باخبار الحكماء اور کتاب آثار باقیہ میں ملتا ہے ان کے نام یہ ہیں —

۱ - کتاب العمل بالجدول المتینلی۔

۲ - کتاب استخراج الاوتار۔

۳ - کتاب الزیج الشامل۔

۴ - کتاب المجسطی۔

آخر الذکر کتاب ابوالوفا کی نہایت مشہور یادگار ہے اور اس کا ایک ناقص نسخہ پیرس کے وطنی دارالعلوم میں محفوظ ہے، غالباً یہ نسخہ سنہ ۳۷۷ھ کے بعد تالیف ہوا تھا —

مضامات ابوالوفا کی یہ فہرست اور اس کے سوانح زیادہ تر قدوری حافظ طوفان کے ایک مضمون مطبوعہ المقتطف سے ماخوذ ہیں۔ مگر ہمیں اس کے چند حصوں سے اختلاف ہے جنہیں یہاں واضح کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ مگر فاضل مضمون نگار نے ابوالوفا کے حالات میں لکھا ہے کہ ”ہندی رقموں کا استعمال ابوالوفا اور کرخی کے سوا کسی نے نہیں کیا“۔ یہ بیان محلِ تامل ہے۔ کیوں کہ ابوالوفا اور اس سے پہلے عموماً حروف سے اعداد کا کام لیا جاتا تھا۔ ہندی رقم کا استعمال تو ہروج اسلام کے کئی صدی بعد ہوا۔ اس وقت تک علمائے ریاضی بالعموم یونانی طریقہ کا اتباع کرتے تھے۔ چنانچہ بعض زیچیں اور ریاضی کی جدولیں جو تیسری صدی اور اس سے پہلے کی بنی ہوئی ہیں ان میں حروف ہی اعداد کے بجائے لکھے ہوئے ہیں۔ مصر کے عجائب خانہ میں تیسری صدی ہجری کا بنا ہوا ایک اصطرباب اب بھی محفوظ ہے جس میں تمام اعداد

حروٹ کی صورت میں منقوش ہیں۔ جرجی زیدان نے تاریخ آداب اللغة العربیہ میں اس کا فوٹو بھی شائع کیا ہے —

اس کے علاوہ مضمون متذکرہ بالا میں کتاب الکامل اور کتاب الزیج الشامل کو درجہ اکابرہ کتابوں کی حیثیت سے درج کیا ہے۔ حالانکہ کتاب الکامل سرے سے ابوالوفا کی تالیف ہی نہیں ہے بلکہ اصل میں اس کی کتاب الزیج الشامل ہے، اس کی شرح کا نام کتاب الکامل ہے جو سید حسن ابن علی القومنی نے لکھی تھی۔ اس سے پہلے سید حسن کے باپ سید علی القومنی اسی زیج کی شرح لکھ چکے تھے۔ پھر سید حسن نے سلطان یلدرم بایزید کے لیے کتاب الکامل لکھی —



دلچسپ اقتباسات

(حضرت آدم و حوا کا قصہ اور آثار قدیمہ)

حضرت آدم و حوا کا قصہ کتب مقدسہ تورات و انجیل وغیرہ میں مذکور ہے، اور نصرانی علما کا اس خیال پر اتفاق ہے کہ سفر تکوین جس میں یہ قصہ بیان کیا گیا ہے حضرت موسیٰ کلیم اللہ علیہ السلام نے تقریباً سنہ ۱۷۰۰ قبل مسیح میں تحریر فرمایا تھا۔ حال ہی میں کچھ آثار تقریباً دو ہزار سال پہلے کے بعض ماہران آثار قدیمہ کو ایسے دستیاب ہوئے ہیں جن پر حضرت آدم و حوا کا قصہ منقوش ہے —

یہ قصہ حقیقی ہو یا مجازی، اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ اس کی اشاعت قدیم ترین زمانہ سے ہوتی چلی آئی ہے۔ اخلاص اپنے اسات سے اس روایت کو بتواتر نقل کرتے رہے ہیں۔ یہ قصہ تورات میں جس فہم سے مسطور ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ ”اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو مٹی سے پیدا کر کے ان کی فاک میں روح پھونکی۔ پھر ان کی رفاقت کے لیے حضرت حوا کو پیدا کیا۔ جس کی شکل یہ ہوئی کہ حضرت آدم پر فیئد طاری فرمائی۔ جب وہ سو کر اٹھے تو اپنے ایک جانب حوا کو پایا۔ حضرت آدم ان کے ساتھ جنت میں عیش و آرام سے بسر کرتے رہے۔ جنت

میں جتنے پھول پھل اور میوے وغیرہ تھے ان میں سے کوئی چیز ان کے ایسے مہلوع نہ تھی ۔ البتہ ایک درخت کو چھونے اور اس کے پھل کھانے کی سخت مہانت تھی جو خیر و شر کی معرفت کا درخت تھا ۔ اس مہانت نے دونوں کے دل میں اس کے پھل کھانے کی حرص پیدا کر دی ۔ اس سے شیطان نے فائدہ اٹھایا اور سانپ کی صورت بن کر حضرت حوا کے پاس پہنچا اور انھیں شجر مہلوعہ کے پھل کھانے کی ترغیب دی ۔ حضرت حوا اس کے بھکانے میں آگئیں ۔ اس کے پھل خود بھی کھائے اور حضرت آدم کو بھی لالچ دلا کر کھلائے ۔ اس نافرمانی سے دونوں پر خدا کا غضب نازل ہوا ۔ یہ جنت سے نکال دیے گئے اور زمیں بھی ان کے وجہ سے لعنت میں مبتلا ہو گئی ۔“

جزئیات کو چھوڑ کر نفس روایت قرآن کریم میں بھی تقریباً اسی طرح مذکور ہے اور دوسری اقوال قدیمہ کے یہاں بھی کم و بیش اسی قسم کی تفصیل پائی جاتی ہے ۔ بہر حال قصہ کا خلاصہ جو زیادہ سے زیادہ ہو سکتا ہے اتنا ہی ہے جو اوپر بیان ہوا ، اب مضمون کے دوسرے اجزا سے بحث کی جاتی ہے ۔

علمائے آثار کا اتفاق ہے کہ انسان اول کا ظہور ان مشہور شہروں میں ہوا جو دو دریاؤں کے مابین واقع تھے اور روایات توریت کے تھام قرینے اس پر دلالت کرتے ہیں کہ باغ عدن ، خواہ اس سے مکان حقیقی مراد ہو یا مکان مجازی ایسی ہی جگہ تھا ۔ اس مقام کی آب و ہوا وہاں کے چشمے اور کھوئیں اور پھل پھول وغیرہ سب چیزیں انسانی رغبت کے لحاظ سے بہترین تھیں ۔

حضریات کی تازہ خبروں سے معلوم ہوتا ہے کہ علمائے آثار کو

کچھ چیزیں ایسی دستیاب ہوئی ہیں جن سے قصہ آدم و حوا کی کابل تائید ہوتی ہے۔ یہ اشیاء ایسے شہر کے کھنڈروں میں ملی ہیں جو بلاشبہ انسان کے آباد کئے ہوئے شہروں میں سب سے زیادہ قدیم ہے یعنی شہر ”قیب جورا“ جو چھ ہزار سال پہلے تعمیر ہوا تھا۔

ان چیزوں میں ایک تھیکری کا ٹکڑا خصوصیت سے اہم اور قابل ذکر ہے، اس ٹکڑے پر ایک مرد اور ایک عورت کی شکل کندہ ہے۔ تصویر سے معلوم ہوتا ہے کہ رنج و ملال نے دونوں کی کمر جھکا دی ہے اور حزن و ملال کے آثار ان کے چہرے سے نمایاں ہیں۔ یہ دونوں جنت سے بربہ نہ نکلے ہیں۔ ان کے پیچھے ایک سانپ کھڑا ہوا ان کی نگرانی کر رہا ہے جو گویا ان کی نخوست کی تصویر ہے جس کی بدولت یہ مصیبت میں مبتلا ہوئے ہیں۔

ان مرد اور عورت کا نام تو نہیں لکھا ہے لیکن تصویری قرائن دلاتے ہیں کہ یہ دونوں سانپ کے جال میں پھنس گئے تھے جو ان کے جنت سے نکالے جانے کا باعث ہوا۔ ورنہ اس سے پہلے عیش و راحت کی زندگی بسر کر رہے تھے۔

اس امر کی تحقیق سے پتہ چلا ہے کہ جس نقاش نے اس شکل کو کندہ کیا ہے وہ تقریباً تین ہزار سات سو قبل مسیح یعنی اب سے کوئی پانچ ہزار سات سو برس پہلے موجود تھا۔ یہ زمانہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قصہ تخلیق عالم اور قصہ آدم و حوا کے لکھنے سے دو ہزار سال پہلے کا ہے۔ تھیکری پر جو نقش بنا ہوا ہے وہ اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ یہ قصہ اس زمانہ میں بھی متداول تھا اور کچھ بعید نہیں کہ یہ قصہ اپنی نوعیت کا پہلا قصہ ہو جسے انسان نے اپنے جد امجد کی

سرگزشت کے طور پر نسل بعد نسل روایت کیا ہو اور اسے مختلف طریقوں سے محفوظ رکھنے کی سعی کی گئی ہو —

شہر ”تیب جورا“ جس کا اوپر ذکر کیا گیا بلاد بین النہرین کے شمال مشرق میں واقع ہے۔ جن لوگوں نے اس شہر کے کھنڈر دریافت کئے ہیں وہ ایک علمی مہم کے ممتاز ارکان ہیں۔ یہ مہم امریکہ کے کئی کالجوں اور یونیورسٹیوں کے اہتمام سے ڈاکٹر سمیزز مشہور ماہر آثار کی سرکردگی میں بھیجی گئی تھی —

اس مہم کے کئی سال شہر ”اور“ کی کھدائی میں صرف ہوئے۔ یہ وہی شہر تھا جس کے متعلق کہاں ہے کہ حضرت ابراہیم خلیل علیہ السلام کا مولد تھا۔ اور اب سے پہلے یہ بھی خیال کیا جاتا تھا کہ ”اور“ ہی انسان کا بسایا ہوا قدیم ترین شہر ہے۔ جب یہ مہم شہر ”اور“ سے فارغ ہوئی تو دوران تلاش میں اسے شہر ”تیب جورا“ کے کھنڈروں کا پتہ ملا جن کی کھدائی سے واضح ہوا کہ یہ شہر تو کلدانیوں کے شہر سے بھی زیادہ پرانا ہے بلکہ علمائے آثار نے پورے تجسس اور فور کرنے کے بعد بعض چھوٹے قریوں، غاروں کو مستثنیٰ کر کے انسان کا قدیم ترین شہر ”تیب جورا“ ہی کو قرار دیا۔ ظاہر ہے کہ ایسی قدامت معلوم ہونے کے بعد حضرت آدم و حوا علیہما السلام کے قصہ والی ٹھیکری ماننے پر کوئی تعجب کی گنجائش نہیں رہتی —

جو لوگ نص تورات کے بنا پر اس عقیدہ کے قائل ہیں کہ باغ عدن بین النہرین واقع تھا ان کا عقیدہ توریت کی ان آیات سے ماخوذ ہے —

”شرقی عدن میں ایک باغ لگایا اور اس میں آدم کو رکھا۔

عدن سے ایک دریا نکلتا تھا جو اس کو سیراب کرتا تھا اور

وہاں سے تقسیم ہو کر اس سے چار دریا بہنے لگے تھے۔ ایک دریاے فیشون جو سرزمین ”حویلہ“ کو محیط تھا جس میں سونا ٹوٹل اور حجر الجزع (سنگ) پیدا ہوتا تھا۔ دوسرا دریاے جذعون جو سرزمین کوس کو احاطہ کئے ہوئے تھا۔ تیسرا دریاے حد اقل جو اشور کے جانب مشرق رواں ہے چوتھا

دریاے فرات - (سفر تکوین الاصحاح ۲ : ۸) —

بعض مفسرین تورات کا خیال ہے کہ فیشون بھر ہند کا نام ہے۔ اور باغ عدن اس کے ساحل پر ہندوستان میں تھا۔ بعض کی رائے میں دریاے جیعون، دریاے نیل ہے اور یہ جنت اس کے کنارے مصر میں بنی تھی۔ مگر جمہور مفسرین کو اس سے اختلاف ہے۔ وہ بتا کید بیان کرتے ہیں کہ جنت عدن بین النہرین واقع تھی یعنی کسی ایک دریا یا سمندر کے ساحل پر نہ تھی۔ اس کا محل وقوع اور کے درمیان تھا —

جب ماہرین آثار نے ان دریاؤں کے مابین کھنڈروں کی کھدائی شروع کی تو وہ اشور بابل اور بلاد کلدان کی تاریخ سے بہت کم واقف تھے۔ ان کی معلومات کا زیادہ حصہ تورات کے بیان تک محدود تھا۔ اسی سے ان شہروں کے تمدن قائم ہونے اور ان کے تباہ ہونے کا پتہ چلا تھا۔ مگر ان کے آغاز و انجام کی شرح و کیفیت اور مدت مرور وغیرہ کی تاریخ سے بالکل ناواقف تھے۔ یہی صورت، کنعانیوں، فلسطینیوں اور عبرانیوں کے تمدن کی تھی، جن کا تعلق کچھ نہ کچھ مذکورہ تمدنوں سے رہا ہے۔ گزشتہ صدی کے نصف آخر میں علما نے وحشی اقوام کے آثار کھودنا شروع کئے اور ان کی مدنیت کے اسرار معلوم کرنے کی سعی کی۔ اس میں انہیں قابل ذکر کامیابی ہوئی اور بکثرت آثار کا پتہ چلا۔ ان کے مطالعہ سے عبرانی

تہذیب کا وحشی اقوام کے تہذیب سے صحیح تعلق اور رشتہ معلوم ہو گیا۔ خصوصاً اشوری اور بابلی تہذیب کا ربط اچھی طرح آشکارا ہو گیا۔ دوران تحقیق میں ان قوموں کی تاریخ اور روایات کی نسبت بہت سی چیزیں معلوم ہوئیں۔ جن میں ایک قصہ طوفان بھی ہے جو انہیں تمام و کمال بابلیوں کے قصص میں حاصل ہوا تھا۔ اس قصہ میں نوح علیہ السلام کے نام کی جگہ ایک اور نام ”اوت نابشتیم“ درج تھا۔ ساتھ ہی یہ بھی معلوم ہوا کہ اہل بابل، ارواح، ملائکہ، کروہیم، سرافیم وغیرہ کے وجود پر ایمان رکھتے تھے جو عبرانی مذہب کے مسلمات ہیں۔

علمائے آثار ان انکشافات کے بعد قصہ آدم و حوا علیہما السلام کے آثار پا کر چنداں حیران نہیں ہوئے۔ کیونکہ بابلی اور عبرانی تہذیب کے درمیان مضبوط علاقہ ہونے کی قوی دلیلیں پہلے سے موجود تھیں۔ علاوہ ازیں یہ احتمال بھی ہو سکتا ہے کہ ان قومی و مذہبی قصوں کا مصدر جنہیں بابلی اور عبرانی نقل کرتے آئے ہیں اصل میں ایک ہو۔

چند سال ہوئے جب علمائے آثار کو ایسے آثار اور بھی دستیاب ہوئے تھے جن میں حضرت آدم و حوا کی حکایت کے غیر صریح اشارے پائے جاتے تھے۔ اور قرائن سے یہ ثابت ہوا تھا کہ حضرت آدم و حوا اور ان کے بھٹکنے کا قصہ اہل بابل کے یہاں بھی مشہور تھا۔ قرائن اور اشاروں کی حیثیت و شان الہیہ علما کے سامنے وجہ اختلاف رہی ہے۔ بعض کا خیال ہے کہ یہ قرائن اس قصہ پر صریحاً دلالت کرتے، بعض انہیں غیر صریح سمجھتے ہیں۔ بہر حال نفس دلالت

کے سب قائل ہیں —

بابلی اور عبرانی روایات کے درمیان جو ربط معلوم ہوا ہے اس کے مبدع و منشأ میں بھی اختلاف پایا جاتا ہے۔ مشہور ہے کہ حضرت ابراہیم خلیل جن کے متعلق علمائے تورات کا بیان ہے کہ یہودیوں کی امت انہیں سے بنی، کلدانیوں کے شہر ”اور“ سے نکل آئے تھے۔ یہ شہر ان کا مولد و مسقط الراس تھا۔ چونکہ اس کا نام ہی ”کلدانیوں کا اور“ ہے جو خود اس پر دلالت کرتا ہے کہ حقیقت میں یہ شہر بابلی تھا اس لئے ظاہر ہے کہ حضرت ابراہیم کے ساتھ بابل کی بہت سی روایتیں اور قصے بھی عبرانیوں میں منتقل ہوئے ہوں گے۔ پھر یہودیوں پرور زمانہ سے ”ارض موعہ“ میں کنعانیوں سے جا ملے ہوں گے —

کنعانی اور فلسطینی لوگ اپنے نسب کو اہل بابل سے منسوب کرتے آئے ہیں اور ان میں بابلیوں کے بہت سے قصے اور ان کے حالات جن میں پرور زمانہ سے تغیر و تعریف بھی ہوئی ہے، رائج ہیں۔ غالباً جب عبرانی کنعانیوں اور فلسطینیوں میں شامل ہوئے ہوں گے تو انہیں کنعانیوں میں بابلی عقائد و اخبار دیکھ کر کوئی تعجب نہ ہوا ہوگا —

اس موقع پر قدرتا یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ خلقِ آدم و حوا اور ان کے بہتکلنے کا قصہ اہل بابل کو کیونکر پہنچا کہ انہوں نے اس قصہ کو نقوش کی صورت میں مرتب کر دیا۔ سر دست اس کا جواب مشکل ہے۔ غالباً مستقبلِ خود جواب دے لے گا۔ اس وقت تک جو کچھ ثابت ہے وہ یہ ہے کہ حضرت آدم و حوا کی پیدائش اور

ان کے غلطی میں مبتلا ہونے کا قصہ دنیاے بشریت کو کم از کم حضرت موسیٰ علیہ السلام سے دو ہزار سال پہلے بھی معلوم تھا۔ بلکہ غالباً اس سے بھی بہت پہلے بنی نوع انسان میں متداول تھا۔

بہت زیادہ تعجب کی بات یہ ہے کہ اہل بابل (۵۷۰۰) پانچ ہزار سات سو سال پہلے قہدن میں اس درجہ ترقی کرچکے تھے کہ اپنے قصص اور عقائد دینیہ کو ٹھیکروں پر نقش کر دیتے تھے۔ جس ٹھیکرے پر حضرت آدم و حوا کی تصویر کندہ ہے اس کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ نقش نہایت باریک اور ذفیس ہیں۔ حضرت آدم کی داڑھی نمایاں ہے، جسم برہنہ ہے، صرٹ سر پر ایک پوش ہے۔ وہ جنت عدن سے نکل کر جا رہے ہیں۔ حضرت حوا بھی برہنہ ہیں اور آدم علیہ السلام کو پکڑے ہوئے ہیں۔ دونوں کے بشرے سے ندامت و مسکنت کے آثار عیاں ہیں۔ غرض تصویر اپنے نقوش کے ذریعہ سے توریث کی پوری روایت کا منظر سامنے کر دیتی ہے۔

ڈاکٹر سبیزو کو یہ قاریخی ٹھیکرا ”تھب جورا“ کے کھنڈروں میں ملا تھا جن کے تفحص سے واضح ہوا ہے کہ اس مقام کے طبقات پر آٹھ شہر اور آباد ہو کر معدوم ہو چکے ہیں۔ ان کھنڈروں میں علمائے آثار کو لوہے یا تانبے کے آلات و ظاروت کا کوئی پتہ نہیں ملا۔ اس لئے شہر تیب جورا بلا شبہ حبری زمانہ میں تعمیر ہوا ہوگا۔ ان سب باتوں سے مجموعی طور پر یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ تیب جورا کے کھنڈر انسان کے دریافت کئے ہوئے کھنڈروں میں سب سے زیادہ قدیم ہیں۔ اس موقع پر یہ ذکر کر دینا بھی مناسب ہوگا کہ اس شہر کے کھنڈر ترقی یافتہ قہدن پر دلالت کرتے ہیں۔ ان کھنڈروں کے مزید حالات یہ ہیں۔

" شہر کے وسط میں ایک وسیع میدان ہے جس میں ایک بڑا مندر بنا ہوا تھا ۔ اس مندر کے پاس ایک مضبوط قلعہ تھا ۔ آثار سے ظاہر ہے کہ شہر کا جنوبی حصہ قونکروں کے سکونت کے لیے مخصوص تھا ۔ شہر کے لیے باقاعدہ سرکیں بنی ہوئی تھیں ۔ جن میں سے ایک شاہراہ عام بھی تھی ۔ "

یہ بھی ظاہر ہے کہ شہر کی تعمیر کرنے والے دور رس نگار رکھتے تھے ۔ مختلف اطوار اور تہذیب کے متلوع طرز پسند کرتے تھے ۔ انہیں جنگ کے وقت حصار سے کام لینے کا اصول معلوم تھا ۔ اسی لیے انہوں نے شہر کی فصلوں کے اندر پانی کی خندق بنا رکھی تھی جس کی گہرائی ایک سو فٹ سے زیادہ تھی ۔

شہر کے ہندسی آثار اس پر دلالت کرتے ہیں کہ اس قوم کا فن تعمیر نمایاں ترقی کرچکا تھا ۔ شہر کے مکانوں میں سے کوئی گھر کھڑکیوں ' چھجوں اور سناروں وغیرہ سے خالی نہ تھا ۔ یہ لوگ پل اور برجوں اور چوکیوں کی تعمیر کا راز جانتے تھے ۔ یہ تمام معلومات ان کے ذوق سلیم اور فنی مہارت کی شاہد ہیں ۔

نیند کے اوہام و حقائق

امریکہ کے دو مشہور سائنس دان لایرٹ اور سولر نیند کے متعلق علمی نقطہ نظر سے بہت کچھ تحقیق کرچکے ہیں ۔ انہیں اسی سلسلہ میں

بہ کثرت حقائق معلوم ہوئے اور بہت سے اوهام کی لغویت کا ثبوت ملا ۔
کچھ مدت ہوئی دونوں نے اپنی متفقہ تحقیقات کی رپورٹ شائع کی تھی ۔
اس رپورٹ کا ملخص ذیل میں شائع کیا جاتا ہے ۔

نیند کے متعلق یہ بات بہت زیادہ مشہور ہے کہ سونے والا پہلے کھنٹہ
میں بہت کھری نیند میں ہوتا ہے ۔ اتنی کھری نیند بعد کے دوسرے کھنٹوں
میں نہیں ہوتی ۔ جو آواز اسے دوسرے کھنٹہ کی نیند سے بیدار کرنے کے
لیے کافی ہوسکتی ہے وہ پہلے کھنٹہ کی نیند سے اٹھانے کے لیے کافی نہیں
ہوتی ۔ اسی طرح یہ خیال بھی بہت عام ہے کہ نصف شب کے پہلے حصہ
میں کھنٹہ بھر سو لیٹا نصف آخر میں دو کھنٹہ کی نیند کے برابر ہے ۔
یہ خیالات بے بنیاد ہیں ۔ تحقیقات سے ثابت ہوا ہے کہ اگرچہ انسان کی
نیند پہلے کھنٹہ میں کھری ہوتی ہے تاہم جسم کے عضلات دوسرے اور
بعد کے کھنٹوں میں زیادہ تھیلے اور سست ہوتے ہیں ۔ اس سے کم سے
کم یہ ظاہر ہوتا ہے کہ جسم کی چستی و تازگی کم اور پست ہو رہی ہے ۔
یہی کمی اور پستی کھری نیند کی لازمی شرط ہے ۔ حقیقت میں نیند کی
حالت مدت کے لحاظ سے بہت اہم ہے ۔ اگر نیند سیٹھی اور کھری ہو تو
چار کھنٹہ کی نیند سے اتنا فائدہ ہوتا ہے جتنا نو کھنٹہ کی اچات نیند
سے نہیں ہوتا ۔

ریاضت اور نفسی اثرات | تحقیقات سے معلوم ہوا کہ سونے سے پہلے بدنی
ریاضت کرنے سے اونگھ غائب اور نیند اچات
ہو جاتی ہے ۔ صبح کو جب آدمی سوکر اٹھتا ہے تو ہلکوں پر نیند کا
بوجھ محسوس کرتا ہے ۔ فکری و دماغی ریاضت و محنت کا معاملہ اس
کے برعکس ہے ، کیونکہ سونے سے پہلے قوالے فکریہ سے کام لیٹا نیند پر

کوئی ناگوار اثر نہیں ڈالتا۔ یہ حقیقت ہے کہ جب انسان کی نفسی حالت سوتے وقت پر سکون ہوگی، اسے کسی نوع کی پریشانی یا کوفت نہ ہوگی تو اسے نیند بھی آرام و سکون سے آئے گی۔ اور اگر سوتے وقت کسی خوت یا آئندہ مصیبت و افتاد کے امیدوار ہوتے ہیں تو انہیں میٹھی نیند سونا نصیب نہیں ہوتا۔

بالغ نظر اشخاص کی رائے میں بے خوابی کے بھوک اور غذا کا نیند پر اثر اہم اسباب تین ہیں۔

(۱) ایسی غذا استعمال کرنا جو معدہ کے لیے نامناسب ہو

(۲) کھانا، کافی کھانا

(۳) دیر ہضم اور بہ مشکل ہضم ہونے والی غذا استعمال کرنا۔

ان میں سے ہر سبب بے خوابی کا باعث ہے اور انسان کو میٹھی نیند

سے محروم کر دینے کے لیے کافی ہے۔

معدہ کا کام کھانا ہضم کرنا ہے۔ اس لیے وہ کھانے کے تقریباً چار گھنٹہ

بعد خالی ہو جاتا ہے۔ کوئی شخص دن کا کھانا صبح کو آٹھ بجے کھاتا ہے اور رات

کا شام کو سات بجے۔ ایسی صورت میں اس کا معدہ رات کو گیارہ بجے کے

قریب خالی ہو جائے گا اور نو گھنٹے تک مسلسل خالی رہے گا۔ اس کا

لازمی نتیجہ بے خوابی ہوگا۔ بالفرض اگر ایسا شخص سوتے میں کامیاب ہوا

تو بھی اسے آرام کی اور میٹھی نیند نہ آئے گی اور صبح کو جب اٹھے گا تو اس

کی طبیعت سخت مکدر رہے گی اور دن بھر نیند کا غلبہ رہے گا۔

برخلاف اس کے اگر رات کا کھانا دیر کر کے کھایا جائے اور اس کا خیال

رہے کہ غذا زود ہضم ہو اور بستر پر جانے سے پہلے معتدل حوارت کا کوئی

میٹھا شربت، دودھ یا ہلکی چائے وغیرہ پی لی جائے تو نیند خوب آئے گی۔

جن عصبی مزاج اشخاص کو چائے خصوصیت سے نقصان پہونچاتی ہو، انہیں چھوڑ کر باقی سب کے لیے رات کے کھانے کے ساتھ چائے اور قہوے کا استعمال بہت مناسب ہے۔ اس سے بے خوابی بالکل نہ ہوگی۔

چائے اور قہوے کے متعلق بہت سے اشخاص اسی وہم میں مبتلا ہیں کہ رات کو اس کا استعمال بے خوابی کا باعث ہوتا ہے۔ حالانکہ یہ وہم بے بنیاد ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ جو بے خوابی کبھی کسی محرک چیز کے استعمال کرنے والوں کو ہو جاتی ہے اس کا سبب یہ چیز نہیں بلکہ کچھ اور ہوتا ہے۔ مثلاً افراط حرکت یا سونے سے پہلے زیادہ دیر تک لہو و لعب میں مشغول رہنا۔ وغیرہ۔ اگر اس قسم کی حرکات سے بے خوابی کی شکایت ہو جائے۔ تو اس کا بہترین علاج یہ ہے کہ گرم حمام کھا جائے۔ اس سے بہت فائدہ ہوگا اور نیند اچھی طرح آنے لگی۔

کمرے کی فضا | کمرے کی فضا کو نیند کے ساتھ بڑا لگاؤ ہے۔ اسی طرح جسم کے درجہ حرارت کو بھی اس باب میں نمایاں اہمیت حاصل ہے۔ اگر کوئی کہے کہ کمرے کی فضا اس حد تک سرد ہونا چاہئے کہ لعنت یا بیماری کھل وغیرہ اڑھنے کی حاجت ہو تو اس کا یہ کہنا بڑی جہالت کی دلیل ہے۔ کیونکہ اڑھنے کی یہ چیزیں سوتے ہیں عضلات کے اچھے طرح پھیلنے میں مزاحم ہوتی ہیں اور بدن پوری طرح تھیلنا ہونے اور کافی آرام پانے سے قاصر رہتا ہے۔ اسی طرح اگر کمرے بہت سرد ہو اور اڑھنے کے لیے اتنی ہلکنی پوشش سے کام لیا جائے کہ جسم میں معتدل گرمی نہ آئے تو جسم ضرور مناسب درجہ حرارت قائم رکھنے کے لیے غیر معمولی جد و جہد کرے گا اور جب آدمی سوکر اٹھے گا اور اسے سردی محسوس ہوتی ہوگی تو اسے خود معلوم ہو جائے گا کہ وہ آرام کی نیند نہیں سوسکا۔

تجربات نے ثابت کر دیا ہے کہ جو تھڑا آواز سونے والے کے قریب بلند ہوتی ہے وہ اس کے عضلات پر ضرور اثر کرتی ہے اور قریب قریب اسے بیدار کر دیتی ہے۔ جو لوگ تھڑے اور ریلوں کی پٹری کے قریب سوتے ہیں یا اس طرح کے اور مواقع پر سونے کی کوشش کرتے ہیں انہیں جیسی چاہئے ویسی آرام کی نیند نہیں آ سکتی۔ خواہ انہیں ٹرینوں اور مختلف سواریوں کے جھٹکے برداشت کرنے کی عادت ہو کیوں نہ ہو اور وہ سوتے ہیں ان جھٹکوں سے بیدار ہوتے ہوں یا نہ ہوتے ہوں۔ یہی صورت روشنی کی ہے کیونکہ اس کی شعاعیں سونے والے پر ضرور اثر انداز ہوتی ہیں اور اکثر نیند آنا دیتی ہیں۔ تجربات سے ثابت ہو چکا ہے کہ روشنی سونے کے کمرے کی فضا میں نہایت سرعت سے گزرتی ہے اور اس کے اثر سے سویا ہوا شخص بے چین ہونے لگتا ہے۔ گو ظاہر میں خود اسے اس کا واضح اور نمایاں شعور نہیں ہوتا —

اس سے زیادہ عجیب بات یہ ہے کہ کمرے کا رنگ بھی نیند پر خاصہ موثر ہے اور یہ تسلیم کر لیا گیا ہے کہ نیند کی نوعیت اور راحت بعضی سے رنگوں کو بڑا تعلق ہے۔ اگر کمرے کا غالب رنگ ساڈل، سبز یا سفید ہوگا تو اچھی طرح آئے گی اور اگر گہرا سیاہ یا کوئی اور گہرا رنگ ہوگا تو اس کا اثر برعکس ہوگا یعنی نیند اچانک رہے گی —

نیند کی نسبت سے لباس کا معاملہ بھی کچھ کم لباس اور جسم کی وضع اہم نہیں ہے۔ بعض لباس اس وضع کا ہوتا ہے کہ اس سے اعضا کو اچھی طرح پھیلانے اور آرام لینے کا موقع نہیں ملتا اور بعض آرام دہ ہوتا ہے۔ ساتھ ہی یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ جو لوگ سوتے وقت کپڑے بالکل اتار دیتے ہیں انہیں خوب گہری نیند آتی ہے —

تخت یا پلنگ پر سوتے وقت کسی خاص وضع یا کروت سے لیٹنے کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ کیونکہ جسم حالت خواب میں تقریباً ہر پندرہ منٹ میں ایک وضع سے دوسری وضع پر ہوجاتا ہے۔ طبیعت خود اسے مناسب وضع پر متوجہ کردیتی ہے۔ اس لیے سونے والے کبھی پیت پر کبھی پیٹھ پر سوتے نظر آتے ہیں۔ کوئی دائیں کروت پر سونے کا عادی ہے کسی کو بائیں کروت سے سونے کی عادت ہے۔ بہر حال یہ ایک قطعی امر ہے کہ کم و بیش پندرہ منٹ تک ایک ہی وضع پر لیٹے رہنے کی فوجت بہت کم آتی ہے۔ یہ ضرور ہے کہ پیٹھ کے بل اور دائیں پہلو پر سونے سے جتنا فائدہ ہوتا ہے اتنا فائدہ پیت کے بل اور بائیں پہلو پر سونے سے نہیں ہوتا۔

غذا اور خواب | علمائے فحسات کی غالب رائے یہی ہے کہ رویا یا خواب کا اثر نیند پر زیادہ نہیں ہوتا۔ بعض لوگ البتہ کبھی کبھی تراونے خواب دیکھ کر خوت زدہ ہوجاتے ہیں لیکن ان پر عام حکم نہیں لگایا جاسکتا۔

تازہ ترین علمی تحقیقات یہ ہے کہ جو شخص دن کو مصروفیت کی وجہ سے آرام کی طرت متوجہ نہیں ہونے پاتا اسے خواب بہت نظر آتے ہیں۔ غذا کے متعلق واضح ہو چکا ہے کہ جس کھانے میں غذائیت زیادہ ہوتی ہے وہ کھانا جسم کی ان قوتوں کا بدل بن جاتا ہے جو بیداری میں زائل یا کم ہوتی رہتی ہیں۔ اگر کسی شخص کی کوئی رات بیداری میں کئی ہو تو وہ اچھی غذا کی مدد سے ایک حد تک اس قوت کو بحال کر سکتا ہے جس کی توقع عموماً نیند ہی سے کی جاتی ہے۔ تحقیقات سے معلوم ہوا ہے کہ شکریا ایسی چیزوں کو

کثرت سے استعمال کرنا جن میں شکر زیادہ ہو، ایک دو گنا زیادہ فیصد لانے کا باعث ہوتا ہے۔ اس لیے جب آدمی سوکر اٹھے اور نیند کا غلبہ محسوس ہو تو اسے کچھ شیرینی کھانا چاہیے کیونکہ یہ اس کی قوت شدہ نیند کی قلافی کو دے گی۔ اسی طرح اگر کوئی بہت سویرے اٹھے بیٹھے اور اسے اس کا احساس ہو کہ کافی سونے کو نہیں ملا ہے تو وہ بھی کوئی ایسی چیز کھا کر باز رفتہ قوت حاصل کر سکتا ہے جس میں کاربوہائیڈریٹ (شکر) زیادہ شامل ہو۔ غرض اس خصوص میں مہٹائی عجیب و غریب چیز ہے۔ ضرورت ہو تو اس سے ضرور فائدہ اٹھانا چاہیے۔

شکر کی طرح کیماسیم کا اثر بھی اس مقصد کے لیے اچھا ہوتا ہے اور یہ چیز دودھ میں کافی ہوتی ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ اگر غذا کم ہوگی یا ایسی چیزیں کھانے میں آئیں گی جن میں غذائیت کم ہو تو گہری اور آرام کی نیند کم آئے گی۔

جو چیزیں نفسیاتی انفعالات کا باعث ہوتی ہیں وہ انفعالات اور اونگھ | بڑی بلاشبہ نیند کے معاملہ میں خاص اثر رکھتی ہیں۔

جو شخص کسی اضطراب یا انفعال کی حالت میں سوتا ہے یا ایسا کام کرتے کرتے سو جاتا ہے جس میں تمام افکار و قویں مشغول ہوں تو اسے اچھٹی ہوئی نیند سے دو چار ہونا پڑتا ہے۔ ایسا شخص آرام سے نہیں سو سکتا اور خلاف اس کے جس شخص کو صرف قوالے بدنیہ سے کام لینے کی نوبت آئے خواہ اس میں کتنی ہی مشقت کیوں نہ ہو، اس شخص کو نیند خوب آئے گی۔

اہل علم کا تجربہ ہے کہ سونے سے پہلے کچھ پڑھنا اور مطالعہ کرنا

نیلند خوب لاتا ہے - اور بیداری کا اندیشہ کرنا اور اس کے خیال سے
 ترنا بے خوابی کا باعث ہوتا ہے - بیداری پر قابو پانے کا بڑا ذریعہ یہی
 کتاب اور اس کا مطالعہ ہے - اطباء نے بار بار اس کا تجربہ کیا اور اسے
 کامل الاثر پایا —

انسان غذا کو تو دنوں اور ہفتوں کے لیے چھوڑ دینے پر قدرت رکھتا
 ہے مگر وہ بغیر سوئے ہوئے ایک ہفتہ بہ مشکل گزار سکتا ہے - بلکہ یہ بات
 اس کے قابو سے بالکل باہر ہے - اگر کوئی شخص مسلسل ایک ہفتہ تک نہ سوئے
 تو یقیناً ہلاک ہو جائے گا - پینتیس سال سے زیادہ عمر ہونے کے بعد سونے کی حاجت
 کم ہوتی ہے اور مدت خواب کے کھت جانے سے خطرہ بھی کم ہو جاتا ہے —

(۲ - ز - ۲)



دلچسپ معلومات

سفیہ فام زنگی | زنگیوں کے متعلق مسئلہ ہے کہ "بشستن نگر نہ سفید"۔ مگر اب زمانہ کی بوقلمونی اسے بھی جھٹلانے کے لیے تیار ہے۔ آج کل امریکہ میں ایک زنگی کا رنگ تبدیل ہو جانے پر بڑے بڑے مہلا دنک ہیں اور اس عجیب واقعہ سے بڑی دلچسپی پیدا ہو گئی ہے۔ اسمیوں تو فام کا ایک زنگی ہائیٹی کا باشندہ ہے۔ کچھ مدت سے مریض تھا۔ اس نے ہائیٹی کے بعض جادو گروں کا علاج شروع کیا جس کا اثر یہ ہوا کہ اس کا بشرہ یکا یک سفید ہو گیا۔ امریکی اطباء اور سائنس دان بڑی سرگرمی سے کوشش کر رہے ہیں کہ کسی طرح اس دوا کی ترکیب وغیرہ معلوم کر لیں جس کا یہ عجیب و غریب اثر ظاہر ہوا ہے۔

چھپا لیس درجہ کی حرارت | لاس انجلوس (امریکہ) کے ایک شفا خانہ میں اپنی مریضہ کا درجہ حرارت چھپا لیس سنٹی گریڈ ہے، 'بارجون اس کے زندہ ہے!۔ اب تک کی تحقیقات سے یہ تسلیم کیا جا چکا ہے کہ جب درجہ حرارت بیالیس سنٹی گریڈ سے بڑھ جائے تو موت واقع ہو جاتی ہے۔ اطباء نے اس عجیب واقعہ کی توجیہ

یہ کی ہے کہ مریضہ کے اجزاء دماغ میں کسی جگہ قدانی (سل) درم ہو گیا ہے جو طبعی کیفیت کے ساتھ حرارت جسم کو منظم رکھنے سے مانع آتا ہے —

تیراک اور موٹر | مسٹر وارن ولیمز نے لاس انجلوس میں ایک مشین ایجاد کی ہے جو بخاری کشتی کے موٹر سے مشابہ ہے۔ یہ اس موٹر کو اپنی پیٹھ کے پیچھے رکھ کر پانی میں اُترتے ہیں۔ جب خود تیرتے تیرتے تھک جاتے ہیں تو موٹر کو چالو کر دیتے ہیں اور اس کے ذریعہ سے تیرنے لگتے ہیں —

پر دار بلیاں | حضرت سعدی کا مقولہ ”گربہ مسکین اگر پر داشتے“ والا بہت مشہور ہے جو ایک مسلمہ صداقت ہے۔ لیکن آج اس کلیہ کا بھی استثنا موجود ہے۔ آکسفورڈ کے باغ حیوانات میں ایک بلی ہے جس کے دو برس پہلے اس بلی کا پتہ مسز ہیوز گریفتھ کو ملا۔ ان کا بیان ہے کہ میں نے اس بلی کو ان یوروں سے بالکل اسی طرح کام لیتے دیکھا ہے جس طرح پرندے اپنے یوروں سے کام لیتے ہیں —

بغیر آواز اور | انگلینڈ کے ایک تجربہ کار ماہر جنگ نے یہ محسوس دھوئیں کی بندوق | کیا کہ نشانہ اندازی کی تعلیم میں رنگروٹوں کو بندوق کی آواز اور اس کے دھوئیں سے بہت نقصان پہنچتا ہے، ان کے اعصاب مردہ ہو جاتے ہیں اور درد سر کا عارضہ مستقل ہو جاتا ہے۔ اس لیے اس نے ایک بندوق ایجاد کی جس سے نہ دھواں اُٹھتا ہے نہ آواز پیدا ہوتی ہے۔ سر ہوتے وقت نشانہ پر صرف ایک شعاع سی پڑ جاتی ہے —

زہین کا حالہ | سب کو معلوم ہے کہ سورج اور روشنی قاروں کے ارد گرد ہالے ہیں اور جن اجرام فلکیہ میں نور اصلی نہیں ہے ان

کے ہالے نہیں ہیں۔ مگر پروفیسر لارس وگارتہ مہم فلکیات جامعہ اولو نے ایک نیا علمی نظریہ قائم کیا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ کرۂ ارض کے بھی حالہ ہے جو فضاے محیط میں ۷۰ کیلو میٹر سے آئینہ سو کیلو میٹر کی بلندی تک دیکھا جاسکتا ہے۔ یہ حالہ سورج کی شعاعیں کرۂ ارض پر چھائی ہوئی کیسوں پر پڑنے سے پیدا ہوتا ہے۔ یا اس وقت وجود میں آتا ہے جب نائٹروجن گیس کرۂ ارضی پر برقی رو کے گزرنے سے مشتعل ہوتی ہے۔

علمی تجربات سے واضح ہوا ہے کہ انسان و حیوان کمی اشتہا کا سبب میں بھوک اس وقت کم ہوتی ہے جب غذا میں حیاتین (ب) نہیں ہوتی۔ بسا اوقات اس مادہ کی کمی یا فقدان سے بھوک بالکل ہی جاتی رہتی ہے اور کبھی نا کھانی موت بھی واقع ہو جاتی ہے۔

اجرام فلکی کے اختلات سے قوت جاذبیت میں اجرام مختلفہ میں جاذبیت اختلات ہوجاتا ہے۔ مثلاً سورج میں زمین سے بہت زیادہ قوی جاذبیت ہے۔ اگر کوئی معمولی قن و توش کا آدمی جس کا وزن زمین پر ۱۲۰ پونڈ سے زیادہ نہ ہو بالفرض کرۂ شمس میں منتقل ہوجائے تو وہاں اس کا وزن تقریباً تین ہزار نو سو پونڈ ہوجائے گا۔ اور فقط اس کے ہاتھوں کا وزن تقریباً تین سو پونڈ ہوگا۔ یہ بوجہ اتنا ہوگا کہ اس کے ہاتھ ہالنے سے معذور ہوں گے۔ اور اگر اسی شخص کی رسائی کرۂ قمر میں فرض کی جائے جہاں قوت جاذبیت سورج کے مقابلہ میں کم زور ہے تو وہاں اس کا وزن صرف (۲۲۰) تین سو بیس پونڈ رہے گا۔ اور یہی وزن سرخ میں پہنچ کر صرف (۵۳) تین پونڈ

رہ جائے گا۔ کرۂ قمر اور کرۂ سرخ دونوں میں جست و خیز کی قوت بہت قوی اور سرعت سیر بے حد بڑھ جائے گی حتیٰ کہ جدید ترین تیز رفتار قرین بھی اس رفتار کا مقابلہ نہ کر سکے گی۔

کرۂ ارض کا رنگ | امریکہ کے عالم فلکیات پروفیسر سلیمور کا بیان ہے کہ اگر ہم کرۂ شمس تک پہنچ سکیں تو ہمیں زمین کے کرۂ کا رنگ ارزق (نیلگون) نظر آئے گا۔ ان کے اس قول کی تصدیق علمی ذرائع سے بھی ہو چکی ہے۔ پروفیسر موصوت نے یہ بھی کہا ہے کہ سیارہ پلوٹو کا رنگ جو نہایت روشن اور چمکیلا ہے، سورج کی روشنی کو بڑی قوت سے لوٹا دیتا ہے اور اس میں اس درجہ لمعانیت پیدا ہو جاتی ہے کہ اس کے فوٹو کو دیکھ کر اس کا درجہ معلوم کرنا ناممکن ہے۔ اس موقع پر یہ معلوم کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ اجرام فلکیہ کے رنگ جو مقابل کے اختلاف سے بدلتے رہتے ہیں کبھی سورج نظر آتے ہیں کبھی نیلگوں اور کبھی کسی اور رنگ کے۔

سانپ اور کھاری پانی | سانپ کے نہمت مشہور ہے کہ کھاری پانی یعنی سمندر کے پانی سے تڑپتا ہے اور اس کے قریب نہیں جاتا مگر میٹھے پانی کے دریاؤں میں خرسی سے تھیرتا اور رہ سکتا ہے۔ لیکن علمائے حیوانات نے ایک قسم کے سانپ کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ وہ سمندر میں بہت تھیرتا ہے بلکہ سوائے سمندر کے پانی کے اور کسی پانی میں جاتا ہی نہیں۔ یہ قسم استوائی افریقا کے سوا اور کہیں نہیں پائی جاتی۔

فضا اور جنسی غدود | حیاتیات کے مباحث سے واضح ہے کہ فضا کے حوالی اور درجہ برودت و حرارت کو غدودی افراوات میں عموماً اور جنسی غدود میں خصوصاً بڑا دخل ہے۔ معلوم ہوا ہے کہ جنسی

تازگی و توانائی جمہور کے اعتقاد کے خلاف بلاد بارہ میں زیادہ پائی جاتی ہے۔ اتنی بلاد حارہ (گرم ممالک) میں نہیں ہوتی۔ معتدل ممالک میں نسبتاً جو نسلی تلامض پایا جاتا ہے وہ فضا کے عوامل سردی و گرمی کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ اس کا تعلق مدنیت کے مخصوص عوامل سے ہے۔

یہ غدہ حنجرہ کے بالائی جانب رہتا ہے اور انسانی غدہ درقیہ کے افعال جسم میں اس کی بڑی قیمت ہے، اس کی بدولت

جسم کے بہت سے کام انجام پاتے ہیں۔ اس غدہ کا حجم چھ اور فصلوں کے اختلاف سے کم و بیش ہوتا رہتا ہے۔ جرمنی کے ڈاکٹر وان کولڈنز نے کئی اشخاص کے غدہ درقیہ دیکھے اور تحقیقات سے معلوم کیا کہ یہ غدہ ۴۰ سال کی عمر تک حجم میں بڑھتا رہتا ہے پھر اس کا حجم کم ہونے لگتا ہے۔ ساتھ ہی یہ بھی پتہ لگا کہ عورت کا غدہ درقیہ حجم میں مرد کے غدہ سے بڑا ہوتا ہے مگر عورت کے غدہ میں آبدائی کا عنصر کم ہوتا ہے۔ اس غدہ کا وزن ماہ اپریل سے ماہ جولائی تک بڑھتا ہے پھر ماہ اکتوبر تک اپنی حالت پر قائم ہو جاتا ہے بعد ازاں سال کے باقی مہینوں میں اس کے حجم میں کمی ہونے لگتی ہے۔

غدہ درقیہ کے متعلق یہ بیان تازہ ترین تحقیقات کا نتیجہ ہے —

امریکہ کے ایک علمی جماعت کے اخبار مظهر ہیں کہ ڈاکٹر سارفیا کا بدل

ناتان ایڈی جو شیگی یونیورسٹی کے پروفیسر ہیں ایک ایسی نہاتی دوا کے دریافت میں مصروف ہیں جو اعصاب کی تھپہر (سن کرنا) میں سارفیا کی پوری خاصیت رکھتی ہو ساتھ ہی مضمرات کے استعمال کی عادی بھی نہ ہونے لے۔ گویا سارفیا کا بے عیب بدل معلوم کرنا چاہتے ہیں۔ پروفیسر موصوف نے اب تک جو تجربات کئے

ہیں وہ ان کی کامیابی کی توقع دلاتے ہیں۔ معلوم ہوا ہے کہ انہوں نے مارفیا کا وہ جزو معلوم کر لیا ہے جو خاصاً مشہور ہے۔ اس کی مدد سے انہیں اپنے اکتشافات میں بہت مدد ملی۔

ایک نئے طرز کا امریکہ میں عمل تنویم کے بعض عجیب حادثے پیش آچکے عمل تنویم ہیں۔ وہاں کے جرائم پیشہ لوگ تنویم سے بھی عجیب عجیب طرح کے کام لیتے ہیں۔ ایک واقعہ خود امریکی پولیس کے ساتھ ہوا تو معلوم ہوا کہ یہ لوگ دوران عمل میں ایک عجیب سیال دوا سے مدد لیتے تھے۔ پولیس نے یہ سیال امتحان و تجزیہ کے لیے ایک معمل میں بھیج دیا جس کی تحقیقات سے معلوم ہوا کہ اس سیال میں جو عناصر شامل ہیں ان میں فیرونل اور پربیتریک ایسٹ بھی ہیں۔ یہ سیال تنویم میں کام آنے والے مشہور سیالوں سے مختلف ہے۔ اس کا ایک نقطہ بھی فی الفور تنویم طاری کرنے کے لیے کافی ہے۔

ٹائفائڈ بخار کے متعدد علمی تجارب سے ثابت ہوا ہے کہ روشنی کی چھوٹی جراثیم اور اسواج نور چھوٹی شعاعیں ٹائفائڈ بخار کے جراثیم کو ہلاک کر دیتی ہیں۔ امریکہ کے دو ڈاکٹر 'فابیون اور گراہم نے اس کا ثبوت دیا ہے کہ چھوٹی موجوں والی شعاعیں 'علم الجراثیم کی بعض معلوم قسموں اور ٹائفائڈ کے جراثیموں پر ڈالنے سے اس مرض کا استیصال ہو جاتا ہے۔ اس نظریہ کی بنا پر آج کل کے ڈاکٹر اس کوشش میں ہیں کہ ریڈیو کی چھوٹی موجوں سے خلا کو پاک کرنے کا طریقہ معلوم کریں اور ٹائفائڈ سے بچنے کے لیے ان کی تاثیر دریافت کریں۔

بعض امریکی سائنس دانوں نے اپنے جدید تجربات امریکن

مہلک شعاعیں

کیہکل سوسائٹی کے سامنے پیش کر کے اپنے اس دعوے کو

ثابت کیا کہ بالائے بنفشی شعاعیں نغز مایہ کے خلیوں کو فنا کر دیتی ہیں اور اس جلسہ میں جو خلیے طحال سے اخذ کئے تھے انہیں پیش کر کے ان پر شعاعیں ڈالیں جن کا طول (۳۵۰) انگسٹرام سے (۲۲۳۵) انگسٹرام تک تھا۔ اس مہل کو ۱۵ منٹ بھی نہ ہوئے تھے کہ تمام خلیے ہلاک ہو گئے اور ان کی غشاء خارجی پر ہلچل سے نمودار ہونے کے بعد زندگی کا ذرا بھی اثر باقی نہ رہا۔

جعلی فوت دریافت | جعلی پرامیسیو فوت کی حقیقت معلوم کرنے کے لیے کرنے کا آلہ ایک انگریز نے ایک آلہ ایجاد کیا ہے جس کا تعلق فوٹو گرافی سے ہے۔ اس آلہ میں بالائے بنفشی شعاعیں پیدا کرنے والی مشین نصب ہے۔ جب کسی فوت کے اصلی ہونے میں شبہ ہوتا ہے تو اس فوت پر یہ شعاعیں ڈالی جاتی ہیں۔ پھر اگر وہ فوت حقیقت میں مصنوعی ہوتا ہے تو اس کے جن حصوں میں جعل کیا گیا ہے وہ سات اور آشکارا نظر آنے لگتے ہیں۔

ایک عجیب ٹیلیفون | آسٹریا کے دو انجینئروں نے ایک عجیب آلہ ایجاد کیا ہے جو ٹیلیفون کے پاس لگا دیا جاتا ہے۔ اس آلہ کی عجیب خصوصیت یہ ہے کہ جس نے گھر میں یہ آلہ ہو اگر اس سے کوئی شخص ٹیلیفون سے بات کرے اور گھر والا موجود نہ ہو تو بجائے اس کے یہ آلہ جواب دیتا ہے اور جس وقت صاحب خانہ کے ملنے کا امکان ہے اس وقت سے مطلع کرتا ہے۔

کالی کھانسی کا ٹیکہ | کالی کھانسی جسے بعض جگہ کوکر کھانسی اور انگریزی میں ہوپنگ کف کہتے ہیں بچوں کو اکثر ہو جایا کرتی ہے اور سخت تکلیف دیتی ہے۔ اس کے لیے بعض

اطباء ، بعض قسم کے انجکشن (ٹیکہ) بھی دیتے ہیں مگر اب تک کوئی انجکشن ایسا نہیں ملا جو اس مرض کے لیے علاج شافی ثابت ہوتا —

حال ہی میں ڈاکٹر لیوس ساور (Dr. Louis Saur) نے جو امریکہ کے شہر ایونسٹن کے ایک کاسیاب ڈاکٹر ہیں - امریکہ کی مجلس طبی میں اپنے ایجاد کردہ کھانسی کے ٹیکہ کا ذکر کیا اور اسے دوائے شافی ثابت کیا۔ اس کے بعد سے یہ ٹیکہ برابر استعمال ہوتا اور مفید ثابت ہوتا چلا جاتا ہے۔ اب تک تین سو بچوں کو یہ ٹیکہ دیا جاچکا ہے اور تجربہ کے لیے تعدیہ کی کوشش کی گئی ہے مگر ان بچوں میں سے کسی کو اس کھانسی کی شکایت نہیں ہوئی۔ امریکہ کے ایک اخبار نے لکھا ہے کہ یہ ٹیکہ بعض جراثیم کے اجسام عضویہ سے تیار کیا جاتا ہے جنہیں ”ہیپوفیلوس پرتوسس“ کہتے ہیں۔ جو کالی کھانسی کے جراثیم سمجھے جاتے ہیں —

پہلا انسان اور کوہ ہمالیہ | مونت ایورسٹ کی سیاحت کے لیے جو مہم لگی ہوئی تھی اس کی رپورٹ اور دوسرے ذرائع

تحقیق سے معلوم ہوا ہے کہ سلسلہ کوہ ہمالیہ پرفستانی دور میں اتنا بلند نہ تھا جتنا اب ہے ، بلکہ اس زمانہ میں اس کی بلندی رو بہ ترقی تھی۔ حجری زمانہ کا انسان اس کی گھاؤں اور غاروں میں سکونت رکھتا تھا۔ علمائے آثار کو اس دور کے انسانوں کی بنائی ہوئی مختلف سنگین اشیاء دستیاب ہوئی ہیں۔ جن میں تیز اور کاٹنے والے آلات زیادہ نمایاں ہیں۔ اسی سلسلہ میں بعض ہڈیاں اور بعض خوں خوار جانوروں کے سم بھی ملے ہیں جو اس دور میں ان پہاڑوں میں رہتے تھے —

تہذیب

A Text Book of Heat for Junior Students از ڈاکٹر ایم این سہا

بی این سریواسٹو، مطبوعہ اقدیں پریس، الہ آباد، صفحات ۱۸ + ۵۳۱،
طباعت ۱۹۳۳ء قیمت پانچ روپیہ کلدار —

یہ کتاب در اصل اس بڑی کتاب کا اقتباس ہے جو مصنفین نے بی
ایس سی (آنرس) اور ایم ایس سی کی جماعتوں کے لیے لکھی ہے۔ جس
کا ذکر اس سے پیشتر ان صفحات میں آچکا ہے —

اس کتاب کے مضامین کی ترتیب تقریباً بڑی کتاب کی ترتیب کے مماثل
ہے۔ بعض عنوانات مثلاً مادہ کا نظریہ، تحرک، حرکیات اور اشعاع حرارت
پر جدید طریقوں سے بحث کی گئی ہے۔ حرارتی انجلیوں اور گیسوں کی
اماعت کے متعلق ملاحظہ باب دئے گئے ہیں —

اگرچہ مصنفین کی رائے میں یہ بی ایس سی (پاس) کے طلبہ کے
لیے معیاری کتاب ہے لیکن ایسے بعض اہم مضامین بھی اس میں شریک
ہیں جو ایم ایس سی کے طلبہ کو تحقیقاتی تجربوں میں رہبری کرسکتے ہیں۔

ہماری یہ کتاب انٹرمیڈیٹ کے طلبہ کے لیے سوزوں نہیں رہتی —
 فی الحقیقت مصنفین نے اپنی بڑی کتاب لکھ کر کافی شہرت حاصل کر لی
 ہے۔ اس لیے نفس کتاب کے متعلق اس کا نام ہی اب کافی ضمانت ہے۔ البتہ
 اگر اس کتاب میں بھی حرارتی نظریوں کا ذکر کر دیا جاتا تو بہت مناسب ہوتا—
 پھر حال کتاب کے عہدہ اور اعلیٰ ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔ امید کہ
 طلبہ اس سے عام طور پر مستفید ہوں گے —

جدید نصاب طبیعیات

برائے جماعت ۱۱۱۱ عثمانیہ میٹرک ، حصہ اول ، خواص ۱۱۱۱ ، از محمد
 سردار خاں بی اے (عثمانیہ) بی ٹی (علیگ) و ابوالمکارم فیض محمد
 صدیقی بی اے ، ڈپ ، ایڈ (عثمانیہ) مدرسین سائنس مدرسہ فوقانیہ
 ۱۳۵۱
 عثمانیہ ، دارالعلوم بلدہ حیدرآباد دکن ، صفحات ۱۵۶ مطبوعہ
 ۱۹۳۳
 قیمت ایک روپیہ —

جامعہ عثمانیہ نے جہاں دماغوں میں جنبش پیدا کر دی ہے وہاں قلوبوں
 میں بھی حرکت پیدا کر دی ہے چنانچہ کتاب زیر بحث کے ہر دو مصنفین
 جامعہ عثمانیہ ہی کے فارغ التحصیل ہیں اور اب مسند درس پر متمکن ہیں —
 جامعہ عثمانیہ نے میٹرک کے نصاب میں جو تبدیلیاں کی ہیں
 اس کے مطابق لائق مصنفین نے یہ کتاب تیار کی ہے —

مضامین کی ترتیب بہت مناسب ہے ، زبان بھی صاف اور سہل استعمال

کی ہے ۔ جا بجا مشقی سوالات بھی جمع کئے ہیں ۔ اور کوشش کی ہے کہ ہر مضمون طالب علموں کی سمجھ میں اچھی طرح سے آ جائے ۔ بہر حال لائق مصنفین کی یہ پہلی کوشش مستحق مبارکباد ہے ۔ لیکن چونکہ یہ ”نقش اول“ ہے اس لیے چند امور گوش گذار کر دینا مناسب ہو گا ، تا کہ ”نقش ثانی“ بہتر ہو جائے ۔

سب سے پہلے کتاب کے متن کے متعلق کچھ عرض کرنا ہے اور وہ یہ کہ چونکہ باب میں طول کی پیمائش کے سلسلے میں ”سرل چاپ“ کا ذکر کیا ہے ، اور وہ بھی اس قدر مختصر کہ نہ ہونا بہتر تھا ، سرل چاپ کے سلسلے میں ”کسوپیم“ کی تفہیم زیادہ بحث چاہتی ہے ۔ اس کے علاوہ اگر مختلف قسم کے طولوں کی پیمائش کے طریقے بیان کیے جاتے تو اچھا ہوتا ۔

پانچویں باب میں رفتار کے سلسلے میں لکھا ہے ”اگر کہا جائے کہ موٹر کی رفتار پچاس میل فی گھنٹہ ہے تو اس سے یہ سمجھا جائے گا کہ موٹر خاص سمت میں پچاس میل فی ساعت کی شرح سے فاصلہ طے کرتی ہے ۔“

چونکہ ہماری زبان میں ابھی ”رفتار“ اور ”چال“ کا باریک فرق عام فہم نہیں ہے اس لیے ”پچاس میل فی ساعت“ کی رفتار سے سمت کا مفہوم فہم میں نہ آئے گا ۔ ایسی صورت میں مناسب ہوتا کہ کسی ایسی چیز کی مثال لی جاتی جس میں سمت کا تغیر زیادہ واضح ہوتا ۔ سائنس کی کتابوں میں مسائل اور مثالوں میں ابہام نہ ہونا چاہئے ۔ یہ ضرور ہے کہ اس قسم کی مثالیں کتاب میں زیادہ نہیں ہیں ۔

زبان کے متعلق یہ عرض ہے کہ اگرچہ یہ حیثیت مجبوری زبان صحت

اور سادہ استعمال کی گئی ہے ، تاہم معاورے اور زبان کی خاصیاں متعدد ہیں ۔ مثلاً

(۱) تم سمجھ گئے ہوں گے ۔ ” تم سمجھ گئے ہو گے “ ہونا چاہئے —

(۲) ... ایک ہی فضا میں ” نہیں سمجائی جا سکتی ہیں “ ۔ ” نہیں سمجائی جا سکتی ہیں “ ہونا چاہئے —

(۳) زمین پر گئے تمام اجسام دیگر اجسام کی اضافت سے ساکن ہیں ۔ یہ فقرہ واضح نہیں ۔ جب تمام اجسام لے لیے گئے تو دیگر کی کنجائش نہ رہی ۔ اس کو یوں ہونا چاہئے :۔ ” زمین پر تمام اجسام ایک دوسرے کی اضافت سے ساکن ہیں “ —

طباعت اور املا کی غلطیاں اس کے علاوہ ہیں —

اصطلاحوں میں بھی اصلاح کی ضرورت ہے ۔ لفظ ” طبعی “ فطری یا نیچرل کے معنوں میں ہے ۔ یہاں دراصل ” طبعی “ مراد ہے جو فزیکل کا مراد ہے —

” استخراجی “ اکائیوں کی بجائے ” ماخوذ “ اکائیاں ہونا چاہئے ۔

” چپک “ کی بجائے ” التماس “ ہونا چاہئے کہ منظور شدہ یہی لفظ ہے ۔ بہر حال ہمارے نزدیک یہ حیثیت مجبوری کتاب قابل قدر اور طلبہ کے لیے قابل استفادہ ہے —

ہندوستانی بابت جولائی سنہ ۱۹۳۳ ع

ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد کا مشہور سہ ماہی رسالہ ہے ۔ جولائی نمبر ہمارے سامنے ہے ۔ دیگر قابل قدر اعلیٰ مضامین کے ساتھ ایک مضامین ” آکرہ کی ہوائی رصدگاہ “ پر بھی ہے ۔ واقعہ یہ ہے کہ بہت کم لوگ ہوں گے جن کو یہ بھی معلوم ہوگا کہ آکرہ میں کوئی ہوا کی رصدگاہ بھی ہے ۔ مسٹر

کرشن چندر صاحب ایم ایس سی نے یہ واقعی بڑا احسان کیا جو اردو میں اس کا پورا حال لکھ دیا۔ اور ساتھ ساتھ متعدد فوٹو بلاک بھی ہیں جن سے مضمون اور بھی دلچسپ ہو گیا ہے۔

اس کے متعلق ہمیں صرف یہی عرض کرنا ہے کہ اصطلاحات وضع کرنے کی بجائے جامعہ عثمانیہ کی اصطلاحات سے کام لیا جاتا تو زیادہ بہتر تھا۔ مثلاً اب تو "ٹمپریچر" کی بجائے "درجہ حرارت یا حرارت" کانوں کو ناگوار معلوم ہوتا ہے۔ ان معنوں میں "تھش" زیادہ گوش آگدا ہے۔ "Humidity" کے لیے برودت صحیح نہیں۔ رطوبت یا سرطوبیت ہونا چاہئے۔ تھرماسیٹر کے لیے "تپش پیما" کی بجائے مقیاس الحرارة ثقیل ہی ہے۔ اسی طرح دیگر اصطلاحیں اصلاح طلب ہیں۔

یہ صحیح ہے کہ فی الحال ایسی کوئی لغت تیار نہیں جس میں اس قسم کی جملہ اصطلاحیں یک جا مل سکیں۔ لیکن ایک حد تک یہ ضرورت اوراق "سائنس" کے مطالعہ سے بھی رفع ہو سکتی ہے۔

طبیہ کالج مسلم یونیورسٹی

۴

بے مثل ماہوار طبی رسالہ

طبیہ کالج میگزین

قدیم و جدید طب کے بلند پایہ مضامین شایع کرتا ہے۔ زبان سلیس اور
شستہ ہوتی ہے۔ قدیم طب کو جدید طب کے ہم آہنگ بنانا میگزین کا خاص
مقصد ہے۔ بعض مضامین مثلاً جدید طب، بچوں کے امراض، اکتشافات طب،
بے نالی کے غدد کے متعلق اصولی معلومات، امراض چشم کی مسلسل
اشاعت کی جارہی ہے۔ فوٹو اور متعدد ڈائی گرام بھی ہوتے ہیں۔ کاغذ
مہذب۔ کتابت طباعت نفیس۔ حجم کم و بیش ۶۳ صفحہ سائز ۳۰ × ۲۰

۸

سرورق بہترین اور خوش نما ہوتا ہے۔

چند سالانہ دو روپیہ آٹھ آنے۔ طلباء سے بھرط تصدیق دو روپیہ چار آنے

ملنے کا پتہ

دفتر طبیہ کالج میگزین، طبیہ کالج، مسلم یونیورسٹی۔ علی گڑھ

نیرنگ خیال خاص نمبر

شائع ہو گیا ہے

نیرنگ خیال کا خاص نمبر چھپ گیا ہے۔ جس میں جناب حامد اللہ صاحب افسر بی۔ اے، قاضی عبدالغفار مصنف لیلئ کے خطوط، حضرت جلیل قدوائی ایم۔ اے، خان بہادر چودھری خوشی معہہ صاحب ناظر بی۔ اے، حضرت آرزو لکھنوی، حضرت یاس یگانہ لکھنوی، خان بہادر رضا علی خان وحشت، مولانا سہا، حضرت وقار انبالوی، پروفیسر محمد دین صاحب تاثیر ایم۔ اے کے تازہ افکار زینت رسالہ ہیں۔

بہترین کاغذ، عمدہ لکھائی چھپائی، حجم تقریباً ۲۰۰ صفحات، متعدد رنگین تصاویر ہندوستان کے بہترین رسالے کا یہ بہترین شاہکار ہے۔ دو سو صفحہ حجم میں ایک ہزار کتابی سائز کا چیدہ چیدہ انتساب ہے۔ اور یہ خاص نمبر ہو پہلو سے کامیاب ہے۔ اس میں

لیلئ کے خطوط

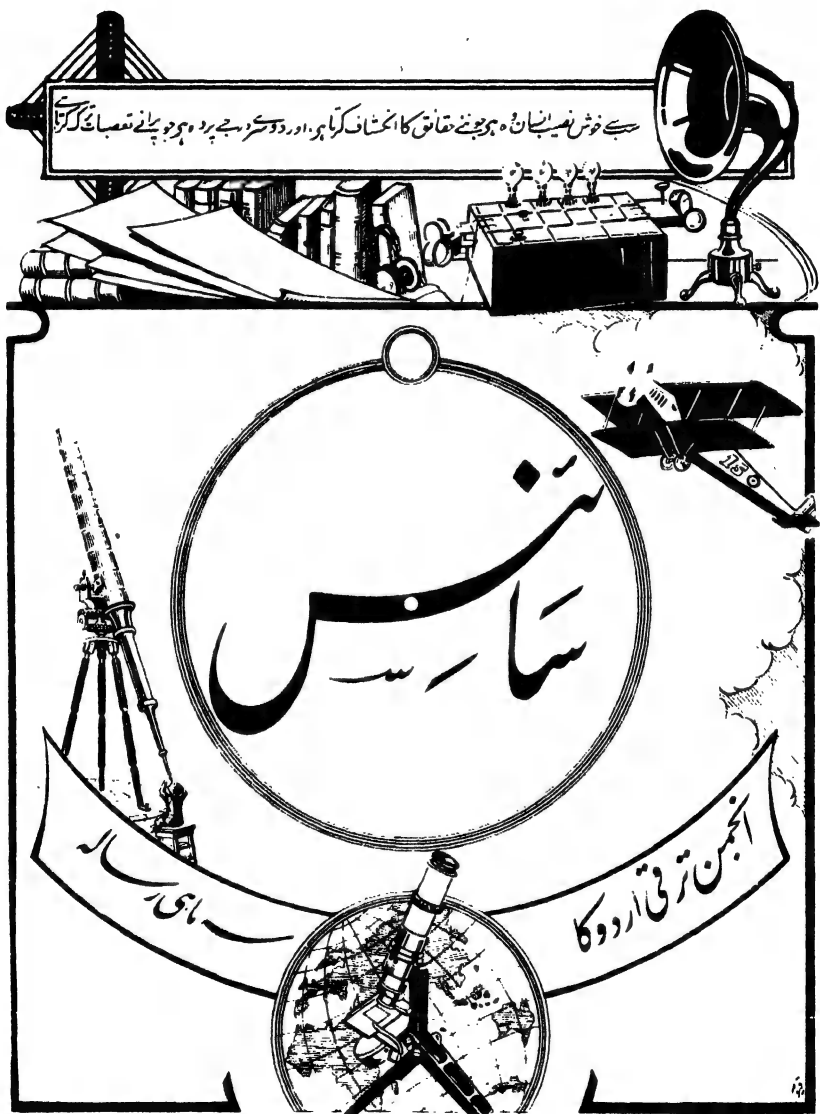
کی ایک تازہ قسط بھی درج کی گئی ہے جس کے مطالعہ سے آپ کے افکار دور ہو جائیں گے۔ اس مضمون کا ایک ایک حوت قابل مطالعہ ہے۔

نیرنگ خیال کا سالانہ چندہ صرف تین روپے چھ آنے ہے۔ اور جو لوگ جولائی سے خریدار ہوں گے۔ ان کو اس چندہ میں یہ رسالہ ملے گا۔ گویا مفت ملے گا۔ اس لیے جولائی سے خریدار ہو جائیے۔

ورنہ بعد میں یہ نمبر ایک روپیہ میں آپ کو خریدنا پڑے گا۔

ملنے کا پتہ

ملھیر رسالہ نیرنگ خیال لاہور (شاہی محلہ)



اطلاع

- (۱) اشاعت کی غرض سے جملہ مضامین اور تبصرے بغام ایڈیٹر سائنس ۹۱۷، کلب روٹ، چادر گھاٹ حیدر آباد دکن روانہ کئے جانے چاہئیں —
- (۲) مضمون کے ساتھ صاحب مضمون کا پورا نام مع تگزی و عہدہ وغیرہ درج ہونا چاہئے تاکہ ان کی اشاعت کی جاسکے بشرطیکہ اس کے خلاف کوئی ہدایت نہ کی جائے —
- (۳) مضمون صاف لکھے جائیں تاکہ ان کے کپیوز کرنے میں دقت واقع نہ ہو۔ دیگر یہ کہ مضمون صفحے کے ایک ہی کالم میں لکھے جائیں اور دوسرا کالم خالی چھوڑ دیا جائے — ایسی صورت میں ورق کے دونوں صفحے استعمال ہو سکتے ہیں —
- (۴) شکلوں اور تصویروں کے متعلق سہولت اس میں ہوگی کہ علحدہ کاغذ پر صاف اور واضح شکلیں وغیرہ کھینچ کر اس مقام پر چسپاں کر دی جائیں — ایسی صورت سے بلاں سازی میں سہولت ہوتی ہے —
- (۵) مسودات کی ہر ممکن طور سے حفاظت کی جائے گی — لیکن ان کے اتفاقیہ تلف ہوجانے کی صورت میں کوئی ذمہ داری نہیں لی جاسکتی —
- (۶) جو مضامین سائنس میں اشاعت کی غرض سے موصول ہوں امید ہے کہ ایڈیٹر کی اجازت کے بغیر دوسری جگہ شائع نہ کئے جائیں گے —
- (۷) کسی مضمون کو ارسال فرمانے سے پیشتر مناسب ہوگا کہ صاحبان مضمون ایڈیٹر کو اپنے مضمون کے عنوان، تعداد صفحات، تعداد اشکال و تصاویر سے مطلع کر دیں تاکہ معلوم ہو سکے کہ اس کے لئے پرچہ میں جگہ نکل سکے گی یا نہیں۔ کہیں ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک ہی مضمون پر دو اصحاب قلم اٹھاتے ہیں۔ اس لئے اس توارف سے بچنے کے لئے قبل از قلم اطلاع کر دینا مناسب ہوگا۔
- (۸) بالعموم ۱۵ صفحے کا مضمون سائنس کی اغراض کے لئے کافی ہوگا۔
- (۹) مطبوعات پرانے نقد و تبصرے ایڈیٹر کے نام روانہ کی جانی چاہئیں — مطبوعات کی قیمت ضرور درج ہونی چاہئے —
- (۱۰) انتظامی امور و اشتہارات وغیرہ کے متعلق جملہ مراسلت منیجر انجمن ترقی اردو اورنگ آباد دکن سے ہونی چاہئے —

جلد ۶ سائنس اکتوبر سنہ ۳۳ ع نمبر ۲۲

مرتبہ

مولوی محمد نصیر احمد صاحب عثمانی ام اے - بی ایس سی (علیگ)
معلم طبیعیات کلیۃ جامعۃ عثمانیہ - حیدرآباد دکن

فہرست مضامین

نمبر شمار	مضمون	مضمون نگار	صفحہ
۱	تخلیق انسان (۹)	پاپولر سائنس	۴۵۱
۲	رنگ اور رنگ کی رویت	جناب پروفیسر منہاج الدین صاحب اسلامیہ کالج - پشاور	۴۷۲
۳	سر جگدیش چندربوس	جناب محمد عبدالغنی صاحب معلم بی ایس سی الہ آباد یونیورسٹی	۵۱۰
۴	ہوا	جناب رفعت حسین صدیقی صاحب ام ایس سی (علیگ) ریسرچ انسٹی ٹیوٹ طبیہ کالج دہلی	۵۳۰
۵	محمد ابن موسیٰ خوارزمی	جناب محمد زکریا سایل صاحب	۵۸۴
۶	فن دباغت (۴)	حضرت "دباغ" سیلانوی	۵۹۳
۷	تعلیل و تغریب اشیا	حضرت "دباغ" سیلانوی	۶۰۳
	اور اس کا تدارک		
۸	تعلیل عقامت کا جدید نظریہ	جناب محمد زکریا سایل صاحب	۶۱۱
۹	دلچسپ اقتباسات (ریٹیم) ع ۱-۰ ع		۶۱۹
۱۰	دلچسپ معلومات	م - ز - م	۶۲۵

تخلیق حیات و انسان

پر

ایک مکالمہ

(۱)

اس سلسلے کے ابتدائی مضامین میں امریکہ کے متحف تاریخ طبعی کے مشہور سائنس دان ڈاکٹر ولیم کے گریگوری نے یہ بتلایا تھا کہ ایک نفع سے زندہ ڈرے سے جملہ حیات کا نشو و نما کیونکر ہوا ، اور پھر اس کا بتدریج ارتقا انسان پر کیونکر ختم ہوا ۔ اس کے بعد کلیہ نیو یارک کے شعبہ حیاتیات کے ڈاکٹر ہربرٹ روکس نے یہ بتلایا کہ انسان اپنی خصوصیات اپنی اولاد میں کیونکر منتقل کرتا ہے ۔ پچھلے نمبر میں جامعہ کولمبیا کے صدر شعبہ نفسیات : ڈاکٹر اے ٹی پین برگ نے یہ بتلایا کہ ہماری جذباتی زندگی خوت ، غصہ ، اور محبت پر مبنی ہے ۔ آج کی گفتگو میں ڈاکٹر پین برگ نے یہ بتلایا ہے کہ حالات اور قہمیں کا اثر ہمارے انفرادی جذبات پر کیا پڑتا ہے ۔ اور ایک انسان اشرافیت اور دوسرا مفید شہری کیونکر بنتا ہے ۔

مسٹر ماک :- ڈاکٹر پین برگ صاحب ۔ ایک روز ایک ماہر نفسیات نے مجھ سے کہا تھا کہ نیپولن نے یورپ کی فوجوں کو

اس وجہ سے شکست دے دی کہ اس میں مغلوٹہ فروتری (Inferiority Complex) موجود تھا - یہ مغلوٹہ کیا ہلا

ہے - میں آج کل اس کا بہت ذکر سنتا ہوں —

ڈاکٹر یفن برگر :- جو کچھ آپ سنتے ہیں اس پر ایمان نہ لے آئیے - آپ کے ماحر نفسیات کے نظریہ کے بموجب نیپولین نے دنیا کو فتح کرنے کا ارادہ اس لیے کیا تھا کہ اس کو اپنے قد کے پانچ فٹ دو انچ ہونے کی وجہ سے اس احساس فروتری کو دور کرنا تھا - اس خیال میں سب سے بڑی دقت یہی ہے کہ کوتاہ قد تو بہت سے ہیں ، لیکن نیپولین کوئی بھی نہیں - ممکن ہے کہ ہونا پارت میں مغلوٹہ فروتری ہو ، لیکن اس کی کاسیابی کے اسباب اور بھی تھے - اب میں آپ کے سوال کا جواب دیتا ہوں - مغلوٹہ فروتری کسی شخص کی خواہش اظہار نفس میں خلل اندازی کا نتیجہ ہوتا ہے —

مسٹر ماک :- ذرا اس کی تشریح فرما دیجئے ؟

ڈاکٹر یفن برگر :- ابھی عرض کرتا ہوں - میں پہلے یہ بتلانا چاہتا ہوں کہ جن لوگوں میں مغلوٹہ فروتری ہوتا ہے ان کی شناخت کیونکر کی جائے - سر سری طور پر ہم ان کو دو قسموں میں تقسیم کرسکتے ہیں - ایک تو وہ ہیں جو بیداری میں خواب دیکھا کرتے ہیں یعنی وہ " فوام ایوم " (Day Dreamers) ہوتے ہیں - دوسرے وہ جو شیخی باز ہوتے ہیں اور دھونس جھپا کرتے ہیں —

مسٹر ماک :- سبب ایک ہی ہے تو اس قدر مختلف نتیجے کیوں ؟

ڈاکٹر یفن برگ :- جب زندگی میں کسی شخص کو کسی خاص موقع سے سابقہ پڑے اور وہ اس موقع کا مقابلہ کرنے سے قاصر رہے تو پھر اس میں مخلوط فروتری پیدا ہو جاتا ہے ۔

جو شخص اس طرح قاصر رہتا ہے وہ اپنے قصور کا بدل کسی دوسرے طریقے سے کرنا چاہتا ہے ۔ جس طریقہ سے وہ اس قصور کا بدل چاہتا ہے اس کو ہم عمل تلافی کہتے ہیں ۔ بعض اوقات مخلوط فروتری کا اظہار اس طرح ہوتا ہے کہ اس شخص میں از خود کسی کام کے کرنے کی صلاحیت کا فقدان ہوتا ہے ۔ اس کی قوت ارادی بالکل مغلوج ہو جاتی ہے ۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہ ایسے شخص کی زندگی مہین کی طرح ہوتی ہے ۔ ایسی صورتوں میں وہ بیداری میں خواب دیکھ کر اس کی تلافی کرتا ہے ۔

مسٹر ماک :- آپ کا مطلب یہ کہ وہ بس حیرتی بنا بیٹھا رہتا ہے ۔

ڈاکٹر یفن برگ :- نہیں بالکل ایسا تو نہیں ۔ اچھا ایک مثال پیش کرتا ہوں ۔ فرض کیجئے کہ نیویارک کے ایک کارخانے کا ایک معمولی اہلکار ہے ۔ وہ کارخانے جا رہا ہے ۔ وہ ٹرام کے ذریعے جاتا ہے ۔ ٹرام بالکل بھری ہوئی ہے ۔ وہ خود بھی لوگوں میں دبا ہوا ہے ۔ بائیں ہاتھ وہ ایک خوبصورت لڑکی کو نزدیک بیٹھی دیکھتا ہے ۔ اور اپنے بالکل سامنے ایک ایسے شخص کو بیٹھ دیکھتا ہے جس کی آنکھوں سے خونخواری ٹپکتی ہے ۔ گاڑی چلتی ہے تو وہ اپنے آپ کو بالکل

ایک معمولی شخص محسوس کرتا ہے۔ لیکن اس سب کے عقب میں ایک خیال اس کے ذہن میں دوڑتا ہے کہ ”اگرچہ میں ایک معمولی آدمی ہوں لیکن فی الحقیقت میں عجیب و غریب شخص ہوں۔ میری پوشاک ان ہی لوگوں جیسی ہے۔ اور قدرتاً ان کو اس کا اندازہ نہیں ہوتا کہ میں کون ہوں۔ اور کیا ہوں۔ لیکن ذرا اس بدنہاد کو اس لڑکی کو چھیڑنے دیجئے۔ میں فوراً وہاں پہنچتا ہوں۔ اس پری کو دیو کے پنچے سے چھڑاتا ہوں۔ دیو کو نیچے کراتا ہوں، اور میدان میرے ہاتھ رہتا ہے۔ اب ہر شخص پوچھتا ہے ”یہ کون ہے۔“ ”یہ کون ہے۔“ اب میرا موقع آیا۔“ اب ہمارا ہیرو بیدار ہوتا ہے تو اس کو معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے مقام سے چھہ مقام آگے نکل گیا ہے۔

مسٹر ماک :-

کیا ہم سب اس قسم کے خواب روئے نہیں دیکھا کرتے۔ مجھے یاد ہے کہ جب میں مدرسے میں پڑھتا تھا تو میں اپنے آپ کو ایک کامیاب تراسا نویس تصور کرتا تھا، اور یہ خیال کرتا تھا کہ تھیٹر میں جب تراسا کھیلا جائے گا تو سارا تھیٹر بڑے بڑے لوگوں سے بھرا ہوگا اور ہر شخص دریافت کرے گا کہ اس کا مصنف کون ہے۔

ڈاکٹر پفن برگر :- جی ہاں۔ اس قسم کے منصوبے بچپن اور عنفوان شباب میں بہت قائم ہوا کرتے ہیں۔ ایک لڑکا یہ تصور کرتا ہے کہ وہ ایک بڑا جرنل ہے، جو کسی جنگ سے کامیاب ہوکر کھوڑے پر سوار ہوکر واپس آ رہا ہے۔ دوسرا یہ

تصور کرتا ہے کہ جس دن اس کے بٹائے ہوئے پل کا افتتاح ہو گا اس دن وہ ایک بڑا انجینئر مانا جائے گا۔ لڑکی اگر سخت کثیر والدین کی اولاد ہے، تو بالعموم یہ تصور کرتی ہے کہ ایک دن ایسا آئے گا کہ سب جان لیں گے کہ وہ ایک شہزادی ہے جس کو ایک ملکہ راء چلتے چھوڑ گئی ہے۔ باینہمہ جوان ہونے پر اس قسم کے تصورات اُن ہی لوگوں میں زیادہ قائم رہتے ہیں جن میں مخلوطہ فروتری ہوتا ہے۔

مسٹر ماک :- شیخی بازی اور دھونس کی نسبت کیا ارشاد ہے ؟
ڈاکٹر پفن برگ :- شیخی بازی اور دھونس دونوں نفس پر بے اعتدالی کی تلافی کی مختلف صورتیں ہیں۔ ایسی صورتوں میں وہ فرد دوسروں پر دھونس جھا کر اپنی نظروں میں ہا وقعت بننا چاہتا ہے، اور اگر تھوڑا بہت اس نے کوئی کام انجام دیا ہے تو دوسروں کے سامنے اس کو بہت بڑھا چڑھا کر بیان کرتا ہے، یا پھر بالکل جھوٹ بول کر اپنی طرف ایسے امور کو نسبت دیتا ہے جو اس نے کبھی سر انجام نہیں دیے۔ جو شخص اپنی بہادری کی لمبی چوڑی داستانیں بیان کرتا ہے وہ دراصل اپنے بزدل ہونے کا اعلان کرتا ہے۔ اس سے بھی لطیف تر شیخی کی اور صورتیں ہیں، مثلاً ضرورت سے زائد انکسار - جو شخص یہ کہتا ہے کہ ”میں بھی کیا بے وقوف ہوں“ وہ دراصل چاہتا ہے کہ آپ اس سے اتفاق نہ کریں۔ اور جب اس

تخلیق حیات و انسان سائنس جولائی سنہ ۳۳ع

سے یہ کہتے ہیں کہ "اے مشہور کیوں کرتے ہو" تو وہ خفا ہو جاتا ہے۔ مظلومہ فروتری والے لوگ ہی اکثر آپ سے باہر ہو جاتے ہیں۔ چیختے ہیں اور چلاتے ہیں۔ جاہ اور شہرت طالبی اس کی دوسری علامت ہے۔ جب کسی گروپ کا فوٹو لیا جا رہا ہو اور کوئی شخص خواہ مخواہ سرگز میں آنا چاہے اس میں ضرور مظلومہ فروتری ہوتا ہے۔ اسی طرح آپرا کی وہ رقاصہ بھی اس مظلومہ میں مبتلا ہوتی ہے جس کو مطلب میں ناکامی کی وجہ سے دروزہ پڑ جاتا ہے۔ وہ حوادث زندگی کا مقابلہ معقول طریقے پر نہیں کر سکتی۔

مسٹر ماک :- تو کیا مظلومہ برتری (Superiority Complex) پیو کوئی چیز ہے ؟

ڈاکٹر پٹن پر کر :- نام نہاد مظلومہ برتری کی صورتیں عام طور پر وہ صورتیں ہوتی ہیں جن میں ایک شخص اپنے احساس فروتری پر غالب آنے کا کوئی انوکھا اور دلگیر طریقہ اختیار کرتا ہے۔ ایک کروڑ پتی جو کالجوں میں نہایت فیاضی سے امداد دیتا ہے، ممکن ہے کہ اس کی تعلیم بہت تھوڑی ہو یا بالکل نہ ہوئی ہو۔ جو شخص اپنے ملازموں یا زیر دستوں کی خطائیں معاف نہیں کرتا، غالباً ابتدا میں اس کے والدین اساتذہ یا اس کے پہلے بالادست نے اس پر بہت سختی کی ہوگی۔ یا پھر ممکن ہے کہ مدرسہ میں نمایاں طور پر

وہ بڑا طالب عام رہا ہو۔ ایسے بھی لوگ ہوتے ہیں۔ جن میں ہوتری کا احساس بہت زبردست ہوتا ہے، لیکن اس کا اظہار اس طریقے پر کرتے ہیں کہ احساس فروتری والے اشخاص کے طریقے سے بہت کم فرق رہ جاتا ہے۔

مسٹر ماک :- آپ نے فرمایا تھا کہ مغلوطہ فروتری کسی شخص کے تقاضے اظہار نفس میں مزاحمت کا نتیجہ ہوتا ہے۔ یہ تقاضا کیا ہے؟ کیا یہ بھی کوئی جذبہ ہے؟

ڈاکٹر یفن برگر :- ہرگز نہیں۔ پچھلی صحبت میں میں نے آپ سے عرض کیا تھا کہ ہماری جذباتی زندگی 'خوت' غصہ اور محبت کے تین ابتدائی جذبات پر مبنی ہے۔ جذبات کے علاوہ محرکات یا تقاضے ہیں جو غالباً جذبات کی بنیاد ہیں۔ مسٹر ماک :- "بنیاد" ہونے سے آپ کا کیا مطلب؟

ڈاکٹر یفن برگر :- ایک مثال سے مطلب واضح ہو جائے گا۔ جذبات کو آپ موٹر کے پھیپے تصور کیجئے اور ان محرکات یا تقاضوں کو موٹر کا انجن قرار دیجئے جو پھیپوں کو حرکت میں لاتا ہے۔ فرق یہ ہے۔ ایک مشین صرف بیرونی تحریک کا اثر قبول کرتی ہے، چنانچہ آپ کی موٹر کا انجن پھیپوں کو اس وقت تک نہیں چلائے گا جب تک کہ آپ استارت پر پیر نہ رکھیں۔ اگر آپ پیر نہ رکھیں گے تو موٹر اپنی جگہ سے قطعاً نہ ہلے گی۔ اب انسانی یا حیوانی مشین کو لیجئے۔ یہ بھی بیرونی تحریکات کا اثر قبول کرتی ہے لیکن اس کے علاوہ وہ خود کار بھی ہے۔ ہم

تخلیق حیات و انسان سائنس اکتوبر سنہ ۳۳ع

کہہ سکتے ہیں کہ یہ مشین ان تحریکوں یا تقاضوں سے
باردار ہے۔ بیرونی حادثہ اس بار کو حرکت میں لاسکتا
ہے، لیکن یہ بیرونی تحریک مفقود ہو تو بھی یہ
حرکت میں آسکتا ہے۔

مسٹر ماک :- مجھے اندیشہ ہے کہ میں ابھی آپ کا مطلب نہیں سمجھ سکا۔
ڈاکٹر پفن برگ :- مجھے یقین ہے کہ آپ ذرا سی دیر میں سمجھ جائیں گے۔
اچھا تو یوں دیکھئے کہ قوی ترین تقاضا تو بھوک کا ہے۔
جب کوئی کتا بھوکا ہو اور آپ اس کے سامنے ایک پلیٹ
میں کھانا رکھ دیں تو وہ پلیٹ کی طرف جھپٹ کر
آئے گا۔ یہ مثال ایک بیرونی تحریک کی ہے جو بار کو
حرکت میں لے آئی۔ آپ نے گویا اسٹارٹر پر قدم رکھ
دیا۔ اب فرض کیجئے کہ آپ کتے کو کھانے کو نہ دیں
اور اس کی بھوک بہت بڑھ جائے تو وہ کیا کرے گا۔
مسٹر ماک :- وہ غذا کی تلاش میں نکل کھڑا ہوگا۔

ڈاکٹر پفن برگ :- بالکل درست۔ یعنی کتا ایک خود کار مشین ہے۔ اور
بھوک وہ اندرونی تقاضا یا تحریک ہے جس نے کتے کو عمل
پر مجبور کر دیا۔

مسٹر ماک :- اگر میں نے آپ کے مطلب کو صحیح سمجھا ہے تو وہ
غالباً یہ ہے کہ جب کتا کسی ہڈی پر لڑتا ہے یا بچہ
دودھ کے واسطے روتا ہے، تو غصے کا جذبہ جو کتے یا
بچے سے ظہور میں آتا ہے وہ بھوک کے تقاضے کا نتیجہ ہے۔
ڈاکٹر پفن برگ :- درست۔ اسی لیے میں نے فرض کیا تھا کہ تحریکیں یا

تقاضے جذبات کی بنیاد ہیں۔ گزشتہ صحت میں میں نے آپ سے عرض کیا تھا، مشہور ماہر نفسیات ڈاکٹر واٹسن نے تجربے سے ثابت کیا ہے کہ نوزائیدہ بچے کو صرف دو ہی چیزیں غصے میں لاسکتی ہیں ایک تو بھوک اور دوسری حرکات و سکنات میں رکاوٹ۔ ایک صورت میں غصہ اگر بھوک کی تحریک کی بناء پر پیدا ہوتا ہے تو دوسری صورت میں تقاضے فعالیت کا نتیجہ ہوتا ہے۔ مسٹر ماک :- لہکن بچے کو غصہ کیوں آتا ہے؟ کیا ان تحریکات سے صرف غصے ہی کا جذبہ بروے کار آتا ہے۔

ڈاکٹر پفن برگ :- ہرگز نہیں۔ میں ابھی عرض کرچکا ہوں کہ حیوانی مشین ان تحریکوں یا تقاضوں سے بار بار یا بھری ہوتی ہے۔ یہاں نکتہ یہ ہے کہ اس بار کو خالی کر دیئے سے اطمینان پیدا ہوتا ہے اور اس میں رکاوٹ ہے اطمینانی پیدا کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بچے کو اگر وقت پر دودھ ملتا رہے اور اس کی حرکات و سکنات میں رکاوٹ نہ ہو تو وہ مطمئن رہتا ہے۔ اسی بنا پر جب اس کو وقت پر دودھ نہیں ملتا اور کھلائی اس کو گود میں لے کر باتیں کرتی ہے تو وہ غصے میں آجاتا ہے۔ جب آپ کو بھوک لگتی ہے تو کیا آپ بھی تلک مزاج ہو جاتے ہیں؟

مسٹر ماک :- تلک مزاج نہ کہیے۔ میں تو ایسے وقت چڑچڑا اور نامعقول سا ہو جاتا ہوں۔

ڈاکٹر پفن برگ :- یہی میرا بھی حال ہے۔ یہ وہی ہے اطمینانی ہے جو

تخلیق حیات و انسان سائنس اکتوبر سنہ ۳۳ ع

بھوک کی تحریک کو پورا نہ کرنے کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔ اور یہی تحریک بچے کو بھی دودھ کے لیے رلاتی ہے۔ ہم میں اور بھوک میں صرف اتنا فرق ہے کہ ہم کو اپنے تجربے سے یہ ثابت ہو چکا ہے کہ چیخا چلانا ہمارے حق میں کھانے کے لیے مفید نہیں۔ بھوک کی اس تحریک کی بنیاد طبیعی ہے۔ اس کا سبب جسم کے نشو و نما کے لیے چند اشیاء کی کمی ہے۔ لہذا آپ کہہ سکتے ہیں کہ اس کا سبب کھمبیاوی ہے۔ پیاس کی تحریک کی بھی یہی صورت ہے۔ حیوان ہو یا انسان دونوں پانی کی تلاش میں دور دھوپ کرنے لگتے ہیں، جب کہ جسم کے اندر مائیت کم ہو جاتی ہے۔ اسی طرح طبیعی بنیادوں پر دوسری تحریکیں اور دوسرے تقاضے کام کرتے ہیں۔ جسم میں چونکہ طبیعی توانائی ہوتی ہے اس لیے وہ اپنا ظہور چاہتی ہے۔ لہذا نقل و حرکت کا تقاضا پیدا ہوتا ہے، جس کا اظہار کھیل کود وغیرہ سے ہوتا ہے۔ آرام کی ضرورت بھی ایک تحریک ہے، جو جسم کے اندر تکانی سمیت کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔ کامل ایقان کے ساتھ تو نہیں، البتہ کسی قدر وثوق کے ساتھ یہ کہا جاسکتا ہے کہ فام نہاد صنفی تحریک (Sex drive) کی طبیعی بنیاد جسم کے اندر چند اشیاء مثلاً افرازات غدودی، ہارمون، یا دیگر کھمبیاوی مادے کی کمی ہے۔ ان محرکات کے علاوہ متعدد دیگر تقاضے بھی ہیں جو

سب کے سب ہمارے وجود جسمانی کے عنصر ہیں، لیکن ان کے لیے ابھی تک ہم کوئی طبیعی بنیاد قرار نہیں دے سکے ہیں۔

مسٹر ماک :- وہ دیگر تقاضے کون کون سے ہیں؟

ڈاکٹر ہفن برگ :- میں یہاں چند کا ذکر کرتا ہوں، جن کو آپ نے اپنے انہر یا دوسروں میں مشاہدہ کیا ہو گا۔ ضرورت مدنیت، ضرورت دوستی، ضرورت صحبت متاھلانہ، جو لوگوں کو گھروست بنانے پر مجبور کرتی ہے۔ اور ضرورت پابندی وضع۔ پھر وہ تقاضا ہے جس کا میں نے ابتدا میں ذکر کیا تھا، یعنی دوسروں پر اپنی فرقیت ظاہر کرنے کی ضرورت۔ بالفاظ دیگر اظہار نفس کا تقاضا۔

مسٹر ماک :- کیا آپ ان ضرورتوں اور خواہشوں کو بھوک کی طرح کے محرکات کہیں گے؟

ڈاکٹر ہفن برگ :- یقیناً۔ ان میں سے بعض بھوک کی طرح زبردست نہ ہوں گے۔ لیکن ہمیں سب کے سب بنیادی طور پر تقاضے۔ تمام طبیعی انسانوں میں یہ پائے جاتے ہیں اور ان کے برتاؤ پر اثر دالتے ہیں۔ ان کو محرکات ہم اس وجہ سے کہتے ہیں کہ ان میں حرکت میں لانے کی قوت ہے۔ وہ فی الحقیقت ایک انسان کو مجبور کر دیتے ہیں کہ وہ اپنے آپ کو خاص خاص صورتوں میں ظاہر کرے۔

مسٹر ماک :- آپ نے فرمایا کہ یہ تقاضے تمام طبیعی انسانوں میں پائے جاتے ہیں۔ میں ایک طبیعی انسان ہوں لیکن مجھ میں

وضع کی پابندی یا دوسروں کی طرح ہونے کی کوئی خواہش نہیں —

ڈاکٹر پفن برگر :- کیا واقعی نہیں ہے ؟ کیا آپ گرسی میں بھی بھاری توہی پہنے رہیں گے ؟ یا جازوں میں آپ دوستیں کا لباس پہنے پھریں گے ؟ آپ اور ہم سب آخر آستیلوں میں ہون کیوں لگاتے ہیں ؟ عرض کروں کہ کیوں ؟ معص اس لیے کہ ہم سب وضع (فیشن) کے غلام ہیں ۔ خواہ ہم اس کو تسلیم کریں یا نہ کریں —

مسٹر ماک :- میرے نزدیک تو اس پابندی کا سبب خوت تضعیک ہے — ڈاکٹر پفن برگر :- اچھا یوں ہی سہی ۔ لیکن اگر پابندی وضع کا تقاضا آپ میں قوی نہ ہو تو آپ اس تضعیک سے نہ تریں گے ۔ اس وقت بجائے وضع کی پابندی کے آپ خود ایک وضع قائم کردیں گے ۔ اب ایک بالغ انسان کو لیجیے تو اس کے اندر ان محرکوں اور تقاضوں کی ایک پوت کی پوت ہوگی ۔ وہ سوتے میں کاربن ڈائی آکسائیڈ کی طرح اس کے اندر بند ہیں ، اور ہر وقت ابھرنے کے لیے تیار ۔ اس کو اخراج کا موقع دینے سے انسان کو تسکین ہوتی ہے ۔ خود انسان کو اس کا موقع ملتا بھی ہے یا نہیں ؟

ڈاکٹر پفن برگر :- ہمیشہ تو نہیں ۔ تمدن و تہذیب کا قدم درمیان میں آجاتا ہے ، اور وہ مانع ہوتے ہیں ۔ معاشری رسم و رواج ، اخلاق ، تمیز ، آداب اس کو چاروں طرف سے گھیر لیتے ہیں ۔ مہذب معاشرہ (Society) اوسط انسان کے حق میں وہی

حیثیت رکھتا ہے جو دایہ بچے کے حق میں رکھتی ہے ' یعنی جس طرح دایہ بچے کو چمکتا کر دبا لیتی ہے اسی طرح معاشرہ بھی انسان کے ذاتی انداز کو دبا دیتا ہے —

مسٹر ماک :- اس کا نتیجہ ؟

ڈاکٹر پفن برگ :- نتیجہ یہ کہ اس کو اپنے محرکات اور تقاضوں کا اظہار توہم شدہ صورت میں یا با اصطلاح ماہران تجزیہ نفس (Psychoanalysis) تصعیدی شکل (Sublimated form) میں کرنا پڑتا ہے —

مسٹر ماک :- یہ تو آپ نے بڑا زبردست لغت استعمال کر دیا - اس کے معنی کیا ہوں ؟

ڈاکٹر پفن برگ :- اس کا مطلب یہ کہ انسان اپنے تقاضاؤں کو ایسے راستوں پر قائل جن کو دنیا پسند کرتی ہے - تعلیم و تربیت کا عمل در اصل ایک تصعیدی عمل ہے یعنی اپنے محرکات اور تقاضوں کو اچھے راستے پر قائلے کا عمل ہے —

مسٹر ماک :- لیکن تعلیم کو ہمیشہ اس میں کامیابی نہیں ہوتی - کیوں جناب —

ڈاکٹر پفن برگ :- بد قسمتی سے ایسا ہی ہے - لیکن اس کے متعلق میں ابھی عرض کروں گا - پہلے میں یہ بتلانا چاہتا ہوں کہ تصعید کیا مراد ہے - مثال کے طور پر اظہار نفس کے تقاضے کو لیجئے - ابتدائی انسان میں یہ تقاضا جسمانی لڑائی کی صورت اختیار کرتا تھا - آج ایک شخص انتخابات

تخلیق حیات و انسان سائنس اکتوبر سنہ ۳۳ ع

میں دوسرے شخص کو شکست دیتا ہے اور اس طرح
سیاسیات میں اپنا نام پیدا کرتا ہے۔ دوسرا شخص اپنے
حریفوں کو کاروبار میں فیہا دکھاتا ہے، تیسرا شخص
سائنس اور ایجاد میں نام پیدا کرتا ہے، چوتھا شخص
دک کے وقت جمع کرنے میں سب سے سبقت لے جاتا ہے۔

مسٹر ماک :- میں نے توسل ہے کہ شاہ انگلستان شاہ راقین (Stamp Collector) بھی ہیں۔ تو کیا آپ کا یہ مطلب ہے کہ وہ اپنے تقاضائے
اظہار نفس کو اس طرح پورا کرتے ہیں۔

ڈاکٹر پفن برگ :- بے شک۔ آج کل بادشاہوں کے لیے اور طریقہ ہی کون
سا ہے۔ اگر وہ پانسو برس اُدھر ہوتے تو غالباً ان
کو شاہ فرانس یا شاہ اسکاچستان سے جنگ کرنے کے لیے
جانا پڑتا۔ واقعہ یہ ہے کہ ہر قسم کی دھن کی تہ میں
یہی تقاضائے اظہار نفس ہوتا ہے۔ اور تمام مقابلوں کی
بنیاد بھی اسی پر ہے۔ ہر صورت میں انسان دوسروں
پر اپنی فوقیت اس طرح جتاتا ہے جو معاشرہ کے لیے
مفید ہوتا ہے اور خود اس کے نفس کو اطمینان بخشتا
ہے۔ ویانا کے مشہور ماہر نفسیات فروت اور ان کے
متبعین تو یہاں تک کہتے ہیں کہ تمام شاعری، نقاشی،
اور صورت تراشی تقاضے صنفی (Sex) کی تصعیدی
شکل ہے، یعنی اس کے اظہار کی ایک ترمیم
شدہ صورت ہے۔

مسٹر ماک :- تو کیا عہد حاضر میں جملہ عشق و تعشق تقاضائے صنفی

کی تصدیق نہیں ہے۔ مثلاً اگر کوئی اپنی محبوبہ کو ایک غزل لکھ بھیجے یا اس کو پھولوں کا ایک گلدستہ بھیجے تو کیا یہ نشانیاں انسان کے مورث اولین کے طریقوں کا بدل نہیں ہیں ؟ جب کہ وہ اپنی پسند کردہ دو شیزہ کو اپنے غار تک گھسیت لے جاتا تھا —

ڈاکٹر پگن پرگر :- اصولاً یہ صحیح ہے لیکن واقعاً اس سے بہت پہچیدہ ہے۔ آپ جانتے کہ عہد جدید کے عشق میں صرف صفت ہی شامل نہیں ہے۔ اس میں خود نہائی کو بہت کچھہ دخل ہے، دوسروں کو خوش کرنے کی آرزو بھی اس میں موجود ہے، احساس حسن بھی اس میں ہے اور نہ جانے کیا کیا ہے —

مسٹر ماک :- اچھا اگر اپنے محرکات اور تقاضوں کو ہم اچھے راستے پر نہ ڈال سکیں تو کیا ہوتا ہے ؟

ڈاکٹر پگن پرگر :- ابھی صرف تقاضائے اظہار نفس تک ہی محدود رہتے، کیونکہ ہمارے بہت سے مسائل کی تہ میں یہی تقاضا ہے۔ جب تعلیم [جس میں بچپن کی قربیت بھی شامل ہے] اس کو صحیح راستے پر ڈالنے میں کامیاب نہیں ہوتی تو ہمیشہ دقتیں پیدا ہوتی ہیں۔ بچوں میں ضد کی صورت میں یہ نمودار ہوتی ہے۔ بالغوں میں یہی دھونس کی صورت اختیار کرتی ہے۔ اسی سے اشخاص جرائم پیشہ بھی بنتے ہیں اور تہارض مزمین میں مبتلا رہتے ہیں —

مسٹر ماک :- تمہاری ؟

ڈاکٹر یفن برگ :- جی ہاں۔ یہ بھی ایک مظہر ہے تقاضے اظہار نفس کا۔ یہ ایک طریقہ ہے جس سے ایک شخص دوسروں کو اپنی طرے متوجہ کر لیتا ہے۔ اب رہے جرائم پیشہ تو آج کل کے راہزموں اور قضاہوں کے سرغلہ تقاضے اظہار نفس کے غلط اطلاقی بہترین مثالیں ہیں۔ بدنام زمانہ قمار باز راتھسٹائن نامی اور الکپون دونوں نے سرداری کی اہلیت کا ثبوت دیا، لیکن بے محل۔ راتھسٹائن چاہتا تو سو برآوردہ بیلگر بن سکتا تھا، اسی طرح الکپون نے اپنی قابلیتوں سے اچھا کام لیا ہوتا تو ہم پلٹے فیو لین ہو سکتا تھا، یا پھر صنعتی یا سیاسی تنظیم اچھی طرح کر سکتا تھا — مسٹر ماک :- جب تقاضائے صنفیت کو صحیح طریقے پر پورا نہیں کیا جاتا تو کیا نتیجہ پیدا ہوتا ہے ؟

ڈاکٹر یفن برگ :- ایسی صورتوں میں بے اطمینانی اور بے قراری پیدا ہو جاتی ہے، اس کی سادہ ترین مثال آپ بچے میں دیکھتے ہیں جب کہ اس کے بازو دبالیے جائیں۔ بدترین صورت میں غیر طبعی برتاؤ کی نوبت آ جاتی ہے، جس کو ہمارے اخلاق آداب قبول نہیں کر سکتے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ صنفیت سے نفرت ہو جاتی ہے۔ لوگوں میں ”تصلع“ (Prudery) کی یہی بنیاد ہے اور پھر یہی لوگ تقلید میں مبالغہ سے کام لیتے ہیں —

مسٹر ماک :- کیا اسی کو استئاع (Repression) کہتے ہیں ؟

ڈاکٹر پفن برگر :- ہاں امتناع سے مراد ان فطری تقاضوں کے پورا کرنے پر معاشری رسم و رواج کی پابندی ہے ۔ ان ہی کو نواہی

(Taboo) کہتے ہیں ۔

مسٹر ماک :- تو کیا آپ کے نزدیک جہلہ نواہی ہرے ہیں ؟
ڈاکٹر پفن برگر :- ہرگز نہیں ۔ معنیت میں معاشرہ کے لیے ضروری ہے کہ فرد جہالت کی بے پرواہی کے لیے اپنی آزادی کا ایک حصہ ایثار کرے ۔ اس کو کس قدر ایثار کرنا چاہئے ؟ اس کا تعین ایک ایسا معاشری مسئلہ ہے جس کا جواب اب تک نہیں دیا جاسکا ہے ۔ مختلف تاریخی معاشروں میں یہ تحدید مختلف رہی ہے اور اب بھی مختلف ملکوں میں یہ مختلف ہے حتیٰ کہ ایک ہی ملک کے مختلف معاشروں میں بھی یہ مختلف ہے ۔

مسٹر ماک :- امتناع اور اجتناب (Inhibition) میں کیا فرق ہے ؟
ڈاکٹر پفن برگر :- اگر کوئی فرق ہے تو یہ ہے کہ امتناع باہر سے ہمارے معرکوں اور تقاضوں پر ایک پابندی ہے ۔ بالعموم ہمارے برتاؤ پر یہ پابندیاں عائد ہوتی ہیں ۔ اجتناب و پابندی ہے جو ہم خود اپنے نفسوں پر عائد کریں ۔

مسٹر ماک :- اور مخلوط کیا ہے ؟
ڈاکٹر پفن برگر :- یہ نفس کی وہ حالت ہے جو مسلسل امتناع کی حالت میں رہنے سے پیدا ہو جاتی ہے ۔

مسٹر ماک :- تو کیا یہ طبعی حالت ہے ؟
ڈاکٹر پفن برگر :- جی نہیں ۔ طبعی حالت تو امتناع سے نہیں پیدا ہوتی

بلکہ تصدیق سے پیدا ہوتی ہے اور تصدیق کے متعلق مرض کرچکا ہوں کہ یہ گویا ہمارے محرکوں اور تقاضوں کا کار آمد اور پسندیدہ طریقوں میں منتقل ہو جانا ہے ۔ اگر کوئی مظلوم اس قدر سلگین ہو جائے کہ اس کے علاج کی ضرورت لاحق ہو جائے تو پھر تصدیق کے عمل سے یہ مظلوم ”تحلیل“ (Resolved) ہو جاتا ہے ۔

مسٹر ماگ :- اس سے آپ کا کیا مطلب ہے اور یہ کیونکر انجام پاتا ہے ؟

براؤننگٹن :- فرض کیجئے کہ ایک شخص تقاضے جنس کے استناع کی وجہ سے ایک مظلوم میں مبتلا ہو جاتا ہے ۔ میں عرض کر چکا ہوں کہ اس کا اظہار مختلف طریقوں سے ہوتا ہے ۔ ممکن ہے کہ وہ اس حد تک پہنچ جائے کہ اس شخص کے اعصاب کو بالکل تباہ کر دے ۔ ایسی صورت میں علاج یہ ہوگا کہ اس شخص کے متنج تقاضے جنس کو عمل تصدیق سے ایسے پسندیدہ امور میں لگا دیا جائے جیسے کہ فنون لطیفہ اور خدمت خلق ہوں یا پھر کسی ایسے مفید کام میں اس کو لگایا جائے جو خود اس شخص کو مرغوب اور پسندیدہ ہو ۔ اس قسم کے تبدلات میں بڑی ہوشیاری کی ضرورت ہے ۔ اس کو صرف ایک ماہر فن ہی انجام دے سکتا ہے ۔ ماہر کے لئے بھی لازمی ہے کہ وہ فطرت انسانی کا عمیق مطالعہ کرچکا ہو ۔

مسٹر ماگ :- کیا اسی کو نفسی تجزیہ (Psychoanalysis) کہتے ہیں ؟

ڈاکٹر پفن برگ: - جی ہاں۔ مخلوطوں کے سلسلے میں میں نے شروع ہی میں آپ سے عرض کیا تھا کہ مخلوط فروتری کسی شخص کے تقاضے اظہار نفس میں مزاحمت کا نتیجہ ہوتا ہے۔ اب آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ میرا مطلب تقاضے اظہار نفس کے امتناع کے نتیجہ سے تھا۔

مسٹر ماک: - جی ہاں میں سمجھ گیا۔ آپ نے یہ فرمایا کہ طبعی انسانوں میں اظہار نفس کا تقاضا ہوتا ہے۔ تو پھر کیا وجہ ہے کہ بعض انسان میں محتج ہو جاتا ہے اور بعض میں نہیں؟

ڈاکٹر پفن برگ: - زندگی کے ابتدائی سالوں میں جو تربیت ملتی ہے اس کو اس میں بہت کچھ دخل ہے۔ عموماً ہر بچہ کسی نہ کسی وقت جن معرکوں یا تقاضوں میں مزاحمت پاتا ہے اُن کے اظہار کی کوئی نہ کوئی غیر اطمینان بخش صورت ضرور اختیار کرتا ہے۔ اس کی ادنیٰ مثال ضد کرنا اور بھالنا ہے۔ فرض کیجئے کہ ایک بچہ سے کہا گیا کہ وہ ایک خاص غذا کھائے۔ وہ بجائے کھانے کے مڑے غصے کے فرش پر لیٹ جاتا ہے، ہاتھ پیر مارتا ہے اور غل مچاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کے علاج کی ضرورت ہے۔

مسٹر ماک: - تو نا تجربہ کار والدین کو آپ کیا رائے دیں گے۔

ڈاکٹر پفن برگ: - اس کے دفعیہ کی ایک ترکیب تو وہی پرانی ترکیب ہے یعنی 'ضرب' کی گردان اچھی طرح کردی جائے۔ دوسری ترکیب یہ ہے کہ بچہ کی تمام حرکتوں سے بالکل انجان

تخلیق حیات و انسان سائنس اکتوبر ۱۹۳۳ ع

ہیں جانا چاہئے۔ اگر کچھ نہ کیا جائے گا تو حوادث زندگی کا مقابلہ کرنے کے لیے ایک غیر طبعی طریقہ کی بنیاد پڑ جائے گی۔ اب گویا بچے کے ہاتھ میں ایسا ہتھیار آگیا ہے جس سے وہ اپنے تقاضوں کو جبراً پورا کرا سکتا ہے۔ اس میں دقت یہ ہوتی ہے کہ آگے چل کر جب زندگی میں وہ قدم رکھتا ہے تو وہ ہتھیار بے کار ہو جاتا ہے، اس لیے وہ زندگی کے معمولی حوادث سے بھی عہدہ برآ نہیں ہو سکتا۔ نتیجہ کیا ہوا؟ اس میں مظلومہ فروتری پیدا ہو گیا، جس کا اظہار میرے بیان کردہ طریقوں میں سے کسی نہ کسی ایک طریقے سے ہوتا ہے —

مسٹر ساک :- آپ کا مطالبہ یہ ہے کہ مظلومہ فروتری کی جملہ صورتیں پہچاننے میں نامناسب تربیت سے پیدا ہوتی ہیں۔ اگر واقعی ایسا ہے تو دنیا میں اس کی کثرت ہونی چاہئے یا ہم سب کو اس میں مبتلا ہونا چاہئے —

ڈاکٹر یفن برگ :- آپ کا سوال دو جواب چاہتا ہے۔ پہلا تو یہ کہ اس کی کثرت دنیا میں اس سے زیادہ ہے جتنا کہ آپ کے خیال میں ہے۔ دوسرا یہ کہ ہم کو بالکل یہ یقین نہیں ہے کہ بعض لوگ فروتری کی طرف پیداؤشی میلان نہیں رکھتے۔ اس کو قطعی طور سے دریافت کرنا تقریباً ناممکن ہے۔ لیکن اتنا ہم جانتے ہیں کہ چند گھنٹوں کا نوزائیدہ بچہ بھی اتنا جان جاتا ہے کہ رونے

یہ اس کی خواہشیں پوری ہو جائیں گی اور اس کو
خوب پیار کیا جائے گا۔ ممکن ہے کہ اس طرح معرکوں
اور تقاضوں کو پورا کرنے سے بالکل ایک غلط طریقہ کی
بنیاد پڑ جائے۔ اگر آپ اس کو یوں ہی چھوڑ دیں گے
تو آپ بچے کو ایک غلط راستے پر تال دیتے ہیں۔ اور
ممكن ہے کہ آپ مخلوط فروتنی کی بنیاد تال دیں
تو بعد میں چل کر اس شخص کے لیے بہت مضرت رساں
ثابت ہو —

رنگ اور رنگ کی رویت

از

جناب پروفیسر منہاج الدین صاحب ، اسلامیہ کالج، پشاور

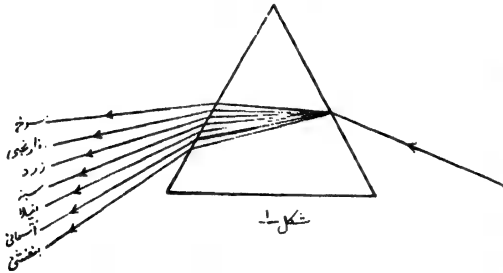
جب ہم اپنے ارد گرد کی اشیا پر نظر ڈالتے ہیں تو اُن میں تین طرح کے اختلاف دیکھتے ہیں۔ اول تو اُن کی شکلیں مختلف ہوتی ہیں۔ دوسرے بعض اشیا تیز روشن ہوتی ہیں اور بعض مدہم۔ تیسرا اختلاف جس کے متعلق میں اس مضمون میں بحث کروں گا ' رنگوں کا اختلاف ہے۔ کوئی چیز سوخ ہے کوئی سبز اور کوئی بنفشتی —

ہماری حس باصرہ مختلف رنگوں میں تھیز کرسکتی ہے۔ اُس کی وجہ یہ ہے کہ آنکھ کے پردے اول پر ہر رنگ کی چیز کا اثر الگ ہوتا ہے۔ اسی طرح کان پر مختلف سروں کا اپنا اپنا اثر ہوتا ہے۔ جس کی وجہ سے ہم سروں میں تھیز کرسکتے ہیں —

سوال پیدا ہوتا ہے کہ رنگوں کا اثر مختلف ہونے کا طبیعی سبب کیا ہے۔ یعنی کیا وجہ ہے کہ کوئی چیز تو ہمیں سرخ نظر آتی ہے اور کوئی سبز۔ اس لیے پہلے میں طبعی نقطہ نظر کو لے کر بتاؤں گا کہ چیزوں کے رنگ ان کی کس خاصیت کے ساتھ وابستہ ہیں —

رنگ کی ماہیت

اگر تاریک کمرے میں آفتاب کی شعاعیں باریک شکات کے مسلسل طیف راستے داخل ہو رہی ہوں - تو سامنے کی دیوار پر سفید روشنی کی لکیر سی بن جائے گی - اب اگر ان شعاعوں کے راستے میں شیشے



کا تگون یا منشور (م) رکھ دیا جائے تو سفید کرنیں منشور میں سے گذرنے کے بعد مختلف رنگوں کی شعاعوں میں تبدیل ہو جائیں گی - اور دیوار پر

ایک چوڑی رنگین دھاری نمودار ہوگی جس کے رنگ مندرجہ ذیل ہوں گے -

سرخ - نارنجی - زرد - سبز - فیلا - آسمانی اور بنفشہ —

یہ رنگ وضاحت کے ساتھ بالکل الگ الگ نظر نہیں آتے - بلکہ یہ معلوم نہیں ہوتا کہ ایک رنگ کہاں ختم ہوا اور دوسرا کہاں سے شروع ہوا - اور دونوں کناروں پر بھی رنگ آہستہ آہستہ مدھم ہوتے جاتے ہیں -

دھاری اور تاریکی کے درمیان کوئی واضح حد فاعل نہیں ہوتی —

رنگین دھاری جو آفتاب کی شعاعوں کے منشور میں سے گذرنے پر نمودار ہوتی ہے آفتاب کا طیف (Spectrum) کہلاتی ہے - طیف کا مقام دیکھنے پر معلوم ہوا کہ وہ اُسی سمت میں نہیں ہے - جس میں آفتاب کی شعاعیں منشور پر پڑنے سے پہلے جاری تھیں - بلکہ منشور میں سے گذر کر سب شعاعوں کی سمت بدل گئی ہے - ان رنگوں میں سے بنفشہ شعاعوں کا انحراف سب سے زیادہ ہوا ہے - اور نیلے رنگ کا سبز رنگ سے زیادہ - سبز کا زرد سے زیادہ اور زرد کا سرخ سے زیادہ - سرخ شعاعوں کا انحراف

اور سب رنگوں سے کم ہے —

اب اگر پردہ میں اُس جگہ جہاں زرد رنگ کی دھاری بنتی ہے شکات کر دیا جائے تو زرد رنگ کی شعاعیں شکات میں سے گذر جائیں گی۔ ان شعاعوں کے راستے میں ایک اور اُسی قسم کا منشور حائل کر دیا جائے جیسا کہ آفتاب کی روشنی کے راستہ میں حائل کیا گیا تھا تو اُس میں سے گذرنے میں زرد شعاعیں اتنی ہی منحرف ہوں گی جتنی پہلے منشور میں سے گذرنے میں منحرف ہوئی تھیں۔ لیکن ان کا رنگ زرد ہی رہے گا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر منشور زرد شعاعوں میں معین انحراف پیدا کرتا ہے۔ اسی طرح ہر منشور سرخ شعاعوں میں معین انحراف پیدا کرتا ہے جو زرد شعاعوں کے انحراف سے کم ہوتا ہے وعلیٰ هذا القیاس —

چونکہ سب رنگوں کی شعاعیں سفید نور سے حاصل ہوتی ہیں اس لیے ہم یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ معمولی سفید روشنی سات رنگوں پر مشتمل ہے۔ منشور میں سے گذرنے پر وہ مختلف رنگوں میں اس لیے پھٹ جاتی ہے کہ ہر رنگ کا انحراف مختلف ہوتا ہے۔ نور کے رنگوں میں اس طرح بت جانے کو انتشار نور کہتے ہیں —

ہم ایلی حس باصرہ کے ذریعے مختلف انحراف والی شعاعوں میں اُن کے رنگوں کو دیکھ کر تمیز کرتے ہیں۔ مگر جن شعاعوں کو مثلاً ہم سبز رنگ کی شعاعیں کہتے ہیں اُن سب کا انحراف بالکل برابر نہیں ہوتا۔ بلکہ بعض کا کسی قدر کم ہوتا ہے اور بعض کا زیادہ۔ اس فرق کو ہماری آنکھ محسوس نہیں کر سکتی۔ اس لیے ہم سب شعاعوں کو سبز کہتے ہیں۔ نیز بسا اوقات رنگ کی تمیز بھی مشکل ہوتی ہے۔ مثلاً سبزی ماٹل نیلے رنگ کو بعض لوگ نیلا کہہ دیتے ہیں اور بعض سبز۔ ان وجوہات کی بنا پر انحراف

کے ذریعے شعاعوں کو معین کرنے کا طریقہ زیادہ صحیح ہے —

اگر شعاعیں ایک واسطے (ہوا) سے دوسرے واسطے (شیشہ) میں گذریں تو اُن کی سمت بدلتی ہے۔ اس مظہر کو انعطاف نور کہتے ہیں۔ سفید روشنی میں مختلف قسم کی شعاعیں ہوتی ہیں۔ جن میں سے بعض زیادہ انعطاف پذیر ہوتی ہیں اور بعض کم۔ پس شعاع کو معین کرنے کے لیے صرف یہ جاننا ضروری ہے کہ وہ کس حد تک انعطاف پذیر ہے —

اب ہم اس مسئلہ پر غور کرتے ہیں کہ انعطاف کا اختلاف کیوں ہوتا ہے۔ ہمیں معلوم ہے کہ نور کی خاصیات اسواج کی سی ہیں۔ پس نور کی اشاعت کے لیے تہوج کی ضرورت ہے۔ یہ تہوج مبداء نور سے روانہ ہوتا ہے۔ اور اثر * میں سے ہوکر آنکھ سے ٹکراتا ہے تو رویت کی کیفیت پیدا ہوتی ہے —

مبداء نور سے اسواج روانہ ہونے کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ اُس کے ذرے نہایت سرعت کے ساتھ تھر تھراتے ہیں۔ اور مختلف رنگوں کی روشنی کا اختلاط اس لیے ہوتا ہے کہ ذروں کی تھر تھراہٹ کی تیزی بواہر نہیں ہوتی۔ مثلاً بنگشتی شعاعوں کا تعدد + ارتعاش سرخ شعاعوں کے تعدد ارتعاش سے تقریباً دگنا ہوتا ہے۔ اس لیے اگر ہمیں کسی خاص سبز شعاع کو متعین کرنا ہو جس کا انعطاف معلوم ہو تو ہم صرف اس شعاع کے متعلق

* موجودہ قہاس کے مطابق تمام نضائے بسوط میں ایک واسطہ موجود ہے جس کا نام اثر ہے۔ اثر سے کوئی جگہ خالی نہیں۔ نور اور لاسلکی امواج کی اشاعت اثر کے ذریعے ہوتی ہے —

+ جعلی مرتبہ کوئی ذرہ ایک ثانیہ میں تھر تھراتا ہے اُسے ذرہ کا تعدد ارتعاش کہتے ہیں —

ذروں کا تعدد ارتعاش بیان کر دیں گے۔ اس ترکیب سے شمع بالکل معین ہو جائے گی —

فضا یا ہوا میں نور کی رفتار تقریباً ۱۸۶۰۰۰ میل یا ۳۰۰۰۰۰ کلومیٹر فی ثانیہ ہے۔ اور جتنا فاصلہ کسی خاص رنگ کی شعاعیں ایک ارتعاش کے دوران میں طے کر لیتی ہیں اُس فاصلہ کو شعاعوں کا طول موج کہتے ہیں۔ پس اگر شمع کے تعدد ارتعاش کو طول موج میں ضرب دیا جائے تو ایک ثانیہ میں طے کردہ فاصلہ یعنی رفتار نور حاصل ہوگی۔ اس سے ظاہر ہے کہ اگر کسی شمع کا طول موج معلوم ہو تو اُس سے بھی شمع متعین ہو جائے گی —

ہماری حس باصرہ صرف اُن امواج کو محسوس کر سکتی ہے جن کا طول موج خاص حدود کے درمیان واقع ہوتا ہے۔ مندرجہ ذیل جدول میں مرئی شعاعوں کا طول موج دیا گیا ہے —

سرخ	۶۷۲۳۰	مائیکروں * سے	۶۱۳۷۰	مائیکروں تک
نارنجی	۶۱۴۷۰	" سے	۵۸۵۰	" تک
زر	۵۸۵۰	" سے	۵۷۵۰	" تک
سبز	۵۷۵۰	" سے	۴۹۲۰	" تک
نہلا	۴۹۲۰	" سے	۴۵۵۰	" تک
آسمانی	۴۵۵۰	" سے	۴۲۲۰	" تک
بنفشہ	۴۲۲۰	" سے	۳۹۷۰	" تک

* مائیکروں $\frac{1}{1000}$ ملی میٹر یا $\frac{1}{1000000}$ میٹر کے برابر ہوتا ہے —

یہی امواج جب آپس میں خلط ملط ہو کر آنکھ سے نکراتی ہیں۔ تو سفید نور کا احساس ہوتا ہے۔ اگر انہری امواج کا طول موج مذکورہ بالا حدود کے اندر نہ ہو تو ان کا آنکھ پر کوئی اثر نہ ہوگا۔ لیکن اور مختلف طریقوں سے ان کا احساس ہو سکتا ہے۔ مثلاً سرخ شعاعوں سے زیادہ طول موج کی لہریں ہم حرارت کی شکل میں محسوس کرتے ہیں۔ اور بنفشتی شعاعوں سے کم طول موج کی شعاعوں کو ان کے کیمیائی عمل سے شناخت کر سکتے ہیں۔ بہت لمبے طول موج کی شعاعیں بے تار پیام رسانی میں استعمال ہوتی ہیں۔ ان شعاعوں کا طول موج $\frac{1}{10}$ ملی میٹر سے ۱۳۰۰۰ میٹر تک ہوتا ہے۔

ظاہر ہے کہ رنگوں کا اختلاف کوئی حقیقی اختلاف نہیں۔ محض ہمارے احساس کا اختلاف ہے۔ بعض آدمی فیلے اور آسمانی رنگ میں تمیز نہیں کر سکتے۔ ان کی حس باصرہ کے مطابق طیف کے چھ رنگ ہوتے ہیں۔ بعض آدمیوں کی حس باصرہ اتنی کم زور ہوتی ہے کہ وہ اور رنگوں میں بھی صحیح طور پر تمیز نہیں کر سکتے۔

خلا یا ہوا میں ہر رنگ کی روشنی کی رفتار برابر ہوتی ہے۔ لیکن کثیف واسطوں میں روشنی کی رفتار رنگ پر منحصر ہوتی ہے۔ یہی رفتار کا فرق ہے جس سے انعطافات کا اختلاف پیدا ہو جاتا ہے۔ کسی خاص رنگ کی شعاعوں کا طول موج مختلف واسطوں میں مختلف ہوتا ہے۔

بخارات کا طیف | سورج کی کرنوں کا طیف مسلسل ہوتا ہے۔ اس میں سات رنگ ہوتے ہیں جو ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ واقع ہوتے ہیں۔ لیکن اگر ہم گیس کا شعلہ روشن کریں اور کسی سلاخ میں نہک لگا کر شعلہ پر رکھ دیں تو شعلہ کا رنگ زرد ہوگا۔ اور اُسے

رنگ اور رنگ کی رویت سائنس اکتوبر سنہ ۲۳ ع

منشور میں سے دیکھنے پر مسلسل طیف کی بجائے زرد خط نظر آئے گا جو طیف کے خاص مقام پر راقع ہوگا۔ نمک سوڈیم کا مرکب ہے۔ شعاع میں رکھنے سے سوڈیم کے بخارات بھڑک اُٹھتے ہیں۔ اور ان بخارات کا طیف ایک خط ہوتا ہے۔ یہی حال اور چیزوں کا ہے۔ جس عنصر کو شعلے میں رکھ کر بخارات میں تبدیل کیا جاتا ہے اس کے طیف میں خاص خاص مقاسات پر خاص رنگوں کے خط نظر آتے ہیں۔ اُس کی وجہ یہ ہے کہ جب کوئی عنصر بخارات میں تبدیل ہو کر بھڑک اُٹھتا ہے تو اُس سے خاص طول موج کی لہریں پیدا ہوتی ہیں۔ اور اُنہی لہروں کے مطابق خطوط طیف میں پائے جاتے ہیں۔ اسی بڑا پڑ کسی مرکب کے طیف کو دیکھ کر ہمیں معلوم ہو سکتا ہے کہ اُس میں کون سے عنصر موجود ہیں۔

وسیع معنوں میں رنگ کا اطلاق تنویر یعنی روشنی رنگ فرعی یا لون کی تیزی پر بھی ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے رنگ اختلاف تین طرح سے ہو سکتا ہے۔

۱۔ حدت یا تنویر کا اختلاف۔

۲۔ سیری کا اختلاف یعنی رنگ خاص ہے یا اس میں سفید روشنی

کی آمیزش ہے۔

۳۔ رنگ فرعی یا لون کا اختلاف۔

آفتاب کی روشنی کو جس میں طیف کے تمام رنگ شامل ہوتے

ہیں سفید رنگ کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔

رنگ فرعی یا لون سے مراد اصل رنگ سے ہے۔ مثلاً کوئی چیز سرخ

ہو تو اُس کا رنگ فرعی سرخ ہے۔ اور سبز ہو تو اُس کا رنگ فرعی یا لون سبز

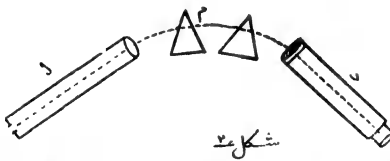
ہے۔ عام اصطلاح میں صرف رنگ فرعی کو رنگ کہتے ہیں۔

رنگ کی سیری کا مطلب یہ ہے کہ خالص رنگ میں سفید روشنی کس نسبت سے ملی ہوئی ہے۔ مثلاً اگر کوئی شعلہ زرد شعلے اور سفید شعلے سے مل کر بنا ہو اور اُس میں زرد رنگ کے مطابق طول موج کی شعاعوں کی تیزی کل شعلہ کی تیزی کا نصف ہو تو شعلے کا رنگ زرد نظر آئے گا۔ مگر وہ خالص زرد نہ ہوگا۔ بلکہ اُس کی سیری ۵۰ فی صدی ہوگی۔

رنگ کا تجزیہ اور ترکیب

رنگوں کا تجزیہ | مرکب رنگ کو مفرد رنگوں میں تقسیم کرنے کے لیے طیف نما استعمال ہوتا ہے۔ اس آلہ کے اجزاء حسب ذیل ہیں: —

۱۔ منشور (م)۔ اگر زیادہ تشریح کی ضرورت ہو تو دو یا تین منشور استعمال ہوتے ہیں۔



۲۔ نلی (الف) جس کے ایک سرے پر باریک شکات ہے اور دوسرے سرے پر محدب عدسہ۔ شکات کے سامنے

منور جسم رکھا جاتا ہے اور اس کی شعاعیں شکات میں سے گذر کر آتی ہیں تو عدسہ انہیں متوازی کر دیتا ہے۔ یہ متوازی شعاعیں منشور کے ذریعے مختلف رنگوں میں تقسیم ہوتی ہیں۔

۳۔ (د) ایک چھوٹی سی دوربین ہے جو طیف کو دیکھنے کے لیے استعمال ہوتی ہے۔ دوربین منشور کے گرد گھوم سکتی ہے۔ اس لیے اُسی کو گھما کر طیف کے ہر حصہ کا معائنہ ہو سکتا ہے۔

اگر طیف نما میں سوڈیم کا شعلہ دیکھا جائے تو وہ باریک زرد خط

نظر آئیں گے۔ جو بالکل قریب قریب واقع ہوں گے۔ یہ خط سوڈیم کے مخصوص خط کہلاتے ہیں۔ سوڈیم کے شعلے کی شعاعیں منشور میں سے گذر کر پڑنے پر پڑیں تو صرف ایک خط نظر آتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ سوڈیم کے دونو خط پاس پاس ہوتے ہیں منشور میں سے گذرنے پر وہ علیحدہ علیحدہ نظر نہیں آتے۔ طیف نما میں الگ الگ نظر آجاتے ہیں۔

اگر سوڈیم کی بجائے کسی اور عنصر کے بخارات کو بھڑکا کر طیف نما میں دیکھا جائے تو اس عنصر کے مخصوص روشن خط دکھائی دیں گے۔ لیکن اگر آفتاب یا ہرقی لمپ کی روشنی کا مشاہدہ کیا جائے۔ تو مسلسل طیف نظر آئے گا۔ پھر اگر معمولی لمپ اور آفتاب کی روشنی کا مقابلہ کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ آفتاب کی روشنی کا بنفشتی حصہ نہایت تیز روشن ہے اور لیمپ کی روشنی کا سرخ حصہ تیز روشن ہے اور بنفشتی حصہ مدہم۔ پس ہم طیف نما کے ذریعے نہ صرف یہ معلوم کر سکتے ہیں کہ کسی خاص مہداء نور میں سے کون کون سے طول موج کی امواج خارج ہو رہی ہیں بلکہ یہ بھی معلوم کر لیتے ہیں کہ کن امواج کی تنویر زیادہ ہے اور کن کی کم۔

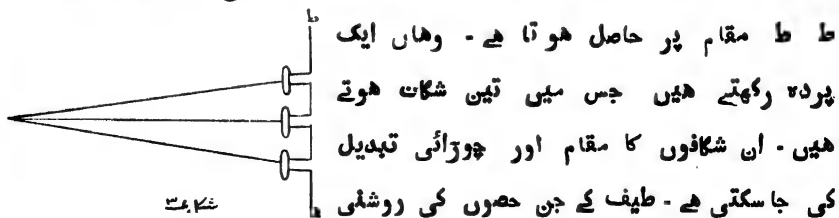
طیف کے رنگور اگر طیف کے سامنے ایک مناسب عدسہ مناسب فاصلے پر کی ترکیب رکھا جائے تو عدسہ تمام رنگوں کی روشنی کو ایک مقام پر جمع کر دے گا اور وہاں سات رنگوں کی دھاری کی بجائے سفید لکیر دکھائی دے گی۔

طیف کے رنگوں کی ترکیب کا ایک اور طریقہ یہ ہے کہ طیف کو ایک بکس پر تالا جائے جس کے چاروں پہلوؤں پر آئینے لگے ہوں۔ اور پھر بکس کو کھپایا جائے۔ بکس کو کھپانے سے سب رنگ باری باری آنکھ

کے سامنے آتے جائیں گے۔ اور رویت کے استہرار کی وجہ سے آنکھ پر ان سب کا مجموعی اثر پڑے گا۔ ایسا معلوم ہوگا کہ آنکھوں سے سفید روشنی منعکس ہو کر آرہی ہے۔

تیسرا طریقہ یہ ہے کہ ایک گول قرص پر نصف قطر کھینچ کر اسے سات حصوں میں تقسیم کیا جائے اور ان قطعوں پر طیف کے رنگ ترتیب وار لگا کر قرص کو تیزی کے ساتھ گھمایا جائے۔ قرص کا رنگ دھندلا سفید یا مٹیالا سا نظر آئے گا۔

مذکورہ بالا طریقوں میں طیف کے سب رنگ آپس میں خلط ملط ہوتے ہیں۔ اور ان کے باہم ملنے سے سفید نور یا خاکستری رنگ حاصل ہوتا ہے۔ لیکن رنگوں کی مکمل تحقیقات کے لئے ضروری ہے کہ خاص طول موج کی امواج کو طیف سے الگ کیا جائے اور پھر انہیں کسی اور طول موج کی امواج کے ساتھ ملا کر مشاہدہ کیا جائے۔ اس مطلب کے لیے سفید نور کے طیف میں سے خاص رنگوں کی روشنی لیکر انہیں باہم ملاتے ہیں۔ طیف پیدا کرنے کے لیے طیف نما استعمال کرتے ہیں۔ جس میں دوربین کی بجائے ایک عدسہ ہوتا ہے۔ عدسہ کے محل سے واضح اور مسلسل طیف



کو باہم ملانا مقصود ہوتا ہے۔ ان کے سامنے شکات لے آتے ہیں۔ شکافوں کے سامنے عدسے ہوتے ہیں جو شکافوں کی روشنی پردے کے ایک معین مقام

پر جمع کر دیتے ہیں۔ جہاں طیف کے رنگوں کا مجبوعی اثر مترقب ہوتا ہے۔
طیف کے رنگوں کی آمیزش سے مندرجہ ذیل نتائج اخذ ہوئے ہیں۔

سرخ روشنی + سبز روشنی = زرد روشنی

سبز روشنی + آسمانی روشنی = طاوسی فیلی روشنی

آسمانی روشنی + سرخ روشنی = قرمزی روشنی

نہز یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ 'سرخ' سبز اور آسمانی رنگوں کی مناسب آمیزش سے ہر رنگ پیدا ہو سکتا ہے۔ اسی بنا پر رویت کا یہ رنگی نظریہ قائم ہوا ہے کہ آنکھ کے شبکیہ میں تین قسم کے رنگ گیرندے ہیں۔ جن میں سے ایک سرخ رنگ کا احساس کرتا ہے دوسرا سبز رنگ کا اور تیسرا آسمانی رنگ کا۔ جب ان تینوں گیرندوں کو مناسب تحریک ہوتی ہے تو سفید رنگ کا احساس دماغ کو منتقل ہوتا۔

توس الوان
مختلف رنگوں کی ترکیب کا سادہ طریقہ یہ ہے کہ ایک گول قرس لیں اور رنگوں کو جس نسبت سے ملانا مقصود ہو اسی نسبت سے نصف قطر کھینچ کر قرس کے حصے کر لیں۔ اور اُن پر رنگ لگا دیں۔ پھر قرس کو کھوائیں۔ رویت کے استہوار کی وجہ سے ایک رنگ کا اثر غائب ہونے سے پہلے دوسرے رنگ آنکھ کے سامنے آتے جائیں گے اس لیے سب رنگوں کے مجبوعی اثر کا احساس ہو گا۔

اتھامی رنگ
ہر رنگ کی روشنی کے مطابق ایک ایسا رنگ ہوتا ہے۔ کہ جب دونوں کو باہم ملایا جاتا ہے تو اُن کی ترکیب سے سفید روشنی کا احساس پیدا ہوتا ہے۔ ان رنگوں کو اتھامی یا تکمیلی رنگ کہتے ہیں۔ طیف کے اکثر حصوں کا اتھامی رنگ بھی طیف کا کوئی اور حصہ ہوتا ہے۔ جیسا کہ مندرجہ ذیل جدول سے ظاہر ہے۔

رنگ اور طول موج	رنگ اور طول موج
اتھامی رنگ اور طول موج	سرخ ۶۵۶ مائکرون
نیل کون سبز ۴۹۲ مائکرون	نارنجی ۶۰۸ مائکرون
فیلا سبز ۴۹۰ مائکرون	زرہ ۵۸۵ مائکرون
فیلا ۴۸۵ مائکرون	سبزی مائل زرہ ۵۶۴ مائکرون
بنفشہ ۴۳۲ مائکرون	

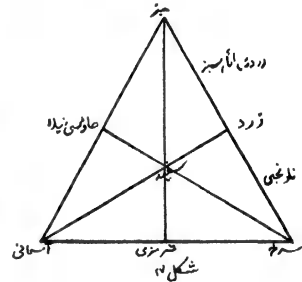
مختلف طول موج کے رنگوں کی ترکیب سے وہ رنگ تو پیدا ہوسکتے ہیں جن کا طول موج اُن کے بین بین ہو۔ لیکن سرخ اور بنفشہ رنگ اور رنگوں کی ترکیب سے پیدا نہیں ہوتے۔ اس لیے ان دونوں رنگوں کو اصلی یا اساسی رنگ کہتے ہیں۔ سرخ اور بنفشہ کو ملانے سے قرمزی رنگ حاصل ہوتا ہے۔ اور ان کے ساتھ سبز رنگ شامل کرنے سے سفید رنگ پیدا ہوتا ہے۔ پس سبز رنگ کا اتھامی رنگ قرمزی ہے۔

رنگین شیشوں والے لپ یا رنگ دار جسم کی جو روشنی آنکھوں میں پہنچتی ہے وہ ہم طور پر خالص طیفی رنگوں پر مشتمل نہیں ہوتی۔ یعنی اس میں محدود طول موج کی امواج نہیں ہوتیں۔ بلکہ وہ مختلف امواج کے سلسلوں کی مرکب روشنی ہوتی ہے۔ اس قسم کی روشنی کی طبعی تعبیر کے لیے یہ دیکھتے ہیں کہ مرکب نور میں کون کون سے طول موج کی لہریں موجود ہیں اور ہر طول موج کی لہروں کی تئویر کیا ہے اگر یہ معلوم ہو جائے تو اسی رنگ کی روشنی کا پیدا کرنا کچھ مشکل نہیں کھوونکہ مناسب نسبت سے طیفی رنگوں کو ملانے سے جو روشنی حاصل ہوگی اس کا آنکھ پر بے ہلہ اسی رنگ کی روشنی کا سا اثر ہوگا۔

یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیے کہ اگر دو جسموں کی روشنی کا آنکھ پر بالکل یکساں اثر مترتب ہو تو ضروری نہیں کہ جو ساہت پہلے جسم کی

روشنی کی ہے وہی دوسرے جسم کی روشنی کی ہو مثلاً طہفی سبز رنگ اور طہفی سرخ رنگ کو باہم ملانے سے ایسا زرد رنگ حاصل ہوتا ہے کہ آنکھ اس رنگ میں اور خالص طہفی زرد رنگ میں مطلق تمیز نہیں کر سکتی۔ اور جیسا کہ اوپر بیان ہوا ہے تین اساسی رنگوں کی مناسب آمیزش سے تمام رنگ بن سکتے ہیں۔

مثالث الوان طیف کے مختلف رنگوں کی ترکیب سے جو لا تعداد رنگ حاصل ہوتے ہیں ان کو دکھلانے کا آسان طریقہ یہ ہے کہ شکل نمبر ۴ کے مطابق مثالث الوان بنالیا جائے۔ مثالث متساوی الاضلاع ہے۔ تین اساسی رنگ سرخ، سبز اور آسمانی اس کے کونوں پر ہیں۔ اساسی رنگوں کے اتھاسی رنگ اضلاع کے وسط میں ہیں۔ اور سفید مرکز میں۔ طیف کے رنگ یعنی سرخ، نارنجی، زرد، زردی مائل سبز اور سبز اوپر کے ایک ضلع پر ہیں اور سبز اور نیلا دوسرے ضلع پر۔ قاعدہ ۴ پر



سوخ، گلکاری، ارغوانی، قرمزی اور نیلگوں بے نقاشی رنگ ہیں۔

خالص یا سیر رنگ تو پہلوؤں پر واقع ہیں۔ مدہم رنگ مثالث کے اندر سفید کے ارد گرد ہیں۔ مثلاً اگر ہم سرخ رنگ والے کونے سے مرکز کی طرف جائیں تو سرخ رنگ میں سفیدی ملتی جائے گی اور رنگ کی سرخی گھٹتی جائے گی۔ حتیٰ کہ مرکز پر رنگ سفید ہو جائے گا۔ مرکز سے گزر کر سفید رنگ میں کچھ نیلا پیدا ہوگا۔ جس کی سبزی بڑھتی جائے گی۔ پہلو پر پہنچ کر رنگ خالص طاؤسی نیلا ہوگا۔

دو رنگوں کی ترکیب سے جو رنگ حاصل ہوتا ہے وہ ان کے خط

اصل پر واقع ہوتا ہے۔ اگر دونوں رنگوں کی تنویر برابر ہے تو ان کا مرکب رنگ خط واصل کے درمیانی نقطہ پر ہوگا۔ مثلاً سورج اور سبز کا مرکب زرد ہے۔ جو پہلو کے وسط میں ہے۔ اگر ایک رنگ کی تنویر دوسرے سے زیادہ ہو تو ان کا مرکب خط واصل کے عین درمیان میں نہ ہوگا۔ مثلاً اگر ایک رنگ کی تنویر دوسرے سے دگنی ہو تو مرکب رنگ کا مقام خط کو ایک اور دو کی نسبت میں قطع کریگا۔ زرد رنگ کو نیلے رنگ سے ملا کر سفید رنگ حاصل کرنا ہو تو شکل کے مطابق زرد کی تنویر نیلے رنگ سے دگنی ہونی چاہئے۔

سفید سیاہ اور سواں پھندا ہوتا ہے کہ سفید رنگ سے صحیح مراد کیا خاکستری رنگ ہے۔ یعنی روشنی کا وہ کونسا معیار ہے جس پر ہم سفید روشنی کا اطلاق کر سکیں۔ آفتاب کی روشنی کو طیف نما میں دیکھیں تو صبح کے وقت مختلف رنگوں کی تنویر کچھ ہوگی۔ دوپہر کو کچھ اور شام کو کچھ اور۔ اسی طرح اگر گرہ ہوائی میں گرد و غبار ہو تو تنویر میں فرق پڑ جائے گا۔ اس سے ظاہر ہے کہ اگر کسی خاص وقت اور خاص حالات میں آفتاب کی روشنی کو سفید روشنی کا معیار قرار دیا جائے تو حالات کے تبدیل ہونے سے رنگوں کی تنویر بدل جائے گی۔ اور روشنی سفید نہ رہے گی بلکہ اُس میں بعض رنگ اصلی معیار کے مقابلے میں زیادہ شوخ ہوں گے۔

سفید روشنی کا اطلاق عام طور پر اس روشنی پر کیا جاتا ہے جو آفتاب سے دوپہر کے وقت مطلع صاف ہونے کی صورت میں آتی ہے۔ مصنوعی لیمپ جلہیں ہم سفید کے نام سے موسوم کرتے ہیں فی الواقع سفید نہیں ہوتے۔ ان میں نیلے رنگ کی کمی ہوتی ہے۔

رنگ اور رنگ کی رویت سائنس اکتوبر سنہ ۳۳ ع

ہماری حس بصرہ اصلی سفید روشنی کی شناخت نہیں کرسکتی۔ اس کا تو یہ حال کہ دو اقسامی رنگوں کی مرکب روشنی اور طیف کے ساتوں رنگوں کی مرکب روشنی میں تمیز نہیں کرسکتی۔ حالانکہ دونوں کے اجزائے ترکیبی میں زمین و آسمان کا فرق ہے —

اگر کوئی جسم سفید روشنی کا کچھ حصہ جذب کر لے اور جذب انتخابی نہ ہو یعنی سب رنگوں کی روشنی کا تناسب قائم رہے تو جسم کا رنگ خاکستری نظر آئے گا۔ اگر تمام روشنی جذب ہو جائے تو جسم کا رنگ سیاہ ہوگا —

رنگوں کی تقسیم و ترتیب

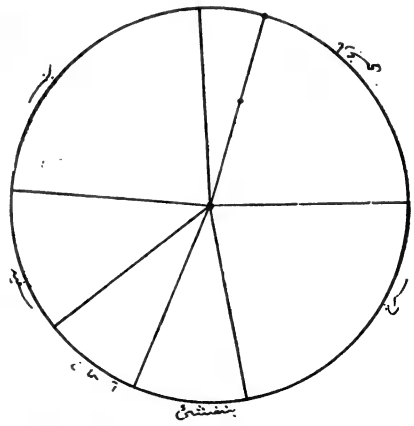
رنگوں کی کئی طرح سے تقسیم و ترتیب ہوسکتی ہے۔ اوستوالڈ (Ostwald) کی تقسیم نہایت سادہ ہے۔ اس تقسیم میں سفید اور سیاہ رنگوں کا نام مدہم رکھا گیا ہے۔ اور طیف کے سات رنگوں کا نام شوخ رنگ - مدہم رنگوں کے سلسلہ میں بھی شوخ رنگوں کی طرح تمام مدارج ہوسکتے ہیں۔ سیاہ اس سلسلے کے ایک سرے پر ہوگا اور سفید دوسرے سرے پر۔ مختلف خاکستری رنگ درمیان میں واقع ہونگے۔ ایک خاکستری رنگ کا دوسرے خاکستری رنگ سے اختلاف اس طرح ہوسکتا ہے کہ دونوں میں سفیدی اور سیاہی کی نسبت مختلف ہوگی۔ اگر دو خاکستری رنگوں کو ملایا جائے تو تیسرا خاکستری رنگ حاصل ہوگا جو ایک سے زیادہ روشن ہوگا اور دوسرے سے کم روشن۔ خاکستری سلسلہ کے تمام رنگوں کی تمیز ان کی وضو سے ہوسکتی ہے۔ یعنی اگر یہ معلوم ہو جائے کہ کتنے فی صدی روشنی منعکس ہوئی ہے تو ہمیں رنگ کا درجہ معلوم ہو جائے گا۔ مثلاً خاکستری رنگ نمبر ۹۵ وہ رنگ ہوگا جس سے واضح روشنی کا ۹۵ فی صدی حصہ منعکس ہو جائے۔ ایسا رنگ

سفید نظر آتا ہے اور خالص جست کے رنگ سے ملتا ہے۔ خاکستری نمبر ۸۰ خالص چاک کا رنگ ہوتا ہے۔ جو خاکستری رنگ ۴ فی صدی سے کم روشنی منعکس کریں انہیں سیاہ کہہ سکتے ہیں اور جن سے ۸۰ فی صدی سے زیادہ روشنی منعکس ہو ان پر سفید کا اطلاق ہو سکتا ہے۔

طیف کے رنگ اور (خاکستری اور سفید کے علاوہ) اور سب رنگ جو ان کو ملا کر پیدا ہوتے ہیں شوخ رنگ کہلاتے ہیں۔ رنگوں کا یہ سلسلہ نہایت وسیع ہے۔ پہلے تو ہم طیف کے مختلف رنگوں کو باہم ملا کر بہت سے رنگ پیدا کر سکتے ہیں۔ پھر ایک رنگ لے کر کسی سفید یا خاکستری یا سیاہ رنگ کے ساتھ اس کو ترکیب دے سکتے ہیں۔ اور پھر جب ایک شوخ اور ایک مدہم رنگ انتخاب کر لیں تو ان کو جس نسبت سے چاہیں ملا سکتے ہیں۔ اس لئے شوخ رنگوں کی تو قیاس اور شناخت اس قدر آسان نہیں جیسی کہ مدہم رنگوں کی۔

ہمیں طیف کے معائنہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک سرے پر سرخ رنگ

ہے۔ وہاں سے شروع ہو کر رنگ کی سرخی بدلتی جاتی ہے۔ حتیٰ کہ وہ نارنجی ہو جاتا ہے۔ اس سے آگے نارنجی بتدریج زرد ہوتا ہے۔ اسی طرح بدلتے بدلتے بلفشتی رنگ ہو جاتا ہے۔ لیکن ہم نے کہیں غور نہیں کیا کہ بلفشتی کو بتدریج تبدیل کرنے سے سرخ رنگ بن سکتا ہے۔ اس کا مطالب یہ ہے کہ طیف کو خط مستقیم میں پھیلانے کی بجائے دائرے کی شکل میں پھیلا سکتے ہیں۔ اس دائرے پر کہیں



شکل نمبر ۵

سے روانہ ہوں مختلف رنگوں میں سے ہوتے ہوئے پھر وہیں پہنچ جائیں گے۔

اور تمام سفر میں رنگوں کی تبدیلی بتدریج ہوگی۔ پروفیسر اوستوالد زرد رنگ کے عین وسط میں سے جہاں نارنجی اور سبز کا نشان تک نہیں ہوتا دائرہ شروع کرتے ہیں۔ اور اس سمت میں روانہ ہوتے ہیں۔ جس میں وہ پہلے سبز رنگ میں داخل ہوتے ہیں۔ اور وہاں سے نیلے بلفشٹی سرخ اور نارنجی میں ہوتے ہوئے پھر زرد رنگ میں آجاتے ہیں۔

اوستوالد کا دائرہ ۱۰۰ برابر حصوں میں منقسم ہوتا ہے۔ اور ہر حصے میں طول موج کا اختلاف برابر ہوتا ہے۔ اس میں آسمانی رنگ ایک دوسرے کے مقابل واقع ہوتے ہیں۔ اگر زرد اور نیلے آسمانی رنگوں میں سے گذرتا ہوا قطر کھینچ دیا جائے تو ایک نصف دائرہ میں زرد، نارنجی، سرخ، بلفشٹی اور آسمانی رنگ ہوں گے اور دوسرے نصف دائرے میں آسمانی، نیلا اور سبز۔ مزید براں ہر ایک نصف دائرے کے رنگوں کی ترتیب ایسی ہے کہ ہر دو رنگوں کو ملا کر ان کا درمیانی رنگ بن جاتا ہے۔

دائرے کے ۱۰۰ حصوں میں سے ہر حصے کا رنگ الگ قرار دیا جاسکتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ حصے کے اندر رنگ کا اختلاف اس قدر کم ہوتا ہے کہ نظر سے بالکل معلوم نہیں ہوسکتا۔ رنگوں کو صفر سے ۹۹ تک اعداد سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ صفر رنگ گندھک کا سا زرد ہے۔ صفر سے ۲۴ تک زرد سے شنگرفی سرخ تک تمام رنگ ہیں۔ شنگرفی سرخ سے آسمانی تک رنگ ۲۵ سے ۴۹ تک ہیں۔ ۵۰ سے ۷۴ تک آسمانی سے شروع ہوکر نیلگوں سبز میں ختم ہوتے ہیں اور ۷۵ سے ۹۹ تک نیلگوں سبز سے گندھکی زرد تک۔

جب سفید مدھم رنگ کو کسی شوخ رنگ کے ساتھ ملایا جاتا ہے تو

روشن شوخ رنگ حاصل ہوتا ہے۔ دائرہ کے سو رنگوں میں سے ہر ایک رنگ اس طوم سے شوخ رنگ میں تبدیل ہو سکتا ہے۔ مثلاً نمبر ۲۱ رنگ سرخ ہوتا ہے اس لیے ۲۱ سے مراد خالص سرخ رنگ ہوگا۔ لیکن ۷۵ ۶ ۲۱ سے مراد وہی سرخ رنگ ہوگا جس میں ۷۵ فی صدی اصلی رنگ ہو اور ۲۵ فی صدی سفید رنگ —

اسی طرح جب خاص رنگ کو سیاہ رنگ کے ساتھ ملائے ہیں تو تاریک شوخ رنگ بن جاتا ہے۔ اس سلسلہ میں ۷۵ ۶ ۲۱ سے یہ مراد ہوگی کہ ۷۵ فی صدی رنگ سرخ ہے اور ۲۵ فی صدی سیاہ۔ رنگ کے بیان کرنے میں یہ بتانا ضروری ہے کہ رنگ روشن شوخ ہے یا تاریک شوخ۔ ۷۵ ۶ ۲۱ سے یہ بات معلوم نہیں ہوتی —

جس شوخ رنگ میں سفید اور سیاہ دونوں رنگ ملے ہوں اسے متیلا رنگ کہتے ہیں۔ ایسے رنگ کے بیان کرنے میں تینوں رنگوں کی فی صدی نسبت دینی چاہئے۔ اگر دو رنگوں کا فی صدی تناسب معلوم ہو تو تیسرے کا خود بخود نکل آتا ہے۔ مثلاً ۴۰ - ۲۲ - ۶ ۲۱ سے متیلا سرخ رنگ مراد ہے۔ ۲۱ سے معلوم ہوا کہ رنگ سرخ ہے۔ ۲۲ کا مطلب یہ ہے کہ ۲۲ فی صدی خالص رنگ ہے۔ اور ۴۰ سے مراد یہ ہے کہ ۴۰ فی صدی سفید رنگ اس میں ملا ہوا ہے۔ ظاہر ہے کہ باقی ۳۶ فی صدی سیاہ رنگ ہوگا —

کسی خاص رنگ کی ترکیب معلوم کرنی ہو تو اوستوالد کے دائرہ ازان کے رنگوں کو ملانے کا کوئی مفادری آلہ ہونا چاہئے۔ قوس الوان اس مقصد کے لیے موزوں ہے۔ پہلے قوس الوان پر مختلف رنگ لگا کر اسے کھائیں تو رنگ کی اصلیت معلوم ہو جائے گی۔ پھر اس میں سفید اور سیاہ کی

مختلف مقادیر ملا کر اسے دیے ہوئے رنگ کے مطابق کر لینا چاہئے —

یہ تو ایک رنگ ہو گیا۔ بہت سے ایسے رنگ بھی بن سکتے ہیں جن میں دو رنگوں کی جھلک ہو۔ اندازہ کیا گیا ہے کہ اس طرح سے ۴۵ لاکھ مختلف رنگ بن سکتے ہیں۔ مگر ہماری ضروریات کے لیے ۵۰۰ سے ۲۰۰۰ تک رنگ کافی ہیں۔ کیوں کہ جتنے رنگ زیادہ ہوں گے اتنا ہی ایک دوسرے میں اختلاف کم ہوگا —

چونکہ رنگوں کی تعداد بڑھ رہی ہے اس لیے اوسطوں کی تقسیم و ترتیب رنگوں کی شناخت کے لیے نہایت ضروری اور مفید ہے —

اجسام کے رنگ

جب کسی جسم پر نور کی شعاعیں پڑتی ہیں تو ان کے کچھ اجزا جسم میں جذب ہو جاتے ہیں کچھ جسم سے منعکس ہوتے ہیں اور کچھ اُس میں سے گذر کر پار نکل جاتے ہیں۔ اس اعتبار سے مادی اجسام دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک وہ ہیں جو نور کی شعاعوں کے لیے شفاف ہیں۔ ان اجسام میں جذب سے بچی ہوئی روشنی جسم میں سے پار نکل جاتی ہے۔ دوسری قسم میں غیر شفاف اجسام شامل ہیں۔ جو جذب سے بچی ہوئی روشنی کو منعکس کر دیتے ہیں —

سفید روشنی مرئی طیف کی مختلف امواج پر مشتمل ہوتی ہے۔ اگر اس روشنی میں کوئی جسم مثلاً سرخ کپڑا رکھ دیا جائے تو وہ سرخ اس لیے نظر آتا ہے کہ طیف کے سرخ حصہ کے سواے اور سب رنگوں کی روشنی جذب کر لیتا ہے۔ اور سرخ روشنی اُس سے منعکس ہو جاتی ہے۔ جو جسم طیف کے تمام رنگوں کی روشنی برابر مقدار میں منعکس کر دیتا ہے وہ سفید دکھائی دیتا ہے۔ سفید کاغذ اسی سبب سے سفید نظر آتا

ہے۔ جس جسم میں تمام رنگوں کی روشنی جذب ہو جاتی ہے وہ سیاہ نظر آتا ہے۔

اگر ایک کاغذ پر سرخ رنگ لگا لیا جائے۔ اور پردہ پر طیف پیدا کر کے سرخ کاغذ اُس کے مختلف حصوں میں رکھا جائے تو وہ طیف کے سرخ حصہ میں سرخ دکھائی دے گا اور اُس کے سوائے طیف کے باقی تمام رنگوں کی شعاعوں میں سیاہ نظر آئے گا۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ سرخ کاغذ سرخ شعاعوں کے سوائے اور سب شعاعوں کو جذب کر لیتا ہے۔

عام طور پر رنگ دار جسم صرف ایک ہی رنگ کی روشنی منعکس نہیں کرتا۔ بلکہ منعکس شدہ روشنی میں اور رنگوں کی امواج بھی کم و بیش ملی ہوتی ہیں۔ مثلاً معمولی نیلی چیز نہ صرف نیلے رنگ کی شعاعیں منعکس کرتی ہے، بلکہ سبز، آسمانی اور بنفشتی شعاعیں بھی قلیل مقدار میں اُس سے منعکس ہوتی ہیں۔ اسی طرح زرد جسم کی منعکس شدہ شعاعوں میں سبز، نارنجی، اور سرخ رنگ بھی قلیل مقدار میں ملے ہوتے ہیں۔

اکثر اجسام کی بیرونی سطح سے سفید نور کا کچھ حصہ تبدیل ہوئے بغیر منعکس ہو جاتا ہے۔ لیکن زیادہ حصہ تھوڑی دور تک اندر چلا جاتا ہے۔ وہاں اندرونی انعکاس و انعطاف کی وجہ سے کئی رنگوں کی شعاعیں جذب ہو جاتی ہیں۔ اور بعض رنگوں کی روشنی منعکس ہو جاتی ہے۔ اسی وجہ سے اُن اجسام کے رنگ خاص رنگ نہیں ہوتے۔ بلکہ اُن میں سفید روشنی کی ملاوت ہوتی ہے۔

اس بات کو ثابت کرنے کے لیے کہ جسم کی سطح سے سفید روشنی کا انعکاس ہوتا ہے ایک رنگ دار شیشے کا ٹکڑا لے کر اُس کے ریزے

رنگوں کی شعاعیں گذر جاتی ہیں۔ اس لیے وہ سفید نظر آتے ہیں —
 اگر شفات جسم کی موٹائی کم ہو تو اُس میں سے گذرنے والی
 شعاعوں کا رنگ خالص نہیں ہوتا۔ لیکن جوں جوں موٹائی بڑھتی ہے
 رنگ زیادہ خالص ہوتا جاتا ہے۔ چونکہ رنگ دار شفات جسم میں سے
 خاص رنگ کی روشنی گذر سکتی ہے اس لیے وہ اُس روشنی کو الگ
 کرنے کے لیے استعمال ہو سکتا ہے۔ جب وہ جسم روشنی کے انتخاب کے
 لیے استعمال ہوتا ہے تو اُسے رنگ بین (لون فلٹر) کہتے ہیں —

بعض چیزوں کی خاصیت ہے کہ اُن کی موٹائی کم ہو تو ایک رنگ
 کی روشنی اُن میں سے گذرتی ہے۔ لیکن اگر موٹائی بڑھ جائے تو پار
 گذرنے والی روشنی کا رنگ بدل جاتا ہے۔ اس مظہر کو اختلاف لون کہتے
 ہیں۔ مثلاً اگر کوہلت کی تختی باریک ہو تو اُس میں سے نیلی روشنی
 گذرتی ہے۔ لیکن اگر تختی موٹی ہو تو اُس میں سے سرخ روشنی پار
 نکلتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کوہلت سرخ شعاعوں کو جذب نہیں کرتا
 نیلی شعاعوں کو کم جذب کرتا ہے۔ اور ان کے علاوہ اور سب رنگوں کی
 شعاعوں کو بالکل جذب کر لیتا ہے۔ اب اگر کوہلت کی باریک تختی ہو
 تو اُس میں سے سرخ روشنی گذرے گی اور اُس کے ساتھ نیلی روشنی کی
 کافی مقدار بھی گذر جائے گی۔ لیکن سرخ روشنی کی تنویر نیلی روشنی
 کے مقابلے میں بہت کم ہوتی ہے۔ اس لیے روشنی کا رنگ نیلا نظر
 آئے گا۔ تختی موٹی ہو تو نیلی شعاعیں بھی اُس میں جذب ہو کر رہ
 جائیں گی۔ اس لیے صرف سرخ روشنی خارج ہوگی۔ بہت سے رنگ دار
 مادوں میں یہ خاصیت پائی جاتی ہے —

گو اکثر اجسام کے رنگ جذب نور کی وجہ سے ظہور میں آتے ہیں۔

لیکن بعض چیزوں کا سطحی رنگ بھی ہوتا ہے۔ مثلاً سونے کا زرد رنگ سطحی ہوتا ہے۔ اگر سونے کا ورق لیکر دو شیشے کی تختیوں کے درمیان رکھا جائے اور اُس میں سے سفید روشنی کا معائنہ کیا جائے تو ورق سبز نظر آئے گا۔ جس سے ثابت ہوتا ہے کہ سونے کا اصلی رنگ سبز ہے۔ یعنی سبز کے سوائے اور سب رنگوں کی روشنی اُس میں جذب ہو جاتی ہے۔ زرد رنگ سطح سے انعکاس کی وجہ سے نظر آتا ہے۔

آسمان کا نیلا رنگ | آسمان کا نیلا رنگ نظر آنے کی وجہ یہ ہے کہ ہوا میں چھوٹے چھوٹے خاکی ذرات ہوتے ہیں جو آفتاب کی روشنی کو چاروں طرف بکھیر دیتے ہیں۔ نیلے رنگ کا طول موج کم ہوتا ہے۔ اس لیے ذرات کا اثر نیلے رنگ پر زیادہ ہوتا ہے۔ سرخ رنگ پر طول موج کے زیادہ ہونے کی وجہ سے ذرات کا عمل کم ہوتا ہے۔ پس ذرات سے منتشر ہو کر جو روشنی ہماری طرف آتی ہے وہ نیلی ہوتی ہے۔

ظاہر ہے کہ انتشار سے بچ کر جو روشنی سیدھی گذر جائے گی وہ مقابلتاً سرخ ہوگی۔ اس میں نیلی اور دیگر چھوٹی امواج کی شعاعوں کی کمی ہوگی۔ یہی وجہ ہے کہ شام کو سورج کا رنگ سرخ نظر آتا ہے۔ سورج کی نیلی شعاعیں ادھر ادھر بکھر جاتی ہیں۔ اور سرخ رنگ کی شعاعیں کرۂ ہوائی میں سے گذر آتی ہیں۔

رنگوں کے آمیزے

اگر ہم ایک امتحانی ٹلی میں قرمزی رنگ دوسری میں زرد اور تیسری میں نیلا رنگ حل کر لیں اور پھر ایک اور ٹلی لے کر اُس میں قرمزی رنگ کو نیلے رنگ کے ساتھ ملائیں تو سرخ رنگ حاصل ہوگا۔ زرد کو نیلے رنگ کے ساتھ ملائے سبز رنگ بنے گا اور نیلے کو سرخ

کے ساتھ ملانے سے ارغوانی رنگ۔ زرد اور نیلے رنگوں کو ملانے سے سبز رنگ بن گیا۔ لیکن ہمیں معلوم ہے کہ زرد اور نیلے طیفی رنگوں کا مرکب سفید ہوتا ہے۔ تو یہ اختلاف کیسے پیدا ہوا ؟

اختلاف کا سبب یہ ہے کہ طیفی رنگوں کی ترکیب سے جو رنگ پیدا ہوتے ہیں وہ اُن رنگوں کے مجموعی اثر سے مترتب ہوتے ہیں۔ لیکن رنگ دار مادہ کا رنگ وہ ہوتا ہے جو جذب ہونے سے بچ گیا ہو۔ مثلاً زرد مادہ اس لیے زرد نظر آتا ہے کہ سفید روشنی میں سے نیلے اور بنفشتی رنگوں کی شعاعیں جذب کر لیتا ہے۔ اور زرد روشنی منعکس کرتا ہے۔ لیکن کوئی زرد چیز ایسی نہیں جو صرف زرد روشنی کو منعکس کرے۔ بلکہ اُس کے ساتھ سرخ اور سبز روشنی بھی منعکس ہوتی ہے۔ زرد رنگ کی تیزوی کی وجہ سے سرخ اور سبز رنگ ماند پڑ جاتے ہیں۔ اس لیے مادے کا رنگ زرد نظر آتا ہے۔ اسی طرح نیلا رنگ دار مادہ اس لیے نیلا نظر آتا ہے کہ سرخ اور زرد رنگ جذب کر لیتا ہے۔ اور سبز رنگ کے ساتھ ملی ہوئی نیلی روشنی منعکس کر دیتا ہے۔ اب اگر زرد اور نیلے رنگوں کا آمیزہ تیار کیا جائے تو زرد رنگ نیلی شعاعیں بالکل جذب کر لے گا اور نیلا رنگ زرد روشنی جذب کرے گا۔ پس دونوں رنگوں کے متحده عمل سے سبز رنگ کے سوائے اور سب رنگوں کی شعاعیں جذب ہو جائیں گی۔ اس لیے آمیزہ کا رنگ سبز ہوگا۔ حقیقت میں سبز رنگ نیلے اور زرد رنگ کا مرکب نہیں ہے۔ بلکہ وہ رنگ ہے جو نیلے اور زرد رنگدار مادوں کے جذب سے بچ جاتا ہے۔

رنگدار فلٹر | رنگدار مادوں کی ترکیب سے جو مختلف رنگ پیدا ہوتے ہیں اُن کے مطالعہ کے لیے رنگدار فلٹر ملتے ہیں۔ تین فلٹر اس طرح بنے ہوتے ہیں کہ پہلے فلٹر میں مسلسل طیف کا ایک طرف کا تھائی

حصہ ہوتا ہے، دوسرے میں بیچ کا تہائی حصہ، اور تیسرے میں دوسری طرف کا تہائی حصہ۔ پہلا سرخ نظر آتا ہے۔ دوسرا سبز اور تیسرا فیلا۔ تین اور رنگدار فلٹروں پر ان تینوں رنگوں کے اتھاسی رنگ ہوتے ہیں۔ گویا ان میں سے ہر ایک طیف کا دو تہائی حصہ ہوتا ہے۔ سرخ کے اتھاسی فلٹر کا رنگ طاوسی فیلا ہوتا ہے۔ سبز کے اتھاسی فلٹر کا قرسی اور نیلے کے اتھاسی فلٹر کا زرد —

اب اگر نیلے اور زرد فلٹروں کو جوڑ دیا جائے تو ان میں طیف کا مشترک حصہ سبز رنگ ہو گا۔ پس ان کو باہم ملانے سے وہی رنگ حاصل ہو گا جو زرد اور نیلے رنگوں کی آمیزش سے حاصل ہوتا۔ اگر تیسرا اتھاسی فلٹر بھی شامل کیا جائے۔ تو سب رنگ جذب ہو جائیں گے۔ یعنی رنگ سیاہ ہو جائے گا۔ مختلف فلٹروں کو باہم ملا کر یہ تحقیق ہوسکتا ہے کہ مختلف رنگوں کے آمیزوں کے رنگ کیا کیا ہوں گے —

[رنگدار مادوں کی آمیزش سے جو رنگ پیدا ہوتے ہیں وہ شکل ۶

(ج) سے ظاہر ہیں] —

رنگ پر تنویر کا اثر

اگر آنکھ کے چاروں طرف کسی خاص رنگ کی روشنی پڑ رہی ہو تو وہ اسی کے زیر اثر ہو جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دن کی روشنی میں جو اختلافات پیدا ہوتے رہتے ہیں وہ عموماً نظر انداز ہو جاتے ہیں۔ بلکہ اگر ہم دن کی روشنی سے مصنوعی روشنی میں جائیں تو خاص فرق محسوس نہیں کرتے۔ البتہ اگر دونوں کا تقابل ہو جائے تو فرق نمایاں ہو جاتا ہے —

مختلف لہروں کی روشنی میں اختلاف اسی وجہ سے پیدا ہوتا ہے کہ تپش (ٹھپریچر) کی کئی بھشی سے مختلف طول موج کی شعاعوں کی طاقت

تنبویر میں فرق ہو جاتا ہے۔ ہر مبداء نور کا رنگ اُس کی تپش پر منحصر ہوتا ہے۔ معمولی لہپ جن کی تپش کم ہوتی ہے زردی مائل سرخ ہوتے ہیں۔ اس سے زیادہ گرم کاربن کے برقی لہپ ہوتے ہیں۔ جن کا رنگ زرد ہوتا ہے۔ دھات کے سوت والے تیز روشن برقی لہپ جو آج کل عام طور پر استعمال ہوتے ہیں مقابلۃً سفید ہوتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ زیادہ گرم ہوتے ہیں۔ اور ان میں فہلی اور بلفشٹی شعاعیں بھی پیدا ہوتی ہیں۔ برقی قوس اور بھی گرم ہوتی ہے اور اس کا رنگ دیگر لہپوں کے مقابلے میں زیادہ سفید ہوتا ہے۔ اور زیادہ سفید لہپ کیس کے لہپ ہیں۔ جن میں حباب [Mantle] استعمال ہوتے ہیں۔ حباب کی ترکیب

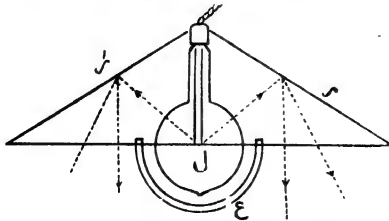
شکل نمبر ۶ کا بلاک وقت پر تیار نہ ہو سکا اور رسالہ کے شایع ہونے میں دیر ہوتی تھی لہذا یہ شکل بلاک بن کر آنے کے بعد جنوری سنہ ۳۴ ع کے رسالے کے ساتھ شایع کر دی جائے گی۔

رکھ دیں گے ، کاغذ کا رنگ بھی وہی ہو جائے گا۔ مثلاً فیلی روشنی میں وہ نیلا نظر آئے گا۔ اور سرخ روشنی میں سرخ۔ اس کا سبب یہ ہے کہ سفید کاغذ ہر رنگ کی روشنی منعکس کر دیتا ہے۔ اگر سفید کاغذ کی بجائے سرخ کپڑا فیلی روشنی میں رکھا جائے تو سیاہ نظر آئے گا۔ سرخ روشنی میں وہ تیز سرخ ہوگا اور زرد روشنی میں نیم زرد۔ نیلا مادہ سرخ نارنجی یا زرد روشنی میں سیاہ نظر آتا ہے۔ اور سبز روشنی میں

سبزی مائل۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ نیلے مادہ میں سبز رنگ کلی طور پر جذب نہیں ہوتا —

اگر رنگدار کپڑوں کا مشاہدہ لمپ کی روشنی میں کیا جائے تو ان کے رنگ وہی نظر نہیں آتے جو آفتاب کی روشنی میں نظر آتے ہیں۔ خاص طور پر نیلے کپڑوں کے رنگ میں نمایاں تبدیلی پائی جاتی ہے۔ مثلاً جو کپڑا دن کو نیلا نظر آتا ہے وہ معمولی لمپ کی روشنی میں تقریباً سیاہ نظر آئے گا۔ سبب یہ ہے کہ وہ نیلے رنگ کے سوائے اور رنگ جذب کر لیتا ہے۔ اور لمپ کی روشنی میں نیلا رنگ تقریباً مفقود ہوتا ہے — رنگ کی تبدیلی ان کپڑوں میں اور بھی نمایاں ہوتی ہے جن سے کئی رنگوں کی روشنی منعکس ہوتی ہے۔ بعض کپڑے جو دن کی روشنی میں سبز یا نیلے نظر آتے ہیں لمپ کی روشنی میں بھورے یا سرخ دکھائی دیتے ہیں —

روز نما لمپ | چونکہ مصنوعی سفید روشنی میں کپڑوں کے رنگ دن کی روشنی سے مختلف نظر آتے ہیں اور رنگوں کی شناخت نہیں ہو سکتی اس لیے بزاروں کو خاص ساخت کے لمپوں کی ضرورت پڑتی ہے۔ جن میں کپڑوں کے رنگ وہی نظر آئیں جو دن کی روشنی میں نظر آتے ہیں۔ ان لمپوں کو روزنہ لمپ کہتے ہیں۔ ایک قسم کے 'روز نما' میں



شکل ۷

ایک معمولی برقی لمپ 'ل' ہے جس کے ایک طرف مجہا عکس انداز 'ع' ہے۔ جو لمپ کی روشنی منعکس کر کے رنگین عکس انداز پر ڈالتا ہے۔ رنگین

عکس انداز پر مختلف رنگوں کے قطعے لگے ہوتے ہیں جن میں سبز اور نیلے رنگوں

کے قطعے زیادہ ہوتے ہیں۔ پس لمپ کی روشنی کے سبز اور نیلے رنگ کے اجزا کا انعکاس نسبتاً زیادہ ہوتا ہے۔ اور رنگدار عکس انداز سے جو روشنی منعکس ہو کر آتی ہے وہ دن کی روشنی کے مشابہ ہوتی ہے۔

رنگ کی رویت

رنگ ایک احساس ہے جو خاص طول موج کی شعاعوں کے شبکیہ یا آنکھ کے پردہ اول پر عمل کرنے سے پیدا ہوتا ہے۔ یہ احساس دو باتوں پر منحصر ہوتا ہے۔ ایک تو نور کی طبیعی تحریک پر اور دوسرے اس امر پر کہ شبکیہ کے کس حصے پر عمل ہوا ہے۔ شبکیہ کا وسطی حصہ جو اور سب حصوں سے زیادہ حساس ہے زرد داغ کہلاتا ہے۔ اگر روشنی اس حصے پر پڑے تو یہ حصہ ۲۰۰ سے زیادہ رنگوں میں تمیز کر سکتا ہے۔ اس سے باہر درمیانی طبقہ میں صرف ان رنگوں کی تمیز ہوتی ہے جن کا طول موج زرد اور نیلے رنگوں کے آس پاس ہوتا ہے۔ اگر روشنی تیز ہو تو شبکیہ کے کناروں تک رنگ کا احساس ہوتا ہے۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ رنگوں کا اختلاف ہم کیونکر محسوس کرتے ہیں۔ ممکن ہے کہ جب اثر کے ارتعاشات کا سلسلہ شبکیہ کے ساتھ تکرار ہو تو ان کے ہم آہنگ ارتعاشات فسون کے سروں پر پیدا ہو جاتے ہوں۔ اور وہ دماغ کو منتقل ہوتے ہوں۔ اس صورت میں تسلیم کرنا پڑے گا کہ جب بہت سی مختلف امواج عمل کرتی ہیں تو ان کا متفقہ اثر دماغ کو منتقل ہوتا ہے یعنی یہ ارتعاشات باہم مل کر ایک اور ارتعاش پیدا کرتی ہیں۔ یا ممکن ہے کہ مختلف طول کی امواج حساس پردے پر پڑ کر اس کی کیمیائی تبدیلی کو تیز یا مدہم کردیتی ہوں۔ اور کیمیائی تبدیلی کا فرق حساس فسون میں تبدیلی پیدا کرتا ہو۔ جس سے احساس کا

اختلاف پیدا ہوتا ہو —

رنگ کی بصارت کے متعلق نظریوں کا موازنہ کرنے کے لیے
رنگ کے متعلق تمام محقق اسور کو پیش نظر رکھنا چاہئے ۔ مندرجہ ذیل
اسور تحقیق ہو چکے ہیں —

۱ - سرخ ، زرد ، سبز اور نیلے رنگوں کا الگ الگ اثر ہوتا ہے ۔ نیز
سفید رنگ کا اثر ان سب رنگوں سے مختلف ہوتا ہے —

۲ - ۲۰۰ کے قریب فرعی رنگ ہیں جن میں آنکھ تیز کر سکتی ہے —
۳ - مختلف رنگوں کی رویت اور تفویض اسواج کے طول پر منحصر
ہوتی ہے —

۴ - طیف کے تین رنگوں یعنی سرخ ، سبز اور آسمانی سے تمام فرعی رنگ
پیدا ہو سکتے ہیں —

۵ - آنکھ کے شبکیہ کی ساخت اور اس پر روشنی کا عمل ہمیں
بخوبی معلوم ہے —

۶ - جس چیز کا عکس پردہ شبکیہ پر پڑتا ہے وہ چیز کے غائب ہونے کے
بعد بھی ذرا سی دیر تک قائم رہتا ہے —

۷ - جب آنکھ پر ایک رنگ کی روشنی کا عمل کچھ دیر تک جاری رہے
تو وہ اس رنگ سے اُکتا یا تھک جاتی ہے —

اب میں رنگ کے احساس کے متعلق دو نظریے بیان کروں گا ۔ اور ان پر

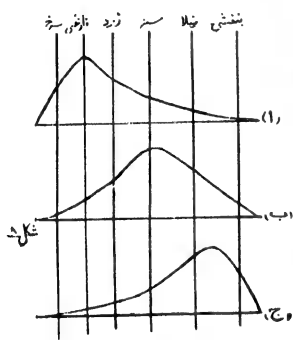
مختصر بحث کروں گا —

ہیلیم ہولٹس [Helmholtz] اس نظریہ کی بنیاد رنگی بصارت پر ہے ۔
اس کا دھویا یہ ہے کہ شبکیہ میں تین قسم کا نظریہ

کے عصبی نظام ہیں ۔ ان تینوں میں سے ایک نظام کی تحریک سے خالص سرخ

رنگ کا احساس پیدا ہوتا ہے - دوسرے نظام کی تحریک سے خالص سبز کا اور تیسرے کی تحریک سے آسمانی کا - ہر طول موج کی روشنی تینوں اعصاب میں تحریک پیدا کرتی ہے - لیکن رنگدار روشنی سے سب اعصاب کی تحریک برابر نہیں ہوتی -

لہٰذا امواج سے سرخ عصبی نظام کی تحریک خوب ہوتی ہے - لیکن سبز اور آسمانی اعصاب کی تحریک کم ہوتی ہے - درمیانی امواج سے سبز عصبی نظام کی تحریک زیادہ ہوتی ہے اور چھوٹی امواج سے آسمانی عصبی نظام کی - شکل نمبر ۸ (۱) میں مختلف رنگوں کی شعاعوں سے سرخ نظام



شکل ۸

کی تحریک کا مقابلہ کیا گیا ہے - اسی طرح شکل (ب) میں سبز عصبی نظام اور شکل (ج) میں بنفشتی عصبی نظام کی تحریک کا منحنی کھینچا گیا ہے -

ہیلم ہولتس کے نظریہ کے مطابق طبیعی رنگوں کے احساسات کی تشریح یہ ہے :

۱ - سرخ رنگ سے سرخ عصبی نظام کی تحریک زبردست ہوتی ہے - لیکن باقی دونو نظاموں کی تحریک نہایت کم ہوتی ہے - اس لیے احساس سرخ ہوتا ہے -

۲ - زرد رنگ سے سرخ اور سبز دونو محرک ہوتے ہیں - لیکن نیلے اعصاب میں تحریک بالکل خفیف ہوتی ہے - اس لیے احساس زرد ہوتا ہے -

۳ - سبز رنگ سے سبز عصبی نظام کی تحریک خوب ہوتی ہے - لیکن

باقی دونوں اعصاب کی کم - اس لیے احساس سبز ہوتا ہے -

۴ - نیلے رنگ سے سبز اور ہلکے فلفش نظام دونوں محرک ہوتے ہیں - لیکن سرخ

اعصاب پر اثر خفیف ہوتا ہے - اس لیے احساس نیلا ہوتا ہے -

۵ - ہلکے فلفش رنگ سے ہلکے فلفش نظام کی تحریک خوب ہوتی ہے لیکن سرخ

اور نیلے اعصاب پر اثر کم ہوتا ہے - اس لیے احساس ہلکے فلفش ہوتا ہے -

۶ - سفید رنگ سے تینوں قسم کے اعصاب کی تحریک برابر ہوتی ہے - اس

لیے احساس سفید ہوتا ہے -

اس نظریہ کی رو سے تین رنگوں کے احساسات اساسی ہوتے ہیں

اور ان تینوں کی مختلف ترائیب سے سب فرعی رنگ پیدا ہوتے ہیں -

اگر بالکل خاص سرخ رنگ کی امواج شبکیہ سے ٹکرائیں تو اسی رنگ

کے متعلق عصبی نظام میں زیادہ تحریک پیدا ہوگی - اسی طرح سبز اور

ہلکے فلفش رنگوں سے ان کے متعلق اعصاب اثر پذیر ہونگے - لیکن اگر رنگوں کے

کسی آمیزہ کی امواج شبکیہ پر پڑیں تو اس رنگ میں ہر عصبی نظام

کے متعلق جتنی زور دار امواج ہونگی اسی نسبت سے وہ اثر قہول کرے گا -

تینوں قسم کے اعصاب کے متعلقہ عمل سے اس خاص رنگ کا احساس

پیدا ہو جائے گا - جیسا کہ تینوں کی برابر تحریک سے سفید روشنی

محسوس ہوتی ہے -

ہیرنگ (Hering) کا اگر ہم رنگوں کے نفسیاتی آثار کو مد نظر رکھیں تو

متضاد رنگی نظریہ معلوم ہوتا ہے کہ طیف کے رنگوں میں سے چار رنگ

یعنی 'سرخ' 'زرد' 'سبز' اور 'نیل' نفسیاتی اعتبار سے ایک دوسرے سے بالکل

الگ ہیں - ان کے علاوہ طیف کے اور رنگوں کا اثر اپنے قریب کے رنگوں

کے بین بین ہوتا ہے - مثلاً نارنجی رنگ کو دیکھ کر ذہن فوراً سرخ اور

زرد رنگوں کی طرف مغتقل ہوتا ہے۔ گویا فارنچی کا احساس سرخ اور زرد رنگوں کا یک جائی احساس ہے۔ بنفشتی رنگ بعض آدمیوں کو نیلے اور سرخ کے آمیزہ کے مشابہ معلوم ہوتا ہے۔ پس ڈھنی نقطۂ نظر سے اسی رنگ تین فہیں بلکہ چار ہیں۔

ان چاروں رنگوں میں سے سرخ رنگ سبز کا انتہائی رنگ ہے اور زرد نیلے کا۔ چونکہ سرخ اور سبز کو ملانے سے سفید روشنی پیدا ہو سکتی ہے اس لئے سبز کو سرخ کا متضاد کہہ سکتے ہیں۔ اسی طرح زرد رنگ نیلے رنگ کی ضد ہے۔ اور سیاہ رنگ کو ہم سفید رنگ کا متضاد کہہ سکتے ہیں۔

ان باتوں کو مد نظر رکھ کر ہیرنگ نے متضاد رنگی نظریہ پیش کیا۔ نظریہ کا مفہوم یہ ہے کہ شبکی دماغی آلہ احساس میں تین بصری جوہر موجود ہیں۔ ان میں ایک جس کا نام سفید سیاہ بصری جوہر ہے ہر طول کی امواج سے ان کی تلوڑ کے مطابق اجزا میں تقسیم ہوتا ہے اور روشنی کی عدم موجودگی یعنی تاریکی میں پھر ترکیب پاتا ہے۔ یہ کیہیائی تبدیلیاں سفید اور سیاہ کا احساس پیدا کرتی ہیں —

دوسرا بصری جوہر جو سرخ سبز کھلاتا ہے سرخ رنگ کے اثر سے اجزا میں منقسم ہوتا ہے اور سبز رنگ کے اثر سے ترکیب پاتا ہے۔ تیسرا بصری جوہر زرد نیلا ہوتا ہے اس کا زرد رنگ سے تجزیہ ہوتا ہے اور نیلے رنگ سے ترکیب —

جب کسی قسم کی روشنی آنکھ پر عمل نہیں کرتی تو ہر بصری جوہر خود بخود اجزا میں تقسیم ہوتا رہتا ہے اور ترکیب پاتا رہتا ہے۔ گویا ہر بصری جوہر کے تجزیہ اور ترکیب میں توازن قائم رہتا ہے۔ اس لئے

کسی روشنی یا رنگ کا احساس نہیں ہوتا —

اب فرض کرو کہ سرخ اور سبز رنگوں کی روشنی ایک ہی وقت پر آنکھ پر پڑتی ہے۔ دوسرے جوہر کا سرخ روشنی سے تجزیہ ہوگا اور سبز سے ترکیب۔ پس اس حالت میں اس میں کوئی تبدیلی واقع نہ ہوگی اور وہ کسی رنگ کا احساس کرنے سے قاصر ہوگا۔ البتہ سفید سیاہ جوہر دونوں رنگوں سے متاثر ہوگا اور خاکستری رنگ کا احساس پیدا ہوگا۔

نظاریوں کا موازنہ | ۱- رنگدار جسم کے سامنے سے ہٹ جانے کے بعد بھی آنکھ پر اثر باقی رہتا ہے۔ اس مظہر کی توجیہ متضاد رنگی نظریہ سے بخوبی ہوتی ہے۔ فرض کرو کہ شبکیہ پر سرخ روشنی کا عمل ہو رہا ہے۔ اس سے دوسرے بصری جوہر کا تجزیہ ہوگا۔ اب اگر رنگ کو دور کر لیں گے بعد بھی جوہر کا تجزیہ کچھ دیر تک جاری رہے تو سرخ رنگ کا احساس ہوتا دیکھا۔ یعنی مثبت خیال پیدا ہوگا۔ اس کے بعد جوہر کو اپنی اصلی حالت پر آتا ہے۔ اس لئے اس کے اجزا کی باہم ترکیب شروع ہوگی جس سے سبز رنگ کا خیال یعنی منفی خیال پیدا ہوگا۔

۲- اگر سرخ روشنی کا آنکھ پر مسلسل عمل جاری رہے تو رفتہ رفتہ دوسرے جوہر کا کلی تجزیہ ہو جانا چاہئے۔ اور اگر وہ ساتھ ساتھ پیدا بھی ہو تو سرخ روشنی کے زیر اثر اسے غائب ہو جانا چاہئے۔ اگر ایسا ہو تو سرخ رنگ کا احساس باقی نہ رہے گا۔ بلکہ سرخ روشنی آنکھ کو خاکستری نظر آنے لگے گی۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ گو آنکھ کسی خاص رنگ سے اکتا جاتی ہے لیکن خاکستری رنگ نمودار نہیں ہوتا۔ یہ بات متضاد رنگی نظریہ کے مخالف ہے۔

۳- متضاد رنگی نظریہ کا یہ نظریہ سے بڑا اختلاں یہ ہے کہ سفید رنگ کا

احساس اور رنگوں کے احساسات کے مجھوے اثر سے پیدا نہیں ہوتا۔ بلکہ بالکل جداگانہ احساس ہے۔ جو پہلے بصری جوہر کے تجزیہ سے پیدا ہوتا ہے۔ اور تاریکی میں اس جوہر کی ترکیب ہوتی ہے۔ اب اگر کچھ دیر تک مکمل تاریکی چھائی رہے تو پہلا جوہر مکمل ہوجائے گا اور اس کی ترکیب بند ہوجائے گی۔ پس اس صورت میں تاریکی کا احساس جاتا رہے گا اور تاریکی میں خاکستری رنگ کا احساس مستقل طور پر قائم ہوجائے گا۔ مگر فی الواقع ایسا نہیں ہوتا متضاد رنگی نظریہ پر یہ بھی ایک بہت بڑا اعتراض ہے۔

رنگ کوری

بعض آدمی رنگوں کی صحیح شناخت نہیں کرسکتے۔ انہیں رنگ کور کہتے ہیں۔ ان میں سے بعض کی بینائی اس قدر کمزور ہوتی ہے کہ وہ سرخ اور سبز میں مطلق تمیز نہیں کرسکتے۔ لیکن بعض کی آنکھیں بہتر ہوتی ہیں۔ اور وہ اچھی روشنی میں کم غلطی کرتے ہیں۔ لیکن جب تھکے ہوئے ہوں یا روشنی کم ہو تو سرخ نارنجی اور سبز میں اور زرد اور سفید میں فرق نہیں کرسکتے۔

یہ نقص مردوں میں عورتوں کے مقابلے میں بہت زیادہ پایا جاتا ہے۔ تا فی صلی مرد مادر زاد رنگ کور ہوتے ہیں۔ لیکن ہزار عورتوں میں سے صرف چار اس مرض میں مبتلا ہوتی ہیں۔ بیماری سوروئی اور لاعلاج ہوتی ہے اور عورتوں کی وساطت سے پھیلتی ہے۔ لیکن عورتوں پر اس کا اثر نہیں ہوتا۔

بعض اوقات آنکھ کی بیماریوں کے اثر سے بھی رنگ کا احساس ناقص ہوجاتا ہے۔ مثلاً تمباکو اور دیگر منشیات کی سہیت سے آنکھ میں نقص پیدا ہوتا ہے۔ مگر یہ نقص مقامی ہوتا ہے یعنی شبکیہ کے خاص مقام

تک محدود ہوتا ہے۔

یہ معلوم کرنا نہایت مشکل ہے کہ رنگ کور آدمی کے احساسات کیسے ہوتے ہیں۔ کیوں کہ ہمارے پاس سوائے اس کے اور کوئی ذریعہ نہیں کہ اپنے احساسات کا ان کے ساتھ مقابلہ کریں۔ ہم نے اپنے احساسات کی بنا پر رنگوں کی طویل فہرست بنائی ہے۔ اور ان کے نام مقرر کئے ہیں رنگ کور آدمی بھی تفویہ کی کمی بیشی اور شکلوں وغیرہ کو پیش نظر رکھ کر ان سب رنگوں کے نام سیکھ سکتا ہے اور اگر تعلیم کے بعد اس سے پوچھا جائے کہ فلاں رنگ کیا ہے تو وہ اپنے اندازے سے صحیح جواب دے گا۔ یہ ممکن ہے کہ سرخ رنگ کا نابینا کبھی غلطی سے سرخ کی بجائے سیاہ لباس پہن لے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ سرخ رنگ کا اثر اس کی آنکھوں پر برائے نام ہوتا ہے۔

یہ سوال کہ آیا سرخ کور آدمی سبز رنگ کو بعینہ ویسا دیکھتا ہے

جیسا کہ ہم نہایت مشکل ہے۔

دورنگی اور سہ | اگر بہت سے رنگ کور آدمیوں کا امتحان لیا جائے اور رنگی بصارت | انہیں کہا جائے کہ رنگوں کے ذریعے طیف کے سب رنگ

پیدا کرو تو وہ دو رنگوں کو مختلف تناسب سے ملا کر اپنی بصارت کے مطابق طیف کے سب رنگ اور سفید رنگ بمالیں گے۔ پھر اگر رنگ کور آدمیوں کا آپس میں مقابلہ کیا جائے۔ تو وہ دو قسموں میں تقسیم ہو جائیں گے۔ ایک قسم کے آدمی دو رنگوں کو معین نسبتوں سے ملا کر اور رنگ حاصل کریں گے اور دوسری قسم کے آدمی مختلف نسبتوں سے دو رنگوں کو ملائیں گے تو دوسرے رنگ حاصل ہوں گے۔ امتیاز کے لیے پہلی قسم کے آدمیوں کو گر وہ الف کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے اور دوسری قسم کے آدمیوں کو گر وہ ب کے

نام سے چونکہ رنگ کو آدسی دو رنگوں سے سب رنگ پیدا کرسکتا ہے۔ اس لیے اُس کی بصارت کو دو رنگی بصارت کہہ سکتے ہیں۔ معمولی آدسی کی بصارت سے رنگی ہوتی ہے۔ نیز چونکہ رنگ کو دو رنگوں کی مناسب ترکیب سے سفید روشنی پیدا کرسکتا ہے اور انہیں رنگوں سے سب رنگ بنا سکتا ہے اس لیے اُس کی رویت کے مطابق طیف ۲ کوئی حصہ ایسا بھی ہونا چاہئے جو سفید رنگ سے ملتا جلتا ہو یعنی خاکستری ہو۔ اسے دو رنگی بصارت کا نقطہ تبدیلی کہتے ہیں۔ گروہ الف کے آدسیوں میں اس نقطے کا طول موج ۶۴۸۹ مائیکرون ہوتا ہے اور گروہ ب کے آدسیوں میں تقریباً ۶۵۰۰ مائیکرون دیا دو رنگوں کے تبدیلی نقطے نیلگوں سبز حصہ میں ہیں۔ —

طیف کے مختلف رنگوں کی تنویر الف گروہ کے آدسیوں کو معمولی آدسیوں سے مختلف نظر آتی ہے۔ اُن کی بصارت کے مطابق طیف کا سب سے زیادہ روشن حصہ کسی قدر سبز رنگ کی طرف جھکا ہوا ہوتا ہے۔ ب گروہ کو تنویر تقریباً معمولی آدسیوں کی سی نظر آتی ہے۔ —

ہیام ہولٹز کے نظریہ کے مطابق رنگ کوری کی وجہ یہ رنگ کوری کی توجیہ

مفقود ہوتا ہے۔ الف گروہ کے آدسیوں کا سرخ عصبی نظام غائب ہوتا ہے اس لیے وہ سرخ کوور کہلاتے ہیں۔ ب گروہ کا سبز نظام نہیں ہوتا اس لیے وہ سبز کوور ہوتے ہیں۔ اگر اس نظریہ کو صحیح مان لیا جائے تو بعض ایسے آدسی بھی ہونے چاہئیں جن کا آسمانی نظام نہ ہو۔ اُن کو سرخ اور سبز رنگ صاف نظر آئیں گے لیکن وہ نیلے رنگ اور زرد رنگ میں قویک تمیز نہ کرسکیں گے۔ تجربہ سے معلوم ہوا ہے کہ چند اشخاص کی

بصارت اس قسم کی ہوتی ہے۔ —

رنگ اور رنگ کی رویت سائنس اکتوبر سنہ ۲۳ ع

اس کے علاوہ یہ بھی ممکن ہے کہ بعض آدمیوں کے تینوں عصبی نظام الگ الگ نہ ہوں۔ بلکہ ایک مرکزی نظام میں شامل ہوں۔ ایسے آدمیوں کو رنگوں کی بالکل تمیز نہ ہوگی۔ وہ صرف تلویر کے اختلافات میں تمیز کر سکیں گے۔ تجربہ سے یہ بھی ثابت ہو چکا ہے کہ بعض آدمیوں کی رنگوں کی بینائی بالکل مفقود ہوتی ہے یعنی وہ مطلق رنگ کور ہوتے ہیں۔ رنگ کوری میں اور بھی کئی قسم کے اختلافات پائے جاتے ہیں۔ بعض آدمیوں کے شبکیہ کو سبز اور نیلے رنگوں سے اُقتی ہی تحریک ہوتی ہے جتنی کہ معمولی آدمیوں کو لیکن سرخ رنگ انہیں معمول سے زیادہ مدہم نظر آتا ہے۔ اسی طرح بعض آدمیوں کو سبز رنگ نظر تو آتا ہے مگر نہایت مدہم۔ البتہ سرخ اور نیلا رنگ طبیعتی نظر کے مطابق شوخ دکھائے دیتے ہیں۔ اس قسم کے آدمیوں کو جزوی رنگ کور کہتے ہیں۔ ان کے دو عصبی نظام بالکل صحیح سالم ہوتے ہیں۔ لیکن تیسرا کم حساس ہوتا ہے۔

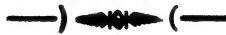
ہیرنگ کے نظریہ سے رنگ کوری کی تشریح مشکل ہے۔

رنگ کوری کا امتحان | اس امر کی خاص احتیاط رکھنی چاہئے کہ رنگ کور آدمی کو ایسے پیشوں میں ملازمت نہ دی جائے جن میں رنگوں کے ذریعے اشارات کیے جاتے ہیں۔ مثلاً ریل گاڑی کے ترائور یا گارتے اور جہازوں کے جہازران رنگ کور نہ ہونے چاہئیں۔

اس مقصد کے حصول کے لیے امیدواروں کا امتحان لیا جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کو بعض رنگ کور آدمیوں کا آسانی سے پتہ چل سکتا ہے لیکن بعض کا پوری تحقیقات کے بغیر کچھ علم نہیں ہو سکتا۔ امیدوار جو امتحان میں پاس ہونے کے لیے کوشاں ہوتا ہے عام طور پر روشنی کی

کمی زیادتی سے رنگ کا اندازہ لگایا جاتا ہے۔ مثلاً اگر سرخ کور کو سرخ روشنی دکھائی جائے تو اُسے مدہم رنگ نظر آئے گا پس وہ غالباً روشنی کی کمی کو دیکھ کر مدہم رنگ بتلا دے گا۔

رنگ کوری کے امتحان کے کئی طریق ہیں۔ محکمہ تجارت نے لالٹین کے ذریعے آنکھوں کے امتحان کا یہ طریقہ مقرر کیا ہے کہ امیدوار لالٹین کے پہلو کے دو سوراخوں کا آئینہ میں عکس دیکھتا رہے۔ اُن کی جسامت وہ ہوتی ہے جو سگنلوں کی روشنی کی معین فاصلہ سے نظر آتی ہے۔ سوراخوں کے رنگ جلد جلد بدلے جاتے ہیں اور اُن کی تلویز برابر رکھی جاتی ہے۔ پھر امیدوار سے کہا جاتا ہے کہ رنگوں کے تبدیلی ہونے پر اُن کے نام لیتا جائے۔



سر جگدیش چندر بوس

از

(محمّد عبدالحی، معلم بی۔ یس سی کلاس - الہ آباد یونیورسٹی)

”بچپن آئندہ زندگی کا نمونہ ہے“ یہی وجہ ہے کہ بچپن اور ابتدائی تعلیم سیرت لکھتے وقت بچپن کے حالات لکھنا ضروری خیال کیا جاتا ہے۔ بچپن کی معصومانہ عادتیں اور لڑکپن کی طفلانہ حرکات آئندہ ہونے والی ہستی کے کردار پر کافی روشنی ڈالتی ہیں۔ ڈی وگنی (De Vigny) کا قول ہے کہ ”اعلیٰ زندگی کیا ہے؟ یہ اوائل عمر کے چلہ سالوں میں حاصل شدہ خیال ہے۔“ یہی وجہ ہے کہ بچے کے تخیل اور مشاغل کو آئندہ زندگی کے بنانے میں کافی دخل ہے۔ علم النفس کی ترقی کے ساتھ ساتھ یہ تحقیق ہوتا جاتا ہے کہ انسان پر صرت اسات کی طبع و طینت کا ہی اثر نہیں پڑتا بلکہ بچپن کے مشاغل و اہمات اور تخیلات بھی آئندہ زندگی کے بنانے یا بگاڑنے میں کارفرما ہوتے ہیں۔

مشرقی بنگال کے دارالسلطنت تھاکہ کے مغرب میں وکرم پور ایک سرسبز و شاداب علاقہ ہے۔ اسی علاقہ کے موضع راوی کھال میں ۳۰ نومبر

سنہ ۱۸۵۸ ع کو جگدیش چندر بوس پیدا ہوئے۔ بچپن فرید پور میں بسر ہوا۔ فرید پور میں ان کے والد بھاگیاں چندر بوس تپتی مجسٹریٹ تھے۔ ۱۸۶۹ م میں جب جگدیش ۱۰ برس کے تھے ان کے باپ بردوان کے اسسٹنٹ کمشنر ہو گئے۔ جہاں وہ ۱۸۷۴ م تک اس عہدہ پر فائز رہے۔ پھر ۱۸۷۵ میں کٹوا سب تریژن کے ایگزیکوٹیو انسپر ہو گئے۔ اپنے کثرت کار اور مشاغل کی گونا گون نوعیت کے باوجود مسٹر بوس اپنے بچہ کی تعلیم سے غافل نہ رہے۔ تعلیم کی ذمہ داری کا بار اپنے ہی اوپر رکھا۔ وہ اپنے بچہ جگدیش کے لیے ایک رہنما دوست ہی نہ تھے بلکہ فلاسفر بھی تھے۔ دن بھر کی محنت کے بعد باپ شام کا کھانا کھا کر اپنے بچہ کے پاس لیٹ جاتا۔ اور ان مختلف اللوع سوالات کے جوابات دینے کی کوشش کرتا جو یہ چھوٹا مستفسر کیا کرتا۔ یہ سوال خاص ہوتا تھا۔ ”میں نے آج ایسا ایسا دیکھا۔ باپ یہ کیوں تھا۔“ غرض ہر بات کی تحقیق کرنے کے لیے بچہ ”کیوں؟ اور کیسے؟“ کی بھر مار کر دیتا۔ اس کا جواب جہاں ممکن ہوتا تھا باپ دے دیتا تھا ورنہ اکثر اس کا جواب یہی ہوتا تھا ”بیٹا! میں نہیں جانتا۔ میں نہیں بتا سکتا۔ ہماری معلومات بہت کم ہیں۔“ اس قسم کے جوابات کی وجہ اکثر تو یہ ہوتی تھی کہ بچہ ایسی باتیں جاننا چاہتا تھا جو اس کی سمجھ سے باہر تھیں۔ مگر کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ درحقیقت باپ کے دائرہ معلومات سے دور سوالات کا جواب طلب کیا جاتا تھا۔ مگر کچھ بھی ہو ان جوابات کا ایک بڑا فائدہ یہ تھا کہ بچہ کی قوت استفسار کو برقرار رکھنے کی کوشش کی جاتی تھی۔ اس کے ہر سوال کو غور سے سنا جاتا تھا اور حتیٰ الوسع جواب دینے کی کوشش کی جاتی تھی۔ برخلاف ان نا سمجھہ باپوں کے جو اس قسم کے سوالات پر

بچوں کو اکثر دانت دیتے ہیں اور اس طرح ان کی قوت استفسار کو ہمیشہ کے لیے سرد کر دیتے ہیں —

۵ سال کی عمر میں جگدیش کو اسکول بھیجا گیا۔ اگرچہ فرید پور میں ایک انگریزی اسکول بھی تھا مگر مسٹر بوس نے ان کو ورنا کیولر اسکول میں بھیجا۔ ان کا خیال تھا کہ بچہ کو پہلے اپنی مادری زبان اور اپنے ماحول سے مناسبت حاصل کرنا چاہئے۔ جگدیش کے اسکول کے ساتھی ملاحوں اور کسانوں کے لڑکے تھے۔ ان کی غریبانہ زندگی اور خانگی معاملات کے تذکروں نے جگدیش میں نہ صرف حب وطن کے جذبات پیدا کیے بلکہ ان کو ہندوستان کی غریبانہ طرز معاشرت سے بے آگاہ کر دیا۔ اب جگدیش کی باری دوسرے اسکول میں جانے کی آئی۔ اس وقت ان کے باپ کا قبائلیہ برودان بہ حیثیت اسٹنٹ کمشنر ہو چکا تھا۔ اب وہ سینٹ زیویئر (St. Xavier) اسکول میں داخل کر دیے گئے۔ یہ اسکول تقریباً انگریز بچوں کا تھا۔ وہاں جگدیش کو اجنبیت نے بہت پریشان کیا۔ دوسرے یہ کہ وہ ابھی دیہاتی زندگی سے نکل کر آئے تھے۔ شہری زندگی کے متعلق ان کو کچھ بھی تجربہ نہ تھا۔ چہیزم اور مذاق اڑانے کی مصیبت سے زیادہ پریشان کن اسکول اور بورنگ کی اجنبیت تھی —

کالج کی زندگی۔ کلکتہ | سولہ سال کی عمر میں جگدیش اسکول سے فارغ ہو کر اور انگلینڈ میں سینٹ زیویئر کالج میں داخل ہوئے۔ وہاں پروفیسر فادر

کیفلٹ کی تعلیم سے میلان طبع طبعیات کی طارت ہوا۔ اس میلان طبع نے سفر انگلینڈ کے ابتدائی خیال میں اور بھی انگلیں پیدا کر دیں اور یہ نوجوان طالب علم اپنی دنیائے خیال میں انگلینڈ اور اس کی اعلیٰ تعلیمات کی سیر دیکھنے لگا۔ مگر اس وقت مسٹر بوس کی مالی حالت ٹھیک نہ تھی۔

ان کے قرض اور مزید برآں اقساط سود کی ادائیگی نے تمام پس انداز کرنے کے مواقع کو مسدود کر دیا تھا۔ فووان بوس کو فوالحال ڈاکٹری پڑھنے کا شوق تھا اور وہ اس شوق کو سہلدر پار جاکر پورا کرنا چاہتے تھے۔ مگر باپ کی مالی حالت کسی طرح اجازت نہ دیتی تھی۔ بالآخر اس مجبوری نے بوس کو اٹاس رھنے پر مجبور کر دیا۔ اس اداسی کو ان کی شفیق اور علم دوست ماں برداشت نہ کر سکی اور باوجود تمام خاندان کی مخالفت نے اس امر پر مستعد ہو گئی کہ وہ اپنے تمام زیورات اور جواہرات فروخت کر تالے گی اور اپنے جگدیش کو تحصیل علم کے لیے انگلستان بھیجے گی۔

لندن پہونچکر بوس نے میڈیکل کالج کا پہلا سال شروع کیا۔ طبیعات و کیمیا کے مضامین ان کے لیے نئے نہ تھے مگر حیوانیات کا نیا مضمون پروفیسر رے لنکاسٹر کے ماتحت ان کے لیے نئی دلچسپی کا باعث ہوا۔ مگر جب کالج میں تشریح البسن کی تعلیم شروع ہوئی تو بوس نعشوں کو چوتا ہوا نہ دیکھ سکے چہ جائیکہ بذات خود ان کو چیرتے۔ ان کو اس کھرے کی بو سے بخار چڑھ آتا تھا۔ چنانچہ ڈاکٹر رفجر کے مشورہ پر ان کو اپنی ڈاکٹری کی تعلیم مسدود کر کے لندن کو خیر باد کہلا دیا۔ اب وہ کیمبرج سائنس کی تعلیم کے لیے گئے۔ جنوری ۱۸۸۱ ع کو کرائسٹ کالج میں داخل ہو گئے۔ یہاں تھیوڈور بک (جو بعد کو علیگڈہ کالج کے پرنسپل ہوئے) 'تاریخی تھامسن اور دیگر اہل علم سے مراسم پیدا ہو گئے۔ یہاں بوس کالج کی تعلیم کے علاوہ متعدد تجربہ گاہوں کی سیر اور بہت سے اصحاب فن و ذوق کی صحبت سے فیضیاب ہوئے۔ ان میں مائیکل فاسٹر، فرانسس بالفور اور پروفیسر ہیوجز خاص طور سے قابل تذکرہ ہیں۔

لندن اور کیمبرج کی اعلیٰ تگریوں سے مالا مال ہوکر بوس کلکتہ واپس

آئے۔ یہاں پر یسی زندگی کالج میں طبعیات کے پروفیسر مقرر ہوئے۔ مگر ان کی نظروں میں یہ انتہائے عروج نہ تھا۔ وہ جانتے تھے کہ ابھی ان کو بہت کچھ کرنا ہے۔ چنانچہ ۳۰ نومبر ۱۸۹۴ ع کی پینتیسویں سالگرہ کے بعد انہوں نے تہیہ کر لیا کہ اب وہ علمی انکشافات کی طرف متوجہ ہوں گے۔ تین ہی مہینے کے اندر بغیر کسی تجربہ گاہ کی مدد کے انہوں نے ایسے آلات بذایہ جن کی مدد سے انہوں نے بجلی کے نہایت اہم انکشافات کی تکمیل کی۔ اس میں ان کو فوری کامیابی ہوئی۔ رائل سوسائٹی نے ان کے انکشافات کی اشاعت کی اور ان تحقیقات کو آئندہ جاری رکھنے کی ہمت دلائی۔ ان کے انکشافات کو دیکھ کر لندن یونیورسٹی نے بغیر کسی امتحان کے ڈاکٹریٹ آف سائنس کی ڈگری عطا کی۔

تھام دن پڑھانے اور اس کی تیاری کرنے کے بعد جو کچھ وقت ملتا تھا اسی میں وہ اپنی تحقیقات کیا کرتے تھے اور اپنی ہی آمدنی سے اپنے تجربہ گاہ کا خرچ بھی برداشت کرتے تھے اگرچہ آخر میں ان کے کاموں کی اہمیت کا اندازہ کر کے گورنمنٹ نے تھائی ہزار روپیہ سالانہ کی امداد ان کی تحقیقات علمی کے اخراجات کے لیے منظور کر دی تھی۔

سر جگدیش چندر بوس کی تمام و کمال تحقیقات و انکشافات کی تفصیل کے لیے ایک بڑی ضخیم کتاب بھی شاید کفایت نہ کرے۔ ان کی مکمل فہرست پیش کرنا موجودہ مضمون کی وسعت سے باہر ہے۔ بہر حال ذیل میں ان کے کچھ ایسے انکشافات کا مجملہ ذکر کیا جاتا ہے جنہوں نے دنیاے علم میں ایک گراں قدر معلومات کا اضافہ کیا ہے اور جن کی وجہ سے ہمارے ملک کا ایک فرد مغربی مہذب دنیا کے طبقہ عالم کے افراد کے لیے ایک قابل رشک ہستی بنا ہوا ہے۔

بوس کے انکشافات کا اجمال یہ ہے کہ انہوں نے سب سے پہلے طبیعیات کی دنیا میں قدم بڑھایا۔ اس کے بعد ان کی توجہ نباتیات میں فعلیات (فزیاالوجی) کی جانب مبذول ہوئی۔ چونکہ وہ ایک اچھے ماہر طبیعیات رہ چکے تھے اور اس صنف میں ان کو انہماک بھی رہا تھا لہذا نباتیات میں بھی انہوں نے جو کچھ کیا وہ بہت کچھ طبیعیات کا پہلو لیے ہوئے تھا۔ اور نباتیات کا یہ وہ رخ تھا جس کی طرف ابھی بہت کم دماغ مائل ہوئے تھے۔ انہوں نے اس سلسلہ میں ایسے حیرت انگیز انکشافات کئے کہ دنیا بھر کے سائنس انگشت بدندان رہ گئی۔ انہوں نے ایسی باتوں کو آنکھوں سے دکھا دیا جن کو سن کر کسی شخص کو یہ یقین نہ آئے گا کہ وہ اصل حقیقت ہیں۔ جو باتیں اب تک افسانہ سے زیادہ اہمیت نہ رکھتی تھیں وہ دنیا نے آنکھوں سے مشاہدہ کر لیں۔

اب تک اہل مغرب کا یہ خیال تھا کہ مشرق والے صرف تخیلات کے مرد میدان ہیں۔ ان کا ذہن مابعدالطبیعیات، فلسفہ، علم ہندسہ، شاعری جیسی چیزوں سے آگے بڑھ کر تجربہ و مشاہدہ کی دنیا میں کچھ نہیں دکھا سکتا۔ مگر بوس نے دنیا کو دکھا دیا کہ اہل مشرق بھی وہ کر سکتے ہیں جس پر اہل مغرب کو ناز ہے۔ رہی یہ بات کہ مواقع کے بہترین استعمال پر کس کو اختیار ہے، اس سے انسان مجبور ہے۔ بہر حال بوس کے انکشافات میں حقیقی سائنٹفک روح کے ساتھ مشرقی تخیل کی بھی چاشنی ہے اور یہی وہ فوقت ہے جس نے بوس کو آسمان سائنس پر چاند بنا کر چھکایا ہے۔ نباتیات میں انہوں نے انکشافات کر کے بتلایا کہ درخت محسوس کرتے ہیں۔ ان کے دل ہوتا ہے۔ ان میں اعصاب کے ذریعہ بیرونی حوادث کا احساس ہوتا ہے۔ وہ بھی سنتے ہیں مگر ہم سے ۱۱ گنا تیز۔ وہ بھی دیکھتے ہیں

مگر ہم سے کہیں زیادہ - ہماری بینائی کا احساس محدود ہے - صرف ان مادوں تک جو سرخ، نارنجی، پیلے، سبز، نیلے، اور اورے رنگ کی شعاعوں کو منعکس کرسکیں - اگر روشنی کا طول موج (Wave length) ایک مقررہ مقدار سے چھوٹا ہوتا ہے تو ہم دیکھنے سے قاصر رہتے ہیں - اگر ہم بالابالغشعاعوں کو دیکھنا چاہیں تو طاقثور سے طاقثور خورث بین بھی ہم کو جواب دیدے گی - مگر درخت ان شعاعوں کو بھی محسوس کرتے ہیں - ہمارا احساس اثیری تہوج (Ethereal wave) سے متاثر نہیں ہوتا حالانکہ درخت اس اثیری تہوج کو بھی محسوس کرتے ہیں جو لاسلکی کے باعث پیدا ہو - ہم حواس خمسہ کے علاوہ ایک چھٹی حس 'ادراک' پر نازاں ہیں - درخت بھی اس حس سے محروم نہیں - ہمارے رگوں میں خون ڈرتا ہے جس سے قلب کی حرکت نبض کے ذریعہ معلوم ہوتی ہے - درختوں کی بھی "نبض" دیکھ کر ان کے "قلب" کی ضربات کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے -

اس کے علاوہ بوس نے درختوں کی رفتار نمو (Growth) کو دریافت کیا - انہوں نے بتلایا کہ درختوں میں نمو کی مقدار گھونگے (Snail) کی رفتار کا ۶ ہزار واں ($\frac{1}{6000}$) حصہ ہے - عام طور پر درختوں کے بڑھنے کی مقدار کا اوسط یہ ہے کہ وہ ایک ملین سکینڈیا ۶۵۷۳۰۰۰ دن میں ایک انچہ بڑھتے ہیں - مگر بانس کا درخت سب درختوں سے جلد بڑھنے والا ہے - وہ صرف ۲۴ گھنٹہ میں ۹ انچہ سے لیکر ۱۲ انچہ تک بڑھتا ہے -

بوس کے حیرت افزا الکشافات کا اختتام صرف درختوں میں حس دریافت کرنے پر نہیں ہوتا بلکہ انہوں نے دکھلایا کہ دھاتوں میں بھی حس موجود ہے - دھات میں بھی "تازگی" "افسردگی" اور "موت" کی

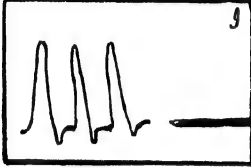
کیفیات پائی جاتی ہیں۔ دھات زھر کے اثر سے مر جاتی ہے اور اگر عین وقت پر اس کو کوئی دوا ایسی دیدی جائے جو زھر کے اثر کو زائل کر دے تو پھر سے ”زلدہ“ ہو جاتی ہے اور اگر دیر تک زھر کا اثر رہے تو پھر کوئی دوا جلانے میں کار گر نہیں ہوتی۔

یہ باتیں پڑ کر ایک اجنبی کا حیرت و استعجاب اس درجہ بڑھے گا کہ وہ کسی طرح بھی ان ناممکنات (اپنے ذہن و علم کے موافق) کو ماننے کے لیے تیار نہ ہوگا۔ وہ ان کو صرف ایک افسانہ سمجھے گا۔ مگر سائنس کی دنیا وہ ہے جہاں کوئی بات اس وقت تک کہی نہیں جاتی جب تک کہ وہ دکھلائی نہ جاسکے۔ یہاں واقعات پر اعتبار مشاہدات کے ذریعہ ہوتا ہے۔ صرف تخیلات کی مدد سے کسی امر کو نہیں منوایا جاسکتا۔ چنانچہ بوس کے انکشافات کا بیان بھی اس عام قاعدہ سے علیحدہ نہیں۔ اس کے بیان کے لیے بھی تعارُب و مشاہدات شاہد ہیں۔ اگرچہ ہمارے موجودہ مضموں کی وسعت اس امر کی حامل نہیں ہوسکتی کہ ہم تمام و کمال انکشافات و تجربات کی ہملی اور نظری تفصیل پیش کر کے قارئین کو مطمئن کرسکیں تاہم کچھ مختصر اور عام فہم تشریح پیش کی جاتی ہے جس سے ان ”معجزات“ کے متعلق امکان کا گمان ہوسکے۔

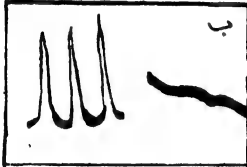
پودوں اور دھاتوں	پودوں اور پودوں میں حس دریافت کرنے کے لیے
میں حس	بوس نے جو آلہ استعمال کیا اس کی ساخت یا عمل کی

تشریح یہاں بے محل ہوگی۔ صرف یہ جان لینا کافی ہے کہ نامیاتی اور غیر نامیاتی اشیا میں برقی رو سے متاثر ہونے کی مقدار دریافت کرنے کے لیے بوس نے ایک خاص قسم کا رو پیما (Galvanometer) بنایا تھا جس کی سوئی کی حرکت سے کافذ پر جو خطوط بشکل منحنی ملتے تھے ان سے اس

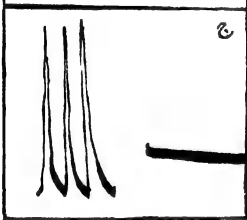
قادر کا پتا لگتا تھا جو کہ اشیاء زیر عمل میں برقی رو کے لیے موجود تھا۔ چنانچہ اس اثر کو مختلف اشیاء میں مختلف صورتوں میں مشاہدہ کیا گیا اور اس سے عجیب و غریب نتائج اخذ کئے گئے۔



اس سے پہلے برقی رو کا اثر حیوانی اعصاب میں دریافت ہو چکا تھا اور اس کا منحنی بھی دریافت ہو گیا تھا۔ بوس نے انہی اصولوں میں کچھ ردوبدل کر کے برقی رو سے متاثر ہونے کا منحنی پودوں میں دریافت کیا۔



پہلے اس نے اس رو سے متاثر ہونے کی مقدار کو باغ میں اگنے والے پودوں میں دریافت کیا پھر ان ترکاریوں میں جو بازار میں دستیاب ہو سکیں۔ ایک مرتبہ ایک ترکاری برقی رو سے بالکل متاثر نہ ہوئی۔



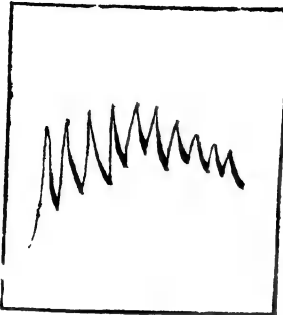
دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ شہر لاتے وقت اس پر سخت برت باری ہوئی تھی۔ دوسری مرتبہ جب اسی ترکاری کو قازہ حالت میں دیکھا گیا تو وہ

شکل نمبر ۱ کھڑے خطوط زہر دینے سے قبل کی حالت بتاتے ہیں اور مسلسل بڑے خطوط زہر دینے کے بعد جس کے بالکل مردہ ہوجانے کی کیفیت بتلاتے ہیں۔

الف - حیوانی اعصاب پر زہر کا اثر
ب - پودوں پر زہر کا اثر
ج - دھاتوں پر زہر کا اثر

حسب معمول رو سے متاثر ہوتی تھی۔ اس اثر کی مقدار اس منحنی سے معلوم ہوتی تھی جو رو پیما خود بخود کاغذ پر بنا سکتا تھا۔ اب اس نے دھاتوں پر تجربہ کیا اور ان کا بھی منحنی معلوم کیا۔ اب حیوانی اعصاب، پودوں اور دھاتوں کے منحنی جب ایک دوسرے

کے مقابلے میں لائے گئے تو وہ اس درجہ ایک دوسرے سے ملتے جلتے تھے کہ ان میں امتیاز دشوار تھا (دیکھئے شکل نمبر ۱)۔ گویا کہ حیوانات، نباتات اور فلزات برقی رو سے مساوی مقدار میں متاثر ہو سکتی تھیں۔ یا بالفاظ دیگر مادہ



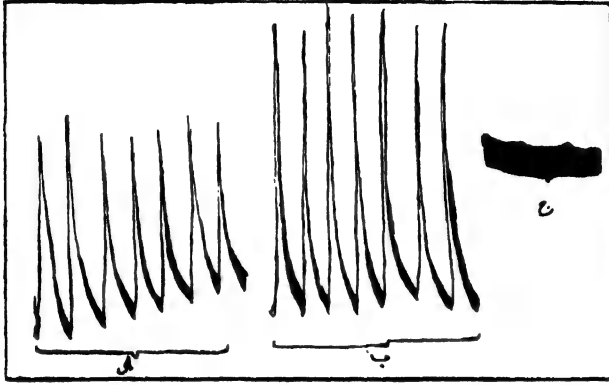
کی یہ تیزوں شکلیں برقی رو کے احساس میں برابر تھیں —

اب ایسے پودوں یا دھاتوں پر تجربہ کیا گیا جو مسکرات، مغداس یا زہر کے زیر اثر رہ چکی تھیں۔ چنانچہ کلو رو فارم (Chloroform) کے اثر سے پودوں میں برقی رو سے متاثر ہونے کی قوت

شکل نمبر ۲ - دھات (رائٹ) میں برقی رو سے متاثر ہونے کا منحنی - خطوط کے بتدریج گہٹنے سے دھات کے مضبوط ہونے کا پتہ لگتا ہے —

اسی طرح جاتی رہی جس طرح جانداروں میں —

اور جب ان پودوں کو دیر تک تازہ ہوا میں رکھا گیا تو پھر ان میں وہ احساس کی قوت عود کر آئی۔ پودوں پر زہر کا اثر بھی دیکھا گیا۔ زہر کے اثر سے پودوں میں برقی رو کو محسوس کرنے کی قوت رفتہ رفتہ کم ہو کر بالکل غائب ہو گئی گویا کہ وہ زہر سے مر گئے۔ اب بوس کو ایک بالکل نئی بات سوچی۔ اس نے وہ کیا جس کی طرف آج تک کس کا دماغ گیا ہی نہ تھا۔ اس نے دھات کو زہر دیا یعنی جست، تانبہ، پیتل، پلیٹینم وغیرہ دھاتوں کو مختلف زہروں میں رکھا۔ اور پھر جب ان میں برقی رو سے متاثر ہونے کی مقدار کا اندازہ لگایا تو ایک بڑی حیرت انگیز حقیقت کا انکشاف ہوا۔ کیونکہ دھاتوں نے بھی زہر سے وہی اثر لیا جو حیوانی اعصاب یا پودوں نے لیا تھا اور معلوم ہوا کہ زہر کے طویل اثر سے دھاتیں بھی گویا مرجاتی ہیں۔ زہر دی ہوئی دھاتوں کا منحنی بھی وہی تھا جو زہر دیے ہوئے حیوانی اعصاب یا زہر دیے ہوئے پودوں کا تھا۔ دھاتوں پر آکزیلک ترشہ (Oxalic Acid) کا زہریلا اثر بہت تیز ثابت ہوا —



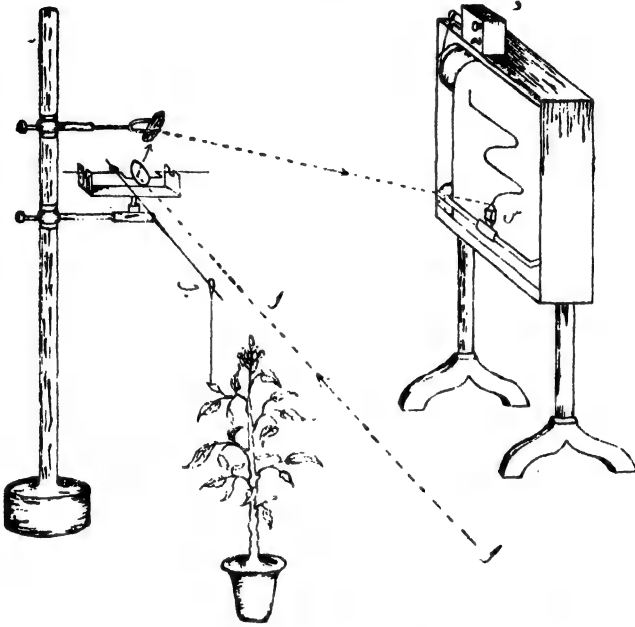
شکل نمبر ۳ مخطوطا ا و ب کے مقابلے سے پتہ لگتا ہے کہ دھاتوں کو تھوڑا سا زھر دینے کی وجہ سے کس طرح ان میں برقی رو سے متاثر ہونے کی قوت بڑھ جاتی ہے۔ حالانکہ زھر کی زیادہ مقدار سے وہ بالکل بے حس یا مردہ ہو جاتی ہیں۔

بوس نے ۱۰ مئی ۱۹۰۱ ع کو رائل انسٹی ٹیوشن میں ان تجارب کی تشریح کرتے ہوئے جو کچھ کہا اس کا خلاصہ ذیل میں پیش کیا جاتا ہے —

”..... ان مختلف تجارب سے ہم نے یہ معلوم کر لیا کہ جس طرح جانداروں اور درختوں میں قہکوت کے انٹو سے (درختوں میں عموماً شام کو) برقی رو کا احساس کم ہو جاتا ہے اسی طرح دھاتوں میں بھی کام کرتے کرتے اضافہ حلال کے آثار پیدا ہو جاتے ہیں۔ جس طرح درختوں اور جانداروں کو تقویت بخش غذا دیدیئے سے یہ احساس بڑھ جاتا ہے اسی طرح دھاتوں میں بھی یہ قوت تیز ہو جاتی ہے اور جس طرح حیوانی اعصاب اور پودے زھر کے اثر سے مر جاتے ہیں اسی طرح دھاتیں بھی زھر کے اثر سے مردہ ہو جاتی ہیں اور برقی رو سے کچھ

بھی متاثر نہیں ہوتیں کیا ان مشاہدات سے ہم کو یہ نہیں معلوم ہوتا کہ مادہ کی کچھ خصوصیات عام ہیں؟ کیا ہم ان سے یہ نہیں معلوم کرتے کہ حس جالدار اور بے جان دونوں میں سوجود ہے؟ کیا اس حقیقت سے اس خیال کی تصدیق نہیں ہوتی کہ تمام کائنات کے پس پردہ صرف ایک ہی 'حقیقت' کام کر رہی ہے اور ایک ریت کا چمکتا ہوا ذرہ اور دنیا کو روشن کرنے والا آفتاب ایک ہی 'نور' کے پرتو ہیں۔ اب زندگی میں پہلی مرتبہ مجھے اس دھوی کی حقیقت کا اعتراف کرنا پڑتا ہے جو میرے اساتذہ نے تیس صدیوں پیشتر دریائے گلگا کے کنارے کیا تھا۔ "وہ لوگ جو کائنات کی گونا گوں فورنگیوں میں صرف ایک ہی ہستی کا جلوہ دیکھتے ہیں وہی درحقیقت ابدی صداقت کے عارت ہیں اور کوئی نہیں! اور کوئی نہیں!!"

پودوں میں تاثر | پودے بیرونی حوادث یا اپنی ہی توانائی (Energy) سے بھی متاثر ہوتے ہیں۔ زندہ اجسام میں اس قسم کے تاثر کا پتہ نبض کی رفتار سے لگایا جاتا ہے۔ نبض کی رفتار کی نوعیت سے اس طاقت کی کمی و بیشی کا اندازہ ہوتا ہے۔ نبض کا سست ہونا طاقت یا بالفاظ دیگر حرارت غریزی کے کم ہونے کی علامت ہے۔ پودوں میں بھی اس حرارت غریزی کے کمی و بیشی کا اندازہ ان کی "ضربات نبض" سے ہو سکتا ہے۔ بوس نے ان ضربات نبض کو ٹھیک ٹھیک معلوم کرنے کے لیے ایک آلہ ایجاد کیا (دیکھیے شکل نمبر چار)۔ اس کا نام نبض نگار Pulse Recorder رکھا۔ اس کے عمل سے جو نتائج اخذ کیے گئے وہ بے افتہا

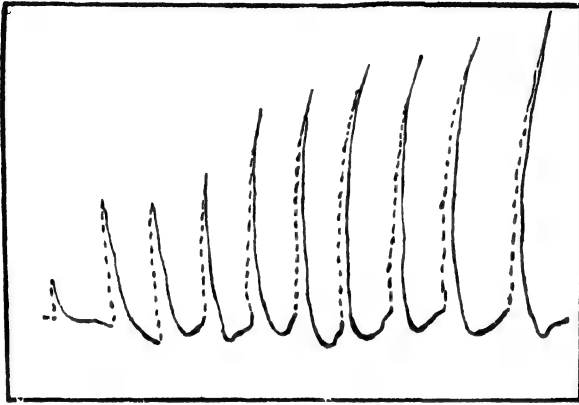


شکل نمبر ۴ - " نبض نگار " (Pulse Recorder)

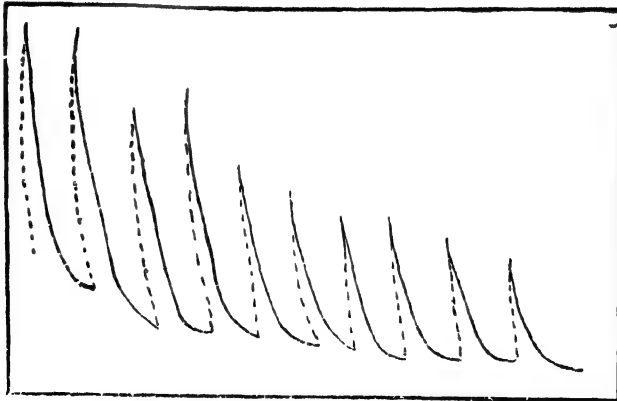
- ۱ - روشنی کی شعاع جو دو آنٹوں سے منعکس ہو کر کاغذ پر پڑ رہی ہے -
- ب - لیور - جو حرکت کرنے والے درخت کی پتی سے ملا ہوا ہے -
- س - روشنائی کا ذخیرہ جس میں ایک باریک ٹوک کا قلم لگا ہے اور جو منعکس شعاع کے منصفی کو کاغذ پر بنا تا رہتا ہے -
- د - گھڑی کی طرح ایک مقررہ رفتار پر خرد بخود چلنے والی مشین - جو ان بیلبوں کو گھماتی رہتی ہے جن پر کاغذ لپٹا ہوا ہے -

حیرت انگیز ثابت ہوئے۔ اس آلہ نے ظاہر کیا کہ درخت جب کام کرنے کے بعد تھک جاتے ہیں تو کس طرح ان کی ضربات نبض مدہم ہوتی چلی جاتی ہیں۔ (یہاں درختوں کے کام سے مراد دن بھر پتیوں کے ذریعے اپنے ایسے غذا بہم پہنچانا ہے) اور جب ان درختوں کو غذا یا دوا کے ذریعہ تقویت پہنچائی جاتی ہے تو کس طرح ان میں زندگی اور طاقت کے آثار پیدا

ہو جائے ہیں۔ (اشکال نمبر ۵ و ۶ ملاحظہ ہوں)۔

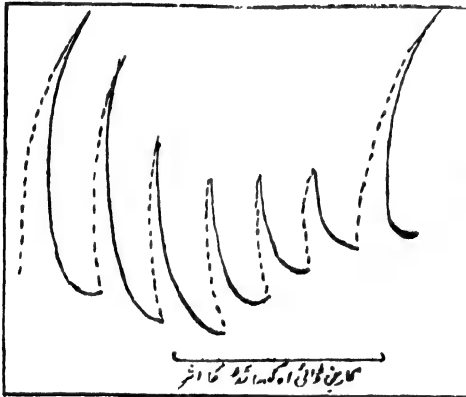


شکل نمبر ۵ - درخت میں مقدار حس کا مسلسل اضافہ - دیکھئے حس کے اضافہ کے ساتھ نبض پیماس کس طرح ضربات نبض کے بڑھنے کا پتہ دیتا ہے —



شکل نمبر ۶ - درخت میں مقدار حس کا مسلسل گھٹناؤ - دیکھئے تھکاوٹ کے آثار کو نبض پیماس کس طرح ظاہر کرتا ہے -

اب تک سائنس دانوں کا خیال تھا کہ حیوانات کی موت نباتات کی زیست کا باعث ہے کیونکہ اجسام حیوانی کے گلنے سڑنے سے کاربن ڈائی آکسائیڈ کیس پیدا ہوتی ہے جو پودوں کی غذا ہے۔ مگر ہوس نے دریافت کیا کہ اگرچہ کاربن ڈائی آکسائیڈ پودوں کی غذا ہے مگر جس طرح کاربن ڈائی آکسائیڈ کے زیر اثر جانوروں کا دم گھٹنے لگتا ہے اسی طرح پودے کی ضربات نبض بھی بہت مدہم ہوکر اس کے ”دم گھٹنے“ کا پتہ دیتی ہیں۔ اور جب پھر تازہ ہوا بہم پہونچائی جاتی ہے تو یہ ضربات پھر اپنی اصلی حالت پر آ جاتی ہیں۔ (شکل نمبر ۷ دیکھئے)۔ اوزون (Ozone) کے ساتھ ضربات



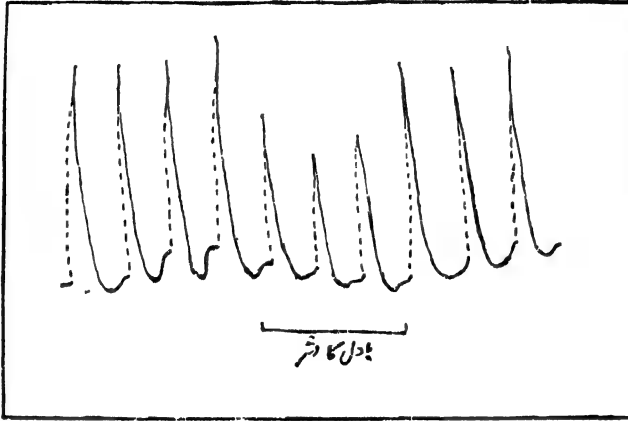
نبض کا شمار اور بھی بڑا جاتا ہے۔ پودوں میں غلیظ کیسوں سے متاثر ہونے کی قوت بہت تیز ہے۔ سلفیورائیڈ (Sulfurated hydrogen) کا خفیف جزو بھی پودوں کے لیے مہلک ہے۔

پودے روشنی سے بھی متاثر ہوتے ہیں۔ سورج کی روشنی کی زیادتی سے ان کی ضربات نبض تیز ہوتی ہیں اور اس کی خفیف سی کمی سے بھی ان ضربات میں کمی ہو جاتی ہے۔ روشنی کے احساس میں پودے اس قدر زود حس ہیں کہ اگر ہادل کا ایک ٹکڑا ان کے اوپر سے گذر جائے تو وہ روشنی کی اس کمی سے بھی متاثر ہوتے ہیں اور ہادل آجائے سے ان میں

شکل نمبر ۷- کاربن ڈائی آکسائیڈ کے زیر اثر ضربات نبض میں اضافہ

دیکھئے - پھر تازہ ہوا ملنے سے ضربات کس قدر بڑا جاتی ہیں

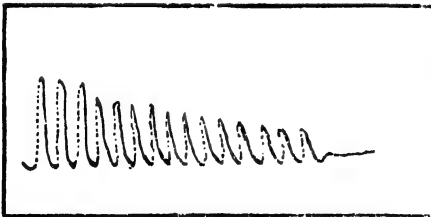
اضہلال کے آثار پیدا ہو جاتے ہیں (شکل نمبر ۸ دیکھئے)۔ اگر درخت زیادہ



شکل نمبر ۸ - بادل آنے سے شربات نبض میں کمی

دیر تک تاریکی میں رہے تو رفتہ رفتہ وہ اپنے اضہلال کو کم کر دیتا ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے کہ ہم یکبارگی اندھیرا چھا جانے سے کچھ نہیں دیکھ سکتے مگر کچھ دیر کے بعد اندھیرے میں بھی کچھ نظر آنے لگتا ہے۔

درختوں کو زخم کا بھی احساس ہوتا ہے۔ اس احساس کا پہلا اثر نمو پر پڑتا ہے۔ اس کا ذکر کیا جا چکا ہے کہ بوس نے ایک آلہ نمونگار (Crescograph) درختوں کی مقدار نمو ناپنے کو بتایا تھا۔ چنانچہ اس



نے ایک ایسے درخت میں جس کا نمو اس آلہ کے ذریعہ ناپا جا رہا تھا ایک سوئی چھو کر دیکھی تو معلوم ہوا کہ یکبارگی اس کی رفتار نمو چوتھائی رہ گئی اور پھر

شکل نمبر ۹ - درخت کی موت کے قریب شربات نبض

کا بتدریج مدہم ہونا اور بالآخر ختم ہو جانا —

۴: کہنتہ لگے۔ پھر جب چاقو سے زخم لگا کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ رفتار نہو بالکل ختم ہو گئی اور بہت دیر کے بعد درخت دوبارہ اپنے تہل نہو کو جاری کر سکا۔

اس سوال کا جواب دینے میں کہ کنول (نیلوفر) رات درختوں کا سونا کو کہوں جائتا ہے اور دن کو کہوں سوتا ہے شاعر سائنس دان پر سہقت لے گیا۔ اس کے خیال میں کنول کے رات کو جائنے کا سبب یہ ہے کہ ”وہ چاند پر عاشق ہے اور جیسے ہی کہ اس کے محبوب کی پہلی کرن اس کی پتیوں پر پڑتی ہے وہ آنکھیں کھول دیتا ہے۔ اور پھر تمام رات اس کے دیدار سے شغل رکھتا ہے۔ اور صبح کو جیسے ہی سورج کی تند و تیز شعاعیں اس کے رخساروں پر پڑتی ہیں وہ اپنی پتیاں بند کر کے سو رہتا ہے۔“ گو شاعر نے پھل کے کھلنے اور بند ہونے کی وجہ بتائی مگر اس نے یہ نہ کیا کہ کسی اندھیری رات کو چراغ لیکر جاتا اور دیکھتا کہ چاند کی عدم موجودگی میں بھی کنول کی پتیاں کھلی ہوئی ہیں۔ شاعر سے ایسی امید کرنا ہی حماقت ہے۔ وہ صرف بیان پر قادر ہے توجیہ پر نہیں۔ کسی بیان کی صحت کے لیے مشاہدات و تجربات سے ثبوت حاصل کرنا سائنس دان کا حصہ ہے۔ پھر یہ کہ کنول سورج کی روشنی کے اثر سے بند بھی نہیں ہوتا۔ کیونکہ ایسے کنول بھی مشاہدہ کیے گئے جو ۱۱ بجے دن تک کھلے رہتے ہیں۔ لہذا کنول کھلنے اور بند ہونے کی شاعرانہ توجیہ تو پادار ہوا تھی ہی مگر ابھی تک کسی سائنس دان نے بھی کوئی صحیح وجہ بیان نہ کی تھی۔ اس مسئلہ پر سب سے پہلے برس نے روشنی ڈالی۔

بوس نے خیال کیا کہ شاید درجہ حرارت کی کمی بیشی کے ساتھ،

کنول کھلتا بند ہوتا ہے۔ چنانچہ اس نے پھول کے کھلنے اور بند ہونے کی رفتار کو اہلک منحنی واضح کیا۔ یہ منحنی ۲۴ گھنٹہ کا بنایا گیا۔ اور ساتھ ہی ساتھ دوسرا منحنی ۲۴ گھنٹہ میں درجہ حرارت کی تبدیلی کا بنایا گیا۔ اب جو دونوں منحنی مقابلہ میں لائے گئے تو معلوم ہوا کہ واقعی کنول کا کھلنا اور بند ہونا درجہ حرارت کے تغیر پر منحصر تھا۔

شام کے ۶ بجے کے بعد جب درجہ حرارت گرتا گیا کنول کا پھول کھلتا گیا۔ یہاں تک کہ رات کو ۱۰ بجے پھول پورا کھل گیا۔ اور جب صبح کو ۶ بجے سورج کی گرمی سے درجہ حرارت بڑھنا شروع ہوا تو پھول بند ہوتا گیا یہاں تک کہ ۱۱ بجے جب خوب گرمی کا وقت ہو گیا تو پھول بالکل بند ہو گیا۔

ہلال کے ایک ضلع فرید پور میں ایک خاص قسم کا تار کا درخت پایا جاتا ہے۔ اس کی خاصیت ہے کہ شام کو غروب کے وقت جھک کر زمین پر آ رہتا ہے۔ گویا کہ سجدہ کر رہا ہے۔ صبح ہوتے ہی پھر سیدھا کھڑا ہو جاتا ہے۔ یہ درخت اپنے اس ”عمل عبادت“ کو روزانہ دہراتا ہے۔ اس عجیب و غریب خاصیت نے اس درخت کو اس علاقہ میں خاص اہمیت دے دی ہے اور یہ زائرین کا خاص سرج ہو گیا ہے۔ اس تار کا علمی نام *Phoenixdactylifera* ہے۔ اس کا قلم تقریباً ۵ — گز لمبا اور ۱۰ — انچہ سوتا ہے۔

اسی قسم کا ایک واقعہ نور پور (انگلینڈ) کے قریب بھی مشاہدہ کیا گیا۔ بوس کے ایک دوست نے وہاں کے ایک اخبار (سورخہ ۳۱ دسمبر ۱۸۱۱ ع) کا مندرجہ ذیل اقتباس ان کے پاس بھیجا —

”..... یہاں بیکہ مجنوں (Willow) کا ایک درخت ہے جو بہت

لانگبا ہے اور جس کے تلے کا محیط تقریباً ۳ گز ہے..... دیکھا گیا

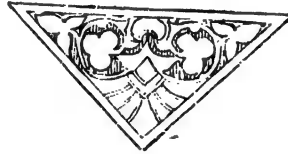
ہے کہ یہ درخت رات کو تمہم کا تمام زمین پر دراز ہوجاتا ہے اور صبح کو پھر سیدھا کھڑا ہوجاتا ہے۔ اگرچہ یہ عجیب بات معلوم ہوتی ہے مگر یہ ایسا واقعہ ہے جس کو صدہا آدمیوں نے تعجب سے دیکھا ہے۔“

ان عجیب و غریب واقعات کی طرف بوس کی توجہ بھی مبذول ہوئی۔ انہوں نے بہت سے مشاہدات کرنے کے بعد اس واقعہ کی توجیہ کی۔ مگر سائنس دانوں نے اس توجیہ کو ان مشاہدات و تجارب کا درست نتیجہ نہ ٹھہرایا جو انہوں نے اس سلسلہ میں کئے تھے۔ چنانچہ یہ بھید اب تک بھید ہی رہا اور کوئی مطمئن کن وجہ اس امر کی نہ بتائی گئی۔

بوس ریسرچ | بچپن سال کی عمر پوری ہونے کے بعد بوس کو سنہ ۱۹۱۳ ع انسٹیٹیوٹ میں پریسی ڈنسی کالج کی خدمات سے سبکدوش ہوجانا چاہیے تھا۔ مگر حکومت بنگال نے بوس کی شخصیت اور ان کے ان احسانات کا خیال کرتے ہوئے جن سے کالج زیور بار تھا ان کو سنہ ۱۹۱۵ ع تک کالج سے علیحدہ نہ ہونے دیا۔ کالج سے علیحدہ ہوکر اگرچہ عمر کا تقاضا تھا کہ بوس اپنی باقی ماندہ زندگی سکون و آرام سے گزارتے مگر مدت سے ان کے دماغ میں ایک ایسا دارالتجربہ قائم کرنے کا خیال تھا کہ جس میں ہندوستانی طلبہ تحقیق و تدقیق کرسکیں۔ اس خیال نے ان کو نہ چھلنا نہ بیتھنے دیا۔ آخر کار انہوں نے اپنی انسٹیٹیوٹ ساگرہ ۳۰- نومبر سنہ ۱۹۱۷ ع کو اس دارالتجربہ کا افتتاح کیا۔

دارالتجربہ کی شافدار عمارت عہد اسلامی سے قبل کے ہندوستانی طرز پر بنی ہوئی ہے۔ جس میں جا بجا فن و حرفت کے اعلائی نہونے موجود ہیں۔ عمارت کے سامنے ایک چھوٹا سا خوشنما باغیچہ ہے جس میں

زیادہ تر حساس (Sensitive) پودے لگائے گئے ہیں۔ مہارت میں ایک وسیع ہال ہے جہاں شیشہ کی ہاریوں میں وہ آلات قرینہ سے رکھے ہوئے ہیں جن سے ہوس نے طبیعیات اور نباتات میں تحقیقات کیں۔ باقی ماندہ مہارت مختلف شعبہ جات تحقیق پر مشتمل ہے۔ مہارت میں ایک بڑا لکچر ہال ہے جس میں تیرہ ہزار (۱۵۰۰) سامعین کی گنجائش ہے۔ یہاں ہندوستان کے ہر طبقہ کے طلباء مختلف شعبہ جات سائنس میں تحقیقات کرتے ہیں۔ اور وہ وقت کچھ دور نہیں جب کہ ہوس کے لگائے ہوئے اس ”پودے“ سے ایسے ”پھل پھول“ پیدا ہوں کہ جن سے ہندوستان صرف علمی میں پھر نمایاں حیثیت حاصل کر سکے۔



ہوا

از

(جناب رفعت حسین صدیقی صاحب - ایم - ایس - سی

(علیک) ریسرچ انسٹی ٹیوٹ طبیبہ کالج دہلی)

ہوا کے راز نے صدیوں سے شعرا اور حکما کو معجز حیرت بنا رکھا ہے ۔
یہ امر واقعہ کہ ہم ایک نظر ذہ آنے والی شے کے بھر پے کنار میں رہتے
ہیں اس ابتدائی زمانہ سے معلوم ہے ، جب کہ انسان عالم وجود میں آیا ،
اور اس نے ہوش سمجھایا اور بود و باش اختیار کی ۔ احبق ترین وحشی
انسان بھی اس کو بغیر محسوس کیے نہ رہ سکتا تھا کیونکہ اس نے اس شے
کی قوت و توانائی کا مشاہدہ بڑی بڑی آندھیوں اور طوفان میں کیا جو
بڑے بڑے درخت کو خس و خاشاک کی طرح پھیٹک دیتے ہیں ۔ اور
جن میں جنگل کے جنگل ایک آن میں تباہ و برباد ہوجاتے ہیں ۔ لیکن وہ
اس قوت عظیم کو اپنے معبودوں یعنی دیوتاؤں ، شیطانوں اور بہت پریت
کی غضب آلودہ جلوہ آریاں تصور کرتا تھا جو آسمان پر اور فضاء میں سیر و
تفریح کرتے پھرتے ہیں اور جن کی ناراضگی قضا و بربادی کا باعث ہوتی
ہے ۔ وہ ہوا کے تیز جھونکوں کو دیوتاؤں کی چہل پھل ، درختوں کی
سنسناہٹ اور شائیں شائیں کو اُن روحوں کی آواز و زاری ؛ نالہ و شیون خیال

کرتا تھا جو تکلیف و مصیبت میں تھیں۔ اس کے نزدیک ارض و فلک سرہستہ راز تھے۔ کوئی جگہ خوت و خطرہ سے خالی نہ تھی۔ ہر جگہ ایک نیا طلسم تھا —

آفرینش عالم کو ایک زمانہ گذر چکا ہے جس کا تعین بھی ممکن نہیں۔ تہذیب بھی ہے، تمدن کو بھی فروغ ہے، لیکن فی زمانہ بھی عوام کی قوہم پرستی بڑبان حال بیان کر رہی ہے کہ اولد سرلابیہ۔ ہمارے مورث کے ضمیر میں جن اور بھوتوں کا ایسا خوف شامل ہوا تھا جو نہ ٹکلتا تھا اور نہ نکلا۔ ترکہ جیسی مہم ہم بھی اس سے مستفیض ہوئے۔ باوجود روشن دماغ حالی خیال ہونے کے ہم ان کا شفاقت، نظر نہ آنے والا، غیر مادی وجود تصور کرتے ہیں۔ یہ وجود ہمیشہ شب کیسویے دراز کی تنہائی و تاریکی میں ہوا کے تیز و تند طوفانوں میں، بجلی کی چمک، بادل کی گرج، موسلا دھار پانی میں جس وقت سناتا چھایا ہوتا ہے اور ایک عجیب ہوکا عالم ہوتا ہے نمودار ہوتا ہے۔ اور پھر لطیف ہوا میں غائب ہو جاتا ہے۔ ان خیالات کی کچھ حقیقت ہو یا نہ ہو لیکن اتنا ضرور ہے کہ یہ زمانہ جاہلیت کی یادگار ہیں اور نسل بعد نسل سینہ بہ سینہ منتقل ہوئے ہیں —

یونانیوں کے دیوتا کیا ہیں، جو اپنی قوت کو بادلوں، بارش، ژالہ باری اور برق و رعد کی شکل میں پیش کرتے ہیں۔ وہ صرف اسی ہوا کی پرستش کی یادگار ہیں۔ سائنس اور سرد شمالی خطہ کے جنگجو اور جری باشندے تمام قدرتی مظاہر کو دیوتاؤں کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ چنانچہ حیرت انگیز افق شمالی کو جو گرج، چمک اور زلزلہ کے ساتھ آسمان کو روشن کر دیتا ہے دیوتاؤں کی قوت کا معجزہ قرار دیا گیا —

" The light thou beholdest
 Stream through the heavens
 In flashes of crimson
 Is but my red beard
 Blown by the night wind
 Affrighting the nations !
 Mine eyes are the lightning
 The wheels of my chariot
 Roll in the thunder ;
 The blows of my hammer
 Ring in the earthquake . "

یہ وہ الفاظ ہیں جو بادشاہ الٹ (Olaf) کے قصہ میں تھور (Thor) دیوتا کی طرف منسوب کئے جاتے ہیں۔ اسی طریقہ پر کوہ جدوی کی باطل پرستی کے مطابق بعلی کی کوک دیوتاؤں کی گاریوں کے پہیوں کی کڑکڑاہٹ تصور کی جاتی ہے جو آسمان پر نہایت تیزی سے چلتی ہیں اور انہیں کی رگڑ سے آسمان کے فرش پر بعلی کی خیرہ کن چمک پیدا ہوتی ہے —

دنیا میں حیات و مہات کا سلسلہ ایک غیر متعین زمانہ سے جاری ہے۔ یونانیوں کا فلسفہ، روما کا دیوبہ، مصریوں کا عروج، عربوں کا اقتدار، صرف ماضیء قریب کی یادگار تصور کرنا چاہیے۔ شاید ہی کوئی زمانہ ایسا گذرا ہو جس میں کم و بیش علم و حکمت کا چرچہ نہ رہا ہو لیکن ہوا کی ماہیت کا راز کبھی نہ حل ہو سکا —

ابتدائی زمانہ میں یونانیوں میں یہ خیال پیدا ہوا کہ ہوا لطیف اور نظر نہ آنے والی شے ہے۔ اس کی ساخت جوہری ہے۔ وٹروویس (Vitruvius) نے

یقین کے ساتھ بیان کیا کہ اس میں وزن ہے۔ ارسطو نے بھی ہوا کا وزن ثابت کرنے کی غرض سے خالی اور ہوا سے بھر کر تھیلی کا وزن کیا مگر اس کے نتائج اس قدر ثابت نہ ہوئے اس لیے کہ مناسب آلات موجود نہ تھے۔ اس کے بعد دنیا کے علمی افق پر دو ہزار سال تک جہالت و ظلمت کی تاریک گھٹائیں منڈلاتی رہیں۔ اب فلسفہ مابعدہ الطبیعیات کا دور شروع ہوا۔ اس کو تجربہ سے نفرت تھی۔ انکشافات سے رغبت نہ تھی تو سائنس کی دستگیری ہوتی تو کیسے۔ ظلمت دور ہوتی تو کیونکر۔ تاریک افق منور ہوتا تو کیسے۔ نئی نئی مشکلات تھیں۔ نئے نئے مذہب تھے۔ لہذا سیکڑوں برس تک علم و حکمت (سائنس) کی تمام امیدیں سپرد خاک رہیں (ح) اے بسا آرزو کہ خاک شدہ۔ تجسس و تفتیش کے قہام در بندہ رہے۔ قدیم تہذیب و تمدن علوم فنون کا جنگجو وحشیوں نے قلع قمع کیا اور مذہبی رہنماؤں نے ثواب دارین حاصل کر کے اس کو اس سے بھی زیادہ سلیا میت کیا جو افواج اٹیل (Attila) * سے

* چوتھی صدی کے ربع آخر میں ہنوں نے جنوبی و مشرقی یورپ پر قبضہ کر لیا۔ ایک عرصہ تک آپس میں ان لوگوں میں اتفاق رہا مگر بعد ازاں سردار روگیلس نے ان کو متحد کر دیا۔ اس کی وفات پر اس کے دو بھتیجے بلیڈ اور اٹیل جانشین مقرر ہوئے۔ اٹیل نے بلیڈ کو قتل کروا دیا اور خود قتل حکمران ہوا۔ حکومت کے پہلے آٹھ سال میں تمام وحشی قوموں کو مطیع کیا اور قتل و غارت کا بازار گرم کیا۔ اس نے مشرقی سلطنتوں پر اور آرمینیا، شام، سیریا، قزاق وغیرہ پر کئی مرتبہ چڑھائی کی۔ ایران بھی اس کی زد میں آگیا تھا اور فدیہ دے کر آزاد ہوا۔ اٹلی پر بھی حملہ کیا تھا مگر سپاہ بیمار ہو گئی اور مجبوراً واپس آنا پڑا۔ کہا جاتا ہے کہ ایک لڑائی میں اس نے ایک دن میں ۱۷۵۰۰ یا ۳۰۰۰۰ آدمی قتل کروائے۔ پھر کیف بیس سال تک اس نے کیسپن سے رائن تک بغیر کسی کی مزاحمت کے حکومت کی۔

سرزد ہوا تھا —

پندرہویں سولہویں صدی عیسوی میں سائنس نے اپنی مشعل علم کو رفتہ رفتہ پھر بلند کرنا شروع کیا اور اس کے فروغ و ترقی سے ہوا کی ساخت کے مسئلے میں بھی واقفیت بڑھتی گئی اور اضافہ ہوتا گیا —

ہوا سادہ ہے اس میں وزن ہے۔ اگرچہ نظر نہیں آتی ہے لیکن حقیقتاً وہ ویسی ہی مادی شے ہے جیسے کہ پتھر یا سنگریزہ لٹکھر کے چھوٹے سیر کھرے میں بھی اس کے قیس چالیس تین ہوتے ہیں۔ اگر کھرے کی یہ سب ہوا منجمد ہو کر فرش پر چھت سے گرائی جائے تو نیچے جو چیز بھی ہوگی وہ سفوت ہو کر میدہ ہو جائے گی اور گرنے کی آواز سیکڑوں گز کے فاصلہ تک سنائی دے گی۔ اس کا اندازہ اس وقت زیادہ بہتر ہو سکتا ہے جب اسی قدر لوہا برابر کی بلندی سے گرایا جائے تو جس شے پر بھی وہ گرے گا قطعاً چکنا چور ہو جائے گی۔ تمام کرہ ہوائی کا وزن تقریباً ۵۲۱۰ بلین تین ہے۔ ہر ایک سربج گز زمین پر آٹھ یا نو گن ہوا ہوتی ہے —

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر ہوا حقیقتاً مادی شے ہے تو کیا وجہ ہے کہ ہم اس کو نہیں دیکھ سکتے۔ وہ نظر نہیں آتی۔ وجہ یہ ہے کہ ہم اس میں غرق ہیں۔ وہ ہر طرف سے ہمارا احاطہ کئے ہوئے ہے۔ ہم پانی کو دیکھ سکتے ہیں لیکن غرق آب مچھلیاں اس کو محسوس نہیں کر سکتیں۔ تاہم پانی میں ہم ہوا کے بلبلوں کو اسی طرح دیکھ سکتے ہیں جیسے ہوا میں پانی۔ نظر نہ آسکنے کے لیے مادی شے میں حدود کا ہونا لازمی ہے۔ نظر آنے کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ ساحول میں اور اس چیز کے رنگ و شکل میں کچھ فرق ہو، جس کو دیکھنا ہے۔ تاکہ آنکھ اُس کو دیکھ سکے اور دماغ محسوس کر سکے۔ ہم کسی شے کو نہیں دیکھتے ہیں بلکہ وہ

اس کے خواص ہیں جن کو دماغ متمیز کرتا ہے۔ ہوا چونکہ شفات ہے اور اس میں کوئی رنگ ہے اور نہ اُس کی کوئی اپنی شکل ہے اس لیے ہم اس کے دیکھنے سے قاصر ہیں۔ اسی طریقہ پر ہمارے پس و پیش، چپ و راست ایک ایسی شے ہے جس کو ائیر کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے اور جو بھر بھرے پتھر (Granite) سے ہزارہا گنا زیادہ وزنی اور فولاد سے کروڑہا گنا زیادہ مضبوط ہے۔ حالانکہ ہم اس کے وجود سے قطعاً ناواقف ہیں۔ طبعی تجربات اس کے وجود کا پتہ دیتے ہیں —

کپس کے اس متحرک بعر ذخار میں جس کو ہم کرۂ ہوائی کے نام سے موسوم کرتے ہیں مادہ کا پیہم و مسلسل دوران اور اس نے تمام تغیرات نہایت سرعت کے ساتھ جاری ہیں۔ ہوا کا یہ غلات نہ ہوتا تو تمام دنیا ایک ویرانہ ہوتی۔ اگر نظر تعمق سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ ہمارے خوبصورت جہان کی زیب و زینت، آرائش و زیبائش، بنار سنگھار، سجاوت و سرصح کاری، حسن و خوبی، قصہ مختصر تمام مخلوق کی حیات کا گہوارہ یہی کرۂ ہوائی ہے۔ اگرچہ اس کے بعض تغیرات نہایت غضبناک ہوتے ہیں اور ہلاکت و تباہی کا موجب ہوتے ہیں لیکن زیادہ تر اس کا سلوک مشفقانہ اور ہمدردانہ ہے۔ اسی کی وجہ سے ہم فضا کی سردی سے محفوظ ہیں۔ ہمارے جہان کے باہر طبقات بالا میں انتہائی سردی ہے۔ تپش - ۲۷۳° مئی ہے۔ اس سردی کا اندازہ اس وقت ہوسکتا ہے جب کہ منطقہ باردہ کی سو درجہ و تاریک ترین شب کی تپش سے اس کا مقابلہ کیا جائے۔ جو برت کے نقطہ اساعت سے بہت زیادہ نیچے نہیں کرتا ہے۔ اگر یہ غلات ایک رات کے واسطے ہٹا دیا جائے تو زمین، چٹانیں ایسی یخ بستہ ہوجائیں جس پر حیات حیوانی ممکن ہی نہیں ہوسکتی اور سلسلہ حیات ایک دم منقطع ہوجائے —

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ایسا کیوں نہیں ہوتا - اس کی وجہ یہ ہے کہ کرۂ ہوائی زمین کی اس طرح حفاظت کیے ہوئے ہے جیسے موسم سرما میں گرم کھبل - یہی وجہ ہے کہ ہم پر اس سردی کا اثر نہیں ہوتا - کرۂ ہوائی میں وہ سب خواص موجود ہیں جو شیشہ کے ایک گرم مکان میں ہوتے ہیں - سورج سے روشنی اور حرارت کی ملور شعاعیں سطح زمین تک آتی ہیں اور اس کو گرم کرتی ہیں لیکن حرارت کی تاریک شعاعیں اس میں ہو کر نہیں گذر سکتیں اور نہ زمین کی حرارت فضاء میں واپس جا سکتی ہے - اس طریقے سے سورج کی گرمی زمین پر جمع ہوتی رہتی ہے اور اس کو سرد ہونے سے بچائے رکھتی ہے جیسے کہ اور کوٹ سردی کے موسم میں گھنٹک سے محفوظ رکھتا ہے اور جسموں کو گرم کرتا ہے -

کرۂ ہوائی ہم کو آسمانی گولہ باری سے بھی بچائے رکھتا ہے - ہوا میں ہماری تیز سے تیز گولی نصف میل فی ثانیہ کی رفتار سے بھی کم سفر کرتی ہے - لیکن فضاء کی خالی گہرائیوں میں بے شمار لوہے کے سنگ شاہابی جن کے قد و قاست مختلف ہوتے ہیں حتیٰ کہ کہیں تو وہ افتہائی چھوٹے ہوتے ہیں اور کہیں ان کے مقابلہ میں پہاڑوں کی بھی کچھ وقعت نہیں بلکہ وہ بالکل ہیچ ہیں 'ایتھرمیں بغیر کسی مزاحمت کے بھس تا سو میل فی ثانیہ کی رفتار سے سفر کرتے ہیں - اگر کرۂ ہوائی ہم کو ان سے نہ بچائے تو وہ دن رات بارش کی طرح سطح زمین سے اس زور سے ٹکرائیں کہ مضبوط ترین شے بھی چور چور ہو جائے اور پہاڑوں اور چٹانوں کی جگہ سو سو میل گہری وادیاں بن جائیں - ذرا غور کیجئے کہ بارہ انچ کی بندوق کی گولی جو صرت ایک تھائی میل کی رفتار سے نکلتی ہے وہ فولاد میں

اس طرح گزرتی ہے جیسے کہ فولان کاغذ کی دفتی ہو ، تو یہ آسمانی گولے جن کی رفتار سیکڑوں گلی زائد اور جو قوت و توانائی اور قہ و قاست میں ہزاروں گنے زیادہ ہیں ، وہ کس قدر زور سے ٹکرائیں گے اور ان کے ٹکرائے سے کیا حشر بپا ہوگا ۔ لیکن خوبی کی بات یہ ہے ، اگرچہ تعجب خیز معلوم ہوتی ہے ، کہ زیادہ رفتار کی وجہ سے ہی ہم ان آسمانی پتھروں سے محفوظ ہیں کیونکہ جس قدر تیزی سے وہ کرہ ہوائی میں داخل ہوتے ہیں اتنی ہی ان کی مزاحمت ہوتی ہے ۔ مزاحمت کی وجہ سے وہ سفید گرم ہو جاتے ہیں اور ہم تک پہنچنے سے قبل ہی جل کر خاکستر ہو جاتے ہیں ۔ سنگ شہابی کا دفعاً مشتعل ہونا اور آسمان پر آہستگی سے نہایت چمک دسک کے ساتھ گذر کر ختم ہوجانا آسمانی گولے کا وجود آخری ہوتا ہے ۔

سو ، سوا سو میل کی بلندی پر شہابی پتھروں کو مشتعل پایا گیا ہے ۔ لہذا اتنی اونچائی پر بھی کافی ہوا ہوتی ہے ۔ ارہینیس کے تخمینہ کے مطابق کرہ ہوائی کی بلندی ۲۵۰ میل ہے ۔ لیکن بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ۵۰۰ میل ہے ۔ جو کچھ بھی ہو لیکن بہر کیف یہ ضرور ہے کہ جتنا ہم کرہ ہوائی میں زیادہ بلندی پر جاتے ہیں اتنا ہی ہوا کی مقدار اور اس کے دباؤ میں کمی آتی جاتی ہے ۔ ۴۲۹۹ میٹر کی بلندی پر یعنی پوتاسی (Potasi) پر سطح سمندر کے مقابلے میں ہوا کا دباؤ صرف ۶۲ + ۷۰ رہ جاتا ہے ۔ گلیشیر (Glaishier) نے اپنے غباروں کے سفر میں معلوم کیا کہ چھ سات میل کے درمیان کرہ ہوائی کا دباؤ تقریباً چہارم تھا ۔ پچاس کلومیٹر یا اکتیس میل کی بلندی پر دباؤ ۶۳ + ۷۰ رہ جاتا ہے ۔ جب کہ سطح سمندر کا ۷۶۰ مہر ہوتا ہے ۔ اسی طرح سو کلو گرام یا ۶۲ میل کی

اونچائی پر دباؤ صرت ۲۰۰۰ مہر رہ جاتا ہے۔ لہذا ۶۰ میل کی اونچائی پر ہی ایسا خلا پیدا ہو جاتا ہے جیسا کہ ہوائی پمپ سے حاصل ہوتا ہے۔ ایسی بلندی پر پہنچ کر انسان دفعتاً تشلیم میں مبتلا ہو کر ختم ہو جائے گا اور اگر یکبارگی ہم ہوا کے دباؤ میں آجائیں، جو فی مربع انچ پندرہ پاؤنڈ یا پورے جوان آدمی کے واسطے ۱۴ ٹن ہے، تو ہمارے خون کی تمام نالیوں پھٹ جائیں گی اور دماغ، کان، ناک اور آنکھوں سے خون جاری ہو جائے گا۔ یہ حالت تو صرت ۶۰ میل کی بلندی کی ہے حالانکہ کرۂ ہوائی کی وسعت سیکڑوں میل ہے۔ ٹروبرج (Trowbridge) [از دی فورم جلد ۲۶ صفحہ ۵۶۱ سنہ ۱۸۹۸ ق ت نوٹ] کا بیان ہے کہ ”ایسی نا معلوم فضاء عظیم موجود ہے جو سائنٹسٹک نقطۂ خیال سے قطب شمالی کے برفیلے خطوں سے بھی کہیں زیادہ دلچسپ ہے۔ ہوا کے بالائی طبقوں میں کسی کی بھی رسائی ممکن نہیں۔ اگر یہ فرض بھی کر لیا جائے تو سانس لینے کے واسطے اس کو کافی ہوا کی اور گرم رکھنے کے واسطے کافی ایندھن کی ضرورت ہوگی۔ کیونکہ صرت دس میل کی بلندی ہی پر ہوا اس قدر لطیف ہوتی ہے کہ تنفس میں دقت واقع ہوتی ہے اور اس قدر سردی ہوتی ہے کہ تپش پیما کا پارہ درجہ صفر سے کہیں کم ہوگا۔ اگر کسی پہاڑ کی چوٹی کی یہ تپش ہو تو وہ ہمیشہ برف سے تھکی رہے گی۔ اس اونچائی پر ایک شخص اپنے غبارے میں اپنے دوست کی آواز قریب کے غبارے میں سے نہیں سن سکے گا خواہ وہ اتنے قریب کیوں نہ ہوں کہ ہاتھ ملا سکیں۔ آواز کی اسوج ایسی جگہ کشت نہیں کرسکتیں۔“

پھر بھی ہوا کے یہ بالائی طبقے بغیر ساخت کے نہیں ہیں اور نہ قائم ہیں۔ بلکہ متحرک ہیں۔ اس فضا کا ہر ایک حصہ پیچیدہ گردش

کی حالت میں ہے وہاں زبردست ہوائیں ہمیشہ تقریباً ستر میل فی گھنٹہ کی رفتار سے چلتی ہیں۔ کرۂ ہوائی کا مقابلہ ایک بڑی مشین سے کیا جاسکتا ہے جو سورج کی شعاعوں کی گرمی کی وجہ سے متحرک ہے۔ یہ مشین غیر محدود زمانہ سے چل رہی ہے اور اس میں سے مختلف پیچیدہ ہوائی رویں جاری ہیں جن کی مکمل تحقیق و تفتیش کے واسطے صدیاں درکار ہیں۔ جدید انکشافات نے ہوا کے بالائی طبقوں کے رموز میں اور بڑی اضافہ کر دیا ہے۔ اس لیے کہ یہ ثابت ہوا ہے کہ یہاں زبردست برقی رویں موجود ہیں جو ترو برج کے قول کے مطابق تمام زمین کا احاطہ کیے ہوئے ہیں۔ یہ رثوق کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ بلند طبقوں کی لطیف ہوا برق کی ویسی ہی موصِل ہے جیسے کہ بہترین دھاتیں موصِل ہوتی ہیں۔ اس میں بڑی شک نہیں کہ سورج غیر معین زمانہ سے کرۂ ہوائی کے بالائی طبقوں میں مذہبی بار کے ذرات مسلسل طریقہ سے شامل کر رہا ہے۔ برقی روؤں کی وجہ سے ان کا رخ زمین کے قطبین کی طرف ہوجاتا ہے۔ شمالی طبقوں میں یہ جمع ہوجاتے ہیں اور ان سے ان عجیب و غریب قدرتی برقی مظاہر کا ظہور ہوتا ہے جس کو اُنق شمالی (Aurora Borealis) کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ جس کی بینجانی "سبز اور ارغوانی روشنی کے شرارے بھالوں کے مشابہ ہوتے ہیں۔ اور اسی وجہ سے بقول شخصے کہنا پڑتا ہے:—

" Fierce fiery warriors fight upon the clouds,

In ranks and squadrons and right form of war. "

کرۂ ہوائی کی گیس کے افزائش و پیدائش کا مسئلہ سائنس دانوں میں ایک عرصہ تک معرض بحث میں رہا ہے۔ اب یہ یقینی کیا جاتا ہے کہ

کرہ ہوائی کچھ بھی نہیں ہے سوائے اس آتشی سحابیہ (Nebula) کے جس میں سے زمین 'سورج' اور نظام شمسی پیدا ہوئے ہیں۔ ابتداءً ایک مشتمل گولا تھا لیکن ایک زمانہ کے بعد تپش کم ہو جانے پر ہماری دنیا عالم وجود میں آئی اور تپش اس قدر کم ہو گئی کہ غیر طیران پذیر اجزاء زمین کے مرکزی طبقوں میں مائع حالت میں جمع ہو گئے اور پھر تپش اور کم ہو جانے کی وجہ سے اس پر ایک جامد تہ بن گئی۔ اس طریقہ سے ہماری زمین کی ساخت عمل میں آئی۔ زیادہ طیران پذیر گیسوں اور بخارات جو باقی بچے وہ کرہ ہوائی میں شامل ہو گئے۔ کرہ ہوائی میں اس وقت سحابیہ کے وہ اجزاء شامل ہیں جو سطح زمین کی موجودہ تپش میں گیسو حالت میں قائم رہ سکتے ہیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ سحابیہ کی تکثیف کا مسئلہ ابھی پورے طریقہ سے حل نہیں ہوا ہے۔ زمانہ مستقبل میں جب کہ زمین کی تپش اور کم ہو جائے گی اور وہ سرد ہو جائے گی تو گیسو ہوا پہلے مائع شکل میں منتقل ہو جائے گی اور بعد ازاں جامد شکل اختیار کر لے گی۔ اس وقت ہم یہ کہہ سکیں گے کہ آتشی سحابیہ کی مکمل تکثیف ہو گئی۔

یہ کیسی تعجب خیز بات ہے کہ موسم گرما کی باد سموم، موسم بہار کی باد نسیم اور موسم سرما کے سرد جھونکے جو دن رات کبھی فرحت و مسرت کا سامان مہیا کرتے ہیں اور کبھی باعث کلفت اور رنج و معن ہوتے ہیں ان کی عہر پرانی سے پرانی پہاڑیوں اور قدیم ترین سمندروں کے مقابلہ میں بہت ہی زیادہ ہے۔ یہ پہاڑ و سمندر کل کے بچے معلوم ہوتے ہیں۔ یہ ہوا اس وقت سے چلنا شروع ہوئی ہے جب کہ ہماری زمین کی کوئی شکل نہ تھی بلکہ گیسو وسعت تھی یا ایک میدان تھا اور

اس وقت تک ہوا چل رہی ہے اور شب و روز غیر معین زمانہ تک یوں ہی چلتی رہے گی جب تک کہ سورج سرخ شفق جیسی حالت میں نہ آجائے اور پھر شب تاریک کی طرح بالکل تاریک نہ ہو جائے۔ اس وقت اور صرف اس وقت کرۂ ہوائی کا دور دورہ ختم ہوگا اور ہمارے ارد گرد سخت چٹانوں کی شکل میں اس کی تکثیف ہو جائے گی۔

ہوا مختلف گیسوں کا آمیزہ ہے لیکن زیادہ تر مقدار نائٹروجن اور آکسیجن کی ہے جو ۱:۴ کے تناسب میں ہیں یعنی ۴ حصہ نائٹروجن کے اور ایک حصہ آکسیجن کا۔ ہوا کا حامل جز آکسیجن ہے جس سے ہمارے جسموں کا احتراق ہوتا ہے۔ نائٹروجن غیر عامل شے ہے جو نہ معین احتراق ہے اور نہ معین تنفس۔ دوسری گیسوں کا تناسب ہوا میں بہت ہی کم ہے۔ نقشہ ذیل میں جدید انکشافات کی بناء پر ہوا کے اجزا کا تناسب دیا جاتا ہے۔

نقشہ

خشک ہوا کے ایک مکعب میٹر (یا ۱۰۰۰ لٹر) میں [میٹر = ۳۹۶۳۷۱

انچ اور ایک پاؤنڈ = ۴۵۴ گرام] —

۷۸۰۶۳ لٹر	نائٹروجن	گیس	۹۷۵۶۸۰	گرام
۲۰۹۶۹	آکسیجن	”	۲۹۹۶۸۳	”
۹۶۴	آرگن	”	۱۶۶۷۶	”
۳۶۳	کاربن ڈائی آکسائیڈ	”	۶۵۹	”
۶۱	ہائیڈروجن	”	۶۰۱	”

۱۲۹۳۶۰۰

۱۰۰۰

ان گیسوں کے علاوہ دوسری غیر عامل گیسیں موجود ہیں جو حال ہی میں معلوم ہوئی ہیں : —

۶۰۱۵	لٹر نیان (Neon)	۶۰۱۳۳۹	گرام
۶۰۰۱۵	" ہیلیم (Helium)	۶۰۰۰۰۲۷	"
۶۰۰۱۵	" کریپٹن (Krypton)	۶۰۰۰۰۱۸	"
۶۰۰۰۰۰۹	" زینان (Xenon)	۶۰۰۰۰۰۳	"

ان کے علاوہ اوزون، امونیم نائٹریٹ، فائٹریٹ، سلفریٹ، ہائڈروجن - خورد بینی جراثیم، ذرات خاک وغیرہ کی بھی انتہائی قلیل مقدار شامل ہے —

کریہم کی ایک تفصیل سے یہ توازن اور زیادہ واضح و صاف ہو جاتا ہے —

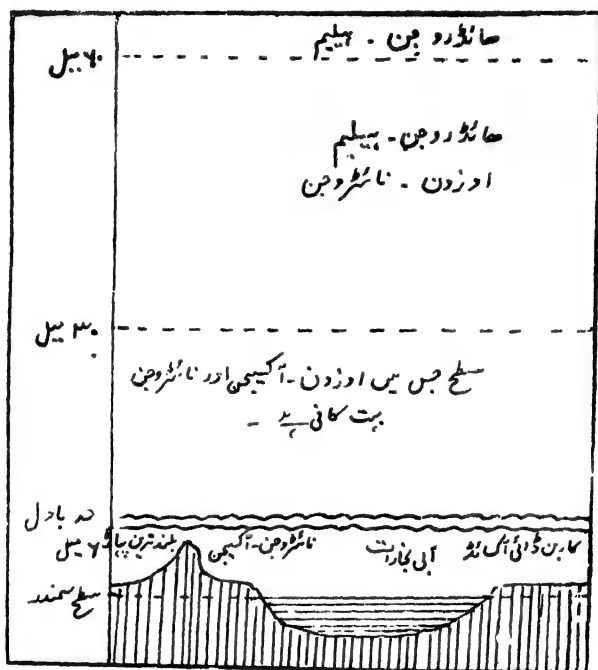
وہ بیان کرتا ہے کہ فرض کرو کہ ہوا کے اجزا ایک بیک علقہ علقہ ہو جائیں اور وہ ایسے علقہ ہوں کہ آپس میں نہ مل سکیں اور ان کی ثقافت اضافی کا بھی لحاظ ہو، تب سطح زمین پر یکے بعد دیگرے حسب ذیل غلات ہوں گے —

پانی (مائع)	۱۵ انچ
کاربن ڈائی آکسائیڈ	۱۳ فٹ
آرگن	۹۰ گز
آکسیجن	۱ میل
نائٹروجن	۴ میل

یہ اس وقت ممکن ہو سکتا ہے جب کہ یہ فرض کر لیا جائے کہ گیسیں ہر

جگہ گرتے ہوئے کے دباؤ پر ہیں —

پانی کی مقدار جو ہوا میں بخارات کی شکل میں موجود ہے وہ کچھ زیادہ نہیں ہے۔ ہوا کے سو حصوں میں ۱۶۳ حصے آبی بخارات کے ہوتے ہیں۔ ہوا کے وزن کے اعتبار سے یہ ۸۳۶ فی صدی ہوگا۔ ہوا کے ایک مکعب میٹر میں دس گرام آبی بخارات ہوتے ہیں۔ ظاہر یہ مقدار بہت ہی قلیل معلوم ہوتی ہے لیکن اگر ہم تمام کرۂ ہوائی پر اور پھر آبی بخارات



زمین کے کرۂ ہوائی کا ایک حصہ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ بلندی پر کس طرح ترکیب مختلف ہوتی جاتی ہے۔

پر غور کریں تو معلوم ہو کہ یہ کس قدر ہے۔ اس کے تقریباً پچاس بلین ٹن ہوں گے اور اس سے بارہ ہزار مربع میل کی ایک میل گہری جھیل بن سکتی ہے۔

ان آبی بخارات کا دنیا کی آب و ہوا پر بہت بڑا اثر پڑتا ہے اگر یہ سب دور ہو جائیں تو کرۂ ہوائی کی تپش تقریباً ۲۰ درجہ مٹی کم ہو جائے اور سطح زمین کا بیشتر حصہ برت کے ایسے ویرانہ میں منتقل ہو جائے جیسا کہ منطقہ بارہ میں موجود ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آبی بخارات سورج کی منور شعاعوں کے واسطے شفات ہیں لیکن غیر منور کے واسطے کثیف۔ اس میں سے ہو کر سورج کی شعاعیں زمین تک آتی ہیں اور اس کو گرم کرتی ہیں لیکن حرارت کی تاریک شعاعیں جو زمین سے خارج ہوتی ہیں وہ پھر فضاء میں واپس نہیں جاسکتیں۔ ان سب کو کرۂ ہوائی کے آبی بخارات اور کاربن ڈائی آکسائیڈ روکے رکھتی ہے اور اس وجہ سے تمام سطح زمین کی اوسط تپش میں کمی نہیں پیدا ہونے پاتی۔

آبی بخارات ہوا سے بہت ہلکے ہوتے ہیں۔ مساوی الحجم خشک ہوا کے مقابلہ میں ان کا وزن ۶۶۲ ہوتا ہے۔ اس سے مطلب یہ ہے کہ وہ ہوا سے بہت ہلکے ہیں۔ وہ اتنے ہلکے ہوتے ہیں جیسے گول گیس (Coal gas) جو غباروں کے بھر نے میں کام میں آتی ہے۔ سبک پن ہی ابھروں سے بھری ہوئی ہوا کو کرۂ ہوائی کے بالائی سرد طبقوں کی طرف بھیجتا ہے۔ اور وہاں بخارات کی تکثیف پانی کے قطروں کی شکل میں ہو جاتی ہے اور یہی بادل ہیں جو آسمان پر گھومتے پھرتے ہیں۔ یکہی وجہ ہے کہ سطح زمین سے عام طور پر بہت زیادہ بلندی پر پائے جاتے ہیں۔ اب ذرا غور کیجئے کہ سائنس کے ایک ادنیٰ واقعہ سے کس قدر رسوا وابستہ ہیں۔ مثلاً لیجئے اگر بخارات کا وزن خشک ہوا کے مقابلہ میں زیادہ ہوتا تو مرطوب ہوا سطح زمین کو ہرگز نہ چھوڑتی۔ اس سے

ہماری زندگی پر بہت کچھ اثر پڑتا - ہماری آنکھیں نہ سورج کی روشنی کو دیکھ سکتیں اور نہ چرخ نیلگوں کا لطف اُٹھا سکتیں - ہم ہمیشہ کھر میں رہتے - ہم سیکڑوں نٹ موٹے کھر میں مقید ہوتے - دنیا کے تمام پرفضا و دلفریب مناظر کی ہم پر کوئی کیفیت نہ طاری ہوتی - نہ کسی پہاڑی کی گلکاریاں دیکھنے کا موقع ہوتا اور نہ کسی وادی کی سرسبزی و شادابی کا - ہر جگہ سنسان اُداس اور پٹھان ہوتی - ہم صرف فاصلہ سے ہی آبشار نیاگرا اور سمندر ساحل کی اسواج کا شور سن سکتے - زیادہ کھر کی وجہ سے کبھی بھی ہماری آنکھیں اس کو نہ دیکھ سکتیں - غالباً ہم کو ان کا سبب ہی نہ معلوم ہوتا - تمام بحر اور بحیروں پر کھر کی انتہائی موٹی چادر ہوتی - کسی نئی جگہ کا انکشاف نہ ہوا ہوتا - تاریکی و ظلمت ہی میں اسوقت تک پڑی ہوتی - ہر جگہ بھید 'اسرار' خوف اور ڈر سے پر ہوتی - اس میں شک ہے کہ ایسی صورت میں انسان خود بھی مہذب ہوا ہوتا یا نہیں -

ہوا میں کاربن ڈائی آکسائیڈ کی مقدار اگرچہ کم ہے (۰.۰۳ فیصدی) لیکن وہ بھی بہت زیادہ اہم ہے - کیونکہ حیوانی و نباتی اشیاء کی سب کاربن اسی سے حاصل ہوتی ہے - اس کی مقدار ہر جگہ مختلف ہوتی ہے - قصبات کے مقابلے میں بڑے بڑے شہروں میں زیادہ ہوتی ہے اور سمندر کے مقابلے میں بڑے بڑے قصبات میں - سطح زمین کے مقابلہ میں (۰.۰۲۹ فیصدی) کچھ بلندی پر زیادہ ہوتی ہے (۰.۰۳۳ فیصدی) - اس کی وجہ یہ ہے کہ اوپری حصوں میں آتش فشاں پہاڑ اور اونچی اونچی چمپیاں ہوا میں ہمیشہ اس گیس کی بہت زیادہ مقدار شامل کرتی رہتی ہیں - اور بخلاں اس کے پودے نیچے کے حصوں میں سے اس کو حاصل کرتے رہتے

ہیں۔ آدسی روزانہ اس گیس کی تقریباً تیز ملیں تین مقدار خارج کرتے ہیں لیکن اس سے کہیں زیادہ مقدار دوسرے ذرائع سے، مثلاً نباتی و حیوانی مادے کے سڑنے و گلنے سے، آگ سے، آتش فشاں پہاڑوں سے، اور زمین کے دراڑوں اور شکافوں سے، خارج ہو کر ہوا میں شامل ہوتی رہتی ہے۔ اوزون کی مقدار بھی ہوا میں ہر جگہ مختلف ہوتی ہے۔ سطح زمین کے قریب بڑے بڑے شہروں میں وہ بالکل نہیں پائی جاتی لیکن جیسے ہی ہم کڑھوائی میں بلندی پر پہنچتے جائیں اس کی مقدار بہت تیزی سے بڑھتی شروع ہو جاتی ہے۔ بڑے بڑے پہاڑوں پر زمین کے مقابلہ میں چار گنی ہوتی ہے۔ بہت زیادہ بلندی پر جہاں انتہائی سردی اور بہت ہی کم دباؤ ہے برق کی بڑی بڑی روئی اور اوزون پیدا کرنے والی سورج کی بالا بلغشتی شعاعیں ہوتی ہیں، وہاں اس کی مقدار بہت ہی زیادہ ہوگی۔ ان طبقوں میں ہوا کی آکسیجن اوزون میں منتقل ہو جائے گی۔ اس گیس کی قلیل مقدار جو اچھے کے حصوں میں پائی جاتی ہے وہ صرف اوپر سے چھن چھن کر شامل ہو گئی ہے۔

کڑھوائی کی سبک تری گئیں جو ہمیشہ زمین سے نکل کر ہوا میں شامل ہوتی رہتی ہیں وہ آہستہ آہستہ اوپر اٹھتی ہیں لیکن انتہائی اونچے طبقوں میں پہنچتی ہیں۔ لہذا سو ۱۰۰ کلو گرام یا ۶۲ میل کی اونچائی پر کڑھوائی میں ۹۹ فیصدی ہائڈروجن اور نصف فیصدی ہیلیم ہوگی [از کتاب غیر نامیاتی کیمیا مصنفہ ارتمان صفحہ ۳۶۷ء ۱۹۰۶ء خطبہ برٹش اسوسیشن از دیوار صفحہ ۲۰ء سنہ ۱۹۰۲ء]۔ یہ واقعات خیالی نہیں ہیں بلکہ مشاہدات کی بناء پر اخذ کئے گئے ہیں اس لیے کہ سنگ شہابی جب سو میل کی بلندی پر مشتعل ہو کر نظر آتے

ہیں تو ان کے طیف سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہائڈروجن اور ہیلیم کے کرۂ ہوائی میں دور لگا رہے ہیں۔

اگر کسی طریقہ سے کوئی پہاڑ اسقدر بلند ہو جائے اور اس پر پہونچنا بھی کسی صورت سے ممکن ہو جائے پھر بھی کوئی جاندار اس پہاڑ کی چوٹی کی ہوا میں ایک لمحہ بھی زندہ نہیں رہ سکتا۔ اس لیے کہ سانس لینے کے واسطے آزاد آکسیجن نہیں ہوگی اور انسان دم گھٹ کر مر جائے گا ایسی جگہ کی ہوا میں موسم ہتی روشن نہیں ہو سکے گی اور کوئلہ اور کافڈ ایسے ہی غیر احتراق پذیر ہوں گے جیسے ایلٹ یا پتھر۔

یہ تعجب کی بات ہے کہ کھیاپ اور وزنی کرپٹن نامی گیس سو میل سے زائد کی بلندی پر پائی جاتی ہے جیسا کہ افق شمالی کے طیف سے معلوم ہوتا ہے۔ ہائڈروجن کے مقابلے میں اس گیس کا جوہر ۸۱۶۲ گنا زیادہ وزنی ہوتا ہے اور اس لحاظ سے اس قدر بلندی پر اس کو جمع نہیں ہونا چاہئے تھا۔

ہوا کے طبقات بالائے متعلق بہت سے ایسے مسائل ہیں جو عجیب و غریب معلوم ہوتے ہیں۔ ان کے مسائل کا حل ہونا تو درکنار ہم ان کے متعلق ابھی تک کچھ واقعات ہی جمع کر رہے ہیں۔

معمولی حالات میں ہوا کی کوئی شکل نہیں ہوتی ہے۔ لیکن تاریک کمرے میں اگر کھڑکی وغیرہ کی دراز یا کسی سوراخ میں سے جس میں سے ہوکر روشنی گذرتی ہو دیکھا جائے تو ہم کو وہ چمکیلی معلوم ہوتی ہے۔ اس میں ہزارہا خوردبینی ذرات متحرک نظر آئیں گے۔ کسی بڑے شہر پر ایسے ذرات کا ایک بڑا سمنڈر ہوتا ہے۔ کرۂ ہوائی کی بہت زیادہ بلندی جہاں کہ رسائی ممکن ہے وہاں بھی یہ موجود ہوتے ہیں لیکن وہاں

ان کی مقدار بہت کم ہوتی ہے۔ آخر یہ کہاں سے آتے ہیں؟ سطح زمین کے قریب یہ خاک کے ذرات ہوتے ہیں۔ ساحل سمندر کے قریب ریت اور نمک کے اور پھر ان میں مفید و مضر جراثیم شامل ہو جاتے ہیں۔ ہوا ان کو ہر جگہ اڑائے پھرتی ہے۔ اور کرۂ ہوائی میں خوردبینی ہونے کی وجہ سے یہ قائم رہتے ہیں۔

کرۂ ہوائی کے بلند طبقوں میں ان ذرات کے ہونے کی وجہ اور ہے۔ وہاں صدیوں سے اوپر کے طبقوں میں کرۂ ہوائی کی حدود سے باہر ذرات شامل ہوتے رہے ہیں اور سلسلہ تا ہنوز جاری ہے۔ یہ ذرات کائناتی (Cosmic) خاک کے ہیں کیونکہ ہمارے جہان میں ہر ایک ستارہ، ہر ایک سورج، اور تقریباً ہر ایک سیارہ خواہ وہ ظاہر ہو یا پوشیدہ فضاء میں چھوٹے چھوٹے ذرات متواتر مسلسل طریقہ سے داخل کر رہا ہے۔ کوہ آتش فشاں کے پھٹنے سے بھی کچھ خاک نکل کر فضاء میں جا پہنچتی ہے۔ سورج اور لگھو کھا دوسرے اجسام میں جو رات کے وقت آسمان کو منور کر دیتے ہیں ان کی سطح پر ہر لمحہ ایسے سیکڑوں دھماکے ہوتے ہیں جن کی آواز اور جن کا زور ارضی شدید ترین دھماکوں سے کہیں زیادہ ہوتا ہے۔ یہ سیکڑوں ٹن خاک فضاء میں شامل کر دیتے ہیں۔ اس طریقہ سے سورج ایک سال میں 'تین کھرب' ٹن خاک خارج کر کے فضا میں پھینچتا ہے اور اتنے ہی وقفہ میں کم از کم بیس ہزار ٹن خاک کا زمین پر اضافہ ہوتا ہے۔

تمام فضاء میں یہ سلسلہ غہر معدود زمانہ سے جاری ہے۔ تمام جہان جہاں تک دوربینیں کام دیتی ہیں، خاک سے بھرا ہوا ہے۔ تمام خاک جو زمین یا سورج میں جمع ہے وہ ایک زمانہ میں فضاء میں گردش کرتی پھرتی تھی اور پھر ایک زمانہ گزرنے کے بعد ایک ہی مرتبہ نہیں بلکہ

بہت سی دفعہ پھر اسی میں گردش کرے گی ۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر کیا وجہ ہے کہ سورج ختم نہیں ہو جاتے اس کی وجہ یہ ہے کہ جس قدر خاک وہ خارج کرتے ہیں اسی قدر ان میں آکر شامل بھی ہو جاتی ہے ۔ اسی وجہ سے جہاں میں ایک توازن قائم ہے ۔ یہ خاک سورج یا ستارے سے نکلتے ہی ہزاروں میل فی سیکنڈ کی رفتار سے گردش کرتی پھرتی ہے ۔ بالآخر یہ ذرات متحد ہو جاتے ہیں اور ان سے سلک شہابی بنتے ہیں (اور بعد ازاں ان کا وجود مدار ستاروں (Comets) سحابیوں (Nebulae) سورج اور سیاروں میں منتقل ہو جاتا ہے ۔ ہر ایک سنگ شہابی (Meteorite) جو ہمارے کرۂ میں داخل ہوتا ہے وہ پھر رگڑ سے خاک ہو جاتا ہے جو زمین پر آکر گر جاتی ہے ۔

اس میں سے زیادہ تر خاک برقائی ہوئی ہوتی ہے اور اس منفی برق کی حامل ہوتی ہے جو مطلقہ بارش شہابی و جنوبی کے باشندوں کو حیرت میں ڈال دیتی ہے ۔ برق جو ہمارے کرۂ ہوائی میں آہستہ چلنے والی آتشی گیند کی صورت میں گردش کر رہی ہے وہ کچھ تو سورج سے حاصل ہوتی ہے جس کا فاصلہ کروڑ ہا میل ہے اور کچھ ستاروں سے خارج ہوتی ہے جو اس قدر فاصلہ پر ہیں کہ ان کا بعد مسافت انسان کے تخیل میں بھی نہیں آسکتا ۔

یہ خاک ہمارے واسطے بہت ہی مفید شے ہے ۔ اسی پر ہوا کے آبی بخارات کی بارش و بادلوں کی شکل میں تکثیف ہوتی ہے ۔ اگر ہوا میں مطلق خاک نہ ہوتی تو غالباً زمین خشک ہوتی ! بغیر پانی کا ویرانہ ہوتی ! کہیں بھی بارش نہ ہوتی اس لیے کہ یہ ثابت ہو چکا ہے کہ بغیر کسی مرکزہ (Nucleus) کے آبی بخارات کی تکثیف نظر آنے والے قطرات کی شکل

میں نہیں ہوسکتی —

جب ہم خاک کے ان چھوٹے چھوٹے ذرات کی حرکت و گردش پر غور کرتے ہیں تو ہم کو احساس ہوتا ہے کہ ہوا حقیقتاً اس سے بھی کہیں زیادہ پیچیدہ ہے جتنا کہ ہم نے خیال کیا تھا۔ اسی خاک نے یونان و ہندوستان کے حکما و فلاسفا کے دماغوں کو نظریہ جواہر کی طرف منتقل کیا۔ ہندی فلسفیوں کے مطابق ہر ذرہ کو چھ مرتبہ تقسیم کرنے پر جواہر حاصل ہوسکتے تھے لیکن اب ہم کو معلوم ہے کہ جواہر ہزار ہا لکھو کہا مرتبہ تقسیم کے بعد حاصل ہوسکتے ہیں۔ اگر ہم ہوا کو کروڑ ہا گنا زیادہ بڑا کریں تو کہ اس کے سالمات اس قدر بڑے ہوجائیں کہ وہ نظر آسکیں تو اس کی پیچیدگی اور بھی زیادہ محو حیرت بنا دے گی۔ اس وقت خاک کا ایک ذرہ کھکشاں سے سیکڑوں کروڑ ہا گنا زیادہ بڑا ہوگا اور اس میں جواہر صرت اخروٹ کے قد و قامت کے نظر آئیں گے۔ یہ بہت ہی قریب قریب ہوں گے اور نہایت سرعت کے ساتھ متحرک ہوں گے۔ گردش کا سلسلہ پیہم و متواتر ہوگا۔ ذرہ کے ارد گرد ہر سمت میں ہوا نے بے شمار سالمات تقریباً ۴۸۵ میٹر فی سیکنڈ کی رفتار سے گھرائیں گے۔ ہوا کے سب سالمات بھی ایک ہی طرح کے فہ ہوں گے بلکہ مختلف نوع کے ہوں گے۔ اگر ہم ایک جگہ بیٹھ کر اس کی سیر کریں تو معلوم ہوگا کہ دس ہزار سالمات میں ۷۸۰۰ فائٹروجن کے ہیں، ۲۱۰۰ آکسیجن کے ۹۴ آرگن کے، ۳ کاربن ڈائی آکسائیڈ کے اور ایک ہائڈروجن کا۔ دوسروں کی مقدار اس قدر کم ہے کہ اگر ہوا کے سالمات ایک مرتبہ فی سیکنڈ کی رفتار سے گردش کریں تو زیلاں کے ایک سالہ کو دیکھنا پانچ سال بعد نصیب ہوگا بشرطیکہ ہم دن و رات اس کو نہایت غور سے دیکھتے رہیں اور کرپٹن کا ایک سالہ کا جلوہ

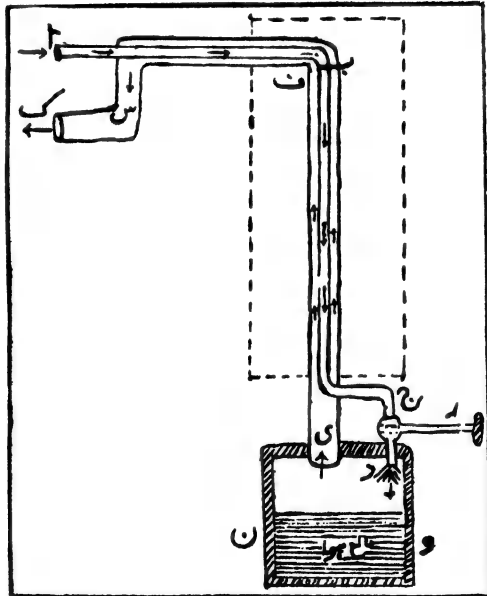
آٹھ ماہ بعد نصیب ہوا۔ ہیلیم کے سالہ کے واسطے تین ماہ اور نیاں کے واسطے تقریباً ایک ہفتہ درکار ہوگا۔ بخلات اس کے ایک منٹ میں فائٹروجن کی ۴۸ اور آکسیجن کی ۱۲ گردشیں ہوتی ہیں۔ کس قدر بڑا فرق ہے۔ اس حالت کا کچھ اندازہ ہم کو اس وقت ہوسکتا ہے جب ہم ایک ہرت کے طوفان کا منظر اپنے پیش نظر رکھیں جس میں بہت ہی زیادہ ژالہ باری ہو رہی ہو۔ اس میں ہم کو خیال کرنا پڑے گا کہ ہر ایک اولہ ۵۰۰ کڑ فی سیکنڈ کی رفتار سے متحرک ہے تاکہ اس کی رفتار ہوا کے سالمات کی رفتار کے برابر ہو جائے۔ ایسی حالت میں ہوا کے سالمات یا اولے بلذوق کی گولیوں کی طرح نہایت ہی تیزی سے متحرک ہوں گے۔ اب ذرا خیال کیجئے کہ ایک مکعب سنتی میٹر ہوا میں کم از کم ۳۶ سلکھ (Sixty Trillion) سالمات ہوتے ہیں۔ اب ذرا کل کرہ ہوائی کا خیال کرو جو ہر سمت میں میلوں دور تک پھیلا ہوا ہے۔ یہ اعداد و شمار بے انتہا زیادہ ہیں۔ خیال و وہم میں بھی نہیں آسکتے۔ اب ان زبردست ہوائی رٹوں کا خیال کیجئے جو ہر سمت میں طوفانوں وغیرہ کی شکل میں آشکارہ ہوتی ہیں۔ ہوائیں بے شمار سالمات کے طوفان عظیم ہیں۔ جو ایک ہی سمت میں بہا ہوتے ہیں۔ اگر ایک ایسے پتنگے کا خیال کیا جائے جو ہوا کے صرت ایک سالہ میں بالکل اس طرح سکونت پذیر ہو جیسے کہ ہم زمین پر ہیں تو اس پر چپ و راست نہایت تیزی سے گردش کرنے والے لکھو کھا سالمات کی وہ کیفیت طاری ہوگی جو کہکشاں کی زمین کے ہیئت دانوں پر ہوتی ہے۔ آخر اس پیچیدگی کی غرض و غایت کیا ہے اور اس کا اختتام کب ہوگا؟ ہر سالہ کی اپنی انفرادی ہستی ہے اور ہر ایک کا ایک سلسلہ حیات ہے ہر ایک خاص قوانین کے ماتحت بدوین خلات ورزی

اسی طرح مصروت گردہی ہے جیسے سیارے اپنے مدار پر سورج کے گرد گردہی کرتے ہیں —

ہمارے باپ دادا کو جب کہ وہ جوان تھے یہ بتایا جاتا کہ مستقبل قریب میں نظر نہ آنے والی ہوا کو وہ چمکتی ہوئی مائع کی شکل میں دیکھ سکیں گے جو برت کی تپش پر بوی جوش کھانے لگے گی، الکوحل کو منجمد کر دے گی، تو ان کے تعجب و حیرت کی کوئی انتہا نہ رہتی۔ اور اس وقت تو حیرت سے مہر بہ سکوت ہوتے اگر ان سے کہا جاتا کہ بعد ازاں اس کو برت جیسی جامد شکل میں بھی حاصل کر لیا جائے گا۔ یہ اس قدر سرد ہوگی کہ صرت چھونے سے نہایت تیز آگ کی طرح جلنے لگے گی۔ اب ہم قارئین کو کچھ جدید انکشافات سے آگاہ کرنا چاہتے ہیں جن کی بناء پر یہ عجیب و غریب نتائج حاصل ہوئے ہیں —

”دیوار (Dewar) کا بیان ہے کہ معمل میں مائع ہوا کا پیدا کرنا انتہائی دشوار امر ہے جیسے بھاپ سے پانی کا حاصل کرنا جب کہ وہ سفید حرارت (White heat) پر ہو اور ماحول و آلات بھی اسی بلند درجہ تپش پر ہوں۔ اس میں صرت یہ دشواری نہیں ہے کہ انتہائی سردی کیسے پیدا کی جائے بلکہ یہ بھی ہے کہ تیار ہونے کے بعد وہ ارہ گرد کے نسبتاً گرم ماحول سے کیسے محفوظ رہے۔“ ایک صدی کی جانفشانیاں اور استقلال کے ساتھ کاوشیں برداشت کرنے کے بعد انسان کو اس پر فتح حاصل ہوئی اور نتیجہ یہ ہوا کہ مائع ہوا ایک مرتبہ میں صرت گیلوں کی مقدار ہی میں تیار نہیں ہو سکتی ہے بلکہ وہ ہفتوں تک ایسے ظروٹ میں بھی رکھی جاسکتی ہے جن کو دیوار نے ایجاد کیا ہے، اور جن پر ماحول کی گرمی کا مطلق اثر نہیں ہوتا ہے —

ہوا کی اماعت میں جن اصولوں کو دخل ہے وہ بہت ہی آسان ہیں، جب گیس کو دبایا جاتا ہے تو حرارت پیدا ہوتی ہے۔ بخلات اس کے جب اس کو آزادی سے اور دفعۃً پھیلنے دیا جاتا ہے تو سردی پیدا ہوتی ہے۔ گیس کی ابتدائی تپش جس قدر کم ہوگی پھیلنے میں اسی قدر زیادہ سردی حاصل ہوگی۔ ان ہی اصولوں پر ہوا کی اماعت کے واسطے لنڈے (Linde) ہامپسن (Hampson) ٹریپلر (Tripler) نے مشینیں تیار کی ہیں۔ لنڈے کی مشین کا خاکہ شکل ۲ میں دیا گیا ہے۔ معمولی تپش اور ۲۰۰ ایٹما سفیر کے دباؤ پر ایک مضبوط نلی الف ب ج ۵ میں ہوکر ہوا داخل ہوتی ہے۔



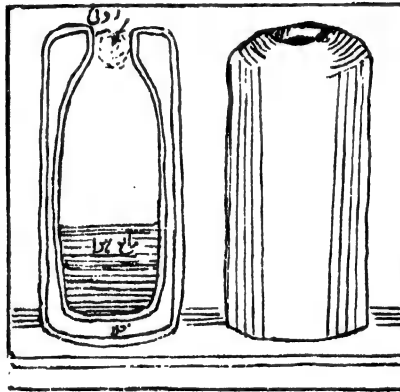
شکل ۲ ہوا کی اماعت کے واسطے لنڈے کا آلہ

صہام (Valve) ر کو درست کر کے ٹھہرے ن و میں جہاں کہ دباؤ صرت ۲۰ ایٹما سفیر ہوتا ہے۔ اس کو یک بارگی پھیلنے دیا جاتا ہے۔ اس عمل میں

بہت سردی پیدا ہوتی ہے اور ہوا سرد ہو کر نلی ی ت س ک میں گذرتی ہے اور نلی الف ب ج د میں نئی داخل ہونے والی ہوا کو سرد کر دیتی ہے۔ اس کے بعد یہ سرد کی ہوئی ہوا ج پر آکر پھیلتی ہے۔ اس کی تپش نسبتاً کم ہوتی ہے اور جب یہ نلی ی ت س ک میں گذرتی ہے تو داخل ہونے والی ہوا کو اور زیادہ ٹھنڈا کر دیتی ہے۔ یہ سلسلہ جاری رہتا ہے یہاں تک کہ تپش اس قدر کم ہو جاتی ہے کہ ج پر پھیلتے ہی اس کی اماعت بے رنگ مائع میں ہو جاتی ہے جو نہایت تیزی سے کمرے ن و میں جمع ہو جاتا ہے۔ سرد ہوا جو ی ت س ک میں ہو کر گذرتی ہے پھر نلیوں میں پھونچائی جاتی ہے اور اس کو ۲۰۰ ایٹماسفیر کے دباؤ پر دبایا جاتا ہے اور معمولی تپش پر پانی سے ٹھنڈا کیا جاتا ہے اس لئے کہ دبانے سے وہ بہت گرم ہو جاتی ہے۔ اور بعد ازاں اس کو پھر داخل ہونے والی نلی میں گزارا جاتا ہے۔ چونکہ ان نلیوں میں اندر تپش انتہائی کم ہوتی ہے اس لئے ان کو باہر کی حرارت سے اون یا پروں کے ذریعہ سے بچائے رکھنا چاہیے۔ مشینوں میں نلیوں کے حصے ب اور ی کے درمیان سیکڑوں کڑیہے ہوتے ہیں لیکن ان کو مرغولہ کی طرح بنایا جاتا ہے اس لئے کم جگہ میں آ جاتے ہیں۔ مائع ہوا سے آکسیجن اور نائٹروجن کا علحدہ کرنا آکسیجن کیس کی تیاری کے سلسلہ میں بتایا جا چکا ہے۔

مائع ہوا تیار ہونے کے بعد اس کا قائم رکھنا بھی کوئی آسان کام نہیں۔ یہ بھی اتنا ہی مشکل ہے جتنا پانی کو قائم النار کر دینا۔ دیوار نے اس مسئلہ کو بھی حل کر دیا۔ اس کے رکھنے کے واسطے اس نے دوہری دیواروں کے برتن تیار کئے۔ دیواروں کے درمیان کی جگہ میں پہلے ہی خلا کر دیا گیا تھا۔ خلا کی وجہ سے باہر کی حرارت کا مائع

ہوا پر مطلق اثر نہیں ہوتا ہے اور وہ ہفتوں تک اس میں رکھی جاسکتی ہے ۔ ایسے ظروٹ میں نقصان یا ضائع ہونے کا تر نہیں ہوتا اور وہ ہزاروں میاوں کے فاصلے پر بھیجی جاسکتی ہے حالانکہ جس ماحول میں کہ وہ ہے وہ مقابلتاً سوخ گرم کھلائے جانیکا مستحق ہے ۔ اب ذرا ان عجیب و غریب امکانات پر بھی فور کیجئے جو دیوار کی صراحیوں نے پیدا کر دیے ہیں ۔ صدیاں گذرنے کے بعد جبکہ دنیا کا کوئہ تقریباً ختم ہو جائے گا



شکل ۳

مائع ہوا رکھنے کا خلا دار ظرف - ایسی صراحیوں میں گرم یا سرد مائع ایک عرصہ تک رکھے جاسکتے ہیں -

اور آگ کا روشن کرنا ایک اسرگراں بھا ہو گا اس وقت یہ خلا والے ظروٹ مائع چیزوں کو گرم یا سرد رکھنے میں عام طور سے استعمال ہونے لگیں گے بلکہ مکانوں کی دیواروں پر بھی سردی یا گرمی کا کچھہ اثر نہ ہو گا ۔ بجائے اس کے کہ گرم چاء دن میں کئی مرتبہ تیار کی جائے سہینے میں ایک یا دو مرتبہ تیار کر ایٹا کافی ہو گا ۔ ایسے ظروٹ میں رکھنے سے وہ گرم رہے گی اور خواہ کبھی کبھوں نہ پی جائے گرم ہی ملے گی ۔

مائع ہوا پانی کے ہر ابروزنی اور ویسے ہی صاف اور شفاف ہوتی ہے۔ کھالی ہوا میں وہ سفید کھر کی شکل میں معلوم ہوتی ہے اور صراحی سے خوبصورت بادل اٹھتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ملاحظہ تقریباً بالکل وہی ہوتا ہے جو ابلتے ہوئے پانی کی بھاپ کا ہوتا ہے۔ انتہائی سردی کی وجہ سے قریب کی ہوا کی رطوبت کے بادل بن جاتے ہیں —

دنیا میں کوئی دوسری شے سوائے مائع ہائڈروجن یا مائع ہیلیم کے



شکل ۲

مائع ہوا گرائی جا رہی ہے۔ جب کلا یہ مائع ہوا اس طرح گرائی جاتی ہے تو ماحول کی ہوا کی تمام رطوبت کی انتہائی سردی کی وجہ سے تکثیف ہو جاتی ہے اور بڑے بڑے بادل جیسے کلا شکل میں دکھائی دیتے ہیں بن جاتے ہیں —

اس قدر سرد نہیں ہے جتنی کہ مائع ہوا۔ مگر پھر بھی اس میں ہاتھ

قبویا جا سکتا ہے۔ یہ محسوس ہوتا ہے کہ ہاتھ ملائم تکبہ پر ہے۔ یہ خلات توقع ضرور ہے لیکن اس کی وجہ یہ ہے کہ مائع ہوا کے مقابلہ میں ہاتھ بہت زیادہ گرم ہوتا ہے لہذا فوراً اس پر بخارات کا ایک غلات چڑھ جاتا ہے اور اسی کی وجہ سے ہاتھ مائع کے متصل نہیں ہونے پاتا۔ پھر بھی ہاتھ ایک سیکنڈ سے زیادہ مائع میں نہیں رہنا چاہیے اس لیے کہ اگر زیادہ دیر تک رہا اور مائع سے متصل ہو گیا تو ایسا زہر دست زخم پڑ جائے گا جو مہینوں میں اچھا ہو سکے گا۔ آدمی کے ہاتھ پر صرف چند قطرات ہی وہ حالت پیدا کر دیں گے جو سفید گرم لوہا پیدا کر سکے گا۔ اسی باعث عمل جراحی میں جہاں



شکل ۵

مائع ہوا کی کیتلی جو ہر پر جوش کھا رہی ہے۔ مائع ہوا کے مقابلہ میں ہر ۱۸۰ درجہ زیادہ گرم ہے۔ کیتلی بہت جلد پالے سے تنک جاتی ہے۔

کہ داغیے (Cauterisation) کی ضرورت ہوتی مائع ہوا کو کام میں لایا جاتا ہے۔ فاسد گوشت آنا فنا ہوں جل کر ختم ہو جاتا ہے۔ نیویارک کے ایک مشہور طبیب نے اس سے سرطان کو جلایا۔ سرخ کی حالت قابل علاج نہ تھی لیکن اس علاج سے وہ شفا یاب ہوا۔ اس سلسلہ میں امید افزا نتائج حاصل ہونے کا گمان ہے لیکن ابھی تک کسی کو اس طریقہ کے کامیاب بنانے کا خیال پیدا نہیں ہوا ہے۔

مائع کی انتہائی سردی کو بہت سے تجربوں سے دکھایا جا سکتا ہے ہر جو ہم کو اس قدر سرد معلوم ہوتا ہے اس کی تپش بھی مائع ہوا کی تپش سے بقدر ۱۸۰ درجہ مٹی زیادہ ہے۔ یا یوں سمجھیے کہ دونوں کی حالت میں اسی قدر فرق ہے جتنا ہماری حالت اور اس شے کی حالت میں

ہوتا ہے جو کڑھائی مہن تلی جاتی ہو یا بیہونی جارہی ہو یا جو کہ پگھلے ہوئے سیمسہ اور اُبلتے ہوئے پانی میں ہوتا ہے۔ لہذا اگر مائع ہوا کو برت پر ڈالا جائے تو وہ ویسا ہی شور مچائے گی جو سرخ گرم اوہے پڑ پانی ڈالنے سے ہوتا ہے۔ اگر مائع ہوا کو چاء کی کیتلی میں بھر کر برت میں ڈبایا جائے تو فوراً ہوا نہایت تیزی سے جوش کھانے لگے گی اور بھاپ جیسے سفید بخارات تھکن وغیرہ سے نکلنے لگیں گے۔ اگر کیتلی کو روشن کوئلہ پڑ رکھا جائے تو مائع نہایت تیزی سے اُڑ جائے گا اور بھاپ کا فوارہ بہت زیادہ بلندی تک جائے گا۔ اگر مائع ہوا لے جوش کھا کر ختم ہوجانے کے بعد کیتلی میں پانی ڈالا جائے تو وہ فوراً برت ہوجائے گا اور کیتلی کی تلی میں کاربونک ترشہ منجمد ہو کر جم ہو جائے گا۔ یہ سب باتیں اسی وقت تکمیل کو پہنچ جاتی ہیں جب کہ آگ برائے نام جل رہی ہو۔ اگر کوئی شخص مائع ہوا کے کھلے برتن میں پھونک مارے تو اس کی تمام رطوبت ایک دم منجمد ہوجائے گی۔ اسی طریقہ سے آبلے ڈالنے والی بھاپ بھی فوراً جامد شکل اختیار کرلے گی کیونکہ مائع ہوا اور بھاپ کی تپش میں ۳۰۰ درجہ مٹی کا فرق ہوتا ہے۔ پارا بھی چاندی کی طرح چمکتی دھات کی شکل اختیار کرلے گا۔ اس وقت پارا کریڈائٹ (Granite) کی برابر سخت ہوگا۔ اس کے اوزار و تلواریں نہایت آسانی سے بن سکیں گی۔ اگر ہتھوڑے کی شکل کا دھتے کا ایک تہہ بنایا جائے اور اس میں پارا بھر کر بیچ میں لکڑی کا ایک دستہ لگا کر اس کو مائع ہوا میں رکھا جائے تو ویسا ہی عہدہ ہتھوڑا بن جائے گا جو کہ سخت لکڑی میں کیلیں تھوکنے کے کام میں آتا ہے۔ یہ سب کی سب کیسی تعجب خیز باتیں ہیں۔

ایسے تجربات سے فضا کی سردی کا کچھہ نقشہ ہمارے پیش نظر ہو جاتا ہے۔ فضاء کی سردی کے مقابلہ میں مائع ہوا کی سردی کوئی سردی نہیں ہے۔ اب ذرا غور کیجئے کہ اس شخص کے واسطے جو فضا کی ویران تاریکی و سردی میں رہتا ہو ہمارے جہان کی حرارت کس غضب کی ہوگی۔ وہاں کا باشندہ ہمارے سیارے کے فرش پر قدم رکھتے ہی پتھر کو کباب ہو جائے گا اور جل کر خاکستر ہو جائے گا جیسے کہ گوشت تنور میں ہو جاتا ہے۔ مسٹر ویلیس کے قول کے مطابق اگر یہ شخص خدا نخواستہ اپنے سرد و تاریک مسکن کو کسی طرح واپس ہو جائے اور وہاں جاکر کتاب لکھنے بیٹھے تو وثوق و کامل یقین سے یہ ثابت کرے گا کہ ایسے جہان میں، جیسے ہماری دنیا، حیات ممکن ہی نہیں ہو سکتی۔

یہ واضح رہے کہ دوسری گرم چیزوں کی طرح سطح زمین سے بھی گرمی اور روشنی کی شعاعوں کا اخراج ہوتا ہے لیکن ہماری آنکھیں اس کو محسوس نہیں کر سکتیں۔ لاہون (Lebon) کے مطابق "صفر مطلق تک کی قیاس پر بھی چیزوں سے روشنی کی امواج نکلتی ہیں جن کو ہم نہیں دیکھ سکتے۔ غالباً وہ جانور اس کو محسوس کرتے ہوں گے جو تاریکی میں رہتے ہیں، دن کی روشنی سے اجتذاب کرتے ہیں اور شب کی تاریکی میں اپنی چھل پھل میں مصروف ہوتے ہیں۔ ان کو ایک ذی حیات مخلوق کے جسم کے ارد گرد جس کی حرارت ۳۷ درجہ مٹی ہو ایک منور حلقہ معلوم ہوتا ہوگا جس کو ہماری قوت بصارت دیکھنے سے قاصر ہے۔ حقیقتاً دنیا میں کوئی تاریک شے نہیں ہے بلکہ یہ ہماری کوتاہ نظری کا نتیجہ ہے۔ تمام اجسام نظر آنے والے اور پوشیدہ اشعاع کا مخرج ہیں۔ یہ ایک

قسم کی ہوں یا زیادہ لیکن ہمیشہ روشنی کی شعاعیں ہوتی ہیں " —
 مائع ہوا کا درجہ حرارت 18° مٹی ہے ۔ بلند تپش پر وہ ویسے
 ہی جوش کھانے لگے گی جیسے پانی سو درجہ سے زائد کی تپش پر ۔ جو
 رشتہ بھاپ اور پانی میں ہے وہی ہوا اور مائع ہوا میں ہے ۔ سطح
 زمین کل تپش مائع ہوا کے نقطۂ جوش سے ۲۰۰ درجہ مٹی زائد ہے ۔ لہذا
 اس مائع اور سطح زمین میں بھی وہی رشتہ قائم ہے جو کوئلہ کی آگ
 اور پانی میں ہے ۔ پس ہمارے چاروں طرف جو بھتی ہے اس میں مائع
 ہوا کو کھولنے سے وہ فوراً جوش کھانے لگے گی اور اس پانی کی طرح '
 جس کے ارد گرد آگ ہو ' بخارات پیدا کرے گی جن کے پھیلنے سے قوت
 حاصل کی جاسکتی ہے ۔ لہذا ہم مائع ہوا سے قوت محرک (Motive power)
 حاصل کرسکتے ہیں —

مائع ہوا کو کیسی شکل اختیار کرنے کے لیے بہت زیادہ دباؤ کی
 ضرورت ہوتی ہے ۔ کوئی بند برتن اس کی قاب نہیں لاسکتا ۔ اس کے
 سمجھنے میں اس وقت آسانی ہوگی جب ہم خیال کریں کہ ایک مکعب فٹ
 مائع ہوا کی تکثیف ۷۵۰ مکعب فٹ ہوا سے ہوتی ہے جو معمولی درجہ
 حرارت و دباؤ پر ہو ۔ اب اگر اس کو ماحول کی حرارت جذب کرنے کے
 لیے چھوڑ دیا جائے تو وہ اسی قدر قوت سے پھیلے گی یا اگر اس کو ایک
 برتن میں بند کر کے روکا جائے تو معمولی تپش و دباؤ پر دس ہزار پاونڈ
 (ساڑھے چارٹن) فی مربع انچ کے دباؤ سے مقید ہوگی ۔ اگر اس کو گرم
 کیا جائے تو دباؤ دس تا تیس ٹن فی مربع انچ ہوگا ۔ ایسے دباؤ کا بڑے
 سے بڑا جوشدان بھی متحمل نہیں ہوسکتا ۔ اگر یہ قوت قبضہ قدرت میں
 آجائے تو انتہائی طاقت حاصل ہوسکے گی ۔ بعض لوگوں کا مشورہ ہے کہ

یہ قوت ان بڑے بڑے انجینوں کے چلانے اور اڑانے میں مفید ثابت ہوئی جہاں ہلکے پن کا خیال بھی ملحوظ ہو - اس کے استعمال میں صرف ایک رکاوٹ ہے اور وہ اس کی اشیاء کو منجمد کردینے والی خاصیت ہے - مشین پر نہایت تیزی سے ہوا کی رطوبت ہر کی شکل میں منجمد ہو جاتی ہے - بالخصوص اس جگہ جہاں سے کہ سرد ہوا باہر نکلتی ہے - اس سے باہر خارج کرنے والی نلی بند ہو جائے گی اور اس کی وجہ سے مشین - اس کے علاوہ اور بھی خرابیاں اور مشکلات ہوں جن کا یہاں بیان کرنا مناسب نہیں - مائع ہوا کی پھیلنے والی قوت بھی تمہیل دیکھائی جاسکتی ہے - ایک نہایت مضبوط تات سے بند کی ہوئی فولادی نال میں اس کو بند کرو - بہت ہی جلد تات بھٹاتا ہوا ایک دھماکہ کے ساتھ ہوا میں سیکڑوں فٹ کے فاصلہ پر جا کر گرے گا - اگر قابضے اور فولاد کی نلیوں میں مائع ہوا کو بند کر کے سر بہ مہر کر دیا جائے تو بہت جلدی وہ تائلمیٹ کے گولوں کی طرح پھٹ جائے گی اور دھات کے ٹکڑے ہر سمت میں نہایت زور سے اڑ کر جائیں گے -

مائع ہوا پانی جیسی بے ضرر ہے - اور جب تک وہ مقید نہ ہو خود دھماکہ پیدا نہیں کرے گی لیکن دوسری اشیاء کے ساتھ ملنے سے اس قدر عظیم دھماکہ پیدا ہوتا ہے جس کا تائلمیٹ بھی مقابلہ نہیں کر سکتا - فیو یارک کے مسٹر ٹریپلر (Tripler) نے ایک تجربہ کیا - افہوں نے تیل سے بھیگی ہوئی روئی کو مائع ہوا میں تر کر کے ایک لٹھے کی نلی میں رکھا جو دونوں جانب کھلی ہوئی تھی - یہ نلی ایک دوسری نلی میں رکھی گئی اور وہ بھی دونوں جانب کھلی ہوئی تھی - جب کہ روئی کو فٹیلے (Detonating fuse) سے جلایا گیا تو اس قدر بڑا دھماکہ ہوا کہ صرف اندر

کی نلی ہی تگڑے تگڑے نہیں ہو گئی بلکہ باہر کی نلی میں بھی
سوراخ ہو گیا —

جرمنی میں اس کو کوئلہ کی کانوں کو اڑانے میں کام میں لایا گیا۔
روٹی میں پسا ہوا کوئلہ بھر کر اس کو ہوا سے تر کیا گیا اور کوئلے میں
سوراخ کر کے اس کو رکھا اور سب کو فتیلہ (Detonator) کی مدد سے
اڑایا۔ دھماکہ تائنٹامیٹ سے کم نہ تھا لیکن اس کے ناکوار اثرات اس میں
نہ تھے اور نہ کسی قسم کا خطرہ تھا۔ اگر اس پر فتیلہ کا فوراً اثر نہ
ہو تو صرت پسا ہوا کوئلہ اور روٹی باقی رہے گی۔ مائع ہوا اڑ جائے گی۔
یہی اس کے استعمال کی خوبی ہے۔ یہ وصف تائنٹامیٹ میں موجود نہیں۔
اگر تائنٹامیٹ میں کسی وجہ سے دھماکہ نہ ہو تو پھر اس کو
ہٹانا کوئی آسان کام نہیں۔ اس میں سالانہ بہت سی زندگیاں
تلف ہوتی ہیں —

مائع ہوا کی یہ خاصیت آکسیجن کی وجہ سے ہے جو اس میں نہایت
ہی مرتکز حالت میں موجود ہوتی ہے۔ جب یہ کسی ایسی چیز سے ملائی
جائے جو آکسیجن میں بہت تیزی سے جلتی ہو اور آمیزہ کو فتیلہ سے
روشن کیا جائے تو نہایت تیزی سے دھماکو احتراق شروع ہو جاتا ہے
اور زیادہ حرارت پیدا ہونے کی وجہ سے گیس اس قدر تیزی اور شور کے
ساتھ نکلتی ہے جیسے کہ کوئی گولا پھٹ گیا۔ درنوں کے تعاملات میں بھی
تقریباً کوئی فرق نہیں ہے —

ہوا میں، جیسا کہ ہم بھان کر چکے ہیں ۲۱ حصے آکسیجن کے اور
۷۹ حصے نائٹروجن کے ہوتے ہیں۔ ۱۹۵ درجہ مٹی پر جوش کھانے لگتی
ہے۔ نائٹروجن کا نقطہ جوش ۱۹۵ درجہ مٹی ہے۔ پہلے نائٹروجن جوش

کھاتی ہے اور آکسیجن باقی رہ جاتی ہے تپش آہستہ آہستہ بڑھتی ہے یہاں تک کہ وہ ۱۸۳ ° درجہ سٹی ہو جاتا ہے ۔

جیسے ہی فائٹروجن کی مقدار کم ہوتی جاتی ہے مائع کا رنگ زیادہ نیلا ہو جاتا ہے اور وہ وزنی پانی ہو جاتا ہے ۔ اس تبدیلی کو ایک بوتل میں کچھ پانی بھر کر اور اس میں مائع ہوا ڈال کر دکھایا جاسکتا ہے ۔ ایک لمحہ تک وہ پانی پر تیرتی ہے اور نہایت تیزی سے جوش کھاتی ہے ۔ جب کل فائٹروجن اُتر جاتی ہے تو آکسیجن جو پانی سے زیادہ وزنی ہوتی ہے رو پہلے بالہوں کی شکل میں تہ نشین ہو جاتی ہے ۔ جو نہایت تیزی سے جوش ہو کر ختم ہو جاتے ہیں ۔ مائع ہوا کے چند قطرے پانی میں پھینکتے ہی وہ اس کے ارد گرد منجمد ہو جاتا ہے اور یہ برت کی کشتیاں اُس وقت تک پانی میں تیرتی رہتی ہیں جب تک کہ مائع ہوا بالکل اُتر نہ جائے ۔ یوں کھلا رکھنے سے پہلے فائٹروجن اترتی ہے اور آکسیجن کی مقدار رہ جاتی ہے اور یہ آکسیجن عجیب و غریب شے ہے ۔ معمولی اونٹنی تو ہی آگ میں بہ مشکل تھام جلے گی لیکن اگر مائع آکسیجن میں یا صرف مائع ہوا میں ڈبایا جائے تو اسی قدر تیزی اور شور سے جلے گی جیسے دھماکو روٹی ۔ لکڑی کی ایک کھپچ کو اگر مائع آکسیجن میں تر کر کے جلایا جائے تو وہ تارچ کی طرح نہایت ہی تیزی سے جلے گی ۔ اگر چمکتی ہوئی کھپچ کو مائع ہوا میں ڈالا جائے تو فوراً ہی بڑا زبردست شعلہ پیدا ہو جائے گا ۔ اور وہ برتن جس میں مائع ہے گرمی سے ریزہ ریزہ ہو جائے گا ۔

مائع ہوا فولاد کو بھی جلا دے گی ۔ اس کو دکھانے کے لیے برت کا ایک کپڑا برتن بٹایا جاتا ہے اور وہ تقریباً نصف مائع آکسیجن

بہر دیا جاتا ہے۔ اب ایک فولادی کھانی پر ایک جلتی ہوئی دیاسلائی لگا کر سب کو برتن میں ڈالو۔ فولاد جلنے لگے گا۔ شرارے نکلیں گے اور چکاچوندہ پیدا کرنے والی چمک ہوگی۔ جلتے ہوئے فولاد اور مائع آکسیجن میں تقریباً دو ہزار درجہ مٹی کا فرق ہوتا ہے لیکن برت کے برتن پر کچھ اثر نہیں ہوتا۔ احتراق شروع ہونے سے پہلے آکسیجن کیسی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ بجائے فولادی کھانی کے بجلی کی روشنی کے کاربن کا سرخ گرم حصہ اسی قدر تیزی سے جلے گا۔ مائع ہوا کی انتہائی سردی اس کو جلانے سے قطعاً نہیں روکتی ہے۔

مائع ہوا کو دیکھ کر خیال پیدا ہوتا ہے کہ سرد جہاں ہماری دنیا سے قطعاً مختلف ہوگا۔ ایسے کم درجہ تپش پر تمام چیزوں کے خواص بالکل تبدیل ہو جائیں گے۔ دلیا کے تمام مہذب ملکوں میں مادے کے خواص کی ایسے سرد ماحول میں جانچ و پڑتال جاری ہے۔ لوہے اور فولاد کی مضبوطی بہت زیادہ ہو جاتی ہے لیکن ساتھ ہی وہ اس قدر بھر بھرے ہو جاتے ہیں جیسے کہ شیشہ۔

مائع ہوا اور مائع ہائڈروجن میں بیچ مہیلوں تک منجمد رہ سکتے ہیں لیکن خوبی یہ ہے کہ وہ ضائع نہیں ہوتے۔ اگر بعد ازاں ان کو بویا جائے تو وہ اُگ آتے ہیں اور ان کی بالیدگی میں بھی کوئی فرق نہیں آتا۔ ایسی سردی میں بہت سے جراثیم بھی نہیں مرتے ہیں۔ بے شمار مہلک جراثیم کو مائع ہوا میں چھ مہینہ تک منجمد حالت میں رہنے کے بعد بھی جب نکالا گیا تو انہوں نے اپنی پہلی چہل پھل پھر شروع کر دی۔ سر بہ مہر بند نلیوں میں پروفیسر میک کیڈنڈرک (Mc Kendrick) نے گوشت اور دودھ وغیرہ کو ۱۸۲° مٹی پر رکھا۔ جب ان کو کھولا گیا

تو خون کے درجہ حرارت پر کئی دن رکھنے کے بعد معلوم ہوا کہ ان میں تعفن موجود ہے۔ جراثیم عمل انجماد میں بھی نہیں سرے تھے۔ ایسی حالت میں حیاتی مادہ نہ مرقا ہے اور نہ زندہ رہتا ہے۔ یہ ایک درمیانی حالت ہے جس میں حیاتی رزم و بزم کچھ مدت تک ملتوی ہو جاتی ہے۔ ہزار ہا برس تک وہ بغیر کسی تبدیلی کے پتھر کی طرح ساکت رہتا ہے اور مناسب تپش میں آتے ہی پھر ان کی تگ و دو شروع ہو جائے گی —

یہ سب صرف چھوٹی چھوٹی مخلوقات کے لیے ہے۔ بڑے بڑے جانور اس سردی کے متحمل نہیں ہو سکتے۔ وہ ان کو مارتالے گی۔ آدسی یا سور مائع ہوا میں منجمد ہو کر سخت اور بھر بھرا ہو جائے گا اور پھر اس خواب سے کبھی بیدار نہ ہوگا خواہ اس کو کتنے ہی بہتر ماحول میں لاکر کیوں نہ جگا یا جائے۔ البتہ یہ ضرور ہوگا کہ ان کا گوشت ایسی حالت میں بالکل تازہ رہے گا۔ دنیا کے مختلف حصے سے منجمد گوشت انگلستان کو روانہ کیا جاتا ہے۔ اس سلسلہ میں یہ ایک دلچسپ بات ہے کہ میموتھ (Mammoth) کی لاشیں جو کہ ایک قسم کا بالدار ہاتھی ہوتا تھا اور اب معدوم ہے، برت میں دفن پائی گئی تھیں اور ایسی تازہ حالت میں ہیں گویا کہ وہ کل مرے تھے حالانکہ برت و یخ کے ویرانہ کی سردی میں مرے ہوئے ان کو صدیاں گذر چکی ہیں۔ ان کا گوشت قطعاً خراب نہیں ہوا۔ آدمیوں نے اور بھیڑیوں نے ان کا گوشت کھایا ہے لیکن ان کو کسی قسم کا نقصان نہیں ہوا —

ان واقعات کا ایک بڑا دلچسپ پہلو ہے۔ اریٹینس (سویڈش کیمیا دان) کا بیان ہے کہ اسی حالت کی وجہ سے غیر محدود فضا میں ایک جہان سے جہان تک حیات کا ایک زبردست چشہ بہہ رہا ہے۔ اس کے مطابق حیات کے

چھوٹے چھوٹے کیڑے، چھوٹے چھوٹے تخمک (Spores)، چھوٹے چھوٹے جراثیم ہواؤں اور طوفانوں کی وجہ سے کرۂ ہوائی کے بالائی حصوں میں پہنچ جاتے ہیں اور پھر سورج کے اشعاعی دباؤ (Radiation pressure) کی وجہ سے فضاء کی تخیل میں نہ آنے والی گہرائیوں میں پہنچ جاتے ہیں۔ اس حالت میں وہ بہت متحرک ہوتے ہیں۔ ان کی رفتار سیلکڑوں، نہیں بلکہ ہزاروں میل فی سیکنڈ کی ہوتی ہے اور پھر فضاء کی مطلق سردی و تاریکی میں مقیم ہوتے ہیں۔ یہاں غیر معین زمانہ تک وہ فضاء کے ویرانوں میں گردش کرتے رہیں گے۔ ان کو نہ سردی مار سکتی ہے اور نہ وقت ان کو تباہ و برباد کر سکتا ہے۔ وہ غیر محدود زمانہ تک یوں ہی گردش کرتے رہیں گے یہاں تک کہ وہ بالکل سرد ہو جائیں گے۔ تپش تقریباً اس وقت ۲۷۳ درجہ مٹی ہوگی۔ جدید انکشافات سے یہ معلوم ہوا ہے کہ ایسے جراثیم سورج کی روشنی کی بالا بنفشئی شعاعوں میں کرۂ ہوائی کے حدود میں داخل ہوتے وقت ختم ہو جاتے ہیں۔ اگر فرض کیا جائے کہ وہ زندہ رہیں گے تو وہ کسی دور و دراز کی دنیا کے کرۂ ہوائی کے بالائی طبقوں میں ضرور پہنچ سکیں گے۔ ایسا سیارہ ان کی نشو و نما کے واسطے مناسب نہ ہوگا یا تو وہ بہت گرم ہوگا یا بہت سرد اور پس جراثیم یا تو ضائع یا خوابیدہ (Dormant) حالت میں ہو جائیں گے اس حالت میں سیکڑوں ہزاروں سال تک رہیں گے یہاں تک کہ ایک نوعی تبدیلی پیدا ہوگی اور کارزار ہستی کی جلوہ آرائیاں پھر شروع ہو جائیں گی۔

بعض مرتبہ یہ ہوتا ہے کہ جراثیم سیدھے ایسے سیارے میں پہنچتے ہیں جہاں حیات کے واسطے مناسب کیفیت موجود ہے۔ جب ایسا ہوتا ہے تو ایک کیڑے سے لکھو کھا مختلف قسم کی حیات کا سلسلہ لامتناہی

شروع ہو جاتا ہے جو کہ ابتداءً سادہ ہوتا ہے اور پھر انتہائی پیچیدہ ہو جاتا ہے۔ اور ہم کو بقول شخصے کہنا پڑتا ہے :-

“ From earth to lichen, herb to flowering tree,

From cell to creeping worm, from man to what shall be. ”

اس طریقہ سے ایک سیارہ جو ابتداءً ویران تھا جہاں زندگی معدوم تھی، وہ چھوٹے چھوٹے جراثیم، بڑے بڑے جانور، پودوں، درختوں، چڑیوں اور کیڑے مکوڑوں سے پر ہو جائے گا جو خشکی و تری و سمندروں میں ہر جگہ پھیل جائیں گے۔ ان سے ذہ ہوا خالی ہوگی اور نہ سمندر کی کھرائیاں۔ یہاں تک کہ حیوان ناطق کا ظہور ہوگا۔ پھر تو بڑے بڑے شہر آباد ہو جائیں گے اور علوم و فنون کا چرچا ہوگا۔ تہذیب بھی ہوگی، تمدن بھی ہوگا، سیاست بھی ہوگی، تدبیر بھی ہوگا۔

ایک زمانہ گزرنے کے بعد پھر اس سیارے پر حیات کے موافق ماحول نہیں رہے گا اور رفتہ رفتہ وہ پھر ویرانہ ہو جائے گا۔ خاموشی پھر اس پر اپنا تسلط کر لے گی اور وہ جہاں جو علم و حکمت کا گہوارہ تھا اس پر اب ہو کا عالم ہوگا اور ایک سناٹا ہوگا۔ غالباً ہمارا چاند یہ سب مراحل طے کر چکا ہے اور اب بغیر حیات کا خاموش ویرانہ ہے۔ ہمارا جہاں بھی اور تمام دوسرے جہاں جو اس وقت حیات کی سرگرمیوں میں منہمک ہیں ایک زمانہ غیر معین کے بعد تباہ و برباد ہو جائیں گے۔

اگرچہ بحالت موجودہ ہوا میں چار حصے فائٹروجن کے اور ایک حصہ آکسیجن کا ہے لیکن قارئین کو اس سے یہ نتیجہ اخذ نہیں کر لینا چاہیے کہ ہوا کی ترکیب ہمیشہ یہی تھی۔ ہر چیز ہمیشہ آہستگی سے یا تیزی سے بدل رہی ہے اور جو اشیاء قائم معلوم ہوتی ہیں وہ صرف اُن کی

ظاہری کیفیت ہے۔ حقیقتاً یہ واقعہ نہیں ہے۔ ہوا بھی اس قاعدہ کلیہ سے مستثنیٰ نہیں۔ اس کی ترکیب بھی نہایت ہی آہستگی سے بدل رہی ہے لیکن اس تبدیلی کی رفتار اس قدر کم ہے کہ چھ ہزار سال کی مدت میں کوئی خصوصی تبدیلی پیدا نہیں ہوسکتی ہے۔ یونانیوں اور روسیوں نے تقریباً اسی ترکیب کی ہوا میں سانس لی ہوگی جس میں ہمارا عمل تنفس جاری ہے۔ لیکن اگر ہم لکھو کھا اور کرورہا برس سے مقابلہ کریں تو حالت یقیناً مختلف ہوگی۔ آہستہ اور مسلسل تغیر جو مدت دراز سے جاری ہے اس کے تاثرات بھی تصور افزا ہیں۔ فرض کیجیے کہ آکسیجن کی مقدار ہزار سال میں صرف $\frac{1}{1000}$ فی صدی کم ہوئی۔ یہ تغیر کسی حساب سے نہیں معلوم ہو سکتا۔ تاہم دس ہزار سال میں ایک فی صدی مقدار کم ہو جائے گی اور دو لاکھ دس ہزار سال میں آکسیجن بالکل نہیں رہے گی۔ اب زمین کی عمر کرورہا سال سے بھی زائد ہے۔ اس وقفہ دراز میں کرۂ ہوائی کی ساخت صرف ایک سرتبہ ہی نہیں بلکہ بارہا تبدیل ہو چکی ہوگی۔ ہم کو یہ وثوق کے ساتھ معلوم ہے کہ زمانہ گذشتہ میں ہوا کی ترکیب موجودہ ترکیب سے قطعی مختلف تھی۔ دنیا کی تاریخ کے اس تاریک اور مظنی زمانے میں جب کہ تمام سیارے کی سطح ایک سفید گرم پگھلی ہوئی چٹان کا ایک سمندر تھا تو ہوا کی ترکیب میں بھاپ، کاربن ڈائی آکسائیڈ، نائٹروجن، مارش گیس اور غالباً ہائیڈروجن اور ہیلیم شامل تھی۔ آزاد آکسیجن جو معین تنفس اور مہد حیات ہے اس وقت قابل ذکر مقدار میں ہرگز نہ تھی۔

اس ابتدائی زمانے کے کرۂ ہوائی کے متعلق بہت زیادہ مہموت بنانے

والی چیز کاربن ڈائی آکسائیڈ کی مقدار ہے۔ اس گیس کی مقدار کثیر جو کہ اب چاک اور چوٹے کے پتھروں میں شامل ہے اس وقت آزادانہ طور پر ہوا میں شامل تھی۔ تمام وادیاں، تمام غار و سو راخ اس سے پر تھیں۔ زمین پر ہر جگہ اسی کا دور دورہ تھا۔ صرت اس گیس کا حجم موجودہ کرۂ ہوائی کے حجم سے سیکڑوں گنا زیادہ تھا۔ ہاگبوم (Hogbom) اور چیمبرلین (Chamberlin) نے بہت ہی ہوشیاری سے حساب لگا کر معلوم کیا ہے کہ چاک اور دولومائٹ (Dolomite) میں کاربن ڈائی آکسائیڈ کی مقدار موجودہ کرۂ ہوائی کے حجم سے ۴۰۰ تا ۶۰۰ گنی زیادہ تھی۔ لیکن یہ مقدار بھی بہت کم ہے اس لئے کہ اس میں پیش کمبری (pre cambrian) زمانے کے چوٹے پتھروں کی مقدار کا حساب بالکل شامل نہیں کیا گیا ہے۔

اس ابتدائی کرۂ ہوائی کے ڈباؤ سے بھی ہم کو حیرت ہوتی ہے۔ وہ غالباً ہندوستان فی مربع انچ یا اٹھارہ ہزار فی مربع کز سے بھی زیادہ تھا۔ ایسی حالت میں اور ایسے کرۂ ہوائی میں کوئی متلفس، جانور یا انسان جو فی زمانہ دنیا میں اپنی سیر و تقریم میں مشغول ہے ایک منت بھی زندہ نہیں رہ سکتا تھا۔

یہ حالت بہت زیادہ زمانہ تک نہیں رہی۔ جیسے ہی زمین ٹھہلتی ہوئی شروع ہوئی، بھاپ کے رفتہ رفتہ بحر اور بحیرہ بن گئے اور ساتھ ہی ساتھ چٹانوں نے آہستہ آہستہ ٹھہلتا ہونے میں کاربن ڈائی آکسائیڈ کو جذب کر لیا یہاں تک کہ اب موجودہ ہوا میں اس کی مقدار کے صرت اثرات ہی باقی ہیں (۳۰۰۰ فی صدی)۔

ابتدائی زمانے میں بہت ہی کم یا بالکل آکسیجن نہ تھی۔ یہ صرت تخیلات نہیں ہیں بلکہ واقعات پر مبنی ہیں اور اس کے متعلق شہادت موجود ہے۔

پہلی بات یہ ہے کہ پگھلی ہوئی زمین میں دوسری اشیاء کی اس قدر مقدار عظیم تھی کہ وہ آکسیجن سے متحد ہو گئیں اور تمام آکسیجن ختم ہو گئی۔ کیوں کہ کاربن کی موجودہ مقدار جو کوئلہ وغیرہ کی شکل میں جمع ہے وہ تمام موجودہ آکسیجن کی ۱۲۱۶ بلین گن کی مقدار سے متحد ہونے کے واسطے کافی ہے۔

فلکی شہادت سے ان نتائج کی تصدیق ہوتی ہے۔ کیونکہ سورج کے کرہ ہوائی میں آزاد آکسیجن اور ہائڈروجن موجود ہے۔ زمین کا ابتدائی کرہ ہوائی بھی بالکل اسی نوعیت کا تھا (ایک زمانے میں وہ بھی اس آتش سیلاب کا ایک جز تھا جس میں سے ہمارے سورج یا جہان کی تشکیل ہوئی ہے) اور اس میں ہائڈروجن موجود تھیں۔

جیسے ہی کل نظام ٹھنڈا ہونا شروع ہوا آکسیجن اور ہائڈروجن کے متحد ہونے سے پانی بن گیا لیکن آزاد ہائڈروجن کی ایک بڑی مقدار کرہ ہوائی میں باقی رہ گئی۔ غالباً ابتدائی کرہ ہوائی میں مارہ گیس اور ایتھین وغیرہ کی بھی بہت زیادہ مقدار موجود تھی کیوں کہ ان گیسوں کی موجودگی دھندلے ستاروں میں جو کبھی کبھی نظام شمسی میں داخل ہو جاتے ہیں، پائی جاتی ہے۔ مہلک سیانوجن گیس اور ہائڈرو سیانک ترشہ کے بخارات بھی قلیل مقدار میں اس میں شامل تھے۔ فائٹروجن کی مقدار میں غیر عامل ہونے کی وجہ سے کوئی فرق ضرور نہیں آیا ہے حالانکہ اس قدر زمانہ گزر چکا ہے۔ اس کی عمر بہت ہی زیادہ ہے۔

پنپسن کا خیال ہے کہ بہت سے بڑے بڑے اوز بہت سے جراثیم اس کرہ ہوائی میں جس میں صرف کاربن ڈائی آکسائیڈ اور ہائڈروجن ہوں نشوونما پاسکیں گے۔ لہذا اس وقت بھی جب کہ ابتدائی زمانہ میں معتد بہ

آکسیجنی ہوا میں موجود نہ تھی۔ سادہ پودے موجود تھے۔ بعض جراثیم کے واسطے آکسیجن ہلکے تو وہ تو صرت اسی وقت پھول پھل سکتے تھے جب کہ آکسیجن بالکل نہ تھی۔

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ آکسیجن کہاں سے آگئی۔ یہ نہایت حیات کا نتیجہ ہے جو وسیع پیمانہ پر ابتدائی زمانہ میں سرسبز و شاداب تھی اور جس کے تھام و ہر باد ہونے سے تمام زمیں بھر گئی اس لیے کہ سبز پودے اہلی خوراک میں اس گیس کی انتہائی قلیل مقدار شامل کرتے ہیں۔ سورج کی روشنی میں کاربن ڈائی آکسائیڈ کا تجزیہ ہو جاتا ہے۔ کاربن کو وہ جذب کر لیتے ہیں اور آکسیجن آزاد ہو جاتی ہے۔ کاربن سے درخت اور پودوں کا تھانچہ تعمیر ہوتا رہتا اور آکسیجن آزاد ہو کر ہوا میں شامل ہوتی رہتی ہے۔ اریٹھیس کا خیال ہے کہ ابتدائی پودے جو بغیر آکسیجن کے کرہ ہوائی میں جس میں کاربن ڈائی آکسائیڈ اور ہائیڈروجن اور مارش گیس شامل تھی انہوں نے آہستہ آہستہ آکسی ہائیڈروجن کو آزاد کیا اور برقی باروں کے اثر نے (اس لیے کہ اس ابتدائی دنیا میں بھی برق و رعد کی کڑک اور چمک موجود تھی) آزاد ہائیڈروجن سے پانی بنا دیا اور مارش گیس اور ایتھین وغیرہ کی تکسید کاربن ڈائی آکسائیڈ اور پانی میں ہو گئی۔ چپ تک کہ وہ بالکل ختم نہ ہو گئیں۔ بے شمار زمانہ گذر چکا ہے۔ اس وقت سے لاکھوں پودے مسلسل طریقہ سے آکسیجن کی مقدار خاموشی سے کرہ ہوائی میں شامل کر رہے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ موجودہ ترکیب کا کرہ ہوائی بن گیا۔ موجودہ ترکیب حاصل کرنے کے واسطے تقریباً آکسیجن کے ۱۲/۱ بلین گن درکار تھے۔ یہ کام موسم گرما کی چمکتی ہوئی گرم سورج کی روشنی نے تکمیل کو پہنچایا ہے۔ یہ اس زمانہ کا واقعہ ہے جب کہ انسان کا وجود بھی نہ تھا۔ وہ صفحہ ہستی پر ظاہر

نہیں ہوا تھا۔ اور نہ اس کی آواز نے جہاں کی خاموشی کو توڑا تھا۔ ماحرین نباتات کا خیال ہے کہ پودوں کی نشوونما کے واسطے کچھ آکسیجن لازمی ہے۔ ارہینیس اس کا یہ جواب دیتا ہے کہ جب کہ آتش سحابیہ سے دنیا کی پہلے پہل تکثیف ہوئی تو ہر جگہ تپش انتہائی زیادہ تھی اس کی وجہ سے سبک ترین گیسوں مثلاً ہائیڈروجن اور ہیلیم فضا میں جا داخل ہوئیں اس لئے کہ زمین کی قوت جاذبہ اس قدر کافی نہ تھی کہ گیس کے انتہائی متحرک سالمات کو اس درجہ تپش میں جو اس وقت موجود تھا روک سکتی۔ بخلاف اس کے فائٹروجن اور آکسیجن وزنی گیسوں جنکی رفتار بھی نسبتاً بہت کم تھی باقی وہ گئیں اہلذا زمین کے سخت ہونے سے قبل ہی ہائیڈروجن اور ہیلیم غائب ہو چکی تھیں اور زمین کی تھوس شکل کے فوراً ہی بعد آکسیجن، فائٹروجن، کاربن ڈائی آکسائیڈ اور بھاپ تھی۔ لیکن اس بحث سے بھی نتیجہ جو اخذ کیا جا چکا ہے جس کا اشارہ پہلے نے اور اس سے قبل کوہنلے (Koehn) نے ۱۸۵۹ء میں بروسلز میں کیا تھا، یعنی یہ کہ آکسیجن کو پودوں نے کاربن ڈائی آکسائیڈ کا تجزیہ کر کے آزاد کیا ہے اس میں کوئی فرق نہیں آتا۔

بہر کیف اس میں شک نہیں کہ حیات حیوانی کے واسطے آکسیجن کا وجود لازمی امر ہے۔ حیوان مثل طفیلیوں کے ہیں جن کی زندگی کا انحصار صرف پودوں پر ہے۔ بخلاف اس کے پودوں کو مناسب درجہ حرارت کے علاوہ کاربن ڈائی آکسائیڈ کی اور پانی کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ گیسیں غالباً تمام سیاروں کے کرہ ہوائی میں موجود ہیں اور ان کے چمکتے ہوئے حصے کے ٹھنڈے ہونے کی وجہ سے فضلہ کی شکل میں خارج ہوئی ہیں۔

پس کرۂ ہوائی غیر عامل گیسوں کا مجموعہ نہیں ہے جس میں تغیر و تبدل نہ ہو۔ اس میں تبدیلی جاری ہے اور یہ تسلسل اس زمانے سے جاری ہے جب کہ وہ فضاء میں آتش شکل میں گردش کرتی پھرتی تھی اور متحرک تھی۔ اس کی موجودہ حالت صدیوں کے بعد تدریجی ارتقاء سے حاصل ہوئی ہے۔ ہوا خود اپنے سفر کا ابتدا کا انتہا قصہ بیان کرسکتی ہے۔

اور وہ پریوں کے تمام فرضی فسانوں سے کہیں زیادہ دلچسپ ہوگا —

کرۂ ہوائی کی قسمت کا آخر بھی رنج و الم کی ایک داستان ہے۔ بالآخر وہ سطح زمیں سے قطعاً غائب ہو جائے گا۔ دوائر ایسے ہیں جو قلم یا مل کر اس کام کو انجام دیں گے۔ ان میں سے پہلا تو بیرونی زمین کا سورج کی اشعاعی قوت کے کم ہو جانے کی وجہ سے ٹھنڈا ہو جانا ہے۔ جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے کرۂ ہوائی اس ابتدائی سحابیہ کا ایک حصہ ہے جس میں سے دنیا کی تکیوں ہوئی ہے اور جو خود مائع یا جامد حالت میں اس وجہ سے نہیں آسکا ہے کہ سطح زمین کی تپش اس قدر بلند ہے کہ اس کی کیسی حالت کو قائم رکھ سکتا ہے۔ سطح زمین کی تپش کا انحصار سورج کی گرمی پر ہے جو اس سے خارج ہوتی ہے۔ چونکہ سورج بھی ٹھنڈی ہونے والی چیز ہے ' آہستہ آہستہ اس کی گرمی اور روشنی بھی کم ہوتی جائے گی اور بالآخر بالکل ختم ہو جائے گی۔ تب ہماری روشنی ختم ہو جائے گی اور تمام نظام شمسی سردی و تاریکی میں غرق ہو جائے گا۔ لہذا جیسے جیسے سورج کی حرارت کم ہوتی جائے گی ' زمین بھی سرد پڑتی جائے گی۔ پہلے تمام دنیا پر ایک کھر فہو دار ہوگا اور قہام پانی منجمد ہو کر برت بن جائے گا۔ بعد ازاں ہوا کی حالت میں فرق آئے گا۔ پہلے وہ مائع ہوگی اور پھر جامد۔ یہ اس وقت ہوگا جب کہ سطح زمین کا درجہ

حوارت ۱۸۰ درجہ مٹی ہوگا۔ یہ تپش بہت زیادہ نہیں ہے اگر اس کا مقابلہ اس سے کیا جائے جو دنیا کے سرد ترین طبقوں میں موجود ہے۔ کپتان امولڈسن (Amundsen) نے بوتھیا (Bothia) واقع کیلیڈا میں سنہ ۱۹۰۵ء میں ۶۱۶۷ مٹی قلمبند کیا ہے۔ قطعہ میں کبھی کبھی یہ ۹۰ مٹی ہو جاتا ہے۔ اب ہوا کو مائع شکل میں لانے کے واسطے یہ خیال کیجئے کہ اسی قدر درجہ تپش اور کم ہو گیا۔ جب کہ دنیا ٹھنڈا ہونا شروع ہوئی تو یقیناً ایک وقت ایسا آئے گا جب کہ ہوا کے بالائی طبقوں میں سفید بادلوں کی شکل میں جو کہ مائع ہوا کے قطرات سے بنے ہوں گے، بستگی ہوگی۔ بعد ازاں ان کے اُتارے ہلکے نیلے رنگ کے سمندر بن جائیں گے۔ یہ سمندر اس قدر سرد ہوں گے کہ پگھلے ہوئے سینسہ کی طرح ہم کو جلا دیں گے۔ یہ سمندر وہاں بہنے لگیں گے جہاں آج کل بڑے بڑے بحر ہیں جن کا پانی ایک زمانہ پہلے منجمد ہو چکے گا اور سنگ سرد یا گار پتھر کی طرح چمکتا ہوگا۔ انسان تو اس وقت ہوں گے نہیں۔ اگر ارزا بہ اندام ہوے بھی تو اس کو انتہائی سردی کی وجہ سے بے حد خوفناک تصور کریں گے۔

اس وقت جو پانی کا حال ہے وہ اس زمانے میں مائع ہوا کا ہوگا۔ اس وقت جیسے ہم بارش میں پانی کے قطرات پاتے ہیں اسی طرح اس زمانہ میں ۱۹۰ مٹی پر مائع ہوا کی بارش و بوجھار ہوگی۔ زمین پر کہیں کہیں منجمد سفید ہوا ملے گی اور اس کی نوعیت وہی ہوگی جو کہ آج کل قطعہ میں پرت ہوتی ہے۔ اور جامد ہوا مائع ہوا کے سمندروں میں پرت کے پہاڑ کی شکل میں تیرتی پھرے گی۔

جب کہ درجہ حرارت ۲۱۰ مٹی ہوگا ہوا ۳۵ فٹ موٹی شفات چٹان کی شکل

میں منتقل ہو جائے گی - زمین پر پھر کوئی کرۂ ہوائی نہیں ہوگا - وہ بالکل سرد تاریک ویرانہ ہو جائے گی - پھر زمانہ ہالے دراز کے بعد بڑی بڑی حرکتوں اور تبدیلیوں کے بعد ہمارے سیارے پر خاموشی مطلق ہوگی - نہ کہیں حرکت ہوگی اور نہ کوئی آواز - اس کو قطعی آرام نصیب ہوگا - اس لیے کہ جب اوپر ہوائی غلات نہ ہوگا تو نہ ہوا کی سلسلہات ہوگی - نہ بجلی کی گرمی ہوگی - نہ میلہ کی بوچھاڑ کا پتہ ہوگا - نہ کسی چشمہ کی آواز ہوگی - آدسی ' پرند یا حیوان کی ایک آواز بھی شب کی سیاہی و تاریکی میں ابدی خاموشی کی مہر سکوت کو نہ توڑ سکے گی - دنیا کی سطح ایک مکمل خلا ہوگی جیسی کہ دیوار کی خلا دار مراچیوں میں ہوتی ہے - ستارے کوئلے جیسے سیاہ آسمان سے مرده جہاں پر جواہر قضا کی گرفت میں بالکل سخت ہو چکے گا چمکتے ہوں گے اور تاریکی میں جلے ہوئے سورج کے ارد گرد گردش کرتے ہوں گے - لیکن زمین کی چند پہلوں کی گہرائی کے اندر بھرونی سردی کے مقابلہ میں بڑی بڑی بھتیاں جو قوت و توانائی کا سرچشمہ ہیں اب بھی چمکتی ہوں گی - دنیا اس حالت میں صدیوں رہے گی اور فرق صرت اس وقت پڑے گا جب اس کا مادہ حل ہو کر یا کسی صورت سے ایتھر میں نہ آجائے یا کسی کائناتی تکر میں وہ پھر ایک چمکتا ہوا صحابیہ نہ ہو جائے - ایسا ہونے پر پھر حیات کا دورہ شروع ہو جائے گا -

اگر سورج کی قوت اشعاع ایک غیر محدود زمانہ تک قائم رہے تو بھی زمین کے کرۂ ہوائی کا خاتمہ ضروری ہے اس لیے کہ زمین کی اندرونی حرارت کی وجہ سے بھی سطح زمین پر ہوا کا ایک غلات موجود ہے - چند میل کی گہرائی میں سفید گرم چمکتی ہوئی بھتیاں اکر وہاں ہوا یا پانی کا کوئی قطرہ پہنچ جائے تو اس کو فوراً اٹکا دیتی ہیں -

اب اگر زمین کا اندرونی حصہ جو کہ بالآخر ہو کر رہے گا ، قہنڈا ہو جائے تو تمام کرۂ ہوائی سے پانی کے اسی طریقہ سے جذب ہو جائے گا جیسے اسونیا کوئلہ میں یا پانی جاذب میں —

پس زمین جو اپنے تغیرات و تبدلات میں مصروف ہے کرۂ ہوائی بھی جو اس کے ارد گرد ہے اس میں ہمیشہ زبردست تبدیلیاں ہوتی رہیں گی۔ کرۂ ہوائی کا ایک عجیب و غریب ساڑی رہا ہے اور اس کا مستقبل بھی نہایت دلچسپ و شاندار رہے گا —

حساب لگا کر معلوم کیا گیا ہے کہ آسمان پر دس کروڑ سے زائد سورج موجود ہیں۔ بعض کے متعلق طیف نمائی شہادت ہے کہ ان کے بھی سیاری نظام ہیں جو ان کے گرد گردش کرتے ہیں۔ ہر ایک کے ایک یا زیادہ سیارے موجود ہیں۔ اس طریقہ سے سیارے بھی کم از کم اسی قدر موجود ہیں جو کہ ہماری زمین سے مشابہ ہیں اور ستاروں کے نظام میں پھیلے ہوئے ہیں۔ لہذا ان کے کرۂ ہوائی کی ساخت کا دلچسپ سوال پیدا ہو جاتا ہے —

پہلا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہماری زمین کے کرۂ ہوائی کی طرح ان کے کرۂ ہوائی ہیں یا نہیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ان جہانوں کے کرۂ ہوائی ہر اس ممکن ساخت کے ہو سکتے ہیں جن کا کہ ہم خیال کر سکتے ہیں۔ بعض پر وہ اشیاء جو ہمارے کرے پر بے اقتبا موجود ہیں قطعاً نہیں ہیں۔ اور بعض پر وہ چیزیں بہ افراط ہیں جو ہمارے کرے پر انتہائی قلیل مقدار میں موجود ہیں۔ بعض سیاروں کا کوئی کرۂ ہوائی نہیں ہے۔ اس لیے کرۂ ہوائی ہونے کے واسطے جیسا کہ ہم ابھی بیان کر چکے ہیں یہ لازمی شرط ہے کہ اس کے سیارے کا اندرونی حصہ سرخ گرم یا سفید

گرم ہو یا بالفاظ دیگر اس قدر اندرونی حرارت ہونا چاہیے جو تمام گیسوں کو اندر سے نکال کر پھینک دے اور اس کی سطح پر قائم رکھ سکے۔

ہر کرے کی ایک رفتار فاصل ہوتی ہے۔ اگر کوئی چیز رفتار فاصل سے یا اس سے زائد رفتار سے اوپر پھینکی جائے تو وہ پھر واپس نہیں آئے گی۔ تھمبیلگہ زمین کی حالت لیجیے۔ اگر سات میل فی سیکنڈ کی رفتار سے کوئی گولی اوپر پھینکی جائے تو وہ واپس نہیں ہوگی لیکن اگر یہ رفتار جس سے کہ وہ اقتصادی بلندی پر پرواز کرتی ہے سات میل فی سیکنڈ سے کم ہے تو وہ چیز ایک بلندی پر پہنچنے کے بعد واپس ہونی شروع ہوگی۔ جب کہ رفتار، رفتار فاصل سے زائد ہوتی ہے تو اس کا سفر جاری رہتا ہے اور پھر اس چیز کو زمین کی قوت جاذبہ واپس نہیں بلا سکتی۔ اب سب گیسوں کو جو ایک نہ ایک وقت سیاروں کی سطح پر ہوتی ہیں یہ فرض کر لیتا چاہیے کہ اُترنے والے سالہات ہیں اور اگر ان کو روکنے کے واسطے زمین کی قوت جاذبہ کافی نہیں ہے تو نہایت تیزی سے متعرج سالہات آہستہ آہستہ فضا میں چلے جائیں گے اور گروہ ہوائی ان کو مستقل طریقہ سے کھو دے گا۔ ایک خاص قد و قامت کا سیارہ گیسوں کو گروہ ہوائی کو قائم رکھ سکتا ہے۔ ہر ایک نہیں رکھ سکتا۔ اس دھوے کی فلکی شہادتیں بھی تصدیق کرتی ہیں۔

ڈاکٹر جان استون استونی نے دریافت کیا ہے کہ سبک گیسوں کے ذرات بہ نسبت وزنی گیسوں کے زیادہ تیزی سے سفر کرتے ہیں۔ اسی وجہ سے ہائڈروجن زمین پر قائم نہیں رہ سکتی۔ وجہ یہ ہے کہ معمولی تپش پر ہائڈروجن کے ذرات سات میل فی سیکنڈ کی رفتار یعنی زمین کی رفتار فاصل سے زائد

تیزی سے سفر کرتے ہیں اور اس لیے وہ فضا میں چلے جاتے ہیں۔ خلائی اس کے کرۂ ہوائی کے دوسرے اجزاء مثلاً آکسیجن، فائٹروجن، آرگن اور کاربن ڈائی آکسائیڈ زمین سے باہر نہیں جاتے۔ وہ ان کو برقرار رکھتی ہے۔

چاند میں حالات بالکل مختلف ہیں۔ زمین کے مقابلے میں اس کی قوت جاذبہ — ہے۔ لہذا اگر کسی کیسی سالہ کی رفتار ۱۶۲۵ میل فی سیکنڈ ہے تو وہ آرکر فضاء میں پہنچ جائے گا۔ چاند کی سطح کی زیادہ سے زیادہ تپش ۱۵۰ ہے۔ اس تپش پر ہائڈروجن کے سالمات کی رفتار ۱۶۳۵ میل فی سیکنڈ ہوگی یا بالفاظ دیگر یہ رفتار 'رفتار حاصل سے زائد ہوگی۔ لہذا ہائڈروجن چاند کے اس حصے سے جہاں کہ یہ تپش ہے غائب ہو جانا چاہیے۔ وہ برابر غائب ہوتی رہتی ہے جب تک کہ قطعاً ختم نہ ہو جائے اور یہی وجہ ہے کہ ہائڈروجن اگر وہ ہمارے سیارے (Satellite) میں توی تو وہ بہت جگہ ختم ہوگئی۔ یہی دہلہ آکسیجن، فائٹروجن اور کم و بیش آرگن کے لیے بھی ہے۔ لہذا کوئی تعجب کی بات نہیں ہے کہ چاند پر کوئی کرۂ ہوائی نہیں ہے۔ اس کی گہری وادیوں میں اور زمین دوز غاروں میں ممکن ہے اب بھی کاربن ڈائی آکسائیڈ ہو۔ لیکن چاند کی سطح کا بیشتر حصہ ایسی مکمل خلا کی حالت میں ہے جو بہترین پمپ پیدا کر سکتے ہیں۔ اس کی چٹانی سطح پر بہت سے آتش فشانی دھانے ہیں جن کے ارد گرد گیارہ ہزار بارہ ہزار فٹ اونچی دیواریں ہیں۔ آبی بخارات کا ہمارے کرۂ ہوائی پر بہت کچھہ دخل ہے۔ لیکن چاند پر اس کا ایک قطرہ بھی نہیں۔ اس وجہ سے اس کی وادیوں میں اور پہاڑ کی چوٹیوں پر نہ کبر ہے اور نہ بلال ہیں اور نہ نشیبی سطح پر دریا و سمندر ہیں۔ بعض دور حاضر کے مصنفین کا دعویٰ ہے کہ چاند کی سطح برف و یخ کے صندوق میں بند

ہے۔ بعض مثلاً ٹائی کو اور کوپوئی کس کے بڑے بڑے دھانوں سے بڑی جیسی شعاعیں یا چشمے نکلتے ہیں جن کے متعلق خیال ہے کہ یہ قدیم گلہ شہر کے چشمے ہیں۔ یہی وجہ بڑے پہاڑ ارستارکس (Aristarchus) کی سفیدی کی بھی بیان کی جاتی ہے۔ بہر کیف چونکہ وہاں ہوا اور پانی نہیں ہے اس لیے اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کی سطح پر خاموشیء مطلق موجود ہے۔

زہرہ (Venus) بھی زمین کے برابر اور اس میں بھی تقریباً وہی گیسیں ہیں۔ اس کا کرہ ہوائی زیادہ اونچا اور کثیف ہے۔ جس کا وزن ہمارے کرہ ہوائی سے تقریباً دوگنا ہے۔ اس میں آبی بخارات موجود ہیں۔ تمام سیارے پر بھاپ کے زبردست بادل ہیں جو اس کی سطح کو چھپائے ہوئے ہیں اور اس وجہ سے دریا، براعظم اور بحر اعظم نظر نہیں آتے ہیں۔ جدید انکشافات سے ظاہر ہے کہ ایک حصہ مستقل طریقہ سے سورج کے سامنے ہے اور گرم رہتا ہے اور دوسرا اس سے دور رہتا ہے اور سرد و تاریک ہے۔ اگر ایسا ہے تو زبردست ہوائیں گرم حصہ کی جانب سے سرد حصہ کی جانب چلنا لازمی ہیں اور گرم حصہ کا پانی سرد حصہ میں آکر بالکل منجمد ہو جائے گا۔

ارہینیس کا خیال ہے کہ اوسط تپش ۴۰ درجہ مئی ہے اور یہ اس قسم کی زندگی کے واسطے بالکل مناسب ہے جیسی کہ ہماری زمین پر ہے۔ بڑے بڑے شہر مخلوق کی چہل پھل سے پُر ہوں گے۔ ذہین و ذکی مخلوق ہوگی۔ لیکن جب تک کہ بادل اس کی سطح کو چھپائے ہوئے ہیں کوئی انسانی آنکھ اس وجود کا پتہ نہیں لگا سکتی۔

مریخ (Mars) زمین کے مقابلہ میں — ہے۔ اس کی قوت جذبہ بھی ایک تہائی ہے۔ لیکن یہ اس قدر کافی ہے کہ آکسیجن، نائٹروجن، آبی

بخارات اور کاربن ڈائی آکسائیڈ کو روک سکے۔ باوجود چھوٹے ہونے کے اس کا ایک پتلا کرۂ ہوائی ہے جس کا ثقل اضافی ہمارے کرۂ ہوائی کے مقابلہ میں $\frac{1}{7}$ ہے۔ اس قدر لطیف ہونے پر بھی سربخی کرۂ ہوائی میں کھر موجود ہے اور بادل پائے جاتے ہیں۔ آخر اکتوبر سنہ ۱۸۹۴ع میں یورپ سے زائدہ حصہ بارش کے بادلوں سے تھکا رہا۔ صاۃ آسمان میں سورج نہایت چمک دمک سے چمکتا ہے اور اس کے چشمے اور پہاڑ اس کی دوپہر کی شان و شوکت کا ثبوت دیتے ہیں۔ کرۂ ہوائی کی گردش نہایت خاموشی سے جاری ہے تاکہ گرم ملک کی خاموشی پر کچھ ہرج واقع نہ ہو۔ پانی کرۂ ہوائی میں موجود ہے۔ طیف نما سے اس کا پتہ چلتا ہے اور اس کے ہر فیلے قطبین ' سمندر اور افجنیری کے بڑے بڑے کاموں کا پتہ چلتا ہے جن کے متعلق لورویل (Lowell) کا خیال ہے کہ وہ ہوشیار لوگوں کا کام ہے۔ سمیزی بھی اس چھوٹے کرۂ ہوا پر موجود ہے اس لیے کہ میدانوں کا اور نہروں کا سال کے مختلف حصوں میں رنگ تبدیل ہو جاتا ہے۔ حال میں اس کے کرۂ ہوائی میں آکسیجن بھی دریافت ہوئی ہے۔ عطارد زمین کے مقابلہ میں بہت چھوٹا ہے اور اس کا کوئی کرۂ ہوائی نہیں ہے۔ اس کی رفتار فاصل صرت تین میل فی سیکنڈ ہے جب کہ زمین کی ۷ میل فی سیکنڈ ہے۔ لہذا وہاں بہت ہی کم آبی بخارات اور بہت ہی ہلکے ہوائی غلات ہوں گے۔

بڑے بڑے سیارے مشتری، زحل، یورانس، نپتون، سب بہت گرم

معلوم ہوتے ہیں اور ان کا وجود یا تو کیسی ہے یا سائچ حالت میں۔ ان کی سطحیں بھاپ کے زبردست ہادلوں میں پوشیدہ ہیں۔ یہ سیارے بہت وزنی اور کثیف ہیں لہذا ہلکی کیسیں بھی وہاں ہوں گی۔ ان کے بالائی طبقوں میں بھاپ کے علاوہ ہائڈروجن، ہیلیم، فائٹروجن، کاربن ڈائی آکسائیڈ، سلفر ڈائی آکسائیڈ ہوگی۔ ان کے نیچے کے طبقے سفید گوم ہیں اور ان میں غالباً دھاتیں مثلاً لوہا یا کیلسیم وغیرہ کیسی حالت میں ہوں گی۔ طیف نما سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے کرۂ ہوائی میں ایسے نامعلوم عناصر موجود ہیں جو ہماری زمین پر نہیں پائے جاتے ہیں۔ مشتری اور زحل کے طیف میں ایک سرخ حلقہ پایا جاتا ہے اور یہ کسی زمین کے عنصر سے نہیں ملتا۔ یورانس اور نیپتون کی روشنی میں دیگر نامعلوم عناصر کا وجود پایا جاتا ہے۔

سورج زمین سے ۳۳۲,۰۰۰ گنا زیادہ بڑا ہے اور وہ سبک ترین کیسی سالہات کو قبضہ میں رکھ سکتا ہے۔ قبل اس کے کہ وہ آزاد ہوں ان کے سالہات کی رفتار ۳۹۱ میل فی سیکنڈ ہونی چاہیے۔ بہت کم کیسی سالہات کی یہ رفتار ہے۔ پس سورج کا کرۂ ہوائی بہت ہی زیادہ بڑا ہے۔ اس کے بالائی طبقوں میں ہائڈروجن، ہیلیم اور دوسری ہلکی کیسوں کی جو ہماری دنیا میں نہیں پائی جاتی ہیں بڑی زبردست مقدار موجود ہے۔ ہائڈروجن سے اوپر نامعلوم کورونیم (Coronium) موجود ہے جس کی روشنی نہایت صاف سبز ہوتی ہے۔ سورج کے نیچے کے طبقوں میں کیسی لوہا، کیلسیم، میگنسیم اور دوسری دھاتیں موجود ہیں کیوں کہ سورج کی تپش انتہائی

زیادہ ہے جس میں دھاتیں جوش کھا کر اسی طرح اُڑ کر سطح پر آجاتی ہیں جیسے مائع ہوا اُڑ کر ہماری زمین پر بادلوں کی شکل میں چھا جاتی ہے۔

فضا میں اور بھی بے شمار جہاں موجود ہیں جو کہ ہم کو نظر نہیں آتے۔ ہم کو ان کے کرۂ ہوائی کا مطلق علم نہیں اور نہ ان کے دیکھنے یا معلوم کرنے کی کوئی اُمید ہے۔

بعض کے کرۂ ہوائی ایسے ہوں گے جیسے ہماری زمین کے۔ دوسروں کے کیسی غلات ہوں گے لیکن نظام شمسی سے بالکل جدا گانہ۔ ان عجیب و غریب دور کے جہانوں میں جو رموز پوشیدہ ہیں وہ ہر اس بات سے زیادہ دلچسپ ہوں گے جو ہمارے تخیل میں آسکتی ہے۔

اس مہدان میں عقل فکر کے جس قدر بھی گھوڑے دوڑائے ہماری مشکلات میں اضافہ ہی ہوتا گیا۔ ہم نے یہ ضرور محسوس کیا کہ ایک گتھی ہے۔ یہ ضرور معلوم کیا کہ ایک عقدہ ہے لیکن یہ مشکل کہ وہ گتھی کیوں کر سلجھے اور وہ عقدہ کیوں کر حل ہو ہماری فہم و ذکا سے کہیں بالاتر ہے۔ ان صفحات میں جو کچھ ہم بیان کیا گیا ہے دراصل یہ ہمارے لیے بچوں کے خوش نہا کھلونوں کے مانند ہیں جن کی بیرونی سطح ملمع کاری سے چمک دمک رہی ہے۔ بچے جس طرح خوش رنگ اور خوش منظر نئے نئے کھلونوں کو دیکھ کر خوش ہوا کرتے ہیں اسی طرح ہماری آنکھوں کے سامنے جب کائنات ہستی کا کوئی نیا خوش منظر شکوفہ کھلتا ہے تو ہم پر اس سطحی اور خوش رنگ منظر سے

تھوڑے اور خوشی کا ایک عجیب عالم طاری ہو جاتا ہے ۔ رہا
یہ اسر کہ ہمیں اس خوش نہا شگوفہ کی اصل حقیقت کا کہاں
تک علم ہے تو لا علمی کی انتہائی مجبوری اور مایوسی میں
ہمیں اقرار کرنا پڑتا ہے کہ حقیقت کا علم بس خدا ہی کو
حاصل ہے ۔



محکمہ ابن موسیٰ خوارزمی

از

(جناب محمد زکویا صاحب مائل)

سابقہ اشاعت میں ابوالوفا بوز جانی کے حالات اور ان کے ساتھ اہل مغرب کی سرگد مہری کا ذکر ہوچکا ہے اب دنیائے ریاضی کی ایک اور اہم شخصیت کے سوانح و کھالات حوالہ قلم کئے جاتے ہیں —

اس حقیقت کا اظہار ناگزیر ہے کہ ایسی عالی مرتبہ اور ناقابل فراموش ہستیوں کے ذکر جھیل اور علمی خلود کی طرف سے بے پروائی برتنے کی بڑی ذمہ داری زیادہ تر ہمیں پر عائد ہوتی ہے۔ ادب و تاریخ کے بڑے بڑے فاسور وکن جن پر مشرق کو بجا طور پر فخر و فارح کا موقع ہے ہمارے مشرقی ہونے کے باوجود اس طرح ہمارے تساہل و سہل افکاری کا شکار ہوچکے ہیں کہ دنیا ان کے نام و نشان تک سے ناواقف ہے۔ اگر ہم اس عبرت ڈاک جہود و غفلت میں مبتلا نہ ہوتے تو خدا جالے کتنے مہرین ریاضی و طبعیات اور دوسرے اہم علمی شعبوں کے ہاکمال حاصلوں کے خزائن تحقیق و نتائج فن ہمارے سامنے ہوتے اور آج کسی کو یہ دعویٰ کرنے کی جرأت نہ ہوتی کہ ”عرب کبھی مفتوح اور موجد کی حیثیت نہ حاصل کرسکے۔ انہوں نے ہمیشہ غیر اقوام کی نقالی کی اور دوسروں کا سرمایہ کمال تراجم کے ذریعے سے اپنے یہاں منتقل

کر لیا۔ حالانکہ یونان اور ہندوستان کے علوم سے استفادہ کے سوا عربوں نے بیشتر علوم اور احسانِ مدنیت میں اتنے اہم اور عظیم الشان اضافے اور ایجابیں کیں جو بلا اختلاف مغرب کی حضرات موجودہ کا اساس شمار کی جانی ہیں۔ جن کی بنا پر عربوں کی فضیلت ذکر و بحث کی محتاج نہیں رہی۔ خود مغربی مصنفین نے کھلے دل سے علمِ کیمیا و جبر و مقابلہ اور مثلثات و فلکیات وغیرہ میں ان کا فضل تقدم تسلیم کیا ہے اور اعتراف کیا ہے کہ عربوں نے فلکیات کو اپنے یہاں لینے کے بعد اس میں بہت سے اضافے کئے اس کے اصول مدون و مرتب کئے۔ اسی طرح جبر و مقابلہ کو مکمل کیا جو تکمیل و استیعاب کے ساتھ یونانیوں کو معلوم نہ تھا۔ اس کے بہت سے نظریے بنائے جو آج دنیا کو معلوم ہیں اور جن کے ذریعہ حل اشکال وغیرہ کی مختلف ترکیبیں اور معادلات کے متعدد حل واضح ہو گئے ہیں۔ علم حساب میں بھی بہت سے اہم اضافے کئے خصوصاً نظریۂ اعداد میں۔ چنانچہ عام طور پر مشہور ہے کہ لفظ صفر ٹھیک انہی معنوں میں جن میں آج مستعمل ہے سب سے پہلے عربوں ہی نے استعمال کیا۔ مثلثات میں نہایت کمال و مہارت پیدا کی اور اس فن میں عجیب عجیب اختراعیں کیں۔ جیہڑوں کے قانون تناسب کی دریافت اور مثلثاتِ کرویہ کے حل کا عام قانون انہیں کی عقل و ہمداری دماغ کا مہمں ہے، 'مماس التمام' قاطع اور قاطع التمام کے لیے جد اول ریاضیہ سب سے پہلے انہیں نے وضع کیں۔ غرض ان تمام امور میں عربوں کے لیے فخر و مباہات کا کافی مواد موجود ہے۔

حاصلِ تہدید یہ ہے کہ انہیں فاضل ہستیوں میں ایک معبد ابن موسیٰ خوارزمی ہی ہیں اور علوم ریاضیہ کے تقسم و ترقی میں انہیں بڑا درجہ حاصل ہے۔ انہوں نے ریاضی کی سب سے اہم شاخ جبر و مقابلہ کے اصول

مرتب کرنے میں بہت مہارت و دماغ سوزی کا ثبوت دیا۔ ان کے متعلق ایک یورورپین فاضل کا مقولہ ہے کہ ”محمد ابن موسیٰ عرب کا سب سے بڑا ریاضی دان تھا جو ماسوں کے عہد میں فاسور ہوا“ اور حقیقت میں یہ مقولہ ذرا بھی غلط نہیں ہے۔

مغربی سوانح نگاروں نے محمد ابن موسیٰ اور ابو جعفر محمد ابن موسیٰ ابن شاکر کو ایک سمجھہ کے خلط مبعث کر دیا ہے، کیونکہ موہرالذکر بھی ایک مدت سے ابو جعفر کے نام سے مشہور تھا۔

محمد ابن موسیٰ خوارزمی ترکی الاصل تھے +۔ خراسان میں پیدا ہوئے اور بغداد میں سکونت و اقامت اختیار کی۔ یہ اس مہم کے ایک ممتاز رکن تھے جو ماسوں رشید نے بحث و تحقیق کے لیے افغانستان بھیجی تھی۔ مختلف علوم میں ان کی متعدد تالیفات ہیں خصوصاً ریاضیات اور فلکیات میں۔ یہ علوم اولین سے واقفیت پیدا کرنے کے بڑے شائق تھے اور ان پر بہت زیادہ غور و بحث کیا کرتے تھے۔ ان خصوصیات میں وہ اپنے معاصر علما کے دوش بدرش تھے۔ اسی مہارت مطالعہ اور زبردست شوق تحقیق کا نتیجہ تھا کہ انہوں نے علم جبر و مقابلہ میں ”کتاب المختصر فی حساب الجبر والمقابلہ“ جیسی اہم اور قابل قدر کتاب یادگار چھوڑی۔ کہا جاتا ہے کہ خوارزمی پہلے شخص میں جبر و مقابلہ کو علمی شکل سے وضع کیا اور اس فن میں سب سے پہلے تالیف کا کام کیا۔ گو بظاہر اس بیان میں مبالغہ معلوم ہوتا ہے لیکن جب مورخین کے اقوال

پر نظر پڑتی ہے تو اس کی صداقت چندان مشتبہ نہیں رہتی۔ یہاں چند اقوال درج کیے جاتے ہیں۔ علامہ ابن خلدون اپنے مقدمے میں لکھتے ہیں۔ "خوارزمی سب سے پہلے شخص ہیں جنہوں نے جبر و مقابلہ میں کتاب لکھی" —

ابو کامل شجاع ابن اسلم نے کتاب "الوصایا بالجبر والمقابلہ" کے مقدمے میں لکھا ہے۔ خوارزمی ہی نے سب سے پہلے عالم الجبر کو مدون و مرتب کیا * —

پھر انہیں ابو کامل نے "کتاب الجبر والمقابلہ" کے مقدمے میں اس حقیقت کا سات لفظوں میں اعتراف کیا ہے کہ خوارزمی جبر و مقابلہ کے موضوع پر کتاب لکھنے میں سب سے سمیت لے گئے + اور لکھا ہے کہ "میں نے جبر و مقابلہ میں ایک کتاب جو تالیف کی اور اس میں بعض معلومات معتمد ابن موسیٰ کی درج کیں جو انہوں نے اپنی کتاب میں لکھی تھیں اور ان کی شرح لکھی، جن بیانات کو معتمد ابن موسیٰ نے بلا شرح و وضاحت کے درج کیا تھا میں نے ان کی تشریح و توضیح کی" —

اس اعتراف سے یہ اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ "کتاب الخوارزمی" کے بعض دقیق مسائل کی شرح لکھے جانے سے کتاب الخوارزمی کی قدر و قیمت کم نہیں ہوئی بلکہ اور بڑھ گئی —

خوارزمی کی وہ کتاب جس پر اس وقت ہمیں کچھ لکھنا ہے، بہت سے وجوہ سے تالیف کی گئی تھی جن میں سے بڑا سبب یہ ہے کہ

مہند ابن موسیٰ خوارزمی نے دیکھا کہ لوگوں کو ایک ایسی کتاب کی سخت ضرورت ہے جو تجارتی معاملات، اراضی کی پیمائش اور دشوار حسابی مسائل کے حل میں سہولت پیدا کرے، اس ضرورت کو پورا کرنے کے لیے انہوں نے یہ کتاب لکھی —

اس موقع پر یہ معلوم کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ سب سے پہلے لفظ ”جبر“ کا استعمال مروجہ اصطلاحی معنوں میں خوارزمی ہی نے کیا۔ اس کے بعد اہل فرنگ نے اپنے یہاں لے کر اس عام کا نام ”الجبرا“ رکھا —

کتاب متذکرۃ ہالا کا نام ”کتاب المختصر فی حساب الجبر والمقابلہ“ ہے

اور یہ پانچ ابواب میں منقسم ہے —

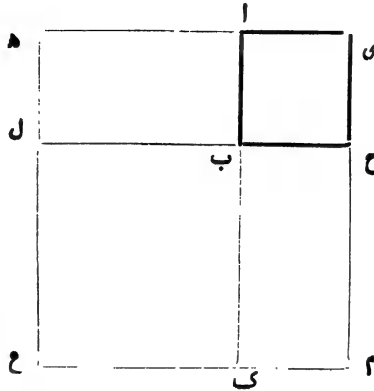
پہلا باب — اس میں پہلے اور دوسرے درجہ کے معاملات اور ان کے حل کرنے کا بیان ہے۔ اس میں معادلات کو چھ قسموں میں تقسیم کیا ہے۔ ب س = ح س و ب س = د، م س = د، ب س + ح س = د، ب س + د = ح س، ب س = ح س + د —

خوارزمی نے صحیح طور پر مثبت جذر نکالے وہ اس سے بے خبر نہ تھے کہ دوسرے درجہ کے معادلہ کے دو جذر ہوتے ہیں۔ چنانچہ معادلہ کے دونوں جذر نکال کر دکھا دیے —

دوسرے باب میں بعض قواعد جبر و مقابلہ کے دلائل حسابی طریقہ سے لکھے ہیں۔ تیسرے باب میں اسی علم کے مقداروں کو ضرب دینے کے نظریہ پر بہت مفصل بحث ہے۔ مثلاً (س - ب) کو (س - ح) سے ضرب دینا —

چوتھے باب میں معادلات کے ہندسی حل بہت سے طریقوں سے واضح کیے ہیں

اس بحث کی اہمیت سمجھنے کے لئے حسب ذیل مثال پر غور کرنا چاہئے۔



$$س^۲ + ۸س = ۲۰$$

فرض کرو $[ب س] = س$

ب پر ایک مربع ب س ا بنائو۔ اور ی اکو ہ تک اور ی ح کو م تک خارج کرو۔ اور $ا = س - \frac{۱}{۲} \times ۸ = ۳$ اب شکل م م ی مکمل کرو۔

مربع ا ح = $س \times س = س^۲$

مستطیل ب ہ = $س \times ۲ = ۲س$

مستطیل ب م = $س \times ۲ = ۲س$

اس لئے $س^۲ + ۸س$ برابر ہے مربع ا د اور دو مستطیلات ب ہ

ب م کے مجموعہ کے لیکن $س^۲ + ۸س = ۲۰$ اس لئے مربع ا د اور دو

مستطیلات ب ہ اور ب م کا مجموعہ برابر ہے ۲۰ کے

مگر مربع ب ع = $۴ \times ۴ = ۱۶$

جب ہم نے ب ع کی پیمائش ہر طرف سے بنائی تو نتیجہ نکلا

$س^۲ + ۸س + ۱۶ =$ مربع ا ح + مستطیل ب ہ + مستطیل ب م + مربع ب ع

$$\text{لیکن } ۸ + ۱۹ = ۲۰ + ۱۹ = ۳۹$$

اور مربع ۱۸ اور دونوں مستطیل ب ۵ ب ۸ اور مربع ب ۸ کے برابر
 ہے مربع ۱۸ کے ۱۰ اس لئے مربع ۱۸ = ۳۶ یعنی ضلع ۶ برابر ہے ۶ کے
 مگر ۶ برابر ہے ۸ + ۴ کے اس لئے ۸ + ۴ = ۱۲ = ۱۲

چوتھا باب مقادیر جبر و مقابلہ کے قواعد و جمع وغیرہ پر
 مشتمل ہے اس میں تفریق و ضرب و تقسیم کے طریقے بھی بیان کئے ہیں۔
 آخری باب سین ریاضی کے بعض مسائل اور بعض نظریات کی تطبیق
 کی ہے جن میں سے بعض بعض مدارس ثانوی کی درسی کتابوں میں نظر
 سے گزرے ہیں۔

" کتاب المختصر فی حساب الجبر و المقابله " کو بڑی تاریخی اہمیت حاصل
 ہے۔ کیوں کہ اس کتاب کے بعد جتنی کتابیں علما نے لکھی ہیں وہ سب
 اسی کے آثار پر مبنی ہیں۔ لاطینی زبان میں اس کا ترجمہ رابرٹ آف
 چسٹر (Robert of Chester) نے بارہویں صدی عیسوی میں کیا *۔ یہ شخص
 ریاضیات میں مشرقی مآثر سے اتنی دل بستگی رکھتا تھا کہ اس نے بڑے
 اہتمام کے ساتھ اپنی غرض پوری کرنے کے لئے اندلس کا سفر کیا اور دوشلونہ
 میں ریاضی کی تعلیم پائی۔ لاطینی زبان میں قرآن مجید کا پہلا ترجمہ
 بھی اسی رابرٹ کا کیا ہوا ہے +۔

لاطینی میں جبر و مقابلہ کا ترجمہ ہوجانے سے قرون وسطیٰ اور قرون
 جدیدہ کے بہت سے علما نے اس علم سے استفادہ کیا۔ اور یہ علم ان کی
 ریاضی کی تحقیقات اور مطالعہ کا مدار علیہ قرار پا گیا۔ اس سلسلے میں جن

لوگوں کو شہرت حاصل ہوئی وہ یہ ہیں : فیبوناچی (Fibonacci) ' لوقا دو بورگو (Lucas de Burgo) ' پاچیولی (Paccioli) ' کارڈان (Cardan) ' تار تا غلیا (Tartaglia) اور فراری (Ferrari) وغیرہ *۔

عبداللہ ابن حسن ابن الکاسب صید لانی نے " کتاب المختصر " کی شرح لکھی اس کا یہ نام رکھا " کتاب شرح کتاب محمد ابن موسیٰ الخوارزمی فی الجبر " اسی طرح سنان ابن فتم حوافی نے بھی اسی کتاب کی ایک شرح لکھی اور اس نام " کتاب الجبر و المقابله للخوارزمی " رکھا ۔

اس کے علاوہ محمد ابن موسیٰ خوارزمی کی مشہور تالیفات میں ایک کتاب کتاب الحساب الہندی کے نام سے ہے جو انہوں نے کتاب المختصر کے بعد تالیف کی تھی ۔ عجیب بات ہے کہ یہ کتاب مفقود ہے اور اساسی کتب کی مشہور فہرستوں میں اس کا نام نہیں ملتا ۔

بارہویں صدی عیسوی میں انگلینڈ میں ایک شخص Adelard of Bath کا نام یونان و مصر اور بعض بلاد عرب کی سیاحت میں بہت مشہور ہوا اور ساتھ ہی یہ شہرت بھی ہوئی کہ یہ شخص علوم مشرقیہ سے استفادہ کی جد و جہد میں مصروف ہے ۔ اس شخص نے بہت سی عربی کتابیں لاطینی زبان میں ترجمہ کیں ۔ ان منتقل شدہ کتابوں میں کتاب ہندسہ اقلیدس اور کتاب المختصر فی حساب الہندی الخوارزمی ہے جس کا عنوان (Algoritimi de Numero Indorum) کے نیچے لکھا ہے اور لفظ غور یتھی (Algoritimi) مولف کتاب خوارزمی کی نسبت استعمال کیا ہے ۔

حساب کی یہ کتاب اہلی نوعیت کی پہلی کتاب ہے جو یورپ میں آئی۔ اسی لئے علم حساب ایک مدت تک یورپ میں فوریسہوس (Algorismus) کے نام سے، موسوم رہا جو فور یتیمی یعنی (Algoritimi) سے ماخوذ ہے۔ چونکہ ان دونوں کتابوں کو قاریوں اور ریاضیاتی نقطہ نظر سے بڑی اہمیت حاصل تھی اس لئے ان کی بدولت ان کے مولف کی بھی شہرت ہوئی اور ان کا نام اور کارنامہ ہمیشہ کے لئے یاد گار ہو گیا۔ ان کتابوں کے علاوہ خوارزمی کی اور سولقات بھی ہیں۔ یہاں صرف ان کا نام درج کرنا کافی معلوم ہوتا ہے۔ ”زنج الخوارزمی“ ”کتاب الخرامہ“ کتاب العمل بالاصطراب اور کتاب التاریخ۔ (ماخوذ)

فن دباغت

از

حضرت دباغ سیلانی

(۴)

کھال کی خرید و فروخت کو اس مضمون سے زیادہ
 کھال کی خرید و فروخت
 متعلق نہیں ہے مگر ہماری میدان میں جو کچھہ توجہ
 میں آیا ہے اس کے نتائج سے واقف ہوتے ہوئے اس کو نظر انداز کرنا
 بڑی غلطی ہوگی۔ اس لیے چند معمولی طریقے جن کا ملتی میں رواج ہے
 مختصر طور پر لکھ جاتے ہیں۔ ہندوستان کی موجودہ رفتار صنعت و
 حرفت اور تجارت کو دیکھتے ہوئے نہ مالک کارخانہ کو الزام دے سکتے
 ہیں کہ وہ ایک ماہر فن سے تاجر، منشی، محاسب، وغیرہ سب کا کام
 کیوں لیتا ہے، اور نہ کسی فن کے وقف کار کو ہی کوئی الزام لگا سکتے
 ہیں۔ مالک کارخانہ (سرمایہ دار) اول تو صنعت و حرفت اور کوئی اس
 قسم کا کام کرنا پسند نہیں کرتا اور کبھی کسی کے کہنے سننے یا اپنے شوق
 تجارت میں کرتا بھی ہے تو یہ سمجھتا ہے کہ ٹینر صاحب کو معقول تنخواہ
 دی جاتی ہے اور یہ جاپان، انگلستان، امریکہ اور جرمنی کے تعلیم یافتہ
 ہیں اس لیے ان کو ان کے فن کے متعلق خرید و فروخت لین دین سب

میں مہارت ہونا لازمی ہے اور اس لیے جتنا کام چاہو مہار صاحب سے لے لو۔ مہار فن جن کی قابلیت کی قدر کرنے کے لیے ملک بالکل تیار نہیں ہے یہ سمجھ کر کہ اگر کسی کام کے لیے نفی میں جواب دیتا ہے تو مالک صاحب اُسے ناقابل سمجھیں گے اور ملازمت ملنا دشوار ہوگا اس لیے ان سے جو سوال کیا جاتا ہے فرماتے ہیں کہ اگر میں اس کو نہیں جانتا تو دنیا میں اور کون اُسے جان سکتا ہے۔ چنانچہ یہ ہر فن مولا ہو جاتے ہیں۔ قصہ مختصر یہ کہ یہ دونوں صاحب اپنے آپ کو دھوکا دیتے ہیں اور ان کی اس ہت دھرمی کا برا نتیجہ کارخانہ کو برداشت کرنا ہوتا ہے۔ اس حد تک تو زیادہ افسوس نہیں ہوتا۔ کیونکہ ملک میں جدید صنعت و حرفت قائم کرنے کے لیے ہم کو بہت سی قربانیاں کرنا لازم ہے اور اس کے بعد کی نسل ہماری ان فاکسیوں سے فائدہ اُٹھائے گی۔ مگر سرمایہ دار صاحب اور مہار فن کی غلطی سے کوئی برا نتیجہ پیدا ہو تو ملک کے اور احباب جو اس بات کے منتظر تھے کہ فلاں صاحب کا کاغذ کا کارخانہ یا شکر کا کارخانہ یا چمڑے کا کارخانہ اگر کامیاب ہوا تو اللہ کا دیا ہمارے پاس بھی بہت سرمایہ ہے اور ہم بھی کچھ نہ کچھ ضرور کر سکتے ہیں، وہ سب کے سب پست ہمت ہو جاتے ہیں اور ہماری صنعت و حرفت کی رفتار برسوں کے لیے بند ہو جاتی ہے اور ملک اور قوم کو بجائے فائدہ کے سخت نقصان ہوتا ہے۔

کھال سے چمڑا پکا کرنا اور بات ہے۔ خرید و فروخت، لین دین، لوٹ و پھیر وغیرہ سے اس کو کوئی تعلق نہیں۔ مہار فن کا کام یہ ہونا چاہیے کہ کھال سے جو ملک میں نہایت کثرت سے ہوتی ہے، عمدہ سے عمدہ چمڑا بنائے اور اس کی لاگت ایسی کم ہو کہ کارخانہ کا مال چمڑے کی منتقلی میں اوروں کے مقابلہ میں آسانی سے اور نفع سے جلد فروخت ہو جائے۔ اگر

یہ صاحب کچھ سمجھ رکھتے ہیں تو شروع ہی سے اس کا پورا پورا خیال رکھیں گے کہ مال کی لاگت کم آئے ورنہ مال تو بہت عمدہ ہوگا اور ملتی میں نہایت خوشی سے سوداگر خرید بھی لیں گے ' مگر بازار کے نرخ سے فروخت کرنے میں بجائے نفع کے کارخانہ کو نقصان ہوگا۔ تجربہ کہتا ہے کہ کھال کی خرید اور بیکے چمڑے کی نکاسی (فروخت) سے واقف نہ ہونے کی وجہ سے ہندوستان کے بہت سے کارخانوں کو سنہ ۱۹۰۴ء سے اس وقت تک سخت نقصان اٹھانا پڑا ' چنانچہ بہت سے بند ہو گئے ہیں۔ سالی دشواریاں اور مالک کارخانہ و ماہر فن کی بدگمانیاں بھی اس ناکامی کی بڑی حد تک ذمہ دار ہیں۔ اس کے برعکس کھال کے فروخت کرنے والے اور چمڑے کے خریدنے والے نسبتاً فائدہ میں رہتے ہیں، کیونکہ یہ تمام عمر صرف ایک کام کرتے رہتے ہیں اور اس کی اونچ نیچ سے مالک کارخانہ اور دباغ صاحب سے زیادہ واقف ہوتے ہیں۔ جس کارخانہ کا مالک یا ماہر کھال کی خرید و فروخت سے واقف ہوتا ہے اس کی سب سے بڑی مشکل آسان ہو جاتی ہے۔ جس کو کارخانہ کی بڑی کامیابی سمجھنا چاہئے۔ اس لیے کارخانہ میں تقسیم فرائض اور ان کی باقاعدہ انجام دہی نہایت ضروری ہے۔ جو کارخانے بڑے پیمانے پر چلائے جاتے ہیں وہاں تقسیم فرائض کا انتظام بہت ہوشیاری سے کیا جاتا ہے۔ اس میں جو ماہر ہیں وہ کارخانہ کے لیے صیغوں میں سے صرف ایک میں کھال رکھتے ہیں اور برسوں ایک کارخانہ میں صاحب کھال سمجھے جاتے ہیں۔ مگر اس کے دوسرے صیغوں سے بالکل ناواقف ہوتے ہیں اور جس خوبی اور کھال کے ساتھ اپنے صیغہ کا کام انجام دیتے ہیں اسی کارخانہ کے کسی دوسرے صیغہ کو اس خوبی اور کھال کے ساتھ نہیں چلا سکتے —

کھال کی خرید و فروخت کے کئی طریقہ ہیں۔ ان میں سے چند، جن کا زیادہ رواج ہے، درج کئے جاتے ہیں —

۱ - کمیشن پر مال خریدنا :- قصاب کارخانہ کی ضرورت کے مطابق گائے بھینس کی کھال کھیلے سے خریدتا ہے اور اگر کارخانہ اُسی شہر میں ہوا تو جلد از جلد مال کو وہاں بھیج دیتا ہے لیکن اگر کارخانہ شہر سے فاصلہ پر ہے اور مال ریل سے جاتا ہے تو کھال کو کھیلے سے مکان پر لاتا ہے۔ اُس کو خوب دھو کر کھانے کا نمک لگاتا ہے اور جب وہ اس قابل ہو جاتا ہے کہ ہفتہ وار ہفتہ سفر میں خراب نہ ہو تو اس کو ریل سے روانہ کر دیتا ہے۔ کھیلے سے مکان پر لانا، نمک لگانا، گتھری باندھنا اور ریل پر مال چڑھانا، اس کے کل اخراجات کارخانہ کے فہم ہوتے ہیں اور عام طور پر قصاب کو اس کا مستثنانہ چار آلے فی فرد گائے اور آٹھ آلے فی فرد بھینس کے حساب سے دیے جاتے ہیں۔ بعض کارخانہ دار آڑھت سے کام کرتے ہیں جس کے یہ معنی ہیں کہ خرید کرنے والا اور مال فروخت کرنے والے کے درمیان ایک اور صاحب ہوتے ہیں جن کو آڑھت یا کمیشن دار کہتے ہیں اور زیادہ تعداد میں کام کرنے والے ان کی معرفت اپنی ضرورت کا مال خریدتے ہیں۔ اس صورت میں کمیشن دار ایک حد تک دونوں فریق کا خیال رکھتا ہے اور بعض اوقات یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ آپس میں کوئی قرار نہ بھی ہو تو بھی کارخانہ میں اگر مال میں کوئی عیب نکل آیا، تو بیچ بھاڑ کر کے کارخانہ کے ساتھ کچھ رعایت کرا دیتا ہے —

۲ - خرید مکرر :- خرید مکرر اُس کو کہتے ہیں جس میں قصاب کھال کو اُٹھا کر اُس کے وزن اور چھائی کا اندازہ کرنے کے بعد اس کی قیمت

طے کر کے مال خرید لیتا ہے۔

۳۔ تیسرا طریقہ یہ ہے کہ ذبح کے بعد کھال کا وزن کر لیا جائے اور فی سن یا سہرے جو قیمت طے ہو ادا کر دی جائے۔

۴۔ بہترین طریقہ کار خانہ کے لیے چوہہ کے وزن پر کھال خریدنے کا معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ اس طریقہ میں جب کھال کے بال چھیننے سے بغیر صحت کر دیے جاتے ہیں تو اس وقت اس کی کل خوبیاں خامیاں آسانی سے معلوم ہو جاتی ہیں۔ اس کے مطابق سال کو پرکھ کر اس کا وزن کر کے قیمت ادا کی جاتی ہے۔ بالوں میں کھال کے عیب پوشیدہ رہتے ہیں جس کو صرف وہی لوگ تازہ جانتے ہیں جو سہرے بھر اس کام کو کرتے رہے ہیں مگر قازہ ولایت دباغ صاحب کو یہ عیب اسی وقت معلوم ہو سکتے ہیں جب مال چوہہ سے صحت کیا جائے۔ اور اب قیمت چونکہ ادا ہو چکی اس اس لیے ان کے پاس اس کا کوئی علاج نہیں ہوتا۔

اس طریقہ سے مراد وہ طریقہ ہے جس میں مال کو چوہے کے وزن کا طریقہ

اصل چمڑا وزن کیا جاتا ہے۔ کمبلہ سے آئے کے بعد بھی کسی قدر باریک گوشت جھلی یا جھنی لگی رہتی ہے جو اُس وقت یعنی قازہ ہونے کی حالت میں چھڑے سے علیحدہ نہیں ہو سکتی۔ یعنی ہاتھ کی گرفت میں نہیں آتی۔ اس کو چوہہ سے تیار ہو جانے کے بعد چھری سے چھیل دیتے ہیں اور گھری 'ہم' چھوٹی اگر لگی ہو سب کات دیتے ہیں۔ اس کا نرخ پورٹل فی روپیہ میں پیشتر طے ہو جاتا ہے اور پرکھائی، جھائی یا اول، دریم، سویم، داغی کا الگ الگ نرخ طے

ہو جاتا ہے۔ یہ بہترین طریقہ ہے جو ہندوستان میں رائج ہے۔ اور گورنمنٹ ٹیلری کانپور میں بھی یہی طریقہ کام میں لایا جاتا ہے۔ تجربہ بتلاتا ہے کہ چونہ کا وزن کمیلہ کے تازہ چھڑے کے وزن سے دو پونڈ فی چھڑا بھینس میں اور ایک پونڈ فی چھڑا گائے میں کم ہو جاتا ہے۔ بعد ذبح گوشت نکال کر چھڑا بالکل صاف کر کے پانی سے دھویا جائے اور خون وغیرہ سے صاف کر کے دم، چوٹی، کھری کات کر پانی نکال دیئے گئے بعد وزن کیا جاوے تو چونہ میں یہ ہی وزن آوے گا۔

۵۔ مردار یا سکتی گوکھ اور بھینس من کے نرخ سے فروخت ہوتا ہے اور ولایت کے خریدار بھی جو ہندوستان میں خریدتے ہیں وہ بھی من کے نرخ سے خریدتے ہیں۔

۶۔ مصالحہ یعنی فرسے کا گوکھ بھینس بیس بیس پونڈ کے نرخ سے فروخت ہوتا ہے۔ ولایت سال بوجھ والے بھی بیس پونڈ ہی پر نرخ طے کرتے ہیں۔ بھاری بھڑی اور بکری کا عام رواج فی سیکڑہ ہوتا ہے۔ ہندوستان اور ولایت ہر جگہ فی سیکڑہ کا نرخ رائج ہے۔ فی سیکڑہ کا نرخ ناپ پر ہوتا ہے خواہ وہ کیلی ہو خواہ خشک۔ پتنہ بنی ہوئی ہو سب کا نرخ ناپ پر سے ہوتا ہے۔

بکری کی ناپ اس طرح ہوتی ہے :- چھوٹی (Kid '۲۸ — ۳۰ انچ) ہلکی (Light '۳۰ — ۳۲ انچ)، درمیانہ (Medium '۳۲ — ۳۶ انچ)، بھاری (Heavy '۳۶ — ۴۰ انچ) تہل بھاری (Extra Heavy '۴۰ سے اوپر)۔

اب ان پیمائشوں پر نرخ طے ہو جاتا ہے۔ کیسی خوردہ فروش بھی جیسا کہ عام رواج ہے فرد فرد فروخت کرتے ہیں۔

پانی

پانی جس کثرت اور افراط کے ساتھ چھڑا پختہ کرنے کے لیے کارخانوں میں استعمال ہوتا ہے اس کا اندازہ کرنا نہایت ضروری ہے ورنہ کارخانہ کو دن بھر میں لاکھ دو لاکھ منبک پانی کی ضرورت ہوتی ہے اور اس سے کم کا انتظام کیا جاتا ہے۔ اس لیے اس کا لحاظ کر کے انتظام کرنا چاہیے کہ کنویں میں گرمی کے موسم میں بھی کارخانہ کی ضرورت سے بہت زیادہ پانی ہونا چاہیے اور ذخیرہ کے حوض میں جمع کرنے کے لیے اگر انجن کنویں یا ندی پر لگایا جائے تو اس میں کافی سوت ہونے چاہئیں۔ پانی کے ذرائع ندی، کنویں وغیرہ کے سوا اور کوئی نہیں ہوسکتے۔ کیونکہ نلوں سے پینے کا پانی لینا نہایت گراں ہوگا۔ اس لیے کارخانہ کو اپنا انتظام آپ کرنا نہایت ضروری ہے۔

پانی عام طور سے ہلکا اور بھاری کہا جاتا ہے۔ ہلکا پانی وہ سمجھا جاتا ہے جس سے کھانا جلد ہضم ہو اور جس کے استعمال سے کوئی بیماری نہ ہوتی ہو۔ ہندوستان کے مختلف حصوں (اور ہندوستان ریاست کے) بعض صوبہ کے متعلق یہ اکثر سنا گیا ہے کہ وہاں کا تبادلہ تو کالے پانی کا تبادلہ سمجھنا چاہئے۔ اس کے معنی سمجھ میں یہ آتے ہیں کہ ان مقامات کا پانی صحت کے لیے خراب ثابت ہوا ہے۔ اور جانے والوں کو بخار وغیرہ امراض کی شکایت ہو جاتی ہے۔ بعض مساوی العجم پانیوں کو وزن کر کے اندازہ کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ پانی ہلکا ہے یا بھاری۔ سمجھ دار لوگ بھاری یا خراب پانی کو ہمیشہ جوش دے کر ٹھنڈا ہونے کے بعد استعمال میں لاتے ہیں۔ جوش کرنے کے بعد بہت سے نمک پانی کی تہہ میں بیٹھ جاتے ہیں اور مہکن ہے کہ یہ مضر صحت ہوں۔

پانی سب سے اچھا اور صاف ستھرا وہ سمجھا جاتا ہے جو بارش کے

موسم میں زمین پر گرنے سے پیشتر جمع کیا جاتا ہے - اس کا آسان طریقہ یہ ہے کہ موسم ہارن میں ایک نہایت صاف دھوبی کی دھالی ہوئی چادر کو خیمہ کی طرح میدان میں تان دیا جائے اور اس کے نیچے ایک صاف قلعی دار برتن رکھ دیا جائے تاکہ بارش کا پانی چھن کر اس برتن میں جمع ہو جائے - اس کو استعمال کیا جائے - دوسرا طریقہ یہ ہے کہ انجن کی بھاپ کو کسی ترکیب سے سرک کر کے جمع کر لیا جائے یا قریبیقی کے ذریعہ سے پانی کشید کیا جائے - یہ طریقے چلند نفوس کے لئے اور دوا سازوں کے لیے مفید ہو سکتے ہیں مگر تجارتی پیمانہ پر جہاں پانی کا لاکھوں مشک روزانہ صرف ہوتا ہو وہاں ان کا گذر نہیں ہو سکتا - قدرت نے جہاں اچھا پانی عنایت کیا ہے اس سے فائدہ اٹھانا چاہئے -

بارش کا پانی زمین پر بہہ کر اور اس میں جذب ہو کر کنوؤں میں جمع ہوتا ہے - زمین میں بہت سے ٹھک، جو قدرت نے کسی مصلحت سے اس میں رکھے ہیں وہ اس پانی میں گھل کر شریک ہو جاتے ہیں - کسی کنویں کا پانی کھارا کسی کا سیٹھا اور کسی کا بد ذائقہ کھا جاتا ہے - اس کی وجہ ٹھک، شور، سوتا، کی موجودگی ہو سکتی ہے - زمین کے بہت سے نمکوں میں سے بعض نمک کارخانہ کے لیے مفید نہیں ہوتے اس لیے کارخانہ کے لیے عمدہ پانی کا افراط سے ہونا نہایت ضروری ہے -

ٹھک اور اسی قسم کی اور چیزیں اگر پانی میں ہوتی ہیں تو چھال، پتی، اور دیگر کارخانہ کی قیمتی چیزوں کو پھار کر بیکار کر دیتے ہیں اور قلیل مقدار میں موجود ہوں تو جب مال پختہ ہو کر کودام میں آتا ہے، تو اس میں عیب آ جاتے ہیں، جو آسانی

سے اور بلا خرچہ کے دور نہیں ہو سکتے ، اس لیے کارخانہ کے قیام کے وقت پانی کی جانچ پڑتال نہایت ضروری ہے ۔ کیمیاوی طریقہ سے پانی کی اصل خرابی کو دور کیا جاسکتا ہے مگر اس پر جو صرفہ ہوگا وہ کارخانہ کے لیے مفید ثابت نہیں ہو سکتا —

اور رجوہات کے علاوہ جہاں تک خیال کیا جاتا ہے واقعات اس کے شامع ہیں کہ کانپور ، لاہور ، جالندھر ، پھگوارہ ، کرانچی ، بمبئی ، مدراس ، حیدر آباد دکن ، اور میسور وغیرہ کے پختہ چھڑے کی جو تعریف ہندوستان ، انگلستان ، جرمنی اور امریکہ میں کی جاتی ہے اس میں پانی کا بڑا حق ہے ۔ پختہ چھڑا بنانے والے کارخانوں کو اس سے فائدہ ہوا ۔ نہایت افسوس کی بات ہے کہ اس پر زیادہ توجہ نہیں کی گئی کہ ہندوستان کے ایسے مقامات پر جہاں خاص خاص صنعتیں زیادہ فروغ پاتی ہیں ، وہاں ایسی کیا خصوصیات ہیں کہ کارخانے اس خاص مقام پر زیادہ کثرت سے قائم ہوتے ہیں ، ورنہ سائنس ضرور امداد کرتی اور ملک کو معلوم ہو جاتا کہ کانپور اور دیگر مقامات کا پختہ چھڑا کیوں مشہور ہے ، اور اس میں اچھے پانی کا کس قدر حصہ ہے ۔ موجودہ صورت حال میں بیبی کہا جاسکتا ہے کہ اور اسباب کے علاوہ ان مقامات کا پانی بھی اس صنعت و حرفت کے لیے نہایت مفید ثابت ہوا ہے —

پانی خواہ ندی سے لیا جائے یا کنویں سے اس کو کارخانہ میں ایک بڑا ذخیرہ بنا کر جمع کرنا چاہئے تاکہ مٹی وغیرہ ہو تو اس کی تہ میں بیٹھ جائے اور اگر انجن میں کوئی

خرابی ہو جائے یا کوئی اور رکاوٹ پیدا ہو تو یہ کار آمد ثابت ہو۔ یہ ذخیرے کا حوض کارخانے کے سب گوداموں سے کافی اونچا ہونا چاہئے تاکہ کارخانے کے ہر گودام اور حصے میں نہایت آسانی سے پانی تل کے ذریعہ سے وہاں ہر وقت پہنچ سکے اور کارخانے کے ایک حصہ سے دوسرے حصہ میں پانی لائے لے جانے کا ہا کمل صرفہ نہ ہو۔



تحلیل و تخریب اشیا اور اس کا تدارک

از

(جناب حضرت دباع سیلاٹوی)

دنیا کی جس قدر چیزیں ہیں وہ سب فانی کہی جاتی ہیں۔ بعض گھنٹوں میں، بعض چلک دنوں میں، بعض چند ماہ میں اور بعض سال بھر میں غرض گھنٹوں سے لے کر سالوں تک جہلہ اشیا میں کوئی نہ کوئی خرابی پیدا ہو جاتی ہے۔ اور یہ اس وقت زیادہ رونما ہوتی ہے جب کوئی جز اپنے کل سے ہلحدہ ہو یا اس کو ہلحدہ کیا جائے۔ مثلاً دودھ وغیرہ اور اسی قسم کی اور چیزیں۔ دودھ جب تک گائے بھینس کے تھن میں رہتا ہے تب تک اُس کو کوئی چیز خراب یا بگاڑ نہیں سکتی مگر دودھ جہاں نکالا تو اس کا گرم کرنا لازمی ہوا تاکہ وہ زیادہ ٹھیر سکے۔ اس کو وقت پر استعمال کر لیا تو ٹھیک ورنہ پھت جائے گا اندیشہ ہوتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اونٹ کا دودھ گائے بکری وغیرہ کے دودھ سے بھی جلد خراب ہو جاتا ہے۔ گوشت پوست کا بھی یہی حال ہے۔ جب تک جانور زندہ ہے تب تک یہ بگڑتے اور خراب نہیں ہوتے لیکن جہاں جانور اپنی موت مرا یا ذبح کیا گیا وہاں گوشت پوست میں ابتداء شروع ہوئی اور اگر ان کا فوری تدارک نہ کیا گیا تو نہ گوشت

کھانے کے قابل رہتا ہے اور نہ کھال سے کوئی تجارتی فائدہ پہنچ سکتا ہے۔ اس لئے ان کو یا تو فوراً استعمال میں لانا چاہئے یا ان کو خراب ہونے سے پہلے ہی کی فکر کرنا چاہئے ورنہ یہ سب مٹی ہو جائے گا۔

جائزے کے موسم میں جب کہ جانور بارش کے بعد نہایت تندرست اور توانا ہوتا ہے، سردی کی وجہ سے گوشت پوست وغیرہ کے بگڑنے اور خراب ہونے کا کم اندیشہ ہوتا ہے۔ اس موسم میں آگرہ وغیرہ سے نمک وغیرہ لاکر بہت کثرت سے گوشت برما اور ان مقامات کو بھیجا جاتا ہے جہاں فوج کا قیام ہوتا ہے یا جہاں کے باشندے گوشت خور ہوتے ہیں اور گوشت اُن کے یہاں کم ہوتا ہے یا اچھا نہیں ہوتا۔ اس کی اچھی خاصی تجارت ہوتی ہے۔ کھال بھی مختلف طریقہ سے محفوظ کر کے مہالک غیر کو روانہ کی جاتی ہے جس کا کہیں اور ذکر کیا گیا ہے۔ اس موقع پر صرف یہ بتانا منظور ہے کہ کھال وغیرہ کے بگڑنے کے اسباب کیا ہیں اور ان کی خرابی کی روک کس طرح ہوسکتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے کھانے پینے اور آرام کی بے حساب نعمتیں دنیا میں پیدا کی ہیں اور یہ اپنی روزانہ کی ضرورت نہایت آسانی سے پوری کرسکتا ہے۔ مگر دیوانہ انسان کچھ ایسا طامع اور غاصب واقع ہوا ہے کہ ہر روز کی ضرورت کو روزانہ پورا کر کے مطمئن نہیں ہوتا بلکہ چاہتا ہے کہ تمام دنیا اور اس کا کل سامان اپنے اکیلے کے لیے جمع کر لے۔ اور اپنے ہی قبضہ میں رکھے۔ اس کو خوب معلوم ہے کہ یہ خود اس سے بیس تیس سال سے زیادہ فائدہ نہیں اُٹھا سکتا۔ مگر یہ اسی دہن میں اس فضا میں رہتا ہے، اس میں لڑتا جھگڑتا ہے، نفع نقصان دونوں اُٹھاتا ہے؟ دنیا سے نالان ہے، اس پر بھی اس سے عائد ہونا اس کو منظور نہیں ہے۔ چنانچہ اسی اُدھیڑ میں میں عمر تمام ہو جاتی ہے اور بالآخر ایک روز دنیا

سے رخصت ہو جاتا ہے۔ روزانہ یہی ہوتا رہتا ہے —

پھل، پھول، گوشت، پوست وغیرہ ایسی چیزیں واقع ہوئی ہیں جو بہت جلد خراب ہو جاتی ہیں۔ انگور کو لٹھائے۔ یہ جنت کا مہوار کچھ دنوں اچھا رہ سکتا ہے مگر جلد خراب ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ لیکن کشمش پر غور کیجئے جو خشک انگور ہوتے ہیں اور جن کو خشک انگور کہنا بھلا نہ ہوگا۔ یہ کئی ماہ تک اچھی حالت میں رہتا ہے اور یہی حال خشک ترکاریوں اور اسچور وغیرہ کا ہوتا ہے۔ لیکن اگر ہم کو آم، سیب وغیرہ کو خشک کی بجائے تو تازہ یا کچھ اصلی حالت میں زیادہ عرصہ تک محفوظ رکھنا ہے تو ہم کو اور طریقہ اختیار کرنا ہوگا۔ ہم ان کا مربہ اچار وغیرہ بنا کر ان کو رکھ سکتے ہیں۔ یا پھر انگریزی طریقہ پر تہوں میں بند کر کے ان کو محفوظ رکھ سکتے ہیں تاکہ بے موسم کے زمانہ میں ان سے لطف اُٹھائیں۔ مربہ شکر کی چاشنی میں اور اچار تیل وغیرہ میں بنائے جاتے ہیں اور کم از کم ایک سال تک خراب نہیں ہوتے لیکن ان کو چاشنی یا تیل سے علیحدہ کر کے زیادہ عرصہ تک اچھی حالت میں نہیں رکھ سکتے کیونکہ ان پر پھپھوند آنا شروع ہو جاتی ہے اور یہ جلد خراب ہو جاتے ہیں اور کھانے کے قابل نہیں رہتے — اور جو کچھ بیان کیا گیا ہے اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ترچیزیں جلد خراب ہو جاتی ہیں اور خشک خراب نہیں ہوتیں۔ اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ اگر کسی چیز کو خراب ہونے سے بچانا منظور ہے تو اسے خشک کر کے بھایا جاسکتا ہے۔ اور یہ ممکن نہیں ہے تو چاشنی، شہد اور تیل وغیرہ میں رکھ کر ان کو محفوظ رکھا جاسکتا ہے۔ یہ وہ عمل ہے جو ہر ادنیٰ اور اعلیٰ گھرانوں میں موسم کے لحاظ سے عمل میں آتا ہے جس کا سب کو تجربہ ہے۔ اچار، مربہ، کشمش، اسچور وغیرہ کے دیکھنے سے یہ نتیجہ

نکلتا ہے کہ یہ چیزیں پانی کی تری یا نہی اور ہوا کی موجودگی میں خراب ہو جاتی ہیں۔ اس لیے اگر ان کو اچھی حالت میں رکھنا منظور ہے تو ان کو یا تو خشک کر لینا چاہیے تاکہ نہ ان میں نہی ہو اور نہ یہ خراب ہوں اور اگر یہ ممکن نہیں ہے تو شکر کی چاغی، 'شہد' تھل وغیرہ ایسی چیز میں رکھ دیا جائے تاکہ ان تک ہوا کا گذر نہ ہو اور یہ خراب نہ ہو سکیں —

پھپھوند جس کا ذکر آیا ہے اس کو ایک قسم کا خمیر سمجھنا چاہئے جو کائی کی طرح گوشت وغیرہ کے شوربہ پر آ جاتی ہے جس کا اندیشہ پیدا ہوتے ہی باروچی اور ہوٹل والے اس کو خوب جوش دے کر کچھ دیر کے لیے ٹھیرا دیتے ہیں تاکہ یہ کسی کے کام آ جاے اور پھیدکے کی نوبت نہ آے۔ لیکن یہ آگ سے علحدہ ہونے کے بعد زیادہ نہیں ٹھیر سکتا ہے اس لیے اگر جلد استعمال نہ ہوا اور کچھ نہی اس میں باقی رہی تو یہ پھر خراب ہو جاتا ہے اور ایسی صورت میں اس کا استعمال خلاف اصول صحت ہوتا ہے۔ اسی طرح مچھلی وغیرہ جو جلد خراب ہو جاتی ہیں ان کو یا تو بھون کر یا تھل وغیرہ میں تل کر دیر تک اچھی حالت میں رکھ سکتے ہیں یا مچھلی کو برف میں رکھ کر ہم محفوظ رکھ سکتے ہیں اور شہلہ وغیرہ مقامات پر جہاں قدرتی برف قدرت سے دستیاب ہو سکتا ہے وہاں مچھلی وغیرہ کو برف میں رکھنا معمولی بات ہے۔ بھٹی کی مشہور مچھلی جس کو پام فریٹ کہتے ہیں؛ اسی طرح برف میں رکھ کر بھٹی سے باہر بھیجی جاتی ہے۔ اسی اصول کے مطابق امسال ہندوستان کا مشہور میوہ آم ولایت کو روانہ کیا گیا اور بڑی قیمت سے ولایت میں فروخت ہوا۔ بھٹی کا مشہور آم (الفانسو) ہا پوس وغیرہ ایک مشین میں جس کو کیلوی نیٹر (Kelvinator) کہتے ہیں یا اسی قسم کا کوئی اور آلہ یا (Ice chamber) برف کی کوٹھری میں رکھ کر ولایت روانہ

کہیے گئے۔ اس مشین کی حرارت ایسی ہوتی ہے کہ اگر اس میں معمولی پانی رکھ دیا جائے تو وہ بڑھ جاتا ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ خرابی پیدا کرنے والی چیز خواہ وہ خمیر ہو یا پھپھوند وغیرہ ہو کسی چیز کو اس وقت تک خراب نہیں کر سکتی جب تک یہ چیز بالکل خشک ہے یا یہ بڑھ نہیں رکھی ہوتی ہے۔ ان دو صورتوں میں خمیر وغیرہ کا اس پر کچھ برا اثر نہیں ہوتا اور یہ عرصہ دراز تک اچھی حالت میں محفوظ رہ سکتی ہیں۔ خشک آٹے میں کبھی خمیر کا اٹھنا نہیں سنا سکر اس کو پانی سے گوندھا جاتا ہے تو اس میں خمیر اٹھ آتا ہے اور اس کی روٹیاں اچھی ہوتی ہیں لیکن اگر خمیر حد سے زیادہ ہوا تو روٹی بد ذائقہ اور قروش ہو جاتی ہے اس لیے خمیر ہمارے لیے مفید بھی ہوتا ہے اور مضر بھی۔ ہم کو اس کے منافع سے فائدہ اٹھانا ہے اور اس کی مضرتوں سے بچنا چاہئے۔

سائنس یہ کہتی ہے کہ یہ خمیر اور پھپھوند جس کو خرابی کا باعث سمجھا جاتا ہے یہ کسی جاندار چیز کے وجود سے پیدا ہوتا ہے اور ہوا، نمی اور دیگر غذاؤں کی موجودگی میں بڑی سرعت سے ترقی دینے والی طرح بڑھتے رہتے ہیں۔ مگر ان کی بقا کے لئے نمی، تری اور ہوا کا ہونا نہایت ضروری ہے۔ ان کی بقا کی ضرورت کے اسباب میں سے کسی ایک چیز کو کسی ترکیب سے بلند کر دیا جائے تو ان کا جینا دشوار ہو جاتا ہے۔ خمیر کا آٹا زیادہ عرصہ تک نہیں رہ سکتا مگر خمیری روٹیاں خمیر کے آٹے کے مقابلہ میں زیادہ ٹھہر سکتی ہیں۔ اسی طرح مرغی کے اقلے بھی عرصہ دراز تک اچھے نہیں رہ سکتے اور گلہ بے ہو جاتے ہیں لیکن اگر وہ لڑک مرغی کے نیچے رکھ دیے جائیں تو اکیس بائیس روز میں ان میں

بچے نکل آتے ہیں۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ گرمی، حرارت، یا سورج کی تپش حیات کے لیے کس قدر ضروری ہے اور قدرت کی ایک بے جان چیز میں جان تال دیتی ہے۔ اگر اندوں کو مرغی کے جسم کی حرارت ایسی جگہ یا کسی ایسے آلہ میں جس میں مرغی کی حرارت کسی ترکیب سے قائم رکھنے کا انتظام ہو سکتا ہے رکھا جائے تو اندوں میں سے بلا مرغی کے بٹھائے بچے نکل سکتے ہیں اور اسی اصول پر ولایت والوں نے وہ مشین یا آلہ ایجاد کیا ہے جس کی امداد سے بلا مرغی کے اندوں سے بچے نکالے جاتے ہیں —

قدرت کی چیزوں کے خراب ہونے اور بگڑنے کے اسباب اور ان کی روک تھام کے موئے موئے اصول اس لیے بیان کئے گئے ہیں کہ کہاں جو قدرت کا ایک عجیب کرشمہ ہے، اس کو یہ سب مشکلات پیش آنے والی ہیں۔ ان کا حل کرنا اور کہاں کو زیادہ کار آمد بلانا اصلی مقصد سمجھنا چاہئے۔ چرم خام سے لے کر پختہ چمڑا ہونے تک اس کو مہینوں روزانہ خمیر اور پھپھوند وغیرہ سے سابقہ پڑتا رہے گا۔ مہینوں اُن کے مضر اثر سے بچا کر اس کو کار آمد بلانا اور اس گردش میں جہاں اور جس صیغہ عمل میں خمیر وغیرہ سے مفید یا مضر کا سامنا پڑے اُس سے بچنے اور فائدہ اٹھانا ضروری سمجھنا چاہئے —

انہیں اصول کے مطابق ہم کہاں کی حفاظت کرتے ہیں تاکہ یہ خراب نہ ہونے پائے۔ شکر کی چاشنی، شہد اور تیل وغیرہ اس قدر قیمتی اجزاء ہیں کہ ہم کسی حالت میں ان سے فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔ آگ پر رکھ کر خشک کرنا کہاں کو تباہ کرنے سے کسی طرح کم نہیں اور برے میں رکھ کر اس کو خرابی سے بچانا خیال خام سے زیادہ وقت نہیں رکھتا —

تجارتی اصول کی بنا پر ملک کی وہ چیز جو افراط سے ملک میں پیدا ہوتی ہو ' اور نہایت کم قیمت سے ملتی ہو اس کو کام میں لانا یہی کامیابی کا پہلا ذیلہ سمجھنا چاہئے۔ اس لیے کھانے کا نمک ' کھاری نمک ' اور ریہ * (ریو) وغیرہ جو نہایت کثرت سے ہندوستان میں پیدا ہوتی ہے ان کا استعمال زیادہ مفید معلوم ہوتا ہے۔ کھانے کا نمک اور کھاری نمک کھال میں سے پانی اور رطوبت کو کھینچ کر نکال دیتا ہے اور یہ دونوں کھال میں خرابی پیدا کرنے والی چیزوں کے لیے ایک حد تک قائل ثابت ہوئے ہیں۔ کھاری نمک یا پتھہ کے نمک میں جزو اعظم ایک دوا ہوتی ہے جس کو سوڈیم سلفیٹ (Soaium sulphate) کہتے ہیں — کھال کو کئی طرح سے نقصان پہنچتا ہے مگر خاص طور پر دو قابل ذکر معلوم ہوتے ہیں۔ ایک وہ کرم یا کیتڑا جس کو معمولی طور سے دیکھہ کہتے ہیں دوسرے وہ کرم جن کو بلا امداک خوردبین نہیں دیکھہ سکتے۔ اکثر دیکھا جاتا ہے کہ اگر کھال کی دیکھہ بھال وقت پر نہیں کی گئی تو اس کو کرم کھا جاتے ہیں اور کھال خراب ہو جاتی ہے۔ اس لیے کودام میں عام رواج ہے کہ مال کی صفائی رکھی جاتی ہے۔ ورنہ مال کرم خوردہ ہو کر کم قیمت کا ہو جاتا ہے۔ اسی وجہ سے فرسہ وغیرہ کے مال کو سردی کے موسم میں ہوا اور صبح کی دھوپ میں بانس کے

* یہ وہ مٹی ہے جس کو دھوبی لوگ کیتڑا دھرنے میں استعمال کرتے ہیں اور سردی کے موسم میں فدی ' نالوں کے کنارے کثرت سے سپرد برف کے جیسے زمین کے اندر سے باہر کی سطح پر جمع ہوتی ہے —

چوکھٹے پر تان کر خشک کر لیا جاتا ہے اور خوب اچھی طرح خشک ہو جانے کے بعد اس کو سنگھٹے کے پانی میں غوطہ دے دیا جاتا ہے کہ کرم اس کو کھا کر نقصان نہ پہونچائے اور جو کرم اس کی جرأت کرے ان کو سنگھیا ہلاک کر دیتا ہے ۔ وہ کرم جن کو دیکھ نہیں سکتے وہ نمی نہ ہونے اور سنگھیا اور کھاری نمک وغیرہ کی وجہ سے پیدا نہیں ہو سکتے ۔ لیکن جہاں کھال میں کسی قسم کی نمی آئی اور یہ تقویٰ دل اس پر قوت پڑتا ہے —



تعلیل و عظمت کا جی دی نظریہ

از

(جناب محمد زکریا سائل صاحب)

حجم دماغ سے ذکاوت | عوام میں یہ خیال بہت زیادہ رائج ہے کہ حجم دماغ کو کوئی علاقہ نہیں | اور ذکاوت کے مابین نمایاں ترین علاقہ ہے ' عوام ہی نہیں بلکہ بعض متعلم بھی اس خیال کے موید نظر آتے ہیں ۔ یہ لوگ اس پر یقین رکھتے ہیں کہ انسان کا دماغ جتنا بڑا ہوگا اتنی ہی اس کی عقل قوی اور بڑی ہوگی ۔ ” سربڑا سردار کا “ ایک پرانی ضرب المثل ہے ! اس کی عمارت بھی تقریباً اسی خیال پر قائم ہے ۔ رہا امثال و شواہد کا معاملہ تو بظاہر بہت سی مثالیں اس خیال کے صحیح ہونے پر دلالت کرتی ہیں مگر ساتھ ہی بہت سی مثالیں ایسی بھی ہیں جن سے اس کی کوئی تائید نہیں ہوتی ۔

دنیا میں عظمت و ناموری کا راز معلوم کرنے کے لیے ہمہ حاضر کے مفکر علما نے پیہم کوششیں کیں اور آخر اس کی لم ہی معلوم کر کے چھوڑی اور تحقیقات سے ثابت کر دیا کہ عا سی اور عالم کے دماغوں میں نہایت واضح فرق پایا جاتا ہے ۔

اس سلسلہ میں یہ بھی واضح ہو گیا کہ فرق خواہ کتنا ہی نمایاں

ہو، اس کا تعلق حجم دماغ یا تلافیف دماغ (دماغ کی لپیٹیں) (Convolutions) سے کوئی نہیں۔ برخلاف اس کے دماغ میں پہنچنے اور اس کا تغذیہ کرنے والے خون سے اس فرق کو نہایت قوی علاقہ ہے۔ خون کی یہی مقدار یا کمیت ممتاز ذکاوت کا سبب واضح کرتی ہے اور کسی شخص میں دوسروں سے زیادہ جو خاص قابلیت یا کمال پایا جاتا ہے اس کا راز فاضل کرتی ہے۔

جن علما نے دماغ اور ذکاوت و عظمت کے باہم تعلق کا علم حاصل کیا ان میں ڈونالڈسن سب سے پیش پیش ہیں۔ یہ فیلاتو لگیا کے ویسٹر کالج میں علم تشریح کے پروفیسر ہیں۔ انہوں نے کئی سال، متوفی علما کے دماغوں کا مطالعہ کرنے میں گزارے اور عام اشخاص کے دماغوں سے مقابلہ کر کے ان کا فرق اور عظمت کا سبب معلوم کرنے کی کوشش کی۔ ان کا دستور تھا کہ وہ ان دماغوں کے مقیاس و اوزان، ان کی شکلیں اور ان میں پہنچنے والے خون کی مقدار وغیرہ پر غور کیا کرتے اور علمی نقطہ نظر سے ہر بات کی تحلیل و توجیہ کرتے۔ آخر وہ اپنی اس مسنت میں کامیاب ہوئے اور انہیں قطعی طور پر یہ معلوم ہو گیا کہ جو خون دماغ کو لپیٹنے والی غشاء و عائی (جوت دار جہلی) اور جہلی شوکی (وہ نکاس جو مہروں کی پشت پر کانتے کی شکل کا ہوتا ہے Spine) کے واسطے سے دماغ میں پہنچتا ہے اور جسے اطباء کی اصطلاح میں غشاء لین * یا ام رقیق (Piamater) کہتے ہیں، وہی خون عظمت و ذکاوت کا باعث ہوتا ہے۔ یہ غشاء نہایت باریک شفات اور

* غشاء لین دماغ کے نرم ارد باریک پردہ کو کہتے ہیں جو بھیجے کے اوپر

سگریٹ کے کاغذ سے زیادہ پتلا ہوتا ہے اور پورے دماغ پر اپنے ابھاروں کے ساتھ چھایا ہوا ہوتا ہے اور جو خون اوعیہ دسویہ (خون پہنچانے والے جوت) سے اپنی جانب کھینچتی ہے اسی سے دماغ کا تہذیبہ کرتی ہے —

اگر بچہ پورے یا گوسالہ کے دماغ کو چیر کر دیکھا جائے تو اس میں جیسے ہونے خون کی باریک باریک پھتکیاں ملیں گی اور ان میں سے کسی کو جدا کرنے کی کوشش کی جائے تو معلوم ہوگا کہ وہ پھتکی ایک باریک قانت کے ذریعہ سے اور پھتکیوں سے بندھی ہوئی ہے۔ یہی غشاء لپین ہے جس کے تمام تار باہم جڑے ہوئے ہیں اور ان کے مجموعہ سے نہایت فزک پردہ سا بن جاتا ہے۔ اسی میں وفات کے بعد خون کی ننھی ننھی پھتکیاں موجود ہوتی ہیں —

ڈاکٹر روفالڈسن نے ایک مردہ شخص کے دماغ پر تحقیقات کرتے ہوئے، غشاء لپین کو علاحدہ کر کے ایک طرف رکھ دیا تاکہ دماغ کے دوسرے حصوں پر کام کرنے کے بعد اس غشاء پر خصوصیت سے غور و خوض کریں —

اس موقع پر ڈاکٹر نے جدید علمی تحقیقات اور اس کے مسلمات سب کو پیش نظر رکھا۔ ڈاکٹر کو معلوم تھا کہ غشاء مذکور میں اوعیہ دسویہ (تجاریف خون) کی ترتیب، اشخاص کے اختلات سے مختلف ہوتی ہے اور اس اختلات کا ایک خاص مقصد ہوتا ہے۔ حقیقت میں مطلق دلائل ہمیں یہ تسلیم کرنے پر مجبور کرتے ہیں کہ دماغ جن مختلف مادوں سے مرکب ہے ان مادوں کو دماغ کے حجم و شکل میں بڑی اہمیت حاصل ہے۔ اور قرآن بھی سب اس پر دلالت کرتے ہیں کہ خون ہی وہ قوت ہے جس پر دماغ کی حرکت و حیات منحصر

ہے۔ اسی لیے جو عوامل و اسباب دماغ میں خون پہنچاتے ہیں انہیں نظام جسم میں نمایاں حیثیت دی جاتی ہے۔ دماغ کی نسبت سے خون کی جو قیمت ہے اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اگر دماغ سے خون نکال لیا جائے تو بے ہوشی واقع ہو جاتی ہے۔ اور آدمی ہر طرح بے ہوش ہو جاتا ہے۔

ڈاکٹر ہیڈز نے ترکیب اومیہ دماغ کی تحقیق کی تو اس ترکیب اور قوالے عقلیہ کے درمیان بڑا علاقہ معلوم ہوا۔ یہ امر خوب واضح ہو گیا کہ جب یہ قوی اعلیٰ و اکمل ہوں گے تو غشاء لپن میں اومیہ دمیہ کی ترکیب ضرور پیچیدہ اور بہت باریک نظر آئے گی۔ اور جب اومیہ دمیہ زیادہ و پیچیدہ ہوں گی تو اعصاب کے خلیوں کا تغذیہ بہت کافی اور اتم ہوگا۔

ان تمام حقائق کو سامنے رکھ کر ڈاکٹر روفالڈسن نے یہ مطلق نتیجہ نکالا کہ ”دماغ جسم کے ہر عضلہ کی طرح اسی وقت بہت اچھا کام کرتا ہے جب اس کا تغذیہ کرنے والے خون کی مقدار بہت ہوتی ہے“ بالفاظ دیگر ”خون اور قوت عقل کے مابین جو علاقہ قائم ہے“ اس کا انکار ناممکن ہے۔“

اب ایک اور مفروضہ پر نظر کرنا ضروری ہے جو یہ ہے کہ مادہ کی کمیت میں نہیں بلکہ خود مادہ دم کی ترکیب میں قوت عقل کے ساتھ مضبوط اور گہرا تعلق پایا جاتا ہے۔ بعض علما نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ دماغ جو خون حاصل کرتا ہے وہ اعصاب دماغ کے خلیوں میں نمایاں طور پر اثر انداز ہو کر اس میں واضح ترین تغیرات کا باعث ہوتا ہے اور یہ تغیرات، وظیفہ دماغ کے تغیرات سے بالکل متفق ہوتے ہیں۔

مگر اس تمام تحقیق و تلاش کے باوجود، یہ تسلیم کرنا ناگزیر ہے کہ نتیجہ کے لحاظ سے ہلوز اس منزل کی طرف پہلا قدم ہے اور علم یا سائنس غشاءلین (Piamater) میں ارمیہ دسویہ کی تعداد بڑھانے سے عاجز نظر آتا ہے۔ اب تک صرف اتنا ہوسکا ہے کہ خون کے خلیوں میں پہنچنے اور اس کو بہتر بنانے والے خون کی نوعیت بہتر کرنے کے لیے مواد غذائی معین کر دیے گئے۔ اس سے زیادہ کوئی خاص فائدہ حاصل نہ ہوسکا۔

اس موقع پر یہ بیان کر دینا بھی ضروری ہے کہ علمائے فراست کا کچھ مدت پہلے تک عقیدہ تھا کہ بعض لوگوں کے دماغوں میں دماغ کے تمام ابھاروں اور قہودہ (کدی کی ہڈی) کے ساتھ قوالے عقلیہ کے رقبہ کا نہایت قوی اکڑ دیکھا جاتا ہے۔ مگر ان کا یہ عقیدہ جو بالے تحقیق مفکرین کے لیے کافی نہ تھا اس لیے انہوں نے بحث و تفحص سے افراد کے مابین قوالے عقلیہ کے فرق معلوم کرنے کی سہم جاری رکھی۔

علمائے اس گروہ کے مقابل ایک مخالف گروہ بھی تھا۔ جس نے انیسویں صدی کے نصف اول میں کوشش کی تھی کہ کاسٹ سر کی شکل اور قوالے عقلیہ کے درمیانی تعلق کو دلائل سے ثابت کرے۔ اس گروہ کا پیشوا "فرانز جول" تھا۔ اس نے کاسٹ سر کے ساتھ کھوپڑی کے تمام ابھاروں کو بھی اس تعلق میں شریک کر دیا تھا۔

اس کا مقولہ تھا کہ کھوپڑی کے بالائی ابھار دماغ کے اندرونی ابھاروں کے مقابل ہیں اور ہر ابھار کا ایک فوض یا محل مقرر ہے۔ مگر فرانز

جول اور اس کے گروہ کی کوششیں مشکور نہ ہوئیں اور یہ نظریے جہور علما کے نظر میں قابل قبول نہ تھے۔ تاہم فرانس جول کی جدوجہد سے یہ فائدہ ضرور ہوا کہ علماے فراست کی توجہ بجائے چہرے کے دماغ پر مبذول ہو گئی۔

جب فرانس جول والا گروہ اپنی نوبت پوری کر چکا تو اس گروہ کے علما میدان میں آئے جس نے دعویٰ کیا کہ دماغ کے وزن اور قوائے عقلیہ میں شدید علاقہ ہے۔ اس لئے دماغ انسانی جتنا وزنی ہوگا اقلیٰ ہی اس کی عقلی قوتیں زیادہ اور قوی ہوں گی۔ یہ نظریہ حالات کے زیادہ مطابق تھا۔ ایسی صورتیں بہت رونما ہوتی تھیں جن سے اس کی تصدیق ہوتی رہتی تھی مگر چونکہ مستحکمیات کی بھی کثرت تھی اس لئے علما اس کی صحت و صداقت میں شک کرنے لگے۔ مثالیں دیکھتے تو دونوں طرح کی ملتے تھے۔ جیسے لارڈ بیرن جو انگلستان کے چوٹی کے شاعر تھے ان کا دماغ بہت بڑا تھا، اس کے مقابل نیپولین اور اناطول فرانس وغیرہ عظماء تاریخ کے دماغ چھوٹے تھے۔ لوئیسیس اگا سیز مشہور امریکی سائنس دان کا سر بڑا تھا۔ لیکن جب وہ مرا اور اس کے دماغ کو تو لا کیا تو نہایت ہلکا اور خفیف وزن نکلا۔

اس کے بعد اس نظریہ کی باری آئی جو "نظریۂ تلافیف دماغ" یا دماغ کے اپیتوں والا نظریہ کہے جانے کا مستحق ہے اور اس کا خلاصہ یہ ہے کہ دماغ کی تلافیف جس قدر زیادہ اور پیچیدہ ہونگی اسی قدر قوائے عقلی ترقی یافتہ اور کامل ہوں گے۔ مگر اس نظریہ کی نسبت بھی یہ لکھنا ناگزیر ہے کہ بعض حالات میں اس کی تصدیق ہوتی ہے اور بعض میں نہیں ہوتی۔

ان سب نظریوں کے بعد جو نظریہ قائم کیا گیا وہ بہت عظیم الشان ہے اور اب تک نہایت اہمیت سے دیکھا جاتا ہے۔ اس کی اصل یہ ہے کہ دماغ میں چند مرکز ہیں اور ہر مرکز کا ایک کام یا وظیفہ معین ہے۔ مثلاً ایک سماعت کے لئے ہے، ایک بصارت کے لئے ہے، ایک گویائی کے لئے، ایک حافظہ کے لئے ایک زبانیں سیکھنے کے لئے ہے۔ اسی پر اور قوتوں کو قیاس کر لیجئے۔

جب سے یہ نظریہ وجود میں آیا ہے بہت سے لوگ سرنے سے پہلے وصیت کرنے لگے ہیں کہ ہمارے دماغ بعد وفات علمی اداروں کو دے دئے جائیں تاکہ علما ان کا مطالعہ و تحقیق کر کے فرق مراتب عقل کا راز معلوم کریں۔ اس نوع کے مطالعہ و تحقیق کے لئے آج کل یورپ و امریکہ میں متعدد ادارے کھل گئے ہیں جن کا خاص کام دماغ پر تحقیقات کرنا ہے۔ ان میں سب سے بڑا ادارہ کورنیل یونیورسٹی امریکہ کا ہے اور اسی کے برابر و ستر کالج کا ادارہ تحقیقات دماغ ہے۔ اسی آخر الذکر ادارہ میں ڈاکٹر ڈونالڈسن نے اپنی تحقیقات جاری کی جس کے ذکر میں یہ مضمون مرتب کیا گیا ہے۔

ڈاکٹر موصوف نے بہت سے عظام کے دماغوں پر تحقیقات کی، ان کا وزن کیا، ان پر قیاس دوڑایا، ان کی ترکیب اور اپیتوں کا مطالعہ کیا، جھجھوں اور شکلوں پر غور و فکر کر کے نتیجے نکالے۔ اس تمام جد و جہد کے بعد انہوں نے یہ عقیدہ قائم کیا کہ تمام قرینے اس پر دلالت کرتے ہیں کہ جو عامل یا سبب قوالے عقلیہ میں کار فرما ہو کر انہیں ضعیف یا قوی کرتا ہے وہ اسی خوں کی مقدار ہے جو غشائے لہن میں اوعیہ دومیہ کے واسطہ سے دماغی خلیوں کا تغذیہ کرتا ہے، ان کا یہ بھی عقیدہ ہے کہ بعض دماغوں کا ثقل ان دماغوں کے اعصابی خلیوں کے ثقل سے پیدا ہوتا ہے۔ اور بعض

دماغوں کے حجم کی بڑائی انہیں اسبابِ نہو کی کثرت کی دلیل ہے اور دماغ یا کاسہ سر کے بھاری ہونے سے قوالے عقلیہ کو ذرا بھی نسبت نہیں ہے۔ برخلاف اس کے قوالے عقلیہ کا گہرا تعلق اس خون کی مقدار سے ہے جو غشائے لپیں کے ارمیہ و موئے کے ذریعہ سے دماغ کا تغذیہ کرتا ہے۔

(ماخوذ)

—*—

دل چسپ اقتباسات

ریتیم اور اس کے معیر العقول کر شہے

جدید انکشافات کی موجودہ رفتار کی بنا پر کوئی نہیں کہہ سکتا کہ ہمارے اس بے حقیقت سیارے پر ہی خدا کے بے شمار عطیوں میں سے کوئی ایسی شے ہاتھ نہ لگ جائے گی جو زندگی اور موت کے مسئلوں کو یکسر بدل دے۔ ہم نے جن چیزوں کو مسلمہ اور واجب سمجھ کر اپنے افعال کو ایک نہج پر ترتیب دیا ہے ممکن ہے کہ کسی فنی دریافت کی روشنی میں ان میں ایک انقلابی تغیر لازم آجائے۔ اس سلسلہ میں سر فریڈرک ہاپکنس کے الفاظ قابل توجہ ہیں جو انہوں نے مانتھورٹ ہال میں برطانوی سائنٹفک ایسوسی ایشن کو خطاب کرتے ہوئے اپنے صدارتی خطبہ میں فرمائے۔ حیاتی کیمیا (Biochemistry) کی جدید ترین تحقیقات ہر سمت میں ترقی کر رہی ہے۔ انسانی اغراض و مقاصد پر اس کا اثر بہت واضح ہوا جہاں جدید سائنس فلسفہ کے سابقہ ہم آہنگ ہوتی ہے وہاں ان امور پر چند معرکہ الازم مقامات میں یہ دکھایا گیا ہے کہ انسانی ذہن اور نفسیاتی عمل طبیعیات کے ساتھ کس حد تک وابستہ ہیں اور خود خدا کی ذہنی تشکیل پر ظن آرائی کہاں تک ممکن ہے۔ حیاتیات کے علم اور عمل کا تعلق جو معاشرتی ترقی کے سلسلہ میں نہایت اہم ہے انسوس ہے کہ اب بوی توجہ کا محتاج ہے جو اوک تغذیہ اور صحت پر چٹان بین کر رہے ہیں عرصہ ہوا اس نتیجہ پر پہنچ چکے ہیں کہ انسان کے لئے سب سے زیادہ مفید ترین غذا اب تک دریافت

فہمیں ہوئی۔ یہ کہ النسب غذا وہ ہوگی جو انعطاط اور فنا کا سد باب کرے بالکل قرین قیاس ہے۔ نسل کا موجودہ تغذیہ کے ساتھ اب تک چلے جانا کوئی دلیل نہیں کہ آئندہ ترقی کی گنجائش نہیں —

زندہ اجسام پر کیمیائی ترکیب کا اثر بہت دور رس ہے اور انکشاف کا میدان نہایت وسیع۔ اس بنا پر کچھ بعید نہیں کہ کسی نئی تحقیق پر ہمارا زاویہ نگاہ زندگی اور اُس کے لوازم کی بابت بالکل بدل جائے۔ ہم ساری اشیا کے خواص اور اُن کے کیمیائی امکانات اس قدر محدود طور پر جان سکے ہیں کہ کوئی تعجب نہیں کہ حوادث کے مقابلہ میں ہماری بے بسی ویسی ہی ہے جیسی مثلاً دو ہزار برس قبل تھی۔ دنیا ایک غیر محدود معمل ہے اور انسان محقق۔ کسر صرف اتنی ہے کہ محقق کو اشیا کا باقاعدہ جائزہ نہیں دیا گیا۔ لہذا اُسے جو کچھ مشاہدات اور تجربات کرنا ہیں اپنی اذنی تحریک سے کرنا ہوں گے اور نتائج میں کامیابی اُسی حد تک ہوگی جس حد تک معمل کے ارکان معملی ضوابط پر کاربند ہوں گے۔

تجربات کا منشا انسانیت کی تکمیل ہے —

موجودہ صدی کے کشفیات میں سے فضا کی تسخیر کے علاوہ کوئی انکشاف اس قدر حیرت انگیز نہیں جتنی ریڈیم کی دریافت، جسے سنہ ۱۸۹۸ ع میں پروفیسر وینٹیم کیوری نے حسب اتفاق معلوم کر لیا۔ اس طرح اگرچہ اس کا راز اُنیسویں صدی کے آخر میں کھلا لیکن چونکہ اس کے مختلف خواص بتدریج ہی حاصل ہو سکے۔ ہیں اس لیے فی الحقیقت اُسے بیسویں صدی سے منسوب کرنا زیادہ مناسب ہوگا۔ ریڈیم کے متعلق ہم طور پر لوگ صرف دو باتیں جانتے ہیں۔ ایک تو اس کی کیمیائی اور بیش قرار قیمت، دوسرے اس کی مخصوص حدت۔ لیکن اس کے امکانات اور دیگر خواص سے ماہرین اور اہل سائنس کے

علاوہ کم لوگ واقف ہیں لہذا اس عجوبہ روزگار معدنی جوہر کے متعلق یہ چند سطور دلچسپی سے خالی نہ ہوں گی —

حقیقت یہ ہے کہ رنٹگنی (Rontgen) شعاعوں کی دریافت کے بعد سے اہل فکر ریدیو کے عمل تابکاری (Radio activity) کی بابت نئے نئے امکانات پر طعن آرائی کرنے لگے اور بالآخر پروفیسر کیوری نے تابکاری کے اس عظیم الشان خزانہ سے دنیا کو روشناس کرایا ۔ یہ ایک تابکار دھات ہے اور برخلاف نور کی اور شکلوں کے اس میں اس قدر طاقت ہے کہ کثیف (Opaque) اجسام میں سے روشنی اور حدت گزار دیتی ہے ۔ تابکار اشیاء بعض اور بھی ہیں مثلاً تھوریئم اور یورانیم ۔ مگر یورانیم ہماری بحث کے سلسلہ میں اس لیے کار آمد ہے کہ ریڈیم کا وجود اُن ہی مادی ذخائر میں ہوا جن میں اس کے معینہ اجزا شامل ہوں گے ۔ چنانچہ فی الحقیقت یورانیم وہ عنصر ہے جو تابکاری کا ماخذ ہے ۔ اس گراں قدر دھات کے ذخائر اس قدر جستجو اور کاوش و محنت کے بعد ملتے ہیں کہ ۱۵ ہزار پونڈ فی گرام بھی یقیناً اس کے لیے کم قیمت ہے ۔ زیکو سلاقیہ ، وسط افریقہ ، آسٹریلیا کو لوروتو اور پرتگال میں بعض خام معدنیات ہوتے ہیں جن سے یورانیم اور بالآخر ریڈیم حاصل ہوتے ہیں ۔ اور ۶ ٹن یا ۱۶۵ من خام دھات میں سے سات کلو گرام ایک گرام ریڈیم نکل سکتا ہے ۔ لیکن عملاً ایسا بہت کم ہوتا ہے کہ کسی معدنی ذخیرہ میں ۵۰ فی صدی یورانیم موجود ہو ۔ چنانچہ خام دھات کے ۱۰ ٹن (۲۷۵ من) میں بھی اگر گرام بھر ریڈیم برآمد ہو جائے تو اس ذخیرے کو غنیمت سمجھا جاتا ہے اور بعض اوقات دوسو ٹن میں سے ایک گرام بھی نکل آئے تو اس معدن پر کام کیا جاتا ہے —

ریڈیم نکالنے کے طریقوں میں اب تک کوئی مزید ترقی نہیں ہو سکی ۔ اسی

لیے یہ عوام کی دسترس سے باہر ہے اور انسان کی زندگی اس سے کافی طور پر مستفید نہ ہو سکی۔

ریڈیم کی شکل کیا ہے؟ یہ ایک سیسہ کی فلکی میں رکھا جاتا ہے جس کے اندر کی جانب ایک باریک سا شیشے کا پردہ ہوتا ہے۔ یہ شیشہ سیوریہن والا ہوتا ہے اور اس کے اندر آلپین کے سرے کی برابر ایک مدہم پیلی روشنی ہوتی ہے۔ یہ ہے لاکھوں روپیہ کی قیمت کی حقیقت! تاریکی میں یہ روشنی بہت تیز ہو جاتی ہے اور دور سے دکھائی دیتی ہے۔ اس کا نور متزہر یا عارضی نہیں ہوتا بلکہ اشعاعی قوت ہوتی ہے۔ جس میں صدیوں اور قرونوں تک کوئی فرق نہیں آ سکتا بلکہ اپنے محدود وقت کی نسبت سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہمیشہ برقرار رہے گا۔ اس میں اتنی حدت ہوتی ہے کہ اسی قدر وزن کے پانی کو گھنٹہ بھر میں اُبال دے گا۔ یہ عمل ہزار برس تک جاری رہ سکتا ہے۔ اس کی حدت تپش کے کسی تغیر کے تحت کیوں نہ دیکھی جائے ہمیشہ یکساں رہے گی۔ لاشعاعوں کی نفوذی طاقت کو سیسہ کی ایک خاص دبازت روک دیتی ہے۔ لیکن ریڈیم کا نور پتھر کی دیواروں اور جہازوں کی فولادی پلیٹوں میں سے بھی نفوذ کر جائے گا۔ کہتے ہیں کہ ریڈیم کے ایک ٹیوب کو انسانی درد کو دور کرنے کے لیے پچاس نسلوں تک کام میں لایا جاسکتا ہے۔ اس زبردست قوت سے انسانی زندگی میں کس قدر انقلاب ہو سکتا ہے۔ قیاس کرنے کی بات ہے۔

فی الحقیقت ریڈیم کے شفا بخش عمل کے ساتھ جو وہ زندہ اجسام پر کرنے کے قابل ہے بڑی بڑی امیدیوں وابستہ کی جا رہی ہیں۔ اس وقت تک تمام عالم کے جید اطباء اور حفظان صحت کے ماہرین سرطان کے سرس کو لا علاج سمجھتے رہے ہیں اور اس سے شفا یا بی تقریباً معال سمجھی گئی ہے

لیکن ریڈیم کے ماہرین نے بالآخر موت کے اس زبردست گھاٹہ کو بھی مسخر کر لیا اور خون کی تحریک و تولید سے قطع نظر درد اور تکلیف کو بالکل زائل کر دیا ہے۔ چنانچہ انٹر عمل جراحی کی ضرورت اس کی وجہ سے دور ہو گئی۔ مضر اندرونی ہالید کی ہر اس کا اثر فوری ہوتا ہے حالانکہ دوسرے حصوں کو ساڑت ہونے سے روکنا اب تک ممکن نہیں ہوا۔ گوشت خور (Rodent ulcer) کے علاج میں ریڈیم کو نمایاں کامیابی حاصل ہوئی ہے اور فی الحقیقت وہ ماہرین طب ہمارے شکر یہ کے مستحق ہیں جو مختلف انسانی کھزوریوں پر اس کو آزما رہے ہیں۔ ممکن ہے کہ مستقبل قریب میں شاندار نتائج پیدا ہوں۔ مگر انسانی کھزوریوں کے علاج کے ماسوا تندرست جسموں پر اس کا عمل زیادہ بار آور ہوگا۔ حال ہی میں یہ بات منکشف ہوئی ہے کہ کولورو تو میں ریڈیم کی کانوں میں کام کرنے والے مزدور عموماً نہایت تندرست رہتے ہیں۔ ایک امریکن طبی ماہر نے کئی سال تک اُس مقام پر اپنے مشاہدات قائم رکھے اور آخر کار اس نتیجہ پر پہنچا ہے کہ کان کلون کی عہدہ صحت کا راز یہ ہے کہ اُس مقام کے پانی میں ریڈیم کا خفیف اثر آگیا ہے۔ اس دریافت کے بعد سے ماہرین نے ریڈیم زدہ گولیاں اور تکیاں تیار کی ہیں کہ استعمال عمر رسیدہ اور ضعیف اشخاص کے لیے نہایت مفید اور صحت بخش ثابت ہوا۔ بعض صورتوں میں برسوں کا درد کچھ دنوں کے استعمال سے رفع ہو گیا۔ مریض کی بھوک بھل گئی اور زندگی کے نئے ولولے پیدا ہو گئے۔ بالفاظ دیگر شباب کا دوبارہ حاصل ہونا اور برقرار رکھنا اس کی بنا پر قرین فہم ہو گیا ہے۔ ممکن ہے کہ آئندہ ریڈیم اور خدود کے ایک مشترکہ طریقہ علاج سے ہم اسی برس کے نوجوان پیدا کر سکیں۔ اس کو بیجا امید پر مہول نہ کرنا چاہئے۔ آج جو باتیں ہم دیکھ رہے ہیں

سن رہے ہیں اگر پچاس برس اُدھر کسی پرجوش فردائی سے کہتے تو وہ بھی ہمیں 'بیوقوفوں کی بہشت' کا مستحق قرار دیتا۔ حقیقت میں مستقبل کے امکانات کی کوئی حد بندی نہیں کر سکتا —

قیمتی پتھروں اور جواہرات پر ریڈیم کا عمل اور زیادہ حیرت انگیز ہے۔ لعل، پکھراج، فیلم وغیرہ کے معمولی رنگ بوجہ اندرونی ٹوٹوں کے ایسے معلوم ہوتے ہیں ورنہ خالص ہونے پر اُن کی آب و تاب نہایت نظر فریب ہوتی۔ چنانچہ ریڈیم کی شعاعوں سے جب ان کو متواتر جلادی جاتی ہے تو اندرونی ٹوٹیں دور ہو جاتی ہیں۔ اُس وقت وہ جواہرات حقیقت میں اپنی قیمت کے اہل ہوتے ہیں —

غرض کہ کوئی کہہ نہیں سکتا کہ ریڈیم کے خواص اُتار دہ کس طور پر افسانہ کی کار براری میں حصہ لیں گے اور طبیعی زندگی کس حد تک اس کی رہیں منت ہوگی۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ جب میڈیم کیوری وغیرہ نے دنیا کے آگے اس کراں بھاگھلنے کو پیش کیا تو اُنہوں نے اپنے ہم نسلوں کی ایک زبردست خدمت کی اور سائنس کی ترقی میں مستقل حصہ لیا۔ ہم خدا کی اس عجیب ترین نعمت سے محض سطحی طور پر آگاہ ہوئے ہیں اور زندگی کے لوازم میں سے صرف چند چیزوں پر اسے تجربہ کیا ہے۔ یقین ہے کہ جتنا زیادہ ہم اسے جانیں گے اُتنا ہی زیادہ حیرت کا مقام ہوگا اور اس درمیان میں دوسری ترقیوں کے دوسرے بدوہ نہ معلوم کہاں تک پہنچ جائیں گے —

آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آ سکتا نہیں

محو حیرت ہوں کہ دنیا کیا ہے کیا ہو جائے گی

دلچسپ معلومات

بھینک کی ایجاد | عموماً خیال کیا جاتا ہے کہ بھینک جدید تمدن کی پیداوار ہے ، مگر کچھ مدت ہوئی جب ارضیاتی تحقیقات سے یہ ثابت ہو چکا ہے کہ بھینک کا طریقہ قدما میں بھی رائج تھا ۔ عراق میں جو آثار برآمد ہوئے ہیں ان سے پتہ چلا ہے کہ اہل بابل ۵۰ ہزار سات سو برس پہلے بھینک کی قسم کا لین دین کرتے تھے —

ان آثار میں پختہ ایلت کی جو تختیاں لکھی ہوئی دستیاب ہوئی ہیں ان سے استدلال کیا گیا ہے کہ شہر بابل میں (۷۰۰) سال قبل مسیح ایک بھینک " ایچی بی اور شرکا " کے نام سے تھا جو مروجہ بھینکوں سے بالکل مشابہ تھا اس میں حسابات جاریہ ، معاہدات ، دستاویزیں ، حصص وغیرہ سب کی معاملت ہوتی تھی —

چونکہ اس زمانہ تک کاغذ ایجاد نہیں ہوا تھا اس لیے لوگ پکی ایلت پر عبارت کندہ کر کے حرارت کے ذریعہ سے تحریر کو محفوظ کر لیتے تھے اور دھارت اتلی پختہ اور محفوظ ہو جاتی تھی کہ اب بھی اسی طرح اچھی حالت میں نظر آتی ہے —

دول یورپ میں کتاب کے اوپر بھی بڑی منافست اور سب سے بڑی کتاب | مقابلہ رہا ہے ۔ ہر ایک نے اس کی کوشش کی کہ ہمارے

یہاں سب سے بڑی کتاب ہو —

یہ بڑی کتابیں زیادہ تر تورات و انجیل ہوتی ہیں مگر اب معلوم ہوا ہے کہ جرمنی کی روستوک یونیورسٹی میں جو یورپ کی سب سے پرانی یونیورسٹی ہے ایک کتاب سب سے بڑی محفوظ ہے جس کا طول دو میٹر اور عرض سوا میٹر ہے۔ اس کتاب کو اتنے عمدہ نقش و نگار اور فنی خوبیوں سے مزین کیا گیا ہے کہ اس کا شمار نادر کتابوں میں ہوتا ہے۔ کتاب کی موجودہ زیب و زینت سولہویں صدی کے ماهر دستکاروں کی دھین منت ہے۔ موضوع کے لحاظ سے یہ کتاب مختلف علوم پر حاوی ہے 'جغرافیائی'؛ 'ہندسی'؛ ادبی اور تاریخی معلومات کا اچھا ذخیرہ ہے۔ اس کے اوراق نہایت اچھی حالت میں باریک کپڑے پر چسپان ہیں اور اس کی حفاظت کے لیے خاص اہتمام و انتظام کیا جاتا ہے ' اور اسے دیکھ و غیر سے محفوظ رکھنے کے لیے تازہ ترین ایجادوں سے کام لیا جاتا ہے۔ تاکہ کتاب کو کسی قسم کا نقصان نہ پہنچ سکے —

مچھلیوں کا انجھاد | مچھلیوں کے متعلق مشہور ہے کہ وہ جم کر برت کے ٹکڑے کی طرح ہوجاتی ہیں اور پھر بھی زندہ رہتی

ہیں۔ اس کے مائلے میں بعض سائنس دانوں کو شک ہوا اور فرانس کے ایک عالم نے میٹھے پانی کی مچھلیاں جمع کر کے ان پر تجربات کیے۔ مچھلی اور برت کو ملا کر ایک ٹکڑا بنا لیا اور مقررہ احتیاطوں کے بعد اُسے توڑا مگر جب برت پگھلی تو مچھلی میں جان آگئی اور تیرنے لگی۔ واضح رہے کہ اس تجربہ میں درجۂ انجھاد صفر سے نیچے ۲۰ درجہ سے زیادہ نہ ہونا چاہئے —

دماغوں کا عجائب خانہ | وائلا میں ایکو نو مو نام کے ایک قاتل نے بڑے بڑے عالی رتبہ آدمیوں کے دماغوں کا ایک عجائب خانہ بنایا ہے۔

اس ڈاکٹر کا یہ کام ہے کہ وہ ماہرین فن، عالمان، ادیبوں اور باکمال جنرلوں اور سیاست دانوں کے دماغ جمع کرتا رہتا ہے۔ جو دماغ اسے ملتا ہے اسے ایک شیشہ کے صندوقچہ میں محفوظ کر کے جس شخص کا دماغ ہے اس کا نام اور دماغ کارزن وغیرہ لکھ دیتا ہے اور اس کی بڑی حفاظت کرتا ہے۔ ڈاکٹر ایکونومو کو اب تک کچھ بہت زیادہ دماغ نہ مل سکے۔ مگر اب وہ ہر قوم کے مشاہیر سے مراسلات کر کے توجہ دلا رہا ہے کہ وہ لوگوں کو وصیت کر دیں کہ ہمارے مرنے کے بعد ہمارا دماغ اس عجائب خانہ کو بھیج دیا جائے۔ دنیا کی جدت پسندی یقین دلاتی ہے کہ تہوڑے ہی دنوں میں یہ عجائب خانہ بہت وسیع اور قابل دید ہو جائے گا اور لوگ بڑے ذوق و شوق کے ساتھ اس کی سپر کیا کریں گے۔

ابھی ہلدوستان کے لوگ دور حاضر کے سب سے بڑے علمی و قومی رہنما سر سید مرحوم کو نہ بھولے ہوں گے جن کے متعلق عام شہرت تھی کہ بارہا ان کے دماغ کی قیمت لک چکی ہے اور انگریز اس کی بڑی سے بڑی قیمت ادا کرنے کو تیار تھے۔ اسی مناسبت سے جرمنی کے شاعر اعظم ہر ماں سو درماں کا تذکرہ بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا جس کے انتقال کو ابھی زیادہ زمانہ نہیں ہوا۔ اس شخص نے انتقال سے پہلے وصیت کی تھی کہ میرا دماغ ”کایزر فہلم“ ہولن کے ایک ادارہ کو دے دیا جائے۔ اگر اس وقت واڈنا والا دماغوں کا عجائب خانہ موجود ہوتا تو بلاشبہ جرمنی شاعر کا دماغ اسی کے حصہ میں آتا۔

ولہم ویدماں جرمنی کے ایک ۸۰ سال والے بڑے سگریٹ کے تباہوں کا محل

شخص کے دل میں مدت سے دیواروں کو کافدوں سے سجائے کا خیال جاگزیں ہے، بہت دن سے وہ اسی مشغلہ میں تھا۔

پھر اسے خیال آیا کہ سگریٹ کے تباہوں سے قصر سانسوے کے نمونہ کا ایک محل بنائے جو فریڈوک اعظم نے بو تسدام میں بنایا تھا۔ اس خیال کی تکمیل میں اس کے ۸ سال گزرے مگر آخر وہ اس ارادہ میں کامیاب ہوا اور بالکل اسی نمونہ کا محل تیار کر لیا۔ اس واقعہ سے اس کی مہارت واستقلال کا اندازہ آسانی سے کیا جاسکتا ہے۔

اندھوں کی عینک | ڈاکٹر ولیم فزیلوم امریکی نے سات سال کی مسلسل تحقیق کے بعد دوربین کی ایک عینک ایجاد کی ہے جسے وہ لوگ استعمال کر کے فائدہ اٹھا سکتے ہیں جن کی قوت بینائی ۲ فی صدی ہو۔ یہ تسلیم کیا جا چکا ہے کہ جس شخص کی قوت بینائی ۲ فی صدی ہو وہ اندھا شمار کیا جاتا ہے۔

صفر مطلق | درجہ صفر مطلق وہ درجہ ہے جس کے اثر سے ہر حرکت سرد ہو جاتی ہے یہاں تک کہ جوہر فرد اور برقیہرے بھی اپنی حرکت کو کھو بیٹھتے ہیں۔ غالباً یہی وہ درجہ ہے جو ابھی تک انسانی دسترس سے باہر ہے۔ یہ دنیا کے کل جوائب اور اجرام فلکیہ کے ہر جرم میں پایا جاتا ہے۔ علما نے صنایعہ تدبیروں سے اسے حاصل کرنے کی کوشش کی تو صرف ۴۵۹°۱ فارن ہیت تک پہنچ سکے۔ جو درجہ صفر مطلق ۲۷۳° سلتی گریڈ یا ۴۵۹°۸ سے سات اعشاریہ کم ہے۔ علما ہلوز تدابیر سے غافل نہیں ہیں اور برابر اسی کوشش میں لگے ہوئے ہیں کہ آخری درجہ اپنے انتہیک تجربات سے معلوم کر لیں۔ اس درجہ کو معلوم کرنے کی زیادہ کوشش اس لیے ہے کہ اس کی بدولت بہت سی علمی مشکلات حل ہو جائیں گی۔ منجملہ ان کے علمی نقطہ نظر سے خلاء تام حاصل کرنا ہے اور سخت اور نہایت مضبوط قسم کا فولاد بنانا مکمل نظر ہے۔ اس کے علاوہ اور بہت سے

مسائل بھی ہیں جو آخری درجہ صفر مطلق معلوم ہونے پر خود بخود حل ہو جائیں گے۔

یہ مادی عناصر کا اکٹھا ہوا عنصر ہے جسے علما اب عنصر ایلینیم کہتے ہیں۔ یہ نہ جدا کر سکے تھے۔ حال کی علمی خبروں سے معلوم ہوا ہے کہ پروفیسر مورسی کوری (پروفیسر کوری) نے پروفیسر تگورین کی مدد سے عنصر ایلینیم بھی ملے۔ کر دکھایا ہے۔ یہ عنصر ان مشہور عناصر میں سے ہے جو بیش قیمت ارضیات کہے جاتے ہیں اور معدنی اوکسائیڈ کے مرکبات ہیں۔ اس عنصر کے جو خواص معلوم ہوئے ہیں وہ ریتیم سے بہت مشابہ ہیں۔

حرارت شمس | ڈاکٹر چارلس ایبٹ ایک امریکی عالم کا بیان ہے کہ جو حرارت سورج سے پیدا ہوتی ہے وہ آئندہ دو سال میں بہت کم ہو جائے گی۔ یہ کہی اس صدی کے آغاز سے منسوب ہوگی۔ مگر آفتاب کی حرارت کی یہ کہی زمین کے حالات پر کچھ اثر نہ کرے گی کیوں کہ یہ حالات بہت سے دوسرے عوامل و اسباب سے وابستہ ہیں۔

لکڑی کو سخت بنانے کا نیا طریقہ | بعض اہل سویدن نے نرم لکڑی کو دھاڑ دے کر اسے معدنی اشیا کی طرح سخت بنانے کا طریقہ دریافت کیا ہے۔ نرم لکڑی لے کر خاص طریقوں سے اس کے داخلی خلیوں کی تمام ہوا جذب کر لی جاتی ہے۔ پھر ان خلیوں پر میکانیکی طاقت سے دھاڑ پہنچا جاتا ہے جس کی بدولت لکڑی نہایت سخت اور ٹوٹنے کی طرح مضبوط ہو جاتی ہے۔ مضافی نہ وہ کہ لکڑی کو سخت کرنے کا ایک طریقہ اور بھی وہاں مشہور ہے اور وہ یہ ہے کہ لکڑی کے ریشے تلے اوپر رکھے کر

ان پر ایک دم زبردست دباؤ ڈالا جاتا ہے جس سے لکڑی نہایت سخت ہوجاتی ہے اور معمولی لکڑی سے بوجھ چند بہتر و افضل ہوتی ہے خصوصاً اس کا وزن نہایت کم ہوتا ہے۔ اور اس طرح بنائی ہوئی لکڑی لوہے پیتل وغیرہ کی مانند اچھی طرح صیقل کی جاسکتی ہے۔

اب تک علما کا خیال تھا کہ جو روشنی محیط آفتاب سے نور آفتاب خارج ہوتی ہے وہ اپنی تابش اور چمک میں مرکز آفتاب سے صادر ہونے والی روشنی کے برابر ہے۔ مگر جدیدہ عالمی تحقیقات اور رصد گاہوں کی رپورٹیں ظاہر کرتی ہیں کہ محیط آفتاب کی روشنی مرکز کی روشنی سے بہت کم زور ہوتی ہے۔

عالمی حیوانیات نے دریائے کانگو کے جنوبی علاقہ میں کوٹا قد چھپانزی چھپانزی ہندو کی ایک نئی قسم معلوم کی ہے۔ اس صنف کے ہندو بہت کوتاہ قد ہیں۔ چھپانزی ہندوؤں میں ان سے چھوٹا ہندو کوئی نہیں ہوتا۔ اس ہندو کی آنکھیں اور کان امتیازی طور پر چھوٹے ہیں اور اس کی آواز تمام ہندوؤں کی آواز سے مختلف ہے۔ چند سال قبل بعض امریکی علما نے اس نوع کو معلوم کر کے خیال کیا تھا کہ یہ چھپانزی سے جدا صنف کا ہندو ہے مگر جدید دریافت سے یہ خیال دور ہو گیا۔

دستاویزوں کا جعل و فریب آسٹریا کے ایک عالم کیمیا نے دستاویزوں کا جعل معلوم کرنے کا طریقہ سے سرکاری کاغذات اور دستاویزوں کا جعل و فریب آسانی ظاہر ہوجاتا ہے۔ یہ طریقہ آسٹریائی گورنمنٹ کو بہت مفید معلوم ہوا اور وہاں اس قسم کے حوادث میں اسی طریقہ سے کام لیا جاتا ہے۔

اس کی تفصیل یہ ہے کہ دنیا کی تمام روشنائیاں کسی نہ کسی شکل کا کلورائڈ مادہ رکھتی ہیں۔ فرق کمیت کا ہوتا ہے (معمولی فہک بھی ایک کلورائڈ ہے)۔ یہ مادہ ورق میں پھیل کر کاغذ کے خلیوں میں بتدریج جذب ہو جاتا ہے لیکن بعض آنکھ اسے دیکھنے سے قاصر رہتی ہے۔ اگر کسی نوشتہ پر کیمیائی عمل کیا جائے تو کلورائڈ کا اثر ورق پر اتنا واضح ہوتا ہے کہ اس سے تاریخ نوشتہ معلوم کر سکتے ہیں۔ مثلاً اگر تحریر ایک گھنٹہ پہلے کی ہے تو کلورائڈ کے آثار نہایت واضح اور جلی ہوں گے، ایک دن پہلے کی ہوگی تو یہ آثار واضح مگر ان کے خطوط عریض نظر آئیں گے۔ چار دن پہلے کی ہوگی تو غیر جلی۔ اور دو مہینہ یا سال دو سال پہلے کی تحریر پر دوسری علامات واضح طور پر نظر آئیں گی۔ اس طریقہ سے جملہ و فریب کا عمل دستاویزوں پر چھپانا بہت دشوار ہو گیا ہے۔

عجیب مرض | امریکہ کے ایک علمی رسالہ کی خبر ہے کہ کیپٹن چارلس مارٹل نام کا ایک ملازم جہاز ایک عجیب مرض میں مبتلا ہو گیا جس نے تمام اطبا کو حیران کر دیا ہے۔ یہ شخص اضافی غدہ درقیہ کے ورم میں مبتلا ہوا جس سے اس کی ہڈیاں چھوٹی ہونے لگیں یہاں تک کہ اس کا قد چند روز میں بارہ انچ کم ہو گیا۔ اس کے بعد اس کی ہڈیوں میں انکسار کی کیفیت بہت بڑھ گئی۔ ذرا سے صدمہ میں ہدی ٹوٹ جاتی تھی۔ تاکنون نے اس کی ہڈیوں کی اصلاح کے لیے آتھہ عمل جراحی کئے جن میں آخر کے چار آپریشن خود کیپٹن مارٹل کی خواہش سے ہوئے کیوں کہ وہ اپنی زندگی سے مایوس تھا اور چاہتا تھا کہ اطبا اس کے عجیب مرض کا راز معلوم کریں۔ اطبا نے اسے ترایا ہوئی کہ اس صورت میں تم جلد مر جاؤ گے مگر وہ آپریشن کئے جانے پر اصرار کرتا رہا اور

وصیت کی کہ میرا جسم وفات کے بعد کسی طبی ادارہ کو دے دیا جائے۔ بہر حال آپریشن ہوئے اور وہ مر گیا مگر اب تک اطباء اس کے سرخس کا راز قہ معلوم کرسکے۔

ذیابیطس کے مریض | کہا جاتا ہے کہ ذیابیطس یا ہول شکاری کے مریض جن کا علاج انسولین (Insulin) سے ہوا ہے صرف یورپ اور

ولایت امریکہ میں ایک ملین سے زیادہ ہیں۔

دوران خواب میں پرواز | ایک انگریز انجینئر ایدورٹ ہوسز نے ایک فنی کے لیے ایک فنی مشین | مشین مصدومہ طیارچی کے نام سے ایجاد کی ہے جس کی بدولت طیارچی دوران پرواز میں آرام سے سو سکے گا۔ اور یہ مشین اس کا کام کرتی رہے گی۔ دو فوجی طیارچی جانیورہ اور فیکولیتز نے اس مشین کا تجربہ کیا اور ہوائی سفر میں نہایت آرام سے سوئے۔ توقع ہے کہ اس ایجاد کا اثر پرواز کے مستقبل پر بہت اچھا پڑے گا۔

بھک سے اڑ جانے والے مادوں | اکثر جرائم پیشہ اشخاص بم اور دوسرے آتشگیر سے بچنے کے لیے لباس | مادے تاک کے پارسلوں میں بھیج دیا کرتے

ہیں اور یہ پارسل دوران تفتیش میں ذلتاً بھٹ کر بھک سے اڑ جایا کرتے ہیں۔ اس بلا سے محفوظ رہنے کے لیے برلن میں ایک خاص لباس تیار کیا گیا ہے جسے تاک خانہ کے ملازم مشکوک پارسلوں کے تفتیش کے وقت پہن لیتے ہیں اور حادثہ کے وقت خطرہ سے محفوظ رہتے ہیں۔

امریکہ کی ایک جغرافیائی مہم تحقیقات کی غرض سے | ہرن کی سرعت رفتار | سوئٹزرلینڈ پر صحرائے کوہی کی سیاحت کر رہی تھی۔

اتفاقاً ایک ہرن موٹر کے سامنے آئے بھانڈے لگا۔ اس موقع پر ارکان مہم کو اندازہ ہوا کہ ہرن پہلے تین کیلومیٹر مسافت میں ۴۵ کیلومیٹر فی گھنٹہ کی رفتار سے چلا پھر ۳۳ کیلومیٹر فی گھنٹہ مسافت طے کی اس لیے ہرن کی اوسط رفتار (۲۰) کیلومیٹر کے فاصلہ میں 'فی گھنٹہ ۲۵ کیلومیٹر ہوئی اور موٹر کی متوسط رفتار بھی تقریباً اتنی ہی ہے۔

ایک نئے ستارہ کا انکشاف | حال ہی میں رصد خانہ جوهانسبرگ نے ایک نئے ستارہ کا پتہ لگایا ہے جو ان کے اندازہ میں زمین سے تین سو ملین کیلومیٹر کی بلندی پر ہے۔ یہ ستارہ بہت چھوٹا ہے، اور اس کا قطر سو میٹر ہے۔ اس ستارہ سے پہلے جو ستارہ دریافت ہوا تھا اس کی مسافت زمین سے ۱۰ ملین کیلومیٹر تھی۔

سزائے قتل کا نیا طریقہ | ولایت نیوٹا کی مجلس داخلی (ہوم تپارٹمنٹ) نے سزائے قتل کے ایک نئے طریقے کو رواج دینے کی منظوری نافذ کی ہے۔ اور اسے جملہ ممالک متحدہ امریکہ میں بھی رواج دینے کے لیے واشنگٹن کی جنرل کانگریس میں پیش کیا ہے۔

وہ طریقہ یہ ہے کہ واجب القتل مجرم کو وقت و مقام سزا کی اطلاع دیے بغیر ایک آخری تحقیقات اور باز پرس کے بہانہ سے ایک کمرہ میں لے جاتے ہیں جو بہت آراستہ ہوتا ہے اور اس میں بہت سے سہکتے ہوئے پھول گلہانوں میں رکھے ہوتے ہیں۔ مجرم کمرہ میں داخل ہوتے ہی تین ملت کے اندر سو جاتا ہے، مگر یہ خواب حقیقت میں خواب مرگ ہوتا ہے۔ کیونکہ گلہانوں کے پھول زہریلے ہوتے ہیں، ان کی سمیت آمیز خوشبو خواب مرگ سے ہمکنار کر دیتی ہے۔

اس طریقہ کو اس لیے ترجیح دی گئی ہے کہ مجرم آخر وقت تک

اپنی موت سے بے خبر رہتا ہے۔ حکام اسے معافی کے وعدہ سے اطمینان دلاتے رہتے ہیں۔ اور جب سزا بھگتنے کے لیے اس گھر میں داخل ہوتا ہے اس وقت بھی اسے کسی درد یا تکلیف کا احساس نہیں ہوتا بلکہ ایک سرور و بیخوشی کے عالم میں قالب تہی کرتا ہے۔

ریڈیو کی چوری زیادہ تر انگلستان و امریکہ میں رائج ہے۔ کیونکہ ان ممالک میں ریڈیو استعمال کرنے والے بہت ہیں۔ ریڈیو کی چوری اس طرح ہوتی ہے کہ ہر شخص بغیر کسی کے اطلاع کے ریڈیو کا ایک چھوٹا آلہ اپنے گھر میں نصب کر کے مرکز بلکہ تمام دنیا کی ریڈیو والی خبروں اور گانوں سے استفادہ کر سکتا ہے اور محصول سے کوئی واسطہ نہیں رکھتا۔

ایسی چوری زیادہ تر موسم سرما میں کی جاتی ہے کیونکہ لوگ عموماً کھڑکیوں کو بند رکھتے ہیں اور آواز باہر نہیں جانے پاتی۔ لیکن موسم گرما میں ایسا نہیں ہوتا اور رات کو پھر دینے والی پولیس ریڈیو کی آواز سن کر ریڈیو کے باقاعدہ خریداروں اور حصہ داروں سے دریافت کرتی ہے اور مجرم کا پتہ لگا لیتی ہے۔ امریکہ میں ریڈیو کی چوری کے لیے دس تالی جرمانہ مقرر ہے۔ اعداد و شمار سے معلوم ہوا ہے کہ حال بھر میں اس قسم کی دس ہزار چوریاں ہوتی ہیں۔ اس طرح ہر سال حکومت کو ایک لاکھ تالی جرمانہ ریڈیو کی مد میں وصول ہو جاتے ہیں جو ہندوستانی سکے سے تیس لاکھ روپے کے برابر ہوں۔

نیرنگ خیال خاص نمبر

شائع ہو گیا ہے

نیرنگ خیال کا خاص نمبر چھپ گیا ہے۔ جس میں جناب حامد الدہ صاحب افسر ہی اے 'قاضی عبد الغفار مصنف لیلیٰ کے خطوط' حضرت جلیل قدوائی ایم۔ اے 'خان بہادر چودھری خوشی محمد صاحب ناظر بی۔ اے' حضرت آرزو لکھنوی 'حضرت یاس یگانہ لکھنوی' خان بہادر رضا علی خان وحشت 'مولانا سہا' حضرت وقار انبالوی 'پروفیسر محمد دین صاحب تاثیر ایم۔ اے کے تازہ افکار زینت رسالہ ہیں۔



بہترین کاغذ - عمدہ لکھائی چھپائی - حجم تقریباً ۲۰۰ صفحات - متعدد رنگین تصاویر ہندوستان کے بہترین رسالے کا یہ بہترین شاہکار ہے۔ دو سو صفحہ حجم میں ایک ہزار کتابی سائز کا چیدہ چیدہ انتخاب ہے۔ اور یہ خاص نمبر ہر پہلو سے کامیاب ہے۔ اس میں

لیلیٰ کے خطوط

کی ایک تازہ قسط بھی درج کی گئی ہے جس کے مطالعہ سے آپ کے افکار دور ہو جائیں گے۔ اس مضمون کا ایک ایک حرت قابل مطالعہ ہے

نیرنگ خیال کا سالانہ چندہ صرت تین روپے چھ آنے ہے

اور جو لوگ جولائی سے خریدار ہوں گے۔ ان کو اسی چندہ میں یہ رسالہ ملے گا۔ گویا مفت ملے گا۔ اس لیے جولائی سے خریدار ہو جائیے

ورنہ بعد میں یہ نمبر ایک روپیہ میں آپ کو خریدنا پڑے گا۔

ملنے کا پتہ

ملیجر رسالہ نیرنگ خیال لاہور (شاہی محلہ)

گل صد رنگ

یعنی

ادبی، علمی، تاریخی، تعلیمی، صنعتی اور حفظان

صحت کے متعلق بہترین مضامین کا بہترین مجموعہ

حیرت انگیز فسانے، دلچسپ تراے، پاکیزہ نظمیں

نظم و نثر کے ۱۶۳ فادر مضامین، قدیم و موجودہ انشا پردازوں کے ایک

سو نایاب فوٹو۔ متعدد سہ رنگی قصاویر۔ مشاہیر ادب اُردو کے ہاتھ کی

تحریروں کے قیمتی عکس اس مجموعہ کی زینت ہیں۔ (ملک کے قریباً تیز

سوفاضلوں اور ادیبوں نے اس کی تیاری میں حصہ لیا ہے۔) سائز 20×30

ضخامت قریباً ۷۵۰ صفحات۔ لکھائی چھپائی بہترین۔ متعدد صفحات رنگین۔

ہمارا پر زور دعویٰ ہے کہ

اس سے زیادہ شاندار اور ضخیم مجموعہ مضامین اب تک اُردو زبان

میں شائع نہیں ہوا۔ اس کی تیاری میں آٹھ ہزار روپیہ نقد خرچ کیا گیا ہے۔

اگر آپ نے

ادب اُردو کی اس انسائیکلو پیڈیا کو فوراً نہ منگوایا تو یقیناً آپ

پچھتائیں گے۔ کسی وجہ سے بھی ناپسند ہو تو بلا قائل واپس فرمائیں۔

قیمت باوجود اتنی بڑی ضخامت اور اس قدر فوٹوؤں کے

صرف دو روپیہ آٹھ آنے۔ سجاہ ۳ روپیہ ۴ آنے

ملنے کا پتہ

ماسٹر جگت سنگھ پرو پرائٹر رسالہ رہنمائی تعلیم، لاہور۔ رام گلی۔ نمبر ۵۵۰

بے مثل ماہوار طبی رسالہ

طبیہ کالج میگزین

قدیم و جدید طب کے بلند پایہ مضامین شائع کرتا ہے۔ زبان سلیس اور سنا ہوتی ہے۔ قدیم طب کو جدید طب کے ہم آہنگ بنانا میگزین کا خاص مقصد ہے۔ بعض مضامین تجدید طب، بچوں کے امراض، اکتشافات طب، بے نالی کے غدد کے متعلق اصولی معلومات، امراض چشم کی مسلسل اشاعت کی جارہی ہے۔ فوٹو اور متعدد نائی گرام بھی ہوتے ہیں۔ کاغذ

۳۰ × ۲۰

عہدہ۔ کتابت طباعت نفیس۔ حجم کم و بیش ۶۴ صفحہ۔ سائز ۸

سر ورق بہترین اور خوش نما ہوتا ہے۔

چند سالانہ دو روپیہ آٹھ آنے طلباء سے بشرط تصدیق دو روپیہ چار آنے

ملنے کا پتہ

دفتر طبیہ کالج میگزین، طبیہ کالج، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

رسالہ "زمانہ" کانپور

اُردو کا بہترین رسالہ

جو سنہ ۱۹۰۳ء سے اب تک روز افزوں ترقی کے ساتھ جاری ہے

ایڈیٹر:- منشی دیا فراین نگم، بی، اے

زمانہ میں ہر قسم کے بہترین مضامین شائع ہوتے ہیں

زمانہ میں مطبوعات جدید پر بے لوث تنقیدیں شائع ہوتی ہیں

زمانہ میں متعدد قابل دید رنگین و سادہ تصاویر دیجاتی ہیں

زمانہ میں بہترین شاعروں کی بہترین نظمیں درج ہوتی ہیں

زمانہ میں ملک کے بہترین ہندو مسلم انشاپردار مضامین لکھتے ہیں

قیمت فی پرچہ ۸ آنے قیمت سالانہ پانچ روپیہ

کسی ماہ کا پرچہ ملاحظہ فرما کر خریداری جاری فرمائیے

المشہد

مشیخو "زمانہ" کانپور

اردو

انجمن ترقیء اردو اورنگ آباد دکن کا سہ ماہی رسالہ ہے جس میں ادب اور زبان کے ہر پہلو پر بحث کی جاتی ہے۔ اس کے تخلیقی اور محققانہ مضامین خاص امتیاز رکھتے ہیں۔ اردو میں جو کتابیں شائع ہوتی ہیں اُن پر تبصرے اس رسالہ کی ایک خصوصیت ہے۔

یہ رسالہ سہ ماہی ہے اور ہر سال جنوری، اپریل، جولائی اور اکتوبر میں شائع ہوتا ہے رسالہ کا حجم تیزاً سو صفحے ہوتا ہے اور اکثر اس سے زیادہ۔ قیمت سالانہ موصول ڈاک غیر ملاکر سات روپے سکے انگریزی [آٹھ روپے سکے عثمانیہ] المہتہر : انجمن ترقی اردو اورنگ آباد - دکن

نرخ نامہ اجرات اشتہارات اردو و سائنس

کالم	ایک بار کے لئے	چار بار کے لئے
دو کالم یعنی پورا ایک صفحہ	۱۰ روپے سکے انگریزی	۴۰ روپے سکے انگریزی
ایک کالم (آدھا صفحہ)	۵ روپے سکے انگریزی	۲۰ روپے سکے انگریزی
نصف کالم (چوتھائی صفحہ)	۲ روپے ۸ آنے سکے انگریزی	۱۰ روپے سکے انگریزی
رسالے کے جس صفحے پر اشتہار شایع ہوگا وہ اشتہار دینے والوں کی خدمت میں نمونہ کے لئے بھیج دیا جائے گا۔ پورا رسالہ لیٹا چاہیں تو اس کی قیمت بحساب ایک روپیہ بارہ آنے سکے انگریزی برائے رسالہ اردو اور رسالہ سائنس دو روپے سکے انگریزی اس کے علاوہ لی جائے گی۔		

المہتہر : انجمن ترقیء اردو اورنگ آباد - دکن

سائنس

۱ - یہ رسالہ انجمن ترقی اُردو کی جانب سے جنوری، اپریل، جولائی اور اکتوبر میں شائع ہوتا ہے —

۲ - یہ رسالہ سائنس کے مضامین اور سائنس کی جدید تحقیقات کو اُردو زبان میں اہل ملک کے سامنے پیش کرتا رہے گا۔ یورپ اور امریکہ کے اکتشافی کارناموں سے اہل ہند کو آگاہ کرے گا اور ان علوم کے سیکھنے اور ان کی تحقیقات میں حصہ لینے کا شوق دلائے گا —

۳ - ہر رسالے کا حجم تقریباً ایک سو صفحے ہوگا —

۴ - قیمت سالانہ محصول داک وغیرہ ملا کر آٹھ روپے سکہ انگریزی ہے (نو روپے چار آنے سکہ عثمانیہ)

۵ - تمام خط و کتابت :- آنریری سکرٹری۔ انجمن ترقی اُردو اورنگ آباد دکن سے ہونی چاہئے —



(باہتمام معتمد صدیق حسن منیجر انجمن اُردو پریس اُردو باغ

اورنگ آباد دکن میں چھپا اور دفتر انجمن ترقی اُردو سے شایع ہوا)



سبیل



ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد دکن کا ماہ نامہ

زیر نگرانی
ڈاکٹر بی بی محمد الدین قادری رور
مجلس ادارت
خواجہ حمید الدین ایم اے
سکینہ بیگم



نشان طبعہ آصفیہ ۱۵۲
نشان طبعہ برطانیہ ایم ۳۹۵۰
طبعی فون نمبر ۲۲۰۹
چند سالانہ چار روپیے آٹھ آنے
بچوں کا سب دن ایک روپیہ آٹھ آنے
فی پرچہ آٹھ آنے

جلد ۹ بابت ماہ نومبر و دسمبر ۱۹۴۶ء شماره ۱۱ و ۱۲

فہرست مضامین

- ۱۔ عرض حال ادارہ
- ۲۔ پیام اقبال (نظم) سکندر علی وجہ فی اے۔ اتج سی ایس۔
- ۳۔ خواتین اور سماج رضیہ سلطانہ ایم اے
- ۴۔ کافرانہ بنیادی (نظم) سید علی منظور
- ۵۔ لوطیہ کسان (نظم) پرو فیسر خواجہ ایم ایل ایل بی
- ۶۔ غزل خاور درانی ایم اے۔ بی ٹی (ٹونگ)
- ۷۔ وقت جمیل ملک (راولپنڈی)
- ۸۔ برسات (نظم) سلیمان اربیب
- ۹۔ ناکام آنسو { (افسانچے) رونق فہریر بی ایس سی (غنائیہ)
- ۱۰۔ ماں (فانہ) نجمہ سمیع
- ۱۱۔ سر رہے (نظم) خورشید الاسلام
- ۱۲۔ کون جانے (غنائیہ) جی۔ جیلانی (غنائیہ)
- ۱۳۔ ایک سوال (نظم) اختر الامیان
- ۱۴۔ محبت کی جیت (فانہ) زبیدہ (غنائیہ)
- ۱۵۔ دلہی مرغامنی مجلس قانون ساز طاہر تیزی
- ۱۶۔ نفیروز میں احساس اصول امجد علی
- ۱۷۔ ایک نظم (نظم) ولی احمدی
- ۱۸۔ اہمیت محرم اور موجودہ حالت کربلائی خواجہ حسین الدین احمد (غنائیہ)

خواجہ حمید الدین ایم اے کے اہتمام سے دستگیر پریس میں چھپکر دفتر ادارہ رور منزل خیرت آباد سترخان ہوا

عرض حال

اس پر سچے کی اشاعت کے ساتھ سب رس کی زندگی کا نوں سال ختم ہوتا ہے اور اب وہ اپنی زندگی کی دہائی منزل میں قدم رکھ رہا ہے۔ علم ادب کی دنیا میں نرسال کا عرصہ شاید کچھ زیادہ نہ معلوم ہوتا ہو لیکن ایک ادبی رسالہ کے لئے یہ عرصہ یقیناً قابل اعتنا ہے۔ کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ اکثر وہ بیشتر رسالے ابتدا میں تو بڑی آب و تاب کے ساتھ شائع ہوتے ہیں، اور چند سال بلکہ چند ماہ بھی گزر گئے نہیں پاتے کہ ان کا وہ طمطراق باقی نہیں رہتا اور بہت جلد وہ اپنی زندگی کی آخری منزل پر پہنچ جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ ادبی دنیا میں ان کا نام و نشان تک باقی نہیں رہتا۔ شمالی ہند اور حیدرآباد کے کئی رسالے ایسی ہی گستاخی کا شکار ہو چکے ہیں اور بہت کم خوش قسمت رسالے ایسے ہیں جو دنیا کے ادب میں اب تک اپنے وجود کو برقرار رکھے ہوئے ہیں۔

سب رس نے بھی ان تمام کٹھن اور دشوار گزار منزلوں کو طے کرتے ہوئے اپنے وجود کو قائم رکھنے میں دامن انتقامت ہاتھ سے جانتے نہ دیا۔ ادارے کو بعض وقت ایسی رکاوٹیں پیش ہوئیں کہ سب رس کا شائع کرنا دشوار معلوم ہونے لگا۔

بالخصوص یہ سال سب رس کی زندگی میں بہت محسوس اور نامساعد ثابت ہوا۔ کا تبوں کا کتابی مطالعہ کا بوقت کام انجام نہ دینا اور کاغذ کی فراہمی میں تاخیر ایسے اسباب تھے کہ کام کرنے والوں کے جی جھوٹ گئے اور رسالہ حسب وخواہ اور پابندی سے نہ چھپ سکا۔ سب رس کی ایک نمایاں خصوصیت یہ بھی تھی کہ وہ ہر مہینے کے پہلے مہینہ میں شائع ہو جاتا تھا لیکن اس سال وہ اپنی اس خصوصیت کو برقرار نہ رکھ سکا۔ تاخیر کو دور کرنے کے لئے ایک دو شمارے مشنر کے بھی شائع کئے گئے لیکن ہمیں افسوس ہے کہ بائیں ہم اس مشکل پر قابو نہ پاسکے۔ چونکہ سال ختم ہو رہا تھا اس لئے نومبر و دسمبر کے شمارے بھی مشنر کے طور پر شائع کئے جا رہے ہیں تاکہ آٹے والے سال میں رسالہ ہر ماہ وقت پر شائع ہو سکے۔ اگر خدا نے چاہا تو جنوری سے مئی تک کا پرچہ دوسرے مہینے میں چھپ کر آپ کی خدمت میں حاضر ہو جائے گا اور پھر بہار پہلے مہینے میں اس کی اشاعت ہوتی رہے گی۔

ادارہ سب رس کے قدردانوں سے معذرت خواہ ہے کہ اس سال ان کو انتظار کی زحمت اٹھانی پڑی۔ اکثر اصحاب نے سب رس کی دیررسی کی شکایت بھی کی اور وہ حق بجانب ہیں۔ امید ہے کہ وہ ہماری غیر محتاجی مجبوریوں کے پیش نظر ہم کو معاف فرمادیں گے۔ اور محض اس شکایت کی بنا پر سب رس کی سرپرستی اور معاونت میں درج ذلک فرمائیں گے۔ ہم انتہائی کوشش کر رہے ہیں آئندہ قارئین سب رس کو کسی قسم کی شکایت کا موقع پیدا نہ ہونے پائے۔

پیامِ اقبال

آتشِ غم کا مداوا نہ خند	دم بہ دم نالہ نہ کر شل پسند
چند روزہ زندگی کے کام چند	فرضِ انسان سہی و صبر و ذکر و فکر
ہر مصیبت ایک پنہاں تلخ پسند	ہر مسرت آشکارا اجڑ کار
طالبِ زر و خوار و مایوس و منتہد	طالبِ حق مطمئن، مستِ عمل
بے یقینی و جھبہ صخر و گزند	نورِ ایماں باعثِ آرامِ جاں
ڈال مہر و ماہ و انجم پر کمند	زورِ بازو آزمانے کے لئے
رکھ تخیل کو سدا بے قید و بند	جسم کی پابندیاں کچھ بھی نہیں
ہو تری اپنی نظر اپنی پسند	دوسروں کی آنکھ سے دنیا نہ دیکھ
سادگی، فکرِ ساعزم بلند	مردِ مومن کی متاعِ زندگی
گفتگو میں کیفیتِ روح شہد و قند	جستجو میں گرمیِ برقِ تپاں

فاش کر دیتی ہے اسرارِ حیات

سودِ بستاں اک نگاہِ ہوشمند

سکندر علی وجہ

خواتین اور سماج

سماج پر خواتین کے احسانات اور خواتین کے سماجی فرائض بتانے سے پہلے میں اس کی تشریح ضروری سمجھتی ہوں کہ سماج ہے کیا چیز؟

سماج کا لفظ ہمارے کانوں کے لئے غیر ناؤس نہیں۔ آئے دن نادلوں اور فلموں میں سماج کے مظالم کا حال پڑھتے اور دیکھتے ہیں۔ بالخصوص ہندوستانی فلموں میں ہیرو اور ہیروئن کی جدائی کا باعث یہ کہ بخت سماج ہی ہوا کرتا ہے۔ ہر افسانے میں سماج کو برا بھلا کہنا ضروری سمجھا جاتا ہے۔ پس اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سماج انسانوں کی اس جماعت کا نام ہے جو شعوری طور پر جغرافیائی، لسانی یعنی اپنی بول چال اور دینی ضروریات کی خاطر متحد اور مل کر رہتی ہو۔ اور جو ان افراد کے اعمال و افعال پر ایسی نگرانی رکھتی ہے جو اس کے حلقہ اثر میں ہوں۔ اب قدرتی طور پر یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ خواتین کو ان امور سے کیا تعلق؟ ان کی زندگی کو نفس کی تیلوں سے سرگراں نہ کر دیتے ہیں کہ ان کو معاشرہ کی سود و بہود سے کیا واسطہ لیکن واقعہ یہ نہیں۔ خواتین کا سماج سے اتنا ہی تعلق ہے جتنا زندگی سے۔ ہوا، پانی اور غذا کا۔ کیونکہ سماج کی تشکیل عورت ہی کی رہن منت ہے۔ اس کی تعمیر میں بھی اس کا دست عمل کار فرما ہے ورنہ حضرت انسان دورِ حجر پر یہ طرح آج بھی اپنا اسباب سر پر اٹھاتے خانہ بدوش زندگی بسر کرتے۔ گھر کا تصور عورت کی وجہ سے پیدا ہوا اس لئے کہنا چاہئے کہ اجتماعی زندگی کی ابتدا عورت کے ہاتھوں بڑی اور طاہر ہے جب فرد کا کوئی مرکز نہ ہوتا اور وہ در بدر کی خاک چھانٹا تو سماج کی ابتدا کیونکر ہوتی جس طرح عورت نے سماج کی ابتدا کی اسی طرح بلکہ اس سے بھی زیادہ اس کے ارتقا اور نشو و نما میں حصہ لیا اس نے انسانوں کو ان کی حیثیت سے ان فرائض اور ذمہ داریوں سے آگاہ کیا جو ان معاشرہ کی صورت میں اس پر عاید ہونی چاہئیں۔ اس نے ہی ایسی شخصیتوں کو جنم دیا جنہوں نے سماج کی تشکیل کو آجا کر کیا اور سماج کو انسانی خوشیوں کا محور بنایا اس طرح دیکھا جائے تو ایک بہتر اور برتر سماج کی آفرینش عورت ہی کے ہاتھوں بڑھ سکتی ہے وہ فرعون اور شہدادیجیسے لوگوں کو بھی جہنم دے سکتی ہے اور حضرت محمدؐ کو آجاتا بعد، حضرت عیسیٰؑ وغیرہ جیسے مقدس اور پاک ہستیوں کو بھی وہ اپنے اشارہ ابرو سے میلن اور کلہو پیر کا روپ دھار کر سماجی نظام کو بہتر و بالا بھی کر سکتی ہے اور فلاسفی، ٹائٹل انگیل، فاطمہ بنت عبد اللہؓ چاندنی بی، نورجہاں کی طرح سماج کے مقاصد کو اپنے خون جگر سے پیچ بھی سکتی ہے۔

نفیاتی نقطہ نظر سے بھی عورت کا سماج پر بڑا اثر ہے سماجی قوت اور اہمیت کو برقرار رکھنے کا موجب بھی عورت ہی ہے۔ عورت کو سماج کے لحن طبع کا بڑا امثال رہتا ہے اور وہی سماج میں نام و نمود حاصل کرنے کے لئے فضول رسومات اور فنونِ خریج کا باعث ہوتی ہے۔ علم سماج کے ماہر بیان کرتے ہیں کہ سماجیت کا وجود انسان کے جذبہ تقلید مشیخت و نمود داری ہی وجہ سے ظہور میں آتا ہے۔ مثلاً اس نظریہ کے تحت کہ پیدائش اور موت کے بعد کی رسوم اگر نہایت شان و شوکت سے ادا کی جائیں تو بڑا نام ہوتا ہے۔ سماج میں نام اور امتیاز حاصل کرنے کے لئے لوگ یہ رسومات بہت دھوم سے کرتے ہیں اور ان کو اس عمل پر کسانے والی خواتین ہی ہوتی ہیں گویا فرد کو سماجی سانچے میں ڈھالنے والی بھی عورت ہی ہوتی ہے۔ گالز ورڈی (M. G. Ward) اور ایچ جی دیزل کا یہ خیال بالکل ٹھیک ہے کہ خواتین ہمیشہ ہیئت اجتماعی اور تمدن کی علمبردار رہی ہیں۔

علم سماج کے ماہرین نے سماجی ذہنیت میں تبدیلی کی کوششیں کو تفرید کے نام سے تعبیر کیا ہے۔ تفریق پھیری بھی ہوتی ہے اور تخریب بھی۔ دونوں صورتوں میں مخالفیتوں کا سامنا ہوتا ہے۔ اہموم دیکھا گیا ہے کہ تعبیری تفرید میں زیادہ دقتوں کا مقابلہ ہوتا ہے۔ تخریبی تفرید کی بنیاد چونکہ خود غرضی پر ہوتی ہے اس لئے دوسروں کے نقصان سے اپنا فائدہ چاہئے، اسلئے افراد ہاں میں ہاں ملاتے دیکھتے ہیں۔ ایسے ہی لوگوں کو سماجی باغی کہا جاتا ہے تاریخ عالم کے صفحات پر نظر ڈالیں تو تخریبی تفرید میں کسی قانون کا نام نہیں ملتا۔ اس کے برخلاف تعمیری تفرید اکثر و بیشتر خواتین کی رہنمائی منت ہے اگر وہ پیش منظر پر نہ بھی آئے تو پس منظر میں اس کا دست عمل ضرور کارفرما رہتا ہے۔

علاوہ ازیں معاشرہ میں کوئی تبدیلی بغیر عورت کی تائید کے نہیں حاصل کی جاسکتی سماج کا یہ طبقہ عقائد ہی کی حفاظت کو سماجی خدمت سمجھتا ہے اور پوری قوت سے نئے خیالات کی مخالفت کرتا ہے۔ اسی لئے نیگورنے عورت کو قدامت پسند کہا ہے۔ عورت سماج کی آنکھ ہے جس طرح بغیر آنکھ کے انسانی جسم بے کار ہے، اسی طرح بغیر عورت کے انسانی معاشرہ بے کار ہے۔ لیکن یہ خواتین کا فرض ہے کہ وہ اپنی اس اہمیت کو پہچانیں۔ موجودہ جمہوری دور میں افراد بچائے خود کوئی چیز نہیں۔ جب تک وہ سماج سے وابستہ نہ ہوں، اسی طرح جس طرح موج دریا کے باہر کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔ چنانچہ اب سماج ہی آمر بھی ہے اور مامور بھی۔ کارفرما بھی ہے اور کار گزار بھی۔ سماج کی اہمیت کے مدافع فرانس کے مفکر آگسٹ کانٹ نے اسے باقاعدہ دھڑ، ہنگامہ و عریانیات کے نام سے اٹھارھویں صدی میں اہل دنیا کے سامنے پیش کیا۔ خواتین کا فرض ہے کہ وہ اس علم سے اسکا حق و اقیقت حاصل کریں اور معاشرہ میں اپنا صحیح مقام پہنچاں۔ حالیہ زمانے میں خواتین کو سماج میں خاص اہمیت دی گئی ہے۔ موجودہ سماج سے خواتین کو مرد کا نصف بہتر تسلیم کر کے سیاسیات میں بھی حصہ لینے کا موقع دیا۔ اس نظریہ سے خواتین خود بھی سماج کی کارآمد و مفید رکن بن سکتی ہیں اور سماج کے لئے کارکن اور کارفرما افراد کو بھی جنم دے سکتی ہیں۔

اس کے علاوہ خواتین دیگر سماجی کام بھی بحسن و خوبی انجام دے سکتی ہیں۔ کیونکہ مرد کا زیادہ تر وقت فاعل میں بسر ہوتا ہے۔ وہ اپنا زیادہ وقت سماج کی فلاح و بہبود میں صرف نہیں کر سکتا۔ اس کے برخلاف عورتیں چونکہ اس فکر سے بری رہتی ہیں اس وجہ سے وہ آسانی سے اپنا وقت سماجی فلاح و بہبود کے کاموں میں دے سکتی ہیں۔ تعلیم بالخال ہی کے مسئلے کو لیجئے۔ عورتیں گھر میں بیٹھے زیادہ سے زیادہ افراد کو تعلیم دے سکتی ہیں اور ملک کی ان نکتہ تعداد کو مفید شہری بنا سکتی ہیں۔ عورت کے دل کو تبکینہ سے تشہیر دی جاتی ہے۔ اس لئے کردہ دوسروں کے درد کو بہت جلد محسوس کر لیتا ہے۔ وہ بھی قلب میں احساس رکھے تو اپنے سماج کے ان معذور اشخاص کے لئے روزی فراہم کر سکتی اور ان کی آسائش کے اسباب ہیا کر سکتی ہے جو سماج کی گردن کا بوجھ بنے ہوئے ہیں لیکن یہ امر قابل حیرت ہے کہ سوشل ریفارمرز یعنی سماجی مصلحوں اور کار گزاروں میں خواتین جمہور کی تعداد بہت کم ہے۔ حیدر آباد کی حد تک مسز سروجنی ناٹھو۔ بیگم رستم جنگ۔ مس ہدجا ناٹھو۔ بیگم رحمت اللہ، بیگم امیر حسن اور خود شہزادیاں والاشان کی سماجی امور سے گہری دلچسپی اور اہتمام کو بھلایا نہیں جاسکتا۔ لیکن ابھی اس فہرست میں اضافے کی ضرورت ہے۔ مجھے امید ہے کہ جامعہ عثمانیہ کی وہ طالبات جنہیں موقع حاصل ہے اس میدان عمل کو اپنی جولان گاہ بنائیں گی۔ (حیدر آباد ریڈیو سے پڑھا گیا)

رفیعہ سلطانہ

کافرانہ بے نیازی

کافر سے مراد وہ ہیں ہے فی الحال جو حُسن آفریں ہے
 اللہ رے بے نیاز کافر ہر ڈھنگ سے رنگِ حُسن ظاہر
 نورِ دل و جان و پیکرِ نور پیرایہ جلوہ ہائے مستور
 سر دفترِ دلبرانِ خوش رُو سرنامہ داستانِ دل جو
 پیائہ آرزوئے گلغام ! افسانہ جستجوئے خوش کام
 ہیں حُسنِ مجسم اس کے جلوے

چو میں جہ و مہر اس کے تلوے

ہر آن میں نشانِ بے نیازی ہر شان میں آنِ بے نیازی
 خود سر خود و ار خود نگر دوست خوش و خوش کام خوش سیر دوست
 یہ دوست خزانہ دارِ عرفان یہ دوست فسانہ سازِ ایمان
 کس دشمنِ جاں کو کہہ دیا دوست کہنا ہی پڑا کہ جاں ہمہ دوست
 کہتا ہے مالِ حُسنِ فطرت نظارہ حُسن ہے عبادت

نیچر کی عطا بُتِ حمیں ہے

معیوب اسے پوچنا نہیں ہے

بیش سے ملا جو ذوقِ دانش جائز ہوئی حُسن کی پرستش
 مقصود بصیرت و بصارت کیا ہے؟ دل چشم کی طہارت
 جب تزکیہٴ دل و نظر ہو یہ کافر قدس جلوہ گر ہو
 ہے حُسنِ نظر کا مدعا کیسا میں دیکھ کے اس کو دیکھتا کیا
 حُسنِ بہتہ کافر اور دیکھوں جانچوں اسے اس کے طور دیکھوں

اس کی ہر ادا ہے پیاری پیاری

منشکل ہے بہت ادا شمار می

اس پر بھی میں کچھ نہ کچھ کہوں گا ہاں جائزہ اس حسیں کا نوں گا
 سوجھیں کبھی شوخیاں جو اس کو بے چین دل اور مضطرب ہو
 ہنس دے یہ حسیں تو چاند شرمائے چاند ابر میں دل میں یہ جگہ پائے
 جھینپے تو نگاہ اور چمکے ! چھپ جائے غلاف میں حرم کے
 سہمے تو خدائے دلبری ہو مسجود بُتائے آذری ہو

اس حُسن پہ یہ ادا طرازی

بے جا نہیں اس کی بے نیازی

علی منظور

بوڑھا کسان

دن ڈھلے پردیسوں کے گیت پنکھٹ پر تھے بھگتے باز دیتھے چھلکے ہوئے لگا کر نہ تھے
 آپکی تھیں، دختران کوہ و صحرا اپنے گھر گاکے تھے گیت چرواہے ہوا کے ساز پر
 بھوے سیکے قافلوں کی رہگذاروں کے چراغ دور افتادہ جھلملاتے تھے تاروں کے چراغ
 وادیاں کھولے ہوئے تھیں دو تہا شالوں پہ بال غلٹیں پکڑ ٹڈیوں پر بند ہی تھیں اپنا جال
 کھل چکے تھے کالے کالے بادلوں کے بادباں ایک چاندی کا سفید تھا اندھیرے میں رواں
 پھیلتے جاتے تھے کھیتوں پر تھیں بڑے رات کے ڈوبتے جاتے تھے کچے راستے دیہات کے
 ناگہاں اک شخص یوں آیا نظر صرف حرام لے رہے تھے جس کے سوچ سے اندھیرے انتقام
 کھوئی تھی جس کی پیری ٹھوکر س کھانے کی تاب جس کا چلنا تھا قیامت جس کا گنا تھا عذاب
 ڈمگاتی ایک میت لڑکھڑاتی ایک لاش جس کے ہر احساس پر بیتے زمانوں کی خراش
 گر چکا تھا جو تہنگوں کی نظر سے وہ چراغ جس کو ہونٹوں سے لگا کر پھینک دیں ایسا یاغ
 ایک سمجھوتہ ہنسی اور آنسوؤں کے درمیاں اپنے مستقبل کی ذلت اپنے ماضی کی فغاں
 صبح کا اک تہی، اک چاندنی کا سو گوار سانس لیتی ایک تربت چلتا پھرتا اک مزار
 نبض ڈوبی، دل فردہ، حوصلے چھوٹے ہوئے ایک ایسا ساز جس کے تار سب ٹوٹے ہوئے
 مجھ سے کہتا تھا ”سنائے انتقام جنگ پر لوٹ کر میڈیاں سے آتے ہیں سپاہی اپنے گھر“
 ”موت کو بیچا ہے میں نے سیکڑوں صبحوں کا نور اپنی فصلوں کی امانت، اپنے کھیتوں کا غور
 ایک مادر کا کلیبا، ایک دلہن کا سہاگ ایک ایسا پھول ہنسنا تک جسے آیا نہیں
 ایک کچی کا تبسم جس کے سر سایہ نہیں میں نے تاریکی میں آنکھوں کی بصارت پہنچ دی
 گولیوں کے دام گھر کی ساری دولت پہنچ دی

دیکھتے ہو راستوں پر کس قدر اندھیرے ہے
 صبح ہونے کے لئے اب اور کتنی دیر ہے؟
 شور

غزل

وقت

دل درد سے معمور ہے معلوم نہیں کیوں
 زخموں سے جگر چور ہے معلوم نہیں کیوں
 اک آتش دل سوز اور اک آتش شراب
 ہر سانس میں مستور ہے معلوم نہیں کیوں
 یوں لب پہ تقسیم ہے کہ ہیں آنکھوں میں
 دنیا مری مجبور ہے معلوم نہیں کیوں
 گردِ آبِ بلا میں رہا میدوں کی شتی
 قیمت کو یہ منظور ہے معلوم نہیں کیوں
 لب تک جو نہ آئی کبھی وہ دل کی کہانی
 ہر زخم میں مشہور ہے معلوم نہیں کیوں
 طتی ہے یہاں نیکی کے بدلے میں الٹی
 دنیا کا یہ دستور ہے معلوم نہیں کیوں
 تار یک ہے گوشتِ غم سے مری دنیا
 سینہ مرا پر نور ہے معلوم نہیں کیوں
 ہر وادی ہے اب سیکر لئے وادی سینا
 ہر کوہِ جبل طور ہے معلوم نہیں کیوں
 خاور کو بجا ناز ہے شوریدہ سری پر
 تو عقل پہ مغرور ہے معلوم نہیں کیوں

خاور و رانی

وقت بہتا ہوا سمندر ہے
 سال ہیں اس کی بے پنہا موجیں
 کتنی ڈوبی ہیں کتنی ڈوبیں گی
 آکے اس میں جہان کی فوجیں
 جو کوئی اس کی زد میں آتا ہے
 وہ عدم کو سدھار جاتا ہے
 اس کی پُر پیچ و نشہ موجوں نے
 شاہزادوں کا دل نکالا ہے
 خوں پلا کر نہ جانے کس کس کا
 لٹے لٹے کو اپنے پالا ہے
 اس کو ہر کام میں مہارت ہے
 اس کی چپ چاپ میں ہرارت ہے
 میں سمجھتا ہوں وقت کی اسواج
 خونِ انسانیت کی دھاریں ہیں
 کیا خبر ہے عمیق تر کتنی
 اس کی گہرائیوں میں غائب ہیں
 کون آئے گا جو بتائے گا؟
 وہ تو خود اس میں ڈوب جاگا!

جمیل ملک

برسات

بادل کا آغوش لہراتی بجلی کے کنگن چمکاتی !
دامن کی ٹٹاک ہوا سے دل کو آتش زار بناتی !

آئی لو برسات پھر آئی

آئی لو برسات پھر آئی

نیل کنول نے لی انگڑائی کلیوں نے گویائی پائی
دور کہیں متانہ لے میں چرواہے نے تان اڑائی

آئی لو برسات پھر آئی

آئی لو برسات پھر آئی

ویرانوں میں آئیں بہاریں جنگل جنگل، شور پکاریں
دھرتی کے پیاسے بوٹیوں پر امرت کی پڑتی ہیں بھواریں

آئی لو برسات پھر آئی

آئی لو برسات پھر آئی

کھیتوں پر آیا ہے جوبن ہروادی مالین کا دامن
رنگ و بو کی ارزانی سے جنت و دجنت ہر گلشن

آئی لو برسات پھر آئی

آئی لو برسات پھر آئی

میخواری پھر عام ہوئی ہے توبہ خرق جام ہوئی ہے !
آؤ، چھوٹے بچے نے ہائیں وقت سے چیلے شام ہوئی ہے

آئی لو برسات پھر آئی

آئی لو برسات پھر آئی

رم جھرم رم جھرم پانی برے چھم چھم کرتی آجا گھر سے
آجا، آجا دید کو تیری آخ کوئی کب تک تر سے

آئی لو برسات پھر آئی

آئی لو برسات پھر آئی

سلیم اریب

ناکام آنسو

نغمہ ساز

بچہ ہاتھ میں کھڑا لے جا رہا تھا پیچھے سے
ایک موٹر آئی..... ہارن گرجا..... پیٹہ پٹے موٹر کا
دھکا اسے لگ ہی گیا..... وہ گر پڑا۔
مٹی پر دو دو ایک سیاہ کار کے سفید لباس
کی طرح پھیل گیا۔
موٹر کی اور چند خوش پوش اترے۔ بچے کو
صبح سلامت دیکھ کر ان کے چہروں پر آئے ہوئے
نزد و کے اہم تر مسکراہٹوں کے پوچھے گئے ہو گئے۔
ایک نے کہا "گھر سے اسٹرک تیرے باپ کی
ہے جو یوں بیچ بیچ میں سے چلتا ہے؟"
دوسرے نے کہا "قیمت اچھی تھی جو بیچ گیا
مرد مرنے جاتا۔"

بچے کے ہونٹ کانپ رہے تھے اور آنکھوں
میں آنسو پھل رہے تھے..... اس لئے نہیں کہ
چوٹ سے اس کے پاؤں میں تکلیف ہو رہی تھی۔
اس لئے کہ اس کی مشقت کا معاوضہ اس کی اتنی
بوختی جو وہ اپنی بیمار ماں کے لئے لیجا رہا تھا اس ٹرک
پر پہیلی ہوئی تھی جس میں ابھی تک اس کے مرحوم باپ
کی عینیتیں جھلک رہی تھیں۔

آنسو نکلنے ہو رہے تھے اور وہ سوچ رہا تھا
ٹرک باپ کی ہے؟ وہ خوش قسمت ہے؟ ماں بیمار
ہے!!

وہ واپس ہو گئے۔ موٹر چلی۔ انجن کی آواز
کے ساتھ قہقہوں کی صدا بھی پیچھے چھوڑتی گئی۔
بٹنے والے ٹکر پیچھے دکھائے ہیں اس لئے
ان کی آواز دھڑکنے لگی تھی ہے لیکن رونے والے
آلف اللف۔ وہ تھیں نہ تو انہیں کوئی سن نہیں پاتا۔

لہو نغمہ ساز

اُن..... یہ دن بھر کی محنت..... کا نفاذ
جسٹر منسلک..... گالیاں..... اور تنخواہ برآمد
ہوئی کو بھی آج ہی میکہ جانا تھا؟ اس سے باتیں کرنے
میں کچھ تو دل بہلانا..... شکنیں ہوتی..... تکان دور
ہوتی..... دل کا بوجھ ہٹا ہوتا..... برکتی.....
رات بھیاں ہو چلی ہے جو جانا چاہیے۔
گلی میں یہ کون گفتگو کر رہا ہے؟ اتنی رات گئے؟
اس سنان گلی میں؟؟؟

میری سوہنی..... ٹیکر کہاں جاتی ہے۔ آتجے
ایک بار حرم تو لوں۔

دشاش!..... کسی..... کہ لے آیا ہے۔
نکن سکون ہوتا ہے جب تجھے گے سے نکال لیا ہوں

سب کچھ بھول جاتا ہوں..... کسی کو میٹھی میٹھی باتوں میں پھنس
جھوٹا..... فریبی..... کسی کو میٹھی میٹھی باتوں میں پھنس
رہا ہے۔ منہ سے الفاظ برا بر گل بھی نہیں رہے ہیں شاید
خواب پی لی ہے۔

خواب جانتا ہوں..... تیری بے بسی کا سبب
جانتا ہوں..... خواب..... یہ آوارہ اس گلی کو
گھنٹائی کوڑے گا..... ٹیکر خبر لیتا ہوں۔

میں غصہ میں بھرا ہوا باہر نکل آیا.....
!!!..... چتھڑوں میں ملبوس ایک خف لوٹھا
گو وہیں ایک کہ بہ صورت لاغر غلی کو لئے بیٹھا تھا اور

کہہ رہا تھا.....
کلی تو تجھے کہیں سے روٹی مل ہی جائے گی۔ پھر منہ
تجھے آدمی کھانا ملے گا۔ آخر تیرے سوا میرا ہے کون؟

لہو نغمہ ساز

ماں

اس کے خوبصورت سفید ہاتھ دعا کے لئے بلند تھے اور وہ سراپا عزت نوا آہستہ آہستہ اپنے محبوبہ سے التماس کر رہی تھی غفلت کی لپی آناک سرخی میں اس کا متھل چہرہ چمک رہا تھا۔ چڑیوں کے شیریں نغمات حسینہ سحر کا خیر مقدم کر رہے تھے۔ چنبیلی کی نازک ٹیکس ہوا کے نرم ہموں کوں سے جھوم رہی تھیں۔ گلاب کی پتیوں پر مجسم ہرک رہی تھی جیسے کسی کے رخسار پر نمودار ہوا آئینہ عرض طلوع ہو رہی تھی۔ صبح۔ یعنی۔ ارب کا ناست کی اولین نواں محبت تہمت کا پہلا ورق۔

اس کی آنکھیں بدلتی اور ہاتھ دعا کے لئے بلند تھے۔ ناگہاں اس نے آنکھیں کھولیں اور اس کی فضا سامنے نکلتی ہوئی تھی پر بڑی جمال، روشن آفتاب طلوع آہستہ آہستہ بلند ہو رہی تھی اس کی زمین کریں۔ عمارت کھڑی رہی تھیں اور بادلوں کا بیغ نہ گل جہر کے جھروں کی گھاٹ شعلہ داراں تھا۔ رخسانہ کی آنکھیں اس حسین منظر کو دیکھ کر ہلکے نہیں اور وہ آواز جو اس کی آنکھوں میں چمک رہا تھا۔ غور بڑی دیر کے لئے غائب ہو گیا۔ وہ اپنے ادول سے یکسر غافل ہو کر قدرت کی حق کاروں میں گھوٹی مگر جلدی ہی آج سے بہت پہلے کی ایک حسین صبح اسے آئی اور انسانی کے دھندلے نقوش ابھرنے لگے۔ آج سے بہت پہلے۔ جبکہ رخسانہ باپ کی شفقت و محبت سے محروم نہیں ہوئی تھی۔ ایسی ہی رنجین صبح تھی۔ رخسانہ اپنی بالکونی میں کھڑی تھیں منظر سے غفلت انداز ہو رہی تھی۔ وہ بہت مسرور تھی کیونکہ میراگ کا استھان اس کے امتیاز کے ساتھ پاس کیا تھا اور آج اسی خوشی میں اس کی سہیلیاں آنے والی تھیں وہ اپنی کامیابی پر مسکرا رہی تھی کہ جیسے سے کسی نے اس کے کندھے پر

ہاتھ رکھا: بابا۔۔۔ کہہ کر وہ مڑی اور اس کا سراپہ باپ کے سینے سے لگ گیا۔ "رخسانہ۔ میری بچی۔ وہ شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرنے لگے۔ آج میں بہت خوش ہوں رخسانہ۔ بھاری اس کا سامیانی سے میرے حوصلے بڑھ گئے ہیں میں تمہیں بہترین تعلیم دلوں گا۔ اعلیٰ تعلیم اور عمدہ تربیت سے تم میں بہترین جہلیتیں پیدا ہوں گی۔ تم ملک کی مائیدار لڑکی بنو گی۔ مجھے تمہارے کرنے نہیں دیا وہ تم لو۔ اگر کوئی میرا غضب العین تمہارے ذریعہ پورا ہو گا۔" ہاں بابا۔ میں اپنے آپ کو ایسا ہی ثابت کر دیکھاؤں گی۔ میرے ہاں میں سوائے قوی درد و فلاح کے کچھ نہ ہو گا۔ خدا بخیر ایک ٹول اور کامیاب زندگی دے۔ ایسی زندگی کہ جس کا ستھ خود تکلیف اٹھانا اور دوسروں کو سکھانا ہو۔ انھوں نے آہستہ سے آمین کہا اور زیر لب سترائے چلے گئے۔

گر آہ ان کی زندگی نے وہ زندگی اور وہ انہی بیوی ناز و اور رخسانہ کو چھوڑ کر ہوش کے لئے چلے گئے۔ ماں غم سے بالکل سی ہو رہی تھی۔ میں سالہ سالی ہوش کے لئے بھول گیا تھا اور رخسانہ دیکھ رہی تھی کہ "رشتہ دار" ان کے غم کی پرواہ کے بغیر آہستہ آہستہ ان کی چڑیل پر قبضہ چار رہے تھے۔ آہ یہ جو میں دیا۔ غم تازہ ہی تھا اور ان کو ترکہ کی فکر پڑی تھی۔ وہ چاہتے تھے کہ جتنی جلدی ممکن ہو سکے وراثت کی تعمیر ہو جائے۔ ماں کو اتنا ہوش نہ تھا کہ کچھ خیالی کرتی اور رخسانہ سب کچھ بھری تھی اور بے بسی تھی۔ اس کی بھوپلی بے دوسروں کو اپنے موافق کر لیا اور وہ مکان جو نہ جانے کتنی آرزوئوں سے بنایا گیا تھا جس مکان میں رخسانہ کا نہیں گزرا تھا۔ کامیاب اور پرمست، وہ اب دوسروں کے قبضے میں تھا۔ بھوپلی نے اسے باپ کے ترکے سے محروم کر کے مکان پر قبضہ کر لیا۔ اور وہ اپنے باپ کی اس ایک چیز سے بھی محروم کر دی تھی جس وقت اسے معلوم ہوا کہ اب یہ گھر اس کی بھوپلی کا

وہ ایک لمحے کے لئے بھی اپنی ماں کو چھوڑنا نہیں چاہتی تھی۔ وہ سب کچھ بھول کر اپنی ماں میں گم ہوئی تھی۔ بھوچھی اب بھی اپنی تعلقیں کہہ ان کے بچوں کی دیکھ بھال کرے مگر رخسانہ کو جیسے کسی بھی چیز کا ہوش نہ تھا۔ وہ تمام وقت اپنی ماں کے پیٹنگ کے پاس زمین پر بیٹھی اس کے زرد چہرے کو دیکھا کرتی۔ ایک دن نازو کی حالت زیادہ خراب تھی۔ وہ مہو چھی میں جانے لگا۔ کیا کیا کر رہی تھی۔ رخسانہ بھی اسی آسمان سے اسے دیکھ رہی تھی اور اس کے بالی اس کے منہم زرد چہرے پر کھڑے ہوئے تھے۔ اپنی ماں کے کنارے چہرے کو دیکھ کر اس کی آنکھوں میں آنسو جھپک پڑے۔ اسے اپنی بے بسی کا شدت سے احساس ہونے لگا۔ آہ کہیں اس کی ماں بھی تو اس سے جا نہیں ہو رہی ہے۔ اس نے ایک "ان دیکھی لے پناہ فوت کے سامنے عاجزی سے سر جھکا دیا اور آہستہ آہستہ رک رک کر اپنے مالک سے اتھا میں کرنے لگی۔ نہیں، نہیں میرے مالک۔ میری ماں کو کچھ سے جدا کر۔ ان کی محبت کے سوا میرے لئے دنیا میں اور کچھ نہیں۔ انھیں مجھ سے مت چھین۔ آم یہ وسیع و عریض دنیا۔ اس میں مجھے تنہا اور بے سہارا نہ چھوڑ۔ مجھے ماں کی محبت سے محروم نہ کر۔

میرے محبوبہ

نجمہ سمیع

تو آئندہ قربانی کی دیوی۔ منہم وراثت کا مجسمہ۔ محبت و خلوص کی سرچشمہ تو اولاد کے لئے کیا کچھ نہیں ہوتی؟ ماں! رخسانہ خلاء میں جانے لگا کیا دیکھتی ہوئی بڑا ہراسی تھی اور ناز و حیران و مبہوت اسے دیکھ رہی تھی۔

رخسانہ اپنی مختصر سی زندگی میں نئے نئے تجربات سے روشناس ہو رہی تھی۔ بھوچھی کے تڑاؤ میں اب وہ بھی سی محبت نہ رہی تھی۔ وہ بظاہر اس سے محبت کرتیں مگر انہیں یہ پریشانی بھی تھی کہ کہیں رخسانہ اپنے باپ کی وراثت کے لئے مصروف نہ کر دے۔ اس کی بڑھتی ہوئی عمر کے ساتھ ان کا یہ اندیشہ بھی بڑھ رہا تھا۔ رخسانہ ان کے اس اندیشہ سے بے خبر اپنی پریشانیوں میں گم تھی۔ اس سے اپنی ماں کی حالت پر تشویش نہ تھی۔ وہ دیکھ رہی تھی کہ نازو کی محبت روز بروز گرتی ہی جا رہی ہے۔ اگر کچھ دن ان کا علاج نہ کیا گیا تو۔۔۔ اس کے آگے وہ سوچ نہ سکتی۔

بھوچھی کی لاہرہ دانیوں اور نازو کی زندگی سے بے ڈارگی نے آخر نازو کو سخت بیمار کر دیا۔ رخسانہ جیسے اپنے ہوش و حواس گم ہو بیٹھی۔ دن رات وہ ماں کی تیار و ادوی میں مصروف رہتی۔ اسے اپنے کھانے کی بھی پروا نہ تھی۔

من کی دنیا۔ حیدرآباد کے نوجوان افسانہ نگار رشید قریشی ایم اے کے افسانوں کا انشیں مجموعہ ہے۔ افسانوی ادب کا دلچسپی رکھنے والے ضرور اس کا مطالعہ کریں کتاب بہت دلچسپ اور افسانہ نگار بیان نہایت دلکش ہے۔ ہر فساد و رعنائی خیال اور رنگینی بیان کا بہترین نمونہ ہے۔ اردو کے نئے ادب سے دلچسپی رکھنے والے اور ترقی پسند فکروں کے پرستان افسانوں کے مطالعہ سے ضرور محظوظ ہوں گے جو صاحب اردو کے جدید ترین افسانوں کا مطالعہ کرنا چاہتے ہیں وہ اس نوجوان مصنف کے ان پرکیت افسانوں سے ضرور لطف اندوز ہوں گے۔

صفحات (۱۹۰) قیمت جلد عہ روپیہ

سب کس کتاب گھر۔ خیرت آباد سے طلب فرمائیے۔

سحرِ اسے

رباب کا ساتھ توج، تار کی سسائی
 کوئی ڈھلی ہوئی دھوپ اور کچی ہوئی لڑائی
 کوئی وہ موسم سرما کی چاندنی کم کم
 کوئی دھواں سا چلتا ہوا فضاؤں میں
 کوئی وہ موج رسیدہ جسے قمار کہیں
 کوئی وہ نکتہ ابرِ رواں ہواؤں میں
 کوئی حجاب درونِ حجاب و پردہ ساز
 کوئی وہ لہجہ جو داؤد کی زبور میں ہے
 کوئی وہ تلخی احساس جو شعور میں ہے
 کوئی وہ عفتِ جو برپا نہ ہو گھل جائے
 کوئی خیال کی جولانیوں میں ایک قرار
 کوئی ہزار کتابوں میں ایک ہجاءِ ظہار
 کوئی سردی کے عالم میں بے دلی کم کم
 کوئی تبسمِ ابر بہار و موسمِ گل
 کوئی وہ تیرگی کی افسردگی میں تازہ خیال
 کوئی تغزلِ خسرو میں آریوں کا حال
 کوئی وہ برف جو کرنوں کے انتظار میں ہو
 کوئی وہ بات جو الجھے ہوئے شراب میں ہو
 کوئی وہ قصہ جو اکثر دراز ہو جائے
 کوئی وہ لے جو بڑے اور ساز ہو جائے

خوشیڈ الاسلام

یہ رنگ روپ، یہ سائے، یہ دھوپ چھاؤں، یہ جال
 کہیں فخریکہ و دہ عالم، کہیں خیال محال

ہی کسی منظر کو لافانی کر کے خدا نے محنت کی تخلیق کی ہوگی۔ میں سمجھا ہوں کہ رستے اس مہول کوئی جانا چاہتا تھا۔ اور اسی لئے مجھے اپنے پیچھے سے ایک آواز سنائی دی۔ شرارڈ میں نے حکر دیکھا، لیکن کچھ نظر نہ آیا۔ کچھ قدم آگے بڑھ کر میں ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ پھر ایک مرتبہ دیکھی ہی آواز آئی اور اس کی دھڑ میں نے اسے دیکھ لیا۔ وہ ایک چرواہی تھی۔ ہاتھ میں ایک لمبی سی دراتی لئے وہ ایک دشت پر چارھی پتہ توڑ رہی تھی۔ میرا قریب چلا گیا اور اسے غور سے دیکھنے لگا۔ جوانی اور صحت ان کا ایاکل اتمزاج میں نے اسی دن دیکھا تھا۔ وہ سانولے سے رنگ کی ایک اطرسی لڑکی تھی، میلے سرخ رنگ کا ہون بگ بگ سے بھٹ گیا تھا۔ بارش میں سبک کر کے لمبے لمبے بالوں کی ٹیلیں چہرے پر اور ادھر ادھر ہوں لگ رہی تھیں جیسے بڑی جڑیں۔ کانوں پر سیاڑی ہوئی بانیاں لگوانے کے ہر جھلکے کے ساتھ آپس میں ٹکرا کر ایک لطیف جھنجکاہ پیدا کرتی تھیں، اس کے چہرے کی سب سے نمایاں چیز اس کی آنکھیں، بڑی بڑی لمبے چہن سی، جیسے کچھ کہنے کے لئے بے تاب ہوں۔ وہ کچھ ایسی جیلن نہ تھی لیکن جن کا دوسرا نام شاعر جوانی اور صحت ہی تو ہے۔۔۔۔۔ میں اسے دیکھتا اور قریب چلا گیا۔ دراتی اس کے ہاتھوں میں رک گئی اور اس نے جلدی سے اپنی ننگی بائہ کو ہون کی پٹی ہون کی کھچ کر ڈھک لیا۔ وہ درخت پر اسی جگہ کھڑی ہوئی تھی جہاں پہلے سے ایک آدمی موٹی شلغ پھوٹ نکلتی تھی۔ دائیں طرف درختوں کی ٹہنیوں اور پتوں نے اس کے گرد ایک سبز جال سا بن دیا تھا۔ پس منظر میں نیلے آسمان پر تقریاً کناروں والے سرمئی رنگ کے اہل جھول رہے تھے۔ ایک ہاتھ میں دراتی تھامے اور دوسرے سے برابر کا ہٹا کر لے، گردن اٹھائے وہ یوں کھڑی تھی جیسے کوئی یونانی مجسمہ۔

طبع چکا ہوتا اور اب فضا میں ان گیتوں کی بجائے طوطوں اور میناؤں کا شور اور کوئل کی فریاد پھیل جاتی۔ پر تو تھے ہوئے کوئل کی قطاریں وقف وقف سے کان میں گائیں کا ایک ٹل مچا دیتیں اور سبھے پھر وہ سادہ گائیت یا د آجاتا۔۔۔۔۔ جارے کا گاتی کے دیں۔

تو میں سائیکل سے اتر کر پیدل اس سیاڑی کی طرف بڑھنے لگا۔ پگڈنڈی کی دونوں جانب بھکی ہوئی بھڈیاں کے چٹان پر ٹیرے ہوئے پانی کے لوجھ سے دبے جارہے تھے۔ میں ان سے بچتا بچتا اور چرواہے جارہا تھا۔ کوئل اتر کر میں نے نہ ہوں پر ڈال لیا تھا اور ٹیلوں کو پیٹ پر کافی اور چھینچ لیا تھا۔ سائیکل کی موجودگی اس چرواہی میں تخلیق تو بہت دیر ہی تھی لیکن سیاڑی پر پہنچنے کی زبردستی خواہش کے آگے پہلے حقیقت نہ تھی۔ بالآخر میں آخری چٹان کے پہلو سے ہو کر نیلے کی چوٹی پر پہنچ گیا۔

سائیکل کو زمین پر لٹا کر میں ایک پتھر پر سیدھا کھڑا ہو گیا۔ مجھے یوں محسوس ہونے لگا جیسے سائیکل سے سبیلوں تک چھٹی ہوئی کائنات میرے قدموں کے پیچھے ہے۔ جیسے درختوں پر مڑلاتے ہوئے یہ بد اور نیل گنڈے تک نہ پہنچ سکیں گے، جیسے میں ایک کر سر پر اڑتے ہوئے ان بادلوں کے ٹکڑوں کو کھانوں گا۔ جیسے یہ غیر متکئی آسمان بھی کچھ دیر میں جھٹک کر مجھ سے سرگوشیاں کرنے لگے گا۔۔۔۔۔ اور میں دنیے ہی کھڑا رہا۔ مغرب کی طرف غروب آفتاب کی تیاریاں شروع ہو گئی تھیں۔ بادلوں کے کنارے اپنا رنگ بدل رہے تھے اور دور افق تک پھیلے ہوئے سبز سے سرخی کی کرنیں پھوٹ پڑی تھیں۔ گنجائی درختوں کے درمیان بل کھاتی ہوئی سڑک کسی تصور میں بنا رہی ہوئے لہجہ کے دریا کا منظر پیش کر رہی تھی۔ ہوا سیاڑی کے غور دھوپوں کی خوشبو سے بھری ہوئی تھی۔۔۔۔۔ میں سوچنے لگا شاید ایسے

پیلے کی کوشش کر رہی تھی جسے دیکھ کر روکے ہوئے تھی۔
 مگر تصویر تو میری ہے، انعام تمہیں کیوں ملے گا؟
 میں سٹے پٹا گیا۔ اب اسے کیسے بھاؤں کہ یہ یوں ہی
 ہوتا ہے۔
 "بھی کبھی تو میں نے ہے!۔۔۔۔۔ اس نے
 انعام بھی کوٹے گا۔"

واہ! یہ بھی کوئی بات ہوئی، تصویر میری اور انعام
 تمہیں ملے گا۔"

"دیکھو نا یہ کیمرو میرا، اس کے اندر کی فلم میری
 اور پھر محنت کر کے تصویر آمارنے والا بھی میں۔۔۔۔۔"

انعام تو۔۔۔۔۔
 مگر تصویر تمہو نے والی میں، میں نہ ہوتی تو
 تصویریں کی آمارنے؟"

"اچھا بھئی۔ انعام ملے گا تو سارے کا سارا تمہیں
 لا دوں گا۔"

اور میں ہنس پڑا، وہ بھی ہنس پڑی۔ مجھے ایسا محسوس
 ہوا جیسے حاملہ کے ذرے ذرے ایک قبضہ لگایا ہے۔
 "تم چرواہی ہو؟"

"ہاں۔"

"تو تمہاری بھیڑیں، بکریاں کہاں ہیں؟"

"انجیس میرا بھائی، بھائی ہے، میں روز شام کو
 ٹھوڑے سے چٹے کھٹے کر کے بکریوں کے بچوں کے لئے
 لیجاتی ہوں۔ اس نے توڑے ہوئے چھتے جرتے
 ہوئے کہا۔ میں ہمارا پی سا نیل اٹھالایا۔

"تمہارا گاؤں کونسا ہے؟" میں نے کیمرو نیل
 سے باندھتے ہوئے پوچھا۔
 "وہ رہا سامنے، چند رنچو۔"

"تو چلو، میرا راستہ بھی وہیں سے جاتا ہے؟
 اور وہ چنل کا گٹھا سر پر کے میرے ساتھ ساتھ
 پہاڑی پر سے اترنے لگی۔ ہمارے چلنے سے گڈنڈی پر

دلفشا میرے ذہن میں ایک خیال آیا اور میں دوڑا
 ہوا جا کر سائیکل سے اپنا کیمرو مکمل لایا۔ وہ میں کھڑا
 ہوئی میری ان عجیب حرکتوں کو دیکھ رہی تھی۔ میں نے
 اسے خاموش کھڑے رہنے کا اشارہ کیا اور اس کی
 تصویر اتالی۔ اس کی کچھ میں یہ کھنڈ آیا۔ وہ دھرت
 سے نیچے کو آئی اور میرے قریب آکر کیمرو کو غور سے
 دیکھنے لگی۔

"یہ کیمرو ہے، اس سے تصویر کبھی باقی ہے۔
 میں اسے بھجوانے لگا۔"

"تصور اب" اور وہ کچھ گھبرا سی گئی۔ شاید اس کے
 ذہن میں گاؤں کے کسی پیلے کے سفری ٹوٹو گرا دی دکان
 کھوم گئی ہوگی۔ وہ اور زیادہ حیرت سے کیمرو کو کھورنے

لگی۔
 "اس سے میں نے تمہاری تصویر آمار ہے، میں

کہا۔ میری تصویر۔۔۔۔۔ مجھ سے کہے بنا کیوں منجلی
 تم نے؟" غصہ اور شرم سے اس کے گالوں کی رنخت ایسی

ہی ہو گئی جیسی اس وقت بورد کی طرف آسمان کی ہوسا
 تھی۔ تو اس میں ہرج کوٹا ہے؟ اور میں اس کے

ہاتھوں سے گڑی ہوئی درختی لے کر دھرت کے چتے توڑنے
 لگا۔ اس کی لمبی لمبی پلکیں بڑی تیزی سے حرکت کر رہی

تھیں۔ شاید وہ سوچ رہی تھی۔ "ہاں! اس میں ہرج
 کونسا ہے؟۔۔۔۔۔ اور یہ وہ اپنے میلے اور نکلے

پیروں اور پیرن کے بیٹھے ہوئے محسوس کو دیکھنے لگی۔
 "مگر میری تصویر کا ٹکڑا کیا کر دے گا؟ اس کا قصہ اور غم

اب ایک قسم کی دہلی ہوئی خوشی میں بدلنے لگے تھے۔
 "ایں! اتے، خبریں بھجوں گا؟"

"خبر؟"

"ہاں، تمہاری تصویر چھپ گئی، سب لوگ دیکھیں گے،
 تمہاری تعریف کریں گے اور مجھے انعام ملے گا۔ اس کی پلکیوں
 کی حرکت اب اور تیز ہو گئی تھی۔ اس کے ہاتھوں پر شاد مسکراہٹ

ایک سوال یہ نشان تھی۔

ہاں۔۔۔۔۔ آں۔۔۔۔۔ یہ دفتر ایک پتھر تھا ہے
جہاں آدمی سر پہ پٹو کر مارتے ہیں۔
اپنی خوشی سے؟

ہاں۔ اور کیا!۔۔۔۔۔ لیکن اس کا اطمینان
نہ ہو سکا۔

پتوں کا گھٹا اب اس نے سر سے اتار رکھ دیا ہے
رکھ لیا تھا، ہم اتنے قریب قریب مل رہے تھے کہ ہوا
کے ایک جھونکے سے اس کے بال اڑا کر میرے چہرے پر
پڑ گئے۔

دیکھو تو، تمہارے بال کس قدر لمبے ہیں! شرم
کے مار چھپے، مگر تم نے انہیں برباد کر رکھا ہے۔ اور
اس نے اپنے منہ پر بالی پھرا کھینے لگے۔ کبھی منگیلی بھی
کرتی ہو؟ لیکن وہ خاموش رہی، اب اس کے بالوں
کی حالت سے خود بخود ظہور ہوتا تھا۔

اب ہم بہاؤ میں سے اتر آئے تھے۔ ایک کچا راستہ اس
گھاؤں کی طرف، چار ہاتھ، میرا اور وہ تھا کہ اس کے گھاؤں
تک پہنچ جائیں، وہاں سے بائیں ہاتھ کو مڑ کر پھر مڑ کر
ہو لوں گا۔

چلتے چلتے دفعتاً ایک خیال یہ بہ ذہن میں آ گیا۔ ایک
طرف مڑا کر کہنے لگا۔ "تو تمہیں سناٹا نہیں ہے؟" اس نے کہا۔
وہ کچھ بدحواسی ہوئی، کوئی جواب نہ دیا۔ میں نے فریاد
چاہتی تھی، مگر ظاہر کیا کیسے ہستی۔۔۔۔۔ "اوہوں۔ گھاؤں
کا کوئی آدمی دکھ لے گا۔۔۔۔۔ تو۔۔۔۔۔ لیکن میں تمہیں
گھاؤں شرم سے ہونے سے پہلے ہی انار دوں گا۔۔۔۔۔ آؤ۔۔۔۔۔

اور میں نے اسے کچھ ادا کیا، باسوئے کا سوئے کا سوئے
ہی نہ وہاں سہارا دے کر اس کے سناٹے کو بٹا دیا۔
پتوں کا گھٹا اس نے آگے منڈائی پر رکھ دیا۔ اتنی دیر
سدانے سے نئی طاقت آگئی، پھر سے زور سے

بیٹھے ہوئے منہ کی کڑے کوٹے پھدک پھدک کر برابر
کی گھاڑیوں میں چپتے جا رہے تھے، آسمان کی سرفی
اب سیاہی میں بدلنے لگی تھی۔

سائیکل کا بریک دبا کر میں نے اتار پر سے
اترتے ہوئے اسکو اپنے قابو میں کر رکھا تھا۔ تھوڑی
تھوڑی دیر سے میں چرواہی کی طرف دیکھ لیتا، میری نظریا
اپنی طرف اٹھی ہوئی دیکھ کر وہ اپنی نظریا زمین میں گاڑ
دیتی، لیکن جب میں بہت دور اُفتی کے قریب ابھرے
ہوئے پہاڑوں کے سلسلے کو دیکھنے لگا تو مجھے محسوس
ہوتا کہ وہ مجھے گھور رہا ہے۔ کچھ دیر ہم اسی طرح
خاموش چلتے رہے۔

تم نے اپنی تصویر اس سے چلے بھی کبھی چوٹی
ہے؟ خاموشی کو توڑتے ہوئے میں نے کہا۔

"اوہوں۔" اور نفی میں اپنا سر بھی ہلا دیا۔
"تو یہ تمہاری پہلی تصویر ہے؟" جیسے میں نے
اپنے آپ سے کہا۔ "اب کلاں تیرے گھر سے آؤں گا تو تمہارا
یہ تصویر تمہیں بھی دے جاؤں گا۔"

"ابھی کیوں نہ دیدو؟" اس کا اشتیاق بڑھتا
جا رہا تھا۔ میں ہنس پڑا۔ "ابھی تو اسے بہت دن گزرے،
شہر جا کر بنائی پڑے گی۔ لیکن اس کی آنکھیں کبہ رہی
تھیں کہ اسے اس کا یقین نہ آ سکا۔

"سہر میں تو کہو؟" بڑی دیر بعد اس نے
ایک سوال کیا۔

"نہیں تو۔۔۔۔۔ چاہتا ہوں فی۔ اسے میں؟"
"فی۔ اسے؟" اس کا چہرہ ایک سوالیہ نشان
بن گیا۔ "یہ فی۔ اسے کیا ہوا؟"

"فی۔ اسے۔۔۔۔۔ تم۔۔۔۔۔ لوں کچھ جاؤ
۔۔۔۔۔ فی۔ اسے ایک کھیت ہے جہاں کی پیداوار
دفتروں میں بھی جاتی ہے۔"

"دفتر؟" اور اس دفعہ وہ پوری کی پوری

سائیکل چلانے لگا۔

سڑک بہت فرا بہ حالت میں تھی اس لئے بار بار سائیکل ایک جاتی اور اس کا سر میرے سینے سے آٹھو اتا۔ اس کے نرم نرم ہال چہرے پر پھیل کر گہ گہی سی کرتے تھے۔ اور ساتھ ہی وہ اور سکر جاتی۔ ایک جگہ سڑک کچھ ہموار تھی۔ میں نے سائیکل بوری رفتار سے چلا دی۔ سامنے سے آتے ہوئے ہوا کے زور کے جھونکوں کی وجہ سے شاید اس کے پیٹ میں گہ گہی ہو رہی تھی اس کی ہر منٹ کی بے چینی سے یہی ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ بڑی مشکل سے تہی کر کے ہونے ہے۔ بالآخر تھک مار کر بولی۔

”بس، بس، اب رو کو بجا۔۔۔۔۔ میرے گرد گردیاں ہو رہی ہیں یہ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے اس بدن کا سارا خون اس کے چہرے پر گنچ ہو گیا ہے۔ وہ نہ ہاتھوں سے ہینڈل کو مضبوطی سے پکڑے وہ کھلے پڑی تھی۔“ میں۔۔۔۔۔ اسے اسے مجھے ہول آ رہا ہے۔۔۔۔۔ مجھے آثار وہ۔۔۔۔۔ مجھے۔“

لیکن میں نے رفتار اور بڑھا دی۔

”اوہ۔۔۔۔۔ رو کو، رو کو۔۔۔۔۔ نہیں تو میں کو دو جاؤں گی؟ اس کی بے چینی اب بہت بڑھ چکی تھی۔“ میں۔۔۔۔۔ خبردار رو کو نامست، ورنہ ہاتھ پیر پٹ جائے گا۔“

لیکن اب اس کی حالت قابلِ رحم ہو گئی تھی۔ میں نے سائیکل روک لی۔ وہ کہہ کر بیٹھ اتر آئی۔ ایک دم آنکھوں کے کونوں سے میری طرف جھانک کر دیکھا۔ ان ہی بے چین نظروں سے۔۔۔۔۔ اور پھر ایک دم جس بڑی ”علوم نہیں کیوں! اس کا گلاں اب بہت قریب آ گیا تھا۔ میں نے کوٹ کا کارڈ پر دست کر لیا۔ اور اس پر ایک آخری نظر ڈال کر سائیکل اٹے بڑھا دی۔ وہ ایک درخت کے

گٹھا زمین پر ڈالے میری طرف گھور رہی تھی وہی بڑی بڑی آنکھیں اب بھی کچھ کہہ رہی تھیں۔۔۔۔۔ جانے کیا! کچھ دور جا کر میں نے مڑ کر دیکھا وہ وہیں کھڑی اب تک بٹھے گھور رہی تھی میں آگے بڑھ گیا۔ پھر ایک مرتبہ پلٹ کر دیکھا، وہ اسی طرح کھڑی تھی، پھر ایک مرتبہ میں مڑ کر دیکھا، اور پھر ایک مرتبہ اور۔۔۔۔۔ اور وہی طرح کھڑی رہی۔ لیکن میرے ہر پیدل پر طعنے باناتے ہوئے اور ہم میں فاصلہ بڑھتا رہا کئی بار وہ نے کہا کہ ایک دفعہ واپس چسپلو۔ لیکن میں آگے بڑھتا ہی گیا۔ کئی دور ایک موٹر پر وہ نظروں سے غائب ہو گئی۔ اور پھر میں تیری سے سائیکل چلانے لگا۔ سات میل فاصلوں میں ملے کر کے میں اپنے گاؤں پہنچ گیا لیکن راستے بھر بٹھے اب محسوس ہوتا رہا جیسے دو بڑی بڑی اور مضطرب سی آنکھیں میرا تعاقب کرتی رہی ہیں، جیسے وہ آنکھیں کچھ کہتی رہی ہیں، اور جیسے میں ان نظروں کی پہنچ سے ابھر نہیں سکتا۔ گا۔۔۔۔۔

دو بھر دو دن بعد جب میں واپس شہر جا رہا تھا تو چند گھر کے قریب سڑک سے ہٹ کر میں نیچے رستے پر ہولیا۔۔۔۔۔ ہاں غیر اعتدالی طور پر ہی! جانتا تھا سید ہا اپنے رستے پر چلا جاؤں لیکن میں ایسا نہ کر سکا۔ صبح کے کوئی سات با آٹھ بجے کا وقت تھا، میں گاؤں کے بالکل قریب سے گزر رہا تھا۔ کوئی تیس چالیس جھوٹوں کا معمولی سا گھوڑا تھا۔ جھوٹیاں مار کر کے میں دوسرے کنارے پر پہنچ گیا لیکن وہ کہیں نظر نہ آئی۔ باؤس ہو کر میں دائیں جانب پیٹائی کی طرف مڑنے ہی لگا تھا کہ وہ نظر آگئی۔ وہ سامنے کھینٹوں کی طرف سے آ رہی تھی۔ آگے آگے کبھی کے دو سفید بچے کھلیں کرتے دوڑے آ رہے تھے۔ اس وقت وہ ایک نو رنگ کی چھون پہنچے ہوئے تھی جو پہلے پھرن سے فورا اچھی حالت میں تھی، اور اس کے سر کے بال، اور ہاڈا ہاڈا نے کی بجائے ایک جگہ مضبوطی سے بندھے

ہوئے تھے۔ شائدان میں تیل ڈال کر نگلی بھی کی گئی تھی۔
..... وہ اس وقت بڑی خوش نظر آرہی تھی اور
برکی کے دونوں بچوں کے پیچھے اپنی کی طرح تلاپٹیں ہارتی
ہوئی میری طرف چلی آرہی تھی۔

لیکن میں ایک غیب سے، معلوم نہ کیے گئے
ایک جھاڑی کی آڑ میں ہو گیا، میں نے ایسا کیوں کیا یہ
خود مجھے بھی نہیں معلوم۔ لیکن وہ میرے پاس سے گزری
چلی گئی اور میں سائیکل تھامے جھاڑی کے پیچھے کھڑا
رہا۔ وہی بے چین آنکھیں اب بھی کچھ کہہ رہی تھیں،
..... شائد۔ لیکن میں انھیں اس وقت اپنی طرح نہ
دیکھ سکا تھا۔

اس کے بعد میں چلا گیا۔ پہاڑی کے دامن سے
کھیتوں کے بیچ میں سے، دیہاتوں کے سامنے سے اور
باغوں کے کنارے سے، جہاں کہیں سے بھی میں گزرا
ایک سوال براہ میرے ذہن میں ٹھوٹتا رہا۔
اس نے وہ بال کیوں گوندہ رکھے تھے؟
..... کیا۔

لیکن میں یہاں آکر رک جاتا اور پھر شروع
سے سوچنے لگتا۔

کہتی ہوں۔۔۔۔۔ یا شائد اب بھی وہ کچھ کہتی ہوں۔۔۔۔۔ کون جانے!

جی جیلانی

محبت کی جھاؤں :- مرزا غفر الرحمن صاحب بی آکے چودہ افانوں کا دھبب مجموعہ ہے۔ اس کے
جلد افانے عشق و محبت کی ولولہ انگیز یوں اور حسن و شباب کی رعنائیوں سے معمور ہیں۔ ہر فسانہ میں تخیل کی
جولانیاں اور مشاہدات کے تاثرات کا رفرہا ہیں۔ نوجوانوں کے نصب العین معاشرہ کی بچی نقویہ اور مصروف
زندگیوں کے لحاظ فرصت کے لئے ایک شائستہ ذہنی تفریح ہے۔ اس کا حسین و جمیل سرورق دیکھتے ہی اس
کتاب کے بیناک اسلوب اور اس کے افانوں کے لیے پناہ شوقی کا اندازہ ہو جاتا ہے۔

چھوٹی قطع (۱۳۲) صفحات قیمت مجلد چھ

شہر پہنچا تو کچھ دن اور اسی سوال کو دہراتا رہا۔
پھر رفتہ رفتہ میں اس واقعہ کو بھول گیا، اس سفر کو
بھول گیا، اس پہاڑی کو بھول گیا، اس چرواہی کو
بھول گیا۔۔۔۔۔ وہ سوال بھی میرے ذہن میں جانے
کہاں وقت ہو گیا!..... بی آکے کا استحسان دیکر
جب میں لاری میں آنے کاؤں جا رہا تھا تو چند نر کے
قریب سے بھی گزرا تھا۔ لیکن میں سب کچھ بھول چکا تھا۔
مجھے یاد ہے، لاری میں اپنے کسی دوست کے ساتھ باتوں
میں میں ایسا محو تھا کہ مجھے یہ بھی خبر نہ رہی کہ چند نر گزرا
اور کب گزر گیا۔۔۔۔۔ اور پھر برابر ایسا ہی ہوتا رہا۔

ہاں، وہ نقویہ میں نے دھوا کر اپنے الہم میں
لگوئی تھی جو آج تک وہی ہی پڑی ہے۔ آج رسول کے بھر
اپنا الہم دیکھ رہا تھا کہ اچانک نظروں کے سامنے وہ نقویہ آگئی
اور میرے ذہن کے سامنے تاریجے کسی نے جھنجھوڑ ڈالے
اس واقعہ کی یاد ذہن کی سب سے علی تہہ سے ابھر
آئی اور پھر میں الہم کا وہ صفحہ الٹ سکا۔

جانتے وہ اب کہاں ہو؟ کسی ہو؟..... شائد اب
پھر اس کے بال بکھر گئے ہوں اور شائد اس کی وہ بچپن
آنکھیں اب بے چین درہی ہوں، شائد اب وہ کچھ
.....

ایک سوال

زمیں کے تاریک گہرے سینے میں پھینک دو اس کا جسم خاکی!
 یہ سیگوں نرم نرم کر نہیں
 جو ماہ و انجم سے پھولتی ہیں
 یہ نیلگوں آسماں کی دنیا
 یہ شرق و غرب کے کنارے
 یہ میوہ ہائے لذت و شیریں
 یہ حین بے نام کے اشارے
 کبھی نہ اس کو جگا سکیں گے!
 جوان و کش حین چہرہ سے چھین لی غم نے تابناکی!
 کھلی ہوئی بد نصیب آنکھیں
 یہ دیکھتی تھیں کہ آدمی نے
 اک اپنے ہی جیسے آدمی پر
 تمام دروازے بند کر کے
 بہیمیت کو جگا دیا ہے!
 لذت انبار نعمتوں کے
 سیاہ پردوں میں دب گئے ہیں
 اور آخرش راندہ جہاں سے زمیں کی آغوش وفا کی!
 اسی لئے کیا اُگاکریں گے
 یہ نرم پودے یہ نرم ستائیں
 کہ ان کو اک روز ہم اٹھا کر
 خزاں کی آغوش میں سلا دیں؟

احقر الایمان

محبت کی حبت

عزیز احمد برسرِ طرکی کوٹلی میں غیر معمولی پہل پہل ہے کیونکہ ان کے ہاں چائے پر کچھ زمانہ دیکھیں اور یہ پارٹی شفیق احمد کو لندن سے واپسی کی خوشی میں دی جا رہی ہے۔ کوٹلی کو خوب سجایا گیا ہے۔ ڈرائنگ روم میں ایک نوجوان شیلے سوٹ میں ملبوس بے چینی سے کسی کا منتظر ہے۔ کھلتا ہوا دروازہ کتا پیچہ، بڑی بڑی آنکھیں ایک صوفے پر دراز کھڑا بیٹے اتھلی سے اخبار پڑھ رہا ہے کہ گویا وقت گزارنے کی ناکام کوشش میں ہے۔ ریل ٹوگ ہوا ہے لیکن شفیق پر بار چہرے پر سے اخبار ہٹا کر آہٹ کو بغور سنتا ہے۔ بے چینی کا یہ عالم ہے کہ سگریٹ پر سگریٹ سلگاتا ہے لیکن اس کو یہ بھی نہیں لہر آیا وہ اس کو پی بجھا رہا ہے یا تو بی جلا رہا ہے۔ اتنے میں ایک اور نوجوان (جو گفٹ گسے شفیق کا بے تحلف دوست معلوم ہوتا ہے) داخل ہوتا ہے اس وقت ریل ٹوگ بریکٹ کا یا جا رہا تھا

”ایک ندی کے دو کنارے ملنے سے محبوب“ شفیق اسی محبت کے سنے میں کچھ ایسا محو تھا کہ شاہد کے داخل ہونے کی اس کو خبر تک نہ ہوئی۔ شاہد نے اس کے شانے پر ہاتھ دارتے ہوئے کہا: ”کہو یار“ شفیق گویا کسی گہرے خواب سے چونک بڑا اور شاہد سے بڑے تباہ سے بڑھا کھڑا۔ ”ہیں بھئی کوئی خاص بات نہیں سن رہی تھی تمہارے انتظار میں۔۔۔“ شاہد نے بات کاٹ کر کہا میرے انتظار میں یا کسی اور کے۔ نہیں شاہد تمہارا ہی انتظار تھا۔ شفیق نے کہا۔ ارے تو بے وقوف۔ طاہر۔ انوکا تو اب تک پتہ نہیں۔ یہ ہندوستانی بھی بڑے وعدہ کے پابند ہوتے ہیں!

شفیق نے منتظر ٹھاہوں سے باہر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ شاہد۔ تو کم تو ہندوستانی نہیں ہو جو ہندوستانی پر طنز کرتے ہو۔ انکشان کا کیا چکر لگا آئے ہو میں گویا اپنے آپ کو بھی پور وپن تصور کرنے لگے۔ دانشور شفیق مجھے تو ڈر لگتا ہے۔ خدا کرے تمہارے خیالات بالکل ہی تبدیل گئے ہوں۔ ورنہ کسی کی زندگی تباہ ہو جائے گی۔ شفیق نے بے چینی سے کہا۔ نہیں نہیں شاہد! تم کو غلط فہمی ہوئی میرے خیالات وہی ہیں جو آج سے چھ سال قبل تھے۔ یہیں شاید مجھے اب اپنے خیالات تبدیل کرنے پڑیں۔

”کیوں خبر تو ہے آج تم کچھ ایسی دوسری باتیں کر رہے ہو“ شاہد نے کہا۔ خیر چھوڑو ابھی اس جھگڑے کو اب انور۔ نعیم وغیرہ کو میرے خیال میں فون کرنا پڑے گا کہ آیا وہ آ رہے ہیں یا نہیں۔ یہ شفیق نے بات کا پہلو بدلتے ہوئے کہا۔ شاہد۔ ارے یار دیکھو فون کرنے کی زحمت کیل گولڑا کرتے ہو۔ وہ رہے انور۔ نعیم۔ وغیرہ۔

شفیق اور شاہد بڑھ کر سب کے یکے بعد دیگرے لاتے ہیں۔ شفیق سے تو ہر ایک بطور خاص ملاقات کر رہا ہے۔ کیونکہ آج کی دعوت کا مرکز ہی وہی تھا۔ یہی گفتگو اور چائے سے فارغ ہو کر تمام دوست کچھ خوش گویوں کے بعد رخصت ہو گئے۔ اس طرح سات بجنے تک شفیق اور شاہد تنہا رہ گئے۔ لیکن شاہد موقع کی تلاش میں تھا کہ شفیق کی رنجیدگی کا حال کسی طرح معلوم کرے۔ چنانچہ شاہد اپنی جگہ سے اٹھ کر شفیق کے بازو پیٹ لیا اور بے تحلفی سے گلے میں باہیں ڈال کر پوچھا کہ ”بھیا شفیق آج تو تمہیں اپنی غائب دماغی یا رنجیدگی کا اصل واقعہ سنا ہو گا۔ تمہاری کوئی بات مجھ سے تو پوشیدہ نہیں دانتہم کہ وہاں سے اٹھنے سے دوں گا جب تک کہ سارا حال نہ کہہ ڈالو“ شفیق نے کہا۔ شاہد مجھے خود تم سے مشورہ لینا ہے۔ اس وقت میری جان عجیب

مکمل میں ہے۔ تم کو معلوم ہی ہے کہ میں انگلستان جانے سے پہلے کیسے خیالات رکھتا تھا اور وہاں کے قیام کے دانے میں بھی جو امیدوں کے شجر لگانے تھے اور جن کی آبیاری اپنے خونِ جگر سے کی تھی، خزاں کی فدا ہوئے معلوم ہو رہے ہیں۔ میری بد قسمتی تو دیکھو کہ میرے انگلستان پہنچنے کے چند روز بعد ہی ابا جان اس جہانِ فانی سے کوچ کر گئے۔ اب رہیں امی تو ان بیچاری کا حال غم کی وجہ سے پہلے ہی سے اتنے ہی افسردہ و سوگندے کے مصداق پہنچی صاحب کی پوشیدہ کارروائیاں ان کے لئے سوہانِ روح و شہادت ہو رہی ہیں۔

شادیات کاٹ کر یہ تمہاری پہنچی صاحبہ کو تو ایسے وقت میں تمہاری والدہ صاحبہ سے اور بھی زیادہ ہمدردی اور نگہ ساری کرنی چاہیے تھی۔

شفیق نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ہاں شاید تمہارا اکہنا بالکل ٹھیک ہے لیکن ان کو ظاہر کوئی تکلیف نہیں۔ لیکن تم کو یاد ہو گا کہ میرے انگلستان جانے سے قبل چچا صاحب نے اپنی اکلوتی لڑکی شمیمہ کو مجھ سے منسوب کر دیا تھا۔ اور اہرم سے وعدہ بھی کر چکے تھے۔ اور یوں بھی مجھے بچپن سے نہ جانے کیوں اس لڑکی سے کچھ انس سا ہے۔ لیکن اب جب کہ ابا جان نے رحلت فرمائی پہنچی صاحبہ کے خیالات بالکل بدل گئے ہیں۔ وہ یہ چاہتی ہیں کہ شمیمہ غیر گھر میں بیاہ دی جائے اور وہ ہیں سطر آئید۔ شاید نے کہا کیا تمہارا مطلب اکبر حسین جاگیر دار کے لڑکے سے ہے؟

شفیق۔ ہاں۔ شاید کہ ان کے ہاں بڑی جاگیریں ہیں۔ اہرم جہ کی ساری جائیداد کے قریب چچا ہی مالک ہوں گے۔ پھر حصہ نہیں بھی مل جائے گا۔ لیکن آئندہ کی تو پوری جائیداد اس طرح ان کے ہاتھ

لگ جائے گی؟ شاید نے کہا۔ میرے خیال میں ان کو تم سے بہتر اور صالح لڑکا ملنا دشوار ہے۔ شفیق بولا۔ تمہارے خیالات کا دوسروں سے متفق ہونا دشوار ہے۔ شاید۔ شفیق دشوار نہیں بلکہ ضروری ہے کیوں کہ سب کی رائے تمہارے متعلق اچھی ہے۔ بلکہ تمہارا انگلستان جانا سونے پر سہاگہ ہو گیا۔ اگر بی بی جان تم کو کھودیں گی تو سمجھ لو کہ انھوں نے دنیا کی انمول شے، اُکھودی۔ شاید وہ یہ نہیں جانتیں کہ ہر جگہ جی چرمونا نہیں ہوتی۔

شفیق بولا۔ ہاں تو شاید میں کیا کہہ رہا تھا کہ میرے لئے گھر میں کوئی دلچسپی سوائے امی کے باقی نہیں رہی البتہ شمیمہ کا وہی طرز اور اطوار اب بھی دستور ہے کیونکہ اس کو اس تبدیلی کا علم ہی نہیں۔ مجھے یہ لڑکی درشت و صفت معلوم ہوتی ہے اس کی آنکھوں میں نہ جانے کیوں میرے لئے محبت کھلتی رہتی ہے۔ اس کی ہر حرکت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ میری دایسی پر بی بی خوش ہے۔ اس بیچاری معصوم کو ان جھگڑوں سے کیا سروکار۔ کل میں نے ان حالات کا اس سے ذکر کیا تو وہ بہت پریشان ہوئی اور اس وقت سے ہر لمحہ رنجیدگی اس کے معصوم چہرہ کا طواف کر رہی ہے۔ اس کا بھول سا چہرہ کھلا گیا ہے۔ امی جان نے اب تک اس کے کانوں کا رخ نہ کی تھی۔ آخر میرا اور اس کا معاملہ تمہا میں نے گل ڈرتے ڈرتے اس ذکر کو چھٹی ہی دیا۔ وہ اتنا سنتے ہی اس قدر متاثر ہوئی کہ بس تکلیفیت بگڑی بخار ہی چڑھ آیا۔ اب تم ہی بتاؤ کہ اس صورت میں میں کیا کر سکتا ہوں۔

تم کو اپنے چچا صاحب کی رائے بھی معلوم کر لینی چاہیے تھی۔

شاید نے کہا۔ اور اگر تم مناسب سمجھو تو شمیمہ کے خیالات کو بھی آج کے متعلق دریافت کر لیتا۔

شفیق۔ اے بھئی اچا ابا کو تو بوجھے ست چھٹا
 نے ان کو کٹ پٹلی بنا رکھا ہے۔ وہ تو ہر بار ہی کہتے ہیں
 کہ میں اپنے بھائی کی واحد یادگار کو کسی صورت ہذا نہ
 کروں گا۔ اور اپنا وعدہ پورا کروں گا۔ شاید نے کہہ
 "اماں پھر نصیب وار کس بات کا ہے۔"
 حقیق۔ سنا آج ہی صبح بچا صاحب نے مجھ کو
 بلا کر کہہ دیا کہ "میں نے تمھاری بیٹی سے اس معاملہ
 میں لاکھ ہتھاری طوط داری کرنی چاہی لیکن انوس
 تمھاری بیٹی کسی طرح راضی نہیں ہوئیں۔ میں مجبور ہوا۔"
 اور آپ تو اچھے بات چیت کی بھی رہو چکی ہو
 شامہ۔ خیمہ اگر ناراض ہو بھی تو کیا یہ کام
 ہو سکتا ہے شفیق۔ کیوں نہیں۔ بلکہ اس کو مجبور کیا
 جائے گا۔ اس بھاری کی کون سنک ہے۔ تم خیمہ سے
 پھر ایک بار مل کر اس بات کی ترغیب دلاؤ کہ وہ نکلا
 کر دے۔ اسی میں تم دونوں کی بہتری ہے۔
 شفیق۔ اچھے یقین ہے کہ خیمہ جیسی اعلیٰ نظر
 اور طریقہ رکھنے والی اس بات کو گوارا نہ کرے گی۔ اگر وہ نکلا
 کرے تو ہندوستان کے سماجی قانون کے لحاظ سے اس کے
 لباس معصومیت پر دھتہ سالگ جاتا ہے۔ گفتگو نہیں
 تک پہنچی تھی کہ لازم نے آکر کہا کہ "حضور بڑی بیگم صاحبہ
 آپ کا کھانے پر انتظار کر رہی ہیں اور آپ کو یاد دلاتی
 ہیں۔"
 شفیق شامہ سے فرصت ہو کر اندر آیا تو کیا
 دیکھتا ہے کہ میز پر سوائے اس کی والدہ کے کوئی نہیں۔
 شفیق نے پوچھا۔ "انی سب کہاں ہیں اور خیمہ۔"
 "بیٹا آج صبح سے خیمہ کمرے سے باہر نہیں نکلی اس کی
 طبیعت ناساز ہے۔ بخند کچھ تیز ہو گیا ہے۔ اس نے تمھاری
 چچی جان شامہ دہیں ہوں۔ میں بھی ابھی تمھارے
 کھانے کے انتظام کے لئے آگئی۔" اچھی آپ میرے
 کھانے کی فکر نہ کیجئے میں کچھ دیر طیر کر کھا لوں گا ابھی

مجھے کہنے بھی تو تبدیل کرنے ہیں۔ آپ خیمہ کے پاس
 جائے۔ اگر ڈاکٹر کی ضرورت ہو تو اطلاع دیجئے۔ بیٹا
 وہ تم کو صبح سے یاد بھی کر رہی تھی۔ اگر تم ہی جانا تو
 بہتر ہے۔" اچھا انی جان آپ کا حکم ہو تو میں جانا ہوں۔
 یہ کہہ کر شفیق خیمہ کے کمرے میں آگیا ہے ایک آراستہ
 کمرے میں ایک حسین دو سٹیزہ جس کی عمر ۱۵-۱۶ کے
 لگ بھگ ہے۔ مسہری پر آنکھیں بند کئے لیٹی ہے
 بال پریشان ہیں۔ دو پٹے شاٹوں سے ڈھلک کر
 آگیا ہے۔ سرخ و سفید رنگ۔ شرقی آنکھیں۔
 ابھی ہوئی زلفیں اس کی پیشانی پر اس طرح بکری
 ہوئی ہیں گویا وہ اس کے مصمم چہرے کی ملا میں
 لے رہی ہیں۔ پائنتی کر دین میں بیٹی کی باتیں کر رہی ہے
 "خیمہ کیا ہم اندر آسکتے ہیں؟" شفیق۔ بولا۔
 خیمہ (جیسے کسی سہلے خواب سے بیدار ہوئی ہے
 اپنی شرقی آنکھیں کھول کر)۔ "آئیے شفیق بیبا۔
 مجھے آپ کا بہت انتظار تھا۔" اسے خیمہ تم نے
 دور دراز میں لڑھی یہ کیا حالت بنائی ہے۔ کریں نے
 کہا۔ چھوٹے مہاں۔ دیکھئے ہر ڈیڑھ گھنٹے سے بنانی
 کو دوا پلانے کی کوشش کر کے ٹھک گئے۔ آخر کو چھوٹی
 بیگم صاحبہ تو کسی کام سے اور پر جلی گئیں۔ بھلا میری تو
 کیا سنستے۔ ذرا آپ ان کو کھائیے۔"
 "اچھا کریں تم مٹ جاؤ۔ اب ہم کوشش کرتے ہیں
 دیکھیں خیمہ۔ کیسے نہیں مانتی۔" شفیق نے آرام کرنا
 مسہری کے قریب کر لی۔ خیمہ دیکھو بھی اگر تم نے
 دوا نہ لی تو ہم تمھارے کمرے میں نہ آئیں گے۔ سرد
 کی ضد اچھی نہیں۔ تم دوا پیو گی تو جلد ابھی ہو جاؤ گی۔
 میرے کو ہماری لائی ہوئی دھبب کتا میں بڑھنے کا
 موقع ملے گا۔ بیکھو نام تو پوری مرخصیہ معلوم ہو رہی
 ہو۔"
 خیمہ (گھبرا کر) شفیق بیبا میں دوا پیئے لیتی ہوں

خدا را آپ یہاں آنا نہ چھوڑیے۔ پھر جلدی پانی بھی لو۔ ورنہ ہم چلے۔

شفیق نے شمیمہ کو سہارا دے کر دوا خود پلائی۔ شمیمہ بولی بیتی جب بھی آپ میرے کمرے میں آجاتے ہیں تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ میری کوئی کھوٹی ہوئی چیز مل گئی ہے۔ دو تین روز سے تو عجیب ہی کس کسٹل میں مبتلا تھی۔ لیکن آج آپ کے دشن جوتے ہی ایسا معلوم ہو رہا ہے کہ ساری الجھنیں دور ہو گئیں۔

ہاں شمیمہ ٹھیک ہے لیکن جہاں تم میرا اپنا خیال رکھتی ہو وہاں ایک اور بات مان لو تو کہم سب باتوں کو ٹھیک جائیں یہ شمیمہ نے بے چینی سے کہا۔ صیبت بتائیے تو وہ کیا بات ہے کیا میں نے کبھی آپ کی بات مان لی ہے۔ سوہہ یہ کہ تم اپنی حالت بہت جلد درست کر لو۔ اور ہاں یہ تم نے کالج چانا کیوں چھوڑ دیا یہ شفیق نے سوال کیا۔

کیا کہوں بیچارہ دل کالج میں ہلک نہیں لگتا۔ جیسو۔ و تشاد کہتا بھی مجھ سے یہی کہتی ہیں یہ شمیمہ نے معصومانہ انداز سے کہا۔ کل سے تم کالج جایا کرو تاہم بیماری و رفع ہو جائے گی اور بیماری شلو صحت مند ہو جائے گی۔ شمیمہ نے کچھ سوچ کر کہا تو اسے مجھے صحت مند ہو کر کیا کرنا ہے جیسا؟

شفیق نے جذبات کو ضبط کرتے ہوئے کہا یہ بیچارہ اب دو روز و شب بخاری صحت کے لئے دست پا ہو گا نہ جانے کتنی مٹیں مان رہی ہوں۔

شریفو جیسا آپ ہرگز اس کا نام زبان پر نہ لائیے۔ وہی تو میری بھائی کا سبب بنا ہوا ہے۔ میں مانتی ہوں کہ آپ بھی اس کا نام زبان پر لانا نہیں چاہتے لیکن کالج پھر کیوں اس کا ذکر چھڑا۔

شفیق نے کہا۔ شمیمہ اب تو تم کو اسی کے ساتھ

زندگی۔۔۔۔۔ الفاظ گلے میں ایک کر رہ گئے۔ گلہ گزرا میں۔۔۔۔۔ تم کو زندگی اسی کے ساتھ گزارنا ہے۔ اب تمہیں ہم کو بھلائی کی کوشش کرنی چاہیے۔ شمیمہ نے کہا۔ میں نے جو تہیہ کر لیا ہے وہ پورا ہی کروں گی۔ اور انشا اللہ اپنے منصوبے پر مضبوطی سے قائم رہوں گی۔

اری شمیمہ کیا تم بھی اب مضبوط منصوبے باندھنے لگی ہو۔ کیا تم وہی الخطر لگی ہو جو بار بار کاغذی ناؤ بنا کر پھر خود ہی بھگدڑی تھیں اور ریت کے ٹکڑے بنا کر اپنی ایک ٹھوکر سے پھر اس کو براد کر دیتی ہیں۔ تم میں اتنی قوت کیسے پیدا ہو گئی۔

شفیق۔ ہاں بہتاً منصوبے باندھنا آپ کی کل کی گفتگو نے سکھایا اور آپ کی محنت نے اس میں مضبوطی پیدا کر دی۔ گھر وندوں اور ناؤ کا معاملہ واقعی کھیل تھا لیکن یہ معاملہ میری دائمی زندگی کا کھیل ہے۔

تھیں یہ بھی تو یاد ہو گا کہ پھر آپ میری ناؤ کو جوڑ بھی دیتے اور گھر وندے کو دوبارہ بنا دیا کرتے تھے۔

وہ زمانہ اور تھا شمیمہ دیا کو ایک پہلو قرار نہیں۔ شمیمہ نے معصومانہ انداز سے کہا۔ معلوم تو ایسا ہوتا ہے کہ قدرت ہم سے کھیل رہی ہے۔

شفیق۔ بیماری زندگی قدرت کے ہاتھ کا کھلونا ہے۔ یہی باتیں ہو رہی تھیں کہ ناؤ۔ انور شمیمہ کی ماموں زاد بہنیں آگئیں۔ ان کی سنی باتوں سے شمیمہ اور شفیق بڑی دیر تک ہنستے رہے۔ انور کی تو چھوٹی بھائی کھنڈان

بھوکھی تھی۔ (اتنے میں شمیمہ کی والدہ انور کو ڈھونڈتی ہوئی آئی تھیں۔ اسے انور پھل میں تجھے ڈھونڈتے ہوئے

کب سے مارے اسے پھر رہی ہوں۔ چھوٹی بھائی کی طبیعت عجیب نہیں انہیں آرام کرنے دے۔ شمیمہ نے کہا۔ اچی اسے رہنے دیجئے اس کی باتیں ایسی پیاری ہیں کہ میرا دل بہل جاتا ہے یہ۔ بیٹی تھیں حرارت تھی نا

یہ کہ اب تم کو اس چیز کا مادی بھی بننا ہے۔ اسی خیال سے ادھر نہیں آنا ورنہ کوئی بات نہ تھی۔ اتنا سنتے ہی شہیدہ کی آنکھوں سے آنسو نکل پڑے۔

شفیق۔ اری تم کو تم یہ کیا کہہ رہی ہو۔ دیکھو تمہارے سرخ گال دور در میں تمہارے کپڑوں کی طرح زرد پڑ گئے ہیں۔ اور تمہاری اداس صورت کسی غیر معمولی واقعہ کا پتہ دے رہی ہے کم از کم دنیا والوں کو دکھانے کے لئے اپنی حالت سنبھالو ورنہ بڑا نام بھوجاؤ گی۔ شہیدہ یہ سب کچھ جو دنیا کے لئے برداشت کر رہی ہوں کیا یہ کچھ کم ہے جو آپ اس میں اضافہ چاہتے ہیں۔

شفیق۔ اچھی شہادت تم کو رنج ضرور ہو گا لیکن سنئے گھر میں اپنے قبضوں ساتھی اور اپنے ناز برداروں میں رہ کر کبھی نہ کبھی تمہارا غم غلط ہو جائے گا لیکن کیا میری حالت تم سے زیادہ قابلِ رحم نہیں ہے کہ ابا کو سدھار کر ابھی ایک برس بھی نہ گزرا تھا کہ دوڑا جانچا مادہ پیش آیا۔ لیکن دیکھو قہر درویش ربان درویش سب سہارا ہا ہوں۔ جانتی ہو کس کی خاطر۔ تم کو چاہیئے کہ صبر کرنے میں میرا ساتھ دو۔ تم کو ایک بیون سا بھائی مل رہا ہے۔ میرا بیون ساتھی بھی تم نے مہیا کر دیا۔ یہی احسان کیا کم ہے۔ عین اسی وقت ریڈیو پر یہ ریکارڈ بچ رہا تھا۔

تو نے دیا ہے غم مجھ سے لے غم سے چار ہے۔
سنٹی ہو شہو۔ ”غم“ میرا بیون ساتھی ہے جس طرح میں اپنے اس ساتھی کے سامنے سر نہ تپاؤں کہ روں گا اسی طرح تم کو اپنے بیون ساتھی کے بدلے آئے۔

اس دوران میں شہیدہ روتے ہی گئی اور شفیق کی آنکھیں بھی پرٹم ہو گئیں۔ شہو کہ تم کو میری قسم آئندہ بہانا۔۔۔ کیا تم اپنے غم کو کسی ایک اور آخری بات نہ مانو گی۔ وہ یہ کہ آج جو کچھ بھی ضرور

آرام کرو۔ (ماتھے پر ہاتھ رکھ کر) خدا یا تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ تجارا ترکا اب تو غمی کے دن نزدیک ہی ظلم ہوتے ہیں۔ جیسے شہو تم کھڑے کیوں ہو بیٹھ جاؤ۔ میں جاتی ہوں۔ شہیدہ کی ماں آگیا میں ان دونوں کی خوشامیوں کو اپنے ایک فقرے کے ساتھ بھاگ گئیں۔ دین بچ رہے تھے۔ شفیق بہت کچھ تسلی دیکر شہیدہ سے رخصت ہوا۔

جون ہی شہیدہ کو صحت ہوئی اس کی شادی کی تیاریاں ہونے لگیں۔ آخر وہ دن بھی آگیا جب کہ شہیدہ کو ماتھے بٹھایا جانے والا تھا۔ شفیق کی ماں نے لاکھ وعدے یاد دلائے لیکن سب بے سود ثابت ہوئے۔ آج پھر ”عشرت منزل“ میں پہل پہل ہے اور کوئی کو سجا کر دہن بنا دیا گیا ہے۔ شفیق سب کچھ دیکھ رہا ہے لیکن زبان نہیں ہلا سکتا۔

شہیدہ زرد لباس میں ملبوس اپنے کمرے میں تنہا بیٹھی ہوئی تھی۔ ماں کو بڑی آرزو تھی کہ شہیدہ اکلوتی لڑکی تھی۔ مال و دولت کی کمی نہ تھی۔ گیارہ دن کے لئے مانگے بٹھایا گیا کہ دل کے ارمان غلبیں۔ شفیق اور شہیدہ کی تمنائیں آخری ہچکیاں تھیں معلوم ہو رہی تھیں۔

ریڈیو دھیمپل رہا ہے لیکن شہیدہ کسی خیال میں گم نہ بنی بیٹھی ہے۔ اسے میں پیچھے سے کسی کے چاپ کی آواز آتی ہے اور ساتھی شفیق کی رنج و اندوہ میں ڈوبی ہوئی آواز ”تم کو کیا ہم اندر آ سکتے ہیں“ شہیدہ (جو تک کر) اسے شہو۔۔۔۔۔

انفاد گھر میں آگئے (پھر کچھ سنبھل کر) آئیے آنکھیں آپ کا انتظار دیکھتے دیکھتے پھرا گئیں۔ پانچ چھ دن سے آپ کی صورت کو ترس گئی۔

شفیق میں ضرور آتا۔ پہلے تو یہ کہ تم کو ہانوں سے کب چھٹکارا ملتا ہے۔ دوسری چیز

آج جلوه کی رسم ادا ہونے والی ہے۔ لیکن حقیقت میں شفیق اور شمیمہ کے ارا مانوں کا جنازہ غلے والا ہے۔ شمو کی والدہ خوش ہیں کہ آخر اپنی مرضی کی شادی کر کے ہیں۔ حالانکہ وہ یہ بھی نہ جانتی تھیں کہ جو ان کا داماد بن رہا ہے اس کے پوشیدہ حالات کیا ہیں۔ عزیز احمد بھی اس شادی سے بالکل بے لاگ ہیں۔ اور کمرے میں تنہا لیٹے ہیں۔

شب گشت کو دو لہا بڑی دھوم دھام سے "عشرت نزل" میں داخل ہوا۔ برات کا پرچوش استقبال کیا گیا۔ صرت قاضی صاحب کچھ انتظار کے بعد آتے ہیں۔

اتنے میں باہر کچھ شور و شغب سنائی دیتا ہے۔ ہر ایک عزیز احمد کو بلانے دوڑ رہا ہے۔ جب ان کو معاملہ کی اطلاع ملی تو وہ باہر نکلے۔ پورے واقعات معلوم کرنے سے قبل ہی کایک ایک اپنی اپنی شخص ان کے پیروں پر گر پڑا۔ عزیز احمد نے بھر اس کو اٹھا یا اور ماجرا دریافت کیا۔ معلوم ہوا کہ باجیاں جو اس وقت نوشہ بے ہوئے ہیں اس اجنبی شخص کی بہن زرنہ کو بیاہ چکے ہیں اور وہ شادی بھی اسی دھوکے میں کی کہ ان کے ہاں مال و دولت بہت ہے۔ لیکن بعد میں ہمیں معلوم ہوا کہ ان کی سب جاگیر ان کے بڑے بھائی کے قبضے میں ہے۔ اور میاں ماجد کو سوائے نو بھائی کے کچھ نہیں ملا۔ اس شخص نے کہا اس وقت میری بہن سخت بیمار ہے علی اس کے لڑکی پیدا ہوئی۔ جس کا انتقال ہو گیا۔ اب زرنہ کا آخری وقت ہے اگر ماجد آجائیں تو دیدار طیب ہو سکا گا۔ اتنا سننے پر عزیز احمد کے ہاتھوں کے طوٹے اڑ گئے۔ دوڑے ہوئے بیوی کے پاس آئے سارا حال سن کر بیوی نے سر پیٹ لیا کہ ہائے میں لٹ گئی۔ اب رات کا لوٹا ناجی جگ ہنسائی کا باعث تھا۔ لیکن دانشمند

وقت ملا ہے اس کو اچھی طرح گزار دو۔ اور مجھ سے وعدہ کرو کہ تم مجھ کو بھلانے کی کوشش کرو گی۔

لیکن میں اس میں شائد ناکام رہوں گی۔ عظیمہ نے کہا۔ تم کو اپنی زندگی کا سیاب بنانے کے لئے اس کے ہر پہلو کو کا سیاب بنانا پڑے گا۔ اور تم ہریش خوش رہنے کی کوشش کرنا، عظیمہ۔ حکم کو بہت سخت ہے لیکن چونکہ آپ نے بھی جان کی بازی لگادی ہے اس طرح اگر مجھ کو بھی اسی قیمت پر وہ شے حاصل ہوتی ہو تو مجھے کوئی دلیل نہیں۔

شفیق (پریشان ہو کر) نہیں ہنس شمو میرا مطلب یہ تھا کہ تم جاننا چاہو دو بلکہ تمہاری زندگی اور تمہاری خوشی میری خوشی اور تمہارا دکھ میرا دکھ ہو گا۔

شمیمہ شفو جیسا آج آخری موقع ہے۔ شمو سے آپ کو کوئی شکایت باقی نہ رہ جائے مہینے اور کیا حکم ہے۔

شفیق شمو بس یہی کافی ہے۔ جو کچھ میں نے کہا ہے اسی کو نبھانے کی کوشش کرو۔ دیکھو دونوں بھی شائد اگلی ہیں۔ بچی جان آ رہی ہیں۔ پھر مجھے اچانک کو بھی نو لکھین دینی ہے ان کی حالت بڑی خراب ہے۔ عظیمہ۔ ہاں بڑی امان کو میرے ہاں بھجوائیے تاکہ تنہائی میں ان سے بھال لیں۔ لیکن جب تک تم آئو نہ پونچھ لو میں ہرگز نہ جاؤں گا۔ شمیمہ نے آئیل سے آنسو خشکی کے تھے کہ بھر بہہ نکلے۔ جب اٹھو رکوانے کی ناکام کوشش نہ کیجئے۔ آج ہی کا تو دن ہے بہہ لینے دیجئے۔ وہ میرے اختیار میں بھی تو نہیں حقیقت۔ اری دیوانی ناکام کوشش کی کامیابی رہی تو حقیقی خوشی حاصل ہوا کرتی ہے۔ اچھا خدا حافظ وہ دیکھو اب بھی آ رہی ہیں۔ شفیق تھوڑی دیر بعد شمیمہ سے رخصت ہو گیا۔

آرسی مصحف کے بعد دہن رخصت کر دی گئی۔
 دہن کو یہ بھی خبر نہ تھی کہ وہ جس گھر میں آئی ہے کس قسم
 کا ہے۔ وہاں کے لوگ کیسے ہیں۔ وہ کسے میں تھا
 ادا اس بیٹھی ہے کہ اتنے میں اس کے کان میں
 کسی کی دلربا آواز گونجی ہے۔ شو کو کیا ہم اندر گئے
 ہیں۔ آواز جانی بھائی تھی لیکن شیمہ کو اپنے کان پر
 اعتبار نہ آتا تھا۔ حیرت و استعجاب سے نگاہیں خود
 بخود اوپر اٹھ گئیں تو منتظنین کو اپنے جواب کا منظر
 پایا۔

زربیدہ (خجندا)

مٹی فرما شوہر کو ایک طرف لیجا کر کہہ دیا سمجھا یا کہ وہ الٹے
 پاؤں داپس چلے گئے۔ اوپر آج میاں میں تپشانی
 کے عالم میں ساری باتیں جھٹلانے کی کوشش کر رہا
 ہیں۔
 شیمہ کا حال ابتر ہے اب تک دو مین بار تو
 بے ہوش ہو چکی ہے۔ تمام سہیلیاں اور ہم عمر بہنیں بیٹھی
 تلی دے رہی ہیں۔ شام کو دو لہا میاں آرسی مصحف
 کے پلے لائے گئے، ہر ایک دوسرے کو دیکھنے کا شوق
 تھا۔ لیکن سہرا ان کے چہرے پر ایسے چھایا ہوا تھا کہ
 صورت دیکھنا دشوار تھا۔ سہیلیوں اور بہنوں نے
 ہر قسم کا ذراں کیا لیکن وہ لہا کی طرف سے جواب نہ دیا۔
 کسی نے کہا کہ اسے تو پھر اس دو لہے نے تو گویا گونج
 کا گڑھا لیا ہے۔ غرض مٹی منہ اپنی باتیں۔

حقیقی ترقی پسند ادب کے ترجمان ماہنامہ چمنستان

کالم

۱۹۴۶ء کو شائع ہونے والے چمنستان نے محبوبانِ ادبی افلاق
 اور فن کاروں کی توجہ حاصل کی۔

- پاکیزہ ادب
- زندگی کے آئینہ دار
- صحت مند تنقید
- کائنات کا ترجمان
- یہ سب اس ادب کے حسین نمونے ہیں
- قریب میں چمنستان کے ایڈیٹر شمس الدین احمد صاحب نے
- مطالعہ کیا ہے اور ان کی تائید کی ہے۔

۱۹۴۶ء کو شائع ہونے والے چمنستان نے
 اپنے نمونے کے ذریعہ ایک نیا عالم
 فیہر چمنستان، قصہ شاعر، (پنسل روڈ ولی)

”نور و سُر“

شاعر جذبات اختر رضوانی کا نازہ محبوبہ کلام۔

یہ محبوبہ کیفیت وجدان کا مرقع ہونے کے علاوہ

موجودہ ہندوستان کے عوام جذبات کا

آئینہ دار ہے۔

مقدمہ شیخ سر عبد القادر نے رقم فرمایا ہے

لئے کاپی: ناظم مکتبہ ادب سی ۱۸، انارکلی لاہور

دیسوی مرغی مجلس قانون ساز

غلطی کی سب سے بڑی منڈی کے میدان میں افسر خوراک کی اجازت بغیر ایک ہی رات میں سندھ کے احرار نے ایک وسیع پنڈال، آل انڈیا دیسی مرغی مجلس قانون ساز، کے اجلاس کے لئے تیار کر دیا تھا، تمام مسلم لیگی رضا کار تہجد کے وقت سے اس پنڈال کی حفاظت کے لئے کمر بستہ موجود تھے، پنڈال کا صدر دروازہ دیسی مرغیوں کے انڈوں سے نیا گیا تھا اور صدر مجلس کے لئے تخت سیرخ، بچھا گیا تھا،

مجلس کی صدر محترمہ سیدہ صاحبہ ملازمہ نمبری نمبر ۲ تھیں جو بین الاقوامی مرغی مرغی کی یورپی مجلس میں ہندوستانی مرغیوں کی نمائندگی کے فرائض انجام دے چکی ہیں، مجلس کے سرکاری ممبروں کے مقابل آج کی تحریک کے تحریک شہرور مشہور حضرت ملازمہ نمبری صاحبہ صدر صاحبہ کی میز کے برابر برابر ہندوستان کے ہر سو بے کے دیسی مرغیوں کے سیکڑوں ٹاپے رکھے ہوئے تھے اور ہر ٹاپے کے اوپر ایک نمونہ کا انڈا تھا، صبح کو جیسے ہی کہ تمام آل انڈیا دیسی مرغیوں نے انڈوں کا آغاز کیا، سب سے پہلے اپنی یورپی صندوق کے مطابق انڈوں کی نمائندگی اور مجلس قانون ساز کے اطلاوی ممبر پنڈال میں داخل ہوئے۔

صدر صاحبہ ان کے کوئی گیارہ بجے کھانے والے سے فارغ ہو کر تشریف لائیں اور اطلاوی اراکین مجلس سے اپنی ملکی کاہلی کی معافی چاہی، اس کے بعد ہندوستانی اراکین مجلس کا سلسلہ شروع ہوا جو عصر کی نماز کے وقت تک جاری رہا، اس پر اطلاوی نمائندوں نے ہندوستانیوں کی روایتی کاہلی اور غیر قانونی زندگی پر احتجاج کے طور پر اطلاوی مرغیوں کے تمام ٹاپے

پنڈال سے باہر نکلا دیئے، صرت چند ہی آپاس مرغیوں کے ٹاپے رکھے گئے، اس کے بعد صدر صاحبہ نے غلطی برقعہ کے اندر سے مجلس کا ایکٹا پڑھ کر حضرت ملازمہ نمبری کو اپنی تحریک پیش کرنے کی اجازت دی۔

حضرت ملازمہ نمبری آج ایک بڑے دیسی مرغی کے صرح یوں کی ٹوٹی پیسے ہوئے تھے جس کا مطلب یہ تھا کہ وہ اپنی عادت کے مطابق سخت بحث فرامیں تھے ملازمہ نمبری صاحبہ کے کھڑے ہوتے ہی تمام اطلاوی مرغیوں نے خطرہ کی وہ آوازیں بلند کیں جو جتنی اور بے کو چکر مرغیوں کی کرتے ہیں، اس کے بعد ملازمہ نمبری صاحبہ ذیل کی تحریک پڑھ کر سنائی۔

ہر گاہ اس مجلس کے عوامی اراکین کے علم و شہ میں یہ بات آئی ہے کہ ہندوستانی لیکس اور ہندوستانی زبان و ادب کی طرح اب ہندوستانی مرغیوں کی قدیم نسل بھی اس طرح ضائع کی جا رہی ہے کہ جنگ کے زمانے کی لیک مارکیٹ قسم کی آدمی سے چند ہندوستانی جو قدر سے قلیل، نو دو لیتے ہو گئے ہیں اب ہمارے چند روزہ ثروت کے دیسی مرغیوں کے گوشت اور انڈوں سے نفرت کرنے لگے ہیں اور اطلاوی مرغیوں کی نسل بڑھانے میں مصروف ہیں چونکہ اس طرح نمک کی ایک قابل اور نسل ہی ضائع نہیں ہوتی بلکہ اس طرح ہر غیر ملکی چیز سے موانعت اور ملکی چیز سے نفرت عام ہونے کا امکان پیدا ہوتا ہے، لہذا یہ مجلس حکومت سے سفارش کرتی ہے کہ ائندہ ہندوستان سے جو ہندوستانی سفیر ملکی میں مقرر کیا جائے انکو

اس موقع پر صدر صاحب نے ملازمی صاحب سے ان کے اس فقرہ کی شرح چاہی کہ "اطالوی مرغیوں کے انڈوں کی نالائقی ثابت ہے۔"

اس پر ملازمی صاحب نے فرمایا کہ :-

محترمہ اطالوی مرغیوں کے انڈوں کی نالائقی سے میری مراد یہ ہے کہ علم طب میں یہ بحث و تحقیق ہو چکی ہے کہ مرغ کا گوشت اور مرغی کے انڈے مقوی ہیں لہذا جس انسان کو مرغ مرغیوں کے گوشت اور انڈوں کی طاقت حاصل ہو وہ پھر طلوع آفتاب سے پہلے اگر بیدار ہو کر کھائے تو میں معروفت نہ ہوا اور دن کے گیارہ بجے تک سوتا رہے تو اس کا مطلب صاف ہے کہ پھر گویا اطالوی مرغیوں کے گوشت اور ان کی مرغیوں کے انڈوں میں طاقت کے عوض منفع ہے جس کی بے بسی کے وجہ سے لوگ دس دس بجے تک بستر سے حرکت کے قابل نہیں ہوتے۔ اس لئے جب اطالوی مرغ مرغیوں کے گوشت اور انڈے نوش فرما کر بھی ہندوستانی طلوع آفتاب سے پہلے بیدار نہ ہوں اور دوسری غیر ہندوستانی قوموں کے برابر نوٹ کر کام نہ کریں تو ایسے کامل ہندوستانیوں کے لئے یورپی مرغ مرغیوں پر دولت صرف کرنا بیکار۔

عین اسی طرح علم طب سے ثابت ہے کہ عمدہ قسم کے مرغ کے گوشت کی دہانوں میں سونے تولاد اور جوار کے جوتسہ اعلیٰ کے عصارہ مشال ہوتے ہیں ان سے انسان کے دماغی قوی کو کمال ملتی ہے لہذا ایک ضابطہ یہ بھی تیار پایا ہے کہ جو ہندوستانی اطالوی مرغیوں کے انڈے کھائے اور قسم اول کے اطالوی مرغیوں کے انڈے کھائے اس میں دوسرے ہندوستانیوں کے مقابل زیادہ ذہانت ہو لیکن ہندوستان میں لاکھوں اطالوی مرغ مرغیوں کے گوشت اور انڈے کھا لینے کے بعد بھی آج جو ہندوستانی مسلمانوں میں ہورہے ہیں ان سے ثابت ہے کہ ہندوستانیوں کے دماغوں میں اعلیٰ درجہ کے اطالوی مرغی کھا کر عمدہ

ہدایت کی جائے کہ وہ اطالوی حکومت کے اس معاہدہ کو منسوخ کرانے کی کوشش کرے جو برطانوی حکومت کے عہد میں حکومت ہند کے نام سے ہوا تھا۔

اس تحریک کی تائید میں حضرت ملازمی نے ایک بچہ موٹے مرغے کو بغل میں دبا کر ہندوستان میں مرغی کھانے پھر مرغی لڑانے پھر انڈے کھانے اور پھر اطالوی مرغ مرغیوں کی آمد اور ان کے انڈوں کی ترشی کے تمام تاریخی اسباب اس کمال جامعیت سے پیش فرمائے کہ عصر سے عشار کا وقت ہو گیا مگر ایک مسلمان ممبر نے بھی احتجاج کی ہمت نہ کی کہ دیکھنا زین تضا ہو چکی ہے۔ اس کے بعد ملازمی نے اپنی بغل میں دے دیے ہوئے مرغے کا ٹیٹو دبا کر اس کی آواز کی گرج سنوائی اور کہا کہ ہم ہندوستانی چونکہ جو کھٹ سے جو کھٹ جوڑ کر گھسان کے مکان بنا کر رہنے کے عادی ہیں اس لئے صبح کو ایک پورے محل کی آوازیں کے لئے تنہا ایک سی مرغ کی آواز کافی ہوتی ہے لہذا کوئی وجہ نہیں کہ ہم اس سے بڑی آواز کے مرغیوں پر اپنی محدود دولت کو صرف کریں، اس جگہ اطالوی کا بندہ نے ثبوت کے طور پر اپنے مرغے کا ٹیٹو دبا کر کہا کہ ہمارے مرغیوں کی آواز میں تمام بستی کے لئے کافی ہوتی ہیں۔ لہذا صبح تیزی کے لئے اطالوی مرغیوں کی ہندوستان میں ضرورت ثابت ہے لیکن ملازمی صاحب نے برجستہ فرمایا کہ ہندوستان میں دولت مند طبقہ تین بجے شب تک مجا وڑنا مش کھیتا ہے یا یورپی کھیل کھانوں میں مصروف رہتا ہے اس لئے وہ تین بجے جب کھینچو تو اسے لہذا مرغیوں کی آواز تو کم فٹ وہ قویوں کی گرج سے بھی دس بجے دن سے پہلے بیدار نہیں ہوتا تو اطالوی مرغیوں کی آواز بیکار اور اطالوی مرغیوں کے انڈوں کی نالائقی ثابت۔

غزل

دشت پیائے محبت ہوں نہ چھیلو مجھکو

ہمہ تن مائل وشت ہوں نہ چھیلو مجھکو

نہ شفا سے مجھے مطلب نہ میا سے عرض

میں مریض غم فرقت ہوں نہ چھیلو مجھکو
نہ تو تکلیف کا احساں نہ راحت سے عرض

ہمہ تن در محبت ہوں نہ چھیلو مجھکو

عیش و آرام کہاں صحبت احباب کہاں

میں گرفتار محبت ہوں نہ چھیلو مجھکو

دوست احباب بھی ہوتے ہیں غرض غریزہ

میں تو لبریز شکایت ہوں نہ چھیلو مجھکو

غریز یا رنگ

قسم کھا لاوی انڈے اڑا کر بھی کوئی لاکٹ امتیاز نہ پتا
پیدا نہیں ہوئی بلکہ اطالیہ کے جھنڈے کے مرے اور انڈوں
کے استغالی سے ہندوستانوں میں بربریت اور ہمت
کے ہیجان اور جذبات میں اضافہ ہو گیا جنھوں نے ہندو
مسلمانوں کے فداوت کی صورت اختیار کر لی۔ لہذا اس
دلیل سے اب میری تحریک اقتصاد و مد سے بڑھ کر سیاسی
اعتقاد ہے بھی اس قابل ہو گی کہ گورنمنٹ آف انڈیا کو
دیسی مرغام غیوں کو ترقی دینے کی خاطر غیر ملکی مرغام غیوں
اور غیر ہندوستانی انڈوں یا غیر ہندوستانی انڈوں
سے بھی ہوئی دوسری ہر نوع کی غذائی و تاد کو روک
دے، لاہ موزی صاحب نے جیسے ہی کہ دیسی مرغام غیوں
کے حق میں یہ زبردست دلیل بیان فرمائی تمام دیسی
مرغام غیوں کے مالوں میں ایک عظیم حرکت پیدا
ہو گئی اور تمام دیسی مرے اڈا میں دینے لگے۔
اس موقع پر صدر صاحب نے شب کا کھانا کھا
اور نمازیں قضا ہونے اور ان کے ادا کرنے کے وقفہ کا
اعلان فرمایا۔
اس موقع پر اٹالوی نمائندے سائیر رائڈ
جنھوں نے جوش کی منہج کے بعد تمام چٹھی انڈوں کے
اطالیہ پہنچانے کے تجربہ کا شکریہ ادا کیا اور شش کی اجلاس
جاری رہے اور انھوں نے ہندوستان کے مسلمانوں
کے بعض ایسے مشاعروں اور ایسی اسلامی انجمنوں کے
اجلاسوں کی اطلاعات پیش کیں جن کے دوران میں
نمازوں کے اوقات گزر گئے مگر نہ صدر مشاعرہ نے نماز
کے لئے اجلاس بغاوت کیا نہ شرکار نے اس کی بڑا
کی لیکن لاہ موزی صاحب کی مداخلت سے صدر محترمہ
نے اٹالوی نمائندے کی کوشش کے خلاف اجلاس کو
برنست کیا جانا ضروری قرار دیا۔

لاہ موزی

پس جو نقاشی سیکھتا ہے، اسے چاہیے کہ تصویروں کو ترتیب دینا بھی سیکھے۔ اساتذہ سلف کے زمانے سے لے کر آج تک، جن قابل اور خوش ادانقاشوں نے اپنے تخلیقات سے پروہ تصویر (کرمی) یا صفحہ قرآن کو مزین کیا ہے، ان کے کارناموں میں بس یہی ایک چیز ترتیب دیکھنے میں نہیں آتی۔ حالانکہ ان تصویروں میں جزئیات کو تفصیل کے ساتھ ہوید کر نے کی قابلیت، تصویر کے ہر حصے اور ہر جزو سے عیاں ہے۔ جزئیات نگارسی ہی کی وجہ سے کہ مصور کے ابتدائی خیال میں ان تفصیلی اجزاء کا جو حقیقی زور تھا، وہ تصویر کے ان حصوں کی اجتماعی ہیئت میں ضم ہو کر کمزور پڑ گیا۔

علم ترتیب دراصل علم الاجتماع ہے، اور یہ قول ہے نہال اس گلستاں میں جتنے بڑے ہیں ہمیشہ وہ نیچے سے اوپر چڑھے ہیں دنیا کا آرٹ ترقی کرتا گیا ہے۔ یعنی مصورین، لفظ شیر خوار کی طرح پہلے پہل، اشیاء کی شکل سے واقف ہوئے۔ زوال بعد تصویر سی مواد (Material) سے، اور آخر میں رنگ اور روپ دونوں کی ترکیب یا ہیئت اجتماعی سے (Form) نشاۃ جدیدہ کے حسن کاروں کے ایسے کارنامے جو دنیا کی ساری تصویروں میں اپنی نظیر نہیں رکھتے، ان میں بھی مذکورہ بات کی تدریجی کیفیت کو بتلایا جاسکتا ہے۔ لیکن اتنا ضرور ہے کہ تدریجی ارتقاء کو مد نظر رکھتے ہوئے، ان سے نظیر شاہکاروں کو جب نشائی آرٹ کے کثیر حصے کے ساتھ مقابلہ کیا جاتا ہے، تو اچھے کے ساتھ بڑے کام میں جو نسبت دکھائی دیتی ہے، اسی نسبت کو دور حاضر کا آرٹ نسبت معکوس میں پیش کرتا ہے۔

ترتیب اور رنگ کی اہمیت ترتیب یعنی تصویر کی اجتماعی ہیئت کے متعلق ہم کسی بحث کو روشنی ڈالنے والی ایک ایسی ظاہری مثال کو پیش کر دینا کافی سمجھتے ہیں، جو آرٹ کے متلاشی خواہ وہ عامی ہو، یا پیشہ ور حسن کار، دونوں کے لئے یکساں طور پر دعویٰ ہے۔ وہ یہ کہ تماشائی جب یورپ کی قریبی قدیم آرٹ گیلری سے گذرتے ہوئے، جدید آرٹ گیلری میں قدم رکھتا ہے تو اس کی دماغی انقباضی کیفیت میں ایک دم سکون پیدا ہو جاتا ہے۔ یہ اچانک تبدیلی اس امر کا ثبوت ہے کہ جدید آرٹ گیلری میں متوازن خطوط، متوازن کمیتوں، اور متوازن رنگ کے ساتھ عام طور پر ایسی سادگی بھی پائی جاتی ہے، جو تصویر میں ہم آہنگی کے لئے نہایت ضروری ہوتی ہے۔ پس ظاہر ہے کہ رنگ، روپ اور ترتیب ارکان ہی اہم آہنگی پیدا کرنے والے عناصر ہوتے ہیں۔ لیکن قدیم آرٹ میں ترتیب کی خامی ہی اس کی کمزوری کا سبب بن جاتی ہے۔ یاد رہے کہ ترتیب کی خامیوں کو الفاظ میں بیان کرنا آسان نہیں، اس لئے قدیم آرٹ کے اس جزو کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے، اور جہاں تک رنگ کا تعلق ہے، یہ بتلادینا ضروری ہے کہ امتداد زمانہ کے اثرات نے ان شہرہ آفاق شاہکاروں میں جو گہست لونی ہم آہنگی پیدا کر دی ہے، اس کو بھی ہم بادل ناخو اسے ہی شاید کسی اور چیز سے بدلنے پر راضی ہوں۔

متقدمین میں گروپ بندی اور متاخرین میں دوپیکری ترتیب اچھی ہوتی ہے

ہر جن کاربھی طرح واقف ہے کہ ایک، تین اور
کثیر پیکروں کی ترتیب سے دوپیکری ترتیب بے حد مشکل
ہوتی ہے۔ اس اصول کو سامنے رکھتے ہوئے صرف
دوپیکری تصویروں کو لے کر ان کی ترتیب پر غور کرنے
سے معلوم ہوگا کہ ترتیب کی اس صنف میں متقدمین
سے متاخرین بہت پیش پیش نظر آتے ہیں اس مثال

سے یہ سمجھ لینا کہ متاخرین کو متقدمین پر ہر صورت تفصیلت حاصل ہے۔ اسی لئے دوپیکری تصویروں
کے ساتھ ترتیب کی دوسری اصناف کا علم رکھنا بھی ضروری ہے، تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ منطقی
ارکان کی گروپ بندی اور منظر کے اندر حیوانی یا انسانی پیکروں کو نہایت خوش اسلوبی سے منظر
کرنے کا لطیف ترین احساس، آرٹ کی دنیا میں سلف کے باکمال اساتذہ فن ہی کی بدولت داخل
ہوا ہے۔ ہر حال یہ امر واقعہ ہے کہ کثیر پیکروں والی تصویروں کی ماہرانہ ترتیب کی بعض مثالوں میں
میکال انجیلو، روبینس، کورجیو، اور ونیس کے دوسرے قائدین فن پر آج تک کوئی سبق نہ لے
جاسکا۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ جہاں ہم ان اساتذہ کی نمایاں کامیابیوں کی ستائش کرتے ہیں وہاں
ہم ان کی فرد گذاشتوں، یا ان کے معاصرین کاروں کی ترتیبوں میں سہو نظری کو ذرا موش و گداز چاہیے۔
ایسے تارین جن کی تعلیم اساتذہ سلف کے بحالوں کی اساس پر یا ان کے
متقدمین ہمدردانہ ہوا اساتذہ مسلک کے مطابق ہوئی ہو، اور ایسی تعلیم کو انھوں نے بلا جواز دہرا

سلیم بھی کر لیا ہو ان سے ہماری اسناد ہمارے کہ وہ اپنے دل کو قدیم روایاتی تعصب سے بالکل پاک
کردیں، اور ہر تصویر کو معصوم کے نام یا تاریخی حوالے کی مدد سے جاننے کی بجائے خوش ترشی کے
اصولوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے ان کا رناموں کے حسن و قبح کو دیکھیں تو بہتر ہوگا۔ ایسی نقدی کے لئے
غیر جانب دارانہ نقطہ نظر کی سخت ضرورت ہے، اور ایسا نقطہ نظر ہمدردی سے خالی نہ ہو، اور ایسا ہونا بھی
نہ چاہیے۔ ورنہ صد ہا سال کے جمع شدہ ذخیرہ نقادیر کو جو عشق عقیدت سے دیکھتے رہنے کے سبب
ناظر کے خیالات میں قدامت پرستی کا جو میلان پیدا ہو جاتا ہے، وہ میلان زیر غور نقادیر کی تمام
خوبیوں پر پانی پھیر دیتا ہے، اور تصویر پر متحد ستائش سے محروم ہو جاتی ہے۔

جدید تصویر میں قدیم نمونے غیب پیدا کر دیتے ہیں

فن ترتیب پر اب تک جتنی اہم تعانیات دستیاب ہوئی ہیں
ان سب میں برنٹ کی کتاب "نور و ظلمت قدیم تر ہے۔"
اس زمانے کی تصنیف ہے، جب قدیم اساتذہ کے
اثرات کا زور تھا، اور دعوایہ استدلال پیش کیا جاتا
تھا کہ اساتذہ قدیم کی تصویریں اپنی ترمیمی خوبیوں کے اعتبار سے ہرگز مورد الزام نہیں قرار
پاسکتیں، اور چونکہ بائی جینی، رافائل، پال پاٹر، اور ونس، گوٹ، ڈاچی، چیتو، ڈیورر،
فینیا وغیرہ سب قدیم اساتذہ ہیں، اس لئے ہم ان کے شاہکاروں کو نفیس ترتیب کے بغیر

نوع تسلیم کرتے ہیں، جن کی پیروی ہر زمانے میں کی جانی چاہیے۔ اس خوش اعتقاد کی تحت، اساتذہ قدیم سے مختلف نقطہ نظر رکھنے والے حسن کار، جب ان اساتذہ کے نمونوں کو آزادی سے اپنی تصویروں میں استعمال کر جاتے ہیں، تو ان کا بہترین کام بھی کمزور پڑ جاتا ہے۔ دو برعکس کے مصوریں کی بھی یہی کیفیت ہے، جو اساتذہ قدیم سے بالکل مختلف انداز میں کام کرتے ہیں، لیکن اپنی سادہ لوحی سے قدیم اساتذہ کے نمونوں پر اقتدار کرتے ہوئے انھیں اپنے کارناموں میں استعمال کر کے عملی حیثیت سے ایسی بے میل اور ناقابل برداشت چیز کو تصویر میں داخل کر دیتے ہیں جن کو نقادانِ فن بلکہ تصویر کے ناشرین تک پسند نہیں کرتے۔

گزشتہ تین سو سال کے دوران میں، فن مصوری کے احاطہ عمل کی حدود میں جو خفیف سی ترقی رونما ہوئی ہے، وہ حقیقت میں قدیم اساتذہ کے آرٹ ہی کی بدولت ہے۔ اگر اس طویل عرصہ کی لگاتار جدوجہد کے بعد بھی آرٹ کی دنیا میں کسی قسم کی ترقی نہ ہو، تو واقعی بڑی حیرت کی بات ہوگی۔ **وہ جو تصویر نہیں** اقصائی اور رنگ جس طرح تصویر کی مدافعتی چٹائیں خیال کی جاتی ہیں، اسی طرح کوئی وقعت حاصل نہیں ہوتی۔ دیوار سازی میں کچھ ہی ان پتھروں میں وحدت و چسپیدگی پیدا کرنے والا عنصر ہوتا ہے، جس کی عدم موجودگی سے سارے پتھر پر انگہ اور غیر منظم کائناتیں بن جاتے ہیں۔ پس ظاہر ہے کہ ترتیب ہی تصویر کے تمام ارکان کو آپس میں مربوط کر کے ان میں وحدت پیدا کر دیتی ہے۔ اس طرح ناظر جب تصویر پر وحدت کے اصول کو تسلیم کر لیتا ہے تو ضمناً وہ یہ بھی مان لیتا ہے کہ جن تصویروں میں ترتیب پائی نہیں جاتی، انھیں تصویروں کے ذریعے سے کلانی پھیٹا جائے۔ با ترتیب اور بے ترتیب تصویروں کی جماعت بندی میں ذیل کی سناری توضیحات خود بخود تصویروں کے ذریعے سے خارج ہو جاتی ہیں :-

۱۔ ایسی ساختیں مختلف تفسیلات کا بیشتر حصہ، جس کا اصل مقصد کسی حادثے، واقعہ، مقام کا اظہار

یا جزائیاتی منظر کشی ہوتا ہے۔ یا

۲۔ ایسے منظر نگروں یا ان کی نقل، جن میں تصویر کا ہر فرد اپنی حیثیت میں دوسرے کی برابری کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ ایسی مساوات کی وجہ سے تصویر مختلف پیکروں کا مجموعہ بن جاتی

ہے۔ اور

۳۔ ایسی تفسیلات جنہیں روزانہ اخباروں میں دیکھا جاتا ہے۔ جن میں تصویر کشی کے موقع کو

نمایاں کرنے کی بجائے ظاہر کیا جاتا ہے کہ قائل کس جگہ سے فرار ہوا، مقتول کہاں گرا،

غلاں کس کہاں غرق ہوا، اور تلف یہ کہ ان واقعات و حادثات کو تصویر میں تیرنا

یا ستارہ نامہ علامات کے ذریعہ بتایا جاتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ مذکورہ بالا تمام توضیحات تصویر میں نہیں ہوتیں، وہ تو صرف تقابلی وار داتوں یا حادثات کے منظر کی نقشے ہو کر رہتے ہیں۔

۴۔ ان کے علاوہ فن مصوری کی عمل کاری کے میدان میں کبھی کبھی مصوری ایسی ماہرانہ کارستانیاں بھی دیکھنے میں آتی ہیں جو بچائے خود رنگ اور فن کاری (ٹیکنک) کے لحاظ سے تو بڑی دلچسپ ہوتی ہیں، لیکن ایسی دست کاریوں سے ایک متوازن دماغ کو کبھی مسرت حاصل نہیں ہوتی۔ کیونکہ ایسی کارستانیوں میں توازن اور ہم آہنگی کے ایسے بدیہی اصولوں کا فقدان پایا جاتا ہے جو کائنات میں ہر جگہ کار فرما نظر آتے ہیں۔

اسی لئے تو کہتے ہیں کہ جب آپ پتھر سے اٹھول توازن کو الگ کر لو گے تو اسے ہم آہنگی سے محروم کر دو گے، اور جب ہم آہنگی کو نکال لو گے تو ظاہر ہے انتشار و پرالگندگی پیدا ہو جائے گی۔

تصویر کی تعریف آدمی، لکھوڑا، درخت، پارٹھ، پہاڑ، درہ گزر وغیرہ کی ایک چیز میں تصویر کے اجزائے ترکیبی ہو سکتے ہیں لیکن یہ اچھی طرح یاد رہے کہ ان سب اشیاء کو کاغذ یا پردہ تصویر پر برائے نام کر دینے سے تصویر نہیں بنا کرتی، اور یقیناً اس وقت تک نہیں بنتی جب تک ان سب اشیاء میں ایک باقاعدہ نظم و ترتیب نہ پیدا کر دی جائے۔
حاصل کلام یہ کہ بغیر ترتیب کے تصویر ناممکن ہے، اور تمام تصویریں اکائیوں کی من حیث الحال ترتیب ہی کو تصویر کہتے ہیں۔

یہ بات ناممکن نہیں کہ کوئی شخص تصویریں ترتیب میں توازن اور وحدت کے اصولوں کی سادگی کو دیکھتے ہوئے انھیں بالکل ہی مضحکہ خیز چیز سمجھ بیٹھے کیونکہ ہمیں خود بھی یہ دیکھ کر بڑی حیرت ہوتی ہے کہ ایک طرف تو ابتدائی دور کے

توازن، تناظر، تقابل، وحدت
اور ہم آہنگی، ترتیب کے اجزاء ہیں

ایسے باکمال اساتذہ جن کے شاہ کار پر اعتبار فن چوٹی کے شمار ہوتے ہیں، ترتیب کے اصول انہی کو بخلا دادے کہ نظر دے سے ادھل ہو گئے، اور دوسری طرف پتھر پرست یا ارتسام نگاری کے جدید تصویریں داستان نے انہی اصولوں کو اپنی دانست میں غیر لازم سمجھ بیٹھا۔ یہ انکار ہی تھا جس کی وجہ سے تمام ارتسامین مندرجہ ذیل ترتیب کے اصول سے اتفاق نہیں کرتے۔ حالانکہ اس اصول کی اس خوبی کو دیکھتے ہوئے جو اس کی ایک غیر منفک خصوصیت ہے، ارتسامین کے دعوے کی ترتیب میں ثبوت ملتا ہے۔
یعنی جو ابی باقاعدگی (Symmetry) توازن ترکیبی اجزاء میں تنظیم، عالی جگہ کی پرکاری جیسے ترتیب کے بہترین قانون کی یکسانی برسی بدستبی ہے، جو اس کی مخالفت میں یوں اب کشائی کی جاتی ہے۔

”کیا پتھر خود اشیاء میں ترتیب پیدا نہیں کر سکتی، حالانکہ اسی ترتیب کو وہ اپنے خوش آئند انداز میں دس ہزار گنا ہنر طریقہ پر پیش کر سکتی ہے؟“

ایسا دعویٰ کرنا کہ ترتیب پتھر کے قانون کا ایک غیر منفک جزو ہے اور جو ترتیب اس کے ذریعہ عمل میں آتی ہے بہترین ہوتی ہے، تو اسی سانس میں ہم ایک جو نگار کا ایسا طنز بھی سن لیتے ہیں جو نہ صرف اس بے بنیاد دعوے کی تردید کرتا ہے، بلکہ سرے سے دعوے ہی کو کالعدم کر دینا چاہتا ہے، جو یہ کہتا ہے کہ ایسی مقروضہ دعوے کی لغت کے زیر اثر ہم اپنی تصویروں میں سے یکے بعد دیگرے ایسے عناصر کو دینی توازن وحدت و

ہم آہنگی، غلطہ کہتے دیتے ہیں، جن پر یہ تصویریں بنائی گئی تھیں، اور آخر میں اس سے جو نتیجہ برآمد ہو گا، یعنی پرکندگی، اس کو پھر پرست مصوری کے مصنف مسٹر بیس کے ملاحظہ میں پیش کر دیں گے۔

وہ سہل کہتا ہے :-

یہ پھر ہمیشہ غلط ہو ا کرتی ہے

انتخاب میں انتہائی احتیاط اور ذوق سلیم سے کام لیتے ہوئے سائنس کی مدد سے ان عناصر میں ایسی ترتیب پیدا کر دے، جس سے حسین ترین نتیجہ برآمد ہو۔ یہ عمل اسی طرح ہونا چاہیے جس طرح ہر ایک نغمہ ساز مطرب منقبتہ سرود کو جمع کرتے ہوئے، ان کے خوش آہنگ ملاپ کو دریافت کرتے ہوئے اپنی طریزیں یہاں تک ایجاد کرتا چلا جاتا ہے کہ آخر میں بے منکم شور میں سے ایک عظیم الشان ہم آہنگی پیدا کرنے میں وہ کامیاب ہو جاتا ہے۔ پس پھر کی پیش آہادہ صورت کو بحسنہ قبول کرنے کی مصور کو تاکید کرنا ایسا ہی بے معنی ہے جیسے کسی ساز نواز کو پانچ پرچہ بیٹھنے کا حکم دینا، جس سے یہ یک وقت سارے سرود کے بچنے سے خوش آہنگی کی بجائے بے منکم شور پیدا ہو جائے گا، یہ کیا کہ پھر ہمیشہ صحیح ہوتی ہے، یہ اعتبار ان مصوری، صداقت سے بعید، صرف دعویٰ ہی دعویٰ ہے۔ اس دعوے میں وہی غلطی پائی جاتی ہے جو عام طور پر کسی دعوے کو قیض اپنی خوش فہمی سے صحیح ہو ا کرتی ہے۔ اس لحاظ سے یوں کہنا زیادہ صحیح ہو گا کہ پچیس عمر غلط ہو ا کرتی ہے۔ یا پھر میں غلط ہوا اشارے ایسے حالات و کیفیات جن سے تصویریں ضروریات کے مناسب حال کامل ہم آہنگی پیدا ہونے کے بجائے تشاد صورتوں کے ہرگز عام نہیں ہوتے۔

مکتبی تعلیم صورت نہیں بناتی [زندہ معمول اور بے جان نمونوں کے شبیہ کشی کراتے ہوئے، نگار خانے طلبہ کو پالیا تو جھوٹا ہر چیز کی تصویر بنا سکتے ہو۔ نگار خانوں کی اس دیرینہ نصیحت کے باوجود ہم دیکھتے ہیں کہ ایسا لائف کلاس جس میں مدرسہ کا معمول (ماڈل) مکتبی انداز میں کھڑا یا بیٹھا رہتا ہے اور وہی معمول جب کسی منظر کے اندر خیال کے اظہار کا جزو اعظم بن جاتا ہے، تو ان دونوں صورتوں کی تصویر کشی میں زمین و آسمان کا فرق پیدا ہو جاتا ہے۔ اس لئے کہ لائف اسکول کی ساہما سال کی صورت از تربیت کے باوجود اکثر طلبہ مذکورہ بالا نگار خانہ کی نصیحت کی نیم صداقت سے متاثر ہو کر، ان واحدیں تصویر سازی کی منزل میں در آئے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن جو بھی وہ اس منزل میں قدم رکھتے ہیں ان کی کوتاہیاں اور خامیاں ان پر واضح ہو جاتی ہیں کہ روزانہ مشق کے ذریعہ ٹریس ہوا شادی دکھلاتے ہوئے جو کچھ انھوں نے مدرسہ میں بنانا سیکھا تھا، وہ دراصل تصویر سازی کی نہایت آسان ترین شکل تھی، اور اب جبکہ اسی پیکر کو اپنے ماحول (پیش منظر یا پس منظر) میں موزوں کر کے ماحول

آیا ہے، مکتبی تعلیم نے ساتھ چھوڑ دیا ہے، اس لئے انھیں سخت سے سخت مشکلات کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ چنانچہ اس سلسلہ میں ایک طالب فن جو سات سال تک غیر ملکی نگار خانوں میں کام کر چکا تھا، یہی شکایت کرتا ہے کہ:-

میں نے آرٹ کو اس لئے ترک نہیں کیا کہ مجھے تصویر کشینی نہیں آتی، بلکہ اصل وجہ یہ تھی کہ مجھے جو معلومات تھیں، ان کو استعمال میں لانے کے طریقوں سے مدد میں مجھے لاعلم رکھا گیا تھا۔

شاید یقین نہ ہی نہیں، اکثر شہید کش مصواری میں قلب سے اس امر کا صاف صاف اعتراف کرتے ہیں کہ حقیقت میں انھیں پیکری موضوع کو اس کے مناسب حال تصویر ہی ماحول میں ٹھیک طور پر پیش (ملو) کرنے کے لئے بڑی بڑی دقتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ پس یہ بڑا دلچسپ اور غور طلب مقام ہے کہ شہید کش مصور کو صرف ایک ہی پیکری تصویر سازی کرنی پڑتی ہے۔ لیکن اس تنہا پیکر کو بھی وہ موزوں طریقہ پر تصویر ہی ماحول میں پیش کرنے سے قاصر رہتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ پیکر کو اجاگر کرنے کے لئے جب پس منظر سے اسے کافی تاہم نہیں ملتی، تو وہ پیکر خود ہی اپنی ناموزوں تصویر کشی کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتے ہوئے تنقید کو مشتعل کر دیتا ہے۔

عامی جامعہ کے لوگ شاید اس ماحول کو اچھی طرح نہ سمجھ سکیں اور لظاہر یہ اصول انھیں غیر معقول اور بے معنی نظر آئے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس مگر کو ہی لوگ اچھی طرح سے سمجھ سکتے ہیں جو تصویر نگار جانتے ہیں۔ تصویر معلوم اور نامعلوم، اجزاء پر مشتمل ہوتی ہے جس میں انسانی پیکر اپنی اثر انگیز قوت کے ساتھ شے معلومہ (known) کا شبہ بھی پیش کرتا ہے۔ اس کے برعکس پس منظر ایسے نامعلوم (unknown) قاعدہ بندی

بغیر مہارت کے جزئیات یا تفصیل نگاری ممکن نہیں

گھسے چلے جانے یا کشادہ ہونے والی جگہ ہوتی ہے جو بڑھتے بڑھتے انوش (Fame) پیدا کرنے والے مقام میں جذب ہو جاتی ہے۔ تصویر کشی کے وقت اس اصول کو ضرور پیش نظر رکھنا چاہیے کیونکہ جس طرح موسیقی میں صوتی نروں کے مد و جزر کی خاص کیفیات ہی فم کا اہم ترین جز ہوتے ہیں، بالکل اسی طرح تصویر ہی موضوع کے محاسن کو نمایاں کرنے کا دار و مدار بھی اجزاء کے تقابل و توازن پر ہوتا ہے۔ اس اصول کو نظر انداز کرنے سے تصویر غیر متوازن اور بے آہنگی کا نمونہ بن کر رہ جائے گی۔ یہی وجہ ہے کہ جب ہم توازن اور تقابل کے اصول کی تحقیق کی طرف رجوع ہو رہے ہیں تو ہمیں صاف طور پر معلوم ہو جانا ہے کہ اصل موضوع کی تصویر کشی سے کہیں زیادہ مہارت اس کے معنی اور ذیل لوازمات کو بنانے میں درکار ہوتی ہے۔ اس کی وجہ صاف ظاہر ہے کہ اصول تقابل کے ذریعہ ہونے والے موضوع کو زیادہ سے زیادہ اجاگر کرنے کا پورا دار و مدار تصویر کشی کے معنی اور لوازمات و تفصیلات ہی پر ہوتا ہے۔ اس وجہ سے جب ہم تفصیل نگاری پر غور کرتے ہیں تو راست اصول ترتیب (یعنی تناظر، تقابل، توازن، کی طرف رہنمائی ہوتی ہے۔

طباع حسن کا زفن پر قدرت رکھتا ہے الفاظ پر نہیں

مختلف تصویروں کے گونا گوں اثرات کا گہری نظر سے مطالعہ کرنے کے بعد سر جو شواری بتا لڈ کہتا ہے :-

طوفا کر باہی ہسی اور دوسرے اثرات کی مانند، ایک صاحبِ جودت (صدمہ صحت) کے کارناموں کو بھی چند قاعدوں کا پابند ہونا پڑتا ہے۔ جب یہ معلوم کرنے کے بعد کہ ان تاثیرات کی کوئی نہ کوئی علت ضرور ہوتی ہے، تو پھر ان کے لئے خاص خاص قاعدوں کا ہونا بھی ضروری ہے کیونکہ ایسی مستقل نوعیت کی خوبیاں یا محسن محض اتفاقات کی بنا پر تو پیدا نہیں ہو کر تے۔ یہ تمام خوبیاں ضرور کسی کسی حقیقت اور اس تحقیق پر استقلال سے مجھے رہنے کی بدولت پیدا ہوتی ہیں۔ پس ان محسن کی نوعیت ہرگز اتفاقی نہیں ہو سکتی۔ بڑے بڑے قابل افراد اور ایسے افراد جنہیں صاحبانِ طغنت (صدمہ صحت) کہا جاتا ہے، اپنی قاعدوں کی مدد سے کام کرتے چلے آئے ہیں۔ یہ ایسے قاعدے ہیں جن کو یا تو وہ اساتذہ اپنے مخصوص انداز مشاہدہ کی بدولت خود ہی دریافت کر لیتے تھے، یا ان کی بناوٹ (Texture) کے اثرات ہی میں ایسی نفاست و نزاکت پائی جاتی تھی جس کو یہ آسانی الفاظ کا جامہ پہنا سکتے ہیں جاسکتا تھا۔ یہ بیان کر دینا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ مصوروں کی ایک بڑی اکثریت خصوصیت کے ساتھ اپنے خیالات کے نفی میں کش میں ماہر نہیں ہوتی۔ یہ قاعدے بادی النظر میں کہتے ہی غبارِ کم یوں نہ معلوم ہونے ہوں، اور ان کو ضبطِ تحریر میں لانا کتنا ہی مشکل کیوں نہ ہو، پھر بھی مصور اپنے نفس میں انہیں دیکھتا اور محسوس کرتا ہے، اور انہی کی مدد سے ایسے کامل نقیص کے ساتھ کام کرتا ہے، گو یا وہ ضابطے صفحہ قرطاس پر مجسم بن چکے ہیں۔ یہ سچ ہے کہ ان نازک اور نفیس ترین اموال کو ہمیشہ اس انداز سے محسوس نہیں کرایا جاسکتا، جس انداز سے کرٹ کے موٹے موٹے اور بھدے قاعدوں کو محسوس کرایا جاسکتا ہے۔ تاہم مذکور بالا بیان سے اس کے سوا لے اور کوئی لازمی نتیجہ نہیں نکلتا کہ نفس کو اس انداز سے تربیت دی جانی چاہیے کہ وہ ایک ایسے سائنٹفک احساس کی مدد سے تصویر کے موضوع کا اذراک کر سکے، جس کی موردِ نیت کو الفاظ

عکس سے ادا نہیں کر سکتے۔

یہ یاد رکھنے کی بات ہے کہ سائنس کا تعلق تمام تر صداقت سے ہوتا ہے، اور آرٹ کا صداقت ادراک، دونوں سے۔ لیکن تصویر کی ترتیب کے وقت ان دونوں میں جب بھی توجیح کا سوال پیش آئے تو

ایک نظر

از رفا اقصیٰ

دیکھنے کو تجھے بیتاب ہوا جاتا ہوں!
جیسے اک پیکر سیما ہوا جاتا ہوں!
تیش شوق سے پہم ہی پھینکا جاتا ہوں!
مغلہ عشق سے جلتا ہوں بھنا جاتا ہوں!

سامنے آ کہ تجھے ایک نظر دیکھوں گا!

روبربات کی بکھی ہوئی گھنیری زلفیں!
بجھ گئیں، نور کو آغوش میں لیکر ملیں!
اور یہ پہا ہوا اہسا ہوا، منظر شاید
آگیا گھر خوشی سے گذر کر شاید

سوچتا ہوں اس اندھیرے میں کہ ہر دیکھوں گا!
سامنے آ

دل کی دھڑکن کے سوا، ساری فضا ہے خاموش!
جیسے کوئی نہیں دنیا میں ہے منت کش ہوش
ہاں گر ایک فہم سے نہیں جی کو دکھاؤ!
نیل ندی میں گشت سی رہ چاندی کی ہے ماؤ

اتنی فرصت ہے گر کب؟ جو ادھر دیکھوں گا!
سامنے آ

کا ہے احساس دلاتا ہے، مسلسل سکوت!
بجھ میں نامیں گئے پد تک ترے نکل کے بھوت
اس مخالف سے معاً، دہشت ایک گنا بھٹا ہوا
کانپا بھٹا ہوں بجھی کانپ کے کانپ بھٹا ہوں

خود کو کب تک؟ یوں ہی محسوس ہوا دیکھوں گا!
سامنے آ

جان مستفی آرام ہے آنکھیں بے خواب!
آرزو و تن غلش، اور تنہا بیتاب!
جراتیں اب تو جوتی جاتی ہیں بال بال، انہما!
پڑتی جاتی ہے مرے دیدہ امید پاؤں!

کس طرح؟ تجھ کو سوئے راہ گذر دیکھوں گا!
سامنے آ

اہمیت صحرا اور موجودہ حالت پر نظر ثانی

کوئی گناہ کی پھینکار جو قدرت کے خلاف عمل میں لائی گئی ہو، اس سے بڑھ کر نہیں ہو سکتی کہ وہ قیامت کا نذرانہ ہو۔ اس کی ہنر پر شش سے ہٹایا جائے۔ جنگلات بالواسطہ اور بلا واسطہ زندگی کا معرک ہیں۔ اول الذکر بلحاظ اپنی پیداوار کے، موخر الذکر سبب موسم، باقاعدگی نمی و حفظ صحت اور خدائی اثرات کے۔ بالواسطہ معرک صحرا کو پیداوار کی ذیلی میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ پیداوار کی چوبینہ ہنرمند اور کوئلہ پر مشتمل ہے۔ قطع نظر کثرت کے صحرا سے بے شمار پیداوار، مثلاً چھال (جو عموماً باغیت کے کام آتی ہے) گوند، شہد، موم، لاک، بانس، بید، پتے، پھول، بیج، گھاس وغیرہ برآمد ہوتے ہیں۔ یہ تمام پیداوار ذیلی میں شمار کیے جاتے ہیں۔ دراصل پیداوار ذیلی بہ نسبت پیداوار کیلے زیادہ قیمتی ہے۔ پیداوار ذیلی کا بیشتر حصہ بغیر صحرائی چوبینہ کو نقصان پہنچائے صحرا سے حاصل کیا جاسکتا ہے۔ لیکن ہر وقت اس پر عمل نہیں کیا جاسکتا۔ اکثر ہم کو فیصلہ کرنا پڑتا ہے کہ آیا ہم اپنے جنگلات سے چوبینہ حاصل کریں گے یا کوئی ذیلی پیداوار۔

جیسا کہ بیان کیا گیا ہے، بالواسطہ فوائد کے علاوہ صحرا کے بلا واسطہ بہت سے فوائد ہیں جو کسی طرح بالواسطہ فوائد سے کم اہمیت نہیں رکھتے۔ بعض صورتوں میں بلا واسطہ فوائد بہ نسبت بالواسطہ فوائد کے بہت زیادہ اہمیت رکھتے ہیں۔ ایک زمین ساکھڑا جو سبز پوش سے مختلف اسباب طبعی کو خوشگوار بنا کر سورتج کی گرمی کو کم اور نہو کو آجور پرت زمین سے متصل ہے معتدل کرتا ہے۔ ان اسباب کو حسب ذیل طریق برحقہ قرار سے بیان کیا جاتا ہے :-

الف۔ درختوں کا گھنٹا تاج زمین سے کسی قدر بلند ہی پر ایک چھت بناتا ہے جو سورج کی شعاعوں اور برسات کے پانی کو زمین پر گرنے میں رکھتا ہے۔ پیدا کرتا ہے۔ یشامیاد ہوا کے جھونکوں کو روکتا، اور رات کے وقت گرمی کو کم کرتا ہے۔

ب۔ بے اور گھاس گرمی کا مقابلہ کر کے پرت زمین کی حفاظت کرتے ہیں۔ ہوا اور پانی جو اس میں جذب ہوتے ہیں اس پر بڑا اثر کرتے ہیں۔

ج۔ درختوں کی جڑیں زمین کے اندر پھیلی ہیں اور اس کی ساخت کو مضبوط رکھ کر مٹی کے پورے جانے کو روکتی ہیں۔ اس کے برخلاف یہی جڑیں ایسی زمین کو جو سخت ہے، پھیلنے لگتی ہیں۔

ان کاموں کے اثرات پر ہمیشہ غور کیا جاسکتا ہے اور بعض صورتوں میں ایسے زمانے کی بھی تحریرات محفوظ ہیں کہ جن کا ٹھیک پتہ نہیں چلایا جاسکتا۔ لیکن شکل یہ ہے کہ صحرائی اثر کے فرق کو ان کاموں کے

مقابلے میں کس طرح پھیانا جائے۔ کیونکہ ہر ماحول میں مختلف البتھیں اسباب وقت واحد میں سرگرم کار ہیں۔ مثال کے طور پر صحرائی آخر مختلف وجہ سے اعتدالی پذیر ہوتا ہے۔ جیسے جزائی محل وقوع۔ سطح سمندر سے بلندی۔ ڈھال۔ عام ہیئت۔ بالائی وزیریں پرت زمین کی قدرتی ساخت اور وسعت جھکات وغیرہ۔ طے جیلے اسباب کی وجہ سے جو وقت واحد میں سرگرم کار ہیں، اور معلومات کی کمی کی وجہ سے بعض تجربے نوی معاشرہ میں اہمیت صحرا کے متعلق مبالغہ آمیز ہو گئے ہیں۔ حالانکہ دیگر مالک اس کی اہمیت کی طرف مائل نظر آتے تھے۔ یہی تجربے کیا گورل کو فرانس میں اور نارڈلجرا در کینٹرل کو جرمنی میں رہبری کے موجب ہوئے۔ اس کے بعد انہی تجربات کو میٹھوئے فرانس میں اور ابرسیرنے جرمنی میں وسعت دی۔ ان تجربوں کے نتائج اس قدر دلچسپ ثابت ہوئے کہ دوسرے ملکوں نے ان کی تقلید کی۔ ان تجربات کی تفصیل میں جانا غیر ضروری ہے۔ ہمارے مطلب کے لئے یہ بات کافی ہے کہ مسافر اہلین جو صحرائی برش اسباب کو معنی منقہ ہوئی تھی اس کے اقتباس کو جو تمام مشاہدات کا امتحان کرنے کے بعد مقرر ہوئی تھی درج کیا جائے۔

موسم پر صحرائی اثر

الف۔ حرارت: پودے ہوا کی حرارت کو کم کرتے ہیں۔ زندہ پودے اس قدر بلند گرم نہیں ہوتے جتنا کہ چٹان یا کھلی زمین۔ پودوں کے نیچے کی زمین سورج کی شعاعوں سے بہت زیادہ گرم نہیں ہوتی، کیونکہ یہ سبز شامیائے سے ڈھکی ہوتی ہے۔ پس صحرا زمانہ بالیدگی میں ہوا کی حرارت کو ان کے اطراف اور اندر کم کرتا، اور نیز زمین کی حرارت کو کم کر کے برودت پیدا کرتا ہے۔ صحرا عام طور پر موسم سرما میں بہت کم گرم کرتا ہے، صیبا کہ شدت گرمی سے اکثر نقصانات ہوتے ہیں، اس کی تلافی سردی سے جو صحرائی اثر کے تحت ہے، بہت زیادہ مفید ہوتی ہے۔

ب۔ ہوا: صحرا ہوا کا زور کم کر کے حرارت میں کمی اور ہوا میں غلا پیدا ہونے نہیں دیتے۔ صحرا مقامی ہواؤں پر اثر پذیر ہوتے ہیں، اس لئے کہا گیا ہے کہ صحرا ہوائی رُے اثرات کو زائل کرنے میں بالکلیہ مفید ہیں۔

ج۔ بارش: یہ نسبت گنجان صحرا کے کسی مقام کی جغرافیائی ہیئت اصلی بارش پر

بہت زیادہ اثر پذیر ہوتی ہے، اس کے برخلاف صحرا ان ہواؤں کی گرمی کو جو رطوبت سے بھری ہوئی ہیں، کم کر کے مقامی بارش پر اثر انداز ہوتا ہے۔

د۔ فضائی رطوبت: گنجان درختوں کی وجہ سے یہ نسبت میدان کے صحرا میں

ہوائی نمی بلند رہتی ہے۔ انتقال حرارت کا سلسلہ خرد بخود صحرا کے اندر قریب کی

نئی کو بڑھاتا اور حرارت کو گھٹا کر انتہائی درجہ حرارت پر لے جاتا ہے۔
 ۶۔ بھاپ : تجربوں سے ظاہر ہوا کہ زمینی حرارت بہ نسبت کھلے میدان کے صحرائیں کم ہے جس قدر ہوا زیادہ ہوگی اسی قدر حرارت بلند اور نمی نیچے ہو کر زمینی حرارت کو بڑھائے گی۔ نتیجہ کے طور پر صحرا حرارت کو کم اور ترابی نمی کو بڑھا کر ہوا کی رفتار کو کم کر کے حرارت میں کمی کرتا ہے۔ تجربے یہ بھی بتلاتے ہیں کہ میدان اور صحرا کے مقابلے میں پانی کی سطح پر حرارت کم ہوتی ہے۔ پودوں کی خاصیت سے حرارت میں اختلاف ہوتا ہے لیکن پھر بھی باوجود مختلف درختوں کے بڑھتے ہوئے اثرات کے صحرائی خاصیت سطح زمین سے حرارت کو کم کرتی ہے۔
 مقامی موسم پر صحرائی تباہی کے اثر کو تعمیلی نے اختصار و صمت سے حسب ذیل الفاظ میں بیان کیا ہے:-

”موسم، باوجود ان تمام اسباب کا مجموعہ ہونے کے صحرا کو تباہ کر کے بلاشبہ زمین کے ایک بہت بڑے حصہ کو برباد کرتا ہے۔ ایسی صورت میں کسی ملک کی آب و ہوا کو قدرے نوپیدائش صحرائی برداشت کر سکتا ہے۔ وسیع قدرتی صحرائی رقبوں کی مسلسل تباہی نتیجہ ہے سطح زمین کا خشک ہو کر پھٹ جانا اور افلاس پیدا کرنا“

پس اس سے صاف ظاہر ہے کہ صحرائی قدرت اور معاشرہ میں اہم حصہ لیکر انسان کے لئے بعض ضروری مفید اشیاء مثلاً ہیزم، میل، گوند، گھاس وغیرہ فراہم کرتے ہیں۔
 تسلیم کرتے ہوئے کہ صحرائی سلامتی کے لئے ضروری ہے، یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ملک کے رقبے کا کتنے فی صد رقبہ صحرائی رکھا جائے۔

ہمارے ملک میں جو ہیزم استعمال کیا جاتا ہے اس سے ظاہر ہے کہ ایک اوسط خاندان کے لئے جو پانچ آدمیوں پر مشتمل ہو، روزانہ (۵) پونڈ سے (۱۰) پونڈ تک ہیزم کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ شہری اعداد و شمار ہیں جہاں ہیزم کے استعمال کی معاشرہ کو شدید ضرورت ہے اور صورت پکوان کی مدد تک استعمال میں لایا جاتا ہے۔ دیہات میں عموماً لوگ زیادہ ہیزم استعمال کرنے کے عادی ہیں۔ شہر اور دیہات میں ہیزم کی کچھ مقدار اشیاء کو گرم کرنے کے کام میں لائی جاتی ہے۔ کم سے کم گھریلو ضروریات کے لئے فی ہزار آدمی ہیزم ایک خاندان کے لئے کافی ہے جیسا کہ ملک محروسہ کی اوسط آبادی میں فی ہزار (۱۹۶) ہے تو سالانہ ایک مربع میل میں بسنے والے خاندانوں کو (۱۳۳۰۰) پونڈ یا (۶۲) ٹن کلومیٹر کی ضرورت ہوگی۔ اب ہم کو یہ دیکھنا چاہیے کہ کل کتنا رقبہ (۶۲) ٹن ہیزم پیدا کر سکتا ہے ہندوستان کے کھلے صحرائیں ایک ایکڑ میں اوسطاً (۶۲) ٹن ہیزم برآمد ہو سکتا ہے۔ لہذا (۶۲) ٹن کے لئے (۱۲۸) ایکڑ صحرائی ضرورت ہوتی۔ بالفاظ دیگر ہر ایک مربع میل میں (۱۲۸) ایکڑ یا صرف گھریلو ضروریات کے لئے ہیزم پیدا کرنے کے لئے (۲۰۱) فی صد رقبہ کی ضرورت ہے۔ گھریلو ضروریات کے علاوہ ہیزم کو

بہت سی ضروری بنیادی صنعتوں میں استعمال کیا جاتا ہے۔ مثلاً اینٹ بنانا۔ چونا جلانا اور لوہا پگھلانا وغیرہ۔ یہ کام ملک کے ہر گاؤں میں ہوتے رہتے ہیں۔ خاص کر شہری لوگ بجائے ہیزم کے گولہ زیادہ مقدار میں جلا رہے ہیں اور یہ بہت افزا ہے۔ لیکن قبل اس کے کہ گولہ ہیزم کی جگہ لے، دیہات میں لوگوں کی عادت اور ان کے چوٹوں کی بناوٹ ایک عرصہ تک یوں ہی قائم رہے گی۔ بڑے شہروں میں گولہ کا استعمال عام ہوتا جا رہا ہے۔ ہیزم کی مانگ سے نجات دلانے کا یہ شکوہ نیک ہے۔ ہیزم کے علاوہ چار دی آج کل کی اعلیٰ مخلوق ماسوائے میں چوبینہ بھی زیادہ استعمال میں آ رہا ہے۔ دراصل چوبینہ کا استعمال اس قدر کثرت سے ہے کہ یہ خیال کرنا ممکن ہے کہ انسان بغیر لکڑی کے نہیں رہ سکتا۔ چوبینہ کے بڑھتے ہوئے کثرت استعمال کا یہ مطلب ہو کہ علاوہ ہیزم کے ہم کو ایک بہت بڑا صحرائی رقبہ درکار ہے۔ چوبینہ کے علاوہ ذیلی پیداوار کثرت سے استعمال میں لائی جا رہی ہے۔ اکثر یہ دیکھ گیا کہ ذیلی پیداوار چوبینہ و ہیزم کی پیداوار پر اثر انداز ہوتی ہے۔ پس اس سے ظاہر ہو کہ جلد صحرائی رقبہ (۲۰) فی صد سے زائد ہونا چاہیے جس سے ہیزم برآمد ہو گا۔ ہماری یہ غلطی نہ ہوگی اگر ہم اس رقبہ کو (۲۵) فی صد بڑھا دیں۔

ایک دوسرا سوال یہ ہے کہ کسی ملک کی ضرورت کے لئے کم سے کم کس قدر رقبہ صحرائی رکھنا چاہئے۔ یورپ کے ممالک میں بلحاظ آبادی فی فو ایکڑ بھل کی ضرورت ہے۔ اس طرح حیدر آباد میں فی ہرلے میل (۱۹۶) ایکڑ صحرائی ضرورت ہے۔ اس کا اوسط (۳۰) فی صد ہو گا۔ مذکورہ بالا اعداد و شمار کو ممالک یورپ و امریکہ کے حوالوں سے جانچا جاسکتا ہے۔ یہ معلوم کیا گیا ہے کہ فرانس اور جرمنی میں (۲۵) فی صد صحرائی رقبہ کی ضرورت ہے۔ ممالک متحدہ امریکہ کے متعلق ایک مصنف نے یوں خامہ فرسائی کی ہے۔

”قوموں کی ضروریات زندگی کے لئے زمین کی خیالی تقسیم قدر تا بہت زیادہ ہوگی۔ معیار زندگی میں صنعتی و معاشرتی ترقی کے لحاظ سے ممالک متحدہ امریکہ میں حسب ذیل اعداد و شمار بلحاظ اوسط ضرورت فی ایکڑ زمین برائے کاشت ۳ ایکڑ برائے جنگلات ضروری ہے۔ یہ اعداد و شمار مشرقی ممالک کے لئے کم ہونا چاہیے، کیونکہ یہاں کا معیار زندگی گھٹا ہوا ہے کسی گنجان آبادی کے ملک میں صحرائی زمین اور چرائی کے قدرتی ذریعہ کم اعداد و شمار سے بچائے جاسکتے ہیں۔“

(ڈاکٹر آر ایم جیوری)

اس طرح حساب کرنے کے بعد یہ کہا جاسکتا ہے کہ سب سے زیادہ ترقی یافتہ ممالک میں کل زمین کا (۲۵) فی صد رقبہ صحرائی ہونا چاہیے۔ اگر ذرا غمی و معاشرتی ترقی حاصل کرنا مقصود ہو تو بعض مستثنیات میں مثلاً برطانیہ، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ اور ڈنمارک۔ برطانیہ کی حالت جداگانہ ہے وہ ہمیشہ اسکندینیائیہ کے ممالک اور ماتحت سلطنتوں سے درآمد کرتا ہے لیکن تاہم برطانیہ بھی گزشتہ جنگ کے تجربوں کے بعد سے

بڑی جاگیرات اور زمینوں کے خانگی حوالے کی حالت تباہی کی طرف تیزی سے بڑھتی جا رہی ہے۔ دوسری ہڈی یہ ہے کہ سرکاری و خانگی حوالہ کا ۵۰ فی صد رقبہ پہاڑوں اور چٹانوں پر واقع ہونے سے ناقابلِ پیداوار ہے۔ ہمارے حوالوں کے رقبہ کی کمی کو منظم کرنے کا بیج اندازہ کرنے کے لئے یہ امر خانی از دیکھی نہ ہو گا کہ اس کا مقابلہ برٹش انڈیا کے مختلف صوبوں سے کیا جائے۔

۱۹۳۰ء میں سرکار عظمت ہدار کا صحرائی رقبہ مربع میل میں

صوبے	جملہ رقبہ	حاکم محروسہ کا صحرائی رقبہ			خانگی حوالہ	جملہ	رقبہ بمطابق بلحاظ صوبوں کے بقیہ خانہ رقبہ
		صحرائی رقبہ	دوسرے جگہات	جملہ			
۱	۲	۳	۴	۵	۶	۷	۸
اچیرا دارا	۲۵۳۶۷	۰۰	۷۳	۷۳	۰۰	۷۳	۳
انڈیا نگرہار	۲۵۵۰۸	۱۳۳۹۸	۶۹۱	۲۱۸۹	۰۰	۲۱۸۹	۸۷
آسام	۵۵۵۳۵	۲۲۸۳۱	۰۰	۲۲۸۳۱	۰۰	۲۲۸۳۱	۳۱
بومستھان	۵۲۹۲۵	۰۰	۲۲۲۱۸	۲۲۲۱۸	۰۰	۲۲۲۱۸	۳
بنگلہ	۷۸۷۰۸	۶۵۳۳۹	۵۵۹۵۴	۱۲۱۲۹۳	۱۵۹۶	۱۳۵۸۹	۱۷
بہار	۶۹۳۳۸	۱۷۷۰۱	۶۳۱	۲۳۳۲	۷۵۸۵	۹۵۹۱۷	۱۳
بھٹی	۷۶۰۲۶	۶۵۵۵۴	۶۵۵۶۶	۱۳۱۱۲۰	۰۰	۱۳۱۱۲۰	۱۷
سی پٹی ادبہ	۹۸۵۷۳	۱۳۵۲۳۳	۸۵۶۳۱	۲۳۰۷۴	۲۳۵۳۱۲	۲۷۵۳۸۶	۳۸
کونگ	۱۵۵۸۲	۵۱۷	۳۱۸	۸۳۵	۳۴۷	۱۷۱۸۳	۷۵
مدراں	۶۵۱۶۳	۶۵۵۳۹	۱۳۲۶۹	۱۸۵۸۰۸	۱۳۸۷۱	۳۳۷۷۹	۲۷
شمال مغربی	۱۳۵۰۹۹	۱۳۶	۳۱۴	۳۶۰	۱۳۳	۵۹۳	۵
صحرائی صوبہ							
اڑیسہ	۳۲۵۳۹۸	۱۷۴۵۴	۸۱۳	۲۲۶۸	۶۷۷۷۸	۳۵۹۴۵	۱۲
پنجاب	۹۶۸۳۰	۱۷۹۷۷	۳۳۴۴	۶۵۳۰۱	۲۰۲	۶۷۵۰۳	۷
سندھ	۴۷۱۵۵	۱۷۱۳۵	۰۰	۱۷۱۳۵	۰۰	۱۷۱۳۵	۲
متحدہ صوبہ	۱۷۰۶۲۳۸	۳۵۴۹۱	۱۰۷۷۸۳	۱۳۷۷۷۵	۳۷۰۹۷	۱۷۵۴۷۲	۱۶
میسور	۵۵۵۸۰۳۷۵	۶۸۷۶۳۵	۵۳۳۸۶	۵۷۲۵۰۲۱	۵۳۵۸۳۱	۵۷۵۵۸۳۲	۲۰

بقیہ نمونہ ۱۷۵ (۳۱) پر

ادارہ ادبیات اردو کی کتابیں

نام کتاب	قیمت	نام کتاب	قیمت
سرگزشت حاتم	۱۲۸	سج کا جادو	۴۸
سرگزشت غالب	۹۳	طبیعیاتی کائنات	۹۸
نظام الملک	۴۰	مناجیح سخن	۱۲۳
تاریخ گولکندہ	۳۳۰	کیف سخن	۱۲۲
ریڈیو نمبر (۸ تصاویر)	۱۶۰	باد سخن	۱۲۷
ارمغان جناب	۱۲۰	سراج سخن	۱۵۲
سوتیلی ماں	۴۸	ایمان سخن	۱۳۰
سر سید احمد خان	۱۶	فیض سخن	۱۳۴
سر سالار جنگ	۴۸	موقع سخن جلد اول (۵۵ تصاویر)	۵۰۰
مغربی مصانیف کے اردو تراجم	۱۴۵	دوم (۵۰)	۳۳۲
معصیت کی چھاؤں	۱۳۲	نقد سخن	۱۷۵
اقبال نمبر	۲۶۸	نذر ولی	۲۴۸
سائنس کے کرشمے	۱۱۲	گریو و تبسم	۱۹۲
شعراء عثمانیہ	۲۳۰	مہاشیر قلعہ ہار دکن	۱۸۴
مکتوبات شاد عظیم آبادی	۳۰۰	من کی دنیا	۱۴۵
دادا بھائی	۱۶	مدارس میں اردو	۱۹۶
ادو نامہ	۲۰۰	معجم ذمہ	۱۱۲
حیدر آباد	۸۵	نذر دکن	۱۵۳
عماد الملک	۴۰	روح غالب	۱۴۰
اردو دانوں کی پہلی کتاب	۵۶	عامہ	۲۰۰
دوسری کتاب	۵۶	دفتری معلومات	۵۶
محمد حسین آزاد	۲۰۰	آپدور کشمیر اور سرنگ	۴۸
کاغذ کی ناؤ	۱۴۰	اردو مکتوبی کا ارتقاء	۱۴۳
فرن تقریر	۹۲	نمونہ زندگی	۲۱۶
مقدمہ تاریخ دکن	۱۴۳	سرگزشت ادارہ	۳۰۰
ہندوستانی تمدن	۱۴۰	میر محمد مومن (۲۴ تصاویر)	۳۱۲
پودوں کی کہانی	۸۰	پلکان	۳۲
مس لقا	۱۰۰	خطا پیات	۱۱۳
پانی کی کہانی	۴۸	علم خانہ داری	۱۵۰
رسائل طیبہ	۳۹۰	چیونٹی (۱۶ تصاویر)	۱۱۸
سلک گوہرین	۴۰	انوار	۱۶۸
تاریخ ادب اردو	۱۷۲	نغمش بانی (۴ تصاویر)	۸۰
اشوک اعظم	۵۶	کارمان دقتی	۱۲۸
پانچیں	۸۴	رات کا بھولا	۱۶۸
یو۔ پ۔ جنگ سے پہلے	۱۱۸	سکندر جاہ	۲۴
شہنشاہ	۱۷۶	بلاغت	۵۴
پانی بھین	۱۰۲	ادارہ سنہ ۱۹۴۱ء میں	۲۰۰
ظہار علی خان	۳۰	ناصر الدولہ	۲۴
دہرہ اردو - خطوطات جلد اول	۳۹۶	افضل الدولہ	۳۲
عرب اور عربستان	۵۶	نواب میر محبوب علی خان	۳۲

(ماه نامه)

مسب اس



۷۹۰۳۲
حیدرآباد دکن

اداره ادبیات اردو

ادارہ ادبیات اردو حیدرآباد دکن کا مہنامہ

زیر نگرانی
ڈاکٹر سید محمد الدین غازی نذر
مجلس ادارت
خواجہ سید الدین ایم اے
سکینہ بیگم

سپرس

نشان پستہ آصفیہ ۱۵۳
نشان پستہ برطانیہ ایم ۳۹۵۰
ٹیلیفون نمبر ۲۲۰۹
چند سالانہ پارہوں کے طے کرنے
بچوں کا سہولت کار اور دیگر آئے

شمارہ ۱

ماہ جنوری ۱۹۴۶ء

جلد ۹

فہرست مضامین

۲	خواجہ محمد الدین ایم۔ اے (عثمانیہ)	۱	اردو میں سنی ادب
۴	بشیر انصاریہ بیگم بکیر	۲	تقی ہند فن کار سے (نظم)
۹	خان بہادر عبدالرحمن حسینی	۳	وہمت (افسانہ)
۱۲	رومی (اورنگ آباد)	۳	نورید زندگی (نظم)
۱۳	صغی شہر (عثمانیہ)	۵	جھنگلیاں (افسانہ)
۱۴	جہاں بانو بکیر ایم۔ اے بکیر انصاریہ	۶	نعمت پر باد (افسانہ)
۳۰	سکینہ بیگم (جلیپور)	۷	جستہ راز (نظم)
۲۱	فریدہ بی بی	۸	نشین
۲۳	سلیمان اربیب	۹	خوش آمدید (نظم)
۲۵	قتیل شغاف	۱۰	دو شطے
۲۶	محمود قادری	۱۱	محسوسات (غزل)
۲۷	اقبال مبین	۱۲	مشرق (ترجمہ)
۲۸	محمد معین الدین ایم۔ اے (آخری)	۱۳	دھوکے (نظم)
۳۲	منظر الدین ظفر ایم۔ اے (عثمانیہ)	۱۳	مجاز علی قطب شاہ اور رومانیت
۳۳	شوق بانو	۱۵	غزل
۳۴	عظیمہ سید آبادی	۱۶	فریسیس (افسانہ)
۳۵		۱۷	تجلیات (غزل)
۳۶		۱۸	بیتا لوں اور صحتی اداریوں میں نزول کی بجلی
۳۷		۱۹	نئی کتابیں
۳۸		۲۰	نظارے (افسانہ)
۳۹		۲۱	ارباب غفر (افسانہ)
۴۰		۲۲	وضع کیسائی
۴۱		۲۳	حسین گمان (نظم)
۴۲		۲۴	اندھرا (افسانہ)
۴۳		۲۵	تقدیر و تہرہ
۴۴		۲۶	۱۰۱۔ ۱۰۲

اردو میں نسائی ادب

(دہلی کالج کی خدمات)

اور سائیس کی تعلیم اردو میں دی جاتی تھی۔ مغربی علوم کو اردو میں پڑھانے میں سب سے بڑی رکاوٹ یہ تھی کہ ان علوم میں اردو میں کتابیں نہیں کھئی گئی تھیں۔ اردو کے حامیوں نے اس کمی کو پورا کرنے کے لئے سوشلسٹ عہد میں ایجوکیشنل کمپوٹنگ کی۔ اس سے قبل اسکول بک سوسائٹی کی طرف سے ہزاروں نصابی کتابیں تیار ہو کر شائع ہوئیں لیکن یہ سب ابتدائی قدم کی کتابیں تھیں۔ سوشلسٹ عہد میں ایجوکیشنل کمی کے تحت بیک ڈیلی کٹی کا قیام عمل میں آیا جس میں ایسے اصحاب کا انتخاب عمل میں آیا جو انگریزی زبان سے اردو میں ترجمہ کرنے کے اہل تھے۔ کمیٹی نے پہلے کہا کہ درسی کتابوں میں غلطی نہ ہو اور پھر آہستگی پر قرار رکھنے کے لئے کتابیں پہلے انگریزی میں لکھوائی جائیں اور پھر ان کا اردو میں ترجمہ کرایا جائے۔

دہلی ونگلر سوسائٹی کے قیام کا سب سے بڑا مقصد یہ تھا کہ جدید ترین کتابوں کی تالیف اور ترجمہ کے ذریعہ سے اردو زبان کو ترقی دی جائے۔ اس مقصد کو آگے بڑھاتے ہیں ہندوستانی اور انگریز برابر کے شریک تھے۔ اس سوسائٹی کے اخراجات کی ذمہ داری کے لئے چند سے اردو کے لئے گئے شاہ اردو کے ان کے صاحبزادے اور ان کے عہدہ دار امراء نے بھی خطے دیے۔ اسی طرح حیدر آباد میں سے نواب سراج الملک جہاد نے بھی رقمیں دیں۔ اس سوسائٹی کی مالی امداد کی اس سوسائٹی کے سرکاری مسٹر بیرس پرنسپل دہلی کالج تھے۔ سوسائٹی نے انگریزی سے اردو میں ترجمہ کرنے کے جو قواعد وضع کیے تھے ان کا ذکر نامزدوری ہے۔

(۱) سائیس کا کوئی ایسا لفظ جس کا مترادف اردو میں نہ ملے تو ایسے لفظ کو اردو میں ترجمہ کے لینے میں کوئی قباحت نہیں۔ مثلاً سوڈوم، کلورین وغیرہ۔

(۲) اگر سائیس کا کوئی لفظ ایسا ہے جس کا مترادف اردو میں موجود ہے تو اردو لفظ ہی استعمال کیا جائے جیسے

شمس اللہ اور ادو شاپان اور دوسرے بعد اردو کو علمی موضوعات سے روشناس کرنے کی باضابطہ اور منظم کوشش دہلی کالج میں کی گئی۔ اس کا دائرہ عمل ان دونوں سے زیادہ وسیع اور منطقت - غوث نسائی سے اس کو ایسے ذی علم اصحاب مل گئے تھے جنہوں نے اردو کے بڑے دامن کو مغربی علوم کے جواہر پاروں سے آلاہل کر دیا۔ چونکہ اس کالج کا مقصد تعلیم اردو تھا اس لئے نصابی ضروریات کے تحت سائیس اردو بک سوسائٹی علوم کی کمی کتابوں کے ترجمے کئے گئے اور اس کے فیض یافتہوں نے بھی اس قسم کی کتابیں تالیف کیں۔ مختلف علوم اور سائیس کی اشاعت نے سوشلسٹ عہد میں دہلی ونگلر ٹرانسلیشن سوسائٹی کا قیام عمل میں آیا جس نے پہلی دفعہ ترجمہ کے ایسے اصول مرتب کئے جو ترجمہ کی مشکلات کو دور کرنے میں بڑی حد تک مددگار ثابت ہوئے۔

اگرچہ یہ کالج سوشلسٹ عہد میں قائم ہوا لیکن اس ابتدائی (۳۰) سال کے حالات پر پردہ پڑا ہوا ہے۔ البتہ یہ نیاں کیا جاتا ہے کہ اس حصر تک اس میں انگریزی تعلیم کا کوئی انتظام نہ تھا۔ مثل دوسرے مدارس کے عربی فارسی کی مروریہ تعلیم ہوتی ہوگی۔ جس تعلیم عام کی سفارش پڑھنے میں اس کے لئے پانچ سو روپے ماہانہ مقرر کئے گئے اور باضابطہ تعلیم کا انتظام عمل میں آیا۔

سوشلسٹ عہد کے جیسے جیسے ملکات کی سفارش پر اردو کے لئے ایک ایسی جماعت کھولی گئی۔ نواب احمد ولد ولہ کے قیام میں خاں بہادر وزیر بادشاہ اردو کے لئے سوشلسٹ عہد میں ایک ایسا مترادف اردو کے لئے علمی اعراض کے لئے جتھہ کر دیا۔

اس سوسائٹی کے سب سے بڑے مقصدیت اور اس کی کامیابی کے لئے سوشلسٹ عہد کا قیام اردو تھا اور سوشلسٹ عہد کے دوسرے تمام مضامین سوشلسٹ عہد کے فلسفہ ہیئت

انگریز کے لئے لوہے کے سلفورک کے لئے گندھک وغیرہ

(۳) یہ ضروری نہیں کہ جو انگریزی الفاظ اردو میں لئے جائیں ان کو جگہ بگھما کر لیا جائے بلکہ ان میں اضافہ کر کے لیا جائے مثلاً جیٹس آفٹ وی ہائیں کو اردو میں جیٹس میں کہہ سکتے ہیں۔

(۴) سائنس کی کتابوں کا ترجمہ چونکہ انگریزی ہی سے کیا جائے گا اس لئے انگریزی الفاظ کا اردو میں استعمال ناگزیر ہے۔ بعض الفاظ ایسے ہیں کہ جن کے مترادف کسی نہ کسی صورت میں اردو میں پائے جاتے ہیں تاہم انگریزی الفاظ اردو میں منتقل کر لئے جائیں تو کوئی ہرج بلیکس مثلاً *specimen* و *specimen* وغیرہ

(۵) یہ بھی دہشت کی گئی کہ جہاں تک آسانی سے ممکن ہو انگریزی الفاظ کے استعمال سے احتراز کیا جائے۔ جو شخص کسی سائنس کی کتاب کا ترجمہ کرنا چاہتا ہے تو اسے چاہیے کہ اس سائنس پر کوئی اردو میں اس سے قبل عملی جائیل ہیں انہیں پہل نظر رکھے اور وہی اردو الفاظ اور اصطلاحیں استعمال کرے جو ان کتابوں میں استعمال ہوئی ہیں۔

(۶) اگر انگریزی جملے میں کسی ایسے واقعہ کی طرف اشارہ ہو جس سے اہل ہند واقف ہوں تو مترجم کو چاہیے کہ حاشیہ پر یا مناسب ہوتو متن میں مختصر طور پر اس کی تشریح کر دے۔

(۷) ترجمہ نقلی نہ ہو بلکہ اردو میں مفہوم ادا کرنے کی کوشش کی جائے۔

(۸) کیمسٹری کی اصطلاحات کو جگہ جگہ اردو میں لے لیا جائے۔ البتہ کیمیائی اصطلاحات کے نام اردو میں موجود ہیں تو انہیں برقرار رکھا جائے لیکن مرکبات کے نام انگریزی ہی میں رہیں جیسے *ایٹرو سلفورک*۔ *سلفورک*۔ *ایٹرو* وغیرہ۔

دہلی کالج نے اردو میں سائنس کی جو کتابیں شائع کیں ان کی اشاعت میں مسٹر تروس برنیل

کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ انہوں نے یہ کام سے پہلے یہ کام چھپنے سے پہلے شروع کر دیا تھا۔ جب سوسائٹی قائم ہوئی تو اس کا کام بھی کالج والے ہی کرتے تھے۔ وینیکل سوسائٹی برٹش سوسائٹی اردو سوسائٹی۔ لائبریری آف پمفل کالج وغیرہ سب اسی کے نام ہیں مسٹر تروس کے خلیفہ برٹش سوسائٹی کے نام ہیں جو ان کے پیچھے منوں میں بائیں تھے۔

اس سائنس کے قیام سے قبل دہلی کالج میں ترجمہ کا کام شروع ہو چکا تھا۔ چنانچہ اس کالج کے تین طالب علم (جن میں مسٹر اجڈریش بھی تھے) اوقات درس کے بعض لمحوں اور ریاضی وغیرہ کی کتابوں کا ایک ایک صفحہ اردو میں ترجمہ کر کے مسٹر تروس کو دکھاتے اور وہ اس ترجمے کی اصلاح کرتے تھے۔ اس طرح جب ترجمہ مکمل ہو جاتا تو طباعت کر دیا جیٹس کے جانتوں کے نصاب میں داخل کر دیا جاتا۔ دہلی کالج میں تراجم کی ابتداء مسٹر تروس ہی کے جبکہ مسٹر تروس کا تقرر کالج کی پرنسپل پر ہوا۔ مسٹر تروس کے نصاب کو دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ سائنس کی تعلیم کس درجے تک تھی۔ مسٹر تروس نے سائنس کی حاجت الگ قائم نہ کی تھی اور حاجت اول تا ششم کی اردو میں سائنس کی تعلیم دینا چاہتی تھی۔

غرض دہلی کالج ہی ایک ایسی درس گاہ تھی جہاں مغربی علوم مثلاً طبیعت، ریاضیات، فلسفہ وغیرہ کی تعلیم اردو میں دی جاتی تھی اور تدریس ہر سال اچھے رہتے تھے۔ چنانچہ مسٹر کارٹر پرنسپل دہلی کالج نے فری رپورٹ بابت مسٹر تروس سے لکھا ہے کہ

مشرقی شعبے کا طالب علم اپنے مغربی شعبے والے حریف سے سائنس میں کم نہیں بلکہ ہوا ہے۔ اس رپورٹ پر نقشہ کو ترجمہ ہوا جس طرح اظہار خوشنودی کیا ہے۔ طلبہ (محبوبہ مشرقی) کی سائنس کی ترقی کے متعلق

• علم مثلث کروہی کے تحت قائم الزاویہ مثلثوں اور غیر قائم الزاویہ کروہی مثلثوں کے سوالات حل کرنے کے طریقے بتا کر بیان کئے گئے ہیں۔
• تراشیں مخروطی کے تحت تین قسم کے خطوط کا حال درج ہے جن کو قریب البیضوی، بیضوی اور بعید البیضوی کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ اور ہر خط کے متعلق ضروری معلومات اور اشکال دی گئی ہیں۔

• علم حندسہ بالجبر میں علامات جبریہ کے تدریس سے مقادیر ہندی معلوم کرنے کی ترکیب، مساوات خط مستقیم و تراش ہائے مخروطی و غیرہ کا تفصیلی بیان ہے۔
• تینہ کی سرخی کے تحت قوس اور کرہ و مخروط کی مساوات کا حال درج ہے۔

• اس کتاب کا اسلوب بیان تعریفی ہے جو اس سے پہلے کی کتابوں کا ہے۔ عربی الفاظ کا جگہ جگہ استعمال ہوا ہے مثلاً: "صلی الاستقامت" فی البیت، "منقطع علی القاع" ماہین اور مستطیق وغیرہ دیکھا کو مانا، ہاتھ کو ہات، نوکارم کو نوکارم لکھا ہے۔

• صفحہ ۲۶ کے بعد کتاب کے آخری صفحات (۳۱، ۳۲، ۳۳) غلطی سے لگ گئے ہیں۔ یہ کتاب کتب خانہ جامعہ عثمانیہ میں نمبر (۱۰) پر رکھی ہوئی ہے۔

(باقی آئندہ)

خواجہ حبیب الدین

صحیفہ مشین پریس میں چھپ کر دفتر ادارہ
رفعت سنڈل زیریت آباد سے شائع
ہوا۔

• کہ اگر بروقت مطالعہ کے اس کی مطلب دیاس پر مطلع ہوں
تو اس خاکسار کی کم استعدادی پر نظر کر کے اعراض نظر اس
سے واجب جانیں
بیت
پیش کش گرہ خطائی درسی و علمہ مزین
کہ بیچ نفس بشر خالی از خطا و بود

یہ کتاب اپنے موضوع کے لحاظ سے بہت اہم اور
معیار کے اعتبار سے بلند پایہ ہے۔ اس صحیفہ کتاب میں مرتجم
نے بڑی محنت اور کاوش سے پورا مواد سنجی کر دیا ہے۔ ہر
مشکل کو نہایت وضاحت کے ساتھ سمجھا دیا گیا ہے۔ ہندی
اشکال اور مثالوں سے اس کی تشریح کی گئی ہے۔

• علم مثلث مستقیم الاضلاع بالہندسہ کے تحت جدول
مشکلی بنائے۔ در مثلثوں کے سوالات حل کرنے کے طریقے بتائے
گئے ہیں۔ علم مثلث مستقیم الاضلاع بالجبر میں جیب سنتی
وجیب التمام کے جدول بنائے۔ قریب البیض قائم الزاویہ
حادۃ الزاویہ اور منفرعہ الزاویہ کے سوالات حل کرنے کے طریقے اور
پیمائش مشکلی وغیرہ کے سوالات مع اشکال درج کئے گئے
ہیں۔ اس حصے کی ایک عبارت یہ ہے جس میں طالب علم کو تدریس
کے یاد کرنے کی طرف توجہ دلائی ہے۔

• اگر طالب علم خوب مہارت پیدا کیا جائے تو علم مثلث
میں اور خوب واقف ہوا جائے تو فوائد مہر توں مذکورہ بالا کے
سے اور بوسیدہ ان محدود توں کے اور محدودیں پیدا کرنے کی قوت
ماہل کیا جائے تو لازم ہے اسے کہ بہت شوق کرے اور ہر
قیمت جس تلاش و محنت کا اور کس کتاب مفید دلی کو خوب لے اور
بغیر اعانت کسی کے ثابت کرے۔

• اس کتاب میں جو سوالات درج ہیں ان میں سے
ایک کی عبارت یہاں نقل کی جاتی ہے۔
"مطلوبہ ہیں ہمیں تینوں مثلث ایک مثلث کے۔ چاہئے ہیں
ہم دریافت کرنا غلط نظر اس دائرہ کا جو بنایا جاوے بیچ اس
مثلث کے؟"

ترقی پسند فن کارے

اے ہم صنفیہ گو تری پرواز ہے بلند
میری نظر سے تیرے مقاصد نہاں نہیں
ہے تلخی حیات سے معمور تیرا جام
تیری خواہش میں جذب ہے آواز زندگی
دل تیرا کائنات کا آئینہ دار ہے
فطرت کو تو نے طرزِ تکلم سکھادیا
لیکن بتا، کسی کو ترقی ہے ناپسند؟
تیرے خلوص غم سے میں بدگمان نہیں
تیری نظریں میں قہر ہے بے بطنی نظام
تیرے تفکرات ہیں دم ساز زندگی
تیری صدا شگستہ دلوں کی پکار ہے
احساسِ زندگی کو ادب میں بسادیا

لیکن، سمجھ رہا ہے یہ سارا زمانہ کیا۔؟

”کہتی ہے تجھ کو خلقِ خدا غائبانہ کیا۔؟“

سن! میں بتاؤں اصل حقیقتِ غائب کی
وابستہ ہے جو شیشہ گراں ہنر سے تو
ریشاتِ فکرِ خام کا تو پرودا ہے
جو ٹپے تجھ کی عام ہوئیں ریزہ کاریاں
سطحِ ادب تباہی کی آماجگاہ ہے
تینگ آگئی ہے منکر فرومایہ سے نظر
فہرِس میں کرگسوں کے جوشا ہیکلِ ام ہو
مصور کر رہا ہے تجھے تیرا حسنِ ظن
ہے مضمحل ضمیر ترا قید و بند میں
اس طرح اپنے خونِ جگر کو تلف نہ کر
اور اہل فن کی برہی و اقبال کی
ہے دور دور اس لئے اہل نظر سے تو
بہل نگارشات کا خوداشتہا ہے
ااہلیت بھی زعمِ ہنر میں ہے سرگراں
اور خسارِ عقبتِ قلب و نگاہ ہے
ہے مرگ ذوق، یہ ترا اندازِ درگزر
چرچانہ کیوں ضمیرِ فروشی کا عام ہو
تو دل شکن نہیں، ترا عنوان ہے اہل فن
ناحق! سمجھ رہا ہے پسند ناپسند میں
فطری صلاحیت کے تحفظ پر کر نظر

”جس کی بہار تو ہو، یہ ایسا چمن نہیں
قابل تری نمود کے یہ انجمن نہیں“

ہر دور اپنے دور میں خود مجتہد رہا مقصد حیاتِ نو کا سدا متحدر رہا
فرق و تمیز رنگ و اثر ناگزیر ہے ہر ذوقِ تندرست، ترقی پذیر ہے
تابندہ یہ جو کاغذِ علوم و فنون ہے دیکھ، اس کے بند بند میں کس کس کا خون ہے
تیرے بیان، تیرے قلم کی ہے جو زبان وہ خود ہے انقلابِ مسلسل کی داستان
نقشِ دوام گرمیِ خونِ جگر سے ہے یہ ارتقاء، فن، تہ و تاب ہنر سے ہے
کسبِ کمال، سلسلہ، ناہم ہے معمارِ سلف کا تو قائم مقام ہے
امرا کاؤنٹات کا فن کار ہے امیں اخلاصِ عالمی سے ہے پیدا دم یقین
شاہیں کو احتیاجِ نشین، نہ انجمن ہے شاہِ باز کے لئے سارا جہا چمن
تو اپنی جاں نشانی کا عنوان بدل کے دیکھ !

جو ہر پیرا اپنی ندرتِ سنکرو عمل کے دیکھ !

بن کر صحابِ فیض، زمانے پہ چھا جا انسانیتِ نواز، ترانے سنائے جا
افکارِ نو میں وحدتِ نوعی تلاش کر اور سرمدی حیات کے امرا فاش کر
تیرا پیام سنکر و نظرِ عالمی رہے سررشتہٴ فروغِ عمل باہمی رہے
پیدا جہاں تازہ ہو تیری نگاہ سے روشن ہو چشمِ دہر تری جلوہ گاہ سے
والتہ تیرے دم سے ہے رنگینیِ حیات تیرے لہو سے گرم و رواں روحِ کائنات
احسان کر، رحونیتِ احساں کو بھولنا سوزِ یقین میں شہرِ ترازوں کو بھولنا

ذوقِ سفر پہ عشرتِ سنرل حرام ہے !

تیرا تو ہر مقام سے آگے مقام ہے !

بشیر البناکم بشیر

تو یا تو دروازہ کھٹکھٹانے لگی، اما کو زور زور سے آواز دیں
وہ۔۔۔۔۔ اما دروازے کے دھڑک رہی۔

”میری موتی شلوار کہاں لپٹ ہے؟“ اما کا رنگ
زرد پڑ گیا، بیچارہ ہنہار ہو کر دواڑے کے ساتھ لگ گئی و سیم
پھر زور سے چلائی۔۔۔۔۔ ”میری موتی شلوار۔۔۔۔۔“
اما نہایت نرمہ جھوپے میں بولی، ”بائی بیسے شام کیلے کپڑوں
میں کمال دیا جو۔۔۔۔۔ اسے سخت غصہ آیا، او۔۔۔۔۔
جھٹلا کر کہا وہ ضرورت میں اس کی موتی شلوار پہن
کر کے لائے۔

اما شلوار تلاش کر کے لائی تو گورا گورا نیم گلابی
بازو نکالی، شلوار کو پیرا لیا۔ و سیم کے ننگے بازو پر شلوار
رکھتے ہوئے، اما کے جسم میں ایک سرسراہٹ سی ڈوڑ
گئی، ”جیسے جیسے بی بی کے ننگے سے دو چار ہو گئی ہے!
شلوار نے گرد و سیم کو ایک لطیفان اور سکون حاصل ہوا۔
بڑا ٹھیکہ دوم سے گزر کر اما مسکراتی جارہی تھی سر پہ
پرچہ بٹنے، ”جی کر، جی کر، سب سہیلیوں نے پوچھا، و سیم کہا
سہ۔۔۔۔۔ اما کے چہرے پر ہر آنے دو وہ یہ کہہ کر
اوپر پرچہ کئی منہ و موتی شلوار پہننی باقی ہے!“

کچھ سی ان ہونے لگے تھے کہ و سیم کی موتی شلوار پر
پان کا داغ ایک لپٹ تھا، اور ایک کچھ اہل طرح سے گری
تھی کہ داغ اکر لیے پرواہی سے تھی دیکھا، اما نے نواگور
کا جھپٹا سا پتا معلوم دیتا تھا۔ و سیم پان کھانے کی ناوی
نہ تھی کسی نے دیکھا، اور وہ معلوم نہ ہو پا گیا تھی جب
داغ اس کی موتی شلوار پر پڑا تھا تو اسے اپنی قیمتی
شلوار کے خواب میں چوہا جانے کا یہ فیصلہ ہوا تھا۔ موتی
شلوار اسے اپنی بہادر شلوار کے ساتھ لے کر سرے بنات کی
شلوار سے بھی عزیز تھی اور وہ اسے اسی قیمت پہنچتی تھی
جب کبھی کچھ ضرور ہونے کی امید تھی، اس کی گئی تھی۔
و سیم اپنی سہیلیوں کے ساتھ، اما سے ملنے گئی تھی
سب باتوں سے تھکا تھکا، اما نے زور زور سے سب سے زیادہ

تازہ دم اور خوبصورت معلوم دے رہی تھی۔ اس کے چہرے
پر ایک ہلکا سی کھیل رہی تھی، سینا جانے اور گنڈا رہے
فلم دیکھنے کا احساس لے ہوئے نہایت خوش تھی۔
”اما نگہ جب آخری موڑ مڑا تو اس کی آنکھوں کے سامنے
بالوں کی ایک لٹ آئی۔ اس نے اس کو ہاتھ سے پرے
ہٹا دیا، اما بازاری آدھ رفت پر خیرانہ طور پر سمجھ نہ سکی
کرتے تھی، سب نے اس کی طرف دیکھا، ایسی طنز اور کٹھن چینی
دیکھ کی فطرت کے غلات تھی۔ دو بچے اور آٹھ لڑکیاں
دو آنکھوں میں مناشا دیکھنے جا رہے تھے۔ اس مختصر سے
قافلے پر ہر راہ گزری کی نظر پڑ رہی تھی، یہی بات و سیم کی
”کٹھن چینی“ اور طنز کا باعث تھی، وہ جاہلی تھی برقعہ اٹ
دے اور لے نقاب پر چلے، اور دیکھے کون اس کی
طرف دیکھنے کی جرات کرتا ہے۔

اما نگہ لٹ سے تھک کے سامنے آکر رہا۔ و سیم کو ایک
دسکا سا لگا۔ اس کے خیالات کا تسلسل رک گیا۔ وہ کچھ شوکا
ہو کر اتری۔۔۔۔۔ وہ سب خوش خوش ادھم چاتی اپنی
اپنی جگہ پر غائبیں اور لوگوں کا بڑے دل فریب زاویوں سے
مطالعہ کرتے تھیں۔ وہ ہر آنے جانے والے کا جائزہ لے رہی
تھیں۔۔۔۔۔ نفسیاتی لذت سے ہم کنار ایک ایک پر تنقید
کرتی تھیں۔ اس پکس بیٹھنے والوں کا بیٹھا دو سر کر دیا
تھا۔ ہر نگاہ ان پر اٹھ رہی تھی۔ ادھر نگاہ ایک خوش گوار
تعب ظاہر کر کے ایک دوسرے سے جگہ بدلنے میں مصروف
تھی۔ و سیم خوب بے تکلفانہ انداز میں کھل کر اپنی ”سٹ“ پر
بیٹھی تھی، اما سے ساتھ وہ ایوں کی حرکات سے کوئی سروکار
نہ تھا، اور نہ کوئی گہری دیکھی معلوم ہوتی تھی۔ اس نے اراتا
موتی شلوار کا داغ جس کا رنگ کچھ سیاہی مائل سا ہو گیا تھا،
بڑی احتیاط سے واضح کروا دیا اور کھٹکھٹا کر ان کے اوپر کر لیا۔
پھر خود کچھ ذرا متین بن کر جید گئی اور چرچا ہوں سے
ادھر ادھر دیکھ کر اس بات کا اظہار کرنے لگی، ”دیکھیں
آج سب سے پہلے اس داغ کا ذکر کون چیرتا ہے۔“

اپنی سرت کا اظہار دو مہروں پر ظاہر کرنا نہیں چاہتی تھی۔
پان کا داغ چھوٹے انگوڑے پتے کی شکل نہ تھا۔
اور ایسا معلوم دیتا تھا، جیسے چھوٹا بڑھانے کے ساتھ ہی
کسی نے وہاں اپنے کسی بچے نے کاغذ پر سیاہی لگا کر کاغذ
میں شکن ڈال کر ایک موبوہی شکل بنا دی ہے۔ آج پان
کے اندر وہ ابھی بیٹھتی چپ ساڑھے رکھی اور ہنسی ہنسی
کرتے لگی، مگر پان کا داغ کسی کی نگاہ کا مرکز نہ بن سکا۔
میں جب تانے کے پہلے گھوم رہے تھے، تو وہ ایک مضحکہ خیز
آزمائش میں سے گزر رہی تھی اس کا خیال اور نگاہیں پان
کے داغ کا پتھا کر رہی تھیں، اگر تانے کسی وجہ سے دھبہ
پڑ جاتا تھا، تو اس کا ہاتھ بغیر سوچے سمجھے رانوں کے
درمیان کھٹکھٹولنے لگتا تھا۔ انھیں بن بن کر ہنسی اور گم
ہوتی جارہی تھیں، اس نے ذرا تین کرناٹکوں میں اکرٹا
پیدا کر لیا اس کا ہر سانس تانے کی آواز کے ساتھ چلتا جا
تھا۔ اور وہ بسے پیار سے کبھی نینا سے اور کبھی روزا
سے لگ جاتی تھی۔

فلیم پوری رفتار سے سکرین پر چل رہی تھی، ہر لمحہ
ایک نیا منظر آنکھوں کے سامنے آتا تھا۔ ہر کوئی اپنے اپنے
ذائق کے مطابق مسرور ہو رہا تھا۔ ساتھ والیاں بھی کافی
سے زیادہ مطمئن اندوز ہو رہی تھیں۔ نیلن دیکھ کر خیالات
کا تسلسل ہر بار ٹوٹتا اور بنتا تھا۔ کبھی جیسے جیسے جاتی
لیجے لگتی۔ جیسے مٹھل ہوتی جارہی ہو، اور کبھی سیٹ پر
اپنا آپ پھیلادیتی، اور پان کا داغ نمایاں کر کے بیٹھ
جاتی۔

انٹرول ہوتے ہی اس نے داغ اور بھی نمایاں
کر دیا، داغ کو دیکھ کر اس کے اندر کچھ ہیجان سا اٹھ
رہا تھا۔ کاش یہ ہیجان طوفان کی صورت اختیار کر لیتا
اور اس میں وہ سیم بہ جاتی، یا کسی نے اس کے چہرے
کو مچھایا تھا۔ اور انہیں بندہ ہو جی معلوم ہو رہی تھی۔
جیسے سر سے پاؤں تک رطوبت لپٹنے لگی ہو۔

رہتا۔ نینا۔ بڑا اور روزا، اپنی اپنی صحن میں محو تھیں، وہ
محسوس بھی نہ کر سکیں کہ وہیم کیوں چپ چپ ہے، اور اس کے
خیالات اسے کہاں سے کہاں لئے جارہے ہیں۔
وہیم ان سب کے درمیان مبہولی مہالی لڑائی کی مانند تھی۔
اس کے سامنے وہ بہت سی باتیں کرتی ہوئی بھجک بھی
جاتی تھیں، اور جب کسی اہم بات سے انھیں لذت حاصل
ہوتی تھی اور وہ پروا داشتہ کر جاتی تھیں تو ایک دوسری
کو اہتمام میں لے کر کہہ لگتی تھیں: وہیم کو ان جہلیاتی بچا
سے باج کر کے کی ضرورت نہیں۔

وہیم اور اس کی سہیلیاں آج سے ایک ہفتہ پہلے
اسی ٹھیٹر میں ایک امونک فلم دیکھنے آئیں تھیں، وہیم نے
اس روز بھی جیو تیا شلوار پہن رکھی تھی۔ اور
پان کا داغ اس کی شلوار پر ایک شام پہلے ہی لگا تھا۔
آج سے ایک ہفتہ پہلے جب یہ جھنڈا کا جھنڈا اپنی اپنی جگہ
پر بیٹھا تھا تو سب سے پہلے نینا کی نگاہ اس پان کے داغ
پر پڑی تھی۔ وہ پان کے داغ کا ذکر کرتے کرتے اس کی ران
ہاتھ رکے داغ کو مسلتے لگی تھی، پھر دوسری اور پھر تیسری
اسی طرح باری باری سب نے داغ کو مسلا اور اس کا ذکر
کیا تھا۔ اور اس کی قیمتی شلوار کے خراب ہو جانے کا افسوس
ظاہر کیا تھا۔ جوں جوں اس کی موٹیا شلوار کے داغ پر بات
چلتی گئی، اس کی رانوں پر پہلے ایک پھر دوسرا اور پھر تیسرا
ہاتھ حرکت کرتا رہا۔ اس مسلتے اور حرکت کرنے سے اس کے
تمام جسم میں ایک نامعلوم سی سرسراہٹ رنگیتی رہی۔
وہیم چاہتی تھی، یہ سب کیسی ختم ہو۔ فلم بند ہو جائے لائٹ
فیل ہو جائے، پھر اس کے داغ کا ذکر چلے کہے اور مختلف
ہاتھ اس کو مسلتے رہیں۔ پان کا داغ دونوں رانوں
کے درمیان لگا تھا۔ نیچے سے تھوڑا کوئی باشت بھر بیٹھا تھا
تو اسے اندر کی طرف ہر کا کچھا دیتی یا اس روز وہ اپنی مڑتی
شلوار نہ پہنتی، داغ کی دہ سے اس کے جسم میں زندگی
کی بالیاں بھٹ اٹھتیں۔ وہ کسی صورت بھی،

عورتوں کی نگاہ پان کدواغ پر جا پڑی، داغ اس گھڑی کچھ براہمدار سامن گیا، پہلی نے دوسری کے چٹکی لینے ہوئے کہا: "بہی جو ہوئی، نادان ہی تو ہے۔" انجان پن میں خون کا دھبہ لگ گیا ہے غریب کے! انڈول کے بعد فلم پھر چلنے لگا، ہال میں اندسرا چا گیا تھا، اس کی آنکھیں بڑبڑا آئیں، وہ آگے کی طرف جھکتی ہوئی سگ رہی ہوئی، پیسے بالوں والی کرسی میں دھبہ کراپٹ آپ کو نہ، ناگ، محسوس کرسی ہو، اس کی چھوٹی چھوٹی چھائیاں سڈول اور تناؤ لئے ہوئے نیم گلابی سٹینر میں ٹھنڈی ٹھنڈی ہو رہی تھیں۔ خاکسوس اور گن — فلم تیزی سے چل رہی تھی! چٹائی

گم سم کچھ ضرورت سے زیادہ پیچھے تھی، بیٹی تھی۔ اور بازو دھیلے چوڑے کئے تھے، پیچھے سے روزانہ وسیم کو زور سے جھپٹا اور کہا: "سب تیری طرف دیکھ رہے ہیں، رات بھر جانتی رہی تھی کیا۔" تیرے جمائیل لینے کا یہی وقت ہے؟" وسیم کے ساتھ والی سیٹ پر دو عورتیں بیٹھی تھیں، ایک کی گود میں کچھ تھا، بچہ چاہیوں سے کھیل رہا تھا، دوسرے کو بڑے لاؤتے دیکھ رہی تھی، اسے متوجہ پا کر دوسری بھی دیکھنے لگی، دونوں وسیم کے بھولے پن سے نہایت متاثر ہوئیں اور اسے دو مردوں سے مختلف پایا۔

نویذ زندگی

منتخب لا جواب ہو جائے
جبکہ بیت عذاب ہو جائے
صبر بھی آب آب ہو جائے
ہر عمل کا میاں ہو جائے
دل بھی اک آفتاب ہو جائے
کام کو فی خسرا ب ہو جائے
دل کی حرکت رباب ہو جائے
فضل حق ہم رکاب ہو جائے
راز حق بے نقاب ہو جائے
پاک فرد حسرت ہو جائے
ورنہ جینا حباب ہو جائے
ہر سکون اضطراب ہو جائے
زندگانی سرا ب ہو جائے

جب نظر انتخاب ہو جائے
زندگی کو بھی جی سکے بتلا دے
ضبط کر یہ جو گرا تو ایسا ہو
عقل و تدبیر کے تعاون سے
روشنی ہو وہ حسن ایال میں
یہا آغاز ہو بھلائی کا
گوں اٹھے صدائے حق اس سے
عزم راسخ ہو جس کی فطرت میں
گر تو پا جائے نفس پرست ہو
گر بڑے اشک انفعال اگر
سے عمل ہی میں زندگی کی بہت
گر تو سمجھے حیات کا مقصد
نہ ہو گر نموجون جو اہفت و دست

تیری فطرت میں تھا یہی روحی
شاعر بو تراب ہو جائے

”روحی“

جھکیاں

میں گشت کا فنیہ آن کی آن میں ملے، تھکے اور ہنسنے کی چھایا۔
اور اب نقطہ کی جگہ۔۔۔۔۔ گوری گوری چھٹی رنٹ،
چوڑا تھا، کچنی ہوئی مینوس، کسی قدر چھوٹی لیکن تارہی
روشن پھیں کلب و نظر کو براہا ہیں۔ تنگ دہانہ، گلاب
جیسے ہونٹ ان پر ادوی ادوی مٹی کی دھڑی، گالوں پر
چلتی کاکیں، آڑی انگ، ناک میں جھل جھل کرتی ہیرے
کی کیل، سونے کے سینکڑے جڑاویں کر رہی ہیں، بات کچھ جڑاؤ،
پاؤں میں پازیب۔ ہوتا یہ رنگ کی بڑے بڑے رپیلے پھولوں
والی ساری، اسی کا جھیر۔۔۔۔۔ اجلا اجلا فرش، فرش
پر قالین، دیوار سے گاؤں کی لگا، اور یہ اس سے تھک لگا،
بیٹی میں، سامنے کٹاؤ پاندان، اور غرام دان، اور گالا
سرا پھر خیام کی رابی، بھر پور جانی، تیز دند، شرا بہ خود
ہی بدست و سرشار۔ پاس ہی ان کی راز دار سہلی خیر
بہٹی ہیں۔ چہرہ مہر، بالکل عین میں دیا ہی۔ بہن کو تو
کسی کو شہ نہ ہو سہلی کو تو نہیں کھانے پر کوئی یقین نہ
کرے۔ ہاں ایک ذرا ان میں لیکن پیٹ میں گن بھرے
ہیں، ہیں شیطان کی خالہ آفت کی پر کالہ، جتنی ہیں بڑی
معصوم۔ کچھ راز کی باتیں ہو رہی ہیں، دھیرے دھیرے
کہ کسی کو جھینک نہ پڑا ہے۔ ہونٹوں پر مسکراہٹ اور آنکھوں
میں شہرت لٹ رہی ہے۔۔۔۔۔ ٹن ٹن،
سویکل کی گھنٹی نے اپنے مخصوص بول بکالے اور انھوں نے
خیر کچھ سے اشارہ کیا۔ کمرے کا وہ دروازہ دھیرے سے
بند کر دیا گیا جس کے بند ہونے سے یہ حصہ مکان سے بالکل
مطمئن ہو جاتا ہے اور پھر یہاں کیا کچھ نہ ہو جائے کسی کو خبر
ہیں ہوتی، مجھے دیکھتے ہی مرد و قدامت کھڑی ہوئیں، سر پر
آنکھ ڈال لیا، منہ پر ہار چھائی، آنکھوں میں جالوٹ
گئی اور گالوں پر سرخ و زلفی۔ گردن خم ہوئی، پیچھے مرانا
پریشانی تک پہنچا۔ سلام کرتی ہیں۔ میں کچھ کہہ بھی
نہ پایا تھا کہ بولیں، سر تاج راہ، دیکھتے دیکھتے انھیں پتھر
گئیں آپ تو دھڑکی گئے اپنی کنیز سے، یہ سریلے بول،

بڑے بڑے آتا جاتا ہوں، کھینکتے کھینکتے طبیعت اچٹ
جاتی ہے، باغی ٹھکانا، کوئی چاہتا ہے تو سونے کے کمرے
میں در آ جاتا ہوں اور دھڑا دھڑا سے بستر پر چاروں طرف
چٹ کر اس کا بازی۔ جے تھا قب کرنے والے خیالات کے
ہجوم کو دھکا سالے اور کچھ دیر کے لئے ان سے خیانت
پاؤں۔ چٹ لیٹ کر جھٹ کی باتیں کھینکے لگتا ہوں۔ گوم
پھر کر نظر ایک جگہ ایک سی جاتی ہے، کڑی کے بالے میں۔
ہمین ہمین سا زناڑ پلا پلا، اجلا اجلا جال۔ جو
لرز لرز کر، تھک تھک کر اور زیادہ حسین اور جاذب نظر
ہو جاتا ہے۔ بیچوں بیچ جیسے ڈرائنگ روم ہوئی مگر
بیٹی ہیں۔ بے دھنکی سی مکر وہ لیکن اک ذرا چمک دار۔
کڑی پر نظرس جم جاتی ہیں۔ اگرچہ کرشمہ دامن دل
کی کشکدہ جاں راست، کا معاملہ نہیں لیکن اس محسوس
ہونے لگتا ہے کہ کڑی کی قوت ارادی نے میری آنکھوں
پر جادو کر دیا ہے کہ جتنی جانتی ہی نہیں، جھپکتی ہی نہیں، میری
ساری حیات باصرہ میں سمٹ آتی ہیں اور کڑی پر مرکز
ہو جاتی ہیں۔ کڑی پھیلنے لگی ہے۔ کبھی بالانظروں
سے اوجھل سا ہو جاتا ہے، کبھی کڑی پھیلنے پھیلنے جالے
سے پرے نکل جاتی ہے اور صرٹ کڑی ہو کر رہ جاتا ہے۔
پھر کڑی سٹھرتی گئی ہے اور ایک نقطہ ہو کر رہ جاتی ہے۔
نقطہ، موٹا، بارک مہین۔ اپنی تمام تر معنوی و صوری
کیفیات و تعریفات کا حامل۔ چمکتا ہے، جھلکتا ہے، لڑا
ہے، دھم پڑتا ہے۔ روشن ہو جاتا ہے، ڈوہتا ہے اور
ابھرتا ہے۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے نگاہوں سے اوجھل ہو جاتا
ہے۔ جالا پھیلنے لگتا ہے، لرز لرز کر، چمک چمک کر بے نام
نقوش بننے لگتا ہے، ابھرتے اور دھندلاتے ہیں، نقطہ
میں حرکت سی ہوتی ہے اور جھپک سے روشن، جیسے

برابر کچھ کہہ سن لیں سبیکل رکشا کے بارہوی۔ باز وہ کہہ رہی تھی۔ ہٹا دیا گیا، بالکل نظر کے سامنے نہیں جیسے اگلے دنوں کی جان پہچان ہے۔ اسی ہی بات نظر میں جلا دیں تو کیا سن پہچان ہی ہوتا ہے، اس کی نظریں نہیں چمکیں۔ سلام و تعارف کی ضرورت ہی کیا۔ انسان ہی کہہ دے تو ہیں۔ کہنے لگیں "تو آپ کا نام....." میاں نے کہا

میرا پکرا یا۔ یا اللہ یہ تو دنیا دہی معلوم ہوتی ہیں میل خیال شائد صبح ہو، ہونہ ہو، جو بے ہی ہو۔ جیسے سال پہلے کی بات ہے کہ پیک بڑی تھی یہی اسی اوجھل ہوئیں نظروں سے کہ جیسے وجود ہی نہیں ان کا۔ کہ یہیں نہ آتا تھا کہ وہی، میں کہ کوئی اور۔ ایک نقشہ، بات بیت کا انداز آواز بالکل وہی لیکن وہ دروادی دلی نازک اندک نہیں۔ ابھن بڑی جلدی تھی۔ میں نے بول کھلا کہ جواب دیا "جی ہاں" لیکن اب وہ ہنس رہی ہیں "یہ شائد نہ معلوم ہو سکے آپ کو" میں اور بول کھلا کیا لیکن مسامتہ سے کہا "اچھا تمہیں فدا بل کھاتے ہوئے جواب دیا" تو کیا خدا کی ظلم ہے آپ کا بے ٹیلے۔"

میں نے کہا "تو حاضر ہوتا ہوں پھر" اب وہ پکرا ئیں، اس چڑھار کی طرح جس کے لیے وار بائس میں چڑھایے چٹے پیر پیرا کر نکل جائے۔ سر کا خیال رہا اور نہ راہ کیوں کا "چلائیں" سنئے تو..... اے صاحب..... میاں! ایک ذرا سنبھلے تو بائیں میری بات لیکن ہم پلٹ چکے تھے۔ نام معلوم کرنے کی دھن سوار تھی یہی رشتہ نگ کی دوکان پر پہنچے، کیاں عزت تھے نام معلوم کرنے کے لیے دیر نہ لگی۔ وہی نہیں جن کا شبہ تھا۔ واہ ری عورت، وہ دن گئے کچھ بچی جاتی تھیں، سامنے کی طرح چوٹی رہیں تھیں اور ہم جھانکے جھانکے پرتے تھے کہ آپائیں گی تو کیا کہیں گے! وہ دن ادا آج کا دن۔ دنیا ہی بدل گئی۔ کیا ہی عورت کی نفسیات ہے اور ہی اس کی محبت کی طرف بڑے قوططے کی طرح آنکھیں پھیلے اور پائیں

کاؤں ہی میں نہ پڑے دل و روح کی گرا نیوں میں بھی سنا گئے۔ ترنہ، شہریت اور نقوش بھی ٹوٹا گئے تھے۔ لیکن ہونٹوں کی مسی، پور پور ہندی اور لکھی کی کالی پتہ پر نظر پڑتے ہی دل سن سا ہوا۔ صغرا کی تو شادی ہو چکی۔ ابا! اندھا پار اچھانے لگا آنکھوں میں۔ جب تیار کی ہیرے و ہیرے چھٹ گئی اور اہلا فرش، ایرانی قاتین کٹاؤ پا زبان، سرو قامت نکلتا جسم، دکتے عارض، گلا ہونٹ تحلیل سے ہو گئے کسی کی ادھٹ میں تو اسی ادھٹ میں وہی نقطہ ابھر نہ لگا۔ باریک سا، ہین ہین، چمکتا دکھنا، اجڑا ڈوٹیا۔ پھر وہی کڑی کا مال، کڑی کریمہ منظر چلتی، دکتی، اچلی اچلی میٹائی مکاری۔

پھر نظریں جھنڈے لکھیں کڑی پر پھر نقطہ سا بننے لگا۔ وہی ڈوٹیا، اجڑا، چمکتا، نہ نقطہ، چمکا، ڈوٹیا، ابرا اور پھر غائب۔ اب جو ابرا تو پھینچنے لگا رکشا کے بلے رنگ پھینچے، ابھرے، پھیلے، سٹے۔ رکشا حرکت کرنے لگا۔ چھر چر ابدن، مہانہ قد، ٹھوٹا، ایک نقشہ، نیکیے خط وصال، بڑی بڑی باوادی آنکھیں، گھٹی ہلکوں سے ایسی جھانک رہی ہیں جیسے پہاڑوں میں جھڑا جھل جھل کر رہا ہو۔ پھنچیں، شروع پنچل جیسے کچھ کہہ رہی ہوں، کچھ گنگنا رہی ہوں کچھ یاد دلاری ہوں، بھولی ہوئی کہانیاں۔ کاؤں میں میں صرف لیے لیے ایک گے میں چند دن ہار ہاتھ میں دو دو چوڑا بان، تنھی سی سہری گھڑی کلائی پر۔ سہری نہالی ساری لپٹی لپٹی سی، چت بلاؤ، ایسا کہ سینہ دھڑکا، ہر نقوش ادھارے واضح اور جاذب نظر ہو گیا ہے۔ آواز بھاری بلکہ ٹوڈرین اگر لہجہ نہ ہو تو درکار آدھی نہ پہچانے کہ مرد بولا کہ عورت۔ رکشا میں ابلی تنہا بہ تقدیر پہنچے کا پردہ ایک طرف سے کھلا، ایک لمحے کو پھینک نہیں۔ پردہ اٹھا، آنکھیں ملیں، کچھ کہہ لگیں، کچھ یاد دلانیں کچھ جھلا لگیں۔ پھر ایسے ہی یہ چلے گراؤ ڈنڈے، وہ بارہ در، سلکٹ ڈاکٹر نیچے دھکیلی یہ سامنے نیپل رہا۔ اب کی دیکھا تو آنکھیں کہہ رہی ہیں چلاؤ

ہوتا، جانے کیا بات ہے۔۔۔۔۔ ہاں تو وہ بیٹی ہیں۔
 ہاتھ میں "سب کس" ہے۔ میں ان کے سلیٹیوں کا خلاصہ
 بنارہا ہوں۔ پڑھتے پڑھتے بولیں "اللہ یہ کیسے نکلتے
 ہیں آپ، ہمیں بھی لکھا دیجئے نا" میں نے جودیت کیا
 تو اجازت لے لی ہے اپنی اماں سے۔

تکلیف لگیں۔ چہرہ پر ہوا سا اڑنے لگیں، ہنٹ
 خشک ہونے لگے، کھسیانی ہنسی، ہنسنے آجھ میں آنسو بہ
 آئے، کہنے لگیں "میں ہندوستانی لڑکی ہوں۔۔۔۔۔ اور
 اسی کو بنا رہی ہوں، کیوں اس سزا کو چھوڑیے گا بس میں
 فساد کے مولا کچھ نہیں۔۔۔۔۔"

میں نے کہا "جی ہاں اور دنیا کو فریاد کی ضرورت نہیں۔
 وہ رونے لگیں، گنگا جمنابلی پڑیں، چکیاں بندھ
 گئیں۔ کانوں کے ایرنگ پٹنے لگے۔ سترے ایرنگ کاری کے
 جال دانے، باریک باریک مہین مہین دھکنے سے جال جھلکا
 بیچ کر دی۔۔۔۔۔ میں سوچنے لگا۔ لڑکیاں بھی تو بس کر دیں
 جی ہیں۔ ناؤ، ناؤ کس، چکلی، بکری، دلی، موٹی، چکلی
 شوخ بے آزار اور بس جی۔ کوئی موٹی یا چکلی ہے، کوئی
 گھات لگائے بیٹھی ہے اور کوئی جھپٹ چکی ہے شکار پر۔
 کوئی تلم کے زور سے جال پھیلا رہی ہے، کوئی مرز پر طنز کرکے
 لیس ہو رہی ہے، کوئی کہتی ہے "اگر میں مرد ہوتی۔۔۔
 جیسے ہم نے بڑا تیر مارا مرد ہو کے اور جو وہ مرد ہو میں تو
 سارے جہاں کے مردوں کی کڑوریاں دھو ڈالتیں۔
 گارش کوئی انھیں سمجھائے۔ ماں، بیوی اور بہن تئیں تو
 سب کچھ بنائیں، مرد کی سادی "مردانگی" قربان ہے تم پر
 لیکن یہاں تو "ہلین"، کلیو پترا، قرۃ العین اور رادہ رانی
 کی کمی نہیں۔۔۔۔۔ اتنی لڑکیاں۔ اور کڑیاں بھی تو جانت
 سجات کی ہوتی ہیں، اہلی اجلی، لال، لال، ٹیلی، ٹیلی،
 موٹی بے آزار اور نہرہی۔۔۔۔۔"

بالوں کی ننھی سی لٹ پھلی اور کانوں پر کھڑکی، ایرنگ
 کو گھیر لیا، اپنے زنجیرے میں لکھو اس انداز سے جیسے دانشمن

پا ہے تو قدموں پر گر پڑے، لاکھ بھاگے پر پھینکا پھوٹے
 انجن پڑنے لگی، تارکی سی چھانے لگی۔۔۔۔۔ بیسویں لفظ
 تھرکتے تھرکتے نا چنے لگے اس تارکی میں۔ آن کی آن میں سب
 ڈوب سے گئے اور صرف ایک نقطہ رہ گیا وہی تھرکتا، چمکتا،
 ابھرتا دھرتا۔۔۔۔۔ پھر وہی جال تھا، وہی لڑکی، کرہ نظر
 ٹیالی چمکی کر دی۔

پھر نظروں میں گئیں۔ نقطہ سا بننے لگا۔ ڈوبا، ابھرا
 چو کا پھر غائب۔۔۔۔۔ وہ سہلے بیٹھیں ہیں، لگد لگد، جھج
 بولسا تو، سافٹو سلفی رنگت، تکیے خط وخال، بڑی بڑی شہر
 انھیں، لمبی لمبی پللیں اک دم اموٹے ہوٹ ادوے اودوے
 طبقاتی چہرہ گال پر دو جا رہا ہے۔ اودی تو کی سفید سفید رہا
 سادی، اسی رنگ کا کرتا، چھوٹے داموں کا، پٹ ابرے
 ہونے۔ پورے سینٹ پیٹس پینے، گلابی میں چنت، اردہا
 چوٹیاں، دانوں میں بیسی تن کی بھلی ویسی جی من کی لیکن
 کٹھن کے کان موم کی ناک، انا اور بہن نے بدھ رہا موم
 لیا جاتی ہیں کہ بہن ڈنک، اری ہیں لیکن یہ سکراری ہیں۔
 کچھ من کی کڑو کچھ سوادت، ہندی کا گھونڈ، استانی ہیں،
 انھیں سے گھر چلتے۔ ماں بڑی بیٹی پر بھی جاتی ہیں۔ دار
 تیار ہو رہے ہیں، چھنے چلو بیٹی میں چلو، انھیں کوئی پھٹا
 نہیں لیکن کیا حال کہ چٹائی پر کوئی لی تک آجائے۔ بلند
 بظاہر خود بھی شریک ہیں اس لاڈ میں۔ جو کھلا دیکھا لیا، جو
 پسند آیا، بہن لیا، نہ ٹھو کہ شکایت لیکن اندر والا ہی تو
 مانے، کھلی جاتی ہیں اندر ہی اندر۔ بایں کاس ہے، ماں
 کہتی ہیں، ابھی سچ ہے اور یہ دل پر پتھر رکھے چپ۔۔۔
 کوئی سمجھ جاتا ہے، لیکن یہ نہیں بولتیں، ماں کو جو پسند ہیں
 اور ماں کو کیا پسند ہے یہ خود انھیں بھی نہیں معلوم ستار
 خاندان کے سلی جھول مشہور ہیں لیکن یہ ادھر چپ اور وہ
 ادھر خاموش۔ جانے کب چھوٹے یہ جوالا کھی و پیام سلام
 بس انھیں کی زبانی، اللہ اللہ خیر صلہ۔ وہ جا رسال لے
 انھیں پر ادھر کھائے بیٹھے ہیں ادھر ان کا بچا کچھ نہیں

اور کبھی ادھر کہ جیسے کہتی ہو ہاری ماؤ، ہم تمہارے لیڈر
میں۔ لیکن وہ پھر بھٹانے لگیں جیسے کہتی ہوں امن کی
سنو میری اور آؤ۔۔۔۔۔ سر۔۔۔۔۔ ہوا کا تیز جھونکا
آیا۔ دھڑل سے دروازہ کے دونوں پٹ کھل گئے اور
پردہ لہرا کر بھٹ کو چھپنے لگا۔ آن کی آن میں جالا ٹوٹ
گیا۔ کڑی فرش پر گر پڑی چڑیا نے بھٹ سے ایک سیاہ
بگڑے ہوئے جال ایک سرا ہوا میں لہا کر عجیب عجیب
اور نقش تیار ہاتھا۔ رام راج کا نقشہ، پاکستان کے حدود
سکھستان کی سرحد، گاندھی، جناح، دیول، کرچی، برلا
کے کارٹون۔ دھیرے دھیرے یہ نقشہ دھندلا سے گئے
جیسے ریڈیو پر کسی فوج میں آواز میں منظر میں ڈوب جاتی
ہے اور نئی آواز نئی تان چھا جاتی ہے۔ ننھے ننھے سبز
طلی رنگے جھنڈے لہرائے، ان سب پر سرخ پرچم سایہ سایہ
کئے تھے۔ آسمان سے باتیں کر رہا تھا اور ہوا میں گڑا سٹ
بھر رہا تھا۔ اسے چائیس کڑوا ہاتھ تھامے ہوئے تھے مزدور
اور کسانوں کے ہاتھ ہماری بھر کم اور مضبوط۔ میں پلنگ سے
اچھل پڑا۔ جالا لہرا لیتا ہنسنا کی شکل بنانا نہ دیا میں تیر رہا تھا۔
میں لگھلگھانے لگا۔
”جب دست و قدم آگے بڑھیں گے چائیس کڑوا سٹوں کے“

حسینی شاہ

محبت کی چھاؤں :- مرزا ظفر احسن صاحب بی آ کے چودہ افغانوں کا دھچپ مجموعہ ہے۔ اس کے کلمہ افغانی
عشق و محبت کی دولہ انگیز لبوں اور حسن و شباب کی رعنائیوں سے معمور ہیں۔ ہر شانہ میں خیال کی جولانیاں اور مشاہدات
کے تاثرات کا لہر ہے۔ ذوق انوں کے نصب العین معاشرہ کی کئی تصویر اور مصروف زندگیوں کے لمحات فرصت کے لئے
ایک شائستہ ذہنی تفریح ہے۔ اس کا سینہ و قیل سرورن دیکھتے ہی اس کتاب کے بے باک اسلوب اور اس کے افانوں کے
بے پناہ شوخی کا اندازہ ہو جاتا ہے۔

چھوٹی تقطیع (۱۲۲) صفحات قیمت مجلد چھ

طالب علم ہندوستان کا نقشہ آمار نے کی کوشش کر رہا ہو۔
مجھے ایسا محسوس ہونے لگا جیسے یہ کالا زنجیر، یہ سبز اجال
اور کڑی سامراج، لیگ و کانگرس اور ولی والا صاحب
ہیں اور چائیس کڑوا کھپاں، پڑھو کی اس دہرے جال
میں پائیس بھٹنا رہی ہوں۔ کچھ دم قورچی ہیں۔ جیسے
جلیان والا باغ کے شہید اور کھوکے چار کسان، کچھ سوکھ
بچہ میں صرف پڑھ رہا ہے۔ جیسے جنگال کی دلاک
فائق کی شکار جتنا کچھ خیر جان میں جیسے ہم اور آپ مزدور
اور کسان لیکن ان کے لوگے ہاتھ بچھے ہوئے ہیں، ٹھہرا
کسی ہوئی ہیں، ہنسی ہوئی آنکھوں میں خون اتر آیا ہے
زور و چہرول پر عزم کی ہیبت چھائی ہوئی ہے۔ کیا ہوگی بھٹنا
میں خود ہوا۔ حرکت تڑپ اور ایک جھکنا۔۔۔۔۔ کڑی
ہینچے آ رہی جال ٹوٹ چکا تھا۔ سنہ راہی ساہمی، اور کھپاں
آزاد بھٹنا چٹا اور بڑی۔ میں چونک سا گیا۔۔۔۔۔
ہانسون میں وہی جالا تھا، کڑی بچوں بیچ بیچ ہوئی تھی۔
سامنے دو کھپاں، ایک ذرا بھوری اور دوسری سیاہ
ایک دوسرے سے گتھی ہوئی تھیں۔ اڑتیں، بھٹنا تیں
گتھ جاتیں۔ اب کی بہت دیر تک گتھی رہیں، پھر بڑی تیزی
سے الگ ہوئیں۔ سامنے ہی جالا تھا، دونوں میں چمک
سی لگیں۔ کڑی نے حرکت کی کبھی ادھر کو اور

عقد و شادی — یہ سب غور فریب دنیا کے ظاہر و محسوس
ہیں۔ روح تو منک ہو جاتی ہے۔ بہت پہلے ہی —
میں کیا کروں گی اس سنا رہی رہ کر — خیر و شر کے
بغیر زندگی۔ موت کیوں نہ کہوں اس زندگی کو غرض —
آئے جانے والے خیالات تھے۔ اور رضوانہ کی مصطفیٰ نے
راتیں، اس کی زندگی کے پرمقصد سے دن — یہی
سوچتے جیتے جاتے۔
خیر و شر کی ہم سب کو کم کھن — تھی۔ ایک طرف عزت و
شہرت جیسے انمول راز تھے۔ دوسری جانب محبت
جس کی آج تک کوئی قیمت ہی نہ لگ سکی۔ زندگی کے اس
دور اس پر اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ دو کون سا رخ اختیار
کرے۔ محبت کی موڑ پر صرف رضوانہ تھی۔ — یکہ و تنہا —
ایک دولت بیدار لئے ہوئے۔ عزت و شہرت کے رخ پر
ساری دنیا تھی۔ دنیا والے تھے۔ سماج کی محنت پس نظر
تھیں۔ ملک کی امیدیں تھیں۔ قوم کی آرزوئیں تھیں —
وہ اب کرے تو کیا کرے۔ بڑی بے بسی کا عالم تھا۔ اس نے
جیسے اپنی سوچ بوجھ ساری ٹھوکی ہوئی ہو۔ اس نے سوچا محبت
تو کیا۔ وقتی جذبہ ہے۔ جہاں عقل کے پاساں نہیں آسکتے
یہ وہ مقام ہے۔ یہ محلو جیسے مادی سلگتا ہے، اس سے بڑا
بڑی ہستی سے بچ کر بھی جاتا ہے۔ ٹھنڈا بھی ہو جاتا ہے۔
غصہ مٹا کر جب پوری ہو جاتی ہے، تو پھر کبھی نہیں جیتا
نہاں میں رہتے دو اس شر کو یوں ہی — سیکھتے — جیتے۔
پھر اس نے یہ بھی تو سوچا۔ موت کی آنکھیں میں
آنکھیں ڈال کر دیکھا۔ کتنی حیرت آنکھ پر کھڑی ہوئی محبت
توٹ جاتی تھی ہے۔ لیکن اس انمول موت زندگی میں بار بار
نہیں آتا۔ نہ جانے ہر کب جنگ چھڑے۔ شاید بوڑھا بھی
ہو جاؤں اس وقت تک جو ان کا مقصد اس سے بہتر کیا
ہو سکا ہے کہ ملک و قوم کے فوائد کے لیے چروں میں جک
ویں — ان کے مقابلہ میں کیا ہے یہ زندگی —
یہی محبت — اس کی حفاظت میرا دل کرتا رہے گا۔

کل شادی ہو جائے گی۔ اور پرہیزوں — خیر و شر
کی جانب قدم بڑھائے گا۔ بڑی مصوم و حامی شادی
ہوئی۔ ایک جنگ پر جانے والے دو لڑکے شادی شادیوں
میں ایک ٹکٹین سافٹ بھی چھپا چھپا تھا۔ جس کو کسی اور نے
نہیں۔ صرف رضوانہ کے دل کی دھڑکنوں نے سنا۔ زندگی
سنو رہی تھی بگڑنے کے لئے۔ قسمت کا ہندسہ دو دنوں کو
ایک ہی دھاگہ میں باندھ رہا تھا۔ لیکن مدائی کا عقل
جان بوا طور پر روح فرساتھا۔ کہاؤں کی کثرت تھی۔
اس کی جان بازی نے اس کو ہیر و بنا دیا تھا۔ اور اس ہیر و
کو دیکھنے ملک کے گوشے گوشے سے محبت ملی آتی تھی۔ پھول
کے ہاروں نے اس کے قدم قامت کو ٹھک بٹھکایا تھا۔
بس کہ میں ہم اک بہار، انا کے مارے ہوئے
بلوہ گل کے سوا گرو اپنے دھن میں نہیں
پھولوں کی زبان کون کہے۔ پھول سے پھول کب کہہ
تھا۔ لیکن کیا —؟ شادی کے فتوں میں امام خاں نے بھی
تھیں۔ حیرت جان کی تعویذیں بھی تھیں۔ غرض دوسرے ہی دن
خیر و رواں ہوا۔ اس کے پیچھے کیا ہوا۔ یہ ایک لیلہ شدہ امر ہے۔
اور اس کا اعادہ ایک دور از کار کی بات — ادا ہوئے
سال، ایک دو تھیں، چھ سات سال گزر گئے۔ آنکھیں پتھر
کیں سے

نئے شروہ وصال نہ نظارہ جمال
دلت ہوئی کہ آشی چشم و گوش ہے
تین چار سال تک تو خط آتے رہے۔ اس کے بعد موت۔
افراہیں درود و بار سے سرگوشاں کرنے لگیں۔ جا پانی قیدی
بھی آئیں آتے آزاد ہو سکتے ہیں خط لکھیں۔ وال تو
بات پر زبان گھٹی ہے۔ کسی نے کہہ دیا زندہ ہوتے تو
خط لکھتے۔ غرض بے پروا ہوتے۔ ہوشیار تنقیدیں عقل کی
بارگاہ سے جنگی ہوئی عقل ادا نہیں۔
رضوانہ جیسے جیتے ہی مر چکی تھی۔ اس خبر نے اس کی
رہی تھی دنیا بھی لوٹ لی غم کا پناہ ٹوٹ پڑا تھا اس پر لیکن

میں نہیں۔
 رضوانہ ایک مجرم کی طرح زندگی بدمعاشی رہتی ہے۔ ہنسنا پڑتا
 تو وہ بھول ہی چکی تھی۔ اس کے منہ سے — سات سال
 ہوئے انھیں وطن ہو کر۔

یہ نام نہاد دنیا دکھاوے کی شادی ہوئے ۶ ماہ گزرے
 پہلے کے کہ جبکہ امن سے بدل گئی۔ ماں باپ کے دلوں نے باغ
 اٹھے۔ تہ نئے خواب، اپنے اپنے لڑکوں کی واپسی کا
 حسین خیال ان کے دل و دماغ کی پال دوٹیوں میں گھومتے
 خسر و کے والدین کی تو اس ٹوٹ چکی تھی انھیں وہ
 اب کسی کا انتہائی رشتہ تھا۔ اسی بناء پر رضوانہ خود کی تنہاؤں کی
 جھینٹ چڑھادی گئی تھی۔ باوجود انکار اور جدوجہد کے اس کی
 ساری انتہائیں ٹھکرادی گئیں۔ زبان رکھتے ہوئے بھی اس
 اس قسم کا سلوک جیسے بے زبانوں سے ہوتا ہے۔

مندانہ ستانی لڑائی کی تنہا اس کی اپنی تنہائی کی ہوتی
 ہے اس کے رمانوں سے توجہ اکھلا جاتا ہے۔ اس کے اپنے
 دل میں، اس کی اپنی خواہش، تو کوئی چیز ہی نہیں ہوتی۔
 اور چہ فتنہ نگاروں کا فتنہ ہے کہ عورت بے وفائے مکر
 ہے۔ اس کا ظاہر و باطن یکساں نہیں۔ اس کی ات کا
 کیا جو وہ خیر — رونا اس کا ہے کہ قلدشمن کے
 ہاتھ میں ہے۔

ع۔ کوئی چارہ ساز ہوتا کوئی ٹھکانا ہوتا
 لیکن اس کی تو آرزو یہ رہ گئی۔

خسر و لاکھوں تنہاؤں کی دنیا کا سہارا لے رہی
 وطن واپس ہوتا ہے۔ وہ جیتا جاگتا ہے۔ قبیح و سالم ہے۔
 رضوانہ اس کے مدد و تحیل سے ایک ٹھکانہ ٹھٹھکی ایکٹن
 یہاں اگر اپنے جمن حیات کو بچانے کی دست بردوسے پال
 ویر باد و کچھ کر اس کا دل اس کے قابو میں نہیں رہتا۔
 سارے گھر پر رونے سی چھا جاتی ہے۔ والدین کے
 دلوں میں اب کس قسم کی انگلیں ہوں گی؟ رضوانہ کے
 قلب کی بے پناہ دھڑکنوں میں کس نوعیت کی کیفیت کا

انسان میں برواشت کی قوت پیدا ہو جائے تو ہر ٹری کی
 جڑی مصیبت بھی اس کی پہلوں کے آگے اپنا سر پھل کر رکھ دیتی
 ہے۔ مصائب و آلام خود اتنے خوفناک نہیں ہوتے جتنا
 ان کا خیال ہوتا ہے۔ بہادری و شجاعت صرف مرد کی
 میراث ہی نہیں۔ یہ عورت کا بھی جوہر ہے۔ ایک نرول
 عورت ایک سطحی و جانباز عورت کو کیسے جنم دے سکتی ہے۔
 رضوانہ نے جہاں اس کی جدائی گوارا کر لی تھی۔
 اب اس کی واپسی کی جدائی کو سہارا بھی تو اس کے بس کی
 بات نہ تھی۔ لیکن سہنے کے لئے خود کو بے بس پانی۔ وہ کبھی
 کیا سمجھتی تھی۔ تقدیر کے سامنے انسان مجبور ہو جاتا ہے۔ تقدیر
 کے اٹل قانون کیسے بدل سکتے ہیں۔ بشیت ایزدی —
 اور کیا —

وہیر سے وہیر سے محمود کی ہمدی رضوانہ سے بڑھتی
 جاتی تھی۔ ہمدی شاید محبت کا پہلا زینہ ہے۔ لیکن —
 رضوانہ کے دل میں محمود نے وہ جگہ نہ لی جو خسر و کی ہو چکی تھی۔
 یوں موت و اخلاق کے کارن وہ اس سے جبراً و قہراً متوجہ
 بھی ہو جاتی۔ لیکن عورت شاید زندگی میں ایک ہی مرتبہ محبت
 کر سکتی ہے۔

والدین محمود کے بھی وہی تھے جو خسر و کے تھے۔ ان کی
 توجہ دونوں آنکھیں تھیں۔ انھوں نے سوجا خسر و تو اب اس
 سسٹم میں انہیں محمود سے رضوانہ کا عقد گردینا بہتر لگا۔
 مدد نہ ملے۔ اور سبب — اس کا کون سا مقابلہ کرے۔
 بزدل قسم کی مخلوق سطح سے بہت ڈرتی ہے۔ کاش
 اتنا ہی خوف انھیں شمع کا ہوتا۔ ادھر سبب — اس کی
 روح فرسائیوں سے خدا تالا ڈالے۔

خسر و اس دنیا میں نہ ہو۔ لیکن رضوانہ کے دل
 سے اس کو کون نکالے۔ ادھر والدین کی دھمکیاں۔ پھر سہ
 ہی ساتھ پیا واد پر کار کی باتیں۔ غرض سب ہی کچھ۔ خست
 محمود اور رضوانہ کا عقد ہو جاتا ہے۔ بغیر کسی دبا
 کے اپنی لادشت میں یہ سمجھتے ہوئے کہ خسر و تو اب اس دنیا

۱۹ اصول و مشرعا۔ اس کا فیصلہ

جہاں بانو

(نشر گاہ حیدرآباد سے نشر ہوا)

احساس ہو گا؟
عمود کے ضمیر و دامن کی اپنی جلد بازی کا آخر
کیا نتیجہ ہو سکتا ہے؟ ہر عنوان اب درحقیقت کس کی پرکھ

احترار

ان کی محفل میں نہ جاؤں گا نہ جاؤں گا کبھی

وہ مجھے بندہ بے دام سمجھتے ہیں ہنوز
وہ مجھے نقش تہہ گام سمجھتے ہیں ہنوز
زر کے زبریلے ببولوں سے ڈراتے ہیں مجھے
اپنی محفل میں وہ ہنس ہنس کے رلاتے ہیں مجھے
حسن و معصوم کی سوگند ستم کر رہیں وہ
میری نظروں میں خدا ہو گئے بھی کاؤں میں وہ
وہ مرے فن کو سمجھتے ہیں جو اہر کا عوض
ستارے سے بھی ہوتے نہیں شاعر کا عوض
وہ مجھے شاعر خود دار سمجھتے ہی نہیں
وہ تو تلوار کو تلوار سمجھتے ہی نہیں

میں اگر جا ہوں تو محفل تہہ و بالا کروں
ساغر عیش بہر طاق الٹ کر رکھ دوں
زہر شادی کو غزا خانہ بنا کر رکھ دوں
برج ابرخ شب عشرت کو بھگا کر رکھ دوں
نور آدم ہوں فرشتوں کو بھی حیراں کروں
شاہ غلام کے بھی دامن کو گریباں کروں
میری تقدیر کی مشکل اگر آساں نہ ہوئی
فطرت حسن اگر پھر بھی پشیاں نہ ہوئی
اور پھر بھی وہ اگر سر بہ لکریباں نہ ہوئے
اپنے محبوب شعل سے گرہن ڈال نہ ہوئے

مستقل طور پر ہے میرا ارادہ سنی
ان کی محفل میں نہ جاؤں گا نہ جاؤں گا کبھی

ساقی صیقی

فیشن

داعی ہو گئے ہیں۔ تہذیب و تمدن اور فزین کا مطلب فلاسفہ
کیا ہے اور اس بات پر فرض کر لی گئی ہے کہ جب تک ظاہری نیکی
نہ ہو گئی ہو اور یہ کلمی کا خون نہ خرابا جائے انسان
مذہب (Religion) نہیں رہتا۔ اس طرح ہوا
کہ فزین کا کیا اور کج رو گئی اور ہادی بر سر ہماری کام میں بناوٹ
اور قیاس و ذہن کا شغل ملنے میں کھانے پینے میں الفز
ذہنی کے بر شے ہیں۔

وہی فیض اچھا اور قابل تقلید ہے جس میں ہمیں آرام و چین نصیب ہو جس سے لوگوں کو انگشت نمائی کا موقع نہ ملے۔ آج کل جیسوں حملہ وراج میں اور ان فیشنوں پر چلنے سے ہماری زندگی بہت اچھی ہو گئی ہے مثلاً مکانات جو سو سال پہلے بنائے جاتے تھے عموماً بے خریدہ اور صحت کے لئے خواہ ہوئے تھے لیکن آج کل کے خوبصورت مکان میں رہائش کے علاوہ محفوظ صحت کا بھی بہت کچھ بخاؤ رکھا جاتا ہے۔ ایسے مکانات بنانے کی تقلید ہندوستانیوں نے بھی کی اور وہ اس حد تک اچھی تھی لیکن برصغیر میں ڈرائنگ کے مکان جن کا حیدر آباد میں بہت رواج ہے میرے خیال میں ہندوستانیوں کے لئے موزوں نہیں۔ کیوں کہ ایسے مکانوں کی قیمت بہت پیچی ہوئی ہے جو مغربی ممالک کے لئے کافی ہے کیونکہ وہاں کا سو بھی بہت سہو چتا ہے اور بہت مکان کمر ہوتے ہیں لیکن حیدر آباد میں اسکی تقلید کرنا کہاں تک مناسب ہے؟ کسی دوسرے ملک کے فیشن کی انہی تقلید کے نتیجے میں ختم ہونے پر ہرگز ہلکے ہو چیں گے۔ اس قسم کا فیشن غصہ برکھاتا ہے۔ اگر اس پر غور کرے گا تو کوئی جزئی فتنہ برائی اور کیا بتلائی ہے۔ اگر اسے فیشن میں کیا کر کے تو بھائے انگشت نمائی کے ہم قابل ہیں اس کے ہم۔ میں اس کا گزیروں میں سیدھی فرق ہے اور ہماری اچھی چیزیں چین کر رہا ہے اور ان کا استعمال سلیف سے کرتے ہیں برخلاف اس کے ہم بدحوشی طرح بغیر سوچے سمجھے ان کی پیروی کرتے ہیں اور نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ”ادھر سے رہے نہ ادھر کے“

انسان خواہ وہ کتنا ہی اچھا کام کیوں نہ ہو مسلسل کرتے تھک جاتا ہے اور اس میں دوسری سیدھا کرنے کے لئے تبدیلی ضروری ہوتی ہے اور اسی تبدیلی کا نام کمیشن ہے جو فلاح کے باقیہ ساتھ بدلتا رہتا ہے۔

فیشن کا بدلنا ضروری ہے جس میں زمانہ گزرتا ہوا ہے نئی نئی ایجادیں ہوتی ہیں اور جو دیکھا ہی نہیں معلوم ہو رہا ہے کہ فلاں چیز ہمارے لئے مفید ہے اور فلاں مضر۔ بعض اربو جین میں دھکیں پیش آنے لگی ہیں اس لئے اس کو ترک کر کے نیا فیشن اختیار کر رہے ہیں۔ ایسی صورت میں رواج کا چرمانے کے ساتھ بدلنا بدرجہ اولیٰ ضروری ہے۔ مثلاً پچیس برس قبل ہندوستان میں انگریزوں کا رواج تھا۔ مسکان میں دینے اور عمیق حلائی جاتی تھیں لیکن جب علی کی خصوصیات اور اس کے استقامت کی سہولتیں معلوم ہوئیں تو بھانجے کیسے کمپ کے معمولی معمولی لہروں میں علی کی رازشوی آئی۔

لکھی فضا اور دوسرے کچھ فیشن پر اثر پڑتا ہے۔
 ہر ملک کے فیشن بدلتے رہتے ہیں۔ ممکن ہے جو چیز ہندوستان میں
 کی ہوگی، ہو کہ افغانستان میں خراب قرار دیں مثلاً مغربی ممالک
 میں بال کا ٹنٹا فیشن ہے۔ ہندوستان میں لانے بال رکھنا
 خوب صحتی میں شالی ہے۔ مغربی ممالک میں وزن میں تین چار
 مرتبہ کم پٹے بدن تہذیب سے باقی پہل اس طرح کڑاؤت
 کی برادری تصور کرتے ہیں۔ آج کل مغربی فیشن کے مستحق
 کمزوروں کی زندگ لیتے ہیں لیکن دراصل اس کا پتہ وزن
 کی زندگی کے ہر شعبے سے چلتا ہے۔ مثلاً بودا باش پہننے
 کھانا پینا وغیرہ۔

ہماری معاشرت میں آج کل بناوٹ بہت زیادہ ہو گئی ہے اور ہماری طرز زندگی میں خلعت اور منافق بہت

جب کوئی بزرگ مدہمتی یا کوئی شہزادی کسی چیز کو اختیار کرتی ہے تو لوگ اس کی تقلید کرنے لگ جاتے۔ اس طرح نئے نئے عقین وجود میں آتے ہیں۔ یہ طریقہ ہر زمانہ اور ہر قوم کے ساتھ پایا جاتا ہے۔ پنجاب میں اسٹیل کے اپنے ایک خطی (دولت مند) کے ساتھ پایا جاتا ہے۔ اس سسٹم پر کافی بحث کی ہے۔ مثلاً سکندر اعظم کی گردن ایک طرف ڈرا سی جھکی ہوئی تھی لوگ اس کی تقلید کرنے لگے۔ فیشن کے واسطے یہ ضروری نہیں کہ وہ کوئی نئی طرز اختیار کریں۔ آج کل پرانے فیشن کی طرف بہت میلان پایا جاتا ہے۔ اگر ہندوستانی نقالوں کے سامنے چند بدترین چیزیں فیشن بنا کر پیش کی جائیں تو وہ اس کو فوراً قبول کر لیں گے۔ ہم لوگوں پر تقلید اس قدر غالب ہوئی اور ہر چیز پر اس قدر بناوٹ غالب ہے کہ ہم خود مصنوعی ہو گئے ہیں۔ ہم ہر چیز میں انگریزوں کی پیروی کرتے ہیں مثلاً ہندوستانی اچھائی کے بجائے چاکلیٹ پسند کرتے ہیں۔ روٹی کے کوریائی پر ترجیح دیتے ہیں۔ گوشت تو چاہتا ہے کہ بریانی چمیس لیکن فیشن کے خیال سے روٹی مسکھ کھاتے ہیں۔ یہ ہے ہماری معاشرت کا رنگ۔

رہنے چھنے کے طریقوں میں بھی بہت نقل کرتے ہیں۔ مغربی ممالک کے لوگ فرش پر نہیں بیٹھے بلکہ صوفوں پر اپنی عمر گزارتے ہیں۔ لیکن اس کا سبب بھی ہے۔ وہاں فرش اس وجہ سے استعمال نہیں ہوتا کہ وہاں کا موسم بہت سرد ہوتا ہے اور پتھروں کی ٹھنڈک سے بیار پڑنے کا اندیشہ رہتا ہے۔ برطانیہ اس کے ہندوستان جیسے گرم ملک میں ہمیشہ صوفہ پر بیٹھنا بہت تکلیف دہ ہوتا ہے لیکن کیا کریں فیشن ابل کھانے کی خاطر سب کے گوارا کر لیتے ہیں۔ موجودہ زمانے میں اپنے آپ کو کیا رہتا تھا خدا ایک فیشن سمجھا جاتا ہے۔ کچھ زمانہ پہلے کسی کو دیکھو وہ درگدہ میں مبتلا ہے پاس سے دروازے کے پاؤں میں ہوتا ہو پاس سے مرئی لیکن ہمیشہ وہ خود کو اس مرض میں مبتلا کہتا ہے۔ اب تو

ہمارے دوسرے ہندوستانی بھائی ہم پریشہ ہیں اور انگریز بھی بیوقوف سمجھتے ہیں۔ اس بخود ہی تقلید سے بچا جی انفرادیت کو دیتے ہیں۔ ایک صاحب کا خوب فرماتے ہیں کہ فیشن کا دوسرا نام "ایک عام میں سب تنگے" کا ہے۔ بظاہر تو کچھ ایسا ہی معلوم ہوتا ہے۔ فیشن کی اندھی تقلید کبھی یا بخود ہی نقل ہندوستان کی رباوی اور تباہی کا باعث ہے۔ دنیا کا ہر ملک دوسرے ممالک کی اچھی چیز کی پیروی کرتا ہے۔ لیکن ہندوستان میں تقلید اس طرح پھیلی ہے کہ دنیا کے کسی ملک میں نہیں ہے۔ بہت کم ہندوستانی ایسے نظر آتے ہیں گے جو اپنی خاص وضع پر قائم ہوں اور عام طور پر غیر ممالک کی تقلید اس حد تک کرتے ہیں کہ اچھائی اور برائی کا بھی امتیاز باقی نہ رکھا۔ یورپ سرد ملک ہونے کی وجہ سے وہاں شراب کا استعمال کثرت سے ہوتا ہے۔ لیکن ہندوستانیوں نے اس کی نقل شروع کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ گرمی کے اور پھیپھڑے خراب ہو گئے۔ باوجود اس کے وہ خوش ہوتے ہیں تو ہم ہیں اور انگریزوں میں کوئی فرق نہیں بہتا۔

یورپی دنیا میں فیشن کا مرکز کئی سال سے فرانس ہے۔ یہاں جو فیشن رواج پاتا ہے ساری دنیا میں اسی کی تقلید ہوتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آج کل حیدر آباد ہندوستان کا پیرس بنا ہوا ہے۔ یہاں کسی دعوت یا جلسہ میں جائیے قدم قسم کے لوگ نئے نئے روپ میں نظر آتے ہیں اور لطف تو یہ کہ خواہ انھیں وہ لباس اچھا معلوم ہو یا برا۔ انگریزوں کا لباس عریاں نہیں تو نیم عریاں تو طور ہے۔ ان کے محلہ اور استیج چڑھتے ہیں کہ ہم بغیر غور کیے اس نمونے کے لباس پہنتے ہیں۔ اس بات کا خیال نہیں کرتے کہ ہم فیشن کی خاطر عریاں ہو رہے ہیں اس لئے ہمیں چاہیے کہ کسی فیشن کو اختیار کرنے سے پہلے امتیاز کریں آیا وہ اچھا ہے یا برا۔

ہے۔ کیسائیت کی زندگی سے موت بہتر ترقی کے لئے تبدیلی ضروری ہے لیکن کس قسم کی تبدیلی — تبدیلی ہمارے موافق ہو اور اس لئے ہمیں راحت و آرام ملے نہ دیر تعلیق جو ممکن ہے ہمیں پیرس کے کی طرح انجمنیں بنانے کی اجازت دے اور ہماری حالت اس شعر کے مصداق ہو جائے۔
ہوئے اس قدر مذہب کہ نہ کبھی ٹھہری صورت
کئی عمر ہو ٹولوں میں مرے ہسپتال جا کر

فریدہ

نئی زندگی کا معرکہ آلا راس لالہ نمبر جو صرف مسلمہ پاکستان پر مشتمل ہے۔

بنوری مسلمانوں میں شائع ہو چکا ہے۔
۵۰ صفحات کی غیر ملکی سرائے مطبعہ پاکستان سے متعلق ایک کتاب ہے جس میں مشرور سے آخر تک اس سلسلے کی اپنی تاریخ و اس کے مختلف پہلوؤں پر ملت پاکستان کی جوئی کے مطابق جدید علماء اور سیاسی رہنماؤں کے مضامین ہیں۔ وسیعہ پاکستان کی مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہیں علاوہ اس کے ادارے کی فراہمی کی جوئی اس سلسلے سے متعلق ہر قسم کی غیر معمولی اعداد و شمار اور متعدد نقشے اور تصاویر مل کر ایک پیکل بہا خزانہ ہے جو اس نمبر میں شامل کیا گیا ہے۔

نہایت اعلیٰ و اعلیٰ دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ نئی زندگی کا یہ پاکستان نمبر اس سلسلے پر آخری نقطہ، آخری فقرہ ہے جو آئندہ ان باروں میں بھی ملو یہ نہیں نظر سے نہیں گزرا۔
جگم ۵۰ صفحات
قیمت سالانہ ۱۰ روپے
ناظرین سے عرض ہے کہ کاغذ کی رانٹنگ کم کرنے میں وہ کام سے زیادہ کامیاب شائع نہیں کر سکے۔ اسلئے جب تک کہ یہ دورہ یہ دفتر میں بیچ کر لکھا جاتی ہو گی معذور کرالیں اور کام کی صحیح تعداد معلوم ہو جائے تو زیادہ کامیاب دیکھ سکتے اور یہ سلسلے کی ذمہ داری نہیں لے سکتے۔ بھلائی خیر و برائی کو یہ ذمہ داری نہیں لے سکتے۔ لہذا اپنا حق یہ ہے سالانہ چند ہیکر متعلق خیر و برائی جاننے۔

منجر سالہ نئی زندگی شہوش چندر با سو روٹو، الہ آباد، یو۔ پی

خوش آمدید

یہ کون جھپکتا آتا ہے ! کیوں آتے ہوئے شرماتا ہے
انداز تو چپنے کے ہیں وہی ہر گام پہ ہے اک موسیقی
ہے قد میں وہی ڈالی کی ٹپک سو آئی نظر بندوں کی چمک
وہ ہاتھ بے ساغر کھینکے ناہید نے پھیرے ساز نے
خوشبو کی پٹیلیں آتی ہیں دامنِ فضا ہکا تتی ہیں
لو آہی گئے وہ آہی گئے اور دیدہ و ولی پر چھا ہی گئے
اب جائے کہاں کھو جاؤں گا
میں ان پرندہ اہو جاؤں گا

دو قطعے

گر نہیں ترے لئے لطف بہاراں ہی
عیش و عشرت نہ ہی بزمِ شجائاں نہ ہی
ہو مبارک پہ جو انہروں کا جینا تجھ کو
ہمتِ مور تو ہے ملکِ سلیمان ہی

لطفِ سہل نہ ہی تلخیِ طوفاں ہی ہی
فراہیاں نہ ہی ظلمتِ عصیاں ہی ہی
ہائے محرومی جاوید کہ یہ بھی تو ہمیں
زندگی خوابِ سہی خوابِ پریشاں ہی ہی

محسوسات

مگکا ہوں میں بیمار آتا ہوا محسوس ہوتا ہے

تصور جام چمکاتا ہوا محسوس ہوتا ہے

خرام ناز اور ان کا خرام ناز کیا کہنا!

زمانہ ٹھوکریں کھاتا ہوا محسوس ہوتا ہے

تصور ایک ذہنی جستجو کا نام ہے شاید!

دل ان کو ڈھونڈھ کر آتا ہوا محسوس ہوتا ہے

کسی کی نقرئی بازیب کی جھنکار کے صدقے

مجھے سارا جہاں گاتا ہوا محسوس ہوتا ہے

تھرکتا ہے گھٹا کا عکس موجوں کی روانی پر

کوئی آنچل سا لہراتا ہوا محسوس ہوتا ہے

لچکتا جسم رقصِ بنخودی میں دیکھنے والو

سنہرا سانپ بل کھاتا ہوا محسوس ہوتا ہے

قتیلِ ابدل کی دھڑکن بن گئی ہے چاپ قدموں کی

کوئی میری طرف آتا ہوا محسوس ہوتا ہے

قتیلِ شہنائی

مشرق

(از مولیان)

جیسے ہی مرا شروع ہوتا ہے میں اپنے دوست کو یاد کرنے لگتا ہوں جو بہت دور ایشیا کی سرحد پر رہتا ہے۔ یہ بچوں کا دور ہے اس سے ملنے گیا تھا۔ میں جانتا ہوں کہ دوبارہ اس سے ملاقات نہ ہو سکے گی۔ آج سے نکال قبل سترہ کی بات ہے کہ میں ایشیا گیا تھا میں نے وہاں اس کو اپنے دو ان کے خانے میں انھوں نے کثرت میں پیغمبر خدائی کی حالت میں پایا۔

اس نے بغیر حرکت کئے کہنا شروع کیا، بیٹھ جاؤ پھر تم جو کچھ چھو گے میں اس کا جواب دیتا ہوں گا۔ لیکن میں حرکت نہیں کرتا، میں بیٹھ گیا اور پیرس کے متعلق خبر لیا۔ میں کہہ ڈالیں۔ لیکن اس نے کہا۔ تم کیا کہہ رہے ہو مجھے اس سے فخر برابر بھی ہو گی نہیں کیونکہ میں ایسے عالمک کا دلدادہ ہوں جو دوسرے تماموں سے بڑھ کر ہے۔ اودہ بیچارہ کا شریانو نے مشرق کی خواہش میں جان دیدی تم نہیں جانتے کہ یہ ملک کس طرح سمندر سے ہے۔ یہ مقدار آسمانوں کی راہ ہوتا ہے وہاں پر چھایا ہے۔ اور اپنی محبت کے بغیر میری دعا کے میں باندھ لیتا ہوں۔ میں یہاں انھوں کی رہنمائیوں سے کھینچتا ہوں یہ کہہ کر اس نے انھیں بند کر دیں۔

میں کہا۔ تمہیں زہر میں کیا مضرہ لگا ہے۔ تمہیں اس سے کیا جسمانی لذت حاصل ہو رہی ہے جبکہ یہ بیمار ایک نہ ایک دن خاتمہ کر کے رہے گا؟ بات کاٹنے ہوئے اس نے کہا۔ یہ جسمانی لذت نہیں بلکہ اس سے بھی بڑھ کر حسین شے ہے۔ انھوں تمام دنیاوی جھگڑوں سے دماغ کو بچاتے دلاتی ہے۔ کیا تم جانتا جانتے ہو مجھے کون کونسی چیزیں پسند ہیں۔ کوسو تو ایک تو سچا فیون اور وہ سب ہے مشرق میں جب افیون کھا کر لیٹ جاتا ہوں تو پیچھے ہٹا ہٹا سا تھا ہوتا ہے اس کے بعد تمام اعضاء پر یہ اثر چڑھ جاتا ہے۔

اس کے بعد میں بالکل بے خود ہوتا چلا، مجھے بے اندازہ مسرت ہوتی ہے جس کو میں بیان نہیں کر سکتا، میں خیالات کے انتہا سمندروں میں بہتا ہوں مسرت و انبساط سے کھتا رہتا ہوں۔ دوبارہ اس نے انھیں بند کر دیں۔ میں نے کہا۔ تم جو مشرق سے آتی محبت کرتے ہو وہ صرف اس لشکر کا دہائے وردہ کوئی کیونکر اس وحشی ملک کو پسند کرے گا جہاں دماغ بے حس ہیں، جہاں خیالات پر محدود کی روایتوں کا بار ہے، جہاں جدیدیات نام کو نہیں دیتے جس سے محبت کرتا ہوں وہ خواہ ہے وہ حیل ہے کہہ سکتے ہو۔ مشرق ایک وحشی ملک ہے، یہ خاموش، بدتریزی ہے ایک فرشتوں کا ملک ہے وحشی مغرب کے لوگ ہیں جو اپنے آپ کو مستحق اور شان سے سمجھتے ہیں، ہم قابل نفرت وحشی ہیں جو حشوں سے بدتر زندگی گزارتے ہیں۔

ہمارے پتھر سے بنے شہروں اور خوبصورت فریج کی طرف دیکھو ہماری ساری زندگی کہاں ہے۔ گھروں کے دو در کتوں کو دیکھو جس میں سے خون کو کاٹنے والی ٹھنڈی ہوا میں اتنی کافی آتی ہیں کہ ان سے جلی چل سکتی ہے ہمارے ساری زندگی کریسوں پر کھڑے گزرتی ہے۔ کتنی مسکندہ چیز ہے۔۔۔۔۔ ہمارے دماغی زندگی پر بھی نظر ڈالو جو کتنی مصیبتیں اور غمگینیوں کی آماجگاہ بنی ہوئی ہے۔ آئے دن لڑائیاں ہو کر رہی ہیں مطلق ہمارے ہی کا بازار گرم ہے۔ وہ خود ہی دیر کے لئے خاموش ہو گیا پھر کتنا شروع کیا۔ میں اس مکان کو جانتا ہوں جس کو قریب میں خریدنے والا ہوں وہ ایک مشرقی وضع کا بنا ہوا لکڑی کا مکان ہے۔ تم اس مکان سے سمندر کو آسانی دیکھ سکتے ہو۔ سفید بادبان تھر تھرتے ہوئے دکھائی دیں گے، ترکوں اور یونیوں کی کشیدیں نظر آئیں گی۔ مکان میں چھوٹا سا چمن ہے جس میں ٹھنڈی ٹھنڈی مٹھی ہوا میں سرسرا رہی ہیں اور خیتوں کی شاخوں سے فوارے اگلے ہیں اور آسمان کی صورت

محمد قلی قطب شاہ اور رومانیت

میں پایا جاتا ہے۔ لیکن نظر کا حصہ خاص طور پر محمد قلی کے دیار سے وابستہ ہے جس کے حسن و عشق کی ایک عجیب و غریب تصویر (Epic of Love) ہو رہی ہے۔ اس دنیا میں محمد قلی کم ہو کر ساری کائنات سے بے غل جاتا ہو۔ فلسفہ اور حکمت اہل کے نزدیک کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔ ہاں اگر اہمیت ہے تو ان کی کیس (Epic of Love) کے قول کے مطابق لکھا ہو چکا اور عیش کر دے کی تنگ چنانچہ نظم کی داری کا شکر کرتے ہوئے عیش کا تھانہ وہ یوں کا تھانہ دنیا کا حکمت اور بھیس ہرگز عیش کا ہر دم ہیا کے نام (اسے) اس تراز عیش کے لئے وہ اپنی تیار یوں کی محفل جاتا ہے۔ اور ان کے لئے محفل قیام کر دیا ہے۔ ان محفل میں ہر شخص کی ناز نیاں بے تکلفی کے ساتھ اپنے حسن و جمال اور آرائش و زیبائش میں مصروف و متہنگ اور عشق و عشق کی عجیب و غریب کیفیتوں اور جوانی و جوانی کے لئے بے پناہ جذبات کے مظاہرے کرتی رہتی ہیں۔ محمد قلی کی پیاریوں میں شخصی ساؤنڈ کی پیاری، گندمی، چھیلی، لالا، بھینس، زانی، ہندی، چھوری، پستی، سندھ، مشہری اور بھاک متی وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں کیونکہ ان پر محمد قلی نے مستقل نظمیں لکھی ہیں۔ ان کے حسن و جمال کی داد دی ہے اور ان کے ساتھ اپنے عاشقانہ تعلقات کا اظہار کیا ہے۔ محمد قلی کو ان پیاریوں سے جو لگاؤ تھا اس کا اظہار ایک واقعہ سے ہوتا ہے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ بھاک متی کی خاطر محمد قلی نے موسیٰ ندی کی تیز تند طغیانی میں اپنا گھوڑا ڈال دیا اور اپنی پیاری بھاک متی کی جان بچائی۔ اس حرم کی پادشہ میں اس کو محل میں چند روز قیام بھی رہنا پڑا۔ اپنی پیاریوں کے حسن و جمال اور غمزہ و مشوہ کی تصور پر محمد قلی نے اپنی نظموں میں بھیجی ہے اس کے چند اشعار ہم ذیل میں پیش کرتے ہیں۔

محمد قلی قطب شاہ کا عہد تاریخ گو گنبد کا وہ دور ہے جبکہ دکن ہند اسلامی ثقافت و تمدن کا سنگ بنا اور مندرجہ مسئلہ آرٹ کا ایک حسین امتزاج پیدا ہوا۔ چنانچہ محمد قلی قطب شاہ پہلا کوئی مسلمان بادشاہ ہے جس نے ہندوؤں کے لباس اور طرز نامزد و نو کو اختیار کیا۔ اسی کجنگت اور نسل طاپ کا نتیجہ یہ ہوا کہ محمد قلی کے دربار اور محلات شادی میں ہندوؤں نے باریادہ مندرجہ کیا اور قلی کی حسن پرست طبیعت نے ایک عجیب و غریب رومانہ فیض پیدا کر دی۔

کلیات محمد قلی قطب شاہ اٹھارہ دیکھتے تو اکثر و بیشتر نظمیں ایسی ہیں جن کے پیچھے ہیں محمد قلی کے دربار میں حسن و عشق کے ڈرامے کیلئے جاتے نظر آئیں گے۔ یہ دیار کیا تھا تو یار وں از تجھی اد یہ نظیں کیا ہیں گو اس جویم ناز کی زندہ اور قیامی پھر قیامی ہیں۔ ان زمانہ ان کیل فیضوں میں محمد قلی کا دل جو زندگی اور کائنات میں سوا حسن و عشق کے کسی اور حقیقت کو کار فرما نہیں دیکھتا چو میں لکھنے تیرا نظر آتا ہے۔ محمد قلی میں حسن و عشق کا احساس پہچان ہی سے قدر تانے و ولایت کیا تھا اور رومانیت ایک سبب جسمی کیفیت (معصومیت) سے رواں دواں نظر آتا ہے۔

محمد قلی قطب شاہ کا کلیات دو حصوں پر مشتمل ہے ایک میں نظمیں کا طواری مجموعہ ہے اور دوسرے میں غزلیات ہیں غزل اور نظم اگرچہ مختلف کے اعتبار سے دو علم و فن ہیں مگر ان میں یہ دو قابل راگ کلیات محمد قلی قطب شاہ میں ایک ہی اسپرٹ سے نکلتے ہیں اور وہ اسپرٹ رومانیت (Romanticism) ہے۔ غزلوں میں یہ اسپرٹ رومانیت کے پردہ میں جھلکتی ہے اور محمد قلی قطب شاہ کی زندگی کے عام پہلو اس میں دکھائی دیتے ہیں۔ شاہ کے جذبہ و خیال کا ایک دھندلا سا احساس ان غزلوں

کچھ بھی سہائی نہیں دیتا تیری یاد کچھ اس طرح لگی ہوئی ہے کہ
پھر کچھ بھی یاد نہیں آتا محبوب کی یاد اور اس کی مرکزیت
کی مثال ہمیں خون میں لٹی ہے۔
تم مرے پاس ہوتے ہو گو یا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

مشرقی کے متعلق لکھتا ہے۔
عرا ہستی اسی کا، فوج نہن میں جایا ہو
توج مستی تھے ادا بک باصفا ہو

اسی مستی کے تیش توں جب ہیا بہو دیں ایں
ہزاراں شکر و سجدے کر کہ کج سو مر جیہے

ہمن دل کے گنوارے میں جن کا نور دستیا
سورج کرناں کی دوریاں یوں جھلکتا تو کج
(شرح)۔ زندگی اسی کا ہے کہ جسم میں دل ہو اور ہمارا دل
ہمارا مشوق ہے جس میں عشق کی ادبی مستی ہے جس کی
وجہ سے وہ ہمارے دل میں عرصہ سے جکڑے ہوئے ہے۔
جہاں اس کا نور سورج کی شعاعوں سے زیادہ خوشا اور
دوست ہے)

ان گفتا بات کے علاوہ ہیں کلیات محرقی قطب شاہ
میں میسوں نگین ایسی ہیں گی جو محمد علی کی حسن افروز اور
عشق لبریز زندگی کی آئینہ دار ہیں، اپنی پیاریوں کی محبت
میں محمد علی نے جذبات و احساسات کا اظہار جس حسن کا رانہ
انداز میں کیا ہے وہ محض علمی قلابا زیاں نہیں ہیں بلکہ سچی
تصویریں ہیں۔ ڈاکٹر زور صاحب نے کلیات کے مقدمہ
میں بڑی خدمت اور عمیق بات نکھی ہے۔

و دنیا کا کوئی شاعر اپنے کلام میں اپنی زندگی
کو اتنا عیاں نہیں پیش کر سکتا تھا جتنا کہ
محمد علی نے کیا اس کا کلام قلب کی گہرائیوں

مشرقی۔
دند کر لاج سوں نخل و دشتی لگی جہن
اس مٹی وال او پر کیوں لگیو چو میو یوں

لو کاسوں کریں جو قصہ دناز کی باتیں
جب ہونیاں تھے جھڑے چو بی بی بیٹا سکھیں
(شرح)۔ جب جہن میں مٹی محو خرام ہوئی ہے تو خرم کس کا
نخل وال لٹی ہے معلوم نہیں کہ اس مٹی والی پرانی سے
شباب کے پھل کیوں لگا گئے۔ جب وہ قصہ یاد سے خط
سرنکے شمار سے بات کرتی ہے اور اس کے ہونٹ عرق آؤ
چھانے ہیں تو دل چاہتا ہے کہ اس کو گمن و بھیل)

کنولی۔
تازگی تھے تازہ نخل آئی میرے برسنے
بیل کول لے سبز اپیل پھول جیتے پرسنے

کنولی باری پہلی باری ڈاوساری دادوں
نین ناری رنگ و صادی مدھاری سرسنے

نہہ و من کا از من کا پادوں جھلکا یوں
آس من کا پیش تن کا ذوق کن کا پرسنے

(شرح)۔ یہ شگفتہ چمن پھر میرے یہاں سبز پھل اور سے اور
چھوٹیوں کی کھنی لگائی ہوئی آئی۔ اس کی انگریز چال سے
شراب کا شمار اور آنکھوں میں رنگ کے دوسے نظر آ رہا
ہیں۔ اس حسین کی محبت اور اس کے پاؤں کی جھنکا دل
کے لیے امید تن کے لیے پیش اور کان کے لیے ذوق
کا باعث ہے)

پیارے کے متعلق لکھتا ہے۔
رین دن کج جانے نا جو کوئی برعاش تیرا
لگیا ہے یاد یوں تیرا کہ مٹی کج یاد آئے گی
(شرح)۔ جہل سے میرا عاشق ہے اس کو رات اور دن

دواں ہے۔ "ماز نہیں" امر اور شباب: انداز شباب: پتھیل نہیں: ماہ ابرو: کعبہ: سرو خوش قد: چاندنی اور سخن:

چاندنی اور سیاہ۔۔۔ ان تمام نظموں میں شباب کی لذتیں اور عیش کی وسعت گیر و غامض ہیں اپنے استہانی نقطہ پر نظر آتی ہیں۔ لیکن اس کا یہ مدعا نہیں کہ عمر قلی کی عشق و عاشقی اس کے مادی ماحول (یعنی اپنی پیاریوں کی زلفوں میں) الجھ کر رہ گئی۔ بلکہ عمر قلی اس سے بھی آگے بڑھتا ہے۔ اس کی محبت کی ابتدا عورت سے ہوتی ہے لیکن آنتہا اس (Gual She) پر بس کھڑا ہے۔

When a man loves a woman,
Then he knows God's secret and
secret of the world (Oskar Wilde)

اگرچہ آکر و اُن کی طرح میں یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ عمر قلی کی اس عشق و عاشقی نے اس پر کائنات کے سارے راز فاش کر دیے تھے۔ اور نہ ہی اس کا قال ہل کر ایک رومانی شاعر کہاں تک فلسفہ طرازی کر سکتا ہے۔ لیکن یہ ضرور ہے کہ جس مادی ماحول کی عمر قلی نے اپنے کلام میں عکاسی کی ہے وہ اپنی پوری گہرائیوں کے ساتھ اس میں موجود ہے اور یہ حافظ کے مطالعہ نے عمر قلی کی طبیعت پر تصویق و عرفان کا کچھ دیا۔ رنگ نہ دیا تھا کہ بعض تخلیق عافظ کی غزلیات کا باطل ترجمہ معلوم ہوتی ہیں۔

عمر قلی نے یہ معلوم اپنی پیاریوں کے قتل سے یہ کسی اور سیاسی وجوہ کی بنا پر یا رشتہ نگان دکن سے کچھ ایسے قریبی اور گہرے روالہ پیدا کر لئے تھے کہ مرزا محمد علی حسین مستغان کے بمصداق اسلامی اور ہندو قلم کے دو ہرے گولہ انداز کی سرزمین میں بیٹے لگے چٹا چٹا اس نے بعض ایسی عیدیں اور بہار رائج کئے جو عورت اس کی روانہ پسند طبیعت میں سرخس پیدا کرتی بلکہ اس کی رواداری اور

نکلتا تھا۔ اس کو مبالغہ تصنع یا آرو کی ضرورت ہی نہ تھی۔

ایک اور مقام پر زور صاحب یوں رقمطراز ہیں۔

"شباب کی رنگارنگیوں اور جذبات کی جھلانیوں کے انہما میں اس کا قلم غریبہ کی قدرت رکھتا تھا۔ اور یہ قدرت تخلیق یا فرضی محفل و عاشقی سے نہیں پیدا ہو سکتی جو محفل صحیح معنوں میں اس میدان کا مہر تھا۔ اس کے رنج اشان محفل تھے بلکہ اس میں عین قوی سن و غمہ کی وسعت اور آراستہ ویراستہ نمایاں گاہیں تھیں۔"

عمر قلی کی ان نظموں کا مقابلہ ہم اردو ادب کے شبابی پیغمبر خوش سنج آبادی کی نظموں سے کر سکتے ہیں۔ دونوں میں ہمیں وہی رومانیت کا شدید ترین احساس مشترک طور پر ملتا ہے۔ لیکن فرق یہ ہے کہ عمر قلی میں عریاں واقفیت ہے اور خوش میں جس کو غالباً عمر قلی جیسا جلیانی باطن نصیب نہیں تخلیق اور واقفیت کا امتزاج ہے۔ عمر قلی نے پیاریوں کے ذکر میں بعض راز و نیاز کے معاملات بھی اس انداز سے پیش کئے ہیں کہ موجودہ ترقی پسند ادب کے بعض عریاں افسانوں اور نظموں کو بھی شرم آنے لگے۔ لیکن یہ عمر قلی پر کوئی الزام نہیں کیوں کہ جیسا کہ ہم نے کیا کیلئے عمر قلی اپنی زندگی کے ہر پہلو کو عریاں سے عریاں انداز میں اور پوری پوری واقفیت کے ساتھ پیش کرتا ہے وہ شعرو سخن کا حقوق ادبیات میں کوئی خاص مقام حاصل کرنے کے لئے نہیں بلکہ اپنے بڑے عشق کی تسکین کے لئے لکھا ہے اور یہ مقصد بے مقصود یا کائنات کے نصف نمائندہ

as a man loves a woman, then he knows God's secret and secret of the world (Oskar Wilde)

اس کو صحیح معنوں میں ایک بڑا حسن کار بنا دیتا ہے۔ خواہ اس کا پیرایہ انہما عریاں ہی کیوں نہ ہو چلے جتنا عجیب و غریب وصال "عیش وصال" اور "بعد وصال" وغیرہ اس کی عریاں نگاری کی مثالیں ہیں اپنی پیاریوں کے ناز و انداز پر بھی اس کا قلم جذب و کیف کے ساتھ دھلا

کی نہیں ایسی نظر آتی ہیں جیسے پہاڑیوں پر کالے کالے
بادل چڑھائی کرتے آئے ہیں۔

بست پر ایک قصیدے کے چند اشعار ہیں :-
پلا ساتی سمرامرے کو تاہوئے کشف ہنما کون
کہ اس سے تھ دیسے رنج کول سدا سب را بہانی
عینہ مورخو و مشک دز عفران کا رویت آیا
اسی تھے باس انوکا جگ میں کرتا ہے کھستانی
بست بیل کا حامل پہن کر آئی انٹن میں وطن
سو پہلی سدا کے نقش انٹن میں حیران ہے انی

(شرح :- اسے ساتی اشراب پلاتا جا تا کچھ کو کشف ہونے لگے
کیونکہ شراب کی وجہ سے مجھ پر پوشیدہ راز بھی نظر آنے لگتے
ہیں۔ عینہ مورخو، مشک، زعفران کی رت آئی ہے۔ اس وجہ
سے ان سب کی خوشبو دینا کو کشتاں بنا دیتی ہے۔ بست
کے پھولوں کی مالا پہن کر وہ جہیں جہن میں نکل آتی ہے۔
جس کے پھولوں کے نقش انٹن کو دیکھ کر مانی بھی حیران ہے)

اسی طرح عید میلاد النبی شہب معراج، شہب رات، عید فک
عید غدیر وغیرہ پر محمد علی کی بلند پایہ نظمیں ملتی ہیں۔ ان نظموں
کی ایک خاص خصوصیت اس کی منظر نگاری اور عیاں کا قافی ہونا ہے۔
بعض بعض مقامات پر موسیقی کی مینوں کو اس انداز سے پیش
کرتا ہے کہ کول اور دوسرے گادو گادو کا ہونے لگتا ہے۔ اور اپنی
پیاریوں کی وہ تصویریں (صور) جو
عیش و طرب کی حالت میں اس کے پیش نظر ہوں اس انداز
سے انہی حکاکی کرتا ہے کہ اس کی مثال مشکل سے ہمارے
ادب میں ملتی ہے۔

جن کا یہ پرستار محمد علی جو یاہ اپنی شاعری میں کہتا
ہے وہ رتبہ و کمن کی معاشرت اور تمدن کی تعمیر کاری میں بھی
اسے شامل ہے۔ اپنے ہمد حکومت میں اس نے بعض ایسے

سیاحی قابلیت کا بھی پتہ دیتی ہیں۔ "نوروز" - "بست"
شہب رات، عید غدیر اور دوسری عیدوں پر محمد علی نے
جو نظمیں لکھی ہیں ان میں ان وہ نظمیں پہلوؤں کا اظہار ہوتا
ہے۔ خاص کر "نوروز" اور "بست" میں محمد علی دیکھی
سے صبر لیتا اور عیش و طرب کی داد دیتا تھا۔ ان موضوعات
پر محمد علی خطبہ شاہ کے نہایت بلند پایہ قصیدے لکھیں
ملتی ہیں جو اس کی انتہائی مسرت کی ترجمانی کرتی ہیں۔
بست کی عید میں محمد علی کی ہندوستانی پرستی بھگاتی
ہے اور یوں بھی عیش و طرب کے لئے (جو فطرت محمد علی کی
جذیبہ وجود تھا) بست سے بڑھ کر کون سا موسم ہو سکتا
ہے۔ ان نظموں میں اس نے جس بے ساختگی اور دلچسپی
کے ساتھ اظہار خیال کیا ہے وہ اپنی آپ نظیر ہے۔

شہب رات پر ایک نظم میں لکھتا ہے :-
ہر ٹیکہ دھن ہر یک کھن پہل درخ کے بریں
پنی مدن جھلکا بدن شہب کھن کول آئے ہیں
کھ شہب کے شہب کوں آفتاب جلن تہ
دکھائے کرتاب کول آفتاب کے بھلائے ہیں
سو دھن ٹیک کے جب جھلکا وہ نول الیک کے سو ٹیک
بھکیا ملک پر تھے ملک بے سد ہو ملک اب آئے ہیں
چھاتی پر چھاتی سندھ لٹا سیام ہر جگ تس بھتر
جانے کر کالے ابر دو گریہ چلائے آئے ہیں

(توضیح :- ہر طرف سے جہاں ایک نازنین درخت کا لکڑا لکڑا
آئی ہے تاکہ بادشاہ کے ساتھ چمن میں نکلے شہب رات
پہننے کے ان کے جسم جھلکنے لگے ہیں۔ اور اپنے نوجوان
چہروں کے آداب و رنگ اور آفتاب جیسی جھلک سے ہتھاب
کرتے آتے تیار نگار ہی ہے ناز میں اس انداز سے جو
خوام ہے کہ اس کی زلفوں کے لہانے کی وجہ سے خوشبو
آسمان تک پہنچی ہے اور سارا آسمان ٹیک کیست۔ ایک
سیاح کے کہ پستان زیادہ خوبصورت ہیں جن پر سیاہ بادلو

والطہ، بانوک اور اڑ پیر و خجرو کے شاہکار ملے۔
 انداز بیان میں فطری بہاؤ ہے اور کہیں بھی نہیں
 دھوکا نہیں ہوتا کہ شاعر نے خواہ مخواہ خیال آرائی
 کی ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ محمد علی کی شاعری غزل کی
 بلند پروازیوں سے خالی ہے۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ اس کی
 غزل کے پائل اس کے چھائی اول میں محروم ہیں تو
 اس کے پر شاعری اور خیال کی بلند فضاؤں میں پرواز کرتے
 ہیں۔

رسم و رواج کی بنیاد رکھی جو اس کے مرنے کے بعد بجا عرصہ
 دراز تک دکن میں قائم رہیں۔ چنانچہ ابھی شادی سیاح
 کی رسومات میں طبع اور احمدی محمد علی کی ہی روایت برور
 ہیں۔ ان رسومات پر بھی محمد علی کا نظم حسن اخلاقی کرنا چلا جاتا
 ہے۔
 محمد علی کے اسٹائل اور خیال میں وہ ہادوگی اور
 رنگینی پائی جاتی ہے جس کا مقابل ہم یا تو خوش کی شاعری
 اور نیاز کے رومانی افسانوں سے کر سکتے ہیں یا چھوڑ کر

محمد معین الدین

غزل

فریب پیہم سہی یہ مینا، مگر کہاں کہنے سب کہاں
 یہی جو ہے زندگی کا حاصل، تو کیوں نہ جینے پڑاں

جنوں کو کچھ اور آرائیں، حضور جی بھر کے مسکرائیں
 مرے نشین کے تنکے تنکے پہ شوق سے جھلیاں گر لیں

غم گزشتہ کا تذکرہ کیوں، کشش بیم و آرزو کیا
 وہ دیکھو اٹھی ہیں پھر گھٹائیں اٹھاؤ ساعی پٹ لیں

مجھے غم عشق دینے والے فساد غم پہ ہنس رہے ہیں
 الہی! ایسا ہی وقت آئے مرافقاں مجھے سنائیں

مری طرف آپ دیکھئے تو جھکی جھکی سی ہیں کیوں لگیں
 اگر جفاؤں پہ منفعل ہیں، مری وفاؤں کو بھول جائیں

مرے جنوں سے نہ مٹ سکے جو عین مامہ مٹا گا کیا
 مری وفاؤں کے نقش ہیں یہ مٹائیں آپ مٹائیں

کبھی جو تعین زندگی کا حاصل ظفر وہ انجباب ہو گئی ہیں
 وہ روج پرور سہانی راتیں، وہ بیگی بھیگی ہوئی فضاں

منظف الدین ظفر

(محبت بھرے دل کے ساتھ — اپنی تسنیم چٹاری
کے نام — !)

قریب سلسل

دو دنوں بچوں پر آنکھ نہ آنے دیتی تھی۔ یسائی بیس کر
چرخہ کات کر۔ سلائی سی کر اس نے اپنے بچے کو بڑھایا۔
تنبینہ کا تو اس نے غریب گھرانہ میں نکاح کر دیا۔
گویا فرض سے سیکہ دشمنی حاصل کی — اور بچے کی
نکاح میں لگ گئی اب اس کی یہ کوشش تھی کہ میرا بچہ
کہیں لو کر جو جائے۔ انٹرنس تک ہی شغل تیرے کر آیا
تھا آگے کو بھلاہٹ ہی کیا ہوتی — دو تین
سال اور اسی کش کش میں گزر گئے۔ خیر خدا کر کے
اقبال اس قابل ہوا کہ وہ کھنے کی دکان پر ملازم
ہو گیا — یہ خوش خبری اتفاقاً بل بیان تھی۔ راتندہ
مسکراتی تھی۔ خدا کا شکر ادا کرتی تھی۔ زندگی تو چار
روپوں میں گزارہ کی تھی اب آکھتے بچیس روپے اور
لاکریں گے؟ یہ خیال ہی بس دکھ تھا۔ پہلی تنخواہ
اقبال نے ماں کو بھیجی — دوسرا مہینہ پورا بھی نہ ہوئے
پایاک ماں ختم — دو روز بخار آیا تیسرے
دن کھڑے سے جو غش آیا تو ترخان سے گریں۔ مگر تے ہی
دل نیل ہو گیا — اس کے دل ناؤں میں دکھائی
کیا تھا؟ سترہ اٹھارہ سال فریبی سسرال کے چرکے
کھاتے کھاتے محض پتلہ سا رہ گئی تھی۔ خون کا چہرے
پر نام تک نہ تھا۔ عرن لقمہ سے پتہ اتنا چلتا تھا
کہ یہ مسکراتا ہوا چہرہ کبھی حسین ضرور ہو گا۔ چونتیس
سال کی عمر میں تمام دراج طے ہو گئے۔
شادی — جوانی — سہاگ — بچے — پرورش
شادی — تعلیم — آرزو — ملازمت —
حسرت بھری موت — جس وقت ماں کے مرنے کا
تار اقبال کو ملا تو وہ اپنی ماں کی صورت کا عاشق
بچھلی کی طرح تڑپ کر آیا لیکن وہ غریب تو لاکھوں
من منی کے پیچے دب چکی تھی — گھر غالی
پڑا رہ گیا تھا — مختصر سا بھو پڑا — دالان منہ سے

بجلی میں جب کوئی بڑا سا جانور مر جاتا ہے تو چاروں
طرف سے گدہ ٹوٹ پڑتے ہیں — کوئی شہد کی
کھس مر جاتی ہے تو اسے بیسوں چوٹیاں گھٹٹ لے جاتی ہیں
سمندر میں بڑی پھسل ہزاروں مٹی مٹی پھیلے
کو ہضم کر جاتی ہے —
سو دکھانے والے ہا جن خود پھولتے چلے جاتے
ہیں اور جن سے وصول کرتے ہیں وہ جلدی جلدی سوکھ کر
قبر کے کنارے جا پہنچتے ہیں —

ہمارے جنت لگان ہندوستان میں جہاں
کوئی مرا خللا بھائی — معنیہا — چچا یا اور کوئی
رشتہ دار — اور یہ لکھ لاجت ہوئی کہ حق داروں
کو قاتل بدوش بنا کر خود مال غنیمت پر قبضہ کر لیں۔
بقول شاعر ع

کسی بے کس کو اے بیدار مارا تو کیا مارا
راختہ کا سہاگ لگا تو جیشہ صاحب کو فوری
فکر جو بڑی وہ مکان کی تھی — صحن میں دو گئی
زمین اپنی طرف کر کے دیوار کھینچ دی — اس ظلم کی
داد تھی نہ فریاد؟ بیچ دو سال کی تھی اور بچہ دو چھپے گا
— جس نے باپ کی شکل تک بھی نہ دیکھی تھی۔ باپ
کے مرنے کے دوسرے مہینے دنیا میں قدم رکھا تھا۔
تیرہ سال کی راتندہ۔ بیاہی گئی تھی اور پانچ سال
بادشاہت کی۔ سترہ اٹھارہ سال کی کس لڑکی
منہ سے پھول جھڑکتے تھے۔ دنیا کے کرو فریب سے
نا آشنا — کچھ خدا کا خوف کر کے کچھ دنیا کی
شرم کر کے چار روپے گزارہ کے بلندہ دئے۔ جیسے
بہت بڑا احسان فرمایا ہو —
راشدہ خدا معلوم کس بے زبان ماں کی بی بی تھی
جس نے یہ تمام مصیبتیں چپکے چپکے سہلیں۔ پندرہ سال
تک متواتر — قاتلہ پہ قاتلہ کرتی تھی اور اپنے

جوان بیٹھے کا ہاتھ پکڑ دیا دھاڑے نکال باہر کیا۔ اور اس کا سامان کچھ تو توڑ پھوڑ دیا اور کچھ سڑک پر یہ کہہ کر پھینک دیا۔ — بے جاؤ یہ کات کباڑ — اور یاؤ دعویٰ کرو — میرے بھائی کا مال ہے۔ میں مالک ہوں۔ اقبال نے کھڑے اور بڑے اپنا سر پیٹ ڈالا۔ اپنی بے بسی سے مجبور ہو کر تائے کے پاؤں پکڑائے لیکن اب بھلا کہاں ترس آسکتا تھا۔ — جون چڑھ چکا تھا۔ — ٹھوکر ماری تو سر سے خون چھوٹ پڑا۔ — دو من کی زندہ لاش اڑ رہے سانپ کی طرح "دھون فون" کر رہا تھا۔ —

مگلے والے یہ تماشا دیکھتے رہے اور نہ بولے۔ گھر کے چھوٹے بڑے سب یہ منظر منہ ہنس کر دیکھتے رہے اور دل نہ پیسجا۔ — اب اقبال خان بدوش ہو چکا تھا وہ آہرا دیکھ رہا تھا کہ کوئی اسے سہارا دے؟ تمام تکلیفیں اٹھا چکا تھا۔ فائے کر چکا تھا۔ ماں کے ساتھ گھنٹوں رو رو کر چپ ہو چکا تھا پر گھر کی مصیبت آج نئی تھی۔ —

تائے اتانے یہ غریب سے حاصل کیا جو امکان کھٹ سے اس کی مصیبت بنایا۔ — عالی شان مکان میں اور خفا ہو گیا۔

کئی روز تک اقبال گھر کے لئے ایک ایک کاسہ لگتا پھرا۔ ترسار اس کی رشتہ کی ایک غریب بہن کو ترس گیا۔ اس نے اس مصیبت میں اپنا ہاتھ بڑھایا۔ — اپنے مختصر سے ٹوٹے ہوئے مکان میں محبت سے بلایا مکان گریہ پڑا پھر اقبال نبین دل غنی تھا۔ دل میں جذبہ تھا۔ درد تھا۔ ہمدردی تھی۔ غریب کا دخل نہ تھا۔ — انسانیت فخر کر رہی تھی۔ — محبت سر اٹھائے علی ثبوت دے رہی تھی کہ لاکھوں غریبوں کے دنیا

فریادی تھا کہ اس کی مالک گھر سونا کر گئی۔ — درو دیوار وحشت سے خاموش تھے۔ — اداسی کی غمناک گھٹا چھائی ہوئی تھی۔ — بھوں کا درخت سر جھکاٹے منظر تھا کہ نازک ہاتھ توڑیں گے۔ — مرغیاں دلنے کو ڈھونڈتی پھر رہی تھیں۔ — محبت سے دانہ پانی دینے والی اب کہاں تھی چغندر ہو کر ملاتی۔ — اقبال دیوار سے لگ لگ کر روتا تھا۔ کپڑے پھاڑتا تھا۔ آوازیں دیتا تھا۔ —

اماں! — اماں! — ہائے میری اماں! — اب وہ اماں کہاں تھی جو بے چین ہو کر پی پی آواز پر دوڑ پڑتی تھی؟ ہزاروں آنسو گرتے تھے۔ اور خاموش — — — — — بھوج دو چاندوں کو اپنی ہونٹیں لیکن وہ بھی سسرال کی دلی ہوئی تھی۔ زیادہ نہ رہ سکی اور بھائی کو تڑپنا پھوڑ پھار دیا چار ساس کے حکم سے واپس چلی گئی۔ —

اب اقبال اس کھنڈر میں لاوارث سا بڑا رہتا۔ — تائے صاحب تائی صاحبہ کا غم بھی بکالاتا۔ —

ایک دن اقبال نے کہا تائے ابا یہ جو صحن میں میرے والد کی زمین تپ نے ابر کر لی۔ —

ہو سکے تو اس کا کچھ — — — — — کیا سا کر میں۔ — — — — — بیکاری میں کچھ کام لائیں۔ — — — — —

انہی جملے سننے کی تاب بھرا نہ آیا۔ — — — — — بے درد تائے ابا کو کب ہو سکتی تھی۔ — ہزاروں گھایاں دیں۔ — مارنے کو چڑھ دڑے۔ — چار روپے ہینہ کا کھنڈ دیا۔ — سر پرستی کا زانا یاد دلایا۔ — احسانات گناہے۔ — اقبال نے صل کر کہا

اس چار روپے کے بے میری ماں سے تمام گھر کا کام جو لے لیا جاتا تھا کیا جب بھی منہ پورا نہ ہوا؟ —

— جواب پا کر تھکا گئے۔ — — — — — عاقبت سے

بے خبر، خوف خدا سے نا آشنا بڑھتے تائے رہے۔ —

ستارہ چمک رہا تھا۔۔۔۔۔ بازو پر انبیازی نشانات تھے۔ سینے پر تمغہ لٹک رہا تھا۔۔۔۔۔ پاؤں میں بھاری بھاری جوتے تھے۔۔۔۔۔ لفٹ رائلٹ کے انداز سے قدم اٹھتے ہوئے۔۔۔۔۔ جیسے یہ ساری دنیا کو مرکز بنانے کا اعلان فرما رہے ہوں۔۔۔۔۔

اب وہ خاصہ خوبصورت جوان نکلا تھا۔ البتہ ماتھے پر چند شکنیں پڑ چکی تھیں جو ثبوت دیتی تھیں کہ دلی نے جو تلخیاں سہی ہیں ان کا گہرا اثر پہرہ پر نمایا ہو گیا۔۔۔۔۔

جو اپنے پرانے پر تھائیں سے بھوت کی طرح خوف کھا لے تھے اب فریب دینے کے لئے مختلف اختیار لے کر آگے بڑھے۔۔۔۔۔ کوئی ہراسہ نہ ہی کی باتیں لے کر۔۔۔۔۔ کوئی رشتہ داری کے بہانے۔۔۔۔۔ کوئی مبارکباد کے سنہرے الفاظوں کے ساتھ۔۔۔۔۔ کوئی دعوت کا کردہ بہانہ کر کے غرض سب نے فریب کے جال تیار کر کے قسمت آزمائی کی۔۔۔۔۔

اقبال بھولانہ قسا اسے سب کچھ یاد تھا۔ ایک ایک لوگ اس کے کالج پر ناسب بنا ہوا اب بھی موجود تھا۔۔۔۔۔ تب دنیا کو اس کی ضرورت اگر نہ تھی تو اب اقبال کو مطلق ان حکام و لوگوں کی حاجت نہ تھی۔۔۔۔۔ اس نے سب سے بے ڈنکی کا بڑاؤ کر کے منہ پھیر پھیر لیا۔ فریبی رشتہ دار اپنے اپنے کمرہ جال پھندے لے کر اٹے ڈالوس گئے۔۔۔۔۔

اقبال نے اپنی شادی کی پانچ راہ راست فود ایک غریب لیکن شریف گھر سے۔۔۔۔۔ لی کہ اسے شادی کے بعد ان ہی لوگوں میں رہنے پہنچے لگا۔ وہ لوگ بھی اپنے بیٹے کی طرح جھکتے۔۔۔۔۔ بیوی قناعت کے ساتھ شوہر کی دلداری میں مصروف رہتی۔ صحیح معنوں میں سچی جھدر، محبت پرست، نیک طبیعت۔۔۔۔۔ جو کچھ فوج کی ملازمت سے لایا تھا اس روپے سے

ابھی اہل دل بھی باقی ہیں؟ قیمت دھکے دیتی ہے تو دے چلی جاتی ہے۔ یکساں قسم کی ٹھوکریں۔۔۔۔۔ دکھ۔۔۔۔۔ بے بسی۔ محتاجی اور جب پیٹھ ہے۔۔۔۔۔ تاش کے پتوں کی طرح۔۔۔۔۔ اٹلی چال۔۔۔۔۔ تو ہر بانی کا پالنے سیدھا پھینکتی ہے۔ اقبال کے دن جب پھرے تو ایک دنیا اسے اپنا اپنا رشتہ دار بتانے لگی۔۔۔۔۔ رستہ چلتے خود بخود "آپ تو میرا چچا زاد بھائی ہیں"

"ارے آپ تو ہمارے بہت قریب کے رشتہ دار ہوتے ہیں۔۔۔۔۔"

"آپ کے والد سے تو میری بہت دوستی تھی" "آپ بے مدحمت والے ہیں۔ ہم تو آپ کی وادی کی بہن کے پوتے ہیں اتنا قریبی رشتہ ہے" یہ آوازیں۔۔۔۔۔ یہ دعوے پرانے زخم ہرے کر ڈالتے ایسا لگتا جیسے کوئی ہزاروں پتھر کھینچ کھینچ کر رہا ہو۔ جنگ شعلہ کی بہت ہی بھاگوں ہوئی۔ بہتوں کو نو بے گھر، بے درخیم بیوہ بنا گئی لیکن بے سہاروں کو زندگی کا عملی سبق بھی دے گئی۔ اقبال نے جس وقت نام لکھوایا تو یہ سمجھ کر کہ میرا کوئی رونے والا تو ہے نہیں۔۔۔۔۔ بیوی بہی سہی۔۔۔۔۔ اگرچہ وہ خیالات میں بے حد آزاد تھا اور غلامی کو موت سے بدتر سوچا کرتا تھا لیکن نہ جانے کیوں فوج میں چلا گیا۔ جوں توں کر کے دو سال وہ مختلف جگہوں پر رہتا رہا۔ پھر مصر، عدن وغیرہ گھوم کر وطن لوٹا۔۔۔۔۔ اس بدتمیز وطن کی طرف جہاں وہ سگے تائے کے ہاتھوں خانہ بدوش ہوا تھا۔ جہاں اسے ٹھوکریں نصیب ہوئی تھیں جہاں سترہ اٹھارہ سال ماں کے ساتھ وہ فاقہ کشی کر چکا تھا۔۔۔۔۔ ہاں اس وطن میں اس نے اس انداز میں قدم رکھا کہ پچھتے ہوئے میں اس کی مدد میں تھے۔۔۔۔۔ تو پی میں

کر کے دوری اختیار کی۔

گھر کی چیزیں تو اندھے پن کے بعد ہی سب نیلام کر کے ختم کر ڈالی تھیں۔ اب تو صرف مٹی کے چند ٹھیکے بڑے رہ گئے تھے اور یا وہ عالی شان کھنڈر کھڑا رہ گیا تھا جس کے دروازے سے اقبال ٹھوکریں کھاتا ہوا فریادی نکلتا تھا۔

مدتوں سے مرمت طلب مکان یوں ہی کھڑا تھا۔

اچانک بارشیں ہوئیں۔ ایسی ایسی موسلا دھند کہ پختہ پختہ منزلیں سر بہ سجود ہو کے ڈھیر ہو گئیں۔ ایک رات کو پڑا رہنے کا ڈر اٹھانا تھا وہ بھی گیا۔ ورنہ سارے دن تو ٹکڑی کے سہارے دونوں بڑھے بڑھیا گلی کوچوں میں جھپک مانگتے پھرتے تھے۔ کبھی کبھی شہر کی طرف بھی نکل جاتے۔ جہاں بعض آنکھیں اب بھی ان ہستیوں کو پہچان لیتی تھیں۔

برسات جب رو رو کر اقبال کے مکان کو بالکل ڈھکا گئی صرف بنیادیں چھوڑ گئیں یا وہ لیوں کا خدا اب چھوٹا سا درخت جو بڑھ کر اب چھت سے بھی اونچا ہو چکا تھا تو موسم نے ایک اور کرٹ لی۔ یعنی سردیاں تو بہ کرانے آن پہونچیں۔

ایک دن سب معمول چھترے لگانے بجیک مانگنے جارہے تھے۔ آہٹ پا کر بڑھے نے دردناک صدا لگائی بابا دے کچھ۔ اس ہاتھ دے اس ہاتھ اقبال کا دل چاہا کچھ مار کر بھاگ جائے۔ یا

دونوں کی گردن دبا دے۔ کبوت اب بھی کچھ اور غریب دینا چاہتے ہیں کیا؟ لیکن اچانک دل کانپ گیا۔ نیکی نیک راہ۔ بدی پیش راہ۔ جھٹکے کا نوٹ پکڑا آگے بڑھ گیا۔ لیکن پاس ہی کوئی محلہ تو جوان کھڑا تھا بولا او بڑھیا! بڑھے کی تو خیر اندھی آنکھیں ہیں وہ تو بھلا کیا پہچانتا؟ کچھ تو بھلی پہچاننا یہ کون تھا؟ وہی اقبال۔ اقبال

اس نے تجارت شروع کی نہایت کامیاب رہا۔ جن سال بعد اس کے پاس سب کچھ ہو گیا تھا۔ مکان، دکان، ٹوکر چاکر، پیشین و عشرت۔ نیچے، سکون و اطمینان۔ ہاں کبھی کبھی گزشتہ تنگیوں یاد آکر ضرور تڑپا دیا کرتی تھیں۔ ان تائے کا علیہ کیا ہوا؟ خدا کی لاشی میں آواز نہیں ہوتی۔ بھارتیا بہت تیز دہا، ڈاکٹروں نے کہہ دیا کہ یہ علامت ہے کہ چپک حملہ کرے۔

آفرود ہی ہوا۔ چپک نکلی اور ایسی زور و شور کی کہ سانس لینا محال ہو گیا۔ زندگی سے سب ہاتھ دھو بیٹھے۔ پاس کھڑا ہوتا نامکن تھا۔ بے حد تعجب تھی۔ اپنے تو خیر ہو گئے لیکن تمام سیم بد گوشت کی طرح۔ آنکھیں چپک کی نذر ہو گئیں۔ گھر کچھ خدمت سے گھرا لے لگا۔ یوں مارے ہاتھ سے اگر تھوڑا بہت لہا لیا گیا بھی تو کیا؟ کارا کا بہت زور شور اٹھا۔ ایسا معلوم ہوا کہ وہ اس غریبی دنیا میں غریبوں سے تو بہ کرانے آیا ہے۔ تین جوان جوان لڑکے منٹوں میں لوٹ پوٹ ہو کے رہ گئے۔ گویا قصداً ہی باپ کے گناہوں میں بے گناہ پس گئے۔ بڑھیا یا پھر اندھا بن۔ یہ داغ دھکتے ہوئے انگارے تھے۔ جن پر ہر وقت نرپتا تھا اور بل اعتنا تھا۔

ایک لڑکی رہ گئی تھی۔ اس کا بھی غریب سے نکاح پڑھا دیا۔ باپ تو ٹوکر سے بیٹھ ہی چکے تھے۔ دانے دانے کو محتاج ہاتھ پاؤں سے کچھ تھوڑی بہت بیوی خدمت کرنے کو تھی لیکن مغلسی نے اس کی صحت پر بہت برا اثر ڈالا۔ آٹے، نیاجار رہنے لگی۔

ایک دن پھلی سسٹیک بک رہی تھی وہ بے لی۔ خدا جانے کئے دن کی سڑی سڑی تھی۔ پکا کر بھوک میں کھائی۔ اب قدرت نے نئے ڈھنگ سے انتقام لیا دونوں کا جسم چوٹ نکلا۔ اور ہر دیکھنے والے نے توبہ توبہ

ہسپتالوں اور صحتی اداروں میں نرسوں کی کمی

(نرسوں کے لئے بہتر انتظامات اور اعلیٰ تعلیم و تربیت)

قلم کے تحقیقاتی کمیشن نے اپنی رپورٹ میں لکھا ہے کہ اگر زراعت پیشہ لوگ بیماری کے باعث جسانی اور ذہنی طور پر کمزور ہو چکے ہوں تو وہ بحیثیت جماعت ترقی نہیں کر سکتے۔ یہ بات شہری آبادی پر بھی صادق آتی ہے۔ مگر ہندوستان ابھی تک علاج، معالجہ اور صحت و صفائی کے انتظامات کے لحاظ سے دوسرے ممالک اور ترقی یافتہ ملکوں سے بہت پیچھے ہے۔ اس کا اندازہ اس امر سے لگایا جاسکتا ہے کہ صوبائی حکومتیں ان سروسوں پر اپنی آمدنی کا اوسطاً ساڑھے پانچ فی صدی حصہ صرف کرتی ہیں۔ لیکن امید ہے کہ مرکزی حکومت کی مالی امداد کے ساتھ صوبے ترقی کی بہتر اسکیمنوں پر عمل درآمد کرنے کے قابل ہو جائیں گے۔

ان سروسوں کی ترقی کے ساتھ ساتھ تربیت یافتہ نرسوں کی تعداد میں بھی زبردست اضافے کی ضرورت ہے۔ یہ صبح ہے کہ زمانہ جنگ میں نرسنگ سروسوں کو ترقی دینے کے لئے بہت کچھ کیا گیا، لیکن ابھی تک ایسی نرسوں کی کمی شدت کے ساتھ محسوس کی جا رہی ہے جو عمدہ اور اعلیٰ تربیت حاصل کر چکی ہوں۔

نرسنگ سروسوں کی ترقی کا آغاز ۱۹۳۹ء میں ہوا اور انڈین نرسنگ نرسنگ سروس قائم کی گئی۔ مگر وہ بڑھتی ہوئی جنگی ضرورتوں کو پورا نہ کر سکی۔ اس کے بعد سرکاری رجسٹرڈ نرسیں اور شہری ہسپتالوں کی نرسیں بھرتی کی گئیں لیکن اس کے باوجود ہندوستانی فوجوں کے بیماروں اور زخمیوں کی غیر گنتی کے لئے مزید نرسوں کی ضرورت محسوس کی گئی اور ۱۹۴۲ء میں آکریمری نرسنگ سروس آٹ انڈیا قائم ہوئی۔ جس میں ہندو، مسلمان اور عیسائی خواتین شامل ہوئیں۔ اس کے علاوہ برطانیہ سے بھی نرسوں کے دستے آتے رہے۔ مگر مذکورہ کوششوں کے باوجود نرسوں کی بدستور کمی ہے۔

۲۰ نومبر ۱۹۴۷ء کو ٹرینڈرز سوسائٹس آف انڈیا کی چوتھی کانفرنس کا جو اجلاس **نرسوں کی کمی**

منعقد ہوا اس میں تعلیم و صحت و اراضی کے ممبر آئی بی سرو گنڈر سنگھ نے بھی نرسوں کی کمی کے متعلق اظہارِ خیال فرمایا۔ اس سلسلہ میں آپ نے اس امر پر زور دیا کہ نرسوں کے رہنے پہنچنے اور ان کی تعلیم و تربیت کے متعلق بہتر انتظامات کئے جائیں اور یہ امید ظاہر کی کہ اگر سروس کے حالات کو ترقی دی جائے تو ہسپتالوں میں کام کرنے کے لئے تعلیم یافتہ خواتین کافی تعداد میں اپنی خدمات پیش کر دیں گی۔

اس کمی کا سبب یہ ہے کہ ہندوستان میں نرسنگ سروس اور اس کی معاون سروسوں نے اتنی تیزی سے ترقی نہیں کی جتنی تیزی سے طبی سروسوں نے ترقی کی ہے۔ چنانچہ اندازہ لگایا گیا ہے کہ بڑے ہسپتالوں میں ۱۵ ہزار بیمار ہیں جن کی تیمارداری کے لئے ۱۷ ہزار نرسیں ہونی چاہئیں۔ مگر ان کی موجودہ تعداد ۷ ہزار ہے جن میں سے صرف نصف تربیت یافتہ ہیں اور چھوٹے ہسپتالوں میں تو حالت اور زیادہ خراب ہے۔

بہر کیف سروس کے حالات کو سدھارنے کے لئے زبردست کوششیں کی جا رہی ہیں۔

کل ہند نرسنگ کونسل کے قیام کے لئے مرکزی اسمبلی کے آئندہ اجلاس میں ایک مسودہ قانون پیش ہونے والا ہے۔ اس کے علاوہ نرسنگ کی اعلیٰ تعلیم کے لئے ایک ہندوستانی اسکول قائم کرنے کا مسئلہ بھی زیر غور ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ یہ اسکول جلد کالج بن جائے جس میں انسٹرکٹرز کا نصاب پڑھایا جائے اور صحت عامہ کی نرسنگ کے متعلق بھی تربیت دی جائے۔

تعلیم و تربیت کے بہتر استقامت حکومت ہند نے نرسنگ کے متعلق صوبوں کے لئے چند معیار تجویز کئے تھے۔ صوبائی حکومتیں ان سے دلچسپی ظاہر کر رہی ہیں۔ چنانچہ بمبئی اور صوبہ متحدہ میں نرسنگ سروس کی نگران خواتین مقرر کی جا چکی ہیں۔ مدراس میں نرسنگ کی سپرنٹنڈنٹ لکڑی ہی میں مقرر کر دی گئی تھی اور اب بنگال میں بھی اس کا تقرر عمل میں آنے والا ہے۔

یورپی ملکوں میں نرسوں کی اعلیٰ تربیت کا سروسٹ چھوٹے پیمانہ پر بندوبست کیا گیا ہے۔ برطانیہ کے بعض ممتاز ہسپتالوں میں ہر سال ۳۲ ہندوستانی نرسوں کو تربیت دی جائے گی اور ان آموزگار نرسوں کے لئے وہی سہولتیں اور آسائشیں جہاں کی جائیں گی جو برطانیہ آموزگار نرسوں کے لئے حیا کی جاتی ہیں۔ (۱) طالبات برطانیہ پہنچ چکی ہیں جن میں سے دو ”سینئر ٹیوٹر“ کے نصاب کی تکمیل کر چکی ہیں۔ حکومت ہند نے بنگال کی ایک قانون مس سوروما بھوس کو بھی رائل کالج آف لندن میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لئے بھیجا ہے۔

دو سال ہوئے سرچوز ہجور کے زیر صدارت ایک کمیٹی مقرر کی گئی تھی تاکہ وہ صحت عامہ کا جائزہ لے اور اپنی سفارشات پیش کرے۔ توقع ہے کہ یہ کمیٹی اپنی رپورٹ جلد پیش کر دے گی اور صحت عامہ کی منصوبہ بندی میں بھی نرسنگ سروس کی ترقی کو خاص اہمیت دی جائے گی۔

ہلت و زیریں خواتین اس ضمن میں ڈاکٹر کمر بنزل میڈیکل سروس و صدر انجمن تپ و ہندوستان نے گفت و گو کی۔ بی۔ بانس کی وہ تقریر بھی دلچسپی سے پڑھی جائے گی جو انھوں نے تپ و دق کے ہلت و زیریں کی کلاس کا افتتاح کرتے ہوئے علی ہی میں فرمائی ہے۔ یہ کلاس تپ و دق کے کلینک نئی دہلی میں قائم کیا گیا ہے۔

اس میں آپ نے ہلت و زیریں کی اہمیت نہایت پر زور الفاظ میں بتائی جن میں خواتین کثیر تعداد میں شامل ہوں گی اور اس اور پر زور دیا کہ ”سینیئر ٹیوٹروں“ کے علاوہ ”کلینک“ بھی کثیر تعداد میں قائم کئے جائیں جو تپ و دق کے ابتدائی درجوں کے علاج کے لئے نہایت ضروری ہیں اور ہر کلینک میں کئی اعلیٰ تربیت یافتہ مائیں اور سرگرم ہلت و زیریں کو مقرر کیا جائے۔

اس کام کے لئے بھی ہندوستانی خواتین کی خدمات درکار ہیں اور وہ امداد تپ و دق کے متعلق بھی نہایت مفید خدمات انجام دے سکتی ہیں۔

از علمہ اطلاعات ہند

نئی کتابیں

- مرزا سیف علی خاں

نظارے

میں صبح سے ارا مارا پھرتا رہا تھا۔ ٹھیک طور سے تو کہہ نہیں سکتا کہ میں جو ارا مارا پھرتا رہا تو وہ آخر کس سلسلے میں تھا۔ کوئی چیز خریدنی نہ تھی، کسی کی تلاش نہ تھی، کسی کا گھر دہشت کرنا نہ تھا۔ میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ میں کسی خاص وجہ کے تحت ارا مارا نہیں پھرتا تھا۔ فرصت تھی، ہاں خوب یاد آیا، فرصت تھی۔ دفتر بند تھا اور گھر میں بیٹھے بیٹھے طبیعت آنا گئی تھی۔ وقت گزارنے کے لئے گھر سے نکلا تو بس ارا مارا پھرتا رہا، ایک جگہ لوگ بھیڑ لگائے کھڑے تھے، میں بھی رک گیا اور ایک تماشا کی جگہ کا دم سے کا سہارا لے کر کھڑا ہو گیا۔ انہوں نے ہماری اس حرکت پر ایک جھٹکے کے ساتھ اپنی گردن موڑ لی۔ ارے وہ تو میرے ہم محلہ شیخ صاحب تھے۔ ”کہنے شیخ صاحب اچھے تو ہیں آپ یہ کیا تماشا ہو رہا ہے؟“ میں نے مسکراتے ہوئے شیخ صاحب سے پوچھا۔ شیخ صاحب کا بڑا ہوا چہرہ، بتدریج اپنی اصلی حالت پر آ گیا۔ ”کچھ نہیں وہ کوئی حالیہ کی طرف سے آئے ہیں بعض جڑی بوٹیاں بہت خاص ہیں ان کے پاس۔ دیکھنے آپ بھی۔ دیکھئے خدا کی قدرت“ شیخ صاحب نے اپنی گردن پھری۔ وہ حالیہ کے باغی مجمع کے شیخ میں ایک کپڑا بچھائے اس پر جڑی بوٹیوں کا ڈھیر لگائے کھڑے تھے۔ میں بھی دیکھنے لگا اور میں نے دیکھا اس شخص نے تماشا یوں کو ایک گلاس بتایا، خالی گلاس، اس کے بعد اس نے اس میں پانی ڈالا۔ پھر تفصیلی میں سے ایک جڑی نکالی، کہنے لگا ”بھائیو! یہ جڑی حالیہ کے دامن میں دستیاب ہوتی ہے اور اس کو پانے کے لئے پانچ سال میں نے جنگلوں میں گزارے، پانچ سال بھائیو۔ میں اس کی تعریف نہیں کرتا۔ اس کا کرشمہ دکھانا ہوں“ اس نے وہ جڑی پانی میں ڈال دی۔ تھوڑی دیر بعد سارے تماشا ی پھٹے ہوئے دیدوں سے دیکھ رہے تھے کہ پانی بجھنے لگا۔ دوا کا کرشمہ دکھانے کے بعد اس نے کھنکار کر چاروں طرف فحشہ انداز نظر ڈالی اور ایک دفعہ پہلے سے بھی زیادہ زوردار کھنکار لگا کر کہنا شروع کیا ”اس کے گن بھی من لو۔ یہ۔ بوڑھے کو.....“ میں نے اپنے کانوں پر ہاتھ رکھ لئے اور نہ سول پڑھتا ہوا اپنی راہ پر لگ گیا۔ پل پر سے گزرنے لگا تو کئی راہ گیر ایک جگہ جمع ہوتے جا رہے تھے اور جھانک جھانک کر نیچے کی طرف دیکھ رہے تھے۔ میں بھی رک گیا۔ میں دیکھنا چاہتا تھا کہ یہ لوگ آخر کیا دیکھ رہے ہیں۔ میں نے بھی جھانک کر نیچے دیکھا، ندی بہہ رہی تھی۔ صرف ندی بہہ رہی تھی۔ میں نے اپنے بازو والے صاحب سے پوچھا ”کیا بات ہے جناب؟“ کہنے لگے ”میں بھی ابھی آیا ہوں۔ آپ سے پوچھئے ان صاحب کے بازو صاحب کھڑے تھے ان سے میں نے رکتے رکتے پوچھا وہ آپ کو معلوم ہے جناب، یہاں یہ سب کیوں جمع ہیں؟“ ”جی جی“ کہتے ہوئے انہوں نے پلٹ کر ادھر ادھر دیکھا۔ ”ارے“ وہ کہنے لگے۔ ”ارے۔ دیکھئے جناب بات دراصل یہ ہے کہ یہاں ایک صاحب جھٹکے کھڑے تھے اور ان کے ساتھ ہم سب بھی جھٹکے لگے۔ وہ صاحب چلنے کہیں۔ درنہ ان سے پوچھ لیتے۔ ہم کو تو کچھ نظر نہیں آرہا ہے۔ ندی تو البتہ بہہ رہی۔ مگر صاحب کچھ تو ہوگا۔ کچھ تو ہوگا ضرور۔ تب ہی تو وہ بے چارے دیکھنے لگے“ خود کشی کے امکانات پر غور کر رہے ہوں گے وہ“ میں نے وہاں سے ہستے ہوئے اپنے دل میں سوچا مجھے تو وقت گزارنا تھا۔ میں کیوں پل پر سے ندی میں جھٹکا تروں۔ پل کے فٹ پاتھ پر بیٹھے ہوئے دو فقیر آپس میں مکرار کر رہے تھے۔ ایک کہتا تھا کہ خواجہ والے کے تو نے ٹانگ کیوں ماری۔ دوسرا کہتا.....“ اور تو نے کیوں سارے بھیجے اس کے

ہڑپ کر لئے۔“ میں جو ان کے قریب پہنچا تو وہ دونوں مسکین صورت بنائے سوال کرنے لگے۔ میں اپنی باتوں کو بچانا دور ہی دور سے جیسوں میں ہاتھ ڈالے چلتا رہا۔ میں آگے بڑھ گیا تو وہ پھر باتیں کرنے لگے۔

”ایک روپیہ کا چکر ہے تیرے پاس؟“..... دوسرے نے کہا ”پیارے کم ہیں۔ شام تک دیدوں گا۔ یہ بے بارہ تھے۔“ ایک تانگہ پان کی دکان کے آگے کھڑا تھا۔ تانگے والا پان سگریٹ خرید رہا تھا۔ ایک چٹا نے تانگے والے سے پوچھا ”کرایہ کرو گے؟“ تانگے والے نے جواب دیا ”کہاں چلتا ہے صاب؟“۔ ان صاحب نے کہا ”گورکھ پور“۔ تانگے والے نے پان بچاتے ہوئے کہا ”ایک روپیہ دلوائیے صاب“۔ ان صاحب نے ناک بہوں چڑھاتے ہوئے کہا ”ایک روپیہ نہیں ہیں آنے دیں گے؟“ تانگے والے نے سڑک پر پیک ٹوکی۔ وہ صاحب آگے بڑھ گئے۔ تانگے والا کہتا رہا ”چنا چنگا، گھاس مہنگا۔ اور گورکھ پور تک کا کرایہ ایک روپیہ نہیں تین آنے؟“ اس کے بعد اس نے انھیں کچھ کہا۔ کرایہ بچانے والے صاحب تو آگے بڑھ گئے تھے۔

ساری باتیں مجھی کو سننی پڑیں۔ میں نے سوچ لیا کہ گورکھ پور جانا ہو تو تانگے والے کو تین آنے پر چلنے کے لئے نہ کہوں گا۔ ایک سڑک زیر تعمیر تھی، مزدور پتھر اٹھا رہے تھے اور مزدوریاں گتے دار صاحب کے پیچھے پیچھے ندی سے پانی لانے جا رہی تھیں۔ ایک صاحب سیکنڈ ہینڈ پر تیزی سے چل آ رہے تھے۔ دوسرے صاحب دوسری طرف سے ان سے بھی زیادہ تیزی سے آئے۔ دونوں ایک دوسرے سے ٹکرائے۔ چاروں گرے۔ دو سیکنڈ سوار اور دو سیکنڈ دونوں نے ایک دوسرے کو بغور دیکھا۔ کپڑے بھارتے ہوئے اٹھے۔ سیکنڈیں بچائیں اور اپنی اپنی سمت چپ چاپ چل نکلے۔ میں مسکرائے بغیر نہ رہ سکا۔ مگر مجھے ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے میری فرحت کا وقت ختم ہو گیا ہے، کٹنا کٹنا نہیں۔ میں نے ایک ٹھنڈی سانس بھری اور پھر چلنے لگا۔ دو اخبار بیچنے والے لوگ آدھریں لگاتے بازو سے گزرے۔ میں نے ایک کو روک کر اخبار خریدا۔ ایک صاحب بول کھلائے ہوئے میری طرف آنے لگے۔ ”جناب، کیا“ جی آپ مجھ سے کچھ کہنا چاہتے ہیں؟ میں نے ہمدردی کا اظہار کرتے ہوئے پوچھا۔ ”دیکھئے جناب آپ یہاں کب سے کھڑے ہیں؟“ میں نے کہا ”ایسی کچھ دیر تو نہیں ہوئی۔“ تو آپ نے ادھر سے کسی رکشا والے کو جاتے دیکھا۔ کچھ سامان تھا اس رکشا میں۔ کبوتروں کی ایک ڈکری بھی تھی۔ دیکھی ہے آپ نے؟“ میں نے سوچتے ہوئے جواب دیا ”مجھے یاد تو نہیں۔ البتہ ایک رکشا.....“ ”جی بس شکریہ ادھر کی کو گئی ہے نا؟“ میں نے بے بسی کے عالم میں گردن ہلادی۔ وہ اس طرف کو دوڑ پڑے۔ وہ تھوڑی دور ہی گئے ہوں گے کہ ایک رکشا کچھ سامان تھا جس میں ایک کبوتروں کی ڈکری تھی جس میں میرے سامنے آکر رکی۔ رکشا والے نے پوچھا ”صاحب ادھر سے کوئی صاحب گزرے دے دے عینک لگائے ہوئے چھوٹی سی ڈاڑھی، میں مسکرا پڑا۔ وہ جانے کیا سمجھا۔ واپس ہونے لگا۔ میں نے جلدی سے کہا ”ارے بھائی ادھر ہی کو گئے ہیں وہ مجھے ڈھونڈتے ہوئے، کدھر بھٹکا رہا ہے انھیں“ رکشا والے نے کہا ”صاحب ایک دکان سے کچھ خریدنے کو گئے تو بس لاپتہ ہیں“ میں نے کہا ”اس طرف چلے جاؤ، وہ ابھی گئے ہیں تمہیں مل جائیں گے۔“ میں نے اخبار کھولا اور پڑھنے لگا۔ میں درخت کے نیچے کھڑا تھا۔ کوئی چیز اوپر سے عین اخبار کے صفحہ پر گری۔ میں نے اوپر نظر اٹھائی۔ ایک کوآڈلی پر بیٹھا کانیں کاٹیں کر رہا تھا۔ میں نے اخبار پھینک دیا اور پھر سے چلنے لگا۔ ایک کتا بھی میرے ساتھ ہو گیا کبھی کبھی وہ

مجھ سے بہت آگے نکل جاتا۔ لیکن وہ کسی پتھر یا دیوار کو سونگھتا کھڑا رہ جاتا تو میں آگے نکل جاتا۔ پھر ہم دونوں ساتھ ہو جاتے۔ ایک دفعہ تو میں نے اسے دھتکارا بھی۔ لیکن وہ تو جیسے فرطِ مبالغہ کر میرے ساتھ دوڑ رہا تھا۔ ایک گھر سے بتی نکلی تو وہ اس کے پیچھے لپکا۔ بتی ایک موری میں گھس گئی تو وہ موری کے آگے کھڑا رہ گیا اور میری طرف اس طرح دیکھنے لگا جیسے کہہ رہا ہو کہ دیکھئے اس موری میں گئی ہے بتی۔ وہ کتا بھی میری طرح بیکا رہتا تھا۔ جسے صحتِ وقت گزارنا تھا۔ اس نے اب میرا ساتھ چھوڑ دیا اور ایک ہوٹل کے باورچی خانے کی طرف چلا گیا۔ ایک صاحب کالے اعلس کی مدد پر پیسے کاتے ہوئے آئے۔ بلب آ تو بجی گا۔ جوں جوں وہ مجھ سے قریب ہوتے گئے ان کی آواز بھی دھیمی ہوتی گئی۔ جب وہ میرے بالکل پاس پہنچے تو چپ ہو گئے اور آگے بڑھتے گئے تو پھر سے کھانے کی لے اوجھی ہوتی گئی۔ بلب آ۔ آ۔ آ۔ آ۔ ایک بھکاری اپنے دو مردہ نمابچوں کو سامنے ڈالے راہ گیروں کے آگے دستِ سوال دراز کر رہی تھی۔ ”دو دن کے بھوکے ہیں“ آفریں ہے اس ماں پر جو دو دن کی بھوک ہو اس کے دو بچے دو دن کے بھوکے ہوں اور وہ ان بچوں کا پیٹ پالنے کے لئے بھیجک مانگے۔ گلا گھونٹ کر مار نہیں ڈالا۔ آفریں ہے اس ماں پر۔

علائی کی دکان مٹھائیوں سے سچی ہوئی تھی۔ دھڑا دھڑا تازہ تازہ مٹھائیاں بی جا رہی تھیں۔ کھانک لڑکیاں سنبھالے ہوئے بھیڑ سے نکل رہے تھے۔ کھیاں بھینھناری تھیں اور توندیلا سیٹھ اپنے نوکروں پر برس رہا تھا۔ کچھ دیر بعد وہ اپنی گدی پر نیم دراز خزانے لینے لگا۔ مٹھائی تیار کرنے۔ جانے اور تولنے والے ملازم کالے جیتھڑوں میں لمبوس اپنے اپنے کام میں لگے ہوئے تھے۔ دکان کے آگے دو بھکارن لڑکیاں کھڑی تھیں ان میں سے ایک کے ہاتھ میں مٹھائی کی بھینکی ہوئی لڑکی تھی۔ جس پر سے وہ دھیرے دھیرے دھاک کھونٹی جا رہی تھی۔ وہ بل جوائی آنٹن میں بڑے تھے ان میں کچھ اور بیچ بڑے جا رہے تھے۔ مٹھائی کی لڑکی سے پٹا ہوا قوام قطرہ قطرہ زمین پر ٹپک رہا تھا۔ بعض کھانک دکان پر بی مٹھائی سے کام و دھن کی تواضع کر رہے تھے۔ گرم گرم جامین اور تازہ تازہ اترتیاں۔ بھکارن لڑکیوں کے ہاتھ آگے بڑھے ہوئے تھے۔ جھوٹے کاغذ اور پتے پھینک جا رہے تھے۔ ڈاکریں بی جا رہی تھیں۔ چنارے بھرے جا رہے تھے۔ لیکن ان بھکارن لڑکیوں کے ہاتھ پھیلنے کے پھیلے ہی رہے۔ ایک لڑکی کچھ اور آگے بڑھی۔ سیٹھ کی آنکھ لگ گئی تھی۔ ایک۔ کھیاں ان کی ناک میں گھس گئی تھی۔ ”سیٹھ“ اس لڑکی نے پکارا، چل بھاگ، اور انھوں نے اپنی چوکی کے نیچے سے ایک چھٹا سا ڈھیلا اٹھا کر لڑکی کی طرف دے مارا۔ سیٹھ صاحب نے ان بھیک منگوں کو مار بھگانے کے لئے اپنی چوکی کے نیچے چھوٹے چھوٹے ڈھیلوں کا ایک ڈھیر سا جمع کر رکھا تھا۔ ان ڈھیلوں کے بازو ہی پیسوں کا صندوق دھوا رہتا۔ لڑکی ڈھیلے کی چوٹ کھا کر سر تھاں کر بیٹھی۔ دوسری لڑکی ایک موڑ کے پردہ کے پاس بھیک مانگتی کھڑی رہی۔ اسے ایک پیسہ ملا۔ دوسری لڑکی کے پیچھے پیچھے موڑ چلی گئی۔ ایک پر دے لگا ہوا تانگہ گزرنے لگا تو اس میں سے ایک چھوٹے بچے نے سر نکالا اور مٹھائی کے لئے پل گیا۔ تانگہ رکوا یا گیا۔ اور مٹھائی لینے کے بعد بھر سے چل پڑا۔ وہ دونوں لڑکیاں اس تانگے کے پیچھے بھاگنے لگیں۔ ان کے پاؤں اور زبائیں مٹھین کی طرح چل رہی تھیں۔ دو بھکاری

روایکوں اور ایک تازہ دم گھوڑے کا مقابلہ تھا۔ میں دور تک ان کو دیکھتا رہا۔ آخر ایک لمبی ٹھوکر کھاکر چڑی میں نے اپنی گردن پھیر لی اور دوسری طرف دیکھنے لگا۔ ایک دکان پر بھیڑ لگ رہی تھی۔ معلوم ہوا سسٹے دکان کی دکان ہے، پیسے دے کر ایسی شکل سے اناج ملے۔ یہ عذاب الہی نہیں تو پھر کیا ہے۔ بڑے کتنا رہے ہیں جو ان آگے بڑھ رہے ہیں۔ عورتیں ان کے پیچھے جگ نکال رہی ہیں لیکن سارے مجمع میں ایک سنسنی سی پھیلی ہوئی تھی۔ اناج بہر صورت حاصل کرنے کا مصمم اور خوفناک راہ وہ ان کے چہروں سے اظہار تھا۔ بیٹا! تیری جے۔ ایک سیٹھ صاحب ایسے گاہک سے بچ رہے تھے۔ ”کیوں بھائی کچھ سا شلر زندہ ہے کہتے ہیں“ گاہک نے جواب دیا۔ ”بشک نہیں رسکتا سیٹھ صاحب“ سیٹھ صاحب نے کہا ”تو پھر جنگ بھی ہوگی“ ”اں“ گاہک نے جواب دیا۔ ”اچھا چاول کا کیا بھلا ہے“ سیٹھ صاحب نے کہا ”چاول نہیں ہیں ہمارے پاس“ گاہک آگے بڑھ گیا۔ مزدور۔ اس سے کچھ کچھ بھری ہوئی ایک لاری سامنے سے گزری۔ مزدور کھاتے ہوئے جا رہے تھے۔ انہیں مزدور یاں بھی بڑھی چڑھی لی نہی تھیں اور سواری کے لئے موٹر بھی..... مر جائے شلر نہ کرے! جب میں ایک ہوئی کے قریب پہنچا تو مجھے وہ ریکارڈ سنائی دیا جس کی موسیقی میرے دل پر جا رہی تھی۔ مجھے اس گانے کے بول یاد تھے۔ طرزیادہ ہو گئی تھی۔ میں گنگنا سکتا تھا، گانہ نہیں سکتا تھا۔ میں ایک درخت کے نیچے ٹھہر گیا اور اس کے بول ذہن نشین کرنے لگا۔ ریکارڈ ختم ہو گیا تو میری خوشی کا ٹھکانہ نہ تھا۔ مجھے پورا ایت حرف بہ حرف یاد ہو گیا تھا۔ لیکن آگے بڑھتے ہوئے اسے ٹٹلنے کی جو کوشش کرتا ہوں تو ہائیں طرزی بھول گئی۔ سانگوں، رکشاؤں اور سائیکل سواریوں کو دیکھتے دیکھتے ہراسہ لگھوٹنے لگا۔ دنیا کی ہر چیز حرکت کر رہی تھی اور میں چاہتا تھا کہ ساری دنیا ٹھم جائے۔ ستھانا بھا جانے اور میں اکیلا دل بہلاتا ہوا ہر چیز کا معائنہ کرتا چروں۔ ٹانگے اپنے اڈوں پر کھڑے رہیں۔ رکشاؤں ٹھہر جائیں۔ سیکل رک جائیں۔ ٹوک اپنے اپنے گھروں میں بند ہو جائیں۔ دو دو فروش امانیہ کی چوٹی پر چلا جائے۔ ریکارڈ بھٹا رہے اور میں ٹھٹھا ہوا یا تیز تیز چلتا ہوا یا دوڑتا ہوا چاروں طرف گھوموں۔ چاروں طرف پھروں اور میری فرصت کا وقت گزرتا جائے۔ لیکن دنیا کے کاروبار کبھی بند نہیں ہوتے۔ یہ کل کبھی رکتی نہیں۔ میں کچھ مضحک اور بہت زیادہ بے کیف اپنے گھر میں داخل ہوا۔ ایک بوجھ سا میرے دل سے اتر گیا۔ سات بج چکے تھے اور مجھے سواٹ رات کا کھانا کھا کر سوجانے کے اور کوئی کام نہ تھا۔

رشید قریشی

من کی دنیا۔ حیدرآباد کے نوجوان افسانہ نگار رشید قریشی ایم اے کے افسانوں کا نفیس مجموعہ ہے۔ افسانوی ادب سے دلچسپی رکھنے والے ضرور اس کا مطالعہ کریں کتاب بہت دلچسپ اور انداز بیان نہایت شگفتہ ہے۔

ہر زمانہ رعنائی خیزان اور گنجی بیان کا بہترین نمونہ ہے۔ اردو کے نئے ادب سے دلچسپی رکھنے والے اور ترقی پسند نظریوں کے پرستار ان افسانوں کے مطالعہ سے ضرور محفوظ رہوں گے۔ جو اصحاب اردو کے جدید ترین افسانوں کا مطالعہ کرتے چاہتے ہیں وہ اس نوجوان مصنف کے ان پر کیف افسانوں سے ضرور لطف اندوز ہوں گے صفحات (۱۷) قیمت تملہ سب رس کتاب گھر۔ خیرت آباد۔ سے طب فرمائیے

ابراہیم ظفر

گرم تھا۔ رعایا سے سن مانی مالگزاری وصول کی جا رہی تھی۔ پیٹ پہل تو ”وطنی مجلس“ نے خفیہ طور پر کام جاری رکھا اور جب رعایا کو کافی اکسا دیا گیا تو اضابطہ طور پر کھلم کھلا تقریریں ہونے لگیں، جلے مستعد کئے جانے لگے، ابراہیم ان سب کارہ نما تھا۔ عوام اس کے اشارے پر ناپٹے تھے۔ بالآخر بغاوت ہو گئی، واسدیو حاکم نزل مع اپنے ساتھیوں کے قتل کر دیا گیا۔

سورج مغربی ہواؤں کے پیچھے تیزی سے بھاگا چلا جا رہا تھا، آسمان پر کلاہی مکرے ادھر سے ادھر منڈلا رہے تھے۔ ایک سو اسی ہزار گھوڑے پر زل سے لکلا اور شاہی ہواؤں کو پیچھے چھوڑتا ہوا جیس میل پر ایک گاؤں میں جا کر دم لیا۔ گھوڑا پسینے میں نر بلر رہا تھا، گھوڑے کی پیٹھ تھکی اور یک معمولی سے مکان میں داخل ہوا۔

”کون ہے ابراہیم! تم آگے میں کب سے تمہارا راہ دکھ رہی تھی۔ میں تو آج بہت پریشان تھی، سنا ہے زل میں بغاوت ہو گئی۔ ابراہیم! تم یہ سب کیا کر رہے ہو بغاوت کو دینا آسان ہے اور اس کا نتیجہ؟ ابراہیم! یہ تم کیا کر رہے ہو؟ اپنی جان کو جان بوجھ کر خطرے میں ڈالنا کوئی عقل مند نہیں!“

”فاطمہ! تم اس کی فکر نہ کرو، سب ٹھیک ہو جائے گا۔“

اس نے نہ تو تم کو اصل بات بتائی ہی نہیں، سونگی تو پاگل ہو جاؤ گی۔ کہدو؟“

”ماں ہاں“

”اب تم فکر ہو“ اور اس نے جھک کر اس کی پیشانی چوم لی۔ وہ کھڑی اس کا منہ تک رہی تھی پھر ایک اس کے ہاتھ میں ”اب میں تمہارے بغیر یہاں نہیں رہ سکتی، اس لیے میں جی بہت گھبراتا ہوں، خوفناک خیالات تلاتے ہیں۔ رات کو کوئی مرتبہ جھج کر جاگ گئی“

”فاطمہ! اگر میں اب تمہیں اپنے ساتھ نہیں لے جا سکتا۔ زل میں ہر طرف بغاوت کی آگ پھیلی ہوئی ہے۔ گو شاہ حیدر آباد کو جلد ہی اطلاع ہو جائے گی لیکن وہ ابھی اس طرف

(اس افسانہ کا چلاٹ ان نصوص اور کہانیوں سے لیا گیا ہے جو زل کی پہاڑی بستی میں مشہور ہیں) مجید ”جہاں بنانا ہمارے جا سوسی نظام کے ذریعہ جو مملکت حیدر آباد کے طول و عرض میں جال کی طرح پھیل چکا ہے اس مرتبہ نہایت ہی اہم خبریں وصول ہوئی ہیں۔ جن میں سب سے پہلے پرگنہ نزل کے متعلق یہ کہ ابراہیم نامی ایک نوجوان نے نزل میں حکومت کے حکامات رعایا کو اکسایا ہے اور اگر اس طرف جلد توجہ نہ کی جائے تو بغاوت کا ہرجا سراج حیدر آباد کے طبقہ احرار کا ایک مشہور مزد تھا جس نے دوبار آصف جاہی میں یہ کیفیت پیش کرنے کی عورت حاصل کی۔

”ہم بہت جلد توجہ کر رہے ہیں“ اعلیٰ حضرت نے ارشاد فرمایا اس کے بعد دوسرے اور اہم معاملات پیش کئے گئے۔

زل، ایک پہاڑی بستی ہے کئی تالاب دار علاقہ کی شکل میں اس کو گھیرے ہوئے ہیں، ان تالابوں کے سروں پر چاروں طرف سیاہ دیوہیکل پہاڑ زل کے سنتری کی خدمات انجام دیتے ہیں۔ انیس سال قبل سپاہیوں کا ایک گروہ زل آیا تھا۔

”یہ سامنے کوٹھی بستی ہے“ سردار نے اپنے ساتھیوں سے دریافت کیا۔ ”یہ بستی زل کہلاتی ہے سردار“ بڑا ہی ریح افزہ مقام معلوم ہوتا ہے۔ بہتر ہے چند دن میں قیام کیا جائے، سینے کی سبھوں نے یہیں سکونت اختیار کر لی اور تجارت کو ذریعہ معاش بنالیا۔ ان کا شمار متول گھرانوں میں ہونے لگا۔ سردار کے گھر ایک لڑکا پیدا ہوا جس کا نام ابراہیم رکھ گیا۔ ابراہیم زل ہی کو اپنے اسلاف کا وطن سمجھتا تھا۔

”وطنی مجلس“ کے صدر ابراہیم اور مجلس کی متفقہ طور پر یہ رائے قرار پائی کہ زل کے حکام کو سرزادی جانی چاہئے۔ اس لئے کہ شاہ وقت دوسرے کاموں میں مشغول تھے اور ان حکام کو جیسے قید سے رہائی مل گئی۔ رشوت خانی کا بازار

کے لئے تیار تھی۔

”جہاں پناہ! وہی ہو جس کا امیٹھ تھا“ خدمت عالی میں آج سے ڈیڑھ سال قبل یہ عرض کیا تھا کہ نزل میں ابراہیم بھی ایک شخص رعایا کو حکومت کے خلاف بغاوت کرنے کی ترغیب دے رہا ہے اور اب وہی ”ابراہیم ظفر“ کے نام سے وہاں حکومت کر رہا ہے۔ نزل اس کا پائے تخت ہے ہمارے نمائندوں کو قتل کر دیا گیا ہے“

”بہت عالی بہت شخص معلوم ہوتا ہے“ اعلیٰ حضرت نے ارشاد فرمایا۔ ”حضور! باغی کو کیسے کرنا؟ ان کے پہنچانے کے لئے غلام کو اجازت مرحمت فرمائی جائے“

”یہ تو بہت معمولی سا کام ہے سراج! خیر، تمہیں اجازت دیتے ہیں“ اور پھر دربار ختم کرتے ہوئے سراج سے مسکرا کر فرمایا ”اس کی رگوں میں بھیجا بہادروں کا خون معلوم ہوتا ہے سراج!“

ایک ہی جھپٹے میں سراج نے اپنی فوج کو تیار کر کے نزل کی طرف کوچ کیا۔ ابراہیم ظفر کو جاسوسوں نے سراج کی آمد کی اطلاع دی اور نزل میں بھی اہل بگڑ بگڑ گیا۔

سراج تمہارا تیزی سے تین ہی دن میں نزل پہنچ گیا اور دیارے گوداوری کے دوسرے کنارے پر پڑاؤ ڈال کر لڑی۔ دوسرے ہی دن ”شام گڑھ“ پر حملہ ہوا۔ دن تمام خونریز لڑائی ہوئی رہی۔ ایک طرف سے گوندوں کے بے حد دریشان سن سنے دوسری طرف شام گڑھ کے اونچے قلعے سے آتش باری، سراج کی فوج میں سراپا لگی کے آثار نمایاں ہونے لگے۔ رات ہو گئی اور لڑائی دوسرے دن کے لٹوئی ہو گئی۔

دوسرے دن صبح سراج نے اپنے دو جنرل اور دو مشیران خاص ڈیڑوں میں مرہ پائے، بڑی جراتی ہوئی۔ سراج نے خود فوج کی کمان لی لیکن دوپہر ہونے ہونے تک انتشاری پہاڑوں کی گرمی اور سب سے زیادہ گوندوں کے عجیب طرز جنگ نے سراج کو ہراساں کر دیا اور رات ہونے ہونے تک سراج اپنی فوج نے کہ نزل سے بھاگ رہا تھا۔ ابراہیم ظفر کے گوند پستان نے کئی میل تک اس کا پیچھا کیا۔

معلوم ہونے کے قابل نہیں ہیں۔ وہ آج کل سلطنت کے دوسرے اور اہم معاملات میں الجھے ہوئے ہیں“ پھر اچھو بد لک

”نزل میں کل مابدولت کی رسم تاج پوشی منائی جائے گی اور کل صابک خدمت میں شخصے روانہ کئے جائیں گے۔ غلطی تم خواہ خواہ افسردہ ہو رہی ہو تمہیں تو خوش ہونا چاہئے۔ کل تمہارے ابراہیم کی رسم تلخ پوشی ہے اور ہاں میں تو یہ کہنا بھول ہی گیا کہ سال یا ڈیڑھ سال کے بعد ہماری شادی بھی.....“ اور اس نے مسکرا کر غلطی کی طرف دیکھا، غلطی کے زخماں نگاروں کی طرح تپ رہے تھے۔

ابراہیم نے کپڑے اتارے اور چار پائی پریٹ گیا۔ غلطی اس کے لئے گلاس میں دودھ لے آئی اور اس نے مسکراتے ہوئے اسے لے کر پی لیا کچھ دیر آرام کے بعد وہ زحمت ہونے لگا۔ ستارے آسمان پر پھل آئے تھے۔ ان کی چھاؤں میں دوڑن خزاں خزاں گھر سے نکلے۔ پھر ایک جگہ رک گئے۔

”ہم بہت جلد میں گئے غلطی! ارے، تمہاری آنکھوں میں آنسو پہلے! پسای کی پیوی اور آنسو؟ غلطی! تم پسای کی ہونے والی پیوی ہو“

اور غلطی کے آنکھیں جیسے ان آنسوؤں کو پی لگیں۔ ”اچھا! اب ذرا تمس دو“ اس نے کہا اور وہ مسکرا دی، چاند بادلوں کے پیچھے چھپ گیا۔

”ابراہیم ظفر الدولہ“ کی رسم تاج پوشی بڑے نزک، منتظا سے منائی گئی اور خود مختاری کا اعلان کر دیا گیا، نزل کے پر رہنے والے کے پیروں پر مسکرا ہٹ ناچ رہی تھی، مسکراہٹیں پیچھے پہل پہل، ذہن نقادے، نزل دہن کی طرح سجایا گیا تھا۔

باضابطہ طور پر حکومتی نظام تمام ہو گیا۔ ایک ہی سال کے اندر اندر رعایا خوش حالی کی زندگی بسر کرنے لگی۔ ایک فارغ ہوتے ہی ابراہیم ظفر نے حفاظتی تدابیر شروع کیں کیونکہ خطرہ روز بروز بڑھتا جا رہا تھا ستارہ آئی ہوئی خروں سے جنگ کا امکان قوی تر ہوتا جا رہا تھا۔

نزل کے اطراف، مخدقوں، قلعوں، موجوں وغیرہ کی تعبیر شروع ہو گئی اور فوج میں بھرتی بھی تین چار مہینوں کے اندر اندر تقریباً دس ہزار فوج باقاعدہ نزل کی حفاظت

منظر تھا، ابراہیم ظفر مجبور ہو گیا اور اس نے اپنی فوج کا بیشتر حصہ بتیس گز گڑھ پہنچا دیا۔ شاہی فوجوں نے بتیس گڑھ کا محاصرہ کر لیا۔

”حضور! صلح کر لینی بہتر ہے“ ایک فوجی افسر نے کہا

”جنگ جاری رکھو جبار!“

”جہاں پناہ!“

”یہ میرا حکم ہے“

”مگر حضور“

ٹھائیں اور جبار اس کی فوج کا ایک افرزین برفوں میں بوٹ رہا تھا۔

”ہم اپنے آخری قطرہ خون تک جنگ جاری رکھیں گے“

اسد!“

”بے شک، جہاں پناہ“

”ہم بہادروں کی موت مرنا پسند کرتے ہیں“

ابراہیم ظفر خود چار دستوں کے ساتھ ایک سرنگ کے ذریعہ سے

شاہی فوج کے پچھلے حصے پر نمودار ہوا، شاہی فوج آسانی سے

پکڑ گئی، شاہی کماندار پریشان ہو گیا۔ لیکن جلد ہی اپنی فوج

کو اس نے دو حصوں میں تقسیم کر دیا اور اڑائی نے شدت

افتیاد کر لی۔ ابراہیم ظفر اپنے ایک جرنیل کے سپرد یہ کام

کر کے قلعہ میں واپس آ گیا۔

”اوہ! تو بچی دیکھتے نہیں ہو، کیا کر رہے ہو؟“

وہ شیر کی طرح غرایا۔

”ہماری فوج کے اس حصے پر زیادہ دباؤ پڑ رہا ہے

توپوں کے دبانے اس طرف پلٹ دو، تم ہٹ جاؤ، گڑھے ختم“

اور اس نے توپچی کی جگہ سنبھالی۔ آتشباری تیر سے تیز تر

ہو گئی، نرمی جرنیل جو میدان میں شاہی فوج سے مقابلہ

کر رہا تھا اپنی جگہ پر جما ہوا تھا۔

”قلعہ کی اس طرف کی توپ سے“ شاہی کمان دار

نے بائیں طرف اشارہ کیا ”بہت زیادہ آتشباری ہو رہی ہے

ہماری فوج پر نشان ہو رہی ہے، خدا نخواستہ کہیں۔۔۔

اس توپچی کو ختم کر دو“ اور ایک افسر اس توپچی کی تاک

میں نکلا ہوا تھا۔ زلی جرنیل جڑھ بڑھ کر کھٹک رہا تھا۔

قلعہ کی طرف سے آتشباری میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔

ابراہیم ظفر کا چہرہ کھیل گیا۔ دو اپنی جگہ سے اٹھا تاکہ

دوسری طرف سے آتشباری تیز کرنے کا حکم دے۔

ٹھائیں!

آہ! اسد! بائیں طرف کی آتش باری.....

اور تیز..... کر دو“

”جہاں پناہ! یہ کیا ہو گیا حضور کو“

”چاؤ! اسد..... تم چاؤ..... پہلے چاؤ“

اور ابراہیم ظفر دم سے زمین پر گر گیا۔

”میرے سرتاج!“

”کون..... فاطمہ..... میری فاطمہ.....“

تم یہاں کیسے آ گئیں.....“

اڑائی زوروں پر جاری تھی۔

”میرے سرتاج یہ کیا ہو گیا آپ کو؟“ اٹ خدا یا.....

.....

اور ابراہیم ظفر مسکرانے لگا۔

”فاطمہ۔۔۔ ہنو۔۔۔ ہنو۔۔۔ ایک بار.....“ میں بہادروں

..... کی موت..... مر رہا ہوں۔

فاطمہ! میں..... بہت خوش ہوں..... بہت“ اس کا سر

فاطمہ کی گود میں تھا۔ سینے سے خون بہہ رہا تھا اور وہ مسکرا

رہا تھا۔

فاطمہ! وطن کی فاطمہ سب کچھ.....“

ایک ہی گھنٹہ بعد آصفی پرچم..... بتیس گڑھ..... پر اہل

رہا تھا اور ابراہیم ظفر..... اپنی محبوبہ کی آغوش میں

ابدی نیند سو رہا تھا۔

عبدالحمید (عثمانیہ)

وضع جسمانی

اس سے قبل کی تقریر میں میں نے بچپن کے زمانے کی وضع جسمانی کی نوعیت کو ضروری توضیحات کے ساتھ پیش کر کے اس کے اصلاحی پہلو کو واضح کیا تھا۔ آج کی تقریر میں زمانہ بلوغ کی وضع جسمانی پر روشنی ڈالی جائے گی۔ میں اس امر کی توضیح کی کوشش کروں گا کہ زمانہ بلوغ زندگی میں کس قدر اہم ہے اس زمانہ میں وضع جسمانی کی پرورش کس نوعیت پر ہونی چاہیے اور وہ کونسے ایسے داخلی اور خارجی امور ہیں جو زمانہ بلوغ وضع جسمانی پر خوش گوار یا غیر خوش گوار اثرات مرتب کرتے ہیں اور جس سے جوانی ادھیڑ سن اور بڑاپے کے زمانے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتے۔

بلوغ کا دور مختلف ممالک میں آب و ہوا کے لحاظ سے مختلف ہے۔ سرد ممالک میں بالعموم ۱۹-۲۰ اور ۲۱ سال کے درمیان زمانہ بلوغ میں قدم رکھتے ہیں لیکن گرم ممالک میں بچے کسی قدر قبل ہی بالغ ہو جاتے ہیں۔ ہمارے یہاں بچے بالعموم ۱۶-۱۷ اور ۱۸ سال کے درمیان بلوغ کے دور میں جاتے ہیں اور لڑکیاں ۱۵-۱۶ اور ۱۷ سال کے درمیان بلوغ کے زمانے میں پہنچ جاتی ہیں جنرالی حالات کے علاوہ غذا اور اس کی نوعیت کا تعلق بھی بلوغ کے دور سے بہت زیادہ ہے۔

گرم ممالک اور اور جڑی خور کھانے والے بچے اس لیے بھی جلد زمانہ بلوغ کو پہنچتے دکھائی دیتے ہیں۔ قطع نظر اس تعلیمات کو بھی اس زمانے کے قبل از قبل آغاز سے زیادہ تعلقی ہے۔ جسمانی سیلان اور اس کے متعلق معلومات کی فراہمی بچے میں نفرت مروجہ ہے۔ انھیں معلومات کے حصول میں اگر اس کی صحیح رہبری نہ ہو تو وہ خود اس کی کھرج میں زکاہ کرتا ہے۔ عام حالات اور اس کے نتائج کے معلقہ راستے یہ کہنا بجا نہ ہوگا کہ اس قسم کی طبعی اور اس کے راستہ یا بالواسطہ کھوج کے طریقے بالعموم گمراہ کن ہی ہو کر رہتے ہیں۔ وہ تمام اعلیٰ اور

مقدس تعلیمات جو جسمانی اعتبار سے دل اور دماغ میں پختہ پانے چاہئیں ان کی بجائے وہ نفسانی خواہشات کا شکار ہو کر اپنی انسانی قدر و قیمت کو کھو بیٹھتے ہیں۔ اسی وجہ سے ہر مذہب میں بلوغ کے آغاز کے ساتھ ہی ہر انسان پر مذہبی پابندیاں عائد کر دی گئی ہیں۔ جسمانی تعلقات کو اس قدر تیار کر دینا کہ ترین حالت میں واضح کئے گئے ہیں جن میں ذمائی فطرتیں ایک گناہ گیرہ بن جاتی ہے۔ ہر حال اس مخصوص میں میں تفصیلات میں جانا نہیں چاہتا بلکہ صرف اس قدر اشارہ کئے دیتا ہوں کہ بچے کے بزرگوں کا یہ فرض ہے کہ اس میں جسمانی تعلیمات اور اس کی ذرا بچی کے حلیے اس پر برا یہ ہیں جیسا کہ جن کے ذریعہ ایک پاک اور مقدس خیال اس کے دماغ پر مسلط ہو جائے تاکہ وہ گمراہی سے بچ سکے اور اپنی زندگی کو تباہ و برباد نہ ہونے دے۔ چنانچہ اسی خیالی کے تحت ہر ترقی یافتہ ملک میں جو بچے نوجوانوں کو تندرست اور قوی تر بنانا چاہتے ہیں، جسمانی تعلیم ان بچوں کے لئے عام اور لازمی کر دی گئی جو زمانہ بلوغ کے قریب تر ہیں۔ غرض مجھے یہاں یہ بتانا مقصود تھا کہ قبل از قبل جسمانی تعلیمات کو چاہیے جس سے بھی بلوغ کے زمانے کا آغاز کسی لڑکے یا لڑکی پر ہونے لگتا ہے۔

زمانہ بلوغ دراصل بچپن اور جوانی کے درمیان کا مدتی صل ہے۔ انسان تعلیمات کے لائق ہے یہی سبب ہے کہ یا معاشی تعلیمات کو پیش نظر رکھتے ہوئے اپنی زندگی کا مقصد کچھ ہی معین کر لے لیکن قدرت انسان سے بچا اور ہی قریب رہتی ہے۔ زمانہ بلوغ میں انسان میں جسمانی سیلان کی پیدائش قدرت کی جانب سے ہوتی ہے۔ اس سیلان کو پیدا کرنے کا یہ فنکار ہے کہ انسان اس سیلان کی تیار کرے کہ آئندہ اس کو ایک باب و اماں بنائے اور اس شخص میں صحیح معلومات حاصل کرنے کی کوشش کرے تاکہ اس کی ہونے والی بود و بودا اور طاقتور ہو سکے۔

ابھی جو ہم نے بتایا کہ بلوغیت کا زمانہ تیار ہی کا زمانہ ہے۔

اگر ان کا قد ۵ فٹ ۹ ۱/۲ انچ ہو تو ان کا معیاری وزن ۱۳۴ پونڈ ہو

۵	۹	۱۳۸
۵	۱۰	۱۴۲
۵	۱۱	۱۴۶
۶	۱	۱۵۰

یہ ۱۶ سال کی عمر والے بچوں کا معیاری وزن ہے
ہم ۱۶ سال کی عمر والے بچوں کا، ان کے قد کے لحاظ سے معیاری وزن بتاتے ہیں۔

اگر ان کا قد ۵ فٹ ۱۱ ۱/۲ انچ ہو تو ان کا معیاری وزن ۱۵۰ پونڈ ہو

۵	۱	۱۰۰
۵	۲	۱۰۵
۵	۳	۱۱۰
۵	۴	۱۱۵
۵	۵	۱۲۰
۵	۶	۱۲۵
۵	۷	۱۳۰
۵	۸	۱۳۵
۵	۹	۱۴۰
۵	۱۰	۱۴۵
۵	۱۱	۱۵۰
۶	۱	۱۵۵

اسی طرح اب ہم ۱۷ سال کے لڑکوں کے ان کے قد کے

لحاظ سے معیاری وزن بتا رہے ہیں۔ ۱۷ سال میں بالغ

ہونے والے بچوں کا قد ۵ فٹ ۱۰ ۱/۲ انچ ہے ان کا قد ۵ فٹ

۱۱ ۱/۲ انچ سے لے کر ۶ فٹ ۱ ۱/۲ انچ تک بھی معیاری وزن بتائے

اگر ان کا قد ۵ فٹ ۱۱ ۱/۲ انچ ہو تو ان کا معیاری وزن ۱۶۰ پونڈ ہو

۵	۱	۱۱۵
۵	۲	۱۱۶
۵	۳	۱۱۷

اس زمانے میں وضع جسمانی میں کئی ایک تغیرات رونما ہوتے ہیں۔ بچوں میں نمودار ہوتا ہے اس لئے اسی مناسبت سے گشت میں اضافہ ہوتا ہے۔ جسمی نظام پر بھی اس کا گہرا اثر پڑتا ہے۔ گو یا جسم اور دماغ ہر دو میں تغیرات رونما ہوتے ہیں۔ بلوغ کا زمانہ جس قدر مختصر ہے اسی قدر زیادہ اہم بھی ہے۔ اس نچلے میں اگر وضع جسمانی کی دیکھ بھال نہ کی جائے تو اس کا برا اثر جوانی اور اس کے بعد اوپر بڑھنے اور بڑھاپے پر ضرور پڑتا ہے۔ دو بار بلوغ میں سب سے پہلے وضع جسمانی کی مبالغہ قد کے نوادر جسم کے وزن سے کی جاتی ہے۔ اہر ان وضع جسمانی نے عمر کے لحاظ سے قد اور وزن میں مختلف تحریکات کی بنا پر یہ خاص نتائج ملے۔ اگر دیکھیں ہیں ان کو کئی خاص فکر معیاری وزن آپ جانتے ہیں۔ یہ وزن انسانی جسم کی اہمیت ہے۔ اس سے وضع جسمانی کی موافقت ہونا بہت ضروری کام ہے۔ جانتے ہیں۔ معیاری وزن کا انکوئی بھی قسم کی آپ دیکھو: یہ قد کی نوعیت پر مشتمل ہے۔ اہمیت آپ کو اپنے فائدے کی آپ دیکھو اور نوعیت کے لحاظ سے دیکھو واضح کرتے ہیں کہ زمانہ بلوغ میں درجہ کا معیار کیا ہوتا ہے۔ سب سے پہلے ہم آپ کو بتاتے ہیں کہ ان کو ان کا معیاری وزن ہر روز بلوغ سے پہلے اور بعد کے لحاظ سے کیا ہوا ہے۔

۱۷ سال کی عمر کے بچے

اگر ان کا قد ۵ فٹ ۱۱ ۱/۲ انچ ہو تو ان کا معیاری وزن ۱۶۰ پونڈ ہو

۵	۱	۱۱۵
۵	۲	۱۱۶
۵	۳	۱۱۷
۵	۴	۱۱۸
۵	۵	۱۱۹
۵	۶	۱۲۰
۵	۷	۱۲۱
۵	۸	۱۲۲
۵	۹	۱۲۳
۵	۱۰	۱۲۴
۵	۱۱	۱۲۵
۶	۱	۱۲۶

اگر ان کا قد ۵ فٹ ۵ انچ ہو تو ان کا معیاری وزن ۱۲۷ پونڈ ہو	اگر ۱۵ سال کی لڑکیوں کا قد ۵ فٹ ۱۰ انچ ہو تو ان کا معیاری وزن ۱۳۶ پونڈ ہو
۵ ۶ ۱۳۰	۵ ۵ ۱۳۵
۵ ۷ ۱۳۲	۵ ۶ ۱۳۵
۵ ۸ ۱۳۶	۵ ۷ ۱۳۵
۵ ۹ ۱۴۰	۵ ۸ ۱۳۵
۵ ۱۰ ۱۴۵	۵ ۹ ۱۳۵
۵ ۱۱ ۱۵۰	۵ ۱۰ ۱۳۵
۵ ۱۲ ۱۵۵	۵ ۱۱ ۱۳۵
۵ ۱۳ ۱۶۰	۵ ۱۲ ۱۳۵
۵ ۱۴ ۱۶۵	۵ ۱۳ ۱۳۵
۵ ۱۵ ۱۷۰	۵ ۱۴ ۱۳۵
۵ ۱۶ ۱۷۵	۵ ۱۵ ۱۳۵
۵ ۱۷ ۱۸۰	۵ ۱۶ ۱۳۵
۵ ۱۸ ۱۸۵	۵ ۱۷ ۱۳۵
۵ ۱۹ ۱۹۰	۵ ۱۸ ۱۳۵
۵ ۲۰ ۱۹۵	۵ ۱۹ ۱۳۵
۵ ۲۱ ۲۰۰	۵ ۲۰ ۱۳۵
۵ ۲۲ ۲۰۵	۵ ۲۱ ۱۳۵
۵ ۲۳ ۲۱۰	۵ ۲۲ ۱۳۵
۵ ۲۴ ۲۱۵	۵ ۲۳ ۱۳۵
۵ ۲۵ ۲۲۰	۵ ۲۴ ۱۳۵
۵ ۲۶ ۲۲۵	۵ ۲۵ ۱۳۵
۵ ۲۷ ۲۳۰	۵ ۲۶ ۱۳۵
۵ ۲۸ ۲۳۵	۵ ۲۷ ۱۳۵
۵ ۲۹ ۲۴۰	۵ ۲۸ ۱۳۵
۵ ۳۰ ۲۴۵	۵ ۲۹ ۱۳۵
۵ ۳۱ ۲۵۰	۵ ۳۰ ۱۳۵
۵ ۳۲ ۲۵۵	۵ ۳۱ ۱۳۵
۵ ۳۳ ۲۶۰	۵ ۳۲ ۱۳۵
۵ ۳۴ ۲۶۵	۵ ۳۳ ۱۳۵
۵ ۳۵ ۲۷۰	۵ ۳۴ ۱۳۵
۵ ۳۶ ۲۷۵	۵ ۳۵ ۱۳۵
۵ ۳۷ ۲۸۰	۵ ۳۶ ۱۳۵
۵ ۳۸ ۲۸۵	۵ ۳۷ ۱۳۵
۵ ۳۹ ۲۹۰	۵ ۳۸ ۱۳۵
۵ ۴۰ ۲۹۵	۵ ۳۹ ۱۳۵
۵ ۴۱ ۳۰۰	۵ ۴۰ ۱۳۵
۵ ۴۲ ۳۰۵	۵ ۴۱ ۱۳۵
۵ ۴۳ ۳۱۰	۵ ۴۲ ۱۳۵
۵ ۴۴ ۳۱۵	۵ ۴۳ ۱۳۵
۵ ۴۵ ۳۲۰	۵ ۴۴ ۱۳۵
۵ ۴۶ ۳۲۵	۵ ۴۵ ۱۳۵
۵ ۴۷ ۳۳۰	۵ ۴۶ ۱۳۵
۵ ۴۸ ۳۳۵	۵ ۴۷ ۱۳۵
۵ ۴۹ ۳۴۰	۵ ۴۸ ۱۳۵
۵ ۵۰ ۳۴۵	۵ ۴۹ ۱۳۵
۵ ۵۱ ۳۵۰	۵ ۵۰ ۱۳۵
۵ ۵۲ ۳۵۵	۵ ۵۱ ۱۳۵
۵ ۵۳ ۳۶۰	۵ ۵۲ ۱۳۵
۵ ۵۴ ۳۶۵	۵ ۵۳ ۱۳۵
۵ ۵۵ ۳۷۰	۵ ۵۴ ۱۳۵
۵ ۵۶ ۳۷۵	۵ ۵۵ ۱۳۵
۵ ۵۷ ۳۸۰	۵ ۵۶ ۱۳۵
۵ ۵۸ ۳۸۵	۵ ۵۷ ۱۳۵
۵ ۵۹ ۳۹۰	۵ ۵۸ ۱۳۵
۵ ۶۰ ۳۹۵	۵ ۵۹ ۱۳۵
۵ ۶۱ ۴۰۰	۵ ۶۰ ۱۳۵
۵ ۶۲ ۴۰۵	۵ ۶۱ ۱۳۵
۵ ۶۳ ۴۱۰	۵ ۶۲ ۱۳۵
۵ ۶۴ ۴۱۵	۵ ۶۳ ۱۳۵
۵ ۶۵ ۴۲۰	۵ ۶۴ ۱۳۵
۵ ۶۶ ۴۲۵	۵ ۶۵ ۱۳۵
۵ ۶۷ ۴۳۰	۵ ۶۶ ۱۳۵
۵ ۶۸ ۴۳۵	۵ ۶۷ ۱۳۵
۵ ۶۹ ۴۴۰	۵ ۶۸ ۱۳۵
۵ ۷۰ ۴۴۵	۵ ۶۹ ۱۳۵
۵ ۷۱ ۴۵۰	۵ ۷۰ ۱۳۵
۵ ۷۲ ۴۵۵	۵ ۷۱ ۱۳۵
۵ ۷۳ ۴۶۰	۵ ۷۲ ۱۳۵
۵ ۷۴ ۴۶۵	۵ ۷۳ ۱۳۵
۵ ۷۵ ۴۷۰	۵ ۷۴ ۱۳۵
۵ ۷۶ ۴۷۵	۵ ۷۵ ۱۳۵
۵ ۷۷ ۴۸۰	۵ ۷۶ ۱۳۵
۵ ۷۸ ۴۸۵	۵ ۷۷ ۱۳۵
۵ ۷۹ ۴۹۰	۵ ۷۸ ۱۳۵
۵ ۸۰ ۴۹۵	۵ ۷۹ ۱۳۵
۵ ۸۱ ۵۰۰	۵ ۸۰ ۱۳۵
۵ ۸۲ ۵۰۵	۵ ۸۱ ۱۳۵
۵ ۸۳ ۵۱۰	۵ ۸۲ ۱۳۵
۵ ۸۴ ۵۱۵	۵ ۸۳ ۱۳۵
۵ ۸۵ ۵۲۰	۵ ۸۴ ۱۳۵
۵ ۸۶ ۵۲۵	۵ ۸۵ ۱۳۵
۵ ۸۷ ۵۳۰	۵ ۸۶ ۱۳۵
۵ ۸۸ ۵۳۵	۵ ۸۷ ۱۳۵
۵ ۸۹ ۵۴۰	۵ ۸۸ ۱۳۵
۵ ۹۰ ۵۴۵	۵ ۸۹ ۱۳۵
۵ ۹۱ ۵۵۰	۵ ۹۰ ۱۳۵
۵ ۹۲ ۵۵۵	۵ ۹۱ ۱۳۵
۵ ۹۳ ۵۶۰	۵ ۹۲ ۱۳۵
۵ ۹۴ ۵۶۵	۵ ۹۳ ۱۳۵
۵ ۹۵ ۵۷۰	۵ ۹۴ ۱۳۵
۵ ۹۶ ۵۷۵	۵ ۹۵ ۱۳۵
۵ ۹۷ ۵۸۰	۵ ۹۶ ۱۳۵
۵ ۹۸ ۵۸۵	۵ ۹۷ ۱۳۵
۵ ۹۹ ۵۹۰	۵ ۹۸ ۱۳۵
۵ ۱۰۰ ۵۹۵	۵ ۹۹ ۱۳۵
۵ ۱۰۱ ۶۰۰	۵ ۱۰۰ ۱۳۵
۵ ۱۰۲ ۶۰۵	۵ ۱۰۱ ۱۳۵
۵ ۱۰۳ ۶۱۰	۵ ۱۰۲ ۱۳۵
۵ ۱۰۴ ۶۱۵	۵ ۱۰۳ ۱۳۵
۵ ۱۰۵ ۶۲۰	۵ ۱۰۴ ۱۳۵
۵ ۱۰۶ ۶۲۵	۵ ۱۰۵ ۱۳۵
۵ ۱۰۷ ۶۳۰	۵ ۱۰۶ ۱۳۵
۵ ۱۰۸ ۶۳۵	۵ ۱۰۷ ۱۳۵
۵ ۱۰۹ ۶۴۰	۵ ۱۰۸ ۱۳۵
۵ ۱۱۰ ۶۴۵	۵ ۱۰۹ ۱۳۵
۵ ۱۱۱ ۶۵۰	۵ ۱۱۰ ۱۳۵
۵ ۱۱۲ ۶۵۵	۵ ۱۱۱ ۱۳۵
۵ ۱۱۳ ۶۶۰	۵ ۱۱۲ ۱۳۵
۵ ۱۱۴ ۶۶۵	۵ ۱۱۳ ۱۳۵
۵ ۱۱۵ ۶۷۰	۵ ۱۱۴ ۱۳۵
۵ ۱۱۶ ۶۷۵	۵ ۱۱۵ ۱۳۵
۵ ۱۱۷ ۶۸۰	۵ ۱۱۶ ۱۳۵
۵ ۱۱۸ ۶۸۵	۵ ۱۱۷ ۱۳۵
۵ ۱۱۹ ۶۹۰	۵ ۱۱۸ ۱۳۵
۵ ۱۲۰ ۶۹۵	۵ ۱۱۹ ۱۳۵
۵ ۱۲۱ ۷۰۰	۵ ۱۲۰ ۱۳۵
۵ ۱۲۲ ۷۰۵	۵ ۱۲۱ ۱۳۵
۵ ۱۲۳ ۷۱۰	۵ ۱۲۲ ۱۳۵
۵ ۱۲۴ ۷۱۵	۵ ۱۲۳ ۱۳۵
۵ ۱۲۵ ۷۲۰	۵ ۱۲۴ ۱۳۵
۵ ۱۲۶ ۷۲۵	۵ ۱۲۵ ۱۳۵
۵ ۱۲۷ ۷۳۰	۵ ۱۲۶ ۱۳۵
۵ ۱۲۸ ۷۳۵	۵ ۱۲۷ ۱۳۵
۵ ۱۲۹ ۷۴۰	۵ ۱۲۸ ۱۳۵
۵ ۱۳۰ ۷۴۵	۵ ۱۲۹ ۱۳۵
۵ ۱۳۱ ۷۵۰	۵ ۱۳۰ ۱۳۵
۵ ۱۳۲ ۷۵۵	۵ ۱۳۱ ۱۳۵
۵ ۱۳۳ ۷۶۰	۵ ۱۳۲ ۱۳۵
۵ ۱۳۴ ۷۶۵	۵ ۱۳۳ ۱۳۵
۵ ۱۳۵ ۷۷۰	۵ ۱۳۴ ۱۳۵
۵ ۱۳۶ ۷۷۵	۵ ۱۳۵ ۱۳۵
۵ ۱۳۷ ۷۸۰	۵ ۱۳۶ ۱۳۵
۵ ۱۳۸ ۷۸۵	۵ ۱۳۷ ۱۳۵
۵ ۱۳۹ ۷۹۰	۵ ۱۳۸ ۱۳۵
۵ ۱۴۰ ۷۹۵	۵ ۱۳۹ ۱۳۵
۵ ۱۴۱ ۸۰۰	۵ ۱۴۰ ۱۳۵
۵ ۱۴۲ ۸۰۵	۵ ۱۴۱ ۱۳۵
۵ ۱۴۳ ۸۱۰	۵ ۱۴۲ ۱۳۵
۵ ۱۴۴ ۸۱۵	۵ ۱۴۳ ۱۳۵
۵ ۱۴۵ ۸۲۰	۵ ۱۴۴ ۱۳۵
۵ ۱۴۶ ۸۲۵	۵ ۱۴۵ ۱۳۵
۵ ۱۴۷ ۸۳۰	۵ ۱۴۶ ۱۳۵
۵ ۱۴۸ ۸۳۵	۵ ۱۴۷ ۱۳۵
۵ ۱۴۹ ۸۴۰	۵ ۱۴۸ ۱۳۵
۵ ۱۵۰ ۸۴۵	۵ ۱۴۹ ۱۳۵
۵ ۱۵۱ ۸۵۰	۵ ۱۵۰ ۱۳۵
۵ ۱۵۲ ۸۵۵	۵ ۱۵۱ ۱۳۵
۵ ۱۵۳ ۸۶۰	۵ ۱۵۲ ۱۳۵
۵ ۱۵۴ ۸۶۵	۵ ۱۵۳ ۱۳۵
۵ ۱۵۵ ۸۷۰	۵ ۱۵۴ ۱۳۵
۵ ۱۵۶ ۸۷۵	۵ ۱۵۵ ۱۳۵
۵ ۱۵۷ ۸۸۰	۵ ۱۵۶ ۱۳۵
۵ ۱۵۸ ۸۸۵	۵ ۱۵۷ ۱۳۵
۵ ۱۵۹ ۸۹۰	۵ ۱۵۸ ۱۳۵
۵ ۱۶۰ ۸۹۵	۵ ۱۵۹ ۱۳۵
۵ ۱۶۱ ۹۰۰	۵ ۱۶۰ ۱۳۵
۵ ۱۶۲ ۹۰۵	۵ ۱۶۱ ۱۳۵
۵ ۱۶۳ ۹۱۰	۵ ۱۶۲ ۱۳۵
۵ ۱۶۴ ۹۱۵	۵ ۱۶۳ ۱۳۵
۵ ۱۶۵ ۹۲۰	۵ ۱۶۴ ۱۳۵
۵ ۱۶۶ ۹۲۵	۵ ۱۶۵ ۱۳۵
۵ ۱۶۷ ۹۳۰	۵ ۱۶۶ ۱۳۵
۵ ۱۶۸ ۹۳۵	۵ ۱۶۷ ۱۳۵
۵ ۱۶۹ ۹۴۰	۵ ۱۶۸ ۱۳۵
۵ ۱۷۰ ۹۴۵	۵ ۱۶۹ ۱۳۵
۵ ۱۷۱ ۹۵۰	۵ ۱۷۰ ۱۳۵
۵ ۱۷۲ ۹۵۵	۵ ۱۷۱ ۱۳۵
۵ ۱۷۳ ۹۶۰	۵ ۱۷۲ ۱۳۵
۵ ۱۷۴ ۹۶۵	۵ ۱۷۳ ۱۳۵
۵ ۱۷۵ ۹۷۰	۵ ۱۷۴ ۱۳۵
۵ ۱۷۶ ۹۷۵	۵ ۱۷۵ ۱۳۵
۵ ۱۷۷ ۹۸۰	۵ ۱۷۶ ۱۳۵
۵ ۱۷۸ ۹۸۵	۵ ۱۷۷ ۱۳۵
۵ ۱۷۹ ۹۹۰	۵ ۱۷۸ ۱۳۵
۵ ۱۸۰ ۹۹۵	۵ ۱۷۹ ۱۳۵
۵ ۱۸۱ ۱۰۰۰	۵ ۱۸۰ ۱۳۵
۵ ۱۸۲ ۱۰۰۵	۵ ۱۸۱ ۱۳۵
۵ ۱۸۳ ۱۰۱۰	۵ ۱۸۲ ۱۳۵
۵ ۱۸۴ ۱۰۱۵	۵ ۱۸۳ ۱۳۵
۵ ۱۸۵ ۱۰۲۰	۵ ۱۸۴ ۱۳۵
۵ ۱۸۶ ۱۰۲۵	۵ ۱۸۵ ۱۳۵
۵ ۱۸۷ ۱۰۳۰	۵ ۱۸۶ ۱۳۵
۵ ۱۸۸ ۱۰۳۵	۵ ۱۸۷ ۱۳۵
۵ ۱۸۹ ۱۰۴۰	۵ ۱۸۸ ۱۳۵
۵ ۱۹۰ ۱۰۴۵	۵ ۱۸۹ ۱۳۵
۵ ۱۹۱ ۱۰۵۰	۵ ۱۹۰ ۱۳۵
۵ ۱۹۲ ۱۰۵۵	۵ ۱۹۱ ۱۳۵
۵ ۱۹۳ ۱۰۶۰	۵ ۱۹۲ ۱۳۵
۵ ۱۹۴ ۱۰۶۵	۵ ۱۹۳ ۱۳۵
۵ ۱۹۵ ۱۰۷۰	۵ ۱۹۴ ۱۳۵
۵ ۱۹۶ ۱۰۷۵	۵ ۱۹۵ ۱۳۵
۵ ۱۹۷ ۱۰۸۰	۵ ۱۹۶ ۱۳۵
۵ ۱۹۸ ۱۰۸۵	۵ ۱۹۷ ۱۳۵
۵ ۱۹۹ ۱۰۹۰	۵ ۱۹۸ ۱۳۵
۵ ۲۰۰ ۱۰۹۵	۵ ۱۹۹ ۱۳۵

اب ہم ۱۵ سال کی لڑکیوں کا معیاری وزن ان کے
تد کے تناسب سے بتاتے ہیں جو لڑکیاں ۱۵ سال کی عمر میں
سین بولڈ میں داخل ہوتی ہیں وہ بالعموم بہت توانا اور
تندرست رہتی ہیں ایسی لڑکیاں عمدہ اور صحت مند
بچوں کی ماں بن سکتی ہیں ان میں توانائی کمزوریاں
جوان کی صحت کو تباہ کرتی ہیں۔ بہت کم پیدا ہوتی ہیں اور
ان کے بچے بھی نہایت توانا اور مضبوط توانائی کے ہوتے ہیں۔
بچپن کی اموات بہت کم ہوا کرتی ہیں۔ اب ۱۵ سال کی
لڑکیوں کا معیاری وزن بغیر سٹیٹ

۱۵ سال کی عمر رکھنے والی لڑکیوں کا وزن اگر وہ ۵ فٹ

موتا یا نہ صرف وضع جسمانی کو بھرا کر دیتا ہے بلکہ ایسے وضع جسمانی کی تمام کیفیات اور خیالات بھی کچھ نہ کچھ بعد اپن ضرورت سے ہوئے ہیں۔

زمانہ بلوغ میں وضع جسمانی کی تبدیلی میں متوازن غذا و موزوں ورزشوں کے علاوہ عادات کو بھی زیادہ دخل حاصل ہے۔ اس زمانہ میں اکثر یہ دیکھا جاتا ہے کہ بچہ اپنے آپ کو بچہ کہہ کر کھینچے لگتا ہے اس میں عقل و تجربہ کا تصور زیادہ پیدا ہو جاتا ہے وہ دیکھتا ہے کہ اس کے بڑے یا بزرگ کیا کرتے ہیں۔ اسی تصور میں وہ اپنے بڑوں کی عادات کو دیکھ کر اپنی عادات کو حاصل کرنے میں لگتا رہتا ہے۔ یہ ہماری بد قسمتی ہے کہ ہم بچے اپنے آپ کو بچوں کے بزرگ و سرپرست سمجھتے ہیں۔ اسی ایک ناقص عادات میں چھپے ہوئے ہیں۔ ہمارے کھانے پینے، اٹھنے بیٹھنے کی عادات میں صحت نہیں ہوتی۔ اس خصوص میں میں نے اس سے قبل کی تقریروں میں بہت کچھ وضع کی ہے لیکن زمانہ بلوغیت کے اعتبار سے بچوں کو جن عادات سے باز رکھنا ہے ان میں سگریٹ نوشی پائے نوشی، بان کا استعمال بہت پیش پیش ہیں۔ یہ عادتیں صحت بخش کسی طرح نہیں۔ یہ بظاہر کچھ لطف آجاتا ہے لیکن اس لطف کے پس منظر کوئی آفتیں نہیں ہیں۔ انی عاداتوں سے وضع جسمانی اور اس کی صحت و خوش حالت پر کافی برا اثر پڑتا ہے۔ بلوغ جو بیماری کا زمانہ ہے اس میں انقطاع پیدا ہو جاتا ہے۔ ان عاداتوں کے متعلق تفصیل سے بیان کرنے کی یہاں گنجائش نہیں لیکن اس قدر بیان کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ ان عاداتوں سے جنسی تحلیلات میں فتور پیدا ہوتا ہے اور کسی ایک جنسی مرکز پر مان پیدا ہو جاتی ہیں۔ اس کے علاوہ لباس کی وضع قطع بھی اس زمانہ میں خاص اہمیت رکھتی ہے۔ جہاں تک ہو سکے تنگ کپڑے نہ پہنے جائیں۔ لڑکیوں کا کد سے زیادہ چٹا و نکلدار کاحیال اور اونچی اڑی کے جوتوں کا استعمال ان کی قدرتی جنسی حالت میں رکاوٹ ڈالتا ہے

لی گیا تو یہ کھلنے کا اپنے وضع جسمانی کی پوری قابیلیتوں کو حاصل کر لیا ہے۔ کم وزن رکھنے والے وضع جسمانی میں کئی ناقص پیدا ہوتے ہیں۔ بالخصوص زمانہ بلوغ میں جینیائی پراثر پڑتا ہے۔ جگر کا راجاتی ہے۔ دماغی کاموں میں دل نہیں لگتا۔ حافظہ بھی بچہ ایسا دیباہی ہوتا ہے۔ قوت و طاقت میں فتور آجاتا ہے۔ نفسیاتی اعتبار سے بھی اس میں کئی ایک غریبیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ چڑچڑاہٹ پیدا ہونے لگتا ہے۔ بار بار معمولی باتوں پر غصہ آئے لگتا ہے۔ صبر و تحمل و لطیفیت میں استقلال بہت کم رہتا ہے۔ جب جسمانی اور دماغی اعتبار سے انسان اپنی کمزوریوں کو محسوس کرنے لگتا ہے تو اس میں ایک عام فاسی رونما ہونے لگتی ہے جس سے اس کے آئندہ دور زندگی کے مثالوں میں بڑی بڑی رکاوٹیں پیدا ہونے لگتی ہیں بالآخر وہ ایک کمزور شخصیت کے تحت ایک ناقص زندگی بسر کرتے ہوئے رہ جاتا ہے۔ اسی طرح معیاری وزن کے اعتبار سے جن کا وزن زیادہ ہو وہ اور بھی زیادہ توہم کے قابل ہیں اگر کوئی کو حسب حال رکھا جائے تو نہ صرف بظاہر وضع جسمانی بھی علوم ہونے لگتی ہے بلکہ اس میں خرابیوں کا ایک اور لامتناہی سلسلہ قائم ہو جاتا ہے۔ جو بڑے بچوں کا پہلا اثر قوت باضمہ پر پڑتا ہے۔ تیج خوراک کم ہونے لگتی ہے۔ پانی زیادہ پیا جاتا ہے۔ دوران خون اور اعصاب پر بوجھ و بار پڑتا ہے۔ ایسی حالت میں جسم کا اندرونی اعضا بوجھ و بار سے بڑا ہو کر بھگوانت کر بیٹھتا ہے۔ ذیابیطس خون کا دائرہ غیر تنظیم باضمہ اور دوران خون سے متعلق ہمارا من میں توجہ حلاوت ہونے جاتے ہیں۔ زمانہ بلوغ میں اگر کوئی بچہ یا لڑکا اپنے آئندہ زندگی میں ان ہلکے امراض سے سبالت نہ پڑے گا جو بچے معیاری وزن سے زیادہ وزن رکھتے ہوں وہ غذائے معادہ میں بہت اختلاط کریں۔ ترک کر لیں اور بیلوں کا استعمال زیادہ کریں۔ پانی کم پئیں۔ پسینہ آور و زہریلی اور کھیل زیادہ کھیلیں۔ اپنے لئے فطرتی بہت وزنی و زہریلی موزوں ہوتی ہیں لیکن ہلکی ورزشوں کے ساتھ ان ورزشوں کو ملا کر کریں۔ بہر حال

اور ناقوان، ظاہر ہے کہ ایسی کمزور وضع جسمانی رکھنے والے
بچے آئندہ قوی ترقی میں کیا فاک ہوتے ہیں گے۔ عرض ضرور
اس امر کی ہے کہ ہر اپنے لڑکوں اور لڑکیوں کی نگہداشت بلوغ
کے زمانے میں خاص طور سے کریں تاکہ وہ آئندہ ایک صحت مند
ہل اور باپ بن کر طاقتور اولاد پیدا کریں۔

(لاسلکی نشر گاہ، چک آباد سے پُر کیا گیا)

محمد غوث الدین

باعث ہوتے ہیں۔ زمانہ بلوغ میں سب سے اہم بات جو وصاحت
طلب ہے اس زمانے کی شادیوں ہیں جو زمانہ بلوغ میں وضع علی
کی ترقی میں سدراہ ہوتی ہیں۔ کم عمری میں شادیوں کے باعث
وضع جسمانی کا پورا نشوونما اپنی جگہ رک جاتا ہے۔ ایک قوی
اپنی وضع جسمانی کی بربادی ہوئی اور دوسرے وقت سے پہلے
اولاد جو لڑکے کے باعث بچے اپنے کمزور اور ناقص پیدا ہو گئے
ہیں جو بہ مشکل زندہ رہتے ہیں۔ اگر زندہ رہے بھی کئے تو کمزور

حسین گماں!

دھیمی دھیمی ہے ہوش کی قندیل
آؤ نگاہوں میں کچھ خلل مٹا ہے
ہو رہی ہے جنون کی تکمیل
ہر عمل میرا بے عمل سا ہے

(۲) تیرے ان زنگی کمزوروں میں
میرے ماضی کا خون چھلکتا ہے
اور ان سرخ سرخ ڈوروں میں
ایک آنچل ہے جو جھلکتا ہے
میری زینت کا سرخ سرخ آنچل
اس کے شانوں پہ یوں سرکتا تھا
جس طرح زینت کا نقاب اٹھے
اور وہ مر مر میں گہرا سا جسم
مخم کیفیت، مست ناز سا جسم

میری باہوں میں یوں تھرکتا تھا
جوں ترپ کر حسیں جا بجاٹھے
میری امید ہو گئی بے گل

(۳) ہو رہا ہے گمان پلکوں پر
دل شکن، دلہنواز پلکوں کا
تیری جادو بیان پلکوں پر
ان کھیل دراز پلکوں کا
(۴) تیری نظریں ہیں موج ہائے جنوں
اے مری نگار، زندہ باد
پوچھ مت مجھ سے میرا حال بول
اے سراپا بہار، زندہ باد
تنگی اور بھی ہو جس سے فزوں
وہ نظر بار بار زندہ باد افسردہ

افسردہ

اندر

۱۲۰ سے گھلاں اور کافز کے گروے خرید لیا۔ اس نے اپنی شادی کی
مٹائی بہتی۔ سوک کی کوئی سرخ ساڑی اس کے ہاتھوں میں پھیل
گئی۔ کٹو کرتے تھے اس کا زور تھا۔ رامو نے اپنے لائے گھونے
گروے اسے پتا دئے اور جو بھی ایک اپنے گھر میں ڈال لیا۔ اس
کی جھوڑوں سے عجیب مرد اور عورتیں نکلی آئیں اور سب نے مل کر
ہولی مہلی۔ چرچر تیں ہولی کا گیت گانے لگیں۔ زیادہ دیر گئے کہ
ہر جگہ رامہ دھڑسا ہوا پتی چھوڑوں کی طرف واپس آئے۔
وہ بھی تھکی ہوئی اپنی جھوڑی میں داخل ہوئی۔ رامو نے پیچھے
سے آکر اس کے پیچھے پر گھول لیا۔ سرخ سرخ گھول چٹا کر
شعلہ کی طرح۔

مکان کا کاحہ تیری سے ختم ہو رہا تھا۔ رات کو کچھ عرصہ دوری کی فکر نہ کی تھی۔ سب سے پہلے ایک لڑکی اس کو رات کی گلی میں پہنچنے کی طرح وہ ساتھیوں سے مل گئی۔ وہ کہیں اور نہ دوری کی کئے بغیر تھے۔

سے کسی کی نسبت زیادہ تراب ہو گئی تھی۔ وہ رات بھر کھاتی تھی اور صبح
پہتا تو اس کے منہ زیادہ تراب آچے ہوئے تھے۔ اس کا علاج ہو کر
اس کی حالت گئی تھی۔

ایک دن اس کے گھر میں کسی کے گناہ میں ان کے پاس
 بھی حصہ لینا تھا۔ وہ لاکھ سے لاکھ تھیں۔ کسی نے تو اس کے سامنے
 کے ساتھ گھر میں بیٹھ کر اس سے لاکھ روپے مانگے۔ اس نے بے خوف
 سے اس کی ناک پر ہتی تھی۔ اسی پر ہنسنا لگا کہ مجھے ان لوگوں نے
 غلامت سے رہ کر نکالتے۔ ان کا یہ دوسرے غلاموں سے زیادہ
 ان سے بہتر وقت تھا۔ یہ لوگ کھیتیں جوں کی باری خد خد کرتے تھے۔
 وہ کیا بن کر نکالے گئے تھے۔ وہ چنی چنی ہو کر نکالے گئے تھے۔
 بہتر بن جائے گی۔ یہ گراموں کو ان سے اسے فائدہ نہیں۔ شاہزاد
 بھی شہزادوں کی پرورش ہے۔ جو دولت مند ہیں۔ ان کی ذرا اور
 چھوڑ دے۔ ان کو کھیتیں لگنے دے۔ وہ بھی اداوارانہ اسے
 کہ لاکھوں روپے لگاتے۔ وہ لاکھوں روپے لگاتے۔ وہ لاکھوں روپے لگاتے۔

[illegible]

دور سے دھڑکتے کی لٹکان آواز برابر کانوں میں بجنا
تھی۔ نہ جانے کس کی ہاتھی تھی۔ لگتا ہے کہ آہستہ آہستہ قدم اٹھانے
شیشاں کی طرف جا رہے تھے۔ سب کے چہرے موت کے غم سے
زرد تھے۔ ایک حرکت ہو جانے سے کیا بھی جنازے کے ساتھ مارا
جائی تھی۔ دم بدمر اس کی سسکیاں تیز ہو رہی تھیں۔ یہ بیوہ تھی۔
دکھوں کی ماری غریب موت۔ اس کے ساتھ ہی اس کا بچہ ہڈیاں
میں آگ لئے جا رہا تھا۔ نادان نہیں جانتا تھا کہ کس کس لئے لے جا رہا
ہے۔ وہ اپنی روتی ہوئی ماں کے ساتھ تماشوں میں رہنا کھج
اس کے باپ کی کھوپڑی پر اپنی کراٹھ سے چلائے شروع ہوا تو وہ آنکھوں
پر زبردتہ رکھ کر غصہ لے کر سورت لئے گئے۔ بڑھکرا رہی ہے اسے گود
میں اٹھا لیا اور سینے سے لگا کر زور زور سے رونے لگی۔ یہی سب
اس کا سہارا تھا۔ بچہ اس کے سینے سے لگ کر اپنی کھوپڑی پر اس
چٹائی کی طرف دیکھا۔ لوگ نہ جھکا کرے گا کہ وہ کھڑے تھے۔ شعلوں
کے درمیان اسے ابھی رہا تو کوا کھٹا ہوتا۔ جہنم نظر آ رہا تھا
سرخ سرخ شعلوں نے اسے گزرے ہوئے دن یاد دلادیتے
اور وہ انہی کی مادیں کھڑی۔

دوستی تھی یہاں ہو کر آتی تھی۔ دن بھر وہ اپنے راجہ کو
ساتھ لاکر کرتے۔ بھارہ بڑ پرستے تھے مکان میں۔ چھوٹا اور بڑا
کی بہت ضرورت تھی۔ وہیں ایک بھلان دووں کو کھال لگا کر اٹھایا
نے لاکر سے تھوڑی سی بگ لاکر رکھی ہو پڑی تھی۔ صبح ہی
صبح جیو پھولی آواز سن کر وہ محلہ بائسل مکان کی طرف روانہ
ہو جاتے۔ وہاں دیکھتا تو وہاں ایک دوہرے کے نزدیک ہے
سے انیس کچھ زیادہ ٹھکانے محسوس نہیں ہوتی۔ دووں یا تین کٹے
ہونے کا کہہ کر تھے یہی راجہ خواتین سے اس کے کان میں کہہ
دیتا اور وہ شکار کر چھ لاتی تھی اس طرح دن آہستہ آہستہ گزر جاتا
اور شام میں دن دووں بڑھتے۔ وہ کھانا پکاتے تھے اور راجہ
سے کھیتے کھاتے۔ دن بڑی کرتے رہے۔

ہولی آئی اور آتش میں جاگ نہیں جھپٹی کے دن رامو
اس نے عکاس اور برائیاں میں چٹا کے طے کی چپڑھے
جی چھا گیا تھا اور ٹوٹنے کے لیے باجوہ اسے رستہ نہیں ل
تھامے اور کچھ دو ٹولے لکڑی کے سہ کے سہ کے رنگ کی کاٹ

تفہیم و تبصرہ

اسلام کے معاشی تصور

حیدرآباد دکن - قیمت ۳ روپے ۱۲۰ ۸۱۲ سر عثمانیہ
۳ روپے ۸۱۲ کلدار - جج ۲۵۸ صفحہ

غلام دستگیر رشید صاحب نے بائیس مقالوں کو ایک کتاب کی صورت میں ترتیب دیا ہے۔ ہر مقالہ اپنی جگہ نہایت اہم اور قابل غور ہے۔ آج کل عوام خصوصاً لہجوں طبقہ نظام اشتراکیت سے بہت متاثر ہے۔ اور اسلامی نظام پر اسے غور دیتا ہے۔ لافنی ترتیب نے اس مجموعہ کی اشاعت سے فوٹیت کو دور کرنے کی کوشش کی ہے۔

پیشروں میں اس کے معاشی نظام کے مختلف پہلوؤں پر بحث کی گئی ہے۔ مولانا ابوالحسن علی محمد مدنی نے مولانا عبد الماجد دیوبادی، مولانا حبیب الرحمن خان شروانی، مولانا ابوالکلام آزاد، ڈاکٹر عبد اللہ اور علامہ اقبال کے مضامین میں اشتراکیت اور اسلام کا بہترین موازنہ موجود ہے۔ مسلمانوں کو موجودہ معاشی پستیوں کا حل ڈھونڈنے کے لئے اس کتاب کو رہبر بنانا چاہئے۔

اسلام کے سیاسی تصور

حیدرآباد دکن - قیمت ۳ روپے ۱۲۰ ۸۱۲ سر عثمانیہ
۳ روپے ۸۱۲ کلدار - جج ۲۵۸ صفحہ
زیر نظر مجموعہ میں بیس مقالے شامل ہیں اسلامی سیاست کے مختلف پہلوؤں پر نظر ڈالی گئی ہے اور یہ کلیا گیا ہے کہ مکمل خانہ کیسی نظام اسلامی ہے اور وہ اسلامی نظام ہے مفکران کی رائے اس کتاب میں ہر شخص کے لئے اسلامی سیاست سے واقف ہونا ہے ضروری ہے اور اس سے واقف ہونے کے لئے اس کتاب کا مطالعہ ضروری ہے

سالنامہ آجکل بالتصور

قیمت ۱۲۰ ۸۱۲ سالانہ چندہ دین روپے
۱۲۰ ۸۱۲ سالانہ چندہ دین روپے

رسالہ آج کل اردو کا پندرہ روزہ رسالہ ہے۔ اس سال کی مقبولیت اس امر کی شاہد ہے کہ رسالہ عام فہم اور پیک اس میں معلوماتی مضامین خاص طور پر شامل کیے جاتے ہیں۔ مسند اور مشہور لکھنے والوں کے مضامین بھی سال نامہ میں موجود ہیں۔ غرض ادنی اعتبار سے تو یہ رسالہ بہت بلند نہیں لیکن معلوماتی لحاظ سے یہ ہندوستان کا واحد مفید رسالہ ہے۔ زیر نظر سال نامہ میں تاریخی، نسلی، تعلیمی، معاشیاتی مضامین اشاعت کے ذرائع اور نظمیں سب ہی شامل ہیں۔ زبان عام فہم ہے۔ ہر جگہ مذاق کے مضامین موجود ہیں۔

نئی جامعہ

نئی جامعہ - ایک روسی اشاعت کا ترجمہ ہے۔ اشاعت شیلی نہیں زندہ حقیقت ہے۔ اس میں ایک روسی عورت کی داستان حیات، انقلاب کی کئی چیزوں نے انقلاب میں مردوں کے برابر حصہ لیا اور اپنی عورت اور عورت کی قربانی قومی آزادی کے لئے کی۔ انقلاب سے پہلے اور بعد کی روسی زندگی کا اچھا مطالعہ ہے۔

ابو جعفر منصور

ابو جعفر منصور - اشاعت اشاعتی، طبع منزل، تالیف ۱۲۰ ۸۱۲ سالانہ چندہ دین روپے
تاریخ کی اہم شخصیات کی سب سے بڑی اشاعت کو قومی میاں، اصلاح کو بلند کرنے اور بنانے کے لئے ضروری ہے۔ یہ بھی اس قسم کی سوانح عمری ہے۔ طرزیان دلچسپ ہونے تو اچھا تھا کیونکہ لہجہ ان طبقہ نصیحت میں دلچسپی کو ڈھونڈ رہا ہے۔

”زس“

نتیجہ امتحان اردو ادبی (دوم) بابۃ

- ۱۲۵۔ محمد عبدالغفور
۱۳۱۔ میر حسن علی
۱۳۲۔ محمد خواجہ
۱۵۰۔ سید افضل
۱۶۱۔ شیخ بوجہ باغرائیل
۱۶۴۔ امجد ادبیر
۱۶۹۔ حسن
۱۷۲۔ غلام صمدانی
۱۹۱۔ کنیا پرکاش
۱۹۲۔ محمد یعقوب
۲۰۳۔ محمد بیگ
۲۰۸۔ محبوب شریعت
۲۱۴۔ دیا شنکر دیویدی
۲۱۶۔ عبدالقادر
۲۱۹۔ دوست خاں
۲۲۰۔ عبدالعزیز
۲۲۳۔ امجد ادبیر پرکاش
۲۹۶۔ محمد عمر خاں
(کامیاب)
۱۹۔ رام سب
۲۰۔ محمد عبدالرحیم
۲۳۔ شیخ چاند
۲۶۔ محمد حفیظ اللہ
۳۰۔ محمد عبدالجبار
۳۲۔ محمد لیلین
۳۳۔ شیخ تاج الدین
۳۳۔ سید حسین

(کامیاب یا امتیاز)

- ۲۱۔ نور احمد
۲۲۔ عبدالعزیز خاں
۲۳۔ محمد عثمان
۲۶۔ محبوب خاں
۳۱۔ چند زمانہ پرکاش
۴۰۔ احسان احمد خاں
۴۹۔ اتیار حسین خاں
۵۱۔ شام سندر
۵۹۔ سید سلطان محمد الدین
۶۲۔ عبدالحق خاں
۶۳۔ منور علی خاں
۶۹۔ عبدالحفیظ
۷۰۔ احمد حسین خاں
۷۶۔ محمد عبدالرحیم
۸۰۔ منور خاں
۸۱۔ محمد اسحاق
۸۶۔ محمد حسین
۸۸۔ مارکھنڈے سنگھ
۸۹۔ رنجیا
۹۴۔ شیخ ابراہیم
۱۰۲۔ شیخ محبوب
۱۱۶۔ نارائن سنگھ
۱۱۹۔ عبدالرشید
۱۲۱۔ محمد فاضل
۱۲۲۔ سید غوث
۱۲۳۔ محمد پرکاش

سب ذیل امیدواروں نے علی الترتیب
سب سے زیادہ نشانات حاصل کئے۔

- ۲۱۴۔ دیا شنکر دیویدی اول (بلدہ فوج)
۳۷۸۔ شوکت جہاں بیگم دوم (نظام آباد)
۱۶۱۔ شیخ بوجہ باغرائیل سوم (بلدہ فوج)

بمطابق رول نمبر
مرکز بلدہ (ناماش)
(کامیاب یا امتیاز)

- ۳۔ محمد بیگم
۴۔ نوشہ بیگم
۵۔ مریم بی
۷۔ ہاجرہ بی
۸۔ رابعہ بی
(کامیاب)

- ۱۔ کنیزہ عائشہ
۹۔ صالحہ بیگم
مرکز بلدہ (ذکور)
(کامیاب)

- ۱۰۔ محمد حسین
۱۱۔ محمد عبدالوہاب انصاری
۱۲۔ رام نسواہی
۱۴۔ حیات خاں
۱۵۔ ٹوٹی ستیا رام
۱۶۔ ابوالحسن محمد ریاض الدین
۱۷۔ جے رام ناتھم
مرکز بلدہ (فوج)

۱۳۷۔ خوش الدین	۸۵۔ شیخ علی الدین	۲۰۔ شیخ احمد
۱۳۸۔ نور خان	۹۰۔ ہمایر	۲۱۔ سید رسول
۱۳۹۔ غلام حسین	۹۱۔ محمد شہاب الدین	۲۲۔ سید الفاضل
۱۴۰۔ رام رتن پرشاد	۹۲۔ گار گیدین	۲۳۔ سلطان خان
۱۴۱۔ نذیر احمد	۹۳۔ علامہ علی	۲۴۔ عسکریہ
۱۴۵۔ وحید الدین	۹۵۔ عبد الوہاب	۲۵۔ محمد قاسم
۱۴۷۔ سرور خان	۹۶۔ مشتاق حسین	۲۶۔ سید نور الدین
۱۵۱۔ عوض بن سید ابی اہل	۹۷۔ حاجی خاں	۲۷۔ غلام مصطفیٰ خاں
۱۵۲۔ عبدالقادر صاعری	۱۰۰۔ مرزا قیصر بیگ	۲۸۔ غلام حسین الدین
۱۵۳۔ عمر باجمید	۱۰۱۔ محمد ابراہیم	۲۹۔ خواجہ خاں
۱۵۴۔ سید مریدادی	۱۰۲۔ محمد یعقوب	۳۰۔ تاج محمد
۱۵۵۔ احمد علیس	۱۰۳۔ محمد خلیف الدین خاں	۳۱۔ سید ہدایت
۱۵۶۔ علی عکبری	۱۰۵۔ ابوالفضل بن سعید	۳۲۔ محمد بازرجم
۱۵۷۔ سالم بلشرم	۱۰۶۔ علی احمد	۳۳۔ امین الدین کمال
۱۵۸۔ حبیب عبدالرحمن بغدادی	۱۰۸۔ عبد الباقی خاں	۳۴۔ محمد زبیر الدین
۱۵۹۔ حبیب خاں	۱۰۹۔ محمد عظیم الدین	۳۵۔ ملک شاکر علی خاں
۱۶۰۔ محمد خاں	۱۱۰۔ شیخ نور محمد حسین	۳۶۔ عبد الرؤف خاں
۱۶۲۔ ناصر باجرائی	۱۱۱۔ شاہ راز خان	۳۷۔ فیض شریف
۱۶۳۔ احمد بغدادی	۱۱۲۔ عبد الوہاب	۳۸۔ محمد باجمید
۱۶۵۔ محمد بادی	۱۱۳۔ محمد حنیف	۳۹۔ احمد خاں
۱۶۷۔ صلاح مشتاق	۱۱۴۔ احسان اللہ خاں	۴۰۔ فخر الدین
۱۶۸۔ احمد باخوان	۱۱۶۔ خضر خاں	۴۱۔ نور محمد
۱۷۰۔ تیسر	۱۱۸۔ سید رسول	۴۲۔ عبد المجید خاں
۱۷۱۔ عبد الرحمن	۱۲۰۔ محمد مولانا	۴۳۔ عبد الرحیم خاں
۱۷۲۔ محمد	۱۲۳۔ کے۔ کے۔ جوزی	۴۴۔ شیخ عبدالقدوس
۱۷۳۔ سید	۱۲۸۔ غلام رسول	۴۵۔ محمد حسنین
۱۷۴۔ عمر	۱۲۹۔ محمد ابراہیم	۴۶۔ مسعود خاں
۱۷۶۔ عبد الحق	۱۳۳۔ محمد نظام الدین	۴۷۔ محمد عبدالغنیف
۱۷۷۔ عبد القادر	۱۳۵۔ محمد عبدالوہاب	۴۸۔ شیخ محمد بن
۱۷۸۔ محمود	۱۳۶۔ محمد پاشا	۴۹۔ محمد سلطان

۲۶۵- گشتی	۲۲۳- قلی کونا	۱۸۱- شیخ نظام الدین
۲۶۶- سید میردام مرقی	(کامیاب)	۱۸۲- ولایت خاں
۲۸۰- ایدم بالسیا	۲۲۶- جعفر خاں	۱۸۸- محمد جہانگیر
۲۸۱- کنگر اچکریا	۲۲۸- جوزت	۱۸۹- عبدالعزیز
۲۸۲- یو میرا راجیا	۲۲۹- جوزت دوات	۱۹۵- محمود علی
۲۸۳- اندرہ نریا	۲۳۰- زینت	۱۹۶- محمد خاں
۲۸۴- دی اندرہ	۲۳۲- شہباز خاں	۱۹۷- غوث الدین
۲۸۵- سید علی	۲۳۵- شیخ محبوب	۱۹۸- علی بن محمد مانی
۲۸۶- نور محمد خاں	۲۳۶- شیخ محبوب	۲۰۰- نرسیا
۲۸۷- بی بی مانی	۲۳۹- عبدالمجید	۲۰۱- محمد امام الدین
۲۸۸- سید علی	۲۳۹- محمد قسطلی	۲۰۲- محمد عباد اللہ
۲۸۹- محمد علی مانی	۲۵۰- محمد مولانا	۲۰۵- سید یوسف
۲۹۰- دشتو محمد	۲۵۵- محمد خاں	۲۰۶- بندہ علی
۲۹۱- مولو گری اوشو نام	مرکز دوم کنڈہ (دکون)	۲۰۹- شیخ صغیر
۲۹۳- ایدم نارائن	(کامیاب بہ اشیاء)	۲۱۰- محمد حسین
مرکز دوم کنڈہ (دکون)	۲۹۶- پیر میری سید نام مرقی	۲۱۱- شیخ سعید الدین
(کامیاب بہ اشیاء)	۲۶۰- دلی سید	۲۱۳- محمد بلین
۲۹۲- سید علی سوسلیہ	۲۶۸- پیر میری ابرام مرقی	۲۱۵- محمود علی
مرکز ہاگر کرولی (دکون)	(کامیاب)	۲۱۶- فیاض علی
(کامیاب بہ اشیاء)	۲۶۰- سعید	۲۱۸- سید چاند
۳۰۳- محمد علی سید	۲۶۱- کشلی	۲۲۱- محمد غوث
۳۲۳- محمد عبد القیوم	۲۶۲- میری بھاشم	۲۲۳- گوپال بی
۳۲۹- سید وزیر الدین	۲۶۵- سید نارائن راؤ	۳۹۳- محمد عبدالرشید
(کامیاب بہ اشیاء)	۲۶۶- پودری ناگیا	۳۹۴- کریم خاں
۳۹۳- محمد عبد العزیز	۲۶۸- دیکندہ بھوسیا	۳۹۵- محمد اسماعیل دوم
۳۹۰- محمد منظور الدین	۲۶۹- دلی میری	۳۱۶- محمد غوث الدین
۳۹۹- محمد سید علی	۲۷۱- گوٹا بالی	۳۹۸- نارائن سنگھ
۳۰۰- عبد الحی الدین	۳۰۲- نرسووان راؤ	۳۰۰- عبدالمجید خاں
۳۰۱- سید علیات الدین	۳۰۳- ایدم نرسیا	مرکز ہاگر کرولی
۳۰۲- سید علی	۳۰۴- آسانی راہو	(کامیاب بہ اشیاء)

۳۶۷۔ وکیلٹ راولو
مرکز نظام آباد انارٹ
 (کامیاب بہ اختیار)
 ۳۶۸۔ شوکت جہاں بیگم
 ۳۶۹۔ امتہ النجب
 ۳۷۰۔ جمیل النصار بیگم
 ۳۷۱۔ رقیہ اختر جہاں
 (کامیاب)
 ۳۷۲۔ شامشا بانی
 ۳۷۳۔ کلادوتی
 ۳۷۴۔ رومین بانی
 ۳۷۵۔ دور بختی بانی
 ۳۷۶۔ گنگوٹانی
 ۳۷۷۔ راجی بانی
 ۳۷۸۔ طاہرہ بیگم
 ۳۷۹۔ رفیع بیگم
 ۳۸۰۔ امتہ النجب
 ۳۸۱۔ افسر پاشا
 ۳۸۲۔ حمید النصار بیگم
 ۳۸۳۔ نجم النصار بیگم
 ۳۸۴۔ عالمہ بیگم

۳۸۵۔ نظام الدین
 ۳۸۶۔ محمد عبدالقادر
 ۳۸۷۔ عبدالقادر
 ۳۸۸۔ حکیم الدین احمد
 ۳۸۹۔ منظور احمد
 ۳۹۰۔ احمد حسین
 ۳۹۱۔ افتخار علی خاں
 ۳۹۲۔ محمد تغیر الدین
 ۳۹۳۔ عبدالقدیر
 ۳۹۴۔ شجاعت علی خاں
 ۳۹۵۔ شیخ محمد صلیح الدین
 ۳۹۶۔ محمد مولا
 ۳۹۷۔ سید وحید الدین
 ۳۹۸۔ محمد علی
 ۳۹۹۔ گنگوٹ رام
 ۴۰۰۔ کے دیر گنگوٹا
 ۴۰۱۔ وی۔ رائیٹور راولو گنگوٹا
 ۴۰۲۔ دیو سنگھ
 ۴۰۳۔ بی۔ فرسیا
 ۴۰۴۔ نرسنگو

۴۰۵۔ محمد قاسم
 ۴۰۶۔ کرشن گاراو
 ۴۰۷۔ محمد عظیم الدین
 ۴۰۸۔ بی۔ وکیلٹ راولو
 ۴۰۹۔ محمد جہاں بیگم
 ۴۱۰۔ بی۔ نرہیت زیدی
 ۴۱۱۔ غلام غوث خاں
 ۴۱۲۔ غلام دوست
مرکز ناگل کر نول انارٹ
 (کامیاب بہ اختیار)
 ۴۱۳۔ مانیش بی
 (کامیاب)
 ۴۱۴۔ نیس بی
مرکز نظام آباد نوکورا
 (کامیاب بہ اختیار)
 ۴۱۵۔ مجاہد حسین
 ۴۱۶۔ محمد اعجاز الدین قریشی
 ۴۱۷۔ محمد عبدالغفور
 (کامیاب)
 ۴۱۸۔ نصیر الدین

مرکز بٹنی۔ بٹنی میں ایک کونسل ہے جس کے سربراہ ہیں۔ اور جس کے قریب کچھ اسلام کو گیا اور وہاں قریشی صاحب سے ملاقات ہوئی قریشی صاحب نے میری آمد سے قبل ہی خطاب مولوی عبدالحق صاحب مولوی کوہ سے استفاد کیا ہے اس شخص نے راولا کو کھانا کین میری برکت سے کچھ ملاقات ہوئی۔ ملاقات خاتمہ نہیں اسلام میں میرے لئے ایک کام کا انتظام کیا گیا تھا۔ وہ میرے ساتھ ملاقات ہوئے تھے۔ قریشی صاحب اور ان کے رفقاء کے ساتھ کہ کچھ کے خطابات میں ایک تھے۔ بیکہ دعوت دینے والے تھے۔ ایک اور حاضر کے بعد بڑے تقریب سے گئے۔ اور وقت سے پہلے ہی امیدواروں نے جوابی خطابات دیدئے۔ قریشی صاحب کی خواہش پر میں نے اپنے امتحان لیا۔ اس کے بعد میری جوابی خطوں کو فائدہ میں بند کر کے مرگادی گئی۔ امتحان کا وہ خطابات کی تعریف سے بھرپور تھا۔ وہ سنا اس کا صاحب قریشی صاحب نے مسلمانوں کی امتحان کی وجہ سے راولا میں کچھ نفقائے کار کے سبب بہت دشواریوں کا خاتمہ کر کے قریشی صاحب کے تشکیک انحال کی طرف کامیابی کے ساتھ قریب ہے وہ قابل تحسین دور و دور بہت افزائی ہے۔ آخر میں میں قریشی صاحب اور ان کے رفقاء کی تعریف کو لازمی کا دل سے ان کے بھائیوں سے ملتا ہوں۔ بگرامی صاحب کا کہن کو میرے قیام کی وجہ سے ان کا چھوڑنا پڑا۔ جہاں قریشی صاحب کی توجہ اور انہماک کے ساتھ سالانہ امتحان کو بہت ترقی ہوئی۔ میری بدقسمتی تھی کہ صاحب علی صاحب مولوی صاحب سے ملاقات نہ ہوئی۔ میری بدقسمتی تھی کہ بٹنی سے باہر گئے ہوتے تھے۔

ادارہ ادبیہ اردو کی چند ادبی کتابیں

اس مجموعے کی اشاعت سے بعد اردو شاعری میں ایک گرانی
اضافہ ہوا ہے صفحات ۶۸ قیمت ۶۸
چوٹ راگھو نیر راہ صاحب قریب
الہ خان بجنوب -۱ (عالم پوری) کی راجیات کا مجموعہ
ہے۔ اس کے تالیف سے سبک دہ ادب کا شاعری کے تخلیقی
اور ماحول پر ہرگز اور دوسرے میں نقل کیا گیا ہے۔ اکثر راجیات سنسکرت
اور بھاشا کے نسخوں کے خیالات کا نقل ہیں اور بعض خود ان کے
دل و دماغ کی تسکیر کاوش کا نتیجہ ہیں۔

سادگی، سلاست، خیالات کے سلیس ہونے اور طرز بیان
اس قدر سادہ اور بے تعلک کے سمجھنے کی طرح کہ ان کی بھی سمجھنے کے
پر باقی دل کی دھڑکن سے جو شعر محمد بن قحی ہے۔ ابتدا میں
جواب ہر القادری صاحب کا کہ لفظ اور معلومات کو قریب مقدمہ
ہے جس میں انھوں نے سبک دہ اور ہندی شاعری پر روشنی ڈالی
ہے صفحات (۱۲۰) قیمت ۱۲۰

یہ مولوی عزیز احمد صاحب کی اسے آئندہ (لند)
ماہ نقاشی - پروغیرا عزیز علی صاحب عثمانیہ و متفہم شاعری
در شہر کی طویل نظموں کا مجموعہ ہے جس میں یورپ کی شاعری کے
مغیرا اثرات ملے کر ہیں۔ جدید یا ترقی پسند اردو شاعری کے دلائل
اس کا ضرور مطالعہ کریں۔ صفحات (۱۰۰) قیمت ۱۰۰۔

فیض سخن - میر تقی میر صاحب کی اردو شاعری کے
فیض سخن - میر تقی میر صاحب کی اردو شاعری کے
فیض سخن - میر تقی میر صاحب کی اردو شاعری کے
فیض سخن - میر تقی میر صاحب کی اردو شاعری کے

یہ اکثر میر تقی میر صاحب کی اردو شاعری کے
فیض سخن - میر تقی میر صاحب کی اردو شاعری کے
فیض سخن - میر تقی میر صاحب کی اردو شاعری کے
فیض سخن - میر تقی میر صاحب کی اردو شاعری کے

گر یہ قلمبند ہوا ہے اور پیش کی نظموں اور غزلوں کا مجموعہ
مجموعہ ہے۔ جناب ملک ڈیرا باؤ کے فوجان شعرا میں ایک خاص
انتیباؤ کے ایک ڈیرا کا کلام بہت ہی خوبصورت ہے۔ عارضیاب
وہ اکثر اردو صاحب کا دیرا ہے جو مولیٰ اور جناب پروغیرا سروری کا
مقدمہ بھی اس کے ساتھ پیش کیا ہوا ہے۔ بدھ شاعری سے
بہتر رکھنے والوں کے لئے اس کا مطالعہ و تجزیہ سے خالی
نہیں ہے۔ صفحات ۸۰، طباعت و کتابت نفیس کاغذ اعلیٰ
قیمت ملے پر پتھر کی نام قیمت ۸۰

مفرد زندگی - کلام کا مجموعہ ہے جو نہایت سلیقہ سے ترتیب
دیا گیا ہے۔ اس میں ۱۰۰ غزلیں اور ۱۰۰ رباعیات
ہیں۔ بدھ علی صاحب جدید کے ہاؤس کے قریب شاعرانہ
میں سے ہیں۔ ان کی شاعری کے قدر دان دور دور پہلے ہونے
ہیں اور وہ کافی مشہور و مستند رہا ہے انہیں جس میں اس کے
دن ان کی غزلیں اور غزلیں نے بھیج دی ہیں اور یہ غزلیں ایک
رسالے سے دوسرے رسالے میں نقل کی جاتی ہیں۔ علی منظور صاحب
محمد صاحب کے ان چند کلام صاحب شاعرانہ ہیں۔ جس سے وہ جنموں
اپنے کلام میں زندگی کی مسیح برآئی اور اس میں کامیابی
بھی حاصل کی صفحات (۲۱۲) قیمت ۲۱۲۔

حضرت علی اور جدید اردو کی غزلوں اور نظموں
الوار - کلام کا مجموعہ ہے جو نہایت خوبصورت ہے
شائع کیا گیا ہے۔ علی احمد صاحب ہندوستان کے بڑے
شاعروں میں سے ہیں۔ ان کا کلام ان کے
دل کی آواز اور غزلیں زندگی کی بے پناہ ہے۔ وہ نہ صرف
ایک کہ بہت ہی شاعرانہ ہیں بلکہ سادگی اور شہساز ہیں ان کی
نظر بہت دلچسپ ہے۔ ان کے کلام کے مطالعہ سے یہ صاف ظاہر
ہوتا ہے کہ ہندوستان کے مدنیوں کے لئے ان کی شاعری بہت ہی
زمانے میں ہونا چاہئے۔

تذکرہ ہے اس کی ترتیب بھی اسی منسلک ہے جیسی پہلے کی ہے
ہر شاعر کے سوانح حیات اور نمونہ کلام کے ساتھ ساتھ اس کی
شاعری پر تبصرہ بھی کیا گیا ہے۔ ان دونوں کتابوں سے حیدرآباد
کی گزشتہ اور موجودہ شاعری کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے۔
صفحہ ۴۳۱ تصاویر و قیمت ۵۰۔

سینج گوگنڈہ :- کے معلم تاریخ پروفیسر عبدالجبار صاحب مدنی
ایم۔ ایل۔ ایل بی نے سلاطین اقلید شاہیہ کی نہایت مستند اور
مبسوط تاریخ قلمبند کی ہے جس میں گوگنڈہ اور اس کے آس پاس
کی سلطنتوں کے تعلقات و کن کا تذکرہ ارتقا و بادشاہوں اور
امیروں کے حالات، لڑائیاں علم و فضل کی سر پرستی، غرض ہر
پہلو پر غور کیا اور قلمی تاریخ کی مدد سے روشنی ڈالی ہے۔
اپنے موضوع پر پہلی کتاب ہے جو اس انتہائی اور محنت سے لکھی
گئی ہے۔ ساری سوانحیں سوئے زیادہ صفحات قیمت (۵۰)۔
یہ کتاب بھی پروفیسر عبدالجبار صاحب مدنی
مقدمہ **سینج و کن** :- نے نہایت تحقیق اور محنت سے مرتب
کی ہے اس میں انھوں نے مزین و کن کے عیسوی مکران خاندانوں
آغاز ارتقا وروج اور زوال کے مختلف تغیراتی مصلحتات کے علاوہ
حکمرانوں کا بوجہ و نسب اور حکمرانوں کی تاریخیں بھی قلمبند کر دی
ہیں۔ اس کتاب کے آخر میں ایک بیواؤ اشاریہ بھی ہے۔ متوسطہ قطع
۴۲۲ صفحات قیمت (۵۰)۔

سیرالارنگ عالم :- یہ کتاب ادارہ کے شعبہ تالیف و ترجمہ کی
مولوی فیض محمد صاحب مدنی نے ایم۔ ایل۔ بی میں جن کو سوانح
نگاری کا خاص کلمہ ہے اور مفید معلومات کو بطورے دلچسپ اور سادہ
پیرایہ میں قلمبند کر دیا ہے۔ یہ کتاب مدرسوں کے طلبہ اور عوام
کے مطالعہ کے لئے بہت ضروری ہے۔ چھپنے کا قطعہ دم صفحات قیمت
مجلد (۱)۔

نواب حماد الملک سید حسن بگرامی عالم فاضل
عالم الملک :- بہت سے کھلا وہ دہر اور غریب تھے۔ وہ آخر تک

اس کتاب میں غزلیات کے علاوہ فیض کی شہرہ اور دیگر
کلام کا بھی انتخاب شامل ہے جس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ
حضرت خواجہ میر درد اور شاہد سراج اورنگ آبادی کے مصنفین
و عرفان اور شعر و سخن کا امتزاج جتنا اچھا حضرت فیض کے کلام
میں موجود ہے کسی اور اردو شاعر کے یہاں نہیں ملتا۔ تھرا لکھنات
(۱۳۸۲) اس تصویر و قد حضرت فیض قیمت ۱۲۔
ڈاکٹر احمد حسین بائی کے کلام کا دلچسپ اور عیاری
باد و سخن :- انتخاب ہے۔ ان کے کلام میں سادگی اور نفاذ
بے غنی ہے اس انتخاب کے ساتھ ڈاکٹر سید علی الدین صاحب قادری
ذکر کا معرکتہ آلا مقدمہ بھی شریک ہے۔ جس میں ادب اور مال
کے معرکوں کا بھی تذکرہ درج ہے۔ صفحات ۱۲۰ قیمت ۱۲۔

مطلع سخن :- نواب عزیز یار جنگ بہادر عزیز و آغ دلو کی
شاگرد اور حیدر آباد کے ایک نیکو متسل شاعر ہیں۔
ان کے کلام میں ادبی لطافت اور زبان کی پاکیزگی نمایاں ہوتی ہے
اس انتخاب کے ساتھ جناب ڈاکٹر سید علی الدین قادری ذکر کا مقدمہ
بھی ہے جس میں ان کی شاعری پر تبصرہ کیا گیا ہے۔ شاعری اور
زبان کا ذائقہ بخشنے والے اصحاب کے لئے اس کا مطالعہ دلچسپی
سے خالی نہ ہوگا۔ نفاذ و صفحہ ۱۲۹ تصویر شاعر قیمت ۱۲۔

مطلع سخن جلد اول :- یہ دکن کے عیسوی شعرا کے دور و صفیہ
مقدمہ اساتذہ طلبہ دار فہم اور اہل فہم اس تذکرہ کی تالیف میں
حصہ لیا ہے۔ یہ تذکرہ پانچ و دو روں پر منقسم ہے جو دور کے شروع
میں ایک نمونہ ہے جس میں اس کی ادبی خصوصیات پر روشنی ڈالی
گئی ہے۔ ہر عہد کے مشاہیر شعرا کے حالات ان کے کلام کا نمونہ اور اس
پر تبصرہ ہے۔ ان شاعروں کے تذکرہ کے ساتھ دیگر ہم عصر و کئی اور
شعرا کی ہند کے شعرا کے نام دیے گئے ہیں تاکہ اردو شاعری کا
تاریخی منظر معلوم ہو سکے۔ شاعروں کی تصویروں کے علاوہ
فرما زوایاں و کلام اور قدر و ان ادب و شعر کی بھی تصویریں شریک
ہیں۔ (۵۰) صفحات ۵۰ نفاذ و قیمت (۵۰)۔

مطلع سخن جلد دوم :- یہ اس شعرا کے دور و صفیہ کا تصویر

کیونکہ گزشتہ ربع صدی میں اردو تجاہل شعاعوں اور ادبوں سے متعلق ایسی نئی معلومات حاصل ہوئی جاری تھیں کہ اس وقت جو بھی کوشش کی جاتی وہ نامکمل رہ جاتی، اب اردو کی گزشتہ صدی کے بڑے بڑے محققین کے نقاب ہونے لگے ہیں اور بہت سی ایسی چیزیں مل گئی ہیں جن کی وجہ سے ایک مربوط اور مسلسل تاریخ مرتب کر لی جا سکتی ہے۔ اس کہولت کے پیش نظر ادارہ نے یہ تاریخ مرتب کرائی ہے۔ یہ تاریخ صرف طلبہ اور عوام کے لئے نئی کئی ہے۔ اردو مصنفات اور ادب سے دلچسپی رکھنے والے طلبہ و محققین کے لئے ایسی معلومات کا بہترین ذریعہ ثابت ہوگی۔ یہ نئی قطعیت ۶۹ صفحات قیمت ۱۰/-

اردو نثری کا ارتقا - افسانہ اور مہیار کے اظہار کے لئے

صرف اس کے مصنف پر و فیر عبدالقادر صاحب سروری کا نام ہی کافی ہے۔ سروری صاحب کی نظر اردو شعاعوں کی تاریخ پر پڑی وسیع اور باریک ہیں۔ اس کی خصوص میں عہد حاضر کے کسی محقق و ادیب کو ان کی ہمہری نصیب نہیں۔ اردو نثری کی تاریخ سے دلچسپی رکھنے والے اصحاب کے لئے یہ کتاب ایک نئے طریقہ پر ہے جو اپنے موضوع اور اہمیت کے لحاظ سے سب سے پہلی کامیاب ترین کوشش ہے۔ یہ کتاب دس ابواب پر مشتمل ہے جن سے اس کی اہمیت اور تلاش و جستجو کا اندازہ ہو سکے گا۔

بڑی سائز (۱۴۳) صفحات قیمت ۱۰/-

مغربی نثر کے اردو ترجمہ - دوسری جلد - یہ کتاب اردو کے نثری ادب میں ایک نئے اور اہمیت کے حامل کتاب ہے۔ اس کتاب کے مصنف مولوی رحیم حسن صاحب ایم اے نے ان تمام انفرادی اور اجتماعی کوششوں کو اکٹبا جمع کر دیا ہے جو صدیوں سے اردو زبان کو مالا مال کرنے کے لئے دوسری زبانوں کی کتابوں کو اردو میں منتقل کرنے کے سلسلہ میں کی جاتی رہی ہیں۔ یہ تذکرہ نہایت اہمیت اور تحقیق سے سمجھا گیا ہے اس لئے مستند بھی ہے، ذریعہ تحقیق۔ نقد ادب اور تاریخی طریقہ تحقیق کے علاوہ انہوں نے متعلق معلومات حاصل کرنے میں ایسی کتابوں کی خاص

سیاسی سازشوں اور ہنگامہ آواروں سے بچ رہے انہوں نے حیدر آباد کو طبع کی ایسی دولت سے الامال کر دیا جس کی وجہ ان کا نام رہتی دنیا تک اس ملک کی تاریخ میں زمرہ رہے گا۔ مولوی فیض محمد صاحب مدتی نے اپنے اپنے اپنے ان کے سوانح پر بڑے قریب سے مرتب کئے ہیں طلبہ اور عوام کے لئے اس کا مطالعہ بہت مفید ثابت ہوگا۔ یہ نئی قطعیت ۶۹ صفحات قیمت ۱۰/-

میر محمد مومن - میں چٹوڑائے سلطنت اور وزیر مطلق تھے۔

دنیوی عروج کے علاوہ ان کی مذہبی سادات و فضیلت بھی بہت مشہور ہے۔ انہوں نے نزار مارو سپہ کے صرغے سے ایک دائرہ بنایا تھا جس میں خاک کر لائے محلی بچا دی تھی۔ اور یہ دائرہ اب تک "دائرہ میر مومن" کے نام سے حیدر آباد میں مشہور و معروف ہے۔ یہ میر مومن صاحب علی پادیکہ فارسی شاعر بھی تھے اور حیدر آباد آنے سے قبل شاہ ایران کے استاد و بچارہ پکے تھے۔ ان کے نہایت تفصیلی اور تحقیقی حالات زندگی اس کتاب میں جناب ڈاکٹر سید فی الدین قادری نے درج کیے ہیں۔ دیکھ کر تعجب اور تعجب عام اسلوب میں تحریر فرمائے ہیں۔ تقریباً تین سو صفحات میں تصاویر قیمت ۱۰/-

اداس میں اردو - اٹھنی نئی فاضل نے مدراس میں

اردو کے نثر و نثر اور اس کے ارتقا کی تاریخ پیش کی ہے۔ کتاب کو دو ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ہر دور کے شاعروں اور نثر نگاروں کے سوانحیات اور غور سے ملاحظہ کیے گئے ہیں۔ تاریخ ادب اردو سے دلچسپی رکھنے والے اصحاب کے لئے اس کا مطالعہ ضروری ہے۔ صفحات ۲۰۰ قیمت جلد ۱۰/-

تاریخ ادب اردو - تاریخ ادب میں کئی نئی اگرچہ

اس موضوع پر دو بار کتابیں چھپ چکی ہیں لیکن ان سے نہ عالموں کی ضرورتیں پوری ہو سکتی ہیں اور نہ عوام اور طلبہ کی۔ اردو ادب کی کوئی مکمل تاریخ اس سے قبل کبھی نہ لکھی تھی

بھی خواہ کے علمی و ادبی کا ناموں، طریقہ تعلیم، تاجروہ کتب خانہ اور دینی حمایت اور تبلیغ کی کوششوں اور اس کے اچھلنے کی دیوبند کی درس گاہوں، اردو کے پروفیسروں اور بیرونی خواہوں کا ایک اجمالی تذکرہ ہے۔ اس کتاب کو جناب ڈاکٹر زور صاحب نے نہایت تحقیق اور جانفشانی سے تالیف کیا ہے۔ طباعت و کماہت دیدہ زیب صفحات (۱۲۰) قیمت چم۔

اس میں دکن کی چار گرجاؤں خاتین انشا پر دواز
تذکرہ ولی :- محترمہ جہاں بالو بیگم صاحبہ، محترمہ نعین النساء بیگم صاحبہ، محترمہ نعیم النساء بیگم صاحبہ اور محترمہ نجم النساء بیگم صاحبہ کے دلچسپ مضامین ہیں جو بائے نیچہ حضرت ولی اور ملک آبادی کے حالات زندگی اور خصوصیات کلام پر نہایت دلچسپ اسلوب میں اور جدید ترین نقطہ نگاہ سے لکھے گئے ہیں۔ ان مضامین میں ولی کی معلومات ان کے تخیل ان کے فن و ذوق عرفان کے علاوہ ان کے اسلوب زبان اور انتخاب الفاظ کے متعلق بھی نہایت مفید اور دلچسپ بحث کی گئی ہے۔ ولی کے متعلق یہ پہلی مستقل اور جامع کتاب ہے۔ اس کا مطالعہ شائقان ادب کی کلی کا باعث ہوگا۔ صفحات ۸۴۰ طباعت و کماہت نفیس کاغذ اعلیٰ قسم جلد پردہ و گونہ نہری نام قیمت جلد مال۔

محبت کی چھلک :- مرزا ظفر حسن صاحب بی اے کے چودہ اس کے جلد افسانے عشق و محبت کی دلوں بالکلیوں اور حسن و خوبی کی رضاگوں سے معمور ہیں۔ ہر فضاء میں تخیل کی جولانیاں اور مشاہدات کے تاثرات کا درخشاں ہے۔ نوجوانوں کے غضب العینی معاشرہ کی کچی تصویر اور مصروف زندگیوں کے لمحات فرصت کے لئے ایک شائستہ ذہنی تفریح ہے۔

چھوٹی قطع (۱۳۲) صفحات قیمت جلد چم۔

اہمیت ہوتی ہے۔ چھوٹی قطع ۴۰۰ صفحات قیمت جلد چم۔
آریائی زبانیں :- اس کے مافذوں کا مستند تذکرہ ہے جس کو ادارہ کے لئے ڈاکٹر مسدیشور داس صاحب ایم اے ڈی لٹ پر فیسر سنکرت و لسانیات نے خاص طور پر مرتب کیا ہے۔ صفحات ۱۰۴ قیمت ص۔

شعرا عثمانیہ :- جس میں شعرا نے جامعہ عثمانیہ کے کلام کا پاکیزہ انتخاب درج ہے۔ یہ مختلف نظموں اور غزلوں کا گلہ رنگ و بو ہے۔ ابتدا میں ہر شاعر کے کلام پر ایک مختصر مگر مفید تنقید کی گئی ہے۔ تقریباً بیس سال سے یہ جواہر پار سے کچھ پڑے تھے جن کو مولوی سید عین الدین صاحب قریشی ایم اے اور مولوی عبدالعظیم خاں صاحب باقی ایم اے (دراپور اسکالر) نے نہایت سلیقے سے مرتب کیا ہے۔ انہیں خیالات کا مطلق جوتو کہیں زبان کا کہیں جذبات کی سازگی اور جلدی ہے تو انہیں خوب بیان کی بدت۔ کلام کا انتخاب اس خوبی سے کیا گیا ہے کہ ہر شاعر کی عظمت اور اس کا معیار اور سے طرز پر سامنے آتا ہے۔ جدید اردو شعاری کے دھانائے کا مطالعہ کرنے والوں کے لئے ایک کیاب اور کلاؤتخ ہے۔ رائل سائز (۲۳۱) صفحات ہارڈور قیمت جلد مال۔

محمد حسین آزاد :- اس کے اس بڑے شاعر اور دانشور نے انہیں ہونے سے۔ اس کتاب کو محترمہ جہاں بالو بیگم صاحبہ ایم اے نے تیار اور دیکھ کر انشاں جامعہ عثمانیہ نے نہایت طبع و لطف سے تالیف کیا ہے۔ یہ کتاب سات ابواب میں تقسیم کی گئی ہے جن میں آزاد کی زندگی، شاعری اور نقاشی سے متعلق مکمل معلومات شامل ہیں۔ مع تقریر آزاد (۲۰۰) صفحات قیمت مال۔

گارساں و تاسی :- اردو کے پہلے پروفیسر فرائس کے شعور اور ہندوستانوں کے بچے

لئے کاپتہ۔ سب کس کتاب گھر خیریت آباد حیدر آباد دکن سے طلب فرمائیے۔

ادارۃ ادبیات اردو کی کتابیں

قیمت	ت	نام کتاب	قیمت	ت	نام کتاب
روپیہ	مقسا		روپیہ	مقسا	
۴	۴۸	سبح کا جادو	۸	۸۰	من کی بیٹا
۸	۶۸	طبیعیاتی کائنات	۸	۶۴	سرگزشت غالب
۱۲	۱۲۴	مناخ سخن	۴	۴۰	نظام الملک
۱۲	۱۲۲	کیف سخن	۸	۳۳۰	تاریخ گولکنڈہ
۱۲	۱۲۷	بادہ سخن	۱	۱۶۰	ریختہ نمبر (۸ تصاویر)
۱۲	۱۵۲	سراج سخن	۱۲	۱۱۲۰	ارمغان جذب
۱۲	۱۲۰	ایمان سخن	۸	۲۱۸	یورپ جنگ سے پہلے
۱۲	۱۴۴	فیض سخن	۸	۲۷۲	تاریخ سیاسیات
۵	۵۰۰	مرقع سخن جلد اول (۵۵) تصاویر	۶	۴۸	سر سالار جنگ
۵	۴۳۲	دوم (۵۰)	۴	۱۴۵	مغربی تصانیف اردو کے تراجم
۱	۱۷۵	نقد سخن	۴	۱۳۲	محببت کی چھاؤں
۸	۲۴۸	نذر ولی	۴	۱۶۸	اقبال نمبر
۲	۱۹۲	گریہ و تبسم	۱	۱۱۲	سالنس کے کرشمے
۱	۱۸۳	مغایہ نقد ہمار دکن	۱۲	۲۳۰	شعر الہی علمانیہ
۱	۱۴۵	من کی دنیا	۸	۳۰۰	مکتوبات شاد عظیم آبادی
۸	۱۹۶	مدراں میں اردو	۲	۱۶	دادا بھائی
۲	۱۱۲	معجم نامہ	۲	۲۰۰	اردو نامہ
۱	۱۵۴	نذر دکن	۲	۱۶۸	سرگزشت حاتم
۸	۲۴۰	روح غالب	۶	۴۰	عماد الملک
۴	۲۰۰	عاصم	۵	۵۶	اردو دانی کی بھائی کتاب
۶	۵۶	دفتری معلومات	۵	۵۶	د سری کتاب
۶	۴۸	آبدوز کشتیاں اور سونگ	۲	۲۰۰	مصدق حسین آبادی
۱۲	۱۴۳	اردو مثنوی کا ارتقاء	۴	۱۲۰	لاغذ کی فانی
۸	۲۱۶	نمود زندگی	۸	۶۲	فن تقریر
۱۲	۳۰۴	سرگزشت ادارہ	۱	۱۴۵	مقدمہ تاریخ دکن
۸	۳۱۲	میر محمد مومن (۳۳) تصاویر	۸	۳۰۰	ہندوستانی تمدن
۳	۳۲	بلقان	۵	۸۰	یودوں کی کہانی
۱۲	۱۱۳	خطا بدلت	۵	۵۰	سر لقا
۱	۱۵۰	علم خانہ داری	۶	۴۸	پانی کی کہانی
۱۲	۸۰	چیونٹی (۱۶) تصاویر	۸	۳۱۲	رسالہ طیب
۸	۱۶۸	ابواب	۵	۴۰	سلک گوہرین
۱۰	۸۰	گمشد فانی (۴) تصاویر	۸	۷۶	تاریخ ادب ارسو
۳	۱۲۸	کاساں دتاسی	۱۲	۲۲۴	رفیق اردو دار
۱	۱۶۸	رات کا بھولا	۸	۵۶	اشوب
۴	۲۳	سکند، جاہ	۱۰	۸۸	حیدر آباد
۱۰	۵۶	بلاغت	۸	۱۶۹	شاد اقبال
۸	۲۰۰	ادب سنہ ۱۹۳۲ء میں	۵	۱۰۴	آرڈر آف انڈیا
۴	۳۲	نارنگی دولت	۴	۳۱	بسم اللہ
۴	۳۲	افضل الدولہ	۵	۳۹۶	نذکرہ اردو مصنفین طاعت جلد اول
۴	۳۲	نواب میر محبوب علی خان	۱۰	۵۶	عرب اور عربستان

(ماء نامہ)

سبب

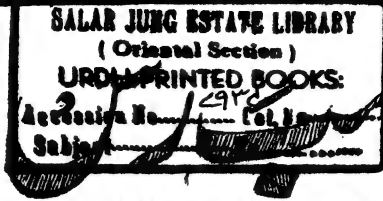


۷۰۹۵۸
حیدر آباد دکن

ادارہ ادبیات اردو

ادارہ ادبیات اردو حیدرآباد دکن کا مہنامہ

ریڈنگ روم
ڈاکٹر سید محمد الدین قادری
مجلس ادارت
خواجہ محمد سید الدین ایم اے
نئی دہلی



نشان پستہ سفید ۱۵۳
نشان پستہ برطانیہ ایم ۳۹۵۰
ٹیلیفون نمبر ۲۲۰۹
چند سالانہ سارا پستہ کی قیمت
بچوں کا سیکس روپے پورے

شمارہ ۱

ماہیت ماہ جنوری ۱۹۴۶ء

جلد ۹

فہرست مضامین

۱	اردو میں سنسکرت ادب	۲	خواجہ محمد سید الدین ایم اے (عثمانیہ)
۲	ترقی پسند فن کار سے (نظم)	۳	بشیر انصاری کی نظم
۳	وصف (افسانہ)	۹	خان بہادر عبدالرحمن عثمانی
۳	نویز زندگی (نظم)	۱۲	رومی (اورنگ آباد)
۵	جھلک (افسانہ)	۱۳	صحنی شاہ (عثمانیہ)
۹	مکھنٹ پر باد (افسانہ)	۱۴	جہاں بانو کی نظم
۹	احترام از (نظم)	۲۰	شرفی صدیقی (جلیپور)
۹	فیشن	۲۱	فریدہ بی بی
۹	خوش آمدید (نظم)	۲۳	سلیمان اربیب
۱۰	دو خطے	۲۵	قتیل شہنائی
۱۱	محموسات (غزل)	۲۶	محمود حق دہلی
۱۲	مشرق (ترجمہ)	۲۶	اقبال شین
۱۳	دھوکے (نظم)	۲۸	محمد مصطفیٰ الدین ایم اے (آخری)
۱۳	مختار علی قطب شاہ اور روانیت	۳۲	منظف الدین ظفر فی ایم اے (عثمانیہ)
۱۵	غزل	۳۳	شوق بانو
۱۶	فریسیل (افسانہ)	۳۴	عظیم حیدر آبادی
۱۷	تجلیات (غزل)	۳۸	نوابہ بی بی
۱۸	پتالوں اور صحت اور دل میں رسول نبی	۴۰	رشید قریشی ایم اے (عثمانیہ)
۱۹	نئی کتابیں	۴۱	حسن علی (عثمانیہ)
۲۰	نظارے (افسانہ)	۴۵	محمد رفیع الدین
۲۱	ابراہیم ظفر (نظم)	۴۹	افسر آزدی
۲۲	وضع حسنہ کیساتی	۵۳	نجمہ بی بی
۲۳	حسین گمان (نظم)	۵۵	نور محمد
۲۳	اندھرا (افسانہ)	۵۶	نور محمد
۲۵	نور محمد (نظم)		
۲۶	ادارہ کی خبریں		

اردو میں سائنسی ادب

(دہلی کالج کی خدمات)

اور سائنس کی تعلیم اردو میں دی جاتی تھی۔ مغربی علوم کو اردو میں پڑھانے میں سب سے بڑی رکاوٹ یہ تھی کہ ان علوم میں اردو میں کتابیں نہیں ملتی تھیں۔ اردو کے جاسوسوں نے اس کی کوپڑا کر کے نئے نئے مشعلہ ۱ میں ایک فیشن بھی قائم کی۔ اس سے قبل اسکول بک سوسائٹی کی طرف سے ہزاروں نصابی کتابیں تیار ہو چکی تھیں مگر سائنس پر سب ابتدائی قسم کی کتابیں تھیں۔ سلسلہ ۱ میں ایچ۔ جی۔ کیش کی کتاب بک ڈیکٹیو کی قیام عمل میں آیا جس میں ایسے اصحاب کا انتخاب عمل میں آیا جو انگریزی زبان سے اردو میں ترجمہ کرنے کے اہل تھے۔ کیش نے پہلے کہا کہ درسی کتابوں میں سائنس اور سائنس کی برقرار رکھنے کے لئے کتابیں پہلے انگریزی میں لکھوائی جائیں اور پھر ان کا اردو میں ترجمہ کرایا جائے۔ دہلی ورنیکل سوسائٹی کے قیام کا سب سے بڑا مقصد یہ تھا کہ جدید ترین کتابوں کی تابیت اور ترجمہ کے ذریعہ سے اردو زبان کو ترقی دی جائے۔ اس مقصد کو آگے بڑھانے میں ہندوستانی اور انگریز برادر کے شریک تھے۔ اس سوسائٹی کے اخراجات کی ذمہ داری اور ان کے صاف ادا کرنے کے لئے شاہ اردو ان کے صاحبزادے اور ان کے صفا و امراء نے بھی نکلے دیے۔ اسی طرح حیدر آباد میں سے فوٹو سرائی فوٹو جہان نے بھی رقمی خطوں سے اس سوسائٹی کی مالی امداد کی اس سوسائٹی کے سب سے بڑے مسرتوں میں دہلی کالج تھے۔ جو تو اوروں میں بھی تھے ان کا ذکر کرنا ضروری ہے۔

(۱) سائنس کا کوئی ایک لفظ جس کا مترادف اردو

میں نہ ملے تو ایسے لفظ کو اردو میں جب سے لینے میں کوئی تباہ نہیں۔ مثلاً سوڈیم کلورین وغیرہ۔

(۲) اگر سائنس کا کوئی ایک لفظ ایسا ہے جس کا مترادف

اردو میں موجود ہے تو اردو لفظ ہی استعمال کیا جائے جیسے

شمس الہ اور شاپان اودھ کے بعد اردو کو علمی موضوعات سے روشناس کرانے کی باضابطہ اور منظم کوشش دہلی کالج میں کی گئی۔ اس کا دائرہ عمل ان دونوں سے زیادہ وسیع اور منظم تھا۔ خوش قسمتی سے اس کو ایسے ذی علم اصحاب مل گئے تھے جنہوں نے اردو کے ترقی و علم کے جوہر پاروں سے امداد لے کر دیا۔ چونکہ اس کالج کا دلچسپ تعلیم اردو تھا اس لئے نصابی ضروریات کے تحت سائنس اور دیگر مغربی علوم کی کتابوں کے ترجمے کئے گئے اور اس کے قبضے یا فزول نے بھی اس قسم کی کتابیں تابیت کیں۔ مختلف علوم اور سائنس کی اشاعت کے لئے سلسلہ ۱ میں دہلی ورنیکل ٹرانسلیشن سوسائٹی کا قیام عمل میں آیا جس نے پہلی دفعہ ترجمے کے ایسے اصول مرتب کئے جو ترجمے کی اشکالات کو دور کرنے میں بڑی حریک اور معاون ثابت ہوئے۔ اس کے بعد یہ کالج سلسلہ ۱ میں قائم ہوا جس میں اس ابتدائی (۳۰) سال کے حالات پر پردہ پڑا ہوا ہے۔ البتہ یہ خیال کیا جاتا ہے کہ اس حصر تک اس میں انگریزی تعلیم کا کوئی انتظام نہ تھا۔ مثل دوسرے مدارس کے عربی فارسی کی موجود تعلیم ہوتی ہوگی۔ جس تعلیم عامہ کی سفارش پر خطبہ میں اس کالج کے بانی پانورویہ ماہانہ مقرر کئے گئے اور باضابطہ تعلیم کا انتظام عمل میں آیا۔

سلسلہ ۱ میں انگریزوں کی سفارش پر اس برس کا میں ایک انگریزی جماعت کھولی گئی۔ فوٹو اعظمی والدہ سید فضل علی خاں جہاد رزیر بادشاہ اودھ نے سلسلہ ۱ میں ایک لاکھ ستر ہزار روپے تعلیمی اخراجات کے لئے وقف کر دیے۔

اس کالج کی سب سے خاص خصوصیت اور اس کی کامیابی کا راز یہ تھا کہ یہاں کوئی تعلیم کیلئے نہ دیتا اور سوائے انگریزی کے دوسرے تمام مذاہن مثلاً ریاضی، فلسفہ، ہیئت

آٹھویں کے لئے لودا سلف کے لئے گندہک وغیرہ۔

(۳) یہ ضروری نہیں کہ جو انگریزی الفاظ اردو میں لئے جائیں ان کو مجتبہ کھائے بلکہ انہیں اردو میں ادراک کرنے کی کوشش کی جائے مثلاً جٹل آت دی پیس کر اردو میں جٹل میں کہہ سکتے ہیں۔

(۴) سائنس کی کتابوں کا ترجمہ چونکہ انگریزی ہی سے کیا جائے گا اس لئے انگریزی الفاظ کا اردو میں استعمال ناگزیر ہے۔ بعض الفاظ ایسے ہیں کہ جن کے مترادف کسی نہ کسی صورت میں اردو میں پائے جاتے ہیں تاہم انگریزی الفاظ اردو میں منتقل کر لئے جائیں تو کوئی ہرج بھلیں مثلاً *Genus, species, order* وغیرہ

(۵) یہ بھی ہدایت کی گئی تھی کہ جہاں تک آسانی سے ممکن ہو انگریزی الفاظ کے استعمال سے احتراز کیا جائے۔ جو شخص کسی سائنس کی کتاب کا ترجمہ کرنا چاہتا ہے تو اسے چاہیے کہ اس سائنس پر جو کتابیں اردو میں اس سے قبل بھی جاچکی ہیں انہیں پیش نظر رکھے اور وہی اردو الفاظ اور اصطلاحیں استعمال کرے جو ان کتابوں میں استعمال ہوئی ہیں۔

(۶) اگر انگریزی جملے میں کسی ایسے واقعہ کی طرف اشارہ ہو جس سے اہل ہند ناواقف ہوں تو مترجم کو چاہیے کہ حاشیہ پر یا متن سبب ہو تو متن میں مختصر طور پر اس کی تشریح کر دے۔

(۷) جو الفاظ اردو میں مفہوم داکرنے کی کوشش کی جائے۔

(۸) کسی سطر کی اصطلاحات کو مجتبہ اردو میں لے لیا جائے۔ البتہ کیلانی صاحب جن کے نام اردو میں موجود ہیں تو انہیں برقرار رکھا جائے لیکن مرکبات کے نام انگریزی ہی میں رہیں جیسے ایٹم و سلفک۔ سلفک ایٹم وغیرہ۔

دہلی کالج نے اردو میں سائنس کی جو کتابیں شائع کیں ان کی اشاعت میں سٹر بتروس پرنسپل

کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ انھوں نے ہی سب سے پہلے یہ کام چھوٹے پیمانہ پر شروع کر دیا تھا جب سوسائٹی قائم ہوئی تو اس کا کام بھی کالج والے ہی کرتے تھے۔ ڈیٹیکل سوسائٹی ٹرانسلیشن سوسائٹی اردو سوسائٹی۔ لائبریری آف یوٹیل ناچ وغیرہ سب اسی کے نام ہیں سٹر بتروس کے خطبہ پر ڈاکٹر اسپرنگر پرنسپل ہونے جو ان کے صحیح معنوں میں بائشیں تھے۔

اس انجمن کے قیام سے قبل دہلی کالج میں ترجمہ کا کام شروع ہو چکا تھا۔ چنانچہ کسی کالج کے تین طالب علم (جن میں سٹر راجندر پش پوٹھی تھے) اوقات درس کے بعض اوقات اور ریاضی وغیرہ کی کتابوں کا ایک ایک صفحہ اردو میں ترجمہ کر کے سٹر بتروس کو دکھاتے اور وہ اس ترجمے کی اصلاح کرتے تھے۔ اس طرح جب ترجمہ مکمل ہو جاتا تو طباعت کے ذریعہ نیچے کی جماعتوں کے نصاب میں داخل کر دیا جاتا۔ دہلی کالج میں تراجم کی ابتدا ستر سالہ میں ہوئی جبکہ سٹر بتروس کا تقرر کالج کی پرنسپل ہوا۔ ستر سالہ ستر سالہ کے نصاب کو دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ سائنس کی تعلیم کس درجے تک تھی۔ ستر سالہ میں تو سائنس کی جماعت الگ قائم نہ تھی تھی اور جماعت اول تا ششم کی اردو میں سائنس ڈاکٹر ایم دیو جاتی تھی۔

غرض دہلی کالج ہی ایک ایسی درس گاہ تھی جہاں مغربی علوم مثلاً طبیعیات، ریاضیات، فلسفہ وغیرہ کی تعلیم اردو میں دی جاتی تھی اور ستر سالہ میں اچھے رہتے تھے۔ جب کچھ سٹر کا محفل پرنسپل دہلی کالج سے ری رپورٹ بابت ستر سالہ میں یہ لکھا ہے کہ

مشرقی شعبے کا طالب علم اپنے مغربی شعبے والے

حریت سے سائنس میں نہیں بڑا ہوا ہے۔

اس رپورٹ پر گفتگو کر رہا ہوں نے اس طرح انہما

خوشنودی کیا ہے۔

طلبہ (مجموعہ مشرقی) کی سائنس کی ترقی کے

(۲۲) حوادث (لائبریری آف ویلنگٹن کے رسالہ کا ترجمہ)

(۲۳) ہائیڈراکس (" " " " ")

Double refraction and Polarization of Light (۲۴)

(۲۵) رسالہ برق (ترجمہ راجٹ)

(۲۶) گالوان ازم (" " " ")

(۲۷) رسالہ اصول حساب (ترجمہ ڈی مورگن) باوہر و لوئنگ

کالج کے اساتذہ میں مولوی مولک علی، ماسٹر راجندر چند

اجرو حیا پر شاہ، پنڈت رام کشن دہوی، باوہر دیو سنگھ

ریاضی، سائینس اور طب پر مکتبہ کتابیں تھیں، ماسٹر راجندر

نے ایک کتاب شائع کی جس میں تفریق اصحاب (محکم دلائل سے مزین)

مکتبہ کتب کا ایک نیا طریقہ بیان کیا۔

اس پر پروفیسر کلاڈ (ڈیپارٹمنٹ آف میڈیسن) اور پروفیسر

(سین ایڈریوس) نے بہت اچھی رائے دی۔ ماسٹر راجندر

نے جو طریقہ ایجاد کئے، یورپ اور ہندوستان کے کالجوں میں

رایج ہو گئے۔ ڈاکٹر سید سجاد صاحب کا بیان ہے کہ انھوں نے

اس کتاب کا ایک نسخہ دہلی سے لا کر کتب خانہ جامعہ عثمانیہ میں

داخل کیا تھا۔ مگر ہم کو اس کا پتہ نہ ملا۔ اس کتاب کے

دوسرے میں ماسٹر راجندر نے لکھا تھا کہ "اس کتاب کی

کاپیاں انگریزی زبان میں مطبعہ میں بطور کریمیں خود مختار

تھا" یہ کتاب انگریزی زبان میں لیتھو میں چھپی تھی۔ ان کی

ایک دوسری کتاب کلیات و جزئیات (محکم دلائل سے مزین)

مکتبہ کتب کے نام سے چھپی۔ اس کتاب کے کئی

نسخے انگلستان بھیجے گئے اور پروفیسر مارگن پروفیسر ریاضیات

لندن یونیورسٹی نے اس کتاب کی بہت قدر لی۔ پروفیسر

موصوف نے ان کے چرمین کرل سائنس کو ایک خط لکھا

جس میں ماسٹر راجندر کی اس ایجاد کی بہت تعریف کی تھی

اور یہاں تک لکھا تھا کہ اس کتاب کے انتخابات انگلستان

کی ابتدائی تعلیم کے نصاب میں فریک کئے جائیں۔ کورٹائن

ڈاکٹر کٹر (ایسٹ انڈیا کمپنی کے معزز ممبروں نے ایک ضلع

پنج پانچ اور دو ہزار روپے نقد بطور انعام ماسٹر راجندر کے لئے

جو تقین دیا گیا اس سے بعد سرت ہو گیا

دلی کالج اور دہلی کالج سوسائٹی نے جو تحریک ادا کیا

شائع کی ان کی فہرست درج ذیل کی جاتی ہے۔

(۱) اصول علم شلٹ و تراش ہائے مخروطی و علم ہند

باجہ راجندر سنگھ

(۲) رسالہ مساحت متعل و علم شلٹ۔ پنڈت راجندر

سنگھ

(۳) رسالہ ریاضیات پیشہ نگری بوسیہ ہندوستان کے

پروفیسر سنگھ

(۴) اصول قواعد ریاضیات۔ پنڈت راجندر سنگھ

(۵) ہندوستان کا نقشہ۔ رسالہ

(۶) ہندوستان کا نقشہ۔ رسالہ

(۷) رسالہ تحقیقات لائبریری آف ویلنگٹن کے

رسالے کا ترجمہ سید کمال الدین بیدر

(۸) تحریک ترقی و ترقی (مقالہ ۱۹۱۰ء تا ۱۹۱۱ء)

(۹) الجبر (ترجمہ راجندر)

(۱۰) عملی علم ہند

(۱۱) اصول علم ہند (ترجمہ علم ہند ہرشل)

(۱۲) رسالہ گریٹر (ترجمہ پارکر)

(۱۳) استعمال آلات ریاضی

(۱۴) تعلیمی علم ہند

(۱۵) میکانات (لاٹن)

(۱۶) مساحت (ترجمہ نیوٹن)

(۱۷) طبیعیات (ترجمہ ارنلڈ)

(۱۸) رسالہ طب (انگریزی سے) پنڈت رام کشن دہوی

(۱۹) رسالہ جراحی

(۲۰) حرکات و سکونیات

(۲۱) علم المناظر (ترجمہ لاپ)

کہیں جو الہ نہیں۔ سرور حق کی اردو عبارت یہ ہے۔

اصول

علم شلٹ و تراشش ہائے مخرومی و علم ہندسہ بالجبر کے ترجمہ راچند را سا را علی دلی کالج کے لئے تصنیفات ہیں اور بوش رلٹ صاحب اور کمن صاحب کے سے کہے۔

صفحہ (۲) اور (۳) پر نقشہ فہرست کی سرخی کے تحت کتاب کو حسب ذیل عنوانات پر تقسیم کیا گیا ہے۔

(۱) علم شلٹ مستقیم الاضلاع بالجبر (اس میں دو باب ہیں)

(۲) علم شلٹ مستقیم الاضلاع بالجبر (اس کے دو ابواب ہیں)

(۳) علم شلٹ کروئی (جو چار ابواب پر مشتمل ہے)

(۴) تراشش مخرومی ()

(۵) علم ہندسہ بالجبر (اس میں آٹھ ابواب ہیں)

(۶) تہیکہ

مترجم کے دیباچہ کا اقتباس کس طرح ذیل ہے۔

..... باعث تالیف کرنے اس رسالہ کا..... بیان

کرتا ہوں..... کہ صاحب عالی مراتب والا مناقب جناب بوٹروس صاحب بہادر پرنسپل مدرسہ دلی کو منظور نظر یہ ہے کہ

جميع کتب علمیا و تحریری زبان سے اردو میں ترجمہ ہو کر طلبہ عربی

اور فارسی خوان کو پڑھانی جاویں اور طلبہ مدرسہ فارسی کا

بھی میل طبیعت طرف تحصیل علم ریاضی کے سبب ان کی سعی بیخ

کے بیخ سیکھنے سالہ جہد و مقابلہ کو جاسی خاکسار نے پہلے تالیف

کیا ہے۔ دریافت ہوا اس سبب سے اس بیخیدان نے قصد

اس رسالہ کی تالیف کا کیا اور پہلے صاحب اور کمن صاحب

اور بوش رلٹ صاحب کے معنفات سے استغاثت چاہی۔

باعث اس کا یہ ہے کہ بہت سی کتابیں علم طبیعت اور علم ادوات

کی زبان انگریزی میں ایسی ہیں کہ بغیر جاننے علم شلٹ اور فروع

ریاضی کی سمجھنا ان کا مستعد نہ ہوتا ہے۔ پس اول بیان کرنا ان

مطالب ضروری کا جو بحث مذکورہ الصدر میں سے افغذ کی گئی

ہیں لازم پڑا..... امینہ ناظرین اس کتاب کے سے یہ

منظور رکھئے اور یہ غلٹ و انعام و عہدہ کے ایک طلبہ میں

ماستر اور امجد کو ان کی علمی و تعلیمی خدمات کے صلے میں عطا کیا گیا

کالج کے تمام طلبہ میں ماسٹر راچند نے جو بعد میں

دلی کالج کے مدرس ہوئے تھے سائنس کی کئی کتابیں لکھیں۔

شمس الغلہ و ڈوکارا و شلٹ ریاضی کی تمام شاخوں پر ادنیٰ

سے اعلیٰ اور سب سے تک نیز طبیعیات و دیگر پورے شمار کتابیں

لکھی ہیں جو سب سے خود ایک چھوٹا سا کتب خانہ بن سکتی ہیں۔ ہم

ان کی کتابوں کا آئندہ باب میں تفصیل سے ذکر کریں گے۔

مستندہ کے جنگا کے دو سے دیا تھا ہوئی۔

کالج (۷) سال تک بند رہا اور عہدہ میں حکومت ہند

نے اس کو لاہور کالج میں دیکھ کر دیا اور جو عہدہ علی و ادنیٰ

کام ہوئے انھوں نے اس کا خاتمہ ہو گیا۔ مولوی ڈاکٹر عبدالحی صاحب

اپنی کتاب "مروم دلی کالج" میں اس طرح اپنے دلی تاثرات

کا اظہار کرتے ہیں۔

..... اس نے تعلیم کا وہ صحیح طریقہ اختیار کیا تھا جس سے

بہتر کوئی اور ہمارے ملک کے حق میں ہو نہیں سکتا۔ اگرچہ اس

مٹنے ہی یہ طریقہ ہی صحت میں گیا لیکن اتنی مدت کے تجربے کے بعد

ہماری یونیورسٹیاں رفتہ رفتہ پھر اسی طرف عموماً گری

ہیں اور آخر وہی ڈھنگ اختیار کرنا پڑے گا۔ ایسی ملک

میں اسے مروم تو کیا شہید بھی کہیں تو جاسا ہے۔ کیونکہ وہ

بلاد پر اور بغیر کسی الزام کے ملی اور سیاسی مصلحتوں کے

بحیث چلنا پڑا گیا۔

بادجو کو تش اور تلاش کے ہم دلی کالج کی طلبہ

میں سے صوف (۹) کتابوں کا تہیلا۔ اب ان کتابوں کے متعلق

تفصیلی معلومات درج کی جاتی ہیں۔

اصول علم شلٹ و تراشش

مخرومی و علم ہند بالجبر

اردو و رنوں میں کتاب اور مترجم کے نام درج ہیں۔ مطبعہ کے نام

.....

• علم شش کروی کے تحت قائم الزاویہ مثلثوں اور غیر قائم الزاویہ کروی مثلثوں کے سوالات حل کرنے کے طریقے بتدریج بیان کئے گئے ہیں۔

• تراشیں مخروطی کے تحت میں قسم کے خطوط کا حامل فوج ہے جن کو قریب البیضوی، بیضوی اور بعید البیضوی کے نام سے معلوم کیا گیا ہے۔ اور ہر خط کے متعلق ضروری معلومات اور اشکال دی گئی ہیں۔

• علم ہندسہ بالجہ میں علامات ہر پرہ کے ذریعہ سے معادیر ہندی معلوم کرنے کی ترکیب، مساوات خط مستقیم و تراش ہائے مخروطی وغیرہ کا تفصیلی بیان ہے۔

• تہذیب کی سرخی کے تحت توس اور کرہ و مخروط کی مساوات کا حال درج ہے۔

اس کتاب کا اسلوب بیان تعزینا دی ہے جو اس سے پہلے کی کتابوں کا ہے۔ عربی الفاظ کا ترجمہ جگہ استعمل ہو رہے ہیں۔

• علمی الاستقامت۔ فی الغیبت۔ متعلق علمی الفوائد

ماہین اور منطبق وغیرہ نام کو ناما۔ ہاتھ کو ہات۔ لوکارم کو

لوکارم کہا ہے۔

اسلام (۲۶) کے بعد کتاب کے آخری صفحات (۳۱۱ تا ۳۱۴)

خطی سے لگ گئے ہیں۔ یہ کتاب کچھ جامعہ عثمانیہ میں نمبر

(۱۰) پر رکھی ہوئی ہے۔

(باقی آئندہ)

خواجہ حمید الدین

صحیفہ مشین پریس میں چھپ کر دفتر ادارہ

رفعت منزل خیریت آباد سے شائع

ہوا۔

ہے کہ اگر برکت مطالعہ کے اس کی طلب و پاس پر مطلع ہوں

تو اس خاکسار کی کم استعدادی پر نظر کر کے ان خاص نظرات

سے واجب جانیں

پیشکش گریہ خطائی از سی و طبعہ مزین

کہ پہنچ نفس بشر خالی از خطا و بود

یہ کتاب اپنے موضوع کے لحاظ سے بہت اہم اور معیار کے اعتبار سے بلند پایہ ہے۔ اس ضخیم کتاب میں مستحکم نے طری تحت اور کاوش سے پورا مواد یکجا کر دیا ہے۔ ہر مسئلہ کو نہایت وضاحت کے ساتھ سمجھایا گیا ہے۔ ہندسی اشکال اور مثالوں سے اس کی تشریح کی گئی ہے۔

• علم شش مستقیم الاضلاع بالہندسہ کے تحت جدول شش بنائے گئے ہیں۔ علم شش مستقیم الاضلاع بالجہ میں جب ششوی وغیب المثلث کے جدول بنانے کی ترکیب شش قائم الزاویہ۔

• حادۃ الزاویہ اور منفرغ الزاویہ کے سوالات حل کرنے کے طریقے اور پیمائش شش وغیرہ کے سوالات مع اشکال درج کئے گئے ہیں۔ اس حصے کی ایک عبارت یہ ہے جس میں طالب علم کو تمیز کرنے کے اور کرنے کی طرف توجہ دلائی ہے۔

• اگر طالب علم خوب جہارت پیدا کیا جائے تو علم شش میں اندر خوب واقف ہوا جائے تو فوائد صورتوں مذکورہ بالا کے سے اور بوسیدان صورتوں کے اور صورتیں پیدا کرنے کی قوت حاصل کیا جائے تو لازم ہے اسے کہ بہت شوق کرے اور ہر قیمت جس لاؤ اور بچاؤ اور کس لاؤ مفصلہ ذیل کو خوب سمجھے اور بغیر اعانت کسی کے ثابت کرے۔

اس کتاب میں جو سوالات درج ہیں ان میں سے

ایک کی عبارت یہاں نقل کی جاتی ہے۔

• معلوم ہیں ہمیں تمیزوں شش ایک شش کے۔ جانتے کیا

ہم دریافت کرنا ظن نظر اس دائرہ کا جو بنایا جاوے پہنچ اس

شش کے؟

ترقی پسند فن کا رے

لیکن بتا، کسی کو ترقی ہے یا پسند ؟
 تیرے خلوص عزم سے میں بدگمان نہیں
 تیری فکر میں گہر ہے بے بطنی نظام
 تیرے تفکرات ہیں دم ساز زندگی
 تیری صدا شکستہ دلوں کی پکار ہے
 احساسِ زندگی کو ادب میں بسا دیا
 لیکن، سمجھ رہا ہے یہ سارا زمانہ کیا۔؟

”کہتی ہے تجھ کو خلقِ خدا غائبانہ کیا۔؟“

سن! میں بتاؤں اصل حقیقتِ قیام کی
 وابستہ ہے جو شیشہ گران ہنر سے تو
 دشمنانِ فکرِ نظام کا تو پروردگار ہے
 جو نئے نئے محسوس کی عام ہو نہیں سکتا
 سطحِ ادبِ تباہی کی آماجگاہ ہے
 تنگ آگئی ہے منکرِ فرومایہ نے نظر
 فہرس میں کر گسول کے جو شاعر کا نام ہو
 محصور کر رہا ہے تجھے تیرا حسنِ ظن
 ہے مضمحل ضمیر ترا قید و بند میں
 اس طرح اپنے خونِ جگر کو تلف نہ کر
 اور اہل فن کی برہی و اجتناب کی
 ہے دور و دور اس لئے اہل نظر سے تو
 مہل نگارشات کا خود اسٹہنا ہے
 نااہلیت بھی زعمِ ہنرمیں ہے سرگراں
 اور شمسِ عفتِ قلب و نگاہ ہے
 ہے مرگِ ذوق، یہ ترا اندازِ درگزر
 چھ چاند کیوں ضمیرِ فروشی کا عام ہو
 تو دل شکن نہیں، ترا غمِ غن ہے غن
 ناحق سمجھ رہا ہے پسند واپسند میں
 فطری صلاحیت کے تحفظ پر کر نظر

”جس کی بہار تو ہو، یہ ایسا چمن نہیں
قابل تری نمود کے یہ انجمن نہیں“

ہر دور اپنے دور میں خود مجتہد رہا مقصد حیاتِ نو کا سدا مستدر رہا
فرق و تمیز رنگ و اثر ناگزیر ہے ہر ذوقِ تندرست، ترقی پذیر ہے
تابندہ یہ جو کاغذِ علوم و فنون ہے دیکھ، اس کے بند بند میں کس کس کا غوغا؟
تیرے بیان، تیرے قلم کی ہے جوزباں وہ خود ہے انقلابِ مسلسل کی داتاں
نقشِ دوام گرئی خونِ جگر سے ہے یہ ارتقاءِ فن، تب و تابِ ہنر سے ہے
کسبِ کمال، سلسلہٴ انجام ہے معمارِیِ سلف کا تو قائم مقام ہے
اسرارِ کائنات کا فنِ کار ہے ایسا اخلاصِ عالمی سے ہے پیدا دمِ نقیض
شاہیں کو احتیاجِ نشین، نہ انجمن ہے شاہِ باز کے لئے سارا جہانِ چمن
تو اپنی جاں نشانی کا عنوان بدل کے دیکھ !

جو ہر پھر اپنی ندرتِ سرِ کرمِ عمل کے دیکھ !

بن کر صحابِ فیضِ زمانے پہ بچھا جا انسانیتِ نواز، ترانے سنائے جا
افکارِ نو میں وحدتِ نوعی تلاش کر اور سرمدی حیات کے اسرارِ فاش کر
نیر اپنا پیامِ منکر و نظرِ عالمی رہے سررشتہٴ فروغِ عمل باہمی رہے
پیدا جہانِ تازہ ہو تیری نگاہ سے روشن ہو چشمِ دہرِ تری جلوہ گاہ سے
دلبستہٴ تیرے دم سے ہے رنگینیِ حیات تیرے لہو سے گرم و رواں روحِ کائنات
احسان کر، رعنوتِ احساں کو بھولنا سوزِ یقین میں شہرِ ترازوں کو بھولنا

ذوقِ سفرِ چہرِ شہرِ مندرِ حرام ہے !

یہ تو ہر مقام سے آگے مقام ہے !

بشیر البناکیم بشیر

اپنی سرت کا اظہار دوسروں پر ظاہر کرنا نہیں چاہتی تھی۔ پان کا داغ چھوٹے انگور کے پتے کی شکل نہ تھا۔ اور ایسا معلوم دیتا تھا جیسے چھوٹا بڑ جانے کے ساتھ ہی کسی نے دبا دبا کر ایک کسی پتے کا ٹکڑا پر سیاہی لڑا کر کاغذ میں حکن ڈال کر ایک موبہم سی شکل بنادی ہے۔ آج ہال کے اندر وہ اٹھی بیٹھتی جب سادھے رہی، اور پہلی پہلی باتیں کرنے لگی، مگر پان کا داغ کسی کی نگاہ کا مرکز نہ بن سکا۔ سنا میں جب تانگے کے پہنے گھوم رہے تھے تو وہ ایک مضحکہ خیز آزمائش میں سے گزر رہی تھی، اس کا خیال اوزنگاہیں پان کے داغ کا پتہ کھانسی تھیں، اگر تانگہ کسی وجہ سے دھبہ پڑ جاتا تھا تو اس کا ہاتھ بغیر سوچے مجھے راولوں کے درمیان کھٹوٹنے لگتا تھا۔ تھیں بن کر ٹھنی اور گم ہوتی جاری تھیں اس نے ذرا ترقی کرنا انگوں میں اکڑا پیدا کر لیا اس کا ہر سانس تانے کی آواز کے ساتھ جلتا جاتا تھا۔ اور وہ بڑے پیار سے کبھی نینا سے اور کبھی روزا سے ٹک جاتی تھی۔

فلم پوری رفتار سے سکرین پر چل رہی تھی، ہر لمحہ ایک نیا منظر، آنکھوں کے سامنے آتا تھا۔ ہر کوئی اپنے اپنے مذاق کے مطابق مسرور ہو رہا تھا ساتھ والیاں بھی کافی سے زیادہ لطف اندوز ہو رہی تھیں، لیکن وسیم کے خیالات کا تسلسل ہر بار ٹوٹتا اور ٹپتا تھا۔ کسی جیسے پہلے جاتی لینے لگتی۔ جیسے مٹھل ہوئی جا رہی ہو، اور کبھی سیٹ پر اپنا آپ بھیلادیتی، اور پان کا داغ نمایاں کر کے بیٹھ جاتی۔

انٹرول ہوتے ہی اس نے داغ اور بھی نمایاں کر دیا، داغ کو دیکھ کر اس کے اندر کچھ ہرجان سا اٹھ رہا تھا۔ کاش یہ ہرجان طوفان کی صورت اختیار کر لیتا اور اس میں وسیم نہ جاتی، دایوسی نے اس کے چہرے کو مڑھا دیا تھا۔ اور آٹھ تھیں بند ہوتی معلوم ہو رہی تھی۔ جیسے سر سے پاؤں تک رطوبت لپٹنے لگی ہو۔

رحمن۔ نینا۔ بڑا اور روزا، اپنی اپنی دھن میں محو تھیں، وہ محسوس بھی نہ کر سکیں کہ وسیم کیوں چپ چاپ ہے۔ پان اور اس کے خیالات اسے کہاں سے کہاں لئے جا رہے ہیں۔ وسیم ان سب سے زیادہ بیان بھولی بھالی کی مانند تھی۔ اس کے سامنے وہ بہت سی باتیں کرتی ہوئی جھجک بھی جاتی تھیں، اور جب کسی اہم بات سے انھیں لذت حاصل ہوتی تھی اور وہ براداشت کر جاتی تھیں تو ایک دوسری کو اعتماد میں لے کر کہہ دیتی تھیں۔ وسیم کو ان حسیاتی بچا سے باخبر کرنے کی ضرورت نہیں۔

وسیم اور اس کی ہسلیاں آج سے ایک ہفتہ پہلے اسی تصویر میں ایک امیج فلم دیکھنے آئیں تھیں، وسیم نے اس روز بھی یہی موتیا شلوار پہن رکھی تھی۔ اور پان کا داغ اس کی شلوار پر ایک شام پہلے ہی لگا تھا۔ آج سے ایک ہفتہ پہلے جب یہ جھنڈ کا جھنڈا اپنی اپنی جگہ پر بیٹھا تھا تو سب سے پہلے نینا کی نگاہ اس پان کے داغ پر پڑی تھی۔ وہ پان کے داغ کا ذکر کرتے کرتے اس کی رائے ہاتھ رکے داغ کو مسنے لگی تھی، پھر دوسری اور پھر تیسری اسی طرح باری باری سب نے داغ کو مسلا اور اس کا ذکر کیا تھا۔ اور اس کی قیمتی شلوار کے خراب ہو جانے کا اندیشہ ظاہر کیا تھا۔ جوں جوں اس کی موتیا شلوار کے داغ پر بات چلتی گئی، اس کی راولوں پر پہلے ایک پیر دوسرا اور پھر تیسرا ہاتھ حرکت کرتا رہا۔ اس مسئلے اور حرکت کرنے سے اس کے تمام جسم میں ایک نامعلوم سی سرسراہٹ رینگتی رہی۔ وسیم چاہتی تھی، یہ سب کبھی ختم نہ ہو۔ فائدہ ہو جائے۔ لاشٹ نیل ہو جائے، پان کے داغ کا ذکر چلتا رہے اور مختلف ہاتھ اس کو مسلتے رہیں۔ پان کا داغ دوڑوں راولوں کے درمیان لگا تھا۔ نیچے سے تقریباً کوئی باشت جبرئیل چاہتا تو اسے اندر کی طرف مڑا کر چھپا دیتی یا اس روز وہ اپنی موتیا شلوار پہنتی، داغ کا وہ سرے اس کے جسم میں زندگی کی بالیاں پوٹ اٹھی تھیں۔ وہ کسی کعبہ کی

عورتوں کی نگاہ پان کے داغ پر جا پڑی، داغ اس گھڑی کچھ بُرا سا رہا بن گیا، پہلی نے دوسری کے ہتھکی لیتے ہوئے کہا: بی بی جو ہوئی، نا اذان ہی تو ہے۔
انجان پن میں خون کا دھبہ لگ گیا ہے غریب کے!
انٹول کے بعد فلم پھر چلیے لگا۔ ہال میں اندھرا چاکا تھا۔ اس کی آنکھیں ڈبڈبائیں، وہ آگے کی طرف جھکتی ہوئی سیکڑی بیٹھ گئی، جیسے بانوؤں والی کرسی میں دھبہ کراپٹہ آپ کو تینا بن گیا۔ محسوس کر رہی ہو، اس کی چھوٹی چھوٹی پھانسیاں سڈول اور تاروں کے نیچے گلابی سٹینز میں ٹھنڈی ٹھنڈی ہو رہی تھیں۔ خاکشوش اور لیکن۔
فلم تیری سے مل رہی تھی! چٹائی

کہ سم کچھ ضرورت سے زیادہ پیچھے بھی بیٹھی تھی۔ اور بازو ڈھیلے چھوڑ کے تھے، پیچھے سے روزانہ ویسٹ کو زور سے بھجھوٹا اور کہا: سب تیری طرف دیکھ رہے ہیں، رات بھر جانتی رہی تھی کیا۔۔۔ تیرے جھانپا لیتے کا یہی وقت ہے؟
ویسٹ کے ساتھ والی سیٹ پر دو عورتیں بیٹھی تھیں، ایک لڑکھو، وہیں کچھ تھا۔ کچھ چابیوں سے کھیل رہا تھا، دوسری ویسٹ کو بڑے لاڈ سے دیکھ رہی تھی۔ اسے متوجہ پا کر دوسری بھی دیکھنے لگی۔ دو فوٹوں ویسٹ کے جھولے پن سے نہایت متاثر ہوئیں اور اسے دوسروں سے مختلف پایا۔

نویز زندگی

منتخب لا جواب ہو جائے
جبکہ جیت عذاب ہو جائے
صبر بھی آ ب آ ب ہو جائے
ہر عمل کا میاں ہو جائے
دل بھی اک آفتاب ہو جائے
کام کو فی خسرا ب ہو جائے
دل کی حرکت رباب ہو جائے
فضل حق ہم رکاب ہو جائے
راز حق بے نقاب ہو جائے
پاک فرد و صاحب ہو جائے
ورنہ جینا حباب ہو جائے
ہر سکون اضطراب ہو جائے
زندگانی سراب ہو جائے

جب نظر اتھا۔ ہو جائے
زندگی کو بھی جی کے تباہ دے
ضربہ کر یہ ہو کر۔ تو ایسا ہو
عقل و تدبیر کے نقاون سے
روشنی ہو وہ حسن ایماں میں
ہی آغاز ہو بھلائی کا
گوئی اسے صدائے حق اس سے
علوم راسخ ہو جس کی فطرت میں
گر تو پا جائے نفس پرست ہو
گر بڑے اشک انفعال اگر
ہے عمل ہی میں زندگی کی بخت
گر تو سمجھے حیات کا مقصد
نہ ہو گر موجزن جو الفت و دست

تیری فطرت میں تھا ہی روحی
شاعر بو تراب ہو جائے

”روحی“

جھکیان

ٹپٹے پڑے اکتا جانا ہوں، لکھتے لکھتے طبیعت اچٹ
 باقی ہے یا کبھی فکر آرام کو جی چاہتا ہے تو سونے کے کمرے
 میں درانا چلا آتا ہوں اور دھڑام سے بستر پر چاروں تھا
 چت کر اس کا بازی۔ سے تعاقب کرنے والے خیالات کے
 خوں کو دھکا سالے اور کچھ دیر نے لئے ان سے جانت
 پاؤں۔ چت لیٹ کر چست کی باتیں لکھنے لگتا ہوں۔ گھوم
 پھر کر نظر ایک جگہ ٹپک جاتی ہے، کڑی کے بالے میں۔ ا
 ہمیں ہمیں ساز ستار پل پل، اجلا اجلا بال۔ جو
 لرز لرز، تھک تھک کر اور زیادہ چین اور عاجز نظر
 ہو جاتا ہے۔ بیچوں بیچ جیسے ڈرائنگ روم ہوئی گاڑی
 بیٹھی ہیں۔ بے دخلی سی کروہ لیکن آگ ذرا چمک دار۔
 کڑی پر نظرس جم جاتی ہیں۔ اگرچہ کرشمہ دامن دل
 می کشد کہ جاں سناست، ملاحظہ نہیں لیکن اس محسوس
 ہونے لگتا ہے کہ کڑی کی قوت ارادی نے میری آنکھوں
 پر جادو کر دیا ہے کہ ہنسی ہی نہیں جھپکتی ہی نہیں۔ میری
 ساری حیات بصرہ میں سمٹ آتی ہیں اور کڑی پر مرکوز
 ہو جاتی ہیں۔ کڑی پھیلنے لگتی ہے۔ کبھی جالا نظر
 سے اوجھل سا ہو جاتا ہے، کبھی بڑی پھیلتے پھیلتے جالے
 سے پرے نکل جاتی ہے اور صاف ٹپک جاتی ہے۔
 پھر کڑی سستے لگتی ہے اور ایک نقطہ ہو کر رہ جاتی ہے۔
 نقطہ، مولاً، بار بار ہمیں۔ اپنی تمام تر معنوی و صوری
 کیفیات و تعویضات کا حامل۔ جگتا ہے، اچھلتا ہے، لڑا
 ہے، دھم پڑتا ہے، روشن ہو جاتا ہے، ڈوبتا ہے اور
 ابتر ہے، پھر دیکھتے ہی دیکھتے نکلا ہوں سے اوجھل ہو جاتا
 ہے۔ جالا پھیلنے لگتا ہے، لرز لرز، چمک چمک کر بے نام
 نقوش بنتے، بگڑتے، ابھرتے اور دھندلا لے لے ہیں۔ نقطہ
 میں حرکت سی ہوتی ہے اور چمک سے روشن، سب سے

میکٹیم کا فیتہ آن کی آن میں ملے، تپکے اور پھر پھر جھکیا
 اور اب لفظ کی جگہ۔ گوری گوری پتلی رنگت،
 چوڑا تھا، کھینچی ہوئی بھروس، کسی قدر بیوی تین بارہویں
 روشن آنکھیں، دلکب و نظا کو برہا میں۔ مناب دھڑا، گلاب
 جیسے ہونٹ ان پر ادی ادی کسی کی دھڑی، گلابوں پر
 چھٹی کا کلیں، آڑی مانگ، ناک میں جھل جھل کرتی میرے
 کی کیل، سونے کے ٹیکے، بڑا دھڑا کرن پھول، بات بگڑاؤ،
 پاؤں میں پانچ بیڑیا، نیو نیو کی بڑے بڑے رپیلے پھولوں
 والی ساری، سی کا جیمہ۔ اجلا اجلا فرش، فرش
 پر قالین، دیوار سے گاؤں کی لگا، دریا اس سے نکلیے لگا،
 بیٹھی ہیں، سامنے کتاؤ باڈان، اوپر حاس داہی، اوپر گلاب
 سرا پھر خیال کی ربا، بھر بھر جانی، تیز دند خراب خود
 ہی بدست و سرشار، پاس ہی ان کی راز دار ہسٹلی نیر
 بھٹی ہیں۔ چہرہ ہرہ ہرہ اگل عین میں دیباہی، ہنر کو تو
 کسی کو شبہ نہ ہو، ہسٹلی کو تو تین کھانے پر کوئی یقین نہ
 کرے۔ ہاں ایک ذرا تین میں لیکن پیٹ میں تین بھرے
 ہیں، میں شیطان کی خاندانیت کی پرکالہ، بنتی ہیں بڑی
 معصوم، کچھ راز کی باتیں ہو رہی ہیں، دہریہ، دہریہ
 کہ کسی کو طنز نہ پڑ جائے۔ ہونٹوں پر مسکراہٹ اور آنکھوں
 میں شرارت لوٹ رہی ہے۔ ٹن ٹن، ٹن ٹن،
 سیک کی گھنٹی نے اپنے مخصوص بول بولے آنکھوں نے
 تیر کو جھپکے سے اشارہ کیا۔ کمرے کا وہ دروازہ دہریہ سے
 بند کر دیا گیا جس کے بند ہونے سے یہ حصہ مکان سے بالکل
 علیحدہ ہو جاتا ہے، اور پھر یہاں کیا کچھ نہ ہو جائے کسی کو خبر
 نہیں ہوتی، سمجھ دیکھتے ہی نہ وہ قدامت کھڑی ہو، سر پر
 آئینہ ڈال لیا، منہ پر ہار چھائی، آنکھوں میں جالوت
 گھٹی اور گلاب پر سمری دو لگی، گردن خم ہوئی پیچھے جاتا
 پیشانی تک پہنچا۔ سلام کرتی ہیں۔ میں کچھ کہہ بھی
 نہ پایا تھا کہ بولیں، سرتاج راہ دیکھتے دیکھتے آنکھیں سب
 گئیں آپ تو رونے ہی گئے اپنی لڑیہ سے یہ سریلے بول

ہوتا۔ جانے کیا بات ہے۔۔۔۔۔ ہاں تو وہ ٹھہری ہیں۔
 ہاتھ میں "سبکس" ہے۔ میں ان کے سلیقوں کا خلاصہ
 بنا رہا ہوں۔ پڑھتے پڑھتے بولیں "اللہ یہ کہیے نکھتے
 ہیں آپ" ہمیں بھی نکھا دیجئے نا۔ میں نے جلد حجت کیا
 تو اجازت لے لی ہے اپنی اماں سے۔
 "تم لای گئیں۔ چہرہ پر ہوا میاں اڑنے لگیں، ہونٹ
 خشک ہونے لگے، کھسالی ہنسی منتیں، آنکھ میں آنسو بھر
 آئے، کہنے لگیں "میں ہندوستانی لڑکی ہوں۔۔۔۔۔ اور
 اسی کو بنا رہی ہوں" کیوں اس سادہ کو پچھلے گاہر میں
 فساد پانے لگا۔۔۔۔۔

میں نے کہا: "جی ہاں اور دنیا کو فریاد کی ضرورت نہیں"
 وہ رونے لگیں، انکا جناں اٹھ پڑیں، چٹکلیاں بندھ
 گئیں، کانوں کے ایرنگ ہٹنے لگے۔ سترے ایرنگ کمری کے
 جال والے باریک باریک بہن بہن دھکتے سے حال چوہا
 بچ کمری۔۔۔۔۔ میں سوچنے لگا، دریا کیابی ہوئی کس
 ہی ہیں، نازک نازک سی، چمکلی، بھڑکی، ملی موٹی، چمکلی
 شمع بے آزار اور بس بھری۔ کوئی موٹے پتلی ہے، کوئی
 گھات لگائے بیٹھی ہے اور کوئی جھپٹ چکی ہے شکار پر۔
 کوئی قلم کے زور سے جال پھیلا رہی ہے، کوئی مرد پر طنز کر کے
 لیس ہو رہی ہے، کوئی کہتی ہے۔ اگر میں مرد ہوتی۔۔۔
 جیسے ہم نے بڑا ترنارام دھوکے اور جوہر دھوکے میں تو
 سارے کہاں کے مردوں کی کردیاں دھو ڈالتیں۔۔۔
 کاش کوئی انھیں سمجھائے ماں بھوی اور بہن نہیں تو
 سب کچھ بن گئیں، مرد کی ساری "مردانگی" قربان ہے کم پر
 لیکن جہاں تو ہمیں، کلیوین، قمرہ العین اور رادہ ہارن
 کی کہ نہیں۔۔۔۔۔ اتنی لڑکیاں، اور کہاں بھی تو جات
 بھانسنے کی ہوتی ہیں، اپنی اپنی لال لال، شبلی، دبی،
 موٹی بے آزار اور سرتی۔۔۔۔۔

بالوں کی خود کی سٹ پٹی اور کان پر کھجھر اڑتے
 کو گھیر لیا اپنے زائرس میں کچھ اس انداز سے جیسے ہنسنے

جاسے تو قدموں پر گر پڑے، لاکھ بھاگے پڑھیا نہ چھوٹے!
 انھیں پڑھنے لگی، ساری سی چھانے لگی۔۔۔۔۔ بیبی لی لفظ
 تھکنے لگے، مانجھنے لگے، اس تاریکی میں، آن کی آن میں سب
 ڈوب سے گئے اور صرف ایک نقطہ رہ گیا وہی نظر کرنا، چمکا،
 اجڑا ڈوٹا۔۔۔۔۔ پھر وہی جال تھا، وہی کمری، وہی نظر
 ملیا، چمکلی کمری۔۔۔۔۔

پھر نظر میں مجھے لگیں، نقطہ سا بننے لگا۔ ڈوبا، اچھا
 چو کا بھرنا۔۔۔۔۔ وہ سارے بیٹھیں ہیں، لگہ لگہ، جھ
 رہا ساق، ساقوں کی سلونی رنگت، نیلے خط وخال، بڑی بڑی شہا
 آنکھیں، لمبی لمبی پلکیں اک ذرا موٹے ہونٹ اور سے اودے
 طبعیاتی چہرہ گال پر دو بار مہاسے۔ اودی قور کی سفید سفید
 ساری، اسی رنگ کا کرتا چھوٹے دامنیوں کا، پت بھرے
 ہونے۔ پورے آئین بیٹھے بیٹھے کلائی میں جنت اور پٹی
 چوڑیاں ہاتھ میں بیٹھی تن کی جلی ویسی ہر سن کی نیکن
 کھنکھ کے کان موم کی ناک ماں اور بہن نے بد چہرہ جال ہا موڑ
 لیا جانتی ہیں کہ بہن ڈنک مار رہی ہیں لیکن یہ سکارا ہی ہیں۔
 کچھ من کی لڑو کچھ سعادت مند کی کا گھنٹا۔ اتنا ہی ہیں
 انھیں سے کھ جلتا ہے۔ ماں بڑی بڑی پر بھی جاتی ہیں، داسے
 تیلے ہو رہے ہیں، نیچے نیچے پتلی میں پتو، انھیں کوئی جھٹ
 نہیں لیکن کیا حال کہ پیشانی پر کوئی بل تک آجائے۔ بلکہ
 بظاہر جو بھی شرک ہے اس لاڈ میں جو کھلا دیا کھانا جو
 پینا دیا بہن لیا، نہ شکوہ نہ شکایت لیکن اندر دانا ہی تو
 ماننے، ٹھکی جاتی ہیں اندر ہی اندر۔ بائیں کاسن ہے ماں
 گھٹی میں ابھی بچہ ہے اور یہ بل پر پتھر رکھے چپ۔۔۔

کوئی کچھ جاتا ہے، لیکن یہ ہیں پونٹیں، ماں کو جو پند نہیں
 اور ماں کو کیا پسند ہے یہ خود انھیں بھی نہیں معلوم سارے
 خاندان کے سلی جھول رہے ہوں لیکن یہ اور چپ اور وہ
 اور ہر خاموش۔ جانے کب چھوٹے ہو آگئی، یا یہ اسلام
 بس انھیں کی زبانی اللہ اللہ خیر صلہ۔ وہ جاساں آتے
 انھیں پرا دھار کھاتے بیٹھتے ہیں اور ان کا بھی کچھ نہیں

اور کبھی ادھر کو جیسے کہتی ہو چھاری ماٹو، ہم تنہا رہے لیڈر
ہیں لیکن وہ ہم بھگناتے تھیں جیسے کہتی ہوں امن کی
سزا میری اور آؤ۔۔۔۔۔ سر۔۔۔۔۔ ہوا کا تیز جھونکا
آیا۔ درجہ سے دروازہ کے دونوں پٹ کھل گئے اور
پردہ ہلکا کر چھوٹے لگا۔ آن کی آن میں مالا ٹوٹ
گیا۔ کڑی فرش پر گر پڑی چٹیا نے جھٹ سے ایک لپا
کھڑے ہوئے جال ایک سرا ہوا میں لہر کر عیب عجیب تھیں
اور نقش نشان ہوا تھا۔ راج کا نقشہ پاکستان کے حدود
سکھستان کی سرحد گاندھی جناح ویول، کڑی برلا
کے کارٹون، دھیرے دھیرے یہ نقشہ دھندلا س گئے
جیسے ریڈیو پر کسی فیچر میں آواز میں منظر میں ڈوب جاتی
ہے، اور نئی آواز نئی تان بجاتی ہے۔ تھکے تھکے سبز
ہلائی رنگے بھندے لہرائے ان سب پر سرخ پرچہ سایہ سایہ
نئے تھا آسمان سے بائیں کر رہا تھا اور ہوا میں لڑائے
بھر رہا تھا۔ اسے پائیں کر ڈر رہا تھا ہوا سے تھکے مڑے رو
اور کٹوں کے ہاتھ بھاری بھرکے اور مضبوط۔ میں ٹانگ سے
بچیل پڑا جالا ہر ایسا ہنسائی شکل بنانا نہ میں تیر رہا تھا۔
میں لگتا نہ لگا۔

”سب دست و قدم آگے بڑھیں گے پائیں کر ڈر رہا تھا“

حسینی شاہد

طالب علم ہندوستان کا نقشہ آنے کی کوشش کر رہا ہو۔
مجھے ایسا محسوس ہونے لگا جیسے یہ کالا زخما یہ سہرا جال
اور کٹاوی سامراج، ایک دکا کرس اور ولی والا صاحب
ہیں اور چالیں کر ڈر کھلیں، پر صوبہ کی اس دہرے جال
میں پھنس بھگن رہی ہوں۔ کچھ دم تو رکھی ہیں۔ جیسے
جلبان والا باغ کے شہید اور کھور کے چار کسان، کچھ موکم
پتلی ہیں صرف ہر چہ کی راہ گیا ہے۔ جیسے جنگل کی دلاک
فاتح کی شہر بننا کچھ پتہ جان ہیں جیسے ہم اور آپا مڑور
اور کسان۔ لیکن ان کے لوگ تھے، ہاتھ جھینے مائے میں، مٹھیا
کسی ہوئی ہیں، وہی ہوئی آتھوں میں خون انرا پستہ
زرد چروں پر عزم کی محبت چھانی ہوئی ہے۔ کیا کی بھگنا
میں نہ ہو جا۔ حرکت بڑی اور ایک چلکلا۔۔۔۔۔ کڑی
شعخے آری جال ٹوٹ چکا تھا سترہ گئی سامجی۔ اور کھیاں
آزاد بھگنا ہٹا اور بڑی میں چڑھ گیا۔۔۔۔۔
بائیں میں دی جالا تھا، کڑی بچوں بچ بیٹی ہوئی تھی۔
سائے وہ کھیاں، ایک ذرا بھوری اور دھڑکی سیاہ
ایک دوسرے سے لٹی ہوئی تھیں۔ اڑتیں بھگنا تھیں
لٹہ جاتیں۔ اب کی بہت ویران تھی، میں، پھر بڑی تیری
سے الگ ہوئیں۔ سائے ہی جالا تھا، دونوں میں چیل
سی لگیں۔ کڑی نے حرکت کی تھی اور ہوا کو اور

محبت کی چھائوں

وہ مرزا مظہر الحسن صاحب کی آگے جو وہ انسانوں کا دلچسپ نمونہ ہے۔ اس کے ہلکانے
عشق و محبت کی دلاور نگہیں اور حسن و شباب کی رعنائیں سے معمور ہیں۔ ہر شانہ میں تخیل کی جولانیاں اور شاہد
کے ذرا تکانہ رہا ہیں۔ تو انوں کے نصب العین جان شہرہ کی انجی تصویر اور مصروفیت کے لہجے غمزدگی کے لئے
ایک شائستہ ذہنی توازن ہے۔ اس کا بہت وقیل و قیل و سرانہ ہے۔ جیسے ہی اس شباب کے بے باک اسلوب اور اس کے انسانوں
بے پناہ شوقی و اندازہ ہو جاتا ہے۔

حبیب فیاض (۱۳۲۰ء) صفحات تینت جلد نمبر

گفت برباد

بچپن گیا نہیں سمجھ نہیں آئی۔ مور کہ کہیں کا۔

والدین کی ایک اور بھی تو تمنائیں۔ رضوان کی شادی خسرو سے ہو جائے۔ سہرا تو دیکھ لیں گے۔ یہ جانے قسمت میں کیا لکھا ہے۔ کلن جیتا ہے۔ سی کی اپنی ایک رضوان اور خسرو آپس کے ساتھ تھیلے، جوں جوں سامنے ہوئے محبت کی جیل بھی ساتھ سی ساتھ منہ دوسے بڑھتی لگی۔

خروج کی فوج میں عبرتی ————— اور رضوانہ پر سننے
 ہی جیسے بجلی گری۔ جن کا گواہ الارم ہے موت کا۔ اس سے
 وابستہ اقدار کی طرف ذہن انسانی کے لئے زور و بزنل
 پکڑ نہیں جاتے۔ ————— اب رسی محبت ————— اس کی
 قسمت میں توڑ کر دیں پٹھانی، ناکافی دولت۔ سب ہی رسی
 دھڑے ہیں۔ تو پر راب ذہنی کا میکہ قسمت ————— یہ
 بزدلوں کی دھارس خوش جہاں دم توڑ دیتی ہے قضا
 جہاں اس سے بدل جاتی ہے، امیدیں جہاں ایک ایک کر کے
 ساری کی ساری سلب ہو جاتی ہیں، جسے معطل ہیں۔
 مختصر کرنے پر جو جس کی اسب۔

روح میں کہیں تپتی باطنی شمع کی محبت۔ اب وہ
 کچھ تو متذکرہ اندکی ساری ہستی پر چھائی تھی۔ محبت کی روشنی
 نے خود کو اپنے لئے کھسکے اور اللہ ایک صابنہ سے بدل چکی
 تھی۔ اشتیاق و خواہش چندان سے مضمون ہو چکی تھی۔
 اس کے سامنے کے صرغ خیال ہی سے اس کی ذرا دہری
 ازمہ ہیری ہو جاتی۔ مقدمہ میں جانے لگتی مرتبہ مریخی
 تھی۔ خدایا پر خدائے اللہ کا کما کما، صہ ان کے کوٹنے
 کی بہت ذمہ داری ہے۔ جیسے کوئی کسی بہت زیادہ خوفناک
 جباری سے ہی آئے۔ مردوں کو دغا دینے کی جگہ ہے۔ لیکن پھر
 اس عقائد کے بندھن سے بہت پہلے ہی خسرو کی ہو چکی تھی۔

روح میں کہیں تپتی باطنی شمع کی محبت۔ اب وہ
 کچھ تو متذکرہ اندکی ساری ہستی پر چھائی تھی۔ محبت کی روشنی
 نے خود کو اپنے لئے کھسکے اور اللہ ایک صابنہ سے بدل چکی
 تھی۔ اشتیاق و خواہش چندان سے مضمون ہو چکی تھی۔
 اس کے سامنے کے صرغ خیال ہی سے اس کی ذرا دہری
 ازمہ ہیری ہو جاتی۔ مقدمہ میں جانے لگتی مرتبہ مریخی
 تھی۔ خدایا پر خدائے اللہ کا کما کما، صہ ان کے کوٹنے
 کی بہت ذمہ داری ہے۔ جیسے کوئی کسی بہت زیادہ خوفناک
 جباری سے ہی آئے۔ مردوں کو دغا دینے کی جگہ ہے۔ لیکن پھر
 اس عقائد کے بندھن سے بہت پہلے ہی خسرو کی ہو چکی تھی۔

کسی نے بوجھا۔ افسانہ کیسے بنتا ہے؟ اس سوال کا جواب سنئے۔ بس ایسے ہی جیسے عورت اپنا بالوں میں کھلی کرتی ہے۔ پھر سوال ہوا۔ یہ بات کس کتاب میں لکھی ہوئی ہے؟ جواب لاکھڑے لائے۔ یہ میرا مطالعہ ادخیال ہے۔ کلکلی کا ایک ایک مس جس کی تاریخ دنیا کے قدیم ترین مضمون کے سن سے بھی پرانی ہوئی۔ راجھوت کدھن میں ایک صاحب برہتری پیدا کر دیتا ہے اور کلکلی چوٹی کے ان گنت ونگٹ راج ہیں۔ دس دس میں۔ افسانہ سمجھنے کے ان گنت طعنے ہیں۔ تو یوں ہے یہ قطعہ۔ یہ افسانہ بھی لکھا نہیں لکھو ایسا بار ہے۔ اس ترقی پسند زمانہ میں ہر عجب ترقی پسند کا کہنا ہے۔ — ہاں تو —

سے سنا تھے دن، یعنی سال، اگر یہ جنگی
 رہی تو شام صدیاں بیت جائیں گشت و خون کی آندھیاں
 فناءوں کی بولی آرزوؤں کے جنازے، جانے کتنے اور
 کتنے کتنی مٹاؤں سے بالا تھا اس کے والدین نے اس کو
 برسوں بعد تو اولاد ہوئی تھی، آرزو مان کا دخت لڑائی
 لگا جری بھر کے حکام نکلے خسرو نے غشی غشی اپنا
 نام لکھوا دیا جان کی بازی لگانے سے جا بڑا اور خائب و
 پیش کرے۔ اپنے فاک اور اپنی قوم پر ہیئت جڑ ہٹا، کتنی
 زبردست قربانی، کتنا روج پروردگار، اس کی خود اعتمادی
 جانت و شجاعت کے جذبات، والدین کو فخر سا ہونے لگا۔
 انجی قسمت پر اس جو نہایت سوت کے غازیانہ اقدام پر۔

محمود۔۔۔ اس سے مرث دو ہی سال چھٹا تھا۔ وہ کیا جانے عام شہزاد کا مزہ۔ قربانیوں کا ذائقہ موت کے فرشتے سے آنکھیں چاکرنا۔ بڑی عاجزی کی کہ بیانہ جاؤ ہماری دہن میں سوئی ہو جانے گی۔ اتنی کا روتے روتے رہا سال ہوگا۔ ابائی زندگی کا اجر جملہ ملے گا ہے۔ گھر خسرو نے اس کی بڑلانہ انتحائیوں کو ٹھکرا دیا۔

کلی شادی ہو جائے گی اور برسوں — خسر مجاہد
کی جانب قدم بڑھائے گا۔ بڑی دھوم دھام سے شادی
ہوئی۔ ایک جنگ پر جانے والے وہاں کی شادی شادیوں
میں ایک تخلیق ساز تھی یہی چھپا چھپا تھا جس کو کسی اور نے
نہیں۔ مرتضیٰ رضوانہ کے دل کی دھڑکنوں نے شادی
سنواری تھی مگر نے کے لئے قسمت کا بندھن دونوں کو
ایک ہی دھماکہ میں باندھ رہا تھا۔ لیکن جدائی کا تھیل
جان لیوا طور پر روح فرساتھا۔ مہاروں کی کثرت تھی۔
اس کی جانب ہی نے اس کو ہیرو بنا دیا تھا۔ اور اس ہیرو
کو دیکھنے کب کے گونے گونے سے محفلت چلی آئی تھی۔ پھول
کے ماروں نے اس کے قدم کو ٹھک لیا تھا۔
بس کہیں ہم اک بہار انا کے مارے ہوئے
بلوہ گل کے سوا گرد اپنے دھن میں نہیں
پھولوں کی زبان کن تیرے پھول سے پھول کب کب
تھا۔ لیکن کیا؟ شادی کے تقفوں میں امام شافعی کی
تقیں جزو زبان کی تقویٰ میں ہی تھیں۔ غرض دوسرے ہاں
خسر روانہ ہوا۔ اس کے پیچھے کیا ہوا۔ ایک تیلیہ شدہ امر ہے۔
اور اس کا اعادہ ایک دور از کار ہی بات — دن
سال، ایک دو نہیں، چھ سات سال گزر گئے۔ انھیں پتھر
کس سے

تے شروہ وصال: نظارہ جمال

رت ہوئی کہ شمشیر و گوش ہے

نہیں چار سال تک تو خدا آتے ہے اس کے بعد سکوت۔
افواہیں درود و یار سے رگوں میں گرنے لگیں۔ جاہلی قیدی
بھی کہیں اسے آزاد ہو سکتے ہیں کہ خط لکھیں۔ وال تو
بات پر زبان لگتی ہے۔ کسی نے کہہ دیا زندہ ہوتے تو
خط لکھتے۔ غرض بلہ بہہ رہے۔ ہوشیار تنقیدیں عقل کی
بارگاہ سے چٹکی ہوئی تھیں آرائیں۔
رضوانہ بیسے جیتے ہی مر چکی تھی۔ اس خرنے اس کی

رہا ہی دنیا ہی لوٹ۔ شہر کا پہاڑ ٹوٹ پڑا تھا اس پر لیکن

نظارہ و شادی — یہ سب خود فریب دنیا کے ظاہر و محسوس
ہیں روح تو شمشیر ہو جاتی ہے۔ بہت چلے ہی —
تینا کیوں کی اس سنا میں رہ کر — خسر کے
بغیر زندگی۔ موت کیوں نہ کہوں اس زندگی کو غرض یہ
ہے جانے والے خیالات تھے۔ اور رضوانہ کی مصطر ابھی نہ مال
را تھیں اس کی زندگی کے یہ مقصد سے — نہ — یہی
لوچے جیتے جاتے۔

خسر کی ہم سبھی کچھ کم کھن — تھی۔ ایک عورت عزت و
شہرت جیسا انول — تھی۔ دوسری جانب محبت
جس کی آفت تھانہ کوئی قسمت ہی نہ لگ سکی۔ زندگی کے اس
دور اسپر اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ وہ کون سا مختیار
کرے۔ محبت کی مڑ پر صرف رضوانہ تھی — یکہ دہنا —
ایک دولت جیسا لئے ہوئے۔ عزت و شہرت کے رخ پر
ساری دنیا تھی۔ دنیا والے تھے۔ سماج کی گتہ چیں نظریں
تھیں۔ ملک کی امیدیں تھیں۔ قوم کی آرزوئیں تھیں —
وہ اب کرے تو کیا کرے۔ بڑی بے بسی کا عالم تھا۔ اس نے
بیسے اپنی سوجھ بوجھ ساری کھودی ہو۔ اس نے سوجھ بوجھ
تو کیا۔ وقتی جذبہ ہے۔ جہاں عقل کے پاس نہیں آتے
یہ دو مقام ہے۔ پہلے جیسے جلدی ملتا ہے اس سے زبا
تیرا دستہ — تیرا جھجکا ہے۔ گھنڈا بھی ہوتا ہے۔
نہ نہ جانا۔ اب پوری ہو جاتی ہے۔ تو پھر پھر بھی نہیں تیرا
ل میں — سے دو اس شکر کو یوں ہی — سکتے — جاتے۔

چراغ اس نے بھی تو سوجھا۔ موت کی آنکھوں میں
آنکھیں آں کر دیکھنا تھی ہر اُت آنکھ ٹھڑی ہوگی۔ نیت
تیرا بھی سکتی ہے۔ لیکن اس دنوں موقع زندگی میں بار بار
نہیں آتا۔ نہ جہاں کب جنگ چڑھے۔ شادی بڑھائی
ہو جاتی اس وقت تک جوانی کا مقصد اس سے بہتر کیا
ہو گیا ہے کہ عالم قوم کے دو کچھ اپنے چروں میں جبکہ
ایک — کے تھا بڑھیں کیا ہے — زندگی —
رہا محبت — اس کی حفاظت میرا دل کرتا رہے گا۔

میں نہیں۔
 رضوانہ ایک محرم کی طرح زندگی بھر رہی۔ تہہ نہایت
 تو وہ بھول ہی چکی تھی۔ کس کے تہہ — سات سال
 ہوئے انھیں دفن ہو کر۔

یہ نام نہاد دنیا دکھاوے کی شادی ہوئے۔ ماہ گزشتہ
 ہوں گے کہ جنگ امن سے بدل گئی۔ ماں باپ کے دولے مانگ
 اٹھے۔ نت نئے خواب اپنے اپنے لڑکوں کی دایہ کی
 حسین نعل ان کے دل و دماغ کی پال رشتہ ہیں جو
 خسرو کے والدین کی تو اس ٹوٹ بچی تھی۔
 اب کسی کا انتظار تھا۔ اسی بنا پر رضوانہ کی کٹافان لی
 جینٹ چڑھا دی گئی تھی۔ باوجود انکار و تہہ کے اس
 ساری التجا میں ٹھکرا دی گئیں۔ زبان رکھتے ہوئے بھی اس
 اس قسم کا سلوک جیسے بے زبانوں سے ہوتا ہے۔

سندھستانی لڑائی کی مناسبت کی اپنی مناسبت کب ہوتی
 ہے؟ اس کے اراکوں سے تو جاکھلا جاتا ہے۔ اس کے اپنے
 دل میں اس کی اپنی خواہش — تو کوئی چیز ہی نہیں ہوتی۔
 اور پھر فتنہ نگاروں کا فتنہ سنا کہ عورت بے وفا ہے کہ کار
 ہے۔ اس کا ظاہر و باطن یکساں نہیں۔ اس کی بات کہ
 کیا بھروسہ خیر — رونا اس کا ہے کہ قلم دشمن کے
 ہاتھ میں ہے۔

ع۔ کوئی چارہ ساز ہوتا کوئی نگار ہونا
 لیکن اس کی تو آرزو ہی رہ گئی۔
 خسرو لاکھوں تناسل کی دنیا کا سامانی کا سہارا ہے
 وطن واپس جاتا ہے۔ وہ جیتا جاگتا ہے۔ قلعہ و سالک ہے۔
 رضوانہ اس کے حدود تخیل سے ایک ٹکڑہ کو ہٹ نہ سکتی لیکن
 یہاں اگر اپنے جمن حیات کو گھٹیں کی دست برد سے پال
 و برباد دیکھ کر اس کا دل اس کے قابو میں نہیں رہتا۔

سارے گھر پر مردی ہی چھا جاتی ہے۔ والدین کے
 دلوں میں اب کس قسم کی انگلیں ہیں لی؟ رضوانہ
 قلب کی پے پناہ دھڑکنوں میں کس نوعیت کی کیفیت کا

انسان میں برداشت کی قوت پیدا ہو جائے تو ہر بڑی سی
 بڑی مصیبت بھی اس کی ہمتوں کے آگے اپنا سر کھل کر رکھ دیتی
 ہے۔ مصائب و آلام خود اسے خوفناک نہیں ہوتے جتنا
 ان کا ٹھیک ہوتا ہے۔ بہادر دی و شجاعت صرت مرد کی
 میراث ہی نہیں۔ یہ عورت کا بھی جوہر ہے۔ ایک بڑول
 عورت ایک کھٹکھٹ و جانناز سہوت کو کیسے جڑوے سکتی ہے۔
 رضوانہ نے جہاں اس کی جدائی گوارا نہ کی تھی۔
 اب اس کی دلی جدائی کو سہارا بھی گواہی کے بس کی
 بات نہ تھی۔ لیکن سہنے کے لئے خود کو بے بس پاتی۔ وہ کبھی
 کیا سکتی تھی تقدیر کے سامنے انسان مجبور ہو جانا ہے۔ تقدیر
 کے اٹل قانون کیسے بدل سکتے ہیں۔ شیت ابروی —
 اور کیا —

دھیرے دھیرے محمود کی ہمدی رضوانہ سے بڑھتی
 جاتی تھی۔ ہمدی شاید محبت کا پہلا زینہ ہے۔ لیکن —
 رضوانہ کے دل میں محمود نے وہ جگہ نہ لی جو خسرو کی جو چلی تھی۔
 یوں عروت و اخلاق کے کارن وہ اس سے جڑا و فہرہ ہوتا ہے
 بھی ہو جاتی۔ لیکن عروت شاید زندگی میں ایک ہی مرتبہ محبت
 کر سکتی ہے۔

والدین محمود کے بھی ادھی گئے جو خسرو کے تھے۔ ان کی
 توبہ و دوزخیں بھٹیں۔ انھوں نے سوجا خسرو کو اب اس
 سنہار میں نہیں محمود سے رضوانہ کا عقد گردینا بہتر ہوگا۔
 ورنہ بڑائی — اور ملک — اس کا کون مقابلہ کرے۔
 بڑول مستم کی مخلوق سچ سے بہت ڈرتی ہے۔ کاش
 انتخابی خوف نہیں غمیر کا ہوتا۔ اہ یہ سچ — اسکی
 روح فرسانوں سے خود پالا ڈالے۔

خسرو اس دنیا میں نہ ہو۔ لیکن رضوانہ کے دل
 سے اس کو کون ختم لے۔ ادھر والدین کی دھمکیاں۔ پھر سہ
 ہی ساتھ پیلا دھکے مار کی باتیں۔ غرض سب ہی کچھ۔ ذہن
 محمود اور رضوانہ کا عقد ہو جانا ہے۔ تھیر گسی دیا
 کے اپنی دانت میں یہ سمجھتے ہوئے کہ خسرو تو اب اس دنیا

احساس ہو گا؟ محمود کے ضمیر اور اس کی اپنی جلد بازی کا آخر کیا نتیجہ ہو سکتا ہے؟ رنواز اب وہ حقیقت کس کی ہو گی
 ہے؟ اصولاً و شرعاً۔۔۔ اس کا فیصلہ۔۔۔ کون کرے۔
 (شرگاہ حیدر آباد سے نشر ہوا)
 جہاں بانو

احترار

ان کی محفل میں نہ جاؤں گا نہ جاؤں گا کبھی
 وہ مجھے بندھے ہے دام سمجھتے ہیں ہمنو ز
 وہ مجھے نقش تہہ گام سمجھتے ہیں ہمنو ز
 زر کے زہریلے سببوں سے ڈراتے ہیں مجھے
 اپنی محفل میں وہ نہیں ہنس کے دلاتے ہیں مجھے
 حزن معصوم کی سوگند سترگر میں وہ
 میری نظروں میں خدا ہو گئے بھی کافر ہیں وہ
 وہ مے دین کو سمجھتے ہیں جو اہر کا عوض
 سنگرزے بھی ہو گئے نہیں شاعر کا عوض
 وہ مجھے شاعر غور دار سمجھتے ہی نہیں
 وہ تو تلوار کو تلوار سمجھتے ہی نہیں

میں اگر جا ہوں تو محفل تہہ و بالا کروں
 ساغر عیش بہر طاق الٹ کر رکھ دوں
 نرم شادی کو غزا خانہ بنا کر رکھ دوں
 بر خراغ شب عشرت کو بھگا کر رکھ دوں
 نوح آدم ہوں فرشتوں کو بھی حلال کروں
 شاہ خاں کے بھی دامن کو گریب تال کروں
 میری تقدیر کی مشکل اگر آساں نہ ہوئی
 فطرت حسن اگر پیر بھی پیشیاں نہ ہوئی
 اور پھر بھی وہ اگر میرے گریباں نہ ہوئے
 اپنے محبوبہ مثل شل سے گریزاں نہ ہوئے

مستقل طور پر ہے میرا ارادہ سلتاقی
 ان کی محفل میں نہ جاؤں گا نہ جاؤں گا کبھی
 سلتاقی صلیقی

فیشن

انسان خواہ وہ کتنا بچا بچا کام کیوں نہ ہو سلسلہ کرتے تک جاتا ہے اور اس میں وہ بھی پیدا کرنے کے لئے تبدیلی ضروری ہوتی ہے اور اسی تبدیلی کا نام فیشن ہے جو زمانے کے ساتھ ساتھ بدلتا رہتا ہے۔

فیشن کا بدلتا ضروری ہے۔ جوں جوں زیادہ گزرتا جاتا ہے نئی نئی ایجادیں ہوتی ہیں اور ہوتی ہیں۔ ہمیں علوم ہو رہا ہے کہ فلاں چیز ہمارے لئے مفید ہے اور فلاں مضر۔ بعض مروجہ فیشن میں دیکھیں بیشیٹس آنے لگی ہیں اس لئے اس کو ترک کر کے نیا فیشن اختیار کرتے ہیں۔ ایسی صورت میں رواج کا جو زمانے کے ساتھ بدلتا رہتا ہے فیشن کا ہے۔ مثلاً پچیس برس سال قبل ہندوستان میں انگریزی کا رواج نہ تھا۔ مکان میں دیئے اور عیس جلائی جاتی عیسیں لیکن جب پہلی کی خصوصیات اور اس کے استعمال کی سہولتیں معلوم ہوئیں تو پچاسے لیسپ کے معمولی معمولی گھروں میں پہلی کی روشنی آئی۔

ملک کی فضا اور موسم کا بھی فیشن پراثر پڑتا ہے۔ ہر ملک کے فیشن جدا ہوتے ہیں۔ ممکن ہے جو چیز ہندوستان یا کسی اور ملک میں خراب قرار دیں مثلاً مغربی ملک میں بال کاٹنا فیشن ہے۔ ہندوستان میں لانے بال رکھنا خوب صورتی میں مثال ہے۔ مغربی ملک میں دن میں تین چار مرتبہ کپڑے بدلنا تہذیب ہے اور یہاں اس طرح کرنا وقت کی بربادی تصور کرتے ہیں۔ آج کل عموماً فیشن کے معنی صرف کپڑوں کی حد تک لیتے ہیں لیکن دراصل اس کا پتہ انسان کی زندگی کے ہر شعبے سے چلتا ہے مثلاً۔ بودا باش پہننے کا فیشن وغیرہ۔

ہماری معاشرت میں آج کل بناوٹ بہت زیادہ ہو چکی ہے اور ہماری طرز زندگی میں تحولات رونما نہیں بہت

داخل ہو گئے ہیں۔ تہذیب و تمدن اور فیشن کا مطالب غلط کام کیا ہے اور یہ بات فرسٹ کڑی لگی ہے کہ جب تک غلط فیشن تک ٹانگ سے سادگی اور بے کٹائی کا نمونہ نہ کر لیا جائے انسان تہذیب (یعنی تمدن) نہیں رہتا۔ اس طرح ہماری زندگی ایک کھاد بکھر رہ گئی اور ہماری جسمانی کام میں بناوٹ اور نقص داخل ہو گیا مثلاً ملنے جلنے میں کھانے پینے میں نقص زندگی کے ہر شعبے میں۔

وہی فیشن اچھا اور قابل تقلید ہے جس میں ہمیں آرام و چین نصیب ہو جس سے لوگوں کو انگشت نما کی کاموں نہ ملے۔ آج کل جیروں عمدہ عمدہ رواج ہیں اور ان فیشنوں پر چھنے سے ہماری زندگی بہت اچھی ہو گئی ہے۔ مثلاً مکانات جو سو سال پہلے بنائے جاتے تھے عموماً بے قرینہ اور رحمت لے لے خوب ہوتے تھے لیکن آج کل کے خوبصورت مکان میں راکش کے علاوہ محفوظ صحت کا بھی بہت کچھ لحاظ رکھا جاتا ہے۔ ایسے مکانات بنانے کی تقلید ہندوستانیوں نے بھی کی اور وہ اس حد تک اچھی تھی لیکن جرمن و ڈان کے مکان جن کا جید آباد میں بہت رواج ہے میرے خیال میں ہندوستانیوں کے لئے موزوں نہیں۔ کیوں کہ دیسے مکانوں کی قیمت بہت پیچی ہوئی ہے جو مغربی ملک کے لئے کافی ہے کیونکہ وہاں کا موسم گرمی بہت سرد رہتا ہے اور بہت مکان گرم ہوتے ہیں لیکن جید آباد میں اسکی تقلید کرنا کہاں تک مناسب ہے؟

کسی دوسرے ملک کے فیشن کی اندھی تقلید کر کے عیسی بننے سے پہلے بہتر ہے کہ ہم کو وہیں کان دلوں گیوں اس قسم کا فیشن اختیار نہ کیا۔ ہر ملک کے لئے اس کی تقلید میں کیا برائی اور کیا بھلائی ہے۔ اگر اس پر غور کر کے ہم کوئی چیز اختیار کریں گے تو جانے انجمن نہ مانی گئے کہ ہم قلی ہوں گے۔ ہم میں اچھا گزرتا ہوں میں بدی فرق ہے اور وہاں اچھی چیزیں چھین کر لے لیتے ہیں اور ان کا استعمال سلیقہ سے کرتے ہیں۔ برغلاف اس کے ہم بدھوں کی طرح بغیر بوجے سمجھنے کی بیرونی کرتے ہیں اور نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اوپر سے رہے نہ اوپر سے رہے۔

جب کوئی بزرگ مرد ہستی یا کوئی شہزادہ کی کسی چیز کو اختیار کرتا ہے تو لوگ اس کی تقلید کرنے لگ جاتے۔ اس طرح نئے نئے فیشن وجود میں آتے ہیں۔ یہ طریقہ ہر زمانہ اور ہر قوم کے ساتھ پایا جاتا ہے۔ جتنا چڑھا سٹیل نے اپنے ایکٹوٹا (Activetota) اور ماسٹکٹا (Mastika) میں اس مسئلہ پر کافی بحث کی ہے مثلاً سکندراعظم کی گردن ایک طرف ڈرا سی جھکی ہوئی تھی لوگ اس کی تقلید کرنے لگے۔ فیشن کے واسطے یہ ضروری نہیں کہ وہ کوئی نئی طرز اختیار کریں۔ آج کل پرانے فیشن کی طرف بہت میلان پایا جاتا ہے۔ اگر ہندوستانی نقالوں کے سامنے چند ترین چیزیں فیشن بنا کر پیش کی جائیں تو وہ اس کو فوراً قبول کر لیں گے۔ ہم لوگوں پر تقلید اس قدر غالب آئی اور ہر چیز پر اس قدر بنا کر غالب ہے کہ ہر مصنوعی ہو گئے ہیں۔ ہم ہر چیز میں انگریزوں کی پیروی کرتے ہیں مثلاً ہندوستانی ہتھیار کے بجائے جاکلیٹ پسند کرتے ہیں۔ روٹی بکے کو بریانی پر ترجیح دیتے ہیں۔ گوشت تو جانتا ہے کہ بریانی چمکیں لیکن فیشن کے خیال سے روٹی سکھ کھاتے ہیں۔ یہ ہے ہماری معاشرت کا رنگ۔

سننے سننے کے طریقوں میں بھی بہت نقل کرتے ہیں۔ مغربی ممالک کے لوگ فرش پر نہیں بیٹھتے بلکہ صوفوں پر اپنی عمر گزارتے ہیں۔ لیکن اس کا سبب بھی ہے۔ وہاں فرش اس وجہ سے استعمال نہیں ہوتا کہ وہاں کا موسم بہت سرد ہوتا ہے اور پتھروں کی تقلید کے سے بیار پڑنے کا اندیشہ رہتا ہے۔ برطانات اس کے ہندوستان جیسے گرم ملک میں ہمیشہ صوفہ پر بیٹھنا بہت تکلیف دہ ہوتا ہے لیکن کیا کریں فیشن اکیل کھانے کی خاطر سب کچھ گوارا کر لیتے ہیں۔ موجودہ زمانے میں آج پتھروں کو کیا رہتا تھا مگر فیشن کھاجاتا ہے کہ زمانہ چلے جس کی کو دیکھو وہ درد مندہ میں مبتلا ہے چاہے وہ اس کے پاؤں میں ہوتا ہو چاہے مرض میں لیکن ہمیشہ وہ خود کو اس مرض میں مبتلا کرتا ہے۔ اب تو

ہمارے دوسرے ہندوستانی بھائی ہم پرستے ہیں اور اگھیز بھی جو توفیق سمجھتے ہیں۔ اس جو بڑی تقلید سے ہم اپنی انفرادیت کو دھو دیتے ہیں۔

ایک صاحب کیا خوب فرماتے ہیں کہ فیشن کا دورا نام "ایک نام میں سب ننگے" کا ہے نظائر تو کچھ ایسا ہی معلوم ہوتا ہے۔ فیشن کی اندھی تقلید کیے یا بھونڈی تقلید ہندوستان کی بربادی اور تباہی کا باعث ہے۔

دنیا کا ہر ملک دوسرے ممالک کی اچھی چیز کی پیروی کرتا ہے۔ لیکن ہندوستان میں تقلید اس طرح پھیلی ہے کہ دنیا کے کسی ملک میں اس سے بہت کم متاثر

ایسے نظر آتے ہیں گے جو اپنی خاص وضع پر قائم ہوں اور نا عام طور پر غیر ممالک کی تقلید اس حد تک کرتے ہیں کہ اچھائی اور برائی کا بھی امتیاز باقی نہ رکھا۔ یورپ سر ملک ہونے کی وجہ سے وہاں مشرب کا استعمال کثرت سے ہوتا ہے۔

لیکن ہندوستان میں اس کی نقل شروع کی۔ نتیجہ ہوا کہ کڑے اور پھلے پر غراب ہو گئے۔ باوجود اس کے وہ غرض ہوتے ہیں تو ہم میں اور انگریزوں میں کوئی فرق نہیں بہتا۔

یورپی دنیا میں فیشن کا مرکز کئی سال سے فرانس ہے۔ یہاں جو فیشن رواج پاتا ہے ساری دنیا میں اسی کی تقلید ہوتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آج کل حیدر آباد ہندوستان

کا پیرس بنا ہوا ہے۔ یہاں کسی دعوت یا جلسہ میں جائیے قسم قسم کے لوگ نئے نئے روپ میں نظر آتے ہیں اور لطیف تو کیا کھانا کھیں وہ لباس اچھا معلوم ہو یا برا۔ انگریزوں

کا لباس عریاں نہیں تو نیم عریاں تو ضرور ہے۔ ان کے کھلے فداستیں جڑ رہتے ہیں مگر بغیر غور کیے اس نمونے کے لباس پہنتے ہیں۔ اس بات کا خیال نہیں کرتے کہ

ہم فیشن کی خاطر عریاں ہوسکتے ہیں اس لئے ہمیں چاہیے کہ کسی فیشن کو اختیار کرنے سے پہلے اختیار کریں آیا وہ اچھا ہے یا برا۔

ہے۔ یکسانیت کی زندگی سے موت بہتر ترقی کے لئے تبدیلی ضروری ہے لیکن اس قسم کی تبدیلی — تبدیلی ہمارے موافق ہو اور اس سے ہمیں راحت و آرام ملے نہ دیر تقلید جو ممکن ہے ہمیں پیرس کے کی طرح انجمنیں بنانے کی اجازت دے اور ہماری حالت اس شعر کے مصداق ہو جائے۔
ہوئے اس قدر ہند کہ نہ کچھ گھر کی صورت
کئی عمر ہوٹلوں میں مرے ہسپتال جا کر

انسان کی شکایت عام ہو گئی ہے محسوس ہے آئندہ صحت مند لوگ
ٹائیٹا نڈ میں مبتلا نظر آئیں!!!
آج کل سینما گھروں کی زندگی کا ایک حصہ بن گئے ہیں
سینما کا اثر فیشن پر بہت بڑا ہے۔ ۱۰ بے اخلاق والوں پر
سینما کا اچھا اثر پڑتا ہے لیکن کمزور اطوار والے چال و حال
بات چیت، الغرض ہر ایک چیز میں ایکڑوں کی تقلید کرتے
ہیں۔
باوجود ان تمام باتوں کے فیشن کا ہونا ضروری ہے۔
اگر ہم اس کو اچھی طرح عمل میں لائیں تو یہ ایک بہت اچھی چیز

فریدہ

نئی زندگی کا معرکہ آلا راستہ لانا نمبر

جو صرف مسئلہ پاکستان پر مشتمل ہے۔

جنوری مسئلہ میں شائع ہو چکا ہے۔
۵۰ صفحات کا فیصلہ نشان سالانہ نمبر مطالعہ پاکستان سے متعلق ایک کتاب ہے جس میں شروع سے آخر تک اس مسئلے کی پوری تاریخ اعداد کے مختلف پہلوؤں پر بحث نشان کی ہوئی ہے غارین احمد علما اور سیاسی رہنماؤں کے مضامین ہیں جو مسئلہ پاکستان کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہیں علاوہ اس کے ادارے کی فوجی ہوئی اس مسئلے سے متعلق ہر قسم کی مفید معلومات اعداد و شمار اور متعدد نقشے و تصویروں کا ایک بیل پہاڑ ہے جو اس نمبر میں اشاعت کیا گیا ہے۔

نہایت اعلیٰ دیکھ بھال سے ڈھکیا جاتا ہے کہ نئی زندگی کا یہ پاکستان نمبر اس مسئلے پر فوری نقطہ اور آخری فقرہ ہے جو اٹکنے والا ہے

بجاء طور پر کہیں نظر سے نہیں گزرا۔
جملہ ۵۰ صفحات

ناظر سے عرض ہے کہ کاغذ کی راشننگ کے زمانے میں ہم ملک سے زیادہ کتابیں شائع نہیں کر سکے اسلئے جب تک آپ دور دور پر دفتر میں بھیج کر لکھائی کا پی ٹیوٹو کرالیں اور ایک کی قیمت تعادلہ معلوم ہو جائے ہم زیادہ کتابیں دینے کا خواہش نہیں کر سکتے اور لکھائی کی ذمہ داری ہمیں ملے سکتے رہا لنڈ خریداروں کو یہ قیمت نذر کیا جائے گا لہذا پانچ روپے سالانہ چندہ بھیج کر مستقل خریداری بنائیے۔

نیچر سالہ نئی زندگی شورش چندر باسور وڈالہ آباد۔ یو۔ پی

خوش آمدید

یہ کون جھجکتا آتا ہے ! کیوں آتے ہوئے شرماتا ہے
انداز تو چلنے کے میں وہی ہر کام پہ ہے اک موسیقی
ہے قد میں وہی ڈالی کی لچک سو آئی نظر بندوں کی چمک
وہ ہاتھ ہے ساغر کھینکے نامید نے پھیڑے ساز نے
خوشبو کی پٹیلیں آتی ہیں دامن فضا ہر کاتی میں
لو آہی گئے وہ آہی گئے اور دیدہ و ولی پرچہ ہی گئے
اب جانے کہاں کھو جاؤں گا
میں ان پرندہ ہو جاؤں گا

دو قطعے

گر نہیں تیرے لئے لطف بہاراں نہ ہی
عیش و عشرت نہ ہی بزم و شبنم نہ ہی
ہو مبارک یہ جو انروں کا جینا تجھ کو
ہمتِ مود تو ہے ملکِ سلیمان نہ ہی

لطفِ ساحل نہ ہی تیری طوفاں نہ ہی
نورِ ایماں نہ ہی، غلکِ عصیاں نہ ہی
ہائے محرومی جاوید کہ یہ بھی تو نہیں
زندگی خواب نہ ہی، خوابِ پریشاں نہ ہی

محسوسات

مگنا ہوں میں بخار آتا ہوا محسوس ہوتا ہے
تصور جام چمکاتا ہوا محسوس ہوتا ہے
خرام ناز اور ان کا خرام ناز کیا کہنا !
زمانہ ٹھوکریں کھاتا ہوا محسوس ہوتا ہے

تصور ایک ذہنی جستجو کا نام ہے شاید !
دل ان کو ڈھونڈھ کر لاتا ہوا محسوس ہوتا ہے
کسی کی نقری پازیب کی جھنکار کے صدقے
مجھے سارا جہاں گاتا ہوا محسوس ہوتا ہے
تھرکتا ہے گھٹا کا عکس موجوں کی روانی پر
کوئی آنچل سا لہراتا ہوا محسوس ہوتا ہے

لچکتا جسم رقصِ بنخودی میں دیکھنے والو
سنہرا سانپ بل کھاتا ہوا محسوس ہوتا ہے
قتیلِ ابدل کی دھڑکن بن گئی ہے چاپ قدموں کی
کوئی میری طرٹاتا ہوا محسوس ہوتا ہے

قتیلِ شہنائی

گھمڑوں کے سفید کپڑے۔ انسانوں کو یاد گوارے پہننے ہوئے
تحلیف وہ کر سکیں پر بات چیت کرتے ہوئے سڑکوں کے
کنارے چارپائیوں میں کسی بھی نہیں دیکھنا چاہتا میں اپنے
حسن و دلکش مکان میں اطمینان سے زندگی بسر کروں گا۔
تمام دنیاوی ہنگاموں سے — اور بہت دور۔ میری
چارپائی بیویاں ہوں گی جو قیمتی قیمتی لباسوں میں ملبوس
رہیں گی۔ یہ دنیا کے مختلف گوشوں سے آئیں گی اصرار دینا
کی ہر نسل کی انسانی خوبصورتی اور لذت کا مزہ چکھائیں گی۔
ایک دم وہ خاموش ہو گیا اور کہنے لگا۔ تجھے چھوڑ دو۔
تجھے اپنے حال پر چھوڑ دو۔ میں وہاں سے اٹھ کر چلا آیا
اس کے بعد ہم اس سے ملاقات نہ ہو سکی۔ لیکن ہمیں کہ
بعد اس نے ایک خط لکھا جس میں فقط یہی جج تھا میں خوش
ہوں۔
اس کا خط روح پرورد خوشیوں میں ڈوبا ہوا تھا۔

محمود قادی

میں ایک موز میں گرتے ہیں جس کی تہ سولے کی بنی ہوئی ہو
وہاں میں ہر وقت نہاؤں گا۔ میں کوئی ڈگر نہیں دیکھتا
گا اس لئے کہ وہ اپنے میلے پیروں کی ٹوکروں سے فرش
کو خراب کرتے ہیں۔ میں اپنا فرش پر بھی کسی جوتوں کی
آواز نہیں سن سکتا، میں خوبصورت کالی عورتوں کو ڈگر
رکھوں گا جو سفید برقعوں میں ننگے پیرقائین پر نظر کرتی
رہیں گی۔ میرے مکان کی دیواریں ایسی صاف اور
چمکیلی ہوں گی جیسے ایک عین عورت کا شفاقت سینہ۔
جب میں ان تمام عین اور دلکش سرقوں سے
تھک جاؤں گا، جب میری خوشی میں تھوڑی سی کمی ہوگی
کسی سفید یا سیاہ ٹھوسے پر سواری کروں گا۔ میں شام
کی خاموش فضا میں ٹھوسے پر سواری دیوانہ وار دوڑنے
سوچ کی طرف دوڑ دلاؤں گا۔ ہر چیز گلابی ہوگی —
پہلا — ریت — عربوں کے کپڑے — اور

دہوکے

میں جانتا ہوں تخیل میں کیا نہیں ہوتا
دو فور صبح گل افشان نشاط شام بخوم
ہر ایک چیز نہاں زیر دامن امکاں
وہ چند لمحے تصور کی وسعتوں سے لطیف
نیم کاش یہ لمحے ہی زندگی ہوتے!

میں اس زمین سے کچھ دور ہو گیا ہوتا

اُسی جہان تخیل میں کھو گیا ہوتا

اقبال متین

محمد قلی قطب شاہ اور رومانیت

محمد قلی قطب شاہ کا عہد تاج کو گنہگار کا وہ دور ہے جسکے دن ہندوستانی ثقافت و تمدن کا سنگم بنا اور ہندو مسلم آرٹ کا ایک حسین امتزاج پیدا ہوا۔ چنانچہ محمد قلی قطب شاہ پہلا کوئی مسلمان بادشاہ ہے جس نے ہندوؤں کے لباس اور طرز نامزد و بوی کو اختیار کیا۔ اسی کجاکت اور میل ملاپ کا نتیجہ یہ ہوا کہ محمد قلی کے دربار اور محلات شاہی میں ہندوؤں نے باریا و شادریں لگا کر قلی کی حسن پرست طبیعت نے ایک عجیب و غریب رومانوی فضا پیدا کر دی۔

کلمات محمد قلی قطب شاہ اٹھا کر دیکھتے تو اکثر وہ چیزیں نظر آتی ہیں جن کی بجائے یہ سمجھے ہیں کہ محمد قلی کے دربار میں حسن و عشق کے طوائف کھیلے جاتے نظر آتے ہیں۔ یہ دبار کیا تھا تو کیا جو ہم انہی اور یہ نگاہیں کیا ہیں تو کیا اس جو ہر ناز کی زندہ اور چلتی پھرتی تصویریں ہیں۔ ان رومان آئینوں فضاؤں میں محمد قلی کا دل بوزندگی اور کائنات میں سوا حسن و عشق کے کسی اور حقیقت کو کارفرما نہیں دیکھتا جو ہم نے طے تیرتا نظر آتا ہے۔ محمد قلی میں حسن و عشق کا احساس پہلے ہی سے قدرت نے دویت کیا تھا اور رومانیت ایک سست و سہمی کیفیت (Semi-sentimentality) اس کی ساری زندگی میں ردال و دواں نظر آتا ہے۔

محمد قلی قطب شاہ کا کلمات و موصوں پر مشتمل ہے ایک میں نظمیں کا طویل مجموعہ ہے اور دوسرے میں غزلیات ہیں۔ غزل اور غزل پرچہ ہند کے اعتبار سے دو علیحدہ چیزیں ہیں۔ نظمیں یہ وہ نثریں ران جنہاں محمد قلی قطب شاہ میں ایک آہستہ آہستہ سے نکلتے ہیں اور وہ اس پر رومانیت (Romanticism) ہے۔ غزلوں میں یہ اس پر رومانیت کے پردہ میں جھلکتی ہے اور محمد قلی قطب شاہ کی زندگی کے عام پہلو اس میں دکھائی دیتے ہیں۔ شاہ کے جذبہ و خیال کا ایک دھندلا سا ماحول ان غزلوں

میں پایا جاتا ہے۔ لیکن نظم کا حصہ خاص طور پر محمد قلی کے دبار سے وابستہ ہے جس کے حسن و عشق کی ایک عجیب و غریب (Semi-sentimentality) ہو رہا ہے۔ اس دنیا میں محمد قلی کو ہرگز ساری کائنات سے بڑے عملی جانا ہو۔ فلسفہ اور حکمت اہل کے نزدیک کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔ ہاں اگر اہمیت ہے تو ان کی کیس (Emotion) کے نول کے مطابق تھا و پورا اور عیش کر دے کی تنگ چٹاچٹہ علم کی ارمائی کا ٹکڑہ کرتے ہوئے عیش کا تھانہ وہ یوں کا تھانہ دنیا کا حکمت نابو جیس ہرگز عیش کا علم سوں کا ڈھانچہ عیش کا ہر دم پیمانے کا نام ہے۔ اس ترانہ عیش کے لئے وہ اپنی مہارایوں کی انجمن جاتا ہے۔ اور ان کے لئے عملی تقیر کر دیتا ہے۔ ان عیشوں میں ہر وقت کی نازنیاں بے تکلفی کے ساتھ اپنے حسن و جمال اور آرائش و زیبائش میں مصروف و شگاف اور عشق و مستی کی ایک عجیب و غریب کیفیتوں اور جوانی و دو عنائی کے لئے بے پناہ جذبات کے مظاہرے کرتی رہتی ہیں۔ محمد قلی کی چار دیواریں میں فضا، ساؤنڈ، میساج، گندی، چھبیلی، لالہ، بلقیس، زمانی، ہندی، بھوری، پڑتی، ہندو، مشہری اور جھاگ مٹی وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں کیونکہ ان پر محمد قلی نے مستقل نظریں بھی ہیں۔ ان کے حسن و جمال کی داد دی ہے اور ان کے ساتھ اپنے عاشقانہ تعلقات کا اظہار کیا ہے۔ محمد قلی کو ان پاروں سے جو لگا دیتا اس کا اظہار ایک واقعہ سے ہوتا ہے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ جھاگ مٹی کی خاطر محمد قلی نے مٹی کی تیز و خفیا میں اپنا گھوڑا ڈال دیا اور اپنی پیاری جھاگ مٹی کی جان بچائی۔ اس جرم کی یاد اٹھانے میں اس کو محض میں چندہ خلیق بھی رہنا پڑا۔ اپنی پیاری لہ کے حسن و جمال اور غمزہ و عشق کی تصویر پر محمد قلی نے اپنی نظریں میں لپیٹی ہے اس کے چند اشعار ہم ذیل میں پیش کرتے ہیں۔

کچھ بھی سمائی نہیں دیتا۔ تیری یاد کچھ اس طرح لگی ہوئی ہے کہ
پھر کچھ بھی یاد نہیں آتا، محبوب کی یاد اور اس کی مرکزیت
کی مثال ہمیں موتن میں ملتی ہے۔
تم مرے پاس ہو تے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

مشتی کے معلق لگتا ہے۔
نورا ہستی اسی کا، افسوس میں میا ہو
تو جہشتی ہے نا بد ملک، اصف ہو

ای مٹی کے تیل توں جب ہیا ہو دیں لہا
ہزاراں شکر و سجدے کر کہ جگ سومر جہا

ہمن دل کے گوارے میں بہن کا نور دستیا
سورج کرناں کی دوراں سوں جھلکتا تو کج
(شرح۔ زندگی اسی کا ہے کہ جسم میں دل ہو اور ہمارا دل
ہمارا معشوق ہے جس میں عشق کی ادبی مٹی ہے جس کی
وہ سے وہ ہمارے دل میں عرصہ سے جگہ پائے ہوئے ہے۔
جہاں اس کا نور سورج کی شعاعوں سے زیادہ خوشا اور
نورن ہے)

ان گفتا سات کے علاوہ ہیں کلیات محمد قلی قطب شاہ
میں مسمیوں نظمین ایسی ہیں گی جو محمد قلی کی حسن افزہ اور
عشق لبر زندگی کی آئینہ دار ہیں۔ اپنی پیاریوں کی محبت
میں محمد قلی نے جذبات و احساسات کا انہار جس صفا کا را نہ
انداز میں کیا ہے وہ محض مٹی قلیا بازیاں نہیں ہیں بلکہ مٹی
نصویریں ہیں۔ ڈاکٹر زور صاحب نے کلیات کے مقدمہ
میں بڑی درست اور عمیق بات سمجھی ہے۔

دینا کا کوئی شاعر اپنے کلام میں اپنی زندگی
کو اتنا عراں نہیں پیش کر سکتا جتنا کہ
محمد قلی نے کیا۔ اس کا کلام قلب کی گہرائیوں

نغمی ہے۔
دور کلاچ سوں نخل دو نغمی نکل چمن
اس نغمی ڈال اوپر کیوں لگیں جو سیریں

سوکا سوں کریں جو غصہ و ناؤ کی با ستی
جب ہونٹاں تے جھڑے پھٹی پھر مٹا سکھن
(شرح۔ جسمین میں نغمی محض نغمہ ہی ہے تو خرم کے
آپٹل ڈال لیتی ہے۔ معلوم نہیں کہ اس نغمی ڈالی پر ابھی سے
شباب کے پھل کیوں لگائے۔ جب وہ غصہ یا ناؤ سے خط
سرنے کے اشارہ سے بات کرتی ہے اور اس کے ہونٹ عرق آؤ
ہو جاتے ہیں تو دل چاہتا ہے کہ اس کو مٹا دیکھیں)
کنولی

ناؤ کی تے ناؤہ چنل آئی میرے بر سنے
بیل کوں لے سبز اپٹل پھول جھید پر سنے

کنولی یا ری پھلی باری ڈا و ساری دا و سوں
نین ناری رنگ و ساری ادھاری سر سنے

نیمہ و من کا از من کا پاؤں جھنکا دیں سکھ
آس من کا پیش تن کا ذوق کن کا میرے

(شرح۔ یہ شگفتہ چنل پھر میرے یہاں سبز اپٹل اور سوں اور
چوہوں کی گھنی گھائی ہوئی آئی۔ اس کی انگریز چال سے
شراب کا خمرا اور آنکھوں میں رنگ کے ڈورے نظر آ رہے
ہیں۔ اس حسین کی محبت اور اس کے پاؤں کی جھنکا دیں
کے لئے امید و ن کے لئے ہمیش اور کان کے لئے ذوق
کا باعث ہے)

پیادہ کی کے معلق لگتا ہے۔
برن دن کو جہانے نا جو کوئی جواشیں تیرا
گیا ہے را دیوں تیرا کہ مجھی کج یاد آئے گی

(شرح۔ جو دل سے میرا عاشق ہے اس کو رات اور دن

دواں ہے۔ "ماذمیں" امر ایشیاب! اندا ایشیاب
چچل میں! ماہ ابرو! کعبہ! سرخ و سفید! چاندنی
اور بھن۔

چاندنی اور سیاہ۔ ان تمام نظموں میں شباب
کی لذتیں اور عیش کی دولت گہرے رنگا نیلی اپنے انتہائی نقطہ
پر نظر آتی ہیں۔ لیکن اس کا یہ دھابیں کہ محفل کی عشق
و عاشقی اس کے دی ہول (یعنی اپنی پیاریوں کی زطوں
میں) الجھ کر رہ گئی۔ بلکہ محفل کی اس سے سچی آگے بڑھتا ہے
اس کی محبت کی ابتدا محورت سے ہوتی ہے لیکن انتہا اس
(Great She) پر بس کو خدا لیتے ہیں۔

When a man loves a woman,
Then he knows God's secret and
secret of the world. (Oskar Wilde)
اگرچہ اسکو انڈی کی طرح میں یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ محفل کی
کی اس عشق و عاشقی نے اس پر کائنات کے سارے راز افش
کر دیے تھے۔ اور نہ میں اس کا قائل ہوں کہ ایک رومانی
شاعر کہاں تک فلسفہ طرازی کر سکتا ہے۔ لیکن یہ ضرور ہے کہ
جس مادی اعلیٰ کی محفل نے اپنے کلام میں عکاسی کی ہے وہ
اپنی پوری ہر انہوں کے ساتھ اس میں موجود ہے اور ہر لحاظ
کے ساتھ اس نے محفل کی طبیعت پر تصوف و عرفان کا کچھ دیا
رنگ جو اس کا محفل کی لطیف حافط کی غزلیات کا بالکل نبرہ
معلوم ہوتی ہیں۔

محفل نے یہ معلوم اپنی پیاریوں کے عشق سے یا کسی اور
سیاسی وجہ کی بنا پر یا شہنشاہان دکن سے کچھ ایسے
قربانی اور گہرے روابط پیدا کر لئے تھے۔ مرزا ابوبکر
مستقمان کے بعد اس کی اسلامی اور ہندو کلچر کے دو دور کے
گو گندہ کی سرزمین میں بیٹے تھے چنانچہ اس نے بعض ایسی
عہدیں اور بہار راج کیے جو حضرت اس کی روانہ پسند
طبیعت میں ترغیب پیدا کرتے ہیں بلکہ اس کی رواداری اور

محفل تھا۔ اس کو باغ و تعلق یا آورد کی
ضرورت ہی نہ تھی۔

ایک اور مقام پر تو صاحب لیں رقمطراز ہیں۔

"شباب کی ہر رنگا رنگیوں اور جذبات کی جولانیوں
کے انداز میں اس کا قلم غیر معمولی قدرت رکھتا تھا اور یہ
قدرت تخلیقی یا فرضی محفل و عاشقی سے نہیں پیدا ہو سکتی محفل
صحیح معنوں میں اس میدان کا مہر تھا۔ اس کے رفیع اشعار
محفل تھے بلکہ اصل میں بین قوی حسن و لغہ کی وسیع اور
آراستہ و پر استند نمائش کا ہیں نہیں۔"

محفل کی ان نظموں کا مقابلہ ہمارے اردو ادب کے شبابی
پہنچے جو شریع آبادی کی نظموں سے کر سکتے ہیں۔ دونوں میں
ہمیں وہی رومانیت کا شدید ترین احساس مشترک طور پر
ملتا ہے۔ لیکن فرق یہ ہے کہ محفل کی عریاں واقفیت
ہے اور عیش میں جس کو غالباً محفل کی عریاں عریاں ہوں
نفیس نہیں تخلیق اور واقفیت کا امتزاج ہے محفل کی
نے بیاریوں کے ذکر میں بعض راز و نیاز کے معاملات بھی
اس انداز سے پیش کئے ہیں کہ موجودہ ترقی پسند ادب
کے بعض عریاں افسانوں اور نظموں کو بھی شرم آنے لگے۔
لیکن یہ محفل کی رگوں کی الزام نہیں کہوں کہ عریاں نے کیا
کیلئے محفل کی اپنی زندگی کے ہر پہلو کو عریاں سے عریاں
انداز میں اور پوری پوری واقفیت کے ساتھ پیش کرتا ہے
وہ شعر و سخن کا شوق و ادبیت میں کوئی خاص مقام حاصل
کرنے کے لئے نہیں بلکہ اپنے بڑے عشق کی تسکین کے لئے کرتا
ہے اور یہ مقصد بے مقصود یا کائنات کے نصف خلد میں

as a man loves a woman, then he knows God's secret and secret of the world (Oskar Wilde)

اس کو صحیح معنوں میں ایک بڑا حسن کار بنا دیتا ہے۔ خواہ

اس کا پیرائہ انداز عریاں ہی کیوں نہ ہو چلے چنا۔

"نقشہ وصال" "عیش وصال" اور "بعد وصال"

وغیرہ اس کی عریاں نگاری کی مثالیں ہیں اپنی پیاریوں

کے ناز و انداز پر بھی اس کا قلم جذب و کیفیت کے ساتھ رواں

کی تئیں ایسی نظر آتی ہیں جیسے پہاڑوں پر کالے کالے
بادل چڑھائی کرتے آئے ہیں۔

بست پر ایک قصیدے کے چند اشعار ہیں:-
پلا ساقی سرا سرے کو تاہونے کشف ہمنائون
کہ اس سے تھے دیسے سچ کون سدا ب راہنہائی
عبر مورعود و مشک وز عطران کا روت آیا
اسی تھے باس انوکا مگ میں کز ناہے کھستانی
بست پہل کا حامل پہن کر آئی انکس میں وطن
سرو پہلی سنگار کے نقش ان سے حیران ہے مانی

شرح :- اسے ساقی اشراف پلا تا جائے کہ مجھ کو کشف ہونے لگے
کیونکہ شراب کی وجہ سے مجھ پر پوشیدہ راز بھی نظر آنے لگتے
ہیں۔ عنبر، عود، مشک، زعفران کی رت آئی ہے۔ اس وجہ
سے ان سب کی خوشبو دینا کو کھٹا بنا دیتی ہے۔ بست
کے پھولوں کی مالا پہن کر وہ یہیں چین میں نکل آئی ہے۔
جس کے پھولوں کے نقش و نگار کو دیکھ کر مانی بھی حیران ہے۔

اسی طرح عید میلاد نبیؐ، شبِ عراج، شبِ رات، عیدِ عزا
عیدِ فربہ وغیرہ پر محمدؐ کی ہندو یاہ لکھیں مٹی میں۔ ان نظموں
کی ایک خاص خصوصیت اس کی منظر نگاری اور محاکاتی پہلو ہے۔
بعض بعض مقامات پر موسیقی کی کیفیتوں کو اس انداز سے پیش
کرنا ہے کہ کہیں اور دوسرے کا دہونا ہو جائے تھا ہے۔ اور اپنی
پیاریوں کی وہ تصویریں (صور) جو
عیش و طرب کی حالت میں اس کے پیش نظر ہوتیں اس انداز
سے انجی حاکم کرتا ہے کہ اس کی مثال مشکل سے ہمارے
ادب میں ملتی ہے۔

حسن کا یہ پرستار محمدؐ کی چوہا ہے اپنی شاعری میں کہتا
ہے وہ رتبہ و کن کی معاشرت اور تمدن کی تعمیر کاری میں مجا
اسے حاصل ہے۔ اپنے عہد حکومت میں اس نے بعض ایسے

سیاحی قابلیت کا بھی پتہ دیتا ہے۔ "نوروز" "بست"
شبِ رات، بقرعید اور دوسری عیدوں پر محمدؐ کی نے
جولہ لکھیں مٹی میں ان میں ان دو نون پہلوؤں کا اظہار ہوتا
ہے۔ خاص کر "نوروز" اور "بست" میں محمدؐ کی دیسی
سے حسرت لیتا اور عیش و طرب کی داؤد مینا تھا۔ ان موضوعات
پر محمدؐ کی قطعیت و کسے نہایت بلند پایہ قصیدے اور نظمیں
ملتی ہیں جو اس کی انتہائی مسرت کی ترجمانی کرتی ہیں۔
"بست" کی عید میں محمدؐ کی کی ہندوستانی پرستی جھلکتی
ہے اور یوں بھی عیش و طرب کے لئے (جو فطرتاً محمدؐ کی میں
مزید موجود تھا) "بست" سے بڑھ کر کون سا موسم ہو سکتا
ہے۔ ان نظموں میں اس نے جس بے ساختگی اور رنگینی
کے ساتھ اظہار خیال کیا ہے وہ اپنی آپ نظر ہے۔

شبِ رات پر ایک نظم میں لکھتا ہے:-
ہر ٹیک دھن ہر ٹیک گردن پیل فرق کے ابراہن
پی مدن جھلکا بدن شہ یک چین کوی آئے ہیں سو
کھ شتاب کے رنگ آب کوی آفتاب جل تباہ
دکھائے کر و تباہ کوی آفتاب بگڑا ہے، میں
سو دھن ٹیک کہ جب جھلک دو نول الیک کے سو بہک
دکھایا ملک پر تھے ملک بے سد ہو ملک لک آئے ہیں

چھاتی ابر بھائی سدر لٹ سیادھر بچ جس بھتر
جانے کر کالے ابر دو گر پڑا نے آئے ہیں

(شرح :- ہر طرف سے ہر ایک ناگزین نورتن کو لکھ لکھ کر
آئی ہے تاملہ، آدشتہ کے ساتھ چین میں بھلے شہر بھٹن
پینے سے ان کے جسم جھلکنے لگے ہیں۔ اور اپنے نور جان
چروں کے آب و رنگ اور آفتاب جیسی جھلک سے متباب
کو اپنے تاب بگڑا چکا ہے۔ ناگزین اس انداز سے محمدؐ
خرام ہے کہ اس کی زلفوں کے لہانے کی وجہ سے خوشبو
آسمانی کی طرح پھیلتی ہے اور سب آسمانی ملک کیست۔ ایک
سچا ملک کی پستان زریہ و خرمیور ت ہیں جن پر سیاہ بادلو

رسم و رواج کی بنیاد رکھی جو اس کے مرنے کے بعد بھی عرصہ
 درالو تک دکن میں قائم رہیں۔ چنانچہ اب بھی شادی بیلہ
 کی رسومات میں عرصہ اور امتداد و تفریق کی ہی روایت برودہ
 ہیں۔ ان رسومات پر بھی عورتوں کا تکرار و تکرار کا جانا
 ہے۔
 تفریق کے اسٹائل اور خیال میں وہ ساوگی اور
 رنگینی پائی جاتی ہے جس کا مقابل ہم یا جویش کی شاعری
 اور نیاز کے رومانی افادوں سے کر سکتے ہیں یا چرتر

دالٹ، بالوکہ اور والڈیٹر وغیرہ کے نشانہ کار وہاں سے۔
 انماز بیان میں فطری بہاؤ ہے اور انہیں بھی انہیں
 دیکھ کا نہیں۔ ہونا کہ شاعر نے خواہ مخواہ خیالی آرائی
 کی ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ عورتوں کی شاعری ان کی
 بھر پروازوں سے خالی ہے۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ اس
 تخیل کے پاؤں اس کے جہان فی احوال میں غور و خرام ہیں تو
 اس کے پرشاعری اور خیال کی بلند فضاؤں میں پرواز کرتے
 ہیں۔

محمد معین الدین

غزل

فریبہ بہم سہی یہ جینا، مگر کہاں تک نے یہ کہاں
 یہی جو ہے زندگی کا حاصل، تو کیوں نہ جینے سے کہاں

جنوں کو کچھ اور آرمائیں، جنو جی بھر کے مسکرائیں
 مرے نشین کے تنکے تنکے پہ شوق سے بجلیاں گرائیں

غم گزشتہ کا تذکرہ کیوں، کششِ بیم و آرزو کیا
 وہ دیکھو اٹھی ہیں پھر گھٹائیں اٹھاؤ سائے چھوٹی لٹائیں

مجھے غم عشق دینے والے فائدہ غم پہ ہنس رہے ہیں
 الہی! ایسا بھی وقت آئے، مرافانہ مجھے سنائیں

مری طرف آپ دیکھئے تو جھکی جھکی سی ہیں کیوں گئیں

اگر جفاؤں پہ منفعل ہیں، مری وفاؤں کو بھول گئیں

مرے جنوں سے نہ مٹ سکے جو نہیں مانہ مٹا گا کیا

مری وفاؤں کے نقش ہیں یہ مٹائیں آپ مٹائیں

کبھی جو تیں زندگی کا حاصل ظفر وہ اجاب ہوئی ہیں

وہ بروج پرور سہلانی راتیں، وہ بیگی بیگی ہوئی فضاں

منظف الدین ظفر

فریب سلسل

جنگل میں جب کوئی بڑا سا جانور مر جاتا ہے تو چاروں طرف سے گدے ٹوٹ پڑتے ہیں۔۔۔ کوئی شہد کی کسی مر جاتی ہے تو اسے بیسیوں بیڑیاں گھیسٹے جاتی ہیں سمندر میں بڑی پھلی ہزاروں متقی متقی پھیل دیں کو مضمّن کر جاتی ہے۔

سو دکھانے والے ہا جن خود پھرتے چلے جاتے
ہیں اور جن سے وصول کرتے ہیں وہ جلدی جلدی سوکھ کر
قبر کے کنارے چاہو نیچے ہیں۔

ہمارے جنتِ نفاق ہندوستان میں جہاں
کوئی مرا مثلاً بھائی — بھتیجا — بچا یا اور کوئی
رشتہ دار — اور یہ فکر لاحق ہوئی کہ حق داروں
کو فائدہ ووش بنا کر خود اہلِ نینت پر قبضہ کریں۔
بقول شاعر ع

کسی بے کس کو اسے پیدا کرنا تو کیا مارا
راختہ کا سہاگ لٹا تو جیتھ صاحب کو فوری
فکر جو پڑی وہ مکان کی تھی ——— صحن میں دو گئی
زمین اپنی طرف کر کے دیوار کھینچ دی ——— اس ظلم کی
داد تھی نہ فریاد و پچی دو سال کی تھی اور بچہ دو جیسے کا
— جس نے باپ کی شکل تک بھی نہ دیکھی تھی — باپ
کے مرنے کے دوسرے مہینے دنیا میں قدم رکھا تھا —
تیرہ سال کی راشدہ بیاہی گئی تھی اور پانچ سال
بادشاہت کی — سترہ اٹھارہ سال کی کس لڑکی
منہ سے پھول جھڑتے تھے — دنیا کے کرو فریب سے
نا آشنا ——— کچھ خدا کا خوف کر کے کچھ دنیا کی
شرم کر کے چار روپے گزارہ کے باندھ دئے — جیسے
بہت بڑا احسان فرمایا جو ———

راشدہ خدا معلوم کس بے زبان ماں کی بچی تھی
جس نے یہ تمام مصیبتیں چپکے چپکے سہہ لیں۔ پندرہ سال
تک متواتر — فاقہ یہ فاقہ کرتی تھی اور اپنے

ابھی اہل دل بھی باقی ہیں؟
 قسمت دھکے دیتی ہے تو دے چلی جاتی ہے۔ یکساں
 قسم کی ٹھوکریں دھکے — بے بسی — محتاجی اور
 جب پٹنی ہے — تاش کے پتوں کی طرح — الٹی چل
 — تو ہر بانی کا پالنے سیدھا پھینکتی ہے۔ اقبال
 کے دن جب پھرے تو ایک دنیا اسے اپنا اپنا رشتہ دار
 بتانے لگی — رستہ چلتے خود بخود ”آپ تو میرے
 چچا زاد بھائی ہیں“
 ”اے آپ تو ہمارے بہت قریب کے رشتہ دار
 ہوتے ہیں۔“
 ”آپ کے والد سے تو میری بہت دوستی تھی“
 ”آپ کے مدحجت والے ہیں۔ ہم تو آپ کی
 دادی کی بہن کے پوتے ہیں اتنا قریبی رشتہ ہے۔“
 یہ آواز ہیں۔ یہ دعوے پرانے زخم ہرے کر ڈالتے
 ایسا لگتا جیسے کوئی ہزاروں پتھر کھینچ کھینچ کر مار رہا ہو۔
 جنگ ششما کے بہت ہی بھاگوں چلی۔
 بہنوں کو تو بے گھر، بے درخیم بیوہ بنا گئی لیکن
 بے سہاروں کو زندگی کا عملی سبق بھی دے گئی۔
 اقبال نے جس وقت نام لکھوایا تو یہ سمجھ کر
 کہ میرا کوئی رونے والا تو ہے نہیں۔ بیوی بچی
 سہی۔ اگرچہ وہ خیالات ہیں بے حد آزاد تھا
 اور غلامی کو موت سے بدتر سوچا کرتا تھا لیکن نہ جانے
 کیوں فوج میں چلا گیا۔ جوں توں کر کے دو سال وہ
 مختلف جگہوں پر رہتا رہا۔ پھر مصر، عدن وغیرہ
 گھوم کر وطن لوٹا۔ اس بدگزشتہ وطن کی طرف
 جہاں وہ سگے ٹائے کے ہاتھوں خانہ بدوش ہوا تھا۔
 جہاں اسے ٹھوکریں نصیب ہوئی تھیں جہاں سترہ
 اٹھارہ سال اس کے ساتھ وہ فاقہ کشی کر چکا تھا۔
 ہاں اس وطن میں اس نے اس انداز میں قدم رکھا کہ
 چمکتے ہوئے مٹی اس کی رودی میں تھے۔ لڑی میں

ستارہ چمک رہا تھا۔ بازو پر اتبازی نشانات
 تھے۔ سینے پر تمخ لٹک رہا تھا۔ پاؤں میں
 بھاری بھاری جوتے — لفٹ رائٹ کے انداز سے
 قدم اٹھتے ہوئے — جیسے یہ ساری دنیا کو سرنگوں
 کرنے کا اعلان فرما رہے ہوں۔
 اب وہ خاصا خوب صورت جوان نکلا تھا۔ البتہ
 ماتھے پر چند شکنیں پڑ چکی تھیں جو قوت دیتی تھیں
 کہ دل نے جو تلخیاں سہی ہیں ان کا گہرا اثر چہرہ پر نمایا
 ہو گیا۔

جو اپنے پرانے پرچہ میں سے صحت کی طرح خوف
 کھائے تھے اب قریب رہنے کے لئے مختلف پنجاب کے
 آگے بڑھے۔ کوئی ہمدردی کی باتیں لے کر
 — کوئی رشتہ داری کے بہانے لے کر کوئی مبارک باگ
 کے سہارے انعاموں کے ساتھ۔ کوئی دعوت کا
 کردہ بہانہ کر کے غرض سب نے قریب کے جاں تیار کر کے
 قسمت آزمائی کی۔

اقبال بھولا نہ تھا اسے سب کچھ یاد تھا۔ ایک ایک سلوک
 اس کے کلیجہ پر تاسو رہنا ہوا اب بھی موجود تھا۔
 جب دنیا کو اس کی ضرورت آئی تھی تو اب اقبال کو
 مطلق ان مہیاں لوگوں کی حاجت نہ تھی۔
 اس نے سب سے بے رخی کا بتاؤ کر کے منہ پھیر بیٹھا۔
 قریبی رشتہ دار اپنے اپنے گہرے حال پھندے لے کر
 اپنے مایوس رہ گئے۔

اقبال نے اپنی زندگی کی پانچواں براہ راست فوج
 ایک غریب لیکن شریف گھرانے کے اندر شادی کے
 بعد ان ہی لوگوں میں رہنے پہنچے لگا۔ وہ لوگ بھی
 اپنے بیٹے کی طرح سمجھتے۔ بیوی شاعرت کے
 ساتھ شوہر کی دلدادہ بیواں مصر و مدنی صحیح معنوں
 میں سچی چہرہ، محبت پرست، ایک طبیعت۔
 جو کچھ فوج کی ملازمت سے لایا تھا اس روپے سے

اس نے تھارت شروع کی نہایت کامیاب رہا۔ چند سال بعد اس کے پاس سب کچھ ہو گیا تھا۔ مکان، دکان، نوکر چاکر، عیش و عشرت۔ نیچے، سکون و اطمینان۔ ہاں کبھی کبھی گزشتہ تکلیفیں یاد آکر ضرور تڑپا دیا کرتی تھیں۔ ان سارے کا علیہ کیا ہوا؟ خدا کی نافرمانی میں آواز نہیں ہوتی۔ بخار آیا۔ بہت تیز ہوا، ڈاکٹرڈوں نے کہہ دیا کہ یہ علامت ہے کہ جیکب حملہ کرے۔ آخر کو وہی ہوا۔ جیکب لنگلی اور ایسی زور و شور کی کہ سانس لینا محال ہو گیا۔ زندگی سے سب ہاتھ دھو بیٹھے۔ پاس کھڑا ہوتا نہ سکن تھا۔ بے حد تعفن تھی۔ اپنے تو خیر ہو گئے لیکن تمام جسم بد گوشت کی طرح۔ آنکھیں جیکب کی نذر ہو گئیں۔ گھر کا گھر غارت سے مچھلنے لگا۔ یوں مارے مارے کہ اگر تھوڑا بہت لٹا لٹا کیا بھی تو کیا؟ کالا کا بہت زور شور اٹھا۔ ایسا معلوم ہوا کہ وہ اس قریبی دنیا میں فریبیوں سے تو بہ کرانے آیا ہے۔ تین جوان جوان لڑکے منٹوں میں نوٹ پلاٹ ہو کر رہ گئے۔ گویا قضا فی باپ کے گناہوں میں بے گناہ پس گئے۔ بڑھا یا پھر اندھا پن۔ یہ داغ دیکھتے ہوئے انگارے تھے۔ جن پر ہر وقت زرتیا تھا اور جل اٹھتا تھا۔ ایک لڑکی رہ گئی تھی۔ اس کا بھی غریب سے نکاح پڑھا رہا۔ باپ تو نوکری سے جیتے ہی چلے تھے۔ دانے دانے کو محتاج ہاتھ پاؤں سے کچھ تھوڑی بہت بیوی خدمت کرنے کو تھی لیکن مفلسی نے اس کی صحت پر بہت برا اثر ڈالا۔ آئے دن بیمار رہنے لگی۔ ایک دن پھل سستی تک نہ تھی وہ بے لی۔ خدا جانے کس دن کی سڑی لگی تھی۔ پکا کر بھوک میں کھائی۔ اب قدرت نے نئے ڈھنگ سے انتقام لیا۔ دونوں کا جسم پیوٹ نکلا۔ اور ہر دیکھنے والے نے تو یہ تو یہ

کر کے دوری اختیار کی۔ گھر کی چیزیں تو اندھے پن کے بعد ہی سب نیلام کر کے ختم کر ڈالی تھیں۔ اب تو صرف مٹی کے چند ٹھیکے بڑے رہ گئے تھے اور یا وہ عالی شان کھنڈر کھڑا رہ گیا تھا جس کے دروازے سے اقبال ٹھوکریں کھاتا ہوا فریادی نکلتا تھا۔ مدتوں سے مرمت طلب مکان یوں ہی کھڑا تھا۔ اچانک بارشیں ہوئیں۔ ایسی ایسی موسلا دھار کہ پختہ پختہ منزلیں سر بہ سجود ہو کے ڈھیر ہو گئیں۔ ایک رات کو پڑا رہنے کا ڈاٹھکانا تھا وہ بھی گیا۔ ورنہ سارے دن تو کھڑی کے سہارے دونوں بڑھے بڑھا لگی کوچوں میں عجیب مانگتے پھرتے تھے۔ کبھی کبھی شہر کی طرف بھی نکل جاتے۔ جہاں بعض آنکھیں اب بھی ان ہستیوں کو پہچان لیتی تھیں۔ برسات جب زور و زور اقبال کے مکان کو بالکل ڈھا گئی صرف بنیادیں چھوڑ گئیں یا وہ یوں کا شاداب چھوٹا۔ ما درخت جو بڑھ کر اب چھت سے بھی اونچا ہو چکا تھا تو موسم نے ایک اور کرڈل لی۔ یعنی سردیاں تو بہ کرانے آن پہنچیں۔ ایک دن حسب معمول جیتھوے لگا دیے عجیب مانگنے جا رہے تھے۔ آہٹ پا کر بڑھے نے دردناک صدا لگائی بابا دے کچے۔ اس ہاتھ دے اس ہاتھ اقبال کا دل جا ہا کچھ نادر کرھاگ جانے۔ یا دونوں کی گردن دبا دے۔ کجنت اب بھی کچھ اور فریب دینا چاہتے ہیں کیا؟ لیکن اچانک دل کا تپ گیا۔ نیکی نیک راہ۔ بدی پیش راہ۔ جھٹک دس کا نوٹ پکڑا آگے بڑھ گیا۔ لیکن پاس ہی کوئی محلہ کا جوان کھڑا تھا بولا اور بڑھیا! بڑھے کی تو خیر اندھی آنکھیں ہیں وہ تو بھلا کیا پہچانتا؟ کچھ تو نے بھی پہچانا یہ کون تھا؟ وہی اقبال۔ اقبال

میں نے ظلم کیا تھا..... بہت بھاری ظلم.....
بد دل گیا..... ظلم کیا تھا۔ مکا چھینا تھا.....
بے گھر کیا تھا.....
اقبال کو خیرگی — بھاگا چلا آیا — اس کے
سینے میں انسانی دل کھٹ کھٹ کرنے لگا —
نفرت کا جذبہ ختم ہو گیا —
کفن دفن کا انتظام کیا۔ اور بڑھے کی بیٹی کو اطلاع
دینی چاہی معلوم ہوا وہ تو مدت ہوئی زبکی میں ختم
ہو چکی۔ اب یہ کھنڈر جس کے لئے درد کی ٹھوکریں
کھنچا تھا اسے ہرگز دیکھنا بھی پسند نہ آیا۔
کھڑے کھڑے معہ اپنے مکان کے اللہ نام پر
پانچ چھے بیس بیس چو اڑوں کو تقسیم کر دیا —
اس طرح خدا خدا کر کے مسلسل فریب کے ٹکڑے
ہو گئے —
شفیق بانو

تجلیات

راز جو رجوعا نہیں معلوم درد دل کی دوا نہیں معلوم
اے سب! تری عنایت سے دردیوں بڑھ گیا نہیں معلوم
عشق کی ابتدا تو میں نے کی عشق کی انتہا نہیں معلوم
ہائے! اُس شوخ نظر کا عتاب کیا غضب ڈھکا کا نہیں معلوم
چچو کو اللہ پر بھروسہ ہے کرم نا خدا نہیں معلوم

اُن کی بیگانگی عظیم آخر

رنگ لائے گی کیا نہیں معلوم

عظیم حیدر بلدی

جس کو تم لوگوں نے حق سے ناحق کیا — سمجھے —
ڈوب مرو کہیں چلے بھر پانی میں — نوٹ بڑی جلدی
سے پکڑ لیا ہے —
یہ سستے ہی دونوں کو گویا سانپ سونگھ گیا —
نوجوان نے ایک اور تیر پھینکا — ”اگر میں تم لوگوں
کا بھتیجا ہوتا تو ابھی مارے جو تلوں کے تم دونوں کا بھیسہ
پہلا کر ڈالا ہوتا — تم دونوں تو بس اس کلمہ سے بھی
دھان ہو جاؤ — اندھے کوڑھی — تمام محلہ
کی آپ دھوا گندی کر رکھی ہے — صحت کے ماروں
نے موت بھی کہیں تم سے دور بھاگ چکی ہے شاید —
آج کا دن شاید خدا نے انصاف کے لئے رکھا جب
دودھ کا دودھ پانی کا پانی دنیا کو نمایاں دکھانا
تھا — رات آئی — اور اپنے ساتھ جاگتا ہوا
انصاف لائی — ایسا انصاف — جو دنیا والوں
سے نہ ہو سکا نہ قانون سے ہو سکا۔ نہ بڑے بڑے
عہد و تھا والے فتویٰ دے سکے کہ مظلوم کے لئے کیا
ہونا چاہئے تھا۔ قدرت نے چند منٹ میں خودی کر دیا۔
برسوں کی پانی کھائی دیواریں تو ڈھیر ہو چکی تھیں۔
بغلی کو ٹھٹھی ذرا کچھ دم ختم والی کھڑی تھی اسی میں
یہ فربہ مکار بڑھا مہ بیوی کے پڑا رہتا تھا۔
آج بھی سردی میں دونوں سکرے ہوئے دیوار سے
لگے بیٹھے تھے — اچانک ایک دھماکے کے ساتھ دیوار
اڑا..... اڑا دھم ہو کر آڑی — خود خفا کھڑے تھیں
بلند ہوئیں اور ختم — کسے غرض پڑی تھی کہ رات کو
دو بجے کاناؤں میں سے نکل کر دوڑتا اور مدد کے لئے
محلہ والوں کو جمع کرتا —

یوہنی سسک سسک کر دم صبح تک اٹکا رہا۔

جب تک کہ پولیس آگئی — ملہ ہٹا یا گیا —

آخری سانس آ اور جا رہی تھی۔

بڑھے کے دم بول نکل رہے تھے..... آہ اقبال پر

ہسپتالوں اور صحتی اداروں میں نرسوں کی کمی

(نرسوں کے لئے بہتر انتظامات اور اعلیٰ تعلیم و تربیت)

قوم کے تحقیقاتی کمیشن نے اپنی رپورٹ میں بھی ہے کہ اگر ذرا مت پیشہ لوگ بیماری کے باعث جسانی اور ذہنی طور پر کمزور ہو چکے ہوں تو وہ بحیثیت جماعت ترقی نہیں کر سکتے۔ یہ بات شہری آبادی پر بھی صادق آتی ہے۔ مگر ہندوستان ابھی تک علاج معالجہ اور صحت و نفعاتی کے انتظامات کے لحاظ سے دوسرے ممالک اور ترقی یافتہ ملکوں سے بہت پیچھے ہے۔ اس کا اندازہ اس امر سے لگایا جاسکتا ہے کہ صوبائی حکومتیں ان نرسوں پر اپنی آمدنی کا اوسطاً ساڑھے پانچ فی صدی حصہ صرف کرتی ہیں۔ لیکن امید ہے کہ مرکزی حکومت کی مالی امداد کے ساتھ صوبے ترقی کو بہتر اسکیموں پر عمل درآمد کرنے کے قابل ہو جائیں گے۔

ان نرسوں کی ترقی کے ساتھ ساتھ تربیت یافتہ نرسوں کی تعداد میں بھی زبردست اضافے کی ضرورت ہے۔ یہ صبح ہے کہ زمانہ جنگ میں نرسنگ نرسوں کو ترقی دینے کے لئے بہت کچھ کیا گیا لیکن ابھی تک ایسی نرسوں کی کمی شدت کے ساتھ محسوس کی جا رہی ہے جو عمدہ اور اعلیٰ تربیت حاصل کر چکی ہوں۔ نرسنگ نرسوں کی ترقی کا آغاز ۱۹۳۹ء میں ہوا اور انڈین ملٹی نرسنگ سروس قائم کی گئی۔ مگر وہ بڑھتی ہوئی جنگی ضرورتوں کو پورا نہ کر سکی۔ اس کے بعد سرکاری رجسٹرڈ نرسیں اور شہری ہسپتالوں کی نرسیں بھرتی کی گئیں لیکن اس کے باوجود ہندوستانی فوجوں کے بیماروں اور جیوں کی خبر گیری کے لئے مزید نرسوں کی ضرورت محسوس کی گئی اور ۱۹۴۲ء میں آکریجری نرسنگ سروس آت انڈیا قائم ہوئی۔ جس میں ہندو، مسلمان اور عیسائی خواتین شامل ہوئیں۔ اس کے علاوہ برطانیہ سے بھی نرسوں کے دستے آتے رہے۔ مگر مذکورہ کوششوں کے باوجود نرسوں کی بدستوری ہے۔

نرسوں کی کمی ۲۰ نومبر ۱۹۴۷ء کو ٹریڈنڈ نرسز ایسوسی ایشن آف انڈیا کی پونجی کانفرنس کا جو اجلاس منعقد ہوا اس میں تعلیم و صحت و اراضی کے ممبر آرنلڈ سر جو گندر سنگھ

..... نے بھی نرسوں کی کمی کے متعلق اظہارِ خیال فرمایا۔ اس سلسلہ میں آپ نے اس امر پر زور دیا کہ نرسوں کے رہنے چھنے اور ان کی تعلیم و تربیت کے متعلق بہتر انتظامات کیے جائیں اور یہ امید ظاہر کی کہ اگر سروس کے حالات کو ترقی دی جائے تو ہسپتالوں میں کام کرنے کے لئے تعلیم یافتہ خواتین کافی تعداد میں اپنی خدمات پیش کر دیں گی۔

اس کی سبب یہ ہے کہ ہندوستان میں نرسنگ سروس اور اس کی معاون نرسوں نے اتنی تیزی سے ترقی نہیں کی جتنی تیزی سے طبی سروسوں نے ترقی کی ہے۔ چنانچہ اندازہ لگایا گیا ہے کہ بڑے ہسپتالوں میں ۱۵ ہزار بیمار ہیں جن کی تیمارداری کے لئے ۷ ہزار نرسیں ہونی چاہئیں۔ مگر ان کی موجودہ تعداد ۷ ہزار ہے جن میں سے صرف نصف تربیت یافتہ ہیں اور چھوٹے ہسپتالوں میں تو حالت اور زیادہ خراب ہے۔

بہر کیف سروس کے حالات کو سدھارنے کے لئے زبردست کوششیں کی جا رہی ہیں۔ — — —

کل ہند زنگ کونسل کے قیام کے لئے مرکزی اسمبلی کے آئندہ اجلاس میں ایک مسودہ قانون پیش ہونے والا ہے۔ اس کے علاوہ زنگ کی اعلیٰ تعلیم کے لئے ایک ہندوستانی اسکول قائم کرنے کا مسئلہ بھی زیر غور ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ یہ اسکول جلد کالج بن جائے جس میں انٹرکلوں کا نصاب پڑھایا جائے اور صحت عامہ کی زنگ کے متعلق بھی تربیت دی جائے۔

تعلیم و تربیت کے بہتر انتظامات حکومت ہند نے زنگ کے متعلق صوبوں کے لئے چند معیاد تجویز کئے تھے۔ صوبائی حکومتیں ان سے دلچسپی ظاہر کر رہی ہیں۔ چنانچہ بمبئی اور صوبہ متحدہ میں زنگ سروس کی نگران خواتین مقرر کی جا چکی ہیں۔ مدراس میں زنگ کی سپرنٹنڈنٹ لکچرر ہی میں مقرر کر دی گئی تھی اور اب بنگال میں بھی اس کا تقرر عمل میں آنے والا ہے۔

بیرونی ملکوں میں نرسوں کی اعلیٰ تربیت کا سروس پچھلے پچھلے پیمانہ پر بند و بست کیا گیا ہے۔ برطانیہ کے بعض ممتاز ہسپتالوں میں ہر سال ۳۲ ہندوستانی نرسوں کو تربیت دی جائے گی اور ان آموزگار نرسوں کے لئے وہی سہولتیں اور آسائشیں جیسا کہ جاپان کی جو برطانیہ آموزگار نرسوں کے لئے عیاں کی جاتی ہیں۔ (۱) طالبات برطانیہ پہنچ چکی ہیں جن میں سے دو ”سپرٹوٹرز“ کے نصاب کی تکمیل کریں گی۔ حکومت ہند نے بنگال کی ایک قانون مس سورما بسواس کو بھی رائس کالج آف لندن میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لئے بھیجا ہے۔

دو سال ہوئے سرچوزف بھور کے زیر صدارت ایک کمیٹی مقرر کی گئی تھی تاکہ وہ صحت عامہ کا جائزہ اور اپنی سفارشات پیش کرے۔ توقع ہے کہ یہ کمیٹی اپنی رپورٹ جلد پیش کر دے گی اور صحت عامہ کی منصوبہ بندی میں بھی زنگ سروس کی ترقی کو خاص اہمیت دی جائے گی۔

ہلت و زیریں خواتین اس ضمن میں ڈائریکٹر جنرل میڈیکل سروس و صدر انجمن تپ ہندوستان لکھنؤ جنرل جے بی۔ بانس کی وہ تقریر بھی دلچسپی سے پڑھی جائے گی جو انھوں نے تپ و ہلت و زیریں کی کلاس کا افتتاح کرتے ہوئے حال ہی میں فرمائی ہے۔ یہ کلاس تپ و ہلت کے کلینک نئی دہلی میں قائم کیا گیا ہے۔

اس میں آپ نے ہلت و زیریں کی اہمیت نہایت پر زور الفاظ میں بتائی جن میں خواتین کی تعداد میں شامل ہوں گی اور اس امر پر زور دیا کہ ”سیمیٹوڈیوں“ کے علاوہ ”کلینک“ بھی کثیر تعداد میں قائم کیے جائیں جو تپ و ہلت کے ابتدائی درجوں کے علاج کے لئے نہایت ضروری ہیں اور ہر کلینک میں کئی اعلیٰ تربیت یافتہ نائٹ اور سرگرم ہلت و زیریں کو مقرر کیا جائے۔

اس کام کے لئے بھی ہندوستانی خواتین کی خدمات کارآمد ہیں اور وہ انداز تپ و ہلت کے متعلق بھی نہایت مفید خدمات انجام دے سکتی ہیں۔

از حکماء اطباء عامات ہند

نئی کتابیں

- [illegible]

مرزا اسد علی خاں

نظارے

میں صبح سے مارا مارا پھرتا رہا تھا۔ تحبک طور سے تو کہہ نہیں سکتا کہ میں جو مارا مارا پھرتا رہا تو وہ آخر کس سلسلے میں تھا۔ کوئی چیز خریدنی نہ تھی، کسی کی تلاش نہ تھی، کسی کا گھر دیکھنا نہ تھا۔ میں بقیوں کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ میں کسی خاص وجہ کے تحت مارا مارا نہیں پھرتا تھا۔ فرصت تھی، ہاں خوب یاد آیا، فرصت تھی۔ دفتر بند تھا اور گھر میں بیٹھے بیٹھے طبیعت آگیا جی نہیں۔ دقت گزار بننے کے لئے گھر سے نکلا تو بس مارا مارا پھرتا رہا، ایک بڑا لوگ بھیڑ لگائے کھڑے تھے میں بھی رگ گیا اور ایک نشانہ کے اندھے کا سہارا لے کر کھڑا ہو گیا۔ انھوں نے میری اس حرکت پر ایک ہتھکڑی کے ساتھ اپنی گردن موڑ لی۔ ارے وہ تو میرے ہم محلہ شیخ صاحب تھے۔ ”کئیے شیخ صاحب اچھے تو ہیں آپ یہ کیا نشانہ ہو رہا ہے پچ میں نے مسکاتے ہوئے شیخ صاحب سے پوچھا۔ شیخ صاحب کا بڑا ہوا چہرہ، بندریج، پری، اصلی حالت پر آگیا۔ ”کچھ نہیں وہ کوئی ہالیوڈ کی طرف سے آئے ہیں بعض جڑی بوٹیاں بہت خاص ہیں ان کے پاس۔“ جب آپ بھی دیکھنے خدا کی قدرت، شیخ صاحب نے اپنی گردن پھری۔ وہ ہالیوڈ کے باشندے تھے شیخ میں ایک کپڑا بچھا، اس پر جڑی بوٹیوں کا دبیر لگائے کھڑے تھے۔ میں بھی دیکھنے لگا اور میں نے دیکھا اس شخص نے تماشائیوں کو ایک گلاس بتایا، غالی گلاس، اس کے بعد اس نے اس میں پانی ڈالا۔ پھر پھٹی میں سے ایک جڑی نکالی۔ کہنے لگا ”بھائیو! یہ جڑی ہالیوڈ کے دامن میں دستیاب ہوتی ہے۔ اور اس کو پانے کے لئے پانچ سال میں نے جنگلوں میں گزارے، پانچ سال بھائیو۔ میں اس کی تعریف نہیں کرتا۔ اس کا کرشمہ دکھانا ہوں“ اس نے وہ جڑی پانی میں ڈال دی۔ تھوڑی دیر بعد سارے تماشائی پھٹے ہوئے دیدوں سے دیکھ رہے تھے کہ پانی جتنے لگا۔ دوا کا کرشمہ دکھانے کے بعد اس نے کھنکار کر چاروں طرف فحش انداز نظر ڈالی اور ایک دھچ پھٹ سے بھی زیادہ زور دیا کہ لگا کر کھنا شروع کیا ”اس کے گن بھی سن لو۔ یہ۔ بوڑھے کو.....“ میں نے اپنے کانوں پر ہاتھ رکھ لئے اور لاسول پڑھتا ہوا اپنی راہ پر لگ گیا۔ پل پر سے گزرنے لگا تو کئی راہ گیر ایک جگہ جمع ہوتے مبارک تھے اور بھانک بھانک کر نیچے کی طرف دیکھ رہے تھے۔ میں بھی رگ گیا۔ میں دیکھنا چاہتا تھا کہ یہ لوگ آتے کیا دیکھ رہے ہیں۔ میں نے بھی بھانک کر نیچے دیکھا، ندی بہہ رہی تھی۔ صرف ندی بہہ رہی تھی۔ میں نے اپنے بازو والے صاحب سے پوچھا ”کی بات ہے جناب؟“ کہنے لگے ”میں بھی ابھی آیا ہوں۔ آپ سے پوچھئے ان صاحب کے بازو صاحب کھڑے تھے ان سے میں نے رکتے دیکھے پوچھا ”آپ کو معلوم ہے جناب؟“ یہاں یہ سب کہوں جمع ہیں۔ ”جی جی“ کہتے ہوئے انھوں نے ہلٹ کر اوپر اوپر دیکھا۔ ”ارے“ ”ارے“ ”ارے“ ”ارے“ دیکھئے جناب بات دراصل یہ ہے کہ یہاں ایک صاحب بھانکتے کھڑے تھے اور ان کے ساتھ ہم بھی بھانکتے لگے۔ وہ صاحب چلے گئے کہیں۔ ورنہ ان سے پوچھ لیتے۔ ہم کو تو کچھ نظر نہیں آ رہا ہے۔ ندی تو البتہ بہہ رہی ہے۔ گھر صاحب کچھ تو ہوگا۔ کچھ تو ہوگا ضرور۔ تب ہی تو وہ بے چارے دیکھنے لگے۔ خود کشی کے امکانات پر غور کر رہے ہوں گے وہ“ میں نے وہاں سے ہستہ ہوئے اپنے دل میں سوچا ”مجھے تو دقت گزار نا تھا۔ میں کہوں پل پر سے ندی میں بھانکتا رہوں۔ پل کے فٹ پاتھ پر بیٹھے ہوئے دو فیگر آئیں میں نکلا کر رہے تھے۔ ایک کہتا تھا کہ خواجہ والے کے تو نے ٹانگ کیوں ماری۔ دوسرا کہتا.....“ اور تو نے کیوں سارے بھیجے اس کے

ہزب کرنے۔“ میں جو ان کے قریب پہنچا تو وہ دونوں مسکین صورت بنائے سوال کرنے لگے۔ میں اپنی ناخوشی کو بچاتا دور ہی دور سے جیموں میں ہاتھ ڈالے چلتا رہا۔ میں آگے بڑھ گیا تو وہ بھربھائیں کرنے لگے۔

”ایک روپیہ کا چکر ہے تیرے پاس“..... دوسرے نے کہا ”پیارے کم ہیں۔ شام تک دیدوں گا۔ یہ بے بارہ اتنے“۔ ایک تانگہ بان کی دکان کے آگے کھڑا تھا۔ تانگے والا پان سگریٹ خرید رہا تھا۔ ایک صاحب نے تانگے والے سے پوچھا ”کرایہ کرو گے“۔ تانگے والے نے جواب دیا ”کہاں چلتا ہے صاحب“۔ ان صاحب نے کہا ”گلزار حوض“۔ تانگے والے نے پان چباتے ہوئے کہا ”ایک روپیہ دلو ایسے صاحب“۔ ان صاحب نے ناک ہونے پر دھانے ہوئے کہا ”ایک روپیہ نہیں تین آنے دیں گے“۔ تانگے والے نے سڑک پر بیک تھوکی۔ وہ صاحب آگے بڑھ گئے۔ تانگے والا کہتا رہا ”چنا چنگا، گھاںس تھنگا۔ اور گلزار حوض تک کا کرایہ ایک روپیہ نہیں تین آنے“۔ اس کے بعد اس نے انھیں کچھ کہا۔ کرایہ چکانے والے صاحب تو آگے بڑھ گئے تھے۔

ساری باتیں سمجھی کوسنی پڑیں۔ میں نے سوچ لیا کہ گلزار حوض جانا ہو تو تانگے والے کو تین آنے پر چلنے کے لئے نہ کہوں گا۔ ایک سڑک زیر تعمیر تھی مرہ دور بٹھراٹھا رہے تھے۔ اور مرہ دور نیاں گتہ دار صاحب کے پیچھے تھیں۔ ندی سے پانی لانے جاری تھیں۔ ایک صاحب سیٹھی پر تیزی سے چل آ رہے تھے۔ دوسرے صاحب دوسری طرف سے ان سے بھی زیادہ تیزی سے آئے۔ دونوں ایک دوسرے سے ٹکرائے۔ چاروں گسے۔ دو سیٹھی سوار اور دو سیٹھیں دونوں نے ایک دوسرے کو زور دیکھا۔ کپڑے جھاڑتے ہوئے اٹھے۔ سیٹھیں سنبھالیں اور اپنی اپنی سمت چپ چاپ چل نکلے۔ میں مسکرائے بغیر نہ رہ سکا۔ مگر مجھے ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے میری فرصت کا وقت ٹھیر گیا ہے۔ کٹنا کٹنا نہیں۔ میں نے ایک ٹھنڈی سائنس بھری اور پھر چلنے لگا۔ دو اخبار بیچنے والے لڑکے آوازیں لگاتے بازو سے گزرے۔ میں نے ایک کو روک کر اخبار خریدا۔ ایک صاحب بوکھلائے ہوئے میری طرف آنے لگے۔ ”جناب!“۔ ”جی آپ مجھ سے کچھ کہنا چاہتے ہیں؟ میں نے ہمدردی کا اظہار کرتے ہوئے پوچھا۔ ”دیکھئے جناب آپ یہاں کب سے کھڑے ہیں؟ میں نے کہا ”ایسی کچھ دیر تو نہیں ہوئی“۔ ”تو آپ نے ادھر سے کسی رکشا والے کو جانے دیکھا۔ کچھ سامان تھا اس رکشا میں۔ کیوتروں کی ایک ٹوکری بھی تھی۔ دیکھی ہے آپ نے؟“ میں نے سوچتے ہوئے جواب دیا ”مجھے یاد تو نہیں۔ البتہ ایک رکشا.....“۔ ”جی بس ٹھہریہ ادھر ہی کو گئی ہے نا؟“ میں نے بے بسی کے عالم میں گردن ہلادی۔ وہ اس طرح کو دوڑ پڑے۔ وہ تھوڑی دوری گئے ہوں گے کہ ایک رکشا کچھ سامان تھا جس میں ایک کیوتروں کی ٹوکری تھی جس میں میرے سامنے آکر رکی۔ رکشا والے نے پوچھا ”صاحب ادھر سے کوئی صاحب گزرے دے دے سے عینک لگائے ہوئے چھوٹی سی ڈاڑھی، میں مسکرا پڑا۔ وہ جانے کیا سمجھا۔ واپس ہونے لگا۔ میں نے جلدی سے کہا ”ارے بھائی ادھر ہی کو گئے ہیں وہ مجھے ڈھونڈتے ہوئے، کوہر بھنگا رہا ہے انھیں“۔ رکشا والے نے کہا ”صاحب ایک دکان سے کچھ خریدنے کو گئے تو بس لاپتہ ہیں“۔ میں نے کہا ”اس طرف طے جاؤ، وہ ابھی گئے ہیں تمہیں مل جائیں گے۔“ میں نے اخبار کھولا اور پڑھنے لگا۔ میں درخت کے نیچے کھڑا تھا۔ کوئی چیز اوپر سے عین اخبار کے صفحہ پر گری۔ میں نے اوپر نظر اٹھائی۔ ایک کوڑا لی پر بیٹھا کایں کایں کر رہا تھا۔ میں نے اخبار بے عینک دیا اور پھر سے چلنے لگا۔ ایک کتا بھی میرے ساتھ ہو گیا کبھی کبھی وہ

مجھ سے بہت آگے نکل جاتا۔ لیکن وہ کسی پتھر یا دیوار کو سونگھتا کھڑا رہ جاتا تو میں آگے نکل جاتا۔ پھر ہم دونوں ساتھ ہو جاتے۔ ایک دفعہ تو میں نے اسے دھتکارا بھی۔ لیکن وہ تو جیسے شرط بانہ کر میرے ساتھ دوڑ رہا تھا۔ ایک گھر سے پتی نکلی تو وہ اس کے پیچھے لپکا۔ جلی ایک موری میں گھس گئی تو وہ موری کے آگے کھڑا رہ گیا اور میری طرف اس طرح دیکھنے لگا جیسے کہہ رہا ہو کہ دیکھئے اس موری میں گئی ہے جلی۔ وہ کتا بھی میری طرح بیکار نظر آ رہا تھا۔ جسے صحت و وقت گزارنا تھا۔ اس نے اب میرا ساتھ چھوڑ دیا اور ایک چوڑے باورچی خانے کی طرف چلا گیا۔ ایک صاحب کالے اٹلس کی صدی پہنے گاتے ہوئے آئے۔ بلبل آ تو بھی گا۔ جوں جوں وہ مجھ سے قریب ہوتے گئے ان کی آواز بھی دھیمی ہوتی گئی۔ جب وہ میرے بالکل پاس پہنچے تو چپ ہو گئے اور آگے بڑھتے گئے تو پھر سے کانے کانے کی اونچی ہوتی گئی۔ بلبل آ۔ آ۔ آ۔ ایک بھکاری اپنے دو مردہ نمابچوں کو سانسے ڈالے راہ گبیروں کے آگے دست سوال دراز کرتی تھی۔ ”دو دن کے بھوکے ہیں آفریں ہے اس ماں پر جو دو دن کی بھوکا ہو۔ اس کے دو بچے دو دن کے بھوکے ہوں اور وہ ان بچوں کا پیٹ پالنے کے لئے بھیک مانگے۔ نگاہ گھونٹ کر انہیں ڈالا۔“ آفریں ہے اس ماں پر۔

طوائف کی دکان مٹھالیوں سے سجی ہوئی تھی۔ دھڑا دھڑا تازہ تازہ مٹھالیاں نکلی جا رہی تھیں لپک لپک کر یاں بھٹانے ہوئے بھیرے سے نکل رہے تھے۔ کھیاں بھنھن جا رہی تھیں اور تو دھڑا سیٹھ اپنے نوکروں پر برس رہا تھا۔ کچھ دیر بعد وہ اپنی گدی پر نیم دراز خزانے لینے لگا۔ مٹھائی تیار کرنا۔ جمانے اور تولنے والے لازم کالے جیتھوڑوں میں ملبوس اپنے اپنے کام میں لگے ہوئے تھے۔ دکان کے آگے دو بھکاری لڑکیاں کھڑی تھیں ان میں سے ایک کے ہاتھ میں مٹھائی کی پھینکی ہوئی ٹوکری تھی۔ جس پر سے وہ دھیرے دھیرے دھاک گھونٹی جا رہی تھی۔ وہ بل جواس کی آنٹوں میں پڑے تھے ان میں کچھ اور بیچ بڑے جا رہے تھے۔ مٹھائی کی ٹوکری سے لپٹا ہوا قوام قطرہ قطرہ زمین پر ٹپک رہا تھا۔ بعض گاہک دکان پر ہی مٹھائی سے کام و دھن کی تواضع کر رہے تھے۔ گرم گرم جانیں اور تازہ تازہ اترتیاں۔ بھکاری لڑکیوں کے ہاتھ آگے بڑھے ہوئے تھے۔ جھوٹے کاغذ اور پتے پھینکے جا رہے تھے۔ دکھاریں جا رہی تھیں۔ پشیرے بھرے جا رہے تھے۔ لیکن ان بھکاریوں کے ہاتھ پھیلے ہی پھیلے ہی رہے۔ ایک لڑکی کچھ اور آگے بڑھی۔ سیٹھ کی آنکھ لگ گئی تھی۔ ایک کھیاں ان کی ناک میں گھس گئی تھی۔ ”سیٹھ“ اس لڑکی نے پکارا، چل بھاگ، اور انھوں نے اپنی چوکی کے نیچے سے ایک چھوٹا سا ڈھبلا اٹھا کر لڑکی کی طرف دے مارا۔ سیٹھ صاحب نے ان بھیک منگوں کو مار بھگانے کے لئے اپنی چوکی کے نیچے چھوٹے چھوٹے ڈھبیلوں کا ایک ڈھبیر سا جمع کر رکھا تھا۔ ان ڈھبیلوں کے بازو ہی پیسوں کا صندوق دھرا رہتا۔ لڑکی ڈھبیلے کی چوٹی لکھا کر سر بھام کر بیٹھی۔ دوسری لڑکی ایک موٹر کے پردے کے پاس بھیک مانگتی کھڑی رہی۔ اسے ایک پیسہ ملا۔ دوسری لڑکی کے پیچھے پہنچتے موٹر چلی گئی۔ ایک پردے لگا ہوا سامنا کر گزرنے لگا تو اس میں سے ایک چھوٹے بچے نے سر نکالا اور مٹھائی کے لئے میل گیا۔ تانکر کو ایسا گیا۔ اور مٹھائی لینے کے بعد پھر سے چل پڑا۔ وہ دونوں لڑکیاں اس تانکر کے پیچھے بھاگنے لگیں۔ ان کے پاؤں اور زباناں مٹھن سنی طرح چل رہی تھیں۔ دو بھکاری

ہوا کیوں اور ایک تازہ دم گھوڑے کا مقابلہ تھا۔ میں دور تک ان کو دیکھتا رہا۔ آخر ایک لمبی ٹوکری
 کھا کر گڑ بڑی میں سے اپنی گردن بچھری اور دوسری ٹٹن دیکھنے لگا۔ ایک دکان پر بھٹو لگ رہی
 تھی۔ معلوم ہوا اس سے لے کر دکان پہنچے دے کر ایسی مشکل سے انداز لے کر عذاب الہی
 نہیں تو پھر کیا ہے۔ بڑے کترا رہے ہیں جوان آگے بڑھ رہے ہیں۔ عورتیں ان کے پیچھے
 جگہ نکال رہی ہیں لیکن سارے مجمع میں ایک سنسنی سی پھیلی ہوئی تھی۔ انداز بہر صورت قابل
 کرنے کا۔ صدمہ اور خوفناک ارادہ ان کے چہروں سے ابلتا پڑتا تھا۔ پیٹا بٹیری جے۔ ایک سیٹھ صاحب
 اپنے گاہک سے دلچسپ رہے تھے۔ ”کیوں بھائی کچھ سا بٹلر زندہ ہے کہتے ہیں“ گاہک نے جواب دیا۔
 ”بٹلر نہیں مر سکتا“ سیٹھ صاحب نے کہا۔ ”تو پھر بٹلر بھی ہوگی“ ”ہاں“ گاہک نے
 جواب دیا۔ ”اچھا یاد دل کا کیا بھلا ہے“ سیٹھ صاحب نے کہا۔ ”چاندل نہیں ہیں ہمارے پاس“
 گاہک آگے بڑھ گیا۔ دو دروازوں سے کھینچ بھری ہوئی ایک ناری سامنے سے گزری۔ مرد دوڑ گاتے ہوئے
 جا رہے تھے۔ انھیں مرد دروازوں بھی، بڑھی بڑھی لی، یہی تھیں اور ماری کے لئے موڑ بھی مگر وہ.....
 مر جائے مثلاً کرے!۔ جب میں ایک بوٹی کے قریب پہنچا تو مجھے وہ ریکارڈ سنانی دیا جس کی موسیقی میرے
 دل پر چڑھ کر گئی تھی۔ مجھے اس گانے کے بول یاد تھے۔ طرز یاد ہو گئی تھی۔ میں گنگنا سکتا تھا مگر نہیں
 سکتا تھا۔ میں ایک دھشت کے نیچے قوی گیا اور اس کے بول ذہن نشین کرنے لگا۔ ریکارڈ ختم ہو گیا تو میری
 خوشی کا ٹھکانہ نہ تھا۔ مجھے اپنا رگیت حرف بہ حرف یاد ہو گیا تھا۔ لیکن آگے بڑھتے ہوئے اسے گنگنانے کی جو
 پریشانی کرنا ہوں تو ہاں طرز ہی بھول گئی۔ سناگوں، رگٹاؤں اور سائیکل سواروں کو دیکھتے دیکھتے میرا سر
 گھومتے لگا۔ دنیا کی ہر چیز حرکت کر رہی تھی اور میں چاہتا تھا کہ ساری دنیا ختم جائے۔ سناٹا بھا جائے اور میں
 کیلا دل چاہتا ہوں ہر چیز کا معاملہ کرنا چھوڑوں۔ مٹے اپنے اڈوں پر گھوم رہیں۔ رگٹاؤں میں ٹھہر جائیں۔
 سیٹھیں رک جائیں۔ بوگ اپنے اپنے گھوڑوں میں بند پڑے رہیں۔ وہ دو فروش ہمارے کی پی پی پر چلا جائے۔
 ریکارڈ بھٹا رہے اور میں جھلتا ہوا تیز تیز چلتا ہوا یا دوڑتا ہوا چاروں طرف گھوموں۔ چاروں طرف بھڑوں
 اور میری خدمت کا وقت گزرتا رہے۔ لیکن دنیا کے کاروبار بھی بند نہیں ہوتے۔ یہ کئی کچھ رکتی نہیں۔
 میں کچھ مٹاؤں اور بہت زیادہ بے کیفیت اپنے گھر میں داخل ہوا۔ ایک بوجھ سا سامنے دل سے اتر گیا۔ سات
 دن چلتے تھے اور مجھے سوائے رات کا کچھ نا کھا کر سوجانے کے اور کوئی کام نہ تھا۔

رشید قریشی

”جید آباد“ جو جوان افسانہ نگار رشید قریشی ایم اے کے افسانوں کا نفیس مجموعہ ہے۔ اضافی
 ادب سے دلچسپی رکھنے والے طور اس کا سلاؤ کریں کتاب بہت دلچسپ اور انداز بیان بہت

تھیں۔ رشید قریشی افسانہ نگار بھی میاں کا بہترین نمونہ ہے۔ اردو کے نئے ادب سے دلچسپی رکھنے والے اور ترقی پسند
 افراد کے لیے بہت اچھا اور افسانہ نگاروں کے مطالعہ سے ہزار کھلونا ہوں گے۔ جو اصحاب اردو کے جدید ترین افسانوں کا مطالعہ
 کرتے چاہتے ہیں وہ اس نو جوان مصنف کے ان پر کیف افسانوں سے غرض و لطف اندوز ہوں گے۔ صفحہ ۱۶۷ (۱۶) تجدید

سب رس کتاب گھر۔ خیرت آباد سے طب فرمائیے۔

ابراہیم ظفر

گرم تھا۔ رعایا سے من مانی مالگزاری وصول کی جا رہی تھی۔ پہلے پہل تو ”وطنی مجلس“ نے خفیہ طور پر کام جاری رکھا اور جب رعایا کو کافی اسکا دیگیا تو باضابطہ طور پر کھل کھلا نظریں ہونے لگیں، جلے منعقد کئے جانے لگے، ابراہیم ان سب کارہ نما تھا۔ عوام اس کے اشارے پر نچتے تھے۔ بالآخر بغاوت ہو گئی، واسدلو حاکم نزل معاہدے ساتھیوں کے قتل کر دیا گیا۔

سورج مغربی پہاڑیوں کے پیچھے تیزی سے بھاگا چلا جا رہا تھا، آسمان پر کلاہی لگ کر اے ادھر سے ادھر منڈلا رہے تھے۔ ایک سو ارب دارفنا گھوڑے پر نزل سے لکلا اور شاہی پہاڑیوں کو پیچھے چھوڑتا ہوا جیس میل پر ایک گاؤں میں جا کر دم لیا۔ گھوڑا پسینے میں نثر بو رہا تھا، گھوڑے کی پیٹھ تھکی اور ایک معمولی سے مکان میں داخل ہوا۔

”فاطمہ؟“

”کون؟ ابراہیم! تم آگے میں کب سے تمہاری راہ دیکھ رہی تھی۔ میں تو آج بہت پریشان تھی، سنا ہے نزل میں بغاوت ہو گئی۔ ابراہیم! تم یہ سب کیا کر رہے ہو بغاوت کر دینا آسان ہے اور اس کا نتیجہ؟ ابراہیم! یہ تم کیا کر رہے ہو؟ اپنی جان کو جان بوجھ کر خطرے میں ڈالنا کوئی عقل مند نہیں!“

”فاطمہ! تم اس کی فکر نہ کرو، سب ٹھیک ہو جائے گا۔“

ابو نے تو تم کو اصل بات بتائی ہی نہیں، سنو گی تو پاگل ہو جاؤ گی۔ کہہ دوں؟

”ہاں ہاں“

”اب تم ملکہ جو“ اور اس نے جھک کر اس کی پیشانی پر چوم لی۔ وہ کھڑی اس کا منہ تک رہی تھی پھر ایک آن لپا۔

”اب میں تمہارے بغیر یہاں نہیں رہ سکتی، ایکس میں جی بہت گھبراتا ہے، خوفناک خیالات تلاتے ہیں۔ رات کو کوئی مرتبہ سوچ کر جاگ گئی۔“

”فاطمہ! اگر میں اب تمہیں اپنے ساتھ نہیں لے جا سکتا۔“

نزل میں ہر طرف بغاوت کی آگ بجھتی چلی ہے۔ گو شاہ حیدر آباد کو جملہ ہی اہلکلاٹ ہو جائے تھی لیکن وہ ابھی سہل

اس افنا کا جلات ان تھنوں اور کہاٹیوں سے

بھاگیا ہے جو نزل کی پہاڑی بستی میں منظم و پرس (مجید

”جہاں پٹنا ہمارے جاسوسی نظام کے ذریعہ جو

مملکت حیدر آباد کے طول و عرض میں جا ل کی طرح پھیلا ہوا

اس مرتبہ نہایت ہی اہم خبریں وصول ہوئی ہیں۔ جن

میں سب سے پہلے برگزیدہ نزل کے متعلق یہ کہ ابراہیم نامی

ایک نوجوان نے نزل میں حکومت کے خلاف رعایا کو اکسایا

ہے اور اگر اس طرف جلد توجہ نہ کی جائے تو بغاوت کا ارتداد

سراج حیدر آباد کے طبقہ امرا کا ایک مشہور فرد تھا

جس نے دربار آصف جاہی میں یہ کیفیت پیش کرنے کی

عزت حاصل کی۔

”ہم بہت جلد توجہ کریں گے سراج“ اعلیٰ حضرت نے

ارشاد فرمایا اس کے بعد دوسرے اور اہم معاملات پیش کئے۔

نزل، ایک پہاڑی بستی ہے، کئی تالاب دار کے کی

شکل میں اس کو گھیرے ہوئے ہیں، ان تالابوں کے سروں پر

چاروں طرف بیاہ دیو پھیل پہاڑ نزل کے سنتری کی

خدمات انجام دیتے ہیں۔ بائیس سال قبل سپاہیوں کا

ایک گروہ نزل آیا تھا۔

”یہ سامنے کو کسی بستی ہے؟“ سردار نے اپنے ساتھیوں

سے دریافت کیا۔ ”یہ بستی نزل کہلاتی ہے سردار۔“

بڑا ہی روح افزا مقام معلوم ہوتا ہے۔ بہتر ہے چند دن ہمیں

قیام کیا جائے۔“ بیستے ہی سبھوں نے یہیں سکونت اختیار

کر لی اور تجارت کو ذریعہ معاش بنالیا۔ ان کا شمار متمول

گھرانوں میں ہونے لگا۔ سردار کے گھر ایک لڑکا پیدا ہوا

جس کا نام ابراہیم رکھ گیا۔ ابراہیم نزل ہی کو اپنے اسلاف

کا وطن سمجھتا تھا۔

”وطنی مجلس“ کے صدر ابراہیم اور مجلس کی متفقہ طور پر

یہ رائے قرار پائی کہ نزل کے حکام کو سرزادی جانی چاہئے۔

اس لئے کہ شاہ وقت دوسرے کاموں میں مشغول تھے اور

ان حکام کو جیسے قید سے رہائی مل گئی۔ رشوت خانی کا بازار

متوجہ ہونے کے قابل نہیں ہیں۔ وہ آج کل سلطنت کے

دوسرے اور اہم معاملات میں الجھے ہوئے ہیں۔ پھر لہجہ بدلتا

”زل میں کل مابدولت کی رسم تاج پوشی منائی جائے گی

اور علامہ کی خدمت میں تحفے روانہ کئے جائیں گے۔ فاطمہ!

تم خواہ مخواہ افسردہ ہو رہی ہو۔ تمہیں تو خوش ہونا چاہئے۔

کل تمہارے ابراہیم کی رسم تاج پوشی ہے اور ہاں میں تو

یہ کہنا بھول ہی گیا کہ سال یا ڈیڑھ سال کے بعد ہماری شادی

بھی“ اور اس نے مسکرا کر فاطمہ کی طرف دیکھا۔

فاطمہ کے رخسار انگاروں کی طرح تپ رہے تھے۔

ابراہیم نے کپڑے اتارے اور چار پائی پیرسٹ گیا۔

فاطمہ اس کے لئے گلاس میں دودھ لے آئی اور اس نے

مسکراتے ہوئے اسے لے کر پی لیا۔ کچھ دیر آرام کے بعد وہ شخص

ہونے لگا۔ ستارے آسمان پر پھل آئے تھے۔ ان کی چھاؤں میں

دوؤں خراماں خراماں گھسنے لگا۔ پھر ایک جگہ رک گئے۔

”ہم بہت جلد میں گئے فاطمہ! ارے، تمہاری آنکھوں

میں آنسو پہنچ چکا ہے! کیا ہی کی بڑی اور آنسو فاطمہ! تم سپاہی

کی ہونے والی بیوی ہو“

اور فاطمہ کی آنکھیں جیسے ان آنسوؤں کو پی گئیں۔ ”اچھا!

اپ ذرا ہنس دو“ اس نے کہا اور وہ مسکرا دی۔ چاند بادلوں

کے پیچھے چھپ گیا۔

”ابراہیم ظفر الدولہ“ کی رسم تاج پوشی بڑے نزک، احتفام

سے منائی گئی اور خود تختہ کار کا اعلان کر دیا گیا، زل کے

پر رہنے والے کے چہرے پر مسکراہٹ تاج رہی تھی، مسکراہٹیں

قیقہ پہل پہل، فیت لٹا رہے، زل دہن کی طرح سجایا

گیا تھا۔

باضابطہ طور پر حکومتی نظام قائم ہو گیا۔ ایک ہی سال

کے اندر اندر رعایا خوش حالی کی زندگی بسر کر رہی تھی۔ اس کے

نارغ ہوتے ہی ابراہیم ظفر نے حفاظتی تدابیر شروع کیں

کیونکہ خطرہ روز بروز بڑھتا جا رہا تھا۔ تانہ آگنی بھڑوں

سے جنگ کا امکان قوی تر ہوتا جا رہا تھا۔

زل کے اطراف، خندقوں، قلعوں، موچوں وغیرہ کی

تعمیر شروع ہو گئی اور فوج میں بھرتی بھی تین چار ہجرتوں

کے اندر اندر تقریباً دس ہزار فوج باقاعدہ زل کی حفاظت

کے لئے تیار تھی۔

”جہاں پناہ! وہی ہو جس کا اندیشہ تھا، خدمت عالی

میں آج سے ڈیڑھ سال قبل یہ عرض کیا تھا کہ زل میں ابراہیم

ایک شخص رعایا کو حکومت کے خلاف بناتو کرنے کی ترغیب

دے رہا ہے اور اب وہی ”ابراہیم ظفر“ کے نام سے وہاں حکومت

کر رہا ہے۔ زل اس کا پائے تخت ہے ہمارے نمائندوں کو

قتل کروایا گیا ہے“

”بہت عالی ہمت شخص معلوم ہوتا ہے“ اعلیٰ حضرت نے

ارشاد فرمایا۔ ”حضور! باغی کو کیفر کردار تک پہنچانے کے لئے

غلام کو اجازت رحمت فرمائی جائے“

”یہ تو بہت معمولی سا کام ہے سراج! خیر ہم تمہیں

اجازت دیتے ہیں“ اور پھر دوبار ختم کرنے ہوئے سراج

سے مسکرا کر فرمایا ”اس کی رگوں میں بھی بہاؤ کا خون

معلوم ہوتا ہے سراج!“

ایک ہی بجھے میں سراج نے اپنی فوج کو تیار کر کے زل

کی طرف کوچ کیا۔ ابراہیم ظفر کو جاسوسوں نے سراج کی آمد کی

اطلاع دی اور زل میں بھی طبل جنگ بجایا گیا۔

سراج انتہائی تیزی سے تین ہی دن میں زل پہنچ گیا

اور دیہائے گوداوری کے دوسرے کنارے پر رٹاؤ ڈال دیا۔

دوسرے ہی دن ”شام گڑھ“ پر حمل ہوا۔ دن تمام خونریز لڑائی

ہو تی رہی۔ ایک طرف سے گوندوں کے بعد ہر نشان کن حملے

دوسری طرف شام گڑھ کے اونچے قلعے سے آتش باری سراج

کی فوج میں سراپٹ لگی کے آواز نمایاں ہونے لگے۔ رات ہو گئی

اور لڑائی دوسرے دن کے لئے ملتوی ہو گئی۔

دوسرے دن صبح سراج نے اپنے دو جرنیل اور دو مشیران

خاص ڈیروں میں مردہ پائے، بڑی جراتی ہوئی سراج نے خود

فوج کی کمان کی لیکن دوپہر ہونے پر تھک آتش باری پہاڑوں

کی گرمی اور سب سے زیادہ گوندوں کے عجیب طرز جنگ نے

سراج کو ہراساں کر دیا اور رات ہونے پر تھک سراج اپنی فوج

لے کر زل سے بھاگ رہا تھا۔ ابراہیم ظفر کے گوند پستان نے کئی

میل تک اس کا پیچھا کیا۔

اس توپچی کو ختم کر دو“ اور ایک افسران توپچی کی تاک میں لگا ہوا تھا۔ زنی جرنل جڑھ بڑھ کر چلے کر رہا تھا۔ قلعہ کی طرف سے آتشباری میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ ابراہیم ظفر کا بچہ کھیل گیا۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھا تاکہ دوسری طرف سے آتشباری تیز کرنے کا حکم دے۔

ٹھانیں!

آہ! اسد! دایس طرف کی آتش باری.....

اور تیز..... کر دو“

”جہاں پناہ! یہ کیا ہو گیا حضور کو“

”جاؤ! اسد! تم جاؤ..... پہلے جاؤ“

اور ابراہیم ظفر جسم سے زمین پر گر گیا۔

”میرے سرتاج!“

”کون..... فاطمہ..... میری فاطمہ.....“

تم یہاں کیسے آ گئیں.....“

لڑائی زوروں پر جاری تھی۔

”میرے سرتاج یہ کیا ہو گیا آپ کو؟“ اف خدایا.....

.....“

اور ابراہیم ظفر مسکرانے لگا۔

”فاطمہ! ہنو۔ ہنو، ایک بار.....“ میں بہادروں

..... کی موت..... مر رہا ہوں۔

فاطمہ! میں..... بہت خوش ہوں..... بہت“ اس کا سر

فاطمہ کی گود میں تھا۔ سیچنے سے ٹوٹ رہا تھا اور وہ مسکرا

رہا تھا۔

فاطمہ! وطن کی خاطر سب کچھ.....“

ایک ہی گھنٹہ بعد آصفی پریرچم“ بنیں گلو“ یہ رہا

رہا تھا اور ابراہیم ظفر..... اپنی محبوبہ کی آغوش میں

ابدی عیند سورا تھا۔

عبدالمجید (عثمانیہ)

منظر تھا، ابراہیم ظفر مجبور ہو گیا اور اس نے اپنی فوج کا بیشتر حصہ بتیں گردھ پہنچا دیا۔ شاہی فوجوں نے بتیں جھٹکا کا محاصرہ کر لیا۔

”حضور! صلح کر لینی بہتر ہے“ ایک فوجی افسر نے کہا

”جنگ جاری رکھو جبار!“

”جہاں پناہ!“

”یہ میرا حکم ہے“

”مگر حضور.....“

ٹھانیں اور جبار اس کی فوج کا ایک افسر زمین پر خون میں بوٹ رہا تھا۔

”ہم اپنے آخری قطرہ خون تک جنگ جاری رکھیں گے“

اسد!

”بے شک، جہاں پناہ“

”ہم بہادروں کی موت مرنا پسند کرتے ہیں“ ابراہیم ظفر خود چار دستوں کے ساتھ ایک سرنگ کے ذریعہ سے

شاہی فوج کے پچھلے حصے پر نمودار ہوا، شاہی فوج آسانی سے

گھبر گئی، شاہی کماندار پریشان ہو گیا۔ لیکن جلد ہی اپنی فوج

کو اس نے دو حصوں میں تقسیم کر دیا اور لڑائی نے شدت

افتیاد کر لی۔ ابراہیم ظفر اپنے ایک جرنیل کے سپرد یہ کام

کر کے قلعہ میں واپس آ گیا۔

”ادھ! تو بچی دیکھتے نہیں ہو، کیا کر رہے ہو؟“

وہ شیر کی طرح غرایا۔

”ہماری فوج کے اس حصے پر زیادہ دباؤ پڑ رہا ہے

توپوں کے دبانے اس طرف پلٹ دو، تم ہٹ جاؤ، گدھے بچم“

اور اس نے توپچی کی جگہ سنبھالی۔ آتشباری تیز سے تیز تر

ہو گئی، زنی جرنل جو میدان میں شاہی فوج سے مقابلہ

کر رہا تھا اپنی جگہ پر جما ہوا تھا۔

”قلعہ کی اس طرف کی توپ سے“ شاہی کمان دار

نے بائیں طرف اشارہ کیا۔ ”بہت زیادہ آتشباری ہو رہی ہے

جہاں فوج پریشان ہو رہی ہے، خدا نخواستہ کہیں۔“

وضع جسمانی

اس سے قبل کی تقریریں ہیں نے بچپن کے زمانے کی وضع جسمانی کی نوعیت کو ضروری تفصیلات کے ساتھ پیش کر کے اس کے اصلاحی پہلو کو واضح کیا تھا۔ آج کی تقریریں زمانہ بلوغ کی وضع جسمانی پر روشنی ڈالی جائے گی۔ میں اس امر کی توضیح کی کوشش کروں گا کہ زمانہ بلوغ زندگی میں کس قدر اہم ہے اس زمانہ میں وضع جسمانی کی پرورش کس نوعیت پر ہونی چاہیے اور وہ کون سے ایسے داخلی اور خارجی امور ہیں جو زمانہ بلوغ وضع جسمانی پر خوش گوار یا غیر خوش گوار اثرات مرتب کرتے ہیں اور جس سے جوانی اور ہیئرین اور بڑباپے کے زمانے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتے۔

بلوغ کا دور مختلف ممالک میں آب و ہوا کے لحاظ مختلف ہے۔ سرد ممالک میں بالعموم بچے ۱۹-۲۰ اور ۲۱ سال کے درمیان زمانہ بلوغ میں قدم رکھتے ہیں لیکن گرم ممالک میں بچے کسی قدر قبل ہی بالغ ہو جاتے ہیں۔ ہمارے یہاں بچے بالعموم ۱۶-۱۷ اور ۱۸ سال کے درمیان بلوغ کے دور میں آ جاتے ہیں اور لڑکیاں ۱۵-۱۶ اور ۱۷ سال کے درمیان بلوغ کے زمانے میں پہنچ جاتی ہیں جنسانی حالات کے علاوہ غذا اور اس کی نوعیت کا تعلق بھی بلوغ کے دور سے بہت زیادہ ہے۔

گرم سالہ دار اور چٹا ٹیٹا کھانے والے بچے اس سے بھی جلد زمانہ بلوغ کو پہنچتے دکھائی دیتے ہیں۔ قطع نظر اس تحلیلات کو بھی اس زمانے کے قبل از قبل آغاز سے زیادہ تعلق ہے۔ جنسی میلان اور اس کے متعلق معلومات کی فراہمی بچے میں نظر نا وجود ہے۔ انہی معلومات کے حصول میں اگر اس کی کھوج رہی رہے تو وہ خود اس کی کھوج میں لگا رہتا ہے۔ عام حالات اور اس کے نتائج کے اعتبار سے یہ کہنا بھلا ہوگا کہ کس قسم کی کھوج اور اس کے راست یا بالواسطہ کھوج کے طریقہ بالعموم گمراہ کن ہی ہوا کرتے ہیں۔ وہ تمام اعلیٰ اور

مقدس تحلیلات جو جنسی اعتبار سے دل اور دماغ میں پیش پانے چاہئیں ان کی بجائے وہ نفسانی خواہشات کا شکار ہو کر اپنی انسانی قدر و قیمت کو کھو بیٹھتے ہیں۔ اسی وجہ سے ہر مذہب میں بلوغ کے آغاز کے ساتھ ہی ہراسانہ پرندہ ہی پابندیاں حاکم کر دی گئی ہیں جنسی تعلقات کو اس مہلک ترین حالت میں واضح کئے گئے ہیں جس میں ذہنی لغزش ایک گناہ بکیرہ بن جاتی ہے۔ ہر حال اس خصوص میں میں تفصیلات میں جانا نہیں چاہتا بلکہ صرف اس قدر اشارہ کئے دیتا ہوں کہ بچے کے بزرگوں کا یہ فرض ہے کہ اس میں جنسی تحلیلات اور اس کی فراہمی کے طریقے اس پر ایسے ہیں جیسا کہ جس کے ذریعہ ایک پاک اور مقدس خیال اس کے دماغ پر مسلط ہو جائے تاکہ وہ گمراہی سے بچ سکے اور اپنی زندگی کو تباہ و برباد نہ ہونے دے۔ چنانچہ اسی خیال کے تحت ہر ترقی یافتہ ملک میں جو اپنے نوجوانوں کو سند رست اور قوی تر بنانا چاہتے ہیں، جنسی تعلیم ان بچوں کے لئے عام اور لازمی کر دی گئی جو زمانہ بلوغ کے قریب تر ہوں۔ غرض مجھے یہاں یہ بتانا مقصود تھا کہ قبل از قبل جنسی تحلیلات کی پیدائش سے بھی بلوغ کے زمانے کا آغاز کسی لڑکے یا لڑکی پر ہونے لگتا ہے۔

زمانہ بلوغ دراصل بچپن اور جوانی کے درمیان کا حد فاصل ہے۔ انسان تعیشات کے لامتناہی پیرے ہیں بزرگ یا معاشی تحلیلات کو پیش نظر رکھتے ہوئے اپنی زندگی کا مقصد کچھ ہی عین کر کے عین قدرت انسان سے کچھ اور ہی توقع رکھتی ہے۔ زمانہ بلوغ میں انسان میں جنسی میلان کی پیدائش قدرت کی جانب سے ہوتی ہے۔ اس میلان کو پورا کرنے کا یہ خفا ہے کہ انسان اس بات کی تباہی کرے کہ آئندہ اس کو ایک باپ یا ماں بنائے اور اس خصوص میں صحیح معلومات حاصل کرنے کی کوشش کرے تاکہ اس کی ہونے والی بود و توانا اور طاقتور ہو سکے۔

ابھی ہم نے بتایا کہ بلوغیت کا زمانہ تیاری کا زمانہ ہے۔

اگر ان کا قدم فٹ ۵ پانچ ہوتا تو ان کا معیاری وزن ۱۳۴ پونڈ ہو
 " ۵ " ۹ " " " " " ۱۳۸
 " ۵ " ۱۰ " " " " " ۱۴۲
 " ۵ " ۱۱ " " " " " ۱۴۶
 " ۶ فٹ " " " " " ۱۵۰
 یہ جو ۱۱ سال کی عمر والے بچوں کا معیاری وزن اب
 ہم ہر سال کی عمر والے بچوں کا ان کے قدم کے لحاظ سے معیاری
 وزن بتلاتے ہیں۔

اگر ان کا قدم فٹ ۱۱ پانچ ہوتا تو ان کا معیاری وزن ۱۹۰ پونڈ ہو
 " ۵ " " " " " " ۱۰۰
 " ۵ " ۱ " " " " " ۱۰۵
 " ۵ " ۲ " " " " " ۱۱۰
 " ۵ " ۳ " " " " " ۱۱۵
 " ۵ " ۴ " " " " " ۱۲۰
 " ۵ " ۵ " " " " " ۱۲۵
 " ۵ " ۶ " " " " " ۱۳۰
 " ۵ " ۷ " " " " " ۱۳۵
 " ۵ " ۸ " " " " " ۱۴۰
 " ۵ " ۹ " " " " " ۱۴۵
 " ۵ " ۱۰ " " " " " ۱۵۰
 " ۵ " ۱۱ " " " " " ۱۵۳
 " ۶ " " " " " " ۱۵۵

اسی طرح اب ہم ۱۵ سال کے بالغ بچوں کا ان کے قدم کے
 لحاظ سے معیاری وزن ظاہر کرتے ہیں۔ ۱۵ سال میں بالغ
 ہونے والے بچوں کا فیو بال ٹیم جوہر نامہ ہے ان کا قدم فٹ
 ۵ انچ سے کم نہ ہوگا اب ان کا بھی معیاری وزن بتائیے
 اگر ان کا قدم فٹ ۵ پانچ ہوتا تو ان کا معیاری وزن ۱۱۰ پونڈ ہو
 " ۵ " ۲ " " " " " ۱۱۵
 " ۵ " ۳ " " " " " ۱۲۵
 " ۵ " ۴ " " " " " ۱۳۱

اس زمانے میں وضع جسمانی میں کئی ایک تغیرات رونما ہوتے
 ہیں۔ بچوں میں نمو ہوتا ہے اس لئے اسی مناسبت سے گوشت
 میں اضافہ ہوتا ہے جسمی نظام پر بھی اس کا گہرا اثر پڑتا ہے۔
 گویا جسم اور دماغ ہر دو میں تغیرات رونما ہوتے ہیں۔ بلوغ
 کا زمانہ جس قدر مختصر ہے اسی قدر زیادہ اہم بھی ہے۔ اس کا
 میں اگر وضع جسمانی کی دیکھ بھال نہ کی جائے تو اس کا برا اثر
 جوائی اور اس کے بعد از بچپن اور بوڑھاپے پر ضرور پڑتا ہے۔
 دور بچپن میں سب سے پہلے وضع جسمانی کی جانچ کر کے فواد
 جسم کے وزن سے کی جاتی ہے۔ ماہران وضع جسمانی نے عمر
 کے لحاظ سے فواد وزن میں مختلف تجربات کی بنا پر خاص نتائج
 مقرر کر دیے ہیں جن کو کسی خاص حکم معیاری وزن کہا جاتا ہے۔
 معیاری وزن کی بڑی اہمیت ہے۔ اس سے وضع جسمانی کی
 مورد نشوونما کا اندازہ قائم کیا جاتا ہے۔ معیاری وزن
 کا تعلق بھی کسی مقام کی آب و ہوا اور غذا کی نوعیت پر
 منحصر ہے۔ اب چونکہ آپ کو اپنے ملک کی آب و ہوا اور
 نوعیت غذا کے ملاحظہ واضح کرتے ہیں کہ زمانہ بلوغ میں
 وزن کا مہیا کیا جائے۔ چاہیے سب سے پہلے تم آپ کو
 بتاتے ہیں کہ اگر کون کا معیاری وزن بڑھانے بطور عام عمر
 اور قدم کے لحاظ سے کیا جاتا ہے۔

۱۵ سال کی عمر والے بچے

اگر ان کا قدم فٹ ۵ پانچ ہوتا تو ان کا معیاری وزن ۱۹۰ پونڈ ہو
 " ۵ " ۱ " " " " " ۹۵
 " ۵ " ۲ " " " " " ۱۰۰
 " ۵ " ۳ " " " " " ۱۰۴
 " ۵ " ۴ " " " " " ۱۰۹
 " ۵ " ۵ " " " " " ۱۱۳
 " ۵ " ۶ " " " " " ۱۱۷
 " ۵ " ۷ " " " " " ۱۲۲
 " ۵ " ۸ " " " " " ۱۲۶
 " ۵ " ۹ " " " " " ۱۳۰

اپنے کا قدر رکھتی ہوں تو ان کا معیاری وزن ۹۰ پونڈ میرا
۵ فٹ کا قدر رکھتی ہوں تو ان کا معیاری وزن ۱۰۳ پونڈ میرا
۶ - ۱ فٹ کا قدر رکھتی ہوں تو ان کا معیاری وزن ۱۰۹ پونڈ میرا

۵	۲	"	"	"	"	۱۱۳
۵	۳	"	"	"	"	۱۱۵
۵	۴	"	"	"	"	۱۲۱
۵	۵	"	"	"	"	۱۲۴
۵	۶	"	"	"	"	۱۲۶
۵	۷	"	"	"	"	۱۲۹
۵	۸	"	"	"	"	۱۳۳
۵	۹	"	"	"	"	۱۳۶
۵	۱۰	"	"	"	"	۱۳۹
۵	۱۱	"	"	"	"	۱۴۲
۶	فٹ	"	"	"	"	۱۴۸

ہم نے زائد بلوغ اور اس زمانے میں بچوں اور
بچوں کا لحاظ معیاری وزن بتا دیا ہے۔ معیاری وزن
در اصل صحت جسمانی اور عموماً وضع جسمانی کا ایک معیار ہے اور
اسی سے کسی کی عمر کا بھی تخمینہ کیا جاتا ہے اسی وجہ سے اکثر میڈ
کینیڈاں جیسے وقت عمر اور وزن کے تناسب کا خاص خیال
رکھتی ہیں۔ فوجی خدمات کے سلسلہ میں بھی معیاری وزن کو
بطور خاص پیش نظر رکھا جاتا ہے۔ ہر حال اب ہم صرف زائد بلوغ
میں وضع جسمانی کے بعض حالات پر روشنی ڈالیں گے جس سے
وضع جسمانی کی نوعیت سمجھ سکیں گے اعتبار سے واضح ہو سکے
بلوغ کے دور میں جسم کے ہر حصہ میں ایک نیا بل تبدیل ہوتا
ہوتا ہے اور یہ تبدیلی خاطر غور اس وقت ہوتی ہے جب کہ اس
خصوصی طور پر خاص خیال رکھا جائے کہ اس کے صحیح نشوونما کے لئے
مناسب اور صحت بخش احوال پیدا کیے جائیں۔ اس میں سب سے
اہم غذا کا سوال ہے۔ انڈیا کو مشیت۔ چھللی۔ پھللی۔ جھکا پھل
زائد بلوغیت میں وضع جسمانی کے نشوونما میں بڑی مدد دیتے
ہیں۔ دودھ کا استعمال اس زمانے میں بچوں کو اگر کرایا

جائے تو ان کے عام نشوونما میں بڑی ترقی ہوتی ہے۔ غذا کے ساتھ
اس زمانہ میں درگوش کا سوال بھی بہت اہم ہے۔ بالعموم
اس زمانے میں عموماً جو بچہ کے دل میں جسمانی طاقت کے
حصول کا خیال پیدا ہوتا ہے۔ اب یہ دیکھنا کہ جسمانی توانائی
اور وضع جسمانی کو قوی کرنے کے لئے کس قسم کی ورزشیں کرانی
چاہئیں۔ ہم نے معیاری وزن بتا دیا ہے اس کو پیش نظر رکھ کر
اور یہ دیکھ کر کہ اپنا وزن معیاری سے کم ہے یا زیادہ کم ہونے
کی صورت میں ایسی ورزشیں کی جائیں جو عضلات اور اعصاب
کو تقویت پہنچا سکتے ہیں جن میں ضرورتاً لاتی ورزشیں بہت سود
مند ہیں۔ سیدی سادھی ورزشیں بہت زیادہ صورت کسی اہل
وضع جسمانی سے تیار کرانی چاہئیں اور اس کے حسب ہدایات ذرا
صبح و شام ان ورزشوں کو کرتے ہیں۔ البتہ اس سلسلہ میں
یہ ضرور یاد رکھنے والے بچے کیلوس میں
زیادہ حصہ لیں۔ ہر کی ورزشیں جو بہت کم تنگائی ہیں اور جن کو
بہت دیر کر سکتے ہیں کرتے رہیں۔ وزنی ورزشیں جو بہت جلد
تنگائی میں پہنچ کر تھک کر رہیں۔ کیونکہ اس قسم کی ورزشیں عضلات
اور اعصاب پر بار ڈالتی ہیں اور اس اہم قسم کے بار سے
ان میں ٹھکن زیادہ پیدا ہو جاتی ہے اور اس سے عضلات
اور اعصاب کے نشوونما میں رکاوٹ پیدا ہو جاتی ہے۔ بظاہر
انسان تو ایسی ورزشوں سے موافق تازہ دکھائی دیتا ہے
لیکن اس کا اردووان خون ہاتھ اور جسمی نظام پر بہت برا
پڑتا ہے۔ وقت سے پہلے ہی اعضا مگر وہ ہونے لگتے ہیں۔
اس میں کچھ شک نہیں کہ وزنی ورزشیں مثلاً ڈمبل۔ بار اور
رنگ اور انگار ڈنڈا اور بیٹیک انسان کے جسم کو بہت جلد
تیار کر دیتے ہیں۔ لیکن دیکھنا یہ ہے کہ انسان کو اس قسم کی
تیاری کی ضرورت ہے یا نہیں۔ بے ضرورت تیاری طے
سوائے نقصان کے اور کچھ نہیں۔ وزنی ورزشیں بھی اپنی
خاص خصوصیات اور افادیت رکھتی ہیں بیشیکہ ان سے مناسب
اور ضرورت کے لحاظ سے فائدہ اٹھا جائے۔ جسم کی تیاری کا
مفہوم عموماً معیاری وزن رہے۔ اگر آپ کو اپنا معیاری وزن

موٹا یا نہ صرف وضع جسمانی کو بگاڑ دیتا ہے بلکہ ایسے وضع جسمانی کی تمام کیفیات اور خیالات بھی کچھ نہ کچھ بعداً بن ضرور ہوتے ہوئے ہیں۔

زمانہ بلوغ میں وضع جسمانی کی تعبہ میں متوازن فضا اور سوزوں و زرشوں کے علاوہ عادات کو بھی زیادہ دخل حاصل ہے۔ اس زمانہ میں اکثر یہ دیکھا جاتا ہے کہ بچہ اپنے آپ کو بچہ کہ سمجھنے لگتا ہے اس میں عقل بزرگ کا تصور زیادہ پیدا ہو جاتا ہے وہ سمجھتا ہے کہ اس کے بڑے یا بزرگ کیا کرتے ہیں۔ انہی تصور میں وہ اپنے بڑوں کی عادات کو دیکھ کر اپنی عادات کو حاصل کرنے میں کوشاں رہتا ہے۔ یہ جاری بدقسمتی ہے کہ ہم جو اپنے آپ کو بچوں کے بزرگ و سرپرست سمجھتے ہیں کئی ایک ناقص عادات میں پھنسے ہوئے ہیں۔ ہمارے کھانے پینے، اٹھنے بیٹھنے کی عادات میں صحت نہیں ہوتی۔ اس خصوص میں میں نے اس سے قبل کی تقریروں میں بہت کچھ تو وضع کی ہے لیکن زمانہ بلوغیت کے اعتبار سے بچوں کو جن عادات سے باز رکھنا ہے ان میں سگریٹ نوشی جانے نوشی، پان کا استعمال بہت پیش پیش ہیں یہ عادتیں صحت بخش کچھ نہیں۔ یہ بظاہر کچھ لطف آتا ہے لیکن اس لطف کے پس منہ کئی آفتیں نہپاں ہیں۔ ان عادتوں سے وضع جسمانی اور اس کی صحت بخش حالت پر کافی برا اثر پڑتا ہے۔ بلوغ جو تیاری کا زمانہ ہے اس میں افکار پیدا ہو جاتا ہے۔ ان عادتوں کے متعلق تفصیل سے بیان کر کے یہاں تجاویز نہیں۔ لیکن اس قدر بیان کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ ان عادتوں سے جنسی تعلقات میں ضرور پیا جاتا ہے اور ایسی جنسی تعلقات کو دیکھ کر بچہ پیدا ہو جاتی ہیں۔ اس کے علاوہ لباکس کی وضع قطع بھی اس زمانہ میں خاص اہمیت رکھتی ہے۔ جہاں تک ہو سکے تک کپڑے نہ پہنے جائیں۔ لڑکیوں کا کد سے زیادہ بناؤ نگار کو خیال، اور بچی لڑکی کے جوتوں کو متواتر استعمال ان کی تدریجی جنسی حالت میں رکاوٹ دیتے گا

لی گاتوہ کھیلے کہ آپ نے وضع جسمانی کی پوری قابلیتوں کو حاصل کر لیا ہے۔ کم وزن کھنے والے وضع جسمانی میں کئی نقائص پیدا ہوتے ہیں۔ بالخصوص زمانہ بلوغ میں بنیادی پر اثر ہوتا ہے۔ جو کہ از جانی ہے۔ دماغی کاموں میں دل نہیں لگتا۔ ساتھ بچہ کچھ ایسا ویسلی ہوتا ہے۔ قوت مدافعت میں فتور آ جاتا ہے۔ نفسی اعتبار سے بچاں میں کئی ایک خرابیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ چڑچڑاہن پیدا ہونے لگتا ہے۔ بار بار معمولی باتوں پر غصہ آئے لگتا ہے۔ صبر و تحمل و طبیعت میں استقلال بہت کم رہتا ہے۔ جب جسمانی اور دماغی اعتبار سے انسان اپنی کمزوریوں کو محسوس کرنے لگتا ہے تو اس میں ایک عام طبیعتی رد و نما ہونے لگتی ہے جس سے اس کے آئندہ دور زندگی کے مسائل میں بڑی بڑی رکاوٹیں پیدا ہونے لگتی ہیں بالآخر وہ ایک کمزور شخصیت کے تحت ایک ناقص زندگی بسر کرتے رہ جھوڑ ہو جاتا ہے۔ اس طرح معیاری وزن کے اعتبار سے جن کا وزن زیادہ ہو وہ اور بھی زیادہ توجہ کے قابل ہیں اگر وہ اپنی کوشش میں رکھا جائے تو نہ صرف بظاہر وضع جسمانی صحت مند ہونے لگتی ہے، بلکہ اس میں خرابیوں کا ایک ایسا علاج ملتا ہے کہ سلسلہ کالم ہو جاتا ہے۔ جو بچے کو بڑا بڑا اثر قوت مضامہ پر پڑتا ہے۔ تدریج خوراک کم ہونے لگتی ہے۔ پانی زیادہ پیا جاتا ہے۔ دوران خون اور اعصاب پر زیادہ باؤ پڑتا ہے۔ ایسی حالت میں جسم کا اندرونی اعضا جیسا کہ دماغ سے براہ ہر کرباوت کر لیتے ہیں ذیابیطس، خون کا باؤ، نیز نظام ہاضمہ اور دوران خون سے متعلق جو امراض ہیں تدریج حوالہ دے رہے ہوتے جاتے ہیں اور زمانہ بلوغ میں اگر مرنائی پر قابو پایا جائے تو آئندہ وہ کئی ایسی صحت کے امراض سے سالق نہ پڑے گا جو بچے معیاری وزن سے زیادہ وزن رکھتے ہوں وہ غذا کے معاملہ میں بہت ناخداہ کریں۔ ترکاویں اور پیوں کا استعمال زیادہ کریں۔ پانی کم پیئیں۔ پسینہ آور ورزشیں اور کھیل زیادہ نہ پیئیں۔ پانی لے لے تھوڑی بہت وزن میں ورزشیں موزوں ہوتی ہیں لیکن ہلکی ورزشوں کے ساتھ ان ورزشوں کو ملا کر کریں۔ بہر حال

باعث ہوتے ہیں۔ زمانہ بلوغ میں سب سے اہم بات جو وضاحت طلب ہے اس زمانے کی شادیاں ہیں جو زمانہ بلوغ میں وضع تھی کی ترقی میں سدراہ ہوتی ہیں۔ کم عمری میں شادیوں کے باعث وضع جسمانی کا پورا نشوونما اپنی جگہ رک جاتا ہے۔ ایک تو خود اپنی وضع جسمانی کی بربادی ہوتی اور دوسرے وقت سے پہلے اولاد ہونے کے باعث نیچے اتنے کمزور اور ناقص پیدا ہوتے ہیں جو بہ مشکل زندہ رہتے ہیں۔ اگر زندہ رہ بھی گئے تو کمزور

اور ناقص۔ ظاہر ہے کہ ایسی کمزور وضع جسمانی رکھنے والے نیچے آئندہ قوی ترقی میں کیا خاک ہاتھ لیا میں گئے۔ عرض ضرور اس امر کی ہے کہ ہم اپنے اولاد اور اولادوں کی نگہداشت بلوغ کے زمانے میں خاص طور سے کریں تاکہ وہ آئندہ ایک صحت مند ماں اور باپ بن کر طاقفور اولاد پیدا کریں۔

(لاسلکی نشر گاہ جیٹا آباد سے پڑ گیا)

مغربی اللہ

حسین گماں!

دھیمی دھیمی ہے ہوش کی تغذیل
آؤ نگاہوں میں کچھ ضل سا ہے
ہو رہی ہے جنون کی تکمیل
ہر عمل میرا بے عمل سا ہے

(۲) تیرے ان زگسی کٹوروں میں
میرے ماضی کا خون چھلکتا ہے
اور ان سرخ سرخ ڈوروں میں
ایک آنچل ہے جو بھلکتا ہے
میری زینت کا سرخ سرخ آنچل
اس کے شانوں پیوں سرکتا تھا
جس طرح زینت کا نقاب اٹھے
اور وہ مرمیں گداز سا جسم
مغمم کیفیت، مست ناز سا جسم

میری ہاتھوں میں یوں سرکتا تھا
جوں ترپ کر حسیں جا بٹھے
میری امید ہو گئی بے کل

(۳) ہو رہا ہے گمان پلکوں پر

دل شکن، دلفروز پلکوں کا
تیری جادو بیان پلکوں پر
ان نیکی دراز پلکوں کا

(۴) تیری نظریں میں موج ہائے جنوں

اے مری نگہار، زندہ باد
پوچھ مت مجھ سے میرا حال بول
اے سراپا بہار، زندہ باد

تنگی اور بھی ہو جس سے فزوں

وہ نظر بار بار زندہ باد افسردہ

انديرا

بازار سے گلال اور کاغذ کے گجڑے خرید لیا۔ اس نے اپنی شادی کی
 ساڑھی پہنی۔ سوت کی موٹی سبز ساڑھی اس کے ہاتھوں میں پھیل
 کے دو کھڑے تھے۔ یہی اس کا زور تھا۔ رامنو نے اپنے لائے کھڑے
 گجڑے اسے پہنا دیئے اور خود بھی ایک اپنے گھٹن میں ڈال لیا۔ اس
 کے جوہڑیوں سے بھی مرد اور عورتیں نکل آئیں اور سب نے ہر
 ہنسی مہکسی پر چرخہ تین ہنسی کا گیت گائے۔ عین زیادہ رات گئے۔
 یہی چنگامہ اور جھرب پڑی اپنی جوہڑیوں کی طوط دایں آئے۔
 دوجی ہٹکی ہوئی اپنی جوہڑی میں داخل ہوئی۔ رامنو نے پیچھے
 سے آکر اس کے چہرے پر گلال مل دیا۔ سبز سبز گلال چٹا کے
 شعلوں کی طرح۔

مکان کا کام تیزی سے ختم ہو رہا تھا۔ رام کو جو ضروری
 کی ضرورت تھی، آخراً اسے ایک گاڑی میں ڈکری لی گئی اور پہلے
 کی طرح وہ سات تیس رہ سکے۔ وہ کہیں اور ضروری کے لئے جانے
 بھی شام میں دوپہر ساٹھ کر لوٹتے۔

را مواب پہلے عیسیٰ مسیحؑ سے نہ اٹھا، گرنے کے کیفیت ہمیں
 سے اس کی سمت خراب ہو گئی تھی۔ وہ رات بھر کھانسی سے پریشان
 رہتا تھا اس کے نئے زیادہ سے زیادہ ضروری کرتی۔ تاکہ رات کو کھانسی
 طرح علاج ہو سکے۔ وہ اپنے بھیل کے کمرے میں کس کا علاج کر دیتی
 رہی عروس کی حالت گرنے ہی گئی۔

ایک دن وہ اس گھر میں گئی جس کے نائے میں ان دونوں
 بھی حصہ لیا تھا۔ وہاں کہ سے انھیں مل کر قبی اس کے گھر میں کے مہمان کے
 کے لئے کچھ روپیہ قرض دے کر اسے نکال دیا۔ اس نے جا کے
 سنا۔ اس کی ناکہ کھڑی تھی۔ ابھی پہنچا بلکہ کو بھی ان کو ان کے
 غلامت سے دھڑا کر رکھا ہے۔ ان کی یہ سوسیدہ غلامی بھر پڑا۔ اور
 ان سے ہر وقت نکلتا ہوا شیفٹ دھواں ساری دنیا خراب ہو جاتا ہے۔
 وہ مالیاں نہ کرنا کا کوٹ آئی۔ وہ سوچتی یہاں کی آئے ہوا
 بہتر نہ جاتی تھی۔ یہ گھر اس کو کبوں اس سے نالہ نہیں سنا۔ اس
 جی اثر ان کو گوں پر پڑتا ہے جو دولت مند ہیں۔ اچھی غذا اور اچھی
 پھر وہ رامو کے لئے کرے۔ وہ سوچتی ہی ہو گئی اور وہ اسے کہتے

ہولی آئی اور شمش جگ ملیں چلی کے دن رامو کے لئے وہ چھڑک مل گیا۔ وہ اس کا بوجھ سنبھالنے کے لئے نہ سہا۔ اس نے گلاب اور انھیں جتنے کے لئے چھڑک ملے تھے انھیں گرا دیا تھا۔ ایسا ہی وہ انہیں اس کی زندگی پر بھی چھڑکنا چاہتا تھا۔ مرنے کے لئے اسے نہیں مل رہا تھا۔ وہی جانے جیسے ہاتھی کی سلاخی ہوئی اس کا بوجھ تھا۔ وہ کہہ کر دوسرے کے ساتھ گری کرنا کہتا تھا۔ مگر وہ انہیں سے چھٹنے کے لئے نہ رہا۔

دور سے دھیرے کی لٹکاک آواز برابر کانوں میں بجتی تھی۔ نہ جانے کس کی اچھی بھئی۔ لوگ آہستہ آہستہ قدم اٹھانے کی نشان دہی کرتے جا رہے تھے۔ سب کے چہرے موت کے غولت سے زرد تھے۔ ایک حرکت کر بھی جائے سسکیاں لیتی جیازے کے ساتھ ساتھ جاری تھی۔ دم بدم اس کی سسکیاں تیز ہو چکی تھیں۔ یہ بڑھتی۔ دکھوں کی ماری غریبہ عزت۔ اس کے ساتھ ہی اس کا بچہ ہانڈی میں آگ کے کنارے جا تھا۔ اداں نہیں جانتا تھا کہ آگ کس لئے لجا رہی ہے۔ وہ ادنیٰ دھڑکی ہوئی ان کے ساتھ خاموشی مل رہی تھی۔ گریب اس کے باپ کی کوسلی پڑیوں کو آگ سے جلا کر خرچ ہو جاتا تھا۔ آٹھوں پر پتہ لگا رہا کہ کچھ نہ لگا۔ حور نے آگ کے بڑھ کر حلدی سے اسے گود میں اٹھا لیا اور سینے سے لگا کر زور زور سے رونے لگی۔ یہی اب اس کا سہارا تھا۔ جو اس کے سینے سے لگ کر خاموش ہو گیا۔ اچھی چٹنا کی طرف دیکھا۔ لوگ سر جھکا کر خاموش کھڑے تھے۔ مشغول کے کہ وہ بیان اسے اب بھی رام کو کھانا ملتا ہو اجسم نظر نہ آتا۔ صرخ صرخ مشغول اپنے اس گز رہے ہوئے دن یاد دلادیتے اور وہ باقی کی یادیں کھو گئی۔

وہ تھی بخیا بیاد ہو کر تھی قہری، دن بھر وہ اور راموہ
ساتھ لاکر گئے۔ بجارہ بڑ پرستے سے مکان بن گئے اور ورنوہ
کی بہت ضرورت تھی۔ وہیں ایک بیکانہ دو نوں کو کام مل گیا تھا۔ محلہ
میں ہانک سے تھڑی سی بگ ہانک کر رہی جھوپڑ بنائی تھی۔ صبح ہی
صبح بیوی بچہ آواز سن کر وہ محلہ بیکانہ کی طرف روانہ
ہو جاتے۔ اور دن بھر ساتھ لاکر گئے۔ ایک دو برس کے قریب پہنچے
سے انھیں کچھ زیادہ محنت محسوس نہیں ہوتی۔ دو نوں میں سے
ہوئے لاکر گئے۔ کبھی راموہ شہادت سے اس کے کان میں کہہ
دیتا اور وہ شہر کا سرھٹکا لیتی، اسی طرح دن آہستہ بہتہ گر جاتا
اور شام میں وہ دو نوں کو لیتے۔ وہ کان پکانے تھی اور راموہ
سے کھینچ لیتا۔ - دن بڑی گزرتے رہے۔

ہوئی آتی اور آسمانیں جاگ اٹھیں جھٹی کے دن رامو
اس نے گائیں اور پراٹھیں جتا کے شعلہ بجھ چکے تھے
بھی تھا گیا تھا اور ٹپو نے کے باجوہ سے رستہ نہیں ل
تھام لے اور کچھ دو فوٹس ایکٹھ سے کچھ زندگی کا رستہ

تفہیم و تبصرہ

اسلام کے معاشی تصور

حیدر آباد دکن - قیمت ۳ روپے ۸/۱۲
۱۲ روپے ۸/۱۲
۱۲ روپے ۸/۱۲

غلام دستگیر رشید صاحب نے بائیس مقالوں کو ایک کتاب کی صورت میں ترتیب دیا ہے۔ ہر مقالہ اپنی نوعیت میں اہم اور قابل غور ہے۔ آج کل کے مخصوص موضوعات اور اسلامی نظام پر اسے نو قیمت دیتا ہے۔ البتہ قیمت نے اس مجموعہ کی اشاعت سے اس غلط فہمی کو دور کرنے کی کوشش کی ہے۔ ہر مضمون میں اس کے معاشی نظام کے مختلف پہلوؤں پر بحث کی گئی ہے۔ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی، مولانا عبد الماجد دریا بادی، مولانا حبیب الرحمن خان، شروانی مولانا ابوالکلام آزاد، ڈاکٹر عبداللہ اور علامہ انصاری کے مضامین میں اشتراکیت اور اسلام کا بہترین موازنہ موجود ہے۔ مسلمانوں کو موجودہ معاشی پینڈوں کا حل ڈھونڈنے کے لئے اس کتاب کو رہبر بنا لیا جائے۔

اسلام کے سیاسی تصور

حیدر آباد دکن - قیمت ۳ روپے ۸/۱۲
۱۲ روپے ۸/۱۲
۱۲ روپے ۸/۱۲

اسلام نامہ آج کل باتصور

حیدر آباد دکن - قیمت ۳ روپے ۸/۱۲
۱۲ روپے ۸/۱۲
۱۲ روپے ۸/۱۲

رسالہ آج کل اردو کا پندرہ روزہ رسالہ ہے۔ اس رسالہ کی مقبولیت اس امر کی شاہد ہے کہ رسالہ عام فہم اور دلچسپ اس میں معلوماتی مضامین خاص طور پر شائع کئے جاتے ہیں۔ مستند اور مشہور لکھنے والوں کے مضامین بھی سالانہ میں موجود ہیں۔ غرض ادبی اعتبار سے تو یہ رسالہ بہت بلند نہیں لیکن معلوماتی لحاظ سے یہ ہندوستان کا واحد مفید رسالہ ہے۔ زیر نظر سالانہ میں تاریخی، سوانحی، تعلیمی معاشیاتی مضامین انسانی کڑات اور انٹیلیجنٹ سبب ہی شامل ہیں۔ زبان عام فہم ہے۔ ہر رنگ و مذاق کے مضامین موجود ہیں۔

ترجمہ اول - احمد نادر - قومی دارالاشاعت بمبئی

”نئی صبح“ ایک روسی اضافہ کا ترجمہ ہے۔ اضافہ نیالی نہیں زندہ حقیقت ہے۔ اس میں ایک روسی عورت کی داستان حیات ظہیر کی گئی ہے جس نے انقلاب میں مردوں کے برابر حصہ لیا اور اپنی عزت اور حوریت کی قربانی قومی آزادی کے لئے کی۔ انقلاب سے پہلے اور بعد کی روسی زندگی کا اچھا مطالعہ ہے۔

ابو جعفر منصور

تاج پور - نامور - جم ۱۵ ص ۱۵
تاج پور - نامور - جم ۱۵ ص ۱۵
تاج پور - نامور - جم ۱۵ ص ۱۵

”ز س“

نتیجہ امتحان اردو دانی (دوم) بابۃ

- ۱۲۵۔ محمد عبدالغفور
۱۳۱۔ میر حسن علی
۱۳۲۔ محمد خواجہ
۱۵۰۔ سید افضل
۱۶۱۔ شیخ بوکر بنائیل
۱۶۴۔ احمد اویسر
۱۶۹۔ حسن
۱۷۲۔ غلام مدانی
۱۹۱۔ کنیزہ عاٹشہ
۱۹۲۔ محمد یعقوب
۲۰۳۔ محمد بک
۲۰۸۔ محبوب شریف
۲۱۴۔ دیا شکر دویدی
۲۱۶۔ سید انعام
۲۱۹۔ دوست خاں
۲۲۰۔ حبیب العزیز
۲۲۳۔ حبیب پیر پشاد
۲۹۷۔ محمد عرفان
(کامیاب)
۱۹۔ رام
۲۰۔ محمد عبدالرحیم
۲۳۔ شیخ چاند
۲۷۔ محمد حفیظ شاہ
۳۰۔ محمد عبدالجبار
۳۲۔ محمد حسین
۳۳۔ شیخ ساج الدین
۳۴۔ سید حسین

(کامیاب با امتیاز)

- ۲۱۔ نور احمد
۲۲۔ عبدالعزیز خاں
۲۳۔ محمد عثمان
۲۶۔ محبوب خاں
۳۱۔ چندر ناتھ پشاد
۳۸۔ احسان انصاری
۴۹۔ امتیاز حسین خاں
۵۱۔ شام سندر
۵۹۔ سید سلطان محمد الدین
۶۲۔ عبدالحق خاں
۶۳۔ مسعود علی خاں
۶۹۔ عبدالحفیظ
۷۰۔ امین خاں
۷۶۔ محمد عبد الرحیم
۸۰۔ مسعود خاں
۸۱۔ محمد اسلم
۸۷۔ احمد حسین
۸۸۔ دار کھنڈے سنگھ
۸۹۔ رنجیا
۹۴۔ شیخ ابیہیم
۱۰۲۔ شیخ محبوب
۱۱۵۔ نثار ان سنگھ
۱۱۹۔ خیر الرشید
۱۲۱۔ محمد فاضل
۱۲۲۔ سید غوث
۱۲۴۔ محمد پاشاد

حسب ذیل امیدواروں نے علی الترتیب

- سب سے زیادہ نشانات حاصل کیے۔
۲۱۴۔ دیا شکر دویدی اول (بلدہ فوج)
۳۷۸۔ شوکت جہاں بیگم دوم (نظام آباد)
۱۶۱۔ شیخ بوکر بنائیل سوم (بلدہ فوج)

لیجاند رول نمبر

مرکز بلدہ (اماش)

(کامیاب با امتیاز)

- ۳۔ محمد بیگم
۴۔ غوثیہ بیگم
۵۔ مریم بی
۷۔ ہاجرہ بی
۸۔ رابعہ بی
(کامیاب)

۱۔ کنیزہ عاٹشہ

۹۔ صالحہ بیگم

مرکز بلدہ (ذکور)

(کامیاب)

- ۱۰۔ محمد حسین
۱۱۔ محمد عبدالوہاب انصاری
۱۲۔ رام سواری
۱۴۔ حیات خاں
۱۵۔ ٹوٹی سستی رام
۱۶۔ ابوالحسن محمد ریاض الدین
۱۷۔ جے رام ناتھ
مرکز بلدہ (فوج)

۱۳۷۔ غوث الدین	۸۵۔ شیخ علی الدین	۲۵۔ محمد احمد
۱۳۸۔ انور خاں	۹۰۔ ہمایوں	۳۶۔ سید رسول
۱۳۹۔ غلام حسین	۹۱۔ محمد شہاب الدین	۴۰۔ عبداللطیف
۱۴۱۔ رام ارتھ پرشاد	۹۲۔ گارگین	۴۹۔ سلطان حسن
۱۴۳۔ نذیر احمد	۹۳۔ طاہر علی	۴۲۔ سید انجم
۱۴۵۔ وحید الدین	۹۵۔ عبدالوہاب	۴۳۔ محمد جبار سید
۱۴۷۔ سرو خاں	۹۶۔ مشتاق حسین	۴۴۔ سید نور الدین
۱۵۱۔ عوض بن خدیجی امیل	۹۷۔ حاجی خاں	۴۶۔ غلام مصطفیٰ خاں
۱۵۲۔ عبدالقادر صاعری	۱۰۰۔ مرزا قیصر بیگ	۴۸۔ غلام محمد بن علی
۱۵۳۔ عربا محمد	۱۰۱۔ محمد ابراہیم	۵۲۔ خواجہ ستار
۱۵۴۔ سید بھدائی	۱۰۳۔ محمد یعقوب	۵۳۔ قور محمد
۱۵۵۔ احمد علیس	۱۰۴۔ محمد رفیع الدین خاں	۵۵۔ سید سہیل
۱۵۶۔ علی مکی	۱۰۵۔ ابراہیم بن سعید	۵۶۔ محمد عبدالرحیم
۱۵۷۔ سالم بلشرم	۱۰۶۔ علی احمد	۵۷۔ امین الدین خاں
۱۵۸۔ حبیب عبدالرحمن بھدائی	۱۰۸۔ عبدالبار خاں	۵۹۔ محمد رفیع الدین
۱۵۹۔ حبیب خاں	۱۰۹۔ محمد عظیم الدین	۶۰۔ ملک عثمان علی خاں
۱۶۰۔ محمد خاں	۱۱۰۔ محمد رفیع الدین	۶۱۔ حبیب الرحمن خاں
۱۶۲۔ عامر باجرائی	۱۱۱۔ شادرا خاں	۶۲۔ یحییٰ شریف
۱۶۳۔ احمد بھدائی	۱۱۲۔ عبدالحکیم	۶۵۔ محمد عبدالقادر
۱۶۵۔ محمد بادشاہ	۱۱۳۔ محمد حنیف	۶۶۔ احمد خاں
۱۶۷۔ صاحب مشال	۱۱۵۔ سلطان امین خاں	۶۸۔ قیصر احمد
۱۶۸۔ احمد باجوہ	۱۱۶۔ شفا خاں	۶۹۔ محمد حسین
۱۶۹۔ قیصر حسین	۱۱۷۔ سید رسول	۷۰۔ محمد امین
۱۷۰۔ عبدالمؤمن	۱۲۰۔ محمد مولانا	۷۱۔ عبدالمجید خان
۱۷۲۔ محمد	۱۲۳۔ کے کے جوت	۷۵۔ شیخ عبدالقادر
۱۷۳۔ سید	۱۲۰۔ غلام رسول	۷۷۔ محمد عبدالرحمن
۱۷۴۔ عمر	۱۲۵۔ محمد ابراہیم	۸۰۔ محمد خاں
۱۷۶۔ عبدالحق	۱۲۳۔ محمد نظام الدین	۸۲۔ محمد عبدالحمید
۱۷۷۔ عبد القادر	۱۳۵۔ محمد عبدالوہاب	۸۳۔ شمس الدین
۱۷۸۔ محمود	۱۳۸۔ محمد اسحاق	۸۴۔ محمد سلطان

۲۴۵۔ گشتیا	۲۴۳۔ علی کوانا	۱۸۱۔ شیخ نظام الدین
۲۴۶۔ سید شہزادہ مورتی	(کامیاب)	۱۸۲۔ ولایت خاں
۲۴۸۔ ایم بالسیا	۲۲۶۔ جعفر خاں	۱۸۸۔ محمد جہانگیر
۲۴۹۔ سید اختر علی	۲۲۸۔ جوزف	۱۸۹۔ عبدالعزیز
۲۵۰۔ یوپیو راسیا	۲۲۹۔ جوزف رودات	۱۹۵۔ محمود علی
۲۵۱۔ اندیسہ نریا	۲۰۳۔ زیتل	۱۹۶۔ محمد خاں
۲۵۲۔ وی۔ نارائن	۲۲۲۔ شہباز خاں	۱۹۷۔ غوث الدین
۲۵۳۔ دی چٹیا	۲۳۵۔ شیخ محبوب	۱۹۹۔ علی بن محمد بانی
۲۵۴۔ نور محمد خاں	۲۳۰۔ شیخ محبوب	۲۰۰۔ نرسیا
۲۵۵۔ بی ایم بالیا	۲۳۹۔ عبد المجید	۲۰۱۔ محمد امام الدین
۲۵۶۔ سائل کنگیا	۲۳۹۔ محمد قسطل	۲۰۲۔ محمد عبداللہ
۲۵۷۔ بخارا پاپا	۲۵۰۔ محمد مولانا	۲۰۵۔ سید یوسف
۲۵۸۔ دشتا شہم و بھل	۲۵۵۔ مختار احمد خاں	۲۰۶۔ بندہ علی
۲۵۹۔ موٹا کمری دشتا شہم	مرکز دوم کنڈہ (ذکور)	۲۰۹۔ شیخ جعفر
۲۶۰۔ ایم نارائن	(کامیاب بہ اختیار)	۲۱۰۔ محمد حسین
مرکز دوم کنڈہ (نات)	۲۰۶۔ پیڑھری سیتا رام مورتی	۲۱۱۔ شیخ معین الدین
(کامیاب بہ اختیار)	۲۶۰۔ ڈی۔ سدا	۲۱۳۔ محمد بلین
۲۶۲۔ بی۔ بی۔ سولید بانی	۲۶۸۔ پیڑھری بلام مورتی	۲۱۵۔ محمود علی
مرکز ہائر کمری (ذکور)	(کامیاب)	۲۱۶۔ فیاض علی
(کامیاب بہ اختیار)	۲۶۰۔ سعید	۲۱۸۔ سید چاند
۲۶۳۔ محمد احمد شہ	۲۶۱۔ گشتیا	۲۲۰۔ محمد غوث
۲۶۴۔ نور عبد الرحیم	۲۶۲۔ سری بھاشم	۲۲۳۔ گوپال جی
۲۶۹۔ سید وزیر الدین	۲۶۵۔ سیتا نارائن رائے	۲۹۳۔ محمد عبدالرشید
(کامیاب)	۲۶۶۔ پوری نامیا	۲۹۴۔ کریم خاں
۲۹۲۔ محمد عبدالعزیز	۲۶۸۔ دیکھتہ بھوشم	۲۹۵۔ محمد اسماعیل دوم
۲۹۶۔ محمد مظفر الدین	۲۶۹۔ دینی دیریا	۳۱۶۔ محمد غوث الدین
۲۹۹۔ خواجہ اسماعیل	۲۶۱۔ گوتہ بالپ	۲۹۸۔ نارائن سنگھ
۳۰۰۔ عبدالحق	۳۰۲۔ نرسووال رائے	۳۰۰۔ عبدالمجید خاں
۳۰۱۔ سید غیاث الدین	۳۰۲۔ ایوان نرسیا	مرکز بمبئی
۳۰۲۔ شیخ داؤد	۳۰۲۔ آسانی رالو	(کامیاب بہ اختیار)

ادارہ ادبیات اردو کی پچھلے ادبی کتابیں

اس مجموعے کی اشاعت سے جویداد و شاعری میں ایک گراں قدر اضافہ ہوا ہے، صفحات ۶۸ قیمت ۱۰/-
امیر خان جذب - (عالم پوری) ایک باعزت کا مجموعہ ہے۔ اس کے ذریعہ سے سنسکرت اور بھاشا کی شاعری کے اطلاقی اور ناصحانہ پہلو کو اردو میں متعارف کیا گیا ہے۔ اکثر باعزت شعرات اور بھاشا کے شعرا کے خیالات کا عکس ہیں اور بعض خود ان کے دل و دماغ کی مستحضر کاوش کا نتیجہ ہیں۔

سادگی، سلاست، خیالات کے طبعی ہونے اور طرز بیان اس قدر سادہ اور بے تعلقت کے معمولی کچھ کہ انسان بھی سمجھ سکے۔ ہر رباعی دل کی دھڑکن ہے جو شعر مجموعہ کی گنجی ہے۔ ابتدا میں جناب ناصر القادری صاحب کا ایک لہجہ اور معلومات آفریں مقدمہ ہے جس میں انھوں نے سنسکرت اور ہندی شاعری پر روشنی ڈالی ہے۔ صفحات (۱۲۰) قیمت مجلد ۱۰/-

ماہ لقا - یہ مولوی عزیز احمد صاحب کی اسے آئندہ (لند) پروفیسر انگریزی جامعہ عثمانیہ و مہتمم شاعر ادبی درگاہ کی طویل نظموں کا مجموعہ ہے جن میں یورپ کی شاعری کے مفید اثرات جلوہ گر ہیں۔ جدید یا نثری بنیاد اردو شاعری کے دلدادہ اس کا صریح مطالعہ کریں۔ صفحات (۱۰۰) قیمت ۵/-

فیض سخن - میر تقی میر الدین غازی صاحب اردو شاعری کے فیض سخن - مملکت اللہ کے استادانے جاتے تھے۔ وہ ایک نیا کتبہ ہے کہ ان کا کلام ان کا دل کی آواز ہے۔ وہ ایک خاص نمونہ شاعری کے بانی بن گئے تھے جو عاشقانہ شاعری میں نصرت کی رنگ آمیزی کرتے ہیں۔

پروفیسر الدین غازی اردو کے حضرت فیض کے کلام کا بہترین انتخاب شائع کیا ہے۔ اس کے ساتھ ان کا ایک مختصر افروز، مقدمہ ہے جس میں فیض کی حیات - شاعری پر مختصراً بحث کی گئی ہے۔

گہرے تقسیم - و - ہوا اور میکش کی نظموں کا بہترین مجموعہ ہے۔ جناب میکش حیدر آباد کے نوجوان شعرا میں ایک خاص اعتبار کے مالک ہیں۔ ان کا کلام بہت مقبول ہے۔ عالیجناب ڈاکٹر آزاد صاحب کا دیرپا عمومی اور جناب پروفیسر سروری کا مقدمہ بھی اس کے ساتھ شائع ہوا ہے۔ جدید شاعری سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے اس کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہیں ہے۔ صفحات ۱۰۲، طباعت و کتابت نفیس کاغذ اطلاقی قسم جلد پر پتھر کا، قیمت ۱۰/-

نمود زندگی - کلام کا مجموعہ ہے جو نہایت سلیقہ سے ترتیب دیا گیا ہے۔ اس میں (۱۰۰) نظموں کا مجموعہ (۱۰۰) براعزت ہیں۔ سید علی منظور صاحب حیدر آباد کے بڑے مخلص مشہور شاعروں میں سے ہیں۔ ان کی شاعری کے قدر وادب دور دورہ دیکھتے ہوئے ہیں اردو کا کوئی مشہور دستہ رسالہ انہیں جس میں آئے دن ان کی غزلیں اور نظمیں شائع ہوتی ہیں اور بھرپور نظمیں ایک رسالے سے دو مرتبہ سالہ میں شائع ہوتی ہیں علی منظور صاحب حیدر آباد کے ان چند کامیاب شاعروں میں سے ہیں جنہوں نے اپنے کلام میں زندگی کی تصویر کشی کی اور اس میں کامیابی بھی حاصل کی۔ صفحات (۱۲۰) قیمت ۱۰/-

الوار - حضرت علی احمد حیدر آبادی کی غزلیں اور نظمیں کا مجموعہ ہے جو نہایت عمدہ ہے۔ اس کا کلام ان کے شاعرانہ کیا گیا ہے۔ علی احمد صاحب نے داستان لہجہ کی شاعروں میں بے حد مقام رکھتے ہیں۔ ان کا کلام ان کے دل کی آواز اور جذبات کی آواز ہے۔ وہ نہ صرف ایک کہیں عشق اور پرگو شاعر ہیں بلکہ سادہ، درخشاں بیان کی نظر میں بہت قیمتی ہے۔ ان کے کلام کے مطالعہ سے بہت اطمینان ہوتا ہے کہ ہر شعر ان کے دماغ سے نکلتے ہوئے دل کی آواز ہے۔ ہوتا ہے۔ ان کے میں موانع جو شاعر کی شاعری کی سادگی کا نہیں۔

تذکرہ ہے اس کی ترتیب بھی اسی منگ رہے جیسی پہلے کی ہے
ہر شاعر کے سوانحیات اور نمونہ کلام کے ساتھ ساتھ اس کی
شاعری پر تبصروں کی کیا گیا ہے۔ ان دونوں کتابوں سے حیدر آباد
کی گزشتہ دور موجودہ شاعری کا بخوبی ابدانہ ہو گیا ہے۔
صفحہ ۴۳۱ تصاویر و قیمت ۷۰۔

تاریخ گوگنڈہ - کے معلم تاریخ پروفیسر عبدالحی صاحب مدنی
ایم۔ ایل۔ ایل بی نے سلاطین اقل شاہیہ کی نہایت مستند اور
مبسوط تاریخ قلندریہ کی ہے جس میں گوگنڈہ اور اس کے آس پاس
کی مملکتوں کے تعلقات و کن کا تمدنی ارتقاء و بادشاہوں اور
امیروں کے حالات و لڑائیاں علم و فضل کی سر پرستی غرض ہر
پہلو پر قدیم نادار اور قلمی تاریخوں کی مدد سے روشنی ڈالی ہے۔
اپنے موضوع پر پہلی کتاب ہے جو اس انتہائی اوجھٹ سے لکھی
گئی ہے۔ ساری سوانحوں سے زیادہ صفحہ قیمت (۷۰) ہے۔
یہ کتاب بھی پروفیسر عبدالحی صاحب مدنی
مقدمہ تاریخ و کن - نے نہایت تحقیق اور محنت سے مرتب
کی ہے اس میں انھوں نے مریضوں و کن کے عیسوی حکمران خاندانوں کے
آغاز ارتقاء وروج اور زوال کے متعلق تعارفی معلومات کے علاوہ
حکمرانوں کا پورا سچو نسب اور حکمرانوں کی تاریخیں بھی تفصیل سے
دیں۔ اس کتاب کے آخر میں ایک بوطا اشاریہ بھی ہے۔ متوسطہ تعلیم
۴۴۱ صفحات قیمت ۷۰۔

سیرالاربع اعظم - یہ کتاب ادارہ کے شیعہ تالیف و ترجمہ کی
مولوی فیض محمد صاحب مدنی بی اے ایم اے میں جن کو سوانح
نگاری کا خاص ملکہ ہے اور مفید معلومات کو دلچسپ اور سادہ
پیرایہ میں لکھ کر دیا ہے۔ یہ کتاب مدرسوں کے طلباء اور عام
کے مطالعہ کے لئے بہت ضروری ہے۔ چھپائی قطعہ ۷۰ صفحات قیمت
مجلد (۶۰)۔

نواب محمد امجد الملک سید حسین بگڑی عالم و فاضل
عقاد الملک - نے کے علاوہ دہرادن فرمیں تھے۔ وہ آخر جنگ

اس کتاب میں غزلیات کے علاوہ فیض کی شوقیوں اور دیگر
کلام کا بھی انتخاب شامل ہے جس کے علاوہ سے معلوم ہوتا ہے کہ
حضرت خواجہ میر درد اور شاہ سراج اورنگ آبادی کے معلقون
و عرفان اور شعر و سخن کا استخراج جتنا اچھا حضرت فیض کے کلام
میں موجود ہے کسی اور اور شاعر کے یہاں نہیں ملتا تھا۔ بعضات
(۱۲۴) بنع تصویر و قد حضرت فیض قیمت ۱۲۔
ڈاکٹر احمد حسین بانی کے کلام کا دلچسپ اور صیادی
باد و سخن - انتخاب ہے۔ ان کے کلام میں سادگی اور تعداد
بے غلطی ہے اس انتخاب کے ساتھ ڈاکٹر سیدی الدین صاحب قادری
ذکر کا معرکتہ آلا مقدمہ بھی شریک ہے۔ جس میں ادب اور مال
کے معرکوں کا بھی تذکرہ درج ہے۔ صفحات ۱۲۰ قیمت ۱۲۔

متن سخن - نواب عزیز یار جنگ بہادر بزرگ دلوں کے
شاگرد اور جید آباد کے ایک بزرگ مشق شاعر ہیں۔
ان کے کلام میں ادبی لطافت اور زبان کی پاکیزگی نمایاں ہوتی ہے
اس انتخاب کے ساتھ نواب ڈاکٹر سیدی الدین قادری ذکر کا مقدمہ
بھی ہے جس میں ان کی شاعری پر تبصرہ کیا گیا ہے۔ شاعری اور
زبان کا ذائقہ لکھنے والے اصحاب کے لئے اس کا مطالعہ دلچسپی
سے خالی نہ ہوگا۔ تعداد صفحات ۱۲۶ بنع تصویر شاعر قیمت ۱۲۔

متن سخن جلد اول - یہ کن کے عیسوی شعراء سے دور کہنے
مستند و سادہ طلبہ فاضلین اور اہل علم نے اس تذکرہ کی تالیف میں
حصہ لیا ہے۔ یہ تذکرہ پنج و دو روں پر منقسم ہے ہر دور کے شروع
میں ایک حصہ ہے جس میں اس کی ادبی خصوصیات پر روشنی ڈالی
گئی ہے ہر حصہ کے مشاہیر شعراء کے حالات ان کے کلام کا نمونہ اور اس
پر تبصرہ ہیں ان شعاعوں کے تذکرہ کے ساتھ دیگر ہم عصر و کئی اور
شعرا کی ہند کے شعراء کے نام دے دیے گئے ہیں تاکہ اردو شاعری کا
تاریخی منظر معلوم ہو سکے۔ شاعروں کی تصویروں کے علاوہ
فرما وایان و کن اور قدردان ادب و شعر کی بھی تصویریں شریک
ہیں۔ (۷۰) صفحات ۷۰ تصاویر و قیمت (۷۰)۔

متن سخن جلد دوم - یہ کن کے شعراء دور آصفیہ کا بقصور

کیونکہ گزشتہ ربع صدی میں اردو قلمیوں، شاعروں اور ادیبوں نے مختلف ایسی نئی نئی معلومات حاصل ہوتی جاری تھیں کہ اس وقت جو بھی کوشش کی جاتی وہ ناقص رہ جاتی اور دو کی گزشتہ تاریخ بری طریقہ پر لکھا جاتا ہے اور بہت سی ایسی لڑیاں لکھی ہیں جن کی وجہ سے ایک مربوط اور مسلسل تاریخ مرتب کر لی جاسکتی ہے۔ اس مہولت کے پیش نظر ادارہ نے یہ تاریخ مرتب کرانی ہے۔ یہ تاریخ صرف طلبہ اور عوام کے لئے تھی لکھی ہے۔ اردو صحافت اور ادب سے دلچسپی رکھنے والے طلبہ صاحب کے لئے تاریخی معلومات کا بہترین ذریعہ ثابت ہوگی۔ یہی نقطہ نظر اصلیت، قیمت ہے۔

اردو شاعری کا ارتقاء — افادہ اور حصار کے اہلکار کے لئے بڑی عالمانہ و محققانہ کتاب ہے کہ

صرف اس کے مصنف پر قلمبر عبدالقادر صاحب مروسی کا نام ہی کافی ہے۔ مروسی صاحب کی نظر اردو شاعری کی تاریخ پر تنقیدی وسیع اور باریک میں ہے کہ اس خصوص میں خود حاضر کے کسی محقق و ادیب کو ان کی ہمہری نصیب نہیں۔ اردو طبعی کی تاریخ سے دلچسپی رکھنے والے اصحاب کے لئے یہ کتاب ایک نعمت غیر متوقع ہے جو اپنے موضوع اور اہمیت کے لحاظ سے سب سے پہلی کامیاب ترین کوشش ہے۔ یہ کتاب دس ابواب پر مشتمل ہے جن سے اس کی اہمیت اور تلاش و جستجو کا اندازہ ہو سکے گا۔

بڑی سائز (۱۲۳) صفحات قیمت ۲۲ روپے کتاب دار کے پیش

مغربی تصانیف کے اردو ترجمہ — ترجمہ کی طرف سے شائع ہوئی ہے اس کتاب کے مصنف ڈاکٹر جبریں صاحب ایم اے نے ان تمام انفرادی اور اجتماعی کوششوں کو اکٹھا جمع کر دیا ہے جو صدیوں سے اردو زبان کو مالا مال کرنے کے لئے دوسری زبانوں کی کتابوں کو اردو میں منتقل کرنے کے سلسلے میں کی جاتی رہی ہیں۔ یہ تذکرہ نہایت محنت و تحقیق سے لکھا گیا ہے۔ اس لئے مستند بھی ہے، ورنہ غلطی، نقد ادب اور تاریخی طریقہ تنقید کے علاوہ نامزدوں کے متعلق معلومات حاصل کرنے میں ایسی کتابوں کی تلاش

سیاسی سازشوں اور ہنگامہ آویزیوں سے بچے رہے۔ انھوں نے حیدر آباد کو حکم کیا ایسی دولت سے الامال کر دیا جس کی وجہ ان کا نام رہتی دنیا تک اس ملک کی تاریخ میں زخموں سے گا۔ مولوی فیض محمد صاحب مدنی نے ایم ایڈ نے ان کے سوانح کا بڑے قریضے سے مرتب کئے ہیں طلبہ اور عوام کے لئے اس کا مطالعہ بہت مفید ثابت ہوگا۔ یہ فیض محمد صاحب کی معلومات قیمت

میر محمد مومن — میں پیشہ اسے سلطنت اور وزیر مصلحت تھے۔ محمد غفرانی قطب شاہ و سلطان محمد قطب شاہ

دنیوی عروج کے علاوہ ان کی دہری بیاد و تعلیمات بھی بہت مشہور ہے۔ انھوں نے نزار مارو پور کے صوفیوں سے ایک دائرہ بنایا تھا جس میں خاک کر لائے معانی بچھا دی تھی۔ اور یہ دائرہ اب تک دائرہ میر مومن کے نام سے حیدر آباد میں مشہور و معروف ہے۔ میر محمد مومن صاحب علیا یاد نے فارسی شاعر بھی تھے اور حجاز آباد آئے سے قبل شاہ ایران کے استاد و بحر و بحر تھے۔ ان کے نہایت تفصیلی اور تاریخی حالات زندگی اس کتاب میں جناب ڈاکٹر سید محمد الدین قادری نے ذرا سے اپنے دلچسپ اور مقبول عام اسلوب میں غور فرماتے ہیں۔ تقریباً تین سو صفحات پر مشتمل تصانیف قیمت ۱۱ روپے۔

اداس میں اردو — تاریخی منشی فاضل نے مدراس میں اردو کے نشوونما اور اس کے ارتقاء کی تاریخ پیش کی ہے۔ کتاب کو نواب میر تقی میر کا گیلہ ہے۔ ہر دور کے شاعروں اور شاعرانہ خیالات کو اس میں حیات اور نمونہ کا نظم میل سے درج ہے۔ تاریخ ادب اردو سے دلچسپی رکھنے والے اصحاب کے لئے اس کا مطالعہ ضروری ہے۔ صفحات ۲۰۰ قیمت ۲ روپے

تاریخ ادب اردو — اردو زبان اور ادب کی کوئی بھی اس موضوع پر دو چار کتابیں خوب سچی ہیں لیکن ان سے نہ عالموں کی ضرورتیں پوری ہو سکتی ہیں اور نہ عوام اور طلبہ کی۔ اردو ادب کی کوئی مکمل تاریخ اس سے قبل لکھی ہی نہ جاسکتی تھی

ہی خواہ کے علمی و ادبی کارناموں، طریقہ تعلیم، تلامذہ کتب خانہ اردو کی حمایت اور تبلیغ کی کوششوں اور اس کے اجماع کی قیادت کی درس کا ہوں، اردو کے پروفیسروں اور ادبی خواہوں کا ایک اجماعی تذکرہ ہے۔ اس کتاب کو جناب ڈاکٹر نور صاحب نے نہایت تحقیق اور جانفشانی سے تالیف کیا ہے۔ طباعت و کتابت ویرہ زیب صفحات (۱۲۸) قیمت ۱۰۴۔

اس میں دکن کی چار کتب خانہ خاتون انشا پر وار تذکرہ ہے۔ مختصر یہاں بالخصوص صاحبہ محترمہ لطیف ان بیچ صاحبہ محترمہ نسیم انشا پر مختصرہ محمد علی بیچ صاحبہ کے منتخب مضامین ہیں جو بابائے ریختہ حضرت امی اور نواب آبادی کے حالات زندگی اور خصوصیات کلام پر نہایت دلچسپ اسلوب میں اور جدید ترین نقطہ نگاہ سے لکھے گئے ہیں۔ ان مضامین میں ولی کی معلومات ان کے نقل ان کے فن شعرا و ادوق عرفان کے کلاوا ان کے اسلوب زبان اور انتخاب الفاظ کے تخیل کی نہایت عمدہ اور دلچسپ بحث کی گئی ہے۔ ولی کے تخیل کی پہلی مستقل ادبیات کتاب ہے۔ اس کا مطالعہ نکتہ شان ادب کی تسلی کا باعث ہوگا۔ صفحات ۲۴۰ قیمت ۲۴۰ کتابت نفیس کاغذ اعلیٰ قسم جلد پر دو جگہ نہری نام قیمت جلد ۱۰۰۔

مرزا مظفر الحق صاحب بی اے کے چودہ محبت کی جہاؤں :- اس فاضل کا دلچسپ مجموعہ ہے۔ اس کے جلد افسانے عشق و محبت کی دولت انگیزیوں اور حسن و شباب کی مضامین سے معمور ہیں۔ حرف و دبیر کی جو زبانیاں اور مشاہدات کے تاثرات کا دریا ہیں۔ نوجوانوں کے نفسیاتی معاشقہ کی کچی تصویر اور مصروف زندگیوں کے لحاظ فرصت کے لئے ایک شائستہ ذہنی تفریح ہے۔

چھوٹی تقطیع (۱۳۲) صفحات قیمت جلد ۱۰۰۔

اہمیت ہوتی ہے۔ چھوٹی تقطیع ۱۸۴ صفحات قیمت جلد ۱۰۰۔ یہ کتاب اردو کی ابتدائی تاریخ اور آریائی زبانیں :- اس کے مضمون کا سستہ تذکرہ ہے جس کو ادارہ کے لئے ڈاکٹر سدیشور داس صاحب ایم اے ڈی لٹ پروفیسر سکرک ولسانیات نے خاص طور پر مرتب کیا ہے۔ صفحات ۱۰۴ قیمت ۱۰۰۔

شعرا عثمانیہ :- چھبیس شعرا کے جامعہ عثمانیہ کے کلام کا پاکیزہ انتخاب درج ہے۔ یہ مختلف نظموں اور غزلوں کا مجموعہ ہے۔ ابتدا میں ہر شاعر کے کلام پر ایک مختصر مرقع تنقید کی گئی ہے۔ تقریباً بیس سال سے جو اہر یا رسے لکھے پڑے تھے جن کو مولوی سید مدین الدین صاحب قریشی ایم اے اور مولوی عبدالعظیم خاں صاحب باقی ایم اے (رہبرج اسکالر) نے نہایت سلیقہ سے مرتب کیا ہے۔ انہیں خیالات کا طعنہ نہ ہو کہیں زبان کا کہیں جذبات کی سازگی اور بلندی ہے تو کہیں اسلوب بیان کی بدت، کلام کا انتخاب اس نونے سے کیا گیا ہے کہ ہر شاعر کی عظمت اور اس کا معیار پورے طور پر سامنے آتا ہے۔ جدید اردو شاعری کے رجحانات کا مطالعہ کرنے والوں کے لئے ایک کیاب اور کارآمد تحفہ ہے۔ رائل سائزر (۲۳۱) صفحات تصویر قیمت جلد ۱۰۰۔

محمد حسین آزاد :- اردو کے اس بڑے شاعر و دانش ور کا مجموعہ نہیں ہوئے تھے۔ اس کتاب کو محترمہ جہاں بانو بیچ صاحبہ ایم اے نے تیار اور دیکھا ڈاکٹر صاحبہ نے نہایت سلیقہ اور کفایت کے ساتھ تلمیذ کیا ہے۔ یہ کتاب سات ابواب میں تقسیم کی گئی ہے جن میں آزاد کی زندگی، شاعری اور تصانیف سے متعلق مکمل معلومات شامل ہیں۔ یہ تصویر آزاد (۲۰۰) صفحات قیمت ۱۰۰۔

گار سال ونامی :- اردو کے پہلے پروفیسر فرانس کے تھوہر گار سال ونامی :- مترشح اور سندھوستانیوں کے بچے

ملنے کا یہ سب سے سب سے کتاب گھر حیرت آباد حیدر آباد دکن سے طلب فرمائیے۔

ادارۃ ادبیات اردو کی کتابیں

قیمت	ت	نام کتاب	قیمت	ت	ملاحظات
۴	۴۸	سج کا جادو	۸	۸۰	میں کی
۸	۶۸	طبیعیاتی کائنات	۸	۶۴	سرگزشت غالب
۱۲	۱۲۳	متاع سخن	۴	۴۰	نظام الملک
۱۲	۱۲۲	کیف سخن	۸	۳۳۰	تاریخ گولکنڈہ
۱۲	۱۲۷	بادہ سخن	۰	۱۶۰	ریڈیو نمبر (۸ تصاویر)
۱۲	۱۵۲	سراج سخن	۱۲	۱۲۰	ارمغان جذب
۱۲	۱۴۰	ایمان سخن	۸	۲۱۸	یورپ جنگ سے پہلے
۱۲	۱۴۴	نیفیں سخن	۸	۲۷۲	تاریخ سیاست
۰	۵۰۰	مرقع سخن جلد اول (۵۵ تصاویر)	۶	۴۸	سر سالار جنگ
۰	۴۳۲	دوم (۵۰)	۴	۱۴۵	مغربی تصانیف اردو کے تراجم
۰	۱۷۵	نقد سخن	۴	۱۳۲	معصیت کی چھاؤں
۸	۲۳۸	نذر ولی	۴	۱۶۸	اقبال نمبر
۰	۱۹۲	گریز و تبسم	۰	۱۱۲	سائنس کے کوششیں
۰	۱۸۳	مغایر قذہار دکن	۱۲	۲۳۰	شعر الی عثمانیہ
۰	۱۴۵	میں کی دنیا	۸	۳۰۰	مکتوبات شاد عظیم آبادی
۸	۱۹۶	مدرس میں اردو	۰	۱۶	داد اہالی
۰	۱۱۲	معصوم نامہ	۰	۲۰۰	اردو نامہ
۴	۱۵۳	نذر دکن	۰	۲۸	سرگزشت حاتم
۸	۲۴۰	روح غالب	۶	۴۰	عماد الملک
۴	۲۰۰	عام صبر	۵	۵۶	اردو دان کی پہلی کتاب
۰	۵۶	دفتری معلومات	۵	۵۶	دوسری کتاب
۰	۳۸	آبدوز کشتیاں اور سونگ	۰	۲۰۰	محمد حسین آزاد
۱۲	۱۴۳	اردو مثنوی کا ارتقاء	۴	۱۲۰	کاغذ کی ٹاؤ
۸	۲۱۶	نمود زندگی	۸	۵۲	فن تقریر
۱۲	۳۰۴	سرگزشت ادارہ	۰	۱۳۸	مقدمہ تاریخی دکن
۸	۳۱۲	میر محمد مومن (۳۳) تصاویر	۸	۳۴۰	ہندوستانی تمدن
۰	۳۲	بلقان	۰	۸۰	پودوں کی کہانی
۱۲	۱۱۳	خطا بیات	۰	۹۰	مہلقا
۰	۱۵۰	علم خانہ داری	۶	۳۸	پانی کی کہانی
۱۲	۸۰	چیونٹی (۱۶) تصاویر	۸	۳۱۲	رسائل طیبہ
۸	۱۶۸	انوار	۰	۴۰	سلک گوہرین
۰	۸۰	کشمش ثانی (۴) تصاویر	۸	۷۶	تاریخ ادب اردو
۰	۱۶۸	گاساں دتاسی	۱۲	۲۳۴	رفیق اردو دان
۰	۱۶۸	رات کا بھولا	۸	۵۶	اشوب
۰	۲۴	سنندہ جاہ	۰	۸۸	حبیب آباد
۰	۵۶	نلائف	۸	۷۶	شاد اقبال
۸	۲۰۰	ادارہ سنہ ۱۹۴۲ء میں	۰	۱۰۳	اریائی زبانیں
۰	۳۲	ناصر الدولہ	۰	۳۲	نظام علی خان
۰	۳۲	افضل الدولہ	۵	۳۹۶	تذکرہ اردو مخطوطات حیدرآباد
۰	۳۴	نواب میر محبوب علی خان	۰	۵۶	عرب اور عربستان

سبیل



U. 907

ادارہ ادبیات اردو حیدرآباد دکن کا مہنامہ

زیر نگرانی
ڈاکٹر سید محمد الدین قادری رند
مجلس ادارت
خواجہ حمید الدین ایم اے
تکینہ جیسٹم

سب رس

نشان پندرہ صدیہ ۱۵۳
نشان پچہ برطانیہ ۲۹۵۰
ٹیلیفون نمبر ۲۲۰۹
چند سالہ جاریہ پندرہ آئے
پچوں کا سب سے ایک چلے گئے

شمارہ ۲

بابت ماہ فروری ۱۹۴۶ء

جلد ۹

فہرست مضامین

۱	اداریہ تطبیقی مطالعہ	۱
۲	موسیقی اور برقی مطالعہ	۲
۳	فترک و یکجہ کر (نظم)	۳
۴	تعارف (نظم)	۴
۵	اردو میں سائنسی ادب	۵
۶	روس اور مذہب	۶
۷	مشرق کا ستارہ سحری (نظم)	۷
۸	دو غزلیں	۸
۹	جاننی رات (افسانہ)	۹
۱۰	انقلاب (فسانہ)	۱۰
۱۱	غزل	۱۱
۱۲	قانون کی ابتداء	۱۲
۱۳	مٹھے ٹھک (نظم)	۱۳
۱۴	کالج کی لاری (فسانہ)	۱۴
۱۵	ایک شام (فسانہ)	۱۵
۱۶	غزل	۱۶
۱۷	خطبہ ہمدرد	۱۷
۱۸	حضرت شاہ ابوالبرکات رحمہ فرما	۱۸
۱۹	احکام (نظم)	۱۹
۲	اجمل علی	۲
۳	بشیر النساء بیگم بشیر	۳
۴	شاہ صاحب	۴
۵	خواجہ حمید الدین ایم اے	۵
۶	احسان اللہ بی اے (عثمانیہ)	۶
۷	پی پیام	۷
۸	مازہ شہزاد گرامی	۸
۹	عزیز النساء بیگم بی اے (آخری)	۹
۱۰	کے سلطان بیگم خود	۱۰
۱۱	حماں خیر آبادی	۱۱
۱۲	عبدالحفیظ صدیقی ایل ایل ایم	۱۲
۱۳	سید علی منظور	۱۳
۱۴	سید محمد الدین احمد بی اے عثمانیہ	۱۴
۱۵	شمس المصطفیٰ شریف (بنگلور)	۱۵
۱۶	افند آفری	۱۶
۱۷	نواب ڈاکٹر مرزا بین جنگ بہادر	۱۷
۱۸	حکیم عبدالقادر شفاء مجددی	۱۸
۱۹	جبریل	۱۹

خواجہ حمید الدین ایم اے کے اہتمام سے صحیفہ مشین پریس میں طبع ہو کر خیر آباد سے شائع ہوا

بات مندرجہ ذیل جاتی ہے۔

حضرت امیر خسرو کی مثال یہاں کافی ہوگی جو سلطان علاء الدین خلجی کے درباری امیر تھے۔ یہ صرف اپنی موسیقی دان تھے بلکہ اچھے شاعر، سپاہی اور سیاست بھی۔ اسی وجہ سے متواتر دو سو طبعین کے عہد حکومت میں عہدہ وزارت پر فائز رہے۔ آپ کا بیچہ بھی اور شاعری سے جیسا کہ کلام تھا، وہ کس و ناس پر عیاں ہے۔ حضرت سلطان حسن نظام الملک اور ناصر آپ کو بہت کثرت بھی ملا رہا ہے۔ مہر قدس کے بہت مقبول نظم کے عوام ہیں۔ مہر و لغزیز آپ ایران کی طرف سے آئے تھے اور ایرانی موسیقی سے خوب واقف تھے۔ مندی کا نام سننے ہی آپ کو بہت پسند آیا اور اسے تعمیل سے سیکھنے کی خواہش آپ میں پیدا ہوئی اور بہت جلد آپ نے ہندی موسیقی پر عبور حاصل کر لیا۔ اور وہ گمان پیدا کیا کہ آپ اسے وقت کے نایک ماننے جاتے تھے۔ چنانچہ سلطنت و جاگیر کے خیر نایک نے بھی آپ کی نایکی کے آگے سر نہیں ہٹا کر دیا۔

نایک اس شخص کو کہتے ہیں جس نے علم گیت پر اہم ہو اور دوسروں کو بھی اچھی طرح سمجھا کر پڑھا سکے۔ کل راگ راگنیوں سے واقف ہو اور ان میں دلچسپی کا اظہار ہو اور دوسرے کو بھی اچھی طرح گانا سکھا سکے۔ استادان سلک کی بہت سی چیزیں ان کی تہذیب سے یاد ہونا اور ان پر طرح رکھ سکتا ہو۔ نہایت تجربہ کار ہو۔ اس کے شاگرد بھی مافیہ کرانی ہوں اور فن میں اجتہاد کر سکتا ہو جو جنت امیر خسرو نے اسی معیار کے مطابق اجتہاد سے کیا ہے۔ ایرانی اور ہندی موسیقی کی موزوں ترکیب سے کوئی راگ نہ بنا لیں۔ اجترار کریں۔

اس بات پر ہمیں یہ جاننا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ جب حضرت امیر خسرو ایرانی موسیقی سے واقف تھے تو انھیں ہندی موسیقی سیکھنے کی ضرورت ہی کی تھی۔ ہندوستان کی ہندی موسیقی کو سن کر اس کی قدر کیوں

کرنے لگے؟ ان سوالات کا حل دریافت کرنے سے پہلے

ایرانی موسیقی پر ایک سرسری نظر ڈال لینا ضروری ہے، ورنہ بات صاف طور پر سمجھ میں نہ آ سکتی ہے۔

ایرانی موسیقی کی بنیاد علم نجوم پر رکھی گئی ہے۔

بارہ برج کے لحاظ سے (۱۲) نظام کو آواز دینے لگے ہیں۔

یہی ایرانی راگ ہیں۔ راگ کی کوفارسی میں شعبہ کہتے ہیں۔

وٹ رات کے ۲۴ گھنٹوں کے اعتبار سے باہر نظام کے

(۲۴) شعبے وضع کئے گئے اور ہر شعبے میں چند شعبے ہوتے

ہیں۔ ہر مقام یعنی راگ کے (۴) پتر ہوتے ہیں جن کو

گوش یا گوشہ کہتے ہیں۔ اس لحاظ سے (۱۲) راگوں

بکے (۴۸) گوش ہوتے ہیں۔ ہندی موسیقی میں بھی (۴۸)

پتر ہوتے ہیں۔ ان دونوں تقیوں میں فرق ہے تو صرف

ایسی قدر کہ ایرانی موسیقی میں (۱۲) راگوں کے (۴۸)

پتر ہوتے ہیں اور ہندی میں (۶) راگوں کے اس

کہ ہندی موسیقی ہر راگ میں (۸) پتر ملتی ہے۔ اس کے

علاوہ (۶) آواز سے ہوتے ہیں جو (۶) اصل ہندی

راگ کے مماثل سمجھے جاتے ہیں۔ ایرانی موسیقی میں (۱۲)

تالیں ہوتی ہیں لیکن ہندی موسیقی کے مانند (۱۵) تالیں

ہی زیادہ معروف و مستعمل ہیں۔ انھیں بحر یا ضرب کہتے

ہیں۔ اس لحاظ سے اور تقابلی سے ہندی اور ایرانی فن

موسیقی کی مماثلت اور قربت واضح ہے۔ ان بارہ مقامات

کے ہم بھی درج ذیل ہیں۔

(۱) راست (۲) اصغیاںک (۳) عراق (۴) کوچک

(۵) بزرگ (۶) حجاز (۷) بوسلیک (۸) عشاقی (۹)

حسینی (۱۰) زنگولہ (۱۱) نثار (۱۲) رملوی۔ باقی تقسیم

بحر و طوالت خدمت کیا جاتا ہے۔

بعض ایرانی راگ راگنیوں میں بڑی حد تک

ہندی راگ راگنیوں کی سی مشابہت اور کیفیت بھی پائی

جاتی ہے۔ چنانچہ

(۱) مقام راست کوٹھ نارائن۔ مقام عراق کو میرا

کے باجول میں بھی اکثر حرکات مثل نغمہ ہندی کے اور بعض ٹون (Tone) ہندی راگنیوں سے اخذ کیے جاتی تھیں۔ غرض یہی طرح ایجاد اور روانہ ہوتا چلا آیا ہے۔

جیان بالا سے ظاہر ہے کہ تطبیقی مطالعہ سے اسنے دوسرے علوم کو بھرپور فائدہ پہنچا ہے۔ علوم کی ترقی کے لئے ایسا مطالعہ بجز ضروری چیز ہے۔ امیر خسرو کو دوسرے نایکوں پر اس لئے بھی فوقیت حاصل ہے کہ یہ دونوں فنون سے واقف تھے جس کی بدولت ان کی ذات سے ہندی موسیقی میں نہ صرف مستقل بہت اور ترقی ہوئی بلکہ دوسرے مالک کی موسیقی پر اثر انداز ہونے کی قابلیت و صلاحیت بھی اس میں پیدا ہو گئی۔ لیکن ان فوس کہ بعد میں اس طرف کسی نے توجہ نہ کی اور نہ ان کی خدمات کو اس نظر سے دیکھا۔

اب رہا بال ٹونک کی موسیقی کا ہندی راگ۔

پھر ناچمی ان کے علماء و محققین کے تطبیقی مطالعہ کا نتیجہ ہے۔ یہاں بھی دوبارہ یہی کہنا پڑتا ہے کہ ال ٹونک بھی تو آریائی نسل سے ہوئے کی وجہ سے ہماری برادری میں داخل ہیں۔ اسی وجہ سے ہر وہ اقوام کی قدر ثقافتی روایات و فنون کی بقایات آپس میں لڑ جاتی ہیں۔ اور وہیں سے تطبیقی مطالعہ اور تحقیقات کی بنا پڑتی ہے۔ جب ہم دیکھتے ہیں کہ انھیں چار سے علوم سے استفادہ کرنے میں ذرا بھی عار نہیں ہوتا تو ہمیں کیوں ہونا چاہیے؟ علوم و فن کا معاملہ کلیتہاً نوع انسان سے تو نہیں کر سکتا ہے اس لئے اس خصوص میں تعصب و تنگ نظری فضول ہے۔

ایسے ہی موسیقی میں پوربی راگ پھول اور میں ہندی کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ چوٹی اور منگو لیوں کی آمد سے ہندی موسیقی ضرور متاثر ہوئی ہے ممکن ہے یہ اثر بہت زیادہ نہ ہوا ہو تا کہ ہوا ضرور ہے۔

اسی طرح سکندر اعظم کی آمد و دستبرد ہونا کی حکمت کا اثر بھی ہندوستان کی موسیقی پر نظر انداز کرنا سلیقہ کس خیالی کی طرف

راگ دھن کے مصنف نے اعتراض کیا ہے کہ سارا گری باؤر عثمان اور وافت نہ حضرت امیر خسرو نے بڑا کمال دکھا ہے۔ قوالی، تراز، نقش بھنگ، بیسط، تالانہ، سہلا وغیرہ بھی حضرت امیر خسرو ہی کی طبعی رسائی ایجادات ہیں۔

مذکورہ بالا بیان سے ظاہر ہے کہ حضرت امیر خسرو نے اپنے تطبیقی مطالعہ کی مدد سے ہندی موسیقی میں بڑی وسعت اور ترقی کے ساتھ جدت بھی پیدا کر دی۔ ہر طائفے میں موسیقی کا مذاق پیدا کیا اور اسے ہر دور و زمانے میں نمایاں کر دیا یہی حاصل کی۔

اس موقع پر یہ امر بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ اس گونا گوں امتزاج کی بدولت غیر شعوری طور پر ہندی موسیقی میں عربی موسیقی کا عنصر بھی داخل ہو گیا۔ چنانچہ عراق، عجم، عثمانی، چینی، حشر (ان) و غیرہ (۲۶) راگ راگنیوں عربی الاصل ہیں جو ایرانی موسیقی میں پہلے ہی سے شامل تھیں اور اختلاط کی وجہ سے ان کے اجزا بھی ہندی موسیقی کا جز بن گئے ہیں۔ جب سے کہ عربی موسیقی کے بعض ملکوں کو سننے سے ہند کا مطرب کو اس لئے دیکھی جوتی ہے کہ پہلے ہی سے اس کے کان ان لکڑاؤں سے آشنا ہوتے ہیں۔ اب ہم ہندی موسیقی کی اثر پذیری کی داستان کو مختصر کرتے ہوئے اس کی اس اثر آفریں قوت پر نظر ڈالتے ہیں جو عربی اور فارسی عناصر کی آمیزش سے اس میں پیدا ہوئی تھی، اس اثر آفرینی کے ثبوت میں ہم خواب نظام الدولہ مردان علی خاں رئیس مراد آباد (جو اس فن کے ماہر اور مصنف بھی ہیں) کا قول نقل کرتے ہیں کہ یہ تھی اسے باجول و تملپڑا (زہن) کہ ہے۔

بعض ایرانی اور افغان نسا کی گانے بجانے والے

جو سے گئے ہر فنون نے ہندوستان کی راگ

راگنیوں سے استفادہ کر کے بعض بعض

اپنے کلمی و فارسی مقام کو مرکب کر کے

نئے طور پر خوش آئند بنا لیا ہے۔ اب ال ٹونک

ترجمہ ہوئی تھی اس کا پتہ چا ماہران فن کے ذمہ ہے۔ فیاض
یونانی موسیقی کا موضوع ہے اس نے شل تان سین کے یونانیوں
کے لئے ایک موسیقی کا نظام مرتب کیا تھا۔ ہندی موسیقی
میں ۲۲ سرتیاں شمار ہوتی تھیں لیکن یونانیوں کے ہاں
۲۴ اور کس ادوی ملک (Centaurs) ۵۰ (۵۰-۶۰) اور ڈوک (Dionysus) ۱۰۰ (۱۰۰-۱۲۰) کے
سے بہت مشابہ تھے۔

امجد علی

چند گیت کے ساتھ بیانی گئی تھی یہاں بیوی کی راگ راگنیوں
میں بھی جوگ ہو کر پڑھا جاوے (بیسے ہو) پیدا ہونے
اور بیٹے ہونے کے کیونکہ میلاس تھینز اس کے دربار میں
مذاہنگ سپر رہا جس کی وجہ سے پانی پیریں اکثر یونانیوں
کی آمد رفت اور بود و باش جاری رہا کرتی تھی۔ تاریخی شہادتیں
موجود ہیں کہ ہندوستانی فنون لطیفہ میں یونانی اثرات
طائفہ طور پر نمایاں ہیں۔ ایسی صورت میں یہ ناممکن ہے کہ
موسیقی اس اثر سے محفوظ رہی ہو البتہ راکر کس حد تک

فتراک دیکھ کر

انکارِ نو میں تاباں، اندازِ محرامانہ
بے ساختہ تاثر، بیتاب سی نگاہیں
تغیث تازہ یعنی "فتراک" سامنے ہو
حسنِ نظرِ سفینہ فطرت کا کھلے رہے
بیانی "مسل" مصروفِ جستجو ہے
سوزِ حیات، دل کا مطلوب بن گیا ہے
ایجازِ کاریاں ہیں، یادوں کی داستان

کیا نذرِ دلوں میں آخر، اے جذبہ تلافی

"تایخ طبع کہہ دے، "فتراک شعرِ بانی"

بشیر النساء بیگم شیر

۱۳ ۵ ۶ ۴

مترجمہاں: ڈاکٹر محمد تقی کے مضامین کا مجموعہ

تعارف

دل ہند ترقی پسند مفین کا نفرش کا کیا نظم

میں اک ترقی پسند شاعر ہوں اور مرا امتیاز یہ ہے
کہ مجھ کو اوروں کی طرح آتما نہیں مطابق ہے نہ چھٹا

مرتل فلک سے دنیا مری نظر عرش سے بچا آگے
گر مرے واسطے ہے مشکل زمین والوں کو بھول جانا

لنا ہے فطرت سے درس میں نے جو دل نہیں کا کھیرا
مجھے کسی نے نہیں سکھایا خوشی میں بھی غم نہ کریگا

وطن کا چہرہ ادا کس دیکھا ہے میں نے اور اہل فغان
مری زبان پر تناسکے کا مسرتوں کا کوئی ترانا

میں واقعات چین کا نباض ہوں گوارا نہیں بچہ کو
خیال میں آشیاں بنانا، خیال کی جھلیاں گرانا

یہ خدمت فن، یہ شوق تحسین، نہیں ہے نمرل نہیں میری
تھکے ہوئے ساتھیوں سے کہہ دو مجھے تو پڑا وہ قدیمانا

مرے بزرگوں کی مصیبت نے حیات کو لودیاں سنائیں
گر مرے نغمہ ہائے مستی سے جاگ اٹھنے کہہ نہانا

جن آرزوؤں کو یاد ماضی تھپک تھپک کر سلاچی تھی
اب ان کو بیدار کر رہا ہے نئے حوادث کا تازیانا

مری محبت کی پرورش زندگی کی آغوش میں ہوئی جو
میں جانتا ہوں غرضقتی ہے مری محبت کا ہر زمانا

ہنسی میں بے وجہ میرے آئینوں میں حقیقت سمجھ چکا ہوں
کہ جذبہ سرخوشی کی توہین ہے غلاموں کا مسکراتا

جو دیکھتا ہوں وہ کہہ رہا ہوں مجھے غروبیاں نہیں ہے
مرا سخن شرح زندگی ہے سنی ہوئی داستانیں نہیں ہے
شاہد صدیقی

یہ کتاب بھی کتب خانہ جامعہ غازی میں موجود ہے جس کا نمبر (۱۰) ہے۔

رسالہ در پائش گزری
تفصیل لہ مرآۃ صفات صلا
(۴۸) حصہ دوم (۴۶) سن
طباعت سنہ ۱۲۸۵ھ

مؤلف: ہرودیسک لائبریرین

دہلی کا محبہ مطبعہ العلوم مدرسہ دہلی قیمت ایک روپیہ۔

اس رسالہ میں زمین کی پائش کرنے کے اصول اور طریقے بیان کئے گئے ہیں۔ ہرودیسک رسالہ مؤلف اور مطبعہ وغیرہ کے نام اردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں درج ہیں۔

ہرودیسک نے سید قادر علی پھر اسکالر فرسٹ عربک کلاس کی مدد سے اردو میں تالیف کیا اور سید اختر علی کے انتظام سے مطبعہ العلوم دہلی میں چھپا۔ زیر نظر نسخہ اس رسالہ کا

دوسرا ایڈیشن ہے اس سے قبل ایک ایڈیشن شاخ ہو چکا تھا لیکن یہ پتہ چل سکا کہتے عرصہ پہلے شاخ ہوا تھا۔ رسالہ کے آغاز میں فرسٹ اور دوسرا چھپے ہیں۔ صفحہ ۱۱ سے اصل

کتاب شروع ہوئی ہے۔

ابتداء میں ان آلوں کا ذکر ہے جن سے زمین کی پائش میں مدد ملتی ہے مثلاً عقیدہ ولائٹ۔ جرب جرب کروں طائن

اوپر سٹ ٹائن اور کمپکس یا قطب نما۔

عقیدہ ولائٹ علم ریاضی کا ایک آلہ ہے جو درجہ جصل جنگل دانتے گاؤں اور کشمیر کی پائش میں کام آتا ہے۔

اس آلے کے متعلق تفصیلی معلومات درج ہیں۔ اس کے بعد پائش اور نقش بنانے کا طریقہ سمجھا گیا ہے۔ نقشہ بنانے

والے کو حسب ذیل اور دیکھو جن میں خیال رکھنے کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔

(۱) جس مقام کی پائش کرنی مقصود ہو اول اس کا نام لکھ لیا جائے۔

(۲) گرد و نوح کی جاگ لیا جا کر داروں کے نام خبر ہو سکنا۔

(۳) بڑی بڑی طرحیں جو اس زمین میں سے گزرتی ہیں

اسی سبب سے جبکہ فی کس پتہ کا رخ ہوا رخا پسہ تو پانی کا رخ اس کے چھوڑا گا اور اس وقت جو اکا بیلہ وسطانی میں ہوگا۔

چوتھے باب میں محسوس اشکال مثلاً متوازی۔ منحنی۔ مخروط اور گڑھ وغیرہ کی تعریفیں اور ان کی جسامت معلوم کرنے کے طریقے مثالوں کے ساتھ درج کئے گئے ہیں۔

پانچویں باب میں علم شملت سے بحث کی گئی ہے۔ چھٹے باب میں خطوط منحنی اور ساقوں میں باب میں تراش مخروط کو وضاحت اور تفصیل سے سمجھا گیا ہے۔

کتاب کے آخر پر یہ عبارت لکھی ہوئی ہے۔

”جس شخص کو کمال فرست تحصیل کرنے علم ریاضی کی نہیں ہے اور نہ ان کی طبیعت اس کی تکمیل کی طرف راغب نہ ہوگا۔

دوسرے اس رسالہ میں خیالات مشہور در باب علم مساحت کا تذکرہ کے اور علم پائش اور علم ہمارے کے کئے ہیں۔

کے خاص تفصیلی علم مساحت کی پائش کی کیا جانتے ہیں ان کو لازم ہے کہ فی فرما صلی کی اور ریونی کیس معاصی کی کتاب کو

در باب ان علوم کے تفصیل کریں۔

اس رسالہ میں ایسے کئی الفاظ ملتے ہیں جو اب ہماری زبان میں ترک ہو چکے ہیں۔ مثلاً

ناپو (ناپو) نقصان کرنا تعریف کرنا کیا چاہو

(کرنا چاہو) وغیرہ

بعض الفاظ کا اور اس طرح کھنڈا ہے۔

سفر (صرف) پونچھ (پونچھ) بان سے (جائے)

کنوا کنواں (کنواں) کٹر (کٹر) وغیرہ

”لاحدود و ادورے انتہا“ کو ملے محدود اور لا انتہا۔

”دونوں اور تینوں“ کو ”تینوں“ کے اور بیان کی پے کی پے

”بیان کیس ہیں“ سمجھا ہے۔ ”مذہب“ بمعنی ضروری اور ”شعبہ“ بمعنی شاخہ استعمال ہوا ہے۔

ریاضی کی بعض انگریزی اصطلاحوں کو اردو میں بول کا قول لکھا گیا ہے۔ مثلاً

سرٹ لبرول۔ پیریل۔ اور ڈی نیٹ۔ لائبرول۔

تعداد اشغال کی	اہم مشغلوں کے	تعداد اعداد و مصرف و بنیہ کی
۲	مشکت	۱۳-۳۳-۱۰۳
۴	مربع	۱۰۰۰۰۰
۵	پانچ ضلع کی شکل	۱۰۰۰۰۰
۶	چھ	۱۰۰۰۰۰

اسی طرح بارہ ضلع کی شکل تک جدول دی گئی ہے۔
دائریہ کا رقبہ معلوم کرنے کے مختلف طریقے بتائے گئے
ہیں مثلاً دائرہ کا فقط قطر معلوم ہو تو قطر کے مربع کو ۰.۷۸۵۴
میں ضرب کرنے سے رقبہ حاصل ہوگا۔ مستطیل، مربع اور مخروط
کے رقبہ کے مساوی مربع بنائے اور مخروط و گول کے رقبہ کے برابر
مشکت تیار کرنے کے قاعدے بیان کر کے متفرق سوالات حل کر کے
سمجھانے گئے ہیں۔

عملی مشقت کا "سری" نے سخت حسب ذیل اصطلاحات
کی فہرست درج ہے۔

جس	واسطے جب مستوی کے
جسم	واسطے جب ان تمام کے
مسلم	واسطے حماس کے
مجموعہ	واسطے حماس ان تمام کے
نقطہ	واسطے نصف قطر کے
لوگ	واسطے دو گارٹھ کے

حصہ اول کے تحت پانچ صفحات میں مختلف آلات کے نقشے
لیتھو میں چھاپے گئے ہیں جن میں سے چند یہ ہیں۔
پیری میٹر، رولر، پروٹریکٹر، سکیل، تقیاس، تقیوڈلا
وغیرہ۔

حصہ دوم میں حصہ اول کے صفحہ (۳۶) پر نقشہ دیا گیا
ہے اس کے بنانے کا طریقہ سمجھایا گیا ہے اور کئی صنعتی نقشے و محنت
کے لئے دینے گئے ہیں۔ چھوٹے نقشوں سے بڑے نقشے تیار کرنے کی

اور ان شہروں کے نام جہاں سے وہ آتی ہیں۔

(۴) پرنٹنگ مشینوں کے نام
(۵) ایک ایسے آدمی کو اپنے ساتھ رکھنا جو وہاں کی
مخصوصیت سے واقف ہو۔

(۶) اکثر اوقات ایک جاگیر دار کی زمین کا کچھ حصہ
دوسرے کی جاگیر میں مل جاتا ہے اس کو بھی خسرو میں درج کرنا
ضروری ہے اور نقشہ بناتے وقت اس کا ایک الگ نقشہ بنانا۔
(۷) جریب کا نہ صرف پیمانہ بلکہ اس کا استعمال کرنا۔

دو صفحات میں انگریزی پیمائش کے خسرو کا خاکہ دیا گیا
ہے۔ جو خسرو کی دوسرے نقشہ تیار کرنے کی ضرورت ہے۔ ان کی
جس زمین کا نقشہ بنانا ہے اس کی گارڈ ٹوڈا اور دوسرے
قطعات کو نقشے میں واضح کرنے کے لئے اس میں واضح علامتیں
اور نشانات عین کر دینے گئے ہیں۔ آبادی، تالاب، سردھ
کنوئیں، بڑا، دریا، سبب، شاہ، باغ، وریل وغیرہ کو مختلف
علامتوں سے دکھایا گیا ہے۔ دریا کا پانچ معلوم کرنے کا طریقہ
مع شال سمجھایا گیا ہے۔ راستوں، دریاؤں اور شہروں کی گول
اور مختلف مشغلوں کے محبتوں کی پیمائش دریافت کرنے کے طریقے
مثالوں کے ساتھ سمجھانے گئے ہیں۔ مخروط اور کثیر الاضلاع
اشکال کا رقبہ دریافت کرنے کے لئے سب ذیل طریقہ بتلایا گیا ہے۔
"ہر شکل میں ضلع سے زیادہ کی تقسیم ہو سکتی ہے مشغلوں
میں چارے مشغلوں میں تقسیم کر کے جو جب اس کا حصہ کے جو
مساحت مشکت میں بیان کیا گیا ہے مشغلوں کی پیمائش کریں
اور سب مشغلوں کے مساحت کو جمع کرنے سے اس شکل کی مساحت
مائل ہو جائے گی اگر کوئی شکل مساوی الاضلاع ہو تو
مشکت نہ ہو تو مساوی الاضلاع یا مساوی الاضلاع ہر
تو اس کے ایک ضلع کے مربع کو ان اعداد میں جو اس فہرست
اس کے مقابل لکھی ہوئی ہیں ضرب کر دو۔ حاصل ضرب
رقبہ اس شکل کا ہوگا۔"

یہ فورسنگ پب اور پلنجرول پب کے اشکال دے کر پانی کو ہندی پر چڑھانے اور کھری کاؤں سے پانی کو خارج کرنے کے طریقے سمجھائے گئے ہیں۔ اسی سلسلے میں آگ بجھانے کی کل اور زنجیر وار پب کبھی بھایا گیا ہے۔ باب یازدہم کے غلطی سے دو دوزیم لکھا ہے اور غلط نامہ میں بھی تصحیح نہیں کی گئی ہے۔ اس باب میں حرکت سیال اور مقدار حرکت مائع دریافت کرنے کے متعلق لکھا گیا ہے۔ بارہویں باب میں برہما صاحب کی کل کا بیان ہے جو کسی چیز کو داہنے کے کام آتی ہے۔ اس کل کی ساخت کی ترکیب بھی بتا دی گئی ہے۔ چرن میں یہ آگ کام آتا ہے۔ مثلاً جہاز کے موٹے رسوں کی مضبوطی اور دہات کی طاقت دریافت کرنے، بیج اور دھت اکھاڑنے اور ان عمارتوں کو اٹھانے کے لئے جزمین دوز ہو گئی ہیں۔ تیرہویں باب میں حرارت کے اخذ اور گرمی کی مقدار معلوم کرنے کے طریقے سمجھائے گئے ہیں۔ اسی سلسلے میں بارہ کے حر موٹری کی ساخت اور اس کے متعلق بحث کی گئی ہے۔ چودہویں باب میں دخان اور اس کے استعمال کے طریقوں پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ پندرہویں باب میں بخارات کا بیان ہے۔ اس ضمن میں برف چلانے کی ترکیب بتائی گئی ہے۔ یہ بھی واضح کیا گیا ہے کہ کس قدر پانی خاص درجہ حرارت میں بخار بن جاتا ہے۔ سوہو باب میں ہوا کے بیان کے لئے وقف ہے۔ اس ضمن میں طوفان ہوا سے تھافتی اور موسموں کی تبدیلی کا حال درج ہے۔ آخری باب میں لمبوں کی کشش پر بحث کی گئی ہے۔ کشش اتصال اجزائے مائع اور کشش اتصال مابین اجزائے مائع اور نمی وغیرہ کو سمجھایا گیا ہے۔ لاپلاس اور دوسرے سائنس دانوں کے تجزیوں کے اختلافات کو بھی واضح کیا گیا ہے۔

کتاب کے ختم پر نقشہ وزن مخصوص، نقشہ زورچک دخان اور نقشہ زور چک بخارات دیے گئے ہیں۔

ان کے خاص حرکت کی تشریح کی گئی ہے۔ تیسرے باب میں اجسام سیال پر کشش ثقل کے اثر کو بتلایا گیا ہے۔ اس سلسلے میں ذیل امور کی وضاحت کی گئی ہے۔

(۱) ٹھیرے ہونے پانی کی سطح کے ہر نقطہ پر داب مساوی ہوگا۔

(۲) ٹھیرے ہوئے سیال کی سطح ہر جگہ ہموار ہوگی۔

(۳) غہروں میں آرسائی کے لئے چشمہ ایسے عمارت بنانا جو سب سے بلند ہوا تمام بیانات کو شامل اور ہندسی کلیات سے واضح کیا گیا ہے۔

باب چہارم ہاشم داب معدلت سیال اور مرکز داب اور پانی میں تیرنے والے اجسام کی معدلت کا بیان ہے۔ باب پنجم میں مایعات کے مخصوص اوزان بتائے گئے ہیں اور ہاؤڈوٹیر کے آٹے سے وزن دریافت کرنے کا طریقہ اور اس آٹے کے جاننے کی ترکیب سمجھائی گئی ہے۔ ایک صاحب اور نیکن صاحب کے ہاؤڈوٹیر کی ساخت اور ان کے اعمال کی تشریح کی گئی ہے۔ باب ششم میں لچک دار اجسام سیال کے قواعد کے تحت ہوا کے زورچک، پر تفصیلی معلومات دی گئی ہیں۔ اس ضمن میں ایرپب، سافٹن ٹیج، سٹن صاحب کا ایرپب، کٹ برٹن صاحب کا ایرپب کنڈنسر اور ہوا کی بدوق و غیر کی ساخت اور ان کے اعمال کی تشریح مثالوں اور نقشوں سے کی گئی ہے۔

باب ہفتم میں ہوا کے محیط زمین، تفصیلی بحث کی گئی ہے اور بتلایا ہے کہ تمام سطح اٹھائے واہ سے ہے۔ اس ضمن میں ترمیلا اور پائل صاحب کے تجربات پیش کئے گئے ہیں۔ ہر دو مٹینا شک کی ترکیب ایداس کے اعمال کو تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ چہرہ دار ہر دو مٹیر کے سلسلے میں لکھا ہے کہ "عال موسم کا دریافت کرنے کے لئے اگر کام آتا ہے۔ موافق تبدیلی موسم کے پائے کی ہندی میں کی جیسی واضح ہوتی رہتی ہے۔ دلوں اب میں کل کے ذریعہ سے پانی کو اوپر چڑھانے کے طریقے بیان کئے گئے ہیں۔ نقص کا پب۔ اٹھانے کا

علوم انگریزی (European Science)

دہلی مدرسہ (Delhi College)

کتاب کو جنہوں میں تقسیم کیا گیا ہے پہلے حصے میں (۱۲)

اور دوسرے حصے میں (۹) ابواب ہیں۔ باب اول میں

آغاز کی سرخی کے تحت جو عبارت درج ہے اس کا اقتباس

یہ ہے۔

”اس رسالہ کی تالیف سے یہ غرض ہے کہ مل کریں

ہرماں شکل اور شکلیں ہندی کو جو در مقابلہ کے ذریعہ سے

واضح ہو کہ جس وقت میں ہندو مقابلہ کرنے لگے اور پس

روح پایا اس کے بخور مدت بعد اکثر سوالات ہندی

بذریعہ جو در مقابلہ کے مل گئے اس طرح سے کہ بجائے

خطوط کے حروف فرض کر کے مل جو در مقابلہ کے جاری گئے

گئے لیکن اس طریقہ کے مل کرنے سے کچھ فائدہ عظیم و توفیق نہیں

میں آگیا اس واسطے کہ موافق اس طریق کے ہر سوال میں کی

نئی ترکیبیں واسطے مل کرنے ہر سوال کے ٹھکانے پڑتے ہیں اور

اسی واسطے کوئی فائدہ کا یہ اس طریق سے نہ نکلا۔ مروجہ اس طریقہ

عام کا جس کے ذریعہ سے جو در مقابلہ کی دوسرے سب قسم کے

سوالات ہندی مل جو سکتے ہیں۔ مہندس و سکارٹینر وغیرہ

اس نے دو مقداریں مچھول لا اور ۶ فرض کریں اور بعد

ٹھکانے ایک ایسی مساوات کے جس میں بے دو مقداریں

مچھول پائی جاتی تھیں ان سے یہ بات ثابت کر دی کہ یہ مساوات

متعلق ہے ایک مسلسل نقاط سے جن کے یہ خطوط وتر ہیں

یعنی یہ مساوات تعلق رکھتے ہیں ایک خط بخنی سے جو مرکب

ہے ان سب نقاط سے اور اس خط بخنی کو لوگوں مساوات

ذکور کی کہتے ہیں۔“

اس کتاب میں ہندی مسائل کو جو در مقابلہ سے مل کر کے

طریقہ سمجھائے گئے ہیں۔ بلکہ جگہ ہندی اشکال کھینچ کر جو در مقابلہ

کی دوسرے ان کو مل گیا ہے جس دہ اول میں جن مسائل

سے بحث کیا گئی ہے ان میں سے چند ہیں۔

نقطہ اور خط مستقیم۔ دائرہ۔ ٹول مساوات۔ جو در

گئے ہیں جو در مقابلہ میں سس کتاب میں ہندی اشکال کی گئی ہیں۔

آج بھی اشکال ہوتی ہیں۔ جہوں کی ترکیب اور ساخت کا

انمازہ مسند فقہ نوٹوں میں ہوتا ہے۔

فائدہ یہ کہ گورنر کا۔“

”چاہتے ہیں ہم ثابت کرنا اس امر کا۔“

”پہلے خراب کا واسطے ۴ روپے کے۔“

صفحہ (۱۵۹) سے اول درج کی مساوات کا ایک مثال

ہرماں نقل کرتے ہیں۔

”ایک شخص کا واسطہ ۹۰ میل ایک روز میں چلتا ہے

ایک ہفتے روا کر گیا تھا لیکن بعد پانچ روز کے ایک اور

فائدہ واسطے اس کے مل گئے۔ اور فائدہ واسطہ ۹۰

کوس روز چلتا ہے تو بتاؤ کہتے۔ روز میں فائدہ اول کو پھر لے گا۔“

کتاب فائدہ جامعہ تھانیہ میں نمبر ۱۵۹ پر یہ کتاب

موجود ہے۔

مندسہ بالچر (Geometrical)

Geometrical کا اردو ترجمہ جس کو ماسٹر رائنڈ اور

راوہا کشن سکالر اعلیٰ دہلی کالج نے کیا تھا۔ کتاب میں کہیں

بھی سند طباحت درج نہیں ہے۔ البتہ سرورق چرچہ نقل

علمی مساوات درج ہے۔ جس سے پتہ چلتا ہے کہ یہ رسالہ مسند

سے نقل طبع ہوا تھا۔

ہندسہ بالچر تمام صفحہ ۴۴۰ میل کے اور ایک ورق

اول میں فهرست کا اور ۵ صفحہ آخر میں غلط نامہ کے بتایج

ہر اکٹوبر مسند طبع

دشیر خاں

سرورق پر انگریزی اور اردو میں کتاب مصنف

مترجمین اور مصنف و مترجم کے نام درج ہیں۔ یہ کتاب مولوی

محمد حسین آزاد کے اہتمام سے امیج دہلی اردو اخبار سے

شائع ہوئی ہے۔ سرورق پر جو انگریزی اردو عبارت

ہے اس کے دو ترجمے قابل غور ہیں مثلاً

پایا جاتا۔ عربی الفاظ اور نرسی ترکیبیں عبارت میں جگہ جگہ ملتی ہیں۔ جوں کی سادہت کے چند نمونے یہ ہیں۔

قبل از تمام کرنے اس باب کے

مختص اور پرکس ذریع اس علم کے ہے

کتاب کے آخر میں (۱۸) صفحات کا غلط نامہ شکر کی ہے۔
(کتاب خانہ جامعہ عثمانیہ خیر کتاب ۵۱۶)

یہ رسالہ سید اشرف علی کے انتہام سے
رسالہ علم طب میں ۱۸۴۶ء میں مطبع العلوم دہلی

دہلی میں چھپا۔ سرورق پر اردو اور انگریزی دونوں زبانوں
میں رسالہ کا نام اور قیمت وغیرہ درج ہے۔ اردو عبارت یہ ہے۔

”رسالہ علم طب میں

انگریزی سٹارڈ زبان میں ترجمہ کیا گیا حصہ اول

(۱۸۴۶ء) صفحہ

اصل کتاب کے مصنف اور ترجمہ کا نام ہمیں بھی درج

ہے اس لئے یہ بتانا مشکل ہے کہ کوئی انگریزی کتاب سے

کس نے ترجمہ کیا شاید ارمین جہاں آباد میں۔ کلیات ”کی

سرخی کے تحت یہ بیان کیا گیا ہے کہ دنیا کی ہر شے تغیر پذیر ہے

اور موت سے پہلے ہر ذی حیات کو مختلف آفات اور بیماریوں

کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ امور خارجی مثلاً غذا اور حرارت کی

افراط تفریط سے انسان کے مزاج میں خلل واقع ہوتا

ہے اور جب کوئی چیز دو اعتدال سے بڑھ جاتی ہے تو ہی

مرط کا باعث بنتی ہے۔ بعض انسان پیدا ہی کمزور ہوتے

ہیں اور یہ کمزوری ان اعضاء کی حرکات اور ان کے افعال

جسمانی میں ایسا خلل ڈالت دیتی ہے کہ وہ مرط کا پتہ نہ

ثابت ہوئی ہے۔ علم الامراض: *Pathology*

اور علم افعال: *Physiology*

میں مرط کی وہ دریافت کی جاتی ہے۔

امراض کی دو اقسام بتائی گئی ہیں ایک افعال جس کو

عضوی بھی کہتے ہیں اور دوسری ترمیمی اس کے بعد اسباب

امراض پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ علم الامراض کے تحت زیر بحث

مسائل بیضوی، بعید البیضوی، تراش ہائے مخروطی،
مخلوط مغنی اور غیرہ۔

حصہ دوم کے بعض مسائل یہ ہیں۔

کہ اردو محجمات و جگہ جگہ مغنی سے پیدا ہوتے ہیں۔

سلطون مغنی استوار و محفوظ و غیرہ۔ اس کتاب میں ریاضی کا ایسا

مسائل جملے کئے ہیں جو اعلیٰ محاسن کے علماء میں داخل

ہوتے ہیں۔ ہر بحث کو نہایت تفصیل اور کثرت کے ساتھ سمجھایا

گیا ہے۔ ان پر دو ہی ریاضی دانوں کے نام اور حوالے دیے

گئے۔ محسوس نے علم ریاضی میں کوئی نیا نظریہ یا آلہ ایجاد کیا۔

”تراش ہائے مخروطی“ کے بیان سے ایک عبارت یہ ہیں

نقل کی جاتی ہے۔

..... اور بیان ان کا اکثر ریاضی دانوں نے

الفاظ کے وقت سے کیا ہے اور یہ خطوط مغنی الفاظ طون

کے درجہ میں دریافت کئے گئے تھے اور جب کہ اس کے

شاگردوں کا اکثر خواص ان خطوط مغنی کے معلوم ہوئے تو

انھوں نے غریبی ان کا امتحان کر کے اکثر کتابیں ان کے

باب میں چھپوائیں ان کتابوں میں سے وہ کتاب جو کہ ابھی

بائستندہ پر گائے نقیصت کی ہے موجود ہے اس کے آٹھ

باب ہیں چار آسان اور چار مشکل.....

ریاضی کی جو اردو اصطلاحیں استعمال ہوئی ہیں

ان میں سے چند یہ ہیں۔

ادوار التمام اعظم، قریب البیضوی، بعید البیضوی

نقطہ اشقی، قطبی مساوی، سطح متغیر المقاتات وغیرہ

بعض انگریزی اصطلاحوں کے ساتھ ساتھ ان کے

ترجمے بھی درج ہیں مثلاً

”خیر نزدیکس۔ خط متحرک

ڈائی ریکٹس۔ خط مغنی“

اس کتاب کی زبان اردو انداز بیان دیباہی ہے۔

جیسا عام طور پر سکائی مضامین کی کتابوں کا ہوتا ہے اگرچہ

یہ انگریزی کتاب کا ترجمہ ہے لیکن عبارت میں ترجمہ پن نہیں

روس اور مذہب

روس میں مسیحی مذہب کی اشاعت کے متعلق ایک قصہ عجیب ہے جس میں ایک غور طلب صداقت کا پتہ ملتا ہے۔ ایک قدیم تاریخ نگار کے مطابق شہزادہ ولادیمیر نے جو دسویں صدی کے آخر میں کیروں کا حکمران تھا، عوامین کے سے مشورہ اور سمجھ بوجھ کے بعد جس عقائد افراد کو پڑوسی ممالک میں رواج کیا کہ وہ چہ نکاح کیے کہ کوشا مذہب ہوں کے ساتھ اہل مذہب میں سب سے بہتر ہے۔ اس زمانے میں فوجات روس کے موجودہ مذہب میں یونانیوں کی رائج اور کچھ مسیحی (orthodox) جو عجمی اور جزیرہ نمائے اسکندریہ یونانی لاطینی عیسائیت "عرب کا اسلام اور دریائے وولگا اور ڈیلت کے ساتھ ساتھ اسٹیپ میں پھیلے ہوئے خزاردوں کی مسودت" شامل تھے۔ ان تمام مذہب کے مطالعے کے بعد وہ نے دانہیں لگ کر ایک زبان یا زبانوں کی رائج الاعتقادی کی حمایت کی۔ انہوں نے کہا کہ "مقدس عیسائی رہائی" مسیحیت کے سنٹ مونیاس میں اس من و بہنام کے ساتھ منایا گیا ہے۔ تھوڑی دیر کے لئے انہیں اس کا بھی پوشہ نہ رکھا تو یہ وہ زمین پر جس کا لاطینی کی رفتوں میں پہنچا دیے گئے ہیں۔ اس قصے میں صداقت کا یہ پہلو مضر ہے کہ اس جن کے متعلق روسیوں کے محنتی احساس کا پتہ چلتا ہے جب کہ اس کی سلطنت اہل اعجاز عجمی میں مذہب سے متعلق ہونے کے بعد اہل صفات ہو گیا ہو۔ روسی دیہاتیوں کے مذہبی جوش و اشتیاق کی تدریج نشوونما اسی مذہب "رائح الاعتقادی" کے ذریعہ سامنے آئی۔ سرزمین یورپ میں عظیم تقررات پر پکڑنے والے افکار بعد کی لہریں — مذہب طائیت "نشواتانہ" سولہویں صدی کی اصلاح دین سمیت (جس سے پروٹسٹنٹ مذہب کی بنیاد پڑی) امداد اس کا رد عمل — رکھا گیا۔ کبھی نہ پہنچ سکیں۔ مگر روس کی مذہبی زندگی تمام بیرونی افکار

سے معرئی مدلول تک قوت و ترقی کی جانب اٹل رہی۔ مسیحی مذہب کا بوشہ ایک انقلاب کروں کی مذہبی زندگی کے لئے جو بدستور اہمیت ثابت ہوا۔ تاہم انقلاب ایک خاص مادی حکومت کا خاکہ تیار کر چکے تھے۔ ۱۲ جنوری ۱۹۱۷ء کے قانون کی رو سے کلیسا اور حکومت دو علیحدہ چیزیں قرار پائیں اور قدیم روسی کلیسا جدید روس کا قومی کلیسا نہ رہا۔ بالکسی نظریات کا مذہب کے متعلق رحمان جس پر ہم آگے چل کر تفصیل سے روشنی ڈالیں گے یہ تھا کہ کسی طرح روس سے مسیحی مذہب کے تصور کو جوش کے لئے متاثر کیا جائے۔ اس بارے میں ان کو خوشی کی لکڑیں ڈالیں ہو کہ مکمل اور موثر تھیں۔ اشتراکیوں کو کوئی وجہ نظر نہ تھی کہ کیوں کلیسا کی جائداد اور دوسری املاک میں فرق کیا جائے۔ لہذا کلیسا کی تمام جائگرس ضبط کر لی گئیں۔ مذہبی اداروں کو مساعی کا مکمل مثلاً ادارہ باہمی اور خیرات خانوں کو اپنے قبضے میں رکھنے یا ان کا انتظام کرنے سے سختی سے باز رکھا گیا۔ کلیسا کے خلاف ان اقدامات سے کھٹکتے ہوئے تھے کہ مسیحی مذہب کی طاعت کے علاوہ آہنی کے دور سے ذرا لے سے ان کو محروم کر دیا جائے۔ مدارس کو کلیساؤں کے بالکل علیحدہ کر دیا گیا۔

ارباب کلیسا پر جنہوں نے اس کی مخالفت کی مقدمے چلائے گئے اور ان کی اس حکومت کی پاداش میں سخت سزا دی گئیں۔ حکومت کی کلیساؤں کا فخر یہ نکلا کہ روس کے چار بڑے مذہبی مراکز جو کیروں، مسکو، پٹرو گراڈ اور کازان میں تھے بند ہو گئے۔ لیکن اس کے باوجود حکومت نے پہلے اہل خانہ کی مذہبی تصویر کو کوئی پابندی نہیں مان لی۔ مگر اس کی سزاؤں اور اشتراکیوں کا محسوس یہ ایک دستور تبدیل کی۔ ابتدا میں حکومت کی پالیسی یہ تھی کہ "ہر شہری کو مذہب کی مخالفت یا مخالفت میں ہر طرح کی آزادی حاصل ہے۔" تبدیل شدہ دستور میں یہ فقرہ تھا۔ "مذہبی اعتقادات اور جماعت مذہب پر پابندی کے کو چھٹی آزادی دی جاتی ہے۔ اس طرح سے مسیحی مذہب صرف عبادت تک محدود ہو کر رہ گیا۔ مگر مذہبی مسائل پر مخاطب کرنا مستحق

مذہب عقلمین کو اپنے ہر پوچھنے کے لیے پوری آزادی حاصل تھی جس کا احتمال وہ اپنے قائد "ماز و سلا فکسی" کے تحت پورے زور و شور سے "جمہوریت" کی طاقت اور اقتدار بڑھانے کے لئے کرتے رہے۔ اس طرح مذہب کے خلاف عظیم اقدامات اخباروں، رسالوں اور ادبی گزشتوں کے ذریعے جاری رہے۔ اتحاد و اتحاد کے پرستاروں کو اس مخالفت کے لئے خاص مشق و تربیت حاصل ہوتی رہی۔ اس میں منظر کو پیش نظر رکھنے کے بعد سوشل حکومت کی مذہب کے متعلق تبدیل شدہ حکمت عملی کو باطل و قبیح کہا جاتا تھا۔ اس تبدیلی کی وجوہات کا تجزیہ کرنے سے قبل بہتر ہے کہ ہم دوسری مذہب کی موجودہ صورت حال کا سرسری مطالعہ کریں۔ ماسکو اور روس کے دوسرے قیام داروں میں عہدہ بطریق کا پھر سے احیا کر دیا گیا ہے۔ محدود کی انجیل کو توڑ دیا گیا ہے۔ پادریوں کو حق رائے دہی عطا کیا گیا ہے۔ اتحاد کو تقطیع کر دیا گیا ہے۔ پھر سے عقیدہ کی یاد دہانی کی گئی ہے۔ عالمی تنظیمیں کچھ آسانی پیدا کی گئی ہے تاکہ وہ سہانہ و مزدور پیسے جتھا رہنا سکیں۔ مخالفت مذہب امتحانات جوگزٹیفکیشن اور سول عہدہ واروں کے لئے ضروری تھے ختم کر دیئے گئے ہیں۔ دس سالوں کے اس محسوس کو خراج کر دیا گیا ہے جو مسیحی مذہب کی دل آزاری کا باعث تھا۔

عراقی نظریات کا جب سائنٹفک نظریات سے مقابلہ کیا جائے تو ضرور ان میں ایک غامض نظر آئے گی۔ سائنٹفک نظریات کا ثبوت آسانی سے ایک تجربہ خانہ میں دیا جاسکتا ہے۔ لیکن ان کے عکس عراقی نظریوں کو جن کا حلقہ ایک عظیم انسانی گروہ سے ہوا دل الذکر کی طرح آسان تجربوں سے ثابت کرنا مشکل ہے۔ بہر حال دوسری قائدین انقلاب نے اپنے نظریہ مذہب کے موافق جس خوبی سے کام انجام دے کر اپنے کمال کا ثبوت دیا ہے وہ حقیقت دنیا کے عظیم پہاڑوں کے عراقی تجربوں کے سلسلے میں ایک قیمتی کوشش ہے۔ یہاں نامناسب نہ ہو گا اگرچہ ان "مفروضات" پر ایک نظر ڈالیں میں میں کو پیش نظر رکھ کر یہ تجربے کئے گئے۔

حالات کے اس تجربے کے پیش نظر ضروری ہے کہ مذہب کے طریق کار کو ختم کر دینا چاہیے۔ جب چیداش دولتا کے ذریعہ مزدور طبقے کے ہاتھ میں آجائیں گے تو انہی اپنی قسمت کا مالک ہو جائیں گے اور مذہبی رجحان خود بخود غلطی کی طرح مٹ جائے گا۔ غرض جو بھی ایٹھوں کی منطق مذہب کے خلاف۔

روس میں موجودہ مذہبی رجحان کے احیاء کی تحریک کے مندرجہ بالا نظریے کی تکیہ بھجنا غیر دانشمندی پر مبنی ہو گا۔ مذہبی اداروں پر جو تنقید کی گئی تھی اس میں صداقت کے بعض اہم پہلو مظہر ہیں۔ روسی کلیسیا کی آزادی جس کی بدولت کلک سولہویں صدی عیسوی کے پہچانی دور

اس نے اس کا بھی پرچار کیا کہ مذہب اور توہمات میں بہت بڑا فرق ہے۔ مذہب کا مقصد انسان کی وفا شناسی کو بیدار کرنا ہے جو بلند ہستی اور انسانیت پرستی کی توثیق کرتی ہے۔ یہ سوشلسٹوں میں جبکہ مخالف مذہب تلخ شدید صورت اختیار کرتے تھے مخالفت کے باقی لیون کا کارسکی وزیر تعلیمات کو ماننا پڑا کہ مذہب ایک سیسل ہے جسکی شدید ضرب تم اس پر لگاؤ کے اتنی ہی گہری ہے کہ وہی میں دھنسی جائے گی :

”رڈ اسکرپر“ کی ایک درگاہ میں جہاں پہلے کنواری آئیریا کی تصویر تھی انقلابی لیڈروں نے ایک نئی دائرے کا یہ جگہ کندہ کر کے لٹکا دی تھی۔ ”مذہب عوام کی آفون ہے۔“ اب اس جگہ کو وہ آلٹا شیا دیا گیا ہے اور کنواری آئیریا کی تصویر دلوں دوبارہ آؤنٹا کی گئی ہے۔ روس میں ہم آہنگ معتدل شخصیت پسندی اور مذہبی بحران کا ایک نیا دور شروع ہو رہا ہے۔

احسان اللہ ربّانہ

گزشتہ کے بعد اس میں دوکن سے چکنا چوکا تھا پہلا جملہ کے دو حکومت میں سلب کر لی گئی۔ پڑا عظیم کسی دوسری قوت کو اپنی رقابت پر آمادہ نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔ پہلے تو اس نے بطریقیت کی حالت کے ذوال کے حالات پیدا کر دیے پھر کلیسا کو ایک سیسل عہدہ کی نگرانی میں کر دیا جس کو وہ معنی خیز طور پر ”زار کی آنکھ“ کہتا تھا۔ انقلاب تک روس میں مذہب کی سماجی جڑیں ناکارہ ہو چکی تھیں۔ اور اس کی حالت ایک زائد نگہ پوش کی سی ہوئی تھی۔ یاد ریلوں سے ہمیشہ اس چیز کا غرض رہتا کہ وہ اپنے ملتے کی رعایا کی باتوں کو پوش تک پہنچا دیں گے فیض اوقات پڑا حکومت سے سنہ شدہ خطبے پڑھتے۔ آزاد خیال پادروں پرستی کی حاقی اور بعض دفعہ قیدی سزا بھی دی جاتی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مذہب کی مخالفت کو تحریک نے نظر مذہب کی بہت سی غرابوں کو دور کر کے میں بڑی مدد کی۔ اس کے ساتھ ساتھ

مشرق کا تازہ سحری

میری آبادی سے کوسوں دور ہے
متصل خاموش جیسے چور ہے
روح ہے لیکن بہت مجبور ہے
ایک تازہ رات کے پچھلے پہر

حسن کی دنیا میں مجھ سے آٹا
عالی امکاں میں صدیوں گم رہا
زندگی کی راہ میں الجھایا ہوا
بجھ رہی ہے اس کی تبدیل ہوتی

میں نکل آیا جہاں خاک میں
رہ گیا یہ منسزل افلاک میں
اشک بن کر دیدہ غمناک میسا
اس میں ہے آئینہ شعلہ بگر

اپ یہ ڈوبا جا رہا ہے کیا کروں
پھر اندھیرا چھا رہا ہے کیا کروں
جی مرا گھبرا رہا ہے کیا کروں
آگ کہاں ہے اسے کون کائنات
دیکھ سوز زندگی دیتا ہوں میں
تجھ کو اپنی روشنی دیتا ہوں میں
زیست کی تابندگی دیتا ہوں میں
ہاں ابھرائے تیرا سہی پھر ابھر

پی۔ پیام

دو غزلین

محرمانہ کے کہساروں اور چاک گر بہاں کر دے
ہم خود بھی پھیماں ہو نہ سکے ان کو بھی پیشیاں کر دے
اک تم جو شب تنہائی میں تسکین کا سلاں کر دے
کیوں ایسی بھیاں کہ راتوں میں تار بھی چراغاں کر دے
وہ فصل بہاراں کی آمد پر سیر بہاں کر دے
جو اپنے لہو کی بوندوں سے زنداں کو گلتاں کر دے
یہ وقت کی طوفانی لہریں رات ہی راتیں کٹتی ہیں
سہل پہلو جو عیش بداماں تھے اندازہ طوفان کر دے

ہنسنے کا طریقہ یاد نہیں رونے کا طریقہ بھول گئے
اے درد جنوں ہو خیر تری ہم جانے کیا کیا بھول گئے
سانسوں میں کسک سہنے میں کٹک آنحوں میں اندھیرا چھایا
انجھم تنہا سانس ہے آغازِ تمنا بھول گئے
یہ صحنِ قفس چمکتی پری یہ دردِ دہریہ کیا کہی
صیادِ ابداد تپتے ہیں تجھے ہم مٹھن جمن کا بھول گئے
دکھ درد کے پھندے کٹ نہ سکے وہ بزمِ قہر ہی میں
ہم بھولنے کو بھولے ہیں انہیں پر دل سے بھلا بھول گئے
وہ میرے قصود میں آئے کچھ کہی گئے کچھ بھی گئے
اب اس کی خبر کس کو آدش کیا یاد رہا کیا بھول گئے
آتشِ بزمِ گہلی

چاندنی رات

ہوں۔ بی۔ اے یوسف کا دوست! اس نے جواب دیا۔ جی واقعی؟ اور ملی گئی۔ مجھے اپنی حاکت پر بچہ غصہ آیا۔ بھلا کون بوجھا تھا مجھ سے کہ میں کون ہوں اور کیا ہوں۔ بہت شرمندہ ہوا اور وہاں سے جاگ نکلا۔ یوسف نے بار بار اصرار کیا کہ میں اس کے گھر آؤں لیکن ہمت نہ پڑی۔ ہمزاد و جیسے بعد وہ مجھے زبردستی لے گیا بہت خاطر ادا دات کی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ بی بی عزیز بہن سے میرا تعارف بھی کروایا۔ اس کو محمود نے ٹکرا کر کہا۔ آپ سطر سلمان بی۔ اے یوسف کے دوست۔ یوسف نے مجھ پر ایک دوسرے کو جانتے ہیں لیکن میں دل ہی میں شرمندہ ہوا جابجا رہا تھا۔ اس نے طے تپاک سے ہاتھ لایا۔ اس دن سے میری زندگی میں ایک تغیر برپا ہو گیا۔ ہر وقت اسی کا خیال۔ پڑائی کے اوقات اسی کے سہانے نظموں میں گزرتے تھے۔ اور میں یہ بھی سمجھا ہوا تھا کہ میری طرح محمود بھی محبت کی آگ میں جل رہی ہے۔ لیکن وہاں وہ معاملہ ہی اور تھا۔ جدید تہذیب و تمدن کی فضا میں سانس لینے والی لڑکی کے لیے کچھ جیسے ان گنت پہ جباری تھے۔ اس زمیری محبت تو کچھ شکل بھیما یا نہ تھی۔ میری لقمہ کاغذ ہو گیا۔ سپرد ہے ناکابوں نے میری کروڑوں لیکن دل زیادہ اثر نہ ہو سکا کیونکہ وہ تو محمود کی شاندار کامیابیوں پر مسرور اور ذراں تھا۔ کچھ میں وہ ایک مساز حیثیت کی ایک ہو گئی۔ میرے لئے اس کی کامیابی اور نیک نامی ایک بیش بہا دولت تھی۔ مجھے اور کیا چاہیے تھا۔ میں اس سے بے لوث اور بے غرض محبت کرتا تھا۔ میری محبت کا صلہ مجھے منظور نہ تھا۔ اس لئے میں کبھی انکار کی جرأت نہ کی۔

وہ آسان کی طرف دیکھنے لگا۔ شاید اُسے آسو پی جانے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں بے یمن ہونے لگا۔ وہ کہنے لگا۔ ہاں تو میں نے اپنی محبت کا اظہار کبھی نہ کیا۔ کبھی بھی نہیں!۔ وہ اب ڈاکٹر محمود بی بی بی میں ہو گئی تھی۔ خوشی سے میں ہچکولوں سے سہا تھا۔ مجھے

جب میں سینا صحت کے ایک نچے ماہر سے پوری حق کوئی شکر کہ مجھوں میں سچ لیا ہوا نظر آتا۔ موٹر روک کر ٹا صبح کی دوسرے دیکھا تو شکر کر رہ تھی۔ اٹانی ہسپتال میں ڈاکٹروں کے بچے بدلتے کچھ ہی دیر پہلے سینا ہال میں زندگی ایک عیم زینتی ایک مسئلہ چھوٹی تھی۔ اور سینا ہال سے باہر اٹھنے کی یہ تھیں ایک میرا دل تھک گیا۔ میں نے اسے اپنی موٹر چن لیا۔ وہ دیوانہ قسمت کی یہ نہیں پر آٹھو ہاتھ نہ بھاتے تھے والا اب زندگی کی پرچھائیں سے بھی گھبراہٹ تھا۔ میں نے اس کے زخم کی مرہم کی۔ پر اس گھاؤ کا علاج کس کے پاس تھا جو اسے اندر ہی اندر رکھائے یا تھا۔ ایک دن میں نے اس کی زندگی کے بارے میں پوچھا۔ بڑے اصرار کے بعد اس نے کہنا شروع کیا۔

ایک مائت ہم سب دوستوں نے ایک عین میں چاندنی رات مٹائی۔ کچھ ہی دیر بعد چمن کے جنوبی حصہ سے ایک بہت ہی پیاری اور سدرنی آواز آئی۔ کوئی بڑی بیٹی نے میں گاربا تھا۔ ہم اس طرف چلے۔ حسین اور نوجوان لڑکیوں کا ایک گروہ کھل رہا تھا۔ ان میں کی ایک میں کی خمار آلود آنکھیں چاند کو ٹھٹھکی باندھے تھیں گاری تھی۔ متناور اور ایکہ نہیں سکتا۔ اس ایک نظر نے کیا غضب ڈال دیا۔ دوسرے ہی دن میں نے یہ لگا دیکھ کہ وہ ایک امیر گھرانہ کی لڑکی ہے۔ گویہ قبیلہ میں اس کی تعلیم کا پہلا سال ہے اور اس کا بھائی یوسف ہے۔ ہمارے ہی کالج میں ہے۔ میں نے یوسف سے وہ سچی کر لی کہیں میری کچھ نہیں آئی کہیں میں کہیں وہ۔

وہ جھٹکے بعد میں یوسف کے منظر پر پہونچا لیکن اس وقت کہیں باہر گیا ہوا تھا۔ میں ڈرائنگ روم میں بیٹھا رہا۔ کوئی دس منٹ گزرے ہوں گے کہ وہ آگئی۔ لگتا ہی تھی باہر آئی۔ میری طرف دیکھا۔ میرا دل زور سے دھڑکنے لگا۔ فوراً ہی اٹھ کھڑا ہوا اور گھبرا کر بولا۔ جی میں سلمان

انقلاب

شام کا سامنا وقت تھا۔ نصائح و نصائحتیں
 جی دن جو کچھ اُتار دے وہاں کہنا اور یہی کہنا
 کی بات چل رہی تھی۔ سندر کی جوا سے دماغ کو تیز کر دیا۔ وہ کہتا
 بیٹہ کرسند کی موبل کو دیکھئے گا۔ سندر کی جتناب تو جیسا
 ایک دوسرے سے جو کھا کر چوں کے حسین ہتھپوں کی سی آواز
 بلند کر رہی تھیں۔
 جی اس دن کش افکارہ میں بالکل کھو سا گیا۔ اس کی نظروں
 سے اٹھنا نہ آتا۔ دماغ کی وہ اقامت ایک ایک کے سامنے آتے تھے۔
 غریب کی زندگی، کتنا بزرگ زمانہ ہوتا ہے وہ جب کہ ایک غریب
 کے لئے نہیں نظر نہیں ہوتی ہے۔ غریبوں کی رشتہ داروں وغیرہ کی
 موجودگی میں جی وہ بزرگی خالی چھاتی پڑتی ہے۔ ایسے وقت
 بھگنا تھ دینے سے انکار کر دیتے ہیں!

تاکہ اس کا غم آگے آپ پر پڑتی ہوئی لاش
 جا رہی۔ اس کے خاویں کا سلسلہ قطع ہو گیا۔ وہ بغیر کچھ بچے
 کے تھا۔ عیاں عیاں کہتا ہوا سندر میں کوہ پڑا اور تیرتا ہوا
 لاش کے پاس گیا۔ لاش کی ریب دا میں ہونے لگا تو اسے
 محسوس ہوا کہ اس کے بازو میں اب جتنی قوت نہیں ہے کہ
 اتنی دور لاش کے ساتھ جاسے۔ بہرہ جی خدا آدم کی موت کے
 بڑھ گیا۔ ساحل پر آکر اس نے اسے سبزہ زار پر ڈال دیا۔ ایک
 حسین و شیرازہ — نو بانی بیکر لطیف مجسمہ بن گیا۔
 انھیں، نماز اور جوش — جی اس حسن کے مجسمہ کو دیکھتے
 میں کھو گیا۔ تاکہ وہ نہ نکلا۔ در اسے ہر ایک شے کے
 لئے کھینچنے کی طرف بل پڑا۔ کراں پرل اور اہل
 سب ڈانٹا جاتا ہے تھے لیکن ایک اب جا رہے تھے چھوٹے
 پریشانی عیاں جی۔ اہل کھرے ہوئے سفید سوت میں موبس
 خزانہ خزانہ اہل کاری کی طرف جارہے تھے
 جی نے سلام کیا اور ڈاکٹر نے جواب دیا لیکن آگے بڑھ گئے جی
 آگے بڑھ کر ڈاکٹر کے ہاتھوں میں آگے لگا ڈاکٹر صاحب پانچ

کے لئے رک جائے۔ ایک لاش کا معائنہ کر لیجئے۔ بڑا کم ہو گا۔
 نہ کچھ بڑا کام صاحب!
 جی نے بغیر کچھ جتنات امیر لوج میں اس وقت ہم کو
 جی نے اٹھانا کھانے مارے تھے۔ کیا دن بھر کو وقت نہیں ہے؟
 جی نے ڈاکٹر صاحب ایک بے بس لڑکی ہے آپ کا فرض ہے کہ
 اس کی حالت کو دیکھیں۔ ڈاکٹر صاحب اپنے اولین فرض کو نہ بھولتے
 جی کی آنکھوں سے آنسو چھلک پڑے!

ڈاکٹر — (کچھ سوچ کر) اچھا! جی ہم دیکھ لیتے ہیں!
 ڈاکٹر لڑکی نے لڑکی کو دیکھ کر اپنی تمام کوششیں اسے
 ہوش میں لانے کی کرنے لگے۔ جی اس کی میران و شش شدہ نظر آگے
 منت اور چہرہ کے آگے چہرہ کو بغور دیکھ رہا تھا!

ڈاکٹر — لڑکی کی کچھ امید ہے!
 جی — یہ خبر آپ کی زبان کو مبارک کرے!
 ایک خط کی بد و بدباد کی بخشش کے بعد لڑکی نے حرکت
 کی اور اٹھ کھولی۔ دو ایک ایک خاک ڈاکٹر نے ہاوی اور دو بچے شہر
 دوسری خوراک دینے کی تاکید کر کے چلا گیا۔ دوسری جی نے دو ایک
 دوسری خوراک و دیری اور تمام رات بیٹھے گزار دی!
 صبح ڈاکٹر لڑکی نے آکر مریضہ کو دیکھا دوسری دو آنچر
 لڑکی کو مبارک باد دیتے ہوئے دوسرے مریضوں کی طرف متوجہ
 ہو گیا۔

ایک مریضہ میں سسرن بالکل تندرست ہو گئی۔ وہ آج
 کچھ دوا س جی جی نے دریافت کیا: تو سسرن مزان کیا ہے؟
 سسرن کے سوکھے ہونے میں برا کیسی سسرا سسرا کھیل گئی اور وہ
 بولی: اب مجھے کیا ہو گا۔ ایک بار موت کے منہ سے نکل آئی زہول
 جی دوا یاں جو برا کا انسان کی کیا ب ہوئے ہیں یہ تو بھاری
 قسم تھی آگے سے موت کا بھی تجربہ کر لیا!

سسرن — کیا میں آپ کے متعلق جانتا ہوں دریافت کر سکتی ہوں؟
 جی — لیکن اس کی پیشہ کیا تو مجھے بتا سکتے ہیں تم نے سندر کی
 خوشی میں جانا کیوں پسند کیا —؟
 سسرن — آپ میرے حسن اور بچہ سے کس طرح آپ سے

بات پوشیدہ رکھوں۔ آج سے چھ سال قبل جب کہ میں دس سال کی تھی اپنے والدین کے ساتھ کہیں جا رہی تھی۔ دوران سفر میں ایک حادثہ پیش آیا۔ زمانہ وہ بین چندہ عاشق کس آئے اور کئی عورتوں کے سونے کے زبورات لیکر جاتی تھیں سے کوڑا کہیں غائب ہو گئے۔ کچھ عرصہ بعد ایک چھوٹا سا لاشیں آیا۔ ٹرین ہاں کی عورتیں رو رہی تھیں۔ خوب شور مچا رہا تھا۔ ایک دوست کی کچھ خبر نہیں تھی تھی اسی وقت اگلی ٹرین روانہ ہوئی۔ میں بڑی تھی ایک چھین لڑکی میرے پاس آئی اور مجھے اپنے ساتھ لیکر اپنی والدہ کے پاس گئی وہ بہت اچھی تھیں مجھے چار کیا اور اپنے ساتھ ٹرین میں لائیں مجھے والدین بہت یاد رہے تھے میں سوچتی تھی کہ ملے۔ مجھے والدین مل جائیں گے۔ میں ان لوگوں کے ساتھ ہی رہا کرتے لیکن یہ سوچ گئی میرے ایک نئی اینٹنگ دولہا اور امید کے ساتھ اچھی بہنوں قسم کے ہوائی قلعے بنائی لیکن باوجود ان کے عالم جو کہ میری امیدوں کا تباہ کیا تو کتنے سار کر دیتے۔ اسی امید میں ملنے سے سال گزر گئے۔ میں اپنی محنت کو کھاتے کہتی تھی وہ مجھے بیکار کر رہی تھیں۔ انھوں نے مجھے کھر کر لائیں رکھ کر اعلیٰ تعلیم دلوائی۔ ان کی جائز کیا تھیں۔ دو شادی ٹھڑ تھیں اور دو زلیخیم تھیں۔ گری کی جھپٹوں میں ہم لوگ سیر کرنے نکلے۔ ارادہ تھا کہ میری آئیں گے اور یہاں کی خوب سیر کریں گے اس لئے ہم لوگ پہلے نوٹ کر کے سورت آئے۔ سورت کے بعد اچھا میں ہم نے چاندنی رات میں کشتی کی سیر کا پروگرام بنایا اور چار کشتی ڈولہ ہم سب اپنی اپنی کشتی پر روانہ ہو گئے۔ کچھ دور نکلے تھے کہ ہماز دور سے چلنے لگی۔ بڑی باجی نے کہا کہ "اب واپس ہوا چاہیے کہیں ہم لوگ غصت میں نہ بیٹھ جائیں۔" ہمیں باجی نے بھی تائید کی لیکن چھوٹی باجی نے کہا "ہر لوگ اتنی ہوا سے ڈاکیں کشتی نہ دل ہو"۔ ہر دور سے بولیں۔ چلو نہ رہیں ہم لوگ آگے چلے گئے۔ ہمیں کون آگے نکلا ہے۔ میں نے اپنی کشتی کو آگے کر دیا۔ بہت دیر تک ہم دونوں کا مقابلہ ہوتا رہا۔ چھوٹی باجی مجھ سے آدھ نیل پچھلے۔ لکھیں۔ میں نے دیکھا کہ وہ بھی واپس جا رہی ہیں اور مجھے سب اہلکارے سے

واپس لاری تھیں۔ میری کشتی بیچ بندھ رہی تھی کہ وہی تیز ہوا نکلے طوفان کی صورت اختیار کر لی۔ میرے کان پانی کے شور و غل سے بہرے ہو چکے تھے۔ آنکھوں کے سامنے تاریکی چھا گئی۔ ہر طرف پانی۔ اور پھر طوفان۔ میرے دلخ کا توازن بھی درست نہیں۔ کہ میں کچھ سوچ سکتی۔ بالآخر تنگ کر کشتی میں بیٹھ گئی۔ کچھ عرصہ بعد ایک دو میری کشتی حیات غرقِ سمندر ہو گئی۔ مجھے نہیں معلوم پھر کیا ہوا۔

اس لئے اپنا افسانہ غم ختم کر کے کچھ چہرہ پر دکھا دالی تو دیکھا کہ کچھ کے رخسار پر آنسو ٹپک رہے ہیں۔ وہ بولی۔ "میں تجھس بات کی حد سے زیادہ خوشی چھکا آپ جیسے نیک اور ہمدرد انسان نے مجھے پایا۔ میں اپنی قسمت پر قناعت ہی ناکر دوں کہ ہو گا۔ کچھ اپنے آنسو خشک کرتے ہوئے کہا "شاہد کو میرے ساتھ خوشی حاصل نہ ہو سکے کیونکہ میں ایک غریب انسان ہوں۔" آنسو غنہ کہا۔ "خدا نہ کرے میں اتنی احسان فراموش نہیں ہوں جو اپنی خوشی کا کھانا کر دوں۔ آپ کا کچھ بھی نہیں!"

ابھی جتنی نے کچھ بھی جواب نہیں دیا تھا کہ کچھ کے دس ادب سے ٹرے تاجر شوکت حیدری کا ملازم کالہ کر گیا۔ اداس نے بتایا کہ شوکت صاحب نے ہمیں باور فرمایا ہے۔ کچھ فوراً ملازم کے ساتھ شوکت منزل۔ روانہ ہو گیا۔ شوکت صاحب کچھ سے بہت محبت سے ملے۔ وہ کچھ کے حسن اخلاق اور لیاقت سے بہت خوش تھے اور کچھ کو کچھ کی طرح چاہتے تھے۔ کچھ کو دیکھ کر فرمائے تھے۔ "بیٹا طبیعت بہت گھبراہٹی تھی اور تم سے کچھ کام بھی تھا اس لئے تمہیں جو معلوم ہے کہ میرا بائیس سالہ اکلوتا لڑکا لندن سے واپس آتے ہوئے حرکتِ قلب کے بند ہو جانے سے مر گیا۔ اب تو صرف خوشخبری میری زندگی کا سہارا ہے۔ وہ دور ویک واپس آجائے۔ میں سیر کی غرض سے شہر نکلتا ہوں۔ میرا ارادہ ہے کہ میں اپنی جان کا کچھ حصہ تمہارے نام لکھ دوں۔" کچھ نے مجھے ہنس دیا۔ لیکن کیا میں اس قابل ہوں۔ "شوکت صاحب نے انوشاک کہہ دیں کہا کچھ میں تم کو ہمیشہ اپنے بیٹے کی طرح چاہتا ہوں۔ ایک حسین خوش اخلاق۔"

قریب رہتے ہوئے بھی اتنا تک ایک دو سرے سے ناواقف تھے۔ میرا خیال ہے کہ یہ کوئی بچی کے رئیس اعظم شوکت حیدر صاحب کی ہے۔

عجی نے کہا: جی ہاں آپ کا خیال صحیح ہے۔ وہ مجھے بہت جانتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے یہ عالیشان کوٹھی مجھ تنہا انسان کے رہنے کے لئے دی۔ ڈاکٹر نے قحب سے پوچھا: تنہا —

کیا آپ کے ساتھ اور کوئی نہیں سوائے سسر کے؟
عجی نے اپنا غم چھپاتے ہوئے کہا: ڈاکٹر صاحب! فیصلوں کا دنیا میں کوئی پتیلں رہتا ہے جو اپنے رشتے میں وہ بھی خیر یا

کی طرح سلوک کرتے ہیں وہ ایک دلچسپ کم حشیت انسان سے سننا ان شان مجھے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے اصرار کے ساتھ کہا: کیا آپ اپنے تعلق کو بتانے کی تکلیف کریں گے؟

عجی نے سندی سانس لیتے ہوئے کہا: آپ کے اصرار سے مجبور ہوں ورنہ میں نہیں جانتا کہ اپنا افتادہ عجم کی کونسا کراچی عجم میں شریک کروں۔ نیچے نیچے۔ میری عمر تیرہ سال کی تھی اس

میں انگریزی کی نوں ساعت میں پڑھتا تھا۔ میرے والد صاحب بہت بڑے رئیس تھے ان کا تین کوا خیال نہیں اور بھی بہت بڑی جائیداد کے مالک تھے۔ میری زندگی کا ایک ایک لمحہ سرت

کے کہو ارہ میں بھولنے کوڑتا تھا ہمارے شہر میں اس وقت ہفتہ کی وبا پھیلی ہوئی تھی والدین کو کس اکلوتا تھا اس لئے انھوں نے

مجھے پاس کے ایک گاؤں میں اپنے قریبی کشتہ دار کے پاس بھیج دیا تھا لیکن موت کے ظالم نے مجھ سے وہ نہیں بچ سکا اور دو نوں کے بعد مجھے بکسہ بخت کو سدا رہا۔ اس کے بعد ہی چاکر

چچا ماموں وغیرہ ماٹا دیہات میں ہو گئے۔ اب میرا دنیا میں کوئی سہارا نہیں تھا۔ میں فدا خاں سے تیار ہو گیا۔ مجھے اور شہنشاہ

ادیت پتھر چاکرے۔ لیکن جن کے کھڑکی میں تھا وہ بہت نیک دل بزرگ تھے۔ ملا لکھان کے صاحبزادے وغیرہ مجھے سحر کرتے تھے۔ تاہم اس نیک مصلحت بزرگ نے مجھے میرک اور میرک کے بعد ایف اے کروایا۔ وہ چاہتے تھے کہ میں ہمیشہ ان کے

ساتھ رہوں لیکن میں اب زیادہ تکلیف برداشت نہیں کر سکتا تھا۔

اعلیٰ تعلیم یافتہ عجم میں وہ خوبیاں ہیں جو آج کل کے جوانوں میں نہ ہوں گی۔ مجھے یہی کہ میرا اکلوتا بیٹا اس دنیا سے چل بسا

قریب نے انھیں دیکھ کر گناہ کا حکم دیا کہ تو میں جیسی طرح اب بھی چاہتا ہوں۔ میں نے اور مختاری خالہ! ایک شوکت نے

فطری طور پر ارادہ کر لیا ہے کہ وہ دنیا میں تمہارے نام لکھ دیا آج سے تم ان کے مالک ہو گئے اور باقی وہ اپنی زندگی خود کشید

کے نام سے بعد وہ ان دونوں کا مالک ہوئی۔ مختاری کیا رہے ہے۔ اب مجھے نے مرحوم کا ادب کے ساتھ کہا۔ آپ کی خوشی

کو اپنی خوشی سمجھنا میرا فرض ہے۔
شوکت: تم یہ تہ سوچو کہ اگر تم میری رائے سے اتفاق نہیں

ہو تو میری طاقت میں بھی آئے گی؟
عجی: اب آپ میرے بزرگ ہیں اور ہر کام کو میری اجازت

کے بغیر کریں گے مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔ لیکن —
شوکت صاحب نے زور دیتے ہوئے کہا: ہاں بولو۔ ترک کیوں

شراؤ نہیں دیتا۔ — عجی خرم سے مرحوم کاٹے بولے۔ میرا مطلب

خود بخیر ہے ان کی رائے بھی تو بہت ضروری ہے۔ شوکت صاحب اس کے دل سے شک کا لہجہ کی روشنی کرتے ہوئے بولے: تم اس

کی طرف سے مطمئن رہو اس نے کبھی میرے کسی حکم کو نہیں ٹالا ہے۔ وہ زیادہ تر یورپ میں رہی لیکن مشرقی خاقان کا وقار اتنا تک

اس کے دل میں لکھ ہے وہ بہت نیک خدمت گزار و خوش مزاج اور با وفا بیوی ثابت ہوگی! — عجی نے اپنی خوشی چھپاتے ہوئے کہا:

میری خوش نصیبی ہے۔ میں آپ کا مومن احسان ہوں! شوکت صاحب نے کہا: اچھا اب فخر کا آرام کرو۔ ضرورت ہوگی تو قہر ملاؤں گا۔

عجی نے سلام کیا اور داموں کے ساتھ گھر واپس چلا گیا۔

دوسرے روز شوکت صاحب نے اعلیٰ پیمانہ پر پی پانی پٹی دی۔
دل کھول کر خوشیاں منائی گئیں۔ پھر بیگم نیازی نے بیگم حمید کا
شکر ادا کر کے ہونے دوسرے دن اپنے گھر جانے پر مدعو کیا۔
بیگم شوکت اور دیگر بیگمات کو سرسبز کے بچپن کا اور والدین
سے ملنے کا واقعہ سن کر بہت خوشی ہوئی اور سب نے بیگم نیازی
کو مبارکباد دی اور رخصت ہوئیں۔ پھر خجی اپنی حسین بیگم عرشید
کو ساتھ لیکر انچی کو ملنے واپس آگیا۔ اب وہ بیچر نہیں بلکہ وہ
کمپیوں کا تنہا مالک اور زمین غلہ کا داماد و افتخار ہے اس
انقلاب زندگی پر سوچا کرتا۔

کے سلطان یحییٰ خور

دوسرے سیکرٹریا دیاجس وقت انہوں نے دلی کے نواب کی بیگم سے
کھٹو کے بچی کشتہ کی بیگم اور لڑکیوں سے تعارف کروایا۔ بیگم
متعجب تھیں ہوں سے انہیں دیکھ رہی تھی کہ وہ یا میں مونی کا نکاح
کی جادی تھا۔ اور وہ کاکا کی اپنی جگہ سے اٹھ کر "بابی" کہتی ہوئی
ایک حسین لڑکی سے جا ملتی تھیں۔ اسے سرسبز نے تم۔؟ کہتی ہوئی
بڑی اور مضحکہ خیز باقی اور غلہ جان قریب آئیں۔ اندر سے باہر تک
شور مچ گیا۔ سرسبز نے تمام واقعہ سنایا اور کہا کہ جس نیک کی
نے مجھے پیا یا کسی کی تقریب شادی میں آج ہم سب خرم ہیں!

غزل

ہر بار نازِ حسن تو جلوں کو واکرے مانگو دعا کہ عشق بھی وعدہ وفا کرے
اس بے وفا کو دم تو آتا ہے عشق پر آخر غریب گرئی انداز کیا کرے؟
تسخیرِ ہفت چرخ بھی کیا کچھ محال ہے یہ شوقِ آرزو بھی کہیں اکٹھا کرے؟
کہتے ہی دشت و دریا بھی ہوتے ہیں لالہ زار کچھ صبر بھی تو بلبل رنگیں نوا کرے
خوں نابہ بارِ اشک کی پریش نہیں وہاں یوں چاہے رنگ و نور کا دیا بہا کرے
کیا صدمہ ہائے ہجر کی مر کر ملے گی داد؟ یا جب کہ دل کی تیز غلاش انتہا کرے

تنگ آگیا ہوں کثرتِ امید و بیم سے

اس کشمکش میں حشر چھپا ہوا خدا کرے

حرمِ خیر آبادی

قانون کی ابتداء

کے دلوں میں محفوظ کر دیا جاتا ہے۔

قابل تحریر زمانے کے معاشروں میں تعزیری تہدیک کا کم پتہ چلتا ہے ابتداء کی قسم کے سادہ معاشرہ میں وہ انشیں جو عام جنایات کے تحت آتی تھیں زیادہ تر صورت مرد کے از یا تعلقات میں تھیں۔ سحر یا سحر جادو، قبائلی رسوم کا نکل توڑا جانا، اور جبرک اور مالک چوروں کی چوری اور اسی طرح کے بعض افعال قابل مزا سمجھے جاتے تھے لیکن خود کیا جائے تو تعزیری تہدیک میں صورتیں ایسی صورتوں کے لئے تھیں جبکہ عام جبرک رسم کے خلاف کوئی حرکت کی جائے اور اس کا مقصد یہ تھا کہ تہدیک کی مذہبی یا اخلاقی تقدس حاصل رہے۔ مذہبی یا رسمی تہدیک کی ابتداء غالباً اس طرح ہوتی کہ بعض افعال کی وجہ سے کسی فرد یا جماعت کو مذہبی یا ذہنی طور پر ناپاک اور اجماعت قرار دیا جاتا اور اس ناپاک کو دھوکہ دے کر پھر اسے پراشحت کی ضرورت ہوتی ہے جو کچھ ضرور یہ ہے کہ کسی فرد کے فعل سے جو ذہنی قوم متاثر ہو جاتی ہے بعد میں جب سیاسی یا اخلاقی اعتبار سے اس شخص یا جماعت کو حاصل ہو گیا، گو وہ سادہ شکل ہی میں بھی ہو اس کے اقتدار سے احترام یا اس کے احکام کی خلاف ورزی بھی عام جنایت ہو گئی۔ اور اگر اس معتد ر ہستی کی ذات کے خلاف کوئی فعل ہو تو اس کے لئے بھی تعزیری تہدیک تھی۔ نیز ایسا فعل بھی جو عوام یا خاندانی جنایت کی حد تک پہنچتا تھا اس فرد کے خلاف لے لئے جاتے تھے عام جنایت تصور کیا جانے لگا۔

خاندانی یا خاص جنایات کی صورت میں جب کوئی فرد یا جماعت کسی ضرر نقصان یا ہرجے سے متاثر ہوتی ہے اور اس کے جائز حقوق پر ضرر پہنچتا ہے تو وہ عدلیہ کی مقید رہائی کے روبرو جارجار کے لئے درخواست کرتی ہے۔ یہ مقید رہائی اسی قوم کے کسی دوسرے فرد یا جماعت کو مورد الزام ٹھہرائی اور محکم دیتی ہے کہ مدعی طلبہ کی نقصان کی خاطر عوام کو تلافی کرے۔ اور یہ تلافی اکثر دیشتر اور ان بارہ کی صورت میں طلبہ ہوتی ہے۔ دوسرے نظروں میں خاندانی جنایت ایک ایسا فعل ہے جس کے لئے بازو دہی یا پھر انڈ (Mendicantism) کا

دین پاؤند کے الفاظ میں قانون دراصل اس معاشرے کا یا سوشل کنٹرول کا نام ہے جو ایک منظم سیاسی معاشرے کے ذریعہ باقاعدہ ملزم پر عمل کر رہا ہے۔ اور اگر تصور کیا جائے تو قانون کا دائرہ عمل منظم قانونی تہدیکوں ہی سے عبارت ہے جس معاشرے میں قانونی تہدیک نہیں ہوتیں وہاں افراد پر جو پابندیاں اور فرائض عائد ہوتے ہیں، وہ قانون کی نہیں بلکہ رسم و رواج کی بنا پر ہوتے ہیں۔ اس لئے یہ کہا جاسکتا ہے کہ سادہ معاشرہ میں قانون نہیں ہوتا گو کہ میں تمام معاشرہ میں رسم و رواج کی پابندی ہوتی ہے اور ان کے پیچھے کچھ تہدیکیں بھی ملتی ہیں۔

موجودہ زمانے کے قانون میں دیوانی اور فوجداری جو امتیاز کیا جاتا ہے اسے قدیم پارہ ساج کے مطالعہ میں پیش نظر رکھنا مشکل ہے۔ قدیم اور ابتدائی قانون کو دراصل عام جلیات اور خاندانی یا خاص جنایات کے لحاظ سے دیکھنا چاہئے۔ بات یہ ہے کہ کوئی فعل اس وقت عام جنایت سمجھا جاتا ہے۔ جب اس کی وجہ سے پوری قوم یا سماجی اقتدار کے دستور یا نمائندوں کی جانب سے کوئی باقاعدہ اور منظم ضابطہ مہین ہوتا اور ایسا ضابطہ کے ذریعہ قوم کے کسی فرد پر کوئی دادرسی یا وجہ عاید ہو سکے۔ اور اگر اس کی خلاف ورزی ہو تو قوم یا اس کے نمائندے خلاف ورزی کرنے والے کو سزا دے سکیں یہ ضابطہ سے تعزیری تہدیک کہا جاسکتا ہے دراصل اس قوم کی طرف سے خاندانی فرد کے خلاف ایک رد عمل کا نتیجہ ہے کیونکہ وہ ایک توری اور عین اخلاقی جذبے کو عین لگاتا اور اسی طرح سلاج کو دکھائی دیتی ہے۔ اس کا فوری اثر تو یہ ہوتا ہے اجتماعی طور پر اخلاقی غصہ کے جذبات ظاہر ہونے میں اور اس طرح سلاج کے نقصان کی تلافی ہوتی ہے۔ اور اس کا آخری اثر یہ ہوتا ہے کہ اس اخلاقی جذبے کو قوم کے تمام افراد

کی تہدید ہوتی ہے۔ امدادی نے قبل تحریر زمانے کے خاندانی جنایات کے قانون کو موجودہ قانون تک یا سبوں لاکھ مال سمجھا سکتا ہے۔ لیکن ان دونوں میں دراصل اہم فرق بھی ہے۔ موجودہ قانون کے لحاظ سے سبوں لاکھ مال صرف اتنے ہی افعال آسکتے ہیں جن کے لئے ہر جادہ یا جلیبہ البتہ اتنا ضرور ہے کہ ان افعال کو پوری قوم کے خلاف نہیں سمجھا جاتا۔ گو دیوانی یا سبوں قسم کی تہدیدوں سے مدعی علیہ ہر جادہ ادا کرتا اور رقی کاٹنے سے نقصان اٹھاتا ہے۔ ہم اس کے لئے یہ تاویلی سزا نہیں ہوتی۔ موجودہ سبوں لاکھ مال میں خالی صورتوں میں حاکم عدالت تا حدی سزا میں دے سکتا ہے لیکن شرط یہ ہے کہ جو مسرت پہنچانی گئی وہ پوری قوم کے خیال میں بوجھ ہو چکا ہے۔ موجودہ قانون میں جب کوئی فعل انفرادی کے خلاف سرزد ہو امداد ساتھ ساتھ مسرت بھی پہنچے تو ایسے فعل کے خلاف دیوانی اور خودی دونوں قسم کے چارہ کار ہیں۔ چوری یا قتل کے لئے جو سزا دی جاتی ہے اس میں زیادہ زور اس چیز پر دیا جاتا ہے کہ وہ پوری قوم کے خلاف ایک جرم ہے۔ اس پر کہ اس فعل کی وجہ سے جن اشخاص کو تکلیف یا مسرت پہنچی ان کو اس کا بدلہ دیا جائے۔

ان قبل تحریر زمانے کے معاشروں میں خاندانی یا خاندانی جنایات عام طور پر چار پانچ چیزوں پر مشتمل تھے۔ جان سے مارنا، زخمی کرنا، چوری، دغا، ختمہ ادا کرنا۔ ان افعال کے متعلق ایک فقہور ہے کہ یہ قوم کے کسی فرد کے خلاف سرزد ہو چکا ہے اور اس کے ساتھ ہی دوسرا فقہور یہ ہے کہ یہ خلاف معاشرہ افعال بھی سمجھے جاتے ہیں جو اخلاق عامہ کو نقصان پہنچاتے ہیں۔ ایسے افعال کے خلاف بازو دیا اور دو دو تہدیریں ہوتی ہیں۔ دوسرے الفاظ میں ایک طرف تو مسرت کے نقصان کی تلافی کا خیال ہوتا ہے اور دوسری طرف اس شخص کی سزا کا جس نے ضرر پہنچا یا مثال کے طور پر بعض بدعتی قبیلوں میں یہ وہ ہے کہ جب کوئی شخص دوسرے کا مال چرانے تو اس کے لئے کسی دینی قیمت ادا کر دیا کرتی رہتی ہے۔ اگر نہ

دیکھا جائے تو خاندانی جنایات کا قانون دراصل ایک ضابطہ ہے جس کے ذریعہ معاشرہ یا قوم کے اندر وہی جھگڑوں سے پیدا ہونے والے معاشرتی مریضوں کو علاج کیا جاتا ہے۔ ایک سرفرے کے کسی فرد نے دوسرے فرد کے خلاف کوئی فعل کیا ہو اور اس سے اس دوسرے فرد کو محسوس ہو کہ اسے مسرت پہنچی تو اس سے عام معاشری زندگی میں ایک ہیجان پیدا ہو جاتا ہے۔ اور جب تک مسرت کے نقصان کی تلافی نہ کی جائے یہ دور نہیں ہوتا۔ اسی لئے ازلیہ کے معنی قانون کے لحاظ سے جب تک حاکم عدالت تمام مختلفہ فرقوں کی نفسی زندگی اس وقت تک اس کا فیصلہ خلاف انصاف سمجھا جاتا ہے۔ بہر حال عام جنایات اور خاندانی جنایات کے فرق سے اتنا ضرور پتہ چلتا ہے کہ قانون کیا اتنا داکٹر نقطہ سے نہیں ہونی چاہئے کہ اس سے مسرت ہو جائے کہ وہ فعل جو قوم کے کسی فرد کے خلاف عمل کیا اسے اور جس کی وجہ سے قوم کا اخلاقی مذہب متاثر ہو اس کے پیچھے تین تہدیریں ہوتی ہیں عام یا اخلاقی تہدید جس کی وجہ سے قوم خاندانی کی ہر طرح مخالفت کرتی ہے اور اسے خطا وار سمجھتی ہے۔ دوسرے کی یاد دہانی تہدید جس کی وجہ سے خاندانی کے اندر مذہبی یا مالی یا جھوٹ پن کی ایک ایسی حالت پیدا ہو جاتی ہے کہ خود اس کے لئے اور پھر ان سب کے لئے جن سے اس کا تعلق رہتا ہے بڑا خطرہ رہتا ہے۔ ایسی صورت میں دم کے معانی مذہبی طریقوں سے اس کو پاک کیا جاتا ہے۔ یعنی باپ کا پرستیت ہوتا ہے۔ اگر یہ گناہ ادا نہ ہو تو خیال یہ ہوتا ہے کہ اس گناہ کی وجہ سے وہ بیمار ہو جاتا گا۔ یا مر جائے گا۔ تیسرے تہدیریں یہ ہیں کہ اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ قوم بعض اشخاص کے ذریعہ جن کو وہ عدلیہ یا جج یا عسکری ہے خطا کار کو سزا دیتی ہے اور اس سزا کو یا تو اس فعل یا جائز کے خلاف عام اور اجتماعی طور پر اخلاقی غصہ کا مظہر سمجھا جاتا ہے یا اس مذہبی یا خاندانی باپ کو روکنے یا اسے دور کرنے کا ایک ذریعہ۔ یا پھر دونوں۔ اس کے خلاف اگر کسی فعل کا اثر ہو کہ کسی شخص یا

اشخاص کے حقوق متاثر ہوں تو مستغیر مواخذہ یا جزا کا مطالبہ کرتا ہے۔ اور جب رسم بھی ایسے مواخذہ اور بدلے کو جائز تصور کرے اور اس کے لئے چارہ کار بھی مہیا کرے تو ظاہر ہے کہ مواخذہ بھی تہذیب کا اثر رکھے گا۔ قبل تحریر حاضر میں جنگ کے لئے ہی ایسی تہذیبی چٹانیں بعض قوموں میں جنگ کو ہی مواخذہ سمجھا جاتا تھا جیسے ایک فریق دوسرے غامی فریق کے خلاف اختیار کرتا ہے۔ اس کے لئے چند رسوم بھی ضابطہ کے طور پر رائج تھے جو موجودہ قانون بین الاقوام کے مشابہ ہیں۔ چنانچہ آسٹریلیا کے بعض قبیلوں میں جنگ کے متعلق آج تک یہ تصور ہے۔ ضابطہ اور منظر طور پر بدلے لینے کا طریقہ بھی اسی "مواخذہ" کی تہذیبی ایک مثال ہے۔ اگر کوئی آدمی جان سے مارا جائے خواہ وہ ارادی طور پر ہو یا حادثہ ہو تو اس سے اس کے خاندان، قبیلہ یا فرقے کو جو ضرر پہنچتا ہے اس کی تلافی ضروری ہے۔ یہ مستغیر گروہ کا حق سمجھا جاتا ہے کہ بدلے بلکہ اکثر و بیشتر تو یہ اس کا فرض ہو جاتا ہے۔ بات یہ ہے کہ مواخذہ کو رسم کی طرف سے حواز ملتا تھا۔ بعد میں *Lex Talionis* قانون مواخذہ کے لحاظ سے یہ اصول بن گیا کہ جس قدر ضرر پہنچا جاتا ہے اس کی پوری تلافی ہونی چاہیے اور انتہائی ذمہ داری کے اصول کے لحاظ سے تو بدلے لینے والوں کے لئے یہ بھی کافی ہو گیا کہ خود قتل کی جائے کسی اور کو قتل کرویں مثلاً اس کے بجائی کو یا بعض صورتوں میں قبیلے کے کسی فرد کو جب بدلہ کا یہ وارہ بہت منظم ہو گیا تو ایک قاتل گروہ اپنے ہی فرد کی موت کو بدلے میں گوارہ کرنے لگا لیکن اس کے بعد یہ مواخذہ کا منسلک جاری نہیں رہ سکتا تھا۔ اس کے علاوہ مواخذہ کی تہذیب اس صورت میں بھی استعمال ہوتی ہے بلکہ ایک شخص دوسرے کو کوئی ضرر پہنچاتا ہے چنانچہ خراب حالات میں ایک شخص کو حق پہنچا ہے کہ کسی دوسرے کو بدلہ لے لے دے۔ اس سے پہلے کے قبیلوں میں جب کوئی فرد کسی دوسرے کے یا غرضی ضرر پہنچاتا ہے تو مستغیر کا یہی

ہے کہ بزرگوں کی اجازت کے بعد ضرر پہنچانے والے سے مثل قسم کا بدلہ لے لے مثلاً اس پر برہمچا یا بھلا چھینک دے یا جسم کے ایسے حصہ پر جو جان لیوا نہ ہو، مثلاً ران پر برہمچا چھینک دے مواخذہ کی تہذیب کی تمام مثالوں میں رسم کا ایک ضابطہ معلوم ہوتا ہے کہ مستغیر کے نقصان کی تلافی کی جائے اور اس کے لئے عام طور پر ضرر رساں شخص کو مثل قسم کا ضرر پہنچایا جاتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ حق پر عمل ہو تو اس کی تلافی کی جاتی ہے اور مستغیر شخص کے ذہن سے یہ بات نکل دی جاتی ہے کہ اسے ضرر پہنچا یا کہ اسے بدلہ لینا ہے۔ بہت سے مشاہد میں مواخذہ کی جائے اور ان کی قرارداد کا بھی ایک طریقہ کار ملتا ہے یعنی ضرر پہنچانے والے اشخاص مستغیر فریق کو جذباتی شہاد دیتے اور اس کو نقصان کی حد تک مطمئن کر دیتے ہیں۔ اس طریقہ پر مستغیر کی اطمینان دہانی، قبل تحریر حاضر میں کافی رائج معلوم ہوتی ہے۔ لیکن یہ عجیب بات ہے کہ ان کے سچے جنگ کوئی نظام قانونی نوید پاسکا۔

قانون کا بہت ارادہ اور اس کے ارتقا کو سمجھنے کے لئے ان قدیم قبیلوں کا مطالعہ بہت دلچسپ اور مفید ہو سکتا ہے جو آج بھی اپنی قدیم روایتوں کے ساتھ موجود ہیں۔ مثال کے طور پر شمالی کینیڈا کے بعض شکاری قبیلے جو "لوورک" کے نام سے مشہور ہیں ان میں سے ہیں تو بنی و کر میں یہ چھوٹے دیہاتوں میں بستے ہیں اور ان کی کوئی سیاسی تنظیم نہیں۔ قوم کے خلاف کوئی فعل یا جرم سرزد ہو جائے تو اس کے لئے ان کے ہاں کوئی ضابطہ مستغیر نہیں اور اسی لئے ان کے ہاں عام جانیات کا کوئی قانونی نوید نہیں ہے۔ اگر ایک دوسرے کو ضرر پہنچے یا ایک شخص دوسرے کو ہراسہ دے تو عام رسم کے مطابق ان کو ان کی قرارداد سے کام لے جانا پڑتا ہے جتنا جانی یا مال یا زمین یا حق کی صورت میں سچائی اور ان کے اپنا جانی یا مال اگر کسی شخص کو جان سے مارا جائے تو ان کے یا خاندان یا قبیلے کے قریبی رشتہ سے بدلہ لے لیا جائے۔ اگر آپس میں جھگڑا ہو جائے تو جھگڑا ختم ہونے کے بعد ان کے قرض چٹا ہے کہ وہ دوسرے

اشخاص کے حقوق متاثر ہوں تو مستغیر مواخذہ یا جزا کا مطالبہ کرتا ہے۔ اور جب رسم بھی ایسے مواخذہ اور بدلے کو جائز تصور کرے اور اس کے لئے چارہ کار بھی مہیا کرے تو ظاہر ہے کہ مواخذہ بھی تہذیب کا اثر رکھے گا۔ قبل تحریر حاضر میں جنگ کے لئے ہی ایسی تہذیبی چٹانیں بعض قوموں میں جنگ کو ہی مواخذہ سمجھا جاتا تھا جیسے ایک فریق دوسرے غامی فریق کے خلاف اختیار کرتا ہے۔ اس کے لئے چند رسوم بھی ضابطہ کے طور پر رائج تھے جو موجودہ قانون بین الاقوام کے مشابہ ہیں۔ چنانچہ آسٹریلیا کے بعض قبیلوں میں جنگ کے متعلق آج تک یہ تصور ہے۔ ضابطہ اور منظر طور پر بدلے لینے کا طریقہ بھی اسی "مواخذہ" کی تہذیبی ایک مثال ہے۔ اگر کوئی آدمی جان سے مارا جائے خواہ وہ ارادی طور پر ہو یا حادثہ ہو تو اس سے اس کے خاندان، قبیلہ یا فرقے کو جو ضرر پہنچتا ہے اس کی تلافی ضروری ہے۔ یہ مستغیر گروہ کا حق سمجھا جاتا ہے کہ بدلے بلکہ اکثر و بیشتر تو یہ اس کا فرض ہو جاتا ہے۔ بات یہ ہے کہ مواخذہ کو رسم کی طرف سے حواز ملتا تھا۔ بعد میں *Lex Talionis* قانون مواخذہ کے لحاظ سے یہ اصول بن گیا کہ جس قدر ضرر پہنچا جاتا ہے اس کی پوری تلافی ہونی چاہیے اور انتہائی ذمہ داری کے اصول کے لحاظ سے تو بدلے لینے والوں کے لئے یہ بھی کافی ہو گیا کہ خود قتل کی جائے کسی اور کو قتل کرویں مثلاً اس کے بجائی کو یا بعض صورتوں میں قبیلے کے کسی فرد کو جب بدلہ کا یہ وارہ بہت منظم ہو گیا تو ایک قاتل گروہ اپنے ہی فرد کی موت کو بدلے میں گوارہ کرنے لگا لیکن اس کے بعد یہ مواخذہ کا منسلک جاری نہیں رہ سکتا تھا۔ اس کے علاوہ مواخذہ کی تہذیب اس صورت میں بھی استعمال ہوتی ہے بلکہ ایک شخص دوسرے کو کوئی ضرر پہنچاتا ہے چنانچہ خراب حالات میں ایک شخص کو حق پہنچا ہے کہ کسی دوسرے کو بدلہ لے لے دے۔ اس سے پہلے کے قبیلوں میں جب کوئی فرد کسی دوسرے کے یا غرضی ضرر پہنچاتا ہے تو مستغیر کا یہی

قانون کے معقول فیصلوں کا خون بہا دیا کرے۔ صرف امر و اقار اور
 ہر جانہ کی تقدیر بھی جانتی ہے اور نیت، ارادے، کینہ، غفلت
 یا عداوت پر غور نہیں کرتا۔ اگر ایک مرتبہ تو اداں قبول کر لیا جائے
 تو مستحق شخص اسی قدر کی بات مزید حکایت کا محاذ نہیں
 چڑھتا۔ تاہم اداں سے متعلقہ شخص کے مابین مصالحت کی بناء
 پر ملے ہوتے ہیں اور کسی حد تک حاکم کے پاس معاملہ نہیں
 جاتا۔ اس لئے یہاں مسیح منہوں میں غامبی خیالات کا وجود
 نہیں۔ شیک اسی طرح فلپائن کے بعض قبیلوں کی حالت بھی
 بڑی عجیب ہے۔ شمالی لوزان (Siam) کے
 کچھ بڑے علاقوں میں آج بوسے والے لوگ جن کو آف گاؤں
 کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، سیاسی لحاظ سے بہت قوم ہیں اور
 ان میں خاندانوں یا قبیلوں کا بھی کوئی نظام نہیں۔ اس کا
 اثر یہ ہے کہ مسافر لوگوں کی صورت میں معاشرہ کوئی سزا کو
 نہیں کرتا بلکہ رانے صاحبی سزا کا کام کرتی ہے۔ دوسرے
 الفاظ میں ان کے ہاں عام خیالات کا کوئی قانون نہیں
 پایا جاتا۔ اور کوئی حقیقی تقریری تہذیب بھی موجود نہیں۔ انہیں
 بعض اصول قابل ذکر ضرور ملتے ہیں۔ مثلاً کوئی شخص اپنے
 خاندان کے کسی فرد پر جادو کر دے تو اسے خاندان والے
 موت کی سزا دیتے ہیں۔ لیکن جہاں بہن سے فعل بد کا مرتکب
 ہو تو یہ کوئی جرم نہیں سمجھا جاتا۔ بد رکھی یا برادر کشی کی صورت
 میں بھی کوئی سزا نہیں دی جاتی تو ممکن ہے کہ ان خیالات
 کی دوک نظام کے لئے اہم مذہبی تہذیبیں موجود ہوں۔ اگر
 ایک شخص دوسرے پر حملہ کر دے یا ایک دوسرے کے حق کو
 متاثر کرے تو اس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ دونوں افراد کے خاندان
 ایک دوسرے کے حق کو متاثر کرے تو اس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ
 دونوں افراد کے خاندان ایک دوسرے کے درمقابل کھڑے
 ہو جاتے ہیں۔ اداں میں ماں اور باپ دونوں طرف کے
 زمین درمحل تک کے رشتہ دار تو لازمی طور پر فریق بن جاتے
 ہیں۔ مثل، زنا، بغاوت، امان کی ادائیگی وغیرہ کی صورت
 میں معاشرہ یہی ہے کہ غامبی یا اس کے خاندان کے کسی فرد

موت کے گھاٹ آنا رہا ہے۔ دوسرے افعال کے لئے ممان
 کی ادائیگی کا بھی جانتی ہے۔ ان قبیلوں میں عدلیہ کی کوئی
 ایسی سختی موجود نہیں جس کے دربر نزاعات لائے جاسکیں۔
 عام طور پر تعصبات ایسے بزرگ کے ذریعہ ہوتے ہیں جس کو مختلف
 فریقین سے کوئی تعلق نہ ہو بعض اشخاص اپنی دیانت داری
 اور غیر جانب داری کے باعث شہرت بھی رکھتے ہیں اور ان
 ہی کے پاس بہت سی نزاعات فیصلے کے لئے آتی ہیں لیکن
 یہ اشخاص کسی طرح مقتدر نہیں ہوتے اور نہ ہی یہ پوری
 قوت کی طرح نمائندگی کرتے ہیں۔ تنازعہ کے دوران میں
 دونوں فریق نہ لٹھ مارے ایک دوسرے کے مخالفت تصور
 کئے جاتے ہیں لیکن جب باعث نزاع دو ہیہ ہو جائے یا
 باہمی تصفیہ ہو جائے تو ہر مسلح ایک خاصی سرگرمی کے ساتھ
 ہوتی ہے۔ تصفیوں کے لئے رسم و رواج کی کوئی معیار مقرر
 کرتا ہے۔ اور خاص صورتوں میں تو اشخاص کی حیثیت
 کے لحاظ سے یہ معیار بدلتا بھی رہتا ہے۔ مثلاً اللہا کے لئے
 ایک اوسط طبقہ کے لئے ایک اور طریقہ کے لئے ایک ہی
 آف گاؤں کی عدلیہ کسری نظام کا رہے اس سے کوئی نظام
 قانون ترتیب نہ پاسا کیونکہ کسی عدلیہ نے اقتدار کا وجود
 ہی نہیں ہے۔ بات یہ ہے کہ جب مسئلہ ثابت حاکم عدالت
 موجود ہوں اور وہ شہادت کی جانچ پر سوال کے بعد حاکم
 یا جرنال کی بابت فیصلہ کریں تو اس سے ایک نظام قانون
 کی طرف رہنمائی ہوتی ہے۔ البتہ ایسی صورت میں صرف
 اس علاقہ نے اقتدار کی کمی ہوتی ہے جو ان فیصلوں کی باطنی
 کروا سکے۔ اگر خود کیا جائے تو بعض حاکموں میں غامبی
 باطنی خیالات کے تصفیوں کے ذریعہ ہی کوئی نظام قانون
 نشوونما پاتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں آف گاؤں کے
 سامنے آتے ہیں اور ثالث رسم کے بنائے ہوئے قواعد
 عمل کا اعلان کرتے ہیں اور پیش آشرہ معاملہ پر اس کو
 منطبق کرتے ہیں مثالوں کی یہی حدائیں رفتہ رفتہ
 باقاعدہ قانونی عدالتیں بن جاتی ہیں اور پھر معاشرے

میں ایک خاص ضابطہ بھی نوپا جاتا ہے جس کے ذریعہ فیصلہ کی تعمیل کروائی جاتی ہے۔

مشرقی افریقہ کے بعض قبیلوں کا بھی مطالعہ کیا جائے تو قانون کا نشوونما اچھی طرح سمجھ میں آسکتا ہے۔ مثال کے طور پر ایک 'گلگوبا' نژاد کا اوربانتو لوگوں کے علاوہ آئر جو مونٹ کنیا کے جنوب اور جنوب مشرق میں رہتے ہیں اس سلسلے میں دلچسپ ہیں۔ یہ لوگ چھوٹے چھوٹے خاندانوں میں بٹے ہوئے ہیں، موسمیاتی اور کھریاں پالتے اور اونچ بڑھتے ہیں، ان میں کوئی سردار یا بزرگ خاندان نہیں ہوتا اور یہ لوگ عمر کے لحاظ سے مختلف طبقوں میں منقسم ہیں۔ ان میں ایک طبقہ سمر امد بزرگ لوگوں پر بھی قبضہ ہے جو مذہبی پیشہ افنی اور عدلیہ دونوں کے فرائض انجام دیتا ہے۔ جب کسی شخص کو یہ بد کرنے کی وجہ ہو کہ کسی دوسرے نے اسے کسی قسم کی مغفرت پیش پیش کی ہے یا اس کے حقوق متاثر ہوئے ہیں تو مراد پیش آنے والے اور مستغفر دونوں فریقین کی طرف سے ان کے دیہات یا ضلع کے جہاں وہ رہتے ہیں تمام بزرگ بلوائے جاتے ہیں اور اس طرح اس عدالت کے دو برو معاملہ پیش ہوتا ہے۔ یہ عدالت ابتدا میں تو صرف عائلی کے طور پر کام کرتی ہے اور عام رسم کے قائم کردہ اصول انضباط کے مطابق تصفیہ کرتی ہے اور تصفیہ کے بعد اپنے فیصلہ کی تعمیل کروانے بغیر معاملہ کو خود مستغفر فریقین کے سپرد کرتی ہے کہ وہ خود اپنے حریف سے ٹک لے۔ البتہ بعض خاص اور متعلقہ خاندانوں میں جب کہ کسی حملہ یا فعل سے پورا فرقہ یا قوم متاثر ہوتی ہے یا جب کہ قوم کے متعلق سمجھا جاتا ہے کہ وہ عادی مجرم ہے یا یہ کہ قوم کے لئے اس کا وجود خطرناک ہے اور اس طرح ان ایک فرقہ کے فعل کو پوری قوم کے خلاف سمجھا جاسکتا ہے تو پھر بزرگوں کی یہ حاجت حالانہ اقتدار استعمال کرتی اور خود اپنے فیصلے کی تعمیل کرواتی ہے۔ یہ بزرگ دراصل ہمیشہ ذہنی اقتدار سے کام لیتے ہیں۔ مثلاً اگر کوئی شخص ان کے فیصلے کو مانتے سے انکار کرے تو اس پر لعنت یا پھینکا

جھیٹے ہیں جس سے ان کے عقیدے کے مطابق باغی نظر سزا اتر آتی ہے۔ ایک خاندان کے کسی فرد کو دوسرے خاندان کوئی فرد جان سے مارے خواہ ارادی طور پر یا حادثے میں تو بزرگوں کی عدالت اس فعل کو ناجائز یا نامناسب خیانت سمجھتی ہے اور مقتول کے رشتہ داروں کو سزا دلانے کے ارادہ رکھتی ہے اور یہ سزا ان قاتل یا اس کے رشتہ داروں سے دلوائی جاسکتی ہے۔ عام خیالات سے متعلق بھی ان بزرگوں کو ایک ضابطہ کے تحت اختیارات ہوتے ہیں جسے کننگال یا مونڈ (Munond) کے محکمہ ۲۲ or ۲۳ (Munond) کہا جاتا ہے۔ اگر کسی شخص پر جادو کا الزام ہو، یا وہ عادی مجرم ہو اور اس طرح اس کا وجود عوام کے لئے خطرناک ہو تو بزرگوں کو اقتدار ہوتا ہے کہ ایسے شخص کو موت کی سزا دیں یا اس کے گھراؤ کو تباہ کر کے اسے اپنے ضلع سے باہر کر دیں لیکن ایسی سخت سزا سے پہلے یہ ضروری ہوتا ہے کہ دو دور کے تمام بزرگ اس شخص پر اس کا فیصلہ کریں۔ نیز غامبی کے اہل خاندان کا بھی اس پر رضامند ہونا ضروری ہے۔

اکبار لوگوں کے برخلاف مغربی افریقہ کے اشنائی فرقہ میں عام خیالات کا ایک منظم قانون ملتا ہے جو مقامی زبان میں ایک خاص نفاذ سے ظاہر کیا جاتا ہے۔ اس نفاذ کے معنی ہیں امور جو قبیلے میں نفرت سے دیکھے جاتے ہیں، ان میں یہ چیزیں شامل ہیں۔ بیبی قتل، خودکشی، نسلی یا ازدواجی رشتہوں میں بعض جسمی تعلقات، خاص قسم کی کالی گفتار، زبان پر حملہ، چوری، کسی سردار پر پھینکا جیسا، بجاوے، جردلی، جادوگری، مسلح قبائلی رسوم و رواج کی خلاف ورزی اور مرکزی اقتدار کے حکم کی خلاف ورزی۔ اشنائی تصور قانون کا خلاصہ یہ ہے کہ یہ تمام افعال دراصل مقدس یا افریقہ فطری طاقتوں کے خلاف سرزد ہوتے ہیں اور ان ہی طاقتوں پر پوری قوم کی بقا ہے اور جب تک ان ناجائز افعال کو غامبی کی سزا کے ذریعہ روکا نہ جائے پورا قبیلہ متلائے آلام رہے گا۔ عدلیہ یا اقتدار کے متعلق تصور یہ ہے کہ یہ بادشاہ یا سردار کو حاصل ہوتا ہے جو

مرکز کی مقتدرہ مستحق لازم کے ظلمات چارہ کار اختیار کرتی ہے۔ راست طور پر موجودہ تعزیری اور دیوانی قانون، علیٰ الصریح عام جنایات اور خانگی جنایات کے قوانین سے انحراف نہیں۔ لیکن فرق یہ ہے کہ جو افعال آج عام جنایات کے تحت آتے ہیں، جیسے قتل، یا چوری، یہی افعال بہت سے قبل تحریر معاشرہ میں خانگی جنایات کے تحت آتے تھے۔ اور مذکورہ اسی طرح وہ افعال جو ان معاشرہ میں عام جنایات تھے ان میں جادوگری اور بدکاری اور تیرک بیڑوں کی چوری بھی شامل تھی۔

اپنا ابتدائی منزلوں میں قانون دراصل سحر یا جادو اور مذہب کا دوسرا نام تھا اور قانونی تہدیدیں دراصل مذہبی تہدیدیں تھیں۔ اسی لئے سادہ معاشرہ میں قانون کی ابتداء کو سمجھنے کے لئے معاشری تہدیدیوں کے تمام نظاموں کا مستعار مطالعہ کہا جانا چاہیے۔

اس مضمون کی تیاری میں فول کی کتابوں سے مدد لی گئی ہے۔
(۱) ایبل ورک ہائیم وہ دولڈ ویرن وہ تراویل ٹریٹل (پیرس ۱۹۱۵ء)
(۲) البرٹ کوکورنا ورنو کور۔ اے۔ ویلن آف لاء۔ پبلڈ (پوسٹن ۱۹۱۵ء)

(۳) سڈنی ہارٹ لینڈ۔ پری پریٹریڈ لاء (لندن ۱۹۲۴ء)
(۴) مالی نووکی۔ کراٹم اینڈ کسٹم ان یونیورسٹی سوسائٹی نیویارک ۱۹۱۶ء
(۵) جیمز ایڈوارڈ ہیلر۔ دی ٹرانزیشنل اینڈ ٹریٹریل ریڈیشن ان اسٹریٹیا (لندن ۱۹۱۸ء)

(۶) لمبی۔ ہنری ملیرڈ اینڈ ٹریٹس (لندن ۱۹۱۲ء)
(۷) رات ٹریس۔ اسٹین لائی اینڈ کاسٹی ٹیوشن (آکسفورڈ)
(۸) ایل ٹارڈے۔ افریکن ریسس (لندن ۱۹۳۳ء)

ایک مقدس تحت یا چوکی پر انصاف کرنے میں تیار ہے۔ اسی کے سامنے خالی کو مزا سنائی جاتی ہے۔ زیادہ عظیم افعال کی صورت میں سرکاشائی ایک مزا ہے گو بعض صورتوں میں خالی اور اس کے رشتہ دار خالی کا سرخوردہ تھے ہیں یہ دوسرے انصاف میں جو جان یا نقصان ادا کرکے اس کی جان بچانی جاتی ہے۔ بزرگوں کی عدالتیں خانگی یا خاص جنایات کی صورت میں کوئی اقسیت یا استعمال نہیں کرتیں بلکہ یہ تحریر نزاعات میں جن کے تعصیب یا خونخوارانہ کے صدر کرتے ہیں یا آپس کے سمجھوتے سے نزاع ختم کی جاتی ہے۔ خانگی جنایات سے متعلق بھی کوئی نزاع سردار کے سامنے لائی جاسکتی ہے۔ مثلاً کسی متعلقہ فریق نے قسم اٹھائی ہو تو وہ عام جنایات میں داخل ہے اور اسی لئے سردار کے روپ میں معاملہ پیش کیا جاتا ہے۔

بہر حال ان فیملیوں کے مطالعہ سے بعض کام کی باتیں ضرور معلوم ہو جاتی ہیں۔ اگر کہا کہ بزرگ خانگی جنایات سے تعلق رکھتے ہیں تو ناشتہ کے سردار عام جنایات کی صورت میں اپنا اقتدار استعمال کرتے ہیں۔ افریقہ اور دوسرے ملکوں میں بعض قبیلہ اور فرقے ایسے بھی بستے ہیں جن کے سردار یا بادشاہان دونوں قسم کے قوانین پر اقتدار رکھتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں لکڑی اقتدار خانگی اور عام جنایات دونوں پر قائم رکھتا ہے۔ ان مختلف فرقوں میں مضابطہ کے لحاظ سے فرق بھی کیا جاسکتا ہے۔ خانگی جنایات کے قانون میں اشخاص یا اشخاص کے گروہوں کے ہمین تہذیبوں کی صورت میں قانون عدالت کے روبرو مطالعہ لایا جاتا ہے۔ عام جنایات کے قانون کے لحاظ سے خود پرکھا اقتدار کی جانب سے اتمام ہوتا ہے اور خود اپنی طرف سے

میٹھے ٹھگ

کرومی جنہوں نے ظاہر اپنوں سے بے نیازی وہ بھی جتا رہے ہیں اب اپنی پاک بازی
عصر جدید کیا ہے؟ عہدِ ریاضتِ رازی ہے فن کی حیثیت سے رائج زمانہ سازی
اُن دہریوں سے کرتا کیونکر نہ میں کٹارا
مہرِ دوف کی رہیں ہیں جن کو ناگوارا

داتا۔ شریف داتا۔ کہتے چلے ہیں جھٹھٹ آقا۔ عزیز آقا۔ ہر آن ہے ہی رٹ
کیوں کھیلتی نہ ان کے چہروں پہ مسکراہٹ ہے طلبِ منفعت کا راز ان کی ہر بناوٹ
دلو اتی ہے انہیں زراں کی زمانہ سازی
ہیں نوگر خوشامد صرف دل نوازی

ظالم دکھا رہے ہیں اس شان کا تھُل خفیہ و غضب سے گویا نا آشنا ہیں بالکل
بیجا خوشامدوں سے دیتے نہیں کسے جُل جل دے کے ڈھونڈتے ہیں یہ حلقہ گل و مل

سامانِ عیش و عشرت کرتے ہیں یوں فراہم
طواریف باندہتے ہیں کذب و ریا کا باہم

بے سود پیش کرتے کیوں شکلِ اعتراضی مفتی ہے ان کے بس میں ان کے اثر میں قاضی
حال ان سے بن رہا ہے جیتو کا عہدِ ماضی ہر شخص کو یہ میٹھے ٹھگ کر رہے ہیں راہی
عمجوار بن کے جن کو دیتے رہے دلا سے
نیپتے ہیں جان اسی کی عبرت فزا ادا سے

علی منظور

ایک

دور ————— کہیں دور سے مغرب کی اذان
رات کی آمد کی خبر دے رہی تھی۔ خاموش فضا میں اس
دلفریب آواز کو سن کر درخت گویا مجھوم اٹھے اور اپنا
سراسر اکلب حقیقی کے سامنے جھکا دیا تھا۔ میں بھی قدرت
کی یہ معبودیت دیکھ کر کجھور رہ رہ ہو گئی۔

فیاض ہو کر دین و دھرم پر روبرو ہوئی۔

مغرب کی آفتاب نماز سے خار غم ہو کر میں ادھر بلا لگانے پر پہلی آفتاب ہر طرف خاموشی چھائی ہوئی تھی۔۔۔۔۔ ایک حسین خاموشی میں بھی کتنی دلفریبیاں پوشیدہ ہوئی ہیں۔۔۔۔۔ اسی خاموشی کی بدولت ہر چیز آج دوڑی ہوئی معلوم ہو رہی تھی۔ پارک کی طرف سے ایک دو چرخہ سوئیچی کی لہر اس خاموشی کو چھرنی مگر اس کے حسن و دہلا کر کی گزری۔۔۔۔۔ شاید کسی نے ریڈیو لگایا تھا۔ شام کے وقت قدرت کتنی بیباں اور مصہوم ہوتی ہے۔۔۔۔۔ غم، کج سموت، بے کسی، تاریکی، آنسو، مسکراہٹ۔ ہر ایک سے بے نیاز قدرت ہی حسین رہتی ہے۔ وہاں دور نازیل کے اونچے اونچے درخت موسیقی کی لہ کے ساتھ جھومتے ہوئے کتنے دلکش معلوم ہوتے ہیں اور ابھی شاید چندہ دن بھی نہیں گزرے جبکہ وہاں ابھی تو آگ کے شعلے بلند تھے۔ آٹ۔۔۔۔۔ اوہ غمناک شعلے جن جنہوں نے گویا عہد کی خاک کو جنگ ہر چیز کو بھرا کبیرہ نہ کریں گے، چمین نہیں گئے۔ یا اللہ وہ دن جبکہ قدرت کو اپنے پورے قہر و غضب کی حالت میں ہم نے دیکھا تھا اور اس کے سامنے کتنی ہی خوبصورت اور عالی شان عمارتوں نے سر ہکا دیا تھا۔۔۔۔۔ آج بھی وہ منظر یاد آگیا تو روح لرز گئی۔۔۔۔۔ کتنا دل ہلا دینے والا نظارہ تھا۔ اپنی آنکھوں کے سامنے اپنی تمام کی بوچی جبل مہر کی تھی۔ خاک ہو رہی تھی اور غریب لوگ بیچنے پلانے کے سوا کچھ کر نہیں سکتے تھے۔۔۔۔۔ اور اس ہیبت ناک ڈرامے کو دیکھنے کی خاطر

ہمارے سہی ہمسائے اسی بالاخانے پر توجہ ہو گئے تھے۔
 سائیں بھی میں پرکرو اور انسانوں کو بہت ناز ہے جیوگا
 دیر کے لئے بہت ہار گئی تھی۔ پہلے ایک پھر دو تین.....
 پورے سات مشین ایک ساتھ کام کر رہے تھے اور آگ کے
 شعلوں کو یہ کھنڈ کا پانی گویا سمنڈ ناز پر تازیانہ تھا.....
 اور آج کتنی خاموشی چھائی ہوئی ہے..... لیکن اس
 خیاست خیز رونہ وہ جہنگ منہ جبکہ ستون آگ کی تاب نہ لا کر
 دھماکے سے گرتے تھے اور اس دھماکے سے ہمارا تخی دور
 کھرے ہوئے بے اثر جاتا ہے..... کیسے کیسے تناور درخت
 جل کر بننے رہ گئے..... اے آربی والوں کا ہجوم.....
 ریہہ گراں کی لایاں..... زمینیں کھینچ پھاڑ کھرے
 انگلوں کے دلوں کو زعفرے..... باؤں کا اپنے بچوں کے لئے
 تڑپ جانا..... عساکر تو بھیں مار مار کر رونے لگی تھی.....
 اور بڑھتین درخت کے گرنے پر ایک ایسے کے ساتھ آنکھیں بند
 کر لیتی تھی..... میرے خدا..... اے جانے کیسے بے حس ہیں
 وہ لوگ جو ایسے منظر کو دیکھتے ہوئے بھی نہیں سمجھتے ہیں.....
 رفتار رونے لگی تو اتنی بے محاشے کی کوشش کی..... گڑبگڑا ہر
 ہنس پڑیں میں حیرت سے منہ نکلتے تھی..... اری دوائی کم کیوں
 رو رہی ہو۔ تمہارا گھر تو بلا نہیں جا رہا ہے..... شہی جیوٹی
 پچی بچی زو..... اور یہ سب ہنس ہنس کر..... میرا دل چاہتا تھا کہ
 کوئی ان کو ایک لمحہ لگا دے..... مگر میں نے سوائے انتہائی
 نفرت سے منہ پھیر لینے کے اور کچھ نہ کیا اور پھر ان شعلوں کو کھینچنے
 لگی تھی..... آت اور خون سے زیادہ لال اور تلوار سے
 زیادہ تیز شعلے کس کو چھونے کی کوشش کر رہے تھے..... اور
 اس کا کتنی دھوپ میں ہم نے خدا کے دربار میں افتخار ادا دینے
 تھے کہ اب شہر اشہان بندوں پر دم کرادھر دیوانہ دارا سنا
 پر اب کو تلاش کرنے کے لئے گردوں اور کا نام و نشان نہ تھا.....
 اور آگ برابر بڑھتی تھی اور بگڑا ہر مسکراتی رہیں.....
 آخر عداوت نے بیخ مار کر آنکھیں بند کر لی تھیں اور اس امید
 موبہم پر پٹے جھاگے کے شاعرانہ بے کسوں کی کچھ مدد کر سکیں۔

اور سچ مجھ وہ مصیبت کیا یہ بھی ممکن ہو سکتا ہے
 سامنے خرابی دل انسانوں کی دیکھ لیاں تباہ ہوئی رہیں
 اور پھر بھی منکر ادا جائے ہاں اگر کچھ ظاہر ایسی ہوں تو
 مگر یہ کیا! میں یہ کیا سوچے تھی بد و غریب اور
 غریب اور غلام ان رنجیدہ دنیاؤں کے لئے تو نہیں
 اور پھر کچھ ظاہر کے نرم دل با سخت دل ہونے سے آگاہ تو
 بھی نہ تھی میں نے سر کی ایک جنبش سے ان خیالوں کو
 دور کرنے کی کوشش کی۔ اور چونکہ اندھیرا ہونے لگا تھا اس
 اداسی کو دور کرنے کی خاطر جو ان فلسفیانہ خیالوں سے پیدا
 ہو گئی تھی ایک علمی طرز نہایت ہی بے پرواہ انداز سے
 گاتی ہوئی پیچھے اترنے لگی۔ اسی جان ابھی مناز سے فارغ
 نہ ہوئی تھیں۔ جنگ آج بہت خاموش نظر آ رہا تھا۔
 آبا جان اور لطافت بستی کا کام پرمج ہی سے گئے ہونے
 لگے۔ رنجیدہ اور سیر بھی انہیں کے ساتھ نئے اصداد اصل
 ان دو شہریروں کی غیر موجودگی ہی کے باعث آج آنا
 سکون اور شادمانی فرود کی بھی چھائی ہوئی تھی۔ میں اپنے
 کمرے میں چلی آئی۔ گو قریب قریب اندھیرا ہونے لگا تھا
 مگر کمرے کی میں سے باہر قدرت کی لطافت اور نیرنگیاں
 نظر آ رہی تھیں ریڈیو کو نے میں گویا زبان حال سے
 خاموشی پر ماتم کرتا نظر آ رہا تھا۔ گردل نے نہ چاہا کہ ریڈیو
 لگاؤں۔

شمسیہ اسماعیل شریف

رات کا بھولا اور دگر افسانے۔۔۔ پروفیسر عبدالقادر صاحب سروردی ایک اہل ایل فی صدر شعبہ ادب
 فارسی و عربی مہاراج کالج مید کے مجاہد و پنداریہ افسانوں کا دمچپ مجموعہ ہے جو نہایت اہتمام کے ساتھ بہت دیدہ زیب
 شائع ہوا ہے۔ پروفیسر سروردی صاحب نے اس سے قبل فن افسانہ پر متعدد کتابیں مثلاً دنیا کے افسانہ دار افسانہ
 وغیرہ شائع کی ہیں۔

طباعت و کتابت پاکیزہ اور دیدہ زیب ہے۔ صفحہ ۱۶۸ قیمت ۵

گرد و غبار ہو تو سرکراتی ہی رہیں اور نہ کتنا خوب صورت منظر
 ہے کہ سما اور کچھ نہ کیا اور لیٹینا ایسا ہی تو تھا
 مگر ان دنوں کی مصیبت نے اس خوبصورتی کو دیکھنے کی
 فرصت نہ دی تھی۔

اور آنا جلد ہی پھر سکون اور اطمینان چھا گیا ہے۔
 فطرت پھر سرکراتے لگی ہے اس حسین و پرکشت ماحول
 میں وہ سب ایک پریشان سا خواب محسوس ہوتا ہے
 کاٹش کہ وہ رات ہی خواب ہو سکتا گرد و غبار حقیقت ہے
 ایک بچہ اور پھر با حقیقت اب بھی جگہ فطرت اتنی
 جاذب نظر ہو کر گویا ان زعموں کا انزال کرنا چاہ رہی ہے
 کہنے ایسے لوگ ہوں گے جن کی زندگیوں صرف اس ایک
 دن میں تباہ ہو کر رہ گئیں۔ حافض ہی نے تو شام کو لوٹ کر
 بتایا تھا کہ رشتہ صاحب دیر ہی سے آگ میں کوڑا کرنا سینہ
 اٹھالائے جس میں ہزاروں روپوں کے ٹوٹے تھے۔ مگر
 جب تک وہ اندھیرا نہ گویا ایک اور صند ہو تو بھی اٹھالائیں وہ لوگ
 سامنے کوئی اٹھا کر کھٹک گیا اور اس دہرے صدمے
 کی تاب دلا کر مہیاں بیہوش ہو کر گر پڑے اور
 عبدالصمد صاحب بڑی مشکل سے اپنا "سینہ" باہر اٹھالائے اور
 اب اسی پر بیٹھ گئے ہیں۔ کسی کو قریب بھی نہیں آنے دیتے
 تھے کہ کہیں یہ بھی جلا نہ جائے۔ کوئی ہمدردی ظاہر کرتا ہے
 تو صرف آٹو پہننے لگتے ہیں۔ آدھیل کا ہجوم ہے۔ لوگ جلتے
 مکانات سے سامان لا کر بیٹھتے ہیں جو نورانی فائبر ہوجاتا ہے
 عات کی آواز سے غوغا مفعول ہو چکی تھی ان کا
 شریار دگر افسانے ہوا چہرہ جو دیکھیں اور تھکا ہوا نظر آتا تھا۔

غزل!

ابھی محبت کی ابتدا ہے دلوں کے ارماں نکل رہے ہیں
 ابھی جوانی پہ میں امنگیں، دلوں میں ہیں سیکڑیں
 عجب برسا کا سماں ہے، نظر کو ہر وقت یہ گیا ہے
 خدا ہی جانے کہ رنگ بدلیں گے دلوں کے کتنے
 کہ حسن انکرائی لے رہا ہے حسین کپڑے بدل رہے ہیں
 وہ دیکھ! انہی کے دوش پر ہیں ہزار ہا ایسی داستانیں
 جو ڈو چرخ آج بھر رہے ہیں تو دس چرخ اجل ہیں
 نہ آمریت کے گاترائے یہ راگ اب ہو چکے پڑانے
 اسی تو گوارہ تمدن میں دل کے ارمان پل رہے ہیں
 مذاقِ عالم بدل چکا ہے نظام سارے بدل رہے ہیں
 قدم قدم پر تحائف طوفان، جگہ جگہ تحفہ آساں
 گرز پہ عشق تیری ہمت مرے ارادے اٹل رہے ہیں
 تھے جن کے اسلاف پیش پر وہ ہیں انکے اخلاف اب گداگر
 امیر زادوں کے دل کے ٹکڑے یتیم خانوں میں پل رہے ہیں
 سگ رہے ہیں ابھی ہمارے دلوں کے آتش کدے سلسلے
 جلا چکے تھے ابھی جو ہم کو اب ان کی باری جل رہے ہیں
 تری نظر میں بھی ہم رنگ شہادت بے محسوس رہے ہیں
 نہیں زمانے سے کوئی شکوہ گلہ نہیں ہے تو فخر ہے

ہوئی سحر ختم پر ہے محفل، اٹھو کہ افسر پاٹ ہے دل
 نہ حسن میں اب وہ دل کشی ہے نہ زلف میں اب بل رہے ہیں

افسر

خطبہ صدر

نواب ڈاکٹر سر امین جنگ بہادر

(جو اردو کتب خانہ اسلامیات کے افتتاحی جلسہ منعقدہ ۲۷ ربیع الاول کو پڑھا گیا)

یوراکلسنی خواتین و حضرات!

مجھے اجازت دی جائے کہ میں سب سے اول اپنے کرم و محترم دوست عالی جناب ڈاکٹر سر سید الملک بہادر بالقابہ کا شکریہ ادا کروں کہ یہاں تشریف فرما ہو کر اس کتب خانہ اردو کے حامی و معاونین کی ہمت افزائی فرمائی۔ ثانیاً میں اپنے کرم فرما ڈاکٹر یحییٰ الدین قادری مدظلہ کی کوشش کی تحمیل کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ایک ولی اللہ کے مزار مبارک کی خانقاہ شریف کو فیض بخش بننے اور ہمیشہ کے تابو رکھنے کے لئے یہاں ایک اردو کتب خانہ اسلامیات قائم کیا۔ اردو زبان میں علوم اسلامی کافی تعداد میں موجود ہیں اور ضرورت تھی کہ ایک ایسا مرکز قائم ہوتا جہاں اردو کی تمام اسلامی کتابیں محفوظ رہتیں۔ ثانیاً میں ان طلبہ اور اصحاب کی طرف متوجہ ہوتا ہوں جن کو مطالعہ و کتب بینی کے شوق نے کتابوں کے کڑے کپے جانے کا مستحق بنا دیا ہے۔ ان کے واسطے میں خود اپنی نظر پیش کرنے کی جرات کرتا ہوں۔

اگر آپ حضرات ایک ہفتاد و چار سالہ بوڑھے کی خودی یا خود ستائی معاف کریں تو میں اپنے کتب خانہ کی مختصر کیفیت بیان کروں گا کہ کب اور کس طرح مجھے کتابوں سے محبت پیدا ہوئی اور میں کس طرح ان کے جمع کرنے کے شوق میں مبتلا رہا۔ شش سال قبل میرے مدرسے کے تقسیم انعامات کے جلسے میں کوئین دکنٹریہ کے بچا ڈیوک آف بکنگھم گورنر مدراس کے ہاتھ سے مجھ ۱۳۱۲ سالہ لڑکے کو ایک چھوٹی سی کتاب بطور انعام دوم ٹی۔ بسکس جلسے اور کتاب کا میرے دل پر ایسا اور اس قدر اثر ہوا کہ میں نے اسی وقت اپنے دل میں نشان لے لی اور پیکا ارادہ کر لیا کہ ہر سال ہر جماعت میں اور ہر امتحان میں پہلایا دوسرا ہو کر کتابوں کا انعام لیتا رہوں گا۔ اس کے بعد چند ہی سالوں میں میرے ارادے کا ارتقاء ہوا۔ انعام کی کتابوں سے دو ایک صندوق یا الماری بھر دی جائے۔ اللہ کا لاکھ لاکھ فکری ہے کہ اس کا فضل و کرم ایسا میرے حال میں شامل رہا کہ مجھے ہر سال ہر کلاس میں ہر امتحان میں بچوں کی جماعتوں سے شروع کر کے ایم اے کی جماعت تک ڈل اسکول کے امتحان سے شروع ہو کر ایم اے کے امتحان تک اول، دوم یا سوم درجے کے انعامات کتب کے علاوہ ربی الغامات مثلاً کو بنگھم برری، مامانہ دس روپے کی کپرس پرائز نقد سو روپے کا وغیرہ ملتے رہے۔ حتیٰ کہ مدراس یونیورسٹی کا بڑے سے بڑا (گورنرس اسکالرشپ) مامانہ ۳۹۱ روپے کھدرا کا بھی مسلسل چار سال تک ملتا رہا۔ میرے والد ماجد نے مجھے اجازت دیدی کہ میں اپنے اسکالرشپ کی رقم جیسا چاہوں خرچ کروں پھر کیا تھا کہ میں اس مامانہ رقم کا نصف اپنے ساتھی غریب طالب علموں کے کتب اور فیس کے واسطے دے کر دوسرے

نصف سے اپنی خواہش اور ضرورت کی کتابیں جمع کرتا رہا۔ اس زمانے سے اب تک پچاس سال سے زیادہ عرصے تک ماہانہ کم از کم پچاس روپے کے کتب خرید کر جمع کرنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ آج میں ایک چھوٹا موٹا یعنی کارآمد اور مفید کتب خانے کا مالک ہونے کا ناز کرتا ہوں اور اپنے کتب خانے کو اپنا خزانہ کہتا ہوں۔ جس روز ڈاکٹر مرزا بندر ناٹھ ٹیگور کتب خانے کا مہاجر اسٹراٹ سے دیکھے آئے تھے تو ان سے میں نے انگریزی میں کہا کہ دنیا میں اس کتب خانے کے سوا کوئی چیز نہیں ہے جس پر مجھے ناز ہو۔ میرا بڑا بیٹا کیمبرج کا آنرز ایم اے۔ خطیب محمود حسین مرحوم جو میری محبت کا دم بھرتا تھا، اس کو میری بات ناگوار ہوئی تو اس نے فی الفور پوچھا کہ ”باوا جان میں آپ کے ناز میں کہاں ہوں“ میں نے جواب دیا کہ ”بابا تم چیز نہ ہو آدمی ہو۔ دنیا میں تمہارے سوائے کوئی آدمی نہیں جس پر مجھے ناز ہو۔“ راہبدر ناٹھ ٹیگور صاحب نے خوب ہنس کر اہم دونوں کو مبارک باد دی اور فرمایا ”دونوں پر آپ کا ناز بالکل بجا ہے۔“

میرے کتب خانے میں عجیب، نادریا قدیم کتب نہیں ہیں۔ اس قسم کے کتب جمع کرنے کا مجھے کوئی شوق نہ رہا۔ فقط کارآمد کتب میں جمع کی ہیں جن سے روزمرہ سیاسی، سماجی و معاشی مسائل کا جواب مل سکے اور علمی و ادبی مشکلات حل ہو سکیں۔ میرے انسانی کتب فقط اتنے ہیں جتنے مستعار لے جانے والوں کی قرضاتی سے بچ سکے۔ ان کے علاوہ مصنفین کے ہدیہ کے کتب ہیں میں شکر ہے کہ ساتھ معترف ہوں کہ مہمانہ غنائی کے تراجم و تالیفات جو مجھے تحفہ دی جاتی ہیں اور ان کی دو الماریاں کتب خانے کو رہنمائی بخشتی ہیں۔ مولانا ڈاکٹر عبدالحق صاحب کی انجمن اردو ملی بھی بہت سے کتابیں ہیں۔ اس انجمن کا میں لائف ممبر کیا مدام الحیات اسرار احسان ہوں۔

ایک افسوس کے سوا اپنے کتب خانے سے مجھے خوشی ہی خوشی حاصل ہوتی ہے اور وہ افسوس یہ ہے کہ بہت سے احباب اور اشخاص میری کتابیں پڑھ کر ان کو واپس لادینے کے وعدوں سے بے گئے مگر لاکر دینا بھول گئے بالابنتہ ہو گئے۔ اگر اپنے آپ کو وعدے کے پکے ثابت نہ کئے ہوتے تو میرے کتب خانے کا نصف حصہ جس میں علمی و ادبی کتابیں رکھی ہیں وہ آج دنگنا رہتا۔ ایسے اشخاص سے آئندہ بچنے کے واسطے میں نے اپنی کتابوں پر انگریزی قطعہ کا ترجمہ چسپاں کر رکھا ہے جس کا ترجمہ میرے لئے ڈاکٹر نور صاحب نے یوں کیا ہے جس کو میں اپنی اردو، عربی، فارسی کتابوں پر لٹکا کر رکھوں گا۔

”اسے کتاب تو خوش آئند ثابت ہوگی اگر میرے دوست مجھ سے مستعار لے کر تجھے پڑھے سیکھے، واپس کرے نہ کہ کسی اور کو مستعار دے۔“

غرض مجھے اطمینان اور فکر اس بات کا ہے کہ اللہ نے میری بچپن کی خواہش کو پورا کیا جس سے میرے بڑھاپے میں میرے اوقات بسر ہو جاتے ہیں۔ مجھ پر اپنا وقت گراں نہیں گزرتا۔ اس سبب میرے دوست و احباب مجھے معاف فرمائیں گے اگر میں کہوں کہ ان کا یہ خیال گراں میں اذیتوار ہے نہ کہ ان کے کتب پڑھے ہیں (غلو و مبالغہ سے خالی نہیں) میں اشتیاق

(کتاب پڑھنے والا) نہیں ہوں جتنا کہ (کتاب جمع کرنے والا) ہوں مجھے پڑھنے کے شوق سے زیادہ کتابوں کی مناسب تقسیم کر کے ان کو جوڑ کر موقع محل پر رکھنے کا شوق رہا ہے۔ میں اپنے وطن و انہمازی کا موروثی خطیب ہوں۔ خطبہ خوانی میرا آبائی پیشہ ہے۔ اب تک میں نے خود کتابوں سے آپ کی مغز فراشی ہوئی ہے وہ محض تشبیہ ہے اس قصیدہ یا خطبہ خوانی کی کہ۔

(۱) دہریوں میں تقسیم الفات کے جلسے بے جا و بے کار نہیں ہوتے بلکہ ان کا اثر بچوں کے دلوں پر بہت گہرا اور دیرپا ہوتا ہے جیسا کہ مجھ پر ہوا۔

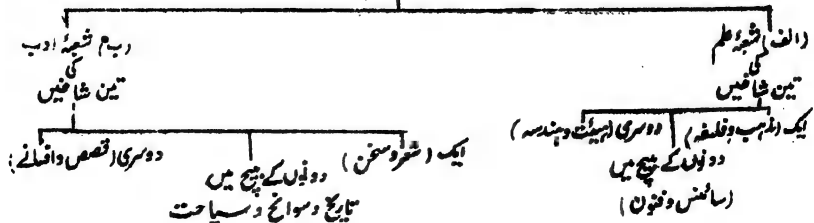
(۲) آدمی کا معمم ارادہ دزے کو بھی پہاڑ بنا دیتا ہے جیسا کہ الفات لینے کا ارادہ استخوانوں میں کاسیاب کر کے مجھ ناچیز کو ایک چیز بنا دیا۔

(۳) معمولی آدمی دلی، اوسط درجے کے اشخاص بھی تعویذی سی کوشش سے اپنے گھروں میں ایک مختصر کتب خانہ اپنے اور اپنے بچوں کے واسطے جہاں کہ اس کے فرائض سے بہرہ اندوز ہو سکتے ہیں۔ (۴) انفرادی و خانگی کتب خانوں کے کتابوں کی ترتیب جمع، تفریقی، تقسیم، ارتقاء کے اصول پر کیے کی جا سکتی ہے۔ میں پہلے تین باتوں کی ”قصیدہ یا خطبہ خوانی“ یعنی تعریف و توصیف و ترغیب پر عہد و معزز دوست جو اس کتب خانے کے نائب صدر ہیں نواب لیاقت جنگ بہادر کے واسطے چھوڑ دیتا ہوں۔ فقط جو محض بات کی قصیدہ خوانی سے پہلے کتب کی مناسب و سہل ترتیب کے تذکرے سے جو میرے ساہل سال کے تجربوں پر مشتمل ہے اپنی تقریر کو ختم کرتا ہوں۔

کتب خانہ آصفیہ جیسے بڑے شاندار کتب خانوں کی ہزار ہا کتابوں کی مجموع، تفریقی و ترتیب کے طریقے جو اہم و پیچیدہ ہیں ان کی تقلید معمولی اور خانگی کتب خانوں کے لئے مناسب نہیں ہو سکتی۔ ایسے کتب خانوں کے واسطے ایسا طریقہ اختیار کرنا چاہئے جو کتابوں کی تقسیم، ان کے مضمون کے لحاظ سے بہت کم شعبے اور شاخوں میں ہو اور جملہ کتب اس طور سے الماریوں میں رکھی جائیں کہ جس سے ایک جہنی بھی سہل طور سے اپنی خواہش کی کتاب دو تین منٹ میں نکال کر پڑھ سکے۔ پچاس سالہ تجربے نے مجھے بتایا ہے کہ فقہ اور قانون کے کتب، ڈکشنریاں، سائیکلو پیڈیا وغیرہ جیسے فقط ”حوالے کی کتابیں“ ایک طرف الگ کر دے دوسرے تمام ”مطالعے کی کتابیں“ محض دو (الف و ہ) اب اظہار میں تفریقی کر دے کہ اور ہر شعبے کو تین شاخوں میں تقسیم کرنا چاہئے۔ دوسرے الفاظ میں (حوالے کے کتب) (مضمرات) کے نام سے الگ رکھ دے کہ باقی جملہ

مطالعے کے کتب کے

دو شعبے شعبہ علم و شعبہ ادب



اگر ذرا غور کیا جائے تو ظاہر ہو گا کہ ادب اور کبھی کبھی پڑھنے کے قابل کتب، لغت و دوا ارمعار جن کا نام میں نے (حوالے کے کتب) رکھا ہے ان کو ایک طرف رکھ دے کر شروع سے اخیر تک یکساں مطالعہ کرنے کے قابل کتابیں جن کا نام میں نے (مطالعہ کے کتب) رکھا ہے، یہ سب کی سب چھ شاخوں میں منقسم ہوجاتی ہیں۔ پہلا (الف) شعبہ علم کی تین شاخوں میں ایک (مذہب و فلسفہ) دوسری (ادبیات و ہندسہ) اور تیسری شاخ یعنی بیچ کی شاخ (اسائنمنٹ و فنون) کی ہوگی۔ یہ جملہ مطالعہ کی کتابیں مصنفوں کے نام کے سرحرف کے سلسلے سے تین یا چھ صدقوں یا الماریوں میں رکھی جاسکتی ہیں تاکہ ایک اجنبی بھی اپنے مطلب کی کتاب دو تین منٹ میں پا چن کر اٹھائے اور اسی طرح دوسرا (ب) شعبہ ادب کی تین شاخیں ہیں اس کی پہلی شاخ (شعر و سخن) کی ہوگی اس میں کلیات و دوا دین، تبصرہ و تنقید کی کتابیں رکھی جاسکتی ہیں۔ شعر و مصنفین کے تذکرے اور مشاہیر کے سوانح و تیسری یعنی بیچ کی شاخ (تاریخ و سوانح و سیاحت) میں ہوں گے۔ شعبہ ادب کی دوسری شاخ میں برقصہ کے ناول و قصص اور کہانیاں ہوں گی اور جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے فقہ، قانون، نقشے وغیرہ ایک جداگانہ ساؤتھ شاخ (متفرقات) کے نام سے رکھے جاسکتے ہیں۔

القسمہ آج میرا اصل مقصد اسی قدر ہے کہ اس کتب خانے کی افتتاح کی رسم کی ادائیگی کے وقت کتابوں کی ترتیب، تقسیم و تعریف کا ایک سہل طریقہ بتا دوں۔ اس کو میں نے بقول شخصے جیسا سد و بھائی اپنا کان بتا دیا ہے۔ دیا ایک ٹیڑھے، ترچھے ٹھٹھکھانے طور سے بتا دیا۔ اس سے اگر میں فاس جلسے کا وقت ضائع کیا ہے تو اس کا ذمہ داری نہیں ہوں، میرا بوجھ پابا ہے۔ اس ذمہ داری میں ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری نور کا بھی بڑا حصہ ہے جنھوں نے اس تقویم پاریہ کو خالصانہ اصرار سے صدارت کے لئے آمادہ کیا۔ اب میں عالی جناب صدر اعظم باب حکومت سے لقمس ہوں کہ اپنے دست مبارک سے اس اردو کتب خانہ اسلامیہ کا افتتاح فرما کر حامیان کتب خانہ کو ممنون اور حاضرین جلسہ کو مسرور فرمائیں اور میرا دلی شکریہ دوبارہ قبول فرمائیں۔

میر محمد مومن - عہد محمد قلی قطب شاہ و سلطان محمد قطب شاہ میں پیشوائے سلطنت اور وزیر مطلق تھے۔ دینی عروج کے علاوہ ان کی مذہبی سیادت و فضیلت بھی بہت مشہور ہے۔ انھوں نے ہزار ہا روپے کے صرفے سے ایک دائرہ بنایا تھا جس میں خاک کر ملائے علی پچھا دی تھی۔ اور یہ دائرہ اب تک ”دائرہ میر مومن“ کے نام سے حیدرآباد میں مشہور و معروف ہے۔ میر محمد مومن صاحب اعلیٰ پایہ کے فارسی شاعر بھی تھے اور حیدرآباد آنے سے قبل شاہ ابراہان کے استاد بھی رہ چکے تھے۔ ان کے نہایت تفصیلی اور تحقیقی حالات زندگی اس کتاب میں جناب ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری نور نے اپنے دلچسپ اور مقبول عام اسلوب میں تحریر فرمائے ہیں۔ تقریباً تین سو صفحات مع تصاویر قیمت ۳۰ روپے

حضرت شاہ ابوالبرکات رفاعی

حضرت حافظ سید شاہ ابوالبرکات غلام محمد زقم قدس سرہ سادات کاظمی سے تھے۔ آپ کے اجداد میں حضرت سید احمد کبیر مشوق اللہ رفاعیؒ اور حضرت سید علی سانگے سلطان شکل آسانؒ بہت مشہور و معروف گذرے ہیں۔ موخر الذکر کی درگاہ قندھار شریف ضلع ناندیڑ میں زیارت گاہ خواص دا نام ہے اور انہی کی اولاد و اخفاء اور اعزہ آج تک مالک محروسہ سرکار عالی کے اضلاع اور دیہات میں قاضی، غلیب، مفتی اور محنت جیسی دینی خدمات پر فائز ہے جس کے تذکرے تاریخ قندھار دکن اور تاریخ شاہیر قندھار میں شائع ہو چکے ہیں۔

حضرت شاہ ابوالبرکات کے دادا مولنا سید شاہ بدیع الدین رفاعی حضرت مولنا ابواللہ خاں نصیلت جنگ علیہ الرحمۃ کے استاد تھے اور والد حضرت صاحب عالم حاجی سید شاہ عنایت اللہ حصین شہید ایک صاحب باطن بزرگ اور حضرت پیر الہی بخش قدس سرہ کے رفیق طریق تھے۔ ان کے حالات زندگی اور کثرت و کمالات کا تذکرہ دکن کے مشہور موبخ ششی شمس الدین امیر حمزہ مرحوم نے ایک کتاب روح شہید زاہد غریب میں لکھ کر مطبع مفید دکن سے ۱۳۲۶ھ میں شائع کیا تھا۔

حضرت شاہ ابوالبرکات ۵ محرم ۱۲۹۵ھ کو تولد ہوئے اور جب ان کے پو یا قاضی محمد امیر الدین پوری نے مدرسہ نظامیہ کی بنیاد ڈالی تو اس میں مولنا محمد عبدالکریم افغانی سے تفسیر اور مولنا محمد یعقوب ہندی سے فقہ اور مولنا محمد عبدالوہاب محدث نقشبندی استاد حضرت سید نور الدین شاہ قادریؒ سے حدیث کی تعلیم پائی۔ عنوان شہاب میں شعر و شاعری کا ذوق پیدا ہوا تو میرزا بعلی زور مرحوم کے شاگرد ہوئے۔ چنانچہ زعم غص انہی کا عطا کردہ ہے۔ شاعری کے علاوہ نیو الفریڈ کینی جیسی ناولوں کے لئے ڈرامے بھی لکھے۔ لیکن پچیس سال کی عمر میں قبرستان کی ایک آواز اور مولنا عبدالوہاب محدث کے فیض صحبت سے طبیعت نے یکایک بظاہر یا اور قرآن شریف حفظ کر لیا۔ اس کے بعد اپنے دیوان اور ڈراموں کو نذر آتش کر کے اور صدر محاسنی کی سرکاری ملازمت ترک کر کے ۱۳۲۳ھ میں وعظ و رہنمائی کی خاطر حیدر آباد سے نقل کھڑے ہوئے۔

آپ کو اپنے والد ماجد سے سلسلہ رفاعیہ و قادریہ کی، مولنا عبدالوہاب محدث سے سلسلہ نقشبندیہ کی اور مولنا نصیلت جنگ سے سلسلہ چشتیہ کی بیعت و خلافت حاصل تھی۔ جب آپ کے وعظ اور رشد و ہدایت سے خلق اللہ فیض یاب ہونے لگی اور لوگ جوت و رجوت برید ہوتے گئے اور بہت سے لوگ آپ کے ہاتھ پر مسلمان ہو گئے تو آپ کے بعض احباب و معتقدین نے حضرت نصیلت جنگؒ سے کہہ کر آپ کو سرکاری واعظ مقرر کر کے تنہا روپے ۱۰ جوار دلائی چاہی مگر آپ نے اس قید و بند کو پسند نہ فرمایا اور اپنی خانقاہی جاگیر اور زمینات کی مختصر آمدنی اور نوکل پر اکتفا کیا اور اپنے عہد امجد حضرت سانگے سلطانؒ کی طرح تمام عمر سیر و سیاحت اور رشد و ہدایت میں صرف کی۔ اسی مناسبت سے علاقہ مرہٹو اڑی کے بعض معتقدین آپ کو سانگے سلطان ثانی کے لقب سے یاد کرتے ہیں۔

حضرت نہایت نیک باطن تھے۔ ہر شخص سے سادگی اور خلوص سے ملنے اور بڑے سے بڑے دنیا دار کے آگے بھی صاف گوئی اور پند و موعظت سے دریغ نہ کرتے تھے۔ جو دل میں ہوتا وہی زبان پر ہوتا۔ کبھی دنیا داری اور شان و شوکت کو پسند نہ کیا اور نہ اصحابِ ہاہ و خروت کو خاطر میں لائے۔ ہمیشہ خوش پوشاک اور خوش خوراک رہے۔ اتنے سرح و سفید اور وجہ تھے کہ علاؤ الدین کے جنگِ عظیم کے دوران میں جب خیر مدراس میں آپ کی مجالس و عظم میں سارا شہر ٹوٹ پڑنے لگا تو اگرچہ عہدہ داروں کو شبہ ہوا کہ آپ ترک ہیں اور سلطان ترکی نے جاسوسی اور ہندوستانی مسلمانوں کو اپنا مایہ بنانے کے لئے آپ کو ہندوستان روانہ کیا ہے۔ اس لئے آپ کو نظر بند کر دیا گیا تھا لیکن جب مولانا لطیفیت جگت نے حکومت مدراس کو یقین دلایا کہ حضرت ان کے عزیز ہیں اور حیدر آبادی ہیں تو نظر بندی سے رہائی پائی۔

حضرت شاہ ابوالبرکات ہمیشہ نماز باجماعت ادا کرتے اور رات میں بہت کم سو تے تھے۔ آپ کا ارشاد تھا کہ آدھی رات کے بعد کی عبادت اور دعا خدا کے پاس بہت مقبول ہوتی ہے۔ شام کی نماز کے بعد آپ مسجد ہی میں دیر تک اور آدھ ظہر میں مشغول رہ کر بڑی رات کو گھر واپس ہونے اور گھنٹہ دو گھنٹے آرام کر کے تہجد و اشراق کے لئے پھر مسجد تشریف لے جاتے۔ جب بھی حیدر آباد میں ہوتے تو عصر کی نماز سے مغرب کی نماز کے بعد تک اپنے والد حضرت صاحب عالم شہید کی طرح چوک کی مسجد ہی میں التشریف رکھتے۔ سواری کے مقابلہ میں پیدل چلنے کو پسند فرماتے اور جہاں کہیں سفر پر تشریف لے جاتے تو امیروں اور عہدہ داروں کے مقابلہ میں غریبوں کے یہاں قیام کرنے کو ترجیح دیتے۔

حضرت کی آواز میں خاص درد اور اثر تھا اور طرز بیان اتنا با اثر ہوتا تھا کہ آپ کی مجلس و عظم سامعین پر بے اختیار رقت طاری رہتی تھی۔ چونکہ حافظہ قرآن ہولے کے سوا حضرت اعلیٰ پائے کے قاری بھی تھے اس لئے ہر رمضان میں آپ کے مصلحین تراویح کے لئے دور دور سے بلاتے اور آکر سنے جاتے تھے۔ اس دورِ مدائ کے دیہانت اور دھماکار گزار مقامات تک پہنچ کر رشید دیانت کرنے میں حضرت نے جو تہمتیں اٹھائیں اور ہزار مسلمانوں کو جو اصلاحِ عالی کی طرف راغب کیا اور سیکڑوں کو حلقۂ اسلام میں شامل کیا ان سب کی تفصیلات حضرت کے نو و مشہور سوانحِ حیات میں درج ہیں جو چار عظیم جلدوں پر مشتمل ہے اور حضرت کے فرزند و اکابر سید محمدی الدین قادری صاحبِ رتور کے کتب خانہ میں محفوظ ہے۔

حضرت کی آپ بیتی چالیس پچاس سال قبل کے مذہبی و معاشرتی حالات کا ایک آئینہ ہے کیونکہ اس میں ہر مقام کی تعلیمی خصوصیات اور وہاں کے مسلمانوں کے حالات شرح و بسط سے بیان کئے گئے ہیں۔ حضرت نے نہ صرف مالک محمود سے ہی کے اصلاح اور دیہانت کو اپنے سوا عطا حسنہ سے فیض پاب کیا بلکہ سندھ سے آسام اور بنوبہرہ سے لے کر ملکِ بنگالہ کے طولی دور سے گئے۔ برا اور جزائرِ مشرقِ الہند میں بھی اپنا فیض پہنچایا۔ یوں تو ہر شہر اور قصبہ میں آپ کے مدید و معتقد موجود ہیں لیکن مدراس، میسور، حیدرآباد، بھوپال، ناگپور، ممبئی، کراچی، بیدر، گلبرگ اور اننگ آباد میں آپ کے مدین کثیر تعداد میں ہیں۔

غرض حضرت شاہ ابوالبرکات نے مسلسل چالیس سال سیر و سیاحت اور پند و موعظت میں گزار دیئے۔ کبھی چند روز کے لئے حیدرآباد تشریف لائے تو یہاں بھی مختلف محلوں میں مجالس و عظم کا سلسلہ شروع ہو جاتا۔ اور

جب کبھی عید وطن میں ہوتی تو حضرت پرانی عید گماہ طلب تھا ہی میں وہاں سے منٹولی شاہ عبدالعزیز مرحوم کے اہلکار پر نماز پڑھاتے۔ یہ سلسلہ حضرت کی جلالت اور وفات تک برابر جاری رہا۔ آخر کار یہ اصغر علی شاہ کو حضرت کا وہاں ہوا اور مسلم جنگ پیل کے کاؤزی حضرت کی نشان دہی جگہ پر پیدائش میں آئی۔ جس پر ایک گشتہ قیدیوں کو پکارتے تھے۔ حضرت کا وہاں ہر سال ۶۵ اور ۷۰ رجب الاول شریف کو ہوتا ہے۔

حضرت شاہ ابوالبرکات قدس سرہ نے اپنی زندگی ہی میں اپنے غیرہ سید شاہ نقی الدین احمد صاحب قادری ابن ڈاکٹر سیدی الدین قادری زور کو سپاہ مظفر آباد تھا اور ان کو اپنے والد حضرت سید شاہ عنایت الدین صاحبی کے نام پر "عنایت پاشاہ" سے خطاب فرماتے تھے اور ہدایت بھی کر میاں ابھی کو دو سال ہیں ان کی اعلیٰ تعلیم و تربیت کا انتظام کیا جا رہا ہے۔

استاد العالی علامہ حضرت مولانا مولوی محمد عبدالقدیر صاحب صدیقی حضرت سابق صدر شعبہ دینیات جامعہ مظہر الہی علیہ السلام کے عرس شریف میں تشریف فرما ہوئے۔ تو میاں عنایت پاشاہ صاحب ممدوح کو طلب فرما کر اپنے دست مبارک سے سپاہی کی تشکیل فرمائی۔ اس موقع پر علماء و مشائخین اور علماء شہر مثلاً حضرت مولانا سید محمد بادشاہ عینی صاحب متمدن مجلس علماء دکن مولانا سید شاہ ولی اللہ حسینی صاحب معتد اجمن پیشوایان مذہب مولانا سید محمود مجددی صاحب جناب سجادہ صاحب لشکر حوض، نواب عزیز نواز جنگ بہادر صدرالہمام عرف خاص مبارک، نواب معین نواز جنگ بہادر مستند سیاحت مولوی قاضی شہزاد زین العابدین صاحب ناظم آبکاری، مولانا سید احمد حسین صاحب افتخار، مولوی سید محمد حسین صاحب آزاد، مولوی محمد منیر الدین صاحب قاضی پربھنی درگاہ شریف میں شریک مجلس تھے۔

تفا مجددی

مشاہیر قندہار دکن

اس تذکرہ میں مولوی اکبر الدین صدیقی صاحب ایم اے نے دکن کے مشہور و معروف اور مردم خیز خطہ قندہار شریف کے معزز خاندانوں اور ان کے باکمال و مایہ ناز افراد کا اجمالی خاکہ کھینچتے ہوئے فیروز آبادی صاحب صدیقی اسناد تاریخ جامعہ عثمانیہ کا بصیرت افروز مقدمہ اس کے ساتھ شائع ہوا ہے۔

قندہار شریف دکن کا بلگرام سمجھا جاتا ہے اور متحدہ تعلق کے زمانے سے آج تک وہاں کی سرزمین سے بڑے بڑے اولیاء و علماء و شعرا اور مشاہیر پیدا ہوتے رہے ہیں دکن کے مختلف شہروں اور قصبوں میں قاضیوں، خطیبوں، محققوں اور دیگر اہل فداات شریعہ کے جو خاندان آباد ہیں۔ ان میں سے اکثروں کا تعلق قندہار شریف ہی کے بزرگوں سے ہے اس لئے یہ کتاب دکن کے شرق اور بزرگوں کا ایک مستند اور مبسوط تذکرہ بھی جاسکتی ہے اور اس کے مطالعہ سے یہاں کی علمی و ادبی تہذیب بھل کا اندازہ ہو سکتا ہے (قیمت ۵۰)

احساس

وہ مرے واسطے بے تاب و پریشاں ہوگی
 بزمِ تنہائی میں وہ سرگرمیاں ہوگی
 میری فرقت میں محبت سے پیشاں ہوگی
 اس کو رہ کے مری یاد ستاتی ہوگی
 دلِ معصوم پہ بجلی سی گراتی ہوگی
 خوفِ دنیا اسے رونے بھی نہ دیتا ہوگا
 دردِ دل راتوں کو سونے بھی نہ دیتا ہوگا

شکوہ وہ کاتبِ تقدیر سے کرتی ہوگی
 چھپ کے باتیں مری تصویر سے کرتی ہوگی

کسی پہلو بھی اُسے چین نہ آتا ہوگا
 سوزِ فرقتِ دلِ مضطر کو جلاتا ہوگا
 رازِ ہم جویوں سے کہہ بھی نہ سکتی ہوگی
 وہ بغیر آہ و فغاں رہ بھی نہ سکتی ہوگی
 چاند کے سینے میں ظلمتِ نظر آئی ہے مجھے
 بے قراری مرے دل کی یہ بتاتی ہے مجھے

وہ مرے واسطے بیتاب و پریشاں ہوگی

جبریل

اداره ادبیات اردو کی کتابیں

ردیف	تالیف	نام کتاب	ردیف	تالیف	نام کتاب	ردیف	تالیف	نام کتاب
۱۲۸	۲	سرگزشت حاتم	۱۲۸	۲	سرگزشت حاتم	۱۲۸	۲	سرگزشت حاتم
۹۴	۸	سرگزشت غالب	۹۴	۸	سرگزشت غالب	۹۴	۸	سرگزشت غالب
۴۰	۶	نظام الملک	۴۰	۶	نظام الملک	۴۰	۶	نظام الملک
۳۳۰	۸ ۳	تاریخ گولکنده	۳۳۰	۸ ۳	تاریخ گولکنده	۳۳۰	۸ ۳	تاریخ گولکنده
۱۶۰	۱	رند یونمبر (۸ تصاویر)	۱۶۰	۱	رند یونمبر (۸ تصاویر)	۱۶۰	۱	رند یونمبر (۸ تصاویر)
۱۲۰	۱۲	ارمغان چنگ	۱۲۰	۱۲	ارمغان چنگ	۱۲۰	۱۲	ارمغان چنگ
۱۲۰	۲	سونیلی مان	۱۲۰	۲	سونیلی مان	۱۲۰	۲	سونیلی مان
۱۶	۴	سر سید احمد خان	۱۶	۴	سر سید احمد خان	۱۶	۴	سر سید احمد خان
۴۸	۶	سر سالار چنگ	۴۸	۶	سر سالار چنگ	۴۸	۶	سر سالار چنگ
۱۴۵	۴ ۱	مہرئی تصانیف کے اردو تراجم	۱۴۵	۴ ۱	مہرئی تصانیف کے اردو تراجم	۱۴۵	۴ ۱	مہرئی تصانیف کے اردو تراجم
۱۳۲	۳ ۱	مصحف کی چھاؤں	۱۳۲	۳ ۱	مصحف کی چھاؤں	۱۳۲	۳ ۱	مصحف کی چھاؤں
۲۶۸	۳ ۱	اقبال نمبر	۲۶۸	۳ ۱	اقبال نمبر	۲۶۸	۳ ۱	اقبال نمبر
۱۱۲	۱	سائنس کے کرشمے	۱۱۲	۱	سائنس کے کرشمے	۱۱۲	۱	سائنس کے کرشمے
۲۳۰	۳ ۲	شعراے عثمانیہ	۲۳۰	۳ ۲	شعراے عثمانیہ	۲۳۰	۳ ۲	شعراے عثمانیہ
۳۰۰	۸ ۴	مکتوبات شاد عظیم آبادی	۳۰۰	۸ ۴	مکتوبات شاد عظیم آبادی	۳۰۰	۸ ۴	مکتوبات شاد عظیم آبادی
۱۶	۲	دادا بھائی	۱۶	۲	دادا بھائی	۱۶	۲	دادا بھائی
۲۰۰	۲	اردو نامہ	۲۰۰	۲	اردو نامہ	۲۰۰	۲	اردو نامہ
۸۵	۱۰	حد رآباد	۸۵	۱۰	حد رآباد	۸۵	۱۰	حد رآباد
۴۰	۶	عماد الملک	۴۰	۶	عماد الملک	۴۰	۶	عماد الملک
۵۶	۶	اردو دان کی پہلی کتاب	۵۶	۶	اردو دان کی پہلی کتاب	۵۶	۶	اردو دان کی پہلی کتاب
۵۶	۶	دوسری کتاب	۵۶	۶	دوسری کتاب	۵۶	۶	دوسری کتاب
۲۰۰	۴	محمد حسین آزاد	۲۰۰	۴	محمد حسین آزاد	۲۰۰	۴	محمد حسین آزاد
۱۳۰	۴ ۱	کاغذ کی ناؤ	۱۳۰	۴ ۱	کاغذ کی ناؤ	۱۳۰	۴ ۱	کاغذ کی ناؤ
۹۲	۱۲	فن تقریر	۹۲	۱۲	فن تقریر	۹۲	۱۲	فن تقریر
۱۴۳	۱	مقدمہ تاریخ دکن	۱۴۳	۱	مقدمہ تاریخ دکن	۱۴۳	۱	مقدمہ تاریخ دکن
۱۴۰	۸ ۳	ہندوستانی تمدن	۱۴۰	۸ ۳	ہندوستانی تمدن	۱۴۰	۸ ۳	ہندوستانی تمدن
۸۰	۱۰	پودوں کی کہانی	۸۰	۱۰	پودوں کی کہانی	۸۰	۱۰	پودوں کی کہانی
۱۰۰	۱	مہ لقا	۱۰۰	۱	مہ لقا	۱۰۰	۱	مہ لقا
۴۸	۶	پانی کی کہانی	۴۸	۶	پانی کی کہانی	۴۸	۶	پانی کی کہانی
۳۹۰	۸ ۲	رسائل طیبہ	۳۹۰	۸ ۲	رسائل طیبہ	۳۹۰	۸ ۲	رسائل طیبہ
۴۰	۴	حکمران	۴۰	۴	حکمران	۴۰	۴	حکمران
۱۷۲	۸ ۱	تاریخ ادب اردو	۱۷۲	۸ ۱	تاریخ ادب اردو	۱۷۲	۸ ۱	تاریخ ادب اردو
۵۶	۸	اشوک اعظم	۵۶	۸	اشوک اعظم	۵۶	۸	اشوک اعظم
۸۳	۱	بانیں	۸۳	۱	بانیں	۸۳	۱	بانیں
۲۱۸	۸ ۲	یورپ جنگ سے پہلے	۲۱۸	۸ ۲	یورپ جنگ سے پہلے	۲۱۸	۸ ۲	یورپ جنگ سے پہلے
۱۷۹	۸ ۴	بلانغیہ	۱۷۹	۸ ۴	بلانغیہ	۱۷۹	۸ ۴	بلانغیہ
۱۰۲	۱	اریائی زبانیں	۱۰۲	۱	اریائی زبانیں	۱۰۲	۱	اریائی زبانیں
۳۰	۴	نظام علی خان	۳۰	۴	نظام علی خان	۳۰	۴	نظام علی خان
۲۹۰	۸	مذکرہ اردو مخطوطات جلد اول	۲۹۰	۸	مذکرہ اردو مخطوطات جلد اول	۲۹۰	۸	مذکرہ اردو مخطوطات جلد اول
۵۶	۱۰	عرب اور عربستان	۵۶	۱۰	عرب اور عربستان	۵۶	۱۰	عرب اور عربستان

سبیل



ادبیۃ ادبیات اردو حیدرآباد دکن کا ماہ نامہ

زیر نگرانی
ڈاکٹر سید محمد الدین قادیانہ
مجلس ادارت
خواجہ حمید الدین شہید
سیکریٹری سیکرٹری

سب رس

شان شمسہ صفیہ ۱۵۳
شان شمسہ صفیہ ۲۹۵
شلیفین نمبر ۲۰۹
چند سالانہ چار روپیہ
پچوں کا رس ایک روپیہ

جلد ۹ بابت مئی ۱۹۴۶ء شمارہ ۵

۱	شعر و نظم	۱	مگر مراد آبادی
۲	عربی پسند ادب	۲	محمد منظور احمد ایم اے (ادبیاتی)
۳	صحافی و دوزخ	۳	پرو فیسر شورش احمد
۴	وحشی اور ابن شیطانی کے اسالیب کا موازنہ	۴	محمد معین الدین بی اے (عثمانیہ)
۵	نقادوں سے	۵	سلام بھٹی شہری
۶	دہ دہ عورتیں	۶	انجمن دوست زنی بی اے (عثمانیہ)
۷	قافیہ کی صنعتی قدر و قیمت	۷	حفیظ قتیل ایم اے (عثمانیہ)
۸	تلقین	۸	جلیل (جلیپور)
۹	استغفار	۹	جلیل بک
۱۰	تعارف و فن	۱۰	کلب اکبر (عثمانیہ)
۱۱	غزل	۱۱	قتیل شفقانی
۱۲	فکرت	۱۲	ابوالنظر عمن الشرف
۱۳	غزلی	۱۳	سید غوث الدین عینی
۱۴	غزل	۱۴	سید محمد الدین احمد ایم اے (آخری)
۱۵	آرٹسٹ میں حسن کارگی شخصیت کا عکس	۱۵	عبدالعزیز فطرت (راولپنڈی)
۱۶	نثر	۱۶	احمد علی
۱۷	نثر	۱۷	سہام مرزا
۱۸	نثر	۱۸	میر محمد اشجاء الدین بہر
۱۹	نثر	۱۹	سید علی منظور
۲۰	نثر	۲۰	زیر نگرانی

خواجہ حمید الدین شاہد ایم اے کے اہتمام سے مجموعہ پیشین پرکس میں چکر فرشتہ خیر و شر

شعر و نغمہ

اللہ اگر توفیق نہ دے انسان کے بس کا کام نہیں
اب لفظ ویاں سب ختم ہوئے ابیدہ و دل کا نہیں
یار بے مقام عشق ہے کیا گویدہ و دل ناکام نہیں
کیوں ست شرابِ عیشِ طرب تکلیفِ توجہ قرار نہیں
آنا ہے جو زہمِ جانان میں پندارِ خودی کو توڑ کے آ
ہر غلطِ قصہ و عیشِ نظر ہر تہِ نطفہ راہِ حاصل
زاہنے کچھ کس انداز سے پی ساقی کی گاہیں پر نہ
عشق اور گوارا خود کر لے بے شرطِ شکستِ عاشِ اپنی
اس حسن کا شکوہ کیا کیجئے محدود ہے جس کی اک دنیا
سب جس کو اسیری کہتے ہیں وہ تو ہے اسیری ہی

فیضانِ محبتِ عام تو ہے عرفانِ محبتِ عام نہیں
عشق ہے خودِ پیغامِ اپنا اب عشق کا کچھ پیغام نہیں
تسکین ہے اور تسکین نہیں آرام ہے اور آرام نہیں
آوازِ شکستِ دل ہی تو ہے آوازِ شکستِ جام نہیں
لے ہوش و خرد کے دیوانے یاں ہوشِ خرد کا کام نہیں
پھر بھی ہے وہ کیا شے سینے میں مکن ہے بے آرام نہیں
میکش ہی اب تک سمجھ تھے شائستہ دورِ جام نہیں
دل کی بھی کچھ ان کے سازش تھی تنہا یہ نظر کا کام نہیں
اُس سنی طلب کو کیا کہئے جو سنی طلب ناکام نہیں
وہ کونسی آزادی ہے یہاں جو آپ خود اپنا دوا نہیں

پینے کو تو سب پیتے ہیں جگر مینخانہِ فطرت میں لیکن

خرومِ نگاہِ ساتی ہے وہ رند جو درِ دواست م نہیں

جگر مراد آبادی

مراد افغان حسین صدیقی
(مراد آبادی)

(ایڈیٹر کا مضمون نگاری کے لئے متفق ہونا ضروری نہیں)

ترقی پسند ادب

انتہائی اہم مقام دیئے چلے جا رہے ہیں جن کی طر امتی میں طبقہ اعلیٰ نے کسی قدر کی توجہ کے اخلاقیات شان مسجد آج مزدوروں کی بین الاقوامی انجمنیں قائم ہیں اور ان جیداری پیدا ہو رہی ہے۔ اسی لئے ان کی آواز پر بہت زیادہ توجہ دی جانے لگی ہے۔ موجودہ صنعتی دور یا صنعتی دور میں مزدوروں کی ضرورت کا لحاظ کرتے ہوئے خود کو زیادہ بحال کر رہے ہیں اور کم کی نظر رکھنا اپنی بقا کے لئے ضروری سمجھتے ہیں۔ جو صنعتی کا منظر ہونی شروع ہوا دنیا میں کمزوروں پر منظم کو دیکھ کر یہ نظریہ قائم کرنے پر مجبور ہوا تھا کہ قدرت انہی ہے۔ اس کی سمجھ میں یہ بات نہ آ سکی کہ دنیا میں ظلم و استبداد اور ناگہانی وحشت و بے ایمانیوں غریبوں اور کمزوروں کے حصے میں آئے ہیں اور کیوں ہر شخص کو اس کی محنت کا صلہ یا معاوضہ صحیح وصول ہونا نہیں دیا جاتا جس کی وجہ سے غریبوں کی غربت میں اور امیروں کی امارت میں اضافہ ہوتا چلا جا رہا ہے۔ دنیا میں انہوں نے ہر جگہ انصاف کا خون بہا ہوا دیکھا اور کمزور پر طاقتور کے مظالم کا مشاہدہ کیا۔ اسی وجہ سے دنیا کے حالات سے وہ ایسے سنا ہوئے اور قنوطیت اس کے دل و دماغ میں راہ پائی۔ لیکن جو صنعتی کے ایک فلسفی نیچم نے طے کیا کہ دنیا میں کمزوروں کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے اور زندگی کا مقصد یہ ہونا چاہیے کہ ہم اقلیت اور اقل کریم کش کش برائے اقتدار کو وہ لازمہ حیات سمجھنا تھا۔ یہ حقیقت ہے کہ پستی ہوشیہ بندی کی دشمنی ہی کو لیکن بلند ہوشیہ کی پستی کا ہوشہ خیال رکھا اور اس کی مصلحت و ہمدردی میں کوشاں رہی ہے۔

دنیا میں دولت مند طبقہ مختصر رہا ہے لیکن اس کا وجود ہر حال ہر زمانے میں رہا اور اس کا رہنا ضروری بھی ہے۔ سماج میں فرق مراتب ہمیشہ رہا ہے اور سماج اگر سماج میں تمام افراد کو غذا فراہم کرنے کے انتظامات

ادب زندگی کا آئینہ ہوتا ہے۔ زندگی اور وہ بھی نظام اقوام کی زندگی ہمیشہ عبوری دور سے گزرتی نظر آتی ہے۔ ایسے ہر آن اور ہر دم ایک نئی کروٹ اور ایک نیا رخ اختیار کرتی ہے۔ ایسے وقت نئے پہلو بدلتے والی زندگی کہ قدرت کو خاطر میں نہ آ سکتی تھے ہر پرانی چیز سے عداوت ہو جاتی ہے۔ اس کے خیال میں (جیسے یہ خیال غلط ہو یا درست) ایسی قدامت غلامی کے بندھنوں کو مضبوط کرتی ہے۔ اس لئے ایسی قضائیں اور اختلافات اور ایسے بندھنوں میں جڑا ہوا انسان ہر وقت اور ہر لمحہ اپنی ہی چیزوں کو بری نظر سے دیکھتا ہے۔ وہ ہر شے کو تنقیدی نقطہ نظر سے دیکھتا ہے۔ یہ سوال کرتا ہے کہ یہ چیز آزادی کی راہ میں عہد معارف سے یا مشکلات کا باعث بن رہی ہے۔

اس نقطہ نظر سے اچھی چیزوں کو حیات نو بخشی جاتی ہیں اور بری چیزوں کو مٹوا دیتی ہے۔ حیات غلط کی طرح مٹا دیا جاتا ہے۔ آج اردو ادب کی دنیا ادب اختیار کر رہا ہے۔ ترقی پسند ادب مجسم تھا ہونے لگا ہے۔

ترقی پسند ادب اور اس سے پہلے کے ادب میں بامبالغہ امتیاز چیز ہے کہ ترقی پسند ادب میں طبقہ سوم یا پست ترین طبقے کی زندگی کو پیش کیا جاتا ہے۔ اس کا مقصد اس طبقے کی ناقصیت و حالت کو پیش کر کے قوم کو اس کی اصلاح کی طرف متوجہ کرنا ہے۔ یہ اس لئے بھی اچھا ہے کہ دنیا کی آبادی کا بڑا حصہ افلاس زدہ افراد پر مشتمل ہے اور یہ کیفیت بالخصوص ہندوستان میں بدرجہ اتم پائی جاتی ہے۔

آج کل دنیا کے بدلتے ہوئے حالات طبقہ اعلیٰ کو

سب کا فرض ہے۔ اگر انھیں یوں ہی برہنہ چھوڑ دیا جائے گا اور محض یہ سمجھ کر ان کا کام ہی چلنا ہے تو سب یہ گردا گرد ہو جائیں گے اس پر بھی جنہم پوشی کی جائے گی تو ان میں آبلے پڑ جائیں گے اور نتیجہً آپ بیلے پھرنے سے معذور ہو جائیں گے۔ اور اس سے آپ ہی کی رفتار ترقی میں خلل واقع ہو گا۔ اس لئے ہر کی حفاظت کیجئے تاکہ آپ نہایت تیز رفتاری سے صافان میں گامزن ہوں۔ پاؤں کو ٹوٹنے نہیں کیونکہ انھیں توڑ کر آپ اپنی ہی شاہی کاسان کا رخ ترقی پسند ادب کے متعلق ایک اعتراض یہ بھی ہے کہ اس کی بنیاد و بنیاد پر رکھی گئی ہے۔ اس کے متعلق یہ عرض کرنا بہت کافی ہے کہ سماج کے جس طبقے کو اس ادب میں پیش کیا جا رہا ہے وہ خود اخلاق کی حد میں توڑ چکا ہے۔ اس لئے اگر جدید ادب کے اس حصے میں عریانیات آج کے زمانہ میں ہوں چڑھا کوئی اچھی بات نہیں جب اس طبقے کی اصلاح ہو جائے گی تو ادب بھی اصلاح پا جائے گا۔ ترقی پسند ادب کے حامی یہ کہتے ہیں کہ وہ اس ادب کے ذریعے انسانوں کی زندگی کو پیش کرتے ہیں۔ ایسے انسانوں کی فن کی تعداد سوسائٹی میں عوام بہت زیادہ ہوتی ہے اور یہ کہ ادب کو انسانوں سے متعلق رہنا چاہئے، انسانوں سے ہٹ کر جس چیز کو پیش کیا جائے گا، وہ نظر انداز کرنے کے قابل نہیں۔ لیکن ان کے اس خیال کی توثیق میں یہ حقیقت بیان کی جاتی ہے کہ ادب کو اس طرح نہ وہ موضوع کا پابند رہتا ہے کہ ادب عالم کو چھوڑے۔ اس میں ساری کائنات کو سمجھ دیا جاسکتا ہے۔ اور سمجھ دیا جانا چاہئے۔ ادب میں انسانوں کی زندگی ضرور پیش کی جاسکتی ہے لیکن انسان کا حلق صرف انسانوں ہی سے نہیں ہے بلکہ جو کہ وہ صاحب عقل اور تمام مخلوقات میں اشرف و افضل ہے اس لئے وہ ساری دنیا سے اپنے آپ کو متعلق بنا رہے۔ فطرت کے حین مناظر اس کے دل پر نشاۃ ہوئے ہیں۔ کبھی کبھی تو اہم قدرت اس کی مزاحمت کرتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔ مختلف موسموں اس کی طبعیت پر مختلف

بھی مہر ہو جائیں تو سبھی فرق مراتب نظام زندگی کو بچانے کے لئے بعد ضروری ہے۔ قوموں کی قیادت کے لئے طبقہ اعلیٰ ہی سے بہتر افراد اٹھتے ہیں اور قیادت کی باگ دراصل ان ہی کے ہاتھ میں ہوتی بھی چاہیے جو بہترین دلغہ رکھتے ہوں بہت طبقے کے افراد سے ایسی توقعات والہ نہیں کی جاسکتیں۔ اگر کبھی قوموں کی قیادت طبقہ اعلیٰ کے افراد میں سے کسی نے کی بھی ہے تو اسی صورت میں جبکہ اس میں طبقہ اعلیٰ کی بہترین خصوصیات پیدا ہوئیں۔ یعنی اپنی ذہنی صلاحیت پاکیزہ اخلاق، جرات و ہمت، وسعت نظر وغیرہ۔ قوم کے افراد بھی بکریاں ہیں۔ ان کی نگاہ بانی کرنے کے لئے ایک گلابان کی ضرورت ہوتی ہے۔ قوم میں لیڈر کا ہونا بہر حال ضروری ہے جس کے علم کے سبب بلا امتیاز سر تسلیم خم کروں۔

ان کو سننے نے طبقہ اعلیٰ اور طبقہ اعلیٰ کے لئے ایک ہی اچھی مثال دی ہے۔ وہ انھیں انسانی جسم کے اعضاء سے تشبیہ دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ انسانی جسم میں مرکز ملزما مقام پر ہوتا ہے اور پیرینٹ ہی ہوتا ہے۔ مرکز کا ملزما مقام پر ہونا ضروری ہے۔ اور پیرینٹ ہی رہیں تو اپنا فرض بخوبی انجام دے سکتے ہیں۔ دلغہ کو اس نے ملزما مقام پر رکھا گیا ہے کہ وہ انسان کی بہت اہم خدمت انجام دیتا ہے لیکن اس سے یہ نتیجہ نہیں نکالنا چاہیے کہ ہمیں پیر کی اہمیت سے انکار ہے۔ ہمیں پیر کی پراہد نہیں ہے۔ ہم نہیں بھی اپنی بقا کے لئے ایسا ہی ضروری سمجھتے ہیں جیسے دماغ کو فین ہمارا کہنا ضرورت اس قدر ہے کہ سراسر مقام پر اور پیر اپنے مقام ہی پر رہیں تو زندگی یہ گاڑی غیر موثر بن جاتی ہے وہ سارا نظام زندگی درہم برہم ہو جائے گا۔

ترقی پسند ادب اپنے مخالفوں سے ضرور دونوں کی تائید میں یہ کہہ سکتے ہیں کہ عقین رکھنے کے پاؤں کبھی سر نہ بنا نہیں چاہتے لیکن ان کی حفاظت آپ کا کارا اور

اثرات پیدا کرتے ہیں۔ انسانی ریت کی نیرنگیاں، جذبات، حسرت اور نظری مناظر سے متاثر ہونے کی صلاحیت سے اس کا دل بھی سرور اور کھنکھنایا ہوا ہوتا ہے۔ ادیب سے ہرگز جذبات محبت جو انسان، حیوان، گھاتات، وحاشات اخلاقی کاغذ کی بے شمار چیزوں سے اس کی وجہ سے حرکت میں آتا ہے اس کے دل، دماغ کے ساکن ہندوستان، احساس و عقل کی لہریں پیدا کرتا ہے جن کے اظہار پر وہ اپنے آپ کو مجبور ہوتا ہے۔ اسی لئے ہاری شاعری بلکہ دنیا کی تمام زبانوں کی شاعری میں قدرتی مناظر کے پرستار موسم بہار کے درج برسات کی برکتوں کو بیان کرتے ہوئے حسین مناظر سے لہنت اندوز ہوتے ہیں۔ اپنے پیش ہوا اثرات کو پیش کرتے چلے آئے ہیں۔ یہ تمام جذبات ہر انسان کی فطرت میں دوامیت کے لئے ہیں جو اعتدال و انانیت سے یا دوسرے وجہ سے کبھی خفا نہیں ہوتے اس کے برخلاف ایسے موضوعات کو شاعری کا واحد موضوع بنانا جو وقتی اور شگفتا میں جس کی اہمیت عارضی ہے جیسے مزدوروں کی مشکلات، امدان کے مصائب، ایک نون کی ناگفتہ بہ حالت یا ملک میں جماعت کا دور دورہ جو بالکل شگفتا میں اور جنھیں محو شہر سے کسی کشش اور جذبہ جذبہ دور کیا جا سکتا ہے ادیب جیسی بلند مرتبہ اور اعلیٰ ترین شے کے شایان شان نہیں۔ ادیب میں لافانی احساسات و جذبات اور تاثرات کو بیان کیا جاتا ہے ادیب کا موضوع محدود نہیں ہوتا۔ وہ کسی ایک سماج کی ترجمانی نہیں کرتا۔ وہ کسی ملک کے ایک خاص طبقے کی نمائندگی نہیں کرتا۔ وہ سب کے لئے ہوتا ہے۔ وہ ہر دور اور ہر زمانے کے لئے ہوتا ہے۔ وہ زمان و مکان کی قید سے آزاد ہوتا ہے۔ ادیب مذہب و ملت رنگ و دل کی تفریق سے بھی زیادہ بلند تھا کہ ہوتا ہے۔ بہترین ادیب چاہے وہ کسی زبان میں ہوا اور کسی قوم کی ہو، کسی اس زبان اور اس ملک یا قوم کی براہ راست ہو یا نہیں رہتا بلکہ وہ سورج کی طرح بلند ترین مقام پر پہنچ کر اپنی شاعری سے دنیا کے چپ چپ کے انسانوں کے دماغوں اور

دلوں کی تلیکی کو دور کرتا ہے۔ ایسے ہی ادیب کو اعلیٰ ترین ادیب کہا جا سکتا ہے۔ اور ایسے ہی ادیب کے پیدا کرنے والوں کی ہمت افزائی کی جاسکتی ہے۔ موسموں کے تغیرات، انسانی طبائع کے تغیرات، عمر کی زیادتی یا کمائی میں سے کوئی چیز بھی ایسے ادیب کی ضرورت اور مدد دینے والا ہو کہ نہیں کر سکتا۔ ترقی پسند ادیب ہر ایہ داروں کے دشمن ہیں۔ ان سے دولت چھین کر وہ طبقہ اسفل میں تقسیم کر دیتا ہے جس میں سوسائٹی کو سرمایہ داروں کی ضرورت ہے۔ طبقہ اسفل کی اصلاح بہت تک متعہ ہے۔ ان کے معیار زندگی کو واقعی بلند کرنا چاہئے۔ ان میں زندگی کا احساس اور سوسائٹی میں ان کی اہمیت کا صحیح احساس پیدا کرنا بھی ہمارا فرض ہے۔ لیکن اس کا لئے اگر ہم ملٹی پر رہنے والے چند افراد کو پستی کی طرف متوجہ لائیں تو اسے کسی طرح ترقی کا نام نہیں دیا جاسکتا۔ ہمیں زندگی کو ملٹی کی طرف لے جانے کی کوشش کرنی چاہئے۔ اگر ملٹی کو بھی سچی سچا کر دیا جائے تو اس کے متغیر ہونے کے انسانی ہزاروں سال کی بدو بہد کے بعد جس مقام تک پہنچ سکتی ہے وہاں سے اسے پیچھے کی طرف چلنے پر مجبور کیا جائے۔ یہ ترقی پسند کسی قوم کے لئے بھی خالی نیک نہیں۔ آگے چلتے ہیں زندگی بچاؤ دیکھتے ہیں موت، مذہب اقوام نے فحش شادی سے اپنی ایک تہذیب اور اپنا ایک تمدن پیدا کیا ہے۔ کیا انھیں پھر اسی دور جاہلیت کی طرف لے جایا جائے گا جب انسان پہاڑوں اور درختوں کی گھون میں بیہوش کرنا تھا۔ زرخ خاک پر بے تحلف ہو جاتا تھا۔ ضروریات زندگی انتہا درجے محدود تھیں۔ محقر تہذیب کا مفہوم ہی سمجھیں نہیں ہوا تھا۔ وہ دن انسانیت کی تاریخ میں الیہ ہو گا جب انسانیت کو اس کے ارفع اعلیٰ مقام سے اس بری طرح گرنے کی کوشش کی جائے گی۔ ترقی پسند ادیبوں کو جان لینا چاہیے کہ انسانی تہذیب کے شیرازے کو بکھرنے کی کوشش کرنی چاہئے بلکہ ان کا فرض تو یہ ہونا چاہیے کہ بعض خود عرض ادا کی جن کوتاہیوں اور لغزشوں کی وجہ سے انسانیت کا شیرازہ فشر

ہوا نظر آ رہا ہے۔ ان کی طرقت اپنے زور قوت سے سارے انسانوں کو متوجہ کر رہی اور ان کے دل میں احساس کی آگ مشتعل کر رہی تاکہ انسانیت اپنے بلند ترین نصب العین کو پہلے اللہ متقبل کی دنیا خطرات سے جہاں تک ہو سکے محفوظ سے محفوظ نظر ہوئی جلی جائے۔

اسی سلسلے میں ترقی پسند ادیبوں کی ایک اور کوشش کا ذکر بھی ضرور کیا ہے۔ ان ادیبوں کا خیال ہے کہ تحریر میں جہاں تک ہو سکے سادگی پیدا کی جائے تاکہ ان کے مضامین ہر شخص پر سے ادرجے۔ چنانچہ اسی تحریک کے متعلق مولوی محمد اسحاق صاحب نے اپنے ایک خطبہ صدارت میں یوں اظہار خیال فرمایا ہے۔

”اسی لئے جہاں سادہ سمجھنے کی جگہ بھروسہ
وہاں اپنے ملک کی جمالت رنے کرنے اور
کے پہلے۔ نہی کو کشش بھی کرنی چاہئے جو
ناخواندہ طبقہ زور ادرائے گا اور پڑ جائے
ادیب اور مصنف ذرا سچے مجلس گے اس طرح
دو فوں کے درمیان تفاوت کم کر دے گا
اور وہ ایک دوسرے کی بات آسانی سے
سمجھنے لگیں گے۔“

ملک کی جمالت رنے کرنے اور عام کے پہلے نے نہ خیال کا
بڑا زور تائید کی جا سکتی ہے۔ اور یہ ہر اس شخص کو فرض اولین
ہے جسے اپنے ملک کی ترقی کا خیال نگار رہا ہے۔ لیکن ناخواندہ
طبقے کی خاطر ادیبوں اور مصنفوں سے مارا یہ مطالبہ ہے کہ وہ
اپنے جملہ مضامین سے ”ذرا سچے“ آرائیں کوئی وزن نہیں رکھتا۔
کیونکہ بلند پایہ ادیبوں کے لئے یہ نا ممکن ہے کہ وہ اپنے اعلیٰ مقام
سے عوام کی خاطر اپنی سطح پر آجائیں۔ یہ تو خطی مر ہے کہ عوام
کی ذہنی سطح بہت ہوئی ہے اور وہ ان ادیبوں کو نہیں سمجھ
سکتے۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ انہیں سمجھنے کی کوشش بھی نہیں
کرنی چاہئے۔ ملک میں تعلیم کھلم کھلا ہو رہی ہے اور جمالت کی
مار بھی کے دور ہونے کے یہ استحقاق نہیں ہیں کہ ہر شخص

میں اعلیٰ ادبی ذوق پیدا ہو چکا ہے اور ہر شخص اعلیٰ پایہ کا
ادب پڑھتا، سمجھتا اور اس سے لطف اندوز ہوتا ہے۔
کیا محققان میں تعلیم کے عام ہونے کا یہ مطلب لیا جاسکتا ہے
کہ وہاں کا ہر شخص شک پر ملن اور ڈر سونہا اور دوسرے
بڑے شرا کے کلام کو پڑھتا، سمجھتا اور لطف اندوز ہوتا ہے۔
میں سمجھتا ہوں کہ ایسا نہیں ہے۔ ہمیں عوام سے اس قسم
کی توقع بھی نہیں کرنی چاہئے کہ وہ نگارندہ شش ایسے انداز
سے لے پر وہاں ہو کر اعلیٰ ادب کو مستند کر کے عوام کے لئے
لائٹ لٹریچر (Light Literature) عوام کے لئے
کی ضرورت ہے اور اس کی فراہمی کے لئے اعلیٰ ادیبوں کو
اپنے بلند مقام سے اتارنے کی ضرورت نہیں بلکہ دوسرے
بہیموں ادیب ایسے ہیں جو عوام کے مذاق اور ان کی پختہ
سطح کا لحاظ کرتے ان کی تفریح طبع کا سامان پیدا کرتے ہیں۔
ایسے ادیبوں کی تعداد عوام ہی کی طرح شراٹ الارض کی مانند
ہے۔ یہ وہ جو ہم کہ ادیب ہیں جن کی تحریر میں اعلیٰ تعلیم
یا عامیہ نہیں ہوا کرتا ہے جس کے مطالعے کے لئے عوام کو اپنے
دماغ پر زہر دہ بار ڈالنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ یورپ میں ہر
سال ایسی ہزاروں کتابیں شائع ہوتی ہیں جن کی کوئی ادبی اہمیت
نہیں ہوتی بلکہ جو فنی سہا سہوں اور عام لوگوں کی تفریح وسیع
کی خاطر بھی بنائی ہیں۔

اس کے علاوہ اعلیٰ ادب کبھی عوام کے لئے نہیں لکھا جاتا۔
جیسا کہ کہا گیا ہے۔

”There is no such thing as
writing for the masses“

ترقی پسند ادیبوں کی طرقت سے عوام ادب کے متعلق کبھی
کبھی اس خیال کا اظہار ہوتا ہے کہ اس زمانے میں ادیب
مجبور تھے کہ جائیداد رائے نظام اور شہسبی کے خطرات کچھ ٹھیکیں۔
کیونکہ وہ بارہ کا اثر ان کے دل و دماغ پر چھایا ہوا تھا۔ لیکن
میں سمجھتا ہوں کہ دوسرے خیالات کی طرح ان کا یہ خیال
بھی صحیح نہیں۔ یوں کہا جاسکتا ہے کہ اس زمانے کے ادیبوں

مختصر یہ کہ ان ادیبوں کے سر میں عجیب سودا سما رہا ہے۔ وہ ادب میں عوام کو پیش کرنا چاہتے ہیں ادبی گوشش میں ان کی تحریریں میں عامیہ پن پیدا ہو جاتا ہے۔ وہ یقیناً ادب میں زندگی کو پیش کر رہے ہیں لیکن ایسی زندگی کو جسے دیکھ کر زندگی ہی سے جھڑکارا ہو جائے۔ وہ حقیقت نگار حاضر و پیش لیکن ان کی حقیقت نگاری اخلاق و مذہب کی سرسری پار کر چکی ہے۔ اور عربیاں نگاری کے روپ میں نظر آ رہی ہے۔

اگر کوئی شخص جدید ادب پڑھنے سے پیشتر جدید ادب کی ان تنقیدوں کو پڑھے جو جدید ادب پر کی گئی ہیں تو اسے یقین ہوگا ہے کہ جدید ادب واقعی بہت اعلیٰ پائے کی چیز ہوئی لیکن اس ادب کے مطالعے کے بعد یہ حقیقت عیاں ہوتی ہے کہ جس ادب کے تخلیق ایسی اعلیٰ پائے کی تنقیدیں بھی گئی ہیں وہ خود کوئی اعلیٰ پایہ کی چیز نہیں۔ گویا اس لحاظ سے یہ تنقیدیں گمراہ کن ہیں۔ لیکن اگر جدید ادب کو کم از کم اس سطح پر آجائے جس پر یہ تنقیدیں نظر آ رہی ہیں تو یہ بھی بہت غصیت ہے۔

اہلِ دہلی یہ خواہش ہے کہ جدید ادب کو کم از کم اس سطح پر آنا چاہیے جس پر اس کی تنقیدیں آ چکی ہیں۔ اگر یہ ہوگا تو جدید ادب واقعی قابلِ قدر چیز ہوگی۔ ورنہ میرے نزدیک موجود حالت میں اس کی ہمت افزائی کرنا اپنی گناہ سے کم نہیں۔

محمد منظور احمد

ہیں یا سی شعور بیدار نہ ہوا تھا۔ اور وہ یہ سمجھنے سے قاصر تھے کہ ان کے اصلی فرغ کیا ہیں۔ اسی لئے انہوں نے کبھی اپنے ماحول سے تنگ آکر صدائے انقلاب بلند نہیں کی۔ ورنہ اگر یہ شعور ہو، فرض کا احساس ہوا اور قومی عزت و وقار کو بلند کرنے کی دھن ہو تو بقول اقبال ع مزارِ بھٹو لیکن زباں ہو دل کی رفیق

کے اصول پر عمل کرنے کا خیال دامن لے رہا ہے۔ کیا آج کے ادیبوں پر پابندیاں عاید نہیں ہیں اور کیا آج بیرونی حکومت ان کے دل و دماغ پر بھی حکمرانی نہیں کر رہی ہے۔ لیکن اس کے باوجود اقبال اور جوش اور دوسرے شعرائے اسی چیزوں کو بیان کیا جن میں پابندیوں اور بندشوں کے اس دور میں سمجھی جان نہیں کیا جاسکتا تھا۔ خود اقبال اسی چیز کی طرٹ اشارہ کرتا ہے۔

سنجھنے نہ گفتہ راجہ قلندر اند گفتم

سچ تو یہ ہے کہ جو الزام قدیم ادیبوں پر لگایا جاتا ہے وہ زیادہ صحیح طور پر موجودہ ادیبوں پر صادق آتا ہے۔ آج ترقی پسند ادیب اپنے دور کے ادیبوں کو مجبور کر رہے ہیں کہ ادب کو برونگنڈے کے روپ میں پیش کیا جائے۔ میر پرچم کے اور انھوں نے کی دعائی جاسے۔ عوام کی زندگی اور وہ بھی ایسی زندگی پیش کی جائے جو ہر لحاظ سے نظر انداز کرنے کے قابل ہے جو ادیب ان کے اس عظیم مقصد کا ساتھ نہیں دیتا اسے رحمتِ بلند قدرتی اور عقل کے دوسرے نازیبا اور ناشائستہ عقاب کے ساتھ یاد کر کے دل کی جڑوں میں نکالی جاتی ہے۔

صحرائی زندگی

(ایک تصویر)

یہ صحرائی کہ ہے شہروں میں رسوا جن کی خوشنوازی
 نہ یہ نیبے نہ یہ پنڈت نہ یہ ملا نہ یہ صوفی
 نہ دام معبود ہیکل نہ فتراک کلیسا
 کسی مسجد میں یہ جھوٹی حدیثیں گڑبگڑ نہیں سکتے
 نہ یہ انفال نہ یہ سید نہ شیخ و گبر و نصرانی
 نہ عصمت کی کوئی منڈی نہ دلالوں کے پھیر ہیں
 نہ مسجدوں کے نشانوں سے کوئی مغرور پیشانی
 نہ ہونٹوں پر نمسی جھوٹی نہ زہر آلودہ ولداری
 نہ بسکول کی تلاوت ہے نہ کفر و دین کی ذات
 شمار ان کا نہیں زر کے تراشیدہ کمینوں میں
 کلاہ یا جگلی ہے نہ کفش آسمان جاہی
 ضمیر و قلب کو سونے کی لو پگھلا نہیں سکتی
 کسی لمبوس زرین سے نظر دھوکا نہیں کھاتی

نہ ان کا کفر نیلائی نہ ان کا دین بازار ی
 نہ یہ تازی نہ یہ تازی نہ یہ مصری نہ یہ کوئی
 نہ تسبیحوں کے پھندے ہیں نہ زماروں کی گہرائی
 کسی نمبر کے اوپر یہ درندے چڑھ نہیں سکتے
 نہ سینہ ہے کوئی کالا نہ ماتھا کوئی نورانی
 نہ صبح ذکر و قوالی نہ چکلوں کے اندھیرے میں
 نہ ماتھوں پر کسی کے خون سے تشوں میں بانی
 نہ اخلاقیوں کی عیاری نہ آدابوں کی پرکاری
 نہ یہ چاندی کے پیغمبر نہ یہ جاگیر کی امت
 نہ صبحیں ان کے ہونٹوں نہ راتیں ان کے سینوں میں
 نہ زنجیروں کی تاریکی نہ قندیل شہنشاہی
 ہواٹے بام و در دشت و جبل تک نہیں سکتی
 گلاب و عطر کی بدبو کہیں پائی نہیں جاتی

یہ حیاں جن کا تاج و تخت سے کوئی نہیں ماتا
 انھیں خود اپنی نسلوں کو بچل جانا نہیں آتا

شور

وجہی اور ابنِ نشاظمی کے سالیب کا موازنہ

زورِ نظر مضمون میں ہم وجہی اور ابنِ نشاظمی کے اسلوبِ بیان اور زبان کا مطالعہ صرف صفتِ ثنوی کی روشِ نظر سے کرتے ہوئے کر رہے ہیں۔ ان کے لٹری کارناموں اور دیگر اصنافِ سخن سے فی الحال ہم بحث نہیں ہے اور سچ تو یہ ہے کہ ملی اور ملک آبادی سے قبل کوئی زبان میں اگر کسی صنفِ سخن کو معراجِ کمال پر پہنچنے کا موقع ملا تو وہ صنفِ ثنوی ہے۔ ادو ادب کا سرمایہ عمدہ و دراز تک غزل رہی ہے اور وہ بھی دیگر اصنافِ سخن کی طرح صفتِ ثنوی کی غزل کی اردو میں ترقی اور عروج کی غالباً ایک بڑی وجہ اس کی رمزیت ہے اور جس طرح مشرقی شاعر کا معشوق پردہ کی رسم و رواج کی وجہ سے "حجابِ اندر حجاب" بنا دیا اسی طرح شاعر کا ہر جذبہ و خیال رمزیت کا پردہ اختیار کر گیا۔ غزل کی ایک بڑی کمزوری یہ ہے (واقعہ جو کہ یہ صنفِ غزل کی مخالفت نہیں کر رہا ہوں) کہ وہ شاعر کے بعض اندرون کی آئینہ داری کرتی ہے اور اس پر مبنی دنیا (Landscape as seen) کا ہمیں اس میں کوئی نقش نہیں ملتا جس میں خود شاعر اپنی تہمتا، غم و فکر کرتا اور ہر جذبہ و خیال کا ادراک کرتا ہے۔ غزل کے برخلاف ثنوی میں اتنی وسعت ہے کہ اس میں شاعر کا اندرون اور بیرون اس کے داخلی اور خارجی دونوں عناصر بار بار سامنے آتے ہیں۔ اور پھر یہاں تک ثنوی کی تکنیک کا تعلق ہے وہ روایتِ قافیہ کے قسمل سے بھی آزاد ہے۔ ہر شو کا قافیہ اور روایت دوسرے شعر سے بالکل الگ ہوتا ہے۔ صنفِ ثنوی اپنے اندرون کے اعتبار سے بھی کچھ اتنی وسعت کی راہ جوئی ہے کہ اس میں تمام اصنافِ سخن کی خصوصیات کمال کی گئی ہیں۔ غزل کا سوز و گداز، تصنیف کی تشبیہ کا چہن، ڈرامے کی کردار نگاری، نچرل شاعری کی ہر ق شاعری، غرض ہر خیال اور ہر جذبہ جو شاعر کے سینہ میں موجزن ہوا اس میں باسانی ظاہر ہو سکتا ہے۔ غالباً یہی وہ خصوصیات تھیں جن کی وجہ سے ثنوی کی صنف کو دکن میں بہت جلد ترقی حاصل ہوئی۔ دکن کے شعور ثنوی نگاروں میں نصرتی، خواصی، وجہی، ابنِ نشاظمی، رتھی، غلام علی وغیرہ کے نام نمایاں بنیت رکھتے ہیں۔ کوئی ثنویات کو ہم دو حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ ایک وہ جو اپنے موضوع اور بلاٹ کے اعتبار سے اور بیکل ہیں اور دوسرے وہ جو فارسی یا ہندی ثنویات کا ترجمہ ہیں۔ چنانچہ ہمارے پیش نظر ثنویوں "قطبہ شہری" اور "پھولین" میں اولیٰ الذکر اور بیکل اور سلطان محمد علی قطب شاہ کی داستانِ حسن و عشق پر مبنی ہے۔ اور موخر الذکر فارسی ثنوی "بساتین" سے اخذ بلکہ بڑی حد تک اس کا ترجمہ ہے۔

جہاں تک ان دونوں ثنویوں کے اسلوبِ اظہار کا تعلق ہے ہم کہ درانِ ثنویوں کے لکھنے والوں یعنی ابنِ نشاظمی اور وجہی ہی سے کچھ نہیں لیں۔ ابنِ نشاظمی، پھولین میں لکھا ہے۔

اے افشا پو میرا میل دائم
طبیعت کو مری ہے حظ دائم

جس سے اس امکا اظہار ہوتا ہے کہ ابنِ نشاظمی کو اپنی شاعری سے زیادہ نثر نگاری یا "اشار پروازی" پزنا تھا۔ دوسرے الفاظ میں ثنوی "پھولین" "آند نہیں ملے" اور "کا نتیجہ ہے۔ ابنِ نشاظمی نے اپنے اندرونی جوہر کو پیش نظر رکھے بغیر محض اپنی طبیعت پر زور دے کر "پھولین" لکھی ہے۔ اس کے برخلاف وجہی اپنی خصوصیات شاعرانہ عقلی کے لیے میں اپنے آپ کو ایک بڑا شاعر بتاتا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ میں نے "قطب شہری" میں وہ

وہ باتیں لکھی ہیں کہ لاکھ برس تک بھی انسان اس کو سمجھ نہیں پائے گا۔

جو تک برس کوئی سربسے رنج کوں
ہوا جو جب شمس یو بولنے
پنا دے کہ ہیں اس چھپے گنج کوں
خزینے لگا غیب کے کھولنے
اگر غوطے تک برس خواص کھائے
یہ موتی نہیں وہ جو خواص پائیں
یہ موتی نہیں وہ جو کلمات آئیں
کہ پانی تھے البو رج مٹھتا ہے نیوں

پھر کہتا ہے کہ میرے اشعار کوں کر کوں کا دل اس طرح پھٹنے لگتا ہے جس طرح مصری پانی میں پھلتی ہے۔

وہی کی یہ نقلی کوئی محذوب کی بڑ نہیں بلکہ وہ حقیقت خود داری اور انفرادیت کے احساس پر وال ہے۔ قطب شتری کسی فارسی یا ہندی شاعری کا ترجمہ نہیں ہے بلکہ یہ محض وہی کے ذوق اور اندرونی خواہش کی پیداوار ہے۔ بلاشبہ وہی کی یہ شاعری اپنے بلند شاعرانہ اور فلسفیانہ موضوعات اور نغمات کے اعتبار سے اردو ادب کا بہت بڑا شاہکار ہے جس نے ’بھولین‘ کی طرح لگا نہیں کھا سکتی۔ لیکن جہاں تک شعر کے ظاہری محاسن کا تعلق ہے ہم ’بھولین‘ کی شاعرانہ ذرا توں کو۔ قطب شتری کے مقابلہ میں کسی طرح نظر انداز نہیں کر سکتے۔ سچ تو یہ ہے کہ ابن نشا ملی نے ایک بڑا مفکر نہ ہونے پر بھی بڑی ایسی شہرت پائی کہ ہمیں اس کے شاعر ہونے میں کوئی کام نہیں (گو وہ شعریت کے اعتبار سے بھی وہی کی فکر کا شاعر نہیں ہے) ابن نشا ملی نے کچھ ایسا انداز بیان پایا تھا کہ بسا اوقات ہمیں اس کی آواز پر بھی آدکا دھوکا ہونے لگتا ہے۔ بلکہ ہر مقام پر وہ روانی اور بے ساختگی پائی جاتی ہے جو وہی کے کسی طرح کم درجہ نہیں۔ اور ہر زبان بھی اس کو ایک ایسے دور کی زبان ملتی جو وہی سے بہت سے نکل چکا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ سلاست اور صفائی و سادگی جو ابن نشا ملی کے دور کی خصوصیات ہیں وہی کی ’قطب شتری‘ میں نہیں ملتیں۔

جدت اور ابتک۔ جیسا کہ ہم نے گزشتہ سطور میں بیان کیا ہے شاعری ’بھولین‘ فارسی شاعری ’بساتین‘ سے ماخوذ اور اسی کا ترجمہ ہے۔ لیکن ایک ذرا ہی جدت ابن نشا ملی نے اس میں یہ دکھائی ہے کہ ’منامات‘ کا حصہ اپنی طرف سے اضافہ کر دیا ہے۔ یوں تو اردو بھی ایسے مقامات میں جہاں کہیں کہیں ابن نشا ملی کے انفرادی رنگ کی جھلک نظر آ جاتی ہے۔ خصوصاً مذہبی موضوعات پر جب وہ غما غما ہے تو اس کا اندرونی سوز و گداز اور مذہبی خوش و خروش ظاہر ہونے لگتا ہے۔ لیکن ’منامات‘ اس شاعری کا ایسا حصہ ہے جس میں ابن نشا ملی کی ذاتی جدت و اختراع پوری شان کے ساتھ نمودار ہے۔ لیکن اگر ’بھولین‘ کے اس حصہ کو نظر انداز کر کے جب ہم ’قطب شتری‘ سے اس کا مقابلہ کرتے ہیں تو ہمیں کوئی بات سوائے ایک دو مثالوں کے نئی نظر نہیں آتی۔ قطب شتری یوں بھی بلا لٹا اور موضوع کے اعتبار سے اور سبیل ہے۔ لیکن جو خیالات و جذبات وہی نے اس میں ظاہر کئے ہیں وہ ماخوذ یا ترجمہ نہیں اس کی ذاتی اور انفرادی کاوشوں کا نتیجہ ہیں۔ کہیں تو وہ شاعری کے بلند موضوعات اس کے اندرون اور اس کی سپرٹ پر تنقید کرتا ہے تو کہیں جن کی حقیقت و ماہیت کی تعریف کرتے لگتا ہے۔ مثلاً شاعری کی سب سے بڑی خوبی وہی کے نزدیک اس کا تاثر ہے۔ وہ کہتا ہے کہ بغیر تاثر کے شاعری محض بیکار ہے۔ پھر وہ بیان کرتا ہے کہ شاعری کی عبارت بہت سادہ ہو اور الفاظ اس طرح استعمال کئے جائیں کہ عبارت کا مطلب بآسانی سمجھ میں آ سکے۔ لیکن یہی الفاظ پر اثر بھی ہوں۔

پھر وہ جن کی تصریحوں میں بیان کرتا ہے کہ "حسن، معشوق یا کسی شے کے اعضاء و اجزا میں نہیں ہوتا بلکہ خود دیکھنے والے کی چشم بینش میں اس کی جھلک موجود ہوتی ہے۔ حسن کا قلع و قمع دلو سے نہیں بلکہ وہ ایک اضافی حیثیت رکھتا ہے چنانچہ وہ کہتا ہے۔"

ایک جنس تک جنس محبوب ہے جو محاورے میں کہیں کہیں "عشق لبتا ہے دیکھا آس" ہے۔
 جو محاورے میں کہیں کہیں "جو بھاؤں پس کوں وہی خوب ہے" ہے۔
 ایک اور مقام پر دہی نے عشق کی اہمیت سے بحث کی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ایک ایسا سوز ادبی ہے کہ اس کی حقیقت اور کنتہ آج تک انسان کو معلوم نہ ہو سکی۔

ع۔ "یوگیا بھید ہے کوئی کست نہیں" اور پھر وہ اس حقیقت نامعلوم کو مانتے ہوئے اس کی تاثیر کے متعلق کہتا ہے کہ "جذبات، عقلیت، اسے بڑھ کر دت رکھتے ہیں۔"

ع۔ "کہ آدم پر غالب ہے دل کیا سبب؟" اس قسم کے مبسوط اور بچل موضوعات "قلب مشتری" کی جان ہیں۔ لیکن انکس ہے کہ "پچو لین" اس طرح کے عمیق اور ادبچل موضوعات سے غالی نظر آتی ہے۔

معاشرت کے عناصر شادی کوئی ایسا مقام ہوگا جہاں دہی نے "قلب مشتری" کے افسانوی پر وہ میں اپنے دور کی معاشرت پر تنقید کی ہو۔ محاورے میں کہیں کہیں "عشق لبتا ہے دیکھا آس" ہے۔ اور ایک تہذیب یافتہ طبقے کے خیالات کو قلم بند کیا ہے۔ "پچو لین" میں "E. M. Forster" کا نام بھی ملتا ہے۔ شادی ایک دو گھنٹوں تک ایسی پیش کر سکیں جن میں ابن نشاٹلی نے اپنے دور کی زندگی کو نمونہ کیا ہو۔ اور عام بیاہی معاشرے کے رنج و غم پر روشنی ڈالی ہو۔ مثلاً ابن نشاٹلی جہاں امن کے جزیرے کے محل کا نقشہ کھینچتا ہے تو اس کی دیواروں پر قلب شاہی نظم کی تصویریں بھی دکھائی دے گی۔ اسی طرح ہمیں برکے کردار کے پیچھے ہمیں ابن نشاٹلی کے دور کی حسین و شوخ نظر نظر نہ آتی ہیں۔ ان ایک دو مثالوں کے قطع نظر ہمیں مشکل سے "پچو لین" میں "دن کی عمارتیں" کے حقائق ملیں گے۔ اس کے برخلاف دہی نے ایک ناقد اور مہر شاعر کی حیثیت سے اپنے دور کی زندگی پر بیک وقت تنقید کی ہے۔

محاکات اور کردار نگاری اس میں کوئی شک نہیں کہ ابن نشاٹلی نے افسانے کے مختلف کرداروں کے ربط و تعلق اور ان کے موقع و محل کو خوب سمجھا ہے اور ان میں وہ تمام خصوصیات پیدا کر دی ہیں جو ایک درانے کے کردار میں موجود ہونی چاہئیں۔ لیکن پھر بھی "قلب مشتری" میں ان خصوصیات میں "پچو لین" سے بہت آگے نکل جاتی ہے۔ اس کے کردار زعفران، انسان اور طبیعت پھر کی تصویریں معلوم ہوتے ہیں۔ وہ ہر کردار اس خوبی سے پیش کرتا ہے کہ ان کے ہر موقع و محل کی گفتگو اور حرکات و سکنات بالکل فطری معلوم ہونے لگتے ہیں۔ اور ان کرداروں پر ہمیں ایک ادکار کا دھوکا دہنے لگتا ہے۔ نفع یا تلف یا آ اور قلب مشتری کے کسی کردار میں ہمیں نہیں دکھائی دیتی۔ برخلاف اس کے "پچو لین" میں کہیں کہیں نفع اور تلف کا شائبہ پایا جاتا ہے۔

اور پھر جب ہم محاکات پر غور کرتے ہیں تو قطب مشرقی، ایک لاجواب شہوی معلوم ہونے لگتی ہے۔ ایک ایسے دور میں جبکہ اردو ادب عہد طلوعیت سے گزر رہا ہو، وہی کا ایک ایسا اور بختل شاہکار پیش کرنا معجزہ سے کم نہیں۔ خصوصاً محاکات کا تو وہی باو آدم معلوم ہوتا ہے۔ اک نور امیر حسن کے باغ کے سین اور وہی کے باغ کے سین دونوں کو پیش نظر رکھ کر غور کیجئے تو باوجود زبان کی ابتدائی کوتاہیوں کے ہم وہی کو کسی طرح میر حسن سے پیچھے نہیں دیکھتے بلکہ بعض اعتبارات سے وہ ان سے بھی بہت آگے نکل گیا ہے۔

تشبیہ و استعارہ
اگر زبان کے ایک ٹھنڈے سے تغیر کے ساتھ وہی کی تشبیہات و استعارات پیش کی جائیں تو ہمیں ان کے جدید ہونے میں کوئی شبہ نہ ہو گا۔ ایسی بدت اور انوکھا پن ان تشبیہات میں پایا جاتا ہے کہ وہی کے دور کا خیال کرنے سے بے ہوش ہیں جب ہے کہ یہ جدید رنگ کیسے ان میں چلا آیا۔ مثال کے طور پر وہی نے باغ کے سین میں جو نازک تشبیہات باز محی ہیں ان کے ہند نمونے ہم ذیل میں درج کرتے ہیں۔

(۱) اچھیں مین اس کیں کالے منے کہ پھچلیاں دو سنڈریاں ہیں جالے منے
یعنی زلفیں چہرے پر بکھر گئی ہیں تو ان کالے بالوں میں دو آنکھیں ایسی معلوم ہو رہی ہیں جیسے دو پھچلیاں جال میں پھنس گئی ہوں۔

(۲) اچھلیاں ہیں بھلیاں اچھالاں تے کہ نینان جھکتے ہیں بالان تے
یعنی آنکھیں بالوں میں ایسی چمک رہی ہیں جیسے بادلوں میں بھلی۔

(۳) سودھن کے سوا اور دوسے یوں گھر کہ بیٹھے ہیں جھگنے مگر سرو پر
یعنی مشوق کے بدن پر تو ہر ایسے معلوم ہوتے ہیں جیسے سرو پر جھگنو۔

(۴) ری چوٹی یوں پیٹ پر اچھبول آ پٹی پر اچھے جیوں الف ٹٹ کا
یعنی پیٹ پر پڑی ہوئی چوٹی کو یا پٹی پر ٹٹ ٹٹ کے الف کی طرح معلوم ہوتی ہے۔

قطب مشرقی کی ان تشبیہوں کو دیکھنے کے بعد جب ہم پھولین پر نظر ڈالتے ہیں تو وہ یکسر اس لطیف و نازک سے خالی نظر آتی ہیں ان میں وہی پرانہ پن اور روایت پسندی معلوم ہونے لگتی ہے جو قدیم دور کی خصوصیات ہیں۔ قطب مشرقی کا سن تعینت مشابہ ہے اور پھولین کا مشابہ ہے۔ اس طرح ان کے دسب ان دور برس کی عین حال ہے جس کے دھاروں ریزان مختلف انقلابات سے دو چار ہوئی رہی۔ لا وہی محمد قلی قطب شاہ کے دور کا درباری شاعر تھا اور ابن نشا علی عبد اللہ قطب شاہ کے دور کا۔ اور ان کے اس ظہری فرق سے ہمیں وہی اور ابن نشا علی کے لسانی اختلافات اور تبدیلیوں کا پتہ ملتا ہے۔

وہی یا محمد قلی قطب شاہ کے دور میں دکن بیرونی حملوں کے خطرہ سے آزاد اور ملک میں سرطرت خوشحالی اور امن و امان کا دور دورہ تھا۔ یوں تو وہ رشتہ اتحاد جس کا سنگ بنیاد حسن کے ساتھ رکھو بھی، کے جوڑے پیدا کر دیا تھا۔ روز بروز مستحکم ہو رہا تھا لیکن اندرونی اطمینان اور امن کی وجہ سے یہ اتحاد اور اتحادیت محض قطب شاہ کے دور میں اپنے انتہائی نقطہ کو پہنچ چکی تھی۔ محمد قلی قطب شاہ کی دکن زدگی کا تو یہ عالم تھا کہ اس نے لباس اور طرز

اندو لوک ہندوؤں کی اختیار کرتی تھی۔ اس گائکت اور میل ملاپ کا ایک بڑا نتیجہ یہ رہا کہ اردو ادب (میری مراد دھنی ادب سے ہے) میں دکن کے مقامی عناصر تیزی کے ساتھ داخل ہو گئے۔ چنانچہ دھنی کی قلب مشتری میں اور مس رس میں مختلف زبانوں کے محاورے، الفاظ اور ضرب الامثال اسی اثر کی طرف رہنمائی کرتے ہیں جن خاص طور پر سنسکرت، ہندی بھاشا، تملی اور مرہٹی زبانیں قابل ذکر ہیں۔ دھنی نے بیسیوں ایسے الفاظ اور محاورے متعارف کئے ہیں جو عام طور پر دکن میں بولے اور سمجھے جاتے تھے اور جن کا تعلق بڑی حد تک (محصلاً) زبان سے تھا۔ اس کے برخلاف ابن نشائی کے دور میں دکنی عناصر سے زیادہ شمالی ہند کے عناصر یعنی فارسی الفاظ و محاورے کثرت سے داخل ہو رہے تھے۔

ڈاکٹر سرووی عبدالحی کے انداز کے مطابق دھنی کے دور میں ہندی بھاشا اور فارسی عربی الفاظ کا تناسب ڈھانی اور ایک کا تھا۔

دکنی زبان کی ابتداء (سہ سہ سہ سہ) تو بلاشبہ ہندی بھاشا سے جاتی ہے لیکن الفاظ کے نقل مقام اور مرادیم کی وجہ سے ان میں ایسی تبدیلیاں پیدا ہو چکی تھیں جن کا تعلق نہ ہندی بھاشا سے تھا اور نہ عربی و فارسی سے بلکہ خاص دکنی زبان کی انفرادی خصوصیات سے تھا۔ کہیں الفاظ کے لفظ میں تبدیلیاں ہو گئی تھیں تو کہیں ان کے لیتے اور بیرونی سمیت ہی بدل کر لی تھیں۔ کہیں کچھ حروف کا اضافہ ہوا تھا تو کہیں اختصار پیدا ہو گیا تھا۔ مثلاً 'بوجھا' اور 'دودھ' جس میں (ا) ایک (محصلاً ۷) کے طور پر استعمال ہو رہا ہے متغیر ہو کر 'بوجھا' اور 'دودھ' ہو گئے۔ اسی طرح 'آنک' بن گئی۔ بعض عربی اور فارسی کے ایسے الفاظ جن کا صحیح تلفظ دکنی عوام میں نہیں پایا جاتا تھا، دھنی اور دیگر دکنی ادیبوں نے ان کو اسی غلط تلفظ کے تحت باندھا ہے۔ حالانکہ وہ اس غلطی سے آگاہ تھے۔ مثلاً وضع 'سج' اور عقل کے بجائے دھنی 'صبا'، اہل لکھنا ہے۔ اسی طرح اور بھی کئی تغیرات کا ہمیں پتہ ملتا ہے جن کا تعلق خاص دکنی معاشرت، دکنی تہذیب، اور دکنی زبان سے ہے جب تک دکن کی سرزمین بیرونی مخلوق سے محفوظ رہی یہ تغیرات بڑھتے رہے لیکن جب مخلوق کے ساتھ دکن میں مغلوں کی زبان لے قدم چلے تو دکنی زبان میں بھانے دکنی عناصر کے شمالی ہند کے عناصر داخل ہونے لگے۔

چنانچہ ابن نشائی کے دور میں عبداللہ قطب شاہ نے شاہجہاں کی اطاعت قبول کر لی تھی اور ملکی آزادی کا خاتمہ ہونے لگا تھا۔ شمال کی سیاست دکن پر تیز گام ابر کی طرح چھائے جا رہی تھی۔ شمال کی تہذیب و تمدن اور ثقافت و زبان دکن میں تیزی کے ساتھ چھیلتے چلے جا رہے تھے۔ چنانچہ شمالی ہند کی وہ زبان جو فارسی سے متاثر اور اس کی اثر پذیر تھی، دکنی زبان میں داخل ہونے لگی۔ لیکن مرہٹی ایسے بیشتر الفاظ و محاورات جو دکنی زبان میں رس برس گئے تھے۔ ان کا بھٹن بہت مشکل تھا۔ یہاں یہ نہ سمجھا جائے کہ شمال کے اس عنصر کے داخل ہونے سے دکنی زبان میں کوئی سانی انحطاط پیدا ہو رہا تھا، بلکہ اس کو خوش گوار نتیجہ بھی برآمد ہوا کہ دکنی زبان روز بروز ان تقاضوں کی طرف متوجہ ہو گئی۔ ابن نشائی کے دور میں اب وہ تنقید اور ثقات باقی نہیں رہی تھی جو دھنی کے دور کی خصوصیت تھی۔ دھنی کی زبان میں بلاشبہ ادب کوٹ کوٹ کر برہمی ہوئی ہے لیکن اس کو کیا سمجھئے کہ دھنی کو وہ سادہ و سلیس زبان نہیں ملی جو بعد میں منج بکر ابن نشائی کے دور میں عوام الناس کی زبان پر بھی بڑھ گئی تھی۔ اگرچہ آج ہم 'قلب مشتری' اور 'مہولین' کا پہلو بہ پہلو مطالعہ کرتے ہیں تو دونوں کی زبان ہمارے لئے ایک ہی قسم کی دشواریاں پیش کرتی ہے۔ لیکن 'مہولین'

کا انداز خود بتائے دیتا ہے کہ یہ وہی کے بہت بعد کی صاف اور نکھری ہوئی زبان ہے۔ سچ پوچھے تو یہ یوں کہ: "نقلہ شریٰ پر اگر کسی اعتبار سے ترجیح دی جاسکتی ہے تو وہ یوں کہ اس کا سادہ و سلیس اور رواں دواں طرز تحریر ہے۔ ابنِ نشا ملی میں وہ بلکہ زیادہ اپنی خصوصیات تو کہیں باقی مائیں جو وہی کی انجی انفرادی خصوصیات ہیں لیکن جہاں تک زبان اور طرزِ اظہار کا تعلق ہے ابنِ نشا ملی زیادہ قادر الکلام شاعر کہا جاسکتا ہے۔ جذبات کی حقیقی تصویر اس کے لفظی اور معنوی صنایع بدائع کے پردوں میں بھجپ جاتی ہے۔ پوری شہسوئی، پھولیں، مرصع ہے لیکن اس کو اعجاز سخن کہیں کچھ اور کہ ابنِ نشا ملی نے کہیں بھی سلاست و روانی کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔

بہر حال جہاں تک شعر کی معنویت اور اس کے اندرون کا تعلق ہے ابنِ نشا ملی وہی سے کسی طرح کا نہیں کھا سکتا۔ اور جہاں ہم شعر کے بیرون یعنی زبان اور زبان کے ظاہری و معنوی محاسن پر نظر کرتے ہیں تو ہم ابنِ نشا ملی کے مقابلہ میں وہی کو بہت پیچھے دیکھتے ہیں۔ ابنِ نشا ملی کی طبیعت میں جودت اور تیزی کا ایک بڑا جوہر موجود تھا۔ اور زبان میں وہ جذبتیں اور ندرتیں پیدا کرتا تھا کہ ہم کو اس کی بہت کم مثالیں وہی میں ملتی ہیں۔ لیکن وہی کی شاعری پختگی اور تجربہ کاری سے وہ عاری تھا۔ وہی ایک شاعر اور صاحبِ ذوق شاعر کے ساتھ ساتھ ایک مفکر اور محاسن انسان بھی تھا، اور یہی وہ ایسی خصوصیات ہیں جو اس کی تصنیفات کو ادبیاتِ عالیہ میں شمار ہونے کے قابل بنادیتی ہیں۔

محمد مصعبین الدین

نقادوں سے!

— تو یہ سچ ہے کہ میں نے جب بھی اپنا سا زخمیگر مرے نغموں میں غیروں کے تغزل مسکرانے میں؟
ابھی تک جب بھی میں نے آئینے میں خود کو دیکھا؟
مرے چہرے پر نہ معلوم ساہے جھلکائے ہیں؟
کسی نے کہہ دیا چپکے سے ٹھہرو یہ پرانے میں؟
ابھی تک جب بھی اپنا ہاتھ پھولوں تک بڑھایا؟
— مگر یہ بھی تو سوچو! مرے بے رحم نقادو!
بڑی مشکل سے ٹکرائے ہیں آنسو چاند تاروں سے
بڑی مشکل سے روشن رہ سکی افکار کی محفل
ہوا تو کیا بگوئے شمع کے دامن تک آنے میں
ابھی کیا ہے مجھے بس اک ذرا زندہ تو رہنے دو
ہوائیں تیز ہیں یہ شمع تابندہ تو رہنے دو۔

سلام محفل شہری

جاگ پڑے اور پھر اس کے بعد..... مل کے صاحب کے پاس آئے ہی دونوں نے بولن گویا ایک دم بند کر دیا، چاہک پر کامیاب پٹھان ان کی طرف ریلی پر ایسی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ وہ جلدی جلدی اندر چلی گئیں۔ اندر کی سب جگہ کالی ہو گئی تھی کھوں کی عجیب عجیب آوازیں ایسی آرہی تھیں جیسے قصائی کاٹے پر گوشت کے ٹکڑے کاٹتا ہے۔ باہر کے بڑے بڑے پکے برابر چل رہے تھے وہ دونوں طرف نئی جونی ہندو کوئلہ کی گردہ کچی تھی جس سے ان کا ہر اڑک کا لاموٹیا بن گیا تھا دھت بنوا میں اسی طرح لہرا رہے تھے گونا گے کتے ہی دونوں سے باقی منٹے پر جمو کے آدمی نے بیزار ہو کر روئی ایک طرف جبکہ دی ہو۔۔۔ وہ گویا بڑے ہو گئے اسی لئے اور کسی طرف جی رہے تھے۔

ان پڑوں کی آڑ میں وہ دو عورتیں بھی آگئیں
اوجھل ہو گئیں۔

(نوشہ) وامن چور گھٹے

کہہ دی مگر رادو صاحب کی شرارت بھری ہنسی سے اس کی غلطی اس کچھ میں آئی۔
رادو صاحب آج تجھے بڑی ہنسی آرہی ہے۔ جا میں تجھ سے بولوں گی ہی نہیں۔
ایسی بھی کیا تاک مزاجی۔ ذرا مذاق میں کہا۔ رادو صاحب اس کا چلو پڑایا،
اچھا۔ اچھا۔ بڑی آئی مذاق والی،

نہیں نہیں میں روئی صورت والی ہی کبھی بس اب تو بولنے کی آواز مجھے بھی کئی بار بالکل منہ ہی نہیں آتی۔ ہاں تو دو شبے رات کو وہ آیا۔ اس کی آواز مجھوٹے کی تھی،
رامیری کا قصہ اس کے آخری الفاظ سے اتر گیا اور وہ بولنے لگی۔

رات کے دو بجے کے بعد اس پر تماشا دیکھنے کے بعد کدو سونے دیتے مجھے؟ تھوڑی درگ پر شب ہو کر پاک جھپک نہ جھپکی کہ سویرے کی سیٹی بھی، اور دونوں پڑ بڑا کر

(مترجمہ) اچھوٹائی

رات کا بھولا اور دیگر افسانے

فارسی و عربی ہمارا راجہ کالج مسور کے گیارہ بند پانچ افسانوں کا مجموعہ ہے جو نہایت اہتمام کے ساتھ بہت ہی دیدہ زیب شائع ہوا ہے۔ پروفیسر سروری صاحب نے اس سے قبل فن افسانہ پر مستند کتابیں شائع دینے افسانہ و غرض شائع کی ہیں۔ طباعت و کتابت پاکیزہ اور دیدہ زیب ہے۔ صفحات ۱۸۰ قیمت ۱۰۰۔

محبت کی جھپکوں۔۔۔ مرزا ظفر رحمن صاحب نے اسے کدو افسانوں کا دیکھپ مجموعہ ہے۔ اس کے جملہ افسانے عشق و محبت کی دلولہ انگیزیوں اور حسن و شباب کی رحمتیوں سے معمور ہیں۔
نوجوانوں کے نصب العین معاشرہ کی سچی تصویر اور مسرور و زندگینوں کے لمحات فرصت کے لئے ایک شائستہ ذہنی تفریح ہے۔

چھوٹی تقطیع (۱۳۲) صفحات قیمت جلد ۱۰۰

قافیہ کی صنفی قدر و قیمت

صفت میں قافیہ کے معنی ہیں یکجہ آنے والا، پچھلے آنے والا اور اصطلاح میں ان چند حروف معین کا نام ہے جو مطلع اور آیات شغوی کے ہر مصرع کے آخر میں اور قطع اور باقی اشعار غزل و قصیدہ کے مصرعہ نمائی کے آخر میں انشاء عطفہ کے اندر دکر آتے ہیں۔ اور مستقل نہیں ہوتے۔ قافیہ کا اطلاق فوجوں پر ہوتا ہے۔ روف اقدار، تاسیس، وخیل، ردی، اصل، مرید، غرض، قافترہ۔ لیکن ان سب حروف کا جمع ہونا ضروری نہیں۔ یہ ایک یا دو یا تین یا زیادہ جس قدر چاہیں جمع کریں اور یہ بھی خیال رہے کہ حروف ردی اصل قافیہ ہے اسی پر قافیہ منحصر ہے۔ باقی آٹھ حروف کے لانے نہ لانے کا شعور کو اختیار ہے۔ بہر حال حروف ردی کی کہ اس کے لانے پر مشاعرہ بخیر رہے۔

۱۔ عرب کے یہاں ردیف نہیں ہوتی اس لئے ان کی ساری توجہ قافیہ کی خوش آہنگی پر صرف ہوتی ہے۔ چنانچہ عربی شاعری میں قافیہ ہر طرح طرح کی پابندیاں ہیں۔ مثلاً قافیہ آخر بیت میں واضح ہو صرف قید کا التزام مطلق نہ ہو تاسیس حرف فیل کا التزام نہ رہد ہو، وزن ضرب بدلنے نہ پائے یعنی اگر قافیہ متواتر ہے تو سارے قصیدہ میں متواتر رہا رہے گا۔ ان سبھوں کو ایک ساتھ جمع کرنا بھی درست نہیں لیکن یہ بھی ممکن نہیں کہ ان میں سے کوئی قید پائی نہ جائے۔

۲۔ غزل اس کے فارسی اور اردو ادبوں کے یہاں اتنے قید و بند نہیں۔ شاعر اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے پاس ردیف قافیہ کے صوتی سیم کی تلافی کے لئے موجود ہے۔ اس کے علاوہ ردیف کی نگاہ اس قدر مشکل ہے کہ اس کے ساتھ قافیہ پر بھی قید و بند عائد کرنا نفس مضی کا خون کرتا ہے چنانچہ اردو میں قافیہ کا اصول صرف اسی قدر ہے۔

”جو کس کی لٹا بہر آ آخروں خواہ ایک ہی حرف اور اس کی حرکت آقبل کا لٹا بہر ہو۔ جیسے ”ور“ ”بر“ خواہ چند حروف معین ایک ہی طرح کے حرکات و سکنات کے ساتھ پائے جائیں بشرطیکہ ان حروف میں کم سے کم پہلا حرف اصلی ہو مثلاً ”آرد“ ”کار“ ”میں“ ”سب“ ”دین“ اصلی ہیں۔ چنانچہ ”تو بانا“ ”میں“ ”ب“ اصلی ہے۔“ (تخصیص عروض قافیہ)

اس کے باوجود فارسی اور اردو میں بھی قافیہ کے حسن و قبح پر ایک مستقل بحث ہے لیکن ان سبجہ و منبع انجمنوں سے بچنے کے لئے قافیہ کا ایک مختصر سا نالج پیش کر دیا گیا ہے جو ہماری بحث کے سلسلہ میں کافی ہے۔

۱۔ شعر میں التزام قافیہ کی بحث وزن سے نپا قن زید قید ہے۔ جیسا کہ اکثر متذکرین وزن کو شعر کے لئے غرض نہیں سمجھتے۔ اسی طرح قافیہ بھی شعر کا لازمی عنصر نہیں سمجھا جاتا۔ لیکن وزن شعر کی جس ضرورت کو پورا کرنا ہے اسی طرح اس ضرورت کی تکمیل میں سادہ ترین کرنا ہے۔ اب تک عربی فارسی و ہندو شاعری میں قافیہ کا اس شدت کے ساتھ التزام رکھا گیا ہے کہ بغیر قافیہ کے مشرقی شاعری کا تصور ہی نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن کچھ دنوں سے اردو غنائی ادبی انقلاب کے بعد سے قافیہ پر مبالغہ فحش کیا جانے لگے ہے کہ اس کے التزام سے انھارانی الضرب میں لگاؤ پیدا ہوتی ہے۔ حالی کا بھی پتہ ایسا ہی خیال تھا۔ لیکن قافیہ کی افادیت کا انھیں بھی پورا اندازہ تھا۔ اس شخصیت کے نمونہ جن اسباب میں پہلا سبب یہ ہے کہ انگریزی شعرو ادب کی تقلید میں ہمارے شعرا نے نظم شعرائی ترویج کرنے پائی۔ وہ سبب جاپانی شاعری کے ترجموں اور دیگر کے شاعرانہ شعر کے تراجم کا وہ اثر ہے جس نے غرضی نوعوان شعرا کو شعر شعور کی طرف راغب کر دیا۔ تیسری وجہ خود اردو شاعری کا وہ نقص ہے جو قافیہ اور ردیف کی بیجا شغالت کے باعث پیدا ہو گیا ہے غرض یہاں واسی

انتہا کرتی ہے

تخلیق شریک دوسری صورت تحریک قافیہ سے شروع ہوتی ہے۔ اور ایسی شاعری کو عام طور پر تیسرے درجہ کی شاعری سمجھا جاتا ہے۔ اور اس کا نام قافیہ پیمانی اور نکستی رکھا گیا ہے۔ یہ تصور غائبانہ دو اسباب کی بنا پر پیدا ہوا ہے ایک سبب قویہ ہے کہ کم مواد شعرا و جن کے پاس کہنے کو کچھ نہیں ہوتا یا کچھ ہے بھی تو کہنے کی استطاعت نہیں رکھتے لیکن اس بے مائیگی کے باوجود کچھ کچھ کہنا چاہتے ہیں وہ قافیہ کی مناسبت سے جو مضمون بھی سوچ جاتا ہے باندھ دیتے ہیں یا اس قافیہ کے ساتھ جس قسم کے مضامین منہ پھرتے آئے ہیں۔ انہیں کو ویرا دیا جاتا ہے۔ اور ایسی شاعری کو قافیہ پیمانی کے سوا کچھ اور کہا جاسکتا ہے۔ دوسری وجہ شاعری کا وہ نقص ہے جو قافیہ کی ناخواری اور رویت کی بے مائیگی کے باعث پیدا ہوتا ہے جیسے نفس کی تکیاں اور دھس کی تکیاں۔ یہی زمین میں شاعر سوائے تکیاں بننے کے اور کیڑ کر سکتا ہے۔ اسی قسم کی شاعری کو دیکھ کر یہ کہیں نہ لگتا کہ قافیہ کی مہر جن منت شاعری مصنوعی اور بے روح ہوتی ہے۔ حالانکہ متذکرہ دونوں صورتوں میں شاعر کی صلاحیتوں کی کوتاہی اس کی پست شاعری کی ذمہ دار ہے۔ صعدت اول میں شاعر کی گہ میں کچھ ہی ہیں جس کو قافیہ کی تحریک باصلاحیت صورت ثانی میں شاعر کی کورڈوئی ایسا بعد قافیہ اختیار کرتی ہے جو صرف غیر شاعرانہ تجربات کی پیش کشی پر منحصر کرتا ہے۔ غرض نتائج کے اسی مطلق استخراج کے باعث قافیہ کی مخالفت کرنے والوں کو اس کی بے پایاں قوت تحریک کا اندازہ نہ ہو سکا۔ اگر شاعر کو عدلان تنہا اور تحمل قوی ہو تو قافیہ کی اک ذرا سی تحریک اس کے تحت منحصر پڑے ہوئے گراں قدر تجربات کو شعور کی دنیا میں منجھلاتی ہے جہاں وہ شاعر کے مذہب و احساس سے اقترا ج پاکر افکار اور دیگر تصور شعور کے مدارج سے گزرتے ہوئے عظیم شعری منزل میں پہنچ جاتا ہے۔ قرآن کو دیکھو یہی نے لہجے

سانٹ کی انگریزی شکل (u n a l l c a d e c a l e b a r) انگریزی شاعری کی اصناف میں قوافی کی برقلوں ترتیب سانچوں کی پیچیدہ ساخت اور اوزان کی تبدیلیاں معنی کا خون کرنے کی بجائے موسیقیت اور قوت انہماک میں اضافہ کرتی ہیں تو یہ فنی فیوہاردو شاعری ہی میں مکمل کیے سنگ راہ کیوں بن جاتی ہیں۔ جہاں تک ہم نے اس اعتراض کی حقیقت پر غور کیا ہے ہم اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ قافین نے شاعر کی کم سوادی کو قافیہ کی فنی قید کے سرخونیا ہے۔ غزل کی تخلیق شریک باعوم و طرح پر عمل میں آتی ہے۔ ایک صورت قویہ ہے کہ شاعر کسی معینہ خیال کو معینہ ذہن میں پیش کرتا ہے۔ دوسری صورت اس کے برعکس ہے یعنی قافیہ کی تحریک سے جو خیال پیدا ہوتا ہے وہ اس کو شعور کے قالب میں ڈھل دیتا ہے۔ پہلی صورت میں قافیہ کی نزاحت شاعر کی فن کارانہ مہارت کے ساتھ معنی بڑھتی ہے جس طرح ایک فن کار کو ایک کٹر صبر کا شوق و کوشش کے بعد کسی فن پر قدرت نامہ حاصل ہوتی ہے بالکل اسی طرح ایک شاعر کو بھی ایک عرصہ کی سعی و کوشش کے بعد الفاظ ترکیب اور پیرایہ ظہار پر قدرت نصیب ہوتی ہے۔ اعلیٰ انہماک کے لئے محض الفاظ اور اسلوب پر قدرت ہی کافی نہیں ہے بلکہ اس کے ساتھ ساتھ انکار کی قوت بھی درکار ہے جس قدر انقادی ہوگا سنا سی قدر اتنی سانی کے ساتھ لفظ و بیان کے موزوں ترین سانچے شاعر کی دسترس میں آئے بائیں گے قدرت بیان اور قوت انکاری ہی وہ ہم آہنگی ہے جو ایسے برجستہ ترین قافیہ کو ذمہ داری دیتی ہے کہ اس لفظ اس زیادہ موزوں مقام تصور میں نہیں آسکا۔ البتہ جس زمین میں قافیہ قبیل اوزار ہموار ہوا اور پھر اس کے ساتھ ایک بے باطل اور طویل رویت بھی جوڑ دی گئی ہو تو فہم ہے کہ ایسے قافیہ رویت انہماک بانی الفہم میں مزاحم ہوں گے لیکن یہاں بھی قصور قافیہ رویت کے فن کا نہیں بلکہ اس بد فانی کا ہے جو قافیہ رویت کے لئے جوصل اور بے ربط الفاظ

مضمون دور حاضر اور اردو غزل گوئی میں قافیہ کی اس افادہ کو پوری طرح واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کی بحث کا حاصل یہ ہے کہ:-

”ہر قافیہ میں شاعر کے وار و ات حیات بھرتا

و احسانتہ اور نقد حیات کے راز مضمون میں

قافیہ و روایت غزل نفسی کے ان تاثرات کا کام

کرتے ہیں جو حیات شاعر کے بظاہر ذرا روشن

اور حقیقت کبھی ذرا روشن نہ ہونے والے

واقعات اور وار و ات کی ترجمانی میں جھک

اور مدعاوں ہیں۔ شاعر کی سوئی ہوئی طبیعت

کو قافیہ و روایت چوٹا دیتے ہیں۔ مگر یہ صرن

منزل میں داخل اور نفسیاتی شاعری میں

مکمل ہے۔ غزل میں قافیہ شاعر کی نفسیاتی

سو آئینہ کی علامت ہیں۔ قافیہ شاعر کے

ذہن کے لئے ایک لحاظ سے پہلا قدم اور دوا

لحاظ سے منزل پر آخری قدم کا کام کرتا ہے۔“

زنگنه کا بیان ہے کہ:-

فراق نے قافیہ کی اس صفت کو داخلی شاعری کے لئے مخصوص

کر لیا ہے۔ اور یہ ظہیر ایک اختیار سے درست بھی ہے لیکن

جان ڈرائیڈن (John Dryden) ہر قسم کی شاعری

میں قافیہ کو خیال کا محرک سمجھتے ہیں۔ وہ () منسلک

The Poet کے اقتاب میں نظم مرزا کے مقابل میں

میں تحریر فرمائے ہیں۔ تقریباً تین سو صفحات تک تصاویر و قیمت حال

قافیہ کی افادیت پر بحث کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ شاعر کا خیال بے ہمار ہوتا ہے۔ اگر اس پر قید و بند عائد نہ کی جائے تو نفس خیال کے ساتھ جو ضروری جزئیات بھی شامل ہو جاتی ہیں۔

ایسا نہ بھی ہو تو کم از کم وہ غیر ضروری تفصیل اور طوالت اختیار

کر لیتا ہے اس لئے یہ قافیہ کا بڑا وصف ہے کہ وہ شاعر کے

خیال کے لئے ایک داس ستر سین کر دیتا ہے۔ یہ محدود صرن

خیال کی سعادت کرتی ہے بلکہ شاعر کو ایسے الفاظ کے نقص پر

مجبور کرتی ہے کہ قافیہ خود بخود ان کا تاج ہو جاتا ہے بغیر

کے اس محدود وصف سے وہ یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ جب

قافیہ خیال کو معین اور منظم کرتا ہے اور شاعر کی فن کا دانہ

صدا حیرت سے کام لیتا ہے نہ لازماً وہ شاعر کو انتہائی بلند اور

واضح خیال دیتا ہے۔

یہاں یہ اعتراض ممکن ہے کہ قافیہ کی اک ذرا سی تحریک

اس قدر پہچان کیونکر پیدا کر سکتی ہے۔ قدوس دتہ

() اس نکتہ کو بھی سمجھا دیا

سچل (Sachal) کے بیان ہے کہ

میں وہ رقمطراز ہیں کہ شاعری سکون میں سوچے ہوئے جذبہ

سے پیدا ہوتی ہے۔ جب اس جذبہ میں استغراق ہوتا ہے تو

روح عمل کے طور پر سکون رفتہ رفتہ زائل ہو جاتا ہے اور استغراق

سے پہلے کے جذبہ سے مشابہ ایک جذبہ پیدا ہو جاتا ہے جو تخلیق

شعری کا موجب بنتا ہے۔

حفیظ قیصل

میر محمد مومن :- عہد محرق قلی قطب شاہ و سلطان محمد قطب شاہ میں بیٹو اے سلطنت اور وزیر مطلق تھے۔ انھوں نے ہزار ہا

روپے کے صرفے سے ایک دائرہ بنایا تھا جس میں خاک کر لائے معلیٰ بھلاؤ تھی۔ اور یہ دائرہ اب تک ”دائرہ میر مومن“

کے نام سے حیدر آباد میں مشہور و معروف ہے۔ میر محمد مومن صاحب اعلیٰ پایہ کے فارسی شاعر بھی تھے۔ ان کے تہا بہت تفصیلی

اور تحقیقی حالات زندگی اس کتاب میں جناب ڈاکٹر سید علی الدین قادری صاحب زور نے اپنے دلچسپ اور مقبول عام مکتوب

میں تحریر فرمائے ہیں۔ تقریباً تین سو صفحات تک تصاویر و قیمت حال

تلقین

شب فراق کا مفہوم انتظار نہیں!
نکاح شوق بہر حال منتظر نہ رہے
سفینہ درد کا سیلاب اشک ہے
لبِ محسوس سے بھی اپنی داستان کہے
زباں پر حرفِ ملکیت نہ اے ظلم ہے

اس مضطرب تنہا سے فائدہ کیا ہے؟
یہ کس کی یاد میں دل کرو میں تکتے؟
یہ کیوں جاگ رہی محبت کا درد پیدا ہے؟
خیال کس بت بیدار کر کا آتا ہے؟
یہ بڑبڑتی بڑبڑتی سی تار کیوں میں جھٹکتی ہے؟
خیز قرار پہ بالوسیاں، سکوں اور اس
نہ موت کی کوئی صورت نہ زندگی کی اس
نہیں ہوں ان کے قریب اور نہ وہ مج سے ملے

یہ پچھلی شب یہ سکوت و جمود کا عالم
کہ سانس بیتا ہے رک رک کے کانوں کے
اواس اواس فضا میں یہ حکمرانی غم
تزلزل نہ دل مضطرب تجھے خدا کی قسم
شب فراق کا مفہوم انتظار نہیں!
جبریل

استفسار؟

کون ہے جو میرے افکار پہ یوں چھایا ہے؟
اپنے مرکز سے پرے ہٹ کے نظر گھوم گئی
روح احساس کی گہرائیوں میں مجھ کو
کون یہ دل میں نشہ بن کے اتر آیا ہے؟
یک بیک کس نے مرے دل میں یہ چٹائی ہے؟
دفعۂ کیوں مرے جذبات ادا آئے ہیں؟
اک گھٹنا بن کے جو احساس پہ لہرائے ہیں!
مجھ کو محسوس یہ ہوتا ہے کہ جیسے پی ہے!
کس نے دنیا کے سکون میں یہ چاودہ بھیل؟
کون ہے جس نے کیا ہے خرد و ہوش کا ٹپ؟
کر دیا کس نے مجھے محرم اسرار جنوں؟
ہو رہا ہوں اسی احساس سے میں تو پاگل!
کون ہے جو میرے افکار پہ یوں چھایا ہے؟
کون یہ دل میں نشہ بن کے اتر آیا ہے؟

جمیل ملک

تعارف

بارانہ ہے ہم دو فول ایک جان دو قالب ہیں "تیسرا
بول اٹھتا ہے" ارے تو تو یوں ہی بکا کرنا ہے آخر
کوئی ثبوت بھی ہے تیرے پاس ان کی محبت کا؟
تو وہ شخص جواب دیتا ہے "کیا میں جھوٹ کستا ہوں
دوست اگر گواہ اور ثبوت ہی پاس ہے ہو تو لوگوں کو
ایک کیا دو ہیں "محبت" کی گواہی کئے لئے

دل صدمہ جاک بھی ہے دیر غمبار بھی
اس کے بعد ایک آدم صاحب بول اٹھتے ہیں "وہ واقعی
محبت کے کرشمے کچھ عجیب و غریب ہوتے ہیں وہ جتنے
ملتی ہیں ہر ایک پر اپنا ترالا کی اثر حاکم اٹھتی ہیں
دیکھئے ہم ان کی تعریف اس طرح کرتے ہیں سہ
وہ آئے ہیں تو دل میں کچھ غم معلوم ہوتی ہے
میں ڈرتا ہوں کہیں اس کو محبت تو نہیں ملے
اس کے بعد شیعیت نے اس کی تائید اس طرح کرتے پکا

غائبانہ تعارف ہم سے کر دیا سہ
شائد اسی کا نام "محبت" ہے شفیقہ
اک آگ کی ہے سینہ کے اندر کی ہوئی
محبت۔ جی نہیں شکریہ آپ نے مجھے کانٹوں میں محبت
جو کچھ بھی آپ نے فرمایا وہ آپ کا اور میرے اجاب کا
صرف حسن ظن ہے۔ کہئے اب مزاج کا کیا حال
ہے؟ کیا بیماری ہے؟ کس کا علاج جاری ہے۔
بیمار۔ محترمہ! یہ دو چھو بیماری کیا ہے؟ ہماری شیخ زندگی
بجھا چلا رہی ہے۔ میری ولی آرزو آپ سے ملنے
کی تھی سودہ پوری ہوگئی۔ علاج تو میں نے بہت
کچھ کر دیا لیکن بیماری میں کچھ افادہ نہیں ہوا۔
ابھی ایک شخص صاحب آئے تھے انھوں نے ٹیبلٹ بھی
اور صرف یہ کہہ کر تشریف لے گئے سہ
انسر بایں سن بریز اے نادان طبیب
در و مندر ہجر دار و بجز دیدار نیست کے
محبت۔ سنا ہے آپ کے سر میں بھی درد ہوتا ہے اس کے

محبت مدد کیا میں اندر نہ سکتی ہوں شباب؟
بیمار۔ جی ہاں! تشریف لائے۔
محبت۔ معاف کیجئے گا ملا تعارف کے آپ سے گفتگو کرنے کا
شرن حاصل کر رہی ہوں۔

بیمار۔ جی نہیں کوئی ایسی بات نہیں اور میں بھی تو بغیر
تعارف کے شرف ملاقات حاصل کر رہا ہوں۔ کیا
میں یہ معلوم کر سکتا ہوں کہ مجھے کس سے گفتگو کرنے کا
شرن حاصل ہو رہا ہے؟

محبت۔ جی مجھے "محبت" کہتے ہیں۔ چند احباب کی لابی مطلق
ہوگا کہ آپ کے دشمنوں کی طبیعت کچھ ناساز ہے۔
اس لئے دل نہ کہا جیوڑا دیکھ رہی آہیں۔ وہ آپ کے
اخلاق کی بہت تعریف کرتے ہیں۔ فرمائیے اب
مزاج کیسے ہیں؟

بیمار۔ وہ محبت صاحبہ معاف فرمائیے اٹھ نہیں سکتا دن
آپ کے قدم چوم لیتا۔ میں کس زبان سے آپ کا
شکریہ ادا کروں۔ میرا در آپ کا پہلے ہی غائبانہ
تعارف تھا اور مدت سے آپ سے ملنے کا اشتیاق
بھی رکھتا تھا یہ تمنا آج پوری ہوئی۔ کتنا خوش قسمت
ہوں کہ آپ نے غریب خانہ ملک زحمت گوارا کی
میرے دوست آپ کی بہت تعریف کرتے ہیں۔
اور جب بھی جیتے ہیں تو آپ ہی کا
ذکر خیر ہوتا ہے اور جو آپ سے متعارف ہیں
وہ آپ کے کئی کرشمے بنا کر ہمارا اور آپ کا فائدہ
تعارف کرا چکے ہیں۔

ان میں سے ایک کہتا ہے مکمل میاں آپ میں
سے کسی کی محبت صاحبہ سے دوستی ہے؟ تو وہ ہوا
کہتا ہے۔ ارے یار ان سے تو ہمارا بہت زمانہ کا

کسی اچھے حکیم سے رائے لی ہوتی۔

بیارہ۔ ہاں محترمہ! ایک طبیب کو میں نے بلوایا تھا۔
دوسری کیفیت بیان کی انھوں نے یہ نسخہ بتایا کہ

ع درجہ حرکت واسطے صندل لگانا ہے مفید

لیکن میں کہاکم صناع اس کا کھنا اور گرگنا درجہ حرکت بھی تو ہے
بس اس پر وہ غصا ہو کر اٹھ کھڑے ہوئے آپ

ہی بتائیے کہ کیا کیا جائے؟

محبت۔ جناب مجھے آپ سے پوری دلی ہمدردی ہے میں بھی
کچھ طب باجی ہوں بتائیے اب اس جگہ درد ہے؟

بیارہ۔ آہ محترمہ! کینٹاؤں درد ایک جگہ ہوتا ہوں
کبھی دل میں کبھی سر میں ہے کبھی پلو میں

چارہ کر کیا کہوں میں درد کہاں ہوتا ہے؟

محبت۔ دوست! پہلو میں اگر درد ہو تو اسے تو ہمارے
پاس اس کا سان نسخہ ہے اس پر عمل کرو

جلد آرام ہو جائے گا۔

ع جمل اٹھتا ہے یہ پلو تو وہ پہلو دلتے ہیں
بیارہ۔ شکر یہ عیسیٰ جی یہ ترکیب تو میں نے کبھی کبھی

توف مذہبیل ہوا۔

محبت۔ مجھے اس کا بہت انوکھ ہے غیر یہ بیاری
انسان کے دل و جگر پر بہت جلد ملکہ کرتی ہے اس

دل و جگر کی اچھی خبر لیتے رہیے۔

بیارہ۔ محترمہ! میں آپ کا سن زبان سے شکر بہ ادھر کر لیا
مرکبھی میں آپ کی ہمدردی بھل نہیں سکتا۔

ایک صاحب گل ہی آئے تھے انھوں نے مجھی
فرمایا کہ دل و جگر ہی کا زیادہ خیال رکھنا چاہیے۔

سے شب فرقت میں ہم ہر سانس سے پوچھ لیتے ہیں
مگر تو فریت سے ہے مزاج دل تو اچھا ہے؟

اور اب سانس بھی مٹتی جواب نہیں دے رہا
ہے محترمہ!

محبت۔ دوست مجھے بہت جلد ہر شخص سے بے تکلف ہونا

عاتد ہے اس لئے آپ بھی تحلف نہ فرمائیے کہ
آپ کے بعد میرے لائق کو کسی خدمت سے تارک اس کو

میں انجام دوں۔ اور دیکھئے صاحب میرا ایک ذاتی
مطیع ہے۔ اگر آپ کو فی چیز طبع کرانے کے لئے چھوڑتے

ہیں تو اس خدمت کو انجام دینے کی سعادت مجھے
عطا فرمائیے اس طرح مجھے آپ کی روح کو مسرت

پہنچا کر بڑی خوشی حاصل ہوگی۔

بیارہ۔ ہاں خوب یاد دلایا اب میرے پاس سوائے
اس کے رکھا ہی کچھ ہے

چند مقصود بتال چند حینوں کے خطوط

بعد مرنے کے میرے کھڑے یہ سامان نکلا

اور آپ سے ہی اتنا ہے کہ ان خطوط کو طبع کرادیکھئے
آپ کو تحلف تو ضرور ہوگی۔

محبت۔ اچی جناب کیسی تحلف! یہ آپ کیا فرما رہے ہیں
اچھا اب اجازت دیجئے۔

بیارہ۔ محبت صاحبہ آپ جاتی تو میں لیکن ہماری سیت
میں ضرور شریک ہونا اور اس کا بھی خیال رکھنا

کرنا آپ اور میں سے کچھ زیادہ ہی دشمن ناک کو لگ
آپ کو قاتل نہ سمجھیں

ہو نہ دامن گیر کوئی جان کر قاتل سمجھے

تو بھی روتا میں جنازے کو ہمارے دیکھ کر
محبت۔ شک تو ہے! لیکن میں اس تذکریوں میں؟

اپنا کلمہ میری آنکھیں نہیں جانتی ہیں کہ انوکھا ہوتا
ہیں؟ اس لئے کسی سے کوئی انسان نسخہ تو فرمائیے

تو فرمائی ہوگی۔

بیارہ۔ مجھے تو کوئی ترکیب سمجھ میں نہیں آ رہی ہے اگر آپ
ہی کوئی ترکیب بتالیں تو بہتر ہے۔

محبت۔ ہاں صاحب! ایک ترکیب یاد رکھی اگر آپ اس
عمل کرنے راضی ہیں تو میں بتاتی ہوں

نئے مرگ ہم جلد ملکہ ہوں و غرق دریا نہ کبھی جانا دلتا کہیں اور ہوتا

بیار۔ بہت بہتر مختصر میرا سی میں آپ کی بھلائی ہے کسی
کا آپ پر گمان تک نہ ہو گا۔

محبت۔ میں خدا سے صدفِ دل سے یہ دعا بھی پو
کہ آپ کو جنت نصیب کرے اور آپ کے پیاروں کو
کو صبر جمیل عطا فرمائے۔

بیار۔ نہیں محبت صاحبہ میرا کوئی رشتہ دار نہیں
ہے اور تمام احباب میں صرف آپ ہی اکیلے ہی
ہیں جن سے مجھے محبت ہے۔ اس لئے میں بھی
خدا سے دعا کرتا ہوں کہ ”رحمت تمام! میری ہر
خطا معاف! اور میری جان سے زیادہ عزیز

”محبت“ کو عمر خضر نصیب ہو اور ساتھ ہی اس کو
صبر جمیل بھی عطا فرما۔“

اودہ محبت صاحبہ، میرے کان میں کسی کی آواز
آ رہی ہے۔ شاید میری دعا مستجاب ہو گئی۔ کوئی
آہستہ سے کہہ رہا ہے ”ارے دو! اسے، محبت کو
تو نے کیا کچھ رکھا ہے! محبت زندگی ہے، محبت دنیا
ہے اور جب تک دنیا ہے گی اس کے ساتھ محبت
بھی رہے گی۔“ اچھا محبت اودہ ارع
ع۔ خوش رہو دلِ وطن ہم تو سفر کرتے ہیں۔

ملکِ ادجن

عزل

دل کو غم حیات گوارا ہے ان دنوں پہلے جو درد تھا وہی چار ہے ان دنوں
ایک ایک اشکِ جان سے پیلا ہے ان دنوں موتی ہے ان دنوں کوئی تارا ہے ان دنوں
ہریں اشکِ ساحل تسکین ہے آج کل دریا کی موج موج کنار ہے ان دنوں
یہ دل ذرا سادل تری یادوں میں گھوٹا ذرے کو آندھیوں کا سہارا ہے ان دنوں
شمنوں کی انہیں ہے وہ پہلی ہی خوشی کیا واقعی وہ سچن آرا ہے ان دنوں
تم آسکو تو شب کو بڑھا دو کچھ اور بھی اپنے کہے میں صبح کا بار ہے ان دنوں

نخلا خوشی کا دور بہت مختصر قاتل
پہلے سے تیز وقت کا دہارا ہے ان دنوں

قتیل شہانی

شکست

ہے وہ دیکھ صاحب کی بیٹی تصور کئے ہوئے تھے۔ ہائے
کیسا ہو کا ہوا۔ آیا جان آپ نے میری زندگی بالکل تباہ
کر دی۔ اپنی منہ پر میری مسرتوں، میری تمنائوں
کو بھینٹ چڑھا دیا۔ دنیا ہی یہ کیا سنگ نرہی ہے کہ جس پر جعفری
فریفت تھے انھیں وہ ملا، درمیں اپنی مرضی کے خلاف ان کے
پالے پر لگی۔ یہ سوچتے سوچتے بھینٹیں خیرالات کے سمندر
میں غرق ہو گئی۔

بڑی دیر تک کہہ میں سکوت چھایا رہا۔ وہ مرد لہجہ
غائب تھا وہ مرد وہ لہجہ نہیں ہوئی اس طول المدت خاموشی
کو جعفری نے توڑا وہ بوجھا ہوا بھینٹ کے قریب آیا اور مات
سلجے ہوئے سہجے میں بولا۔ "مجھے سخت افسوس ہے کہ میرے
باعث آپ اس قدر روحانی توبہ میں گرفتار ہو گئے۔ میری
بہی وہ سب سے آپ کی خوشیوں کو شکرا دیا گیا۔" بھینٹیں
بالکل خاموش تھی جعفری نے بھینٹیں جاری رکھتے ہوئے
کہا۔ "آپ سے میں بہت مدد حاصل کرنا چاہتا ہوں میں
جس راہی سے شادی کرنے کے تصور میں تھا جس کو میں نے
ایک دفعہ دیکھا تھا وہ آپ نہیں ہیں۔ مجھے اس راہی کو
دیکھ صاحب کی صاحبزادی یاد کر رہا گیا۔" بھینٹیں جی پی
جعفری بھا ہوا۔ "مشیت ازوی، آگے انجان چور ہے
یہ خدا کو نظر آتا ہے۔" دوسرے دن شادی کے روز
میں چور دیے جو میں اپنا اعلیٰ نعت سے بوجھ دیکھ کر
اپنی شکست پر شاکر ہوا، برہنہ ہی عبدینت کا ثبوت ہے
بھینٹیں چوکی جعفری اس کے مقصد سے دور ہوتے کیا
تھا۔ بولی آپ بھول رہے ہیں اب بھی ہمیں موقع ہے کہ
بھی ہم گمراہی ہوئی تقدیر نہ بنا سکتے ہیں اب بھی مذہب ہمارا
رہنما ہے اگرچہ اب بھی ہمارا اس نرہی کے رشتہ کو
توڑ کر آزاد ہو سکتے ہیں اپنی زندگی کے سدھارنے میں
ہمیں کون روک سکتا ہے۔

اس قسم کی گفتگو کو جعفری وہ لہجہ سے سننے لگا
تیار نہیں تھا وہ تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد بولا دینا

جعفری اندرونی کش مکش سے ناواقف نہ تھا وہ
خوب جانتا تھا کہ یہ شادی محض دیکھ صاحب کی ضد سے ہوئی
ہے۔ جعفری کو کبھی صدمہ تو یہ تھا کہ جس پر وہ فریفتہ ہے اس کی
محبت کا مرکز تو کوئی دوسری ہستی ہے۔ یہ خیال دل میں لے
ہوئے وہ وہیں کے کمرے میں داخل ہوا اور کرسی پر دراز چھایا
اس میں یہ ہمت نہ تھی کہ دل شکستہ بھینٹ کو پھیلے۔ بڑی
دیر کے بعد جعفری نے کہنا شروع کیا۔ "یہ بھی عجیب بات ہے
جس کی ہم پرستش کرتے ہیں وہ بہت نفرت کرتا ہے۔" آہ وہ بڑا
ایک برقی جوالا کی طرح ایک کایک میرے ہوش و حواس پر لڑی۔
مجھے سسکتا چھوڑ پشیمون میں گچھوں سے چھب گئی۔ دیر تک
جعفری محبت کے سراپا تھا۔ بھینٹیں اپنے خیالات میں متغیر
رہی جعفری گنگنا رہا، اگر کسی پرستہ اٹھ بھینٹیں کا دل بڑھ
دھڑکنے لگا وہ سمجھ کر بیٹھ گئی جعفری قریب آتا ہوا بولاری
والہا بہت محبت کے سیرکامیری کتاؤں کی ملک والا ایک دفعہ
زنگین ٹھوٹھ کو الٹ کر اپنے فرائی کو دیکھے (قریب ہوتا ہوا)
یہ جگہ گنگنا، جھلکا رہا کھوٹھ کتنا جاذب نظر ہے جیسے کوئی
حیوان میں سکر رہا ہے۔ بھینٹیں کچھ بھنے۔ "پتی مٹی کو جعفری
یہ کہتا ہوا پھرتی سے ٹھوٹھ الٹ دیا صورت پر نظر پڑنے
ہی بے اختیار جعفری کے منہ سے نکلیا۔ "کون" "حسرتوں"
ارٹوں کے ساتھ وہ آگے بڑھا اور گھبراہٹ وراسی کی
کی حالت میں دھڑک رہا پرکڑا۔ بھینٹیں پر ایک جہر بری سی
آئی ایک ٹکڑی اس کے دماغ میں کوندی۔ پہلے تو اس نے
جعفری کی بے مٹی باتوں پر غور نہیں کیا۔ کبھی بولی کے جارہے
ہیں لیکن اس کے یہ کہتے پر "کون" "وہ کھٹکی کی یہ بے مٹی
باتیں محض خیال آرائی نہیں ہیں ضرور اصلیت رکھتی ہیں۔
وہ فرما رہا تھا کہ جعفری میری بجائے کسی اور کو دیکھنے کے
مستحق تھے اس کو جس نے ان کا دل ہربانڈا رہا تھا اور

ہرگز نہیں ہو سکتا لوگ کیا کہیں گے بقیس بولی "لوگ! آپس لوگوں سے کیا کر سکا۔ ہم تو اپنی کمزوری ہوئی خوشی حاصل کرنا چاہتے ہیں یہ ہمارا حق ہے۔"

جھفری "آپ غور کیجئے یہ نامکن ہے۔ بقیس عاجز نہ ہو جس میں بولی "اب بھی کچھ نہیں گیا مجھ غریب کی زندگی تباہ نہ کیجئے۔ آپ مجھے اس قدر سے رہا کر دیجئے۔ جھفری نے چہن ہو کر بولا مجھے کوئی غدر نہیں۔ میں آپ کے لئے سب کچھ کرنے کو تیار ہوں۔ لیکن یہ بات خجل ہے۔ لوگ کیا کہیں گے۔ جھفری کچھ سوچنے لگا۔

بقیس تیری سے بولی "ہرگز نہیں ہم باہل حق بجانب ہیں اسی طریقہ سے۔۔۔۔۔ تین زندگیاں سدھر جائیں گی۔ جھفری "مگر آپ غور تو کیجئے کہ ایسا کرنے کے بعد آپ متعلق لوگوں کا کیا خیال ہوگا۔ کیا لگا وہ آپ کو قبول کر لے گا۔ بقیس کے دل میں چہن ہی محسوس ہوئی۔ دم الجھ کر بولی "مجھے پورا اعتماد ہے اس کی میں ذمہ دار ہوں آپ کو سوچنے کی ضرورت نہیں۔"

جھفری "اور آپ نے اسے والد محترم کا خیال نہیں فرمایا وہ اس بے عزتی کو کب برداشت کر سکیں گے۔ وہ خود کشی کر لیں گے۔" بقیس "یہ بے عزتی ہرگز نہیں ہو سکتی یہ تو اپنے حقوق کی جنگ ہے۔ ہم مذہب کے حدود سے باہر نہیں ہیں۔"

جھفری یہ آپ کا خیال ہے۔ بقیس بولی۔ خیال۔ خوب میری زندگی کے متعلق لوگوں سے پوچھوں۔ آپ کو دنیا کی کچی ہے امدادوں کو عزت کا پاس ہے۔ آپ نے محبت نہیں کی۔ جب آپ کسی سے محبت کرتے تو آپ کا دل ٹوٹتا تو دیکھتے۔"

جھفری "میں نے جموٹی محبت کی۔ معاف فرمائیے آپ کا الزام غلط ہے آپ کو دبوکا ہوا ہے۔ اگر آپ چند دن پرشیر میری حالت دیکھیں تو معلوم ہوتا کہ میں کس کس میں جن ہاتھ ہیں ایسا محسوس کر رہا تھا کہ میری زندگی اس ہستی

کے بغیر بیچ ہے۔ میں نے یہ تہہ کیا کیری شادی ہوئی تو اس ہوئی آپ اس روح فرسا غلیظ کا اندازہ نہیں فرما سکتیں جو مجھے غولی دی دیر پشتہ ہوا۔ میری ساری کتابیں سارے بچپن خواب برباد ہو گئے (دم کیس) اور میں زندہ ہوں۔ دلی برضا رہنا اپنا فرض سمجھتا ہوں۔

بقیس بولی "مہربان میں ایک ہی مذہب کے اثرات و متعلقہ طبعیتوں پر کیا نہیں پڑتے بعض کے اثرات نقش بر آب ہوتے ہیں اور بعض کے نقش کا کچھ۔ آپ کا یہ کہنا میں نے ایسا نہیں کیا اس لئے تمہارا اتنا غرور انتہائی ظلم ہے۔"

جھفری "بقیس یہ سب کچھ ٹھیک ہے۔ اول میں نے پہلے ہی آپ سے کہہ دیا کہ آپ کچھ سکتی ہیں۔ مجھے مسرت کی تلاش نہیں حسرتوں کو پورا کرنے کی تمنا نہیں۔ آپ جو کچھ فرمایا ہیں وہ ایک سچہ مکمل خیال اور خوبصورت تصور ہے۔ جو عمل کے سانچے میں ڈھل نہیں سکتا۔ ہم موجودہ رشتہ کو توڑ کر خوش و خرم رہیں گے۔ ایک فریب ہے۔ اس سے آپ کی زندگی آواز قابل برداشت ہو جائے گی اور میں دنیا کی نظروں

میں نہیں دوڑاؤں گا بقیس کو متاثر پا کر "آپ دنیا کا بے مثال ہیچ سمجھتی ہیں مگر باور رکھئے آپ اس دنیا کے ایک جز حقیق ہیں۔ کیا جڑ بھی گل سے ملکہ ہو سکتا ہے۔ کبھی اپنی جڑ سے ٹوٹ کر سر بہر ہو سکتی ہے۔ کیا آپ کو اس ہستی کا اتنا بھی پاس نہیں جس نے آپ کو اپنے خون سے پیدا ہو جس نے آپ کے آرام و راحت کے لئے اپنی جان بھگائی اور اس ساری جان بھگائی کا معاوضہ انھیں ہی ملنا چاہیے کیا اسی کی انھیں توقع تھی۔"

بقیس تنک کر بولی "حسیاتی یا محسوس فوج ہے۔ آپ موضوع غلط سے بٹ گئے ہیں۔ یہ نظریہ کی گزوری ہے۔ آپ نے مجھے برا بھلا کہنا شروع کر دیا۔ علامت سیکھا حاصل اگر میں کسی فعل فحش کی مرتکب ہو رہی ہوں تو اس کی سزا میں جھگڑوں۔ آپ کا کہنا سنا قذیہ مسخ ہے کہ رشتہ کا توڑنا ناقابل عمل ہے۔ یہ تو ایسے خواہ آپ کا بھی نہیں چاہتا۔ باتیں کیوں بناتے ہیں۔"

مردوں کی بنائی ہوئی دنیا کے جعفری کو دیا ہے کیا وہ انتہا۔
اس سے چین نہیں سختی؟

اس انتظار کے سبب ہو جانے سے ہی اس کا جرح
دلِ محنت پاسکتا ہے اس کی کھلائی ہوئی تمنائیں تازہ ہوتی
ہیں۔ اگر قدر نہ اس کا ساتھ دے تو دوسری قوت ہرگز ذمہ
نہیں دے سکتی۔

برخلاف اس کے جعفری کا ہر عمل یہ خواہش لئے
ہوئے تھا کہ بلیغ کی ممکنہ دہائی کا حصے اس کو داخل کیا
جاسکے۔ اس نے بلیغ سے کوئی سروکار نہیں رکھا۔ اس
کو مکمل آزادی دیدی۔ وہ یہاں پہنچے جا سکتے ہیں جس
منا چاہتے ہیں سکتے ہیں اور جو چاہتے کر سکتے ہیں۔ وہ بہت کم بلیغ
کے ساتھ رہتا تھا کہ اسے صحیح طور پر جو چاہئے، ٹھنڈے دل سے
نور کرنے کا موقع ملے اور اپنے غم کو بھول سکے۔ (ان شبہ
تعلقات سے وہ ہر ایک کو داخل طور پر مل کر سل صاحب کو نام
رکھنا چاہتا تھا۔ اور اسی وجہ سے اس نے ایسی راہی سے
شادی کی جو دوسرے کو چاہتی ہو۔

جعفری کا بلیغ کے کمرے میں رہنا بلیغ کے لئے
انتہائی تکلیف کا باعث تھا۔ شادی کے بعد جعفری کی ہر رات
یہ غرابی بے گلی اور سرائیکی میں گزرتی۔ راتوں میں اٹھ کر
ٹھنڈوں وہ بخون کی طرح ٹھٹھا اور سو جتا رہتا۔ جب کوئی نا
ہی نیک نہ ہو کہ ایسی ہی کسی سربراہت یا مسمولی بلیغ سے اس
کی آنکھ مل جاتی۔

بلیغیں سب باغی تھی۔ شروع میں اسے جعفری
کے کمرے میں رہنے پر غور کرنے کی فرصت نہیں ملی۔ رنج و ملال کے
ساتھ ساتھ اس کو اور باتوں کا احساس ہونے لگا۔ جعفری
کی دوری اس کے لئے غیر معمولی جبر تھا۔ جی۔ وہ خود کو
اس کی بھوری ہوئی اور اس کو اپنا مختار باغی سمجھا۔ وہ اس
اقبنا ب سے چند سرور اور اسی درپیش بند رہی۔

دن رات رہے تھے دو دونوں کے تو فحاش و تہمت کے
ساتھ وابستہ تھے۔ دو دونوں کے آرزو مند دل افلاک پہ تھے

تھے بابک کی امیدیں غریبی بقیں اور دوسرے کی تعمیر۔
ایک دوسرے سے دوڑا یاں و حسرت کی زندگی گزار رہے
تھے۔ بلیغ کی صورت میں مجھنے ہوئے بھول کی طرح بڑھک
ہو رہی تھی۔ جعفری کا چہرہ ندوڑا گیا تھا۔

تین ماہ گزر گئے اس دن میں جعفری بلیغ سے لگھوڑا
چلا گیا۔ پہلی بار بلیغ کمرے سے باہر چلی گئی دوسری بار جھجکا کو لگی
آپ جو کچھ کہنا چاہتے ہیں کہہ دیجئے میں سن رہی ہوں؟

جعفری نے کہا میں آپ سے لگھوڑا چاہتا ہوں۔ بلیغ
سنگ آکر بولی۔ مجھ سے لگھوڑا گھستے تو میری۔ میں آپ کا دل
چاہتا ہوں یا ہتی آپ مجھے دن نہ دیجئے؟ یہ سچی جعفری کی تمنائیں
ہیں۔ بلیغ اور جعفری کی تاثیر نہ جتنا لیکن عمل ہی کو بہتر کرنا
ایک دن دوسرے ماہی پر جعفری سے لگھوڑا بلیغ کی انہو
ساتھ آئے کہا "نام میں آئے تھے" دہا بلیغ کا جواب
اور پھر بھائی ہے اسلام کہہ گئے ہیں۔ جعفری معلوم ہوا کہ ہا
چاندہم کہہ کی طرف بڑھا پھر کا اور ملے کر پوچھا بلیغ مجھ سے
کہہ دیجئے تم نے کیوں تکلیف کی۔ لگھوڑا بی نے سادگی سے کہا
"بی بی ان سے نہیں ملیں" جعفری بھی منہ جایا ہوتا تھا۔ بلیغ
سے معلوم ہو جانے کا تو بہانہ تھا جعفری نے حیرت سے

پوچھا۔ کیوں؟ لگھوڑا بولی۔ بی بی نے کہا میں نے
سامنے تلخے کی اہانت نہیں کی ہے۔ جعفری دل میں نہ بک
رہا۔ روج کا اس قدر پاس۔ شادی کی رات کے بعد پہلی دفعہ
جعفری کے جسم میں موت کی لہر دوڑ گئی۔ جعفری تیزی سے کمرے میں
داخل ہوا اور اسے سنا۔ کہنے لگا "معلوم ہوا؟" آئے تھے؟
آپ نے انہیں اندکیوں نہیں بلایا۔ یہ کیا عجب کیا۔ نہ تو
پر وہ بلیغ کی صورت غور سے دیکھ رہا تھا۔ بلیغ سالت و
صامت تھی۔ اس کو آپ کے بھائی ہیں۔ چلے
ابھی آپ ان سے معافی چاہیں۔

..... آج پہلی دفعہ جعفری نے بلیغ کے چہرہ پر خون
دوڑا ہوا دیکھا۔ پھر جب وہ کمرے میں داخل ہوا تو بلیغ
تیار تھی۔ رات میں دو دونوں واپس ہو گئے۔

میں کھو رہے ہیں جعفری معلوم نہ کر سکا۔
 انہیں دونوں ایک رات جعفری کلب سے واپس ہوا
 بقیس کو اپنا منتظر اور مشتاق پایا۔ جعفری کو اپنی طرف آنے پر
 دیکر بقیس کمرہ بند ہو گئی اور کھنوم بی سے بولی میں کہا نا
 کھاؤں گی۔ جعفری منہ ہاتھ دھو کر کمرہ میں پہنچا بقیس جیسی
 تھی چہرہ ستار ہاتھ جعفری نے سکر اتے ہوئے کہا۔ کیا میرا
 خیال صحیح ہے کہ آپ کو اپنی غلطی کا احساس شروع ہو گیا۔
 بقیس جین جیمین ہوکر "آپ ہی غلطی پر ہیں آپ سے
 دوسری بار اور..... آخری بار میں انتہا کرتی ہوں۔

جعفری افسردہ ہو گیا۔ "میں سننے کو تیار ہوں مگر جانتا
 ہوں فضول ہے (کھنوم بی کی طرف دھڑک دھڑک رہا تھا۔
 بقیس اضطراب سے انہیں نہیں آپ کو مجھے جسے جسے
 باز آئے۔ میری اور نامہ کی زندگی تباہ کیجئے۔ رحم کیجئے! میں
 جعفری تندی سے بولا۔ "میں مذکور ہوں ۹ میں مذکور
 تباہ کر رہا ہوں! اور آپ کو کچھ بھنسا نہیں چاہیں۔
 بقیس جی تندی سے بولی میں سوچ چکی۔ آپ ایک
 بے درد ظالم انسان ہیں۔

جعفری "مجھے یہ ہمدردی آپ چاہتی ہیں۔ وہ ظلم ہے
 میں ظلم کا مرتکب نہیں ہو سکتا۔
 بقیس لال ہو گئی۔ انتہائی مجبوری جنم خیز ہوئی
 ہے اب مجھے مجبور نہ کیجئے میں ہر وہ عمل کرنے پر آمادہ ہوں جو
 مجھے آپ کی قید سے نجات دلائے۔
 جعفری "بقیس کو دیکھ کر" وہ سہل نہ دیکھے۔ آپ جو
 چاہے کر سکتی ہیں۔

بقیس کے چہرے پر زہریلی مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔
 اس کی آنکھیں سرخ، آنکھار ہو رہی تھی۔ بالکل خاموشی میں
 دونوں نے کھانا کھا جعفری گردن جھکا کر ہونے تھا۔
 پیشانی پر نشیں تھیں۔ بقیس کے چہرہ کا رنگ بدلا ہوا تھا۔
 کھانے کے بعد جعفری اٹھا کھنوم بی باہر ہی تھی جعفری گلاس میں
 پانی ڈال کر گلاس منہ کو لگا لپٹی پا ہوتا تھا کہ بقیس نے ہرن

دوسرے دن صبح میں ناشتہ پر بقیس نے پہلی دفعہ
 گفتگو میں بدل کی بقیس گردن جھکا کر ہونے بولی۔ "میں
 آج اپنے کمرہ چاہتی ہوں۔
 جعفری زیر لب بسم سے "آپ اپنے کمرہ میں ہی
 ہیں۔
 بقیس جیسی لیکن فوراً توجہ پڑ گئے "زندہ و گد
 ہوں۔
 جعفری ان غصوں کا حامی سا ہو گیا تھا مسکرا کر بولا
 "میں آپ کے ساتھ ہوں۔"

بقیس "خود کردہ راجعہ نیست۔"
 جعفری جیسے شاہی نہیں۔ آپ شوق سے با سکتی۔
 ہیں۔"
 بقیس "نامہ جب تک کہ میں وہیں رہوں گی۔
 جعفری "آپ کو اختیار ہے۔"

امریک موجود کی سے بقیس کے تن بدوہ میں جان پر
 اس کے شابہ کی رنگین آرزوؤں اور تناؤں کا پیکر اس کی
 آنکھوں کے سامنے تھا۔ لیکن وہ اس سے بہت دور تھا اس قدر
 قرب اور اتنا بعد۔ بقیس کی روح بے چین ہو گئی۔ محرومی اور
 بد قسم کا احساس شرت سے تازہ ہو گیا۔ نامہ کے جانے کے
 بعد بقیس مستحکم غمزدہ و استغلا کے ساتھ اپنے کمرہ کوئی جعفری
 نے دیکھا اس قبل کہ نامہ میں بقیس کا رنگ درو پ گھر گیا ہے۔
 بقیس نے محسوس کیا کہ جعفری لانا اور لاغز ہو گیا ہے۔

بقیس انقلاب کے آثار کو اپنے سوا حق پارسی تھی
 اب اس کو صبر کا یار نہیں تھا وہ عجلت چاہتی تھی۔ قدرت
 کی سست رفتار سے وہ بولکلاری تھی نہیں معلوم ابھی کتنے
 پہنچے کتنے سال آزمائش میں گزریں گے۔ جعفری نے بھی
 محسوس کیا کہ ان دونوں بقیس کا رنگ بدلا ہوا ہے وہ کسی
 تشویش اور الجھن میں گرفتار ہے۔ دن میں اکثر وہ
 چنگ پر پڑی رہتی راتوں میں کم سوئی اور بہت بیگل رہتی۔
 بقیس کیا سوچ رہی ہے۔ کون سے خیالات اس کے دماغ

اور گراں بہا چتر جھوٹی بازی میں لگا دی۔ اس واقعہ نے اسے یقین دلادیا۔ یہ یقین جاں کس اور دل کس میں رہتا ہوا۔ بد مزگی اور تنہا کے سماجی حصر کی کہ چہرے سے ظاہر ہونے لگے۔ دن بدن اس کی محنت بڑھتی گئی۔ وہ طویل چوکیا۔ بچنے سے اس کو کمزور کر ڈالا۔ بائیکاٹ کا اس پر سخت حملہ ہوا۔ اس زمانہ میں مسخاؤ جذبات بقیس کے دل میں دوڑ رہے تھے۔ اس غم اور واقعہ سے وہ بیدار متاثر ہوئی۔ اس خیالات میں سکون پیدا ہوا کہ جعفری ہمارا ہو گیا۔ قدرت اس کے جذبات اور اس کی زندگی سے کھیل رہی تھی۔ جعفری کی محنت پر وہ خوشی سے ناچنے لگی۔

جعفری کا اصرار تھا کہ اسے دو اعزاء بھیج دیا جائے۔ اس کی حالت خراب ہوئی تھی۔ اسے دو اعزاء بھیج دیا گیا۔ جعفری جانے وقت بقیس کو قریب بلایا اور بولا "بقیس اب آپ ہر طرح آزاد ہیں۔ بقیس بیاب ہو کر بولی "ہمیں ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا"۔ وہ جذبات سے بے ہوش ہو گئی۔

زندگی اسے خوفناک نظر آ رہی تھی۔ دن گزرتا تو ملت سے وہ خائف ہو جاتی رات بھر ہوتی تو دن اسے بھیاںک معلوم ہوتا۔ مسلسل روح فرسائی اور سیم قلبی اذیت سے وقت گزرا رہی تھی۔ ہر وقت وہ قسمت کا فیصلہ سننے کے لیے تیار تھی۔ قدرت اب بھی سہل بخاری سے کام لے رہی تھی بقیس متحیر تھی کہ اس زبردست جاں سواری کی حالت میں اس کی توانائیوں نے جاب کیوں نہیں دیا۔

کھیل ۲۰ دن کے بعد اس کو معلوم ہوا کہ جعفری موت کے منہ سے نکل گیا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ وہ حیرت و دیر کے لئے کھڑی ہوئی۔ عورت کا زہر ملا انتقام جس پر اس کی ساری امیدوں کا دار و مدار تھا کامیاب نہ ہو سکا اور جبکہ وہ جعفری کی شخصیت سے متاثر ہو چکی تھی۔ قدرت نے (جس سے بقیس کی آس ٹوٹ چکی تھی) جعفری پر بے مروتی اور بے نتیجہ وار کیا۔ وہ سوچنے لگی کیا فی الحقیقت دنیا کو

کی طرح چھلانگ ماری اور گلاس پر ہاتھ مارا۔ گلاس بٹنے لگا۔ گر کر پاش پاش ہو گیا ساتھ ہی اس نے جگ کو بھی زمین میں پھینک دیا۔ جعفری قہقہے سے بقیس کو دیکھنے لگا۔ جس پر جعفری نے بقیس آئی تھی۔ انا ہی آہستہ وہ دہا پس ہوئی۔ جعفری زرد رنگ کی طنز سے بولا "یہ کیا کیا تم نے بقیس دیکھی آواز سے (جعفری کو حشمتیں نظروں سے دیکھ کر) میں جو چاہے وہ کرے ہوں۔

جعفری "حقارت سے بولا "کاش آپ کا قہر و مجھ پر اثر نہ ہو کہ کی طرح آپ مجھے پاش پاش کر ڈالیں (زہر خفہ)۔

بقیس زخمی شیرینی کی طرح ہچکچاہٹ بولی "عورت کا اتنا غم بڑا خوفناک ہوتا ہے جعفری طنز سے بولا "ہم بھی دیکھیں گے۔

بقیس اس طرح طنز سے بولی "یہ تو میں دیکھ رہی ہوں" بقیس اندرونی ہجمن سے بے قابو ہو رہی تھی اس کے ہاتھ پاؤں پھول رہے تھے وہ دوڑتی ہوئی ٹانگ پر گر پڑی اور زار زار روئے لگی۔ اس کی ہچکیاں بندھ گئیں۔

وہ جانتی تھی کہ مذہب و تمدن کے قوانین کا توڑنا بڑا بڑا خلافی گناہ ہے۔ لیکن موجودہ سنگسار سے سنگساری کا زہر سے زیادہ موزوں و مریض طریقہ اس کی سمجھ میں نہیں آیا۔ مجبوری و جہنم میں وہ اس گناہ عظیم کی مرتکب ہونے والی تھی لیکن نہانی نظری کمزوری بھائیک اندیشی کی طرح اٹھی اور اس کے عزم کو ہلا ڈالا۔

اس واقعہ کے بعد بقیس کے جنون و وحشت میں کمی ہو گئی۔ اس کی آنکھیں موتی پر نہ نکلیں اس کی زندگی بیکار و ناامیدی میں بسر ہونے لگی۔ مذہب اس کی مدد نہیں کرتا تھا قدرت اس کا اعتماد کھو رہی تھی اس کو اپنا انجام غیر یقینی اور زیادہ بھیاںک نظر آنے لگا۔

جعفری سوچ رہا تھا کہ اس نے بقیس کا غلط اندازہ لگا یا مفت میں درد سری لے لی احوالی جیسی شیریں

شکست دیدی۔ کمرہ میں بالکل سکوت تھا۔ ناصر کے جانے کے بعد بھی یہ سکوت قائم رہا۔ جعفری اور بقیس اس وقت ایک ہی پبلنگ پر تھے۔ دونوں مختلف فنسب ڈس میں گھوم رہے تھے۔ جعفری نے سکوت توڑا۔

جعفری: "میں آپ کو خط لکھنے والا تھا۔"

بقیس: "میں بغیر بلائے انکئی فرمائیے۔"

جعفری رہے کہیں سے ہوا۔ "میں آپ کو بلانا نہیں چاہتا تھا۔ میں تصدیق کر چکا ہوں کہ آپ کو مذہب کے قید و بند سے آزاد کر دوں۔ یہ میرا اعتراف شکست ہے۔ انتقام کا رخ پھٹ گیا۔"

بقیس نے جعفری کے ہاتھ پر ہاتھ رکھنے کی کوشش کی مگر صرف آنکھیں جھپکیں۔ جعفری بقیس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالی کچھ دیکھنا چاہا۔

"بقیس سرگوشیاں انداز میں بولی ہیں آپ کی قید کو آزادی پر ترجیح دیتی ہوں۔ اعتراف شکست بے عمل ہے بقیس نے نظر سنبھلی کر کہیں۔

جعفری کی ہجرت میں اشارے..... قربانی..... اس کی ضرورت تیار نہ تھی برواشت کر سکتا..... میں ان آنکھوں میں ندامت دیکھنا چاہتا ہوں۔

بقیس کجاہت سے بولی تو بچے ان آنکھوں میں سوئے ندامت و انفعال کے اور کچھ نہیں جعفری نے زبان لپکا وہ آنکھوں میں اٹھارنا دیکھا۔

جعفری: "میں یہ کیا دیکھ رہا ہوں۔ کیا یہ حقیقت ہے یا خوش گوار خواب۔"

بقیس بولی: "اب میں جاگ گئی۔"

جعفری بقیس کو غور سے دیکھ کر بولا: "آپ بدل گیا گی مجھے اس کی کوئی امید نہ تھی مگر وہی کائنات کے باقیہ دل کا کام ہے۔ بقیس بیدار ہوا۔ لیکن وہ اس فضا کو جلد از جلد مٹا کر لینا چاہتی تھی بولی: "یہ سب میرا مقصود تھا۔"

جعفری کے وجود کی ضرورت ہے۔ کیا تو اس سے کسی مسئلہ پر روشنی ڈالنا چاہتی ہے۔ جعفری چونکہ کہہ رہے تھے کیا وہ صبح ہے۔ اس کے پیچھے زاویہ نگاہ کی، طوفانی واقعات کے پر زور ہچکولوں نے خبریں ڈھیلی کر دیں جعفری کی صحت کی اطلاع نے اسے اور بھی بالواس کروا دیا۔

خیالات نے کروٹ لی۔ نئی روشنی کا نفاذ نہیں اس نے موجودہ حالات کا جائزہ لیا۔ پہلے واقعات کی رو کے اثر میں وہ جعفری کے ساتھ دو اٹھانا چاہتی تھی لیکن اس کے والدین نے اسے روکا۔ اب جبکہ جعفری اچھا ہو گیا تھا۔ بقیس دو اٹھانا چاہتی تھی اور یہ وہ سچ رہی تھی کہ جب ضرورت تھی میں نہیں تھی آپ کیا منہ لے کر جاؤں وہ غور ہی آجائیں گے۔

کچھ دنوں بعد بقیس کو اطلاع ملی کہ جعفری دو اٹھا سے اپنے گھر چلا گیا۔ اس کوئی تکلیف ہوئی وہ اس کا انتظار کر رہی تھی۔ بولنے کا انہیں نہیں۔ خود اٹھا سے اجازت نہیں دی۔ جعفری کی طرف سے بالکل سکوت تھا۔ ان اپنا محبوب کر رہے تھے چند دن اس نے انتظار کیا۔ آخر پہلی گئی۔

جب بقیس کمرہ میں داخل ہوئی تو دیکھا ناصر کرسی پر بیٹھا ہوا ہے۔ جعفری پبلنگ پر دراز ہے۔ ایک گوشہ و خون کا تھوڑا سا مجسمہ و سراپا دست و استخوان کا مکمل ڈھانچہ بقیس نے دونوں کو غور سے دیکھا ناصر پوچھا: "آپ کیسے ناصر (جعفری کو بتا کر) آپ کی طاعت کی خبر لے رہی تھی فوراً اومڑ گیا۔" نشریات لائیے۔ "اب کرسی ناصر کے قریب رکھی ہوئی تھی۔ بقیس کرسی کی طرف بڑھی۔ مگر وہ جعفری کے پانچ پبلنگ پر بیٹھی تھی۔ گویا مذہب کی معین کردہ جگہ اسے مغرب ہو گئی۔ اس کے قمران قلب نے کیوں ہی کی راہ میز کر لی۔

قدرت کے کھلنا بیٹھنے کا کس میں حوصلہ نہیں رہا۔ جعفری نے بقیس کے پبلنگ پر بیٹھنے پر نہ کوئی اعتنا کیا اور نہ اس کی جگہ کے انتخاب پر غور کیا۔ اس کے خوفناک عزائم اور ہولناک استقلال نے جعفری کے ارادوں کو

جعفری: خدا کا شکر ہے
 بقیس: تفصیلات میں نہ جائے میں جان گئی آپ
 غیر معمولی انسان ہیں مضبوط و محکم کامل نمونہ۔
 جعفری: شکر ہے۔
 بقیس: حیرت سے کہہ رہیوں؟

جعفری: یہ میں آپ کا دل جیتا، چاہتا تھا.....
 جو آسان نہ تھا۔ میں نے دل جیت لیا۔
 سچا بقیس اس خیال میں گم ہو گئی۔
 ابو الظمحون اللہ

غزل

پیغام دے رہی تھی فنا کا بھانجے
 وہ آگے تو ہو گئی حاصل شفا بھانجے
 کچھ کہہ گئی ہے کان میں جسے بھانجے
 بجھتے تیرے جب سے کیا آشنا بھانجے
 آباد دل کیا میرا احسان ہے تیرا
 زلف سیاہ یار ہے یا مارا تین
 دن رات ہجر میں تیرا تمکین میں اشک

آخر بقا کی دھن نے کیا ہے فنا بھانجے
 حیران ہو کے دیکھ رہی ہے بھلا بھانجے
 آنے لگی ہے گہمت گل سے حیا بھانجے
 میر کہو سے آتی ہے بوئے فنا بھانجے
 رہ رہ کے یاد آتی ہے تیری بھانجے
 جینے کہیں نہ دیگی یہ کالی بھانجے
 کب چین لینے دیگی یہ آہ و بکا بھانجے

غیروں کی بیوفائی کا معنی ہے کیا گلہ

خود میری جان دے گئی آخر دعا بھانجے

سید غوث الدین سی

ڈرامہ گلزارِ نسیم

(نثری صورتیائیکہ مد نظر)

[سرور ہوا میں پرندوں کی چمک آتش لاکرنا]

تاج الملوک! شہزادے! دیکھ لیا باب کی شفقت! ہاں کا پیار، بھائیوں کی محبت۔ اب مجھے آگے بڑھنا ہے اپنی دنیا آپ بنا رہی ہے۔ اپنے پر اعتماد کرنا سیکھ۔ یہ کیسا عجیبی عجیبی عالم ہے۔ (چتر پھینکی آواز) سپاہی۔ (اپنے ساتھی سے) اڑی کہ شہزادوں کا پتہ نہیں چلا جائے کہاں غائب ہو گئے۔

دوسرا سپاہی۔ چلو! اب ڈھونڈنا فضول ہے۔ شام بھی ہو چکی۔

تاج الملوک۔ کس کی تلاش ہے۔

سپاہی۔ تم نے ہمارے شہزادوں کو دیکھا ہے۔

تاج الملوک۔ شہزادے! مطلب۔

سپاہی۔ کئی دن سے لا پتہ ہیں۔

تاج الملوک۔ کہاں کے شہزادے ہیں۔

سپاہی۔ شہنشاہِ زمین الملوک کے فرزندِ رحمت ہیں۔

تاج الملوک۔ شہنشاہِ تاج الملوک کے فرزند!

دوسرا سپاہی۔ ہاں! گل بگائی کی تلاش میں تھے ہیں۔

(مدھانہ کھٹکھٹانے کی آواز)

بیوا۔ کون۔

تاج الملوک۔ میں۔ شہزادہ تاج الملوک۔

بیوا۔ (خوشی کے لہجے میں) تشریف لائیے۔ فرمائیے

کیسے زحمت کی۔

تاج الملوک۔ آپ کی بڑی تعریف سن رہی ہے، سنا ہے کہ شطرنج میں

کمال حاصل ہے۔

بیوا۔ (اکثر کے لہجے میں) اذہر نوازی ہے۔ غماز خواہ کے

لوگوں نے شہزادہ کو رکھا ہے۔

تاج الملوک۔ تو ایک بازی ہو جائے۔

بیوا۔ خوب۔

دنگل سنا۔ دوسرے خوفناک آوازیں سنائی دیتی ہیں۔

(اے ویوینج رہے ہوں)

تاج الملوک۔ آفت میں کس خوفناک جنگل میں پہنچ گیا۔ انھا

اب تو ہی بچا (دوسرے آوازوں کی گھنٹیوں کی آواز

سنائی دیتی ہے)

دیو۔ (خوفناک آوازیں) اہ۔ آج میں کیا بیکار ہوا ہوں۔

ادھر آدم زاد لاہراؤ نشت۔ پہلے کس کو ڈالنا ہوتا۔

پہلے اونٹ کو چٹ کر لیں! بعد میں حضرت آدم کی

خبر لیں۔ تم بہتہ۔

تاج الملوک۔ اودھ لادہ ہی میری زندگی کا محافظ ہے، مجھے

بچا۔ اونٹ۔ دیکھیں اس میں کیا ہے۔ نیٹا!

دیو۔ (قریب آکر) کیوں ہاں سا خبر دے۔

تاج الملوک۔ آواز بجاتا ہوں بچا جان۔

دیو۔ اپنے بچا کے لئے کیا رکھا ہے۔

تاج الملوک۔ ایسی چیز ہے جس آپ یاد ہی کرتے رہے گا۔

فراموشی کی چیز ہے۔

دیو۔ (خوشی کے لہجے میں) بڑی فرسکی ہے۔ آج ہم

تم سے بہت خوش ہیں۔ اٹھ کیا مانگتا ہے۔

تاج الملوک۔ بچا۔ لیکن آپ وہ چیز ہمیں دے سکتے۔

دیو۔ (غصہ سے) ہم ضرور دیں گے۔ دانگ۔

تاج الملوک۔ بچا دل میں ایک ہی آرزو ہے۔

دیو۔ وہ کیا۔

تاج الملوک۔ باغِ ادم کی سیر۔

دیو۔ باغِ ادم کی سیر! یہ سودا کب سے پیدا ہوا۔ جانتا

ہے وہ کس کا باغ ہے۔

تاج الملوک۔ جی ہاں۔ آپ کی مدد و کار ہے۔

دیو۔ افسوس۔ خیر ہم اپنا وعدہ پورا کریں گے۔ (تالی

بجاتا ہے)

دوسرا دیو۔ حضور

دیو۔ اسے حلال دیوی کے ہاں لے جاؤ اور یہ رقمہ دے۔

دوسرا دیو بہت خوب۔

جائزہ دیوئی۔ (محمودہ کو آواز دیتی ہے) محمودہ، محمودہ۔

محمودہ۔ جی۔

تھالہ دیوئی۔ خوش ہو جا۔ تیرا ہم نہیں آگیا۔

محمودہ۔ سچ۔

تاج الملوک۔ (عالمہ خیال میں) اُف کیسی سرد ہو اُمیں میں مل گئی محمودہ۔ (مشتاقانہ لہجہ میں) ایسی ہی ہوا سے گلاب ٹھنسی ہیں۔ پھول بجتے ہیں جس کی خوشبو سے سارا چین تھکسا شستا ہے۔

تاج الملوک۔ اور میں کے دل کا چین ہی اڑا گیا ہو۔ کاش میرے دل کا نعل بھی کھل جاتا۔

محمودہ۔ کنول! کیسی باتیں کرتے ہیں۔ آپ اتنے اداس کیوں ہیں۔ فرمائیے کیا میں آپ کی کوئی خدمت کر سکتی ہوں۔

تاج الملوک۔ خدمت! — قہقہہ۔ مدد کی بھی ایک ہی کچی محمودہ۔ آپ کی باتوں سے مجھے تو پھول ہوتی ہے۔

[گھڑا راہم] ہواؤں کے تیر جھونکے گلے اڑتے ہوئے فوارے۔ درختوں کی ڈالوں کو پٹانے کی آواز۔ ڈالی سے پھول توڑنے کی آواز۔

تاج الملوک۔ (خوشی کے لہجہ میں) اہ۔ میں کتنا خوش ہوں اے نورانی دنیا! تیری ہر چیز کتنی حسین ہے۔ جس پھول کی خواہش مجھے تیری نورانی سرزمین میں ملانی نہیں

نے وہ پھل حاصل کر لیا۔ میں نے ایسا محسوس کیا کہ جیسے میں بندوبست مرا ڈا جا رہا ہوں۔

کیا یہ تم ہو۔ اے حسن کی نگہ و لہذا۔ تم ہی دکھاؤ گی جو جن کی نوعیت شاکر اکتفا۔ کاش مجھیں

آپنی بہت ہوتی کہ اس فتنہ خستہ کو بیدار کرتا۔ دھکی کے کسی جھنڈ میں نہر کے کنارے چربائی کے پھل

فرش پر ایک دوسرے کے مل کی دھڑکیں سننے زندگی گزار دیتے۔ جانتے تم عالم خواب میں کن حسین خیالوں

کی دنیا میں یہ کر دی ہونگی۔ اور میں یہاں کھڑا ہوا ہے قریب حسن کی سرکار با ہوں۔ سچ تم اسوگی تمہیں اس کا بھی علم نہ ہو گا کہ رات کسی نے تمہیں اس حال میں رکھا۔ کہ اگر تم خود بھی اپنے آپ کو دیکھتیں تو حرام میں۔

دُن۔ (ایک! جانے سے پہلے تم تمہیں اپنی ایک نشانی دیتے جاتے ہیں۔ تاکہ ہماری یاد تمہاری زندگی میں بائے۔

[زین الملوک کے رانکے پائے تخت کو دایں ہوتے ہیں] ایک بھائی۔ داد رے مقتدر۔

کس جھل سے پھر جاتے ہیں گھر کیا رنگ زمانے نے دکھائے

محل لینے گئے تھے، داغ لائے کس معرے پر آگے جا میں

کیونکر بے پھول مسرہ دکھائیں اور پھول لہجہ میں

ایک بھائی۔ کمال کو بے وقوف ٹھہرائیں کیا پھول ہے کہ اخر ہے اس میں

ہو جاتی ہیں روشن اندھی آنکھیں فقیر۔ (دبسی آواز میں) صاحبزادے۔ یہ پھول وہ نہیں ہے

جس سے آنکھیں روشن ہو جاتی ہیں۔ وہ گل بگاڑ لی ہے۔

دوسرا بھائی۔ گل ہے کہ علاج نور ہے یہ گل ہے کہ چراغ طور ہے یہ

تاج الملوک۔ بکوفت میں۔ ہاتے اگر اس درخت کی چھانوں پر رکھتے ہیں تو زمین پر پاؤ

ڈینگ آپ کی سب فضول ہے یہ ہو وہ گل یہ پھل وہ پھول تو

دھنل ٹھڑا دے۔ خوب۔ ہاں۔ ہاں وہ پھول ہی ہے۔ ایک بھائی۔ چھین لو۔ دوسرا بھائی۔ کرلو، جانتے نہ پائے۔

ن

ساج الملوک۔ اس طرح حکمرانے ہوئے تھیں شرم نہیں آتی۔

چھوڑ دو۔ (لالی کی آواز)

کو قوال۔ (بکاؤلی) جہاں پناہ اس پائے تخت ابدت میں ایک بے مثل عمل تیار ہوا ہے۔

بادشاہ۔ بے مثل کیا بیک رہا ہے۔

کو قوال۔ اناٹا۔ سچ کہہ رہا ہوں ہر مذہبے حساب خیرت تقسیم ہوئی ہے۔

بادشاہ۔ (زین الملوک) چھوٹا ایسا کبھی نہیں ہو سکتا ہوا کی براہی کوئی بھی نہیں کر سکتا۔

وزیر۔ (شیریں سنوائی آواز میں) حضور ہو سکتا ہے بہتر ہے کہ پل کر دیکھ لیں حقیقت کا نکتانہ ہوا

بادشاہ۔ غیب۔

ساج الملوک۔ حضور نے غریب عاتق پر قدم بخود رکھ کر رونق بخشی۔

زین الملوک۔ ہم نے تمہاری داد و دہش کی بڑی تعریف سن کر ساج الملوک۔ تمہارا نوازی ہے حضور نے کئی فرزند ماجن بنائے۔

زین الملوک۔

یہ چار حاضر ملاقات

ایک اور ہوا تھا قابل خشم

وہ نور بصر تھا دشمن خشم

جب لائے یہ گل بکاؤلی کا

نملا تب خار رو شستی کا

ساج الملوک۔ حضور! آخواب وہ کہاں ہے کیا حضور نے کبھی اس کی خبر لی۔

زین الملوک۔ ہمیں کوئی خبر نہیں، کہاں ہے کہاں ہے۔

ساج الملوک۔ کیا کوئی اس شہزادے کو جانتا ہے۔

ایک آدمی۔ حضور! یہ وہی ساج الملوک ہے، جن کو حضرت ہرودہ شہ نے اپنی نظروں سے گرا دیا تھا۔

زین الملوک۔ میرے بیٹے۔

ساج الملوک۔ حضور! ہا

زین الملوک۔ میرے بیٹے! اٹھو، اپنا سراٹھاؤ مجھے شرمندہ نہ کرو۔

ساج الملوک۔ حضور! آپ سے اور بھی زیادہ حاصل کرنا چاہتے ہیں۔

زین الملوک۔ اجازت ہے۔ تخلیہ۔

ساج الملوک۔ دلبر۔ محمودہ۔

دلبر۔ حضور جان کی اہل پاؤں تو کچھ عرض کروں۔

زین الملوک۔ اجازت ہے۔

دلبر۔ حضور! ان شہزادوں نے آپ کو دھوکا دیا۔ پائے تخت سے

غل کر کے یہی قید میں گرفتار ہوئے۔ شہزادے ساج الملوک نے حکم فیض برداشت کر کے گل بکاؤلی کو حاصل کیا اور

پائے تخت روانہ ہوئے۔ راست میں ان شہزادوں نے پھیل کر چھین لیا اور آپ کے ہاں سرخرو ہوئے۔

زین الملوک۔ بیٹا۔

ساج الملوک۔ حضور! ہا

زین الملوک۔ بیٹا تم نے مجھے اپنی کھوئی ہوئی روشنی دلائی، اب انجی اہل سے لو جو تمہاری یادیں کل رہی ہے۔

ساج الملوک۔ حضور! ہا

ساج الملوک۔ بکاؤلی

بکاؤلی۔ (شیریں سنوائی پوچھ میں) کیوں جی تمہیں لے گئے تھے رگ کیا کہتی تھیں اور ہر تو دیکھو

مری طوت اک نظر تو دیکھو

سہے یا نہیں یہ خط تمہاری

فرائے کیا سزا تمہاری

ساج الملوک۔ (خوشی کے لمحوں میں) ارنہا ہے جو خوشی ہو

عاشق کی سزا پوچھتی ہو

مٹھیں زلفوں سے مٹھیں کسوٹ

کائے ناکھل سے چھو کو ڈسواؤ

تو اسے جو قتل ہو منظور

اب رو کے اشارے سے کر دو چور

زندان میں جو زندہ سمیٹ ہو

اپنے دل تنگ میں جگہ دو

بکاؤلی۔ (شیریں پوچھ میں)

مجھیں تو بس فقط جن کا ڈھوم ہے سارے تن بدلی

رخ دیکھ چکی ہوں اب ترا میں
منہ دوسرے کو دکھاؤں کیا میں
(بکاؤلی کی سہیلیاں بکاؤلی کو بچھانے لگی ہیں)
ایک سہیلی۔ ثنات افرخہ ستارے کا ہے
اس چاند کو گھبرا گھبرا رہا ہے
رحم اپنی جوانی پر دھرا رہا ہے
منہ دیکھ تو آگینے منہ گرا رہا ہے
دوسری سہیلی۔ صورت تیری زار ہو چکی ہے
کل ہو کے تو خسار ہو چکی ہے
چہ ہے تیری عقل کس نے کوئی
ناجنس کو چاہتا ہے کوئی
بکاؤلی۔ رجور جو ہوں تو میں نہیں کیا
مجبور جو ہوں تو نہیں نہیں کیا
نامری حالت اب رومی ہے
بہتر ہے دہی جو کچھ بری ہے
بل اسی شگ کل کی ہوں میں
تم کیا ہو ہزار میں کہوں میں
یہاں عیش لا دوا ہے
اس باغ کی اور ہی دوا ہے
سہیلیاں ہنسی ہیں۔ ایک تان دیتی ہے۔
اب تو عشق سر پر چڑھا کر بھل رہا ہے۔ قہقہہ۔
بکاؤلی۔ روح افزا غیر تو ہے۔
روح افزا۔ بھل میٹھا کی گھڑاؤ گی۔
بکاؤلی۔ کس خوشی میں۔
روح افزا۔ بڑی مزے کی بات ہے۔
بکاؤلی۔ بتا تو۔
روح افزا۔ جی جان نے مان لیا۔
بکاؤلی۔ مان لیا۔ کیا مان لیا۔
روح افزا۔ تیرا بیاد۔
بکاؤلی۔ تیرا بیاد کیا ایک ہی ہے۔

روح افزا۔ تیرا بیاد بشر کے ساتھ۔
بکاؤلی۔ سچ۔ اہم اب میں کتنی خوش ہوں۔
ساج الملوک ہنسا ہوا کہ میں دہل ہوتا ہے۔
بکاؤلی پوچھتی ہے۔
ساج الملوک۔ (ہنسی)
بکاؤلی۔ خیر تو ہے۔
ساج الملوک۔ (ہنسی)
بکاؤلی۔ سبب۔ دیوانے تو نہیں ہو گئے۔
کونئی بے سبب نہیں ہنسا
ساج الملوک۔ خواب دیکھتا تھا۔ آتش پر کباب دیکھتا تھا
بکاؤلی۔ ہم تباہیں تھیر۔ دل سوزی کہے گا کوئی دیگر
ساج الملوک۔ سات کو آتش میں۔ خورشید آتش شعلہ میں
بکاؤلی۔ ہرے شبنم روز۔ عالم میں ہو گئے رونق افزوں
ساج الملوک۔ اگر مقام ہو گا۔ گھڑا اقلیل رہ رہ رہتا
بکاؤلی۔ بشر ہو تم ولاد۔ سر بر ہو تم قوم آتش پر
ساج الملوک۔ کتنی آگ شعلہ۔ شعلہ ہو آگن میں رقصاں
بکاؤلی۔ وہ شعلہ میں پر رہی ہے۔ جواں جواں ناچتی ہوں
ساج الملوک۔ جب ہوا ہالا۔ بخشاہہ آگن نے ہالا
بکاؤلی۔ ہالاہہ آگن کا کیا تھا۔ وہ ہار تھا جو گلہ پڑا تھا
پہلی یہ کیا۔
ساج الملوک۔ ہار تو تھا (ہنسنے لگتا ہے) کیوں جی یہ اکیلا کھیلنا
اور اوپر مڑے اڑنا
بکاؤلی۔ (سن اے صلاح دشمن) اب جا کے کل کو خوش نہیں ہو
تو ہے کہ نہ تیرا پراچ بھانے
ساج الملوک۔ میرے جتنے نہاک ڈالو یہ تم نام نہ والے ملے گا تو
یہ نہ ہو گا۔ میں دو قدم آگے ہونگا تھو
(راجہ اندر کا کل گنا بجا۔ گنا گنا کا ناچ۔ راجہ کا دادہ گنا۔)
راجہ اندر۔ ہم بکاؤلی کا گنا سننا چاہتے ہیں۔
بکاؤلی۔ کوئی بھالاتی ہے۔
راجہ اندر۔ کوئی ابھی سی غزل۔

ہوں۔ میں معصیتوں میں گمراہ ہوا تھا۔ اس لئے میں نے رانی سے شادی کر لی۔ چھوڑا دن وہاں ہیات باقوں کو، اور کسی درخت کی پھاڑوں میں بیٹھ کر پیادگی کریں۔

بکاؤلی آپ علیے میں ابھی آئی۔ بابا کو روٹی دیکر آئی۔ آپ میرا انتظار کیجئے۔ وہ ہتھان: (حصہ سے) یہ بات ہے، کیوں جوانی زور کر کے بکاؤلی۔ بابا۔

وہ ہتھان۔ مکار، دور ہو۔ بکاؤلی۔ بابا یہ میرے شوہر ہیں۔ وہ ہتھان: (حقارت سے) شوہرا تبتا ہوں، تو سمجھتی ہے، کیا تو ایسے ہی باہی جائے گی۔ تجھے تو سونے میں لوگوں کی کیوں ہی تجھے کھلا پا کر بڑا کیا ہے۔

بکاؤلی۔ (حصہ سے) بابا۔ آپ دولت مانجھتے ہیں۔ آئیے میں آپ کو دولت دیجی ہوں، اس شرط سے میں دیکھیے۔ اٹھائیے آپ جتنی دولت لے سکتے ہیں لے جائیے۔ میرا منہ کیا دیکھتے ہیں۔

وہ ہتھان۔ (خوشی کے لہجہ میں) دولت! بکاؤلی۔ آپ کو دولت سے محبت ہے نا۔

وہ ہتھان۔ میری بیٹی! بکاؤلی۔ بابا یہ میرے شوہر ہیں۔ آج سے بارہ سال پہلے ان میری شادی ہوئی تھی، راجہ اندر کی بیٹا سے میں بہتر کی موت میں تبدیل ہوئی۔ اب معصیت کے دن ختم ہو گئے۔ اب میں آپ سے جوا ہوتی ہوں۔

سلاج الملوک۔ بکاؤلی نے مجھے زندگی بخشی، آؤ میں، ایک ایسی دنیا میں جہاں محبت کی چھاؤں ہو، جہاں یہ دل دکھانے والی باتیں نہ ہوں، بس تم ہوا ہمدردیوں کے چھو، آؤ تار کا ترنم ایک ایسی ہی سرزمین میں۔ اپنی زندگی گزار دیں۔

سید محی الدین احمد

بکاؤلی۔ ستارہ ساجی کی گت پر غزل شروع کرتی ہے۔

ساقی قدح شراب دے دے دے

مہتاب میں آفتاب دیدے

ساقی باقی جو کچھ ہو لے لے

باقی ساقی شراب دیدے

اس بت سے نہیں سوال کچھ۔ اور

اسنے منہ سے جواب دیدے

یلتی میں نے تجھے بنایا۔

مجنون مجھ کو خطاب دیدے

اس گل سے بکاؤلی زرنہ مانگ

جو چاہے وہ بھیجا ب دیدے

راجہ اندر۔ واہ واہ، کمال کر دیا۔ مانگ، کیا مانگتی ہے۔

بکاؤلی۔ حضور۔

راجہ اندر۔ مانگ۔

بکاؤلی۔ حضور۔ تاج الملوک!

راجہ اندر۔ تاج الملوک۔ بے شرم ہے جیسا۔ یہ جمال لکھاؤ

اس کو میری نظروں سے دور کر دو، دور پھینک دو۔

بکاؤلی۔ جہا راج!

راجہ اندر۔ ہاں برس تک تو پتھر کی مورت بن جا۔

بکاؤلی۔ جہا راج!

(ہنسی جوتنے کی آواز۔ وہ ہتھان کا بیلوں کو دکھاتا)

سلاج الملوک۔ بکاؤلی۔ بکاؤلی! بکاؤلی!

بکاؤلی۔ کون۔ آپ۔ شہزادے۔ یہاں کیسے

سلاج الملوک۔ بکاؤلی۔ تاجاؤ تم ہی بکاؤلی ہو۔ کیا میں شراب تو

نہیں دیکھ رہا ہوں، تم کو پا کر کچھ کتنی خوشی ہوئی۔

بکاؤلی۔ کہوں بھوت لیتے ہو شہزادے۔ میں جانتی ہوں

اس لئے تو آپ نے رانی سے شادی کی۔

سلاج الملوک۔ مجھو دی۔

بکاؤلی۔ مجھو دی!۔ خوب۔

سلاج الملوک۔ بکاؤلی۔ زخموں پر نمک نہ چھو، میں شرمندہ

غزل

خوشبو کا کارواں ادھر آیا ادھر گیا طوفان بہار کا جواٹھا تھا گزر گیا
 ابرسیاہ میکدہ پر سے گزر گیا دیوانہ دل کو اور بھی دیوانہ کر گیا
 جب سے مذاقِ دیرِ طلوعِ سحر گیا بندہ نواز آپ کا ذوقِ نظر گیا
 بجلی سے بات چیتِ نشیمن کے دم سے تھی کاشانہ جل گیا تو وہ نشہ اتر گیا
 گزرا ہے کون رکھ کر منکر سے کآج دامنِ تصورات کا جلوں سے بھر گیا
 تدبیر اک بہانہ تھی، تقدیر اک خیال تو نے جسے سنوار دیا وہ سنو گیا
 لالہ بھی دل میں داغِ غمِ زندگی لئے چندے غماؤ اہل جہاں میں بھر گیا
 اب دل ہے اور جذب کی کیفیتِ لطیف وہ اشتیاقِ سجدہ ہر سنگِ در گیا
 رندوں کو میکدہ کی روایا سنو پھر ساتی شراب پی کے نہ جانے کدھر گیا
 بکھرے پڑے ہیں پھول کسی کے مزار پر یہ کون صبحِ صبح غریبوں کے گھر گیا
 آنسو میں عکسِ ریز ہے کس کی ضیائے کس کی جھلک سے روپ گہرا کدھر گیا
 طوفان اٹھا اٹھا کے حادثہ گزر گئے اپنی ہی راہ میرا دل بے خبر گیا

ساغر نہیں، شراب نہیں، میکدہ نہیں

فطرت کسی کا عہدِ جوانی گزر گیا
 عبدالعزیز فطرت

آرٹ میں حسن کار کی شخصیت کا عکس

یہ جانتا خالی از دہی نہ ہوگا کہ ہر معمول کی شیبہ کی تصویر حسن کار کے لطافت و ذوق اور نزاکت خیال کی آئینہ دار ہوتی ہے۔ اسی آئینہ کے گماندہ مصور کی شستہ ذاتی اور دقیقہ اس ذہانت کا عکس نظر آتا ہے۔ چنانچہ عام طور پر یہ دیکھا جاتا ہے کہ کردار نگاری کی پیشکش میں مصور کے فطرت اور ناہمواریوں کو بغور دیکھنے سے مصور کا باطنی بھرا پن اور فطرت کی انہماکی ظاہر ہونے لگتی ہیں۔ اسی لئے کہتے ہیں کہ دوسرے موضوعات کے مقابلے میں شیبہ کی تصویروں کے اندر حسن کار کی شخصیت زیادہ نمایاں اور عکس ہوتی ہے۔ اکثر دیکھا جاتا ہے کہ بعض قابل استاد فن، کسی شخص کے کردار کی تصویر کو نمایاں کرتے وقت کہیں نہ کہیں اپنی ذاتی خصوصیات کا بھی اضافہ کر جاتے ہیں۔ پوری تصویر کو جب تک خود نہ بناتے تھے اس پر دستخط نہیں کرتے تھے، اسی لئے قدم استاد کی تصویروں پر شاعر ہی ان کے دستخط ثبت ہوتے ہیں۔ ان حضرات کا اسطرز عمل اس بات کا بین فحوت ہے کہ بڑا چتر کار (Portrait Painter) ایک دقیقہ رس اور نازک خیال شخصیت کا حامل ہوتا ہے۔ تاریخ سے بھی بے بات ثابت ہوتی ہے۔

(۲) اگر کارا پسند یہ حسن کار روزمرہ واقعات کا قلمی عکاس ہے تو اس صورت میں ہم یہ خود کرنے پر مجبور ہوں گے کہ اس کا نفس روزانہ وقوع زیر ہونے والے جھوٹے عجیبے واقعات سے خوش بھی ہو سکے یا نہیں؟ یا محض ہماری خوشی اور خوشنودی حاصل کرنے کی خواہش سے اس نے ایسی تصویریں بنادی ہیں۔ اگر ایسا حسن کار محض ہیں خوش کرنے کے لئے تصویر کشی کرتا ہے تو حقیقت میں ایک لازمہ پیشہ شاعر سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا، اس لئے کہ جن واقعات کی وہ عکاسی کرتا ہے، ان سے اس کو کوئی ذاتی دلچسپی نہیں ہوتی۔ برعکس اس کے اگر وہ

آرٹ کے متعلق کو طرح کہتا ہے۔ وہی چیزیں دیکھنے میں آتی ہیں۔ قدرت کی پیدائی ہوئی یا انسان کی بنائی ہوئی مادی چیزیں تو حیرت قدرت پیدا کرتی ہے، لیکن عکاسی یا شیبہ بالکل انسانی پیداوار ہوتی ہیں۔ ان دو قول خاصہ مدنی مادی و غیر مادی کے خوش آہنگ اتحاد و امتزاج کو آرٹ کہتے ہیں۔ اس تفریق کے اعتبار سے انسانی خیال اور قدرت کی انسانی و مادی کیفیت کا نام آرٹ ملتا ہے۔ ہوں تو ہر نظر آرٹ میں مرد و نہ بچہ ہی ہوتی ہے جس کے اکثر روزے عام نقاد کو واسطہ نہ رہتا ہے، لیکن اسی عجز پر انسانی اثر کا اضافہ ہوتے ہی یہ جاننا ضروری ہو جاتا ہے کہ انسان نے قدرت کو کس جذبہ کی میناک سے دیکھ کر بنا یا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ سطح تصویر پر قدرت معصومہ و لکھلاست ظاہر ہوجاتی ہے جسے ہم دیکھتے ہی فوراً پہچان لیتے ہیں۔ لیکن اس کے بنانے والے صنایع کا اسی میں سراغ لگاتے کے لئے گہری نظر کی ضرورت ہے۔ حسن کار کی شخصیت کا سراغ لگانے میں ذیل کی چند تحقیقات نمودار معاون ثابت ہوں گی۔

(۱) فرض کیجئے کہ ایک حسن کار شیبہ کش مصور یعنی چتر کار ہے۔ اس کی عجیبہ پر نظر پڑتے ہی، ہمیں خود کرنا چاہیے کہ آیا اس نے اپنے معمول کے جسم کی بیرونی سطح کے نشیب و فراز کی نقاشی کی ہے یا کہ اس کی کردار کی خصوصیات کو بھی اجاگر کیا ہے؟ اگر تصویر برس سے ظاہر ہو کہ مصور نے کردار نگاری میں، چمکتا، پس و پیش کیا ہے، لیکن شبابہت بنانے میں کوئی کسر اٹھانہ گئی۔ تو اس صورت کے متعلق ہم یہ رائے قائم کرنے میں محنت بجانب اصل کے مصور نے اپنے معمول کو کسے سے دیوار برنگوں تک پہنچا ہے اور پس۔ اور اگر اس نے کردار نگاری کی کوشش کی ہے تو ہمیں یہ معلوم کرنا پڑے گا کہ اس خصوصیت مند کلی یا جزوی حیثیت سے اسے کس عزمک کامیابی حاصل ہوئی۔

حالیہ زمانے کا کوئی معمولی کرایہ کا لباس زیب تن کئے ہوئے تصور کے لئے رشتہ دے رہا ہو۔ اور تصور ختم ہو جی اپنا اصلی لباس پہن کر ٹھہرا جاتا ہو۔ بلکہ تصور کے پیکر اور دوسری اشکال بھی بالکل اپنے زمانے کی معلوم ہوں۔ زیر غور تصور میں یہ نکات ظاہر نہ ہوں تو وہ تصور بیکار ہو۔ (۴) جو مصور گل کاری کرتا ہو اس کے کام کو اس انداز سے جانچا پڑے گا کہ آیا وہ حقیقی معنی میں حسن کار ہے بھی یا نہیں؟ یا کہ وہ ایک ماہر نباتیات معلوم ہوتا ہے۔ اگر حسن کار ہو گا تو اس کی تصویر کے پھول پتے، عمل ہوئے نباتاتی تفصیلات اور توضیحات سے پاک ہوں گے کیونکہ مصور ادا انداز میں نہانے ہوئے پھولوں کے گلولوں اور گلدستوں میں سازگی، شگفتگی، ہم آہنگی اور جمل کاری کو زبردست اہمیت حاصل ہوتی ہے۔

(۵) جری یا سمندری منظر نگار کی تصویروں کو اسی نقطہ نگاہ سے جانچنا چاہئے جس نگاہ سے خطی کے قدرتی منظر نگار کی تصویروں کو جانچا جاتا ہے۔ دیکھتا چاہئے کہ قدرتی منظر نگار کی طرح، سمندری منظر نگار بھی اپنے بنائے ہوئے منظر سے ای طرح متاثر ہو کر بنایا ہے یا نہیں؟ ورنہ وہی مثل ہوگی کہ تماشائی بھی مثل حضرت مسیح کے ان پر ایمان لائے بغیر پانی پر چلنے نہیں گئے۔ غور سے دیکھو کہ بحر بیکار کی وسعت اور اس کی شان کو مصور نے کس حد تک دوبالا کیا ہے۔ سمندر کے رنگ اور اس کے ٹون میں کس قدر دلچسپی پیدا کی ہے۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ سمندری پھل اور حرکات کو کس دلکش انداز میں ظاہر کیا ہے؟

(۶) اگر کوئی جن کار، منظر نگاری کا مدعی ہو تو اس کا دعویٰ مذکور بالا انجام حسن کاروں سے انفعیل ہے۔ اس صورت میں تناظر کے اس اصول کو یاد رکھئے کہ جو شے منظر اصل موضوع سے جتنی دور رہتا جائے اس کے بغل تماشائی سے جو چیز اصل میں جتنی دور رہتی جاتی ہے ہر دو صورتوں میں اس چیز کی شکل اور نظارے کی باریک

حقیقت میں اپنی ذاتی دلچسپی کے منظر و زمرہ واقعات کا موقع بننا ہے، تو ہم یہ ضرور دیکھیں گے کہ آیا اس نے کل واقعہ کو تمام اسٹاٹسٹک متعلقہ جزئیات غلوں سے مصورانہ انداز میں نظر ڈالتے ہوئے، کسی نہ کسی جگہ اپنی حقیقی فرست (Mood) کا ایک آدھ خوش ضرور ایسا نگاہ یا ہوگا جس سے اس کی حقیقی دلچسپی دلچسپ کا ثبوت ملے۔ ورنہ وہ تماشائی کی خدمت سے بچنے کی خاطر ضروری قسمت کے مطابق کچے بعد و دیگرے گل اشیاء کی تخلیق بنا کر تصور کو اس طرح مکمل کر دے گا کہ اس میں نقاد و تماشائی کو سوائے اشیاء کے ڈھیر کے اور کوئی سامان دل بستگی نہ ملے گا۔ ایسی تصویروں میں ناظر یا تماشائی کو یہ بھی غور سے دیکھنا چاہئے کہ مصور نے اپنے تصویری موضوع یعنی شے، موضوع اور قدرتی اشیاء کی تفصیل اتنا نہ سے ہٹ کر اپنی حدت طاری سے کس حد تک بلند مرتفع بنایا ہے۔ ورنہ اس کی تصویر ایسے عمل کا ثبوت ہے ہوگی جو محض قدرتی اشیاء کی شکل انداز سے ہی کائنات کا کھٹکا کمال سمجھا جاتا ہے۔

(۳) اگر کوئی مصور خود کو محض تاریخی واقعات کی تصویر سازی کا پابند بنا لیا ہو تو اس حسن کار کا اولین فرض ہو گا کہ جن معطیات کی بنا پر وہ اپنی تصویریں بنانا چاہتا تماشائی کو اس امر کا یقین دلائے کہ جو موضوع ہمیشہ کیا جا رہا ہے وہ بالکل حقیقی اور معنی بردار ہے۔ یہ نہ ہو گا کہ اپنی غیر حقیقی تفصیل نگاری کو صحیح مان لینے کے لئے ناظر پر بھڑک دیا جائے۔ یہ بھی جاننا ہو گا کہ جس منظر کو جس حسن کار پیش کر رہا ہے آیا وہ منظر اسے ذہنی القائی ہوا ہے یا کہ محض پائمانہ پیش پا افتادہ موضوع کو پیش کرنے کی توفیق کی ہے جس کو ہر معمولی مصور بھی پیش کر سکتا ہے۔ یاد رہے کہ تاریخی تصویر کی خاموشی تو یہی ہوتی ہے کہ جس زمانہ کی ہندوئی کرتی ہے تماشائی کو کسی نہ کسی کے ماحول میں لاکھڑا کر دیتی ہے۔ تاریخی پیکر اس انداز میں ہر گز نہ پیش کئے جائیں جس طرح

تعب کی بات تو یہ ہے کہ بجایہ بجلی، ہوا، آندھی، باد، باران
جیسی انسان پر قابو رکھنے والی قدرت کی مٹھی طاقیں بھی انسانی
حکمت کا بیج ہو جاتی ہیں۔ پس جن کا بھی ان قوتوں کو اپنے قابو
میں رکھنے ہوئے، صورت انہی مظاہرات اور قدرت کی اعمال
کی رونمائی کرتا جاتا ہے، جس انداز سے یہ قوتیں خاص
خاص حالات کے تحت ظاہر ہوتی ہیں۔۔۔ ان قوتوں
کو اس خوبی سے اپنی تصویر میں عکس دیتا ہے کہ ان کی
موجودگی سے تصویر میں 'متناسع'، 'گوننا گونی' پیدا ہو جاتی
ہے۔ اسی تناسب کی مدد سے، 'ہرمان' طاقتوں کی اضافی
یا تدریجی اہمیت سے واقف ہو جاتے ہیں۔
جو تصویریں ہیں انہی طوط متوجہ کرتی ہیں، وہ ضرور
دو جذبات کو اکٹاتی ہیں۔ ایک کا لعلیں تصویریں موضوع کی
دکھائی سے ہوتا ہے اور دوسرے کا حسن کی تعریف و
ستائش سے۔ بصورتی فن کاری کی نسبت یہ عام خیال ہے کہ
ماہر عمل کے قلم ہوتے ہی (خواہ تصویر ہو یا اور کوئی چیز)
حال حسن کارما کی قوت، غبار اور کمال مہارت کا بھی غائب
ہو جاتا ہے۔ اس لئے تصویر میں شے مصور میں حسن کار
کا زور قلم اور صناعات مہارت، تماشا کی کو اپنی طرف متوجہ
کرنے سے قاصر رہتے ہیں۔ حالانکہ وہ تھا اس کے علاوہ
چتر، مٹی، کاغذ، رنگ یا جو بھی وسائل حسن کاری میں
استعمال ہوتے ہیں، ہر ایک میں کچھ نہ کچھ ایسی فطری
کڑوری ضرورت پائی جاتی ہے، جو مصور کے تصویر کی سطح پر
نہیں کر سکتے۔ لیکن ایک اہر فن حسن کار اپنے عقیدہ وسیلہ
اصول سے انکی خامیوں سے تجلّی واقع ہوئے
کے باوجود اپنی خدا داد قابلیت سے اس میں آرٹ کے زیادہ
سے زیادہ عناصر کو سماتا اور نمایاں کرتا ہے۔ یہی خوبی
اس کی شخصیت یا کمال مہارت ہوتا ہے جسے ستائش
نصیب ہوتی ہے۔ غالباً ایک شاعر کی مثال سے اس اصل
کی وضاحت ہو جائے گی۔ فرض کیجئے کسی شاعر کے دل میں
اپنے جذبات کو ظاہر کرنے کے ارمان ٹوٹ رہے ہوں۔

تفصیلات بتدریج وضند ہی ہونے کے علاوہ خدا میں بھی
کم از کم دکھائی دینے لگتی ہیں۔ دیکھئے کہ منظر نگار نے
اپنی تصویر میں اس اصول کی کہاں تک پابندی کی ہے؟
اس اصول کو سامنے رکھتے ہوئے تصویریں ضرورت کے
مطابق موضوع کی باریک جزئیات یا تفصیلات کو ترک کر دیا
جاتا ہے، تو اسے عمل اختصار یا سہل کہتے ہیں۔ اور
ایسے اختصار کا عمل زیادہ تر انفرادی ذوق اور تجربے
پر منحصر ہوتا ہے۔ اس لئے دیکھنا ہو گا کہ مصور نے کس
حالت کا اپنے انفرادی ذوق کا ثبوت پیش کیا ہے۔ یہ
سچ ہے کہ مصور کا نفس جن اشکال و حقایق کو قدرت
سے انڈر کر لے، بحسب انہیں سطح تصویر پر لوٹا دیتا ہے۔
لیکن منظر نگار تو حقیقت میں اپنے اور قدرت کے موقتی
جذبات (Moods) کو مفسر ہوتا ہے۔
اور اسی موقتی انتخاب کی مدد سے وہ اپنے باطنی تاثرات
یا کیفیات کو دوسروں پر ظاہر کرتا ہے۔ منظری تصویر کو
جاننے وقت یہ دیکھنا پڑے گا کہ یہ مصور کا مقصد یہ تو
ہیں کہ وہ تماشا کی کو کسی ادنیٰ بہار یا شیل پر چڑھا کر وہ
سے دنیا کے پھیلاؤ کو اس انداز سے بتا سکے کہ تماشا کی
پہاڑ سے جہت کر کے پرندے کی طرح ہوا میں دوڑنا
پر فائز ہو، اور گونا گونا جانے اور درمیان میں نہجے
کے لئے نظر کو کوئی سہارا نہ لے۔ یا یہ تصویر میں ایسی
سنگلاخ اور شہوار گزار زمین بنادی ہو جس پر سے
گڑنا تماشا کی کے لئے یعنی نظر کے لئے باعث تکلیف
ثبات ہو۔ ایک حسن کار کی حیثیت سے اس کا فرض ہو کہ
قدرت کے ہر نازک، دلکش اور ترغیر برکت میں تماشا کی
کو بھی اپنا شریک اور ہموا بنائے۔ اگر اس اصول کے
علاوہ وہ ماہور ماہر پر موقتی موقتی بے وضعتی، کثرت
اور کھردری پٹروں سے ایک روک مائل کر دے گا تو
واقعی البتہ کار اپنی نا اہلی کے ساتھ باطنی بردوقی اور
خامی کا ثبوت بھی دے گا۔

اگر وہ شہر دشمن کے وسیع تر حدود سے فائدہ اٹھا کر نکل کے گا تو
ذو سانس ہرگز نصیب نہ ہوگی، جو مسکن یا رہائی جیسے تنگ
حدود میں رہتے ہوئے اپنی بیخ و بن کے جوہر دکھانے پر آمادہ
اور اسکی حدود و اثر سے میں رہنے کی وجہ سے اس کی نصبت
کے جوہر بھی زیادہ نمایاں ہوں گے۔ حسن کار کی بھی یہی
حالت ہوتی ہے، جو اپنے عقیدہ و سبب کے حدود میں کام
کر کے تائید و توثیق حاصل کرتا ہے۔

شخصیت ہی کے مخصوص فوٹو گرافی کو بھی حسن کار
کے سانچے میں ڈال دیا ہے۔ جیسے سی۔ وان ڈائک کہتا
ہے، غور کرنے پر معلوم ہو گا کہ تصویر بعض سوارِ حیات
یا سرگزشت واقعات سے زیادہ کوئی وقت نہیں
رکھتی، حقیقت یہ ہے کہ ہمارے استعجاب و استحسان کو
اکسے والے واقعات نہیں ہوتے بلکہ انسان مضمون
ہوتا ہے۔ جب تک ہم تصویر میں کسی انسانی کارگزاری اور
اس کی خدا داد ذہانت، حسن و جمالت کو محسوس
نہ کریں گے، اس وقت تک تصویر ہمارے لئے محض چند واقعات
کا مجموعہ ہی رہے گی اور بس۔ حقیقت میں کام نہیں کام
کا کرنے والا رہا ہے نہیں، سانچے کا ڈھانچہ اور بنائے والا۔
تنگ نہیں رنگ کا رنگنے والا، مصور اپنی ہمارے خوابیدہ

تخیل کو بیدار کر کے خراجِ تحسین حاصل کرتا ہے۔
جو شخص بھی میکانی یا بیجیو کے بنائے ہوئے مجسموں یا
تصویروں کو دیکھے گا یہی بات محسوس کرے گا۔ اسی طرح خوش
ہار، عمرات، رویشیں، مان ڈائک، ویٹاکس کوئٹرا،
سی پیرا، گویا، واکو، ٹے نیا، ٹے، ٹرایان، روسو، ریکو،
ٹرو، کانسٹیبل، نیس برو، فلڈے، ہائی، وہسلر،
سولے، رومان، برنارڈ، این ٹیس، والی، یانٹا اور بلرچ
کے شاہکار اہل کو غور سے دیکھیں تو ان میں اتنا استعداد
شخصیتیں بخوبی محسوس ہو جائیں گی۔

یاد رکھنے کی بات ہے کہ جس طرح ذہبِ سلطنت کا علم
انہیں، ویسے ہی آرٹ کی سلطنت کا علم نہیں ہے۔ حقیقی معنی
میں آرٹ رومانیت پر مبنی ہوتا ہے۔ ہر تصویر میں حسن کار کی
مدح کو تلاش کرنا چاہئے۔ اس لئے آرٹ میں انسان یعنی
مصور کی شخصیت کا پتہ لگانا وادد دیکھ کر وہ کون ہے اور کیلہ ہے۔

امجد علی

(ترجمہ)

سرگزشت غالب :- اردو اور فارسی کے مشہور شاعر و ادیب مرزا اسد اللہ خاں غالب کی زیات، کا: ناموں اور اعزہ
واحباب کا ایک عمل تذکرہ ہے جس کو ڈاکٹر حبیبی اللہ صاحب قادی زور ایم اے۔ بی۔ ایچ۔ ڈی۔ (لندن) نے نہایت تحقیق اور
محنت سے مرتب کیا ہے۔ طلبہ اور ادب کا مطالعہ کرنے والوں کے لئے یہ عمدہ ہے۔ کتاب کی تصویر اور غنائی نتیجے بھی
شائع کئے گئے ہیں۔ بیچوٹی سی کتاب سالہا سال کی تصنیفات اور غالب کی تصنیفات اور ان کے متعلق جو کچھ اردو ادب تک شائع
ہوا ہے اس کے تنقیدی مطالعہ کا پورا ہے۔

ڈی۔ ایس۔ صفحہ ۶۳۱ کتابت و طباعت و کافتہ اعلیٰ قیمت مر

ملنے کا پتہ۔ سبکس کتاب گھر حیدر آباد حیدر آباد

زلزلے

اسی قدیم کھان بہاڑی بریں اور معراج کے لئے تھے جو تاریخ میں ایک ممتاز دور سمجھے جاتے ہیں۔ جب تک میر تقی میر کیانی میں رہا ہر روز شام کو کسی دوسری پہلے میں اپنے لازم معراج کو سہ لئے پہاڑ آجاتا۔ کبھی ساتھ وہاں کے چند بوڑھے بھی جوتے جن سے کیانی کے متعلق سیکھ لیں معلومات حاصل ہوتی تھیں۔ اسی دوسری میں کھنوں کو جگہ لیکن چھٹی جگہ آئے کون چاہتا تھا ایک شام ہم وہاں پہنچے وہاں کوئی نہ تھا خدا جانے کت کیا تھی عیناً چھٹی کو لوٹ وہاں آئے سے جگہ تھے۔ اس روز معراج نے بھی شکار کے بہانے میری بندہ وقی اٹھائی تھی غیر قصہ مختصر ہم وہاں پہنچے، غمگینی و ہرجاڑیوں میں ادھر ادھر سے مارے چھوڑے، دو تین دفعہ بندہ وقی چلائے کی بجائے تھوڑی خاص اہلقت نہ آیا۔ جھاڑیوں میں سے گل کریم اچھی لاتی جاگڑا بیٹھے، جیسے ہوسے کچھ غمگینی و درمیانی نہ ہوئی تھی کہ معراج نے اپنی بے چینی کا اظہار کیا اور پھر پلٹے پر اصرار کیا۔ میں اٹھ کھڑا ہوا۔ اور کھوم کر وہ قدم ہی بڑھائے تھے کہ فزائے اس پاس ادھر ادھر پہنچی ہی محسوس کی اس اجڑا جس کے ساتھ ہی بے ہمتی نظر میں سامنے افق راہ نکلیں۔ سورج غروب ہو رہا تھا۔ ایک آتش کی کہ باطل سطح جن سے چھوٹا ہوا، سیاہ رنگہ دل و اعلان کر رہا تھا۔ جس کی تیز شاموں اور چمکی کرڈوں سے تم اپنا منہ چھانے، پہنچے ہو اس کا دوسرا رخ بھی دیکھا تو۔ اسی کی زنجیر شاہیں تھیں و موت و فساد وہ دے رہی تھیں اب تم پاس ہے ہلکے ساری عمر ایسا ہی موسم ہے۔ پھر بھی کمرے کی شہید شامیں میں نہیں نہ تھیں۔ یہ تمہارے دل کی کیا حالت ہے، کبھی اسی چیز سے بیزاری۔ اور کبھی اسی چیز کی خواہش کرتے ہو، کیا

نفرت اور محبت کا بھی کبھی معاملہ ہے کیا تمہارے دل بدلتے دیر نہیں لگتی۔ میں انہی خیالات میں منہمک تھا کہ وہاں کو آتا تھا۔ اسی دوران میں معراج نے کئی ایک دفعہ چلنے کے لئے کہا، مگر میں نے اس کو جلد سمجھنے کی کوشش نہ کی۔ بھلا ایسے وقت، اس کو ان بے وقوف ہوگا جو کمر کی راہ لے گا۔ دیکھتے دیکھتے، ریح روشن سے روئے اخر اختیار کیا اور پھر نہ اچانک اس کے بعد اس نے کونسی شکل اختیار کی، البتہ آشنا ضرور ہو، میتی جاگتی دیکھنے میں اچانک زمانہ کی۔

صاحب ۱۴ معراج نے ایک عجیب ذہنی کشمکش کے زیر اثر کہا اندہر پھر اچانک پھر پلٹے، اب ۱۴ اس کی آواز میں ایک مظلوم، محنت اور ایک عجیب بیکار رہا تھی۔

پہلے چلے۔ میں نے بڑی تسانت سے کہا اب تو میں نہیں چلنے کا۔ اس وقت میری عجیب حالت تھی۔ یوں کبھی کہ معراج کو غروب ہوا تھا لیکن کبھی ایسا اثر نہ ہوا کہ پھر نقش کی طرح دھول کا ٹہرنا، سورج روز کی طرح غروب ہوا لیکن غروب ہوتے ہوئے میرے اندر ایک دل میں دیوار روشن کر گیا۔ آج کو یہ صرنا ایک معنی کی کیفیت معلوم ہوئی لیکن سچ پوچھ تو صبح مضمون میں اسی دن سے میری زندگی میں ایک نیاں تبدیلی پیدا ہو گئی، اکثر اوقات ایسے غلطی انسان انقلاب زندگی سے پیشتر دماغ کو ان خیالات کا آرا جگا رہا جاتا ہے۔ وہ رہ کر ہر بار دماغ کے پردوں سے یہ خیال نکلتا تھا کہ ایک سی برابری پر دو سرے کی زندگی کی عمارت کھڑی ہوتی ہے، لیکن ساتھ ہی دماغ کی اندرونی کھربا کھربا میں ایک خاموش آواز زلزلے کی کیا باخیاں کے نقصان پر کھڑا رہتا تھا۔ خدا جانے یہ سورج کا عجیب سبب کہ ایک کایم رہتا تھا۔ معراج نے اپنے اندر ہی غلطی کا اظہار ان الفاظ سے کیا۔ حضور زانو کو یہاں صحت کا کرتے ہیں اور جو کوئی بھولا بھلا ادھر زلزلہ ہوتا اس کی تو پہاڑیں بھی ہلکتی ہیں۔

یہ تو بات اور اچھی ہوئی، میں نے ایک اطمینان کا

بولتے کہہ راقوں کو جنوں سے باتیں کرتے ہیں۔

”کتنا غلط خیال ہے تمہارا“ میں نے اس کے اس خیال سے تعلق کیا۔ ”محبت تو دلیں وہیں کہیں رہنے لگیں۔“ جموٹ نہیں کرکار۔

”وہ بالکل قسم کھانے کے انداز میں بول رہا تھا۔“

”ہندوں کا قوتستان ہے وہ۔“ ”علف غلط“ سوا سولہ آئے غلط۔

میں نے کہا۔ ”مسلمانوں کا دھن ہوا ہندوؤں کا سرگٹ۔ یہ فرقہ بندی نہیں کہ دنیا بھر کے شیاطین اور عیسیت ارواح وہاں وجود چوں۔“

یہ تو تمہارے اپنے دلی کی فکری ہے۔ تم مندر میں رات کو میرے ہو تو صبح کہتے ہو، ایک شکل خیم کے پاسے ملا اور اسے سنا ہوتے

سبز کے پودے میں داخل ہو گیا۔ داخل ہو کر وہ اس کی جوتی سے

ایک عجیب آدمی کی جھلی میں غلط۔ جس کا سر چلنے کھڑے کی طرح صاف

تھا۔ مگر پچھلے حصے سے ایک دم ٹپک دی گئی تھی۔ وہیں اور

اسی جگہ ایک ہندو اپنی زندگی کا اگلی راستہ کو زور دیتا ہے۔ صبح

اٹھ کر کہتے ہیں۔ ”سب کو ان کی حکمرانی ہو یہاں رات کو۔“

زیر وہ آرام میں گئی۔ کسی ہندو کو مسجد میں سلاوا اور پھر صبح

کو سن کر ایسے ایسے واقعات بیان کرے گا کہ جسے ہی نہ سمجھ

کھڑے ہو جائیں۔ آپ بنا کر لیں گے دو من مہرات و فطرت

سنائے گا۔ جی معاف فرماؤ وہ اپنی ان اعمال و عبادتیں کیا کہے گا

جس پر آپ بھی ایمان تو بنائے ہیں یہی تو آپ کی تعین الاعقاد کی

ہے اگر تو یہ خیال کرو کہ زمرہ سے حق میں باعث ہلاکت نہیں

اس اعتقاد میں نہ ثابت قدم رہو تو یقیناً، تو نہ بھی تعاقب

حق میں باعث حیات ہو سکتا ہے، تم ہو پانی پاکستان اس فلسفہ کہ

سمجھ دے سکو کہ اس کے متعلق فرما دینا سود ہو گا۔ چلو پانچ

دیکھ میں گئے، وہ ہے کون۔

”میں سرکار۔“ وہ چیخ اٹھا۔ ”ہندوؤں کے زبردستی

میں رات کو قوت۔“ ”ہاں۔“ ”مجھے ایک کر دی گئی

تھی آپ تو جانتے ہی ہیں میں ایسے فرضی دلائل کا سرے سے

کٹ لیتے ہوئے کہا۔ ”وہ بھی تو یاد ہی کریں گے انھیں پالاکس

پڑا تھا۔“ ”یہ کہہ کر میں نے منہ سے دوہروں کے پچھلے

”آپ کی باتیں کر رہے ہیں سرکار۔“

”ایسی باتیں ہیں سے ظاہر ہوتا ہے کہ میں جموٹوں کا

قائل نہیں۔“

”قائل نہیں۔“ اس نے اپنے اچانک تعجب کا اظہار

کیا۔ اسی سبب اب ہمیں اگر تو ان لوگوں کا کھڑو مٹا ہے۔

”اچھا۔“ مجھے ایک دیہاتی لڑکے کی زبانی ایسا

اچھا جلد سن کر سخت تعجب ہوا بعض اوقات تم اچھے چلے

کہہ لیتے ہو۔“

”سب۔“ ایک شان بے معنی کی گیت اس نے کہا

”بل پاس ہوں۔ جماعت میں میرے اول رہا کرتا تھا۔ خدا

جیسے، اندیشہ میں روم میری بڑی عزت کیا کرتے تھے۔ وہ برابر

بولتا تھا، میں خوش تھا کہ ان کے اس کی خیالات تو بٹ گئے۔

مکن ہے، اب اس کو جموٹوں کے تعلیم وہ احساس کا خیال

نہ رہا ہو۔ مگر وہ کہتے کہتے رک گیا۔ اور پھر وہی اصرار چلنے

صاف، رات ہو رہی ہے، مگر پچھلے بہت دیر ہو جائے گی۔“

”اچھا!۔“ میں نے تائید کن اہو میں کہا جو

تیری مرضی، ان سے پھر کبھی اپنے آپ میں گئے۔

”آج تو سننے ہی چھوٹے سرکار۔“ اس نے

اپنی خوشی کا اظہار کیا۔ اس کے جواب میں میں خاموش ہو گیا

چلنے چلتے۔ میں نے دو راتیں ردھی دیکھی اس کے پاس میں

برو بھی حراج سے دریافت کیا۔ ”معالجہ اولیٰ روشتی کسی

ہو رہی ہے، کسی فاکر ہے کیا۔“

”آج جمعات ہے۔“ نامحور۔“ اس نے پھر قدرے

توقعت کے بعد کہنا شروع کیا۔ ”جمعات کو اس مقام پر رہتی

سکا دکھائی دیتی ہے، فقیر بابا کہتے تھے وہ ایک چڑیل کا لنگن تھا

جہاں بیٹہ کرو ایک ہفتہ کی غذا اپنے کندھے سے پیٹ میں

بھر لیتی ہے صاف! وہ ایک قبرستان ہے جہاں تمام غریب

ارواح رہتی ہیں۔ ہمارے فقیر بابا، اچھا جموٹ نہیں

جہنم کا کھٹکھٹا اور خود کے پاس جنت کا پروانہ گراس لے جاتے ہو جیسے راہ جہنم ملی۔ کتنی تعجب کی بات ہے۔

راستہ بڑا خطرناک تھا۔ وہ برابر ملاح سے مجھے راست بتاتا اور آتے والے خطرناک کہاصوں سے قبل از وقت چوکیدار کو اس لئے بار دیتا تھا۔ کبھی کبھی پٹان ایسی صاف لٹی کہ قدم نہ چھینے پڑتے تھے اور کبھی کبھی ایسے موڑ ملتے تھے کہ زندگی موت سے ہم آغوش ہوئے کہ لئے آگے بڑھ جاتی تھی۔ لیکن ہم دونوں ایک حکم میم کے ساتھ بڑے گئے۔ خدا خدا کر کے ساطر قبرستان کے قریب آ پہنچے یہاں چند جھاڑیاں ایسی تھیں جن کے کانٹے ایک ایسے خوفناک منظر پیدا کر رہے تھے کہ دل لرز اٹھتا تھا۔ ایسی کئی ایک جگہ سے چھ جانے تو قسم لے کر جو کچھ اچھٹنے سے چھوڑ رہی تھیں۔

خیر گواہین کھٹنے کی طویل عرق دہری کے صدرستان میں داخل ہوئے یہاں خود میرے بھی قدم کچے جھاری جھاری پڑ رہے تھے۔ ایک ٹھکاسا خون چھار ہٹا کھٹکھٹ میں میرا پانی پانی کر لیا کرتا تھا۔ کبھی کبھی ایک حدشہ بھی تھا کہ وہیں ہی ہلکا سا فوف۔ جیت کا ٹھکانہ تھا۔ میں نے اپنی بندوق پر نظر ڈال کر انسان کی سانس لی اور صوحاج نے دو من گار کے پتھر اٹھائے۔ ہم پاؤں والے آگے بڑھ گئے اور سینڈ کے ہند کے کچھ چھپے جہاں سے ہم نے ایک پرانی قبر دیکھی جس کے مرنے ایک وادو من تھا۔

”وہیں پاکستانی چند بٹیاں تھیں اور ایک شیشہ میں تیل تھا۔ اور دوا کو شش کرنے والی خود سجدہ میں پڑی ہوئی تھی جس نے پہلے اس کے پاؤں دیکھے وہ چڑیلوں کے سے نہ تھے۔“ میں نے بندوق کی نالی اور پر کردی اور اس عجیب عورت کو تنہا کھڑا ہوا اس نے زار زار روئے ہوئے اپنا سر اور اٹھایا اور کہا ”ریش تم مجھے معاف کر دو میں اپنی ساری عمر تمہارے نام صحبت چڑھائی ہوں۔“

میری نظر میں اس عورت پر پڑیں اور پچھلے سارے واقعات کھم کھم گئے۔ اس اچانک دماغی حملے کے باعث میری زبان سے ہلکی سی چیخ نکل گئی اور میں نے ہوش ہو کر گر پڑا اسی آٹھائیس میں سے چند عجیب پرشود غلط دماغی آوازوں

وہاں اشتیاق نے کبھی ٹٹی کا تیل جھڑکنے میں کوٹا دی نہ کی۔ مجھے ہمیشہ عجیب العتھل واقعات کے انکشافات کا تجسس و اشتیگر رہتا ہے۔ میں نے کبھی ایسے حالات میں اپنے قدم دیکھے نہیں جھٹائے۔

”ہم سے تو یہ نہ ہو گا جناب! وہ بولا۔ سہان چلی جائے پر میں نہ آئے گا۔“

”یہ میرا حکم ہے اس کی تعمیل تمہارا عین فرض ہے“ میں نے کرکڑ کر کہا۔ ”جان کے آگے وقت ضرورت اپنا نہ بچا جی بد لٹکی ابا زنت خدا دیتا ہے۔“ تو پھر جاؤ تم آج سے ہمارے نوکر نہیں ہو گے کل بڑے صاحب سے اپنا حساب چکنا کر لینا۔“

”جو حکم سرکار۔“ وہ بولا ”پائے گدا لنگ نیت! خود تنگ نیت خدا کے فضل سے کھانے پینے کی نہیں۔“ وہ ہر او ملاح اور میری بندوق پر زول کہیں کا۔“ میں نے اپنے بد معنی جیسے کہ بہت کچھ رفع و دفع کرتے ہوئے کہا اور اس کے ہاتھوں سے ملاح اور بندوق ایک جھٹکے کے ساتھ لے لی میں نے شکل تمام دس قدم ہی گیا ہوں گا کہ اس نے کہا ”حصہ میری بات مان جائیے ورنہ نقصان اٹھاؤ گے۔“ مچل اپنا راستہ کاٹا۔ اب یہ کو اس بندکر۔“

”تو پھر چلے میں بھی آپ کا ساتھ دیتا ہوں۔“ کوئی ضرورت نہیں۔“ میں نے شکل کے لہجہ میں کہا ”تو میرے نوکر نہیں ہو۔“

”کوئی پرواہ نہیں۔“ وہ بولا ”آج بہت پرانا ٹھکانہ ہوں بڑے صاحب ”جب سے یہاں آئے ہیں انھیں کے پاس نوکر ہوں“ جھلا آج آپ کا ساتھ کیسے چھوڑ سکتا ہوں۔“ میں خاموش تھا۔ صلوٰۃ وقت کی خاطر گول جلی میں کس کی اس پش دل فساداری بے عیش عیش کر رہا تھا اس کی نظروں کے سامنے موت تھا۔ ہمارا حق لیکن کس نے اپنی زندگی کے آخری لمحات بھی حق و فاداری میں صرف کر دیئے۔ وہ اپنی آنکھوں سے صاف صاف دیکھ رہا تھا کہ اس کے الگ کر پنا

کے ساتھ ایک اور بیچ سنی لیکن اس وقت ماحول گھنے کی دماغی صلاحیت مطلع ہوئی جاری تھی اس لئے اس بیچ پر بیڑاں غور کرنے سے مجبور تھا، رفتہ رفتہ چند لمحوں کے عرصہ میں دماغ کا شیطانی ناچ ختم ہوا، بے سُر و آواز میں دھمکے پڑنے لگیں اور میں اپنے ماحول کے قطعاً بے خبر ہو کر پانچ لکال قبل کے زادہ میں پہنچ گیا۔

جب سے محمود دوا خانہ آیا وہ برابر دیکھتے تھے اور سوچتے گئی۔ لیکن بڑی تکاشش کے بعد بھی اس کو اس کا دل نہ لگا۔ ایک دن اس نے پانچویں کرا کیا، اور قطعی فیصلہ کر لیا کہ آج چلیم کہہ رہے گی کہ محمود کو ملے گا۔ اس نے رات کا بڑی بیچ سے انتظار کیا۔ رات کی نوکری اسی کی تھی۔ مریض کی دیکھ بھال کے بہانے وہ اس کے کمرے میں گئی۔ جب دیکھا کہ محمود بے خبر پڑا ہے تو اس نے تپائی پر کے ذریعہ کاغذ اٹھائے اور چونک پڑی۔ معیار محبت کا خدا جس کی جگہ بڑی کھجی تھی، جس کی ملاقات سبکی میں تھی مگر آج میرے زیر تداروی چلا ہوا ہے۔ اس نے ایک گہری سانس لی، جس میں لذت نہاں تھی۔ ایک نظر محمود پر ڈالی اس نظر میں ایک تقویٰ غلن قوت مستور تھی، پھر وہ چلی گئی۔

”محمود صاحب! صبح میں المانے دوائی کا گلاس دیجئے ہوئے کہا۔ آپ نے یہاں اپنا ماحول کیوں دوج کر لیا؟ اور میرے عیب سے کس ام پر آپ کو ایک افشانہ نگار کے خطوط کیسے مل جاتے تھے۔ خیر جب فنا و کھل ہو جائے، جیسے بھائی۔“

”کس نے کہا؟“ محمود پولا کون کہا ہے میں افشانہ بھائی۔“
”یہ تو آپ کی انکادھی ہے۔“
”تم غلط سمجھ رہی ہو لانا۔“
”آپ مجھے غلط باور کرانے کی کوشش کر رہے ہیں اب چھپانے سے یا ماحول رات یہ حقیقت کھل چکی ہے۔“
”مس لقا، اگر تم سمجھتی ہو کہ میں افشانہ نگار ہوں تو میں اس کو تمہارا حسن ظن سمجھوں گا۔“

اگر کسی کو اپنی تندرستی پر فخر کرنے کے مواقع مل جاتے تو وہ مسودہ دیتا۔ اس کو تو اسے درد سر کے کسی اور بیماری نے بھی گھیرنے کی کوشش ہی نہیں کی۔ جب کبھی وہ اپنے کسی دوست کو فریض دیکھتا تو اس کا دل کھول کر خوب مذاق اڑا دیا کہ سا لیکن کر کے مال کہتے کہ خیر سنا ہے۔ آئی نہیں آئی نہیں اور جوتی تو کبھی تیار ہی نہ جانے کا نام نہ لیا۔ دیواروں اور چٹاقوں سے گھر لینے والا، نوجوان بستر بھال کر رہا رہا۔ بہت دقوں تو گھر ہی پر ڈاکٹر دیکھ جایا کرتے تھے، لیکن جب بیماری نے خطرناک صورت اختیار کر لی تو ڈاکٹر کے مشورہ پر اس کو عثمانیہ دواخانہ میں رجوع کر دیا گیا۔ کھانے پینے گھرانے کا تو کافی تھا ہی، بہت جلد ایک بخورہ کر لیا، جہاں انالہ سہاری کی خاطر بہت سی ہونٹیں بڑھ چکی تھیں۔ ہریان ڈاکٹر نے کھانا دیکھا اپنی خاص بہرہ داری جتنی بغیر دماغ کو خوب اچھی طرح دیکھ بھال لیا۔ پھر اپنے نسخہ خاص کی کپس۔ سے جیب گرم کی اور پتی دفعہ دو تیرہوں کو خاص تیار داری اور نہ سب دیکھ بھال کی ہدایت کی۔

لگا کر چوہل گھنٹے پہلے کہ خیر ہے کون ہونہ رات کو رات خیال کرنا ہے۔ دن کو دن کو دن باوجود بیماری کے یہ دن رات کھانا چاہے۔ باوجود بیماری کے جب جی میں آتا ہے، کھینچ بٹھکھاتا ہے۔ ہر روز باوجود انکار کے ملاقاتیوں کا اصرار ہوتا ہے، کوئی دن ایسا نہیں گزرتا جو ڈاکٹر کے پیروں سے بچ جائے۔ آخر یہ قوش قسمت ہے کون۔

لگا، ایک خوش مزاج اور خوش گوشتی جس کی آواز میں

لکھش۔ اسکو اپنی ناکامی محبت کا پہلو ہی سے
احساس تھا۔ ہمدرد ہوتے۔
خدا کے ایک ہوا جائیں۔

ناگن ہے مسعود۔ اس نے فوڈ کہا۔ سماج
سمندر جم دوں کے زبان حال ہے ہم دونوں ایک دوسرے کو
جانتے ہوئے بھی ایسے ہی نابالغ اور نا آشنا تھے جس
جیسے سمندر کے دو ساحل۔

لنا۔ ہم بیچ بیچیں آخر ہم یہ سطح یعنی کب چلو
گی کہہ رہی ہو سمندر کے دو ساحل ایک دوسرے سے ناواقف ہیں
تم کیسے کہہ سکتی ہو جبکہ دونوں ساحلوں کو ایک ہی پانی جھٹا پھر
کیا اربوں کے دونوں سطحوں میں کوئی باقی قسط نہیں رہتا،
کیا انھیں ملانے والا درمیانی تار نہیں، تو یہ تم یہ کیوں کہتی
ہو کہ ہم دونوں کے درمیان ایک وسیع سمندر ساحل ہے یہی
تو وہ سمندر ہے جو ہم دونوں کو ملانے کا تم اس کی دوست
کیوں مانتی ہو، پہلے پہلی رشتہ دیکھو۔

تم تو بال کی کھال آ کر لیے ہو۔ لنا نے اپنی بیٹھائی
بل ڈالتے ہوئے کہا ایک طون سماج کا خوف اور دوسری طون
ریش کا ڈر۔ وہ میرا منگیتے ہے پھر پر جان پھر کتا ہے
اس کو کچھ سے واہنا نہ محبت ہے وہ پروانہ وار قربان ہوا چاہتا
ہے وہ کب گوارا کرے گا کہ اس کی منگیتے دوسرے کی آغوش
میں چلی جائے کیا اس کو اپنی ناکامی کا خیال نہیں۔

تم نہیں جانتیں لنا۔ میں نے کہا۔ محبت کی قربانی زندگی کا
عجیب انقلاب ہے۔
ہو کرے۔ وہ بولی۔

اجی یہاں تو سو آفتاب مغرب سے طلوع ہوئے ہیں،
اور مشرق میں غروب۔ یہ بھی کوئی مشکل ہے، تم مہرمت اپنے
منگیتے کو لئے بیٹھی ہو۔
اس کی اس فریفتگی نے مجھے حیر کیا ہے کہ میں بھی اب
کہ انہماک ایک نظر اشفاق ہی ڈال لوں۔

ریش تھری محبت میں تنگ رہ رہا ہوا۔

کتے بڑ خال ہیں آپ کی کسی عیب ناکساری ہے آپ کی
آپ کی اسی ناکساری نے آپ کو کسی کی آنکھوں میں بگڑ دلا دی
ہے۔

آپ کیا کہہ رہی ہیں مس لنا!
میں پوچھ رہی تھی آپ کی ناکساری ہے یا تمہاری محبت
اب تم سے کیا چھاؤں مسعود نے دونوں ہاتھ ملے
ہوئے کہا جیسے جو بگڑا گیا
مجھے آپ سے ملنے کی بڑی آرزو تھی جو آج پوری ہو گئی
مسعود خاموش ہو رہا کوئی جواب نہ پڑا۔

آپ کا وہ افسانہ بہت اچھا تھا۔ بہت اچھا تھا۔
شکر ہے۔ پرنا لفظ جو اب ویرا دیا۔
پہلی گفتگو جو دو افادہ کے کسی بھی موضوع پر نہ تھی
ختم ہو گئی اور میں لنا، شریعہ چشم لنا، دوسرے سر نہیں کی
دیکھ بھال کے لئے پہنچا گیا۔

اس کے بعد بھی کسی اور ایسے مواقع نصیب ہوئے
جس میں انھوں نے پورا پورا اظہارِ اطمینان، اظہارِ محبت، موضوع
بہداشتگی ہوئی رہیں۔ لیکن کبھی وہ پیچھے نہ ملے، رات کے بیٹھے تھے
تھے، مگر کوئی بھی نہ ٹھٹھا تھا، آخر ایک دن ایسا بھی آیا جب کہ
دنیا کے سلسلے موضوعات کو ختم کر کے انھوں نے محبت کو اپنی
بحث کا نشانہ بنایا۔

اب ہمارے دن قریب ہیں لنا۔ مسعود نے
تقریباً نیم گریہ آمیز لہجہ میں کہا۔
اے لنا، ملنا نے اپنی لابی سانس کے ساتھ کہا اے
جیلے جیلے ہو چکے ہو اور کرکڑی ہو چکی۔

لنا۔ مسعود نے دہم آواز میں مطالبہ کیا۔
تمہارا خیال نام ہے تم مجھے میں بھی لکھو گی، لیکن کوئی دیکھ
باطنی حالت دیکھنے کوئی کر لیا ہیں گزرتا جبکہ طوفان نہ
اٹھے ہوں، زلزلے نہ آتے ہوں۔ تم کہتی ہو میں تندرست
ہو گیا اتم اتم دیکھو میرے دل کے نامور دیکھو، رستے ہوئے
خون کو دیکھو، بہتی ہوئی پیپ دیکھو۔ کہو اور کیا بتاؤ!

آپ کا مطلب — اُتیوری پر بل ڈالتے ہوئے
اس غلطی کا۔

- سنب راہ دور کروا جاتا ہے۔ میں نے
 پہنچی سانس کے ساتھ کسی قدر اطمینان سے کہا۔
 - کیا کہا۔؟ وہ چلا آئی۔

محبت کی قربانی زندگی کا عجیب انقلاب ہے۔
میں نے اپنا جلد دے دیا۔ یہ کام تمہیں کو کرنا ہو گا۔

اس نے ایک انگریزی
سائنس کے ساتھ کہا، اور اس کی نظروں پر کسی بھی سیاح کی جو میں
اتفاق کیے، ایک دن لٹا نے مجھے اتلوگراف بخشنے پر مجبور
کیا، اور کہا، میں ملاقات کا تمہارا اسی لئے رشتہ تھی، میں نے
جو اتلوگراف وادی پر چھوڑا، جس کو میں نے دجرا یا تھا۔
قدس نے توقع کے بعد اس نے کہا، میں سوچ کر لوگ لکھا
"لات" م، نے خط کی محنت سوچنے کا اہانت

ایک دن ریش و ملاقات کے لئے آیا تو لٹائے کہا ریش
معماری حالت روز بروز کیوں گری جا رہی ہے آخر تمہیں کونسا
غم کھانے جا رہا ہے؟

۱۔ "اس کی نوا تو تمہارے پاس ہے" ریش نے شدت سے محبت، یغور عقیدت سے مجبور ہو کر کہا "اپنے ان ہاتھوں سے کوئی امرت ہی بنا کر دے، سری زمینی بن جائے۔"

[illegible]

رنگوں میں تبدیلی پیدا کرنی شروع کر دی، اس کے اترتے چڑھتے
 دھلکے کو دیکھ کر میٹھن ہمو گیا، وہ حقیقت حال جان ہی گیا کہ
 لاکھ کے ان الفاظ نے مزید تقویت پہنچائی۔ جا بیٹھے آپ گھر
 جا کر زام فرمائیے، گہری نیند آجاسے گی۔ اب یہاں نہ ٹھہریے
 سونے کے لئے مکہ نہیں ہے یہاں۔۔۔ پھر بھی وہ اپنے
 شک و شبہ پر یقین کرنے سے مجبور نہ رہا، اس کی عزیز محبوبہ
 اور منگھٹہ تھی۔

محبوب ہو چاہے ماں ہو جہاں ایک، دفعتاً دوسرے بیٹے کی
میں بھائی تو پھر یہ خیال اس احرار کے کپڑوں کی طرح پڑتا ہی جاتا ہو
ایسے موقع پر تو تندرست سے تندرست آدمی بھی چٹ پٹ
چند منٹوں میں ختم ہو جاتا ہے اس ایک معمولی سے خیال کو آدھے
اس کے دماغ میں انتشار پیدا کر دیا۔ اور اس پر زہر سے
نواہ و اہر نہ سے کام کیا۔ اس کی آنکھیں بند ہوئے بعض مطلق
میں کھر کھاٹ پیدا ہو گئی۔ اور وہ بے ہوش ہو گیا۔

[illegible]

لہذا پر عائد کردہ جرم کی صفائی میں حج نے اس پوچھ

ان دنوں میں محاورہ میں 'میں' کے متعلق دو باتیں ہیں۔
 پہلی بات یہ کہ اس کا استعمال اس کے لیے ہی ہے۔

لہذا کو جمع اعزازات و انعامان کے رہبر و یار گیا۔

کہاں ہیں مدد لوگ جو یہ — دعویٰ کرتے ہیں کہ
عورت نصرت ایک ہی دفعہ محبت کرتی ہے، امداد کی جو رہتی
ہے کہاں ہیں وہ فحشی جنہوں نے محبت کو کھلا علم اور شاکہ
سب جھوٹ بڑھایا تھا۔ لڑنے میں یہ سخت کے حصول کی
فلاطون نے منکر نہ تو کہہ کیا لیکن پھر اس کے بعد اس نے مجھ سے
کبھی غلے کی کو شش کی اس واقعہ کے تین سال بعد ایک دفعہ
واقعات پھولی تھی اس وقت بھی اس نے انجیل کو اسلوک کیا۔
دو بار دو سال بعد یہ موقع دوبارہ عجیب ہوا اس وقت بھی
وہ ریش چھپائی کا دم پھر رہی ہے، آفت اس کے دل کا یہ ایسا
زلزلہ تھا جو آج تک نہ کو کبھی زلزلہ میں آیا ہو نہ دوزخ
میں کیا کبھی ایسے طوفان عورت کے دل میں آئے ہوتے ہیں۔
جو طوفان نور سے بھی بڑھ کر آئے ہیں۔

جب آنکھ کھلی تو میں نے دیکھا، بزرگے اس کوئی
تھیں۔ اس کے بدن مجھے معلوم ہوا کہ سورج کا عمل چلا رہا
ہو گا۔ یہ سوچ کر ہوا اس کے ہوا سے ہی کہ بزرگے اس کو
ہے۔ لہذا جاننا چاہی، مرنے اس کے آثار دیکھنے کے لیے بیٹھے
گراواں اور ایک ہی ہوا کی گرجی، اندھ کے بچوں کے نشانات
تھے۔ یہاں تک مجھے اپنے رفیق سوزج کا خیال آیا کہ اس طرف جو روش
کیا تو وہ بھی نیند سر رہا تھا، اب جو یہ غصہ کھلا، غلط
دماغی آوازوں کے ساتھ میں نے جو انسانی سمجھا تو اس کی
تھی جو میری فوج کے جواب میں تھی، مگر آج یہ غصہ سر رہا تھا۔
اس کو اب دنیا کی کسی چیز کا خوف نہ ہوا، آج تو وہ مجھ سے
دیر بنا دھماکا ہو گا کہ اس کو اب دنیا کی کسی چیز سے کھلی تعلق
نہ رہا تھا۔ — لڑکے کا شیشہ ٹوٹ چکا تھا، اور نمودن

حس کے جواب میں لائقہ نصرت نے کہا: ”مجھ سے بھول ہوئی“۔
 یہی وہی زبان تھا، اقرار جرم تھا، اس کے اپنے وطن سے
 کھڑے کئے ہوئے، لکھنؤ نے اپنی جوتی کا زور دیا، لیکن
 لائقہ نے مجھ سے بھول رہی تھی، کون کونسا اور نہ کیا۔

اپنے جسم کا اقبال کر لیا ہے جب قاتل خود اقرار کرے تو قہر
شہادت اور گواہی کی ضرورت نہیں۔ چونکہ قاتل
ایک نرس سے در اس کو ایسے جسم کا اور پچھڑا کر دیا
تھیں کہ وہ اندہ بھائی ایسے خوشام آفتاب کے کہ کتاب کی
کو محض کرے، اور چونکہ اس نے اقدام قتل کیا ہے جس کی
مزا اوروں کے قہر یا تہنید و تعاضل سے بڑی اور چونکہ
رج آنا ہی کہنے پایا تھا کہ مریض، عدالت میں
گھس آیا، اور اس نے اپنی لفظی زبان سے پرندہ
آواز میں رنج کو خطاب کیا۔

قَالَ صَدِّقُكُمْ جَمْعُ الْمُعْزِزِ عَافِيَةٍ !

”مجھے بواکھڑوں نے اپنی موت سے بچا لیا ہے، جن کا

یہاں تک کہ ہوں میں زندہ ہوں لیکن میرا باطن قید ہے
 نہیں کیا گیا اور محض لٹاکے اقرار ہے صحت پر ہی تسکین
 کیا گیا۔ میں یہ تجھ نہیں سکا کہ لٹا پر کیوں یہ مجرم
 غارت کیا گیا۔ وہ اس سلسلہ میں باطل پر قصد ہے۔
 وہ میری متنگی ہے بھلا، وہ ایسے شرک و فساد کے
 زکاب کیوں کرتے ہیں، کوح اس معاملہ میں قطعاً
 حصوم ہے اسے مرزا کا قانون کی تلافی
 ہے۔ چونکہ یہ شادی میری مرضی کے خلاف ہو رہی
 تھی، اس لئے میں نے عویذ کچھ ایوان بیانی اور
 جاننا ہوں اور وہ سے قانون خود کو کہیں کہیں

کیا ہے۔۔۔ میں۔۔۔ وہ ہمیں تک پہنچا دیا

خاک لاکھ کر گا۔ ہال کی تالیوں کی ہونے کی جگہ ایک بستر
عصرین کے گھسے ہوئے کپڑے پر رکھا گیا ہے۔ نیچو کا شمار
کے چھاسر ساجو کے میں نے اپنی عظیم الشان قربانی پر

سید احمد مرزا

تضمین برقصہ سعدی

ہائے بچپن کب گئی وہ خوشی
چند عیبوں میں وہ تمام ہوئی
بات پوچھو وہیں جوانی کی
اب ہے آغازِ دلست پری
تجربہ عجیب کس کا شہنشاہی
ایک دم پھر کی تھی وہ آہوش
بس فقط چند سانس ہیں باقی

ہر دم از حسرتی رود یعنی
چوں نگاہی کنم منہ سے
دن برس تک نہیں تھے ہوش بجا
رہا چالیس تک تو دیوانہ
میں تک کیل کو دی میں رہا
پیشِ زعشرستیں محمود و جود تھا
نہیں غفلت میں کچھ کمی اصلاً
موت سر پر کھڑی ہے دیکھ ذرا
ای کہ بچاہ رفت و در جوانی

گراں بیخ روز دریا بنی
کرنہ دنیا کو بے سبب بدنام
خاص ہو کوئی یا ہو کوئی عام
چاہتا ہے جو تیک ہو انجام
عمل خیر کا ہی ہے مقام
چند روزہ یہاں ہے سب کا مقام
درست کراے نفسِ نافر جام
نیکیاں کر رہے سنی مقام
خجل آں کس کہ رفت و کارِ رخت
کوس رحمت زوند و بار نہ ساخت

تو مسافر ہے اور جہاں ہے سرا
سامنے آخرت کا ہے رستہ
دم میں تلخ کا صبح کا تارہ
نیل گہری نے یہاں امن
صرف دو روز ہے تمام ترا
یہی رستہ ہے تیری منزل کا
ایں نہ کر کیوں ڈا ہے تو سوتا
کھوئی منہ زل نہ کر اے بیتا
خوابِ فوشین باد اور سیل

باز دارد پیاوہ راز
چوڑ بابا خیال بام دور
نہاں چتر میں کھو نہ سیم دور
ہو کا دون کسی طرح سے گز
جبر کا جو گاتیرا ہے چا مسر
قول سعدی نہیں سنا ہے مگر
ہر چہاں سے مجھو مزا ہو اگھر
جبکہ ہو گا جہاں سے تیرا مستند
وہ مردوں کے لئے یہ مستکرم کر

ہر کہ آمد عمارت نوسانت
رفت منزل آہ و گیس پر رونت
جس کا تو آج ہے کہیں یہ مکاں
دوسرا ہو گا اس پہ قبضہ کیوں
چھوڑ جائے گا تو رہے تھک سہاں
اور بڑ جائے گا اس کو تھما مکاں
رہے کہ کشش میں وہ سدا بیل
کہ عورت ہو سب میں عالی شان
چھوڑ کر وہ بھی تیری طرح میاں
جا جائے گا شہر خاموشاں
واں درخت ہم جنیں ہو

دیں عمارت بس کہ بڑ گئے
جان کر تجھ کو صاحب اقبال
جمع جو دوست ہیں سہاں کا خیال
ہو جو دولت کو تیرے آج زوال
دل میں پچھے ہے زباں پہ کچھ ہے عقل
کہہ کہہ ہر ایک جھاڑ کر پرواں
یہ نہیں دوست چھوڑاں کا خیال
گر تجھے کچھ بھی ہے خیال مانی

یار ناپائیدار دوست مدار
دوستی را نہ شاید ایں خدا
یوں تو ہیں بسم میں کئی اعضاء
پیش کا حال ہے مگر سیارا
سارا سامان ہے اسی میں بھرا
یہی اعضاء کا ہے تہہ غدا
یہ تر ہے ٹھیک تو ہے اپنا بھلا
یہ جو بکرتے تو کام ہو پورا

آؤ عیش آدمی شہر است
تا بتدریج می رود کو غم است
ماہرین فسون طببات
کھاتے ہیں جو غذا و ماگوالات
یہی حکماء نے کی ہے تحقیقات
جا کے پیچھے ہیں مسدود اندات
ان سے بنتے ہیں ثوان و فضلات
خون سے تازگی ہے اور حیات
فصلے خارج نہ ہوں اگر ہیبت
جان خطرہ میں ہو بلا شہات

گر بہ بسند و چنان کہ نکشاید
گردل از عم پری کت کشاید
علم ابدان سے جنہیں ہے ساز
دنیا کی جس سے ہو قلیل و دراز
ان جھیموں سے یہ کھلا ہے راز
یہی قصہ ہے یعنی بول و بروز
ان کا منفذ نہ باز ہو نہ سراز
رہے ہر حال مستدل انداز
ہو جو اخراج میں تشیب و فراز
موت ہی داغ زو بہ سوز و گداز

دور کشید چنان کہ متوال بہت

گو بہ شوی از حیات دنیا دست

پہ صفت آگ میں جلانے کی جذب و معدوم کرتی ہے مٹی
باد ہر شے کو ہے اڑا دیتی آب میں ہے ملکیت بہانے کی
چار عنصر ہیں آدمی کے یہی شکل انسان ہے انھیں سے بنی
جمع طہرین ہیں ہر شوار کی بس غنیمت ہے ان کی بھائی

چار طبع مختلف و سرکش

چند روز سے بوند باہم خوش

جسم انسان کے یہ چار افسداد آتش و آب اور خاک و باد
ہے اہلہا کا اس طرح ارشاد قہر میں جادو ماں میں یہ آزاد
اعتدال ان کا دل کو رکھنا کمی بیشی ہے ان کی وجہ فساد
ایک بھی ان میں کا اگر ہو زیاد زندگی ہو تباہ اور ہر باد

گر کیے زمین چہار شد غالب

جان شیریں برآید از قالب

زلیت ہے چند روزہ بھائی جان اور جو جہر نہ ہو انہی
ایک ہمال سراسر ہے تیرا مکاں جس میں ہے چاروں کا تو ہواں
جہ پیریم سے بلند ستا امکاں جمع کراچے کوچ کا سا ماں
امر حق کہی من علیہا فان ہے ال اس میں شک نہیں ہے جان

لا جرم مرد عارف کا دل

نہند ابر حیات و نیا دل

عالم نامدار و ذی ہمت اور تو شیر و ان با عظمت
گرچہ دنیا سے ہو گئے رخصت نام زندہ ہیں ان کے با عزت
اور ہزاروں ہی صاحب دولت بانی انکم و شہرہ بد طہنیت
جب انھوں نے یہاں سے کی جوت کچھ نہیں لے گئے بجز حسرت

نیک و بد چوں لکھی بیابا مرد

خاک آں کس کہ گوئے نیک برود

گو کہ ماں باپ کو ہے تجھ پر پیار اور بھائی بہن ہیں تجھ پہ شمار
زن و فرزند بھی ہیں تیرے غم خوار دوست کیا ہے تیرے سب اختیار
دوستے اور چہتے محال نہ اڑ ساقیوں کے فقط یہ ستا ہمارا
کر عمل نیکو نہ نہی ہی میں یار زاور وہ اپنا آپ کرتا ہمارا

ہرگھیشی پر گور فویش فرست
کس نیا روز پس ز پیش فرست
کیسے کیسے شہنشاہ زمین جن کے زیر نہیں تھے چین و منت
کتنے ہی باہرینا عشق و فن اور زہار و عا جان حسن
کیسے کیسے فصیح و اہل سخن اور سینان و ہر نازک تن
آئے۔ چہند سے اٹھائے رخ و سخن غاک ہو کر ہیں اب تہہ در فن

ہر برت است و آفتاب تہوز

اند کے ماند و خواہ غرقہ ہنوز

کیا بازار ہے یہ خوش اسلوب میزدن آخرت ہے نام بھی خوب
جس نیکی بدی تو ہو مطلوب تجھے مل جائے گی۔ تجھے مرغوب
فلس بد خواریس و پر ز عیوب دیکھ۔ شہوات کا نہ ہو مطلوب
باتھ خالی نہ جا کہ ہے محبوب کام لیا نہ کر کہ ہو معتوب

اب تہید ست رفتہ در بازار

ترکست پر نیاوری دستار

چار ہوتے ہیں دوسے دول کر کلیہ قاعدہ ہے یہ انگلہ
موت واقع ہو زمر کھائے اگر حلقے اس کو جس نے کھائی فکر
تخم نیکی جو بوئے نیک سیر پائے گا شہ بھی وہ شیریں تر
اور جو باندھے کوئی بے خیال کر بد بخت وہ دیکھے گا اکثر

ہر کہ مزدور خود خود بہ نوبہ

وقت غرضش خوشہ باید چہ

تا بے غفلت اور نادانی ہو کے گمراہ دشت پسانی
جس طرت کو ہوا ہے تو راہی نہیں یہ راہ تیری مسئلہ کی
ہو خبر دار راہ لے سیری بس اسی میں ہے تیرا بیسودی
تیر نادان حضرت صدیقی کہہ رہے ہیں ز راہ ہمدردی

پند سعدی بوش دل بشنو

وہ چنین است مرد با حق دہو

میر محمد شجاع الدین

شعریت فلسفہ آمیز

دے کے صبا تجھ نچے پر جو دکھا
 گنہ وہ کب سبجے پھولوں کی
 پھولوں کے جلوے روشن ہیں
 پھول حسیں بھی حنِ فزا بھی
 خوشِ زود بھی خوش ہیں پھولوں اور
 ایسا ربط باہر سدِ یگر
 لاکھ کہے کوئی البسیل
 پھول چنبیلی کے نہ ملیں گے
 سب پھولوں کا حال یہی ہے
 پھولوں کی جتنی ہیں قسمیں
 طور یہی ہے خاص پھولوں کا
 سارے میوے ہر موسم میں
 میں نہیں کہتا باغِ جنساں کی
 جی چاہے سول نہیں سکتا
 آم کا موسم، ستیا پھل دے!
 ہم کب ان دونوں کو چاہیں
 ستیا پھل کی ہر اک ڈالی
 ہر میوے کی فصلِ جدِ اہر
 لذتِ دنیا ہے ہنگامی
 کیف سے میں خود ہوں بیگانہ
 یا ہے ادھورا "نعتِ خانہ"

سید علی منظور

اداره ادبیات اردو کی کتابیں

ردیف	تعداد	نام کتاب	قیمت	تعداد	کتاب
۱	۴۸	سج کا جادو	۲	۱۲۸	سرور خلافت
۲	۶۸	طوبائی کائنات	۸	۹۳	سیرت شریف
۳	۱۲۳	مقام سخن	۹	۴۰	نظام الملک
۴	۱۲۲	کیف سخن	۸	۳۳۰	تاریخ گوندہ
۵	۱۲۷	بادۂ سخن	۱	۱۶۰	ریڈیو نمبر (۸ تصاویر)
۶	۱۵۲	سراج سخن	۱۲	۱۶۰	ارمغان جذب
۷	۱۴۰	ایمان سخن	۴	۴۸	سونیل مان
۸	۱۴۴	فیض سخن	۲	۱۶	مرید احمد خان
۹	۵۰۰	مربع سخن جلد اول (۵۵ تصاویر)	۶	۴۸	سر سالار جنگ
۱۰	۴۳۲	مربع سخن جلد دوم (۵۰)	۴	۱۴۵	مربعی تصانیف کے اردو تراجم
۱۱	۱۷۵	نقد سخن	۳	۱۳۲	محدث کی چھاؤں
۱۲	۲۴۸	نذر ولی	۳	۲۶۸	اقبال نمبر
۱۳	۱۹۲	گولہ و تھم	۱	۱۱۲	حائس کے کرمے
۱۴	۱۸۳	مقامی قندھار دکن	۳	۲۳۰	شعراۃ عثمانیہ
۱۵	۱۴۵	من کی دنیا	۸	۳۰۰	مکتوبات شاہ عظیم آبادی
۱۶	۱۹۶	مدارس میں اردو	۲	۱۶	دادا بھائی
۱۷	۱۱۲	محرم ذمہ	۲	۲۰۰	اردو نامہ
۱۸	۱۵۳	ذکر دکن	۱۰	۸۵	حیدر آباد
۱۹	۱۴۰	روح غالب	۶	۴۰	عماد الملک
۲۰	۲۰۰	عاصم	۶	۵۶	اردو دانی کی پہلی کتاب
۲۱	۵۶	دبیری معلومات	۶	۵۶	دوسری کتاب
۲۲	۴۸	ابدوز نقوش اور سرف	۲	۲۰۰	محمد حسین آزاد
۲۳	۱۳۲	اردو نقوش کا ارتقاء	۲	۱۴۰	فاغ کی ناؤ
۲۴	۲۱۶	مرد زندگی	۱۲	۹۲	من تعزیر
۲۵	۳۰۰	سرگزشت ادارہ	۱	۱۴۲	محدث تاریخ دکن
۲۶	۳۱۲	میر محمد مومن (۲۴) تصاویر	۸	۱۴۰	ہندوستانی تمدن
۲۷	۳۲	بقا	۱۰	۸	پودوں کی کہانی
۲۸	۱۱۳	حطایات	۱	۱۰۰	سما
۲۹	۱۵۰	علم خاتم داری	۶	۴۸	ہانی کی کہانی
۳۰	۱۱۸	چوٹی (۱۶) تصاویر	۸	۳۹۰	رسالہ طیب
۳۱	۱۶۸	انوار	۴	۴۰	سلک گوہرین
۳۲	۸۰	نغمش دانی (۴) تصاویر	۸	۱۷۲	تاریخ ادب اردو
۳۳	۱۲۸	کارخانہ نقاشی	۸	۵۶	اشوک اعظم
۳۴	۱۶۸	رات کا پہلو	۱	۸۲	ہائیں
۳۵	۲۴	سکندر جاہ	۸	۲۱۲	پورپ جنگ سے پہلے
۳۶	۵۲	بلاغت	۸	۱۷۰	شہنشاہ
۳۷	۲۰۰	ادارہ علم ۱۹۳۱ء میں	۱	۱۰۱	ایضائی زبانیں
۳۸	۲۴	ناصر الدولہ	۳	۳	ظام علی خان
۳۹	۳۲	افضل الدولہ	۵	۳۹۰	دندہ اردو مضبوطیات جلد اول
۴۰	۳۲	نواب میر محبوب علی خان	۱۰	۵۶	عرب اور عربستان

سبیل



U.9072

ادارہ ادبیات اردو حیدر آباد دکن کا مہنامہ

زیر نگرانی
ڈاکٹر سید علی الدین قادری زور
مجلس ادارت
خواجہ حمید الدین ایم کے
سکینہ بیگم

نشان پستہ آصفیہ ۱۵۳
نشان پستہ بھائی ایم ۳۹۵
ٹیلیفون نمبر ۲۲۰۹
چیتوسالانہ چار روپے ٹیکے آنے
بحر کی سب سے اکر و پراٹھ آنے

سب رس

جلد ۹ بابت پانچ و اپریل ۱۹۴۶ء شماره ۳ و ۴

(فہرست مضامین)

۱	زندگی - غائب کی نظر میں	۲	محمد منظور احمد بی اے (عثمانیہ)
۲	احاس محبوب - (نظم)	۸	پیر و فیروز نور ایم اے (امراؤٹی)
۳	ادبی رجحانات کا تجزیہ	۹	تجملہ سمیع اللہ شاہ
۴	یکے میں - (افسانہ)	۱۵	احمد یوسف زئی بی اے (عثمانیہ)
۵	سینے سے آتش - (غزلیں)	۲۰	سید علی منظور
۶	عزیزی دیر سب کس - (ایک خط)	۲۱	مارموزی (بھوپال)
۷	آشمار اقبال	۲۲	سید مبارز الدین رفعت ایم اے
۸	غزل	۲۳	عبدالعزیز فطرت (راولپنڈی)
۹	غزل	۲۴	علی انصرت
۱۰	اسلوب بیان	۲۵	احسان اللہ بی اے (عثمانیہ)
۱۱	کمیلیں - (نظم)	۲۶	احمد رفیع قاسمی بی اے (لاہور)
۱۲	ماحول اور شخصیت	۲۷	عابد علی خاں بی اے (عثمانیہ)
۱۳	جلووں کے شزار - (نظم)	۳۶	سر دار الہام
۱۴	بیدری کی آبادی اور نام	۴۰	سید محمد بیدری
۱۵	غزل	۴۱	جیس ملک (راولپنڈی)
۱۶	قانون - (فسانہ)	۴۱	قاضی وقار الدین
۱۷	ٹھوکریں	۴۹	رشد سید قریشی ایم اے
۱۸	تنقید و تنصیر	۵۳	ق۔ زس
۱۹	ادارے کی خبریں	۶۲ تا ۵۷	ادارہ

خواجہ حمید الدین شاہد ایم کے کے اہتمام سے صحیفہ مشین پریس میں چھپ کر فوٹو لیتھوگرافی سے شائع ہوا۔

زندگی۔ غالب کی نظر میں

یہ تو ایک حقیقت ہے کہ شاعر کوئی مافوق الفطرت ہستی نہیں ہوتا بلکہ وہ ہماری ہی سماج کا ایک فرد ہوتا ہے۔ لیکن چونکہ اس کی طبیعت عام لوگوں سے زیادہ حساس ہوتی ہے اور اس میں فطری طور پر یہ صلاحیت ہوتی ہے کہ کسی واقعہ سے متاثر ہو کر اسے اشعر کے سانچے میں ڈھالے۔ اسی لئے وہ ہر اس جذبے کو جو انسانی دل میں پیدا ہو سکتا ہے صحیح طور پر پیش کرتا ہے۔ درہم بر انسان کے دل میں وہی جذبات پیدا ہو سکتے ہیں اور ہوتے ہیں جو شاعر کے قلب و دماغ کو دو متنازعہ دیتے ہیں لیکن صرف محسوس کرنا ادب بات ہے اور محسوس کرنے کے بعد ان کا اظہار ایک علمدار ہے۔

ہر بڑے شاعر کے کلام کا عین مطالعہ کرنے کے بعد ہمیں اس کی پوری شاعری میں ایک مرکزی خیال ملے گا اور اسی ایک مرکزی خیال کے اطراف اس کی شاعری گھومتی ہوئی نظر آئے گی۔ کہیں وہ زندگی کے متعلق تاثرات بیان کرے گا چاہے وہ اپنے ہوں یا پرانے۔ اور کہیں زندگی کو مختلف زاویہ ہائے نظر سے دیکھے گا۔ اور ان زاویوں کی مدد سے چند حقایق و افاضات زندگی کو پیش کرے گا۔ چونکہ انسان کے دل میں اس کی زندگی کی مختلف فیزوں میں متغایر جذبات پیدا ہوتے ہیں اس لئے شاعر کا کلام بھی متغایر خیالات کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ کہیں وہ زندگی کی پیچیدہ تفصیلات کو دکھاتا رہتا ہے۔ کہیں وہ کشمکش زندگی میں پیہم مشکلات اور نا کامیوں سے دوچار ہو کر انسان کی مجبوری اور ان مجبوریوں کے خاتمے کا ذریعہ موت کو پیش کرتا ہے۔ کہیں اس کی نظر میں دنیا ایک باوجود اطفال نظر آئے گی اور ہنسی خوشی سے زندگی گزارنا اس کے بانیں ہاتھ کا کھیل نظر آئے گا۔ اگر کسی موقع پر وہ مصائب کی زندگی سے تنگ آکر ایک آخری بلا یعنی مرگنا مانتا ہے۔ کاغذ پر اسے گا تو کہیں اس سازش کے ایک نیک دن پر مدعا رہ جائے گا یقین کر لینے کے بعد اپنے دل کو یہ شور و دہ گاہ۔ گنہگارے کو غنیمت مانو کہ یہی وہ ہستی کی دولت بڑھانے اور زینت کا مزمہ پائے کیلئے جتنے خاندان ویران ساز کا دامن تھلنے کی تعلیم دے گا اور کبھی آلام و مصائب سے گھبرا کر رونے آ کر کار و بار شوق کے لئے فرصت اور نظارہ چلنے کے ذوق کا فقدان محسوس کرے گا۔ کہیں فکر و خیال میں سرگھبرانہ اس کے لئے وبال ہو جائے گا اور دینیئے کا مزا موت کے لازم ہونے میں محسوس کرے گا چہاں وہ اپنی زندگی مشکلات میں بسر کرنے کے سبب یہ کہہ مانے گا کہ۔

ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے
وہیں زندگی جی گراں قدر تھے کو بارگاہِ ایزدی میں پیش کرتے ہوئے یہ کہے گا۔

حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہو

مختصر یہ کہ شاعر زندگی و موت کے مسائل، انسانی جذبات کی ترجمانی اور اپنے تجربات زندگی کو شاعری کا موضوع بناتا ہے۔ درحقیقت وہی شاعر ادبی دنیا میں اعلیٰ مقام حاصل کرنے کا مستحق ہے اور وہی شاعر ادبی دنیا میں اپنا مقام آپ پیدا کر لیتا ہے جس کی شاعری کا محور زندگی اور واقعات زندگی ہیں ان ہی شاعروں نے اپنے تخیل و فکر سے دنیا والوں کو ایک پیام دیا ہے۔ زندگی کی دکھتی رنگ بڑھانیا زندگی کے شیب و فراز کو ہماری نگاہوں کے سامنے لا کر دکھانا اور

ان سے بجائے فرار و گریز کے پامردی سے راہ زندگی کو طے کرنے کی تعلیم دینا ایسے ہی شاعروں کا سطح نظر ہوا کرتا ہے۔ مذکورہ بالا تمام خصوصیات دنیا نے شاعری کی جس عظیم المرتبت اور لائق فخر ہستی میں جمع ہو گئی تھیں، وہ اسد ادرخاں غالب ہے جس نے تمام شعرائے متقدمین کی راہ اسے ہٹ کر اپنے لئے ایک نئی راہ انتخاب کی۔ وہ اپنے رنگ کا پہلا اور آخری شاعر تھا۔ اسی کے کلام کو دیکھنے کے بعد عین کی بندی کا مفہوم ہمارے ذہن نشین ہوتا ہے۔ تب ہی یہ کہا جاسکتا ہے کہ انداز بیان کی خوبی کسے کہتے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ انعام اردو شاعری کی حیثیت و سجدگی سمیت سنا کر اس کی شاعری میں جمع ہو گئی ہے۔ اس کے کلام میں اردو شاعری ایک شرارہ چلبلی و خوشترہ کی طرح نہیں بلکہ ایک بادقار، شائستہ و زمین عودت کے روپ میں جلوہ گر ہوئی ہے جسے اپنی شخصیت و مردانگی کا احساس بھی ہوتا ہے۔ اس نے دنیا کے سائنس یا مخصوص پیام اپنے مخصوص انداز میں پیش کیا ہے جو ناقابلِ قدر ہے۔ اس کا کلام حیات جاوید حاصل کر چکا۔ وہ باقی رہے گا کیونکہ اس میں چند حقائق ہیں اور حق کبھی مٹ نہیں سکتا۔ یہ فطرت کا اہل قانون ہے۔

غالب کی ابتدائی زندگی نہایت عیش و عشرت اور بے فکری میں گزری لیکن اس کے بعد انھیں اپنی لقیہ طویل زندگی میں اطمینان و مسرت سے نہیں زیادہ پریشانی و غم سے سہاقت رہا۔ مصیبت کے ان دنوں میں وہ عیش و عشرت کو یاد کرتے ہیں اور پھر اپنی اس حرکت پر عجیب طرح سے تضحیک بھی کرتے ہیں۔

فلک سے ہم کو عیش رفتہ کا کیا تقاضا ہے
متاعِ برہ کو کچھ ہوئے ہیں قرضِ رہزن پر

ایک اور مقام پر وہ اس خیال کو کہ جب مشکلات نے ہمیں گھیرا تھا اس وقت ان کے وضع کردہ کی طاقت تھا اور اب جبکہ پریشانی کا سامنا ہے کچھ بھی نہیں ہو جتنا۔ اپنے آپ سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں۔

درآمدگی میں غالب کچھ بن پڑے تو جانوں
جب دستہ بے گم تھا ناخن گرہ کشا تھا

ہندوستان کے مسلمانوں کی عظمت کے اظہار کا واحد ذریعہ یعنی ری سہی سلطنت مغلیہ کا چراغ گل ہو گیا متاع آزادی لوٹ لی گئی اور بد بخت کاروانِ کدے سے احساسِ زبیاں بھی ہانار با مصیبت ہندوستان کے مسلمانوں کے ساتھ سایہ کی طرح پھری پھی۔ ان تمام ناخوشگوار حالات سے غالب کا دل بھی بیٹھ گیا۔ وہ مسلمانوں کی طرف سے ایوں سا ہو گیا تھا۔ کہتا ہے

خزاں کیا فصل گل کہتے ہیں کس کو کوئی موسم ہو

وہی ہم ہیں نفس ہے اور اتم بال و پر کا کس ہے
آخر عمر میں وہ فقدانِ راحت سے گھرا اسلئے تھے کیونکہ اس وقت نہ ذریعہٴ معاش باقی رہا تھا اور نہ صحت اور دراصل بھی وہ بنیادی ضرورتیں ہیں جن سے انسان کو بڑی حد تک سکون قلب حاصل ہو سکتا ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ شاہی سرپرستی کے زمانے میں بھی وہ بھی فارغِ اہلی سے گز بسرنہ کر سکے۔ شاید یہی سبب ہے کہ ان پریشانیوں نے انھیں غم و مصیبت کو اپنا موضوعِ فکر بنانے پر مجبور کیا۔ چنانچہ انھوں نے اپنے کلام میں غمِ ہستی کا بار بار تذکرہ کیا ہے۔ اور انھیں کہیں اندازِ بیان سے حسرت دیا جس جھلکتی ہوئی نظر آتی ہے۔

انسان کی زندگی اپنے انتقام کو پہنچنے تک ٹھیک و فرازا و مصیبت و غم سے گزرتی ہے۔ اس غم ہستی کا وادہ علاج موت ہے۔ اور غالب کے خیال کے مطابق موت ہی وہ ”سحر“ ہے جس کے اطلوع ہونے کے بعد نئے حیات گل ہو جاتی ہیں۔

غم ہستی کا اسد کس سے ہو جز مرگ علاج
شعلہ ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

اسی خیال کو ذوق نے بھی باندھا ہے اور خوب باندھا ہے۔

حکیم آغا ہان علیش نے اسی خیال کو یوں نظر کیا ہے۔
 اے شمعِ تیری عمر طبعی ہے ایک رات
 رو کر گزار یا اسے ہنس کر گزار دے
 اے شمعِ سوچ ہو تو ہے روتی ہے کس لئے

جب تک انسان زندہ ہے غم واندوہ بھی اس کے ساتھ ہیں۔ موت ہی غم ورج کا خاتمہ کر سکتی ہے ورنہ زندگی و غم ایک دوسرے سے وابستہ ہی رہتے ہیں۔

قد حیات و بند غم اصل میں دونوں ایک ہیں موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے گا تو
لیکن غالب چونکہ بلند مرتبہ شاعر ہے اور ہمالیہ غم سے متاثر ہوتا ہے وہیں اس کی دور رس نگاہ حقیقت پر بھی پڑتی
ہے جہاں ایک معمولی نظر نہیں پہنچ سکتی اس لئے وہ ایک بار غم کو بھی غنیمت سمجھتا ہے کیونکہ جب یہ ساز بھی
ختم ہو جائے گا تو ہر نعمت اپنے غم بھی بنے نہ جا سکیں گے

نفسہ اپنے غم کو بھی اسے دل عنایت پائے۔ بے صدا ہو جائے گا یہ ساز ہستی ایک دن
جب ہماری زندگی کی رن کوئی ہماری اور دھوم یا ہنگامہ پر موقوف ہے اور سرست ہمیں حاصل نہیں ہو سکتی تو
پھر ذرا غم ہی عنایت ہے۔

ایک ہنگامے پہ موقوف ہے گھر کی رونق

نور غم ہی پس نغمہ شادی نہ

انسان کی زندگی بہت مختصر ہے اس لئے اسے محفلت میں نہیں گزارنا چاہیے۔ زندگی کے مختصر ہونے کی غالب نے ایک انوکھی تشبیہ دی ہے۔

یک نظر بیش نہیں فرصت ہستی غافل

گرمی بزم ہے اک رقصِ شرِ ہونے تک

صوفیہ کے ایک گروہ کے خیال کے مطابق دنیا ایک فریب ہے اور کچھ نہیں۔ غالب نے بھی اس خیال کو مختلف انداز میں بیان کیا ہے۔

ہاں کھانچو مت فریب ہستی ہرچند کہیں کہ ہے نہیں ہے

ہستی کے مت فریب میں آجا کیونکہ عالم تمام ملکہ دایم خیال ہے

شاید سچی مطلق کی کمر ہے عالم لوگ کہتے ہیں کہ پرہیز تھو نہیں

شاعر کو ہستی باز زندگی کیوں فریب نظر معلوم ہوتے ہیں اور وہ اسے کیوں دام خیال سمجھتا ہے۔ محض اس لئے کہ وہ دیکھتا ہے کہ اس زندگی پر دنیا ہر انسان کا کوئی قیود نظر نہیں آتا۔ مشکلات و مصائب سدا رہ جاتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ناکامیاں ہمت پست کئے دیجی ہیں۔ اسی سبب سے وہ سمجھتا ہے کہ انسان مجبور محض ہے اور اسے کوئی اختیار حاصل نہیں ہے اس کی مجبوری کی مثال کفایت نے اس شعور میں پیش کیا ہے۔

رو میں ہے رخسار کہاں دیکھئے تھے
نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں
جہاں اس نے زندگی کے متعلق ایسا نظریہ قائم کیا تو پھر دنیا کو وہ تیار چیز سمجھنے لگا ہے اور انسان کے عقل و دانش کے دعوے اسے غلط معلوم ہوتے ہیں۔ وہ دنیا و دین کو انسان کے لئے غفلت میں ڈالنے والی چیزیں سمجھتا ہے۔
لافت و انشل غلط و نفع عباد معلوم
دروہ کہ سامع غفلت ہے چو دنیا و چو دیں

اسی لئے وہ زندگی کو ایک تماشا سے زیادہ اہمیت نہیں دیتا اور ہستی اشیاء کو ہمارا دھرم قرار دیتا ہے کیونکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عالم یہ محض نام ہی نام ہے۔ اس سے بڑھ کر اس کے وجود کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔
باز بچہ اطفال کہے دنیا مرے آگے
ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے
جہاں نام نہیں صورت قائم مجھے منظور
جز وہم نہیں ہستی اشیا مرے آگے
جہاں زندگی مصائب و آلام سے بے کمزور ہوتی ہے اور جہاں انسان اس سے بد دل ہو جاتا ہے۔ وہیں رونق ہستی کے لئے شاعر ایک لازوال غمے پیش کرتا ہے اور بتاتا ہے کہ اس غمے کے بغیر زندگی واقعی فغول ہے۔

رونق ہستی ہے عشق خانہ و براں ساز سے
انجمن بے شمع ہے گر برقی خرمین میں نہیں
زندگی اور عشق میں گہرا تعلق ہے۔ انسان کے لئے عشق ایک ایسا بلند مقام ہے جہاں سے دنیا کے تمام آلام و مصائب کے پہاڑ نشیب میں نظر آنے لگتے ہیں اور برج و غم کے بدن من ٹوٹتے ہوئے محوئے ہوتے ہیں اور اس دنیا کو عشق کے سہارے ایک قدم میں پار کر لیا جاسکتا ہے۔
ہے کہاں تنہا کا دوسرا قسم یارب
ہم نے دشت امکاں کو ایک نقش پا پا پا
یہی عشق ہے جو انسان کو مصائب و آلام کی شدت کے باوجود اپنے حقیقی منصب یا فرض سے غافل نہیں ہونے دیتا اور اس کشمکش حیات میں بچا اپنے آپ کو ایک قابل پرستش ہستی سے وابستہ رکھتا ہے۔

گرمیں رہا رہیں ستم بائے روزگار
لیکن ترے خیال سے غافل نہیں رہا
انسان کی زندگی کا کمال یہ ہے کہ وہ ذات الہی میں اپنی ہستی کو دفن کر دے۔
عشرت قطرہ ہے دریا میں نشا ہو جانہ
درد کا حصہ سے گزرنا ہے دوا ہو جانہ۔

اگر انسان کے لئے کسی نہ کسی دن مرنا لازمی نہ ہوتا تو زندگی بے لطف ہو جاتی۔ زندگی کا لطف موت میں پہنچا ہوا ہے کیونکہ اس حقیقت سے واقف ہو کر کہ ایک دن مادی زندگی کا ختم ہو جانا ضروری ہے انسان کے دل میں کم سے کم موت میں زیادہ سے زیادہ کام کرنے کی انگ پیدا ہوتی ہے اور وہ اچھا ہوتا ہے کہ جلد سے جلد اپنے بلند ارادوں کی تکمیل کرے تاکہ کہیں فرستہ نہ اہل اسے اپنے ارادوں کو نامکمل چھوڑ دینے پر مجبور نہ کرے۔ اگر موت لازم نہ ہوتی تو انسان بے پروا ہو کر اپنے ہر کام کو "فردا" پر ڈال دیتا اور زندگی جس کا مزا سرا سر مصروف رہنے میں ہی ہے بے مزہ ہو جاتی ہے۔

ہوس کو بے نشاط کار کیا کیا

نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا

مقصد میں کامیابی کیلئے نتیجہ کی فکر کئے بغیر اپنے کام میں لگے رہنا چاہیے کیونکہ بالآخر وہی ہو گا جو فکر کرنے کے بعد بھی ہو سکتا ہے۔ مصیبت سے گھبراننا باہمت انسان کا عظیمہ صوبہ نہیں ہے۔

رات دن گردش میں ہیں تآسمان

ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبراہٹیں کیا

اگر قوت برداشت ہو تو مصیبت بھی راحت سے بدل سکتی ہے۔ رنج و مصیبت کی کثرت انسان کو بے پروا بنا

دیتی ہے اور وہ ان کا خور ہو جاتا ہے۔ چنانچہ غالب کہتا ہے۔

رخِ سبز سے غم کو ہوا انسان تو مٹ جاتا ہے رخِ مشکین مجھ پر ہاؤں اتنی کہ آسماں ہو گئیں

زندگی کے ہر لمحے میں اور انسان کے ہر فعل میں نیت و ارادہ اور غلوں کو دیکھنا چاہیے۔ اور اگر مقصد پورا ہو جاتا ہے تو سطحی باتوں کو موضوع بحث و تکرار نہ بنانا چاہئے۔

وفا داری یہ شرط استواری اصل ایمان ہے

مرے بت خانے میں تو کعبہ میں گارو برہمن کو

اگر کوئی نہیں برا کہے تو اس پر دھیان نہ دینا چاہئے۔ اگر کسی کو غلط راستے پر چلتے ہوئے دیکھا جائے تو اس کی رہبری کرنا قاعدہ انسانیت ہے۔ اور چونکہ خطا و قصور ہر شخص سے سرزد ہونے کا امکان ہے اس لئے

غفور و درگزر اچھی صفت ہے۔ دنیا میں ہر شخص کو احتیاجات ہیں اس لئے کوئی کسی کی ضروریات کہاں تک پوری کر سکتا ہے۔ ان خیالات کو غالب کی ربانی سینے سے۔

نہ سو گر برا کہے کوئی نہ کہو گر برا کرے کوئی

روک لو گر غلط چلے کوئی بخش دو گر خطا کرے کوئی

کون ہے جو نہیں ہے حاجت مند کس کی حاجت روا کرے کوئی

چاہے حوادث کی کتنی ہی کثرت کیوں نہ ہو ان سے خوفزدہ ہونے کی ضرورت نہیں کیونکہ یہی حوادث ہمیں سن دیتے ہیں۔ ان ہی سے ہم تجربات حاصل کرتے ہیں اور آئندہ کے لئے احتیاط سے کام لیتے ہیں۔

اہلِ بخشش کو ہے طوفانِ حوادث کتب

لغز موج کم از سبیلی استاد نہیں

مرد میدان دی ہے جو خطرات کو آواز دے کہ وہ آئیں اور اس کے غم وار ادہ اور پامردی کا امتحان لیں۔
موانعات رخصت ترقی کے لئے تیزیانے کا کام کرتے ہیں اور مشکلات میں گھر کر انسان خوش ہوتا ہے کہ اسے
اپنی ہمت کے منظر ہرے کا موقع مل گیا ہے

ان آبلوں سے پاؤں کے گھر گیا تھا میں
جی خوش ہوا ہے راہ کو پر خار و یکہ کر

بعض لوگ بہت جلد مایوس ہو جاتے ہیں۔ حالانکہ اگر مقصد کے حاصل کرنے میں انتظار ہی کرنا پڑے تو اس زحمت
کو بھی گوارا کر لینا چاہیے ہے

نفس نہ انجمن آرزو سے باہر کھینچ
اگر شراب نہیں انتظار ساعندہ صبح

غالب کا خیال ہے کہ عبادت، عبودیت کے اظہار کی خاطر کی جانی چاہئے۔ جنت کی خاطر عبادت کرنا،
عبودیت کی شان نہیں۔ اس لئے وہ کہتا ہے کہ بہشت کو دوزخ میں جھونک دینا چاہیے تاکہ لوگ صرف اندر
کے لئے عبادت کریں۔

طاعت میں تار ہے نہ مے دانگیں کی لاگ
دوزخ میں ڈال دو کوئی لیکر بہشت کو

غالب کے نظریہ حیات اور لافانی پیام کو مختصر آویں بیان کیا جاسکتا ہے کہ زندگی کے سنوارنے میں عشق
کا بہت بڑا حصہ ہے کیونکہ وہی روفت ہستی ہے اور اسی سے دنیا قائم ہے۔ ہر چند انسان بے بس اور غمزدہ و غم
کا مالک ہے لیکن اگر وہ چاہے تو اس فرصت زندگی میں بڑے بڑے کام انجام دے سکتا ہے۔ عشق ہی کی بدولت
دشت امکان ایک نقش پانظر آتا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ رنج و غم اسے زندگی میں واسطہ بڑھتا ہے لیکن اگر
عزم و ارادہ ہو اور دل کی عزت نگاہ ہو تو یہ آلام و مصائب راحت و آرام سے بدل سکتے ہیں۔ انسان کی
معراج کمال یہی ہے کہ وہ اس ذات میں فنا ہو جائے جس کا ایک پر تو ساری دنیا اور وہ خود بھی ہے۔
مختصر یہ کہ اگر زندگی میں رنج و غم نہ ہوتے تو زندگی کا مزہ حاصل نہ ہوتا۔ رکاوٹیں نہ ہوتیں تو انسان کو
سچی پیہم کا خیال نہ آتا اور موت لازم نہ ہوتی تو دنیا میں یہ گرا گری اور پہل پہل نظر نہ آتی۔

محمد منظور احمد

محبت کی جھانوں۔ مرزا ظفر الرحمن صاحب فی کے پڑاؤہ افانوں کا دھچپ مجموعہ ہے۔ اس کے جملہ مضامین
عشق و محبت کی دولتہ انجیروں اور حسن و حجاب کی رعنائیوں سے معمور ہیں۔ نوجوانوں کے نصب العین معاشرہ کی
سچی تصویر اور مصروف زندگیوں کے لمحات فرصت کے لئے ایک شائستہ ذہنی تفریح ہے۔

چھوٹی قطع (۱۳۲) صفحات قیمت جلد ص ۴

احساسِ مجبُو

وہ چنگاری کہ جس کی آگ سے خرمن بڑھائیں وہ دل جس کو ہڑکتے ہی ہزاروں دل دہرائیں
ترے ہاتھوں فرزاں ہو تو کچلا بھی نہیں سکتا!

مرے لب کے تبسم کتنے ہونٹوں پر کبھرتے ہیں مرے نغموں کے نشتر مکتے سینوں میں اترتے ہیں
میں اپنے دل کو لیکن آپ بہلا بھی نہیں سکتا!

دھواں شاداب سیوں اٹھا سکتا ہو محفل میں ہزاروں تیر میں پیوست کر سکتا ہوں ہزل میں
ترے ہی رُخ لیکن تجھ کو دکھلا بھی نہیں سکتا

فضائیرے فانوں سے فسانہ ساز ہوتی ہے مرے نغموں سے فطرت گوشِ برآواز ہوتی ہر
ترے ہی گیت تیرے سامنے گابھی نہیں سکتا

مرے ہی اشک میری آنکھ چھلکا بھی نہیں سکتی مرے ہونٹوں پہ خود میری ہنسی آکھی نہیں سکتی
ترے آگے ترا افسانہ دہرا بھی نہیں سکتا

حرم سے دور جانا، تنگدے سے دور تر جانا بہت آساں ہے مجھ کو ان دیاروں کا گزر جانا
مگر تیری وفاؤں کے محلِ دُعا بھی نہیں سکتا

تری دنیا کہ ہے نعمت میں نعمت کی دنیا مری صبحوں کی دنیا ہے نہ میری رات کی دنیا
مگر میں ہوں کہ اس دنیا کو ٹھکرا بھی نہیں سکتا

ترے نزدیک اگر چاہوں تو خود آ بھی نہیں سکتا تجھی سے دور تجھ کو چھوڑ کر جا بھی نہیں سکتا
تجھے کھو بھی نہیں سکتا تجھے پا بھی نہیں سکتا

شور

ادبی رجانات کا تجزیہ

کی آخری ساخت یہی وہ درمیانی زمانہ ہے جس کے بعد اردو ادب میں انقلاب پیدا ہوا۔ اسی دور میں وہ مشہور شاعر میر تقی میر کا رنچو آتی ہیں جو ہم عصر تھے جو بے شک دیکھتے تھے رجانات کی ترجمانی کرتی ہیں ذوق اور غالب۔ انھوں نے غلط اور اصلاح میں جو فرق ہے وہی ذوق اور غالب میں ہے۔

ذوق پرانے ادبی دور کا آخری آئینہ ہے۔ اور غالب کی شاعری نئے دور کی پینا میر۔ اسی دور کی کہ جس کے پیا فی حالی سرسید پر مجبور اور قابل ہیں۔

غالب کی حیثیت غزل میں مخصوص رہنے کے باوجود ہر طرح آزاد ہے ان کے اشعار ان کا قصوف و غفلت، طبع، ذوق، غرض ان کی ہر چیز میں ذوق نمود و حرکت جیسا ہے جو اس سے صمد یا سلاں پہلے کے سکون کو ختم کرتی ہے۔

اس انقلاب کی کہیں سرسید نے کی۔ یہ سرسید ہی کی کہ جس نے پہلی بار ان کے اسلوب بیان کا رخ بدل دیا اور ان میں آزادی، انسانی اور سادگی پیدا کر دی۔ سرسید کا سادہ خالی نہ دیا وہ ابھی وہ ان کا پر دہ ہے جس نے زمانے کے اقتضا سے واقف ہو کر اردو غزل نگاری کی طرٹ توجہ کی اور زبان کی اہمیت ہمیشہ کا قدر کی کہ توجہیں اسی زمانے میں پریم چند پیدا ہوئے تھے اور ان میں مختلفانہ نگاری کا موجد ہے۔ پریم چند کی فن کی کی چیز ہے۔

صدا حقیر کا انداز اس بات سے ہوتا ہے کہ کسی نے اپنے فن کی نیوایں کچھ اس طرح رکھیں کہ سلی غزل سے دیکھنے والوں کو کچھ احساس نہیں ہو سکا کہ وہ مغربی افراط نگاری سے استہزاء پر چند کی جھجک کئی رنگوں کی تیرہ شمس سے بنی ہے۔ ان کی انداز نگاری فنی حیثیت سے اردو میں ایک نئی چیز ہے۔

اس سبب ان کے افسانوں کا انداز کچھ اور متضاد تھا۔ ان کے خیالی باتوں کی ساری چیزیں مخصوص تھیں جن کو انھوں نے دیکھ لی تھی اور انھوں نے محبت سے جو۔ پریم چند نے ہماری زندگی کو اپنا فن بنایا اور اردو ادب میں واقفیت نگاری کو رواج دیا جو

ادب زندگی کی تصویر ہے اور اس کے ہر پہلو کی۔ ادیب کا فرض ہے کہ انھیں کے اعتراضات اور مواظقت کے رجحانات۔ نئے لکھنے کے لیے ادب کو گورکھ و صدرا سانا دیا ہے۔ ان باتوں کے پیش نظر ادب کے نفاذ و مستقبل سے امید رکھنا سیکار ہے۔ انھیں کا یہ خیال غلط ہے کہ ترقی پسند موجودہ دور کی پیداوار ہے۔ دراصل ترقی پسندی کوئی جدید چیز نہیں۔ عام لفظ کا یہ ہے یہ انسانی فطرت کا خاصہ ہے اور یہ معلوم کرنا دشوار ہے کہ ایسے ادیب کی ابتداء کب اور کبکہ ہوئی کیونکہ زمانے اور دور میں ادب میں ترقی ہوتی رہی۔ ابتداء میں کہانیوں کی بنیادیں کھوکھلی تھیں۔ ان کا مقصد زندگی کی عکاسی کرنا نہیں تھا چنانچہ اس زمانے کی کہانیاں ”سیرالہیان“ ”گلزار الشیم“ ”دیوین کسار“ ”فنون البشر“ اور ”مجموعہ عقول“ جیسا ہیں اور وہ روم و مصر کے افسانہ جہان کے دیوتاؤں اور عجیب و غریب انسانوں کی مشق انھیں کر لیتے ہیں جن کی شکایت کو قیاس سے آئے ہوئے مقدمہ میں انسان کا جدید پری مل کر رہے ہیں۔

مگر زمانے کے ساتھ ساتھ خیال اور ادب دور دور میں بدل جاتی گئی اور اردو شمس بھی انقلاب آیا اور فنی کے اسی شاندار باب کا نتیجہ حال اکو مستقبل میں ہمیں ان ادیبوں کا کچھ جو ضروری ہے جنھوں نے اپنی زندگیوں ہماری زبان کی شاعری میں صرف کر دی تھیں۔

اردو کی نو مت غالب نے زیادہ کی ہے غالب اردو زبان کا بہت بڑا معمار ہے کیونکہ وہ ایسے دور میں پیدا ہوا جبکہ مغل سلطنت اپنے زوال کے آخری مراحل میں تھی اور فنی اور فنی شمس عمل جمود ہی تھی۔ پرانا دور ختم اور نیا دور شروع ہو رہا تھا۔

غالب کا زمانہ ایک ایسا دور ہے جس میں غریب ختم ہوتے ہوئے دور کی آخری شکست تھی اور نئی شمس

زوال کا ہے اس لئے فن کار کو مشرق اور مغرب سے کچھ نہ کچھ ضرور سیکھنا چاہیے۔ اور اس امتزاج سے اگر زندگی کی حسیات کی تحریر ہو سکتی ہے تو۔

مشرق سے ہو بیزار نہ مغرب سے خدکار
فطرت کا اشارہ ہے کہ ہر شے کو جو کر
چنانچہ اقبال نے ان رجحانات کو اگے بڑھا لیکن اس کا مدد سے آج ہم فنر کے اتنے قریب ہیں۔

جب زندگی بدلتی ہے تو آرٹ بھی بدل جاتا ہے اور اس کسی کو انکار نہیں۔ بے شک ترقی پسندوں کا شعری اہلیہ نیلے، انسانہ اور موضوع سخن نیلے ہیں اس پر بھی وہ حکمت راجح زیبائے غافل نہیں۔ ان کی داستانوں میں کینٹاپ بھی موجود ہے۔ ہاں ساتی بدل گئے ہیں اور شراب بدل گئی ہے لیکن یہ تو زندگی کا خاصہ ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ قدیم ادب کے ”دلدادہ“ اسی بدلتی زندگی کا سنا دینا نہیں چاہتے اور اسے ترقی کی طرف تیز قدم ہونے کی بجائے اسی پرانی ڈگر پر ڈالنا چاہتے ہیں۔

نئے ادب کی شعری تعلیقات نے ہندی اور ترقی کی بہت سے مدارج کو کمرے میں لے کر لئے ہیں اور ان تمام تعلیقات سے قصورات کو ابھارا ہے جو عرصہ دراز سے قوم کے سینے میں موجزن تھے جیسے ٹیکوڑ، اقبال، جوش اور لکڑا اسلام نے عصر جدید کی زبان دی ہے اور جسے نئے ادب کے شعرا نیت سنہ روپ میں پیش کر رہے ہیں۔

ہمارے ایک موضوع کا خلق ہے نثر اور فکر جو آج تک نظر آئے ہیں گورو جانی تاثر، حسن، جان اور نازکی طبع انصیب کے وہ دھجڑا صفت ادب کے جسے میں کم آتی ہے۔ ہاں موضوعات کی انقلابی نوعیت کے پیش نظر ترقی پسند فن کاروں نے شعری اسلوب کو بھی ایسے سانچے میں ڈھال دیا ہے جو کہ موضوع کا ساتھ دے سکے اسی شعری اسلوب کی تبدیلی نظر معترایا آزاد نظم کی سموت میں ملو کر ہوئی ہے اور اسی پر آج کل اس قدر اعتراضات ہو رہے ہیں اور جو عرصہ میں اور

بالکل نئی چیز تھی۔ وہ زندگی کے ہر پہلو، ہر رخ اور ہر سمت پر روشنی ڈالنا ہے اور ساقی پر پیغام بھی دیتا ہے۔ اصلاح کا پیغام۔

پیرچند نے اردو انسانوں میں کردار نگاری کو زیادہ اجاگر کیا ہے۔ اصل نے خود کو بچھلکھا ہے وہ بہت بڑی خدمت ہے کہ اس سے بھی بڑی خدمت یہ ہے کہ انھوں نے اردو ادب میں کچھ ایسی روایتوں کی بنیادیں ڈالیں جو دیگر افغانہ نگاروں کے لئے خضر راہ بنیں۔

جس طرح پیرچند وہ توفیق کو لاتے ہیں اسی طرح اقبال کی شاعری بھی وہ توفیق کو لاتے ہیں بلکہ اس میں ہر تمدن کا جو موجود ہے۔ ان کی شاعری، ترقی پسند شاعری کی حرکت ہے۔ ان کے ادب کا نظریہ ترقی پسند ادب کے نظریہ سے بہت زیادہ قریب ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے انیولی نسل کے توفیق کی ہے۔

سلطانی جمہور کا آتا ہے زمانہ
جوشش نہیں تم کو نظر آئے شادو
اور اسی توفیق پر انھوں نے سلفین کے ادب کا پیچلے پر ہے
خیر مقدم کیا ہے۔

ہوائے دشت سے بونے رفاقت آئی ہے
عجب نہیں ہے کہ ہوں میرے ہر جھان پیدا
اور آج کل کے تراشوں نے یہ بھی کہہ دیا ہے۔

گئے دن در تہا تھا میں اجسم میں
ہاں اب میرے راز و دل اور بھی ہیں
اقبال نے عقیدت شاعری کے موضوع کے لئے مختلف تجویزیں تجویز کی ہیں۔

عشق اب پیروی عقل خدا داد کرے
آبرو کو کچھ جہاں میں نہ برباد کرے
کیا بالکل ہی تصور ترقی پسند شاعری کا نہیں ہے؟ تقریباً تمام صاحب عقل و فہم کو ترقی پسند شعرا اور ادیبوں نے اقبال کی رہنمائی کو خراج عقیدت پیش کیا ہے۔ چوتھہ یہ زمانہ

پرانے نقادوں کی شدید بحثہ چھٹی کا مرکز بنی ہوئی ہے۔

سب سے پہلا اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ موجودہ شعرا میں "شاعری" کی قابلیت نہیں۔ گویا شاعری فطری نہیں بلکہ سیکھ کر پزیر ہے، جس کا ثبوت یہ ہے کہ انھوں نے قافیہ و ردیف کا بندھنوں سے اپنے آپ کو آزاد کر لیا۔ دوسرے یہ فریق پر یوں کہہ جاسکتا ہے کہ چونکہ شاعری بغیر قافیہ و ردیف کے ممکن ہے اور اس کے بغیر شاعری شاعری ہی نہیں اور موجودہ شعرا (جنہیں شعرا کہنا بھی درست نہیں) اسے باہر نہیں کھینچ سکتے انھوں نے اپنی آسانی کے لئے نظم معرا ایجاد کی۔ یہی وجہ ہے کہ آج کل ہر طرف شاعر نظر آ رہے ہیں کیونکہ اس منصف نظم میں قافیہ و ردیف کے قیام نہیں۔ اسی سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک نظم معرا شاعری کی قسم نہیں یا اسے شاعری نہیں کہہ سکتے۔ ہم اپنے ان نرگوں کی خدمت میں عرض کرنا ہے کہ آپ کی قابلیت ممکن آپ کا مشاہدہ نظم معری پر ہی دو سرا اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ اس صفت نظم کے نہیں، تاہم ہم اپنی بات منقطع نہیں۔ جس طرح تال راک کے لئے ضروری ہے اسی طرح قافیہ شاعری کی جان ہے۔ مجھے تال کے بارے میں اعتراض ہے۔ یہ بات غلط ہے کہ تال کے بغیر غزلیہ، نغمت نہیں کیونکہ نغمت کی دو صورتیں ہیں پانچاد اور آزاد۔ آزاد کو ہم "الاف" بھی کہہ سکتے ہیں اور ابلی فن جانتے ہیں کہ الاف جب میں راک کا مکمل شکوہ موجود ہوتا ہے اسے تال کی ضرورت نہیں۔ ستار پر شروع میں یہی "الاف" بغیر طبلکے مدد کو ادا کیا جاتا ہے۔

اب ترنم کو لیجئے۔ صوفی اعتبار سے ہر نظم میں ترنم ہوتا ہے اور ترنم کے لئے شریانی نظم کی قید نہیں جو کہ دونوں میں ترنم ہوتا ہے اس۔ دونوں ملکیت میں کاغذ جاسکتے ہیں۔ اس طرح اگر آپ جملہ اصوات کے ایک مرکب کو کسی موسیقار کے حوالہ کیجئے وہ اس میں "نیت" کی روح نمودار ہوگی۔ اس اعتبار سے نظم معرا اسلوب شاعری کی بہترین شکل ہے۔

بعض کرم فرما یہ اعتراض کرنے سے بھی نہیں چوکتے کہ آزاد نظم مغرب کی نقالی ہے اور ہماری قدیم تہذیب اس کی روایات اس نقالی کی شکل نہیں ہو سکتیں۔ مغرب کی نقالی کا طعنہ اکثر تنقید نگاروں کا شیوہ ہے اور ترکیب و انداز کا ہر شعبہ اس کا نشانہ ہے۔ ہمارا انداز فکر اسانید بیان موضوعات اسب کچھ مغرب سے چرایا گیا ہے اور اس میں ہمارے ذاتی جہر مستعدا، انج یا وطنی ماحول کا پھر تغلق نہیں، اور اگر یہ الزام ہی غلط ہے جس کی آگے چل کر تردید کی جائے گی فی الحقیقت مجھے صرف یہ کہنا ہے کہ جب ہم زندگی کے ادنیٰ سے اعلیٰ ترین شعبے تعلیم، سیاست، صنعت وغیرہ میں مغرب کی نقالی کرتے ہیں تو ادب کو کوئی کمر اس سے الگ رکھ سکتے ہیں۔ کیا دینی ہوئی زندگی کے ساتھ ادب نہ بدلے گا۔ کیا ادب تاریخی قوتوں کے ہوا کے ساتھ نہ بدلے گا۔ یا ماضی کا رکی مٹی پر طبری دلدل بن جائے۔ اور ماضی کی طرف نوناٹے والے غریب ملک کو ادب کو کیا فائدہ پہنچا سکتی ہے۔

اور یہ الزام غلط ہے کہ آزاد نظم مغرب کی نقالی ہے کیونکہ نظم معرا مغربی ایجاد نہیں جس طرح انسان نے کی ایجاد سہرا ہندوستان کے سر ہے اسی طرح نظم معرا بھی ہندوستان ہی کی ایجاد ہے کیونکہ گود جو نیکی و دیو گریں انسانی کتاب سمجھی جاتی ہے نظم معرا کا بہترین نمونہ ہے اسی طرح آزادی گیتوں سے لیکر کلاؤس کی شاعری نظم معرا کی شاعری ہے اس طرح نظم معرا مغرب کے نام سے مستعار لیا اور آج عظیم الشان روایت جو قوی ادب کی بنا پر ٹوٹ چکی تھی پھر سے سارے کی جاری ہے تو کیا ہے اس کے کہ اس کو کوشش کی داد دی جائے اور بنظر کمین دیکھا جائے انا اواز سے کہے جاتے ہیں اور مغرب کی نقالی کا طعنہ دیا جاتا ہے۔

ترنم پسند شاعروں میں غزل سے اب وہ دھیمی باقی نہیں ہے بلکہ اس دور کی ذہنی و روحانی مسماہی اور سماجی زندگی کا عکس اپنی نظموں میں پیش کر رہے ہیں اور جوش، سحر، تہا، سانس، تہیج، سرور اور انتہائی تعلقیوں

وہ اپنے اختراع لغو میر ہے۔

زبان اردو کے بہت کم افسانہ نگاروں کو نصیب ہوا کہ ان کے آرٹ کی طرح اس کی نظر نگاری کا کمال بھی اس کے ناول کی شکست میں زیادہ نمایاں ہے۔ منظر نگاری میں اس کے افسانوں کا پس منظر جویشہ شیر کی حسین ادویہی ہے۔ خوش اور بہترین منظر نگاری آپ کو "گرچن کی ایک شام" اور زندگی کے موڑ پر "بانگونی" میں نظر آنے گی۔ اس کی تحریر کا اعتبار ملتا ہے۔ مختصر جو دل کی گہرائیوں تک اترتا ہے۔ سب سے بڑا اثر ان کی اس کی چوٹ سے ہے کہ انھیں ہوجانا ہے۔ مولا جانا ہے۔ اس کے فطریہ انسان کی غلط روی کا اظہار ہوتا ہے۔

راجا ایک سنگو بی بی کے افسانے کے گوشہ و انصاف کی طرف سے بھی رہیں۔ اس کا محور زمانہ کی زندگی ہے۔ وہاں کے مسائل گندی معاشرت کے عین میں اور کوئی ترقی پسند ادیب اس کا مقابل نہیں۔

دیو دستیار بھی کو اس کی "غنا بدوشی" نے افسانہ نگاری بنایا ہے۔ اسی لئے اس کے افسانوں میں "غنا بدوشی" زیادہ ہے۔ مگر غنا بدوشی کے ساتھ ہی ساتھ وسعت اور اہلیان بھی ملتا ہے۔ وہ اپنے موضوعات کے لئے ایسی چیزوں کا انتخاب کرتا ہے جس پر آج کے مسلمان غما کیا ہو۔ دین و دین کے گہرے متعلق کرنا اور انہیں ترمیم و ترمیم سے پیش کرنا اور ان ایتوں کے لئے ہیں وہاں کی تہذیب تمدن و رسم و رنج و غیرہ سے۔

دیو کی طرح اور چند افسانہ نگار بھی متوسط طبقہ کی زندگی کے ترجمان ہے۔ متوسط طبقہ کے ہندوؤں کی معاشرت کی بنیادی جائگہ تصویریں افسانہ نگاروں کے علاوہ اتنی خوبصورت کی کہ انہیں ان کی کہیں اس کے افسانوں میں کہ دار نگار بھی سمجھا جائے۔

اختیار احمد اسی اپنے افسانوں کے اردوں کی حرکات کا تجزیہ کرتے ہیں۔ ان کی حرکات کی کاہل ان کی ان کی کیفیات ان کی خواہشات کے عالم کی ان کی انہیں

اب ترقی پسند ادیبوں پر بھی نظر ڈالئے۔ موجودہ دور کے بول اور افسانہ نگاروں میں کرشن چندر راجندر بیدی اور چندر اشوک دلوڈر سید قتی سعاد حسن منظر خصوصیت کا مصنف احمد بھٹناگی اختر انصاری حسن مسکری وغیرہ ان میں سب کا اثر افسانہ نگار ہے لیکن ایک بات میں سب متفق ہیں اور وہ یہ کہ سب زندگی کو قریب سے دیکھتے ہیں اور اس کے مختلف پہلوؤں کی تصویروں کو مختلف رنگوں کی تصویر کشی سے اجاگر کرتے ہیں۔

ان تمام ادیبوں میں کسی کا بھی نام نہیں دیا تو مصنف کا مقصد یہ نہیں تھا کہ کرشن چندر کا ہے۔ اس کی جو ان کی لکھی ہوئی باتوں میں افسانہ نگاری ہے جو ان کی طرح ہے۔ مگر شیخ نے اور اسی پر ان کے ان کے لکھی ہوئی افسانوں میں ان کی تحریر کی دل آزاری نہیں کرتی وہ دوسرا اثر ان کا کہہ رہی ہے۔ مختار دیکھتے ہیں کہ ان کے افسانے زندگی اور ان کے زندگی کے مسائل ان طرح حل کیے ہیں کہ وہ ان کے افسانہ نگار نہیں کیا جاسکتا یہ بات ایک بار دہرائے کسی ادیب کو حاصل نہیں ہوتی۔

کرشن چندر نے افسانہ نگاری میں جو رنگ پیدا کیا ہے وہ بالکل نیا ہے۔ اس وقت کرشن سے زیادہ کامیاب افسانہ نگار نہ ہو سکی ہیں۔ اس لئے اردو افسانہ نگاری میں بالکل نیا رنگ مل گیا ہے۔ جو ان کی بہت قریب ہے اور اس کی بہترین مثال اس کا افسانہ "دو رنگ مٹی" ہے۔ "انے" مجھے ہے۔ افسانے میں ساری انسانی زندگی پرست ہے ہر طبقہ ہر آدمی کا تہہ پر کیا جاتا ہے۔ اس افسانہ کا ہر پہلو مراد ہے۔ ہر طبقہ کے ہر آدمی اور ان کی حالت ساری دکھائی دیتی ہے۔ ان دنوں ان کا لکھنا کہ قسطے لکھنے کی نئی

تہذیب ہے۔ ان میں چھوڑا، سبک دیا اور مزہ اور ان کی پیش ہے۔ ان کی چھوڑا، سبک دیا اور مزہ اور ان کی پیش ہے۔

کرنا جوت پسندوں کی طبیعت میں داخل نہیں۔۔۔
غرض کہ ہماری افسانہ نگاری نے باوجود ہزار محکبات کے بہت جلدی ترقی کی مگر میں ملے کی ہیں اور اب ہر ملک کی افسانہ نگاری کے دوش بوش ٹھٹھکی ہو سکتی ہیں اس میں شک نہیں کہ اس کا چراغ مغربی افسانہ نگاری سے روشن ہوگا لیکن بقول توکم کے ”ہم نے فن کی باریکیاں مغرب سے مستعار لی ہیں۔“

”ہم نے فن کے خطوں میں ہندوستانی
رنگوں کو ساما ہے۔ ہم نے اپنے دیہات
کی کچی ٹھٹھکیاں پر اسے لیشی نقوش
ہیں۔ ہم کا لالہ انہیں دیتے۔ سچائیاں
بیان کرتے ہیں۔ ہم عریانی کے شہیدا
ہیں ہم یہ کہنا چاہتے ہیں کہ آپ سطح پر
تیرنے کی بجائے تھول میں چاہیے۔ زندگی
عمیق ہے اور صاف ستھری سطح پر پھرنے
والوں کو یہ احساس دلانا بہت ضروری
ہے کہ تھول میں بنائیں بھی ہیں اور وہ
خوفناک روئیدگی بھی ہیں زندگی
پھر پھر جاری ہے۔۔۔۔۔“

بیشک اس میں زندگی کے آماد سارگی سی گہرائیاں ہیں۔
اس میں چمکتے ہوئے جذبات و احساسات کی سی پانی
تریاپ ہے غرض اس میں سب کچھ ہے۔
نئے ادب میں بلاشبہ ایک چیز کی کمی ہے اور
وہ ہے طریقیہ مصرعے اور اب میں شاعری انشا نہیں۔
اس کے نشین کا زائے سرت آگس نہیں بلکہ غمناک ہیں۔
انسانیت کے اس جلتے سلگتے دور میں۔ جلو وار لاشوں اور
کراسے ہوئے ڈھانچوں کی زندگی کی تصویریں۔ اوبار
وتیر کی کی طویل داستان۔ انسانی معاشرت کا ذوقناک
تجزیہ۔ یہ ہیں نئے ادب کے نشری کارنامے جنہیں پھر
بعض اوقات طبیعت اکتا جاتی ہے اور جب ایک نئی دنیا

ہمارے سامنے پیش کرتے ہیں۔ ان کا خاص امتیاز جزئیات
نگاری ہے۔

امروزہ ہم کو سنی نے پنجاب کی دیہاتی زندگی کو پیش
کیا ہے۔ اس کے فن میں سادگی اور معصومیت پائی جاتی ہے۔
دیہاتی دو شہزادوں کے حسن کا بیان، دیہاتی نوجوانوں کے
جذبات کی تصویر کشی اس کی افسانہ نگاری کو بہت دلکش
بنانے ہوئے ہے۔

اب روئے سعادت، عصمت اور حسن مسکری، قیصر علی
افسانہ نگاری میں ایک نئے باب کا افتتاح کیا ہے اور کچھ
سب طبعیات کے متعلق لکھتے ہیں۔ شاید ترقی پسند ادب کے کسی
شعبے پر اتنا اعتراض نہیں کیا گیا۔ ہم دنیا کے جذبات سے
متعلق ادب پر کیا گنا ہے۔ یہ اعتراض ایک دہائی تک نہ تھا
ہے گزشتہ نظری سے کام لیتے کہ ہمیں معلوم ہو گا کہ ادب
میں عریانی آج کی چیز نہیں۔ پرانے شاعروں پرانے نثر نگاروں
اور پرانے ادیبوں نے طبعیات ہی سے متعلق لکھا ہے۔ دنیا کا
بہترین ادب بھی اس سے متعلق نہیں۔ کرشن چندر، فراسے
وضاحت سے لکھا ہے میں دنیا کے بہترین ادیبوں کا ذکر
کر رہا ہوں۔ شکیلیہ سے لیکر روڈن تک، گوئٹے سے لیکر
زنگے تک۔ پرانے آریائی گیتوں سے لیکر کابیر اس تک ولی دلی
سے لیکر مکرادفا باو تک ہمارے دنیا کے بہترین ادب کا
مجموعہ اور عورت کی ذات ہے ہر غزل کو اپنی غزل کے
پروردہ ہونے میرے شریں شربت وصل کا چاہنا نظر آتا ہے۔
اس پر بھی لوگ ترقی پسند ادب پر عریانی کا الزام لگاتے ہیں۔
در کیا کہ ترقی پسند ادیبوں نے عورت کی اہمیت کو اپنے ادب
میں پکاس کی صدی کہ کر دیا ہے۔ وہ پرانے ادیبوں کی طرح
شریبت وصل کا رونا نہیں دوتے پانی روتی، اوہو پاپ ایک
کھلا مکان صاف تھرے کا رخاے اور غمروں سے لائے ہوئے
قدن، جلو انسانیت، محبت، اشتہاک عمل سب کچھ
ہیں جن سے ایک نئی دنیا تعمیر ہو سکتی ہے۔ لیکن کیا کیا جانے
یہاں نوا اعتراض کرنا معصوم ہونے سمجھنا اور سمجھ کر اعتراض

عمل کی پیداوار نہیں؟
 "خوشنئے ادب کی آنکھ صرف حسرت و یکس کے مناظر
 نہیں دیکھتی۔ محض افلاس و ادب کی خوشنک کالی گھٹاؤں
 کا نظارہ نہیں کرتی بلکہ ان ہولناک تاریک گھٹاؤں کے پرے
 اس تانک روشن کیکر کو بھی دیکھ رہی ہے جو زندگی کے لئے
 ایک نئی مثال ہے۔ وہ ہے جو انسانی دکھوں کو کم کر دیتی ہے اور
 کائنات میں اجتماعی مسرت کی بنیاد رکھتی ہے اور انسانی
 حیات کی تاریکی میں تاروں کی روشن کیکر بچھ دیتی ہے۔"

نجمہ سمیع اللہ شہنا

کی تلاش میں ان نظریوں کا مطالعہ کرتے ہیں تو یہ ادب
 اسے جو اسی دنیا میں پہنچاتا ہے اور اسے مجبور کرتا ہے کہ
 اپنے گرد و پیش کے ہول پر غور کرے۔ بقول کرشن چندر۔
 "اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ جب تک کہ دنیا کی خوشیاں
 اور اس کے آرام ایک مخصوص کلسیلہ طیفیہ تک محدود رہیں گے
 اور انسانوں کی آوازیں کا بیشتر حصہ ان سے محروم رہتے گے
 نیا ادب اسی کی کڑھکوں کو تار رہے گا اور ہر لحظہ اس خوشنک
 محرومی کی طرف آپ کی توجہ دلاتا رہے گا کیونکہ نیا ادب مر مر میں

نیاز زمانہ

ادبیر قاضی عبدالغفار

گزشتہ چند سال میں ترقی پسند ادب کی تحریک نے اتنی کافی ترقی کر لی ہے کہ اس کی ترجمانی کے لئے متعدد
 رسائل کی ضرورت محسوس ہو رہی ہے۔ چنانچہ اس خیال کے، نظر حیدر آباد سے ایک میٹھاری سہ ماہی رسالہ
 "نیاز زمانہ" جاری کیا گیا ہے جسے بعض مشاہیر اہل قلم مثلاً ڈاکٹر عبدالحلیم، پروفیسر امتیاز حسین، کرشن چندر اور
 فضل الرحمن صاحب، حیدر آباد کی علمی تائید حاصل ہے۔
 اس کا پہلا شمارہ اواخر اپریل میں شائع ہو گا۔ ہمیں توقع ہے کہ ملک کے وہ اہل قلم جنہیں اردو ادب
 اور خصوصاً ترقی پسند ادبی رجحانات سے ہمدردی ہے اس طرح توجہ کر کے جلد از جلد افسانے، مضامین اور نظمیں
 عنایت فرما کر اپنے مشوروں سے ہمیں مستفید ہونے کا موقع دیں گے۔

مفجر "نیاز زمانہ" مکرم جاہی روڈ حیدر آباد دکن

کیے میں

میں عجالت عجلت سے نصرت ہوا اور جھپٹ کر کیتے پر
سوار ہو کر چل پڑا۔ چلتے کیتے میں اکلیا بیٹا سوچنے لگا، تم بھی آدمی
ہو، وقت پر کچھ نہیں کر سکتے۔ پھر سوچتے ہو کیوں نہیں کر سکتے؟
بیٹے سوچا کہ وہ کچھ نہیں تم کچھ ہو۔ ہاں تو سیدھا صاف اٹھا کھیلے
چلے آئے بڑوں کے چرن تو چھوٹے ہوئے۔
اب کیل راپٹا اور کیک بان اپنے چھوٹے کو
ایک ایک کر چلا رہا تھا۔ ٹھوڑا لہجہ لہو کیک کے چھوٹے کو ڈھانچا
کھینچ پھرا پھر غار کنار پر آجاتا۔ اور بنا کس کی شرک اور گلی اس
طرح باز ہوتی جا رہی تھی۔
سوچا۔ یہ کیا بات ہے جی کہ میں جاؤ اور چرواں
سے آجاؤ۔ پہلے تو نہیں جاؤ گی کیوں؟ اور اگر گلی پر چلے آئے
پہنچ جی گئے تو چرواں سے آجائے کیوں ضروری ہو جانا چلے
نہیں نہیں یہ سب گڑبڑ ہے..... یہ سب تماشا ہے۔" ادیس
نے کرنے سے بچنے کے لئے ایک دم کچھ کا ڈنٹا پکڑ لیا۔ کہا، ٹھیک
سے کیوں نہیں چلا آئے کیک۔ بولا۔ باجی جی تنگی کی سوجھی میں
کچھ ہوت ہے۔ اور مرگن میں کڑے کڑے جاتے ہیں۔ میں
کہا۔ گاڑی کے لئے ٹھوڑا وقت ہے ذرا کچھ بڑھائے بل۔
اس نے کہا۔ ہو..... ایک ایک اور ٹھوڑے کے کھڑے دایں
کان پر جا کر کاتھم بھی دوڑ سے مارا۔ ٹھوڑا اگلے پھروں پر بند
دے کر آگے بڑھا۔ دوڑا اور پھر پہلے کی طرح دم ہو گیا۔ میں
باس لکھے پینڈے پر کھینچ ٹپک کر اور ٹھوڑی ہتھیلی پر کھڑک
دھینچنے لگا۔ یہ مقام مذہب کی حتم جھوٹی سہاس کے چاروں طرف
کھیت ہیں اور باغیچے بھی یہ لال تیلیں منزل مکان کیبے خوبصورت
ڈنٹا میں کا بنا ہے۔ امدید محمد میں روز سانسے کاس میں غلط
خوبصورت مکان کو دیکھتی ہیں جس میں کراچی لوگ رہاں ہتی
ہیں، گالیاں بجاتی ہیں۔ اپنے مردوں کو نکیر اپنے بندہ گھوڑا
کھانڈ پھرس، گڑگڑ کو اڑھنا بھونکا ہنار سو فی ہیں اور دات

کاٹ دیتی ہیں۔ اور چرواں میں آکر اس لال محل کی غرائی اٹھاتا
کے سامنے ہستی اور چہل کرتی اپنا گوبہ باقی اور لوگ رہاں ہتی
ہیں اور ہم کہتے ہیں محبت۔ محبت کچھ سا کھتے ہیں
گلاب، ببل، شراب، محل کے کیکے کھڑے آئے اور
کہتے ہیں فرق، اشتیاق، آرزو، کسک، لیس، آہ، آواز، گنگ
دیگر کہتے ہیں جن، اجالیاں، اعداد..... لیکن یہ
محمد میں کچھ کو لیکر ان کشت دیکھے جاتی ہیں، گوبہ باقی ہیں
اور لوگ رہاں ہتی ہیں۔ ہستی ہیں اور لڑا جھگڑا کر رہتی ہیں
گالی گولج کر رہتی ہیں..... اور یہ مقدس شہر ہے اور باد
اور خوبصورت بھی تو ہے؟
میں نے کہا، کیوں رسے یہ بچا اور گھوڑا..... کیا اس
تو نے چلا چلا کر کچھ اپنے کیک پر لگا کر چلا رہا۔ گاڑی نہ لٹی تو کچھ
دھیلایا بھی نہ لے گا۔
کچھ والے نے جا کر کھڑا اور ایک سن مارا ایک فٹ
گالی دی ٹھوڑے نے دو فٹی جھاڑی اور پھر دوڑنے لگا۔ کیک وہاں
نے کہا اور بے بیٹے۔ اور اپنے بیٹے کے چٹے پر پیار
کے چار چٹکے دیئے۔
میں نے دیکھا جا کیک کا چوٹ پر گھوڑا ایک بار کچھ کر دیتی
جھاڑا ہے لیکن میں نے بھی تو دیکھا کیک کی تھیلیوں پر فوٹا
ہی اس کے بدن پر سرت، دوڑنے جاتی ہے، کھڑے کان کھڑے
رونگٹوں کی طرح کانچے ہیں اور اس کی چال میں تیزی آجاتی
ہے، کیونکہ اس نے جس سن لیا ہے۔ واہ میرے بیٹے! وہاں
ہوا چھپے کہ کیک کو کھینچتے خوشی سے سب کچھ چلا جا رہا ہے
سوچا، جا کیک کی چوٹ کیا جھوٹ ہے؟ ورنہ کیا میری ساری
تھکیاں جھوٹ ہیں؟ ایک ہی کیک والا اپنے ٹھوڑے کو کھڑا کر
ہے اور کوشی کچا کرتا ہے، اس میں کوشی بات جھوٹ ہے
اور کوشی سچ؟ کس بات میں وہ کیک حال لڑا کھینچا ہے اور کھار

اب کے زور سے میرا سر کس رکھا، اپنے بستر کے پلندے میں لگا خیر ہوئی کہ ٹرک میں نہیں لگا خیال آیا۔ دنیا خیالی نہیں ہے۔ یہ تو بنارس کا ٹیکہ ہے اور بنارس کی ٹرک ہے اس لئے اگر خیالی جافور بن کر بیٹھوں تو سخت غلطی کا مرتکب ہوں گا۔ میں نے کہا، سنبھال کر کیوں نہیں چلا تا رے یکاؤ؟ میں سنبھل سنبھال چو کہنا چو منبھل دیکھتا ہوں کہ ٹرک کو پارہوں کی جلدی نہیں ہے یکہ کے نیچے سے آگے سے چپک کے داغ کے لڑا ہوں دالی یہ بڑبا حالہ ٹرک بڑی داہمی وڑبھی چال سے ٹھسک رہی جو میں نے کہا کہ بڑبا حالہ ہے کہ ریل کا ٹکڑی دھن میں ہے..... ریل ٹکڑی کہ پھر تو ہے اور میں، اس نے ٹھوڑے کی پونچھ کے پاس ہاتھ لگا کر کہا ہو..... بڑبا یک..... ٹرک..... مجھ سے کہا، بابو کسا جاؤ؟

میں نے غرضی سے کہا۔ دلی۔
"دلی؟ اور وہ مجھے آگے جا کر دیکھنے لگا، بابو دلی! اس نے سمجھا ہوا کسوئے سے کہ کم مہجی دعوت دلی کی ٹرکوں میں لگی ہوئی، ایک بڑی بڑی دھڑکنے والی ہوں کہ اس احتجاج کے بعد پوچھا بابو تمہارے ہاں کیا ہو چکا؟ موت اسے؟ میں نے کہا چلو چلو کر چلاؤ۔" یکہ پس ہٹا۔ اور چل پڑا۔ بابو دلی میں غل کے بادشاہ ہوتے تھے۔ دلی دہلی۔ وہاں کلا اسے؟

میں نے کہا، مان وہی دہلی وہاں تھک ہے اور چاندنی چوک بھی ہے۔
"چاندنی چوک؟"
"خوب چوری..... کئی ہموار ٹرک ہے، ٹرا میں چلتی ہیں بڑی روتی سے تم نے نہیں دیکھی؟"
"بابو جا رہے چوک سے بھی بڑبا اسے؟"
"ارے دنیا میں ایک ہے؟"
"اچھا! اور وہ اپنے ٹھوڑے کی طرف دیکھ کر بولا، چل، بیٹے شاہینش۔"

اس انجی وہاں شخص کے دل میں دلی کی اہمیت جگا کر

ہے۔ میں نے یکہ دالے کو غور سے دیکھا، ہرے پر کچھ کلن ہوئے تھے جن سے یہ جاننا مشکل تھا کہ کونسی ٹھن کا دھڑک رہی ہے۔ اتنا کم تھا اور جاری بھی مٹنی ہو کر، ٹھنوں پر دیکھنے کی طرح چھائی غصیل۔ اور غور ٹی کی نوک ٹھن جادہ تھی۔ میں نے کہا، ٹرک سے نیارکس میں رہتے ہو؟

اس نے کہا، بابو کس ہو گئے تب ہی سے یہ جناور (جافور) میرے پاس ہے کھواتے دگا دگا، ہمیں دی۔ دیکھا، جناور سے کہہ کر پھر ٹھوڑے کو جو دھیا ہور ہا تھا، گالی دیکر ایک کوڑا لکھا کر دیا۔ ہت تیرے سالے..... مجھ سے کہا، بابو پورے دس ہوئی گئے اور ہم یہاں پڑی دھڑکی رہت آت ہیں..... یہ جناور بڑا مضبوط ہے اور میں کہنے چچ میں دھیا ٹرک پار کرنا ہوا ریل کے اسٹیشن کے قریب کھنی ہوا جا رہا تھا۔

"کیوں جی یہ کیا ہے؟ ابھی بنارس اور اسی کلٹ لیا؟ ریل میں بیٹھے اور کل دلی..... کیوں کل دلی اور آج بنارس؟ کیوں جی روز ایک ہی تھا ہر ٹرک اور ٹرکوں کا پوری طرح چین اور سکون نہیں؟ مگر کس لئے ایک بنیٹہ ٹھن ر ہا جائے؟..... ٹھن ہی کیوں ر ہا جائے؟ کیوں یہاں سے وہاں جھگٹے پھر میں اور ایک دن آئے کہ جہاں ہوں وہیں ٹھن سے ہو کر دھیر ہو جائیں۔ آخر یہی تو ہوتا ہے پھر کیوں نہیں اور بھا دہاں..... یہ ریل بھی تو عجیب تماشا ہے چپک چپک کرتی ہوئی ہر کھڑی ہو جاتی ہے اور کبھی ہے آؤ کو وہاں سے وہاں چلاؤ اور پانچ دس منٹ دیجاری چپ چاپ انتظار میں کھڑی رہتی ہے اور جو لوگ آتے وہیں اٹھیں اپنے چٹ میں لکر چپک چپک کرتی پیرل پڑتی ہے، اس سے کہ سوا کچھ کام ہی نہیں ہو چکا جی ابھی کبھی ہے یہاں سے چلو وہاں، اور لوگ اسی اتھیل مقام اور آؤک جاؤ کہ کہتے ہیں، جو کام کر رہے ہیں اسی کو قوسطہ بنا کر کہتے ہیں، ہم تمہارے کر رہے ہیں، اسطرح کر رہے ہیں، تلخ کر رہے ہیں، پڑجا کر رہے ہیں، احسان کر رہے ہیں تغیر و تبدیلی کر رہے ہیں، ہم کام کر رہے ہیں۔

نیا پرانا، ہلکا بھاری، درسی غیر درسی، مذہبی، غیر مذہبی سب ہی قسم کا علم کچھ منہ بولا جلدوں میں مل کر بندھ کر انجینوں میں بیٹھا ہے اور اسحاق کی معرفت ڈاکڑوں کے اور علما کے جو کہ انسانیوں کو اس آسانی سے مل جاتا ہے جیسے انجم دہ کو ہر ہسپتال سے ہر جگہ کا چاہا۔ اسی طرف علم کی اشاعت ہوتی ہے، یہی پہلی سی ہے اور دولت کے خواہنے سمجھا جاتا ہے اور اسی راہ میں اور اسی کی دولت۔ ہزاروں مضامین، اخبار، ایڈیٹر وغیرہ آسانی سے مل جاتے ہیں۔ اور وہ ہمیں بھی جلی کی قوت سے ایسی جوت کی طرح جلتی ہیں کہ ان کے پڑھنے کے لئے ہاتھ نہ ملے، کہتے ہی رہنا چاہیے کہیں۔ کہیں ہے اور لوگ کھوکھور نظر آتے ہیں، انہیں انہیں کہ جس سے کل جلتی رہے اور اس میں الگ ایڈیٹر اور ایڈیٹر وینا رہے۔ پھر نظر پڑ رہا ہے۔ اخبارات میں کل رہے ہیں۔ مضامین کچھ جارہے ہیں۔ کتابیں تیار ہو رہی ہیں، تعلیم کی جا رہی ہے کہ کتابیں پڑھو اور نالہ نہ کرو۔ کیونکہ شیون کا بیعت کام اٹھتا ہے اور اس بیعت کے ملک کو دولت کی ضرورت ہے۔ یہ لازم: مزدور میں کوئی اس کے مالک کو سمجھنے کے کنارے برکی ایک سارے پھر پار لاکھ کی کوٹھی پیدا آتی ہے۔ اسی لئے لغو اور پڑھو۔۔۔۔۔ میں جانتا ہوں، انٹرین پریس خوب چڑھ رہی ہے۔

بالو اور کوئن کا کالج ہے؟
میں نے کہا کوئن کالج چاہیے۔۔۔۔۔ اس میں کتنی کوشش ہو رہی ہے؟

”نزدیک ہے بالو“
مندرجہ ذیل نکیت ہے، انہیں باغیچے وغیرہ ملانے، مکان گھر ایک ایک کر کے آدمی کے سب کھیل اس میں دو آدمی دکھائی دیے تو کہیں دو عورتیں نہیں رہیں۔۔۔۔۔ لوگ جا رہے ہیں، کام کر رہے ہیں، جنس رہے ہیں۔ کچھ میں جو روٹی رہے ہیں۔ تو کچھ دو یا لاکھ بہت بڑا بورڈ لگا ہے۔ اس کے کہ تو مقررہ یقیناً کچھ ہوں گے کہ اس میں اور ضرورتیں ہیں انسان کی جھلانی اور راحت ہے۔۔۔۔۔ اور بالائی کی وکٹن والی سے زیادہ چڑا لگا لگا کر ایک جگہ آدمی سے کہتا ہوں، اور اس کے

سوچا کہ میں نے بھی اپنے بڑے بہن اور بہنیت کی دھاک بٹھا دی ہے۔ گویا کہ حقیقت میں دلی میں رہنا ایک خصوصیت ہے جس کی بنا پر میں دلی میں نہ رہنے والوں میں بہت ہی بڑا بڑا ہوں۔۔۔۔۔ چھی میں سوچتا ہوں آدمی آدمی ہے کہ بالو اور

میں نے کہا جی ہر گز راستے میں بیٹا ہے کہ کون کیا ہے اور کون کیا؟ ہر گز نہیں کہ میں اور بنا کس بیٹا تو ہر گز نہیں کہ کوئی کون بھی نہیں؟

اس نے کہا: بالو، بنا کس۔۔۔۔۔ اس نے جگہ کو پورا نہیں کیا اور مجھے افسوس ہوا کہ بنا کس کو دلی کے آس پاس پہنچا دیکھ کر بنا کس کے بارے میں کچھ شکیا ق بھی باقی نہیں رہتا بلکہ شرم کا احساس ہی ہونے لگتا ہے۔ بالو بنا کس۔۔۔۔۔ کہہ کر وہ ہنسی چاہ رہے تھے کہ وہ کدھ اور ہاتھ لگتا ہے۔

”دیکھو جی۔۔۔۔۔ یہ بڑی اچھی جگہ ہے؟ یہ تم کچھ سے یا کچھ کو تم سے بڑا بنا دے کہ کوئی نہیں ہوتی وہ چیزوں کو غرض کہ ناموں کو ان کا کوئی آپ دوسرے کے سامنے اونچا کر دے اور نیچا کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ میں میں ہوں اس لئے تم سے بڑا ہوں اور اس میں راضی ہوں کہ تم سے اعلیٰ ہے۔ اسی لئے میری گالی بھی تم سے بڑی ہے۔۔۔۔۔ اس خواہ بڑائی کی حد نہیں۔۔۔۔۔ برکی بلا ہے یہ ایکہ کیفیت ہے۔

قریب ہی ایک عالی شان کوٹھی دکھائی دیتی تھی کہ وہ والے نے کہا: ”بابہ، انٹین پریس ہے“ میں نے دل میں دہرایا انٹین پریس

”بالو چھپ کھانا ہے۔۔۔۔۔ کتابیں بہت ہیں۔“
مجھے اس کی یہ بہت چھی تو بہت معلوم ہوئی کہ کچھ کو سمجھنے کے لئے کہ پریس کیا ہے؟ ہوتی ہے۔۔۔۔۔ میں نے کہا کہ بڑا بڑا عادی ویر ہو رہی ہے۔

یہ بڑا بڑا اور میں نے سوچا۔۔۔۔۔ ان میں پریس خوب تو پیر ہے دینا انہیں علم و دھرم اور مسلمان رجحیتا جلدوں میں بند رہتا ہے اور جہاں پریس کی خوب قیمت وصول کی جاتی ہے

جیسے مستند ہی رہے ہیں اور ایک کے ہاتھ میں ٹینس کا توپ ہے
دوسرے کے ہاتھ میں راکٹ —

اب اسٹیشن پر
یکہ واسے نے کہ تم کار کہا — اب — ٹول
دو تین کوئی دو تار سے سارے کے آواز کے ساتھ
اٹھنا: اور ایک نے ٹرکس۔

بابو دلوں میں —
میں نے دیکھا میں ان کو انوں کو سب سے پہلے کہا تھا
وہ نہیں سہاس لے میں تیسرے میں تیسرے میں — یہ تو
د appreciate نہیں کر سکتے۔

میں نے کہا — وہ چار — اب —
اور جب تک میرے چکر چار رہا: اب اس کی کمر کی کمر کی کمر
دیکھتا ہوں۔ جو کتاب — کتاب — کتاب ہے۔
میں نے کہا — یہ تو ہی ہے۔

میرا اب یہ سننے کی

یا اس کا کوئی بھی کچھ کیسے ہو سکتا ہے اگر کش کی پٹی میں کرنا
سب کچھ کر کش کا بنا کر اس نے گویا دنیا کی ان قیام کو وہ جڑو
کو ٹٹایا۔

ریل کا سٹیشن کہاں ہے کتنی دور ہے — میں نے
کہا کیوں — اسٹیشن نہیں آیا سٹیشن ہے۔

بولنا "باوجی اسی موٹر پر اسٹیشن ہے۔"
میں نے دیکھا عیب نہیں کا مشن ہے۔ ہو چکا ہو
کاجی کچھ ہے اور وہیں بیٹے کو ہنسی کا ایک تھال میں طعی اٹا
ہوا مونگ پہلی بیچ رہا ہے اس کا ایک رٹک سے جھٹکا ہوا

ہے — ایک وزری کی دکان ہے — ایک سوڈا
داڑھی دکان ہے اسی قطار میں کئی دکانیں ہیں۔ ایک جگہ
پانچ سات کوئی لٹے ہوئے سڑک کا ایک دم بار ہے ہیں۔ اور
سڑک پر چو پانچ چھ عیسائی عیس جارجی ہیں انہیں دیکھتے جا کر
ہیں اور کچھ کالج کے لڑکے امریکن کالری میں ہیں بچوں پر

جینیز ریکار

ماہنامہ شاہکار لاہو

میں بلند پایہ ادبا شعرا کے تازہ ترین افکار رشتے جاتے ہیں۔ نثر میں معیاری افسانے، ڈرامے، تنقیدی
مباحثے اور مزاحیہ مضموں کی شکل میں۔ ل۔ احمد، غلام مظہر، بشیر محمد، اختر، ناچر، مرزا ادیب، ویدو، رشتہ
پرچہ ہاتھ پر دسی اور چند کائنات۔ ایسے نامور ادبا کا ایک با اجتماع ہوتا ہے۔ نکلیم میں خوش تبرک، سربست
موبائی، احمق، بیچو، مندری

(مزاحیہ سیاسی کلام، اختر، شرانی، سکیل، براہوئی، نکلیم، چند، محمود، آد، فقیر، کوہ، میا، زئی، ایسے بہت ہی شعرا
کے تازہ ترین افکار رشتے جاتے ہیں۔

اردو ادب میں شاہکار کی افادہ حیثیت ملے ہے فحش مضامین اور اشتہارات شان شعری کے ساتھ
عام شماروں کے علاوہ اپریل میں ایک ضخیم تصویر بہار، غیر فحشی، دو گروپے اور ٹیسمہ شاہ کی فحش تصویر بہار
قیمت دو روپے

منتقل خریداروں کو مفت نذر کیا جاتا ہے۔ سالانہ چندہ رشتہ جاتے ہیں۔
کا قیمت۔ ہے۔

ریکوئے بک سٹالوں اور میوزائیک سٹالوں

منہ آتش

لکھ لیا کس نے مرا نام غزل خوانوں میں
وہ بچوں میں نظر آئے نہ بیگانوں میں
ذکر ہے ان کی بھی زلفوں کا پریشانوں میں
جان اتنی ہے مرے غمزدہ ارمانوں میں
ایسے دیوں کا نہیں نام بھی افسانوں میں
ایسی کیا بات ہے جلتے ہوئے پروانوں میں
روپ وہ دہاتے رہتے ہیں پرستانوں میں
میرادل بھی ہے محبت کے گہب نون میں
خود وہ کب رنگ جاتے ہیں گھٹانوں میں
ہائے یہ جذب سینوں کے گریبانوں میں
سرد تن تھکے یہ کہتے ہیں گھٹانوں میں
نماک اڑا جاتیں بولے جھلٹانوں میں
کیا خدا داد مرے ہیں ترے احسانوں میں
مہر و مہ خود نظر آتے ہیں پشیمانوں میں
جگمگاتا۔ یہ یہ عنوان کئی عنوانوں میں
دھوم ہی دھوم ہے کچھ بھی نہیں بت خانوں میں
عمر کہتی ہے کہ گئے ابھی ناموں میں
نام اللہ کا جیتے ہیں صنم خانوں میں
کاوانہ اثر اتنا ہے مسلمانوں میں
مسجدوں سے ابھی اٹھ آئے ہیں بیگانوں میں
سہم کر بیٹھے ہیں جوئے انسانوں میں
علی منظور

مطلبن تمنا میں پراگندہ دل انسانوں میں
ذہونڈتی ہیں مری نظریں انھیں ہر سو لیکن
میرے افسانہ دل کے یہ پریشان اور اق!
چوٹیاں جلوہ گہہ دوست کی چھو لیں اب بھی
وہ بڑے لوگ ہیں افسانہ جو بن کر رہ جاتیں
ہائے ہم سوختہ دل کیوں ہیں ادھر ہی نگران
کبھی شہسیریں کبھی پرویں کبھی کچھ ہیں کبھی کچھ
میری آنکھیں ہی نہیں حسن کے دیوانوں میں
ان کا ہر تگ ہے اول گھٹانوں کا
ماہ نو چھپ بھی گیا ہم نے ادھر رخ نہ کیا
ان کی ان سرکشوں میں ہیں بہت ڈھکیا
بہر گشت اگر سروسند آیا نہ کریں
اُن پینہ کے یہ قطرے یہ حیا وقت کرم
میں ترے حسن کے معیار یہ جانچوں نہیں کیا
حسن پرووں میں نقابوں میں شبستانوں میں
نہ تجھ نہ تبسم نہ سدا ہے نہ حسدا
خود وہ کہتے ہیں کہ مجھ سا کوئی ہشیار نہیں
ان بتوں کا بھی ڈر نہیں اللہ اللہ
چپکے چپکے بت کا فر کی بھی پوج کر لی
راہِ اصنام کھلے ہم یہ خدا جانے کب
خوش دلوں کی یہ نہیں بزم جناب منظور

عزیزی مدیر سب سے

(ایک خط)

بعد مدت دید اور عرصہ بعد کے اسلام علیکم ورحمۃ اللہ
وہ کا طے کیا مینی کہ اس طویل عرصہ میں آپ کے خیال و تصور اور
آپ کی اصلاحات نے مجھ خدا جانے کن کن صورتوں میں پیش
کیا ہو گا اور محسوس کرایا ہو گا کہ میں اس طویل غیر
عامر کا کو جناب نے میری چاہی ہو یوں کا دو وقتوں کیا جو طر
عزیز از جناب مدیر "سب سے" یہ کچھ بھی نہ تھا بلکہ معاملہ یہ تھا
کہ مجھ میں یہ ذات کوئی مشافہ اندھا بنے کوٹ کوٹ کر ہر وہی
ہے کہ جس کام کو ہاتھ میں لو اس کو خدا پر تاک پہنچا کر چھوڑ
اس لئے میں کام نہ زیادہ پور سے تین کا دل میں لگا ہوا رکھ دو
مہنگ کر رہا۔

پہلا کام یہ کیا کہ ناقدان قوم کے ماحول سے چوٹی
نقصانات پہنچان کر پورا کرنے کے لئے اور غصے سے نجات حاصل
کرنے کے لئے ایک کراہی کری ایسوسی ایشن "توقا" اور ایک
"مرغامی کلب" "کراہی کری ایسوسی ایشن" کا قلم خود مصدرا
اور ناظم بھی یہ ایسا ہی تھا بس یہ کہ پورپ میں بعض اوقات
وزیر ناظم ہی وزیر جنگ بھی ہوتا ہے چاہے وہ توپ تو توپ
کی جگہ بیٹا بھی تھا جگہ سے نہ ہلا سکتا ہوا اور مرغامی کلب
کا صدر بیوی جبرم کو اور ناظم بیوی میرا ایک کو بنا یا، میا بھی
کہ میں بکرا کری ایسوسی ایشن اسے اور میا میں مرغامی کلب
سے تین چار سال کا بحث عرف میزانیہ درست کر لیں گی مگر
بیوی جبرم کے قلم اکثر نثری داں ہونے سے یہ نقصان پہنچا
اس طریقہ نے ہر کام میں پورپ والوں کے ماحول کی فصل
کی اور اس نقالی کا نام اس نے "ترقی" اور "مکشی نالی"
رکھا اگر میں نے ثابت کر دیا کہ دیکھو پورپ پر ہی جس چیز کو
ایشیہ، آفریقہ والوں میں مقبول بنا، چاہتا ہے اس پر چلنے
شان دار اور "دکھن الفاظ" کا خلاف چڑھا دیتا ہے جیسے کہ
پورپ کی تعلیم پڑھے ہوئے کو "اعلیٰ تعلیم یافتہ" کہتے ہیں

اور باقی تمام تعلیموں کے ماہر کو "ادنیٰ تعلیم یافتہ" عین اسی
اگر تم نے ہندوستان میں مرغامیوں کے کلب کو بھی پورپی
اصول پر چلایا تو انشاء اللہ تعالیٰ ان کا کام رہی مگر آخر کار
بیوی جبرم اگر کیوٹ ہی تو تھی مذاق تو کبھی نہیں بس معافی
جان اس مشکل اعززی داں بنا ہی نے امریکا اور انگلستان
کے تمام مرغامیوں کے رسالے پفلٹ کتا ہیں اور مضابطہ
منگ کر جو اس کلب میں رائج فرمائے تو اب زیادہ کیا عرض
کروں بیوی جبرم ایک کے پاس تو دس پانچ دس مرغامی ہیں
سبھی لیکن بیوی جبرم کے پاس کلب ایک ریل کو ہے سوا کچھ نہ
کہ وہ بھی ابھی کے سب سے تینوں کو فضل کدا آپ سے نہ مجھے کئی
ناپور میں دیکھا تھا میں نے تو اپنے محلے تک میں پورپ کی
ایک چیز کو نہیں آنے دیا۔ اب ہی میری بکرا کری ایسوسی
ایشن "سودا کے فکشنل سے وہ برابر ترقی کر رہی ہے۔
نتیجہ میں اب مجھے جو سمجھتی ہے بکرا کریوں کے فائدے اور
ترقی کی اور آپ چاہتے ہیں قوم اور ادب کی ترقی کی اس لئے
میں تختہ تو کیا اور پیش کرنا تو کیا اور یہ آپ ہرگز برداشت
نہ کرتے کہ میں "سب سے" میں مضمون کے بجائے آپ کو ایک جیسے
بڑے میٹنگ کا کرنا بھی دیتا!

دوسرا کام میں نے یہ کیا کہ علم نجوم اور پامری کو میں نے
اتنا گیدا کہ اب یہ دونوں میرے سامنے اہم ہونے لگے
ہستے ہیں وہ تو اونٹ کے ذریعہ پورپ جا نا اب تک ممکن ہیں
جو سکا درہ ان علوم میں پورپ کے مکے مکہ کا کان کاٹ کر
آپ کو لادیتا تب آپ فرمائے کہ یہ بے شبہ قاتل روزی نہ تھا
مضمون نگار نہیں بلکہ مسد بکرا کری ایسوسی ایشن اور
منجم بھی ہے۔

تیسرا کام میں نے یہ کیا کہ عورت ذات پر میں نے
ایک ہی سائنس میں یہاں سے کیر لندن تک کے برابر طویل

تین کن ہیں مکہ دیں کیا معنی کہ میں نے یورپ کی کتابوں کے ترجموں اور حوالوں سے نہیں بلکہ خود تحقیق کر کے اس راز کا پتہ لایا ہے لیا کہ یہ آخر کار وحدت کو مردوں کے برادری ثابت کرنے اور مردوں کی طرح کے کام لینے اور عہدے دینے کی چال ہے پہلے کس نے چلی؟

امید کہ آں مخرم بھی بخیریت ہوں گے خورد و کلان اور پرسان حال کو درجہ بدرجہ سلام۔

کر رہا تھو اگر بنا بہ زور قادی صاحب بعد نماز جمعہ مل گیا تو واجب گراس کو حاضر کجہ کرنا دل کا شرف نہ عطا فرما دیکھ سہ کر رہا تھو

میں نے سنا ہے کہ دنیا میں سب کچھ علی حالہ پیدا ہونے پر بھی جو قطع پڑے گا اس سے آپ ضرور محفوظ رہیں گے تو اگر ایسا کوئی تعویذ خباب کے پاس ہو تو براہ کرم ایک شخص اس کی؟

چہا کر رہا تھو شاہ کاب ریل گاڑیوں سے زیادہ ہوائی جہازوں کا پلن ہو گا اب اگر ایسا ہو تو ایک دن کے لئے آپ میرے "امیر خانے پر" بھی اگر نزل اجال فرمائیں تو رہے بکرا بکری نوازی؟

بچ کر رہا تھو اگر کہیں اخبار "رہبر دکن" کے کارکن مل جائیں تو ان سے میرا دست لبتہ آداب ضرور

کہہ دیجئے گا زیادہ مداد اب۔

ششش کر رہا تھو

"سب کس" مجھے عزیز ہے اس لئے کہ اس کا تعلق آپ

ہے اور میرے عزیز بھائی زور قادی صاحب سے اس لئے

میں یقین دلانا چوں کہ میں اس میں کھتا رہوں گا اور

الٹا اضر وہ لکھوں گا جو دوسروں کے سوچے ہوئے کا ترجمہ

نہ ہوا اور پہلی بات آپ "سب کس" میں لکھنے والوں اور

والیوں سے لکھتے رہئے اور ان کو تاؤ دلانے کے لئے یہ بھی

کہہ دیجئے کہ مشرق سے مغرب تک اور شمال سے جنوب

تک کی اردو میں یہ تنہا اپنا ملا زور قادی صاحب جو دوسروں

کے چمپن کئے ہوئے "مسک ادب" کو قبول کرتا نہ مسکالم

سیاست کو لکھ دوسرے کچھ اپنا ہی غور کیا ہوا لکھتا ہے

اور کہتا ہے اور بدبختی سے اردو کے ذخائر اسی اپنے

سوچے ہوئے اور اپنے پیدا کئے ہوئے سے محروم ہیں یقین

نہ ہو تو اس کی حلقہ کتب ادب و کتب علم کو ملاحظہ فرما لیجئے

امی کہ اس فقور سے کہے کو بہت جان کر آپ ایسا ذریعہ

پیدا کریں گے جو دوسروں کے مسالک کے پیرو ہونے کے

عموم نقلم خود کسی مسلک ادب کے خالق و موجد ہوں گے

اور ہاں ملجی یہ تو فرمائیے کہ کیا آپ کی طرف بھی بارش

ہوئی ہے میری طرف تو اتنی ہوئی ہے کہ آج مبلغ ۱۹ مارچ

کو بھی صبح کے وقت میں جاؤں اور ذکر صبح کی نماز کے لئے

اپنے حلقہ کی مسجد میں گیا تھا زیادہ مداد اب۔

ملازموزی

ہمارے قلمی معائنے

یہ سندربہ لفظ کے آخری حصے میں حضرت ملازموزی نے اپنے اچھوتے انفرادی املا میں اردو کے کھنے والوں کو اس بات کی طرف توجہ دلائی ہے کہ وہ دوسروں کی نقالی اور پیروی کر لیں گے بجائے خود کسی خاص مسلک ادب کے موجد و خالق بنیں۔ ملا صاحب کس اس مؤرخہ کی اہمیت اور افادیت سے کون انکار کر سکتا ہے مگر انوس تو یہ ہے کہ ہمارے لکھنے والے اس طرف توجہ نہیں دیتے۔ اس میں شک نہیں کہ انفرادی اسلوب پیدا کرنا بہت مشکل اور صبر آنا کام ہے لیکن اگر کوئی اس بات کا پکا ارادہ کرے اور مسلسل مشق کرے تو یقیناً وہ اس معصوم کا کامیاب ہو سکتا ہے۔ کسی زبان ادب کی ترقی کے لئے تعلیمی ادیبوں اور فن کاروں کا پیدا ہونا ضروری ہے ورنہ اس ادب میں (مستقلہ و مندرجہ) کی بجائے صرف نقالی ہی نقالی رہے گی۔ شاہد

آثارِ اقبال

ہر اُنس نازی رفیعہ سلطان نور بدیع صاحبہ راجا
جزیرہ من مضافات پنجاب کے مشرق میں اقلتان
فرانس، سوئزر لینڈ، قسطنطنیہ اور مصر کا سفر کیا تھا۔ یہ سفر
اپریل سے اکتوبر تک جاری رہا۔ نازی رفیعہ بیگم صاحبہ
کی خواہر محترمہ زہرا بیگم فیضی نے اپنی بہن کا روزانہ چرچہ
دیا اور لاہور سے غالباً ستمبر ۱۹۰۶ء میں شائع کرایا۔
جس زمانے میں نازی رفیعہ صاحبہ لندن گئی تھیں
تھیں اسی زمانے میں حضرت اقبال مجاہدین تشریف لے
گئے۔ رفیعہ صاحبہ اپنے روزنامہ مورخہ بدھ ۲۰ مئی ۱۹۰۶ء
کو لکھتی ہیں۔

”اگر انصاری جوازہ کے بھائی کے دوست تھا
اور بہت لائق آدمی ہیں، پنجابی ہیں، لکڑا
ملے آئے۔ اور بہت دیر تک ان سے باتیں
ہوئیں رہیں۔ آپ اصل میں کھنڈ لکڑا کے
رہنے والے ہیں۔ یہاں انھیں ہر ہائی ٹس
نقد و کم کی طرف سے وطنیت تھا ہے۔ سب
اسٹان پاس کر چکے ہیں۔ اور یہیں اسٹان
میں انھیں کامل کیا ہے۔ یہاں انھیں بڑا
پوٹہ (تھیں) سوروپ، ماہوار ملتے ہیں۔
اقبال کی شاعری کی بے تحریف تعریف کرتے تھے۔
اقبال ایک دفعہ آئے تھے۔ گراں وقت حضور
در رفیعہ صاحبہ کے شوہر تشریف نہیں لکھتے
تھے۔ حضور کو ان سے ملنے کا شوق ہے
گر پھر نہیں آئے۔“

۲۱ کتاب مذکور روزنامہ سفر یورپ

”بر ۲۵ مئی ۱۹۰۶ء

..... اقبال ہی اسی شب کو آئے تھے۔ کچھ نہیں کھایا۔ اصدیق

دنیا بھر کی تاریخ اور فلسفہ کی گفتگو ہوتی رہی۔
میں ۳۰
تیسری اور آخری مرتبہ اقبال کا ذکر اس طرح کیا گیا ہے۔
”۱۰ جون ۱۹۰۶ء بدھ

..... میں نے ان عنایت فرماؤں کو جانے کی دعوت دی
تھی جن کی یہاں جاری سے فائدہ اٹھایا تھا۔..... مشرق اقبال
موجود تھے۔..... کئی مہانوں نے دستخطوں کی کتاب میں
دستخط اور عبارتیں لکھیں۔ مشرق اقبال نے اس روز یہ شعر
فی البدیہہ کہہ کر میری کتاب میں درج کروائے جنھیں میں
نقل کرتی ہوں۔

اے کہ تیرے آستانے پر چہیں گستر قمر

اور فیض آستان بوسی گل بر سر قمر

روشنی لیس کر تری موجِ غبارِ راہ سے

دیتا ہے لیلانے شب کو نور کی چادر قمر

کاروان قوم کو تجھ سے ہے زینت اس طرح

جس طرح گردوں پر مسدِ جھنڈا خیر قمر

شمع بزم اہل ملت را چراغِ طور کن

یعنی ظلمتِ خانہ مارا۔ سراپا نور کن

سید مبارک الدین نقشبندی

غزل

دیکھانہ کچھ مذاق تماشا کے باوجود
ہوں بے نگاہ دیدہ بنیا کر باوجود
نگین نہیں ہے دل غم دنیا کے باوجود
نشہ ہوانہ تندہی مہربان کے باوجود
برپردہ نظر سے ہوس جھانکتی رہی
تسکین ملی نہ ترک تہمت کے باوجود
تقدیر کی شکست پہ ہے اک طیف ثلثہ
جینا تسلسل غم دنیا کے باوجود
ساحل سے ہے تعلق خاطر دی تجھے
آغوش موج و دامن دریا کے باوجود
ہم نہ نہیں رفیق نہیں ہمراہ نہیں
تہنا ہے دل ہجوم تنہا کے باوجود
پیر حرم سے پیر مغال کے تعلقات
قائم ہیں پردہ سننے و مینا کے باوجود
جو زمانہ سے کبھی ڈرنا نہ چاہیے
مرزا نہ چاہیے غم دنیا کے باوجود
تم میری زندگی میں بہاراں نہ کر کے
اپنے تبسم جین آراء کے باوجود
کیا جائیاں نگاہ کی فطرت نہ جان لی
آوارگی فسکو تہمتا کے باوجود

عبدالعزیز فطرت

غزل

ترک الفت کا اگر اذن ہے ایسا ہی سہی
آرزوؤں کے تسلسل میں بھی وقفہ ہی سہی
نہ سہی لطف و کرم وعدہ فردا ہی سہی
انتفا تہ نگہ ناز کا دھوکا ہی سہی
شیخ افسانہ دل شکوہ بے جا ہی سہی
آپ کے واسطے کچھ دیر تماشا ہی سہی
بصورتہ لے گی نگہ شوق تجھے سن نہاں
راہ میں لاکھ تجاہات کا پردہ ہی سہی
میں بھی گزرا ہوں محبت کے چمن ناروں سے
اب مرا جوش جنوں زینت صحرای سہی
نچھ کو میں تیرے سوا دیکھوں گا آخر کب تک
یہ کرشمہ بھی تری جلوہ گری کا ہی سہی
اور بھلے کے گاہ بھانے سے مرا غلغلہ دل
تیری مرضی ہے تو کچھ اور بہانہ ہی سہی
مجھ کو جینا ہے تو بس تیرے لئے جینا ہے
انقلابات محبت کا سہارا ہی سہی
فاکش کر راہ جنوں بے خبری میں اشرف
پھر بہ عنوان و گرفتہ جس صہبائی سہی

علی اشرف

اسلوب بیان

بجنوری غمخس کرتے تھے۔

بہتر اسلوب بیان نہ مروت عبارت کو خلعت و بچاؤ
مہذب توجہ بناتا ہے بلکہ نفس مفہوم کی کمزوریوں کی بھی ٹھیک
حد تک تلاقی کر دیتا ہے۔ بجنوری کے محاسن کلام غالب میں
ان کی غالب سے شدت عقیدت کی بنا پر جو مبالغہ کا عنصر
بڑھ گیا ہے اور انھوں نے غالب کے خیالات کی جو تباہی
اور اشعار کے نئے نئے مطالب چمکانے میں جو منگنا فسیاں
کیں اس کے باوجود اس دشمن مقدمے کی مقبولیت کسی طرح
کم نہیں ہوئی۔ وہ حضرات بھی محفول نے اس پر سخت ست
تقلیدیں کی ہیں اس کی دل پہ طرز تحریر اور مبالغہ و اراغمار
بیان کا خطا اٹھانے کی خاطر اس کو بار بار پڑھتے ہیں۔ انجلیات
کی اکثر روایتوں کو لے کر ادب میں استناد کا درجہ حاصل نہیں کر
تے۔ آپ خیانت آج ہر ادب کے طالب علم کے لئے ایک تحفہ نرین سے کہ نہیں
”آزاد کے جاوید کمال کی گنگا لیاں پڑنے والے برائے سزا جتنی
ہیں اور اس بات کی بالکل پرواہ نہیں رہتی کہ زیر نظر
واقعات میں سے کتنی حقیقت سے بعید ہیں۔

دست کی شاعری کا بجز یہ کہنے دو ہی چیزیں نکلیں گی۔
”زبان و بیان“۔ وہی بامیں جو آپ دن بھر سوچتے
کرتے اور بولتے رہتے ہیں آپ کے سامنے آتی ہیں اور
آپ چونک پڑتے ہیں منہ سے واہ واہ نکل جاتی ہے۔

بغل میں داب کتاب و تواری کو
کہاں کو اسے دل نادان کہاں کو
تو بھی کسی سے دل لگا ہا ہا ہا اسناد کیوں کی کہی
کبھی ترپا کے دل پہ ہاتھ رکھنا نہ بھی کہنا اسے یہ ہو گیا کیا
ہم تیرے ہیں ادب پر دل تیرا کوئی ہو
دوسرے دشمن مہربان ناہر بان ہو کوئی ہو
غالب کی عظمت کا ایک ہزار اس کا انفرادی انداز
بیان ہے ایک لحاظ سے غالب کی شاعری گزشتہ دور سے
دور منزل کوئی کی روح ہے غالب کی مضمون آفرینی اور
اس کے فلسفیانہ نکتات کو نظر انداز بھی کیجئے تو غزل گوئی کے

اسلوب بیان تحریر کی جان ہے۔ کئی مضمون کے
مطالعہ کے وقت جو چیز آپ سے پہلے ہمارے توجہ کی طالب
ہوتی ہے وہ اس کا طرز تحریر ہے۔ نفس مضمون کے دلچسپ
اور غیر دلچسپ ہونے کا احساس بہت بعد کو ہوتا ہے۔ مضمون
کا عنوان ہی درحقیقت مضمون سے نصیحت آگاہ کرتا ہے۔
اس نصیحت آگاہی کے بعد قاری اس کا خطر نہیں رہتا کہ
مضمون غلط کیا بات کہنا چاہتا ہے بلکہ غیر شعوری طور پر یہ
معلوم کرنے کا خواہشمند ہوتا ہے کہ وہ کون سا طریقہ اختیار فرماتا
کرتا ہے بہت سے ایسے مضامین جن کے مطالعہ کی افادیت
کا ہمیں احساس ہوتا ہے مروت اس وہ سے ہم پڑھنا نہیں
چاہتے کہ ہم سے اس کا ایک صفحہ بھی پڑھا نہیں جاتا۔ بطلان
اس کے اثر و فہم کوئی رسالہ یا کتاب اٹھا لیتے ہیں مروت
عمرات پر ایک سرسری نظر ڈالنے کی خاطر۔ وقت کسی
عنوان کے تحت ایک جگہ ہمارے توجہ کو جذب کر لیتا ہے پھر دوسرے
پہلے سے زیادہ جاذب توجہ ہوتا ہے۔ اس طرح مضمون ختم
کرتے تک ہمیں چین نہیں پڑتا۔

بقینہ پیکر مزہ و گریں کی ابتداء بغیر کسی
تہدید کے اس طرح کرتا ہے کہ پڑھنے والا دو چار ملکوں کے بعد
ہی اپنے آپ کو مصنف کے قابو میں پاتا ہے۔ سید سے ساک
الفاظ چھوٹے چھوٹے جملے ایک علمی اثر پیدا کر دیتے ہیں جن میں
کی فضا کتاب کی آخری سطح تک برابر قائم رہتی ہے۔ بجنوری
کا مشہور مقدمہ ”محاسن کلام غالب“ اس طرح ہے۔

”ہندوستان کی الہامی کتابیں دو ہیں۔ مقدس مژدہ
اور دیوان غالب۔ روح سے تہ تک نگ مشکل سے ترجمہ کیا
لیکن کیا ہے جو یہاں حاضر نہیں کون سا فقہ ہے جو اس زندگی
کے کاروں میں سید یا خواجہ و موجود نہیں۔
یہ اچھوتی طرز تحریر ہمارے دل میں بڑی خوش
وہی عقیدت اور کلام غالب سے وہی محبت پیدا کرتی ہے جن

نہیں پیدا کر سکتے جس کو ہم سوچتے وقت محسوس کرتے ہیں۔

انگریزی میں کہا گیا ہے (The man) اسٹائل آدمی کا جو ہر خاص ہے ایک اداسٹائل ہے (The man of max style) اسٹائل آدمی کی ذات کا آئینہ دار ہے۔ دراصل طبائع کے ساتھ طرز بیان بھی بدلتا جاتا ہے کسی کا اچھا ست اور کسی کا چست کوئی نرم اور کوئی گرم ہوتا ہے کسی کا محبوب بیان دواں دواں ہوتا ہے اور کسی کی طرز تقریر پر بلا و بچہ ہے کہ سمجھنے والا خود سوچ سوچ کر کھڑا ہے اور بڑھنے والوں سے بھی اسی غور و فکر کا طالب ہے بعض مصنف تحریر کی ابتداء میں بس بنا دیتے ہیں کہ وہ کیا ہیں اور بعض کی طبیعت کا کھوج لگانا پورا مضمون پڑھ لینے کے بعد بھی مشکل نظر آتا ہے۔

اسلوب بیان و تحقیق آدمی کی طبیعت کا آئینہ دار ہوتا ہے ہر ادیب اپنی زبان کو بالکل اپنی مرضی کے مطابق استعمال کرتا ہے طرز بیان ایک بالکل ذاتی خصوصیت ہے ایک کا اسلوب دوسرے سے بالکل جدا ہوتا ہے الفاظ کے انتخاب میں ترتیب محاورات جملوں کی ترکیب اور فقرات کی بندش میں ہر ایک اپنے انفرادی ذوق کا پابند ہوتا ہے۔ کادالال کہتا ہے "اسلوب بیان انشاء و پرداز کا لبس نہیں پوشت ہے" ایک اور مشہور ادیب کا کہنا ہے کہ "ادب زبان کے ذاتی استعمال کا دوسرا نام ہے" اسلوب بیان کا غائر مطالعہ ہمیں انشاء پر بازی و ذات سے بہت قریب کر دیتا ہے اس آئینہ میں ہم کو نہ صرف اس کی ذات کا عکس نظر آتا ہے بلکہ اس کی دماغی اور روحانی نشوونما کا خاکہ بھی مل جاتا ہے اس کے ماحول کے وہ تمام اثرات جنہوں نے اس کی حیثیت کی تعمیر میں حصہ لیا ہے ضرور اس کے اسٹائل کی ترکیب میں بھی حصہ لیں گے بالفاظ دیگر اس کا اسلوب بیان اس کی تمام جسمانی اور ذہنی تربیت کا آئینہ دار ہوگا۔

عام اور پامال موضوع گل و بلبل، مرد و قری، بہار و غم عشق بے مہرئی، حبیب و غریب و جواس نے شعر لکھے ہیں ندرت بیان اور تنوع اظہار کی ان سے بہتر بہت کم مثالیں دیکھنے میں آئی ہیں۔

غنج پھر لگا کھلنے آج ہم نے اپنا دل خون کیا ہوا دیکھا کم کب ہوا پایا زخم نے داؤد دی تنگی دل کی یارب تیر بجی سیئہ بسل سے پرانشان نکلا بوئے گل نالہ دل دو دو چہرہ راع محض جو تری نرم سے نکلا سو پریشاں نکلا فوٹوش ہائے بیجا دیکھنا ہموں کا شکایت ہائے زنجیں کا گلہ کیا مندرجہ ذیل اشعار کا انداز بیان دیکھئے۔ اردو غزل میں واقعی ایک بے ہوا اضافہ ہے :-

ہے کس قدر ہلاک فریب وفا سے گل
بلبل کے کار و بار پر ہے غنڈہ ہائے گل
جو تھا سوچ جگ جگ کے دھوکے میں آگیا
اے دوائے نالہ لب خونیں نوائے گل

خیالات پر شخص کے دل میں پیدا ہوتے ہیں ہر انسان کچھ نہ کچھ سوچتا ہی رہتا ہے چاہے اس کے سوچنے کی نوعیت کیسی ہی کیوں نہ ہو۔ مگر ان خیالات کو مجنبہ خاطر دل سے سمجھ کر طلاس پر منتقل کرنا بہت مشکل ہے اور ہر شخص کے بس کی بات نہیں۔ ایمرسن کہتا ہے "آدمی خود ضعف ہے دوسرے ضعف اس کا اظہار بیان ہے" آپ کو دنیا میں آدھے آدمی بہت نظر آئیں گے اور مکمل انسان بہت کم ہے۔

آدمی کو بھی میر نہیں انسان ہونا!
لیکن خیالات کے اظہار بھی پر بات تختہ نہیں ہوتی بس سے بڑا مشکل مرحلہ ان خیالات کو سلیقے انسان کی تانگی کوئے بغیر پیش کرنا ہے ہی وہ ہے کہ ہم سوچ بہت لیتے ہیں مگر کافی ضمیر کے اظہار میں وہ دیکھی، تخلیقی اور لطافت

اشان جوش و خروش اور ان کی نزاکت طبع کا شاہد
”آب حیات“ کا ایک ایک جملہ ہے ہر بات کو وہ اپنے
انداز سے کہتے تھے رنگینی پیدا کئے بغیر انھیں کچھ کنش
اچھا نہ معلوم ہوتا تھا کھٹ اور غوغائی ان کی عبارت کی نمائندگی
خصوصیت ہے ایک جگہ جنگ کی تیاریوں کی تصویریں کھینچتے
ہیں۔

”خلوت کے چین میں حکم ہوا کہ مشورت کی مجلسیں آئیں
کہ ہنگامہ کے لئے کیا صلاح ہے بعض کا زمرہ ہوا کہ بڑے
میں ملک مقبوضہ کا بندوبست ہو جائے گی آدمیں ہنگامہ
پر غور فرمیں گے گوارا کا خاکہ ڈالا جائے بعض نے نقد سرکاری
کی کٹھن دم نہ لینے دواد جائیں اور پھر یکنواری ہونے
کو بھی ہمارے لئے ہے کہ چین اور سلطنت کے باخباں نے کہا کہ
ہاں بھی ہانگ ہے“

کلام دوتی کے متعلق ”آب حیات“ میں لکھتے ہیں۔

”جب وہ صاحب کمال علامہ اور اس کے کوراجام کی طرف
چلا تو فصاحت کے فرشتوں نے باغ قدس کے پھولوں
کا تاج سجایا جن کی خوشبو شہرت عام بن کر جہاں میں پہیلی
اور رنگ نے بقائے دوام سے آنکھوں کو طراوت بخشی۔

وہ تاج سر پر رکھا گیا تو آب حیات اس پر شبنم ہو کر رہا
کہ شادابی کو کلاہٹ کا اثر نہ پہنچے۔ کلام کو دیکھ کر معلوم
ہوتا ہے کہ مضامین کے تسارے آسمان سے آتا ہے جہاں
”ملک الشعراء“ کا سکھ اس کے نام سے موزوں ہوا اور
اس پر نقش ہو گا اس پر نظر آدو کا خاتمہ کیا گیا۔“

اسلوب بیان اور مضمون بالکل علیحدہ چیزیں ہیں
اسلوب بیان کی اہمیت مضمون کے اختصار کے ساتھ ساتھ
جاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ مجھے مضمون میں تفصیل کا موقع
نہیں ملتا طویل بحث اور مباحثہ اور دلائل کے لئے قیاس
نہیں رہتی۔ صاحب مضمون کو اختصار سے کام لینا نازیہ
ہو جاتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ اس بات کا خیال رکھنا بھی
ضروری ہوتا ہے کہ کہیں مضمون میں تشنگی نہ پیدا ہو جا

مکالمے کی تاریخ انگلستان ”لیجے جس کی تاریخی
اہمیت کم اور ادبی اہمیت زیادہ ہے تاریخی واقعات اور
کردار کے متعلق مکالمے نے جو کچھ لکھا ہے وہ واقعی سچی ہے
مکالمے کو کوئی بڑا معیار نہیں تھا اگر اس کی حدت طرازی
واقعت پسندی اپنے دور کی ماہیت پرستی سے بڑجوش
اختصاص اور ہر چیز کو سیدھے سوچنے اور سمجھنے کا شوق
بھی چہرے اس کے انداز بیان کو متوجہ روشن اور
پرنور بنائیں۔

مکالمے ہر چیز کو واضح طور پر سوچنے اور کہنے کا
کمال تھا اس کا خیال اس کی ویل سے زیادہ واضح
ہوتا تھا اس کے اسلوب بیان کے پرزور ہونے کی ایک
اور وجہ یہ بھی ہے کہ ہر بات جس کو وہ کہتا اس پر پورا پورا
اعتماد ہونا چاہیے اس کی صحت کے متعلق شبہ بھی نہ ہو
نہ ہو تھیک سے کہتا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ کسی چیز کے
متعلق سچی سمجھے ایسا یقین حاصل ہو جائے جیسا کہ مکالمے
کو ہر چیز کے متعلق ہے۔ ڈیو۔ ایچ۔ رونا H. R. Rona
نے مکالمے کے اسٹائل کو پبلش شاٹ اسٹائل
(*Staccato style*) مختص کر کہا ہے۔

بغلاف مکالمے کے رسک کی طبیعت کی نرمی حقیقی
روحانیت پر اعتقاد اور اپنے ماحول کی ”ماہیت پرستی“
سے نفرت نے اس کے لہجہ کو بھی نرم اور پاکیزہ کر دیا،
اس کی عبارت ان مصوروں کی نقادوں سے زیادہ چھین
اور دلکش ہے جن کے متعلق اس نے خاصہ فرسائی کی جو
حالی کی طبیعت کی منات ان کی ہمیشہ محتاط رہنے
کی عادت اور سنجیدگی ان کے انداز بیان میں ہر جگہ
جھلکتی ہے۔ میرا تیس کی طبیعت کی نفاست اور پاکیزگی
مزاج کا ثبوت ان کے کمرائی کے ہر شعر سے ملتا ہے جس طرح
زندگی میں وہ سلیقہ اور نفاست کا دامن ہاتھ سے جکڑ
نہ دیتے اسی طرح شعر کہتے وقت بلاغت و فصاحت سے
کوئی معرہ باہر نہ ہونے دیتے۔ آزاد کی طبیعت کا بگن

پڑتے وقت کرتے ہیں بلکہ ہمیں "فائدہ آزاد" کا مطالعہ وقفہ وقفہ سے کرنے میں لطف آتا ہے۔

ہر بڑے ادیب کی تقریر کے مخصوص خود غالب ہوتے ہیں اس کا انداز بیان طرزِ ادا اور اظہارِ جذبات کا طریقہ دیگر سے بالکل مختلف ہوتا ہے ہر بڑے انشاد پر دوا یا شاعر کی غفلت کی کمی ثبوت نہیں کہ وہ اسلوبِ بیان کا ماہر ہو بلکہ یہ بھی ہے کہ وہ دوسرے کے رنگ میں کہنے سے محذور ہے۔

جس طرح ہم آواز سن کر شخص کو پہچان لیتے ہیں اسی طرح طرزِ بیان کے مطالعہ سے ہم مصنف کو فوراً معلوم کر لیتے ہیں۔

شخصی کی تحریر دیکھ کر اسے ہم کبھی آزاد کی عبارت قرار نہیں دے سکتے۔ اور نہ ہم ابولکلام کی شکر و عبدالحی سے منسوب کر سکتے ہیں ایک ہی موضوع پر اگر غالب و ذوق طبع آزمائی کریں اور ان کے نتائجِ فکر ہمارے سامنے لائے جائیں تو ہم فوراً بولیں گے۔ یہ شعورِ ذوق کا ہے اور یہ غالب کا۔ ذوقِ صفائی، روانی اور بول چال کی چاشنی کو کبھی ہاتھ سے نہ جانے دیں گے چاہے اس سے ان کے بیان میں سطحیت ہی کیوں نہ آئے۔ غالب تنوعِ مدد اور جدتِ طرازی کے قائل ہیں۔ وہ مجددِ شاعر ہے اور ادبِ مطلب کی ضرورت پڑے تو وہ نئے الفاظ اور نئی ترکیب آسانی تراش لیتا ہے معمولی بات کو بھی انوکھے انداز میں پیش کرنا اور اپنے مشاہدہ کے اظہار میں زینت نگاہی کا ثبوت دینا اس کا خاص امتیاز ہے۔

ذوق کا شعر ہے۔

ہم آپ جل جہے گراں دل کی آگ کو
ہینے میں ہم نے ذوق نہ پایا بھبھکا ہوا
ہی مضمون غالب سے کہنے۔

عشق پر زور نہیں ہے تو وہ آتشِ غالب
کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بجھے
مضمون ہے "مے نوشی" ذوق اس مضمون کو
لیکر لے ناگ محاورے کے استعمال سے بے تکلف شعورِ دہلی

یا کہیں اختصارِ مطلب سے عبارتِ خشک اور بے مزہ ہو جائے۔ حسنِ نفاذی طویل اور خشک تہید کے بغیر مضمون کو یکایک مٹھ کر دیتے ہیں حسنِ نفاذی صاحب کے مضمون میں کوئی اعلیٰ اور اچھوٹے خیالات نہیں ملتے نہ ہمیں کسی نئے انکشاف کا اس میں علم ہوتا ہے۔ جو مضمون پڑھ لینے کے بعد اگر ہم خاموشی سے غور کریں تو اعتراض کرنا پڑے گا کہ ہمیں کوئی نئی بات نہیں معلوم ہوئی۔ مگر ہمارے لطف میں اس کوئی فرق نہیں پڑتا ہماری جہتِ جستجو قائم رہتی ہے کہ کس طرح بات میں سے بات نکلتی چلی گی عبارتِ نئی نہ ایک جوئے شیر کا سرور و رواں۔

مگر یہ طرزِ فکر طویل ناولِ افسانہ یا مضمون کے لئے جس میں اہم مسائل سے بحث کرنا ہو موزوں نہیں ہوگا اس وقت بیان کی سادگی اور عبارت کا سلیھا و بالکل کافی ہوتا ہے۔ اگر انا پر اندازِ بیان میں لطف و رنگ پیدا کرنے میں محو ہو جائے تو اصل مطلب کے خیر ہو جانے کا اندیشہ ہو جاتا ہے جیسے کہ "آبِ حیات" میں آزاد نے کیا ہے ہر مضمون کا اندازِ بیان انتہائی سادہ اور فطری ہے اگر ان کا مطلب سیدھے سادے الفاظ میں ایک جملے میں ادا ہو جائے تو ہر وہ ایک لفظ کا اضافہ کئے بغیر آگے بڑھ جاتے ہیں سخنِ آرائی اور بات میں بات خنکے کی فرصت ان کو کم ہوتی ہے ورنہ "گمروانی" اور "میدانِ عمل" میں صحتِ الارا سا لگائی ناول لکھنے کے وہ کبھی قابلِ نہ ہوتے اس کے برعکس ہر شے کا فائدہ آزاد لیجئے اکثر واقعات حقیقت سے کچھ دور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ناول نگار لطفِ بیان و زبان کے کلام کو قائم رکھنے کے لئے قصے میں ہر قسم کی بے اعتنائی کرتے تھے ہے ہم آج "فائدہ آزاد" کو سننے کے لئے لطف اندوز ہونے کے لئے لہر اور زبان و طرزِ ادا سے محفوظ ہونے کے لئے زیادہ پڑھتے ہیں غلط ہے کہ اس طویل ذوق کو صرف اندازِ بیان سے حفظ رکھنے کی خاطر ہم اس اضطراب اور ذوق و شوق سے نہیں پڑھتے جس کا اظہار ہم ریٹائڈس کے طویل ناول

کر لیتے ہیں گویا میں گہرائی نہیں۔

زاد شراب پینے سے کافر ہوا میں کیا
کیا ذریعہ چلو پی میں ایسا بہ گیا
یہ قالب کا نتیجہ فکر ہے۔

منے سے غرض نشاط ہے کس رویا کا

اک گونہ بخودی مجھے دن رات چاہیے

مومن کو بیٹھے اس کا ہر بندہ شدت کا رنگ لئے ہوئے ہے
معلوم ہوتا ہے گویا اس کے دل و دماغ میں آتش بری
ہوئی ہے اس کا انداز بیان بھی شعلہ نوائی سے کم نہیں
ہر چیز کو اس طرح پیش کرتا ہے کہ شہید اس اس کی بولنے
والے کے دل و دماغ میں بس جائے۔

ذوق کہتے ہیں۔

ہنیں ہے کم زرخاں سے زردی زخاں
تم اپنے عشق کو اسے ذوق کیسے سمجھو
یہ مومن کا شہ ہے۔

زرد رخ دکھلا و یاد رخ مکر دکھلا دیا

آج اس کو ہم نے اپنا زور ور دکھلادیا

اچھے اسلوب بیان کی دیکھ سب سے بڑی خصوصیت ہے کہ اس کی

صحیح نقل نہیں کی جا سکتی۔ مروجہ سجاوٹ نے "محشر خیالی" میں

ابوالکلام کی شری طرز اختیار کرنے کی کوشش کی ہے مگر اس

میں وہ شان و حرکت اثر و تیز بیاخت اور روایتی نہیں

آئی جہاں عبارت شائع ہو گئی ہے، وہاں آورد کا احساں

ہوئے جتنا ہے؟ ان عبارت میں روایتی پیدا ہوئی ہے وہاں

سلوک معنی یعنی پانگنی ہے آزاد کے بولنے طائر سے آزاد

کے شوح و رنگین انداز بیان کی فہم آڑنے کی کوشش

کی تھی مگر کبھی ان کی عبارت ایک جہی نثر اور بے معنی کوشش

سے زیادہ نہ بڑھ سکی۔ سرسید کی اردو انتہائی سلیس

اور رواں ہے تلفظ اور فصیح اس میں نام نہیں برید

کبھی بات کو بڑھا چڑھا کر کہنے اور مترادفات الفاظ کی بھار

کرنے کے قابل نہیں۔ وہ ہمیشہ سیدھی بات سادھے لفظوں میں

ادا کر کے مطمئن ہو جاتے ہیں سرسید کا ہر بڑے ہنر والا شاعر

یہ سمجھتا ہو گا کہ ایسی آسان اردو وہ بھی بے تلف لکھ سکتا ہے

مگر یہ حقیقت ہے کہ دلیہ و جلد بھی لکھنا انتہائی مشکل

معلوم ہوگی۔ سرسید کا ایک چھوٹا سا مضمون "بحث و تدارک"

جو اکثر درسی کتابوں میں موجود ہے طنز و مزاح اور سلاست

و بے تعلقی کا بے مثال نمونہ ہے جو بڑے چھوٹے جملے معمولی الفاظ

رواں عبارت کہیں لکھنے کا نام نہیں لے سکتا انداز بیان اردو

میں اور نہیں نہیں انسا، انداز و دراصل الفاظ کی صحیح استعمال

کا دومرا ہم نے فقط کو اس کے صحیح معنی میں صحیح مقام پر استعمال

کرنے سے اس میں جان پڑ جاتی ہے اسی طرح بہترین اسلوب

وی ہے جو فطری ہو فصیح سے پاک ہو اور تلفظ سے دور ہو

عبارت میں سادگی، اسی وقت پیدا ہوگی جب کہ الفاظ کا استعمال

بے تلفظ کیا جائے فطری انداز بیان وی ہے جبکہ تحریر و تقریر

میں کم فزق رکھا جائے۔ تلفظ اسلوب بیان حاصل کرنے میں

جو بہت سی دیکھیں پیش آتی ہیں وہ صرف اسی صورت میں دور

ہو سکتی ہیں کہ انسان سمجھے سے پہلے یہ سوچ لے اگر ایسے ہی

بات کسی سے کہی ہوئی تو کیسے کہتا۔ پس وی طرز ادا و اختصار

اور جامعیت کے ساتھ تحریر میں اختیار کرے تو وہ بہترین اہلکار

مطلب ہوگا۔ اختصار اور جامعیت اس لئے ضروری ہیں

کہ ہماری گفتگو میں ہر جملے کا مکمل طور پر ادا ہونا ضروری

نہیں۔ بہت سی باتیں جملہ معترضہ کے طور پر ہمارے منہ سے

نکل جاتی ہیں نیز گفتگو میں عام طور پر ایک ہی بات کو دوہرانا

اور بار بار کہنا آتا معصوب نہیں ہوتا جتنا تحریر میں ہوتا ہے

غالب کے خطوط کی مشرقی تلفظ اور فطری اسلوب بیان

کا اعلیٰ نمونہ ہے غالب نے اپنے اچھے انداز بیان سے حواس

کو رکھ لیا بنا دیا ہے وہ اردو نے معلیٰ کا باعث ہے۔

اس کی زبان نرم شستہ اور فصیح ہے ایسی سلی اردو

بہت کم لوگوں نے اچھی ہے غالب کے خطوط پڑھتے ہوئے

ہیں ایسا محسوس ہوتا ہے گویا غالب خود ہم سے محفل گفتگو

ہے یہ انداز بیان کا سب سے بڑا کمال ہے اس کی تحریر

ہے سادہ بیانی دی ہے۔ گزرا فلہا کا طریقہ بدل گیا ہے۔ اعتباراً حالی کے دل بدو ملے کی خاص صفت ہے وہ بھی حیات کی رو میں بہہ رہیں جاتے ہیں جو محض کے وقت بھی جذبات میں اعتبار ہوتا ہے انداز تحریر نہ بھی بہت تیز اور نہ کبھی بہت مدہم ہوتا ہے۔ انداز پر ہاؤ ضرور ہے کہ کیا نہیں کہ سنجیدگی کا خاص گہاں ہاؤ سے چھوڑ جانے۔ حالی بھی الفاظ سے نہیں بھیلے وہ اب ہی کہتے ہیں جیسے ہمیں کرتے ہیں۔ قبل ازان کہ کھجوری الفاظ ان کے مطلب کو نہیں چمکاتے ان کے مطالب سادہ الفاظ کو چمکا دیتے ہیں۔

اچھو دیوان کے دیباچہ میں اپنے زمانہ کے مجازے ہوئے ذوق شاعری کی اصلاح سے متعلق لکھتے ہیں :-
 جو لوگ عاشقانہ گوئی کے چٹیا رب سے واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ خون جہاں منہ کو لگا پیر ذرا مشکل ہے چھوٹتا ہے مگر زمانہ کی ضرورتوں نے یہ سبق پڑھا دیا کہ دلفریب کر محی باتوں پر آفریں سننے سے دل شکن کر گاہ کی باتوں پر نفریں سننی بہتر ہے۔ اور عالم وقت نے یہ حکم دیا کہ پروانہ و مہل کی شمس کو بہت رو چکے بھی اپنے حال پر کبھی دو آنسو بہانے ضرور ہیں :-
 ایک جگہ دیا و کا غالب یہ کہتے ہیں :-

”اگر چہ اس لحاظ سے کہ ایشیا فی شامی کا مذاق پور و چین سیو کوشت میں روز بروز تسخیر ہوتا جا رہا ہے۔ اور خدای لہجہ ہندوستان سے ایسا نصرت ہوا کہ نظار اس کے مراجعت کرنے کی توقع نہیں رہی۔ یا مسید رکھنی تو فصل ہے کہ مرزا کی ناری نظار و شراب یا آئندہ زمانے میں مقبلی خاص و عام ہوگی مگر جو تو اب پروے مرزا کی شاعری اور نکتہ پر داری پران کی زندگی میں پڑے رہے اور جواب تک مر لکھ نہیں ہوئے کیا عجب ہے کہ ہجاری اور ہمارے بعد کسی دوسرے شخص کی کوشش سے رفع ہو جائیں :-

درد حاضر کہ سب سے اچھے صاحب طرز افسانہ واد ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب ہیں حالی کی تمام اچھی خصوصیات

میں اشارے کا نئے طرز و مزاج کے تمام پہلو بالکل اسی طرح موجود ہوتے ہیں بطرح گفتگو میں برہان خاطر کی مخالفت کے زمانہ میں ایک خط میں لکھتے ہیں۔

”ان فرنگ کھنے والوں کا مدار قیاس پر ہے جو اپنے نزو ویک صبح کھتا ہے وہ کھدیا۔ نظاری یا سعدی کی لکھی ہوئی کوئی فرنگ ہو جو اس کو مانیں ہندیل کو کوسوکر مسلم البیوت جائیں ایک گائے کا بچہ بزور سحر آدمی کی طرح کام کرنے لگا۔ سچ اسرائیل اس کو خدا سمجھے :-

آخری جگہ میں جو طرز کا طریقہ اختیار کیا گیا ہے اور دوشراس سے بالکل پہلی بار دوشراس ہو رہی ہے برتا کے موسم میں ایک دوست کو خط لکھتے ہیں دیکھنے کوئی جملہ یا الفاظ سے زیادہ کہ نہیں۔ نہ کوئی لفظ اب جو عام گفتگو میں نہ آتا ہو پھر بھی اطلوب بیان آسان و کش کہ پوری فصاحت یا دکر نے کو جی چاہتا ہے۔ دیوان خانے کا حال محلہ ان سے دتر ہے۔ مرے سے نہیں ڈٹنا فقدان راحت سے گہرا گیا ہوں پت پت چھٹی ہو گئی ہے ابرو دھکھٹے برسے تو پت جار کھٹے برستی ہے :- ایک خط میں دلی کی اجڑی ہوئی رات کو بڑے پراثر انداز میں پیش کرتے ہیں مخاطب ذاب غلازلین خال ہیں :-

”کل شمارے خط میں وہ پار یہ کل مرتوم دیکھا کہ دلی براشہر ہے ہر قسم کے آدمی و دل بہت ہوں گے اے میری جان یہ وہ دلی نہیں جس میں تم پیدا ہوئے وہ دلی نہیں ہے جس میں تم نے تحصیل علم کیا وہ دلی نہیں ہے جس میں تم شعبان یک کی خوبی میں مجھ سے پڑھنے آتے تھے وہ دلی نہیں ہے جس میں سات برس کی عمر سے آنا چاہا ہوں وہ دلی نہیں ہے جس میں اکیادان برس سے مقیم ہوں ایک کپ ہے جس میں سلمان اہل حو فیا حکام کے آٹا کرو پیش باقی مرا مر نمودا بادشاہ کے ذکور و بقلیہ السیف ہیں وہ دلی پانچ روپیہ ہمینہ پاتے ہیں :-

غالب کی یہی زبان دوازم ہو کر حالی کے حصے میں آتی

ہو جاتے اور نہ جاننے کی وجہ سے استعمال میں نہیں آتے یہاں زبان کا دار و مدار ایک مدت تک شاعروں پر رہا اور شعری کا سبب ان زیادہ تر غزل کے لئے وقف تھا وہ ایسا تنگ کہ اس میں زبان کی کہاں تک گہمت ہوتی۔

ذیل کی عبارت جو ان کے خطبے سے ماخوذ ہے خاص طور قابل غور ہے اس میں ان کے طرزِ تحریر کی عکاسی کے اسلوب سے قریب ترین شاہدیت کا پتہ چلتا ہے۔ بالکل اسی موضوع پر بحالی نے اپنے مشہور مقدمہ شعر و شاعری میں بھی عامہ فرمائی کی ہے۔ اگر وہ عبارت پیش نظر ہو تو اس عبارت سے اس کا مقابلہ خالی از دو شبہ نہیں ہو گا۔

”یہ جو کہا جیسے کہ ادب زندگی کا آئینہ دار ہے وہ حقیقت پر مبنی ہے۔ مثلاً عرب کا علمیت کے شعرا کو عجیب شاعری ان کے رنگ و پلے میں پھری ہوئی تھی۔ معمولی سامعوں اور جزوی سا جزوی معاملہ بحالی کی نظر میں ایک بڑا واقعہ تھا اور تحریکِ شعر کے لئے کافی تھا۔ ان کی لڑائیاں ان کی فتح و شکست اور عشق و محبت (خیالی نہیں) خوف و خطر انتقام مہماں نوازی و بغض بہاں تک کہ ایک پچھلے کی ولادت کا نقشہ ان کی نگاہوں میں زندہ موجود ہے۔“

اسلوب بیان کے متعلق اکثر دو مختلف نظریے پیش کئے جاتے ہیں بعض کا خیال ہے کہ یہ ایک بالکل فطری چیز ہے جیسے شاعری بعض کے نزدیک اسلوب بھی مضمون نگاری اور علمِ نقد کی طرح محنت اور مشق کا ردیہ ہے۔ لیکن غور کیا جائے اس کا جواب بھی بحالی کے کس بیان سے لیا جاتا ہے جو انھوں نے شعر کی آواز اور آواز کے متعلق دیا ہے۔ حلی لکھتے ہیں کہ آواز اور آواز کا مفہوم جیسا کہ عام طور پر لیا جاتا ہے حقیقت سے بعید ہے۔ بیٹ لکھی شعر میں بے ساختگی روانی اور زور ہو تو اسے آمد کا نتیجہ سمجھا جاتا۔ اور کم زور اور سست شعر کو آواز و کی پیداوار۔ نیز برائے ہر اس شعر کو جس میں روانی اور زور ہونا درستگی اور میر کوئی کا نتیجہ خیال کیا جاتا۔ گویا جو شعر سوچا، چاکر کہ بعد بڑی دیر میں صفحہ قرطاس پر آتا اس میں آواز کا جونا ضروری تھا۔

بدیہ اتم موجود ہیں وہی عجب گدی وہی خودداری وہی اعتدال پسندی وہی مخالفتِ تیزی سے احتراز اور وہی ہر بات کو امتیاط سے چیر چکر کرنے کی عادت جو بحالی کا طرزِ اختیار ہے عید الحق کے حصے میں آئی ہے مگر عید الحق صاحب کا اسلوب عکاسی سے زیادہ سنگت اور سادہ ہے بحالی اکثر عکس طلب کے اظہار کے لئے انگریزی الفاظ استعمال کرتے رہے جو بحالی میں مگر عید الحق اوق زین انگریزی ترکیب اور الفاظ کو بڑی سنگت سے خاص اور دکا جانہ پہنچا دیتے ہیں۔

عید الحق کی اردو متنی سادہ ہے اتنی ہی شیریں ہے ان کا یہ انداز بیان ہر قسم کے مطالب کے اظہار کے لئے نہایت معززوں سے ان کے مقدمات دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ وہ کس آسانی سے معاشی، سیاسی اور سائنسی موضوع پر قلم اٹھاتے ہیں اور یہاں مشکل مسائل کو اپنے دل و کش اور سادہ انداز بیان میں بے غصیل شریع کرتے پیلے جاتے ہیں۔ کلام غالب کے متعلق ایک جگہ لکھتے ہیں۔

”غالب کے کلام ایک لازوال نعمت ہے جو ان زبان گزرتا جاتا ہے اس کی قدر اور بڑھتی جاتی ہے جب تک اردو زبان زندہ ہے اس کے زندہ رہنے میں کوئی کلام نہیں اگر یہ نہ سمجھا رہے تو بھی یہ کلام زندہ رہے گا کیونکہ اس کا مکمل محض الفاظ اور زبان پر منحصر نہیں بلکہ ان قیود سے بالا و برتر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی متعدد و شریں بھی جا سکی ہیں اور آئندہ کیوں نہ بھی جائیں گی اور فاضل شجاع اس کلام کے سبب میں اپنی جدت اور ذہانت کو دکھانے کے مواقع ڈھونڈ لیں گے۔“

مقدمہ باغ و بہار میں میر اس دہلی کی زبان کے متعلق لکھتے ہیں۔

”راہِ زبان کا معاملہ تو اس کی فصاحت اور خوبی یا کلام نہیں ہو سکتا اس کے علاوہ جو بات دیکھنے کے لیے یہ کاس میں کس کیوں نہ تھا وہ اسے اور لغتِ خالی سے لے کر آج کل بول چال یا تحریر میں نظر نہیں آتے بعض تو ایسے ہیں جو قلمروک ہو گئے ہیں اور بہت سے ایسے ہیں جو آنکھ سے اوکل

علیت کی علامات نظر نہیں آتیں لیکن اسلوب کی کثافت کی اد
رنگینی کی وجہ سے ہم انہیں پڑھتے ہیں۔ لیکن یاد رکھئے کہ غلطی
اور رنگینی بالکل تاریخی اور طبعی ہے۔ اسلوب کو ایک مستقل
رنگ دینے اور اس کو جیسے باقی رہنے والی غلطی عطا کرنے کے لئے
مطالعہ کی اہمیت کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ آپ کو اردو کے
بہت سے ایسے ادیب نظر آئیں گے جو اتنے ایسے طرز نگارش
کی وجہ سے بہت مشہور تھے۔ لیکن فقدان مطالعہ نے ان کی تحریر
سے وہ بات چھین لی اور ان کی تحریر کی دشمنی کی جگہ بوس
نکار غلطی اور ایک اکتا دینے والے اسلوب نے لی ہے۔ اور
وہ لوگ موجودہ زمانے سے بہت دور دکھائی دیتے ہیں۔ اچھے
اسلوب نگارش کے لئے یہ بات سب سے ضروری ہے کہ لکھنے سے
پہلے سوچنے کا انداز بہت اچھا ہو اور

پہلے سوچنے کا انداز بہت اچھا ہو اور
(حسنہ مصنفہ) یا کچھ موٹے انداز فکر کے بغیر نہ تحریر میں
خوش اسلوبی پیدا ہوگی نہ مافی الضمیر کا واضح اظہار ہوگا اور وہ
لکھنے والے کی طبیعت کا وہ رنگ اس میں بھلے گا جو انفرادیت
کے حصول کے لئے ناگزیر ہے۔ (R. M. Stevenson)۔
اسٹیوٹن کہتا تھا میں ہر چیز پر لکھنے سے پہلے اتنا سوچ لیا کرتا
ہوں کہ وہ بالکل میرے دماغ میں واضح ہو جاتی ہے۔ لکھنے کے
بعد ہر لفظ اور ہر جملے پر غور کرتا ہوں تاکہ اس سے موزوں اور
بہتر کوئی طریقہ اظہار نظر آئے تو اختیار کر لوں۔ میں اپنی تحریر پر
اتنی محنت صرف کرتا تھا جتنا ہوں کہ میرے پڑھنے والے کو اس کے
لکھنے میں کوئی وقت نہیں نہ رہے۔

محمد احسان صاحب

لیکن غور کیا جائے تو دو اقدار بالکل اس کے برعکس ہے۔ وہی
شعر جس پر زیادہ وقت صرف کیا جائے ہر نقطہ نظر سے بہتر
ہوگا۔ یہی بدانت تو ہر برجستہ شعور کا اچھا ہونا ضروری
نہیں۔ اسلوب بیان کا بھی کچھ یہی حال ہے۔ میں نے اکثر لکھا
کہ کچھ سنا ہے کہ فلاں شخص بڑا صاحب طرز ادیب ہے
اور ایک خاص بے ساختہ اسلوب رکھتا ہے۔ ثبوت اس کا
یہاں دیا جاتا ہے کہ وہ قلم ہاتھ میں لیتے ہی بغیر دماغ پر زور
ڈالے بیسوں صفحے لکھ ڈالتا ہے۔ لیکن ہر اس شخص کا جو
فی البدیہہ مقصود لکھ سکتا ہو صاحب طرز ہونا ضروری نہیں۔
اچھے اسلوب اور طرز بیان کے حصول پر غور کریں تو ہمیں چند
نمایاں نکات نظر آئیں گے۔

ایک اچھے طرز کا مالک ہونے کے لئے زبان پر قابو
از ضروری ہے۔ جب تک الفاظ پر محاوروں پر چلنے کی توجہ
پر کسی کو پوری طرح قابو نہ ہو اسلوب قطعاً پیدا نہیں ہوتا۔
جس بات کو آپ کہنا چاہیں بے تکلف بے ساختہ مختلف و عجیب
انمازیں اسی وقت ادا کر سکتے ہیں جب کہ آپ کے پاس
زبان کا وسیع ذخیرہ موجود ہو ورنہ آپ کے خیالات آپ کے
حدود الفاظ کے تابع رہیں گے۔ اور آپ کا ذہنی رجحان جو
صرف آپ کے خیالات کے برجستہ ادا ہونے میں باقی رہ
گا اس صورت میں غائب ہو جائے گا۔
دوسری چیز اس طرح مطالعہ ہے۔ آپ کہیں گے ہمیں
ایسے ادیب بھی نظر آتے ہیں جن کی تحریروں میں ہمیں کسی نمایا

کھیل

دھرتی کا جو سینہ چیرے آغز منہ کی کھائے زر کی خاطر خون بہائے، لیکن خاک نہ پائے
جگ کی جھولی بھرنے والا اور دامن پھیلانے ہرے بھرے کھیتوں کا آقا اور فاقوں مرجائے

مجھ سے تو یہ آڑا سیدھا کھیل نہ کھیلا جائے

یہ کہ ساروں کی دیوی، یہ بے پردہ اور واہی جس کی ایک ادا کس نظر سے رستہ بھولیں ہی
دل کو ہلکورے سے دے جس کی محمود نگاہی اور اک دُور کا دولت والا اس کا مول چٹکا

مجھ سے تو یہ آڑا سیدھا کھیل نہ کھیلا جائے

قدم قدم پر گاگر کو یہ چھلکا قاتی پنہاری آنکھوں میں تاروں کی نو، سانول میں کی بڑاری
اٹھی ہوئی باہوں کے خم میں اڑنے کی تیار اور اک "اپ ٹو ڈیٹ" شکاری اس کی ناک لگا

مجھ سے تو یہ آڑا سیدھا کھیل نہ کھیلا جائے

گھاؤں کے یہ البیلے، باکھے، متانے، متوالے بھولی بھالی دہقانی اؤں کی گوو کے پالے
جن کے ساتھی جیت کے جھونکے اور سادکے جھاٹے ان کو اک منحوس ہاجن ہتھکڑیاں پہنائے

مجھ سے تو یہ آڑا سیدھا کھیل نہ کھیلا جائے

زترین ٹیلے ہست کھجوریں، خاموشی، رعنائی بچنے پرانے خیمے، یعنی یہ قریے صحرائی
جب ان پر چھا جاتے ہیں تہذیبوں کے ٹوٹائی دھرتی ماتا چلتی ہے۔ میں لٹتی ہوں ملنے

مجھ سے تو یہ آڑا سیدھا کھیل نہ کھیلا جائے

مٹی کے معصوم گھر وندے، خن کی یہ درگاہیں کھیتوں میں بل پر بل کھاتی پتلی پتلی راہیں
گھنے گھنے یہ جنگل جن میں بھنگیں تیز گھمیں اور یہاں منعم مرمر کی محسرا بنوائے

مجھ سے تو یہ آڑا سیدھا کھیل نہ کھیلا جائے

آزادی پر مرنے لیکن زنجیروں سے ڈرنا بڑی بڑی تنخواہیں پانا اور من مانی کرنا
خود ہی آگ لگانا اور الزام کسی پر دھرنا شاعر اور بھانڈوں کی طرح نوابوں کے گن گائے

مجھ سے تو یہ آڑا سیدھا کھیل نہ کھیلا جائے احمد ندیم قاسمی

ماحول اور شخصیت

سے نجات دلانے کی کوشش کرتے گئے۔ ان کوششوں کا طرہ جو سے کو بھی ہوا اس نے اپنی قدیم زندگی کی نکتہ ترک کر دی اور یہ جابل نوجوان اس زمانے میں کچھ تکمیل طرہ کے بعد اس نئی تحریک میں شریک ہو گیا۔ آج اس کا شمار چین کے علمی کے چند مشاہیر میں ہے اور اس کو چین کا موشنکو کہا جاتا ہے جو اپنی موشنکو کی زندگی اس بات کی شاہد ہے کہ اس کے ماحول نے اسے جابل اور اقویٰ سے ایک جبریل بنا دیا۔

نفسیات کے جدید نظریات اس بات کی وضاحت کرتے ہیں کہ انسان کی زندگی پر اثر انداز ہونے والے اہم ترین عوامل اس دور کے مادی حالات ہیں۔ مثلاً اعلیٰ ترین میں ابھی تک کی پیدائش کا تکلیف نہیں کیا جاتا جو کہ اعلیٰ انسان کسی دور میں بھی روحانیت اور تخلیقی حسیب کا خالق نہیں رہا۔ مادی حالات وہ اہم ترین ذریعہ ہیں جو کسی شخصیت کی تشکیل کرتے ہیں اور مادی و معاشی حالات ایسی ہی شخص کی ہیرت و کردار کی تشکیل کرتے ہوئے ہیں۔ اور یہ حالات شخص سے گزر کر قوم تک اپنا ماحول کے لئے ہونے دیتے ہیں۔ مثلاً افریقہ کے بعض اپنی معاشی پستی و محکوم کی باعث آج تک کوئی ممتاز مقام حاصل نہ کر سکے۔ عازجہ کمی پیشوں نے اعلیٰ تعلیم بھی حاصل کی اور امتداد مالک میں بھی زندگی بسر کی لیکن انہیں کہیں عزت کی نگاہ سے دیکھا نہ گیا۔ یہ ایک کھلی بات ہے کہ جس ملک کے معاشی حالات جیسے ہوں اس ملک کی معاشرت بھی ویسی ہوگی مثالی کے طور پر جس زمانہ میں جاگیر کی نظام راج تھا تہذیب اور معاشرت کے جو اقدار تھے وہ ماضی اقدار اس ماضی دور میں یکسر بدل گئے معاشرت کی اس تبدیلی سے انسان کا مزاج بھی بدلا۔ اس کا انداز فکر بھی تبدیل ہوا معراج اور انداز فکر کی یہ تبدیلیاں شخصیت کی نشوونما میں اہم ترین اثر رکھتی ہیں اور یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ اعلیٰ نے ہمیشہ ان شخصیتوں کو جنم دیا ہے جنہوں نے کے طور پر یہ پیش کیا جاتا ماننا سب ہو گا کہ آج پست کی پید

نفسیات کے جدید نظریوں نے اس پر پائے خیال کی آج تردید کر دی ہے کہ ہر دور میں بعض نمایاں شخصیتوں نے اپنے ماحول کی تشکیل کی ہے۔ لیکن اس کتب خیال کے ماحولی ہی تک اپنی اس بات پر مصر رہی ہیں مثلاً ان کا یہ ادا ہے کہ اگرچہ جگہ کے بعد جرمی کی کیفیت بہ حالت میں ہٹلر کی شخصیت بھی جس نے ہٹلر کو نام عروج پر پہنچایا۔ اور وہ ہٹلر کی شخصیت کا جائزہ لینے لگتے ہیں کہ اس کے کردار کی استقامت، راسخ عزم مضبوط عقیدہ اور قوت ارادے نے اس کی شخصیت کی تشکیل کی اور وہ اس قابل ہو سکا کہ ہٹلر بزرگ کے مقابل میں اپنی تحریک کو آگے بڑھ سکے۔ یہ ادب بات ہے کہ اس نے سیاسی دنیا کیس جس کی وجہ سے اس کو اپنے مادیوں میں نام کی ہوئی۔ واقعہ یہ ہے کہ ہٹلر کی شخصیت فاشزم کی قوم دار نہیں ہے۔ جرمی کی سیاسی اور معاشی تاریخ شاہد ہے کہ وہ ہیں فاشزم کے ارتقاء و نمو کی ضرورت تھی۔ جرمی کی بڑھتی ہوئی سرمایہ دار کا تقاضا تھا کہ جرمی کی قیادت ساری دنیا پر چما جائے اس جرمی ملام اور باسٹنڈول کا مفاد و ایستہ تھا اور اس نے ساری جرمی قوم نے ہٹلر کی اس تجویز کا خیر مقدم کیا۔ ہٹلر کی ترقی یا اس کی عقل پر شخصیت کا نفسیاتی راز یہ ہے کہ اس نے جرمی قوم کی دلی خواہش کو جان لیا تھا۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ شخصیتوں کی تشکیل میں ہمیشہ ماحول کی کار فرمیاں رہی ہیں۔ مثلاً چین کا ایک ممتاز فوجی جبریل جو سے (مکمل حقیقت) چین سے شباب تک ایک آوارہ و درازت مزاج شخص تھا۔ اس کی یہ ابتدائی زندگی نینٹو فوجی اور پیش پندی میں گذری۔ اس کے فوجی ہیں اس نے فسادیاں کیں اور بغاوت پرستی میں وقت گزارا تاہم یہ سب کیس جب اس کے شباب کے زمانے میں ڈاکٹر سین یات سین کی کوششوں کی بدولت جمہوری حکومت کے قیام کی کوشش ہوئے تھے، انقلابی تحریکات میں سامنے چینی نوجوان حصہ لینے لگے اور چین کو بدیسی حکومت

لگا اور اس پر غشی طاری ہو گئی جبکہ یہ روسی سپاہی خواہ مخواہ جنگ سے محاذ پر سے ہٹا اور فرنگ (تیار داری) کے ادارہ میں شریک ہو گیا۔ لیکن ان غشیوں کی حالت کو وہ بھی دیکھ نہ سکا اور اسے وہاں سے ہٹا کر ایک جنگی کارخانہ میں بیجا لگا کر اس کی نرم دلی اور رفیقہ قبلی نے مجبور کر دیا کہ وہ محاذ سے ہٹ جائے۔ کسی بیل خانے میں آپ کو کئی ایسے شخص ملیں گے جو کسی جرم کی پاداش میں سزا جکٹ رہے ہوں لیکن ان کے ارادوں میں جرم کا کوئی شاہد نہیں اور وہ پاک زندگی کا تصور رکھتے ہیں۔ یا پھر آپ کو ایسے جرم بھی ملیں جن میں سخت ترین سزائیں دی گئی ہیں۔ لیکن اس کے باوجود جرم کرنا چاہتے ہیں۔ ان کی تمام حالات میں انسان کی داخلی خواہشات کا بڑا کام ہے۔ اسی لیے کہا جاتا ہے کہ کچھ آدمی کا باپ ہوتا ہے یعنی بعض فطرتیں نشوونما پا کر اس کی شخصیت کا ایک اہم جزو بن جاتی ہیں اور ہمیشہ برقرار رہتی ہیں۔

نفسیات کے ماہرین کا ایک گروہ یہ بھی خیال رکھتا ہے کہ بعض اشخاص میں جانتا ہوا افرادیت ہوتی ہے۔ ادنیٰ ہی افرادیت انہیں ممتاز بناتی ہے مثلاً جہان کا گاندھی ہیں وہ اس دور میں ہندوستانی سیاست میں داخل ہوئے جب کہ موٹی لال نہرو اور ہارلک جیسے ممتاز سیاست تھے لیکن گاندھی جی کو ان کی زندگی ہی میں ایک اعزاز نصیب ہوا اور اس کی وجہ ان کا راسخ عقیدہ اور خود اعتقاد ہی ہے وہ اس دور میں بھی ہمسایہ پر پورا بھروسہ رکھتے ہیں اور اسے اپنا مسک ہی نہیں بلکہ اپنی جماعت کا بھی مسک قرار دیتے ہیں اس دور میں آپ کی طرح ایک بڑے بڑے خود نیک افرادیت رکھتی ہے۔ اور یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ کئی شخص کی داخلی کیفیات بھی اس کی شخصیت کے میں ایک مقام رکھتی ہیں مثلاً مصطفیٰ کمال کی شخصیت کے نائنے میں ان کی خود داری کا بہت بڑا حصہ ہے۔ انگریزی زبان کا پہلا اور شہرہ آفاق ماہر.....

دوسرے دوسرے جرم کر رہے تھے مگر نہ کھانا اگر ملتا تو قید نہ ہوتی اور

نہیں ہوسکا آج جہنمی سامرا کا وجود ممکن نہیں اور اسی طرح آج سے ایک ہزار سال پہلے جو ہر ہی جرم کے سوجدہ یا جہنم کے دیوتا کرنے والے کا وجود ممکن نہ تھا۔

یہ ایک دلچسپ واقعہ ہے کہ اعلیٰ کی تسمیہ فی شخصیت کی اہمیت پر بھی بڑا اثر رکھتی ہے مثلاً جنگ کے آغاز سے قبل ملٹر موسولینی کے متعلق بڑی خوش امتیاد ہی تھی اور ساری دنیا انہیں خارج عقیدت ادا کرتی تھی کہ ان دو شخصیتوں نے اپنے اپنے ملک کو ترقی کی انتہا پر پہنچا دی ہے۔ لیکن سات آٹھ سالوں کے اس عرصہ میں سارا ماحول بدل گیا۔ سارا احتیاج تبدیل ہو چکا اور دنیا کی سیاسی و معاشی تنظیموں میں بھی ایک تغیر رونما ہو گیا۔ یہی دو ممتاز شخصیتیں آج ایک بلا قرار دی جا رہی ہیں۔ اس موقع پر نیو لین کی زندگی کو بھی میں چٹین کرنا چاہتا ہوں ایک جرم جنس صفت کی کبھی ہوئی سو اچھ کا میں نے ترجمہ پڑھا تھا جس میں اس نے نیو لین کو دنیا کا ممتاز ترین خارج قرار دیا تھا۔ اس کے کچھ دنوں پہلے جی وزلی کی کبھی ہوئی تاریخ عالم پڑھنے کا اتفاق ہوا جس کے مطالعہ سے پہلے کتاب کا وہ تاثر پائی نہ رہا اور جب جرمنی نے روس پر حملہ کیا تو روس نے یہ تہلکا پیٹ کر نیو لین نے بھی روس کی تسخیر کے منصوبے باندھے تھے۔ اور وہ سین گراؤنٹک پہنچ چکا تھا لیکن اس کے ارادوں کو ناکامی ہوئی اور یہی شہر جرمنی کا بھی ہو گا۔ جب یہ دعویٰ کئے جا رہے تھے تو نیو لین کے متعلق یہ تصور برقرار نہ رہا جو پہلے پیدا ہوا تھا۔ یہ واقعہ ہے کہ اس ایک صدی میں تسخیر اور جہاں بانی کے وہ تصورات جو پہلے تھے اب بدل گئے اور ان بدلے ہوئے تصورات میں نیو لین کی شخصیت بھی وہ برقرار نہ رہی جو پہلے تھی۔

شخصیت کی تشکیل میں جہاں خارجی حالات یا سماجی عوامل کی کارفرمائی ہے وہاں کسی شخص کے داخلی فطرت یا اس کے احساسات کا بھی بڑا دخل ہے۔ مثلاً حال میں میں نے ایک روسی کہانی پڑھی تھی کہ ایک روسی سپاہی نے ایک نامزد کو گولی کا نشانہ بنایا اور جب وہ تیغ اٹاتا ہوا گر پڑا تو یہ روسی سپاہی روئے

نکمی ہے اور ان کی تقریریں ہنگاموں اور نعروں کے درمیان ہوتی ہیں۔ ان کی شخصیات کی تشکیل میں مادی حالات ہی کی کافرمانیاں ہیں اور یہاں اوقات کسی شخص کی وہ عقلی کیفیات بھی اس کی شخصیت کو بنانے میں کام کرتی ہیں، اگر یہ عقلی شخصیتیں بگڑی ہی ہیں تو انہی معاشی مادی حالات اور سیرت و کردار کی تبدیلی کا اثر ہوتا ہے۔ اس دور میں تشکیل و تخریب کا نفع باقی جائزہ لیا جا رہا ہے اور اب یہ کہہ کر زندگی سے اور شخصیت سے گریز نہیں کیا جاسکتا کہ۔

ہستی کے مست فریب ہیں آجانبہ آئندہ عالم تمام حلقہ دام خیال ہے

عابد علی خاں

وہ اس زمانہ میں غور و فکر کا عادی نہ ہوتا۔ لیکن کس شخصیت پر ہے کہ وہ تنہائی پسند اور خاموش تھا زمانہ نے اس کو یہ نقطہ دیا اور اس نے انگریزی زبان کا مشہور ترین ناول لکھا۔ حال ہی میں ایک انگریز مصنف نے جو ابرہال نہرو کے متعلق یہ لکھا ہے کہ ان کی کتاب - *India - A History* - ۱۹۱۶ء میں لکھی گئی تھی پڑھے تو معلوم ہوگا کہ نہرو اپنی جگہ بہار کی طرح اہل اور اور تھے۔ یہاں لیکن ان کی اخباری تقریروں سے پتہ چلتا ہے کہ وہ رائے قائم کرنے میں جلد باز ہیں اور میری سابقہ رائے کی مانند وہ یہ ہو کر - *India - A History* - ۱۹۱۶ء میں لکھی گئی تھی جو ابرہال نہرو نے سکون و خاموشی میں

جلووں کے شرار

رنگ و نکمت کافوں خیز جہاں
وسعت ماضی میں بکھرے ہوئے رنگین نقوش
کتنے خوابوں کے نہرے سائے
ظلمتِ شب سے ہم آغوش ہوئے
آج اک پر تو رنگیں کے سوا کچھ بھی نہیں
صبح دم ڈوبتے تاروں کی طرح
ایک بے جان تصور کے دیئے
مسکراتے ہوئے جلووں کے شرار

نسر الہام

مسکراتے ہوئے جلووں کے شرار
ناچنے ناچنے گل ہونے لگے بجھنے لگے
چشمِ میگوں کی چمکتی ہوئی صہبا کا خار
صن محبوب کی نو خیز بہار
اور الفت کا وہ احساسِ جمیل
چاندنی رات میں اک تازہ سترِ تبک
سارے ماحول پہ یلغار کرے
ہر طرف نور ہی نور

ناچنے ناچنے گل ہونے لگے بجھنے لگے

بید کی آبادی اور نام

شہر بیدریط سمندر سے (۲۱۰۰ فٹ) اور حیدر آباد سے ۹۰۰ فٹ بلند اس وقت ایک فیصل کے اندر واقع ہے۔ یہ ایک قدیم شہر اور دکن کا ابتدائی یہ تخت تھا۔ پرانی تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ دکن کے نام سے جب اس ملک میں آبادی ہوئی تھی اس کا دار الحکومت یہی شہر قرار پایا۔ دوسرے لفظوں میں اس کو لوں بھی ادا کیا جاسکتا ہے کہ دکن میں یہ دکن کے نام سے یہ ملک آباد ہوا تو اس کے ساتھ ہی یہ شہر مستقر حکومت تھا اس قدر پرانا اور تاریخی شہر یا آبادی کا حصہ دکن میں دوسرا نہیں ہے۔

اس میں اختلاف ہے کہ موجودہ آبادی ہی آیا یا زمانہ قدیم میں شہر تھا یا اس کے قریب دھوار میں وہ حصہ آبادی واقع تھا۔ انقلاب زمانہ سے قدیم آثار باقی نہیں رہے اور نہ ہی فیصلہ بآسانی اس وقت ہو سکتا ہے یہ بڑا پتہ حیدر آباد کو مل جاتا ہے مضمون ہے جو ہم انشا اللہ تعالیٰ اپنی تاریخ ہند میں لکھیں گے۔ ہماری رائے یہ ہے کہ موجودہ آبادی کا باقی اعظم المسلمین احمد شاہ ولی بھی ہے جس نے قلعہ ارگ بنایا اس میں کسی مورخ اور کسی شخص کو انکار بھی نہیں صاحب فرشتہ اور نیز دیگر مؤرخین جو واقعات اس شہر کی آبادی کے متعلق لکھے ہیں وہ قرین قیاس ہیں کہ جب سلطنت ہندوستان کے حکم دہلیات میں کھینچ ہوئی اور اس کے بعد وہ ایک طرف بکھر رہا نہ کہ جا بھج چکا اور دوسری طرف ماس کواری سے بھی دور نہ کھل گئے بلکہ جگہ ارگ ملک انڈیا اس سلطنت میں داخل ہو گیا تو ایک مناسب مقام پر اور اس سلطنت کے قائم کرنے کی فکر ہوئی اگرچہ کہ لوگ بھی طاقتور اور دار الحکومت اور خاندان ہندوستان کے ماس میں مبارک ہونے کے بعد سے کچھ اس دور میں تھا۔ مگر غلط فہمی کو اس بات کی بڑی فکر تھی کہ اب وہاں کے خاندان سے بھی سفید اور خشتہ مقام منتخب ہونا چاہیے۔ چنانچہ اس نے لوگ کے اطراف چار چار سنسلی تک دورہ کر کے چپہ چپہ زمین کے

معائنہ کے بعد اسے یہ حصہ زمین بہت پسند آیا اور اس نے اس میں قلعہ بنا کر شہر آباد کیا۔ فی الحقیقت یہ امر واقعی معلوم ہوتا ہے اور جن دلائل پر مبنی ہے اس کا آج بھی ثبوت ہو رہا ہے۔ بہ نسبت لوگوں کے بیدر کی آب و ہوا بلند و مست اور کثرت پیدا ہونے کے لحاظ سے نہایت خوشگوار ہے۔ بہ نسبت لوگوں کے بیدر کی زمین کی حالت بھی نہایت اچھی ہے۔ آبادی کی غرض سے ایسے دارالسلطنت کے لئے جن زمینات کی ضرورت تھی وہ سب صفیق بیدر کی زمین میں موجود ہیں۔ یہ نرم پتھر کی بہاڑی پر واقع ہے۔ مشہور ہے کہ اسی زمین میں زعفران اور انعام کے ولایتی انگوڑ وغیرہ کی پیداوار ہوتی تھی۔ اب بھی انہوں و جاہل وغیرہ کی اچھی پیداوار ہو سکتی ہے مگر یہ حکمران قیون کی کاشت بند ہو چکی ہے۔ اعظم المسلمین کی دانشمندی کا پتہ ہوتا ہے کہ اس نے یاسی و سامی غرض پر پہلے اس خطہ کو منتخب کیا جو فی الحقیقت دکن میں بہترین نظیر نہیں رکھتا تھا۔ یہ امتیاز صرف اسی ملک کو ہے کہ جاس بل جنوب و مشرق میں سرخ زمین کی سطح واقع ہے جو مکمل بیدر تک پہنچتی ہے اور اسی طرح شمال و مغرب میں وہ پاس بل تک جو ہر موسم میں اپنی خوبی کے لحاظ سے نہایت زیادہ منظم ہوتی ہے۔ ایک زندہ دل شاعر اس کی سرخ مٹی سے ساڑھوں کر یوں انعام خیال کرتا ہے۔

ازبرائے ماندن ششاق منزل کر دہ اند

خانک بدر را بخون عاشقان گل کر دہ اند

یہ بات دلوگوں کے کسی خطہ اراضی پر متعلق ہے نہ اندر کے واقعات بیدر کے۔ غرض یہ کہ بیدر کی آبادی واقعی ایک نہایت خوش نما خطہ اور بلند تر مقام پر واقع ہوئی ہے اگرچہ کہ یہ مقام سطح سمندر سے ۱۰۰۰ فٹ بلندی سے ۵۰۰ فٹ حیدر آباد سے ۹۰۰ فٹ بلند ہے۔ ۱۵۰۰ فٹ سمندر سے ۲۰۰۰ فٹ (جو اس شہر و ضلع کے اطراف کے مستقر اضلاع میں) بلند ہے تاہم کوئی شخص یہاں پہنچ کر نہ اتنا اسی بلندی کو محسوس نہیں کرتا

مشہور رکھا تھا یہ بات دکن میں کسی اور شہر یا پائنتھ کو نصیب نہیں ہوئی۔

سلاطین بہمنیہ جو دکن میں حکومت حاصل کر کے عرصہ دراز تک کو س لمن الملکی بجاتے رہے ان کو یہ بھی بخوبی معلوم تھا کہ دور بہا (بیدر) کے سوائے دوسرے شہر بھی تخت گاہ قدیم میں گران کی نظروں کو سوائے اس حصہ کے دوسری آبادی پسند نہ آئی۔

اس بات کی سلسلہ شہادت موجود ہے کہ دور بہا (بیدر) کی قدامت کے برابر سلاطین بہمنی دوسرے کو نہیں تصور کرتے تھے۔ اس کے سوا ہم ایک اور بات پر غور کرتے ہیں کہ بہمنیہ کے بعد پانچ سلطنتیں مسلمانوں کی قائم ہوئیں۔ سوائے بریدیہ سلطنت کے دوسری چاروں سلطنتیں اعلیٰ قوت کے ساتھ مشہور و معروف رہیں۔ ان چاروں سلطنتوں کی نگاہ بہمنیہ بیدر پر ہی جو شخص بیدر پر قابض ہوتا وہ فی الواقع دکن کا مالک اور سلطان کہلاتے کا مستحق ہوتا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ بیدر قدیم پائنتھ اور دارا حکومت تھا۔

حیدر آباد اور وزنگ آباد کو کبھی قدیم پائنتھ تھے۔ یہی نہیں اس لئے زمین پر کوئی بحث نہیں کرتے۔ دولت آباد (دو گڈہ) کی نسبت بعض مؤرخین کا خیال ہے کہ یہ بھی غلطی ہوئی کہ دونوں اورنگ آباد اور دولت آباد کو ہم ایک ہی مستعمر سمجھیں۔ البتہ زمین کو قدیم پائنتھ کی عزت حاصل تھی دکن کی تاریخ کا مطالعہ کرنے والوں کو بڑے غور سے

اس بات کی طرف اپنے ذہن کو متوجہ کرنا چاہیے کہ اس کی وسعت کے لحاظ سے کتنے وزراء حکومت یہاں ہوسکتے تھے اور کون کون سے ہوں گے۔ معمولی روایت یا قصہ کہانیوں پر تکیس کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ بیدر کے نام کے متعلق ایک فارسی خواں مورخ کا یہ خیال ہے کہ راجہ بدر نے (جو اس مورخ کا حقیقہ ہے کہ یہاں کا راجہ تھا) اپنے نام سے آباد کیا۔ لوگوں کو عزت میں لانے کی غرض سے جب قلعہ میں کوئی سیاح یا مسافر جاتا ہے تو احشام کلا جوت

کیونکہ تدریجی طور پر بیدر کے اطراف میں ہجرت ہر ہفت روزہ کی گھائیاں ایسی واقع ہوئی ہیں کہ وہ ہیں ۳۰۰، ۴۰۰ اور ہیں ۵۰۰ فٹ کی بلندی سے دینہ بڑھتے جیسے بعد دیگرے ۱۰ صبح میں چنانچہ کلرگر سے آئیوا لوں کو بیدر سے ۳۰ میل کے فاصلہ پر ایک گھاٹی ملتی جو ۶۰۰ فٹ بلند ہے اس سطح گھاٹی کا سلسلہ ۱۵۔۱۶ میل تک ایک ساتھ چلا آتا ہے اور یہ معلوم نہیں ہوتا ہے کہ یہ ایک گھاٹی پر مل رہے ہیں پھر اس کے بعد معلوم ہوگا کہ ۲۰۰ فٹ کی ایک اور گھاٹی سامنے موجود ہے اس کو طے کرتے رہیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ بیدر کے قریب و حوالہ میں ہیں بلکہ گڈہ کے سطح اضطرار اس طرح بیدر کے در سے کے بنا۔ اور شاہ علی بریدیہ کے گنبدہ آئل سے ابھی تلخ دکھائی دیتے ہیں۔ شمال کے تمام لوں کو فٹ (خاناں پور) سے ۳۰۰ فٹ کی گھاٹی سے بلندی کی سطح پر پہنچا ہے اور مغرب کے آئے والوں کو۔ سرسی۔ روراو۔ باؤ کی تہذیب وغیرہ کے پاس اسی قسم کے بلندی پر چڑھتا پڑتا ہے۔ پھر کہیں میل یا دو میل تک سطح زمین کے سوا کسی کوئی سطح ملتا ہے۔

خوشنما معلوم ہوتا ہے۔ بیدر کے قریب تفصیل کے باہر کے حصہ میں) اب تک ناموراری ہے لیکن کوئی حصہ اونچے مقام پر ہے تو کہیں اس کے برعکس کہا جاتا ہے کہ زمانہ قدیم میں بیدر کا نام دورا ہما تھا جو مشہور راجہ بہمن کا پائنتھ تھا جس کی بیٹی وامن پر مالوہ کا راجہ مل عاضی ہو کر سلطنت دست بردار ہو گیا۔ انقلاب زمانہ سے جب اس خاندان کی سلطنت بھی تیار میٹ ہو گئی تو قسند ہار تخت گاہ بنا اور جب اس میں کسی راجہ ہو گئے تو کلیان اور درنگ کو یہ عزت حاصل ہوئی۔ پٹن چروا اور پٹن بھی دکن کے پرانے تخت گاہ کہلاتے ہیں اور اثر قدیم آثار جو اس وقت تک برآمد ہوئے ہیں وہ اپنے بائبل کی شہادت بن کر میٹر کر دیتے ہیں۔ خواہ کچھ دیکھی ہو، بیدر کے جگہ مستدار کلیان، درنگ، پٹن چروا وغیرہ ہونے ہوں لیکن قدامت اور عزت و شہرت اس خطہ و زمین کو حاصل ہے۔ قدیم راجاؤں کی بھاٹ (مورخ) اور کتاب خوالہ (فسانہ خواتوں) اسے اس کا نام دنیا بھر میں

کھنڈ ہو گیا تھا مسلمانوں نے اس موقع کی فداست
اور حالات کو دیکھ کر اپنا خزانہ مقرر کر کے حصار بیدر سے
منسوب کیا۔ اس میں ابھی قائل ہے کہ وہ حصار بیدر کیا ہی
آبادی بیدر ہے؟ مگر جو لوگ موقعی حالت کو دیکھ چکے ہیں وہ
ایسی رائے نہیں رکھتے البتہ یہ حصار بیدر موجودہ آبادی (جیدا)
سے چودہ میل کے فاصلہ پر مغرب میں ہے جو ایک پہاڑ پرانگ
اس حصہ کے کھنڈ پانچوں میں سے زیادہ لمبے پانی کی اونٹنہ

کر رہے ہیں۔
غرض موجودہ آبادی کے متعلق سوئے اس کے کہ اس کے
قلعہ اور آبادی کا بانی اعظم اسلامین اکبر شخص ہے ہم اور
کوئی دوسرا رائے نہیں رکھتے۔ اس شہر کو اعظم اسلامین
احمر شاہ ولی البہمنی نے ۱۵۲۷ء میں آباد کر کے پایہ تخت بنایا
اور قلعہ کی بنیاد ڈالی۔

محمد سید بیدی

غزل

رجوم غم میں راحت کی جھلک معلوم ہوتی ہے
مجھے تاریکیوں میں کچھ جھلک معلوم ہوتی ہے

مجھے اپنی محبت کا تقیہ سا ہوتا جاتا ہے
کہ اب اشکوں میں کچھ خوں کی جھلک معلوم ہوتی ہے

محبت اصل میں شاید اسی کا نام ہے ہدم
جو دل میں میٹھی میٹھی سی رسک معلوم ہوتی ہے

مجھے ڈر ہے ہی وجہ شکست دل نہ بن جائے
جو دل میں دامن ہی سی اک کشک معلوم ہوتی ہے

یہ کون آیا مریض عشق کی بیمار پرستی کو
یہ کس کو بات کرنے میں جھجک معلوم ہوتی ہے

تیری دنیا میں شاید غم سے کوئی دل نہیں ٹالی
دل ہر ذرہ میں غم کی جھلک معلوم ہوتی ہے

جمیل اک خواب دیکھا تھا کبھی زلفوں کے سایے میں
چمک دل میں کچھ اس کی آج تک معلوم ہوتی ہے

جمیل ملک

قانون

(ڈیوڈ لائل David Laill) کا نفاذی
واقعہ (According to Scott) کا ترجمہ
ہے جس میں انسان کے بلند و تکلیف نفسیاتی پہلوؤں کو اجاگر
کیا گیا ہے۔ (مر)

ایک دن صبح ہی صبح کہ دفتر ابھی ابھی کھلا تھا اور سر جیمز ویڈربرن اپنے اجلاس پر پہنچے ہی تھے کہ
ایک گاڑی گھر گھر کرتی دروازہ پر رکی۔ ایک نو عمر خاتون آتری، تیزی سے بیڑھیاں چڑھتی ہوئی دروازہ پر
پہنچی اور دفتر کے بیرونی حصے میں داخل ہوئی۔

”مجھے ان وکیل صاحب سے ملنا ہے“ اس نے تیزی اور باریک آواز میں کہا۔ ”جوں کاروبار کے مد
ہیں۔۔۔ ابھی۔۔۔ فوراً۔۔۔“ اس غیر معمولی درخواست اور انوکھی طرز نے ہم سب کی توجہ اپنی طرف مائل کر لی
اور سب کے سب اپنی میزوں سے نظر اٹھا کر اس کی طرف دیکھنے لگے۔ وہ بالکل نوجوان تھی۔ ۲۳-۲۴ برس کا
بن ہو گا۔ دیکھنے ہی سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ کسی سخت تردد میں مبتلا ہے۔ اس کا جنوبی انگلستان کا لہجہ بے حد
شیریں تھا۔ بدن مثال کی جھڑی لڑکیوں کے برعکس نازک تھا۔ کسی کلرک نے اس سے نام پوچھا مگر اس نے
پورا جواب نہیں دیا۔

”تھمارے سرٹو ویڈربرن مجھے نہیں پہانتے“ اس نے کہا۔ ”کہنا ایک مصیبت زدہ عورت ہوں“
اس پیام نے سرٹو ویڈربرن جیسے شخص کی مشہور سخت ذہنی توجہ پھیلا دیا۔ وہ فوراً کمرہ میں بلا لی گئی اور دروازہ بند
ہو گیا اور پھر کچھ دیکھ یا سن نہیں سکے۔ میرے افسر نے اس ملاقات کے سارے واقعات مجھ سے بے کم و کاست
بیان کر دیے۔ اس میں یہ واقعہ غالب کے صیغہ میں بیان کر دیا گیا اور جہاں میرا اپنا تعلق ہو گا اس حصہ کو ترک
کرنا چاہتا ہوں۔ سرٹو ویڈربرن کے پاس خانگی خطوط کا ایک طومار رہتا تھا اور وہ خط کھولنے کے بارے میں بڑے اولڈ
میشن واقع ہوئے تھے۔ ہر خط اپنے ہی ہاتھ سے کھولنے کے بعد خود زیادہ خطوط بازی کے عادی نہ تھے۔ جس وقت
یہ موقوف آتی ہے وہ خطوط کے ایک پلندے کو پیچھے جھرت سے ٹک رہے تھے۔ اپنی گھونٹ والی کرسی پر بیٹھے ہوئے
انھوں نے ایک نصف دائرہ بنایا۔ سونے کے فریم والی سینک ٹاک پر درست کی اور نوواہ دلڑائی کو غور سے
دیکھنے لگے۔

”گڈ مازنگ میڈم“ انھوں نے اسی متین آواز میں کہا۔ ”کیا میں آپ کا اسم شریف دریافت کر سکتا
ہوں؟“
”میرا نام؟“ اس نے بے بسی کے انداز میں دہرایا۔ ”میں اپنے نام ہی کے معاملہ میں آئی ہوں۔ بیج میٹنگ
میں اپنے کو منبر پہنچانے کی کوشش کرتی آئی۔“
”اس نام سے تو میرے کان سنا نہیں میڈم“ انھوں نے نہایت سنجیدگی سے کہا۔ ”میں دیکھ رہا ہوں
آپ سخت مضطرب ہیں۔ فرمائے میں آپ کی کیا مدد کر سکتا ہوں؟“
”نہیں ہی کہ آپ میری پریشانی دور کر سکتے ہیں“ اس نے کہا اور نیچے ہی میں ہلکی جلدی دیکھنے
اُتارنے لگی۔ ”میں سمجھتی ہوں پہلے کچھ اپنے متعلق بیان کرنا چاہیے؟ ماں اور باپ دونوں بھی دلخیز
دے گئے۔ میرا اپنا نام گرتا رہتا تھا۔ میرے والد محترم وال کے ایک عمدہ وار تھے اور میری ماں اسکاچی تھیں۔

اے انتقال کو گیارہ برس ہوئے اور جب سے ہم یہیں مقیم رہے۔ مگر میں سنسکریٹ میں گزشتہ کے مقام پر پیدا ہوئی۔ دو برس قبل آتی تھی بھاری رات کی اور ان کے پچھلے بھائی وہ حقیقت میں جس کی وجہ سے ہمیں بھلے شخص میں چھانوں بغیر ہی تھی بند ہو گئی۔ اس وقت سے میں ایک مدرسہ میں ڈرائنگ کی اساتذی کا کام کرنے لگی تھی۔

”بڑا دردناک واقعہ ہے میڈم۔ مگر بغیر کسی غیر معمولی عنصر کے۔ اچھا آگے چلیے۔“
 ”اچھی کے انتقال پر میں نے بکھریا یا انا نے فروخت کر کے تجھ کو بھیننے کے معارف ادا کئے اور ایک کمرہ کرایہ پر لیکر رہنے لگی۔ نیچے درجہ کے محلے میں رہنے کی مجھے کوئی پروا نہ تھی اور اس سے زیادہ کی مجھ میں اشتیاق بھی کہاں تھی چنانچہ میں نے ایک چھوٹا سا کمرہ کھیرل کے مکان میں لے لیا جہاں اور بھی بہت سے لوگ رہتے تھے اور اکثریت مردوں کی تھی۔“
 وہ بیکار رک گئی اور سینہ پہ ہاتھ رکھ لیا جیسے اس کا دم گھٹنے لگا تھا۔ اس کی حالت سننے پر میں نے کہا کہ جسم ہمدردی بنے بیٹھے رہے۔

”اس سارے گھر میں مکاندار ہی ایک عورت تھی۔ اس نے عشرت کے دن بچا دیکھے تھے اور اب قسمت تنگ دامانی کے ہاتھوں نیچے آ رہی تھی۔ میں اس سے بھی بہت کم لیتی تھی۔ بالکل اکیلی اور گنگائی زندگی تھی میری۔ یہاں تک کہ ایک کرایہ دار کا ڈھری بھیلن سے اتفاقی طور پر شناسائی ہو گئی۔“

”اس نے پھر ایک وقفہ لیا۔ مسٹر ویڈر برن نے پہلے ہی سمجھ لیا کہ اب آگے وہ کیا کہنے والی ہے۔“
 ”مجھے آپ کو تفصیلات میں الجھانے کی ضرورت نہیں“ حیرت انگیز طریقے سے وہ اپنی طبیعت کو قابو میں لاتے ہوئے بولی۔ ”اتنا کم دینا کافی ہے کہ ہم بہت گہرے دوست ہو گئے اور آپس کے ربط مضبوطی سے خفیہ شادی کی فوج آئی۔ وہ ایک طالب علم تھا۔ طب کا۔ بالکل ایک کادست نگر۔ اگرچہ وہ ہمیشہ شام میں بہت دیر دور کرکٹ میں رہتے تھے اس نے کبھی ان کو اس واقعہ سے مطلع کرنے کی جرات نہیں کی۔ میں دیکھ رہی تھی کہ اس کے ڈگری حاصل کرنے سے پہلے ہمارا کالج کرین اس کے لیے سخت مصیبت کا باعث ہو گا اور مجھے اس سے اس درجہ مشتاق تھا کہ میں اپنے لیے اس کا مستقبل تیار کر رہا تھا۔ میں نے اسے وقف کرنے پر مجبور کیا۔ مگر وہ کب ماننے والا تھا۔ آخر خرابا ہو گیا۔ وہ فوج میں بھرتی ہو رہا تھا اور پردیس جانے کا بھی بہت کچھ امکان تھا۔ آخر تین ماہ تک تو وہ نشانی میں رہا اور اب ہمیشہ شام میں اپنے گھر پر ہے۔“

”اس ساری مدت آپ کو تنہا چھوڑ کے؟“ مسٹر ویڈر برن نے ان اشارات میں ایک اور لفظ کا اضافہ کرتے ہوئے پوچھا جو وہ اپنی فوج میں دیکھتے جاتے تھے۔

”ہاں مجھے اس کی کوئی فکر نہیں تھی۔ میں آپ اپنے پیروں پر کھڑی تھی۔ مجھے یہ بھی خیال تھا کہ اس کی تعلیم پوری ہو جائے۔ میں نے اس وقت تنگ نظر نہ کیا قبضہ کر لیا تھا۔ مجھ سے غصہ نہ تھا۔ وہ گھر پہنچا اور سچ صبح مجھے یہ خط ملا ہے۔ وہ خط کہ اگر آپ خداوند کی تو میں سمجھ لیجے کہ اس نے میری زندگی ہی کا خاتمہ کر دیا اور بدنامی و رسوائی کی صورت اٹک دکھائی ہے۔“

کاشیپتے ہوئے ہاتھوں سے اس نے خط گریبان سے نکالا۔ جب تک مسٹر ویڈر برن خط کا مطالعہ کرتے رہے وہ آنکھیں بند کئے کرسی پر دراز رہی۔ جب انھوں نے خط مزید پھینک دیا تو چونک کے اٹھ بیٹھے۔

”محترم خاتون! انھوں نے کہا جس نسبت سے انھوں نے یہ دو کلمے ادا کئے اب تک کبھی ان کا لہجہ ارمقہر ملائم نہیں ہوا تھا۔“ ایک کلمے کا غلط ہے۔ ایک سنگدل خود غرض بد معاش کا جواب ہے مقدس بندھنوں کو توڑ دینا چاہتا ہے۔ کہتا ہے کہ کوئی نکاح ہی نہیں ہوا تھا اور میں نے نکاح نامہ جتنا ہوا کوئی سرکاری یا داری نہیں تھا اور یہ کہ اب آپ اس پر کوئی دعویٰ نہیں کر سکتیں خیر یہ دیکھ لیجئے۔ دیکھ لیجئے۔ اچھا اب مجھے آپ سے کئی سوالات کرنے ہیں۔ میں جواب کے لیے کوئی جلدی نہیں کروں گا۔ ہر چیز کا انحصار ان کی صحت و صداقت پر ہے۔ فرمائیے یہ نکاح کب اور کہاں ہوا؟“

”مسٹر ورنر کی ایک دوست مسٹر فری کے گھر پر۔ ۲۴ نمبر۔ ولسوڈ سٹریٹ۔ اس نے فرما جواب دیا اور اسی مختصر و جامع طریقے سے وہ ہر سوال کا جواب دینے کو تیار تھی۔“

”مائی ڈیر مسٹر ورنر“ انھوں نے الفاظ پر زور دیتے ہوئے کہا ”میں سمجھتا ہوں اس نام سے نکاح ہوا ہے جانے کی آپ اب بھی اسی قدر مت یقین ہیں جتنی پہلے سمجھتی تھیں۔ آپ کے نااہل شوہر نے اس رسم کے ادا کرنے سے پہلے اسکا چٹان کے قوانین کی کچھ درقی گردانی ضرور کی ہوگی۔ معلوم ہو رہا ہے وہ اس بات سے واقف نہیں جسے قانون کا ہر بندی جانتا ہے کہ اسکا چٹان کے قانون کے مطابق مرد اور عورت کا دو گواہوں کے مواجہ میں ایک دوسرے کو میلی بیوی قبول کر لینا میں شرعی نکاح کے مترادف ہے۔“

وہ اٹھ بھر جیسی سی بیٹھی رہی۔ اس کے چہرے کی متمنا سٹ غائب ہو چکی تھی۔ وہ زرد پڑنے لگی۔ اس کے چہرے پر مردنی سی چھانے لگی۔ مسٹر ویدر برن گھبرا اٹھے اور کہیں وہ بیہوش تو نہیں ہو جاتی ہے۔

”گھبرا ایسے نہیں“ وہ بولی ”میں بیہوش نہیں ہو جاؤں گی۔ مگر احساس نجات کا اثر بہت قوی ہے“ کچھ دیر وہ ساکت بیٹھی رہی اور مسٹر ویدر برن اس کے منبسط طبیعت کا دل ہی دل میں اعتراض کرنے لگے۔

”میں نے بڑی نادانی کی۔ کوئی مجھے میدان کرنے والا بھی نہیں تھا اور میں بے اعتقار اسے چاہنے لگی۔“ وہ بہولت کے ساتھ بولتی جاتی تھی۔ ”میں خوش ہوں کہ خدا مجھے اتنی گڑھی سزا نہیں دیگا جتنی سلوک میرے لیے بہت ہو گیا۔“

اب میں زیادہ سزا کی مستحق نہیں۔ مسٹر ویدر برن حیران تھے کہ کیا جواب دیں۔ وہ بے حد متاثر ہو چلے تھے گران کے بیٹے کے اعتماد سے اس قدر فستیقلی بالکل روایت کے خلاف تھی۔

”پھر آپ کیا کوئی میڈم؟ کیا آپ اس معاملے کو میرے سپرد کر کے میری ہدایات پر عمل کر سکتی؟“

”اوہ ہر وجہ شہم۔“ ہدایت آپ دیں گے میں اس کی تعمیل کو حاضر ہوں۔ صرف دو باتوں کا میں نے فیصلہ کر لیا ہے۔ اول تو یہ کہ میں اب اس کے لیے نہیں بندھنے کی مطلب یہ ہے کہ میں اس کے پاس واپس نہیں جاؤں گی۔ دوسرے میرا عوقت دنیا کے آگے واضح کر دیا جائے۔“

”یقیناً ایسا ہی ہوگا مسٹر ورنر۔ اس کے خاندان کو آپ کی منیت تسلیم کرنی اور آپ کا کفیل ہونا پڑیگا اور میں یہ سب ہوسکتے ہیں مگر مائنس جنس لوگ۔“

میں نے مسرور ہو کر جاتے دیکھا۔ ان کے چہرے سے انتشار کے آثار مٹ چکے تھے۔ ان کے جاتے ہی مسٹر ویدر برن نے مجھے اپنے کمرے پر بلایا اور ساری تفصیلات میرے آگے رکھ دیں جو میں نے ابھی ابھی اوپر

”تو ایسے میں اسے کچھ اضطراب نہیں ہوا۔“
 ”ابی بہت۔“ غلام نے اپنی طبیعت کو سمجھ لے رکھا۔ غریب نے ایک لفظ بھی تو زبان سے نہیں نکالا۔ کہتی تھی ہرات کا بھٹا بھٹا ہی پرہے گرمیوں میں خوب جانتا تھا اگر چیک میں نے کہا نہیں کہ اسی پر ہر جیسٹر کا دار و مدار تھا۔ جب ہم پول پہنچے تو معلوم ہوا کہ ویر کو رٹ کوئی کچھ میل پرہے۔ اٹھائے راہ میں میں نے اسے اچھی طرح سکھا پڑھا دیا کہ اب اسے کیا کرنا چاہیے۔“

وہ کیا؟ میں نے پوچھا۔ میرا اشتیاق ان کی چپ کو برداشت نہ کر سکا۔
 ”بس یہی کہ اس وقت تک کسی ملحدہ کمرے میں عیسویہ جب تک کہ میں کرنل ویر یا ان کی بیوی سے خود دل لوں یا دونوں ہی سے اگر وہ گھر پر موجود ہوں۔ ہم اچھے وقت پہنچے۔ وہ دو پہر کے کھانے پر تھے اور کرنل صاحب کے فارغ ہونے تک میں کچھ دیر انتظار کرنا پڑا۔ ہم ایک چھوٹے سے صاحبی کمرے (Hemming Room) میں ٹھہرے رہے۔ میں نے خانہ مال کو بھیجا کہ مجھے کرنل صاحب سے راز میں گفتگو کرنی ہے۔ اس نے مجھے کتب خانے میں لیجا بٹھا اور میری موکلہ اسی کمرہ میں رہتی تھی۔ ہم نے ”حمت“ میں بیٹھا تھے ہوئے اس کے کان میں کہا۔ گو اس کی مسکراہٹ پھیل چکی تھی تاہم مجھے یقین تھا کہ وہ آخر تک اپنے کو سمجھالے رہیگی۔ ایسی عورت کی اعانت کرتے ہوئے دل میں مسرت و انبساط کیسے اٹھنے لگتے ہیں۔ سچ ہے۔ واللہ سچ ہے۔“

میں کتب خانے میں بیٹھا ہی تھا کہ کرنل صاحب داخل ہوئے۔ میرے دیکھنے میں تو ایک اداکار فوجی نظر آتے تھے مگر کچھ روکے پن کی آمیزش کے ساتھ۔ میں نے سلام کرتے میں فیصلہ کر لیا کہ جب تک منرو تیرنڈر آئیں اپنے مطلب کا ایک لفظ بھی زبان سے نہیں نکالوں گا۔ لایل! معاملات انسانی کے اس وسیع تجربے نے مجھے باا د کھا یا ہے کہ عورت کی ایک مسکراہٹ قافوں کی لاکھوں فنون ساز یوں پر حاوی ہوتی ہے۔ اس معاملہ میں اپنی موکلہ کے قانونی موقف سے زیادہ مجھے ”عورت کی گداز دلی“ پر بھروسہ تھا اگر چیک ابھی مسند دیر سے ملاقات نہیں ہوئی تھی۔“

”جناب کو دن مسود ہو“ کرنل صاحب نے اسی روکھے پن سے کہا جو ایک انگلستانی سے ایک ایسے اجنبی سے ملاقات کے وقت ظاہر ہوتا ہے ملکی ملاقات کے مقصد سے وہ بالکل ناواقف ہے۔ ساتھ ہی میرے پیچھے ہونے کا رد کو وہ اس انداز سے دیکھنے لگے جیسے انھیں تعارف میں اس سے کوئی مدد نہیں مل رہی تھی۔

”آپ میرے نام سے متعارف نہیں“ میں نے کہا ”میں ایک وکیل ہوں۔ آؤ منبر سے اتر آؤں۔“
 میرا معاملہ آپ کے صاحبزادے سے ہے مگر یہ معاملہ ایسا ہے جسے سب سے پہلے ان کے والد اور والدہ کے اگلے پیش ہو جانا چاہیے۔“

اور والدہ کے آگے! کرنل صاحب نے دہرایا۔ اور میں نے دیکھا ان کے چہرہ پر تشریفات کا ایک ہلکا سا رنگ دوڑ گیا تھا۔

”اگر کوئی تکلیف وہ چیز ہو تو میرے خیال میں لیڈی ویر کو معاف ہی رکھیے تو بہتر ہے۔“
 ”میں کچھ سٹپٹا سا گیا۔ مجھے اتوار ہے۔ میری موکلہ نے خاندان کا نام نہیں بتایا تھا۔ مجھے ایسا

محسوس ہوئے لگا جیسے معاملہ ابھر نہیں سکا۔
 ”مجھے انھوں نے کہ لیدی ویر کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا ان کا مطلع ہونا لازمی ہے“ میں نے سر ہلوتے
 جواب دیا ”مجھے لیک سوال کی اجازت دیجئے۔ کیا آپ کے فرزند ہندوستان روانہ ہو چکے ہیں؟“
 ”ابھی نہیں۔ پیر کو روانہ ہوئے“

”پھر گھر میں ہیں؟“
 ”گھر میں ہیں“ کرنل صاحب نے دہرایا اور ساتھ ہی گھنٹی بجادی۔ ”میں تین کروں کہ آپ جو کچھ
 بیان کریں گے اس سے میری بیوی کو کوئی صدمہ نہیں پہنچے گا؟“ انھوں نے جلدی سے پوچھا۔
 ”مجھے اندیشہ ہے کہ یہ نتیجہ لازمی ہے۔ بات صرف یہ ہے کہ آپ کے فرزند نے
 اسکا چتان میں ایک خفیہ نکاح کیا ہے اور میں یہاں سنر جیکسن و بر کی حمایت میں حاضر ہوا ہوں۔“
 ”کرنل صاحب کا چہرہ بالکل سفید پڑ گیا اور انھوں نے اضطرابی طور پر گھنٹی کو ایک اور جھلک
 ”خفیہ نکاح؟“ انھوں نے دہرایا۔ ”میں معلوم تھا کہ وہاں اس کے کسی سے تعلقات ہیں اسنے
 اپنی ماں سے یہ واقعہ بیان کیا اور معافی حاصل کر لی۔ میں نے اسے بیچم پر چھوڑ دیا تھا۔“
 ”اگر آپ اجازت دیں تو ہم آگے بڑھنے سے پہلے لیدی ویر کا انتظار کر لیں۔“ میں نے لینٹ
 کہا۔ یا الفاظ مکمل میری زبان سے ادا ہوئے ہوئے کچھ کہ وہ داخل ہوئیں۔ میں نے ان کے چہرہ کا جائزہ لیا۔
 معاملہ سے تعلق رکھنے والی عورت ہی پر ہر چیز کا دار و مدار ہوتا ہے۔ اپنی مولا کے بارے میں مجھے سن سنے
 گئی جب میں نے لیدی ویر کے چہرہ کا گہری نظر سے جائزہ لیا۔ ایک حسین چہرہ۔ عورت جیسی عورت کا۔ جو
 ”ماں“ تھی اور سب شیتوں سے پہلے۔ ان کے انداز سلام میں اجنبیت جھلکتی تھی۔ ان کے میاں نے جو
 بے مشبہ ان کے پر تار تھے فوراً کسی پر بٹھا دیا۔
 ”یہ نئے کا قصیدہ ہے بیچم“ میں نے انھیں کھپساتے ہوئے سنا۔ ”ہمت سے کام لو“ پھر وہ میری نظر
 متوجہ ہوئے۔ بیوی کی کرسی سے کچھ اٹکے اور ان کے شانہ بہا تھ رکھے ہوئے۔

”اچھا مسٹر وڈر برن ہم آپ کی بات سننے کو منتظر ہیں“
 ”میں نے تفصیلی رد وادنا کر وقت ضائع نہیں کیا۔ اجمالی طور سے سچے واقعات ان کے آگے
 رکھ دیے مگر اس میں اپنی ساری قوت استعمال کر لی۔ میں عدالت کے کمرے کے پاس بھی زور و کالت دکھا سکتا۔ مگر
 مدد نہ دیکھا میرے الفاظ نے میدان مار لیا تھا۔“
 ”فریبک؟“ لیدی ویر نے ایک سو کی ”ہمارا اگر پارہ! اس کے متعلق یہ سوچتے ہوئے کہ
 وہ ایسے ہیماں سلوک اور دغا بازی کے نگاہ میں آلودہ ہے کس قدر دردناک معلوم ہوتا ہے؟“
 ”جب میں اپنی تقریر ختم کر چکا تو وہ اٹھیں۔ میں نے دیکھا انھیں سخت صدمہ ہوا تھا۔ ساتھ ہی عجوبہ
 یہ بھی تعجب تھا کہ ان کی بلند پایہ کیفیات، تحفظ و وقار کا بجلی احساس اور عدل گستری ان کا کام کر کے رہ چکے۔“
 ”اگر آپ نے جو کچھ کہا ہے سچ ہے“ وہ بولنے لگیں اور ان کی شیریں اور گھٹی آواز ہمیں بھی غور و
 نہیں کھاتی تھی ”تو ہمارے لیے جس ایک ہزار اہل کلی ہوئی ہے اور وہ یہ ہے کہ میرے بچے کی بیاہتی سے ہمارا انتقال

فرزدی ہے۔ اُسے یہاں آنا چاہئے اور فوراً آنا چاہئے۔“
 وہ میڈم اے میں خوشی سے چلا اٹھا کیونکہ اس قدر فرزدی ملو مطلب کا مجھے گمان بھی نہ تھا۔ وہ پہلا
 موجود ہے اور بازو والے کمرے میں بڑے۔
 انھوں نے مجھے سوچتی ہوئی نظروں سے دیکھا اور دوسرے لمحہ وہ کمرہ سے باہر جا چکی تھیں۔

میں نے ان کا مطلب سمجھ لیا تھا۔ ان کے جانے کے بعد منٹ بھر تک کمرہ پر خاموشی چھائی رہی۔
 ”کیا یہ حیرت کی بات نہیں؟ آخر کرنل صاحب بول اٹھے۔ ان کے چہرے کی جلد کے نیچے کرب
 و آزار گھٹ رہے تھے۔ کیا یہ حیرت کی بات نہیں کہ ایسی عورت کا شکم زادا ایسی حرکت کرے جو میرے لڑکے
 کا ڈفری نے کی ہے؟“ نظریہ تو ایشیائی کی ساری دلیلیں پاش پاش ہوئی دھڑکی ہیں۔

”ہر کچھ دیروں ہی لٹکھو کتے رہے۔“ کرنل صاحب بری طرح متاثر ہو چکے تھے۔ آخر انھوں نے
 جلدی سے معافی چاہی اور جھٹ سے کمرہ سے باہر نکل گئے۔ میں اپنے خیالات کے میدان میں شہسواری کرنے
 کو آزاد چھوڑ دیا گیا۔ دس منٹ بعد غناساں آیا اور صبا بھی کمرہ سے بلا دیا۔ جب میں کمرہ میں داخل ہوا
 تو دیکھا کہ ان تینوں چیزوں نے اپنا اپنا اقتضا پورا کر لیا تھا۔ ”عدل“ حق اور عورت کی گداز دلی اور باقی سے
 میری موکلہ کی پیاری صورت اور جادو نگار و جاہت نے منٹ لیا تھا۔ گرا بھی اس عجب میں الم کی چاشنی
 پیدا ہوئی باقی سچی اور یہ اس وقت پیدا ہوئی جب شکا ڈفری ویر ایک میز پر لاطلی کے ساتھ طبیبی کے
 انتہائی میں لے اندیشہ منظر پر گیا۔ میں اس کی وہ صورت بھی نہیں بھولوں گا۔ بس مروئی ہی تو
 چھائی اس کے چہرہ پر۔ بالکل بے جان نظر آنے لگا۔ اس کی سیمی لوجوان دھن جس سے وہ دلچسپ تھا
 اور بدنام کر دینے میں یکدم بھی باقی نہ رکھا تھا۔ دوسرے نموانی ہاتھ سے اپنا ہاتھ چمڑے کے ایک طرف لوہوئی
 کرنل صاحب نے سینہ پر ہاتھ باندھ لئے اور لڑکے کو کھونٹے لگے۔ خدا ایسی ہیبتی ہوئی نظروں سے پناہیں
 رکھے۔

”کیا آپ بتا سکتے ہیں۔“ انھوں نے جب دار آواز میں پوچھا۔ ”کہ ایک ہونہار سپوت کے بجائے
 ایک کینہ ہمارے بچے بندے کس قدر تکلیف دہ نہ ہو گا؟“
 ”الفاظ نے کڑے کا سا تڑانہ لگایا۔ حجاب کی کڑواہٹ اور تھماہٹ سے اس کے رخسار
 تپنے اور جھلینے لگے اور وہ ہاتھ ملنے لگا۔ گراس نے زبان نہیں کھولی اور بولتا بھی تو کیا بولتا۔ کس منہ سے
 بولتا؟ اپنے کڑوت اس پر حیاں تھے۔ وہ خط جو اس پر لفریں کر رہا تھا، اور جس نے ایک عورت کا کچھ
 پتہ چھوڑا تھا، میز پر کھلا پڑا تھا۔ وہ الفاظ جو اس نے اعتذار میں تھائے تھے ہونٹوں ہی پر پھیل کے رہ گئے
 میں اس منظر کی تفصیلات پورے طور پر چٹکی کرنے سے قاصر ہوں۔ جب اس لمحہ کی شدت کشائش
 اور تناؤ میں وہ سیلاب پیدا ہوا تو پھر لٹکھو ہونے لگی آخر میں سب ایک سمجھوتے کی طرف آنے لگے۔ اتنے
 میں میری موکلہ کچھ بولنے لگی اور میں سمجھتا ہوں ابتداء میں کسی نے اس کی بات سنی بھی نہ ہو گی۔
 ”میں جس مقصد کے لئے آئی تھی حاصل کر چکی“ وہ صاف صاف بولنے لگی اور اس نے لیڈی
 ویر کے چہرہ سے نظریں نہیں ہٹائیں۔ میں نے بھی طرح سے ثابت کر دیا ہے کہ میں آپ کے فرزند کی

شرعی اور جائز ہو ہی ہوئی۔ میں آپ کی شفقت اور مہربانی کو کبھی نہیں بھولوں گی۔ اب رہا "ان" کا معاملہ تو میں اپنی خوشی سے دوبارہ ان کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھوں گی۔ اور نہ بھی منہ لگاؤں گی۔ مسٹر ویڈربرن! اگر آپ تیار ہیں تو بسم اللہ ہم روانہ ہو جائیں۔"

"میں نے دیکھا اس کی طاقت جواب دے رہی تھی۔ دوسرے لمحہ وہ بے قابو ہو جاتی ہیں۔ اس کا ہاتھ تھم لیا۔ مگر لیڈی درینچ میں آگئیں۔"

"مگر پیاری تو یوں تو نہیں جاسکتی۔ تو میرے بچہ کی دہن ہے۔ اس نے جو کچھ کیا سو کیا مگر اب تو تو ہمارے ہے۔ میرے کوئی بچی نہیں اللہ پاک نے مجھے ہمیں بخشا ہے۔ آہ رہا ہمارے ساتھ! میری موکلہ نے جلدی سے لیڈی دیر کا ہاتھ لے کے لبوں سے لگا لیا۔ میں نے اسے چھوڑ دیا اس کا رواں رواں کانپ رہا تھا۔"

"نہیں نہیں۔ میں نہیں رہ سکتی۔ مجھے جانے دیجئے" اور میں نے انہیں اشارہ سے کہہ دیا کہ ہیں جانے ہی دیں۔"

"رفتہ رفتہ سب ٹھیک ہو جائیگا" میں نے لیڈی دیر سے کھسپاتے ہوئے کہا۔

"میں سمجھتا ہوں وہ اس وقت حق پر ہے۔ بعد میں کوئی بھی راہ نکل سکتی ہے۔"

"میں انہوں نے مہربانی کی کہ ہمیں چھوڑ دیا۔ میں مجھ چکا تھا کہ دنیا کی کوئی قوت اسے وہاں روکنے قادر نہیں۔ اس شخص کی صورت کا پیش نظر ہو جانا جس نے اس سے دعا کی تھی اس کی برداشت سے بالکل باہر تھا۔"

"یہاں مسٹر ویڈربرن نے ایک وقفہ لیا اور میں نے دیکھا اس واقعہ نے ان کے دل پر عجیب طرح اثر کیا تھا۔"

"تو کیا وہ واقعی آپ کے ساتھ اسکا چٹن واپس آگئی؟"

"یقیناً۔ آج شام میں لیوں ٹرس کی قدیم قیام گاہ پر چھوڑ آیا اور میرا خیال ہے وہ پیر کے دن سے پھر تعلیم دینے میں مشغول ہو جائیں گی۔ اور یہ وہی دن ہو گا جس دن اس کا شوہر ہندوستان کی طرف کوچ کر گیا۔ ارے! تو پھر نیچہ ہی رہا؟" میں ناامیدی سے پوچھ اٹھا۔

"نہیں بابا! میرے اصرار نے اپنے سگریٹ کے دھوئیں کے مرغولوں کو تاکتے ہوئے جواب دیا ابھی نتیجہ باقی ہے۔"

(مزعمہ)

محمد وقار الدین صدیقی

(ڈیوڈ لائل)

ٹھوکریں

میرے دوست کسی بڑے مفکر کا قول ہے کہ عقل کا کام جذبات کے لئے راستہ صاف کرتا ہے۔ اگر آپ عقل نے آپ کے جذبات کی رہنمائی کی ہے تو یقیناً آپ کی زندگی میسر ہوگی اور آشا ہوگی اور آپ محنت کے جھیلوں سے دامن کش ہی رہے ہوں گے۔ خوش قسمت ہے وہ شخص جس نے محنت کے صدمے نہیں اٹھائے یقین جانئے محنت کا آغاز جس قدر پر کیف ہوتا ہے انجام اسی قدر تلخ۔ یہی ایک حقیقت ہے، جو انسانہ بنتی رہتی ہے۔ مگر ہم نے جذبات کی اندھا دھند پیروی کی ہے اور اسی جوش جنون میں ہم نے مٹا کی تھی۔ اچھا ہے دل کے ساتھ رہے پاس باندھ لیں، لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دے۔ دل کی یہ کبھی کبھی کی تنہائیاں ہی تو غضب ڈھاتی ہیں۔ بھولی ہوئی محبتوں کی یورش ہوتی ہے۔ کچھ یاد آتا ہے اور دل کے رخم تازہ ہو جاتے ہیں۔ میرا سن چھ سات سال کا ہو گا، اپنے والد کے ساتھ میں ایک گاؤں میں رہتا تھا۔ ہمارے محلہ میں ایک بڑے زندہ دل ملازم رکھا رہتے تھے۔ میں اسکول سے چھٹ کر وہیں جاتا۔ ان کے پاس ایک عورت تھی وہ عورت مجھے ہر روز آنے کے لئے کہتی۔ وہ عورت گوری جی نہ تھی، حسین نہ تھی۔ بس ایک عورت تھی، جسے ہارمونیم بجانا آتا تھا۔ اور گا نا بھی آتا تھا میں وہاں گھنٹوں بیٹھا رہتا۔ بیٹھا گھورتا رہتا۔ اس عورت کو اس گھانے بھانے والی عورت کو اور اندر ہی اندر میرا دل ایک عجیب گھلاوٹ سی محسوس کرتا۔ وہ گاتی، مجھے بھی ساتھ دینے کے لئے کہتی اور میں جب اس کے ساتھ گانے لگتا تو مجھے یوں محسوس ہوتا جیسے میری آواز ہی نہیں۔ میری زندگی بھی اس کا ساتھ دینے کے لئے تخلیق ہوئی ہے۔ کہاں میں چھ سات سال کا بچہ اور کہاں وہ بیس پچیس سال کی عورت۔ لیکن مجھے عمر سے کیا سروکار تھا میں تو اس کی آواز اور ہارمونیم پر ناچنے والی انگلیوں کا دیوانہ تھا۔ میں گھنٹوں اس کے پاس بیٹھا رہتا اور جب وہاں سے زبردستی اٹھا دیا جاتا تو راستہ بھر سوچتا رہتا کہ اگر کبھی میری شادی ہوگی، کسی عورت کو میں اپنی بیوی بناؤں گا تو وہ ایسی ہی عورت ہوگی۔ میرے والد کا تباہ دلہ ہو گیا تو مجھے اس گاؤں کو چھوڑنا پڑا۔ جانے سے پہلے میں اس عورت سے ملا۔ اس نے ایسا صندوق کھولا۔ اس میں سے ایک قلم نکالا۔ کافر کا قلم، جس پر بھول پتے بنے ہوئے تھے۔ اس قلم کو اس نے میرے ہاتھ میں پکڑا دیا۔ کچھ دیر میری طرف تنگی باندھ کر دیکھتی رہی۔ مجھ سے ضبط نہ ہو سکا۔ میری آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔ اس نے مجھے اپنی گود میں اٹھانیا اور میری پیشانی اور گالوں کو چومنے لگی۔ جب میں جانے کو ہوا تو اس نے مجھے ہاتھ کے اشارہ سے روکا اور ہارمونیم لے کر بیٹھ گئی۔ اس طرح دل لگا کر گانے لگی کہ میں رو پڑا۔ اسی طرح رونے ہوئے میں وہاں سے چلا گیا اور وہ بھی میرے ساتھ ہو گئی، میرے دل میں تیغی ہوئی۔ قندک ہوا میں اڑتی ہے تو ڈور بھی ساتھ رہتی ہے۔ لیکن اس محسوس محبت کی دُور وٹ بجی۔ ایک نوخیز اہل لڑائی نے لوٹ لیا۔ مگر اس کا قلم اب بھی میرے پاس محفوظ ہے۔ جانے کب تک رہے۔ میرے دل سے کیسے دیالی یہ دوسری لڑکی میری رشتہ داری تھی۔

میں گمانے کا شوقین ہو گیا تھا۔ جب بھی موقع ملتا میں تائیں اڑاتا رہتا۔ جانے کس گیت کا اثر تھا کہ اس نے ایک دفعہ کچھ عجیب انداز سے دیکھا اس طرح کہ میرا دل زوروں سے دھڑکنے لگا۔ جیسے کچھ میں نے چرایا۔ اس دھڑکنے میں اپنے زروں کی روک ٹوک اور نگرانیوں سے محبت کو چوری ہی سمجھنے لگا تھا۔ اس لڑکی کی نظروں نے مجھے ہمیں کا نہ رکھا۔ میں ہر وقت اس کے خیال میں گرم ”کیا کرنا چاہئے“ ”اور کیا ہوگا“ کی ادھیڑ میں میں لگا رہتا ایک رات گرمی کے مارے برا حال تھا۔ سب کے پھونے باہر صحن میں بٹھ گئے۔ جس پلنگ پر وہ سو رہی تھی وہ میرے پلنگ سے ساڑاں تھا سات پلنگ میرے اور اس کے درمیان حائل تھے۔ مجھے اس رات نیند نہ آئی۔ چاندنی چٹکی ہوئی تھی اس نے موتیا کے چولہی اُچی ہوئی میں گوندے تھے۔ وہ موتیا کے خوشبودار بھول وہ اس کا دیکھا چہرہ اور وہ اس کے پھیلے بال مجھے نیند نہ آئی۔ اتنے میں نور کی آندھی چلنے لگی سب کچھ ہٹا کر کھ بیٹھے اور پھر کے سائباں میں سونے کی مصلح ہوئی۔ سائباں کے قتبے بھی پھونوں کی دی ترتیب رہی۔ سات پلنگ میرے اس کے درمیان حائل رہے۔ آندھی کا زور بڑھنے لگا اور یکایک سائباں کا ایک بانس ٹوٹ گیا۔ سائباں اڑا اڑا دھم زمین پر تودا۔ میں ہڑ ہڑا کر اپنے پلنگ سے اٹھا اور اس لڑکی کے پلنگ کی طرف دوڑ پڑا۔ وہ ہوشیار ہو گئی تھی لیکن اس حادثے سے اس کے ہوش و جاں اٹھانے سے نہ تھے۔ میں نے بے اختیار اسے اپنے ہاتھوں پر اٹھالیا اور باہر نکل گیا۔ میرے اطراف سب گھبرائے جج ہو گئے۔ سب کی نظریں کچھ پوچھ رہی تھیں۔

اس تاریخ اور واقعہ کے بعد سے ہم دونوں کو ایک دوسرے سے ملنے نہ دیا گیا۔ کچھ عرصے بعد اس لڑکی کی شادی بھی ہو گئی۔ اب بھی میں کبھی کبھی اس لڑکی سے ملتا ہوں۔ وہ ہر دفعہ اس واقعہ کی یاد دلاتی ہے۔ کیا وہ کبھی نہ بھولے گی اس طرح یاد رکھ کر اور یاد دلا کر آخر اس کا مقصد کیا ہے؟

زندگی کھیرے آسمان پر بہنے والے کیلے ابر کے ٹکڑے کی طرح سست رفتار اور بے سہارا ہوئی۔ دل کے ہر گوشے سے گرم سمجرات اٹھنے محسوس ہونے لگے کہ پھر وہی چھٹی۔ میں نے ان کو نہ دیکھا۔ انھوں نے مجھ کو دیکھا۔ ہاں بعض وسائل ایسے تھے کہ انھیں میرے بارے میں بہت کچھ معلوم ہو گیا۔ وہ اپنی سہیلیوں سے کہتیں ”میں ان سے محبت کرتا ہوں“ اور میں اپنے دوستوں سے کہتا ”وہ مجھ سے محبت کرتی ہیں“ اکثر ان کو شبہ ہے کہ ہم دونوں ایک دوسرے سے نفرت کرتے ہیں۔ لیکن یقیناً اس نے ہم نے ایک دوسرے کو خط لکھے نہ کہیں ہماری ملاقات ہوئی۔ بس دل ہی دل میں شاید ہم ایک دوسرے کو پسند کرتے اور محبت کرتے ہیں۔ اور اسی محبت کی شہرت ہے۔ وہ اب بھی کہتی ہیں کہ وہ مجھ سے محبت کرتے ہیں۔ کون کہہ سکتا ہے اس محبت کا انجام کیا ہو گا؟ یہ محبت بھی ایک دن مٹ جائے گی۔ ہاں میں محبت کی پائنداری کا قائل نہیں ہوں۔ ایک تلخ تجربہ نے مجھے عورتوں اور محبت کا کچھ بنا دیا ہے۔ یہ عجیب بات ہے کہ محبت میں فریقین ایک دوسرے سے بے وفائی کی امید رکھتے ہیں اور ہر ایک اپنی ہی محبت کو ”جھوٹا“ ثابت کرتے ہوئے دوسرے کی محبت کو غرضی یا مطلبی بتلاتا ہے۔ لیکن میں نے ان سے جو محبت کی تو میرے دل میں کسی مطلب یا غرض کا خائبہ تک نہ تھا۔ میں ان کے حسن یا شباب کا وارفتہ نہ تھا۔ مجھے ان میں ایک خاص کشش محسوس ہوتی تھی۔ ایک ایسی کشش جو صرف دل کی پاکیا اور گرمی کے زیر اثر پیدا ہوتی ہے۔ لیکن وہ ہمیشہ مجھ سے بدظن رہیں۔ آخر اسی بدظنی میں انھوں نے اپنے لئے ایک دوسرے مرد کا انتخاب کر لیا۔ میری خوش قسمتی یا بد قسمتی کہ اس نے

ان کے ساتھ دغا کی اور وہ پھر میری طرف متوجہ ہوئیں۔ میں اب بھی ان کے لئے اپنے دل میں محبت ہی پاتا تھا وہ بدستور بدظن ہیں۔ کہتی ہیں ”تم جھوٹے تنہا رہی محبت جھوٹی“ ان کی بدظنی انہیں نہ جانے اور کتنی غوکریں کھلوائے۔ میں سوچتا ہوں جب ان کی بدظنی دور ہو جائے گی۔ کیا اس وقت بھی میں ان سے محبت کر سکوں گا؟ غایب۔

حسن اور محبت کی یہ پوششیں ہی کیا کم تھیں کہ ایک اور ”محبت نامہ“ وصول ہوا جنہیں میں ایک محترم خاتون سمجھتا تھا انھوں نے لکھ بھیجا تھا کہ ”رات کا کھانا“ ان کے ساتھ کھاؤں۔ وہ رات میرے لئے بڑی صبر آزار رہی۔ بڑا بُر تکلف انتظام کیا گیا تھا۔ باتوں باتوں میں پوچھ دیجھیں ”محبت کیا ہوتی ہے“ اور اس سوال نے ان کی آنکھوں میں وہ خاص چمک پیدا کر دی، جو محبت کی پیاس بھی جاسکتی ہے۔ میں نے انھیں اپنے سے دور رکھنے کے لئے اپنی محبت کی ساری داستانیں بیان کر دیں (ان میں زیادہ تر فرضی اور من گھڑات افسانے تھے) کہنے لگیں ”آپ تو جیسے رستم ہیں۔ ہمیں بھی سکھائیے نا محبت“۔ کون میں؟ بہر اداغ چکرانے لگا۔ وہ اس طرح مُکد ہو گئیں جیسے میں انھیں مایوس کر رہی نہیں سکتا وہ اپنے پلنگ سے انھیں میرے قریب سے گزریں۔ ان کا پلو میرے چہرے پر لہرا گیا اور وہ گنگنا نے لگیں ”نیرے من میں بسوں گی۔ او“ میں وہاں سے بھاگ جانا چاہتا تھا۔ لیکن انھوں نے راستہ روک دیا ”آپ صبح جائیے۔ اتنی اندھیری رات میں آپ کیسے گھر جاسکیں گے“ کس طرح میں نے ان سے چھٹکارا پایا ہے، میرا ہی دل جانتا ہے۔ دوسرے دن میں نے اپنے ایک دوست سے رات کا واقعہ بیان کر دیا۔ اس دوست نے کسی سے کہا اور کسی نے ان سے کہہ دیا۔ بہت چراغ پائوئیں۔ مجھے بہت برا لگلا کہا اور جہاں کہیں میرا ذکر آتا ہے۔ کہتی ہیں ”اس سے تو مجھے نفرت ہے“

محبت اور نفرت کے اس ہجوم میں دل دھروک رہا ہے۔ محبت کی آڑ لے کر بہت سی نادانیاں کر بیٹھے بہت سی کامرانیاں حاصل ہوئیں۔ لیکن اب دل کی تنہائی سے دشت ہوتی ہے عقل کو آگے ہی آگے رکھنا چاہتا ہوں اور دل کی باگ مضبوطی سے تھما ہوا ہوں۔ اب اس کی سرکشی میری جان پر بنادے گی۔ لیکن ان حالات میں سکون اور یکسانیت زندگی کو کچھ اس درجہ بے کیف بنا دیتے ہیں کہ بے اختیار کسی ہلچل سے آشنا ہونے کو جی چاہتا ہے۔ لیکن میں اپنے کچھ عافیت سے باہر نہیں نکلتا۔ بیٹے ہوئے حادثوں کو یاد کرتا ہوں۔ سکون کے سارے بوجھل پردے چاک چاک ہو جاتے ہیں اور دل کی دنیا زبرد زبرد ہو جاتی ہے۔ نامعنی کے لئے میں اپنے حال اور مستقبل سے دامن کش نہیں ہونا چاہتا۔ ٹھوکر دے سے سنبھلتے اور اپنی منزل سے قریب ہو چکنے کے بعد میں لوٹ کر پھر ان پتھروں میں گھرنا نہیں چاہتا۔ رکتناؤں، ٹانگوں اور موڑوں کے شے سرکھے پردوں کی اوٹ میں مجھے کھوئے ہوئے جلوں کی جھلک دیکھائی دیتی ہیں۔ لیکن میرے دل میں کوئی چنگاری نہیں چمکتی۔ کسی سے میری مدبھیر بھی ہو جاتی ہے۔ بے درخیاں، ٹھکانا تیں، عتاب اس کے سوا بھی کچھ ہونا میرے سر آنکھوں پر۔ لیکن اب میں کیا کر سکتا ہوں اور کوئی مجھ سے کیا چاہتا ہے۔ ان آنکھوں میں مجھے وہی پہلے کی سی ہمت افزائیاں تھکتی نظر آتی ہیں۔ ان کے حسن کی تینا جٹیں لٹکار لٹکار پوچھتی ہیں ”ہم نے مایوس کیا تو پھر تمہیں جینے کا حق کیسے ملے گا“ میں محبت کو نشاط زندگی سمجھتا ہوں۔

سواہن روح..... نہیں میں اپنی موت سے ایک بار اپنا دامن چھڑا لیتا ہوں۔ کہیں سے دعوت نامے وصول ہوتے ہیں۔ پھرنے سے ملنے کے جتن کئے جاتے ہیں لیکن میں پوچھتا ہوں۔ اس کے بعد۔ میری عقل کی نارسائیوں پر چل جاتے ہیں۔ دوسرے طریقوں سے سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ میرے ہاتھ کا پاؤں تو اس کو ہمیشہ سے بڑا مزیدار معلوم ہوتا ہے۔ بنا دوں۔ آپ کو یاد ہے وہ رات ٹانگہ سے ہم دونوں گر پڑے تھے۔ آپ اور میں۔ کس بری طرح گرے تھے۔ اچھا ہوا رات تھی۔ اور بھئی شادی کی تو میں تیار نہیں۔ آپ جو چاہیں سمجھیں ”میں پھر بھی کچھ نہیں سمجھتا ما سمجھتا بھی ہوں تو اپنی سمجھداری کو نا سمجھی کے پردہ میں چھپانا چاہتا ہوں۔ آپ تو بالکل بدل گئے۔ وہ جانی لیتی ہیں۔ میرے پاس ان کے لئے ”شب بخیر“ کے سوا اور کیا رہتا ہے۔

بعض اپنی شادیوں میں ملاتی ہیں۔ میں شریک ہوتا ہوں اور مجھے خوشی ہوتی ہے۔ بعض اپنی ”نئی ملاشوں“ سے تعارف کرانے کے لئے بلا بھیجتی ہیں۔ میں جاتا ہوں اور ان دو گرتاروں کی قسمتوں پر روتا ہوں کہ جس جال میں پھنسے ہو اس سے چھوڑ گے بھی تو ہائے ہائے کرنے کے لئے، چند دل والیاں ایسی بھی نکلیں جنہوں نے ”پریم سندلیہ“ جیسا۔ محبت کے کھیل میں متاثر ہونے کے لئے آواز دی۔ اپنی طرف سے ہر طرح اطمینان دلایا۔ لیکن انہوں نے راکھ کی ڈھیر پر ہاتھ مارا تھا۔ گرمی محسوس نہ ہوئی تو انہوں نے اس ڈھیر کو پھونک مار کر اڑا دیا۔ اچھا کیا! میری دعائیں ان کے لئے۔

اب بھاگتا ہوں سایہ عشق بتاں سے میں کچھ دل سے ہوں ڈرا ہوا کچھ آسمان سے میں یہ ”کارنامے“ اس شوہر کے ہیں۔ جو اپنی زندگی میں۔ میرا دوست اور اپنی بیوی کا پاکیزہ شوہر تھا۔ آج میری بیوہ بھائی مرحوم کی مصیبتوں اور وفا شعار یوں کا ذکر کرتے تھکتی نہیں۔ اسی کے سوگ میں اپنی زندگی گزار دینا چاہتی ہیں۔ ایسے فرشتے ہم انسانوں میں کہاں؟

رشید قریشی

من کی دنیا۔ حیدر آباد کے نوجوان افانڈنگار رشید قریشی ایم کے افانوں کا فیس مجموعہ ہے۔ افانوی ادب سے دلچسپی رکھنے والے ضرور اس کا مطالعہ کریں کتاب بہت دلچسپ اور انداز بیان نہایت شگفتہ رہے۔ ہر فائدہ عنائی خیال اور رنگینی بیان کا بہترین نمونہ ہے۔ اردو کے لئے ادب سے دلچسپی رکھنے والے اور ترقی پسند نظریوں کے پرستار ان افانوں کے مطالعہ سے ضرور محظوظ ہوں گے جو اصحاب اردو کے جدید ترین افانوں کا مطالعہ کرنا چاہتے ہیں وہ اس نوجوان مصنف کے ان پرکیت افانوں سے ضرور لطف اندوز ہوں گے۔ (صفحات ۱۶۰۔ قیمت جلد ص) سہل کی کتاب گھر سے طلب فرمائیے

تنقید و تبصرہ

عہد نبوی کے میدان جنگ

۱: ڈاکٹر محمد حمید اللہ استاد قانون جامعہ عثمانیہ
مطبوعہ انتظامی پریس حیدر آباد دکن
۵۶ صفحات کا ایک رسالہ ہے جو دراصل مجموعہ
تحقیقات علمیہ جامعہ عثمانیہ ہیں۔ چھ سات سال قبل
پہ جینیت مضمون کے شائع ہوا تھا۔ بعد کو لائق
مولف نے نظر ثانی اور ترمیم و اصلاح کے ساتھ اسے
کتابی شکل میں شائع کیا ہے۔

یہ کتاب اگرچہ مختصر ہے لیکن مولف نے عہد
نبوی کی جنگوں کے حالات اور ان کے نکل وقوع
نہایت تحقیق اور تہنیش سے تسلیم کئے ہیں اور چونکہ ان
مقامات کا جہاں یہ جنگیں لڑی گئی تھیں موات نے
نہ صحت چشم خود سنا ہے کیا بلکہ ان کے نو بھائی بے اور ہشتے
بھی تیار کئے جو اس کتاب میں شریک ہیں اس لحاظ سے
یہ کتاب بہت گراں قدر اور بہری معلومات کی حامل بن
گئی ہے۔ اپنا نیک خدو ات نبوی سے متعلق زیادہ تر تاریخی اور
روایتی واقعات کتابوں میں درج کئے جاتے تھے لیکن
ڈاکٹر حمید اللہ نے پہلی بار سائنٹفک نقطہ نظر سے ان روایتوں
پر نظر ڈالی ہے جس کے مطالعہ سے نہ صرف عہد نبوی کی جنگوں
کے اسباب ذہن نشین ہو جاتے ہیں بلکہ اس امر کا بھی پتہ
چلتا ہے کہ مسلمانوں نے پیغمبر اسلام کی قیادت میں کس طرح
اپنے دشمنوں کو مغلوب اور مرعوب کیا تھا اور جنگ کرنے
کے کتنے اچھے ڈھنگ انھوں نے رائج کئے تھے۔

یہ کتاب اس قابل ہے کہ نہ صرف تاریخ اسلام
بلکہ عام تاریخ اور سیاسیات کے طلبہ بھی اس سے مستفید
ہو سکتے ہیں۔

از محمد ناصر علی ایم اے
ہندوستان کے معاشی مسائل

مطبوعہ اعظم اسٹیم پریس حیدر آباد دکن
تقریباً چار سو صفحات کی ضخیم کتاب ہے جس میں
مولف کے تیس تیس مضمونیں یک جا کر دی گئی ہیں۔
ان سب مضمونوں کا تعلق ہندوستان اور حیدر آباد کے
معاشی مسائل سے ہے۔ ناصر علی صاحب جامعہ عثمانیہ
کے ایک لائق تعلیم یافتہ ہیں اور اس سے قبل انھوں
نے کئی مضمونیں اور کتابیں لکھیں اور شائع کی ہیں۔
معاشیات پر جتنا تحریری کام اردو میں انھوں نے
گزشتہ چند سالوں کے قلیل عرصے میں کیا ہے اتنا کام
کسی اور شخص نے یا کسی اور زمانے میں اس زبان میں
نہیں کیا گیا۔

وہ اپنے مضمون پر بخوبی حاوی ہیں اور عوام کو
معاشی مسائل سمجھانے کے لئے جس انداز بیان اور نقطہ
نظر کی ضرورت ہے اس سے اچھی طرح واقف ہیں۔
توقع ہے کہ ان کی یہ کتاب بھی پڑھے لکھے لوگوں میں
ہندوستان کے معاشی مسائل سے متعلق ضروری
معلومات میں اضافے کا باعث ہوگی۔

فتم اک - از جہاں بانو بیگم لکچرار اردو کالج اناٹ
جامعہ عثمانیہ

جہاں بانو بیگم حیدر آباد کی ان تعلیم یافتہ خواتین
میں سے ہیں جنھوں نے اپنے ذوق ادب اور لٹریچر و ادبی
کی بنا پر ملک محرومہ کے باوجود بھی شہرت حاصل
کی ہے۔ ان کے ادبی و تنقیدی مضامین کے دو جلد
مجموعے اس سے قبل شائع ہو چکے ہیں۔ یہ کتاب بھی
ان کے مزاج اور سماجی مضمونوں کا ایک دلچسپ
مجموعہ ہے۔ اس میں چھوٹے چھوٹے سائیس مضمون
شریک ہیں۔ جہاں بانو بیگم کا اسلوب بیان بہت
دلچسپ ہے اور ان کی سرعبارات میں ایک خاص شوخی
اور طنز کی جھلک نظر آتی ہیں۔ وہ اپنے مضمون میں
محاسن کو بھی طنزی میں تبدیل کر دیتی ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ

یہ کتاب اگرچہ ایک باضابطہ سفرنامہ افغانستان نہیں ہے لیکن ہندوستان کے ایک مشہور عالم و فاضل کے ایسے احساسات پر مشتمل ہے جو انھوں نے افغانستان کے سفر کے درمیان قلبہند کئے تھے اس لئے اس کی اہمیت ایک معمولی سفرنامے سے بہت زیادہ ہے۔

یونان اور روما کے نوکھے قصے
ناشر- حیدر آباد
بک ڈپلو۔

اس چھوٹی سی کتاب کے مصنف اجمد علی صاحب ہیں۔ جو اس سے قبل معمولی اور تاریخ حسن کاری کے موضوع پر مختلف کتابیں شائع کر چکے ہیں۔ یہ کتاب بھی انھوں نے اپنے ذوق حسن نگاری کی تشریح ہی کی خاطر لکھی ہے۔ اس لئے کہ قدیم حسن نگاروں نے یونان و روما ہی کے دیومالا کے کرداروں کو تصویروں اور مجسموں کے قالب میں ڈھالا ہے جن کے سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ ان قصوں سے واقفیت ہو جن پر قدیم مصوروں اور مریت تراشوں کی تصویریں اور مجسمے مبنی ہیں۔ یوں بھی اردو زبان میں انگریزی اور یورپین زبانوں کے توسط سے یونان اور روما کے مختلف افسانوی کرداروں کے نام اور حوالے نظر سے گزرتے رہتے ہیں لیکن اردو میں کوئی ایسی کتاب اب تک شائع نہیں ہوئی ہے جس میں ان تلیہیات کی تشریح کی گئی ہو اس لئے یونان و روما کے نوکھے قصوں کا یہ مجموعہ دلچسپی سے پڑھا جائے گا اور افسانوی لطف کے علاوہ پڑھنے والے کو یونان اور روما کے دیومالا سے بھی واقف کرائے گا۔

دلکش شخصیت
از بروزجی فیروز شاہ تارا پوری
ناشر- راج پبلشنگ ہاؤس حیدر آباد
یہ کتاب مشہور مفکر و ماہر نفسیات مسٹر الین اوس کی انگریزی کتاب ویننگ (Winning) کی

اردو ادب میں اب تک خواتین کی جو کتابیں یا مضامین ہم دست ہوئے ہیں ان سبھوں میں جہاں باؤ بیگم کی کتابیں اپنے طعن و طنز کی بنا پر ایک خاص حیثیت رکھتی ہیں۔ عہد حاضر کی خواتین میں وہ اپنے اس مخصوص انداز کی وجہ سے بہت ممتاز ہیں اور ان کی یہ تحریریں اردو کے مزاحیہ اور طنزیہ ادب میں اضافے کا باعث ثابت ہو رہی ہیں۔ جو لوگ دنیا کو اس خاص نقطہ نظر سے دیکھ کر خوش ہوتے ہیں ان کے لئے اس مجموعہ مضامین کا مطالعہ بہت ہی دلچسپ ثابت ہوگا۔

سیر افغانستان
از سید سلیمان ندوی مطبوعہ
نفیس الکیڈمی حیدر آباد۔

۱۹۳۳ء میں نادر شاہ دہلی افغانستان نے علامہ اقبال، سر اس مسعود اور سید سلیمان ندوی کو کابل آنے کی دعوت دی تھی تاکہ ان تینوں کے مشورے سے افغانستان میں نظام تعلیم کا ایک اچھا سلسلہ قائم کیا جائے۔ چنانچہ یہ تینوں اصحاب اکتوبر ۱۹۳۳ء میں کابل گئے اور وہاں دو چار روز قیام کیا۔ اس مختصر قیام میں نادر شاہ اور ان کے عاملہ سلطنت اور افغانی ناملوں اور ادبوں سے ان تینوں نے مختلف مسائل پر تبادلہ خیال کیا اور اپنے مشوروں سے مستفید ہونے کا موقع دیا۔

زیر نظر کتاب میں اپنے اپنے ہم سفروں کے تجربات سفر کو مولوی سید سلیمان ندوی نے اپنے سلیبس اور دلچسپ انداز میں قلبہند کیا ہے اور ہر جگہ ان کے قلم سے ایسے درد مندانه اور پر کیفیت جملے نکل پڑتے ہیں جن کے مطالعہ سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ایک حساس اور صاحب ذوق عالم اپنے شاگردوں کو ساتھ لئے ہوئے سفر کر رہا ہے اور انارکسی تحقیق و تاریخ کے ساتھ ساتھ مزید مطالعہ کے لئے دوسرے ماخذوں کی طرف بھی توجہ دلاتا جاتا ہے۔

تالیف کی وجہ سے جامعہ عثمانیہ کے فیض یافتوں میں ایک خاص درجہ رکھتے ہیں۔ انھوں نے اس سے قبل ترقی پسند ادب پر بھی ایک کتاب شائع کی ہے۔ اور ان کی نظموں کا ایک مجموعہ ”ماہ لقا اور دوسری نظیں“ ادارہ ادبیات اردو کی طرف سے شائع ہو چکا ہے۔ زیر نظر ناول حیدر آباد اور ہندوستان کے ان نوجوانوں کی سماجی زندگی اور ذہنی کشمکش کا ایک بہترین آئینہ ہے جو ہندوستان سے باہر خاص کر یورپی ممالک کو انجمن کے لئے جانتے ہیں۔

اس کے کردار اور اس کا خاکہ کم ہر قدم پر نوجوانوں کی گریزی خصوصیات کو واضح کرتا جاتا ہے۔ اس کتاب میں پلاٹ کے علاوہ اس وجہ سے بھی ایک طرح کی دل کشی پیدا ہو گئی ہے کہ اس میں عام ناول نگاروں کی طرح محض سنی سنائی باتوں پر قصے کی تعمیر نہیں کی گئی ہے بلکہ مصنف نے زندگی کے ان تمام شعبوں کا مشرق اور مغرب میں بہتیرا خود معائنہ کیا ہے جن کا ذکر اس ناول میں نہایت ہی خلوص اور بے باکی کے ساتھ کیا گیا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ ناول خود مصنف کا سفر نامہ یورپ ہے۔

یورپی زندگی کی عام عریانی اور اخلاق باختی کو مصنف نے بعض جگہ اتنی بے تکلفی سے بیان کیا ہے کہ عریانی بھٹکنے لگتی ہے۔ کتاب کا اسلوب جدید اور ترقی پسند

ادب کی اکثر کتابوں کی طرح نہایت بے باک ہے لیکن زبان میں شائستگی اور نفاست بھی پائی جاتی ہے۔ توقع سے کہ یہ ناول جدید اردو ادب میں بے باکی اور شائستگی کے امتزاج کا ایک اچھا نمونہ ثابت ہوگا۔

نئی زندگی۔ ڈیٹر سید انیس الرحمن صاحب

قیمت اسپیشل نمبر ایک روپیہ۔ چند سالانہ۔ چھ روپے ملنے کا پتہ دفتر نئی زندگی اہل آباد

پرسنیا لٹی کا اردو ترجمہ ہے۔ منترجم برنوجی فیروز شاہ حیدر آباد کے ایک صاحب ذوق پارسی بزرگ ہیں جن کو اردو ادب اور تصنیف و تالیف کا بھی بڑا اچھا ذوق حاصل ہے۔ جتنا کچھ انھوں نے اب تک اس زبان میں کئی کتابیں تالیف و تصنیف کی ہیں جن میں برنڈ شاہ کے ڈرامے، جوان آف آرک کا ترجمہ مظلوم و غریب بہت مقبول ہو چکا ہے۔

زیر نظر کتاب ایک شہرہ آفاق اور مفید انگریزی کتاب کا ترجمہ ہے اور اس کا مطالعہ ہر ایسے نوجوان کے لئے ضروری ہے جو اپنی زندگی میں کامیابی اور ترقی حاصل کرنا چاہتا ہے۔ یہ کتاب چار ابواب پر مشتمل ہے جن کے عنوان ہیں شخصیت، شعوری شخصیت، نیم شعوری شخصیت، اور علی شخصیت۔ ان چاروں ابواب میں متعدد ذیلی سرخوں کے تحت بے سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ زندگی کو کامیاب اور خوش بنانے کے لئے انسان کو کیا طریقہ اختیار کرنے چاہیے واقعہ یہ ہے کہ یہ ایک بہترین اصلاحی کتاب ہے اور اگر اس کے تمام ہوئے طریقوں پر عمل کیا جائے تو بہت سی باتیں اور ناکام زندگیوں امید اور کاروائی سے مملو ہو جائیں گی۔

انگریزی کتاب کا اسلوب بیان خشک اور ناصحانہ ہے مترجم نے اپنے اردو اسلوب کو شگفتہ اور کاروباری بنانے کی کوشش کی ہے جس کی وجہ سے پڑھنے والے پر کسی قسم کا دائمی بوجھ محسوس نہیں ہوتا۔ توقع ہے کہ طلبہ، عوام اور کاروباری اصحاب اس کتاب کو پڑھ کر اپنی زندگیوں کو سنوارنے اور اپنے کاروبار کو آگے بڑھانے میں کامیاب ہوں گے۔

از عزیز احمد۔ ناشر مکتبہ جدید لاہور
گرہ نمبر یہ ایک ناول ہے جس کے مصنف عزیز احمد سابق کچہرا انگریزی جامعہ عثمانیہ اپنے ذوق تصنیف و

یہ شاید ناقص کتابت کی وجہ سے۔ خصوصاً جھلج کی جگہ بھاوہ ایک جگہ بری طرح ٹھٹھکتا ہے۔ معلوم نہیں یہ تائیت کی تائیت کیسی۔ فارسی ترکیبوں کا بے جا استعمال اگر یہ ترک کر دیں تو زبان بڑی حد تک سدھر جائے۔

افسانہ زرین مترجمہ اسماء صاحبہ۔ قیمت ۱۲۰ روپے
اردو اکیڈمی لاہور۔ حجم ۱۱۲ صفحے طے کا پتہ۔

ایک امریکی مصنف کی کتاب کا ترجمہ یہ افسانہ پیش لفظ فیض نے لکھا ہے اور اس کو شش کو سراہا بھی ہے۔ لیکن درحقیقت ترجمہ اس فن کا نام ہے جو اصل مصنف سے کتاب کو چھین لے۔ آئینہ کو شش شاید کامیاب ہو۔ اس ترجمہ میں تو کوئی دلچسپی نہیں مگر شاید کہانی کی صرف قصہ کی خاطر پڑھنے والے اسے پسند کریں۔

سویت یونین کی نویم از ادھیکاری مترجمہ
قیمت ۱۲۔ حجم ۵۹ صفحے۔ طے کا پتہ قومی دارالاشاعت
یہ کتابچہ اس سلسلہ مضامین کی ایک کڑی ہے جو اشتراکیت کا مطلب و مفہوم عوام کو سمجھانے کے لئے لکھے گئے ہیں۔ ذیلی طور پر موجودہ روسی نظام کو سراہا گیا ہے اور مختلف مثالوں سے یہ بات خاص طور پر واضح کی گئی ہے کہ روس میں مختلف اقوام اپنے اتحاد کی وجہ ایک ہیں۔ اور آپس میں برابر ہیں۔ لیکن ساتھ ساتھ ان کے اپنے قومی حقوق کی بھی حفاظت ہوتی ہے۔ اور انھیں اس کا اختیار حاصل ہے کہ جب چاہیں الگ ہو جائیں۔ شائیت اور اشتراکیت دونوں ادوار میں ان اقوام کی حالت کا موازنہ کیا گیا ہے اور یہ شک موجودہ زمانہ ان کو زندگی کے جائز حقوق عطا کرتا ہے۔ ادنیٰ حیثیت سے اس کتابچہ کا کچھ درجہ نہیں لیکن اپنے مقصد کی تکمیل مددگار ثابت کرتا ہے۔ عوام اور خواص دونوں کے لئے اس کتابچہ کا مطالعہ مفید ہے کیونکہ یہ سیاسی شعور پیدا کرتا ہے۔ ”زس“

رسالہ نئی زندگی اردو زبان کا واحد سیاسی رسالہ ہے۔ عام اور پرسپیکس است عالم اور خاص طور پر جو ہندوستان کی سیاسی زندگی سے واقف ہونا چاہیں، ان کے لئے یہ رسالہ بہت زیادہ کامیاب ہے اور یوں بھی تعلیم یافتہ طبقہ کا سیاسیات سے واقف ہونا ضروری ہے۔ زیر تبصرہ شمارہ سان فرانسکو نمبر ہے۔ چار ابواب کے تحت مختلف عنوانات قائم کر کے مضامین شائع کئے گئے ہیں۔ سب مقالے غور و فکر کا نتیجہ ہیں۔ لکھائی پچھلی عمدہ اور کاغذ بھی اچھا ہے۔

مظالم و شہزادہ مترجمہ برزجی۔ فیروز شاہ تارا اور قیمت تین روپے کلداتین روپے
آٹھ آنے عانی۔ حجم ۳۶۳ صفحے۔ طے کا پتہ۔ نفیس اکیڈمی
عابد روڈ۔ حیدر آباد دکن۔

جون آف آرک کے نام سے کون واقف نہیں۔ انگلستان کے مشہور ڈراما نویس برنارڈ شکس کے ڈرامے جون آف آرک کو ترجمہ نے اردو جامہ پہنایا ہے۔ زبان گوارا ہے اور کو شش کی گئی ہے کہ المیہ ڈراما کی پوری دلچسپی ترجمہ میں بھی باقی رہے۔

دنیا کے شہزاد از محترمہ آئینہ محمودہ رضویہ
(ادیب فاضل) قیمت۔ ۱۰ روپے
حجم ۱۶۶ طے کا پتہ۔ عباسی کتب خانہ۔ جونا مارٹ
بابا بشیر احمد اینڈ سنز۔ جونا مارٹ کراچی

محترمہ رضویہ اردو کی بڑی زود نویس ادیب ہیں۔ یہ ان کی تیسری تصنیف ہے۔ ان کی گزشتہ تصانیف سے یہ کتاب بہتر ہے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ اس میں انھوں نے بجاے حسن و عشق کی المیہ کہانیوں کے عراق کی تاریخ و معاشرت پر قلم اٹھایا ہے۔ اپنا سفر نامہ عراق بھی اس میں شامل کیا ہے جو دلچسپ ہے۔ بعض اوقات زبان کی غلطیاں بہت ناگوار ہوتی ہیں

ادارے کی خبریں

روٹنڈا مجلس اردو امتحانات | مجلس ہذا کا ایک جلسہ تبلیغ ۲۳ فروری ۱۳۵۵ء مطابق ۲۴ فروری ۱۹۳۴ء بروز یکشنبہ شام ۶ بجے پرو فیض عبد المجید صاحب مدنی کے سرکان واقع حمایت نگر میں منعقد ہوا۔ م اتفاق

آرا پرو فیض مدنی صاحب نے طلبے کی صدارت کی۔ حسب ذیل اصحاب نے شرکت فرمائی۔

۱۔ پرو فیض عبد المجید صاحب مدنی۔ ۲۔ ملا فخر الحسن صاحب۔ ۳۔ پرو فیض فضل حق صاحب۔ ۴۔ ڈاکٹر سید محمد الدین صاحب قادی زور۔ ۵۔ خواجہ حمید الدین صاحب شاہ۔ ۶۔ مولوی سید محمد صاحب سندھ۔ ۷۔ ف۔ گزشتہ طلبے کی روزانہ کی خواندگی اور توفیق کے لیے حسب ذیل امور پیش اور طے ہوئے۔

(۱) مولوی سید علی اکرم صاحب صدر مجلس اردو امتحانات کی اس خواہش کی بناء پر کہ موصوف کو ختم ۳۵۰ تک نمک بوجھ مصروفیات سرکاری مجلس ہذا کی صدارت کے فرائض کی انجام دہی سے معاف رکھا جائے۔ طے پایا کہ موصوف کی جگہ ڈاکٹر سید محمد الدین صاحب قادی زور ختم ۳۵۰ تک بحیثیت نگران کار صدر کام انجام دیں۔

(۲) طے پایا کہ سال مال کا جائزہ تقسیم ۱۳۵۵ء اردو ہیشت ۳۵۰ تک کو منعقد کیا جائے اور اس کی صدارت کے لئے حضرت صاحبزادہ نواب بہاؤ دہ سے اور تقسیم اسناد و انعامات کے لئے حضرت صاحبزادہ نقی نقیس بیگ صاحب سے درخواست کی جائے۔

(۳) طے پایا کہ آئندہ سے اردو دوانی کے ساتھ اردو زبان دوانی کا امتحان بھی سال میں دو بار لیا گیا بشمولیکہ ان دونوں امتحانات میں کافی تعداد میں امیدوار شریک ہوں اور امتحانات کے اخراجات کی شعبے کی تنجاش سے آسانی سربراہی ہو سکے۔

(۴) طے پایا کہ سال مال مجلس ہذا کے امتحانات ۱۰-۱۱-۱۲۔ اردو ۱۳۵۵ء کو لئے جائیں۔ اس کے بعد تمام سالانہ امتحانات ڈسٹرکٹ میں منعقد ہوں گے۔

(۵) طے پایا کہ اردو زبان دوانی کے امتحان میں بجائے محمد اسماعیل کی قواعد اردو کے بشیر انسابیگم صاحب کی کتاب پہلی قواعد اردو شریک نصاب کیجائے۔

(۶) طے پایا کہ معاوضہ متغیین کے لئے ڈاکٹر محمد حسن صاحب علی سید محمد علی اور مولوی خواجہ حمید الدین صاحب کی ایک کمیٹی بنائی جائے جو تمام امور پر غور کر کے آئندہ مجلس میں اس مخصوص میں رپورٹ پیش کرے۔

(۷) طے پایا کہ مولوی خواجہ حمید الدین صاحب کو جو بحیثیت ہبتم دار مجلس کے اہلکاروں میں شریک ہوتے تھے مجلس ہذا کا رکن منتخب کیا جائے۔

۱۹۳۵ء | اردو امتحانات بابہ ۱۹۳۵ء کا جائزہ تقسیم اسناد و بعددات مال پنجاب حضرت صاحبزادہ نواب بہاؤ دہ سالہ جام سادہ تبلیغ ہر اردو ہیشت ۳۵۰ ختم ۳۵۰ مارچ ۱۳۵۵ء شام ۶ بجے کو ان پڑھوں کو یوں ہی منتقل نظام کالج میں منعقد۔

ہوا۔ آنریبل نواب ڈاکٹر محمد علی باریک بہاؤ نائب صدر عظمیٰ دولت آصفیہ و صدر ادارہ اوبیات اردو نے خطبہ استقبالیہ پڑھا۔ نواب صاحب معز کی اسد عا پر حضرت صاحبزادہ نقی نقیس انسابیگم صاحب نے اپنے دست مبارک سے

کامیاب امیدواروں کو اسناد اور تحفہ تقسیم فرمائے۔ اس کے بعد حضرت صاحبزادہ نواب بہات جاہ بہادر نے اپنا پرغور خطبہ پڑھا اور ارشاد فرمایا۔ اسناد لینے والوں میں افواج آصفیہ کے امیدوارزادہ قندل میں شریک تھے۔ انصلاخ کے مرکزوں میں سے ٹانگی جاگیر بشیر آباد اور پٹی کے نمائندے شریک جلسہ تھے۔ تقریباً دو گھنٹے کی کارروائی کے بعد جلسہ بحسن و خوبی اتمام کو پہنچا۔ علم دوست اصحاب کے علاوہ حسب ذیل جہان قندل ذکر ہیں۔

آنریبل نواب لیاقت جنگ بہادر صدر المہم فوج و صنعت و حرقت مولوی سجاد مرزا صاحب منیر نائب ناظم تعلیمات ڈاکٹر راحت اللہ خاں صاحب بہتر کتب خانہ صفی دوی میرٹھ عالم صاحب دو گارتعلیمات ملا فخر الحسن صاحب لکھنؤ عثمانیہ نزل کلاں پروفیسر عبدالحمید صاحب صدیقی مولوی فیاض علی صاحب ایڈوکیٹ مولوی ضامن علی صاحب غازی کٹر اکڑ پروفیسر سید محمد صاحب مسٹر چند راج سنگھ سید ریڈر جامعہ عثمانیہ مسٹر ونکٹ رائے مفسرٹ ایس شکران آدمی ایکوئیشنل افسر اس جلسہ کو کامیاب بنانے میں مولوی ضامن علی صاحب غازی نے کارکنان ادارہ کا بہت ہاتھ بٹایا۔ نیز فیچر صاحب کوپریٹیو یونین ہل نے جلسہ منعقد کرنے کی اجازت دیکر شکریہ کا موقع عطا فرمایا۔

آئندہ اردو امتحانات کی تاریخیں

ادارہ ادبیات اردو کے اردو امتحانات سال حال ۱۴۰۱ھ وادو ۱۳۵۵ھ مطابق ۱۵ اتر ۱۵ جون ۱۹۳۶ء کو منعقد ہوں گے۔

شرکت کی فیس دفتر ادارہ خیرت آباد پر ۱۲ روپے مطابق ۱۱ روپے ۱۹۳۶ء تک پہنچ جانی چاہیے نصیب میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی ہے جو اصحاب یا ادارے کی شاخیں اپنے اپنے مستقر پر اردو امتحانات کے مرکز قائم کرنا چاہتے ہوں۔ قبل از قبل ادارے سے مراسلت کریں تاکہ ممکنہ سہولتیں بہم پہنچائی جائیں۔

ہر وہ مقام مرکز قرار پاسکتا ہے جہاں سے کم از کم پچاس امیدوار شریک ہوں۔

خطبہ استقبالہ

جلتہ تعمیر اسناد و امتحانات ادارہ ادبیات اردو بابتہ ۱۹۳۵ء
آنریبل ڈاکٹر نواب سر محمد یاجنگ بہادر ایم۔ اے ڈی لٹ صدارت ادارہ ادبیات اردو نواب عبدالعظیم

حضرت صاحبزادہ نوابیال جاہ بہادری صاحبزادہ نعیمی السناریج صاحبہ بھی خواتین کی برتری ترقی اور خدمت ان کی معاشرتی اور تعلیمی صلاح و فلاح سے جو خاص دلچسپی رکھتی ہیں اس سے آپ سب حضرات بخوبی واقف ہیں میں نہایت ادب کے ساتھ حضرت صاحبزادہ صاحبہ اور حضرت صاحبزادہ صاحبہ کی خدمت میں عرض کرتا ہوں کہ ان کا رکنان ادارہ کی جانب سے نذرانہ تشکر پیش کرتا ہوں۔

حضرت صاحبزادہ نوابیال جاہ بہادری صاحبزادہ نعیمی السناریج صاحبہ بھی خواتین کی برتری ترقی اور خدمت ان کی معاشرتی اور تعلیمی صلاح و فلاح سے جو خاص دلچسپی رکھتی ہیں اس سے آپ سب حضرات بخوبی واقف ہیں میں نہایت ادب کے ساتھ حضرت صاحبزادہ صاحبہ اور حضرت صاحبزادہ صاحبہ کی خدمت میں عرض کرتا ہوں کہ ان کا رکنان ادارہ کی جانب سے نذرانہ تشکر پیش کرتا ہوں۔

حضرت صاحبزادہ نوابیال جاہ بہادری صاحبزادہ نعیمی السناریج صاحبہ بھی خواتین کی برتری ترقی اور خدمت ان کی معاشرتی اور تعلیمی صلاح و فلاح سے جو خاص دلچسپی رکھتی ہیں اس سے آپ سب حضرات بخوبی واقف ہیں میں نہایت ادب کے ساتھ حضرت صاحبزادہ صاحبہ اور حضرت صاحبزادہ صاحبہ کی خدمت میں عرض کرتا ہوں کہ ان کا رکنان ادارہ کی جانب سے نذرانہ تشکر پیش کرتا ہوں۔

حضرت صاحبزادہ نوابیال جاہ بہادری صاحبزادہ نعیمی السناریج صاحبہ بھی خواتین کی برتری ترقی اور خدمت ان کی معاشرتی اور تعلیمی صلاح و فلاح سے جو خاص دلچسپی رکھتی ہیں اس سے آپ سب حضرات بخوبی واقف ہیں میں نہایت ادب کے ساتھ حضرت صاحبزادہ صاحبہ اور حضرت صاحبزادہ صاحبہ کی خدمت میں عرض کرتا ہوں کہ ان کا رکنان ادارہ کی جانب سے نذرانہ تشکر پیش کرتا ہوں۔

حضرت صاحبزادہ نوابیال جاہ بہادری صاحبزادہ نعیمی السناریج صاحبہ بھی خواتین کی برتری ترقی اور خدمت ان کی معاشرتی اور تعلیمی صلاح و فلاح سے جو خاص دلچسپی رکھتی ہیں اس سے آپ سب حضرات بخوبی واقف ہیں میں نہایت ادب کے ساتھ حضرت صاحبزادہ صاحبہ اور حضرت صاحبزادہ صاحبہ کی خدمت میں عرض کرتا ہوں کہ ان کا رکنان ادارہ کی جانب سے نذرانہ تشکر پیش کرتا ہوں۔

دائرہ اثر روز بروز بڑھتا جا رہا ہے۔ صرف بلکہ اور متحد و امتزاج و دہیات میں بلکہ مالک محروسہ کے باہر بھی اس کے اردو امتحانات کو مقبولیت حاصل ہوتی جا رہی ہے سالہائے سابق کی طرح سال گزشتہ بھی اردو دانوں کا امتحان دو بار لیا گیا جن کے نتائج امید افزا رہے۔ اس امتحان میں ایک ہزار پچاس نوے (۱۰۹۵) باغلوں نے شرکت کی اور پچھ لاکھ (۹۹۸) کامیاب ہوئے۔ جن میں (۱۲۲) نے امتیاز حاصل کیا۔

دوسرے امتحانوں کے شرکا، اور کامیاب امیدواروں کی تفصیل یہ ہے۔

اردو دانوں	شریک	۳۹	غیر حاضر	۱۳۲	کامیاب	۲۶۰	فی صد	۷۸
اردو عالم	۱۵۶	۳۷	۵۱	-	-	-	-	۴۳
اردو فاضل	۳۵	۸	۳۳	-	-	-	-	۸۹
خوش نویسی	۳	-	-	-	-	-	-	۲۰

جیسا کہ اوپر لکھا گیا ہے ادارے کے امتحانات نہ صرف بلکہ جدید باوہی میں مقبول ہیں بلکہ اضلاع اور دہیات میں بھی یہاں زیادہ مقبولیت حاصل کر چکے ہیں۔ چنانچہ سال گزشتہ بلکہ گزشتہ تین مرکزوں یعنی مرکز دکن، مرکز ناٹ اور مرکز فوج کے علاوہ اضلاع میں سب ذیل مقامات کے مرکز تھے۔

انڈولہ اند، بشیر آباد، بولی، بانسواڑ، پرانی، ہاکلی، کونڈگل، بنگتال، گدوال، ناگر نول، نظام آباد، مٹھلے گاؤں، دوم کٹہ، موسن آباد۔
بیات جیوا، بادکھن کے مرکز کے علاوہ موسن، بھٹی اور بیات سیور میں ادارے کی یہ محقق کی نگاہوں سے کبھی بھی امدان دونوں جگہ بھی گزشتہ سال مرکز قائم ہوئے۔ مرکز بھٹی سے ایک سو اڑتیس امیدواروں نے شرکت کی اور امتحان اہل دو عالم میں ایک خاتون فیزیو تھے جو بادل میں کامیابی حاصل کی اور سب سے زیادہ نشانہات حاصل کرنے کے صلہ میں نئے کی حق قرار پائی۔
اردو امتحانات کمان عدو شولہ کے سلسلہ میں آپ کی اطلاع کے لئے اس امر کی وضاحت ضروری سمجھنا ہوں کہ یہ امتحانات ایک خاص قسم کے متعقد کئے جاتے ہیں جو ملک کے اہل تعلیم اور اساتذہ اور برہمن ہیں۔ انہی کی ہدایت اور شہدے کے مطابق ادارہ اویات اور فیزیو انڈولہ اند ہر کی پیش رفت کے لئے مفید کتابیں لکھی تھیں۔ اشاعت کا کام بھی انجام دے رہا ہے۔ چنانچہ جو لوگ اردو دانوں کا امتحان میں کامیاب ہو جائے ہیں ان کے مشورے مطالعہ کو برقرار رکھنے کے لئے ورنہ کتابیں لکھی اور ان کی جانب سے انھوں نے اور مطالعہ کی گئی ہیں اور تدریسی طریقہ امتحان بھی محفوظ رکھا گیا ہے۔
اضلاع میں تعلیم باغلوں کی ترویج کے لئے ادارے کی طرف سے وفد کی صورت میں جب ضرورت دور سے بھی کئے جاتے ہیں اور مختلف مقامات پر تعلیم باغلوں کے مدارس شعبہ کے قیام کی اسکیم بھی مرتب ہو چکی ہے اور جیسے ہی رقمی سہولتیں فراہم ہوں یہ تجاویز بھی رو بہ عمل لائی جائیں گی۔

یہ امر باعث مسرت ہے کہ ادارے کے ان اردو امتحانات میں ہر قوم و مذہب کے لوگ شریک ہوتے ہیں اور انہیں یہاں طہر رنگ و بیرون ملک میں تمام اقوام وطن میں مقبولیت حاصل ہوتی جا رہی ہے۔ ان امتحانات کی فہمیں بہت قابل رکھی گئی ہے یہ اتنی قابل بیعت ایک روپیہ، دو روپے اور پانچ روپے ہے کہ اس سے ان امتحانات کے پورے پورے اخراجات نہیں نکل سکتے اور متعین جن میں تقریباً نصف بیرون ریاست کے ماہرین علم و ادب شامل ہیں۔ ہتے میں نہایت ہی ایشیا کویتہ پرچہ بات سوالات کی ترتیب اور جانچ کی زحمت برداشت کرتے ہیں۔

اردو امتحانات میں اول، آئے والے امیدواروں کے لئے ہر سال مختلف علم دوست صحاب اور خود ادارے کی طرف سے نئے نئے عطا کئے جاتے ہیں گزشتہ سال اردو فاضل میں کوئی امیدوار درجہ اول میں کامیاب نہیں ہوا۔

اس لئے حقیقی جنگ مرحوم کا عطا کردہ طلافی تختہ نہیں دیا جا رہا ہے۔ نواب صاحب مرحوم اردو امتحانات کے فاضل قدر دان تھے اور انھوں نے پانچ سال قبل اپنے رفیق حلیے کے ذریعہ سے ایسا انتظام فرمایا تھا کہ ہر سال اردو فاضل میں اول آنے والے کو یہ تختہ ملتا رہے گا۔

میں ان تمام شخصوں کا کرکٹان بلکہ واسطوں اور خاص کر عارف الدین حسن صاحب، کمانڈر احمد العیدروس بہادر، کرنل نذیر الاسلام خاں، مخدوم غوث صاحب (دوم کتھ)، شیخ فضل صاحب و حلی (ملکی)، مولوی عبدالرزاق قریشی اور مولوی اسماعیل منصور صاحب (بمبئی) اور پروفیسر سروری صاحب (میوڑ) کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ محض اردو دوستی کے لئے ادارے کے امتحانات کو کامیاب بنانے میں ہر طرح کی امداد فرماتے رہے۔

آپ صاحبوں اور خصوصاً حضرت نواب بہالت جاہ بہادر اور حضرت صاحبزادی صاحبہ کا مکرر شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپ نے اپنی شرکت سے اس حلیے کو زینت بخشی۔

ادار کی نئی کتابیں

(۱) ہندوستانی قومیت کا تمدنی پہلو ڈاکٹر ایٹور ٹوٹا صاحب پروفیسر جامعہ عثمانیہ۔ ڈاکٹر ایٹور ٹوٹا صاحب کی ایک کتاب "ہندوستانی تمدن" ادارے کی طرف سے شائع کی گئی تھی۔ اسے موضوع پر یہ پہلی کتاب تھی جو علمی حلقوں میں بیدار ہند کی تھی۔ ادارے کی خواہش پر ڈاکٹر صاحب نے ایک دوسری کتاب "ہندوستانی قومیت کا تمدنی پہلو" لکھ کر ایک اہم موضوع پر روشنی ڈالی ہے۔ ہندوستانی قومیت کا مسئلہ نہایت نازک اور پیچیدہ ہے۔ موجودہ دور میں تو اس کی اہمیت اور زیادہ بڑھ گئی ہے۔ اس لئے اس بات کی بید ضرورت تھی کہ ہم اپنا سلج کو ایک نئے زاویہ نگاہ سے دیکھیں تاکہ ہندوستانی قومیت کے مسئلے کی گتیاں جملہ کیں۔ ڈاکٹر ٹوٹا صاحب نے اپنے عالمانہ اور اہم انداز میں اس مسئلہ کو واضح کیا ہے۔ اس کتاب کا مطالعہ سیاست اور تمدن کی بحثوں کا مطالعہ کرنے والوں کے لئے بید مفید ثابت ہوگا۔ صفحات (۵۲) قیمت ۴۰/-

(۲) عروض از مولوی سید کلیم اللہ حسینی صاحب مولوی فاضل نشی فاضل اردو و فاضل اردو امتحانات کے نصاب کے لئے مولوی کلیم اللہ حسینی صاحب نے ادارے کی خواہش پر ایک کتاب "عروض" مرتب کی تھی جو اتنی مقبول ہوئی کہ اب تک اس کے ڈواڈھیں چھپ چکے ہیں۔ عروض اس سلسلے کی دوسری کڑی ہے جس کے مطالعہ سے متدی اس فن پر بخوبی حاوی ہو سکتے ہیں۔ اس رسالہ کی ترتیب میں عربی فارسی اور اردو کی سہ ماہی کتابوں سے مدد لی گئی ہے۔

(صفحات (۵۶) قیمت ۱۰/-)

خطبہ صدکار

حضرت صاحبزادہ نواب بسانت جاہ دہلادام اقبالہ

جلسہ خاصہ

ہمارے متعلق جن خیالات کا اظہار کیا گیا ہے۔ ان سے ہم دونوں بہت متاثر ہوئے اور قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور اوروں کو اس کا نصیب اعلیٰ قابل عقیدہ ہے اور اس کے پرچوش کارکن جو علم و فن کی بے لوث خدمت میں حصہ لے رہے ہیں۔ مبارکباد کے مستحق ہیں۔

مجھے یہ معلوم ہو کر بہت مسرت ہوئی کہ ادارہ اپنی عمر کے سولہ مسنزل اور دو زبان وادب کی خدمت میں نہایت کامیابی سے طے کر چکا ہے اور اپنے دیگر مقاصد کے ساتھ تعلیم بالغان کے سلسلہ میں نمایاں خدمت انجام دے رہا ہے۔ ہمارے ملک کی پست تعلیمی حالت کے مد نظر یہ کام نہایت اہم اور مفید ہے اور دوسرے تعلیمی اداروں کے لئے قابل تقلید ہے۔ امر باعث مسرت ہے کہ ادارہ کا لاٹیکل نہایت وسیع نظر سے مرتب کیا گیا ہے اور ادارے کے امتحانات کو اندرون ملک بڑی مقبولیت حاصل ہوتی جا رہی ہے۔ ہر قوم و ملت کے مرد و خواتین شریک امتحانات ہوتے ہیں۔ نتائج نہایت امید افزا ثابت ہو رہے ہیں نیز سال گزشتہ مرکز بلجی اردو عالم کے امتحان میں ایک خاتون نے شاندار کامیابی حاصل کی اور ترقی کی مستحق قرار پائیں۔ گزشتہ ماہ میں تعلیم اور اساتذہ اردو کی مشترکہ مجلس کے زیر اہتمام ادارہ کے امتحانات کا انعقاد نہ صرف ایک صحیح طریق کا ہے بلکہ ادارہ کی افادیت۔ بہبودی اور دائرہ اثر کی روز افزائی کا ضامن ہے اور مجھے امید ہے کہ جو کتابیں تعلیم بالغان کی جہم کی پیش رفت کے لئے ادارہ کی جانب سے لکھی گئی ہیں وہ طالب علموں میں ذوق مطالعہ کے علاوہ فرض شناسی، وقت کی پابندی، محنت ضابطہ، تنظیم، استقلال، راست بازی، روشن خیالی، کشادہ دلی، بہداری اور سب سے زیادہ ملک و ملک کی محبت کو ترقی دینے کی۔

تعلیم بالغان کے ضمن میں شہیدہ رسول کا قیام خاص اہمیت کا حامل ہے۔ اصلاح کیساتھ ساتھ بلور و بیرونی مریکھا منانات میں جلیقہ دارس قائم کئے جائیں اور ان کی تعداد میں مزید اضافہ کرنے کی پیہم کوشش جاری رکھی جائے۔ مجھے امید ہے کہ وقتی مشکلات سدراہ نہ ہو سکیں گی اور ملک کے باثروت و علم دوست اصحاب مالی اعانت و دستگیری میں مدد فرمائی کریں گے۔ جہالت اور ناخواندگی کو دور کرنے کی مساعی بار آور ہوں گی۔

ادارہ جس نے امتحانات کے لئے سہولتیں بہم پہنچائی ہیں اور محقق جنہوں نے ایشیا کی اعلیٰ مثال پیش کی ہے ملک کے شکریہ کے مستحق ہیں۔

مجھے فوری توقع ہے کہ یہ ادارہ اپنے بانی ڈاکٹر سید محمد الدین قادری زور کی ان تحکیم کوششوں کی وجہ سے شاہراہ ترقی پر گامزن رہے گا اور ملک کی تعلیمی اور تمدنی ارتقا میں قابل قدر حصہ لے گا۔

یہ شاہد و بجاہ اعلیٰ حضرت بندگان عالی مقامی مظلما اعلیٰ کی دوراندیشانہ قیادت کے فیوض و برکات میں کمزورین کو علم و ادب کا گہوارہ بن گئی ہے اور یہاں نشاۃ ثانیہ کی نسیانی اور شان و کھجے میں آ رہی ہے۔ ملک کے نوجوان ملک کی عام اور ذہنی سطح بلند کرنے میں کوشاں ہیں اور علم و فن کی خدمت کے لئے کمر بستہ اور انسانوں کے قلوب ایسی پگھلاؤت کا مسکن ہیں کہ جس کے بغیر تعلیم و ترقی ناممکن ہے۔

میں دستا دعا ہوں کہ خدا عز و جل شاہ جم جاہ کا سایہ ہماروں پر سلامت رکھے اور ذات شاہد کی رہبری میں ملک ترقی کے مزید منازل طے کرے۔

روڈا مجلس انتظامی | ادارہ ادبیات اردو کی مجلس انتظامی کا اجلاس بتلیج ۱۲ خور واد ۱۳۵۵ھ میں ۲۰ اپریل ۱۹۳۵ء شام کے پانچ بجے عالیجناب آنریبل نواب لیاقت جنگ بہادر کے دولت کردہ - کوہان - پر منعقد ہوا جس سے قبل آنریبل موصوف نے ارکان مجلس کو اپنی جانب سے ایک عرصہ رات پر مدعو فرمایا تھا۔ جسٹیل اصحاب نے شرکت فرمائی۔

عالیجناب آنریبل نواب لیاقت جنگ بہادر صدر المہم افوج و صنعت و حرفت
 " معین نواز جنگ بہادر صدر المہم اصلاحات
 " مولوی سید علی اکبر صاحب ناظم تعلیمات
 " عبد المجید صاحب صدیقی صاحب

ڈاکٹر سید نجی الدین صاحب قاضی زور - مستعمر اعزازی ادارہ
 آنریبل نواب زین یار جنگ بہادر نے بذریعہ تحریر اور آنریبل مولوی سید محمد اعظم صاحب نے بالمشافہ منعقد ہوا
 صاحب کو اطلاع دی کہ وہ دوسری مصروفیات کے باعث شریک اجلاس نہ ہو سکیں گے۔
 گزشتہ اجلاس کی روڈا سٹافی فکٹی اور جناب صدر نے اس کی توثیق فرمائی۔
 حسب ذیل امور پیش ہوئے اور طے پائے۔

(۱) عالیجناب نواب معین نواز جنگ بہادر کی صدر المہم اصلاحات پر ترقی کے سلسلہ میں حسب ذیل قراردادیں
 باتفاق آراء منظور کی گئی۔

" ادارہ ادبیات اردو کی مجلس انتظامی اپنے ہر دعوے پر رکن عالیجناب آنریبل نواب معین نواز جنگ بہادر
 کی خدمت میں ولی مبارک باد پیش کرتی ہے کہ جناب کی اعلیٰ خدمات کی قدر کرتے ہوئے حضرت اقدس اعلیٰ
 نے بطور شہانہ معزز کوئل باب حکومت کی کنیت پر آپ کا تقرر فرما کر عزت بخشی جس کی وجہ سے
 نہ صرف ادارہ ہذا کے اعزاز میں اضافہ ہوا بلکہ اس کی علمی و ادبی خدمت گزاری کے منصوبے اور
 زیادہ مستحکم ہو گئے۔

مجلس ہذا کو یقین ہے کہ عالیجناب اپنے اعلیٰ کردار اور ملک و مالک کی خدمات کی بنا پر اس سے
 زیادہ اعزاز و مناصب حاصل فرمائیں گے اور مجلس انتظامی کو اسی طرح کئی بار مبارک باد پیش کرنے
 کا موقع ملے گا۔

(۲) مولوی نصیر الدین ہاشمی صاحب کے کتب خانے کی خریدی کے بارے میں مستعمر صاحب نے اطلاع دی کہ ہاشمی
 صاحب سے ان کے کتب خانے کے معائنے کے بارے میں وقت کا تعین نہ ہو سکا اس لئے یہ کارروائی
 آئندہ اجلاس کے لئے ملتوی کی گئی۔

(۳) عمارت ادارہ ہذا کے سلسلے میں مستعمر نے گزشتہ اجلاس سے اب تک جو کارروائی اور مصلحت عمل میں
 آئی اس سے ارکان مجلس کو مطلع کیا۔ اور طے پایا کہ نواب زین یار جنگ بہادر سے مل کر طیف خانہ صفیہ الہ
 مکان کے بارے میں قطعی طور پر طے کر لیا جائے اسی سلسلہ میں یہ بھی طے پایا کہ اگر اس مقام کے ملنے میں
 دشواری ہو تو آرائش بلکہ کے مخاوی جو زمین خالی ہے اس کے لئے یا آرائش بلکہ کے دفتر کے مقابل

اداره ادبیات اردو کی کتابیں

ردیف	فصل	نام کتاب	ردیف	فصل	نام کتاب
۱۲۸	۲	سرگزشت حاتم	۲	۸	سرگزشت غالب
۹۴	۸	نظام الملک	۹	۸	قاریخ گولکندہ
۳۰	۳	ریڈیو نمبر (۸ تصاویر)	۳۳۰	۱	ارمغان جنپ
۱۶۰	۱	سوتیلی ماں	۱۶۰	۲	سر سید احمد خان
۱۲۰	۲	سر سالار جنگ	۳۸	۲	مغربی تصانیف کے اردو تراجم
۱۶	۲	محبوب کی چھاؤں	۱۶	۱	اقبال نمبر
۴۸	۱	سائنس کے کوشے	۴۸	۱	شعراے عثمانیہ
۱۳۲	۱	مکتوبات شاد عظیم آبادی	۳۳۰	۲	دادا بھائی
۲۶۸	۱	اردو نامہ	۱۶	۲	اردو نامہ
۱۱۲	۱	حیدر آباد	۲۰۰	۲	نذر دکن
۲۳۰	۲	عماد الملک	۸۵	۲	روح غالب
۳۰۰	۲	اردو دان کی پہلی کتاب	۴۰	۲	عامہ
۱۶	۲	دوسری کتاب	۵۶	۲	د ترقی معلومات
۲۰۰	۲	محمد حسین آزاد	۵۶	۲	آپوز کھیاں اور سرنگ
۱۳۰	۲	کاغذ کی ناؤ	۲۰۰	۲	اردو معلوی کا ارتقاء
۹۲	۲	فن تقریر	۱۳۴	۲	نمود زندگی
۱۴۳	۲	عقد سر باغ دکن	۳۰۰	۲	سرگزشت ادارہ
۱۴۰	۳	ہندوستانی تمدن	۳۱۲	۳	میر محمد مومن (۲۴ تصاویر)
۸۰	۳	پودوں کی کہانی	۳۲	۳	بلاقان
۱۰۰	۳	مس لقا	۱۱۳	۳	خطا پیات
۴۸	۳	پانی کی کہانی	۱۵۰	۳	علم خانہ داری
۳۹۰	۳	رسائل طیبہ	۱۱۸	۳	چوٹی (۱۶ تصاویر)
۴۰	۳	سلک گوہرین	۱۶۸	۳	انوار
۱۷۲	۳	تاریخ ادب اردو	۸۰	۳	نہمش نانی (۴ تصاویر)
۵۶	۳	اشوک اعظم	۱۲۸	۳	کارخانہ دقاسی
۸۴	۳	باتیں	۱۶۸	۳	رات کا بھولا
۲۱۸	۳	یورپ جنگ سے پہلے	۲۴	۳	سکندر جاہ
۱۷۹	۳	شہد انبیا	۵۲	۳	بلاغت
۱۰۲	۳	اریائی زبانیں	۲۰۰	۳	ادارہ سنہ ۱۹۳۱ع میں
۳۰	۳	ظام علی خان	۲۴	۳	ناصر الدولہ
۳۹۶	۳	دذکرہ اردو مضبوطیات جلد اول	۳۲	۳	افضل الدولہ
۵۶	۳	عرب اور عربستان	۳۲	۳	نواب میر محبوب علی خان

سبیل



ادارہ ادبیات اردو حیدرآباد دکن کا ماہ نامہ

زیر نگرانی
ڈاکٹر سید محمد الدین علی گڑھ
مجلس ادارت
خواجہ حمید الدین ایما
سکینہ بیگم

سبک

نشان پتہ آصفیہ ۱۵۳
نشان پتہ برطانویہ ۲۵۰
شلیفین نمبر ۲۰۹
چند سالہ ادارہ ہے
پچوں کا سب سے کیا چاہئے
فی پرچہ

شمارہ ۶

بابت ماہ جون ۱۹۴۶ء

جلد ۹

۲	حسرت کی شاعری	۱
۳	غزل	۲
۵	اولیٰ	۳
۶	مادری	۴
۷	بشیرات کی شاعری	۵
۸	غزل	۶
۹	آپ نے کہا میں نے پڑھا	۷
۱۰	غزل	۸
۱۱	حشر و بات	۹
۱۲	کس کا خون	۱۰
۱۳	زندگی	۱۱
۱۴	چمک ناز	۱۲
۱۵	غزل	۱۳
۱۶	بی بی کا حضرت نور جواں صاحبہ کا گہ	۱۴
۱۷	حبیب	۱۵
۱۸	پیشانی	۱۶
۱۹	قربان بھی ہے غم بھی ہے افسانہ بھی (غاکہ)	۱۷
۲۰	نذر فانی	۱۸
۲۱	کلر	۱۹
۲۲	تختہ بھرو	۲۰
۲۳	سلمان آریب	۲۱
۲۴	بشیرات کی شاعری	۲۲
۲۵	غزل	۲۳
۲۶	غزل	۲۴
۲۷	غزل	۲۵
۲۸	غزل	۲۶
۲۹	غزل	۲۷
۳۰	غزل	۲۸
۳۱	غزل	۲۹
۳۲	غزل	۳۰
۳۳	غزل	۳۱
۳۴	غزل	۳۲
۳۵	غزل	۳۳
۳۶	غزل	۳۴
۳۷	غزل	۳۵
۳۸	غزل	۳۶
۳۹	غزل	۳۷
۴۰	غزل	۳۸
۴۱	غزل	۳۹
۴۲	غزل	۴۰
۴۳	غزل	۴۱
۴۴	غزل	۴۲
۴۵	غزل	۴۳
۴۶	غزل	۴۴
۴۷	غزل	۴۵
۴۸	غزل	۴۶
۴۹	غزل	۴۷
۵۰	غزل	۴۸

خواجہ حمید الدین ایما کے ایہ ہتھام سے محسوس میٹھن پر بس میں چمک کر فرشتہ انحریت آباد سے شائع ہوا

حسرت کی شاعری

حسرت ایک غزل گو شاعر ہیں اور غزل گو دھماکے
میں محبت پسند خیال کیا جاتا ہے لیکن اگر غصہ سے دیکھا جائے
تو حسرت باوجود غزل گو ہونے کے محبت پسند نہیں ہیں۔ انھوں
نے دھماکے کا اندازہ دیا ہے کہ ہونے اردو غزل میں ایک
نئی اور عجیب سی۔ ان کا سب سے بڑا کام یہ ہے کہ جس
وقت اردو غزل بے بسد ہو جاتی تھی اداسی سے عام غزل
کا اظہار کیا جا رہا تھا حسرت نے اسی میں ایک نیا رنگ بغزل شاعری
کیا اور اسے مقبول بنایا۔ حسرت اردو غزل میں ایک صاحب طرز
کی حیثیت رکھتے ہیں، انھوں نے تمام ممتاز اساتذہ سے استفادہ
کیا ہے مگر جس چیز نے حسرت کو صاحب طرز کی حیثیت دہی ہے
وہ ان کے دھماکے کے پیچھے نہیں جو حسرت کے بیان نظر
آتے ہیں۔ بہتر ہوگا کہ ہم ان کے نئے دھماکے کا اندازہ
لگا لیں جن کے پچھلے میں نے حسرت کی غزلوں میں ایک نئی
"ناؤ" اور دل کشی پیدا کی ہے۔

اردو ادب میں اس وقت جو رجحان سب سے زیادہ نمایاں
اور ترقی پذیر ہے وہ حقیقت نگاری کا رجحان ہے۔ فنون لطیفہ
میں عموماً ادب میں خصوصاً حقیقت نگاری دور حاضر کی
مسئلہ حقیقت ہے۔ حسرت نے جب اردو غزل کا رنگ لپکا
تو اس وقت "آج" "آج" اور "جہاں" کے لکھے کاؤں میں گونج
رہے تھے۔ ان ہی کے رنگ کا چرچا اور اسی رنگ میں غزل لکھنے
کو لوگ شاعری سمجھتے تھے۔

ان اساتذہ میں میر نے تو پھر بھی نقاب کا دامن آٹ
سے نہیں جانے دیا مگر دواغ کی پرستی، معاملہ بندی اور ایک قسم
کی جنسی سلطنت کے ہاتھوں اردو غزل کوئی اپنی تانستہ طرفہ یاد
بند اپنی اداس شاعری، ذائقہ کو بڑی تھی۔ اس دور کی غزلوں
میں جو حقیقت نگاری تھی وہ محدود بہت اداس قسم
کی ہے۔ اس میں وہ حقیقت نگاری نظر نہیں آتی جو پندار اور

غیر فانی ادب کا ایک لازمی عنصر ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اردو
غزل پر سنجیدہ اور شائستہ ذوق ادب رکھنے والے اعلیٰ
اٹھائے تھے۔

دعایہ امیر زادہ جلال اور بالخصوص انانت، راز و مہیا اور
آبید وغیرہ کے رنگ شاعری کا رد عمل شروع ہوا۔ گفتگو میں بے غور
اور غمزہ کے ہاتھوں اردو شاعری کے جذباتی اسکول کی بنیاد
پڑی اور وہاں کے پاکیزہ رنگ شاعری کا احیا شروع ہو گیا حقیقت
کی شاعری نے اردو غزل کوئی کبھی ایسی نہیں منظر میں جم لیا۔
چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ ان کی غزل کوئی بے نادموں سے
پاک ہے۔ افسانہ میں ان کا ایسی صداقت اور حقیقت نگاری
پائی جاتی ہے جو ادب کا عظیم حصہ ہے۔ ان کے اکثر و بیشتر شعرا
مبالغہ آمیز ہیں اور سچی روایت سے پاک ہوتے ہیں مگر ان
میں کوئی ذوق بے نادمی حقیقت فرود ہوتی ہے۔

حسرت کے بیان ایسی حقیقت نگاری نظر آتی ہے جس سے
ہم اپنی حقیقت نگاری میں دھماکے ہوتے رہتے ہیں اور ان کی
فلسفیات سے گرا تعلق رکھتی ہے۔ وہ محض الفاظ کے گونج
وہندے اور خیالی طوطا بولنے کو شاعری نہیں سمجھتے۔ ان
کے شعرا میں گہری نفسیاتی حقیقتیں پوشیدہ رہتی ہیں۔

حسرت تو ایسے تھے جن کا سرخوشی اور درخشنی خیال کو
منوع قرار دیں۔ افسانہ ایسے چست کو ہوش و خرد کا دامن
ہاتھ سے چھوڑ بیٹھیں۔ ان کے بیان حقیقت نگاری اور دھماکے
کا حسین امتزاج تھا ہے۔ ان کی حقیقت نگاری میں دُور
خصوصیتیں قابل ذکر ہیں ایک تو اس کا بازاریت اور حسرت
پاکیزہ اور شاعرانہ کیفیتیں ہوتی ہیں۔ وہ تمام جدید غزل گو شاعری کی ایک

پیش قدمی ہیں حسرت سب سے آگے ہیں۔ حقیقتیہ بات اور
حیات کی تصویر کشی اور ان کی نفسیاتی پیچیدگیوں کی نقاشی
حسرت سے زیادہ کامیاب طریقہ سے کسی نے نہیں کی۔
حسرت نفس کشی کے راز وال ہیں۔ وہ وقت اشیا
کی اچھٹوں اور نزاکتوں کو اتنا ہی صفائی اور حسن کے ساتھ
غزل کے اشعار میں پیش کرتے ہیں۔ ان کا سب سے بڑا کمال

کامیابی شاعرانہ حسن و صداقت کو برقرار رکھتے ہوئے پیش کر چکا۔
 بچہ کو روتا دیکھ کر وہ قصداً جو کسی مرا
 اور ترا ٹھوکر لگا کر مسکرائے گا۔ یاد ہے
 دوپہر کی دھوپ میں میرے بلائے کے لئے
 وہ ترا کوٹنے پر ننگے پاؤں آگیا بلوے
 بزم اختیار میں ہر چند وہ بیگم رہے
 بات آہستہ موزیک جی رہا کر چھوڑا ۱

جہاں تک قدامت کے رنگ شاعری کا تعلق ہے حسرت
 قزاقیہ سرسبز سے زیادہ متاثر معلوم ہوتے ہیں۔ ان کے اکثر
 و جیتے شاعر ہیں جس کے لب و لہجہ اس کی پردہ کی اور نصرت
 کی صاف جھلک جاتی ہے۔ جہاں تک نغنائی اور فلسفیانہ رنگ
 اور مضامین حسن و عشق کا تعلق ہے وہ عموماً حسن سے اتر پڑے
 معلوم ہوتے ہیں۔

غزل میں جہاں تک خارجیت پیدا کرنے کا سوال ہے
 حسرت کی خارجیت کا اس خارجیت سے کوئی تعلق نہیں ملتی
 جو کھٹو کے آخری دور کی شاعری میں پائی جاتی ہے جس سے
 اپنی غزلوں میں حسن خارجیت کو راہ دی ہے وہ اس کے
 ان کے پیر و دل کی خارجیت سے بالکل قطع ہے۔ وہ چوٹی،
 کنگھی، سرور، مسیحا، انکی ڈوٹہ والی خارجیت نہیں ہے جو
 مامیاد اور تبیل جوئے کے علاوہ شاعرانہ حسن و صداقت
 سے خالی ہوتی ہے۔ اور جس کے لئے کوئی جالیاتی جوان نہیں
 ہوتا۔

حسرت کے یہاں جو خارجیت ملتی ہے اس میں شاعر
 حسن کے خیالی اور جالیاتی عنصر ہوتا ہے حسرت کے اردو غزل
 مبالغہ و اغیت اور فیض شاعرانہ تبدیل خارجیت سے بالکل کر کے
 اسے بہترین نمائندگی شاعری کے پہلو پہ پہلو کر دیا ہے۔

یادیں سارے وہ ہیں، افراخت کے مزے
 دل ابھی بھلا نہیں آکا زلفت کے مزے
 حسن سے اپنے وہ داخل تھا میں اپنے عشق
 اب کہاں سے ملاؤں وہ نادانیت کے مزے

یہ ہے کہ وہ مضامین حسن و عشق کے غیر شعوری اور غیر محسوس
 رموز و مقامات کو بھی اتنی سلا کی اہم ہولت سے شعر میں
 کر دیتے ہیں کہ وہ نہیں انداز بھی شکل پر محسوس کن یا سمجھیں
 نہ آئے والی بات نہیں معلوم ہوتے۔ شاعر کا سب سے
 بڑا کمال یہی ہے کہ شعر میں کہے سے کہے اور محفل سے
 محفل مسئلوں کو آسان کر دے۔ بقول ذائقہ گر کہیں کہیں
 کی شاعری کی سب سے بڑی خصوصیت یہی ہے کہ ان کی باتیں
 بیک وقت سنانے کی چیز ہیں اور اداسک انسانی کی
 آخری منزل بھی۔

دوسری سب سے بڑی خصوصیت جو حسرت کی شاعری
 کو جدید اور غزل میں ممتاز بناتی ہے یہ ہے کہ ان کی
 شاعری سے اردو غزل میں ایک نئی خارجیت کا آغاز ہوتا
 ہے۔ صرف غزل کا تقاضا ہے کہ اس کا انداز ایک ایسی غزل
 قسم کی وادیت کا راز ہے جس کا خارجی محل سے کوئی
 تعلق نہیں ہوتا۔

یہ وادیت کچھ تو صوفی شعرا کے اثر اور کچھ سہمی
 بکرا نڈیوں کے وجہ سے روز افزوں ترقی پر ہی۔ لیکن
 انیسویں صدی کے آخر سے نئی ادیت اور جدید تحریریں بھی
 پر نمایاں طور پر اپنا اثر ڈالتے ہیں۔ اردو شاعری میں بھی ادائیگی
 اور صوفی زندگی کے علاوہ خارجی زندگی کی جھلکوں کی گہرائی
 تھیں۔ اسی اثر سے نگر نگاری کی ابتدا ہوئی۔ حالی اور نانا
 نے جب وہ جھلک غزل کی وادیت خارجی اور حقیقی ماحول کی
 نقاشی کی محفل نہیں ہو سکتی تو انھوں نے نئے اور مختلف
 موضوعات پر نظر بکھانا شروع کیا۔ اس خارجیت کا اثر جدید
 اردو غزل پر بھی پڑا اور اب وہ ہمیں غزل کے جذبات میں اس
 پاس کی جاتی رہی اور آشنائیز بھی نظر آتے ہیں۔
 غزل میں اس رجحان کا سب سے زیادہ کامیاب نمونہ حسرت
 کے یہاں ملتا ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ حسرت کی غزلوں
 میں صرف نفسیاتی اور داخلی دنیا کے رموز و مقامات
 ہوتے ہیں بلکہ وہ خارجی دنیا اور اس کی موضوعی صداقتیں

محبتیں لاکھوں مری تیار ہی غم پر نشا

جس میں اپنے بارہا ان کی عبادت کے گھر

حسرت کی غزل گوئی کی ایک گہری حقیقت جو سرسری

مطالعہ میں نظر نہیں آتی ہے کہ حسرت کے تصور عشق و

محبت میں فطری انداز اور اس کے ساتھ ایک طرح کی مردانگی

چلتی ہے۔ اس کا عشق کمزور، نالازم اور زمانہ قسم کا نہیں

ہے۔ اس میں بلا دہ کی گریہ و زاری، پست ہمتی اور ناست

بھی نہیں ہے۔ حسرت کا عشق وہی ہے جو ایک علی، مصرون

اور مست ازل دل و دماغ رکھنے والے انسان کا ہونا چاہیے۔

غزل کی ایک خاص چیز جسے حسرت نے محدود و

دیا معاملہ بندی ہے۔ حسرت کی بدولت اس میں ایک نیا سنگھار

خراج ملا اس میں ایک نئی تازگی اور نیا باغین پیدا ہوا۔

اور ایک نئی شوخی اور دکھشی پیدا ہوئی۔ حسرت کے شاعر علی نقی

نے جرات اور قاتل کی سادہ بندی میں بخوبی باغین پیدا کیا۔

حسرت کی شاعری کی زبان دور حاضر کے تمام غزل گو

شاعروں کی زبان سے زیادہ صاف ستھری، پاکیزہ اور مؤثر ہے۔

اردو غزل کا جو کلچر بن چکا ہے اس کے لئے حسرت کی زبان بیکر

موزوں ہے۔ اردو زمرہ اور کچا دود کا پورا لطف ان کے

کلام میں غائب ہے۔ ان کے انداز بیان میں بیکر شیرینی اور

تھکائی اور ترم ہے۔

غرض کہ حسرت کی کل خصوصیات شاعری کا مایہ نازہ لیتے

ہوئے یہ کہنا مبالغہ ہو گا کہ دور حاضر کے غزل گو شعرا میں ان

کا درجہ سب سے ممتاز ہے۔ ان کی بدولت اردو غزل کو ایک نیا

محمد حفیظ سید

(تذکرہ سلاطین قلم قلی قطب شاہ)

غزل

میں بھی تو کیا جب جیا جائے نا کہ اب زہر بھی تو پیا جائے نا

وہ سن مجھ ہے اے دوستو اسے نام قاتل دیا جائے نا

بیابان و تیشے سے مجھ کو غرض محبت کو رسوا کیا جائے نا

جنوں آشنا جس نے مجھ کو کیا اسی سے گریباں سیا جائے نا

اک اشک چکیدہ مری کا ثنات یہ تحفہ بھی اس کو دیا جائے نا

کسی کی عنایت نہ پوچھو از سب زمانے کا شکوہ کیا جائے نا

سلیمان اریب

اُوی

سرگوشیوں میں غرق ہیں کہساؤ آسمان زنجیروں میں ڈوبے فیضِ ت کے رازداں
 بستی ہے بادلوں کی ترنم کا دیں ہے اس سرزمین پہ ہوتا ہے دوس کا گماں
 ہیں جا بجا کرشمہ قدرت کے شاہکار رہ رہ کے جگمگاتے ہیں انوارِ لامکاں
 رقصاں ہے مرغزاروں کے حُسنِ سکوت کچھ کہسار کی حبیبوں سے اٹھتا ہوا دھواں
 شفاتِ آبشارِ سمندر کے ہیں سفیر ہیں جن کے انتظار میں پھولوں کی لڑیاں
 ہے کارگاہِ ابرگہسارِ یہ دیار شادابیوں کے یاں سے گزرتے ہیں کلاں
 سرشارِ ذرہ ذرہ ہے کیفِ حیات سے ہر جنبشِ نظر ہے تاثر کی داستاں
 جھتی نہیں ہیں، روئے زمیں کی بلندیاں یاں زندگی بدلتی ہے رُخِ سوسے آسماں

لا ریب! یہ مقامِ وطن ہے بہار کا۔!

جس کی خنک فضاؤں میں ہے سوزِ جاؤں!۔

بشیر النساءِ یگم بشیر

ایوسی

تقدیرات صرف میرے لئے وقت ہو چکے ہیں۔ لیکن یہ میری پہلی
تجدید تھادی زندگی میں جیون نے بھی ایک مقام حاصل کر لیا
ہے۔ اور میں نے سب کچھ کھو دیا۔ آج کی گفتگو میری
زندگی میں یادگار رہے گی۔ آئندہ سے ہم ایک دوسرے کے لئے
اجنبی ہوں گے جیسے کہ ہم ایک دوسرے کو کبھی جانتے ہی نہ تھے۔
انسان ہمیشہ ایسے و مغرب دھوکے صفت نازک ہی کیونکر ہے
برداشت کرتا ہے اور اپنی زندگی کو بچھڑا دیا۔ مصائب میں مبتلا
کر دیتا ہے۔ اگر وہ ایسے حسین خواب نہ دیکھتا تو اس کی زندگی
اعتدال پر قائم رہتی۔ پرکاش کے ہونٹوں پر حاکم ایسا مسکرا
کھیل ہی تھی۔ وہ اپنی آخری گفتگو خیر کے رخصت ہو گیا۔

شام بہت کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن احساس خودداری
پر غم و غصہ وہ بہت جلد بی بی بیٹی کی کچھ کہہ نہ سکی۔ پرکاش نے
دو سال تک اپنی زندگی کو اخلاقی پیتھوں میں جھونک دیا تھا۔
وہ کہنا چاہتا تھا کہ شام سے اس کی کبھی ملاقات تھی۔

لیکن حقیقت کس طرح بھلائی جا سکتی ہے۔ وہ گزرے
ہوئے دن کی یاد کو تازہ کر لے پھر ایک بار کشمیر ملا آیا۔ اور پراڈم
ہوٹل میں میٹھا بھی بوجھ رہا تھا۔

اسی ہوٹل میں کس نے شام کے ساتھ دینیں ساقیں
بسر کی تھیں۔ آج پھر وہی جان لیوا احساس تنہائی۔

دو سال کی جہم بے اعتدالیوں نے پرکاش کی طبیعت کو بہت
گرا دیا تھا۔ یادداشتی نے اس کے دماغ میں الجھن سی پیدا
کر دی تھی۔ وہ آج شراب پی رہے تھے۔ غرابی طبیعت نے
قوت برداشت باقی نہ رکھی تھی۔ اسی عالم دہوشی میں وہ اٹھا
اور سڑک پر جا پہنچا۔ قدم اڑا کر مار رہے تھے۔ جیسے آج
وہ کسی فرد کی کام سے جا رہا تھا۔ پرکاش ایک تیز رفتار
موٹر سے ٹکرا گیا۔ آہ دناں منظور ٹرراں ماں ماں کہہ کر روک
نہ سکا۔

شام کو پرکاش کے وہ الفاظ یاد آ گئے۔

اب جو ہماری کبھی ملاقات ہوگی تو ہم ایک دوسرے
کے لئے اجنبی ہوں گے۔

غم تہی کے اسباب میں سے بڑی وجہ احساس تنہائی
ہمیشہ ہے۔ کتنی ہی انسانوں نے اپنے احساس تنہائی کو کھانے
کے لئے اپنی زندگیوں کو تباہ کر دیا ہو گا۔

پرکاش جذرا لے اسے پراڈم ہوٹل کے چیمبر میں کرک
پر ایک گوشہ میں بیٹھا یہی سوچ رہا تھا۔ اس کی نظروں کے
سامنے زندگی کے جیسے ہوئے دن بھر نے تھے۔ ماں کی گود
جیون کا زمانہ۔ جوانی اور اس کی زندگیوں۔ ایک دوسرے
محول لیکن اس پر بھی تنہائی، اپنی زندگی کا سب سے حسین
دن یاد آیا جب شام نے پہلی دفعہ اپنی زلفیں اس کے شانے
پر کھیر دی تھیں۔ اپنی آنکھوں سے سیام الفت سنایا تھا۔
گو یا احساس تنہائی کو جوش کے لئے مشا دیا تھا لیکن اب وہ وہ
مرد ہے۔ وہ پہلی ملاقات میں انہیں نظر میں ایک دوسرے سے
قریب کر رہی تھیں۔ لیکن حقیقت کچھ اور ہی تھی۔ محبت کے بے پنا
ہیلا بے نظمین شہر کی حسین داویوں میں بہا لایا۔ یہاں سے
وہ اہل ہونے کے بعد ہی شام کے برتاؤ اور میل جول میں
فرق پیدا ہو گیا۔ اس کی ہر ملاقات میں احساس برتری بڑھتا
جا رہا تھا۔

ان کی ملاقات کی آخری پچھلی سی دیو ہوٹل کی گفتگو
تھی۔ پرکاش نے اپنی وسیع دنیا کو شام کی ذات میں مرکوز
کر دیا تھا۔ اور اس کا مضمون تھا کہ شام کا ہر عمل اس کے لئے
وقت ہو جائے۔ یا ایک جیون ان کی زندگیوں میں داخل ہوا۔
شام سے اس کا بڑا موندنا اور محبت آمیز تھا۔ شام اس کو
چند کرنے لگی تھی۔ پرکاش کو گوارا نہ تھا۔ پرکاش اس
شام کی آخری گفتگو کا موضوع جیون تھا۔ اگر میں جیون
سے ملتی ہوں تو تمہیں کیوں اعتراض ہو رہا ہے۔ شام نے کسی
قدر سخت لہجے میں کہا۔

پرکاش نے مضبوطی سے ہاتھ بولا شام۔ تمہاری ملاقات
نے میرے احساس تنہائی کو مٹا دیا تھا۔ میں نے یہ سمجھا تھا کہ تم

پر کاش کے جوشا کی زندگی اداس پیکسی اور بیزہ
 ہو گئی تھی۔ اب اس کا کوئی مقصد نہ تھا۔ انسان کی زندگی
 مصائب و آلام میں گھر جائے تو کیا موت سے پہلے
 آسکتی؟

قید حیات و بند غم اہل میں دونوں ایک ہیں
 موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

شائے رکاش کا سراپے زانو پر رکھا۔ اس کی
 آنکھوں سے دو گرم قطرے آنسو کے پرکاش کے چہرے پر
 گرے۔ اس نے آنکھیں کھولیں اور سکرایا پھر ہمیشہ کے لئے
 ناموش بن گیا۔

غم آہستی کا اسد کس سے جو جزم گ ملاح
 شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہوئے رنگ

سبب

رنگ جذبات

پر دے اٹھتے ہیں جلوہ گاہوں

دن کے نالوں سے شب کی آہوں

آپ چھپتے ہیں کیوں نگاہوں سے

تیرے بختوں سے بے پناہوں سے

جب بھی فرصت ملی گناہوں سے

کیوں دھواں اٹھ رہا ہے آہوں سے

کام کچھ بن پڑا ہے آہوں سے

جانے کیا ربط خاص ہے دل کو

آپا جب نہیں جہاں میں کوئی

گرد منزل لپٹ کے روتی ہے

دیکھی جانے گی گرئی محشر

کیوں غش سی ہے دل میں کیا غم

میں وہ آزاد طبع ہوں اغتر

جس کو نفرت ہے کج کلاہوں سے

اختر رضوانی

مَری کی گلیوش وادوں میں

مَری کے مسکراتے، گنگناتے رگڑاؤں میں حریری آنچلوں کے دھیسے دھیسے گیت سناتوں
گروہ گیت جو تیری نگاہوں نے کبھی سے تھے انھیں اب تک اُفتی کے سرمنی، امن کے چٹنا ہوں

مَری کے بھیکے بھیکے اونچے اونچے کوہ سارنیاں برستی بوندیوں نے موتیوں کا جال پھیلا یا
مَری! شاہ و محبوبہ! قصور کے در پہنچے سے نہ جانے کیوں ترا بھیکا ہوا چہرہ نظر آیا!

مَری کی گل بداماں وادوں میں کھو گئے رہ اگر مجھ کو تمہارا عارض گلگوں نہ یاد آئے
تمہاری یاد نے ہر دم سے مجھ کو بچا یا ہے وگرنہ آدمی، اور بیچہ عیساں سچے جائے!

مَری کی دستوں پر زرد کی دیوی راج کرچی کبھی لے کاش مزدوروں کی زرا روٹھے
پہننے کپڑے پہن کر میں اسے کیا نہ کھاؤں گل کوئی بدلی مرے لمبوس کا بیونہ بن جائے

مَری کے پھیلے پھیلے سبز گوں پڑوں کے سائیں سا کرتا ہوں اکثر میٹھی میٹھی پیاری کی تیں
تمہارے گاؤں کے شہتوت کیا اب بھی ملا ہیں مَری پیاری حسینہ! آ رہی ہیں حیرت کی را

مَری کا حسن افزنگی اداؤں سے نکھرتا ہے برہنہ پنڈلیاں بنتی ہیں ہر محفل کی آرائش
مرا ذوق تجس ایک گھونگھٹ کو ترستا ہے مرے ہمارا! مغرب میں نہیں مشرق کی کنش

فتیل شہانی

غزل

درد کو نیچا دکھانا آگیا چوٹ کھا کر مسکرانا آگیا
مرثیہ خوانی سے اب گھٹنا ہم زندگی کا گیت گانا آگیا
جاہلوں کی بات نہس کرنا دی جہل سے پیچھا چھڑانا آگیا
اُس کو سب کچھ آگیا سمجھو جسے دوسروں کے کام آنا آگیا
حسن نے رکھا جوانی میں قدم خود بخود بجلی گرانا آگیا
ریخ ناکامی سے دل بچتا نہیں وقت سے زور آزمانا آگیا

بے عمل سے کام کچھ ہوتا نہیں

وَجَدَکُو بَاتِیْسَ بِنَانَا آگِیَا

سکندر علی وجہ

آپ نے لکھا میں نے پڑھا

عزیز میرے سب سے عزیز

اللہ تعالیٰ آپ کو سینا کے تماشے اور ریڑھ کی غزلوں سے ہمیشہ ہمیشہ بخیر رکھے، مارچ اور اپریل ۱۹۴۲ء کا سال تھا۔ میں نے ملا۔ ان توام رسالوں کی پیشانی پر قسمت فی پرچہ لکھنا کا تہ صاحب نے پھر ترک فرما دیا ہے جو اصولی کوتاہی ہے اور اصل کتاب کے کرم سے میری عینک سے ہر پرچہ کی اتنی ہی باریک کوتاہی کا دیا نظر آجاتی ہیں۔ لہذا آپ کے کتابت صاحب کے راجن کارڈ میں اگر کمی نہ کر دی گئی ہو تو ان کو تنہائی میں طلب کر کے اردو میں ڈانٹ دیجیئے کیونکہ انگریزی زبان میں تو وزارتی دفتر کا موجودہ نظام بہت موجود ہے!

دیگر احوال یہ ہے کہ سب سے کہ "یہ توام پرچہ طے مال معلوم ہوا۔ کیا معنی کہ دل کو سرور و آسائش کھول کر فوراً حاصل ہوا! انا بعد میں یہ اقرار صادر کیا ہوں کہ اس زمانے کے اردو کے اخباروں اور رسالوں میں آپ سے بہتر اصولی اور قاعدہ کے عین مطابق ایڈیٹر اس طرح ثابت ہوئے کہ آپ نے میرے تارویکے بغیر میرے خط کا ایک ایک حرف پڑا ہی نہیں بلکہ کبھی اور اپنا فرض ادا کرنے پر مستعد بھی ہے۔ اسی لئے آپ نے میرے خط کی دھواں پڑنے اور بیوں کے لئے ایڈیٹری کا نوٹ لکھا۔ ورنہ میں تو راج کر کے چھے چھے پرچوں کے ایڈیٹروں کو دیکھ رہا ہوں کہ وہ اپنے مقالہ نگاروں کے مقالات کو اس درجے بنے خبری اور لیے پر ادھیختیت سے شائع کرتے ہیں جس سے ان کے "کنکھ" انٹراش پرن" کی اہمیت جو بیوں کے چاند کی طرح نمایاں ہو جاتی ہے گمراہ کر کے آپ نے مستعد لوگوں میں طے البتہ آپ کے اس نوٹ کی ایک غیر شرعی شرح نہ لکھی ہے اور وہ یہ کہ جناب گرامی نے لکھا ہے کہ ہر شخص والے کو ایک جدید اسلوب نگارش کا خالق اور موجد ہونا چاہئے اور

میں نے لکھا تھا کہ ہر لکھنے والے کو دو سروں کے کچھ ہوئے کے ترجمہ اقتباس اور حوالہ کے عوض خود کچھ سوچ کر لکھنا چاہئے مثلاً یورپ والے لکھتے ہیں کہ عورت کو لیے پر وہ مجھے کوس کی نعل کے عوض اپنے غمور سے نہایت کچھ لے کر دی کے یہ نصیحتا ہیں مثلاً یورپ والے لکھتے ہیں کہ فٹ بال کا مکمل مست کے لئے مفید ہے مگر آپ بقول خود تمام اعلیٰ اور جزا فیاتی حالات پر غور فرما کر لکھئے کہ بس بس غمور ہندوستان ایسے گرم ملک میں فٹ بال کا مکمل مشقت شاق ہے اس لئے ہندوستان میں کا احصائی نظام اس مکمل سے تباہ ہو چکا ہے گا مثلاً یورپ والے مسیح کے وقت تنگ و بڑے بکھرے تھے ہیں اور اپنے اس نئے پرن کو ڈاکٹری کہتے ہیں تو آپ خود غور کر کے لکھئے کہ کنڈل کی ہوا میں جو برقی لہریں پھیلی ہیں ہندوستان کا جسم ان کے اثرات کو جذب کر کے کے عوض بوجھل ہو کر ضعیف ہو چکا ہے گا اس لئے ہندوستانیوں کا اتنی دیر تک تنگ و بڑے رہنا سضر ہے اسی لئے اپنے گاندھی جی صاحب کو لکھتے ہی جارہے ہیں اور بیاری رہتے ہیں مثلاً یورپ والے لکھتے ہیں کہ سینا کے تماشوں سے اصلاح ہوتی ہے تو آخر غور کر کے لکھئے کہ ہندوستانی قوم ذہنی اور دماغی حیثیت سے ابھی اتنی مستعد نہیں کہ وہ سینا کے تماشوں سے کس فیض کر سکے لہذا ہندوستان میں سینا کے تماشے تجارت اور ادارتی کے سوا کچھ نہیں آنا ہمارا اللہ بس اگر اس طرح غور کر کے لکھئے والے پیدا ہو جائیں تو کچھ کہیں کہ ادب اردو ترقی کر رہا ہے ورنہ کچھ کہیں کہ منظور مطلق مکتب ہے اور بس کیونکہ اردو میں ادب اور ایڈیٹر تو ایک طرف آپ تو اردو کی کتابیں لکھتے والوں تک میں ایک ایسا نہ پائیں جس کی کتاب یورپ کے محققین کے تراجم اور حوالوں سے خالی ہو حتیٰ کہ تصنیفات اردو کے نام سے جو ادارے کام کر رہے ہیں ان کی جملہ کتابیں دو قسم کی کمزوریوں سے خالی ہیں۔ یا تو وہ ترجمہ اور مشتعل ہوں کی چند ورنی حوالوں پر یا پھر تیار اور سوجھ بوجھ کے اعتبار سے حد سے گزری ہوئی یا زاری

معیاری اور عوام کے ذوق کی اور پس اس لئے میں نے ہندوستانی
 داعی کی اس فطری پیدائشی سے تنگ نہ کر لکھنے لکھانے
 عوض بکرا بکری ایسی اٹھیں اور انجمن مرغامی کی بنیاد
 رکھ دی ہے۔ اب شتر سواروں کا ادارہ بنانا اور رگلی
 ہے جو امید ہے کہ بعد ازاں حضرات المبارک میری عربی داں ہوی
 کی صدارت میں بن جائے گا۔ فی الحال میں "مرغامی آئین
 کو طرہ پہ چل جس کی صدر ہوی نمبر ۱۲ اور سکریٹری ہوی نمبر
 ہیں" اٹھے مجھ کو فروخت کرنا پڑتا تھا اس لئے میں نے
 "ہوی گرانڈ کونسل" میں اپیل کر کے اس انجمن کے ترجمانی
 کا عہدہ بقل جو حاصل کر لیا ہے۔ "ہوی گرانڈ کونسل" نے
 میری تحریر کی لیاقت کے اعتماد پر مجھے کو "انجمن مرغامی"
 کا ذریعہ بدینہ ایسی مقرر فرمایا ہے اس لئے آنے والی چیز
 کو میں سیرک کاٹوں، دفادادی، عمار کا اس عہدہ کا جب
 چار سالوں کا تب میں مرغامیوں کا ڈاکٹر کو بڑا مشہور
 ہو جاؤں گا جو ہٹلر ساکن جرمنی کا وزیر پر پوچھ گیا تھا۔ میرا
 ہی نہیں بلکہ میں ایسی رپورٹ تیار کر چکا ہوں جس میں
 میں نے قبلہ جس اعلیٰ راجہ حسن نظامی کے "مرغامی خانے"
 کے جواب میں ایسی جمادیز مرتبہ کی تھی اس پر عمل کرنے سے
 تمام غیر ہندوستانی مرغامیوں سے کہا جائے گا کہ ہندو
 غالی کرو۔ کیونکہ میں اپنی بیویوں کی "گرانڈ فراسٹ
 کونسل" میں ثابت کروں گا کہ ہندوستانیوں کو اعلیٰ
 مرغامی پالنے خصوصاً لنگ ہارن اور روڈنل کی دلائی
 مرغامیوں سے بقدر کئی کروڑ کے نقصان پہنچا اور ابھی
 مزد نقصان کا اندیشہ ہے۔ ہوی گرانڈ کونسل میں مجھے
 انجی انگریزی داں ہوی کی مخالفت کے سوا کوئی خطہ نہیں
 کہیں جو دشمنی سے ہندوستانی داعی جس زبان کی تعلیم حاصل
 کرتا ہے اس زبان کی نسل کے لوگوں کے جو خواص کی بھی لکھ

نہیں کہ یہ نسل عربی فارسی سے کہیں بڑی حد سے ہندوستانی مائیں امید کہ میرے اس تحریر سے کئے کو بہت
 جان کر آپ بھی اس طرف کے لوگوں کو میری مذکورہ بالا انجمنوں کا ممبر بنانے کا کام شروع فرمائیں گے زیادہ اہم

غزل

حشر جذبات

وہ لطفِ جوانی تو ضعیفی میں نہیں ہے
ہے دل ابھی پہلو میں خیال اکویر ہے
دیکھو تو جنوں ہم کو کہاں لیکے چلا ہے
افلاک ہیں سر پر تہہ پا سطحِ زمیں ہے
کنندہ تھے خیالاتِ جوانی میں جو دل پر
ان کی بھی ابھی یاد دم باز پس ہے
افس جوانی میں اسے بھول گئے تھے
دل کہتے ہیں جس کو وہ زمرہ کا نہیں ہے
کس چیز کو ہم زادِ سفر سمجھیں الہی
ہم ایسے مسافر کی نہ دنیا ہے ندی ہے
ایک نفسِ یادِ الہی میں ہے مڑ
میں دور اگرچہ ہوں بہت وہ تو قریں ہے
دنیا کا ہے یہ مال غزیر آپ نے دیکھا
اپنا جسے سمجھے تھے وہی برسرِ کین ہے

ذوقِ ابیری کا یہ کہتا ہے کہ میعاد نہ ہو
ہم بھی آزاد نہ ہوں قید بھی آزاد نہ ہو
ابھی ممکن ہے کہ عشرت کی ہوں ہو پید
اس فراوانیِ غم میں تو ابھی شاد نہ ہو
ہاتھ سے سلسلہ قیدِ محبت کو نہ چھوڑ
روح جب تک بغضِ جسم سے آزاد نہ ہو
کم سے کم موت سے لے عشق میں تعلیم سیکھو
ضبط آنا ہو کہ اندیشہ فریاد نہ ہو
کہتے ہیں بچھ گئی اک شمعِ سحر سے پہلے
یہ دل وقفِ ستم کی کہیں روداد نہ ہو
اعتیادِ انتہی جبینوں سے نہ کراے زاہد
کوششِ حسنِ عمل بھی کہیں برباد نہ ہو
دل محبت کے لئے چاہیے شاقبِ ایسا
جس میں عنقر کوئی من جملہ افساد نہ ہو

شناقبِ کانپوری

عزیز یارِ جنگِ بہادر

کس کا خون!

جب ہی تو ماں سے لڑکیوں کی طرح لیٹ رہا ہے۔ ہٹ
یہاں سے تیار رہنا۔ کل معلوم ہو گا کہ تو لڑکی ہے یا لڑکا جن
دن بھر دونوں بیٹھے کام کرتے رہے۔ آخر کار رات کو تھک کر
باپ بیٹھے دوں سو رہے۔ آدھی رات کو کسی نے دروازہ
کھٹکھٹایا۔ حسن بن عبداللہ! باغیسیب ماں رات بھر نہیں
سوئی تھی، وہ دوڑتی ہوئی اس کمرے میں آئی جہاں اس کے
دونوں شیر پرے سوئے تھے۔ خوف اور فکر سے اس کا چہرہ
زرد ہو رہا تھا۔ حسن بن عبداللہ! حسن فوراً تندر سے چڑھ کر
کہا ہے؟ میں علی بن عصفی! حسن نے فوراً تلوار بھلی
اور اٹھ کھڑا ہوا۔ اتنے میں اس کی نظر اپنی بیوی پر پڑی۔
"کھڑی نہ کی کھڑی رہی ہے؟ اٹھا۔ بچے لڑکے کو۔ آج تیری
جو انفرادی کا امتحان ہے۔ اٹھ، تو سن کر بھی بڑا ہے۔ باپ
کی۔" دواڑ سہا کر ایاڑ اٹھ بیٹھا۔ اپنی تلوار بھلی۔ کمرے میں کنار
بانڈوئی! باپ بیٹھے جانے کے لئے تیار ہو گئے۔ ایاڑ کی ماں
دوڑتی ہوئی آگے بڑھی۔ اور حسن کے قدموں سے لیٹ گئی۔
"خدا کے لئے خردوار رہنا۔" پس دیر ہو۔ حسن نے اسے
پر سے اٹھائے ہوئے کہا۔ ایک عرب کی جان کے لئے دوڑتی
ہے؟" میاں کس قسم! اللہ! کہنا ہوا با۔ بھل گیا ایاڑ
اپنی ماں کو اٹھا لیٹ گیا۔ خدا پر غور نہ رکھو! "یہ کہہ کر
ایاڑ سہا کمرے میں غائب ہو گیا۔ ماں کی آنکھیں تارکی
میں کچھ ڈھونڈ رہی تھیں۔ ایاڑ۔

(۲)

شہر میں ایک کرام سا بیٹا تھا اور سیاحی زمین دو بھائیوں
کے خون سے اپنی بیویاں بچا رہی تھی۔ بہادر جوان جو شیلے بڑے
موج کے شیروں کی طرح ایک دو برس پر بقیہ رہے تھے جن میں
جاننا سلمان اور بہادر راجو تھے۔ کبھی یہ لڑائی حوصل
آزادی کے لئے تھی۔ نہیں! نہ جہالت! اور ایک
دوسرے پر فوقیت جتانے کے لئے۔
حسن بن عبداللہ جس کے باپ دادا نے سرزمین
عرب کے لئے اپنی جانیں لڑا دی تھیں، اب اس کے پہلو میں

آو بالوچ! ایاڑ بن حسن نے آواز کی کوئی
پر دانی۔ وہ کسی گہری سورج میں غرق چلا جا رہا تھا۔
ماں سن کر کتنی پریشان ہوئی۔ اپنی نے تو شاید اب تک کہ بھی
دیا ہو گا۔ آو بالوچ! ایاڑ بھیر گیا۔ ایک لڑکی اس کے
پچھے دوڑتی ہوئی آ رہی تھی۔ اس کے خوبصورت ماتھے پر
شکستیں تھیں۔ کب سے بھائی آ رہی ہوں۔ بالوچ! یہ لو،
یہ کہہ کر اس نے جن کے ایاڑ کے ہاتھ میں ویدیلہ ایاڑ سہا
واچی اس کا جھوگر پڑا تھا۔ تم نے اسے دھکے کیوں دیے۔
ایاڑ نے شرارت سے بول دیا۔ ارے! ام رام مجھے پرایا مال
نہیں چاہیے۔ وہ واپس چلی گئی۔ اس کے پیروں سے ٹھکر رہی
کی بھینکا رہے تھے۔ کچھ دوڑ جا کر اس نے اپنا کھڑا اٹھایا اور پڑے
ایاڑ کی طرف دیکھتے ہوئے سکرانی۔ وہ اپنی سہیلیوں میں جا رہی۔
ایاڑ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا کھڑکی طرف چلا جا رہا تھا۔ بے چارے
سے تڑپ کھولا۔ اس میں سے پانچ روپیہ کا نوٹ غائب تھا!
ایاڑ کو ہنسی آئی۔ "خیر یہ کہیں کی؟ یہ کہنا ہوا کہ کنویں کے پاس بیٹھا
سب لڑکیاں جا چکی تھیں۔ ایاڑ بھی کمرے سے کچھ ہی دور تھا۔
اس نے دیکھا کہ کنویں میں اس کی ماں اس کی منظر کھڑی تھی۔
جب وہ کمرہ پہنچا تو اس کی ماں نے فوراً دروازہ کھولا اور ایاڑ سے
پرٹ گئی۔ آگے میرے چاند؟ خوشی سے اس کے آنسو نکل
پڑے۔ لڑا ایاڑ کو قیاس میں ٹھیک تھا۔ اپنی ماں کو خبر نہ آئی
تھی۔ اس کا بپ تلوار صاف کر رہا تھا۔ چھوڑ دے! اسے
چلا کر اس نے اپنی بیوی سے کہا۔ حسن بن عبداللہ کے
بیٹے کو تو خوف دلایا ہے۔ میں کہتا ہوں بھیر نہ آئے۔
ماں نے دہلی خافا سے بیٹھ کو چھوڑ دیا۔ حسن بڑا بڑا
لگا۔ روز بروز لڑائی جتنا جا رہا ہے۔ اب تو کمرہ بیٹھا۔ ایاڑ
کی بیٹیاں پر پل پڑ گئے۔ ان میں لڑکی نہیں۔ ایاڑ بن حسن
ہوں۔ حسن نے حقارت سے بیٹے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

تپائی کے لئے ستر لاکھ دوڑتی ہوئی آئی خوف سے اس کا خوبصورت چہرہ زرد پڑ گیا تھا۔ آخر کار ماں اور بیٹی نے ہندو کو ستر پر لٹا دیا۔ کچھ دیر تو ہندو انہیں بند کئے پڑا رہا۔ اس کے بعد اس کے زرد بھول کو بخش ہوئی تکیائی ماں نے کہنا تھا "ہندو کی ماں بولی۔" کاش پار لایوں کے کچا صرٹ ایک لڑکا ہوتا۔" تاہم اس وقت لڑکے کی باتیں کہیں کرتے ہوئے تھا۔ چل چلا کر آ رہا تھا۔ ہندو اٹھ بیٹھا جو جس وقت کے جذبات سے وہ کانپ رہا تھا۔ ہاں صرٹ ایک لڑکا ہوتا تو وہ میرا روشن کرتا جس بن عبد اللہ کے بیٹے نے آج میرا اتھان کیا۔ کاش لڑکا لکھتا ہے رہا نہ گیا۔ وہ دوڑتی ہوئی ہندو کے قریب آئی۔ تپائی بھری میں بھی تو راجپوت خون ہے۔ میں بولی کی۔ تو؟ میری چھوٹی کیا؟۔ ہاں ہاں میں "ہندو سکر لیا۔" کہتا ہے ایک نازک لڑکا ہندو کے سینہ پر رکھ دیا جہاں اس کا بہادر خون آہستہ آہستہ بہ رہا تھا۔ قسم ہے اس راجپوت خون کی میں اپنے باپ کا بدلہ لوں گی۔" کہوٹے سے ہندو کے چہرے پر یہ کیسی مسکراہٹ نکلیں گئی۔ ایاز صبح اٹھا۔ اپنی کھڑکی اٹھا لی اور کمر کی طرف چل پڑا۔ راستہ میں اسے وہی کنواں نظر پڑا جہاں وہ لڑکی ملی تھی۔ ایاز ٹھہر گیا۔ اس خیر سے روپے اٹھنے تھے۔ وہ اکیلے گھرا لئے ہوئے اس کی طرف آئی۔ اس کا حلقہ چہرہ دکھلایا ہوا تھا۔ اس کی نظر ایاز پر پڑی۔ اس کی سیاہ آنکھوں میں شرارت کی ایک جھلک پیدا ہو کر کچھ گئی۔ ایاز بھی مسکرایا۔ اس نے اشارے سے اسے اپنے قریب بلایا۔ وہ گھر لپٹے رکھ کر ایاز کے قریب آئی۔ کہاں ہیں باقی پیسے؟ میرے پیسے؟ بھئی کہیں گی۔ لڑکی کی صورت پر بخند کی چھائی۔ اس نے جلدی سے ایک میلا سا ٹوٹ کالایا۔ یہ تو مٹا رہے پیسے نہیں ہیں تو رکھ لے۔ مجھے نہیں چاہیے۔ کیوں؟ مجھے نہیں چاہیے۔ میں تو غرق کر رہا تھا۔ میرے تپائی بیار ہیں۔ اس کے دل کو دھکا لگا۔ نہیں نہیں۔

اس کا شیر سا بیٹا باپ کے دوش پر دوش لڑ رہا تھا۔ دو فو کی تلواریں سوچ کی کڑیوں کی طرح چمک رہی تھیں۔ کھان دو فو کی کے مقابل میں کوئی گیدڑ تھوڑا ہی تھا۔ یہ تو ہندو جیت سنگھ جی تھے۔ اجن کے چھوٹے سے مکان کی دیوار پر بہاوری کے ملائی تھنے لگے تھے۔ وہ حسن بن عبد اللہ یا اس کے باپ سے کیوں ڈرتا ہوڑے ہندو کی رنگوں میں راجپوت خون تھا۔ حسن نے تلوار روک لی اور کہا میدان میں آؤ۔ اس نے ہندو سے کہا۔ وہ فو نے ایک دوسرے میدان کو لپکے بنا دیا۔ اور دو فو کی تلواریں پھینکیں۔ حسن بن عبد اللہ کا سینہ زخمی ہو چکا تھا۔ سچ بھی مسکرا رہا اس کے چہرے پر تھی۔ وہ راجا رہا تھا۔ ہندو نے ہندو سے ہروں کی دشمنی تھی۔ وہ آج اس کی جان بچانے بغیر چھوڑے گا۔ جن جانتا تھا کہ آج فتح اس کی ہوگی کیونکہ ہندو اس کے نزدیک ابھی بچہ ہی تھا۔ ہندو بھی اپنی جان کی بازی لگا چکا تھا۔ ہندو ہر گز لڑ رہا تھا۔ ایاز کی آواز حسن کے کان میں آئی۔ اس لڑے کا دم توڑ دینے ہی گل رہا ہے۔ آپ کسی اور سے لڑیے۔ سن لے فوراً کورار روک لی اسے پہلی دفعہ ہندو کے بڑے اور خود کی جوانی کا احساس ہوا۔ ہندو کا سانس پھول رہا تھا۔ اس کے کندھے پر زخم گہرا لگا تھا۔ حسن اور ہندو کی آنکھیں چار ہوئیں جو ہندو کے لڑنے لگے۔ بڑول کہیں کا بچہ جیسے سارول سے لڑنے کی بھی بہت ہے۔ ہندو تلوار صیغ کر گئے بڑول۔ ایاز نے بھی تلوار سنبھالی۔ اتنے میں ایک پولیس افسر کی آواز آئی۔ لاشی چارج کر دو کچنوں پر راستی سے کوئی بات استے نہیں۔ ایک پولیس والے نے پیچھے سے لاشی لاری ہندو کے ہر لڑکھڑائے تھے۔ کہیں دوسرے ایاز کی سہی کی آواز آئی۔ ہندو دانت جیسے لگا۔ اچھا تو ٹھہر تو۔ ہندو آہستہ آہستہ قسم اٹھا ہوا تھا کہ ہندو۔ اس کی بیوی دوڑتی ہوئی آکر ہندو کے قدموں سے لیٹ گئی۔ یہ کیا ہوا تھا۔ وہ رو رہے تھے۔ کہتا او کہتا۔ اس نے اپنی لڑکی کو بچارا۔

اور ہر کھڑکی سے ہندو کو دیکھتا ہوا۔ حسن بن عبد اللہ نے ہندو کو
مشتبہ نظر دل سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ایاز نے بہ مشکل
تمام آنکھیں کھولیں۔ اس کے زرد چہرے پر ایک فاختہ
مسکراہٹ تھی۔ حسن کی کچھ میں کچھ نہ آیا۔ تو کہنے لگا ہے؟
کیتا کی طرف دیکھ کر پوچھا۔ میری لڑکی۔ ہندو نے فرسے
کہا۔ حسن تلوار بھیج کر ہندو کی طرف بڑھ کر پوچھا کہ اس نے
خفستان کی حالت میں کہا۔ لڑکی سے۔ ابی۔ ایاز نے آہستہ
سے کہا۔ اس میں ہندو کا تصور نہیں۔ کیتا اور میں ایک
دوسرے سے محبت کرتے تھے۔ ایاز کی آنکھیں پتھر کی طرح
کمرے میں موت کی سیاہی موشی تھی۔ حسن اور ہندو اسی طرح
کھڑے تھے۔ ایاز کا دہسینہ میں رک رہا تھا۔ وہ مر رہا تھا
اس کی آنکھوں میں امیدی نئی روشنی جھلک رہی تھی۔ ایاز
اور کیتا کا خون زمین پر بہہ رہا تھا۔ ایاز اور کیتا کے منہ
خون نے دوؤں کے ہاتھ سے تلواریں گرا دیں کہیں دیکھ
سے لپٹ گئے۔

خدیجہ بلگرامی

اشوک عظمیٰ :- یہ کتاب مجلس ادبیات اطفال کی طرف
سے طلبہ اور عوام کے لئے تالیف کی گئی اور اس میں کھائی گئی
ہے۔ محمد سیدہ جعفری صاحبہ نے (آ عثمانیہ) نے اپنے
ہندوستان کے اس شہرہ فراموش اسکے حالات زندگی اور
کارنامے کو خوب پرانے میں قلمبند کئے ہیں۔ کتاب کا تصویر
ہے اور کتابت و طباعت اچھی ہے۔ قیمت (۱۰ روپے)
لئے کا پتہ :- سب سب کتاب گھر رشتہ نزل

حیدرآباد دکن

گئی۔ ایاز لڑتا ہوا ہاتھ اویٹا کیا اور اس کے سینہ میں چاقو
پرست کر دیا۔ ایاز کے منہ سے ایک دلدرد آواز نکلی۔ کیتا
دوڑتی ہوئی کھڑکی تک گئی۔ ایاز نے ایک ہاتھ سے کھینچ کر
اوردہ سرے ہاتھ سے لالین روشن کی۔ دھندلی سی روشنی
میں کیتا کا زرد اور خفزدہ چہرہ نظر پڑا۔ کیسے؟ ایاز
نے حیرت سے پکارا۔ کیتا پر گواہی گئی۔ وہ اس پیری
آواز کو غیب جانتی تھی۔ اس کا سر جھکائے گا۔ ایاز آواز دہرا
ایاز کے پہلو میں گر پڑی۔ ایاز نے اپنا ایک ہاتھ کیتا کے
گردال دیا۔ کیتا نے یہ کیا کیا؟ کیتا کے رخسار پر آنسو
بہہ رہے تھے۔ ایاز مجھے معلوم نہ تھا۔ ایاز مسکرایا۔
کیتا اس سے لپٹ گئی۔ نہیں نہیں ایاز تم اور میں جدا
نہیں ہو سکتے۔ ایاز پھر مسکرایا۔ تم ہی نے کہا کہ جدا کر دیا۔
ایاز میں نے یہ کیا کیا تم ہی ملا دو۔ ایاز گھبراٹھ مچا۔ کیا کہ
رہی ہو کیتا؟ کیتا اندھیرے میں چاقو ڈبوئے رہی تھی۔
تو ایاز۔ کیسے اب چلی جاؤ؟ کیتا نے چاقو ایاز کے ہاتھ
میں دے دیا۔ ایاز چاقو لے کر دیکھنے لگا۔ وہ اس کے بہادر
اور جھیلے خون میں تھار رہا تھا۔ ایاز تمہیں اپنے خون کی
قیمت مجھے بھی تمہیں کر دو۔ کیتا ایاز مجھے بھی ساتھ لے چلو
یاد ہے تم نے کہا تھا کہ ہم ہندی ہیں؟ ایاز اگر اپنی شادی
ہوتی تو ہم ابھی چین سے نہ رہتے۔ اب مجھے اپنے ساتھ
لے چلو ایاز؟ ایاز کچھ ریزک سوچا رہا۔ ایاز نے چاقو تنک
پر کیا۔ اچھا کیتا۔ اس نے آہستہ سے کہا۔ کیتا خوشی
سے ایاز کے قریب کھٹک گئی۔ ایاز نے اسے تنک پر لایا۔
کیتا نے آنکھیں بند کر لیں۔ ایاز نے ہاتھ اویٹا کیا اور
دور بہت دور چینک دیا۔ نہیں نہیں کیتا کیتا آنکھیں
کھول کر دیکھو۔ کیتا نے حیرت سے پوچھا۔ یہ مجھ سے
نہ ہو سکے گا۔ اچھا! کیتا نے چاقو زمین سے اٹھا لیا اور
اپنے سینہ میں گھونپ لیا۔ ایک لحظہ میں چاقو اس کا
چھوٹا سا سرا یا ز کے کندھے پر ڈھلک گیا۔ درد آواز نکلا۔
حسن بن عبد اللہ اور اس کی بیوی اندر داخل ہوئے۔ اور

زندگی

”دو در لنگ لانی سڑک پر جا رہا تھا، کالی کالی، سفید سفید کنکریاں اس کے لیے ڈھب پڑوں سے ٹکرا کر تگے میچے اچھل رہی تھیں۔ پھر اس کے قدم سوکے اور در جھلنے ہوئے کھیتوں کی جانب اٹھے، اور وہ چھوٹے چھوٹے گڑھوں کو بھانڈتا ہوا ایک اونچی سی چٹان پر سرخواریا۔ اس کی نظریں پیناسی زمین اور در جھلے ہوئے مسوں پر پڑیں، بارش کے نہ ہونے کی وجہ سے زمین میں جا بجا ٹکڑا کر پڑ گئے تھے۔ جیسے ایسے سیکھے ہوئے مٹیالے لب والے، وہ آسمان کی نیلگوں بہروں سے پانی کی بے تک مانگ رہی ہو، جھلسی ہوئی زمین پر بیڑھی کھردوں کے نقش، بوٹھی صورت کے پھریوں والے پھرے کے مانند نظر آ رہے تھے۔ وہ سوچنے لگا۔

”گزشتہ سال تو بارش اچھی ہوئی تھی لیکن اس سال بارش کا نام و نشان نہیں۔ آخر کیوں؟“ اس کی نظریں آسمان کی جانب اٹھیں، اس نے زیر لب کہا ”کیا آج بھی بارش نہ ہوگی۔“ بھگوان کیا تیرے پاس ہم غریبوں کے لئے رحم نہیں۔ کیا تجھے ان بھلے ہوئے مدھوم بچوں نے زبردستی ہونے کو دربوڑھوں چچی ہوئی مجبور عورتوں۔ بزرگس نہیں آتا۔ تو ہم سے اتنا خفا کیوں ہو گیا ہے۔ اے بھگوان۔“ ہم غریبوں پر دیا کیوں نہیں کرتا۔“

اس کے قدم آزادی کی جانب اٹھنے لگے، وہ زیادہ دور چلنے بھی نہ پایا تھا کہ اس کی نظریں مردم خوار گرد گرجوں پر پڑیں۔ ہزار ہا گدے۔ ایک گائے کی تکا لونی کر رہے تھے۔ اس نے گائے کو بغور دیکھا۔ اس کی نگاہیں گائے کی سینگوں کے سنہری کندوں پر تیرنے لگیں۔ بیٹھی بیٹھی نگاہوں سے وہ جیلوں لوٹنے والے سنہرے کندوں کو دیکھتا گیا اس کی آنکھوں میں آنسو اُسنے لگے۔ اس کے خیالات ماضی کے دھندلوں پر تیرنے لگے۔ دو سال پہلے اس نے کتنے ہی پیار سے اس گائے کی سینگوں کے لئے سنہری کندے بنوائے تھے۔ چند راکھیاں اس نے اس کو بڑے ہی پسندیدگی سے فروخت کیا تھا۔ دفعتاً اس کو ایسی دکھیا ماں کے الفاظ یاد آئے۔ ”جگت میری گوری دو دن سے غائب ہے۔ ذرا کھیتوں پر دیکھ آجیٹا،“ نے غائے کہاں چلی گئی۔“ اس کی بڑی بڑی آنکھوں سے آنسو چھلک پڑے۔ وہ سوچنے لگا، گھوڑے کھان کو کیا جواب دے گا جبہ یہ سنے گی کہ اس کی گوری اس سے ہمیشہ ہمیتہ کے لئے چھین لی گئی ہے تو اس کو کتنا دکھ ہوگا،“ غائے کی لاش پر گدھے نہ ہوتے تو شاید وہ گائے کی بڑوں کے ڈھانچے سے لپیٹ کر لیتا۔

”مقدس ماں تو تو ملی گئی۔ لیکن اب معصوم ننندہ اکا کیا ہوگا۔ اس کو دودھ کہاں سے ملے گا۔ وہ کیسے زندہ رہے گا۔“ ہال میرا ننندہ۔ مقدس ماں!

اس کی بیٹی جو اب آٹھوں کے آٹھے، مندو اور گوری کی سینگوں کے سنہری کڈے رقص کرنے لگے۔ — اننگت کے

بوڑھے چچانے ابھن میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔ ”گوری تو مر چکی۔۔۔۔۔ اب خود کی فکر کرو۔۔۔۔۔“
 تالاب کا پانی بھی سوکھنے کو ہے۔ ”اب کیا ہو گا“ ہو گا کیا! خطا کی وجہ سے تو ہزار ہا انسان دم توڑ رہے
 ہیں۔ پانی بھی میسر نہ آئے تو اور کئی لعشیں موت کی چپکیوں سے سسکتی نظر آئیں گی۔“ بوڑھے نے پتھر کے ایک
 کالے کوٹے ٹکڑے کو بے رحمی سے ٹھوکا مارتے ہوئے کہا۔۔۔۔۔ جیسے وہ عربوں کی کالی کلوٹی قسمت کو
 کوس رہا ہو۔!

تالاب کا پانی سوکھ گیا، فصل برباد ہو گئی اب تک گاؤں والے قحط سے پریشان تھے، جو کچھ اناج
 ان کے پاس تھا وہ بھی ختم ہو چکا تھا۔ بچے ماؤں کی پیچائیوں میں دودھ بھرنے سوکھ جانے کی وجہ سے
 ہلک ہلک کر دم توڑ رہے تھے۔ پانی کی قلت نے ان کی مصیبتوں میں اور اضافہ کر دیا تھا۔۔۔۔۔ موسیقی چارے
 کی تلاش میں سوکھے ہوئے پتھر کھیتوں میں آوارہ روجوں کی طرح بھٹکتے پھر رہے تھے۔ کھروں اور دانوں
 سے عرصہ زمین کا پیٹ کرید کرید کر، اور کچھ نہ پا کر وہ زمین پر ڈھیر ہو جانے اور گدھوں کا چارہ بن جاتے تھے۔
 اور گاؤں کے کمزور بوڑھے فاقہ کی لعنتوں میں بیٹھ لیٹائے، سسکتی زمین کی آغوش میں سوتے جا رہے تھے۔
 آبادی سے کچھ ناعیلہ پر، بوڑھے برگد کے سائے میں ایک کنواں تھا، گاؤں سے دور ہونے کی وجہ سے یہ
 کنواں ایک غصے سے اس عورت کی طرح بیکار ہو چکا تھا، جو محض بیوہ ہونے کے سبب سوسائٹی اور سماج
 کی نظروں سے گر چکی ہو۔ کنویں کا پانی برگد کے سبز پتوں سے نیلا ہو چکا تھا، گندے پانی پر برگد کے
 سوکھے پتے کوٹھکے داغوں کی مانند دکھائی دے رہے تھے۔ گاؤں والے اسی پانی کو آخری زندگی کے لئے
 استعمال کر رہے تھے۔ گاؤں کی ایک تہائی آبادی فاقہ کشی سے موت کے بھیانک غاروں میں پھیل چکی تھی
 اور گاؤں کے اکثر نوجوان ”فوجی بھرتی“ میں اپنا نام لکھ چکے تھے۔ اگر جگت کو رجزا، نندو اور اپنی بوڑھی
 ماں کا خیال نہ ہوتا، تو شاید وہ بھی فوج میں شریک ہو جاتا۔!

ان مصیبتوں کے باوجود جگت اور رجزا تاروں کی ٹھنڈی چھاؤں میں کنویں پر ملا کرتے، ان کے پریم
 اور پریت کے جدمہن مضبوط ہونے جاتے، رجزا کی بھولی بھالی باتیں۔ جگت کے کافوں میں امت رس
 گھول دیتیں اور اس کی روح میں ستاروں کی موسیقی سرسرا نے لگتی۔ اور اسے محسوس ہوتا کہ وہ
 سورگ کی رنگین دروانی فضاؤں میں اڑا چلا جا رہا ہے۔!

رجزا۔۔۔۔۔ بوڑھی بیوہ کی ان سیاہی لڑکی تھی، چھاؤں کو آنے والی سڑک کے کنارے اس کا بوسیدہ
 مکان تھا، جس کا ایک حصہ بجلی کے گر نہ کی وجہ سے مہدم ہو چکا تھا۔ بوڑھی بیوہ قرض کے بوجھ تلے دنی
 اس ٹوٹے ہوئے حصے کی تعمیر کرانے کی سکت اپنے میں نہ پاتی تھی۔۔۔۔۔ رات کی تاریکیوں میں جب بوڑھی
 ماں کی آنکھ لگ جاتی تو جب سے رجزا اس ٹوٹے ہوئے حصے سے باہر نکل آتی، جگت ٹھیک وقت پر کنویں
 پر پہنچ جاتا، پھر برگد کے تاریک سایوں میں بیٹھ بھی تو وہ پریم اور پریت کی کوسیلی باتوں سے اپنا
 دل بہلاتے اور کبھی مستقبل کے سہلے اور سونے سینوں میں کھو جاتے۔

آج بھی رجزا۔۔۔۔۔ جگت سے ملنے کنویں پر چلی آئی، لیکن آج اس کی کنول جیسی آنکھوں میں آنسو

ہاں — دہ قہجے شیطان بھڑیلے کے ساتھ نہیں آسکتی — جگت نے اندر داخل ہوئے ہوئے کہا۔
 راجندر کا سلوٹوں والا چہرہ غصہ سے کسی پتیکے موئے ٹماڑ کی طرح سرخ نظر آنے لگا۔ اس کی اندر دھنسنی ہوئی
 آنکھوں سے شعلے نکلنے لگے۔ اس کے کمر دھڑکا۔ اس کی عجیب کے جانب بڑھے۔ دوسرے لمحے لیبتول کی
 گولی جگت کے سینے کو پھینکی کہ چکی تھی۔ وہ لڑکھڑایا اور بے جان مجسمے کی طرح فرش پر گر پڑا۔
 چاولوں کی پھیلی اس کے ہاتھ سے گر پڑی۔ چاول — اس کے شیرازہ حیات کی طرح خشک
 زمین پر بکھرے پڑے تھے۔ امارت، غربت پر مسکرا رہی تھی۔ شاید اسے غریب کی نوجوان
 زندگی پھین کر لذت محسوس ہو رہی ہو۔ کتنی ظالم اور سفاک ہیں یہ امارت کی چڑھیلیں۔ !!!

جاوید یزدانی

من کی دنیا — حیدر آباد کے نوجوان افسانہ نگار رشید قریشی کے افسانوں کا نفیس مجموعہ ہے۔ افسانوی ادب سے
 دلچسپی رکھنے والے ضرور اس کا مطالعہ کریں۔ کتاب بہت دلچسپ اور انداز بیان نہایت خلعت ہے۔
 اردو کے نئے ادب سے دلچسپی رکھنے والے اور ترقی پسند نظریوں کے پرستان افسانوں کے مطالعہ سے ضرور فائدہ
 ہوں گے جو صحابہ اردو کے جدید ترین افسانوں کا مطالعہ کرنا چاہتے ہیں وہ اس نوجوان مصنف کے ان پرکین افسانوں سے ضرور
 لطف اندوز ہوں گے۔ صفحات (۱۲۰) قیمت جلد ۷۔ یہ کتاب سب رس کتاب گھر سے مل سکتی ہے۔

ماہرین کتابیات

الہ آباد کے مشہور و معروف ناشرین کتب کتابستان

(نے)

ماہرین کتابیات کی ادبی تنظیم کی نازم ترین تجویز کے ماتحت اردو ادبیات کے ہر شعبے کی جدید تصنیف کی طباعت اور اشاعت کا
 ہنر کیا ہے۔ اس کا ایک کے علاوہ اہل قلم اور ادب باب تصنیف و تالیف کو دعوت دی جاتی ہے کہ وہ اپنی کمال
 مجوزہ تالیفات کے مجموعے سے طبع اور اشاعت کے لئے ہمارے پاس بھیجیں۔ ان پر غور کرنے کے بعد صحیح اور مناسب
 مشورے کے بعد طبع و اشاعت کا ایسا معقول اور پسندیدہ انتظام کیا جائے گا جو مصنف اور تصنیف دونوں کے لئے
 عزت و وقار اور ناموری کا سبب ہے اور ملک اور زبان کی ادبیات میں ہر لحاظ سے صحیح اور قابل قدر اضافہ کرے۔

اس سلسلہ میں ذیل کے پتے پر خط و کتابت کی جائے۔
کتابستان نمبر ۱۔ کلاںہروڑ والہ آباد

پیکرِ ناز

اے مری روحِ زلیت، پیکرِ ناز
تیرے ہنسنے میں برق کا انداز
ہر ادائیری مرکزِ فطرت
ہر نظر تیری جلوہ گاہِ ناز
زلفِ پُر پیچ و زرگی آنکھیں
اک فریبِ حین ہے ان کا راز
عشقِ عالم شکا رکے ہاتھوں
حسنِ خواہاں بھی بن گیا عماز
ایک مدت سے ہائے اتیرے بغیر
نغمہ آرزو ہے بے آواز !
یاس و حرام کی تند موجوں میں
ڈلگاتا ہے زندگی کا جہاز
نغمہ جادواں کو کیا کہئے !
اک مسلسل حیات بخش ہے ساز
میں نے کھایا تھا اک حسیں دھوکا
عشق تکا دل فریب تمہا آغاز
شاید ان کا کرم ہے تجھ پہ عظیم
فکرِ عالی ہے مائل پرواز !

عظیم حیدر آبادی

غزل

شکستِ ربط سے بھی یہ پریشانی نہیں جاتی
محبت کی غلشِ تاحدِ امکاں نہیں جاتی
تسلی لاکھ ہو غم کی فراوانی نہیں جاتی
تری محفل میں بھی دل کی پریشانی نہیں جاتی
ہزاروں بار دیکھا ہے جمالِ شاہِ عالم
مگر ذوقِ نظر کی تشنہ سامانی نہیں جاتی
یہ کون اٹھا تھا آخر میری آغوشِ محبت سے
زمانہ ہو گیا پہلو کی ویرانی نہیں جاتی
ہمیں اپنی تنہائی کا نہیں کوئی نگلہ لیکن
نگاہِ ناز کی طرزِ پیشانی نہیں جاتی
یہ نازک لمحے اُن کی یاد کے تو بہ ارے تو بہ
کہ اپنے دل کی دھڑکن مجھ سے بچانی نہیں جاتی
قیامت ہو گیا حساس ہو جانا طبیعت کا
کوئی عالم بھی ہو دل کی پریشانی نہیں جاتی
وہی احساسِ تنہائی ہے ان کے سامنے عری
نظرِ آباد ہے اور دل کی ویرانی نہیں جاتی

عشری (بھوپال)

بی بی کمالہ حضرت خوجہ ماسا کا گنبد

مختصر ماسا اپنی اور مقامی دونوں روایتیں اس امر پر متفق ہیں کہ بی بی کمالہ حضرت خوجہ ماسا صاحبہ سلطان محمود غزنوی کی اولیٰ صاحبہ زادی ہیں اور حضرت خواجہ نصیر الدین محمود چراغ دہلی سے آپ کو شرف بیعت حاصل ہے۔

اس لحاظ سے آپ خواجہ بندہ نواز کی پیر بہن ہوتی ہیں۔ سید گلبرگہ میں مولوی محمد سلطان صاحب نے لکھا ہے کہ آپ کے شوہر محترم شمس العشاق حضرت میراں حسینی ہیں جن کا مدار موضع سد لگہ تعلقہ ہو کر ی میں ہے جس پر ایک عالی شان گنبد بنا ہوا ہے۔

چونکہ خود محمود شاہ اول ایک نہایت متقی اور پرہیزگار بادشاہ تھا جس نے بیس سال حکومت کرنے کے باوجود ایک سے زیادہ بیوی نہیں کی اور ہر کسب و معیت دین بھی ہوا تو حضرت شیخ ضیاء الدین قتل ہو کر نبیرہ حضرت شیخ زید الدین کچنگ شکر کے پائین میں۔ فقیر دوست اور جوہر شاس ایسا کہ اسی نے حضرت خواجہ حافظہ کو شیراز سے دکن آنے کی دعوت دی اور بہت سے قیمتی تحائف از قسم نقد و جنس روانہ کیا، ایسے بنگ اور خازنر بادشاہ کی بیٹی اگر ایسی ولیہ کا ملہ ہو تو کوئی تعجب کی بات نہیں چنانچہ اب تک آپ کا گنبد زیارت گاہ خاص و عام کمالات باطنی کی وجہ سے ممکن ہے کہ آپ کا لقب کمالہ ہو گیا ہو اور اس کا بھی امکان ہے کہ خوجہ کمالہ آپ کا نام ہو۔ شاہی خاندان سے ہونے کی وجہ سے آپ کو خوجہ سلطانہ بھی کہتے ہیں، مگر آپ کے تقدس کی دلوں پر ایسی عظمت چھائی ہوئی ہے کہ سب آپ کو خوجہ ماسا صاحبہ ہی کہتے ہیں۔

لفظ خوجہ کی تحقیق خوجہ جس کا تلفظ خوزہ بھی ہے، فارسی لغت میں اس کا کہیں پتہ نہیں۔ یہ ترکی زبان کا ترکی تھی، ناموں میں اکثر ترکی الفاظ نظر آتے ہیں۔ خصوصاً خوجہ کا لفظ مستورات کے ناموں میں، امراء و فقراء، دونوں میں یکساں مقبول تھا چنانچہ حضرت خواجہ بندہ نواز کی دو صاحبزادیوں کے ناموں میں یہ لفظ آیا ہے۔ منجلی صاحبہ زادی کا نام خوجہ بنتول اور چھوٹی صاحبہ زادی کا نام خوجہ ام الدین تھا۔ حضرت خواجہ صاحب کی اولاد و احفاد میں بھی یہ لفظ اس قدر پسندیدہ رہا ہے کہ کوئی پیڑی اس سے غالی نظر نہیں آتی۔ چند نام ملاحظہ ہوں خوجہ زینب، خوجہ فاطمہ، خوجہ حمیدہ اللہ، خوجہ بلوچی، خوجہ تخیل، خوجہ روشن، خوجہ یارسا۔

ان ناموں سے معلوم ہوتا ہے کہ خوجہ کا لفظ کلمہ تعظیم و احترام ہے جو عورتوں کے لئے رائج تھا جیسا کہ مقلوب کے زمانہ میں بیگم نے رواج عام پایا۔ بھیمبوں کے بعد دکن کے دیگر شاہی خاندانوں کے حالات میں بھی یہ لفظ بار بار آتا ہے۔ مثلاً خوزہ ہمایوں اہلبیہ حسین نظام شاہ

گنبد گلبرگہ سے جانب شمال دو ایک میل کے فاصلہ پر موضع گینو کے قریب، درختوں کے جھنڈ میں، کھیتوں سے گھرا ہوا ایک گنبد ہے جس کا ہر ضلع اندر سے ۳۱ فٹ پانچ انچ اور باہر سے ۷۴ فٹ ہے۔ اس کا طرز تعمیر دور اول کے ابتدائی حصہ کا ہے۔ کمالوں کے پاکھے پھیلے ہوئے، نیلے ہوئے اور بے ڈول سے، اس کی بعض کمانیں تو اندر و باہر کی طرف بدنامائی کی حد تک پہنچ گئی ہیں۔

گنبد اندر سے بالکل سادہ ہے۔ قبة بھی بالکل سادہ ہے۔ کمالوں اور نیم محرابوں پر کسی قسم کا نقش و نگار نہیں۔

صرف سروں پر ہلال اور ہر دو طرف ڈھال نما پھول ہیں جن میں مختلف نقش ہیں۔ البتہ مغرب رو یہ محراب پر کسی قدر معمولی قسم کی گول کاری ہے اور اس کے نیچے نئی عربی خط میں کچھ لکھا ہوا ہے جو چونے کی تہوں کے جڑ جانے سے پڑھا نہیں جاسکتا۔ یہ محراب ہلال نما لنگرہ دار ہے جس کے صرف بائیں لنگرہ اب باقی رہ گئے ہیں۔ لنگرہ خوش نما ہیں، جب پورے ہوں گے تو محراب بہت خوبصورت معلوم ہوتی ہوگی۔ اس محراب کے سرے پر لفظ اللہ لکھا ہوا ہے۔ اس محراب کے ہر دو جانب دو چوکئی طاقے ہیں، ایک میں اٹھتیل کا پرچم چلتا ہے۔ تین محرابیں کھلی تھیں، بعد میں حفاظت قبور کے لئے میتوں کو جن کر جانب جنوب ایک بہت ہی چھوٹا سائیت دروازہ لگا دیا گیا ہے، اس وجہ سے گنبد میں اندھیرا رہتا ہے۔ گنبد کے بیچوں بیچ ایک مردانہ قبر ہے اور اس سے ہٹ کر جانب مغرب ایک زنانہ دروازہ جس پر غلاف پڑا رہتا ہے اور ہری چوڑیاں رکھی رہتی ہیں۔ یہ دونوں مزار مٹی، پتھر کے ہیں جن پر صندل لپا ہوا ہے۔ زنانہ مزار کافی لمبا چوڑا مگر نسبت سے اور سرمانے کی طرف ذرا اٹھا ہوا جیسے کوئی چادر تانے محو خواب ہے۔ مردانی مزار کچھ زیادہ لمبا چوڑا انہیں البتہ حسب رواج اونچا ہے زنانہ مزار تو یقیناً فخرزہ ماں صاحبہ کا ہے۔ مردانی مزار کے متعلق مقامی روایت یہ ہے کہ یہ آپ کے کم سن صاحبزادے کی قبر ہے جن کا نام لوگ شمنامیراں بتلاتے ہیں۔ شمنامحفت ہے شمس الدین کا بیٹا کہ وہ میں ہو جایا کرتا ہے۔ اس لئے آپ کا نام شمس الدین میراں حسین معلوم ہوتا ہے۔ میراں حسین کا جڑو خاندانی ہو سکتا ہے۔ ایک صاحب نسبت بزرگ سے بھی مجھے اس کی تصدیق ہوئی کہ یہ مردانی مزار صاحبزادے ہی کا معلوم ہوتا ہے۔

کپنور ایک چھوٹا سا موضع ہے۔ یہاں مسلمانوں کے تیس چالیس گھر ہیں۔ یہاں کا مالی پٹیل جو مسلمان ہے وہ اور یہ سب لوگ مل کر ہر سال رجب کی چھٹی کو عرس کر لیتے ہیں اور نذر و نیاز چڑھاتے ہیں۔ گنبد کے سامنے جو حکیت ہے وہ بھی اسی مالی پٹیل کا ہے جس کا نام مشائخ پٹیل ہے۔ یہ گنبد اس سمت کا آخری گنبد ہے۔

ڈیڑھ دو فٹ اونچے چبوترے پر واقع ہے۔ اس میں ایک عہدت یہ کی گئی ہے کہ مغرب کی طرف اس چبوترے کے بیچ میں مسجد نما شٹل لگا لیا گیا ہے۔ اس کے نیچے ایک اور چبوترہ ہے جو ہر طرف سے ٹوٹ گیا ہے۔ اس لئے اس کا عرض ہر طرف کچھ مختلف ہے۔ جانب شمال ۲۳ فٹ پانچ انچ اور بلندی ۴ فٹ ہے۔ اس چبوترے پر جنوب کی طرف دو قبریں ہیں اسی طرف اس چبوترے کے نیچے ذرا ہٹ کر ۴۳ فٹ لائیا ایک اور چبوترہ ہے جس پر آٹھ قبریں ہی ہوئی ہیں۔ اس چبوترے کے نیچے بھی ہر طرف چند قبور ہیں۔ جانب مغرب حکیت میں بھی کچھ قبور ہیں۔

ایک اور گنبد ہتھاباد کی سڑک پر مذکورہ بالا گنبد سے آگے تو کوئی گنبد نہیں ہے البتہ اس کے جنوب میں ایک میل کے فاصلہ پر ایک چھوٹا سا گنبد ہے ضمنہ اس کا بھی مختصر حال سن لیجئے۔ یہ گنبد ایک وسیع چبوترہ پر جو اب ہر طرف سے ڈھ گیا ہے واقع ہے۔ جس کا ہر ضلع اندر سے ۱۹ فٹ اور باہر سے ۲۹ فٹ ہے۔ اس کی کانیں اور نیم محرابیں، فیروز شاہی طرز کی ہیں اور یہ سب نقش و نگار نہ خالی ہیں۔ صرف ان کے سروں پر ایک ایک پھول اور ہر دو طرف ایک ایک ڈھال نما پھول ہے۔

مغربی محراب پر کچھ آیتیں لکھی ہوئی ہیں جواب اکثر جھڑگئی ہیں۔ اس محراب کی ہر دو طرف خوش نما لٹپے ہیں۔ دیواروں کی کچھ سب جھڑگئی ہے۔ فرش بھی اکھڑ گیا ہے۔ بیچ میں صوف ایک قبر ہے جو مردانی معلوم ہوتی ہے۔ قبة بھی سادہ ہے صوف بیچ میں ایک گول پھول ہے جس کا اکثر حصہ جھڑ گیا ہے۔ باہر کی بھی سب استکار دی لکھ گئی ہے خنبہ کی کچھ باقی ہے۔ گنبد زمین طرف سے بند ہے۔ صوف جانب جنوب کھلا ہے جس میں چوکھٹ کے نشان پائے جاتے ہیں مگر اب چوکھٹ موجود نہیں ہے۔ گنبد مجموعی حیثیت سے بہت خستہ حالت میں ہے اور نہ معلوم کس کا ہے۔

میر جہانگیر علی خان

بھیک

سکون زندگی کھو چکا ہوں
جوانی میں جوانی کھو چکا ہوں
شبابِ زلیت آکر چل دیا ہے
سراپا غم بنا کر چل دیا ہے
تری چشمِ عنایت کا تبسم
مرے دل کے مقدیر ہیں ہے
خرام ناز کا رنگیں تر ختم
ابھی تک وہ قیامتِ تشریف
مری الفت کی تاثیریں غلط ہیں

مری قسمت کی تحریریں غلط ہیں
مگر پھر بھی دل نمکین و مضطر
ترا معصوم اشاہ چاہتا ہے
ہر اک تار نگاہِ شوق اکثر
ترا رنگیں نظارہ چاہتا ہے
بس اب یہ بے نیازی ترک کر دے
مرا دامن گلِ مقصد سے بھر دے

نظارہ اور قربت چاہتا ہوں
گداگر ہوں محبت چاہتا ہوں

جبریل

پیشانی

خاقان ایک جھنجھیلو فرکی زبان سے نکل گئی۔

تھہرے بچے کے سہاے خاقان کو اٹھایا اور سہریا
 ڈال دیا زخم ہو جا۔ تھہرے نے ڈاکٹر فریڈ جید کو سیدھیوں پر
 اس عداوت کی جڑ کو کاٹ دیا۔ یہ کی انکیدی ۔ ڈاکٹر صاحب نے خود
 اپنی کارخانہ کر شہر کو اپنی کے لباس ہی میں آسپوٹھ ڈاکٹر
 نے خاقان کے زخم کو دیکھا اور تسلی آفر لہو میں لوے ۔

مستر ظہیر گھبرانے کی بات نہیں ہے۔ زفر کو گھر ضرور ہے
لیکن ملحدی اچھا ہو جائے گا۔ رات کی ڈھلوانی گئے لئے ایک
خوس رکھ لیئے۔ انیل زفر کی کہ میں تم کی کسی تھی روتے
روتے اس کے بچائی نہ دے گی۔ عجب ظہیر نے کہا۔

خدا جانے خاقان کیوں! ہر مہل رہا تھا کہ نیلو فور نے سوچا کہ چور ہے اس کے گروہ میں خاقان ہی کی ایک انگلی رکھی تھی اس نے اس سے اس کے سر پر مارا۔

نہر: سچ! تو اس میں ہم دونوں کی سخت غلطی تھی جیسے وہ آئی تھی ہمیں خافان سے بھی ملانا تھا وہ غریب تو سب کا کہ کوئی ملنے والی بھولی آئی ہیں تو اپنے کمرہ میں چلا گیا۔ اس بچی کو بلا صلہ کہہ کر آ رہا ہے۔

فیروز نے کہا:۔۔۔ ہاں ٹھیک کہتے ہو۔۔۔ نیلو فرسے انہی رورو کو
 ماں کیوں ہلان کے تھیں جو ہر بیماری کوئی غلطی نہیں ہے
 نیلو فرسے طبیعت گرہنے نئی اور وہ بے ہوش ہو گئی وہ اکثر
 فیروز نے کہا:۔۔۔ جی جی تو ہے فرط غم سے طبیعت گر گئی ہے۔

نیو فرمالا کہ تندرست تھی لیکن ایک ہی رات میں اس کی حالت تیب و قی کے مریضوں کی سی ہو گئی تھی!

خاتون آنکھ کھول کر کہا: پانی
نے جلدی سے پانی لگا لاس دیا اور پوچھا: اب کسی طبیعت ہے؟
خاتون نے آنکھیں بند کرتے ہوئے کہا: "اے" مت پوچھئے۔
دور سے کھڑا حارث سے کہتا تھا: "اے" مت پوچھئے۔

موتے مومنوں کے لئے آسمان پر دو تہاڑے درخت ہیں۔ ایک درخت کا نام ہے "شجرہ طیبہ" اور دوسرے کا نام ہے "شجرہ زکوة"۔ ان دونوں درختوں سے جو پھل نکلے گا، وہ پھر اسی جنت میں کھائے جائیں گے۔

شام کا سنا نا وقت تھا اسکان ابراہیم تھا۔ ایک غلیظ
مولٹر کار بڑی تیزی سے چلی آ رہی تھی، کار کا پورچ میں کھڑی
ہو گئی۔ بیگم ظہیر نے پٹیل سے مل کر ہنسی ہوئی، اٹھ کھڑی ہوئیں کہ روٹ
جوری سے باہر اور ایسے وقت کھن آ رہا ہے۔ انھوں نے اپنے
مہمان منتحبہ خاتون کو اس کے کمرہ میں بھیج دیا۔ انھوں نے
راہ دے میں قدم رکھا یہ تھا کہ سامنے سے غلامہ نیلوفر ان کی
لاٹینیائی آتی ہوئی دکھائی دیا وہ دوڑ کر پلٹ گئی، دوسرے
بعد انھوں نے اپنی بیٹی کو دیکھا۔ نیلوفر نے اسے پاس کر لیا تھا۔
وہ لاہور میں اپنی نانی جان کے ساتھ رہتی تھی۔ بیگم ظہیر نے
ظہیر بیگم کو فون سے نیلوفر کی آمد کی اطلاع دی۔ وہ بھی فوراً
آگئے، کمپوٹر شیشی کی ایک کمرہ دور کی غریب خاتون کو کسی
نے یاد دلک دیا۔ نیلوفر خود نہیں جانتی تھی کہ آج کل خاتون
کہاں ہیں۔ والدین نے کھانے کے لئے کہا تو اس سے
انکار کر دیا کہ وہ شام کو چائے پی گئی ہے وہ اپنے کمرہ میں سب
عشب بخیر کہہ کر چلی گئی۔

یہ ایک ناقصان کے سر میں شدت کا درد ہونے لگا۔ اس نے بہت کوشش کی کہ نیند آجائے۔ لیکن کسی پہلو پر آرام نہ ہوا۔ دہر وار نہ کھول کر باہر بیٹھے تاکہ ناک ٹھنڈی ہو اسے درد چھک ہو۔ اسی وقت نیلو فریڈلر ہو گئی، چاندنی رات میں کسی کو ملتا ہوا دیکھ کر پریشان ہو گئی، صبح اٹھی، امی! امی! ہو تیس تو اب جیتیں۔ اس کے دل میں یکایک چور کا خشک ہوا اس نے خود ہی موت کی لٹاچ اور اسٹاک ٹیکر باہر آئی، دیکھا ایک شخص گیسٹ کی طرف چلا جا رہا ہے۔ خشک یقین میں تبدیل ہو گیا، وہ اس کے پیچھے دوڑا اور اسٹاک سے اس کے سر پر کھینچ مارا اور چوتھہ چلانے لگی اس کی آواز سن کر کنبہ اور پیچہ دونوں دوڑ پڑے اور دیکھا تو گیسٹ کے پاس ناقصان پہنچا ہوا ہے۔ سر پر کاری ضرب آئی تھی۔ جگر تھک کے منہ سے صبح نکل گئی، ہائے ناقصان! کنبہ پر پیچہ کے نمبر کی طرح کھڑے رہ گئے۔

نہل سے آنسو بونچھے اور بولی: بڑا تم بہت بڑا ہے
ہو جاؤ گے ضبط سے کام لو ابھی دو اگر صاحب آکر دوادیں گے
کو سر کا درد اچھا ہو جائے گا۔

خاقان: (خفیت آواز سے) نہیں مچی جان اب
شاید نہیں بچوں گا؟

بیگم گلبر: (سجرائی ہوئی آواز میں) بیٹا یہ تم کیا
کہتے ہو۔ تم گھبراہٹ سے لئے خون پسینہ ایک کرنے کو تیار رہیں
نہیں۔ تم بڑا اچھے ہو جاؤ گے۔

نیلوفر: خاقان کے سر پر ہاتھ پٹی اس کا سر آہستہ
آہستہ پہلائے گی۔ خاقان کو کچھ آرام ہوا اور وہ گویا
نیلوفر اپنی صحت کا خیال لئے بغیر دن رات اس کی تمارواہی
میں لگی رہتی تھی۔ وہ گھنٹہ بعد جب خاقان بیدار ہوا تو دیکھا
کہ نیلوفر اب تک اس کا سر پہلا رہی ہے۔

خاقان: (نیلوفر پر) تم اب تک جاگ رہی ہو۔
نیلوفر: مجھے نیند نہیں۔

ایک مہینہ بعد خاقان کو کچھ آرام ہوا۔ اس نے
حادثہ کی رات کے تمام حالات بتائے پتا چلی کہ نیلوفر اور ساتھ
ہی ڈاکٹر فروز حیدر اس کی حالت سمجھنے کے لیے آئے تھے۔
تھے۔ ایک گھر تو ایک گھر کے لئے بچان کو اس کے پاس نہیں
آئیں۔ اور خوشی سے جاگ رہی جانتی تھیں۔ خاقان کی چٹائی پر
پوسوں کی بازخس کرنے لگیں۔ ان کے کوئی لڑکا نہیں تھا۔

نیلوفر بھی ان کی آرزوؤں و تمنائوں کی مر کز تھی۔ بیگم گلبر
خاقان کو سیدھا جانتی تھیں کالج بند ہوئے ہی اسے اپنے پاس
لا لیتا تھا۔ اپنے عزیز و لونڈا جیسے کی حالات سے بخبر
کیوں نہ پریشان ہوتیں۔

خاقان حسین: تندرست بائیس سالہ نوجوان تھا۔

اس نے اسی سال ایم ایس کا امتحان دیا تھا۔ اور اب
پیشہ کا سستہ انتظار تھا۔

ایک ماہ کی صحت پریشانی کے بعد خاقان بالکل تندرست
ہو گیا۔ غسل صحت کے بعد حمام و ستون داہرہ بڑا قارب کو اٹلی

پہانہ پر ٹی پارٹی وڈی گئی۔ اسی دن خاقان کے ایک دوست کا
ٹیلیگرام آیا کہ خاقان ایم ایس سی میں کامیاب ہو گیا۔ اس
خوشخبری نے خوشی میں اور اضافہ کر دیا۔ دوسرے دن نیلوفر
نے اپنی سب سہیلیوں کو رات کی لکھا کرے پر دعا کرنا۔ وہ اتنے
اپنی کسی پہلی سے نہیں ملی تھی۔ خاقان بھی نیلوفر کے ساتھ چلے
چلے گئے۔ لاکھوں میں حصہ لیتا رہا۔ کھانے کے بعد سہیلیوں نے
بہت اصرار کیا کہ نیلوفر ایک گانا سنانے لیکن اس نے اپنی اساتذہ
کا کہنا نہ کیا۔ خاقان نے کہا۔ چاہتی ہوں شہزادہ جانی لکھا

نیلوفر: (خندہ پی سانس لیکر) جی ہاں!
خاقان: (پھوٹوں کو بڑوں کا کہا ماننا چاہئے۔)
نیلوفر سچ رہی تھی کیا میرا خواب کبھی شرمناک نہیں ہوگا۔

کیا وہ اب تک میرے دل کے درد کو نہیں سمجھ سکے۔
خاقان کی آواز سے یہ ایک اس کے خیالوں کا سلسلہ منقطع ہو گیا
اور وہ چونک پڑی اور دیکھ کر سوچے سمجھے جی کہہ دیا
خاقان: میں جانتا ہوں نیلوفر کہ تمام رات جاگ کر
تم نے اپنی صحت خراب کر لی ہے، لیکن مجھے یہ بھی امید ہے کہ

تمہاری تندرستی بہت جلد واپس آئے گی، تم و اس ہوا
اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ لیکن میری ایک خواہش پوری کرو۔
گانا سنا دو۔ تمہاری طبیعت بھی بہل جائے گی۔

نیلوفر: راستی سی بات کے لئے اتنی لمبی بھڑکی ہنسید
کی کیا ضرورت تھی۔ اگر آپ لوگوں کی بھی خواہش ہے تو
ضرور سناؤں گی۔ (ایک سہیلی کو پانچوں کی طرف اشارہ کر کے)

انجمن: تم یہاں تو بھاؤ؟
انجمن: (لوگوں سا گانا گائیگا۔)

نیلوفر: تم لوگ تیار آؤ
سب سہیلیاں: نہیں بھئی۔ ایسا ٹھیکہ نہیں ہے

جو تمہیں پسند ہو گا؟ انجمن کو نیلوفر نے آہستہ سے بتایا اور
دوہریا تو بجانے کچھ اور نیلوفر کا گانے لگی۔ دن کی دھڑکن بنالیا
ان کو؟

اس کے گلے میں لاکا دوڑھا، اس کی سوتیلی آواز فضا میں

کردی۔ اور کرسی پر بیٹھی رہی۔ اب آسمان صاف ہوا جانا تھا۔ کہیں کہیں روشن ستارے نظر آ رہے تھے۔ چاروں طرف یہی چاندنی چمک رہی تھی۔ سیلفز لگھٹانے لگی۔ اسے چاند پر ہی امیدوں کو سنبھال رکھا ہے! کھٹ سے کسی چوڑے کرنے کی آواز ہوئی۔ اس نے دیکھا کہ اس کی گود سے ایک بچہ سرخوئی۔ وہ اٹھانے لگی تو بھیجے سفافان کو کھڑا دیکھ کر خراب ہوئی۔

نیلو فر: آپ۔۔۔ اس وقت۔۔۔ یہاں۔۔۔ ۱۔

کوئی کام ہے۔؟
خاقان :- ایک بات پر چھتے، ایہوں نیلو فر کیا تم جواب دگی
نیلو فر :- خاموش

عاقبتان۔ آخر اس خاموشی کا کیا مطلب تھا؟ کیا میں مجھ
 یوں کہ تم مجھ سے نفرت کرتی ہو؟ میں مجھ سے بات کرنا تک گوارا
 نہیں۔

نیو فور کی آنکھوں میں آنسو چھلک آئے۔
نیلوفر، کاش میرے دروازہ کا اڑدہ نہ گسکتے۔ میری حقارت
خفا خان نے میں تم سے یہی پوچھتے آیا تھا کہ کیا معلوم جب ہم
ایک حصرم تھی سی گڑھا تیں۔۔۔۔۔ لیکن اس کا اظہار اس لئے
ہیں کہ کہیں تم یہ خیال نہ کرو کہ میں خفاقان کو سبائی سمجھتی
تھی اور سخت کرتی رہی لیکن ۔۔۔۔۔ کئی مرتبہ حالات کے بدلنے
میں یہ خیال ہوتا کہ آخر تم میرے لئے اپنی صحت کو کیوں برباد
کر رہی ہو؟ تنہا ہی نظروں میں رات بھی سو جاتی لیکن ہر
میں اسے اپنی غلطی سمجھ کر دل سے نکالت دیتا۔ لیکن آج میں
اپنی قسمت پر متناہی ناگزیروں کم ہوگا۔ کاش بس چنانچی میری
خواہش کو نہیں ٹھکراتے !

بولی: اب آپ جا کر آرام کیجئے، ابھی بستر سے اٹھے ہیں لڑاچا
 نہیں کرتی جا رہے۔ ۱۰ اور دو بجی اٹھ کھڑی ہوئی۔ خاقان
 حبيب بخیر کمر کراچے کرو میں چلا گیا۔ میلو کو رو بہتر کسک
 نہ نہیں آئی اسے کچھ کھسکھسائی اور آواز سنائی دئی اسے

پہل گئی، کائنات کا فرد فرد جھوٹا نظر آنے لگا۔ خاقان کی
عجب کیفیت ہو گئی۔ اس کی کٹاں کی طرح سے باہر ابرتا کو دہلا
پرچی روئی، عین چاند کبھی چھپ جاتا اور کبھی اپنے جلو سے
ونیا کو روشن کر دیتا۔ گانا سن کر ہو گیا لیکن خاقان اپنے خیال
میں محو تھا۔ نیلوفر کی دوسری پہلی اقبال نے چھپڑے
ہوئے کہا: "جانی خاقان کس خیال میں نہیں۔ کسی دل کی
دھڑکن، کون سا کمرہ دہراؤ، سننے؟"

میں نے کہا: "اب تو اس قدر ہنس رہے ہو کہ
 نہ خان سے (محبوب چاہا) اس سے پہلے کہ وہ
 تم لوگ بیکار پھرتے ہو۔ مجھے پتہ ہے اب تم کچھ سناؤ۔"
 پر وہیں۔ میں اس وعدہ پر گامزن لی کہ آپ بھی
 میں۔

عاقبات و ضرور آپ کا حکم مراٹھوں پر ہے
 نیو فور اٹم سے یا تو اسے کر خود جانے بھی اور اس کے
 موافق پر وین گئے انکی توجہ سے سن میں بسوں کی وہ سبنا
 گانے کے ختم پر عاقبات نے کہا: آئیچی اور وہ جلدی سے
 کمرہ سے نکل گیا۔ گانا ختم ہوئے پر وین نے عاقبات کو کلاں
 کیا۔ وہ بچہ نمبر کے پاس بھی نہیں ملا، فحش نے کہا کہ میں
 تو نہیں ملا ہے۔

پروہی نے بتایا کہ وہ اس طرح جواب دے کر وہاں سے چلے آئے۔ بیکم ٹیکہ نہ سنتے ہوئے کہا: "خدا ذاتی بچہ ہے۔ خیراتج اسے چھوڑ دو کسی دین میں خوشنوداؤں گی!" ٹیکہ آدیرجیم بہت دیر تک خافان کے مذاق پر ہنستے رہے۔ پروہی کا ادا اس جہرہ دیکھ کر بے ہیلیاں ٹھکھلکا کر ہنس پڑا۔ بارہ کا گھنٹہ بجنے ہی سب جانے کو، ٹیکہ ٹھہری ہوئیں۔ منہ پر غصے بک خصوصت کیا۔ پورا پنے کو میں اگر کسی پر مینہ لگتی اور باہر کے پر کین منظر سے لطف اندوز ہونے لگی۔ اس کی آنکھوں سے نیند رو لوش ہو چکی تھی۔ والدہ نے بخار کر کہا: "بیٹی! قریب تک کیا کر ہی ہو آدم کرو!" نیلو فرے سوچا کہ کبھی کی روشنی سے اچھی نے سکھایا ہے کہ میں جاگ رہی ہوں۔ روشنی کا بین و بار کا لاش بند

یقین ہو گیا کہ اس کے والدین ایک کھیل رہے ہیں۔ وہ دروازے کے قریب جا کر کھڑی ہو گئی۔ بیچم ظہیر کہہ رہی تھیں۔ جوشہ کے لئے اپنا بھی ہوجائے گا۔ بہت حیلن جوئے اچھا گا۔

ظہیر نے کہا۔ کل ہی والدہ اور اکرام ظہیر کے چھوٹے بھائی اور خاقان کے والدہ کو آنے کے لئے ٹیلیگرام دے دیتا ہوں! بہت اچھا ہوا جو آج تم نے ان کی باتیں سن لیں۔ وہ بچی کی نرمی کے بارے ہاتھوں تباہ ہوا جو ابھی وہ ایک لفظ تک غلات زبان پر نہیں لاتی۔ خانا ہماری امیدوں کو پوری کرے؟

نیلو فر کا دل دھڑکنے لگا کہ والدہ نے اس کی باتیں سن لی ہیں۔ وہ آہستہ سے آکر کھڑے پر راز ہو گئی اور سوچنے ہی سوچنے اسے نیند آگئی۔ صبح دیر سے بیدار ہوئی۔ دیکھا تو سامنے خاقان سفید سوٹ پہنے کرسی پر بیٹھا کوئی کتاب دیکھ رہا ہے۔ اور میز پر پائے ناست تہ رکھا ہے۔ خاقان نے مسکراتے ہوئے نیلو فر کو دیکھا۔ نیلو فر کے پریشان بل پریشانی پر کمر کئے تھے کہ بادل کے سیاہ ٹکڑے میں سے چاند مسکرا رہا ہے۔ نیلو فر مسکراتی ہوئی اٹھ کر چلی گئی۔ خاقان نے لازمہ سے کہا کہ ابھی ناست تہ لیجاؤ چائے ٹمنڈی ہوجائے گی۔ بی بی آجائیں ٹولے آنا۔

نیلو فر نے سبز سلک کا جوڑا پہنا۔ بال سوار اور اپنے کمرے میں آئی۔

خاقان! اوہو! اس وقت تو سبز پر ہی معلوم ہو رہی ہو۔ بھلا تمہاری اس ناؤں گلفی سے کوئی دل والا کیوں کرایج سکتا ہے؟

مرتلا۔ جی ہاں آپ کی غلطی نہیں تھی شاید آپ کے ہاتھوں کی غلطی ہو! اب کچھ بھی کہو۔ ایک بار تو چور کہہ لیا۔

پھر کیسے پسند کیا۔؟ اور وہ زور سے ہنس پڑا۔ لیکن نیلو فر کا سر پشیمانی سے جھک گیا۔

نیلو فر نے ناست تہ کے بعد رات کی تمام باتیں خاقان کے گوش گزار کر دیں۔ وہ خوشی سے کھل اٹھا۔

تیسرے دن نیلو فر کی مالی جان اور جی اچھی آئیں! ظہیر نے اکرام سے کہا۔ میں نے تو تو کوئی کو اس نصیحت دی ہے کہ ہماری دلی خواہش ہے کہ خاقان کو ہم اپنا داماد بنائیں۔ کیا خاقان کے لئے نیلو فر موزوں نہیں ہے؟

بلکہ اکرام۔ ایسے بھی وہ آپ کا بے بھائی صاحب! اکرام۔ میری خوش قسمتی ہے۔ آپ کے ہر حکم کے آگے میرا سر خم ہے!

بیچم ظہیر۔ (اپنی والدہ سے) اتنی جان آپ کی کیلئے ہے والدہ! تم لوگوں کے دل میں اب یہ خیال پیدا ہوا ہے لیکن میں تربیت و نون سے یہی چاہتی تھی۔ نہ انھیں ہزاروں ان کی خوشحالی دیکھنا نصیب کرے۔

ایک ماہ بعد خاقان اور نیلو فر شاہی کی سہری زنجیروں میں باندھ دیئے گئے۔ اب نیلو فر۔ نیلو فر والدہ ہی نہیں تھی بلکہ بیچم ظہیر خاقان تھیں چند روز کے لئے نیلو فر سسرال آئی۔ سب نے نند پریشانی سے اس کا استقبال کیا اور سب نے انتہا درجہ مسرت کا اظہار کیا۔ نیلو فر اپنے کمرے میں بیٹھی خاقان کی شین تصویر جو کہ میز پر رکھی تھی دیکھ رہی تھی۔ یکایک دیکھے سے خاقان نے آکر آنکھوں پر ہاتھ رکھ دیا۔ نیلو فر نے اس کے ہاتھوں کو اپنی آنکھوں پر سے اٹھو

کیا خاقان نے کہا۔ ایک چور کہ میرے بیویوں عطا ہوا۔؟

نیلو فر! ان باتوں کو بھول جائیے میری غلطی نہیں تھی! خاقان! یہ بھول کیسے جاؤں اسی حادثہ کی وجہ سے تو یہ مرتلا۔ جی ہاں آپ کی غلطی نہیں تھی شاید آپ کے ہاتھوں کی غلطی ہو! اب کچھ بھی کہو۔ ایک بار تو چور کہہ لیا۔

پھر کیسے پسند کیا۔؟ اور وہ زور سے ہنس پڑا۔ لیکن نیلو فر کا سر پشیمانی سے جھک گیا۔

کے سلطان سلیم خور

فریاد بھی ہو نغمہ بھی، شعر بھی ہر سانس بھی

(اپنی ان مقبول کے نام جو میمنوں پڑھ کر کچھ سے خفا ہو جائیں)

میر کا ایک سہیلی راز سر بہتہ ہیں، مجموعہ افسانوں میں، پرامرار شخصیت کی مالک ہیں۔ پہلی ملاقات میں ان سے مل کر اکثر ایسی ہوتی ہے۔ نہایت خاموشی، طویل سوالات کا جواب بھی ایک دو لفظ میں اور دنیائی کا کمال ہے۔ چہرے پر عجیب قسم کی مسکراہٹ جس سے دوسروں کے لئے حقارت اور طنز کا پتہ ملتا ہے کبھی کبھی یہ مسکراہٹ تہمتہ بن جاتی ہے۔ سراسر طنز ہے جو کچھ بھونکی چھوٹی روش آنکھیں۔ جو ہر وقت بے چینی سے ٹھوٹتی رہتی ہیں۔ جن میں دوسروں کے راز معلوم کرنے کا بے پناہ جیس ہے۔ وہ دوسروں کے راز معلوم کر کے تشہیر و تباہت پسند کرتی ہیں۔ مگر ان کے راز معلوم کرنا مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن ہے۔ اتنی گہری ہیں کہ کالا ان۔ بعض وقت ان کی گہرائی معلوم کرنے کے شوق میں دوسرے بھاگھو جاتے ہیں۔ دوست بنانے کی بہت شہیاری ہیں مگر جلد ہی ان کا کسی نئی ساتھی کی تلاش میں لگ جاتی ہیں، اس کے باوجود جس سے بھی کچھ دوستی کا عہد کرتی ہیں اسے عمر بھر نباہتی ہیں پھر درمیان میں کبھی ہی سخت جھڑپوں سے ٹھوٹیں ان کے پائے استقامت کو غرض کش نہیں ہوتی۔ ایک چیز سے بہت نفرت کرتی ہیں اور وہ ہے غریب، دوسروں کو بھی نصیحت کرتی ہیں کہ حتی الامکان غریبوں سے نفرت کرو۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ گفتگو کے درمیان غریبوں کا ذکر آ گیا اور وہ خاموش ہو گئیں۔ کہیں کی کچھ نہیں کراچی، ہر پہلی ہنسی کھیرتی رہیں گی، ان کی یہ ہنسی اور اگر کہیں کی بھی تو سراسر طنز، حقارت، غرض عجیب مجموعہ افسانوں ہیں۔

۲

صورت سیرت سے بڑھ کر حسین ہے تو سیرت صورت سے بڑھ کر دشمن، محفل اصحاب میں بہت ہر دلچیز ہیں مجھ پر تو ان کی خاص غنایت ہے۔ میرے دل میں بھی ان کی بہت عزت ہے اور طبیعتوں کے اختلاف کے باوجود بھی ماری ہے۔ کچھ صاف گواہ اور سادہ لوح واقعہ ہوئی ہیں اس پر غضب یہ کہ جو کچھ سنتی ہیں اس پر بغیر کسی تحقیق کے یقین کر لیتی ہیں، پھر اگلے دن کہان کا خیال بدل جاتے۔ چاہے آپ کتنی ہی تحقیق سے ان پر ثابت کریں کہ یہ بات غلط ہے کردہ ہرگز یقین نہیں کریں گی اور انھیں پھر سے شکایت ہی رہے گی۔ ہر دوسرے تیسرے دن یہی ہو گا۔ اب دوستوں کو حیرانی کہ آخر کہاں سے انھیں یہ سب یقین معلوم ہوتی ہیں۔ آپ سوچ کر حیران اور وہ شکایت کر کے۔ چہرے پر ہلاکی سمجھدی مگر ساتھ ہی ہلکی سی نرم مسکراہٹ بھی سنسنیدگی اور مسکراہٹ کا دھنسن افسانہ۔ پہلی ملاقات میں ملنے والے اکثر وہو کھلا جاتے ہیں کیونکہ نہایت کا وہ عالم کہ ایک ایک لفظ سوچ کر کہیں کی گونجنا جب کھلتی ہیں تو بے پناہ ہو کر پھر آپ ان سے زیادہ کسی کو پر مذاق نہیں پائیں گی۔ ان کی فطرت کا یہ رخ مجھ پر ابھی نمایاں ہوا ہے۔

۳

ہمعمان کی تصویر بناتے ہیں بنے یا نہ بنے
دیکھ کچھ گورا اور سرخ رنگ کی سرخی میں کچھ کچھ ہجائی قسم کی روحانیت ہے۔ غمنا ہنستی رہتی ہیں اور ایسا مذاق

کی بات یہ ہے کہ جب بھی ہنسی ہے خلوص دل سے ہنسی ہیں مگر جذبات کے یہ معلوم کس کھیل میں ہارنے کا نتیجہ ہے کہ اب نیکان کی ہنسی کو یہ کیفیت بنائے ہوئے ہے۔ ہر وقت کسی گہری سوچ میں رہتی ہیں۔ کیا لکھو؟ یہ تو ہی جانیں مگر کچھ محسوس درمیا ہے۔ اپنی سہیلیوں کی بہت دلچسپی ہے۔ سہیلیوں ہی پر کیا شخصیت سے بھی ملتی ہیں اس کے بارے میں ہمیشہ اچھی رائے قائم کرتی ہیں۔ جیسی خود نیکان میں وہ کسی سب کو دیکھنا چاہتی ہیں اور جب انھیں تلخ تجربات اٹھانے پڑتے ہیں تو دوسروں کی اصلاح سے ایسے ہو کر میسر رہتی ہیں۔ ان میں ایک صفت بہت اچھی ہے۔ جہاں کہیں دیکھتی ہیں کہ دوسروں کی برائی کی جارہی ہے۔ وہ خاموشی سے اندھ کرتی جاتی ہیں اور اگر نہ بائیں تو بھولی بھالی شکل بنائے خاموش بیٹھی رہیں گی اب آپ ان سے دوسروں کے بارے میں کچھ بھی پوچھیں وہ سوائے تعریف کے اور کچھ نہیں کہیں گی۔ کہتی ہیں۔ دوستی کے تو معنی ہیں کہ درست کی برائیوں کو بھی عزیز رکھیں اور نہ اچھائیوں کو تو سب ہی پسند کرتے ہیں اور کون انسان برائی سے بری ہے۔“

غرض نور سے زیادہ پاکیزہ اور فرشتے سے زیادہ معصوم ہیں مگر نہ جانے معصومیت کے کون سے انوکھے کھیل میں ناکامی ہوئی جس سے ان کے چہرے کی عکاسی میں حزن زیادہ نمایاں ہو گیا ہے۔

بڑی بڑی بھوری آنکھیں جن میں عجیب قسم کا حزن و ملال ایک قسم کی حسرت ہے۔ چہرے پر غم سکر اٹھا۔ ان کے لئے دالوں کو سب سے پہلے ہی چیز متاثر کرتی ہے اور بعد میں وہ خود۔ اکثر لوگ انھیں غلط سمجھ کر ان سے شکی رچتے ہیں کیونکہ انھیں عجیب متغیروں میں ان میں وجود ہیں۔ عام لوگوں کی دنیا سازی اور منافقت سے انھیں بڑی تکلیف ہوتی ہے کیونکہ اکثر وہ اپنے سچ و سچ کو چھپا نہیں سکتیں جو ان کے دل میں ہوتا ہے وہی زبان پر آجاتا یا حرکات سے ظاہر ہو جاتا ہے جس سے اکثر لوگ ناراض ہو جاتے ہیں بغلات اس کے غلوں میں ان سے دور بے کاہنہ اور سی غلوں وہ دوسروں میں بھی دیکھنا چاہتی ہیں۔ جس کی طرف سے ان کے دل میں اچھا گمان پیدا ہو جائے اس کی برائیوں کو بھی نظر انداز کر جاتیں اور ہر وقت اس کی مداخلت کے لئے آمادہ رہتی ہیں۔

بعض ذرا ذرا سی باتیں انھیں سخت پریشان کر جاتی ہیں۔ خاص کر غریبوں کی ذرا سی تکلیف بھی وہ نہیں دیکھ سکتیں اور کسی بڑے سے برا صدمہ بھی ان پر اثر انداز نہیں ہوتا۔

ادب و مطالعہ سے انھیں بے پایان محبت ہے۔ اور یہی ان کے سچے دوست ہیں۔ ان کا ادب مشغلہ کتب بینی ہے۔ ایک چیز ان میں عجیب ہے۔ وہ جس کسی صنعت کے ملازمین اور خیالات سے متاثر ہوتی ہیں اسے دوسروں میں سب سے افضل سمجھتی ہیں اور اس کے بارے میں ذرا سی تنقید بھی براہِ شمت نہیں کر سکتیں۔ دوستوں کی محفل میں انھیں زیادہ موقوت بولتے ہیں کیونکہ وہ تنہائی پسند ہیں انھیں ان محفلوں سے نفرت ہے جہاں سوائے عیش و عشرت کے تذکروں کے اور کچھ نہیں۔ جہاں سرگاہی وادوں کے مظالم، بہا وری کی داستانیں سمجھی جاتی ہیں۔ غریبوں پر ظلم و ستم اور بے بسی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ ایسی کھوکھلی تہذیب سے انھیں نفرت ہے۔ دلی نفرت۔

بہرحال شخصیت کی مالک ہیں انھیں سمجھنا میرے بس کی بات نہیں۔ خوش رہیں گی تو اتنی کہ دنیا میں ہم سے بڑھ کر

انہیں کوئی عز نہیں کران کا زیادہ خوش رہنا بھی نقصان دہ ہوتا ہے کیونکہ نہیں چاہتیں کہ وہ جس سے بھی خوش رہیں ! دوستی کریں اس سے دوسرے لوگ بھی ملیں۔ ان کا یہ بیہناہ مذہب بے شک ہمیشہ دوستوں کو گوارہ ہوتا ہے۔ شریں گفتاری میں سب میں مشہور ہیں گراس شریں گفتاری کے پیچھے کتنے نہر پلوں شہیدہ ہیں اس سے کچھ ہی لوگ واقف ہیں۔ چہرے پر بھولا پن اور معصومیت۔ ان کی یہی معصومیت کو سب کو متاثر کر دیتی ہے اور لوگ ان پر بھروسہ کر لیتے ہیں۔ آپا کتنی ہی سنجیدہ اور اچھ گفتار کو سمجھتے وہ یہ ظاہر آپا کی باتوں سے لاپرواہ رہیں گی مگر ایک ایک لفظ بھروسے کی اور دل ہی دل میں انتہائی مسکرائیں گی۔ جس کا نتیجہ دو محبوب دوستوں میں لڑائی ہو جاتا ہے۔ جانے کیوں یہ کسی بڑھتی ہوئی دوستی اور محبت کو دیکھتے ہیں سنگین اور فوراً الیا کچھ کرتی ہیں کہ جہاں بہت کی فحش ہو ا میں مل رہی تھیں وہاں نفرت کی باوجود دوستی کے نازک پودے کو بھل رہی ہے۔ اس غصب کا تیز دماغ ہے کہ کوئی بھی یہ گمان نہیں کر سکا کہ اچھی کی "عنایت" سے دوستوں میں دشمنی کی بنیادیں پڑیں۔ کیونکہ سب کچھ کرتے ہوئے بھی معصوم اور بھولی ہی رہتی ہیں۔ شاید اسی لئے زمانہ اُن نے کہا ہے کہ "زیادہ دوست نہ بناؤ کیونکہ سچے دوست دنیا میں بہت کم ہوتے ہیں۔"

نجمہ سمیع اللہ شاہ

نذر فانی

ہوش نہیں ہے کب کا مجھ سے عشق کا چھوڑ گیا
دیکھا آغریاں کے ہاتھوں ضبط کا سا چھوٹ گیا
رو بھی نہ سکوں نہ بھی نہ سکوں اوجھنیکی پابندی
جا اسٹک قلم اور کہیں اس لکھرا لکھ چھوٹ گیا
تھا کون؟ کہ جس کا بس ملتا اور راہ نمانی کر لیتا
اس جاہ و قسمت میں آکر انجیہ سارہ چھوٹ گیا
اچھی تو تھی مگر کی اپھانس بھی دل کی اچھی تھی
ظالم کا ہے کو ہاتھ سے تیرے؟ ظلم کا نشتر چھوٹ گیا
اللہ اللہ! اپنا سر بھی مجھ کو وبال دوش ہے جب
کس کو کس کو ڈھونڈوں میں پیر! مجھ سے کوئی گھر چھوٹ گیا
پہلی منزل بھی نہ عدم کی آفرینی تھی کہ کہیں
سختی تھی! جی چل نہ سکا! دو کام ہی چل کر چھوٹ گیا

بیٹھ گیا ہو! جاؤ! اٹھو بھی! راہ لو اپنی! آؤ وقت !!!

ہستی کی اس راہ میں اب تو عیش کا منظر چھوٹ گیا
وقفا آتھوی

گاندھی جی سے خاص عقیدت تھی۔ ان کی دائی ہاتھ کا نوٹ تو بہت
انھوں نے خاص طور سے خریدا تھا جب ننھا دیتو اس کو دیکھ کر
دادا کہتا تو اس کا ذکر وہ دوست احباب میں خاص طور پر
کرتے اور مسرت سے ان کے گورگاہیاں ہونے لگتیں۔ وہ
راہ کوٹ کے بارے میں دامتو اتا سے باتیں کرتے رہے اور
اس میں دس کب بجے اس کی انہیں خبر ہی نہیں ہوتی۔ محبت
جا کر وہ جو کہہ پر بیٹھ گئے۔ پتے پر پیش کی طرح زیادہ چاول
ڈالے گئے تھے۔

یہ تو بہت ہو گیا۔ کچھ کم کر دونا۔

آج روٹی نہیں بکائی؟

ایک ظالم سا ہو کر غلٹ جن نگاہوں سے دیکھا جا
سہان کی نظر میں بھی اسی طرح بیوی کو دیکھ رہی تھیں۔
انھوں نے تیکے اپنے میں کہا کہ ابھی شام کچھ کم ہی ہے۔
صرف آپ تنہا کھائے تو تو بکائی،

میرے لئے یا تمہارے لئے،

بچی..... آج منگل ہے نا،

منگل ہی کا دن سب عورتوں کو برت رکھنا چاہیے،

کیا؟

گھر میں خاموش بیٹھ کر آج تو بچی کس طرح ہنسم کیا

جاٹے؟

ان کی بیوی فوراً سمجھ گئی کہ دست راؤ کا یہ طعنہ آج
روٹی نہ پکانے کی وجہ سے ہے۔ مگر وہ خاموش رہی۔ دست راؤ

گھر سے باہر نکلے تو اپنی بیوی کو برا بھلا کہتے ہوئے مجھے

روٹی پسند ہے یہ تو اسے معلوم ہی ہے اس پر بھی اس کو

پکانا نہیں چاہیے تھا۔ اس کا مطلب..... اس کے معنی

کچھ بھی نہیں..... یہ سچ ہے کہ محبت کا رنگ پتلا شوخ ہوتا

ہے آستا ہی کچا ہوتا ہے۔ شاید ہونے کے ایک دو سال تک

بیوی کس طرح کھیتی پتی تھی۔ اور اب..... اب تو

اس کو میرے آرام کا مطلق خیال نہیں۔ وہ تو میری طرف آنکھ

اٹھا کر بھی نہیں دیکھتی..... پہلے بیان نہیں کھاتا تھا وہ اصل

اس کام میں یہ روٹنے کا آواز کیوں؟ تو بہ..... تو بہ.....
بیاد کہ وقت مرو خیال کرتا ہے کہ دنیا موسم بہار ہے لیکن یہ تو صفر
دسم ہے وہم۔ از دو انڈی زنگی میں گرا۔ اگر اس میں بارش
ہو تو وہ بھی میل بیوی کے جھگڑے سے ہی۔ لیکن کیا اس بارش
سے اور بھی گرمی نہیں ہوتی ہے؟

چراغ کی بجلی کو بھرا کر دست راؤ جب اپنے بستر پر
آئے اس وقت دو بج گئے تھے۔ ہوا سے خود کو مطمئن کرنے
کے لئے وہ کمر کی کلن گئے ابھی ہوا ابھی نہیں رہی تھی۔ سچے
کی کلن کی میں دامتو اٹھ رہے تھے۔

کیا ہے دامتو؟

کیا ہے دست راؤ؟

ان دونوں کا پوچھنا ایسا ہی تھا جیسے دوستی
ایک دوسرے کا مال پر نہیں۔

دست راؤ نے اپنے جیم کو ڈھیلے طور سے بستر پر
ڈال دیا۔ نکلے ہوئے تھے فوراً نیند لگ گئی ان کا دل بیکان ہلک

رہا تھا انھیں کئی خواب دکھائی دے رہے تھے ایک خواب میں

آفس کے صاحب اسے توپ کے ذریعہ کوٹا رہے تھے۔ دوسرے

خواب میں وہ ان کا غذا اٹکے کھینچے دے جا رہے تھے۔ آخری

خواب تو عجیب تھا انھیں ایسا دکھائی دیا کہ وہ گھر ہی میں ہیں

اور ان کا گھر بیکان جیل خانہ میں تبدیل ہو گیا۔ دست راؤ کے

بیکان جیل خانہ کا لباس آگیا۔ ہاتھ میں کٹ کر کرنے والی

گھڑی دے جانے کہاں گئی تھی اور اب گھر کو گھر کرنے والی بیڑی آ

نظر آئی۔ بولے۔ تم پر وہ دار کو دیکھا تو حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی

کہ ان کی بیوی خود یہ فرض انجام دے رہی ہے۔

نیند نہ لے سکی وہ دوسرے دست راؤ آٹھ بجے اٹھے۔

چائے وغیرہ کی کر کے حسب معمول دامتو کے گھر اخبار پڑھنے

کے لئے گئے ان کا دل جہاں گاندھی کے اس بیان پر کہ راجکو

کے معاملہ میں وہ برت رکھنے والے ہیں اسے چین ہو گیا ان کو

لینے کا بھی ہے۔ اسی لئے وینو کا بچہ کم ہونے کے بعد میں
خود اسے تاکہ پرلے گئی وہاں آئی اور چائے بنائی۔

پتی نے ڈاکٹر کی فیس بچائی اور میں.....؟
دست راوتی کے کمروں گئے۔ وینو کے جسم کو ہاتھ لگا کر دیکھا
ابھی وہ گرم تھا۔ وہ پھر سوئی گھریں آئے۔ ان کی پتی کھانا
بھال رہی تھی اور اس طرف ایک اور برتن چاول کے لئے
نظر آ رہا تھا۔ انھوں نے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے
کہا یہ کیس کا؟

آٹھ بیٹے واپس آنے والے ان کے لئے؟

اور یہ چولے پرکا؟

ساڑھے دو بجے واپس آنے والے کا؟

وہ تو بہت تھوڑا دکھائی دیتا ہے؟

آپ کو چاول کہاں بھانے ہیں؟

دست راوتی دو فوٹ پے ہوئے چاول کھا لیں

ضد کی پتی نے پکانی ہوئی چھوٹی سی غولبھوت چپاٹیوں کو
چھوٹے ہی انھوں نے سوچا مردوں کے دکھ ایک پیچے ہوئے
آتش فشاں کے بالائی سطح یا جہان کی طرح ہے، تین عورتوں
کے دکھ اس کے اندر کے جوش نکالتے ہوئے لاوے کی طرح
ہے وہ فوراً دکھائی نہیں دیتا اور محسوس بھی نہیں ہوتا۔

لیکن کیا اس لئے وہ کم گرم ہوتا ہے؟

دست راوتی کی تیلی رولٹی ٹھہر کر صاف صوف کر کے اپنے

کمرے میں گئی، دیکھی کہ وینو بھونے پر نہیں ہے۔ وہ باہر کی

ہو گئی۔ دست راوتی کے کمرے میں آتے ہی وہ ہنسنے لگی، وینو

ان کے پیچھے نے پرور ہاتھ اور وہ ات پیچھے سے ہوا بھل رہے تھے۔

وینو کو لے ہاؤں؟

اوپر؟

کیوں؟

وہ کیا تھا رات بھر کا؟

لیکن یہاں تھیں وہ تو..... سے.....

اس پر.....

سو گئی ہوگی اگر وہ جاگ کر کھانا لایا ہی دے گی تو میں بھی کہوں گا کہ
مجھے بھوک نہیں ایک روز بھوکا رہوں گا۔ اس سے کیا ہوگا!
اس کو آگاہ کر دینے کے لئے کچھ کرنا ہی ہوگا۔ ہاں ہاں ازدواجی
زندگی بھی ایک طرح کی حکومت ہی تو ہے۔ گامدھی بھی کی بھوک
ہڑتال کا اثر نہیں ہوتا کیا؟ پیر..... ازدواجی زندگی میں.....
وہ آٹھ بیٹے کھڑی تھی اس نے خوشی سے کہا کہ
مجھے بڑی مسرت ہو رہی تھی..... دست راوتی سیدھا جانے گئے
وہ بازو ہٹا اور بولی..... میں سادھے میں ہوں، چھوٹا نہیں۔
ابھی میں نے بہت نہیں توڑا ہے۔

دست راوتی جوئے..... یعنی وہ میرے لئے ایک

بھوکا رہی! میں بھوکا رہ کر اس کو سیدھی راہ پرلے آنے والا

تھا لیکن اس نے ہی بھوکا رہ کر مجھے شکست دی لیکن پیچھے

کھلیں کون اثر قبول کرتا ہے؟

دست اس کی طرف آکر بولے یہ کہاں کا برت رکھا

تم نے؟

وہ رسوائی گھر میں جاتے جاتے بولی ایسا نہ کہہو! میں نے

وینو کے لئے باجنگ شکل برت رکھنے کی عزت کی تھی۔ وینو کے لئے؟

ہاں کل رات اسے پھر غارتا یا میں نے فوراً دیوی

انباہائی سے منت کی رات تمام بڑا بے چارہ تھا میری ہی

گود میں تھا۔ مجھے کیوں نہیں بلایا؟

آپ کو دفتر کے ہی تھوڑے کام رہتے ہیں۔ اب تو

آپ دو تین بیٹے تک کا گھنٹے گھے ہیں۔ اگر پریمی بھی ہوئی

تو وہ دو تین کام میں بھی ٹو دو دی ہوئی۔ وہ بولنے بولنے زور

سے ہنسنے لگی۔

دست راوتی نے ابھی کہ آج صبح ان کی بیوی نے

کیوں نہیں پچائی تھی۔ وہ رات تمام جاگتی رہی تھی نا۔ مگر اب بھی

ان کے دل میں ایک گرم باقی تھی۔ انھوں نے کہا میں ڈاکٹر

کو بلانے جاتا ہوں،

اس نے ہنس کر جواب دیا، ڈاکٹر گھر آئے کہ باجنگ

اوپر فیس کے لئے لیتے ہیں۔ ادھر تو آپ کا ارادہ ہی رہتا ہے

۱۱۔ کب کا کسی کے ہاتھ میں دیر یا کیا ہے اور اسی کے ہاتھوں
کا اثر ہے یہ کیوں ہے؟ مشکبک؟
دوست راؤ محبت بھری نظروں سے اپنی بیوی کے قریب
آئے۔ اتنے میں سامنے کی کمرلی میں سے آواز سنائی دی۔
کیا دوست راؤ اب بھی جاگ رہے ہیں۔ بڑی گری ہو رہی
ہے جانی۔
دوست راؤ اپنی کمرلی کے پاس جا کر اسے بند کرتے ہوئے
بولے اچھی۔ کیا ٹھنڈی ہوا ابہر رہی ہے۔
ٹھنڈی ہوا؟ رامونا کا لہجہ ایسا تھا گویا کہ دوست راؤ
پاکل تو نہیں ہو گئے۔
دوست راؤ سب دلوں نے ہو گئے گرجا؟ آج ولی گارڈ
ادو دا جی زندگی کے گڑا میں بیٹھ گئی محبت کے سرو فوجیوں کے پاس ہے
ہی رہتے ہیں۔
(مترجمہ) امجد یوسف ٹی

اس سے کیا ہوتا ہے؟
گرد و خاک کچھ شمار کیجئے گا بھی تو نہیں؟
پھر کیا اس کو بیٹھ گئے؟ دوست بچے تک میں سنا ہوا
گا اس کے بعد کمرے سے لیجائی۔ یہ بولتے بولتے دوست راؤ
کیوں نہیں ہے ان کی بیٹی بچہ گئیں اس کی نیند بہت گہری ہوئی
ہے اس لئے درمیان میں اٹھ کر وہ اسے نہیں لیجا سکے گی۔
لوں کا اسے لگتین تھا۔
دوست راؤ نے گیارہ کے گھنٹے سنے۔ بارہ کے سنے۔
اب ان کی آنکھیں بند ہونے لگیں۔ جانتے ہی وہ ونوکو کچھا
جھپٹے اور پھر ان کی آنکھیں جھپٹنے لگیں۔
ونوکے بن کر باتہ لگا کر اس کی ماں سے کہا خوب
پسینہ آیا ہے۔ آپ کے ہاتھ میں بڑا اثر ہے۔
لیکن میرا ہاتھ کچھ میرا نہیں۔
یہی؟

مرد اقبال پر

جھکی ہے آج مرے پاؤں پر مری تقدیر
کہ خواب شوقِ زیارت کی ہو گئی تعبیر
یہ ہے وجودِ گرامی کے قرب کی تاثیر
کہ ذرہ ذرہ ہے خاک لحد کا بدرِ نیر
و فر شوق میں پلکوں پہ اشک کن سکے
مری عقیدت بیدار تو ہے خوش تقدیر
زباںِ خموش ہے آنکھوں میں آنسوؤں کا کھجما
ہر ایک اشک ہے احساںِ جذب کی تقویر
میں آج اپنی نگاہوں میں سر بلند ہوا
تری بلند مقامی کا صدقہ ہو جائے
ہمارے اوجِ سعادت نصیب ہے
کہ آج سجدہ گہ شوقِ تیری تربت ہے
عبدالعزیز فطرت

تنقید و تبصرہ

قرآنی دنیا مہوار

مدیر ابو محمد مصلح نے کاتبہ دفتر عالمگیر تحریک قرآن مجید حیدر آباد دکن۔
یہ رسالہ خاص قرآنی مضامین شائع کرتا ہے۔ اور
مسلمانوں کو ان کے ذہب و ادنیٰ مسائل سے آگاہ کرتا ہے۔
اس میں بچوں کے لئے بھی چند مضامین شائع کئے جاتے ہیں۔
اس لئے بڑوں اور بچوں کے لئے اس کا مطالعہ مفید ہے۔
ابو محمد مصلح صاحب کا نام اسلامی تحریک کے ضمن میں کافی مشہور
نہایت شہرہ محرم کا ہے جن میں ڈاکٹر ہاشم ابی علی کا مضمون
خاص طور پر نہایت عمدہ ہے۔
مدیر ابو محمد مصلح زیر نگرانی ابو محمد مصلح صاحب
چند سالانہ پانچ روپیہ۔

ترتیب و رسالہ محرم الامام کا شمار ہے۔ اور اسے
تذکرہ حیات عیسیٰ کے لئے مختص کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ
بھی دوسرے مضامین شائع کئے گئے ہیں۔ عورتوں سے متعلق
اسلامی مسائل پر سید محمدی سادھی بحث ہے۔ اور قرآنی تعلیم کو
عام کرنے کی بجائے تحریک کی گئی ہے۔ مسلمان بچیوں کے لئے اس کا
مطالعہ مفید ہوگا۔ "زس"

تنقید پسند ادب

اس کتاب میں اردو ادب کے جدید رجحانات نہایت
بالغ نظری کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں۔ اس کے مولف عزیز محمد
صاحب ادب کے ایک اچھے طالب علم رہ چکے ہیں اور کوشش
چند سالوں میں ان کی چونکا میں شائع ہوئی ہیں ان کے مطالعے
سے پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے مشرقی اور مغربی ادب کا بظرف
غائر مطالعہ کیا ہے اور ان میں تنقید نگاری کی بڑی اچھی مصلحت
موجود ہے۔ چنانچہ زیر نظر کتاب میں بھی تنقید پسند ادب کے متعلق
نہایت مفرد و معلومات صحیح تنقیدی روشنی میں نگہ بند کی گئی ہیں۔

مولف نے پہلے سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ حقیقت
نگاری کیا ہے۔ اس کے بعد انقلابی قدروں کی وضاحت کی
ہے۔ پھر اردو ادب پر جدید تحریک کا جائزہ ہوا ہے اس کو
بیان کر کے ترقی پسند شاعری، افسانہ اور ناول۔ ڈرامہ۔
طرافت اور تنقید پر سیر حاصل تبصرہ کیا ہے۔ یہ کتاب
اس قابل ہے کہ ترقی پسند ادب کے موافق اور مخالف دونوں
قسم کے اصحاب اس کا مطالعہ کریں اور یقین ہے کہ دونوں کا
فائدہ اٹھائیں گے۔

علاؤ اللہ الراشد الخیری

اس مجموعہ میں اردو کے مشہور ادیب علامہ الراشد الخیری
کی ادبی خدمات پر بحث و مباحثہ مسکینوں نے مولفین کے گیارہ تنقیدی
مقالے شائع کئے گئے ہیں۔ اس کے بعض حصے دہلی اردو
کے مشہور انشراح پر دو مثلاً پینڈت برج موہن دتار تریہ کشی۔
مولوی شاد احمد دہلوی۔ ڈاکٹر شمس الدین اختر سہروردی۔ ڈاکٹر
عابدین۔ مولوی نصیر الدین ہاشمی اور ڈاکٹر سعید احمد بریلوی
ہیں۔ اور ان سبوں نے محنت اور تحقیق کے ساتھ الراشد الخیری
کی تحریروں کے مختلف پہلوؤں پر اظہار خیال کیا ہے۔ اس کتاب
میں جو کمی نظر آتی ہے وہ یہ ہے کہ الراشد الخیری کے حالات زندگی
اور اصلاح انہوں نے سلسلے میں انھیں جن دشواریوں کا مقابلہ
کرنا پڑا ان کی تفصیلات درج نہیں ہیں۔ ممکن ہے کہ مرتب
انہیں اس موضوع پر ایک علیحدہ کتاب شائع کرنا چاہتے ہوں۔
اگر ایسا ہو تو اس موضوع کی ایک عمدہ کتاب بن جائے گی۔
از سید حسین قیس شمشوک بک ڈیپو حیدر آباد دکن۔
قیس صاحب حسب آراء کے ہائے لکھنے والے
ہیں اور ان کے بہت سے افسانے مختلف رسالوں میں اب تک
شائع ہو چکے ہیں۔ اس چوتھی کسی کتاب میں ان کے گیارہ
افسانے ایک ایک حصے لکھے گئے ہیں۔ جن میں سے بعض ترجموں
اور اکثر طبع زاو۔ قیس صاحب کے قلم میں روانی ہے اور
خاکہ کے لحاظ سے بھی ان کے افسانے ایک اچھا معیار پیش کرتے ہیں۔

نغمہ جاوید از ناب مرزا جعفر علی خاں اثر لکھنوی۔
۱۰ اشعار محل پبلشرز ممون۔

یہ کتاب دراصل شریذ بلکوت گیتا کا آزاد منظوم ترجمہ ہے۔ بلکوت گیتا کے منظوم اردو تراجم اس سے پہلے بھی شائع ہو چکے ہیں لیکن جعفر علی خاں اثر ایسے اعلیٰ پایہ شاعر کا نتیجہ قلمی ہونے کی وجہ سے یہ کتاب اردو ادب میں خاص اہمیت رکھتی ہے۔ آخر عہد حاضر کے غزل گو شعرا میں ایک استاد کا درجہ رکھتے ہیں۔ بڑی خوشی کی بات کہ انھوں نے بلکوت گیتا جیسی طویل مقدس کتاب کا اردو میں ترجمہ کر کے زحمت بھی کو ادا کی۔ عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ غزل گو شعرا طبیعت طویل نظموں کی طرف مائل نہیں ہوتے۔ لیکن اثر کی اس کا دیکھنے سے اس خیال کو غلط ثابت کر دے۔ اور اس نظم کے پڑھنے سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ یہ کتاب کسی قدیم نظم کا ترجمہ ہے۔ اسلوب بیان اور زبان کی عداوت ہریت میں موجود ہے۔ کتاب کی ابتداء میں متعدد اصحاب مثلاً مرکیب کس نارائن ہاکسر۔ راجہ نریندر ناتھ۔ گنگا کشنکار۔ گنگا ناتھ شرما کی تحریریں بطور تعارف و پیش نظر و رہنما پر شریک کی گئی ہیں جو اثر جیسے اعلیٰ پایہ شاعر کے تعارف کے لئے غیر ضروری بلکہ غیر موزوں نظر آتی ہیں۔

زمین کانپ رہی تھی از سری کرشن سنہا۔ پٹنہ۔
ادبی روشنی حیدر آباد دکن۔

سنہا صاحب جامعہ عثمانیہ کے ایک فارغ التحصیل اور حیدر آباد سیول سروس کے ایک حوال سال دکن ہیں۔ ان کو اردو ادب کا بڑا اچھا ذوق حاصل ہے اور طالب علمی ہی کے زمانے سے انھوں نے مختلف مضامین اور افسانے لکھ کر اس کا ثبوت دینا شروع کیا تھا۔ ان کی پہلی کتاب شائع ہوئی جو جس میں گل آٹھ افسانے ہیں۔ اس کتاب کا مقدمہ جارت چند صاحب لکھنا ہے جس میں انھوں نے بالکل ٹھیک لکھا ہے کہ مصنف کی طرز نگارہیں اور دھماں نگار کی طرح ترقی پسند کہا جائے تو غیر صحیح نہ ہوگا۔ گران کی ترقی پسندی میں وہ

چیز موجود ہیں جس کے باعث آج کل کے اکثر و بیشتر ترقی پسند ادیب یہ عقیدہ کا نشا نہ بنے ہوئے ہیں۔

بزم سخنوران از سید مجتبیٰ حسن جوہر پوری۔ ناشر نسیم ایک پبلیکیشن۔

مجتبیٰ حسن صاحب صنفی لکھنوی کے عقیدت مند شاعر ہیں اور انھوں نے اس کتاب میں سات مختلف عنوانات کے تحت مختلف شعرائے اعلیٰ و اعلیٰ کے کلام کے انتخابات جمع کر دیے ہیں۔ اس قسم کے گلرستے اردو زبان میں اقدم زمانے ہی سے شائع ہوتے رہے ہیں جن میں مولوی الیاس بریلی صاحب کے منتخب نامے خاص طور پر قبولیت حاصل کی ہے۔ یہ مجموعہ بھی اعلیٰ پایہ کا ہے اور مولف کے ادبی ذوق کا ایک اچھا ترجمان ثابت ہو سکتا ہے۔
از مولوی فیصل الدین صاحب پٹنہ۔
۱۰ اشعار حیدر آباد بک ڈپو۔

عہد صنفی کی قدیم تعلیم
اس تذکرہ میں انجمن سلطنت اصغیر سے ۱۳۷۷ھ تک تعلیم و تدریس کے تعلیم یافتہ کے لئے جو شخص کی گئی ہیں ان کا حال بیان کیا گیا ہے۔ اس کا پیش لفظ مولوی سید علی اکبر صاحب نے تحریر کیا ہے اور اس میں مولف کی محنت اور کاوش کی داو دی ہے۔ اس قسم کی کتابیں کسی ملک کی تاریخ کی تکمیل میں بہت عمدہ معاون ثابت ہوتی ہیں۔

پریم کرس از محمد ابراہیم فاروقی۔ ناشر زعفی پریس پرائیون۔

شاہ۔ احمد اظفر فاروقی اور دیگر کے ایک بڑے صوفی گروہ ہیں جو ہندی کے شاعر بھی تھے اور وہ چہن چہن کر تھے۔ سنہ ۱۱۷۷ھ میں پیدا ہوئے اور بارہ بنی میں وفات میں۔ انھوں نے تصوف میں ایک کتاب بھی لکھی تھی جو لغت بلوے و چین کے نام مشہور اور مقبول عوام تھی۔ اس کا ایک قلمی نسخہ مولف محمد ابراہیم صاحب کے ہاتھ لگا تو انھوں نے اردو میں اس کی شرح لکھ کر پریم کرس کے نام سے اس کو شائع کیا۔ مولف نے تصوف کی اصطلاحوں کو سمجھنے اور سمجھانے کا قابل قدر کوشش کی ہے۔ اس کتاب کی اشاعت سے ایک فائدہ یہ بھی ہوا کہ تقریباً

کی ہیں لیکن ان سب میں رہنمائے قرآن کو خاص طور پر اہمیت اور مقبولیت حاصل ہوئی۔

روحِ صہبائی | از خواجہ عبد السمیع ہالی، اخو صہبائی۔
بائش راج محل پیشہ زہجون۔

اخو صہبائی پنجاب کے ایک اچھے شاعر ہیں۔ ان کے کلام میں سوز و گداز اور زندگی و سرمستی کی جھلکیں جگہ جگہ نظر سے گزرتی ہیں۔ ان کے اس مجموعہ میں ان کا جبرست کا کام تاریخ کی ترتیب کے ساتھ جمع کر دیا گیا ہے۔ رباعیاں بھی ہیں۔ نظمیں بھی اور غزلیں بھی۔ پورے مجموعے کو چار حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے اور بغزل یا نظم کے نیچے تاریخ تصنیف بھی لکھی گئی ہے۔ علامہ اقبال کی کتابوں کی طرح اس کتاب کی کتابت و طباعت بھی دیدہ زیب ہے۔

سالنامہ آجکل | دلی سے ایک پندرہ روزہ رسالہ،

ادارت میں شائع ہوتا ہے جس کی ترتیب و تہذیب میں خاص ذوق اور سلیقہ کو ملحوظ رکھا جاتا ہے۔ اس کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس کے ہر شمارے میں اردو کے کسی بڑے ادیب یا شاعر کی تصویر اور حالات بھی شائع کئے جاتے ہیں۔ اور ہر شمارے بالعموم رہتا ہے۔ چنانچہ زیر نظر شمارے میں جوش ملیح آبادی اور ملوک چند محروم کی عمدہ تصاویر کے علاوہ مختلف ممالک کی تہذیب و معاشرت سے متعلق بھی میں پچیس تصویریں شریک ہیں۔ اس کے صفحے والوں میں خواجہ حسن نظامی، جاگیر آزادانہ، تسنیم سیم بخاری، ڈاکٹر انیسار، بادشاہ جیلین خاص کر قابل ذکر ہیں۔ یہ رسالہ اس قابل ہے کہ انگریزی اور دوسری ترقی یافتہ زبانوں کے مفید اور دیدہ زیب رسائل سے مقابلہ کر سکتا ہے۔

تبصرہ حیاتِ شبلی | از محمد امین زہیری، مطبوعہ سنڈل انڈیا پریس بمبئی۔

یہ کتاب دراصل علامہ سید سلیمان ندوی کی مہربان حیاتِ شبلی کے جواب میں شائع کی گئی ہے۔ لیکن اس میں صرف شبلی کی زندگی کے رنگین پہلو کو اجاگر کرنے کی کوشش نایاں ہے۔

ڈیڑھ سو برس پہلے کی ہندی زبان کا ایک اچھا نمونہ منظر عام آگیا جس کی مدد سے لسانیاتی مسائل کے حل کرنے میں سہولت حاصل ہوئی۔

انتخاب اور رائے دہی | از محمد نور اللہ صاحب بی ایس سی، بائش راج محل پیشہ زہجون۔

یہ چھوٹی سی کتاب وقت کی ایک نہایت اہم ضرورت کو پورا کرتی ہے۔ ہمد حاضر میں جبکہ ہر طوائف اصلاحات اور انتخابات کا ہر چاہنے ضروری تھا کہ عوام کو رائے دہی کے طریقہ اور انتخابات کی بات کی ضرورتوں وغیرہ کے متعلق ضروری معلومات ایک کتابچے کی شکل میں شائع کی جائیں اس لئے کہ جب تک عوام کو اس کا علم نہ ہو کہ انتخابات کیا ہیں اور ان کے ضمن میں کون کون سے معاملوں کی تکمیل لازمی ہے اندیشہ ہے کہ انتخابات کا استعمال طلب ثابت ہوگا۔

دامنِ تہی | از سید مبارز الدین صاحب رشتہ نواز، دلی، دانش نکتہ سب راج آباد۔

رشتہ صاحب حیدرآباد کے نوجوان دانشور پرواز ہیں جن کی بعض کتابیں انجمن ترقی اردو دہلی کی طرف سے شائع ہو چکی ہیں۔ زیر نظر کتاب ان کے چند افسانوں کا مجموعہ ہے جن میں سے تین طبع زاد ہیں اور بقیہ تراجم مصنف کی زبان اور بیان کے لحاظ سے یہ مجموعہ قابل قدر اور افسانے کی پسندیدہ۔

لہ نہائے قرآن | مترجمہ ڈاکٹر میر دلی الدین، ناشر ادارہ اشاعت اسلامیات حیدرآباد۔

یہ اصل لٹواب مرزا مست جنگ بہادر کی ایک انگریزی کتاب "این اپروچ ٹو انٹرنیٹ آف آئی قرآن" کا اردو ترجمہ ہے۔ اصل کتاب زیادہ تر غیر مسلم افراد سے مخاطب تھی اور خصوصاً انگریزوں سے جن کی تعلیمات سے مصنف خود واقف نہیں۔ لیکن ڈاکٹر دلی الدین صاحب نے اس کتاب کا اتنا اچھا اردو ترجمہ کیا ہے کہ ہر نوجوان خواہ وہ مسلم ہو یا غیر مسلم کتاب کو دلچسپی سے پڑھے گا۔ ادارہ اشاعت اسلامیات نے اسی قسم کے مفید موضوعوں پر قلیل عرصہ میں متعدد کتابیں شائع

اس چھٹی سی کتاب کا نام بھی تجویز کرتے۔ بظاہر یہ ایک مضمن
سچا اور اس سے علاوہ سلیبان ندوی کی کتاب حیات شمس
کی غلط اور افادیت پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ ”ق“

اور اس لئے مولف نے اس کتاب کا نام غلط تجویز کیا ہے
یا تو وہ جانتی ہے تفصیلی تبصرو کرنے یا اگر ان کا مقصد
کی شخص ایک مکروری کو اچھا نہ تھا تو اسی کی مناسبت سے

ادار کی مطبوعات

مگر گزشتہ حاتم۔ دہلی کے پہلے اردو شاعر استاد شاعر
شاہ غلام الدین حاتم کے حالات زندگی اور اردو فارسی کلام پر
تبصرہ جس کو ڈاکٹر سید محمد الدین قادری صاحب روز نے نہایت
ہی تحقیق و تلاش کے بعد عالمانہ انداز میں قلمبند فرمایا ہے۔
اس چھٹی سی کتاب کے ذریعے سے اردو کے ایک بڑے شاعر
استاد الاساتذہ کی شخصیت اور کردار کے ایسے پہلو روشنی میں
آجاتے ہیں جو ہر زمانے میں معیاری سمجھے جائیں گے۔ ان کی زندگی
کے حالات پر نظر پڑتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ ان کا حال احوال
ایک ہی تھا۔ ان کی زندگی کی طرح ان کی شاعری بھی خلعت اور
نقص سے پاک تھی۔ نثر نگار ادب اور محققین کے لئے یہ اذکار
صفحات (۱۶۰) طباعت و کتابت شدہ دیدہ زیب
(قیمت مال)

تاریخ سیاست۔ از پروفیسر محمد امجد علی صاحب مدنی ایم اے
ایم ایل بی۔ استاد تاریخ جامعہ دہلی۔

اردو زبان میں تاریخ سیاست پر پہلی کتاب ہے جس میں
پروفیسر محمد امجد علی صاحب نے سیاست کی تاریخ کو اپنے خاص پہلو
انداز میں تحریر فرمایا ہے۔ یہ کتاب آپ کی سیاسی معلومات اور
سالہا سال کے تجربوں کا پتلا ہے۔ کالج کے طلبہ کے لئے اس کا
مطالعہ بے حد ضروری ہے۔ صفحات (۲۴۲)

قیمت (تسے)

ملنے کا پتہ۔ سب سب کتاب گھر نعمت منزل خیر آباد
حیدر آباد وکن

انقلاب آب و ہوا ہے

لیکن اس انقلابی سیاست کو سمجھنے کے لئے اور موجودہ
دور کے پیچیدہ مسائل کے فہم و ادراک کے لئے کافی سیاسی
مطالعے کی ضرورت ہے

مشہور سیاسی رسالہ نئی زندگی

یہی اردو کا واحد ماہنامہ ہے جو محض سیاست پر بحث کرتا ہے
کلی اور بین الاقوامی مسائل پر بحث کرتا ہے۔ اس کے مدیر صاحب
ہر ہفتے نئی زندگی میں شائع ہوتے ہیں۔ موجودہ دور کا
سالانہ چہندہ ششماہی سالانہ سے نوے کے لئے
چھ روپے تین روپے پانچ روپے (۱۹۳۶ء) درج کر کے

نئی کتاب وزارتی مشن

ادارہ نئی زندگی نے بڑی جانفشانی سے وزارت مشن
کے متعلق تمام مواد جمع کر کے یہ دلچسپ کتاب مرتب کی ہے
تمام پیچیدہ مسائل پر یہ ماحصل تبصرو کیا ہے۔ یہ کتاب کو
بہندوستان کی گزشتہ سوچ کے سیاست کا پتلا ہے
۱۰۰ نوٹ بک۔ صفحات ۲۲۵

قیمت

الہ آباد

فیروز آباد نئی زندگی

مستقل خریدارین جائیں

ادارہ ادبیات اردو کی کتابیں

ردیف	ردیف	نام کتاب	قیمت	ردیف	نام کتاب	قیمت
۳۸	۱۲۸	سچ کا جادو	۰.۰۲	۱۲۸	سرگشت خاتم	۰.۰۲
۹۸	۹۴	طبیعیاتی کائنات	۰.۰۸	۹۴	سرگزشت غالب	۰.۰۸
۱۲۳	۳۰	متاع سخن	۰.۰۹	۳۰	نظام الملک	۰.۰۳
۱۲۲	۳۳۰	کیف سخن	۰.۰۸	۳۳۰	قاریم گوگندہ	۰.۰۸
۱۲۷	۱۹۰	بادۂ سخن	۰.۰۱	۱۹۰	ریڈیو نمبر (۸ تصاویر)	۰.۰۱
۱۵۲	۱۲۰	سراج سخن	۰.۰۱۲	۱۲۰	اردو زبان چٹ	۰.۰۱۲
۱۴۰	۴۸	ایمان سخن	۰.۰۴	۴۸	سونیلی مان	۰.۰۴
۱۲۴	۱۹	فوض سخن	۰.۰۲	۱۹	سر سید احمد خان	۰.۰۲
۵۰۰	۴۸	مرتبہ سخن جلد اول (۵۵ تصاویر)	۰.۰۶	۴۸	سر سالار جٹ	۰.۰۶
۴۳۲	۱۲۵	" " " دوم (۵۰)	۰.۰۴	۱۲۵	عربی تصانیف کے اردو تراجم	۰.۰۴
۱۷۵	۲۶۸	نقد سخن	۰.۰۴	۲۶۸	معجزہ کی چھاؤں	۰.۰۴
۲۴۸	۱۱۲	نذر ولی	۰.۰۴	۱۱۲	اقبال نمبر	۰.۰۴
۱۹۲	۲۳۰	گرم و نیم	۰.۰۳	۲۳۰	سائنس کے کوشش	۰.۰۳
۱۸۳	۳۰۰	مشاہیر قندھار دکن	۰.۰۸	۳۰۰	شعرا عثمانیہ	۰.۰۸
۱۴۵	۱۹	من کی دنیا	۰.۰۲	۱۹	مکزیات شاد عظیم آبادی	۰.۰۲
۱۹۶	۲۰۰	مدارس میں اردو	۰.۰۲	۲۰۰	نادا بھائی	۰.۰۲
۱۱۲	۸۵	مہر دم	۰.۰۲	۸۵	اردو نامہ	۰.۰۲
۱۵۳	۴۰	ذکر دکن	۰.۰۱	۴۰	مدون رباب	۰.۰۱
۱۴۰	۵۶	روح غالب	۰.۰۹	۵۶	عماد الملک	۰.۰۹
۲۰۰	۵۶	عاصم	۰.۰۹	۵۶	اردو سالی کی پہلی کتاب	۰.۰۹
۵۶	۲۰۰	دبیری معلومات	۰.۰۹	۲۰۰	دبیری کتاب	۰.۰۹
۴۸	۱۴۰	آبدوز کشیاں اور سرنگ	۰.۰۲	۱۴۰	محمد حسین آزاد	۰.۰۲
۱۴۳	۹۲	اردو مثنوی کا ارتقاء	۰.۰۴	۹۲	غند کی ناؤ	۰.۰۴
۲۱۹	۱۴۳	نمود زندگی	۰.۰۱۲	۱۴۳	فن تعمیر	۰.۰۱۲
۳۰۰	۱۴۰	سرگزشت ادارہ	۰.۰۱	۱۴۰	معدسہ تاریخ دکن	۰.۰۱
۳۱۲	۸۰	میر محمد مومن (۲۳) تصاویر	۰.۰۸	۸۰	غذو و حقانی معدن	۰.۰۸
۳۲	۱۰۰	بقلاں	۰.۰۱	۱۰۰	یودون کی کہانی	۰.۰۱
۱۱۳	۱۰۰	خطابات	۰.۰۱	۱۰۰	سم نعا	۰.۰۱
۱۵۰	۳۸	علم خانہ داری	۰.۰۹	۳۸	پانی کی کہانی	۰.۰۹
۱۱۸	۳۹۰	چھوٹی (۱۹) تصاویر	۰.۰۸	۳۹۰	رسائل طبیب	۰.۰۸
۱۶۸	۳۰	انوار	۰.۰۴	۳۰	سلک گوہرین	۰.۰۴
۸۰	۱۷۲	دشمن دانی (۳) تصاویر	۰.۰۸	۱۷۲	تاریخ ادب اردو	۰.۰۸
۱۴۸	۵۶	گارسن دقاسی	۰.۰۸	۵۶	اشوک اعظم	۰.۰۸
۱۹۸	۸۳	رات کا بھولا	۰.۰۱	۸۳	پانی	۰.۰۱
۲۴	۲۱۸	سکندر جاہ	۰.۰۸	۲۱۸	یورپ جٹ سے پہلے	۰.۰۸
۵۲	۱۷۹	بلاغت	۰.۰۸	۱۷۹	شہنشاہ	۰.۰۸
۲۰۰	۱۰۲	ادارہ ستمبر ۱۹۴۱ء میں	۰.۰۱	۱۰۲	اریائی زبانیں	۰.۰۱
۲۴	۳۰	ناصر الدولہ	۰.۰۴	۳۰	ظام علی خان	۰.۰۴
۳۲	۲۹۰	افضل الدولہ	۰.۰۵	۲۹۰	مدبرہ اردو خطوط جلد اول	۰.۰۵
۳۲	۵۶	نواب میر محبوب علی خان	۰.۰۱	۵۶	عرب اور عربستان	۰.۰۱

سبیل



ادارہ ادبیات اردو حیدر آباد دکن کا ماہنامہ

زیر نگرانی
ڈاکٹر سید محی الدین قادری نور
مجلس ادارت
خواجہ حمید الدین ایم اے
سکینہ بیگم

سب اس

شان بابہ اسمعیلیہ ۱۵۳
شان بابہ برطانیہ ۳۹۵۰
سیلفون نمبر ۲۲۰۹
چند سالانہ جاریہ آٹھ آنے
بچوں کا سب اس اگر دیکھ آئے

جلد ۹ بابت ستمبر ۱۹۴۶ء شماره ۹

فہرست مضامین

۲	جگر مراد آبادی	تجلیات (غزل)	۱
۳	ابوالفضل ایم اے پگوار دار العلوم کالج	عربی ادب عہد نبی امیہ میں	۲
۸	صاحبزادہ میکیش	ذوق سفر (نظم)	۳
۹	سید مبارز الدین رفعت ایم اے پگوار دار العلوم کالج	داستان (فناں)	۴
۱۱	سیدہ بدر رفیعہ	بغاوت اور موت (فناں)	۵
۱۶	پروفیسر عبدالحمید خاں شعبہ فارسی جامعہ عثمانیہ	علی گڑھ کے چند فارسی خطوط	۶
۲۸	رشید قریشی ایم اے	جھنگار (فناں)	۷
۳۲	ادارہ	حیات محمدی قلی قطب شاہ کے متعلق رائیں	۸
۳۳	باریڈی بی اے	ہماری قوی زبان	۹
۴۲	جبریل (جیلپور)	آسرا (نظم)	۱۰
۴۳	محمد جمال الدین حیدر	قصہ شاہ داؤد	۱۱
۵۲	منظور احمد القدر قریشی	غزل	۱۲
۵۳	ق	تحقیق و تبصرہ	۱۳

خواجہ حمید الدین شاہ ایم اے کے اہتمام سے دستگیری پریس میں چھپ کر فوٹو ل خیریت ہوئی

تجلیات

غم ہے کیا، زینہٴ صفات و ذات غم نہیں ہے تو آرزو۔ نہ حیات
 نغمہٴ آرزو و رقصِ حیات محب عاشقانِ خوش اوقات
 تو محبت کو لازوال بنا زندگی کو اگر نہیں ہے ثبات
 آرزو ہر نفسِ حیات و مرگ عاشقی بے نیازِ مرگ و حیات
 باتوں باتوں میں آج تو سرِ زم کہہ گئے وہ ہر ایکِ دل کی بات
 آپ جو کچھ کہیں محب، لیکن آپ پر بھی ہیں چند الزامات
 ہم نے دیکھے ہیں جاگتے ہوئے دل ہم سے پوچھوستم کے احساسات
 عشق وہ تشنہٴ کام ہے کہ جسے زہر کا گھونٹ بھی ہے آبِ حیات

اے کمالِ سخن کے دیوانے

ماورائے سخن بھی ہے اک بات

جگر مراد آبادی

عربی ادعیا بنی امیہ میں

(۳۲ء سے ۳۳ء تک)

خلفاء بالکل خود مختار اور مطلق العنان تھے۔ سب سے بڑھ کر خلافت راشدہ کے تمام کام دینی اصولوں پر ہی احکام اور خدا اور رسول کے فرامین کے مطابق ہوتے۔ مگر شاہان بنو امیہ ان اصولوں کی پابندی پر مجبور نہ تھے۔ یہی وجہ تھی کہ جن کی بنا پر ابتدائے اسلام کی حق پرستی ساؤ کی راستی اور راست باقی اس عہد میں بالکل نہیں تو بہت کچھ غائب ہو گئی۔

سیاسی اعتبار سے اموی حکومت کامیاب کہی جائے یا نہ کہی جائے لیکن علمی سرپرستی اور علم و فہم کی منک اس کی مثال قابل تقلید ہے۔ علوم و فنون کی سرپرستی اور ان کی ترقی میں بنو امیہ کے ہر خلیفہ نے کچھ نہ کچھ حصہ لیا۔ خصوصاً شاعری اس عہد میں خوب چلی بھولی۔ اس عہد میں شاعروں کی قدر و منزلت ہونے کے کئی وجوہ میں بعضیں آگے بیان کیا جائے گا۔

اموی حکومت کے آتے ہی قابل عرب میں پہلی مرتبہ بھوٹ پڑ گئی۔ اسلام نے اگر جہاں ہزار ہا قابل اور متقدم قوموں میں یگانگت اور اتحاد کی روح پھونک دی تھی وہاں اب سلطنت کی خواہش نے عرب کے ان جنگجوؤں میں پھر اختلافات کا بیج بویا۔ ہر قبیلہ اپنی پرانی روایات کو دہرانے لگا اور اپنے قدیم عز و شرف پر ناز کرنے لگا۔ اصل میں دیکھا جائے تو ان جنگجوؤں کی بناو حضرت عثمان کی شہادت سے ہوتی ہے۔

اسی واقعہ فوج کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرف دلوں کی ایک جماعت بن گئی اور دوسری حضرت معاویہ کی حق کی ان کی لڑائیوں کا سلسلہ بہت زمانہ تک جاری رہا۔ جس کے آخر میں تاریخ اسلام کا وہ خوشحال اور دھو گدازہ واقعہ پیش آیا جسے ساری دنیا "سانحہ کربلا" کہتی ہے۔

خلافت راشدہ کے خاتمہ پر عرب کے سیاسی حالات میں پھر ایک انقلاب رونما ہوا۔ حضرت معاویہ جو اپنی سیاست وانی اور تدبیر کے بل بوتے پر اب تک صرف گورنر بن سکے تھے، اب موقعہ پا کر انھوں نے اپنی سلطنت کی بنیاد ڈالی۔ خلافت کے حاصل کرنے کی اس کوشش میں انھوں نے متحقیق یعنی اہل بیت ہی سے جنگ کی اس سلسلہ میں انھوں نے اسلام کے بنیادی اصولوں سے انحراف کیا یا نہیں یہ ہمارے بحث سے خارج ہے البتہ یہ ضرور ہے کہ خلافت کو تبدیل کر کے انھوں نے بادشاہی کی بنیاد ڈالی۔

اموی حکومت شام میں قائم ہوئی جس کا دار الخلافہ دمشق قرار ملا۔ اہل شام نے معاویہ کے ہاتھ پر سلسلہ میں بیعت کی اور انھیں اپنا خلیفہ تسلیم کیا۔ عرب کی اس جدید خلافت میں شخصی حکومت کی پوری نشان نمایاں تھی۔ حضرت معاویہ کے بعد یہ سلطنت نہایت کمزور اور کوتاہ اندیش حکومتوں کے ہاتھوں میں چلی گئی۔ صرف عبدالملک بن مروان (۶۸۵ء سے ۷۰۵ء تک) اور حضرت عمر بن عبدالعزیز قابل حکمران گزرے۔ بالآخر سلسلہ میں خلافت عباسیہ کے بانی کے ہاتھوں اس حکومت کا خاتمہ ہو گیا۔

اموی حکومت اور خلافت راشدہ میں بعض اختلافات بھی نمایاں ہیں۔ مثلاً خلافت راشدہ میں خلافت کی بنیاد عوام کی پسند پر تھی۔ سب لوگ شور اور رائے سے جیسے منتخب کرتے وہی خلیفہ ہوتا تھا جس کے بنو امیہ میں سلطنت دست پرست چلی آتی رہی۔ خلفاء راشدین عوام کے شعور اور دھوکے اسلامی امور کی پابجائی کرتے لیکن خاندان امیہ کے

کے نام سے یاد کرتی ہے۔ وہ پھول جواب تک سیاست کے میدان میں چند حادثوں تک محدود تھی اب عوام میں پھیل گئی، حتیٰ کہ بچہ بچہ اس سے متاثر ہونے لگے بغیر نہیں رہا۔

اس عہد میں فتوحات کا سلسلہ بھی جاری رہا چنانچہ کئی نئے ممالک اس زمانہ میں مغربوں نے اسلام میں شامل ہوئے جو ممالک خلافت راشدہ کے زمانے میں پوری طور پر فتح نہ ہو پائے تھے یا فتح ہونے کے بعد بھی جہاں پوری طور پر قبضہ نہ ہو سکا تھا وہاں اسی میں اسلامی تصرف میں آگئے اس کی وجہ سے سلطنت کا خزانہ متعمر اور رعایا میں آسودہ حالی برپا ہوئی۔ دمشق کو دہن کی طرح آراستہ کیا گیا۔ نئے شہر بنائے گئے باغ لگوائے گئے۔ نہریں اور کنوئیں کھدوائے گئے۔ بڑی عالیشان اور خوبصورت عمارتیں، مساجد اور گاہ سراں، پل، منار اور محلات وغیرہ تعمیر کئے گئے۔ عرض فساد و بد امنی کے ساتھ جیسی کہ فوج

کی فتوحات و دوسری ایسی ہی اندرونی سرگرمیوں کی وجہ سے پیدا ہو گئی تھی، ملک میں خوشحالی اور آسودگی پھیل گئی تھی۔ عرب بدوی پہلی مرتبہ اپنے بے برگ و گیاہ صحرائوں کو خیر باد کر کے اموی بادشاہوں کی سرپرستی کے نومحرم شہر دہلی میں جا بسے۔ یہ صحرائی، شہری زندگی سے اور ایسے وحشی تہذیب و تمدن سے آگاہ ہونے لگے۔ دولت کی فراوانی سے عوام کا معیار زندگی بلند ہو گیا۔ ان وجوہ کا اثر لوگوں کے خیالات پر پڑا جس کا عکس ادب کے ہر محکمے اور تحریر کے ہر پارے میں اچھڑا۔

اس زمانہ کے ادب کو ہم دو حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔

(۱) جدید ادب جس میں حسب ذیل علوم شامل ہیں۔

(۲) علوم اسلامی مثلاً علوم القرآن، حدیث،

فقہ، تفسیر وغیرہ۔

(ب) علوم سانی مثلاً لغت، نحو وغیرہ۔

(ج) تاریخ و جغرافیہ وغیرہ۔

(د) وہ علوم جو زمان، فارس اور ہند وغیرہ

ادب عربی میں منتقل کئے گئے۔

(۲) قدیم علوم و فنون جو جہالت اور امام راشدین

و دونوں میں موجود تھے جیسے لغت، خطابت، اشعار وغیرہ۔

علوم و فنون کی مندرجہ بالا فہرست میں بعض علوم

بھی ہیں جن کی اس زمانہ میں حقیقی معنوں میں بنیاد پڑی

اور جن کی ترقی عہد عباسی میں ہوئی جیسے ہی علوم اسلامی

ہیں۔ بلکہ ایک لحاظ سے ہمارا یہ کہنا بالکل حق بجانب

ہو گا کہ جدید ادب کی صورت بنیاداً اس زمانہ میں رکھی گئی۔

یہ واقعہ ہے کہ علوم و فنون کی حالت بالکل انسانوں کی ہی

ہے کہ انھیں کی طرح علوم کی زندگی بھی ہوتی ہے یعنی پہلے تو

وہ نگویں پاتے ہیں۔ جل طرح کہ بچہ پیدا ہوتا ہے اس کے

بعد وہ بچہ ترقی کرتے ہیں پھر پورے شباب پر آتے ہیں۔

یہاں تک کہ وہ کمزور ہو جاتے ہیں اور بالآخر بوڑھے

ہو کر ادب کے آسمان سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہو جاتے

ہیں۔

انہوں ہی کی طرح ان کے بھی بڑھنے اور گھٹنے

کے لئے دو چیزیں ضروری ہیں۔ زمانہ اور ماحول!۔

انھیں کو پیش نظر رکھ کر ہم ان علوم کی تفصیلات پیش

کریں گے۔

عربی ادب کے مرکز

جس طرح ادب اردو میں

دہلی اور کلکتہ کی علمی مجالس

اور مقبض تاریخ ادب اردو میں علمی یا دو گارن گئیں، یہی

حالت عربی ادب کی تاریخ میں مصر اور کوئٹہ کی ہے مگر

ان کی اہمیت اور دو گہ ان ابتدائی گہواروں کے مقابلہ

میں بہت زیادہ ہے۔ عربی ادب، لغت، شعر و شاعری

غلام غباری البیہ کی سرپرستی میں ان شہروں نے اتنی ترقی کی کہ دور دور کے لوگ انھیں دیکھنے اور یہاں کی علمی و تجزیوں میں حصہ لینے کے لئے آتے۔ علم و ادب کے یہ مرکز تاسخ میں ابھی آپ ظہور نہیں۔ ان کا تذکرہ یہاں اس لئے ضروری تھا کہ جدید عربی ادب بلکہ کل ادب عربی پر جو اسلام کے بعد تیار ہوا ان مقامات کا بجا اثر پڑا اور اس عہد کے علوم و فنون کے تذکرہ میں ان کا ذکر آنا نہایت ضروری ہے۔

اسلامی علوم اسلامی علوم میں سب سے پہلے قرأت قرآن کا نمبر آتا ہے عرب میں چونکہ بڑے اچھے لوگ بہت کم ہوتے تھے اور خصوصاً قرآن کے حفاظ اور اس کی قرأت کے سہرا لگتی کے ہوا کرتے تھے اس لئے امتیاز انھیں "القرآن" کہا جاتا تھا جس کا ذکر پہلے آچکا ہے۔ قرآن شریف کی باقاعدہ تدوین کے بعد بھی قرأت کے اختلافات کا سلسلہ قائم رہا۔

فتوحات کی وسعت کے ساتھ مسلمان اقصائے عالم میں پھیلنے گئے اور ان میں بھی ہر قبیلہ اور عرب کے ہر خانہ ان کے لوگ شامل ہوتے جن کی لغتوں میں ابتدا ہی سے جزوی اختلافات موجود تھے۔ پس یہ اختلافات نئے ماحول کے اثرات اور نئی زبانوں کے اختلاف کی وجہ سے ہر جگہ قرأت میں ایک خاص رنگ پیدا ہو گیا۔ چنانچہ قرآن کی عہدوت کو سات طوطیوں سے پڑا جاتا تھا اور ہر ایک میں صیغہ قرأت لکھی اور ہر جو صیغہ میں ہر صیغہ میں ایک لفظ تھا۔

عبداللہ بن کثیر المتوفی ۱۲۰ھ
عاصم بن ابی الجوز المتوفی ۱۲۱ھ
عبداللہ بن عامر المتوفی ۱۲۱ھ
یزید بن الققعاع المتوفی ۱۳۲ھ
حمزہ بن حبيب المتوفی ۱۵۰ھ
ابو عمرو بن العلاء المتوفی ۱۸۰ھ

ادعو کا ایک مائتہ از حصہ انھیں دو مقامات کا رہنما تھے۔ یہ بصرہ اور کوفہ کی بناء کا بھی عجیب حال ہے۔ یہ دونوں مقامات آباد تو ہوئے فوجی ضروریات کے تحت لیکن زمانے انھیں علم و ادب کے مرکوزوں میں تبدیل کر دیا۔ ابتدائے اسلام میں جبکہ فتوحات کا سلسلہ جاری تھا اور مقبوضات میں روز بروز اضافہ ہی ہوتا چلا ہلا تھا اس وقت پائے تخت سے بروقت فوجیں روانہ کرنے اور واپس لانے میں وقت ہوتی تھی اور دوسرے یہ کہ دور دراز کے علاقے آسانی سے قابو میں نہیں رکھے جاسکتے تھے اور ان کے سرکش ہونے کا خطرہ ہر وقت نگار ہوتا تھا اسی لئے جا بجا فوجی چھاؤنیاں بنائی گئیں جن میں ہمیشہ فوج رہا کرتی تھی۔

جب یہ چھاؤنیاں خوب آباد ہو گئیں اور یہ فوجی مرکز بنے شہروں میں بدل گئے اور ان میں کم سوکرا لاخر امن کا زمانہ آگیا تو ان کی حالت بھی بدلتی گئی۔ ہر جگہ فطرتاً شعریہ واقع ہوئے ہیں۔ اسی لئے وہ کسی موقعہ پر بھی (خواہ وہ جنگ ہی کا کیوں نہ ہو) اپنی اس عادت کے پورا کرنے میں پس و پیش نہیں کرتے۔ یہی وجہ تھی کہ ان مقامات میں پہلے پہل شعرو شاعری کے مقابلے ہوا کئے پھر ہر قسم کے ادبی مناظرے اور بحثیں وغیرہ ہونے لگیں حتیٰ کہ ان اغراض کے لئے باقاعدہ انجمنیں اور مجلسیں قائم ہو گئیں اور جاہلیت کی طرح اسواق بھی بن گئے۔

بصرہ کے مشہور سوق مرید کا نام اس سلسلہ میں بیکھر مشہور ہے۔ یہاں ہر قسم کے علمی و ادبی مشا کا تذکرہ ہا کر سکتا۔ مشہور شاعری کے معرکہ الادار مقابلے بھی یہیں ہوا کرتے اور بعد میں چل کر لغت اور نحو کا بھی یہ قدروست مرکز قرار پایا۔ اس کی حالت جاہلیت کے "سوق عکافہ" سے اتنی شاہد ہو گئی کہ اسے "عکافہ الاسلام" کہنے لگے۔

اختلافات پیدا ہو گئے، ان میں مختلف جماعتوں نے اپنی اپنی تائید کے لئے نئی نئی احادیث کو گھڑنا شروع کیا، اصل احادیث ہی سے اپنی مطالب کی باتیں نکالا کرتے جیسے کہ خوارج کے مقابلہ میں مہلب بن ابی صفرو کیا کرتا تھا۔ یہ اختلافات اتنے شدید ہو گئے کہ اصل احادیث کی تحقیقات کے سلسلہ میں یہ فن حدیث کی بنا پر لڑی۔ اسی زمانہ میں حدیثوں کے مختلف نام قرار پائے مثلاً صحیح حسن، ضعیف، مرسل، منقطع، مفصل، شاذ اور غریب وغیرہ اس عہد کے مشہور محدثین میں شعبیہ بن الحجاج المثنوی سلسلہ خاندان الخوار المثنوی سلسلہ

ابوالعزم اور عاصم بن سلیمان المثنوی سلسلہ وغیرہ بہت مشہور ہیں۔ تفسیر کی طرح اس کی ترقی بھی عصر عباسی ہی میں ہوئی۔

فقہ اسلامی قوانین اور احکامات فقہ کی صورت میں جلوہ گر ہوئے۔ قانون سازی میں گو اہل یونان اور ایک مذہب اہل روم بھی عربوں سے آگے رہے ہیں مگر جس کمال پر اسلام نے اس فن کو پہنچایا اس کی نظیر آج تک دنیا کی بڑی سے بڑی قانون قوموں میں بھی نہیں ملتی۔

شخصی تنازعات اور باہمی مناسبات کا فیصلہ بنیادیت وغیرہ کے ذریعہ ہوا کرتا تھا لیکن جب اسلام نے ہر چیز کی منظم اور مدون شکل پیش کی تو عوام کے جھگڑوں کے تسلیہ کے لئے بھی کسی ایسے ہی با اصل فن کی ضرورت درپیش ہوئی جس کے لئے سب سے بہتر ذریعہ ان کے پاس خدا سے عروبل کے احکامات کی صورت میں موجود تھا اس کے بعد قرآن میں مصطفویٰ ان کی ہدایت کے لئے موجود تھے۔ چنانچہ یہی ہوا مسلمانوں نے تقاضا کے فیصلوں کے لئے قرآن اور حدیث سے ہی کام لینا شروع کیا اور یہ فن آگے چل کر

اولاد بن عبد الرحمن المثنوی سلسلہ وغیرہ ہیں۔

تفسیر قرأت کے بعد تفسیر کا نرا نام ہے اسلام کے ابتدائی ایام میں جب قرآن کی سورتوں اور آیتوں کے معانی کے سمجھنے میں وقت ہوتی تو لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے استفسار کرتے اور آپ نہایت آسانی سے ان کے مشکوک رُفع فرمادیتے اس کے علاوہ قرآن چونکہ قریش کی لغت ہی میں نازک ہوا تھا اسی لئے ان کو اس کے سمجھنے میں زیادہ مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا تو یہ مجیدہ سورتوں اور آیتوں کے جو معانی اور مطالب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان کئے تھے انھیں صحابہ نے اور پھر ان کے بعد ان کے تابعین نے محفوظ کر لیا اور یہ سلسلہ اب بھی چلا۔ یہی تفسیر کی بنا ہے۔

اس کے بعد قوامین اور احکام کے وضع کرنے میں جب قرآن سے مدد لینے کی ضرورت لاحق ہوئی تو ساتھ ہی مفسرین کی بھی ضرورت پڑی جو شکل عبارت کے مطالب مل کر لے اس مخصوص میں پہلے حضرت ابن عباسؓ جنھوں نے قرآن کی سب سے پہلے تفسیر کی اور دوسرے مجاہد المثنوی سلسلہ کے نام خاص طور پر یاد رکھنے کے قابل ہیں۔ لیکن ہم بلا خوف و خطر کہہ سکتے ہیں کہ تفسیر کے فن کی صرف بنا اس عہد میں پڑی اور اس کی ساری ترقی مصر جیسا ہی ہوئی۔

حدیث کلام الہی کے بعد مسئلوں کے نزدیک سب قابلِ ذکر اور قابلِ احترام اگر کوئی چیز ہے تو وہ اقوال رسول اکرم ہیں۔ آنحضرت نے مسلمانوں کو قرآن شریف کے مطالب کے ادراک اور دیگر دنیوی امور کی رہبری کے لئے زمینِ مصیبتیں فرمایا کرتے یا زندگی کے اہم ترین مسائل کے حل چند عام فہم اور عمومی الفاظ میں فرما دیتے اور یہ جو اس بارے میں مسئلوں کے مصائب میں مسیح ہدایت کا کام کرتے۔

حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد جو سیاسی

فقہ کی صورت میں تبدیل ہو گیا۔

زبان کو پوری طور پر ترقی کرنے اور اس کے تمام محاورات اصطلاحیں روزمرہ ضرب الامثال اور دوسری ایسی ہی چیزوں کے جاری ہو جانے کے بعد انہیں کی بنیادوں پر نئی عبارت لکھ دی گئی۔ عرب اپنی زبان اور اپنی قوت لفظی پر بہت غرور کرتے چلے آئے ہیں حتیٰ کہ وہ اپنے سوا ہر ایک کو ”گوڑا“ کہا کرتے۔ ان کے تعلقات جب غمبیں سے ہونے لگے اور حکومت میں اہل فارس اور ایران بھی شریک ہو گئے تو اس اختلاف کا ان کی زبان پر اثر پڑنے لگا۔ عرب یہ نہیں چاہتے تھے کہ ان کی لغت میں کسی قسم کی خرابی ہو۔ کلام راعیاب لگانے کا قاعدہ گوان کے پاس پہلے سے ہی موجود تھا۔ لیکن اتنی سی مخالفت زبان کی صورت کے لئے ناکافی تھی۔

اور دوسرے یہ کہ موالی اور فارس کے تو مسلم عربی لغت کی نزاکتوں اور پیچیدگیوں سے قطعاً ناواقف تھے انہی گفتگو میں بہت غلطیاں کرتے انہیں وجہ تھی۔ تاہم جو کربوں نے نئی اصول گہرائی شروع کیے۔ علم عربی کے اہل الاسود الدؤلی ہے جن کا انتقال ۱۱۰۰ھ میں ہوا۔ یہ تابعین کے گروہ میں بہت بڑی شخصیت کا مالک تھا۔ حضرت علی کے ساتھ جنگ مہین میں حصہ بھی لیا اور پھر بصرو میں آکر رہنے لگا۔ زیادہ اہم ابیہ والی عراقی (بصرہ و کوفہ) کے سامنے جس نے جب اس نے پہلے پہل اپنی اس ایجاد کو پیش کیا تو اس نے کچھ اتفاقات سے کچھ مکر حالات سے مجبور ہو کر اس نے نئی کتاب لکھنے کی اجازت دے دی۔ ابوالاؤد نے نہایت محنت سے ایک قواعد مرتب کی جس کے اجزاء مختلف اشیاء پر تحریر کئے۔

الفصل
الواجب (باقی آئندہ)

اسلامی سلطنت کی وسعت کے ساتھ ساتھ فقہ نے بھی ترقی کی۔ ہر بڑے شہر اور شہرہ مقام میں فقہیاد علم موجود ہوتے جن سے شرعی امور متعلق ہوتے۔ فقہ کی بنیاد اصل میں دیکھا جائے تو خلفاء راشدین کے ہاتھوں بڑی کیونکہ مسلمانوں کے کل مسائل کے فیصلے دیے گئے تھے اور ان ہی شرعی اصولوں پر ان کے بعد صحابہ کا فہر آتا ہے ان میں عبدالرحمن بن عوف، ابی بن کعب، عبداللہ بن مسعود، معاذ بن جہیل، عمارہ بن یاسر حذیفہ، زید بن ثابت اور ابو موسیٰ اشجری وغیرہ بہت مشہور ہیں۔

عبدالاموی میں یعنی یحییٰ بن یحییٰ بن سعید بن المسیب، ابو بکر بن عبدالرحمن قاسم، عبید اللہ عروہ، سلیمان اور خارجہ نے زبان نو پیدا کیا اور ان سے ان کے ماسوں کو کسی نے ان اشعار میں کیا ہی خوبی سے جمع کیا ہے دیکھئے!

الاکل من لا یقصدی یا مئة
فقسمة خنری عن النحر
فخذهم عبد اللہ عروہ
سجید، سلیمان، ابوبکر، خارجہ

علوم سانی

اسلام کی آمد عربوں کے ہر طوطے کے منہ سے نکلنے لگی۔ زبان کی مخالفت اور اپنی سانی خصوصیات کے تحفظ کی طرف عربوں نے کچھ خیال نہ کیا تھا۔ اور یہ بھی عجیب بات ہے کہ قواعد اور تنہم نحو کے وجود میں آنے سے مدد لینا پہلے سے عرب میں وہ نایاب بات تھی اور بے نزاع خطابت و فہرہ کا ذخیرہ جمع ہو چکا تھا جو خود بعد میں نئی مسائل اور اختلافات لغت کے حوالہ میں پیش کیا جانے لگا۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہو گا کہ

ذوقِ سفر

گردشِ شمس و قمر، گردشِ شام و سحر
میرے نفس نے دیا، وقت کو ذوقِ خوام
وقت ہے گرم سفر، وقت ہے گرم سفر
رینگتے رہتے یوں ہی ورنہ یہ شام و سحر
میری نظر نے لیا جائزہ کا ناست
مجھ کو نظر آگیا، میرا ہی حسنِ نظر
میرے ہی خوابوں میں گم، شام کی زکری
صبح کی رنگیں شفق میرا ہی خونِ جگر
میرے تبسم کی موج میری جہیں کی شکن
یعنی بہار و خزاں میری ہی طرزِ نظر
عشق میں بے چارگی، حسن میں غلط
عشق رہا سرنگوں، حسن رہا خود مگر
نالہ بھی میری نوا، نغمہ بھی میری نوا
وہ بھی مرا چارہ گر، یہ بھی مرا چارہ گر

میری رہِ شوق میں طور بھی تھا اک مقام
طور سے بڑھنے لگا، اور بھی ذوقِ سفر
جراتِ پرواز نے عیش کو چھو بھی لیا
عکس بھی نکلا مگر میری ہی حدِ نظر

میری نظر بڑھ گئی توڑ کے حدِ فلک
اپنی نظر میں ہوں میں اب بھی مگر کم نظر
میرے سکون میں بھی ہے آرزو و اضطراب

یعنی یہ شبنم کی بوند رکھتی ہے قصِ شرر
میکش

داستان

کسی سے تعارف کرانے کی زحمت گوارا نہیں کی تھی۔ اس کے کچھ معمولی سے تھے، اس کا قد بہت تھا، لیکن سینہ کا وہ تھا۔ وہ بہ ظاہر اجد معلوم ہوتا تھا، اور اس کے بال ایک عجیب سے کھنیز طریقہ سے بنے ہوئے تھے۔

”کیا آپ مجھے اجازت نہیں دیں گے؟“ اس نے اتھا میرا آواز میں مدافعت کیا۔ ”میرا نا، ایک منہ کی طرح پیچھے ہٹا اور اپنے بازوؤں کو سینہ پر سے ایک جھوکا دے کر زمین کی طرف لائے ہوئے کھنیز آواز میں بولا۔

”کیوں نہیں، ضرور، ضرور“

”پھر شروع سے“ آوازہ اپنی نے سارے سے سب طلب ہو کر کہا، ایک لمحہ کے لئے کسی آنکھیں سارے سے چار چوبیس اور اس نے سارے کے پہلے لبوں کے ساتھ اپنا قصہ شروع کر دیا۔ یہ اگلے وقتوں کا ذکر ہے۔ اس وقت سے لے کر اب بہت سے قدیم خاندان دنیا سے نصبت ہو چکے ہیں، بہت سے قلعے ویران ہو چکے ہیں۔

اس زمانے میں قدیم قلعہ جھیل کے درمیان چٹانوں پر کھڑا ہوا تھا۔ اور اس کے گرد و فواح میں ہر شخص جانتا تھا کہ جھیل بڑا قلعہ قابلِ شہر تھا، اور یہ کہ بڑے کالانا پہلی رات کے وقت اٹھایا جاتا تھا۔

”میں نے اپنی عمر کی سادہ منہ میں طے کی تھیں، تاہم وہ نہایت قوی، بلند و صلہ اور بد سے زیادہ فصیح تھا۔ کسی محراب کی پرستش، حج پر وہ ترقی شعلوں کے سرخ دھشت، اک شعلوں میں اپنے سرداروں کے آگے کھڑے پر بھڑائی سے چل کر سے گزرتا، اور اس کے قدموں کے پیچھے جھیل کی چوبیس ایک دوڑے سے لکڑیاں اور بالوں کی آواز سے بڑا ہنگ ہو جاتیں۔ پھر نصبت شعلوں کی مذکورہ جاتے عورتیں رونیں، اور سامان تجارت لانے والے سودا گروں کا قیمتی مال اس کی لوٹ لڑ کی مذکورہ جاتا۔

کوئی نہیں جانتا تھا کہ اس نے ایک معمولی لڑکی سے شادی کیوں کی؟ کیا اس کے ہاں کھنیز لڑکیوں کی بیویوں کی

ایک طویل القامت، دلے تیلے لانے والے بال والے تھا لے سارے کی بجائے شروع کی۔ اس شخص کے چہرے سے فقر و فاقہ کے سادہ ہی ہر جوانی اور ہر مہلک فکرتوں کے طے جھیل سے غریب آثار ہو دیتے۔ یہ ایک پر عظمت، ساحرانہ اور فکرتوں سے نغمہ تھا جس کے اونچے سر نہایت درد انگیز تھے اور چلنے والے میں حزن و ہاس کوٹ کوٹ کر بھر تھا۔ اس میں قوتوں دینی کی کوئی اداس تھی، کوئی ایکس کن، تاہم ہر صد تک دھشت، ظالم اور خوف زدہ کرنے والی چیز تھی۔

میرا نا جو اپنے آپ کو موسیقی کا سر پرست سمجھتا سرخ گون پہنے ہوئے تھا، اس کی بڑی، بک، اوپر اوپر کھونے والی آنکھیں دیوانے آدمیوں کی مانند چمک رہی تھیں۔ وہ اپنی کرسی سے اٹھا، اس انداز میں گویا وہ وصیت سے بے خود ہو گیا، سادہ ہر ایک قصہ گانے لگا، اور اس کی آستینوں کا مسلسل بے ترتیب حرکت تڑپنے پر رکھے ہوئے شیشوں اور پیالوں کو الٹ پلٹ کرنے لگا۔

”میں گزریں کہ.....“ اس کے الفاظ بڑی طرح بگڑ رہے تھے۔ اس لئے اس نے اپنی آنکھیں بند کرتے ہوئے منہ کو اوپر اٹھا کر کہا۔ ہر چند کہ وہ ایک اعلیٰ خاندان سے تعلق رکھتا تھا اور نبات خود اس نے اچھی تعلیم پائی تھی، تاہم اس کی گفتگو پر وہ بیویوں کی جیسی اچھی معلوم ہو رہی تھی۔

”اس واقعہ کو صدیاں گزریں.....“ آہ اس واقعہ کو طویل زمانہ گز گیا، قرن ہا قرن گزر گئے۔ صدیاں بیت نکلیں..... ہر شخص اس کو فراموش کر چکا ہے..... وہ اس وقت کتنا عجیب تھا.....

میرا کہ گزریٹھے ہوئے شخص میں سے ایک شخص کا ایک اٹھا، وہ اس وقت تک خاموش تھا اور اسے شام ہی کو جانتا تھا جو شخص اسے یہاں لے آیا تھا، اس نے بھی اس کا

سردار جب قلعہ پر آخری لفظ ڈالنے کے لئے بیٹے کو قتل
دیکھ کر ہرج کے سب سے بڑے جھوکے میں خود مار ہو گئے اور
لوہے کی بڑی گولی کو جس سے قلعہ کے دروازے سے مقل گئے
گئے تھے، بے تارہ جیل میں بند کئے ہوئے دیکھا۔

سال ہا سال گزر گئے کسی نے بھی اس قدیم دوران
قلعہ کے متعلق کچھ نہیں سنا۔ سوائے گنڈر کے اب وہاں کچھ
باقی نہیں ہے۔ ہر طرف کافی آگ آئی ہے اور وصول اڑتی
رہتی ہے۔ ہری ہری چپکھیاں اور ہر دھڑکتی ہوئی
ہیں اور شہد کے جھپٹے ہوا میں اپنی بو پھیلاتے ہیں۔ ان
ڈوانا کی ہتھیلیوں کا کیا انجام ہوا؟ کیا وہ طولی اور شہد
حلیف اٹھاتے رہے؟ ان دونوں میں سے کس نے زیادہ ذیت

اٹھائی؟ شخص ہاں کوئی شخص ہی اس راز کو کبھی جان
میں پتھر کی بنیادوں سے گرا کر..... ایسا معلوم
ہوتا ہے کہ ان بوجوں کی آواز گھوٹوں کے ناپوں کی وہ پرانی
دہشت ناکہ وار کی مدد سے باز گشت ہے۔ کوئی بھی اس راز
سربستہ کا پتہ سمجھ نہ پاسکا۔

اور خاموش موبیں سال سے گزاری ہیں.....
سارنگیہ اور گانے والا دونوں ایک ساتھ چپ ہو گئے
اور چاروں طرف جھانی ہوئی لڑنے و فیر خاموشی میں نیروان
نے اس کی پٹکیاں لپیٹے ہوئے کہا.....
"ہیں اتنا ہی؟" — "نہیں، نہیں لیکن تقدیر کی....."

درجہ از گہر (سید مبارز الدین)

حسین عورت کی کچی تھی کیا کسی اور بچہ گھرانے کی لڑکی کو یہ
اعزاز عطا نہیں جاسکتا تھا؟ اس نے وحشتانہ طرہ پر اپنی
شاہدہ کاٹش "سنا" خوب خوب مٹرائیں میں اپنے غلاموں
کو مٹھیاں بھر بھر کے جاہرات دیئے اور اپنی جوان بیوی
کو اپنی بڑی بڑی وحشتانہ بے کیف آنکھوں سے گھورتا رہا۔
وہ ایک غریب مصروف کی بیٹی تھی۔

نہار ہا آنکھوں نے اس حسن عورت کا نظارہ کیا
تھا لیکن ایک شخص ایسا بھی تھا جو اس کو محبت بھری نظروں
سے نکتا جو زبان حال سے کہتیں "میری جان حاضر ہے یہ
تم پر سے شمار ہے" مجھے تم سے محبت ہے.....

ایک دن..... جیسا کہ ماضی کی تاریکی میں لپٹی ہوئی
داستان میں مذکور ہے..... میں ایک بچہ سے مل گیا
آپا کو کیا دیکھتا ہے کہ ایک نوع غلام اس عورت کے قدوں
پر بڑا ہوا ہے۔ اس نے غلام کو مٹھیاں میں آنے کا حکم دیا تو
اس کی سیدی آنکھ میں گولی مار کر اسے خنڈا کر دیا۔
اس نے اپنی بیوی کو چھوٹا لگا نہیں لیکن اس
انچھٹان بردار اور جفاکش سرداروں کی جمعیت کو طلب
کیا اور ہر ایک سردار کو شہانہ خیامی سے سزا عطا کر کے کہا
"تم آزاد ہو جہاں جی چاہے جاتے ہو۔"

اور جب ان میں کے آخری آدمی نے لوہے کے
پل کو پار کر لیا تو رئیس خود اٹھا "زنجیر توڑ ڈالی" اور نکلے کے
عظیم الشان دروازوں کو مقل کر دیا۔

محبت کی جھانوں..... اس نے عشق و محبت کی دلولہ انگیز لولوں اور حسن و شباب کی جھانوں سے معمور
ہیں۔ ہر فائدہ میں عقل کی جولانیاں اور مشاہدات کے اثراات کار فرما ہیں۔ جو انسانوں کے غضب یعنی ہمارے
سچی تصور اور مصروفیت زندگیوں کے لحاظ فرصت کے لئے ایک شلستہ ذہنی تفریح ہے۔ اس کا تینوں درجوں میں
دیکھتے ہیں اس کتاب کے بیاباں اسلوب اور اس کے افسانوں کے بے پناہ خوشی کا اندازہ ہو جاتا ہے۔

چھوٹی القلم (۱۳۱) صفحات قیمت مجاہد

بغاوت اور موت

یہ اختلاف پر کہیں ہنگاموں کا عمل ہو
 برائے میں ہے جبکہ خیال فاشی ازل ہو
 قاتل بالکل سیدھی سادی زندگی گزارتی تھی اس میں کوئی
 تکلف تھا نہ تعسف۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس میں مذہبی رنگ
 چڑھا ہوا ہے۔ وہ نماز بھی پڑھتی تھی اور روزے بھی رکھتی
 تھی۔ وہ جو مستین ہونے کے لحاظ رکھتی تھی اور ہر دو بجے جب
 کبھی وہ لڑکیوں سے بات کرتی تو مسئلہ قضا و قدر کے
 متعلق روشنی ڈالتی تو احکانات الہیات پر بھی وجہ تھی
 کہ تمام لڑکیاں اس کو زراہہ نہ شک۔ لہذا کہیں
 قاتل میرے ساتھ میرے کپے میں چھوٹی تو میں
 چاہتی کہ اے کاش وہ مجھ سے بائیں بچا جائے۔
 میں ہر موقع تلاش کرتی اور اس سنجیدگی کے راز کو
 فاش کرنے کی کوشش کرتی۔ لیکن اس کے چہرے سے
 یہ معلوم ہوتا کہ وہ بصداق ہے۔
 سب زبان حال سے بے حال دروغ
 جس کو کہتے ہیں خوشی ہے وہ گویا بی
 جب میں اس کے غامضی معاملات میں اس کے متعلق پوچھتی تو
 وہ آہ صحر کہہ کر کہتا کہ کیا بتاؤں کہ میں کون ہوں؟
 کیا کہوں۔ صرف یہ سن لیجئے کہ
 بکا تا ہے ہر آگ داغ میرے سینے کا
 لئے ہوئے چمن سوگ کی بہار میں
 لیکن میرے پیچھے اصرار سے یہ معلوم ہوا کہ وہ سائیدار کی
 محروم ہے ایک عمارت بہن بستریاں پر ہے اور اس
 کمن بجائی بیٹوں کی خلیج کا عورت فاداری کی وجہ سے کوئی
 خاطر خواہ انتظام نہیں ہوا۔ اب اس سے اچھی خاموشی سے
 ہوئی ایک روز میں اسے اتفاق کی تیاری کے لئے لڑائی
 کی رون گروانی میں مصروف تھی۔ قاتل نے میرے پیچھے
 آکر ایک خط ڈالا اور کہا کہ بڑا ہو۔ مجھ سے اس کی یہ طرف
 پر توجہ ہوا اور بڑی پر شوق نظروں سے خط معلوم کر
 پڑھنے لگی لیکن وہ اس میں کیا تھا، کھاتا تھا کہ اس کی بہن

مجھے پھانسل میں رہتے ہوئے ایک زمانہ گزر گیا تھا
 اور اس عرصے میں کئی واقعات رونما ہوئے۔ پھانسل کی
 زندگی کا احوال بہت پرشور اور منگامہ خیز ہوتا ہے۔ اس
 زندگی کو برنگون بنانے کے لئے کچھ ذریعہ پیدا کرنا پڑتا
 تھا۔ کیونکہ مجھ جیسی خاموش لڑکی کو اپنی زندگی میں ایسے
 ہنگاموں کا قحط ہونا ایک دشوار امر تھا۔
 چنانچہ پھانسل کی ایک گول مدت کے بعد کھلا تھا
 اس لئے اس نے ایک رنگ پیدا ہوئی اور پھانسل میں
 وسط اور دریا کے بیچ ہونے لگی۔ وہ چھوٹی کہ میرا
 کمرہ بھی خالی نہ رہا اور قاتل نے اس کی کوئی لڑائی
 قاتل کو پھانسل کی مائے اکرم سے کہے میں اس کا کھانا بنا دیا
 اس کی اہل دل میں ہرگز قاتل کو کھانا نہ کھانے لگی تو اس کی صورت
 سے ایسی شرمیلی اور محنت ظاہر ہوئی تھی کہ معلوم ہوتا تھا
 کہ ایک صاحب پرستی کرتی ہوئی ہے۔
 میرے دل سے گواہی دے کہ اگر دوست ہو سکتی ہے
 صرف یہ ہستی کہ میں نے اب تک کسی لڑکی کو ایسا دوست
 نہیں بنایا تھا میں ایسی پہلی کی ضرورت محسوس کرتی تھی جو مجھ
 جیسی ہی خاموش ہو۔
 اس لئے میں جس دن اس سے ملا کہ اس کو جانا چاہتی
 تھی میں کہام لڑکیوں کا قصہ ہے۔ میں نے اس سے مل کر
 ہوئے کہ کہہ کہ آپ کو اپنی جگہ پسند آئی۔ میں نے گفتگو کے
 دوران میں کہے کا وسیع گھول دیا اس نے درجہ کے بارے میں
 ہونے کہا کہ میں بھی ایسی ہی لڑکیوں کے جو اپنی ضرورت
 گزرائی دلوں سے چھین کر دے لیکن قاتل سے کوئی یہ گفتگو
 نہ ہوئی۔ سوائے معمولی گفتگو کے۔ کبھی تعلیم کے بارے میں
 کبھی مورتی میں اس کو بار بار مجبور کرتی کہ خدا کے لئے اپنی زندگی
 کو اس قدر متانت سے گزار دینے۔ لیکن وہ صرف یہ کہہ کر
 ٹال دیتی ہے۔

کیا اس کی رحمت میں جوش آیا؟

اگر میں دعا مانگوں تو کیا اس کو اپنی رحمت عطا کرنے کا خیال آئے گا مگر نہیں وہ غریب، کو ان کی زندگیوں کو مسخ کرنے پر تالا ہوا ہے اس نے ایک سانس میں اتنی لمبی تصویر کر دی جس نے ہکا بکا ہو کر اس کی صورت کو دیکھا اور کہا اے خدا قانتہ! تم سے ایسی امید نہ تھی بجائے اس کے تم خدا کا شکر کرتیں اور دوام بخشیں، ابھی ضامی باغی بن گئیں۔ اس خدا لا یرئال و لم یزال کی شان میں گستاخی کر رہی ہو جس کے قہر اور عذاب کے ڈر سے بڑے بڑے انبیاء نے دور و کر شب بیداری کی اور فاقوں پر رناتے رکھ کر بھی اس کی مرضی کے خلاف گردن نہیں موڑی اور جس کے شان میں میں یہ کہہ سکتی ہوں سے

عطر و گلاب و مشک سے دیو کو زبان کو

گستاخ ہوں جو میری پیرا نام لے سکے

یہ سن کر اس کی صورت بدل گئی چہرہ سرخ ہو گیا آنکھوں سے سخت حقہ کا اظہار ہونے لگا۔ مجھ سے کہنے لگی بس بس راضہ اس وقت تم پیند و لہجہ کے فطرت سے میرے زخم ہائے جگر کو اور وجود نہ کرو۔ تم کو کیا معلوم کہ میرے دل میں ناامید لیوں کے سمندر کی موجیں امیدوں کے پہاڑ کو

بڑی تیزی سے بھنور میں پھنسا رہے ہیں اور غم کی موجیں بڑے زور شور سے ساحل دل سے ٹکرا رہی ہیں اور ان موجوں کے نفاذ سے ساحل حاصل کرنے والے مضاربے طبعہ والے ہیں آہ میری دل کی کیفیت کا کوئی انداز نہیں رکھتا شب تاریک و بیم موج و گرداؤں میں غافل

کھا دانتہ حال ہاں سب ساراں ساحل ہا

تم نے دیکھا ہو گا سیدہ کہ منٹل نے ناامید ہو کر اب خدا کی عبادت بھی چھوڑ دی ہے جب کہ میری بین کی پہلی دفعہ نا سازی مزاج کی کیفیت معلوم ہو چکی تھی میں نے خدا کو اپنا بنانے کے لئے تاکہ اس کو ہمارے حال پر رحم آجائے اس کے احکام پابندی سے بجالائے۔ لیکن جب مجھے معلوم

نہت اپنی زندگی کے آخری دنوں کو بڑی بے چینی سے گزار رہی ہے۔ ڈاکٹر نے وقت کے دفعہ کے لئے میور کی صحت چیک کرنا میں نے پہلی تجویز کی ہے۔ میں نے خط پر مدد کا قاتلہ کو دیکھا جو درجہ میں کھڑی ہوئی آنکھوں سے آنسو گراتے ہوئے یہ گفتگو رہی تھی۔

سنتھیلے دے جو دم ناامیدی کیا قیامت ہے

کہ داناں خیالی یار چھوڑا جائے ہے مجھ سے

اس کے چہرے سے یاس و ناامیدی فلک ہی نمی میں نے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ کھراؤ نہیں قانتہ خدا پر ہر دوسہ رکھو اور اس سے مدد مانگو۔

اب اس کے قریب جلی گئی تھی اور میں نے کہا خدا

کریم و رحیم ہے وہ تمہارے حال پر رحم و کرم کرے گا۔

قانتہ نے میری طرف دیکھ کر اس سے کہہ دیا کہ

میں سہم گئی میں کبھی شام اس پر اپنی بہن کی لکڑی کا بہت

اثر ہو رہا ہے لیکن اس نے کہنا شروع کیا کہ تم نے کیا کہا؟

راقعہ خدا سے دعا مانگوں؟ اس خدا سے جس نے مجھے بن

باپ کا کیا۔ اور اس سے جس نے میرے بھائی بہنوں کو

بلے و جومات کا مڑا چکھا کر ہماری زندگیوں کو گوارہ بنایا؟

اس وجہ سے جواب اس بہن کو موت کے گھاٹ اتارنا

چاہتا ہے جو ہمارے لئے زندگی کی نعمت غفر مرتقبہ ہے

اور اس خدا سے جس نے طبقہ امرا کو اپنی تمام زمینیں عطا

کیے طبقہ غریب کے لئے اپنے پاس کوئی عطا نہ کی کہ میں

دیکھتیں کہ اس کی ہزار ہا مخلوق بے خان کی طرح ڈر لیں

رگڑتی پڑی ہوئی ہے۔

کیا تم اس کو محسوس نہیں کرتیں کہ سیکڑوں بچے بلاؤ

تیم ہو کر اپنی زندگیوں کو نیست و نابود کر رہے ہیں اور

کیا اس کے لاکھوں بندوں کی تعداد بے بارہ و دو گار بڑھا

ہوئی ہے؟ اور کیا ہزاروں شاکر بائیں اپنے کسب بگوں

کو فاقوں سے جلنے نہ تڑپتے دم توڑتے ہوئے دیکھ کر بھی اس کی

محب و مہنی شاکر نہیں رہیں؟ ہم ہی تباہ و تارنا ہونے پر بھی

ہو گیا کہ بعد عیاش و عشرت میں سرشار رہنے والے انسانوں کی طرح ہماری طوط سے غافل ہے تو ضمیر نے گواہی دیا کہ وہ قاضی الحجابات نہیں اب میں کس طرح امید رکھوں کہ میری بہن اتنی سخت بیماری میں بغیر موثر علاج کے صحت مند ہو سکتی ہے۔ اُن رافضہ! ہماری زندگی کو خدا نے کس قدر پر آلام بنایا۔

میں نے کہا اسے کاش تم اس پر آلام زندگی کو باطنیان گزار رہی اور سمجھتیں کہ اُن میں سے کون کونسا ہے چل مر جھک گیا تو موت ہے یا لڑا کھیل قاتلہ! اتنے آفریقش سے مخلوق میں خدا کی محبت کی بنا و ست کی صلاحیت بھی موجود تھی اسی کے تحت جب اس کی محبت میں فرق آجائے تو بغاوت کا جذبہ جوش میں آتا ہے قصار سے دل میں خدا کی محبت باقی نہ رہنے سے باغیانہ خیالات جمع ہو کر ہتھارے و داغ کو پرانہ کر رہے ہیں تم اس کو خوب سمجھ لو۔

گرا نہ آئندہ سے آئندہ فریب قسمت پر سکون مل کو چھوڑ دو مضطرب پسند اگر میں کچھ اور کہہ رہی تھی کچھ اور کہنے والی تھی کہ کچھ خوش باش لڑائیاں پر پلٹے گفتگو اور ہو سکتی کہ گونا گونے والے قہقہہ لگاتی ہوئی آئیں اور آتے ہی چھیر چھار شروع کر دیا لیکن قاتلہ اندھ گرا پنے میز پر نہ جانے کیا بھٹی میٹھی رہی چونکہ اس کی یہ عادت تھی ہی اس لئے لوگوں نے اس کی اس سے تو بھی کو زیادہ محسوس نہیں کیا۔ اسی طرح دن گزارتے گئے لیکن قاتلہ کی زندگی میں کوئی دھبہ پیدا نہ ہوئی وہ اور زیادہ ادا کس ہوئی تھی۔ اکثر ایسا کرتا کہ ہم دو دن معلوم ہو گیا کہ میں جا کر بیٹھا جاتے اور میں اس کو کھانا دیا اس کی بہن کی طرف سے تسلی و لاقی وہ کہا کرتی آہ رافضہ بقول کسی کے۔

یہاں بیٹھا ہوا دل میں کسی کو یاد کرتا ہوں کبھی آئندہ بہتا ہوں کبھی فریاد کرتا ہوں اور راتوں کو ہم دو ذراں ایک ساتھ سوئے لیکن کسی وجہ سے جب میری آنکھ کھل جاتی تو دیکھتی کہ وہ ٹپل رہی ہے میں اس بات کو بڑی شدت سے محسوس کرتی اس کو سمجھتی لیکن وہ آدھی کھنچ کر کہتی ہے۔

شب میں ہو جاتی ہے جب شور و غل عالمناش ہم لغز میں تری آواز سن کر کہتے ہیں وہ بہت ابوس ہو کر کہا کرتی رافضہ تم کو نہیں معلوم میرے دل میں کتنی آرزوئیں بستہ مگر پر پڑی ہوئی بہن کو دیکھنے کے لئے تو پڑ رہی ہیں۔ لیکن الٹی کڑوری کے باعث لاہور جانے کے قابل نہیں ہوں۔

مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فضا کے جھوکے لمحہ بہ لمحہ ہمارے بہن کی راہ اور تپ کر راست مجھ تک لاتے ہیں اور میں دل سے تڑپ جاتی ہوں۔ آہ! اس قدر دل و زجر تھا اس کا۔ میں نے کہا۔ میرے محبوب و فائستہ کے دل کو سکون نصیب کر دے۔

— ۲ —
ایک روز میں سب معمول کھانے کے وقفہ میں ہوٹل میں اپنے کمرے میں گئی تاکہ ذرا آرام لوں اور کھانے کی کھنٹی بجتے ہی کھانے پر پہنچوں۔

لیکن میں نے جوں ہی کمرے میں قدم رکھا کسی کی سسکیوں کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔ میں نے دیکھا کہ قاتلہ اپنے پیٹنگ پر بے طعوب پڑی ہوئی رو رہی ہے۔ مجھے تعجب ہوا کہ اس آٹھ بیٹنے کے کمرے میں وہ بھی اس طرح نہ روتی تھی میں نے طے سے بلند ہو کر سبب دریافت کیا۔ اور اس کو منانے لگی۔

جانتے اس کے کہ وہ اور زیادہ روتی آٹھ بیٹی اور اپنا ہاتھ میری طرف بڑھاتے ہوئے ایک لفافہ پھینکا۔ میں نے دیکھا اس کی ماں کی طرف سے آہ آیا ہے

اس نے انتہائی جوش میں کہا یہ خدا ہے جس کو
ایوب سلام کا مہینہ نہ آیا وہ ہمارے ممبر کا کیا امتحان لے گا؟
میں تمہاری عزت و لیلوں کو سننا نہیں چاہتی تم لوگ ہندو
کے نشتروں میں مکاری کا انجمن دیتے ہیں۔ امر اور سہار
کو مت امر تین میز پر ہی وجہ ہے کہ غربا کے حقوق ملنے ہو؟

کیا صرف اٹھ آٹھ روز کی ٹھیسوں میں اتنے دود و راز
خاکلے پر اپنی ماں کے پاس ملے نہیں جاتیں تمہارے پاس
معمولی معمری و جوہری اہم نہیں ہوتیں؟ لیکن ہماری
بڑی سی بڑی اہمیت کو کوئی لحاظ نہیں کرتا۔ کیا میرے ملک
میرے دل میں یہ غلط نہ رہے گی۔ آہ میں نے اسی غربت
کی بنا پر مرے والی کا چہرہ تک نہیں دیکھا۔ اس کا حال
خدا کو ہی نہیں تو تم جیسوں کو کیا ہونا؟ امرادوسر
کے پاس غریبوں کی عزت کو کوئی سوال ہی نہیں۔ غربا کی
عزت و حرمت ذلیلوں اور بازاریوں کے برابر بھی نہیں
ہوتی کیا وہ کسی غریب لیکن شریف طبقے کو اپنے بہن یا
بھائی کی نظروں سے دیکھتے ہیں۔

اے کاش! وہ صرف غربا کی عزت کا ہی احساس کر
غربا کی درگاہ کی بلانے والی غلطیوں کو قابل قبول سمجھتے؟ لیکن نہیں
ایسا نہیں ہے۔ ایسا کہوں نہیں سمجھ میں نہیں آتا۔

کیا اچھا ہوا کہ خدا اپنی تمام رحمتیں اچھی لوگوں پر
نعم کر کے تمام غربا کو موت دیدیتا۔ اگر موت بھی نہ دیتا
تو اس قدر ملک بالک کر پڑیاں رگڑانے دیتا۔ اگر ایسا مجبور بھی
کرتا تو اس کا صرف احساس پیدا کرتا۔

لیکن آہ امرادو تو غربا کو مشرت الارض سمجھ کر ان کو
کھینکنے درپے رہتے ہیں کہ مساوا ان کے حقوق ان کے
اس عیش و عشرت کو قہر زل نہ کر دیں۔

سیدہ! میں سچ کہتی ہوں کہ میرے دل میں خدا
کی نافرمانی سے نفارت کے شعلے بھڑک رہے ہیں اور
اور انہی شعلوں سے میں جلی جا رہی ہوں اور اپنے ہندو
کو بیان کرنے سے قاصر ہوں۔

لکھا ہے تمہارے دنیا میں اکیلے ہونے کا مجھے بہت فکس ہے
تم نہ بہت کے خدا کے پاس بالظہان رہنے کی دعا کرو۔
اس کو بڑھستے ہی میرا سر ہکا آہوا معلوم ہوا۔
دل نے کہا جس کا خدشہ تھا آخر ہو کر رہا۔ آگ میرے مہینہ
تو نے قاتلہ کے دل کو زبردست شکنہ لگایا۔

اس کے یوں خیالات کے دریا کا سیلاب امید کے
کھیتوں کو کس قدر پال کر دے گا؟ میں لکھا کہ کونچے رکھنے
گئی اور قاتلہ کو دیکھا کہ وہ سنبھل کر بیٹھی اور کہنے لگی کہ
را فحہ تمہارا کیا خیال ہے کیا میں حقیقت میں باجی ہوں؟
جیسا کہ تمہارا خیال میرے متعلق تھا۔ کیا خدا کو صرف میری
بہن کی اتنی شہید ضرورت تھی؟ جس کا وجود ہمارے لئے
ایک ذمہ دار باپ سے زیادہ تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں
کہ خدا کا حکم ارادہ ہماری زندگیوں کو بالکل تباہ کر لے گا؟

لیکن میں کہتی ہوں کہ وہ کیوں نہ ہیں ایک دم
موت ہو دیتا؟ وہ کیوں دنیا کو تباہ کر دیا والوں کو ہم پر
جنسے کا بوجھ دے رہے کیا اس کو نہیں معلوم کہ ہماری
زندگی میں اس بہن کی کتنی اہم ضرورت تھی؟ کیا اس کے
پاس ایسے بزاروں بندے جن کی دنیا اور دنیا والوں کو
کوئی ضرورت نہیں پڑے ہوئے ہیں۔ کیا ان میں سے
کسی ایک کو چن لینا اس کے لئے امر محال تھا؟ اس نے
انتہائی زور و غصہ سے یہ بائیں گئیں۔ اس کی آنکھوں
سے مشعل برس رہے تھے پھر اس نے میری طرف
جواب طلب کیا ہوں سے دیکھا میں نے کہا قاتلہ ممبر کرو۔
بہ قول مجھے

سچ میں! کاشانہ ہستی کے یہ نقش و نگار
دست قدرت نے بنائے ہیں مٹانے کے لئے

خدا تمہارے ممبر کا امتحان کر رہا ہے فوراً اس نے طنز
لہجے میں کہا کیا تم لوگ اس امتحان میں کامیاب ہو گئے؟
میں دل میں بڑی غمزدہ ہوئی مجھے افسوس ہوا کہ میں
نے کیوں کہا؟

کے منتظر رہتے ہیں۔ اسے کاش کیا غرباء کے لئے ہوشیار ان کے
دروازے درشتی کی طرح بند نہیں رہتے وہ خدا کی خدائی
میں شکر کر کے فرعون بلے سااں بنے ہوئے ہیں۔ کیا یہ
ہاں اپنی ذرا سی عیش پرستی کی وجہ سے غربائی زینگیوں
کے بار آور و خوتوں کو جڑے اکیڑ کر لیں پھینک رہے
ہیں۔ بتاؤ سیدہ کوساکن کی خنتوں کی تہلہ ساقی
کھیتوں پر طوفان فوج برپا نہیں کر رہے ہیں۔ یہ ایسے
خزانے دار ہیں جن کے ایک خزانہ پر دس قارون کے خزانے
براہی نہیں کر سکتے۔

اس دوران میں اس کا غصہ بہت بلند ہو گیا
منہ سے کف جاری ہو رہا تھا۔ اپنے ہاتھ کی ٹھیکوں کو
خوب پیچھے پیچھے کر اس تقریر کو ادا کر رہی تھی پھر کہنے لگی کہ
تم نہیں سنی القلب اور ظالموں کی طرہ داری کر رہی تھیں
جو اپنے اندر یہ اوصاف رکھتے ہیں۔

میں خدا کو یہ کہوں گی کہ اس نے انصافی کی پینک
اس نے انصافی کی ہے۔ میں اس کے بندوں میں سے
ہونا چاہتی نہیں پانچویں چاند کے ستارے ہوئے کسی بندے
نے کہا ہے۔

خدا کا شوق نہیں ہزاروں بنوں میں چھڑیں مائیک
میں اس کا بندہ بنوں کا جس کو خدا کے بندوں سے مایوس

(۳)

ایک روز دوران گفتگو میں قاتل نے کہا کہ سیدہ
میں بہت دن تک سوچتی رہی کہ سکون کیسے نصیب ہو گا۔
میری سمجھ میں آتا ہے نہ خود کشی ہی ایک ایسی چیز ہے
جس سے سکون ابی حاصل ہو سکتا ہے۔

اور اب میں موت صرف موت چاہتی ہوں اور
میں تم کو بتاؤں گی کہ میں کیا کروں گی۔

جان مضطر کی حقیقت کو نمایاں کر دیا
دل کے پوشیدہ خیالوں کو بھی عیاں کر دیا
میں دنیا کے تمام جگہوں کا قاتل خود کشی سے کرتی ہوں۔

مرے جذبات رہ جاتے ہیں اکثر تشنہ معنی
سے کتنی دل شکن الفاظ کی تینک دانی
کیا تم نہیں دیکھتیں کہ میں نے اپنے شبابی کوئی سنگ کی
آرزو پوری نہیں کی بدل مرچا فنا ہو چکا۔ میرے دل کی
رجحانی امیر کی سیاہی بن گئی ہے

آجمن سے روتا ہوا موبو بہا رہا
شباب سیر کو آیا تھا سو گوارا ہو گیا
میں نے کہا خدا سے دعا کرو اور اس کے احکام پر چلنا شروع
کر وہ معلوم خدا کی مصلحت کیا ہے؟ اور کیا معلوم وہ
مقدارے صبر سے تم کو وہاں کوئی بھی جگہ ملے۔ اس نے
بلے پروائی۔ سے منہ پھیرتے ہوئے کہا اور خدا
دل کے بھانے کو غالب یہ خیال اچھا
دیکھو سیدہ اب میں نہ جنت کی خواہشمند ہوں نہ دوزخ کی۔
نہ میں مشاق جنت کا نہ میں بیزار جنت سے

کیونکر میرے باپ میرے بہن بھائی راہمدم اختیار کر سکیں
اب مجھے کوئی حسن دنیا میں رہنے کا نہیں نہ میں دنیا میں
رہنے کے قابل ہوں نہ دنیا کو میری ضرورت ہے۔

میں نے کہا قاتل آہ تم جی سجدہ اذین اڑا کی سے
ایسی امید نہ تھی کہ تمھاری لکڑی صبر سے تجاؤز کر جائیں گی
تم خدا سے امید ہو کر موت ایک رہی ہو؟

کیا تم کو نہیں معلوم کہ خدا کمال اپنے کلام میں فرمایا
ہے کہ اذعنوا لی الخبیث بکفرہ اذنی لو گن کو پسند کرنا ہے جو
اس کی عبادت اور احکامات پر سرخوں رہتے ہیں اس کی
رضاجوئی کے خواہشمند ہو رہے ہیں جب ہی وہ خدا کے ہو جاتے
ہیں اور خدا ان کا ہو جاتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ امراء و روساء کی تمام خواہشیں نہیں
تمام و کمال پوری ہوتی ہیں میری اس تقریر کو بڑی کچھلی
سے لکھتی رہی اور پھر کہنے لگی۔ آہ سیدہ میرے شہر زندہ دل کو
اور زریادہ مشت دکھاؤ۔

تم نے کیا کہا۔ امراء و روساء ہوشیار خدا کی رضا چاہتی

تھی میرا دل بھی بولا جیگا تھا لیکن اب دل مجھ سے پہلے چلا۔
کیونکہ میری دنیا نے حسرت کو دو بالا کر کے والی ہستیاں
بھی موجود تھیں اور میں نے کہہ سکتی تھی جہاں سے
شغنی نور سحر کالی گھٹائیں پاؤں اور تار
کبھی اجڑا تھے یہ سب میری دنیا نے مرے سر کے
لیکن آہ اب کیا ہے

اور اب یہ حال ہے دل خود یہ خود ہی طہا جاتا ہے

جیسا کہ پیتھو تار بجوں میں آتا تھا میرے
میں نے سن کر اس کو مٹانے کی حتی الاسکان کو مشتیں
کیں اور کہا کہ انشاء اللہ تمہاری زندگی ایسا ہی نہ رہے گی
تم دنیا میں آج کمال کو پہنچ کر اپنی ہمت کی بندی دکھاؤ
اور بالکل اس شعر کے مطابق آنا نصب العین کر لو
دل سے نکال طالع برکت کا خیال

کرو خ کو اسیر ستاروں کو یا کمال

قانتہ اس کو سن کر بہت خاموشی سے بیٹھی رہی اور آہ
بھر کر کہنے لگی وقت گزرنے کے بعد کیا ہوتا ہے

آخر شب وید کے قابل تھی بسل کی تزلزل

صبح دم کوئی اگر بلائے نام آیا تو کیا

بہت رات گئے اب تک ہم لوگوں نے اسی قسم کی گفتگو

کی۔ دوسرے روز قانتہ اپنے وطن کو جا رہی تھی اور

اپنے نام کے اخراج کی درخواست بھی دیدی تھی۔

مجھے اس کا جاننا ناگوار خاطر ہوا۔ اور ہم نے ایک دفتر

کو خط لکھنے کی تاکید کی۔ تمام لڑکیوں نے بھی اس کو بادل

ناغما سے خدا حافظ کہا۔ لیکن آہ۔ اس کے جانے کے چند

روز بعد ہی ایک اور کھلا خط قانتہ کا آیا لکھا تھا کہ سیدہ

میں نے جو خود بخشی کا ارادہ کیا تھا اس کو پورا کر رہی

ہوں۔ تم کو اس وقت خط ملے گا جب کہ میں دنیا میں

نہ ہوں گی۔ لیکن میرے جذبات اور احساسات کا لحاظ کرتے

ہوئے میں اپنے آپ کو کافی معافی تصور کرتی ہوں مجھے

بھول جاؤ لیکن ہو سکے تو میرے جذبات اور غیالات کو

ہیشہ یاد کرنا خدا حافظ سے تازہ عوامی دانش گردانے سیدہ را

گاہ گاہ باز خواں این قصہ پارسیں را

سیدہ بدر رافہ

خود کشی کا نام سن کر میرے حواس منقطع اور ہاتھ
پاؤں شل ہو گئے۔ میں نے اس سے کچھ نہ کہا کہ میا دوا
اور منقطع نہ ہو جائے۔ میرے دل میں ایک غفلت کی چوٹی
کہ ہمیں سچ سچ وہ خود کشی نہ کر لے میں نے اپنی دواؤں
کی صندوقچی کو منقطع کیا اور ہمیشہ سامنے روم میں
اس کی غفلت بخانی رکھنے لگی کہ ہمیں کوئی زہریلی کیس
نہ سمجھ لے اور نہ کوئی ایسی چیز اٹھا لے جس سے جانی
خطر لاحق ہو۔

اس کو فرصت کے اوقات میں سمجھاتی کہ تم اپنی
غربت و افلاس کا سرگرم خیال نہ کرو اس کو ایسا سمجھ کر کہ

میرے افلاس کی طور پر ہے یہ قارونیت فصلا

میرے لئے گدائی پر محکوم خودت کی پیشانی

یہ سن کر کہنے لگی نہیں برا فہم میرا مطلب خودت و دولت کو

مائل کرنا نہیں بقول مجھے ہے

اے زرتو قدائد و لیکن یہ خدا

ستار العیوب قاضی الحجاباتی

میں اس کی حامی ہوں۔ لیکن رافہ میرا دل دنیا کے

ہنگاموں سے بھر گیا۔ میں نے نہایت آہستگی سے کہا کچھ

قانتہ تم اس کا سبھی جو خود کشی حرام ہے۔ تمہاری دنیا کو

ضرورت اور شد و ضرورت ہے تم ان خواہات کو چھوڑو

اپنی ہمت کو کام میں لا کر رہ بلند ہو جاؤ گی تو بہت سی

زندگیاں تم کو دیکھ کر اپنے آپ کو سدھاریں گی جو کچھ مجھے

اس سے قلبی محبت ہو گئی تھی اس لئے ہر ممکن طریقہ سے

اس کو باز رکھنے کی کوشش کرتی وہ بہت مایوسانہ انداز

میں کہنے لگی رافہ تم کو کیوں مجھ سے اتنی ہمدردی ہو رہی

ہے۔ مجھ جیسی ہزاروں لڑکیاں یاد و فکر منقطع میں سیکر لیا

غربت و ناواری کی وجہ سے خود کشی کر لیتے ہیں تم کس

کس کو مٹاؤ گی، کس کس کو روکو گی۔ مجھے دنیا کو چھوڑ دینے

وہ کیونکہ اب دنیا میں کوئی غلہ نہیں رہا ہے

رافہ! میری زندگی پہلے ابھی نامی خوش باش

ہیشہ یاد کرنا خدا حافظ سے تازہ عوامی دانش گردانے سیدہ را

گاہ گاہ باز خواں این قصہ پارسیں را

تم سے کہی نہ ملنے والی قانتہ۔

علی گڑھ کے چنیدار سی مخطوطات

گزشتہ فرم دی میں کاغذ میں کے سالانہ جلسہ سے فراغ کے بعد حضرت قبطی خواب صدر ایچنگ بہادر، ذیل اللہ العالی کا رشتہ سے کتاب خانہ سلطان جہاں منزل کا فارسی و عبری و کھجنگ کی مسرت حاصل ہوئی۔ جناب موصوع کا مکمل کتبہ تھا کہ عربی اور فارسی کتاب کی فہرست از سر نو مرتب کر دی جائے مگر میرے حیدر آباد کو ملنے میں صرف چار روز رہ گئے تھے۔ تین روز کی قلیل مدت میں سب کچھ کرنا اور ترتیب دینا اور مختصر سا مختصر وقت لکھنا بھی دشوار تھا اس لئے اپنے عالی شان خانہ اور دیکھی کے خانہ سے فارسی کتابیں جو نا اور دیکھا بیٹھے نظر آئے خاص کر ان پر عالی شان خانہ کے بعد جیسے کہ کچھ نوزش بن پڑے کہ جناب موصوع کی خدمت میں پیش کر دئے۔ میں جانتا ہوں کہ ان میں بہت کچھ اضافہ کی گنجائش ہے جس کو کچھ سے زیادہ فرصت اور قابلیت رکھنے والے اصحاب ائمہ اشرافیہ کی کریں گے۔ پھر بھی اس اجیز کی حوصلہ افزائی کے لئے جناب موصوع نے ازراہ ہندوستان شہادت یہ عبارت تحریر فرمادی جس کو تبرک کے طور پر میں نے اپنے پاس رکھ لیا ہے۔

میں نے فہرست ہائے علمی، کاشش اور تحقیقی سے علمی گئی ہے جس کی بابت فکر فہرست نگاہ جناب کاغذ میں داخل کیا جاتا ہے۔

میںب الرحمان سکرٹری
مندرجہ ذیل پر پیسے اپنے تمیزی فرمیں کتاب خانہ کی فہرست میں ان کے نمبر اور ہیں۔ وَمَا تَوْفِيقِي إِلَّا بِاللَّهِ
محمد عبد المجید خان

(۱) شتوی ولدی در بیان اسرار احمدی۔

اس مجموعہ میں دو شتویاں ہیں جو حضرت مولانا جلال الدین رومی علیہ الرحمۃ کے فرزند حضرت سلطان ولدی تصنیف میں پہلی شتوی کا وزن "فاصلان من مفاصلین فعلن" ہے۔

سلطان ولدی نے اس کی جو تصنیف لکھی ہے وہ ان ہی کے الفاظ میں زیادہ بطن و بجی عرض — از اشعار شتوی ولدی در بیان اسرار احمدی آن بود کہ حضرت والدہ و شہنشاہ سلطان العلما و العارفین جلال الحق و الدین محمد بن محمد بن حسین البلیغی در شتوی خود قصہ ہائے اولیائے گزشتہ را ذکر کردہ است و کرامات و مقالات ایشان را بیان فرمودہ و غرض از قصہ ہائے ایشان انہما کہ کرامات و مقالات خود بود و ازال اولیائے کہ ہمدل و ہمد و ہم نفس اولیاء مثل سلطان الواصلین سید برہان الدین محقق ترمذی و سلطان الخویشین و المشوقین شمس الدین تبریزی و قطب الاقطاب صلاح الدین زند کو ب قوم و زبانت الاولیاء و الساکین شمس الدین بلخی و لدی انی ترک توئی۔۔۔۔۔

احوال خود و احوال ایشان را بواسطہ قصہ ہائے پیچیدہ اینجا درج فرمود

عمر شتوی آن با سر شد کہ سر و لہر آن

گفتہ آید در حدیث و عر آن

لیکن چون بعضے را آن فطانت و زیر کاری نبود کہ مصدقہ حال را فہم کنند و غرض اورا بداند دریں شتوی مقامات و کرامات حضرت شمس و اولیاء صاحبان کہ ہمدم اولیاء نہ۔۔۔۔۔ شرح کردہ شد تا ماطلا

کنہ گمان و مستحان را معلوم شود کہ ان ہمد احوال او مصاحبتش بودہ است تا شہرت و گمان زایش برودہ
(ترجمہ مختصراً) ثنوی دلدی و دبستان اسرار خودی کھنے کی غرض یہ تھی کہ حضرت والد نے پڑھی ثنوی میں پچھلے ادیب کے
جو قصص اور ان کی کرامات و مقامات بیان کئے ہیں اس سے ان کا مقصد اپنے کرامات و مقامات اور ان اولیاء کے کرامات
(و مقامات) کا اظہار تھا جو ان کے ہول ہدم اور ہم نہیں تھے (اس لئے) اپنے اور ان کے احوال کو پچھلے بزرگوں کے
قصوں (کے پردہ) میں درج کیا لیکن چونکہ بعض لوگوں میں اتنی زیادہ سمجھ نہیں ہوتی کہ ان حالات اور (ان کو پردہ میں
بیان کرنے کی) غرض کو سمجھ سکیں اس لئے اس ثنوی میں حضرت والد اور ان کے ہدم صاحبوں کے مقامات و کرامات کی
تشریح کی گئی تاکہ پڑھنے اور سننے والوں کو معلوم ہو جائے کہ (قصوں کے پردہ میں بیان کئے ہوئے) حالات خود ان
اصدان کے ہمیشہ کی ہیں اور (ان کے متعلق) جو شبہات دل میں ہوں دور ہو جائیں۔
اس ثنوی کا آغاز ابتدائے رجب الاول سن ۱۰۰۰ میں ہوا اور تکمیل اسی سنہ کی چوتھی جمادی الآخر کو یعنی
دو مہینے میں ختم ہوئی۔

بود در شش صد و نو یار
گر فزون گشت ایں مگر طول
چارمین مہ جادی آخر

مطلع ایں بیان جاں افزا
گفتہ شد اول رجب الاول
مقطعش ہم شد ست اے فاخر

دوسری ثنوی کی بحود یہ ہے جو ثنوی مولانا روم کی ہے۔ اس کی وجہ تعریف یہ تھی کہ بزرگ
بزرگے از بزرگان اول بطریق اعتقاد و استدعا کردہ التماس نمود کہ بوزن الہی نامہ خواہ سنا بی رحمت
علیہ کتابے انشا فرمودہ آید توقع است کہ برون ثنوی خداوندگار مولانا قدس سرہ العزیز ثنوی انشا فرماید بہت
خواطر و دستمال کہ برآں وزن از خواندن بسیار خوش گردانند و این وزن در ایشان نشاء است کہ لے دیگر بسیارند
زیرا کہ ہر نظم کہ گفتہ آید بطریق متع و تشبہ حضرتش بودہ است ہم بریں وزن کتابے سامعین اولے بود و زیرا کہ معنی
مناجعت و مشابہت و دین اہل و اہل است بموجب التماس ان بزرگ و بہت آنکہ نے "بحضرت مولانا قدس سرہ
العزیز مخصوص و منسوب است ایں ثنوی را از رباب" آغاز کردہ شدہ
(مختص ترجمہ) اس ثنوی کے کھنے کا سبب یہ ہوا کہ ایک اہل دل بزرگ نے عقیدت مندانہ درخواست کی کہ خواجہ
کی ثنوی - الہی نامہ - کے وزن پر تو آپ نے ایک ثنوی لکھ دی ہے (مگر) ہم کو امید ہے کہ حضرت مولانا رحمۃ اللہ کی
ثنوی کے وزن پر ایک ثنوی اور لکھ دیں گے۔ ان احباب کی خاطر جو اس وزن (کے اشعار) ہمیشہ پڑھتے رہنے سے اس کے
خوگر ہو گئے ہیں اور یہ وزن ان کے دل نشین ہو گیا ہے۔ (نیز) اس لئے کہ اب تک ہر نظم میں آپ نے حضرت مولانا کا
متع اور تشبہ ملحوظ رکھا ہے اس وزن پر (دوسری ثنوی) کھنے سے مناجعت اور مشابہت کا مقصد زیادہ بہتر
اور مکمل صورت میں پورا ہو جائے گا اس بزرگ کے التماس سے اور اس لئے بھی کہ (لفظ) "نے" حضرت مولانا
رحمۃ اللہ کے ساتھ مخصوص و منسوب ہے اس ثنوی کو "رباب" (کے لفظ) سے شروع کیا گیا۔

اس ثنوی کا آغاز سن ۱۰۰۰ میں ہوا اور تکمیل تقریباً مہینے میں اس سنہ کی ذی الحجہ کو۔

رد و لہ خامش کش ایں سرور از
غرہ شعبان شد آغاز کتاب
در سنہ سح ما تہ بہر ثواب

دروہ ذی جوشد ہم ایں تمام سانس اندر بخور معنی غم نام
دو نوں مثنویوں میں ہر نظر سے پہلے چکر سطرۂ شکر کے عنوانات ہیں جن میں ان چیزوں کی مختصر
تشریح ہے جن پر اشعار میں خیال آرائی کی گئی ہے۔
دو قول کے ششہ اور پچھتہ الفاظ اور چست بندشیں مصنف کی کمال شاعری اور پچھتہ مثنوی کی دلیل ہیں۔ پہلی
مثنوی کا انداز بیان مولانا رحمۃ اللہ کی مثنوی سے اس قدر ملتا جلتا ہے کہ اگر دو قول کے اشعار ملا دئے جائیں تو
فرق کرنا دشوار ہو جائے گا۔

پہلی مثنوی کے دیباچہ میں اپنی غزلیات اور ان میں حضرت مولانا کے خیالات اور اسلوب بیان کے ساتھ
تشبیہ و تمثیل کا بھی ذکر کیا ہے۔ یہ مثنوی حجم میں دوسری مثنوی سے کم ہے۔
اس مجموعہ کی تقطیع متوسط ہے۔ عہدوں کا غذا اور خطا باطل یکساں ہے۔ چند مصرعوں کے سوا جو بظاہر تسلیس ہیں
سارے کتاب کی شرح میں ہے اور ایک ہی شخص کی کبھی ہوئی معلوم ہوتی ہے کہ کتاب نے اپنا نام نہیں نکھارنا۔ تاریخ
اور سنیہ کتابت کلمہ کر چھوڑ دیا ہے۔
”تمت الکتاب“ جلد ۱۲، روزنامہ ”ہم ماہ محرم الحرام سنہ ۱۳۹۷ھ“ (۱۲/۱۳۹۷)
یہ مجموعہ ہر اعتبار سے قیمتی اور قابل قدر ہے۔

(۲) تحفۃ الاخبار

یہ مدراس کرناٹک اور میور کے مقامی حالات کی عمدہ تاریخ ہے جس کو منشی غلام حسین خاں نے ایلیٹ صاحب گزشتہ
مدراس کے عہد حکومت میں لکھا ہے۔ اس میں تاریخ تفصیلی نہیں۔
پہلی فصل میں ان روسائے کرناٹک کے حالات ہیں جو عہد عالمگیری سے ۱۷۸۷ء تک برسرِ مارت رہے ہیں۔
دوسری فصل میں مدراس کے گورنروں اور ان کی طرز حکومت کا ذکر ہے۔
تیسری فصل میں انگریزی قوانین کے متعلق اظہارِ رائے کیا گیا ہے۔
چوتھی فصل میں انگریزوں کی معاملہ نموی اور عدل و انصاف کا بیان ہے۔
پانچویں فصل میں کرناٹک کے قدیم جاگیرداروں اور راجاؤں کے حالات ہیں۔ یہ حالات و واقعات
کس صاحب کی سچ اور قابل اعتماد ہیں اس کا فیصلہ تاریخ دان ہی بہتر کر سکتا ہے۔
زبان صاف و سادہ ہے۔ کاغذ قدیم سبز کاغذ، خط قدیم اور تقطیع بڑی معنویت کی تعداد ۱۶۷ سنہ ۱۳۹۷ھ
سنہ ۱۳۹۷ھ مطابق ۱۷۸۷ء تک کی ہے۔

(۳) لغات عالمگیریہ

فہرست میں اس کا نام ”مفاح اللغات“ غلط درج ہوا ہے۔ مصنف ”فاضل خاں“ اور اے عالمگیری ہی ہے۔
ہے۔ غالباً دربار شاہی میں تحفۂ گویش کرنے کی غرض سے جیسا کہ دیباچہ میں اشارہ کیا ہے۔ تخریج کا تحفۃ والہمدیہ

کیا ہے اور پہلی خط میں حدیث باقول محالی باکلمات موقوفہ کئے ہیں اور ان کے نیچے چار مصرعے: بیجا عربی میں ہے جس کا صرت ایک درق رکھتا ہے اور کتاب کے آخر میں لگا ہوا ہے۔
شاعر کے نام شخص اور زمانہ کا پتہ نہیں چلا سکا کلام کا انداز ایرانی ہے اور طباعت بھی وہیں کی معلوم ہوتی ہے۔

(۸) جنت الفردوس

ذہبی رسالہ ہے۔ اس کی ۳۱ فصلیں ہیں جن میں نماز قرآن خوانی صبر وغیرہ کے فضائل درج ہیں۔ کاغذ اور خط معمولی ہے مصنف کا نام اور سنہ تصنیف معلوم نہ ہو سکا۔ صرت اتنا ظاہر ہوا کہ حاجی ابن ترک سلطان کمال الدین کے ایمانے لکھا گیا ہے۔

(۹) رسالہ در فرقہ فارسی

اول اور آخر سے ناقص ہے۔ اس لئے مصنف کے نام اور سنہ تصنیف کا پتہ نہ مل سکا۔ صفحہ ۴۱ کے بعد دو صفحے غائب ہیں۔ محتاج وصیت اور قصاص وغیرہ کے مسئلے بحوالہ کتب وائے مختصر لکھے ہیں۔ مسائل کے ضمن میں بعض ائمہ فقہ کے حالات بھی درج کر دیے ہیں۔ کاغذ خانی قدیم اور رسم الخط نسخ ہے اور موجود مصحفی کی تعداد ۲۶۱ ہے جو حقیقت مجموعی رسالہ بہت اچھا اور کارآمد ہے۔

(۱۰) گننام رسالہ

فہرست میں اس کا نمبر ۲۰ ہے۔ آگے گننام لکھا ہوا ہے۔ اس جلد میں پہلا رسالہ فقہی مسائل کا عربی میں ہے۔ جس کے نام اور مصنف کا پتہ نہ ملا۔ دوسرا رسالہ شیخ علی مستفی کے رسالہ العبادات انصاف فی الواعظ والنصیحتہ کا پہلا حصہ ہے مصنف کا پورا نام علی بن حسام الدین مشہور بہ مستفی ہے۔ جلد سازی کی غلطی سے صفحہ ۱۵۹ کے درمیان ۵ درق کسی اور رسالہ کے آگئے ہیں جو عربی میں ہیں۔ کاغذ چکنا اور قدیم ہے۔ تقطیع چھٹی اور خط معمولی۔

(۱۱) بدایع الانشاء

اس کتاب کے سابق مالک عبدغنی صاحب فہمہ زبانی کاوری ساکن گلگتہ، زریاست حیدرآباد دکن اس نے درق پہ ایک مختصر نوٹ میں داد تحفۃ فیہ دی ہے کہ "بادشاہ مالوی نے اپنے فرزند عزیز قوت العین رفیع الدین حسین کی تعلیم و تربیت کے لئے میرنشی یوسفی سے تصنیف کرائی لیکن مصنف لکھتا ہے کہ:-
"ایں رسالہ ایست سعی بدایع الانشاء و متکل پر محاورات خطابی و جوابی کہ بہت فرزند عزیز قوت العین حسین حسین طالع عوف و صابر طابان در تبر عبادت و قید کتابت فی آئینہ"
اس عبارت کے انداز اور الفاظ کی نوعیت سے صاف ظاہر ہے کہ یوسفی نے اپنے ہی بیٹے اور دوسرے نائب کے لئے یہ انشاء لکھی ہے۔ مالوی بادشاہ کا کوئی بیٹا رفیع الدین حسین نامی نہ تھا۔
مقدمہ میں قابل مصنف نے انشاء کی تقسیم اس طرح کی ہے

فنِ انشا منقسم می شود بدو قسم یکے تو قیعات کہ مضامین آن خطوی برائشکہ احکام سلاطین و حکام است و دیگر محاورات کہ ترکیب آن اسما و صور و کتاباں مضامین است۔

و محاورات منقسم می شود بدو قسم است۔ از برائے آن کہ خالی از آن نیست کہ در تہ مکتوب الیہ از کتاب لذت ترست یا فروتر یا مساوی است اگر لذت ترست موافقت گویند اگر فروترست زجاج و اگر مساوی است مراسلات و ہر یک انہیں اقسام منقسم می شود بہ خطابی و جوابی۔

نمونہ کے طور پر جتنے خطوط اور مراسلات درج کئے ہیں ان میں الفاظ کا جن انتخاب فقروں کا دروہست ان کی شستگی اور عقل مصنف کی اعلیٰ قابلیت اور پختہ مشق کا روشن ثبوت ہے۔ بعض تصنیف مصنف کے ان اشعار سے ۹۴ نکلتا ہے۔

اے امہ کردوست فنِ انشا و بہ نظام کردہ خوشش بدایع الانشا۔ نام
محرار کنی جو نام اور ایک بار شک نیست کہ رہ بری بسال تمام
بحساب جمل "بدایع الانشا" کے اعداد ۱۰۰۰ ہوتے ہیں جن کی تکرار سے سلسلہ نکلتا ہے۔
یہ کتاب بہت کمباب ہے۔ یاد اگر غلطی نہیں کرتی تو اس کا ایک نسخہ صرف راسپو کے کتاب خانہ میں
نہا گیا ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔
مصنفات کی تعداد ۲۶۲ ہے۔ انفس ہے کہ اخیر کے ۹۷ حصے آدھے آدھے دیک کی نذر ہو گئے ہیں۔
کاغذ خطی قدیم اور دیر ہے۔ خط نہایت عمدہ اور پختہ متعلق۔

(۱۲) خمسہ نظامی۔

ایک جتنے حصے نظر سے گزرے ان میں یہ خمسہ ہر لحاظ سے بہترین ہے۔ اس مجموعہ میں ۶ مثنویاں ہیں۔
مخزن امرار۔ خسرو شیریں۔ بیلی مجنوں۔ ہفت پیکر۔ سکندر نامہ۔ اور شرف نامہ۔ مثنوی ہفت پیکر میں ۱۱ مثنویاں تصور ہیں
بھی ہیں جن کے رنگ و طرز سے معلوم ہوتا ہے کہ راجپوتانہ کے انداز میں بنوائی گئی ہیں۔ خط ایرانی ہے نہایت
صاف اور بے عیب قلم کی شان اول سے آخر تک ایک ہے جو دلیں مالتی ہیں۔ شروع کے دو صفحہ ایرانی نقاشی
اور نازک ترین بول قلم کاری کا بہترین نمونہ ہیں۔

مجموعہ کے آخری صفحہ پر کتابت نے اپنا نام اور سنہ کتابت لکھا تھا مگر کسی اصحق نے کتاب کا نام اس پر طے
ٹایا ہے کہ پتہ چلا نا ممکن ہو گیا ہے۔ ملاحظہ ہو۔

"کہ فرخ الکتاب من ترویج نثر الکتاب بعون الملک ابوبابہ ختم حقیقت شیخ الاسلام قطب المصطفیٰ
شیخ نظامی قدس سرہ العزیز علیہ العالیہ الضعیفین الی جتہ اللہ العالی۔ غفرہ و ثوابہ و ستر
محبوبینی عاشر شہر ربیع الاول سنہ ۹۷۱ ہجری بمطالعہ و تسمیہ۔"

کاتب کی فطرت و راسخی ادبیت کے خلاف ہے کہ دو جا بجا تکرار کئے۔ اس تعریف جا و بیجا
ہیں بھی توافق سے شوزمین سے اٹھ کر آسمان پر پہنچ جاتا ہے۔ وہ اکثر و بیشتر تو آسمان سے پہنچ کر زمین ہی
پر آ رہتا ہے۔

ان پانچوں ثنویں کے جتنے جتنے مقامات خصوصاً وہ حصے جو جامعہ کے نصاب کے سلسلہ میں برسوں سے زیر نظر چلے آ رہے ہیں، بغور دیکھ کر حیرت بھی ہوئی اور مسرت بھی کہ یہ مجروحہ متداول اخلاط سے پاک ہے۔

(۱۳) دیوان حافظ

سورت میں ایک مشہور امیر نواب غلام بابا خاں گزرے ہیں جن کے نام مرزا غالب کے متعدد خطوط اردو کی اور عہد ہندی میں موجود ہیں۔ یہ بے نظیر نسخہ ان کی کتاب خانہ کا ہے جو علامہ امین مولوی انوار احمد زہری مرحوم سفیر کافرٹن کو ان کے زمانہ قیام سورت میں نواب ندوچ کے پوتے نواب میر حفیظ الدین احمد خاں نے عطا کیا تھا۔ سرورق پر نواب میر غلام بابا خاں مرحوم سی آئی ای کی مہر ثبت ہے اور اس سے آگے صفحہ پر انوار احمد صاحب مرحوم کا لکھا ہوا یہ نوٹ ہے۔

”ابن نسخہ نادر دیوان حافظ از کتاب خانہ نواب میر غلام بابا خاں مرحوم سی آئی ای بہ اباحت“
نواب زادہ میر حفیظ الدین خاں صاحب گرفتہ داخل کتب خانہ سلطان جہاں منزل کروم۔“
غاکسار انوار احمد زہری از مرحوم مقام سورت
۲ جنوری ۱۹۱۶ء

اس کے بچے نواب میر حفیظ الدین احمد خاں نے یہ فقرہ لکھ دیا ہے۔
”بیاس خاطر محبی انوار احمد صاحب بخیریم۔“

عاصی تہ حفیظ الدین خاں

دیوان کے آغاز میں وہی دیا جا چکا ہے جو اکثر مطبوعہ نسخوں میں پایا جاتا ہے آخری صفحہ پر ایک جگہ عبارت بے جوڑ ہو گئی ہے غالباً کتاب کے کچھ حصہ ہوا چھوڑ دیا ہے۔
تفصیل متوسط کاغذ سرخی مالکی بادامی بست ویز۔ ہر صفحہ پر طلائی اشعار سے ظاہر ہوتا ہے کہ کسی شائق امیر کے لئے لکھا گیا ہے تمام جہد نہیں تھیں اور طلائی نہیں۔ خط بہترین شعلیں ہے۔ ابتدا کے اہم سطور پر کہیں کہیں روشنائی آگئی ہے بعض صفحات پر آب سیاحی کے نشانات بھی ہیں۔ کہاں اور کب لکھا گیا کس نے لکھا یہ کچھ پتہ نہ چلا۔ بہر حال نسخہ بہت قیوم اور نادر ہے۔

(۱۴) شرح ذوان السعدین

یہ حضرت امیر خسرو کی مشہور مثنوی ذوان السعدین کی نہایت بہترین شرح ہے جو بعض احباب کی ذہائیت سے حضرت شیخ نورالحی محدث دہلوی نے تیار کی ہے۔ یہ حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے فرزند کبریت تھے۔ نیز القاری شرح شیخ بخاری کے سوا آپ کی اور تصانیف بھی ہیں جن میں سے ایک تحقیق الروایہ میں ہے۔ غیر مطبوعہ اور کیا ہے اس کا ایک نسخہ خانقاہ مجددیہ مرہٹہ خیریت میں موجود ہے۔ حضرت شیخ نورالحی محدث الامامی علیہ الرحمۃ سے بیعت تھی۔ اور خرقہ خلافت حضرت عروت انور علی خواجه محمد معصوم رحمۃ اللہ علیہ سے لیا۔ مکتوبات امام ربانی (جلد سوم) میں مکتوب سوم ”ان کی نام ہے۔“

ہے۔ دوسری نقل اخوذ بہ بالنا س تک۔ سب سے اخیر کا ایک صغی غائب ہے۔ اس لئے سنہ کتابت وغیرہ کا پتہ چلا قطعاً بڑی ہے۔ کاغذ خانی پکنا اور مضبوط۔

(۲۰) محمد فی المحمد

یہ کتاب ابو بکر سعد زنجی والی شیراز (۶۸۸-۶۲۳) کے حمد کی تصنیف ہے۔ مصنف نے اس دور کے مسلمانوں کی ضعیف الایمانی اور اسلامیات کی طرف سے غفلت و لاپرواہی کا شکوہ کرتے ہوئے ایسی کتابوں کی ضرورت پر زور دیا ہے۔ یہ تمام ضروری اعتقادی مسائل صحافت اور آسان زبان میں لکھے گئے ہیں۔

ابو بکر سعد زنجی کے نام پر مضمون کرنے کی وجہ یہ بتائی گئی ہے
”تمنا و تعلق ان در دہانے عوام افزوں تر باشد و نظر ان در دیدہ ہا کما تقلید بزرگ ترازیں وجہ
آن را یہ ذکر نہ برگزیدہ خدا بہ بادشاہی بقیہ صالحہ لوگ و مسلمانین اسلام بادشاہ نیاز مند دین
ترحم دل درویش نواز سفر سلطان آباد ابوبکر سعد زنجی کہ ہموارہ در نظر و گفت خداے با و معنوں
گردانید“

سروق پر مصنف کا نام امام توبیسی یا توریسی لکھا ہوا ہے۔ کتاب میں تین باب ہیں اور ہر باب میں دس فصلیں۔
باب اول۔ در ایمان خداے عزوجل۔

باب دوم۔ در ایمان بہ فرشتگان و کتاب ہما و پیغمبریں۔

باب سوم۔ در مسائل اعتقادی بر موجب کتاب سنت و اجماع امت۔

مسائل آسان اور مدلل عبارتوں میں لکھے ہیں۔ اس نوعیت کی کتابیں بہت کم دیکھنے میں آئیں۔ کس سنہ میں لکھی گئی اس کا پتہ نہیں چلا۔ خط صاف اور علاوہ ہے۔ صفحات کی تعداد ۲۲۲ ہے۔

(۲۱) منظر الحق فی الامتہ السماع

یہ رسالہ کمال صفی حسینی قزوینی کی تصنیف ہے جو سیدہ السادات حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو داز کے متقیدین میں سے تھے۔ نادانوں کو روایات اور اصطلاحات فقہ کے ورد و اتجار سے بچانے کے لئے لکھا گیا ہے۔ خط بخیرہ و متعلیق ہے۔ آخری چند صفحے ضائع ہو گئے ہیں۔ اس لئے سنہ کتابت وغیرہ کا پتہ نہ چلا۔

(۲۲) کلیات حرمیں

اس مجموعہ میں پہلے قصائد ہیں پھر یہ ترتیبی غزلیات۔ غزلوں کے بعد رباعیات و قطعات ہیں۔
سنہ کتابت وغیرہ کا پتہ نہ مل سکا۔ بظاہر بہت زمانہ کا لکھا ہوا معلوم ہوتا ہے شروع کے دو صفحوں پر
خوشنخیز حرمیں کا مولفہ دیباچہ ہے۔ کاغذ ولایتی ہے۔ کھرا سفید۔ خط نستعلیق۔

حقیقت فکر اثبات روتیہ لاکھ لاکھ سلیم۔ روز قیامت۔ مناقب صحابہ کرام۔ صبر و شکر۔ مراقبہ عبودیت۔ استغفار۔ ذراست۔ قنوت۔ حقوق والدین۔

ان میں سے ہر ایک پر حضرت شاہ عالم کے ارشادات بڑے عالمانہ اور محققانہ ہیں۔ جامع کتاب ہر موقع پر جن القاب اور دین ادب و احترام سے ان کا نام لیتا ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت موصوف بڑے بلند پایہ عالم اور بڑے عالی مرتبہ موصوف تھے اور خواص و عوام سب ان کا اتہائی ادب کرتے تھے۔

خدمت سے مجبور مطالعہ کرنے والے کو اس کتاب میں ایسے مسائل ملیں گے جن کو زوایہ سے الگ کر کے اگر لکھا کر دیا جائے تو تصوف سے ذوق رکھنے والوں کے لئے بہت مفید اور دلچسپ ثابت ہوں گے۔

کتاب میں نہ کہیں جامع کا نام لانا کتاب کا نہ سنا کتابت۔ البتہ سرورق پر ان اصحاب کے نام مع نہیں کے درج ہیں جن کے قبضہ میں نسخہ رہ چکا ہے۔

۱۔ من نعم اللہ علی عبدہ ابن شیخ بہار الدین۔

۲۔ نیک ملک اہل بیت النبی ابو الحسن حسینی نقشبندی مہر میں ہے۔ خادم درگاہ ابوالحسن دیوانہ۔

۳۔ رسالہ دئے حضرت شاہجہ از کتاب خانہ نواب نیک عالم خاں خواجہ عباد اللہ دریہ گرفتہ دم ہراج تبارخ غرہ جمادی الاول ۱۰۸۱ھ۔

۴۔ ایں رسالہ جماعت شاہجہ جلد ششم از خواجہ عباد اللہ نانیہ اہل کمال فقیر حمید حسین الدین حسینی تبارخ غرہ جمادی الثانی ۱۰۸۱ھ دریہ گرفتہ مہر میر حسین الدین ۱۰۸۱ھ۔

عبدالحمید خاں

قاضی عبدالغفار۔ ایسا اچھا رسالہ اور ایسی دیدہ زیب صورت میں
انتہر رائے پوری۔ اب تک میں نے نیا دور کا ذکر نہ کیا تھا اب جو اسے دیکھتا ہوں تو حیرت
ہوتی ہے۔ آپ نے ترقی پسند تحریک کو اس دشنام سے بچایا کہ اس کی نہ جانے کے لئے کوئی معقول
اور مستقل رسالہ لکھ نہیں یہ

نیا دور

نمبر ۸ شائع ہو گیا ہے
مضامین: محمد بن عسکری، عبدالقادر سروری، اختر انصاری، کنہیا لال کپور، نظام الحق، ابو نکر، کوٹلی
افسانے۔ از قزوین حیدر، ابن سبیر، راج، مہر، پریم ناتھ، پروسی، شکر، صدیقی، منتصار
نیو تنوی، صدیق، سنج، اقبال، متین، اکالی گرو، جین، سنگھ، گرو، پندر۔
نظمیں: شاعر، قاتل شقی، اشعر، آبادی وغیرہ۔
چند سال چھ روپے۔ نیا دور "بھگور سٹی"۔ فی پرچہ عرصہ کھدار

(مستر ریشہ پریشی ایم حیدر آباد کے کامیاب نوجوان افغان تھکڑا ہیں۔ آپ کے افسانوں کا مجموعہ "من کی دنیا" ادارہ ادبیات اردو سے شائع ہو کر بہت مقبول ہوا اب آپ ایک دوسرا مجموعہ مرتب کر رہے ہیں) ادارہ

جھنکار

فاروق اپنی خالہ زاد بہن فیروزہ کے ساتھ اپنی کیل میں شریک ہوتا تو اس کا دل دھڑکتا رہتا تھا۔ فاروق کی شرارتیں کیسی مادی تھنڈی اور گھبرائی ہوئی تھیں۔ آٹ ایک رات اس نے وہ خواب بھی تو دیکھا تھا۔ گردلوں کی شادی کا نقشہ تھا چھاپا اور توڑے کیسی شرم کی بات گزرا یا کہ مگر وہ خود دہن بنی مٹی تھی۔ اور فاروق..... فیروزہ کا دل سننا اٹھا۔ اور پسینے بھی ٹھنڈے۔ ہوش کرنے والے اسی زمانے میں چھوٹے چپو وہ بخار ڈالے آگئے تھے جس میں کئی عورتیں لی کر گئی تھیں۔ کڑو محبت کرو۔ چھوٹے چپا تو بیکارڈ کے ساتھ خود بھی گائے تھے۔ پر فیروزہ کیا کرتی بے چاری۔ اور اس دن جو چھوٹے چپا اپنی مومنے والی سسرال لائے گئے تھے۔ اس کی کسی درگت بنی تھی چھوٹے چپا وہ رکاوڑ اپنے ساتھ لیتے گئے تھے۔ لیکن اس کی ایک ہلکی سی گونج فیروزہ کے دل میں بھلتی رہ گئی تھی چھوٹے چپا کی شادی کا دھیان..... اور اس کے بعد اسے یوں محسوس ہوا لگا جیسے اس کے چاروں طرف عورتیں ہی عورتیں جمع ہیں اور اسی گائے کا شور مچ رہا ہے۔ کوئی اس کے اندر بھی گائے لگا کر لو محبت کرو۔

فیروزہ نے گھبراہٹ کے عالم میں آنکھیں اوپر اٹھائیں۔ فاروق..... اور فیروزہ کی نظروں نے وہی گیت فاروق کو بھی سنا دیا۔ دھمک۔ دھمک۔ کرو محبت کرو۔ فیروزہ وہاں سے بھاگ کھڑی ہوئی۔ اب وہ فاروق کا سامنا کرتے ہوئے جھک کر ماری تھی۔ پلو کی آڑ کافی نہ ہوتی تو دروازے کے پٹ نے پناہ دی۔ اپنا کی یہ اجنبیت۔ کیسی دھچک۔ کیسی عجیب تھی۔ جین ہضم بند میں جوان انگلوں کی تاب نہ لاسکا۔ پہلی ہی نظر میں ٹوٹ گیا۔ اور ایک اٹھانڈہ دونوں کو ایک دوسرے

سے قریب کر رہا تھا۔ اور بھی..... فیروزہ دور مٹی گئی۔ وہ انہی کی آواز مٹی قابل عبور آ رہی ہے۔ کوئی فاروق کے دل سے پوچھے۔ اسے تو ایسا معلوم ہونے لگا۔ جیسے فیروزہ نے بھی۔ کوئی آسانی خلق تھی۔ زمین پر آئی پھر آسمان پر چلی گئی۔ مگر وہ آسمان سے تارے کو تو لانا چاہتا تھا۔ اس کا دل بھل چل کر اسے دروازے کی طرف دھکیل رہا تھا۔ اور فیروزہ کی بھانجی ہوئی آنکھیں اس کے قدموں میں بھی جا رہی تھیں۔ آج اس کی سبھ میں آ رہا تھا کہ لوں کے میل کو ریتہ اور دولت کی ٹھیل سے دور کا بھی تعلق نہیں اس کے ہاں۔ باب دولت مند اور فیروزہ غریب ہے۔ تو اپنی امارت داری پر اکر پڑے ہوئے غریب نعید فیروزہ سے آنجان کیوں رہا جائے۔ فیروزہ کو دولت اور حیثیت کی خاطر کتنا کٹھنی پڑی بھول ہو گئی۔ اس نے اپنے باب کے کتا بکدی اس نظام کی تعمیل میں اپنی خالہ کے ہاں آنا ہانا جو چھوڑا رکھا۔ آج اس کی غلطی دروازے کی آواز کی صورت میں اس کا راستہ روکے کھڑی تھی۔ "فیروزہ ہم سے پرہ کر رہی ہو" اس نے گھبرائے ہوئے لہجہ میں کہا۔ فیروزہ کیا جواب دیتی دروازے کے پٹ کو خفیہ سی حرکت ہوئی۔ چوڑیاں بھٹکیں۔ اور فاروق کے دل میں ہزاروں جگنو ٹھلنے لگے۔ فیروزہ کی ہاں کے قدموں کی آواز نے اس طرفانی کش مکش میں سکون کی لہر دوڑا دی۔ خالہ بی۔ یہ فیروزہ کی ہاں سکرانے کو نہیں کہ ان کی جنموں پٹائی کی طرف کھینچ گئیں سکرانے کی یہ لکھی ہی کن حزن و دلال کے جنور میں بچ کر رہ گئی۔ فیروزہ کے چہرے کی تنہا ہوں اور اس کی خود فراموشی کو بھاپ گئی تھی۔ وہ اس بوجھ سے جس قدر بلد ہو سکے بلکہ شش ہونا ہونا ہی تھی لیکن جنہر میں سوئے کے پازہ اور دوسرے مطالبوں کی تکمیل بیوہ ال کے بس کی بات نہ تھی۔ اس لئے کوئی اچھا پیام جتنا تھا۔ فاروق کے پاس شک کا کوئی لڑکا تو نہیں ڈھونڈا۔ سے نہ تھا۔

سے سہیل کی طرف ڈھکیل دی گئی۔ وہ روتی رہی۔ اتنا دل
فیروزہ کو زندگی بھر میں جتنے آنسو وہ بہا سکتی تھی ایک
ایک قطرہ کر کے اس کے کنبہ میں جذب ہو گئے۔ اس کا
دل اس بچہ کی طرح دہشت زدہ اور مجاہد نامت کے
زیر اثر لرز رہا تھا جس نے دیا سلائی کے کھیل میں
گھر کو آگ لگا دی ہو۔

فاروق۔ فیروزہ کا نہیں۔ نہیں نہیں سونا کے سارے
تماشاویوں نے پکار پکار کر کہا۔ پر وہ بیس کے اداکاروں
نے سچ سچ کر کہا اور خود فاروق نے کہہ دیا۔ فیروزہ
میں تم سے محبت کی جھبک اٹھتی ہوں۔ میں مجبور ہوں
میں ان ایندھنوں کو جنہیں توڑ سکتا محبت ان ڈھکوں میں
سے بے نیاز ہے۔ لیکن تم میری مجبوروں کو کبھو مجھے
ٹھکراؤ نہیں۔ فیروزہ کو بھی کھاس کی طرح سنگ اٹھی۔ غم
کی طرح آپ مجھ پر کچھ خرچ کر اپنی دہلی کا سامان ڈھونڈ لے
تھے۔ مجھے جبر تھی۔ میرے دل سے میل رہے تھے۔ اور
میری تباہی کی پیش بندیاں کی کئی تھیں۔ مجھے علم نہ تھا۔
وفا دار۔ فریبی۔ اس کے بعد وہ فیروزہ وطن بنی بیٹی تھی۔
بادش کے قطروں سے لدی ہوئی ٹہنی کی طرح رو پڑی۔
فاروق مجھے معذرتی دولت نہیں چاہیے۔ مجھے یوں
بچ رہا ہے۔ میں اکیلان چھوڑ رہا ہوں۔ چلو اس دنیا ہی کو چھوڑ
جائیں۔ جہاں انسانوں کو درجنوں میں تقسیم کیا جاتا
ہے۔ اور دل پاؤں کے روندے جاتے ہیں۔ کیا تم میری
بات نہ مانو گے۔ فاروق نے فاروق نے کوئی جواب نہ دیا۔
اور فیروزہ دنگ برنگ کے دھڑبڑ بھالوں میں سے غل کر
جھانک اندھروں میں کھوئی۔ اس پہلی ہی غم کرنے
اس کے شیرازہ حیات کو وہم برہم کر دیا۔ فیروزہ اپنی ماں
سے بھی سارا حال کہہ سکتی لیکن وہ فاروق کو شادی پر
رضا مند کر لینے کے سوا اور کیا ستورہ دے سکتی تھی۔
پر کیا وہ نہیں جانتی تھی کہ ایک لفظ ان کی کو کسی نوجوان
کا من جیتنے کے لئے کیسی کھٹنیاں بھیلنی پڑتی ہیں۔

ابھی یقین تھا کہ فاروق کے اصرار پر ماں اب اس رختہ کو
ہرگز پسند نہ کریں گے۔ لیکن وہ پھر سوچنے لگی۔ شاید
فاروق کے اصرار پر ماں بائیں۔ شاید۔ فیروزہ کی قسمت
اس کی طرح حسین ہو۔ انھوں نے فاروق کی آمد و رفت
کو خطرناک تو ضرور محسوس کیا، پر فاروق کے ساتھ ان کے
سلوک میں کوئی نمایاں فرق پیدا نہ ہوا۔

فاروق روز آنے لگا۔ وہ نئی نئی آن بان لگتا
آتا۔ دولت منداں باپ کی دولت اولاد کے حوصلے بڑے
نہ کرے تو حق کفیاں کب رنگ لائیں گی۔ فیروزہ تو دیکھ
نہی فاروق کی طرف اٹھتی تھی۔ اب اس کی دولت نواز
دستی نے تو اس کے دل کو سارے سہاروں سے
توڑ لیا۔ فیروزہ کا دل فاروق کے قدموں میں آگرا۔

ایک دن باقوں باقوں میں فیروزہ کی ماں نے
پوچھ ہی لیا۔ بیٹی فاروق بڑا اچھا لڑکا ہے۔ مجھے پسند
ہے۔ فیروزہ نے شرار کر سمجھا لیا۔ مگر بھی ایک بات
پوچھتی ہوں۔ فاروق نے کسی شادی کا ذکر بھی پھڑپھڑا
ہے۔ فیروزہ جواب دیے بغیر اپنے کمرہ میں چلی آئی۔
ایک تئویش ناک سنسنی اس کے دماغ میں کسی موسیقی
کی طرح جھنجھٹائی ہوئی گھس پڑی تھی۔ اس نے
تنبہ کر لیا کہ آج وہ فاروق کے ساتھ سینما خانے کی
آج تک اس نے اس کی اس خواہش کو ہمیشہ ٹال دیا
تھا۔ پر آج تو اسے جانا ہی ہوگا وہ سینما ضرور جائے
گی اور وہیں اسے فاروق کے دھمکات کا پتہ چل
جائے گا۔

سینما سے واپس ہونے کے بعد فیروزہ جب
فاروق کی موٹر سے اترتی تو اسے پہلی بار اپنے پیر
تکے زمین کی سخت اور کھردری سطح کا احساس ہوا اور
جب فاروق کی موٹر کا شور دیکھ دیکھ بے آواز ہو گیا
تو اسے ایسا معلوم ہوا جیسے وہ زمین سے ابھر کر آسمان
کی نظر نہ آنے والی بلندیوں میں کھو گئی اور پھر آن لندیا

بجھلے تھا۔ اب وہ فاروق کو اپنے لئے کیوں روک کر لے رہا تھا۔ سب کچھ دیکھتی تھی اس طرح بے تعلّق رہنا چاہتی تھی جیسے قیدی قید خانے کے وارڈ سے۔

فیروزہ کے لئے ایک بوڑھے جاگروار صاحب کا نام آیا تھا۔ خاصے مالدار آدمی تھے۔ بڑی ڈیوڑھی میں رہتے تھے۔ انھیں جینے کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ صرف ایک جوان لڑکی پر کاربند تھے۔ بسے وہ اپنی بیویہ میوزر جانا چاہتے تھے۔ بھڑوڑی سی پیروری کے بعد ان کی شادی فیروزہ سے ہو گئی۔ عجم صاحب کا علاج ابھی مکمل نہ ہو۔ نئے پایا تھا کہ جاگروار صاحب پہلے بسے وہ اس شادی کے اعتراض پر ہی میں زندگی کی کڑواہٹ گناہ سنے تھے۔ ہوئی ایک ساڈ جاگروار بے عورت کے لئے نہ ہو۔ یہ لیکن فیروزہ کی پیشانی پر تل نک نہ آیا۔ حصہ بجزوں کے بعد کچھ بھی فیروزہ کے لیے پڑا اس کی امیدوں سے زیادہ تھا۔ وہ اب امیر ہو گئی تھی۔

جوان بیوہ اور مزدور۔ ان دونوں سے حبشہ اندیشہ نکلتا تھا۔ بھلائے ایک نوجوان نے اپنے آپ کو پیش کیا۔ خیر سے تعلیم یافتہ ہے۔ شکل و صورت میں بھی بڑے نہ تھے۔ فیروزہ مال کے اصرار پر راضی ہو گئی۔ اور بھل اس کی زندگی میں اس طرح داخل ہوا جیسے کوئی بڑی رقم کا چیک بنانے کے لئے بنک میں۔ پہلے ہی دن اس نے اپنی آپن کی شادی کے فوضہ کا ذکر جھپٹ دیا۔ فیروزہ سے کوئی چاہتا اس کی جان مانگ لیتا۔ لیکن روپیہ بیسہ کے معاملہ میں وہ بھید بھٹا ہو گئی تھی۔ اس نے بھل کو ملازم بنا مشورہ دیا تو بھل نے تعین دلایا کہ فلاں جو ہیں انھوں نے تمہیں کہا میں ہیں۔ فلاں جو ہیں میرے دوست ہیں۔

فلاں جو ہیں انھوں نے وعدہ کیا ہے اور اب کوئی دن جانا ہے جو مجھے ایک اونچی کرسی پر مانعیں بھلائے ہوئے کھیاں مانے کا حکم مل جائے گا۔ فیروزہ ان اڑان کھاٹیوں میں آنے والی بنتی۔ اس نے صاف صاف نظروں میں کہہ دیا کہ

مجبوریاں مان بچی کی مجبوریاں۔ گھر سے کھیلوں کی طرف انھیں ڈھکیں رہی تھی۔ اور بڑھتی ہی نہیں۔ فاروق کا آنا بھانا اب بہت کم ہو گیا۔ کچھ دن بعد تو یہ کبھی بھلا کا آنا بھی بند ہو گیا۔ ایک فیروزہ نہ ہوئی تو کیا۔ فاروق کے ماں باپ کی دولت اس کے لئے پرویز سن اور جوانی کی خریداریاں کر سکتی تھی۔ انھیں بھنگ جاتی ہیں تو دل بھی ڈالوں ڈول رہتا ہے۔ فاروق اس چٹ کو سپہ جات کے لئے بیباک جوہر اتوڑ کم ریلوں کی فصائل میں اتنی اونچی اڑان مار گیا کہ اس کے ماں باپ کو اس کی شادی کی فکر لاحق ہوئی۔ صاحب جانداروں باپ کے بچوں کو کون بیٹی نہیں دیتا۔ ایک معزز اور لکھتی سیٹھ کی بیٹی سے فاروق کی نسبت قرار پا گئی۔ فیروزہ کے لئے یہ خیر ایک ایسی افتاد تھی جس نے اس کے ارادوں اور منصوبوں کے محل کو ڈھایا۔ اب وہ کیا کرے۔ لیکن وہ ذہر نہیں کھانے گی۔ کنوین میں وہ نہ مرے گی۔

اس کا دل ٹوٹ چکا تھا۔ لیکن اس کی شخصیت زندگی کی سانس لے رہی تھی۔ وہ زندہ رہے گی اور تقدیر کے پیڑوں کے مقابل ڈلی رہے گی۔ اچھا ہوتا جو وہ مری جاتی۔ جینے کا ایسا جھوٹا عدم بڑا خطرناک ہوتا ہے۔ یہ ایسا تیز بوتل ہے جو فراتے بڑا ہوا کسی نہ کی طرف نہیں بے مقصد ہی جھوٹ جاتا ہے۔ پھر جو بھی اس کی ڈوٹیا آجائے۔ فاروق کی شادی ہو گئی۔ شادی کے کسی مقصد ہوتے ہیں۔ فاروق نے اپنی پسند کے خلع جاتے کے بعد صرف ماں باپ کی خوشی پوری کی تھی۔ اب اس کے بعد ماں باپ کی عزت کو بھر خطہ لاحق ہو گیا۔

فاروق اپنی پھلی ڈاگر پریل ڈا۔ ڈائنٹ ڈیٹ ہوئی تھی فراہم ہوں پر روک نظام کی تھی لیکن فاروق کو یہ سمجھنا تھا نہ سمجھنا۔ فاروق کی بیوی کو شوہر کے لیے راہ روی کی کوئی ہر داہ نہ تھی۔ اس کی مرضی کو کسی نے قابل اعتنا

حیات محمد قلی قطب شاہ

از ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور

اردو کے پہلے صاحب دیوان شاعر اور شہر حیدر آباد کے بانی کی یہ سوانح حیات جدید ترین انداز میں مرتب کی گئی ہے۔ اس کی خصوصیات کا اندازہ اردو کے چند مشہور ادیبوں کی حسب ذیل آراء سے ہوگا۔

مولانا عبدالمجید صاحب دیابادی | قدرت نے اس کام کے لئے ڈاکٹر زور کو حین لیا اور انھوں نے اس موضوع پر لکھنے کا حق ادا کر دیا۔ خادم زبان و ادب ہونا تو ان کا پہلے ہی سے مسلک تھا۔ مورخ وہ اب نکلے کتاب قابل دید ہے مفصل بھی، جامع بھی اور بقدر امکان مستند بھی۔ مورخانہ شان ادبی ان دونوں موجودہ عبارت لکھی ہوئی اور شستہ۔ ہر بحث سنجیدہ اور شاکستہ۔ (صدق ۳۰ ڈسمبر ۱۹۷۹ء)

مولانا نیاز فتحپوری | پروفیسر زور کی یہ تالیف دونوں حیثیتوں سے مکمل ہے۔ یہ نقیض فن سیرت و انتقاد کے موجودہ اصولوں کو سامنے رکھ کر مرتب کی گئی ہے۔ ہر حیثیت سے معیاری چیز ہے۔ جس محنت و سلیقہ سے کام لیا ہے اس کی جتنی تعریف بچائے کم ہے۔ (نگار ڈسمبر ۱۹۷۹ء)

مولوی قاضی عبدالغفار صاحب ایڈیٹر پیام | اس لحاظ سے ہم سمجھتے ہیں کہ یہ اپنی قسم کی پہلی کتاب ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ ڈاکٹر زور کی علمی اور تحقیقی کوشش اہل علم اور عوام کے حلقوں میں قدر کی نظر سے دیکھی جائے گی۔

حکیم یوسف حسین صاحب ایڈیٹر نیرنگ خیال لاہور | خیال میں اردو زبان میں اتنی اچھی کتاب کبھی ساون بھی شائع نہیں ہوئی ہوگی۔ اس کی تیاری میں بلاشبہ سیکڑوں پرانی کتابوں کا مطالعہ کیا ہوگا اور کئی سال صرف کر دیئے ہوں گے۔

پروفیسر ہارون خواں شروانی | یہ کتاب تاریخ ادب اور تاریخ سیاسی میں ایک گراں قدر اضافہ ہے اس زمانے کے تمدن کو نہایت صاف اور واضح کر کے رکھ دیا ہے۔ تاریخی تنقیدی حصے بھی نہایت دلچسپ اور سبب آموز ہیں۔

(صفحات ۵۰۰) سے زیادہ تصویریں ملکی ۳۰ سے زیادہ

قیمت مجلد ۵ روپے ۱۲ آنے

ملنے کا پتہ سب کس کتاب گھر خیرت آباد حیدر آباد

ہماری قومی زبان

ہندستان اتنا وسیع ملک ہے کہ اس کو براعظم کہنا بجا ہے۔ ایک طرف یہ مختلف مذاہب کا گہوارہ ہے تو دوسری طرف مختلف زبانوں کا خزانہ ہے۔ یہاں رنگ برنگ کی بولیاں بولی جاتی ہیں اور ہر خطہ کی بولی جدا جدا ہے۔ اس لئے ہندستانی بچہ قدرِ ماد و زبان بولنے پر مجبور ہے۔ ایک تو اس کی اپنی مادری زبان جس کو وہ دنیا میں جنم لیتے ہی رات دن اپنے گھر میں سنتا رہتا ہے۔ اور دوسری وہ زبان جس کے ذریعہ سے وہ اپنے ملک کے مختلف زبان والوں کے خیالات سے واقف ہو سکے۔ اپنی بات انھیں سنائے اور ان کی بات خود سمجھ سکے۔

مشترکہ زبان کی ضرورت :- ہر ملک اور قوم کی ایک ایسی مشترکہ زبان ہوتی ہے جس کے ذریعہ سے افراد آپس میں تبادلہٴ خیال کے قابل ہوتے ہیں۔ جیسے عربوں کی زبان عربی، ایرانیوں کی فارسی اور انگریزوں کی انگریزی۔ یہ ایک حلیٰ حقیقت ہے کہ ایک عام اور مشترکہ زبان قومی ترقی کی اولین شرط ہے۔ دنیا کا ہر مذہب ملک ایک قومی زبان رکھتا ہے۔ کیونکہ باہمی تبادلہٴ خیال کے لئے کسی مشترکہ ذریعہ کے بغیر تعلیمین کو جانا ایک مشکل امر ہے۔ قدیم زمانہ میں جب ہماری معاشرت، معاشی حالات اور آمد و رفت کے ذرائع محدود تھے، ممکن تھا کہ مقامی زبان ہماری ضروریات زندگی کے لئے کافی ہو۔ مگر آج کل تہذیب و تمدن کی ترقی، سائنسی انکشافات اور آمد و رفت کی سہولتوں نے دنیا کے تمام ممالک اور ہندوستان کے مختلف خطوں کو ایک دوسرے سے اتنا قریب کر دیا ہے کہ اب ہماری ضروریات محض مقامی حد تک محدود نہیں رہ سکتیں بلکہ ہمیں مختلف حصوں سے رشتہ جوڑنا پڑتا ہے۔ مگر اس سلسلے میں ہمیں یہ مشکل پیش آتی ہے کہ جب ہم ہندوستان کے کسی مقام پر جانا چاہیں تو نہ ہماری بولی وہاں بھی جاتی ہے اور نہ ہم وہاں کی بولی سمجھ سکتے ہیں۔ اس لئے ضرورت ہوتی کہ ایک مقام والے دوسرے مقام کی بولی سیکھیں۔ مگر ہم اپنی ضروریات کے تحت نہ صرف ایک مقام بلکہ کئی مقامات پر جاتے پر مجبور ہیں۔ اگر ہم ہر جگہ کی بولی سیکھنے بیٹھیں تو اس کے لئے ہماری عمر و فائدہ کرے گی۔ اس لئے ضرورت ہوتی کہ ایک نہ ایک ایسی زبان ہو جس کو ملک ہند کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک سب بولتے اور سمجھتے ہوں۔

ہم اتنا گاندھی سے ہمہ سرگرم ہیں کہ ہمیں بمقام ”رام پور ہاٹ“ اس بارے میں بالکل بجا فرمایا کہ :-
”اگر ہم سارے ہندوستان کا سفر کرنا چاہتے ہیں اور یہ بھی چاہتے ہیں کہ دوسرے ہمارے پاس آئیں تو ہماری ایک مشترکہ زبان ہونی چاہئے، اور یہ زبان ہندوستانی ہے جو لوگ ہندوستان کی خدمت کرنا چاہتے ہیں ان کو ہندوستانی کے دونوں احوال اور رسم الخط اور ہندو ہند کی سمجھنا چاہئے۔“
اس ضرورت کو ہماری اپنی ہی قومی زبان ”لنگوا فرانیکا“ نے بجا ہے ہم اُسے اردو کہیں یا ہندی یا ہندستانی پورا کر دیا ہے۔ یہاں اس بات کے بتانے کی ضرورت تو نہیں ہے کہ اس زبان کو بنانے، پال پوس کر پورا و جڑ حلقے اور ارتقاء بخشنا اور اسے گزرا کر موجودہ حالت پر پہنچانے کا سہرا کسی خاص قوم و مذہب کے سر نہیں ہے، بلکہ اس کی پرورش اور پرواخت میں مادر ہند کے دونوں سپوت ہندو اور مسلمان برابر کے حصہ دار ہیں۔ یہ ایک بڑی غلط فہمی اور لاعلمی ہے کہ اس زبان کو کسی خاص مذہب یا فرقہ سے متعلق کر کے ”اردو“ اور ”ہندی“ کا جھگڑا کھڑا کیا جائے کیونکہ اردو

اردو ہندی میں بجز طرز نوشت کے کوئی خاص فرق نہیں ہے۔ بات دراصل یہ ہے کہ زبان تو ایک ہی ہے، مگر اس کا لباس جدا جدا ہے۔ ایک کو فارسی خط میں لکھتے ہیں تو دوسرے کو دیوناگری میں۔ اس کے علاوہ اردو میں ہندی کی قواعد اور یکساں فی حد سے زیادہ الفاظ موجود ہیں۔ انفس اس کا ہے کہ لوگ اس حقیقت سے واقف نہ ہوتے ہیں کہ اردو زبان انجان بن جاتی ہے۔ اردو زبان کا پھیلنا۔۔۔ ہندستان کی ان گنت زبانوں میں جس کا اندازہ ہندستانی زبانوں کے محقق مسٹر گریس کے حساب سے (۲۳) ہے، اردو کو خاص امتیاز حاصل ہے۔ دنیا میں انگریزی کے بعد اردو کو تمام آریائی خاندان کی زبانوں میں یہ فخر حاصل ہے کہ اس کے بولنے والوں کی تعداد سب سے زیادہ ہے۔ یہ نہ صرف تعلیم یافتہ افراد کی بولی ہے بلکہ یہ عوام کی زبان ہے۔ کانگریس کمیٹی کے فراہم کردہ اعداد کے لحاظ سے ہندستان میں اردو بولنے والوں کی تعداد (۱۷ کروڑ ۲۰ لاکھ ہے۔ اگر اس میں اس کے سمجھنے والوں کو بھی ملا لیا جائے تو ان کی تعداد ۲۵ کروڑ ہو جاتی ہے۔

ہندستان کے باہر ہندستانی زبانوں میں سے ہی زبان زیادہ بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ مالک غیر میں بھی اس کو بین قومی حیثیت حاصل ہے۔ چچا ز اور عراق میں تمام ہندوستانی اسی زبان میں آپس میں تبادلاً خیال کرتے ہیں اور اسی طرح چین اور ہانگ کانگ وغیرہ میں بھی اسی سے کام لیا جاتا ہے۔

اردو نہ صرف ہماری ریاست، بلکہ کل ہند اور بیرون ہند کے لئے بھی اہم ہے۔ کشمیر سے لیکر اس کماری بلکہ لکیا تک، اور بلوچستان سے لیکر برہانپور کی زبان بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ ہندوستان کی دوسری زبانوں کا جاننے والا جیسے ہلالام، تامل، تیلو، مہاشی، بنگالی، سندھی، گجراتی، پنجابی وغیرہ بولنے والا ایک علاقہ سے دوسرے علاقہ میں چلا جائے تو وہاں وہ اجنبی ہو جاتا ہے۔ کیونکہ تو وہاں کی بولی سمجھتا ہے اور نہ اس کی بات وہاں سمجھی جاتی ہے۔ مگر اردو بولنے اور سمجھنے والا ہندوستان کے کسی خطے میں بھی کسی دشواری سے دوچار نہیں ہوتا۔ حدود ہند سے باہر مشرق میں جاوا، برما، سیام اور مغرب میں عدن اور سوئز وغیرہ تک بھی یہ زبان بولی اور سمجھی جاتی ہے۔

حیدرآباد کی حد تک تو اس کی اہمیت اور بھی زیادہ ہے۔ یہ ہماری ریاست کی بین فرقہ جاتی زبان ہے۔ ہر علاقہ کا باشندہ، چاہے وہ سرہٹو، اڑھ کاہویا، کرناٹک اور تلنگانہ کا بھی زبان اس کے تبادلاً خیال کا ذریعہ ہے۔ اس زبان کو جہاں نہ صرف سرکاری، عدالتی اور کاروباری زبان ہونے کا امتیاز حاصل ہے بلکہ جاموں میں بھی ذریعہ تعلیم ہے۔ ہماری ریاست نے اس کو اپنا کاروباری ذریعہ تعلیم بنا کر جو پہل کی ہے اس کی معقولیت کو مشرق و مغرب دونوں نے مان لیا ہے، اور ہندوستان کی اور جامعات بھی اس کی پیروی پر آمادہ ہو گئی ہیں۔ چنانچہ جامعہ عثمانیہ کی پیروی کرتے ہوئے جامعہ ممبئی نے فیصلہ کیا ہے کہ ابتدا میں بی۔ اے، بی۔ سی، ایل۔ ایل۔ بی اور بی کام کا سارا انصاف اردو، ہندی میں رہے، اور ذریعہ تعلیم اردو زبان قرار دی جائے، اور آسان اردو یا ہندی زبان میں تعلیم شروع کی جائے۔

اردو زبان ہندوستان کی عام فہم زبان ہے۔ اس کے ذریعہ سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ ہندوستان کی مختلف قومیں ہم زبان ہو کر ایک دوسرے سے تبادلاً خیال کر سکیں گی، اور ہندوستان کی بین المللی معاشرت اس کے استقبال سے زائل ہو جائے گی۔ اس کا جاننے والا بنگال، آسام، گجرات، غزنو، مکران، مدراس، سری نگر، بھٹی، اوکھٹہ، عرفہ، تمام ہندوستان میں جہاں کہیں چلا جائے کسی دشواری سے دوچار نہ ہوگا۔

اردو کی خصوصیات اور دوسری۔ اردو زبان کا سیکھنا جو ہندوستان ہی نہیں بلکہ اس کے باہر بھی زبانوں پر اس کی فوقیت :- بولی اور بھی جاتی ہے کسی طرح فائدہ سے خالی نہیں۔

(۱) اردو تاجیکی، سماجی اور سیاسی اعتبار سے ہندوستان کے اتحاد اور یکجہتی کی سب سے اہم اور غلیظ الشان یادگار ہے۔ یہ زبان ہندو مسلمانوں کے باہمی میل جول، رواداری اور رفاقت کا شجر ہے۔ یہ زبان تمام ہندوستانیوں کا بلا امتیاز مذہب و ملت موروثی ترکہ ہے۔ سریتج بہادر سپرو نے بالکل صحیح فرمایا ہے کہ: "ہندو مسلم اتحاد کو اس سے بڑھ کر کوئی نقصان نہیں پہنچ سکتا کہ اردو کو جو ہندوؤں اور مسلمانوں کے اتحاد سے جی ہے، مثلاً یہی کوشش کی جائے اور یہ کہنا کہ اردو ہندو مسلمانوں کی مشترکہ نہیں ہے" تاریخ کو جھٹلاتا ہے۔

(۲) یہ زبان اسی ملک میں بنی اور اسی ملک والوں نے بنائی۔ اس کے بنانے میں ہندو اور مسلمان برابر کے شریک ہیں۔ یوں تو زبان کا نہ کوئی مذہب ہوتا ہے اور نہ اس کی کوئی قوم اور ذات ہوتی ہے خصوصاً اردو کی بناؤں تو کچھ اس قسم کی اور اس کی نشوونما کچھ اس ڈھنگ سے ہوئی ہے کہ یہ بلا لحاظ قوم و ملت سارے ہندوستان کی زبان ہو سکتی ہے۔

(۳) مشترکہ زبان ہونے کا دعویٰ ہر بولی نہیں کر سکتی۔ اس کے لئے چند شرطیں ہیں :-

(۱) دیسی ہو دیسی نہ ہو۔ (۲) کسی خاص فرقے اور فرقے تک محدود نہ ہو۔ (۳) ملک کے بڑے علاقہ میں

بولی اور بھی جاتی ہو۔ (۴) ہر قسم کے خیالات اور رجحانات کے ادا کرنے پر قادر ہو۔ (۵) زمانے کا ساتھ دے سکے اور حالات کے مطابق ڈھل سکے۔

یہ تمام خصوصیات اردو زبان میں موجود ہیں۔ یہ خالص دیسی زبان ہے۔ یہیں پیدا ہوئی، پہلی، پڑھی اور پروان چڑھی۔ تو یہ کسی خاص فرقہ کی زبان ہے اور نہ کسی خاص رقبہ تک محدود ہے۔ سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ اس کے بنانے اور ترقی دینے میں صرف ہندوؤں اور مسلمانوں ہی کا ہاتھ نہیں ہے بلکہ انگریز، پارسی، سکھ وغیرہ بھی اس میں شریک ہیں، اور ان میں سے ہر قوم کے لوگ اردو کے معنی، شاعر اور مضمون نگار گذرے ہیں اور اب بھی موجود ہیں۔

(۴) جب ایسٹ انڈیا کمپنی کا تسلط بڑھنے لگا اور تجارت سے سیاست کی طرف قدم بڑھا، اور ملکی زبان کے بیکراں چنانا مشکل ہو گیا تو اس کے لئے انگریزوں نے اردو ہی کا انتخاب کیا، اور فورٹ ولیم کالج کلکتہ کی بنیاد ڈالی، جہاں انگریزوں اور اردو کے ہندوستانی (اردو) کی تعلیم دی جاتی تھی یہاں ہندوستان کے قابل افراد سے اردو میں کتابیں لکھوائی گئیں، اور ترجمہ شاخ کے لئے اس میں اردو کے ہندو مسلمان ادیبوں نے مل کر کام کیا، اور ایسے قلم کے زور سے زبان کی ایسی کاپیٹ دی کہ ۱۸۳۷ء میں جب دفتر اور عدالتوں سے فارسی زبان خارج کی گئی تو اردو زبان نے اس کی جگہ لی۔ یہ اس بات کا کھلا ثبوت ہے کہ اردو ہی ہندوستان کی عام زبان بن گئی۔ اس کالج کے معلم اول جان گلکراٹ اس زبان کو ۱۸۳۷ء میں لکھا کرتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ "یہ نہایت کارآمد اور عام زبان ہے جس پر ہندوستان فخر کر سکتا ہے۔" سیاسی مشنریوں نے بھی اس کی اپنی تبلیغ کا ذریعہ بنایا، اور اس میں کثرت سے کتابیں اور رسالے شائع کئے۔

(۵) ہندوستان کی تمام فوجوں میں یہ زبان عام طور پر استعمال ہوتی ہے۔ ہندوستان کے خانگی معاملات میں کسی زبان کا ایسا عام رواج نہیں جتنا ہندوستانی کا ہے۔ کینڈوں کو درجہ فوجی تعلیم حاصل کرتے ہیں، بنگال، مدراس اور بنگالی میں ہندوستانی

سکھائی جاتی ہے۔ ہندستان میں ہندستانی مادہ ہی درجہ ہے جو انگریزی کا برطانیہ میں یا ترکی کا ترکستان میں۔
(۶) اردو زبان اس اتحاد و یکجہی کا سبق دیتی ہے۔ یہ زبان مختلف زبانوں سے مل کر بنی ہے اور مختلف زبانوں کے الفاظ ایک دوسرے سے مل کر ایسے ایک ہو گئے ہیں کہ ان میں فرق کرنا عوام کے لئے ناممکن ہے۔

(۷) یہ زبان ہندستان ہی میں پیدا ہوئی، ہندوستانیوں نے مل کر اس کو جنم دیا، پالا پوسا اور پروان چڑھایا۔ اگر اب اپنی دونوں میں اس زبان کے بارے میں آپس میں بھیجتاں جو تو ظاہر ہے کہ اس کا وہی حال ہو گا جو ماں باپ کی نا اتفاقی سے اولاد کا ہوتا ہے۔ اس کا نام گو بدیسی ہے (کیونکہ اردو ترکی زبان کا لفظ ہے) مگر نام اردو ہو یا ہندستانی، زبان تو ایک ہی ہے اور بقول خان بہادر شیخ عبدالقادر ہم نام کے پابند نہیں، ہمیں کام سے کام ہے، جو نام کسی کو بھلا معلوم ہو اسی نام سے اسے یاد کرے۔

(۸) زمانہ جنگ میں ہندستانی مسئلہ طور پر تمام دنیا میں ہندستان کی مشترکہ زبان سمجھی گئی یہی وجہ تھی کہ جاپان، جرمنی، ترکستان، انگلستان وغیرہ ہندوستان والوں کے لئے ہندستانی (اردو) میں خبریں لاسکلی کے ذریعہ سے نشر کی جاتی تھیں۔

(۹) دنیا بھر کی زبانوں میں اردو ہی ایک ایسی زبان ہے جو سب سے کم جگہ گھیرتی ہے۔ چونکہ آج کل معاشی حیثیت سے اختصار کا مسئلہ بڑا اہم ہے، اس لئے اردو زبان اس ضرورت کو پورا کرتی ہے۔

(۱۰) ضرورت ایجاد کا ماں ہے اردو زبان کی ایجاد ایک زمانہ میں ضرورت ہی کے تحت ہوئی۔ آج کل تو اس کی اہمیت اور بڑھ گئی ہے۔ ہر قوم اس کو کشش میں ہے کہ ایک مشترکہ زبان ایجاد کرے۔ چنانچہ ایک روسی عالم نے، یورپ کے لئے اسپرانٹو "زبان امید" ایجاد کی جس میں روسی، فرانسیسی، انگریزی، جرمن، اطالوی زبانوں کے الفاظ شامل ہیں، اور مغرب کا ہر ملک اپنی تجارتی، معاشی اور سیاسی سہولتوں کے لئے اس زبان کی ترویج میں مصروف ہے۔ اس کی وجہ سے تاجروں، سیاحوں اور سیاسیوں کو بڑی سہولت ہو گئی ہے۔ بقول سر شیخ عبدالقادر "ہماری اسپرانٹو وہی پیاری زبان ہے جسے کوئی اردو، کوئی ہندی اور کوئی ہندستانی کہتا ہے۔ مگر اردو مغربی اسپرانٹو کی طرح مصنوعی نہیں ہے بلکہ صدیوں میں قدرتی اسباب کے جمع ہونے سے ہوئی ہے۔ اس لئے اردو کی ترویج کا کام بہ نسبت اسپرانٹو کے آسان ہے۔"

(۱۱) اردو کے پھیلاؤ کا اندازہ اس سے بخوبی ہو سکتا ہے کہ ہندوستان کے طول و عرض میں تقریباً ۲۵ کروڑ باشندے اردو سمجھتے اور بولتے ہیں ہندوستان کے باہر بھی افریقہ، ایران، عرب اور دیگر علاقوں میں تقریباً ۳۰ کروڑ دس لاکھ اردو بولنے والے موجود ہیں۔

مختصر یہ کہ :-

- ۱۔ یہ بول چال کی زبان ہے۔ اس کے بنانے میں عوام کا بڑا حصہ ہے، اور زبانوں کی طرح یہ محض تعلیم یافتہ طبقہ کی زبان نہیں ہے بلکہ عوام کی زبان ہے۔
- ۲۔ یہ ہندستان کی دو بڑی قوموں کے اتحاد کی عزیز ترین یادگار ہے۔
- ۳۔ یہاں سے تمدن و معاشرت کا ہمہ دل و دماغ کے ستارچ اور ہمارے مادی اور روحانی خیالات کی حامل ہے۔
- ۴۔ ہمارے اسلاف کی صدیوں کی محنت، جانکھائی اور دماغی و ذہنی کاوشوں کا بخوبی ہے۔

۵۔ اور بزرگوں کی مقدس وراثت ہے۔

اُردو اور انگریزی : بعض لوگ اُردو کے مقابلہ میں انگریزی کو ترجیح دیتے اور اس کو مشترکہ زبان بنانے کے حامی ہیں لیکن حق تو یہ ہے کہ جتنی قوم وہ انگریزی کے سیکھنے پر صرف کرتے ہیں اگر اس کا دسواں حصہ بھی اُردو پر صرف کریں تو وہ آسانی سے حاصل ہو سکتی ہے۔ اس کا سیکھنا ہندوستانیوں کے لئے بالکل سہل ہے، کیونکہ اُردو شہروں، بازاروں، سڑکوں اور گھروں میں غرض کہ ہر جگہ اور ہر مقام پر سننے میں آتی ہے۔ اس لئے اس زبان سے کان آشنا رہتے ہیں اور یہ زبان ابھی نہیں معلوم ہوتی جتنی کہ انگریزی زبان ہے۔ اُردو کے سیکھنے والے الفاظ ہندوستان کی مقامی زبانوں میں داخل ہونے کے علاوہ یہ زبان ہندوستان کے اکثر صوبوں میں بھولی بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ اپنے پھیلاؤ کے علاوہ یہ زبان آسان ہے، اور اس کا بولنا اور سمجھنا بہت جلد آ جاتا ہے کیونکہ یہ ہر جگہ بولی جاتی ہے اور اس کے الفاظ بچپن ہی سے کانوں میں پڑتے رہتے ہیں۔ ہندوستان میں انگریزی بولنے اور سمجھنے والوں کی تعداد بہت قلیل ہے۔

مہاتما گاندھی فرماتے ہیں کہ :۔ بلاشبہ انگریزی بین قومی زبان ہے مگر یہ کبھی ہماری قومی زبان نہیں بن سکتی۔ قومی زبان کو ہماری قوم کے کروڑوں افراد کی ملک ہونی چاہئے۔ وہ انگریزی کو سمجھنے کا بار نہیں اٹھا سکتے۔ ہندوستانی قدرتی طور پر قومی زبان ہے۔ اس لئے کہ اسے اس وقت ۳۱ کروڑ آدمی سمجھ لیتے ہیں اور باقی لوگ بھی اسے آسانی سے سمجھ سکتے ہیں۔ لیکن انگریزی صرف چند آدمیوں (زیادہ سے زیادہ ایک لاکھ آدمیوں) کی قومی زبان ہی جاسکتی ہے۔ اگر ہندوستان ایک قوم ہے تو اس کی قومی زبان بھی ایک ہونی چاہئے۔ ایک اور جگہ ارشاد ہوتا ہے کہ :۔ "ہندوستانی زبان عوام سے رابطہ پیدا کرے گا ایک ذریعہ ہے، اور آج کل ہندوستانی ہندی اور اُردو کے مرکب کا نام ہے۔ جو شخص ہندی جانتا ہے اس کے لئے ہندوستانی آسان ہے۔"

فارسی رسم الخط کا سیکھنا بہت آسان ہے۔ اس خط میں چند ہی بنیادی حروف ہیں جو (۳۷) حروف کے قائم مقام ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ حروف کا ملانا ذرا مشکل ہے۔ لیکن حروف اور ان کے جوڑ سیکھنا زیادہ سے زیادہ ایک ہفتہ کی بات ہے۔ اگر ابتدا میں روزانہ کم از کم ایک گھنٹہ دیا جائے اور اس کے بعد روزانہ آدھ گھنٹہ کی مشق کی جائے تو چھ مہینے میں کام چلانے کی حد تک اُردو سیکھ سکتے ہیں۔ یقینی دونوں قسم کے خطوں کا مطالعہ جو ایک ہی زبان کے لئے کام میں لائی جاتی ہیں، بڑا دلچسپ ہے۔ اگر ہمارے دل میں وطن اور اہل وطن کے لئے محبت ہے تو یہ تمام کوششیں بار آور ہو سکتی ہیں۔ اور انگریزی کے مقابلہ میں اس میں کم محنت کی ضرورت پڑے گی، فارسی رسم الخط مسلمانوں کے لئے ایسا ہی ضروری ہے جیسے ہندوؤں کے لئے سنسکرت۔ اس کے علاوہ یہ خط شمالی ہند میں کروڑوں ہندو اور مسلمان سمجھتے ہیں۔ ایک دوسرے کی محبت کا تقاضا یہ ہے کہ دونوں قسم کی (فارسی اور دکنگری) تحریر سیکھیں۔

ایک غلط فہمی کا ازالہ :۔ مشہور ام بابو سیکینہ مصنف تاریخ ادب اُردو، لکھتے ہیں کہ :۔ "عام طور پر لوگ اُردو کو فارسی کی ایک شاخ خیال کرتے ہیں۔ اس غلط فہمی کی بنا پر عام لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اُردو مسلمانوں کی زبان ہے، اور ہندی ہندوؤں کی، اور اس بحث میں لوگ زبان اُردو کی اصل کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ حالانکہ زبان اُردو اس ہندی یا بھاشا کی ایک شاخ ہے جسے دیوناگری، دکنی اور میرٹھ کے اطراف میں بولی جاتی تھی۔

یہ کہنا چاہیے کہ زبان ہندی اردو کی اصل اور ماں ہے۔ زبان اردو کی صرف ونحو، محاورات، اور کثرت سے ہندی الفاظ کا استعمال اس بات کی دلیل ہے کہ اس کی ابتدا ہندی سے ہوئی اور یہ محض اتفاق تھا کہ وہ ہندوستان کی عام زبان بن گئی۔ مگر حال کی ہندی اردو سے پیدا ہوئی۔ وہ اس طرح کہ اردو سے فارسی الفاظ کو نکال کر اس کی جڑ سنسکرت کے بڑے بڑے الفاظ کو دے گئے ہیں۔

سچ تو یہ ہے کہ اردو اردو ہندی اپنے ماخذ کے اعتبار سے ایک ہی ہیں۔ اگر کچھ فرق ہے بھی تو اس کی نشوونما کے طریقہ میں ہے۔ اردو مسلمانوں میں پئی اس لئے اس میں فارسی الفاظ کی کثرت ہو گئی۔ اور ہندی سنسکرت کی طرف توجہ کر گئی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ موجودہ زمانہ کی ادبی اردو اور ادبی ہندی میں زمین و آسمان کا فرق ہو گیا۔ ایک میں عربی، فارسی کی بھر مار ہے تو دوسرے میں سنسکرت کی ٹھونس ٹھاش ہے۔

اردو کو عام بنانا کیا ہندوستان کی۔ اردو کے پیر پی ڈاکٹر عبدالحق صاحب اس بارے میں ارشاد فرماتے ہیں کہ:-
اور زبانوں کے قریب میں مضر ہو گا؟ ”ایک ہی زبان ہونے کا اگر یہ مطلب ہے کہ ملک میں کوئی دوسری زبان نہ رہے“ تو یہ دعویٰ سرے سے نامعقول اور غیر مقبول ہے۔ اگر اس سے مطلب یہ ہے کہ مقامی زبانوں کے علاوہ کوئی ایسی مشترک زبان بھی ہو جو باہم تبادلہ خیالات، کاروبار اور تعلیم وغیرہ کا ذریعہ ہو سکے تو اس کی معقولیت میں کسی کو انکار نہیں ہو سکتا۔“

ہندی کے بارے میں مولوی صاحب کی رائے ملاحظہ ہو:- ”ہندی کی اشاعت سے ہندی سیکھنے والے اردو سے اور اردو کی اشاعت سے اردو سیکھنے والے ہندی سے زیادہ قریب ہو جائیں گے کیونکہ ہندوستان کی کوئی دوزبانیں باہم اتنی قریب نہیں جتنی اردو اور ہندی ہیں۔ اس کے ساتھ یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ کوئی شخص اردو کا اعلیٰ ادیب اور محقق نہیں ہو سکتا جب تک کہ ہندی نہ جانے نہ سمجھے کیونکہ ان دونوں زبانوں کا بالامتناہ اور ایک مضمون میں چولی دامن کا ساتھ ہے، اور اس لئے ایک دوسرے کی مخالفت لاحقہ عمل ہی نہیں بلکہ مضر ہے۔ جہاں کہیں میں نے ضرورت سمجھی ہندی کی حمایت کی۔ جامعہ عثمانیہ میں ہندی کے رواج دینے میں تھوڑی سی میری ناچیز کوشش کو بھی دخل ہے جس قدر ہندی زبان کا زیادہ رواج ہو گا اسی قدر ہندوہم سے زیادہ قریب ہو جائیں گے کیونکہ ہندی سے زیادہ ہندوستان کی کوئی زبان اردو سے زیادہ قریب بلکہ اقرب نہیں ہے۔“

یہ بڑے افسوس کی بات ہے کہ ملک کی موجودہ نفاذ زبان کے مسئلہ کو پیچیدہ اور ناگوار بنادیا ہے کسی نے اس کا ناخاندانہ ذہن سے جوڑا ہے اور کسی نے سیاست سے۔ یہ باتیں ہیں ایک دوسرے سے جدا کرنے والی ہیں۔ ہر زبان کو خواہ ہندی ہو یا اردو ترقی کا حق حاصل ہے۔ لیکن کسی کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ دوسری زبان کی ترقی میں حائل ہو۔ ایک دوسرے سے بدگمانی کی بجائے ایک دوسرے سے قریب ہونے کی کوشش کرنی چاہئے۔“

علامہ مساب اکبر آبادی کا خیال ہے کہ:- ”ہم پر ہندوستان کی ہر زبان کا احترام فرض ہے۔ ہم کسی زبان کو ناقص یا غیر ضروری نہیں سمجھتے۔ جب ہم غیر لگ زبانوں میں بھی مہارت حاصل کرنا عیب نہیں سمجھتے تو ہندوستانی زبانوں کے حاصل کرنے سے ہمارا اجتناب بے معنی اور ناپسندیدہ ہے۔ ہیں ہندوستان کی ہر زبان سے لچھی سے زبانوں کے متعلق جو باہمی عنقریب آئے دن ہوتے رہتے ہیں، وہ بے فائدہ ہیں۔ زبان قومی نہیں بلکہ ملکی ہوتی ہے۔ کچھ دنوں سے ہندی زبان کو ترقی دینے کی کوششیں جاری ہیں۔ میں اس طریق کار سے بلکلنا بید دل

نہیں ہوں، اور چاہتا ہوں کہ ”ہندی“ سے مسلمان ویسی ہی کچپی لیں جس طرح ہندو ”اردو“ سے کچپی لیتے رہے ہیں۔ کیونکہ وہ بھی ایک ہندوستانی زبان ہے، اور کسی زبان کا جاننا نہ جاننے سے بہتر ہے۔“

ان ذمہ دار حضرات کی آراء سے صاف ظاہر ہے کہ اردو کے ہی خواہ ”ہندی“ یا کسی اور دوسری زبان کے مخالف نہیں ہیں، بلکہ وہ ہندی سمجھنے کی ناکید مسلمانوں کو بھی کرتے ہیں۔ اردو زبان کو مشترک بنانے کے علمی، مقامی زبانوں کی روک تھام نہیں، بلکہ ہندوستان کے عام باشندوں کو ایک زبان بنا کر آپس کے برادرانہ تعلق کو بڑھانا ہے تاکہ ایک دوسرے کو سمجھنے کے قابل بنیں۔

اردو زبان کے بارے میں اہل مشرق — اردو زبان کے فرانسیسی پروفیسر اور عالم انکارسان دتاسی، جنھوں نے اردو زبان و ادب پر پیرس میں خطبے پڑھے، اردو کے خطبہ میں لکھتے ہیں: — ”اردو زبان نے ہندوستان میں وہی رتبہ حاصل کیا ہے جو فرانسیسی نے یورپ میں۔ یہ وہ زبان ہے جو کثرت استعمال میں بہتی ہے۔ یورپین لوگوں سے گفتگو کرے گا ویسلی ہی ایک زبان ہے۔“ ایک اور مقام پر کہتے ہیں کہ: —

”اردو دوسرے ہندوستان کی مشترک زبان بن گیا ہے اور روز بروز جو ترقی اس کو ہو رہی ہے، اس کی وجہ سے وہ پورے دیس کی زبان بھی جاسکتی ہے۔ بلاشبہ کچھ عرصہ کے بعد ہندوستانی مشرق کی ایک نہایت اہم زبان کی حیثیت اختیار کرے گی۔ اس زبان کے توسط سے انھوں اہل مشرق تبادلہ خیالات کرتے ہیں۔ اس زبان میں بدرجہ اتم یہ صلاحیت پائی جاتی ہے کہ ہندو مسلمان دونوں کے مقاصد کو پورا کرے۔“

مسٹر مارچ کیمل اپنی کتاب (The Hindustani Language) میں لکھتے ہیں کہ: — ”ہندوستانی (اردو) ملک کے اکثر طبقوں میں عام طور پر بولی جاتی ہے، اور اس سے زیادہ بھی جاتی ہے۔ مسلمانوں نے اپنی تحریری زبان کو ایک حد تک فارسی رکھا، مگر بول چال میں عام طور پر ہندوستانی کو استعمال کرتے تھے، اور یہی ہندوستان کی عام زبان قرار پائی۔ اور زبانیں جہاں تک ضرورت ہے سکھائی جائیں، مگر یہ مشترک زبان کے ترقی محال ہے۔“

ڈینی سن رائس، مشہور مشرق کا خیال ہے کہ: — ”اردو ہندوستان کی لنگو افریقا (عام مشترک زبان) ہے، اور یہ وہ زبان ہے جو مختلف قوموں کو اتحاد اور اخوت کے مضبوط رشتے میں جکڑے ہوئے ہے۔“

سائنس کیمش کو اعتراف ہے کہ: — ”ہندوستان کے باشندوں کی سب سے بڑی تعداد ہندوستانی زبان بولتی ہے۔“

ہمارا راجہ سر کشن پرشاد آجہانی کا خیال ہے کہ: — ”اردو زبان ہندوستان کی دو بڑی قوموں یعنی ہندو مسلم اتحاد کی یادگار ہے، اور جس قدر اسے فروغ ہوگا اسی قدر دونوں قوموں کی یکجہتی کا باعث ہوگا۔“

جنوبی افریقہ کا ڈیلیکیشن اس امر کا اقرار کرتا ہے کہ: —

”جنوبی افریقہ میں جو ہندوستانی لوگ آباد ہیں وہ ہندوستانی بولتے ہیں۔“

نواب ڈاکٹر ہمدی یا ر جنگ بہادر کا ارشاد ہوتا ہے کہ: —

”اردو زبان ایک ایسی زبان ہے جو تمام ہندوستان میں پھیلی ہوئی ہے، لوگ اس کو بولتے ہیں۔“

اس سے کہ ان کا کیا مذہب و ملت ہے؟

خان بہادر احمد خاں صاحب والی محمود آباد کی رائے ہے کہ : ”اُردو زبان کی بنیاد اتحاد پر قائم ہے، اور اس کا جوہر یا بھی اتفاق کا ثبوت ہے بعض قدرتی اسباب کا لازمی نتیجہ تھا کہ مسلمانوں نے اس کی طرف زیادہ توجہ کی مگر ہندو شعرا و مصنفین کی خدمات بھی کچھ کم قابلِ قدر نہیں۔ اُردو کو مسرتج بہادر سپرو اور مہاراجہ کشن پرشاد بہادر کے سے بزرگوں کی سرپرستی اور حضرت کیفی دہلوی کے جیسے عالموں کی امداد حاصل ہے۔“

سیرتج بہادر سپرو کا خیال ہے کہ : ”در اصل اُردو زبان کے دو دیں آئے کی وجہ یہ تھی کہ ہندو مسلمان ایک دوسرے کے ساتھ جو یکساں ہیں یہ تسلیم کرنے تیار نہیں ہوں کہ اُردو زبان صرف مسلمانوں کی زبان ہے اور اُردو جاننے والے محض مسلمان ہیں۔ چارے بزرگوں نے اُردو کی بنیاد اتحاد کے لئے ڈالی تھی۔ اگر آپ اتحاد کے جو بانی ہیں ان کے بغیر ہندوستان ترقی نہیں کر سکتا، تو آپ اُردو کو ترقی دیں۔“

جنت ہرے مانہ کنتھرو اُردو ”کو ذریعہ تعلیم بنانے پر زور دیتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں کہ : ”یہی وہ چیز ہے جس کے ذریعے موجودہ منافرت دُور کی جاسکتی ہے اور ہم آپس میں متحد ہو سکتے ہیں۔ ہمارے ملک میں اگر کسی زبان کو ہندو مسلم اتحاد کی پیداوار کہا جاسکتا ہے تو وہ اُردو ہے، اور اس کے تمام اجزاء ہندو مسلم اشتراک کا صائب مظہر ہونے کے علاوہ اسے ہندوستان میں سب سے زیادہ دست اور اثر حاصل ہے۔“

غرض یہ کہ کیا ہندو کیا مسلمان اور کیا عیسائی سب اس بارے میں اچھی رائے رکھتے ہیں۔ اگر ہم ان اقوال پر غیر جانبدارانہ طور پر نظر ڈالیں تو اس سے صاف ظاہر ہے کہ اُردو ایک ہر دوزخیز، مقبول عام اور مشترکہ زبان ہے، جو ہندوستان کے طول و عرض میں بولی اور سمجھی جاتی ہے۔

زبان و مذہب : ————— میں اس بات کو کبھی نہ بھولنا چاہئے کہ زبان سے تعلق مقامات سے ہے، مذہب سے نہیں۔ اس لئے اگر زبان کو مذہب سے متعلق نہ کیا جائے تو زبان کا جھگڑا جلد مٹ سکتا ہے۔ ہندی کو ہندوؤں کی زبان کہا جاتا ہے، مگر جب کانگریس کی طرف سے ہندی کے پرچار کی کوشش کی گئی تو بہاریں بنگالی اور مدراس کے حامل اور آندھرا اس کے خلاف ستیہ کرہ کر کے جیل میں تک گئے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ ہندی کی مخالفت خود ہندوؤں نے کی۔ اُردو کو مسلمانوں کی زبان کہا جاتا ہے، مگر کیا کوئی ترکی، ایرانی، افغانی، عربی اور چینی مسلمانوں کو اس کے بولنے اور لکھنے پر مجبور کر سکتا ہے؟ مدراس کے ہندو مسلمان دو توں ہی تامل اور بنگال کے بنگالی اور گجرات کے گجراتی بولتے ہیں۔ یہی حال حیدر آباد کا ہے جہاں کے ہندو مسلمان بلا تفریق مذہب مرہٹو، گواڑہ میں مرہٹو اور تملکانہ میں تملکی اور کرناٹک میں کنڑی بولتے ہیں۔

اُردو کو عام کیسے : ————— ڈاکٹر سید محمد الدین قادری نے زور سے بجا ارشاد فرمایا ہے کہ : —————

”بنایا جاسکتا ہے اُردو زبان کی ترقی دوسری زبانوں سے نفرت کرنے یا دوسری زبانوں کے ہمدردوں سے دشمنی مول لینے سے نہیں ہو سکتی۔ یہ ایک تجربی طریقہ ہے، اُردو بولنے اور لکھنے والے کشمیر سے لنگاہ تک اور بلوچستان سے آسام تک مغل ہیں، اب بھی مل جاتے ہیں کہ ان کے اسلاف نے صلح جو یا نہ مسلک اختیار کیا کبھی کسی مقامی یا دوسری زبان کی مخالفت نہیں کی، حالانکہ اس زبان کی تاریخ میں ایسا زمانہ بھی گزر چکا ہے کہ اس کے بولنے والے صاحبان تخت و تاج تھے اور ہر طرح کی سماجی اور سیاسی اقتدار رکھتے تھے۔ اگر اُردو کے مصنفین اور مبلغین ایک ایسا طریقہ اختیار کرنا چاہیں جو اس کی دیرینہ روایات کے خلاف ہے اور جس پر اپنے ہماکار کے اقتدار کے زمانے میں بھی

قصہ شاہ داؤد

ایک زمانے میں بغداد شریف کا ایک بادشاہ تھا جس کو شاہ مجید کہا کرتے تھے۔ ماضی کے ایک ایک ماضی شاہ داؤد تھا۔ حضرت شاہ مجید کا دھال ہو گیا، اس وقت ان کی ایک بیوی اور کس لڑکا داکو پیمانہ گان میں تھے۔ بادشاہ کے انتقال کے بعد ان کا بھائی بھی اس تخت و تاج کا مالک بن گیا۔ بیوہ اور شاہ داؤد کو گھر سے نکال کر ساری جائیداد پر قابض ہو گیا۔ لوگ کھانے پینے سے بھی محتاج ہو گئے، بیوہ بھٹی پس لپٹا اور بچے کا پیٹ پالتی۔ حضرت شاہ مجید نے اپنے فرزند شاہ داؤد کی نسبت خدا و شاہ مصر کی لڑکی سے کی تھی۔ شاہ مجید کے انتقال کے بعد خدا و شاہ مصر کی لڑکی شاہ داؤد سے رہنے رضامند نہ تھا، چنانچہ اس کی نسبت کو منقطع کر دیا اور شاہ روم کے لڑکے سے نسبت کی۔ داؤد کس تھا، اپنا سارا وقت کھیل کود میں گزارتا، کھیل ہمیشہ فوجی تخت و تاج اور عدل و انصاف کا کھیل کرتا۔

بیٹا شاہ مجید کا اک کھیل بنایا اونچی مٹی دیجھ کے اک تخت بنایا
آپ بنا تھا بادشاہ کوئی نوکر لایا کوئی بنایا جو بدار کوئی کو تو لایا
تیلی کا چھوکر اک کب چور بنایا بیڑی ڈنڈا ٹھوک کے ہنسا دھمکایا
کھال بدن کی دھادی کچھ نمون بنایا

جب تملین (جڑبھت نیک اور روشن سپردی مفت تھی) کو اپنے لڑکے کی مار پیٹ کا حال معلوم ہوا تو اسے اپنے ساتھ لیکر شاہ داؤد کے پاس فریاد کی اور شاہ داؤد کے سامنے اس کی نسبت کا حال (جس کی اس کو خبر نہ تھی) سنایا اور پھر رشتہ منقطع ہو کر شاہ روم کے لڑکے سے ہوئے گا ذکر کیا تو داؤد پر حال شکر سوچ اور نگر میں پڑ گیا۔

(۲)

لڑکے کا ہاتھ کر کے جب تملین روئی جہاں ٹیٹھے تھے حضرت داؤد وہاں تلی
تو نے اپنے پوتے غریب کی تو نے کھا کھائی خدا و مصر میں بادشاہ تیر کی بھی کھا کھائی
غیر دیئے سے دیکھا بادشاہ تجھ کو نہیں جو تو ہمیں سامدہ ہے لا تو کر سیاہی
اتنی سن شاہ داؤد میں چنتا ہوئی

آخر کار بیوہ کو کہنے چھا شاہ آتھن کے دربار میں جا کر اپنا مدعا ظاہر کرتے ہوئے ادا کا طالب ہوا جس کی بنا پر شاہ اس نے امداد دینے کے لئے اپنے بیٹے کو فوج کے کرداؤ کے ساتھ جانے کا حکم دیا، لیکن اس کے بیٹے نے شاہ مجید کے منالیم جیت لینی اور سب کو دائرہ اسلام میں لانے کے واقعات کا اعادہ کیا تو شاہ اس نے امداد دینے سے انکار کرتے ہوئے اپنے گھر واپس بھاگ جانے کا حکم دیا۔

(۳)

چچ کے دربار میں داؤد پکارے مانگ لئے میرے مصر میں اتھنا تھالے

کہتا میں بادشاہِ فرزندِ ہمارے جاؤ دو دے ساتھ میں لے کر مارتے
 بڑے کہتا شاہ کا میں بادشاہ ہمارے پیشا شاہِ جہند کا نہیں ظلم کرارے
 میں جبرائے مسلمان بت تو ہے ہمارے کیسے بغداد سے آروڑ سے ہرگز ارے
 اتنا سنا چلے لڑکا بچے اترارے بھاگ جاؤ تے جہند گھر لو تو ہمارے

جب شاہِ داؤد کو اپنے چچا کی جانب سے بھی ناامیدی ہوئی تو اس نے اپنے باپ حضرت جہند کا گھوڑا دیکھتے ہیں کہ تہ خانے
 میں رکھا جاتا تھا، باہر نکالا، اور اس پر سوار ہو کر امداد کے لئے بجانب مدینہ شریف آنحضرت صلعم کے پاس جانے
 کے ارادے سے راہی ہوا، اثناءِ ماہ میں حضرت علیؑ سے ملاقات ہوئی جو شکار گھیلنے کی غرض سے لکھے تھے حضرت
 علیؑ نے شاہِ جہند کے گھوڑے کو پہچان کر داؤد سے دریافت کیا کہ تم کون ہو اور کہاں جا رہے ہو؟ اس نے
 اپنا سارا حال کہہ سنایا اور برائے امداد مدینہ شریف کا قصد ظاہر کیا۔ حضرت علیؑ کو خیال ہوا کہ امداد کے لئے
 آنحضرت صلعم اس کام پر یقینی مجھ کو ہی مامور فرمائیں گے اس لئے مناسب تو یہی ہے کہ قبل ہی امداد دی جائے۔

(۳) جہند کے گھوڑے کا نام تھا ابراہیم اللہ کا بندہ
 جلا مدینہ شریف اللہ کا بندہ دستہ میں حضرت علیؑ کے لشکر کا بندہ
 گھوڑا شاہِ جہند کا کہاں لے جاتا تھا جاؤں مدینہ شریف کو فریادی بندہ
 شاہِ مصر کا بادشاہ میرا ملک نہیں دینا دستہ میں لگاؤ تو لگاؤ کہیں جاؤں مدینہ شریف کو فریادی بندہ

حضرت علیؑ کے حکم سے پریاں حاضر ہوئیں اور داؤد کو بھول پہن کر اور ہندی لگا کر دھماکے بنائیں اور داؤد کو حضرت علیؑ
 اپنے ہمراہ صلہ لیکر چلے۔

(۵) نانا مارا علیؑ نے میدان کے مائی گھرے لئے ہاتھ میں علیؑ پریاں آئی اندر یا میں
 ہاتھوں کو ہندی لگی ہوئی حکم خدائی اب داؤد گھوڑے پر چڑھو کہ ایسے یا ہی دوسری
 نعل دو گانہ پڑھ لئے شکر ستائی گھوڑے پر چڑھ گئے نے بار لگائی دوسری

حضرت علیؑ اپنے ہمراہ داؤد کو سخت دھوپ اور ٹوپی لیکر بجانب شہر مصر راہی ہوئے۔ شہر مصر، شاہِ روم کے لڑکے شادی کی
 تیاری پور ہو چکی تھی، کسی ایسی کو بلا جاؤں شہر کے حدود میں داخل کی ممانعت تھی۔ یہ لوگ مصر کے ایک زانی شایا
 باغ میں بیٹھے جہاں مرد کا گزروہ دخل نہ تھا۔ اس باغ کی نگہبان تھی جو باغ کے دروازے میں بیٹھی تھی، باغ کے اندر داخل
 ہونے سے روک دی جس کی وجہ حضرت علیؑ نے مالن کو کچھ تذکر کرنے داؤد سے ارشاد فرمایا، اس نے داؤد کو مجبور تھا،
 پاس پائی نہ تھی، اپنی حالت پر افسوس ہایا، اور افسوس کے ساتھ کہنے لگا کہ میرے باپ جو بادشاہ تھے اور میں نے پاس دولت تھی
 وہ خود داخل ہشت ہو گئے، وہ گئی ماں، وہ تیرا چچا علیؑ میں کر سہر کر دی ہے۔

(۶) دھوپ نہ دھتی بنے لوچے جلدے شہر میں دیوار جو کچے
جاہو بچے تھے مصر میں شہر تھے دلتے المینی باغ کی دروازہ کے
حضرت تھے باڑوں دووی گھوٹے لکے اس کے اندر کچھ ہو تیسرے پلے
آئی تھی داؤد نے نس آسو گھٹے جو ہم جوتے بادشاہ کیوں آئے ایسے
میری ماں پیسے میری رب کے حوالے باپ چلے گئے بہشت میں شہر تھے دلتے

جب شاہ داؤد کو حضرت علیؑ نے زنجیر پہنایا تو خدا سے دعا کی، داؤد نے حضرت کی ابرہ سے خدا کا نام لے کر اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا تو ایک اشرفی ملی، وہ اشرفی ماں کو دی گئی۔ ماں اشرفی پا کر خوش ہوئی اور باغ کا دروازہ کھول دیا اور انیس اندر گئی حضرت علیؑ نے ماں کو اسلام سے مشرت فرمایا۔ ماں دائرہ اسلام میں داخل ہوتے ہی اپنا کام تک پہنچ گئی۔ اس دن شہزادی کے لئے پھول چنے اور دیکھ کر گوندھے۔ حضرت نے ہی بکھرے گوندھے اور ایک چھٹی شہزادی کے نام لکھ کر بکھرے میں لگائی، اور چھٹی میں تحریر فرمایا کہ تیرا پہلا منگیتر باغ میں آیا ہوا ہے، اب تجھ کو شاہ روم کے لڑکے سے بیاہ ہو کر نہ جانا چاہئے بلکہ اسی سے نکاح کر لینا چاہئے۔

(۷) اشرفی لیکر ہاتھ میں ماں شرفائی باغ دروازہ دیا کھولنے دو رکائی
حضرت نے مسئلے کی حدیث کی، ان پر جانے فوراً اپنی بھریا مسلمان بنائی
نہ توڑے پھول نہ گوندھے اور نہ ہی لگائی حضرت ہارگو ندھے کر کے چترائی
باغ چھٹی شہزادی کی میری چھٹی آئی آیا تیرے باغ میں تیرا پہلا سائیں
جو تو خدا سے روم میں ملے دن انہیں آؤ جن پہچان کے ہوا حکم عدائی

ماں حب معمول پھول کے بکھرے شہزادی کے پاس لے گئی تو شہزادی نے اس میں چھٹی پا کر خلوت میں جا کر پڑھی اور ماں کو ڈرا دھکا کر مہاراجا حال دریافت کر لیا اور فوراً اپنے وزیر سیدی ابراہیم کے نام ایک چھٹی اور حضرت علیؑ کی چھٹی کا جواب لکھ بھیجا کہ شہزادے داؤد کو باغ میں تنہا نہ چھوڑے گا، میں حب حکم ضرور اس سے شادی کروں گی چاہے کچھ ہو۔

(۸) ابراہیم وزیر کو ہے فرزانہ حضرت علیؑ سے باغ میں دو جاہر دانا
بیٹھے رکھو باغ میں نہیں اور ٹھکانا ان کے چھوڑ دو کہیں در کہیں جاوا
دل جاؤں اس کے نام پہ جاہر دانا جاؤں دانا

جب شادی کی تاریخیں قرار پائیں تو شاہ روم نے شادی کے لئے مصر جانے سے قبل بخیر میوں سے شادی کے متعلق آنے والے واقعات دریافت کئے تو بخیر میوں نے بیان کیا کہ وہاں داؤد اور حضرت علیؑ تشریف رکھتے ہیں اچانک

وہ بیوہ کا لڑکا ہے اُس کا مقابلہ نہ کرنا چاہئے، تمہ کو یہ آسانی کسی اور جگہ لڑکی مل سکتی ہے لیکن اُس کو کوئی اور لڑکی نہیں مل سکتی اس لئے مناسب ہے کہ اُس لڑکی سے بیاہ کا ارادہ ترک کر دیا جائے۔

(۹)

کھڑے بخوی شاہ کے سلام سنانا
ماتک بیاہ غریب کی تو نے نرم نہائی
تھے لہجائیں بہت سی انھیں ملتی تھیں
مصر میں بڑو گڑھ علی گاہیں یاسنانا
وہ بیوہ کا پوتہ ہے اُسے ملتی تھیں

جب شاہ روم نے بخویوں سے یہ سنا کہ وہ لڑکی داؤد کو بیٹے کی تو اپنی کثیر فوج ہاتھی گھوڑے پیدل دوسوار لے کر مصر کا رخ کیا تاکہ اسی لڑکی سے شادی کر لائے۔ وہاں پہنچنے کے بعد بخویوں نے کہا کہ تیرا دشمن وہی داؤد و اسی تیری فوج میں بیٹھا تھا شاد دیکھ رہا ہے (چونکہ باوصف حضرت علیؓ کی ممانعت کے داؤد تماشا دیکھنے باغ سے باہر نکل کر شاہ روم کی فوج میں آگیا تھا) اور حضرت علیؓ بھی اس مقام پر تشریف لائیں گے تو یہ سن کر بادشاہ روم کو یقین نہ آیا اور تحقیق ہونے تک بخویوں کو قید میں رکھا۔ داؤد کی تلاش و گرفتاری کے لئے حکم دیا اور چاروں طرف پھر مقرر کر دیا۔

(۱۰)

کھڑے بخوی شاہ کے سلام سنانا
ہم کرے بہت سی تو مائے تھیں
بیٹھا تیری فوج میں تیرا دشمن بھائی
نیلم جا، شاہ داؤد کو تو نے ملتی تھیں
بھان بھر خدا آری ہیں وہ محوم بھائی
بکری بخوی کئے قید دی شکی بڑھائی
اتنا حضرت کو دیکھ نہ یوں چور دھن بھائی
بہرہ کر دیا قنات دیا حکم چڑھائی
اُس داؤد کو پکڑ لو کیوں دیر لٹھائی

تلاش سے داؤد کا پتہ نہ چلا تو اُس کی نقور ہنگو اگر شناخت کرنے لگا، تصویر کی وجہ داؤد گرفتار ہو گیا اور بادشاہ روم جو ترکی ظالم بادشاہ تھا، داؤد کو پکڑ کر گٹھڑی بنائی اور فوج کے ایک دست ہاتھی کو داؤد پر بٹھانے اور مار ڈالنے کے لئے چھوڑ دیا، لیکن ہاتھی داؤد کو دیکھ کر سلام کیا اور پیشانی زمین پر ٹیک دی اور اُس گٹھڑی کو سونڈ سے اٹھا کر سر پر رکھ لیا۔ بہر حال یہ دیکھ کر ترک بادشاہ روم خوف زدہ ہوا، اُس گٹھڑی کو ایک کنویں میں ڈال دیا، اور اُس کو چتر کی سبوں سے باٹ کر مہر لگا دی، اور کہا کہ اب دنیا میں تیرا حاتی کوئی ایسا نہیں جو تجھے بچائے، اب اسی کنویں میں ستر لکھ کر مر جائے گا۔

(۱۱)

دروازہ بے کمان کا بری عقل بنائی
چاروں طرف لوح کھڑی ہو گئی بزرگائی
ایک ایک کو کچکے پھر باہر نکالی
اُس لڑکے شلہ داؤد کی تصویر لٹائی
اُس لڑکے کو پکڑنے گٹھڑی بندھوائی
اُس لڑکے کو پکڑنے گٹھڑی بندھوائی
خون ہاتھی دیا چھوڑ دیں دیر لگائی
ہاتھی چڑے کر رہا ہے سٹیں جھکائی
اتھا یا پیشانی

گھڑی لکھو سونڈھ میں سر اُپر لکھائی
دیکھو روم کا بادشاہ لڑنے نہ رکھائی
گھنٹوں اٹھائی تھیں کوئل گردائی
اُدھر سب جھٹک دی حد لکھائی
مہر لگائی اپنے ہاتھ کی نہیں دیر لکھائی
ایسا تیرا کون ہے دنیا کے ماہی
لو شکر کے مرے مہر کنوں کے ماہی

ہاں کو جب یہ حال معلوم ہوا تو اُس نے سارا قصہ شہزاد علی مہر کو سنایا جس سے وہ بے حد پریشان ہو کر ایک چینی حضرت علیؑ کے نام لکھی کمانوس کی بات ہے کہ آپ تو بڑے بہادر اور کچھ دار اور شہور ہیں، لیکن آپ کو کچھ خیال نہ آیا کہ آپ نے کیا کیا اپنے ہاتھوں داؤد کو کنوئیں میں گرادیا، میں حشر کے دن آپ کی دامن گیر ہوں گی، اور اگر وہ داؤد (مرعائے نو) دنیا میں آپ کی ہنسی اڑاؤں گی۔

(۱۲)
بیکم چٹھی لکھ دی کر کے چترائی
برے بہادر علیؑ تھے کچھ سمجھی ناہیں
اپنے ہاتھ کوئلوں میں دیا گردائی
پلہ پکڑوں جناب میں چھوڑ دی ناہیں
جو مر گیا بادشاہ تیری کروں ہنسائی

حب حضرت علیؑ کے پاس شہزاد علیؑ کی چٹھی پہنچی تو آپ نے نگہیں کاغذ لکھایا اور نیزہ کھڑ دیا۔ ہاں سے اُس باؤلی لاپتہ دریافت کیا جس میں داؤد کو ڈال گیا تھا۔ ہاں سے اُس باؤلی کا پتہ دیا، تب حضرت نے باؤلی کے ہاتھ جوئے پتروں پر مصلّا پچھا کر نماز و دعا پڑھی اور آواز دی کہ اسے لڑکے اگر کنوئیں میں زندہ ہے تو جواب دے، ورنہ اگر قصداً الہی سے مر گیا ہے تو پچھو کچھ نہیں، حضرت کی آواز سن کر لڑکے نے اندر سے جواب دیا کہ حضرت یہ کہنا نہیں ہے بلکہ باغ ہے، یہاں پر یاں مجھے جھولا جھلار ہی ہیں اور اقسام اقسام کامیوہ کھلا رہی ہیں۔ یہ ایسا باغ ہے کہ آج تک میں نے اپنی عمر میں دیکھا نہیں۔ اُس وقت حضرت نے باؤلی کی سہل پر اپنا نیزہ مارا جس کے اثر سے شاہ روم کی فوج کے ڈوسو گھوڑے اور نو سو سپاہی کٹ کر مر گئے۔ بادشاہ روم بے حد پریشان ہو گیا۔ مجرمیوں نے شاہ کو پھرنکھایا۔

(۱۳)

الف نام اللہ تو ہی جو ربی الہی
نیزہ کھڑا علیؑ نے دیا باغ ہلائی
ہاں کو شافا کر کنوئیں چھو دو بتلائی
ہاں حضرت کو لے چلی ہیں دیر لکھائی
سہل کے پُر آن کے دیا مصلّا پچھائی
نفل دو کمانڈہ کے کیا غنیمت لکھائی
آواز دی حضرت علیؑ نے نرکا بولا ناہیں
جو مر گیا ہو قصا سے ہوا علم خدائی
حضرت کوئل ہیں یہ باغ چھوٹا پلہ لائی
مجھے پر یاں چھوڑ دی رہی سب بوہ لائی
کبھی نہ لکھ رہی تھیں اسحق عمر جہان لائی
حضرت نے نیزہ مارا سہل پر سماں پھل لائی
بڑی روم کی فوج میں لکھی دو ہائی
ڈوسو گھوڑے کٹ گئے نو سو سپاہی

لوے روم کا بادشاہ کیا آفت آئی کھڑے برہمن سامنے سلام سُنائی

پھر جب حضرت علیؑ نے داؤد کو باؤلی سے باہر نکالا تو ایک چٹائی کے ذریعہ شہزادی کو اطلاع دی کہ میں نے تیرے دلہن کو باؤلی سے باہر نکال لیا ہے وہ اب باغ میں بیٹھا ہوا ہے اس کی نسبت کوئی فکر نہ کرو۔ اب جلد یہاں باغ میں آجا شاہ روم سے دُور سے کئی ضرورت نہیں۔

(۱۳)

حضرت جیسی لکھے کر کے جبرائی	پانچویں شہزادی ہو احکم خدائی	پڑھو
کنویں سے باہر لیا کاریوں پی اہی	تیرا دلہن بیٹھا باغ میں میں سفیہ انسانی	
تم جلدی آجاؤ باغ میں کیوں نہ رکھائی	اس روم کو بادشاہ کوچہ ڈرنا ناپی	

جب حضرت کی چٹائی شہزادی کو ملی تو اُس نے اپنی باندھی اور بیلیوں کو جو اُس کے ساتھ رہا کرتی تھیں انکے چولی کھینچنے کے لئے کہا اور چپک کر ایک مقام کو چھوئے کے لئے شروع لگائی۔ کھیل شروع ہوا، سب چپک گئیں تو شہزادی دروازہ لگا کر آہستہ سے ڈول میں سوار ہو باغ میں پہنچ گئی اور حضرت علیؑ کے قدموں میں ہو کر اسلام سے مشرف ہوئی اور کہا کہ ہم لوگوں کو جلد بنداد شریف جانا چاہئے اور زنجیر کی ظالم بادشاہ روم ہم کو باغ ہی میں روک دے گا۔

(۱۴)

بیگم دو ڈیٹھ کے بانچے آئی	بیگم پوت جوئے دی تم کھاؤ ذاتی	غلام آنکھ مچولی
بیگم دو ڈیٹھ کی دی	باندھی نظر نہ آئی	دروازہ
ادھر ادھر لپک رہی	جلدی مصر میں آئی	
بیگم ہاتھ اٹھاؤ دیکھ لی کوئی نکل نہ آئی	بیگم دو ڈیٹھ پوڑ کے بانچے آئی	
حضرت علیؑ کے قدم میں سر لیا چمکائی	تم پیالہ کو دین کا دو شرع پڑھائی	
جلدی چلو بنداد شریف کو میں نہ انسانی	یہی روم کا بادشاہ ظالم تر کائی	روکنا
تم کو جلدی پھر باغ میں جانا نہ ناپی	اتنا سن چو حضرت بیگم کھائی	

شہزادہ کے مشورے پر حضرت علیؑ وہاں سے بنداد شریف چلے تیار ہوئے چنانچہ حضرت اپنے دلہن پر سوار ہوئے اور گھوڑے پر داؤد نے شہزادی کو اپنے ساتھ اٹھایا۔ جب ایزد لکائی تو دلہن ایک جگہ میں بائیں ہاتھ اور گھوڑا تیرہ ہاتھ کودا۔ جب شاہ روم نے دیکھا کہ شہزادی کو لیکر داؤد جا رہا ہے تو اُس نے کہا کہ جس کو بیابان سے آئے تھے وہ بیابانہ ہو سکا۔ اب خواہ میری فوج ساری کھٹ جائے لیکن تم کو جانے نہ دوں گا بلکہ مار دوں گا۔

(۱۵)

حضرت کا دلہن بائیں ہاتھ کو دیکھا گھوڑا تیرہ دیکھے روم کا بادشاہ اٹھ گیا ڈیرہ

ہلکے لئے جا رہے ساتھ میں دشمن ہوا میرے آگیا نظر میں بس نے کنویں میں گھیرا
تو چاہا یا عظیم لیکے بیاہ کھو دیا ہوا تجھ کو ماروں میرے چاہے لٹ جاؤ ڈیرا گھیر کے

جب شاہ روم نے داؤد کو شہزادی سے کر جاتے ہوئے دیکھا تو شاہ نے داؤد پر گولہ باری کا حکم دیا حضرت علیؑ نے داؤد کے گھوڑے کے اطراف اسم اعظم پڑھ کر لکیر کھینچ دی تاکہ گولہ باری کا کوئی اثر نہ ہو لیکن داؤد نے غصہ میں اس لکیر کے حصار سے باہر ہو گیا، جس کی وجہ سے گولہ لگ گیا اور وہ مر گیا۔ شہزادی اس واقعہ سے متاثر ہو کر وہ بھی حصار سے باہر داؤد کے پاس آئی جس کی وجہ سے اس کے گولہ لگ گیا اور وہ بھی مر گئی۔ دیکھا دیکھ کر پلے وقت موت سے حضرت کو انفس ہوا کہ بغیر شکار کے ہی دونوں مر گئے۔ اس وقت خدا سے دعا کی کہ یا اللہ نکاح تک کم از کم چار گھڑی کے لئے انہیں زندگی بخش۔ خدا نے سن لی اور زندگی عطا کی۔

(۱۷) کار توڑ دی علیؑ کی کچھ سمجھا ناہی گولہ لگ گیا داؤد کے گئے ہزار چٹائی قیر مر گیا
ہلکے اچھی کار سے لڑکے برائی دوسرا گولہ لگ گیا ہلکے کے تائی
دونوں کا ہو گیا خاتروں میں بھی اہی آکے حضرت علیؑ نے چھپائی لٹائی
لے اللہ بہ شرح کو مر گیا تیری خدا چار گھڑی کی زندگی اللہ سے پائی

حضرت علیؑ نے بغیر شکار کیجور اور بھول وغیرہ لانے کے لئے اسی باغ میں تشریف لے گئے، اس زمانہ میں دوسری راہ سے ان لوگوں کے لئے کھانا لے کر مالیں بیاہی گئی۔ حضرت نے جب باغ میں مالین کو موجود نہ پایا تو اس کے انتظار میں باغ میں ٹھہرے رہے۔ چونکہ بلا اجازت باغ سے کیجور و بھول توڑنا مناسب خیال نہ فرمایا (ایک فقیر اس وقت وہاں پہنچ کر سوال کیا کہ مجھے پرزین ناستے گزر چکے ہیں، مجھے کھانا کھلایا جائے (یہ فقیر دراصل فرشتہ تھا جس کو خدا نے زندگی بخشے، بیچا تھا، تو ہاوصفت خود ان لوگوں پر کئی ناستے گزرنے کے اپنا کھانا کھا دئے، تو فقیر نے شکر ادا کر کے ان دونوں کو تنویر برسن کی عمر عطا کی اور کہا کہ مجھے موت نہیں آئے گی اور وہاں سے غائب ہو گیا۔

(۱۸) دیگی ہاتھ میں جب پلے پائی صاحب کیا نا کھا چکے کیا شکر منائی
عمر جو سو برس کی انہیں دیا فرمائی بیٹے شاہ مجید کے بھی مرتے ناہی
اسنا سائیں کہہ چکے نہ دئے دکھائی

مالین کی واپسی کے بعد حضرت علیؑ نے کیجور بھول لے کر واپس تشریف لائے، اثناء راہ میں حضرت علیؑ کو مال ہی توہا کہ میں نے خدا سے صرت چار گھڑی کی ہی زندگی مانگی تھی لیکن اتفاق سے دیر ہوئی انفس کو پہرہ وغیرہ شکار کے ہی مر گئے ہوں گے۔ لیکن بیان آ کر دیکھا تو انہیں زندہ پایا حضرت نے متحیر ہو کر داؤد سے دریافت فرمایا کہ تو نے یہ کیا عمل کر دیا اور کیسے زندہ رہ گیا، تو داؤد نے حضرت سے سارا قصہ کہہ سنایا کہ ایک فقیر آیا تھا، اس کو میں نے اپنا کھانا جو مالین لائی تھی

کھلایا تو اُس نے جس کو تلواریں کی عمر دے گیا۔

(۱۹) بیٹے شاہنشاہ کے کیا عمل کیا
اُٹھا گھر حیدر کا آج جس نے سنا
اُٹا لایا کُسن چکا جواب سنا
حکم ہوا جناب سے ایک سائیں آیا
سائیں کھانا لائی ہم نے نہیں کھایا
عمر دے گیا تلواریں کی عمر دینا آیا
عمل میں
مرنے کا وقت

داؤد پھر حضرت کی لکیر کے حصار سے باہر نکل کر شاہ مصطفیٰ فوج پر تلوا کر پہنچ کر ٹوٹ پڑا اور بڑے زبردست کابلی روہیلوں
ایک سو اٹھارہ اور شاہ روم کے بیٹے کو جو شہزادی سے شادی کرنے آیا تھا مار ڈالا۔

(۲۰) لڑکا کھلا تار سے دل کیا دلیر
روم کی فوج میں جاڑے کھینچا شمشیر
بیٹا مارا روم کا بندھا سہرہ والا
کلیجہ مارا کھیت میں ایک سو اٹھارہ
حضرت علی بھی بولے اب گرد مٹالا

حضرت علیؓ ان دونوں کو لے کر میدان جنگ سے معرۃ شریف لے گئے اور شاہ معرے کہا کہ اب جلد نکاح پڑھا دو
تاکہ ہم لوگ بغداد و شریف جلد واپس جا سکیں۔ چونکہ ہم لوگوں نے بے حد تکلیف اٹھائی ہے۔

(۲۱) حضرت چلے دُلوں سے نہیں دیر لگاؤ
جلدی آگئے معرے ہوئی روشنائی
شاہ بادشاہ کو بولے بسمجھو جان
جلدی نکاح کرو ہم کو دیا سنائی
ہم جلدی جائیں گے بغداد شریف کی آفتاب

چنانچہ قاضی طابو اُسے گئے اور وکیل لگاوا رکھ کر نکاح کی تکمیل ہوئی اور بے مدعوئی سنائی گئی اور بعد نکاح وہاں سے
حضرت علیؓ دُعا دینے کو لے کر نکل گئے۔

(۲۲) قاضی طابو آگئے بڑی دُحوم چھائی
شاہد کیل کھڑے کرے نہیں دیر لگاؤ
حکم دیا شاہ نے نکاح فرمائی
لو کے کی شادی میں بڑی خوشی سنائی
دہائے حضرت یکے لکے کچھ دیر نہ لگاؤ
گھوڑوں پر سوار ہو گئے لیا حکمر سناؤ

حضرت نے داؤد اور شہزادی کی آنکھوں پر پٹی باندھی اور گھوڑے پر بٹھاپ ماری تو صرف تین گھنٹے میں بغداد شریف پہنچ گئے۔
داؤد کا چچا امین بادشاہ دیکھا کہ داؤد شہزادی لے کر آیا تو اُس کو قحب ہوا کہ آخر یہ لایا کیسے کیوں مارا نہ گیا؟ داؤد کی
ماں چکی بیٹے اور روتے روتے اندھی ہوئی، شہزادی بہو بن کر گھر میں آئی تو خدا کی قدرت سے اس کو بینائی عطا ہوئی اور

سب خوش ہوئے حضرت علیؑ نے اب واپس مدینہ شریف ہلنے کی اجازت چاہی تو داؤد حضرتؑ کے سامنے ہاتھ جوڑ کر عرض کیا کہ میرا چچا آسمان نے میرا تخت و تاج و محل و فوج اور دھن دولت ظلم سے لے لی ہے وہ واپس دلوانی ہلے تو مناسب ہے۔

(۲۳)

انف نام شد قوی جو رچی الہی	لڑکے کی آنکھ دے سچ دتی لگوائی
مگر بے پہ تعاب و بدی نہیں دیکھی	سفر کیا تھا بہت شہر خدا کی
تین گھنٹے میں آگے اپنی بستی کے ہنسی	دیکھے آسمان بادشاہ دل سوچ پائی
لڑکا شادی کر کے آگیا س نے مار لائی	اس کی ماما جی میں کے اندھی بھائی
جب تکہ آئی گل میں برقی خوشی سنائی	مکرم ہو جناب کو وہ توئی کھیاں لڑائی
حضرت علیؑ بھی بولے لڑکے کے تائیں	لڑکے مکرم دید و حضرت نے مدینہ جلی
ہاتھ جوڑ لڑکا کہے حضرت کے تائیں	حضرتؑ میرا چچا آسمان بادشاہ ظالم تھلا
میرا گل لٹ لیا سب آیا کھسائی	بارہ ہزار میری فوج ہے یہ دیتا ناہی

۱
اندرا

۲
دھن دولت

حضرت علیؑ آسمان بادشاہ کے گل میں تشریف لے گئے اور آسمان کو کہا کہ داؤد کا تخت و تاج اور محل و دولت سب واپس کر دے اور نہ مجبوراً جگ کرنی ہوگی۔ آسمان بادشاہ نے حضرتؑ کو جب دیکھا اور مکرم سنا تو خوشی و آؤد کو سینہ سے لگا کر تخت و تاج حوالہ کر دیا۔ حضرت علیؑ وہاں سے واپس مدینہ شریف تشریف لے گئے۔ اس طرح شاہ داؤد کا قلعہ تمام ہوا۔

(۲۴)

حضرتؑ لڑکے کو لے پلے دیوڑھی کے باہی	حضرتؑ دیکھ آسمان کو دل سوچ پائی
خیمت سازی دیدئے ہیں دیا سنائی	جو تو زور دے جائے کہاں ہونے لڑائی
آسمان نے لڑکا لیا گو میں لیا بھائی لکائی	داؤد تجھے کو کروں بادشاہ میں ہوں سپاہی
حضرتؑ ساری اچھی کر گئے جب کڑی پڑھائی	پلے مدینہ شریف کو نہیں دیر لگائی

قلعہ داؤد کا دیا حضرتؑ نے بنائی

۲
اندرا یا میں

محمد جمال الدین حیدر

غزل

محبت میں خزاں بھی اک بہار جاودانی ہے
 شبابِ شعلہ سا ماں ہی امین کا مرانی ہے
 کسی کے غم کی میرے دل پہ کتنی مہربانی ہے
 کہ میں ہوں شب کا سناٹا ہے انکوں کی روانی ہے
 جو آنسو دردِ فرقت میں نگاہوں سے ڈھلکتا ہے
 وہی غم کا فسانہ ہے، وہی دل کی کہانی ہے
 محبت میں جو زندہ ہے وہ ناکام محبت ہے
 رواں الفت میں مٹنا ہی حیاتِ جاودانی ہے
 ترے رنگین جلوں کی یہ حشر آریاں! تو بہ
 نقابِ رُخ کے ہر اک تار میں رقصاں بولنی ہے
 بہاریں رقص کرتی ہیں قفس کے گوشے گوشے میں
 مجھے رنجِ اسیری ہی نشاطِ جاودانی ہے
 نہ دن کو چین آتا ہے، نہ شب کو نیند آتی ہے
 کسی کے حسنِ رنگیں کی یہی نواک نشانی ہے
 نہ جانے کس کی نظروں کا فسوں ہے آج کلِ آنور
 خموشی میں کھلم ہے، زباں میں بے زبانی ہے
 منظور احمد آنور قمری

تنقید و تبصرہ

۱۹۳۵ء کی منتخب نظمیں - مرتبہ ادارہ ادب لطیف لاہور

ادارہ ادب لطیف کی جانب سے ہر سال اس قسم کے چھپے مجموعے شائع کئے جاتے ہیں۔ زیر نظر مجموعہ انتخاب اور ترتیب دونوں کے لحاظ سے گذشتہ مجموعوں سے بہتر ہے۔ اس قسم کے مجموعوں کی اشاعت سے ہمارے ادب کی زخار کا صحیح طور پر اندازہ ہو سکتا ہے۔ یوں تو اکثر و بیشتر منتخبات ناقص ہوتے ہیں اور ان میں صوبہ جاتی تعصب اور جانب داری کی جھلکیں نظر آتی ہیں، اور بعض میں تو خاص کی کئی بھی دکھائی دیتی ہے لیکن چشیت مجموعی اس قسم کے منتخبات "تابع" ادب کی ترتیب و تدوین میں مدد و معاون ثابت ہوتے ہیں۔ زیر نظر انتخاب کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں ہر مہینے اردو کے رسائل میں جو بہترین نظمیں چھپی ہیں ان کو اس خاص مہینے کے عنوان ہی تحت درج کیا گیا ہے اور مرتبین کا یہ دعویٰ ایک مددگار معلوم ہوتا ہے کہ نظموں کا انتخاب شرکا نام پڑھ کر نہیں کیا گیا بلکہ نظمیں پڑھنے کے بعد شاعر کا انتخاب کیا گیا ہے اور جس کسی نے کوئی کام کیا ہے اسے نظر انداز نہیں کیا گیا۔ سال گذشتہ کی طرح اس سال بھی ممکن ہو انتخاب مجموعہ کے آخر میں شامل کیا گیا ہے۔

مجلد کے کلیرنگ - مدیر مولوی محمد رفیع الدین صاحب ایم۔ اے۔ بی۔ ٹی۔ شائع ہو رہا ہے جس کی تیسری جلد کا تیسرا شمارہ اس وقت پیش نظر ہے اس کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ وہاں کے گیارہ ادارہ مولوی نصیر الدین صاحب ایم۔ اے۔ اپنے طلباء میں علم و ادب کا بہت اچھا ذوق پیدا کر رہے ہیں اور توقع ہے کہ یہ رسائل اپنی کوششوں اور افادیت میں اسی طرح اضافہ کرتا رہے گا۔ اس شمارے میں بھی دور کے اردو ادب پر جو مضمون لکھا گیا ہے وہ خاص طور پر قابل ستائش ہے۔

الوزن ماسہ جو نیر لکچرار اردو مدراس یونیورسٹی۔

یہ کتاب مدراس یونیورسٹی کے سلسلہ اسلامیات کی ایک کڑی ہے اور دراصل کلیات ابجدی کا پہلا حصہ ہے۔ ابجدی، فو ابجدی علی خاں والا جاہ اولی والی اکاٹ کے دربار میں لکھا گیا تھا۔ وہ علائقہ مدراس کے قصبہ چنگل جیٹھ میں پیدا ہوئے تھے لیکن ان کے آباؤ اجداد بیجا پور کے رہنے والے اور مشہور مورخ محمد قاسم فرشتہ کے اعزہ میں شامل تھے ابجدی نے اردو اور فارسی میں تقریباً دس کتابیں لکھی تھیں جن میں انور نامہ، اس نے بھی وراہم ہے کہ یہ فو ابجدی والا جاہ کے معرکوں پر لکھی گئی ہے۔ اس طرح سے اس کتاب کو ایک تاریخی حیثیت حاصل ہو گئی ہے۔ یہ فارسی زبان میں ہے اور مولف نے فارسی کی مشہور ترین زمینوں کے انداز میں اس کو مرتب کیا ہے۔ ابتدا میں مترجم نے چند صفحہ کا دیباچہ اردو میں لکھ دیا ہے جس میں ابجدی کے حالات اور تصنیفات پر اجمالی طور پر نظر ڈالی ہے۔ ضرورت تھی کہ کتاب کو مرتب کرنے کے وقت تاریخی واقعات کے متعلق ضروری حوالے اور تشریحیں بھی دی جائیں۔ بجات موجود یہ کام اس نے قابل قدر ہے کہ اس سے دکن کے ایک دور اور تقریبی کی نسبت ضروری تاریخی معلومات فراہم ہو جاتی ہیں۔

تحلیل نفسی اور تعمیر خواب - مصنفہ سگندہ فراند

ایم۔ اے۔ ادارہ دانش و حکمت۔ حیدرآباد۔ اردو کے جدید ادبی رجحانات میں سگندہ فراند کی تحریروں اور تحلیل کا خاص اثر پڑ رہا ہے۔ ضرورت تھی کہ اس کی اصل کتاب کا بھی اردو میں ترجمہ کر دیا جاتا، اور خوشی کی بات ہے کہ عبدالحی صاحب نے اس کی تکمیل کر دی ہے۔ لیکن اس

سلسلہ مطبوعات میں شائع کی گئی ہے۔ یہ کتاب ۱۵۰ ابواب میں تقسیم کی گئی ہے جن میں پہلا باب تہیدی ہے اور اس میں لکھنؤ کے حکمرانوں کے مختصر سے حالات درج کئے گئے ہیں۔ دوسرے باب میں لکھنؤ کے تمدن پر نہایت ہی اجمال کے ساتھ روشنی ڈالی گئی ہے، اور ایران کا جو اثر لکھنؤی معاشرت اور ادب و شاعری پر پڑا ہے اس کی طرف سرسری طور پر اشارے کئے گئے ہیں۔ یہ موضوع اتنا وسیع ہے کہ اس پر عبدالحکیم شرر نے ایک مہمو کتاب قلمبندی مسمی جو مشرقی تمدن کا آخری نمونہ کے نام سے چھپ چکی ہے اور بعض جامعات میں بطور نصاب پڑھائی جاتی ہے۔ تہیب ہے کہ ڈاکٹر ابوالیث نے اس باب کی تیاری میں اس سے استفادہ نہیں کیا۔ ورنہ یہ باب اتنا مختصر نہ رہنے پاتا۔

زیر نظر کتاب کا قیصر باب اس امر کی وضاحت کرتا ہے کہ لکھنویت کیا ہے اور دراصل اس امر کی چھان بین میں مرتب نے صحیح ذوق سے کام لے لکھنویت کے نشین کرنے میں کامیابی حاصل کی ہے۔ چوتھے باب میں ادوہ کے حکمرانوں کی شاعری پر تبصرہ کیا ہے۔ پانچواں باب دہلی کے ان شعرا کے تذکرہ پر مشتمل ہے جو وہاں سے ہجرت کر کے لکھنؤ چلے آئے اور دراصل ان ہی کی آمد اور قیام لکھنؤ کے باعث لکھنؤ کا ایک جدا گانہ دبستان شعر و سخن وجود میں آیا۔ ایسے شعرا میں تقریباً چودہ اساتذہ سخن کے حالات اور ان کی خصوصیات کلام پر تفصیلی بحث کی ہے۔ ان ہی میں اردو کے مشاہیر میں مثلاً میر، سوسا، حسین، امجد، جرات اور انشاء و مجمع جیسے شاعر شامل ہیں۔ باب بہت طویل ہے اور خوشے زیادہ صفحات اس کے لئے وقف کئے گئے ہیں۔ اس کے بعد دو باب ناسخ و تراش اور ان کے سلسلے کے شاعروں سے بحث کرتے ہیں۔ انھوں نے باب سلسلہ محقق سے متعلق ہے۔ نویں باب میں لکھنؤ کی مرثیہ گوئی پر نظر ڈالی ہے اور چونکہ اس موضوع پر پیشینہ نمانی کا موازنہ اس و دیگر ایک سندی حیثیت رکھتا ہے اس لئے مصنف نے کوشش کی ہے کہ

کتاب کے ساتھ خود مصنف اور اس کی دوسری تصنیفات کے متعلق ضروری معلومات کا اندراج بھی کیا جائے ضروری تھا۔ اگر اس کے دوسرے ایڈیشن میں یہ اضافہ کر دیا جائے تو اردو دان اور خاکسار لوگ جو قراؤن کی اہمیت اور اس کی تحریر کی خصوصیات سے واقف ہیں اس کتاب سے پوری طرح مستفید ہو سکیں گے۔ یہ کتاب چار ابواب پر تقسیم ہے۔ پہلے مقدمہ جس میں نغیات پر بحثیں سائنس بحث کی گئی ہے پھر پہلا باب شروع ہوتا ہے جو خلیل نفسی اور نقیہ ابواب سے بحث کرتا ہے۔ دوسرے اور تیسرے ابواب میں تعریف و خواہ کی وضاحت کی گئی ہے، اور چوتھا باب لازم اختیار کی گئی ہے وقت ہے۔ کتاب اگرچہ ایک نفسیاتی موضوع پر لکھی گئی ہے لیکن دوسرے تعلیم یافتہ افراد بھی اس کو بڑھ کر سمجھ سکتے ہیں۔ از قیس رامپوری، ناشر مہندسانی پبلشرز دہلی۔

شیطان

اس ناول میں قیس صاحب نے یو۔ بی کے ایروں اور ڈیڑوں کی کمزوریاں، باطنی انقلاب کی ہولناکیاں امیروں کے خبا اور ان کی خود غرضیوں اور بدنظریوں کو ٹھوس علم و پیرایہ میں نمایاں کیا ہے۔ ساتھ ہی اس امر کی کوشش کی ہے کہ ایسے گھبراہٹوں کی مسلمانوں میں علی گڑھ اور کو واضح کیا جائے۔ ناول کی ہیروین ایک علی گڑھ کی ایک ایسی پاکیزہ خاتون ہے جو اپنے خاندان کے ظالم اور خود غرض امیروں کے مقابلہ میں اپنی شرافت اور ایثار نفسی کا اعلیٰ ثبوت دیتی ہے۔

اس ناول کا پلاٹ بہت دلچسپ ہے اور کردار نگاری فنی نقطہ نظر سے قابل توجہ ہے۔ اردو کے جدید ناولوں میں امید ہے کہ اس کو کافی مقبولیت حاصل ہوگی۔

لکھنؤ کا دبستان شاعری از ڈاکٹر محمد ابوالیث صدیقی۔ فیض کتاب جو ۶۱۲ صفحات پر مشتمل ہے۔ دراصل سلسلہ یونیورسٹی علی گڑھ کی پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری کے لئے بطور مقالہ قلمبند کی گئی تھی، اور اب سلسلہ یونیورسٹی کی طرف سے وہاں کے

اپنی کاوش کے ذریعہ سے اس میں کچھ اضافہ کیا جائے اس کتاب کا آخری باب آخری دور کے لکھنؤی شعراء کے لئے وقف ہے۔ ان میں بعض ایسے شعراء بھی شامل ہیں جو ابھی زندہ ہیں اور ان کے متعلق اظہار رائے میں مصنف نے کافی بے باکی اور جسکی ذوق کا ثبوت دیا ہے۔ کتاب کے آخری حصہ میں دو ضمیمے بھی شریک ہیں۔ ایک لکھنؤ کے بعض غیر معروف شعراء سے بحث کرتا ہے اور دوسرے کے ذریعہ سے لکھنؤی شعراء کے سلسلوں کو شجروں کے طور پر ظاہر کیا گیا ہے۔ اس کتاب میں نہرست اخذات بھی شریک ہے لیکن اس کی سب سے بڑی خامی یہ ہے کہ اس کے آخر میں کوئی اشاریہ درج نہیں کیا گیا ہے حالانکہ حقیقی کتابوں میں اس کا ہونا ضروری ہے اور اشاریہ کے بشمول کے بغیر کتاب کی افادیت نصف کے قریب گھٹ جاتی ہے۔

از حسن الدین احمد ایم۔ اے۔
جلیل نمبر مجلہ عثمانیہ
امام اہلن ذاب نفاحت بنگلہ لکھنؤ

لکھنؤ کے دبستان سخن کے آخری بڑے شاعروں میں سے تھے، اور المصنف نے نصف جاہ صالح سلطان الشعراء کے استاد ہونے کی حیثیت سے ان کا رتبہ عہد حاضر کے اساتذہ کباروں میں بہت بلند تھا۔ ان کی وفات کے بعد سے اب تک اردو زبان کے مختلف رسائل و جرائد نے ان کے متعلق ایسے ایسے خاص نمبر شائع کیے ہیں لیکن طلباء کا مجموعہ عثمانیہ کے ترجمان قلم عثمانیہ کا زیر نظر شمارہ جو تقریباً چار سو صفحات پر مشتمل ہے اپنی کوتاہیوں خصوصیات کی وجہ سے ان تمام خاص نمبروں پر فوقیت رکھتا ہے اور اردو ادبیہ کے یہ بچے جو خود حضرت جلیل پر ایک مستند کتاب ہے جو آئے دانی سوں کو حضرت جلیل سے متعلق ان کے معاصرین کے افکار و آرا کا ایک بہترین ذخیرہ ثابت ہوگی۔ اس مجموعہ میں چالیس سے زیادہ مضامین نظم و نثر شریک ہیں جن میں سے اکثر و بیشتر ایسے اصحاب کے لکھے ہوئے ہیں جو جلیل سے ذاتی طور پر واقف تھے اور جن کی قلمبند کردہ معلومات اور خیالات آئندہ حیات جلیل کے مرتب کرنے میں مدد و معاون ثابت ہوں گے۔ یہ مجموعہ بالقویہ رشایا ہوا ہے

الاق مرتب نے مختلف اصحاب سے جلیل کے کلام پر مختلف پہلوؤں مثلاً غزل گوئی، نعت گوئی، تاریخ گوئی، غزلیات اور بید شعری رجحانات وغیرہ پر بھی کافی مفید اور چرچا از معلومات مضامین قلمبند کر کے اس مجموعہ میں درج کئے ہیں۔ اس کی اشاعت سے اردو شعروں کی کتابوں میں ایک قابل ذکر اضافہ ہوا جس کے لئے مرتب قابل مبارک باد ہیں۔

از عبدالحکیم خان مددگار ناظم منکلات
مق علم الصحرا
ملک سرکار بھائی ملبوئی دارالطبع حیدرآباد۔
یہ کتاب حیدرآباد کے منکلات کے علم و دست ناملم

دکھائے گئے ہیں۔ یہ فرہنگ بہت ہی مفید اور ضروری تھی۔ اس کے مطالعے سے عوام بھی یہ معلوم کر سکتے ہیں کہ ہمارے ملک کے معمولی و فتنوں مثلاً جاہل، آدم، بک، بھلوان، بیل بھل، پلاس، پانگرہ، دھتورہ، ریشہ اور دیتا بھل وغیرہ کے فنی اصطلاحی نام کیا ہیں۔

اس کتاب کی زبان میں دقت زبانی زیادہ پائی جاتی ہے اور جگہ جگہ مقامی لہجے کا اثر نمایاں ہے۔ لیکن ان نقائص کے باوجود یہ کتاب اردو دنیا کے لئے ایک غیر معمولی نعمت ثابت ہوگی۔

از ڈاکٹر عبدالمعید خان۔ ناشر
تاریخ زبان عربی اور ادب و اشاعت علوم و فنون میں زیادہ۔ یہ دو صفحات کا ایک مضمون جس میں عربی زبان کے لسانیاتی ارتقاء پر نظر ڈالی گئی ہے اور مختلف زبانوں مثلاً عہد جاہلیت، عہد اسلامی، عہد اموی، عہد عباسی اور اس کے بعد سے اب تک اس زبان نے جو ترقیاں یا تبدیلیاں حاصل کیں ان کو جمال کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ یہ موضوع ایسا ہے کہ اس پر ایک بہت بڑی کتاب بھی لکھی جاسکتی ہے اور ضرورت ہے کہ لکھی جائے۔ اس کتاب کے آخر میں ائمہ اور سادات کے دو مختصر اشاریے بھی شریک ہیں جو اس کی افادیت میں اضافہ کا باعث ہیں۔ توقع ہے کہ ڈاکٹر عبدالمعید خان صاحب یا عربی کے کوئی اور فاضل اس موضوع پر آئندہ ایک مسموط کتاب لکھ کر موضوع کی اہمیت کا حق ادا کریں گے۔ بحالت موجودہ یہ چھوٹی ٹیسی کتاب بھی اپنے اندر کافی افادیت رکھتی ہے۔

مولوی سید عبدالواحد صاحب کی تحریک پر لکھی گئی ہے اور اس کے آغاز میں انھوں نے ایک پیش لفظ بھی لکھا ہے۔ کتاب کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ اس کے مرتب ایک واقع کار اور صاحب ذوق عہدہ دار ہیں۔ انھوں نے اپنی کتاب کو پانچ بابوں میں تقسیم کیا ہے اور ان سے پہلے ایک دیباچہ لکھا ہے جس میں اس امر کو خوبی کے ساتھ واضح کیا ہے کہ محض قومی دولت ہوتے ہیں اور ان کا وجود زندگی کے لئے لازمی ہے پہلا باب تربیت صحرا کے لئے وقف کیا گیا ہے اور یہ کافی طویل ہے۔ اس میں دفتوں کے اٹھانے کے طریقے اور اصول بہت عمدہ پیرایہ میں بیان کئے گئے ہیں۔ دوسرے باب میں صحرا کے مصروف سے بحث کی گئی ہے اور یہ سمجھا گیا ہے کہ صحرا کی پیداوار کتنی قسم کی ہوتی ہے اور اس کا استعمال کن کن طریقوں سے ہوتا جائے۔ تیسرا باب فن تعمیر کے عنوان سے لکھا گیا ہے، اور اگرچہ فنون مناسب نہیں ہے تاہم اس کے تحت یہ دکھایا گیا ہے کہ جنگلوں میں شریک کہاں کہاں اور کس قسم کی بنائی جائیں، اور ان کے ذریعے سے صحرا سے کس طرح استفادہ کیا جاسکتا ہے۔ اسی سلسلہ میں ہمارے فن تعمیر ان کی داغ و بڑی اور ان سے متعلق مختلف اجزاء کا اندازہ اور وزن وغیرہ سمجھا گیا ہے چوتھا باب دراصل دفتری ضروریات سے متعلق ہے اور اس میں صحرا کے قوانین اضابطے اور دستور العمل وغیرہ پیش کر دئے گئے ہیں۔ ان سے نہ صرف اس حکم کے لازماً استفادہ کر سکتے ہیں بلکہ وہ لوگ بھی نادمہ اٹھا سکتے ہیں جن کو صحرا سے کسی کسی طرح کا تعلق ہوتا ہے۔ پانچواں اور آخری باب صحرا سے متعلق متفرق معلومات پیش کرتا ہے۔ اس میں اوزان اور پیمانے کے ضابطے، لکڑیوں وغیرہ کے نرخ نامے، حفظان صحت اور دیگر محتاجات شریک کئے گئے ہیں۔ آخر میں ایک ضمیمہ ہے جو دراصل ایک فرہنگ اصطلاحات ہے جس میں انگریزی فنی اصطلاحوں کے اردو مترادفات

ادارہ ادبیات اردو کی کتابیں

ردیف	نمبر	نام کتاب	ردیف	نمبر	نام کتاب
۱	۲۸	سرگزشت حاتم	۱	۲	۱۲۸
۲	۶۸	سرگزشت غالب	۲	۸	۹۴
۳	۱۲۳	نظام الملک	۳	۶	۴۰
۴	۱۲۲	قاریخ گولکندہ	۴	۸	۳۳۰
۵	۱۲۷	ریڈیو نمبر (۸ تصاویر)	۵	۱	۱۶۰
۶	۱۵۲	ارمغان جنپ	۶	۱۲	۱۲۰
۷	۱۳۰	سونیلی مان	۷	۴	۴۸
۸	۱۳۴	سر سید احمد خان	۸	۲	۱۶
۹	۵۰۰	سر سالار جنگ	۹	۶	۴۸
۱۰	۳۲۲	معرہ کی تصانیف کے اردو تراجم	۱۰	۳	۱۲۵
۱۱	۱۷۵	معرہ کی چھاؤں	۱۱	۴	۱۲۲
۱۲	۲۳۸	اقبال نمبر	۱۲	۳	۲۶۸
۱۳	۱۹۲	سائنس کے کرمے	۱۳	۱	۱۱۲
۱۴	۱۸۳	شعراۃ عثمانیہ	۱۴	۲	۲۳۰
۱۵	۱۳۵	مکتوبات شاد عظیم آبادی	۱۵	۸	۳۰۰
۱۶	۱۹۶	دادا بھائی	۱۶	۲	۱۶
۱۷	۱۱۲	اردو نامہ	۱۷	۴	۲۰۰
۱۸	۱۵۳	حد و آباد	۱۸	۱۰	۸۵
۱۹	۱۳۰	عماد الملک	۱۹	۶	۴۰
۲۰	۲۰۰	اردو دانی کی پہلی کتاب	۲۰	۶	۵۶
۲۱	۵۶	دوسری کتاب	۲۱	۶	۵۶
۲۲	۴۸	محمد حسین آزاد	۲۲	۴	۲۰۰
۲۳	۱۳۲	ماغذی فاؤ	۲۳	۴	۱۳۰
۲۴	۲۱۹	فنِ تعمیر	۲۴	۱۲	۹۲
۲۵	۳۰۰	محمد امین دکن	۲۵	۱	۱۳۲
۲۶	۳۱۲	ہندوستانی معدن	۲۶	۸	۱۴۰
۲۷	۳۲	یورپ کی کہانی	۲۷	۱۰	۸۰
۲۸	۱۱۳	سہ ماہی	۲۸	۱	۱۰۰
۲۹	۱۵۰	پانی کی کہانی	۲۹	۶	۴۸
۳۰	۱۱۸	رسائل طیبہ	۳۰	۸	۳۹۰
۳۱	۱۶۸	حکمت گوہرین	۳۱	۴	۴۰
۳۲	۸۰	قاریخ ادب اردو	۳۲	۸	۱۷۲
۳۳	۱۲۸	اشوک اعظم	۳۳	۸	۵۶
۳۴	۱۶۸	پانہیں	۳۴	۱	۸۳
۳۵	۲۳	یورپ جنگ سے پہلے	۳۵	۸	۲۱۸
۳۶	۵۲	شہنشاہ	۳۶	۸	۱۷۹
۳۷	۲۰۰	اریائی زبانیں	۳۷	۱	۱۰۲
۳۸	۲۲	ظام علی خان	۳۸	۳	۳
۳۹	۳۲	ندرتہ اردو مضبوطیات جلد اول	۳۹	۵	۲۰۰
۴۰	۳۲	عرب اور عربستان	۴۰	۱۰	۵۶

سبیل



ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد دکن کا ماہنامہ

زیر نگرانی
ڈاکٹر سید محی الدین قادری
مجلس ادارت
خواجہ حمید الدین ایم اے
سکینہ بیگم
+

سب سے

نشان شہ آصفیہ ۱۵۲
نشان شہ بدایینیم ۲۹۵
ٹیلیفون نمبر ۲۲۰۹
چند سالہ پارکے آگے آئے
پچھلے کال سب سے ایک دو گنا گئے
+

شمارہ ۱۰

بابت ماہ اکتوبر ۱۹۶۶ء

جلد ۹

فہرست مضامین

۱	نیا ہندوستان	۱
۲	غریب کا دل	۲
۳	گھر کے جنگلات	۳
۴	قبضہ بنگالہ	۴
۵	خواتین کے مسائل	۵
۶	جوان سے انسان تک	۶
۷	بہمنیہ دھرم میں زراعت تجارت کی ترقی	۷
۸	عربی ادب عہد بنی امیہ میں	۸
۹	محبت (نظم)	۹
۱۰	مہر و مہر و انجم (فائدہ)	۱۰
۱۱	عبداللہ	۱۱
۱۲	عبداللہ	۱۲
۱۳	سوز و دل (فائدہ)	۱۳
۱۴	نور محمد قلی قطب شاہ (غزل)	۱۴
۱۵	خاندانہ (نظم)	۱۵
۱۶	نئی کتابیں	۱۶
۱۷	تنقید و تبصرو	۱۷
۱۸	ادب کی خبریں	۱۸
۲	نجمہ سمیع	
۵	یاسین (حیدر آبادی) کلیہ اثاث	
۹	سعدیہ سلطانہ	
۱۱	شری یاجنیں	
۱۲	پروفیسر عبد الحمید ایس ای کالج (بھادلوپور)	
۱۵	سید محمد بیدی	
۲۰	ابوالفضل العباس ایم اے کنگر دارالعلوم کالج	
۲۵	پروفیسر منظور حسین شوریہ ایم اے	
۳۳	محبوب حسین بگرنی اے (عثمانیہ)	
۳۴	احمد ظفر (راولپنڈی)	
۳۷	احمد ندیم قاسمی بی اے	
۳۹	سہام مرزا	
۴۰	محشر نقوی	
۴۹	جبریل	
۵۰	نواب مرزا سیف علی خاں	
۵۱	نرس "ق"	
۶۳۱۵۷	ادارہ	

خواجہ حمید الدین ایم اے کے اہتمام سے شکیلی بی بی میں چھپکر دفتر ادارۂ رنزل میرٹ آباد شائع ہوا

نیا ہندوستان

آسمان پر شعلوں کی لگی آگ جیسی تھی شعلوں، بلکہ اس
 کبیر، زیادہ نہیں زمین پر لگی ہوئی تھی۔ سرکاروں پر ہندو
 نزاروں سے گزرتا ان نول کا خون، شعلوں سے زیادہ
 نکھین تھا۔ علم جگہ خون کے وسیع اور ان کی اعتدال سے
 کھٹے ہوئے ٹکڑے کے کچھ بے نظار پیش کر رہے تھے جنہیں
 دیکھ کر اس سے بڑی ہوئی خواہش پڑا آئو ہانے جی
 چاہتا تھا۔ کیا یہ جنوں کی دیکھ بڑھاؤ غلط نہیں ہے؟
 ان سرکاروں پر ہندو ہوئی تھی ان کی لاشوں کو دیکھ کر تعجب اور
 انھوں میں بڑا کہ کیا ایک جہی دوسرے جہی کو اس
 جہاں سے لے کر نکلتا ہے۔ اور دنیا کے کسی بھی
 سے مہم جوئی، مثال نہیں ملے گی کہ ایسی قوم جنہوں سے
 جہاں کے بے گناہوں کو جہاں سے لے کر نکلتا ہے۔
 وہ کلا۔ وہ جنہوں کے خون سے۔ کلا۔ کلا۔ کلا۔ کلا۔
 سے بھی جی جہاں آئے اپنے ہی جہاں کے وہ ہیں شاعور
 ہے۔ ان کی عجیب و غریب سبب اس کو دیکھ کر۔ یہ بھی نہیں
 نہیں کہ اس کے عجیب و غریب کاموں میں نہیں کرتی ہیں۔
 پھر یہ ادا کی گئی تھی۔ یہ سبب ہی جہاں سے لے کر نکلتا ہے۔ کیا
 اپنی طاقت، اپنے ہی جہاں کو لے کر نکلتا ہے۔ کیا
 اس کو وہ بڑی بڑی مصروفیتیں ہیں۔ کیا جواب
 ہے تو یہ بھی نہیں۔ یہ سبب ہی جہاں سے لے کر نکلتا ہے۔
 دے گی۔ وہ سب سے لے کر نکلتا ہے۔ کیا
 اور ہندوستان بھی یہ سبب ہی جہاں سے لے کر نکلتا ہے۔
 ہندوستان، اپنے ہی جہاں سے لے کر نکلتا ہے۔
 اور ہندوستان، اپنے ہی جہاں سے لے کر نکلتا ہے۔

یہ مختصر داستان اس بار وڑکے کی ہے جو
 دہشتہ تک دو بڑی قوتوں کو ان کی غلط کاریوں سے روکنے
 کی کوشش کرتا تھا۔ اور جس نے وہ تیسرے ہوئے تھا
 کہ دوسریاں صلح و محبت کا پرچم لہرانے کی کوشش کرتے

ہوئے ہاں دی۔ وہ غلط قوت سے ان کو لکھ رہا تھا۔
 اس کے یہ ہمارے مل ہوشہ رہے گا۔ اس کا معصوم عقول
 کبھی فائدہ ہو گا۔ بلکہ کبھی نہیں کی کہ یہ معصوم ہوں وہ چپے
 کا پھوسے گا اور پروان چڑھے گا۔

بزرگ روز حالات بڑا تر ہوئے تھے۔ ہندوستان کوئی ان
 ایسا نہیں گزرتا جیکہ اس کی دواوائیں ہوں۔ ہندوستان
 سے نالہ کو فریاد آئے وہ فغان کی آوازیں بلند تھیں۔

ملکوں اور شاہراہوں پر لاشوں کے ڈھیر تھے۔ ہندوستان
 اور مردہ انسان سب ایک دوسرے پر عجیب سے کسی کھال
 میں پڑے رہتے۔ دن اسی فغان کی آواز میں تھا۔ لڑاؤ تھا اور
 رات ان تباہ کاریوں کو اپنی آواز میں لے کر نکلتی تھی
 اور۔۔۔ زیادہ سے زیادہ۔۔۔

ہر ایک لاش کے پاس وہ رنگ، ان کی فغان کی آواز تھی
 اور ہندوستان میں کوئی نہ تھا۔ ہندوستان کی رات
 ہات پاتہ ہوتا۔ ان کے ہات پاؤں۔ ہندوستان
 وہ مسلمان وہ لڑاؤ ہوتا ہے۔ کسی ہندو لاش کو دیکھ کر
 بھی اس کے دل پر عجیب سے لگتا۔ کسی مسلمان لاش کو دیکھ کر
 بھی وہ۔۔۔ وہ پتہ لگتا کہ وہ لڑاؤ تھا۔ ہندوستان کی لاش تھی۔

عجیب اور مسرت وہ ہندوستان کی لاش تھی۔
 کے کہ اپنے کی آواز میں کرو۔ ہندوستان، وہ اپنے دوسرے
 ساتھیوں کی مدد سے۔ ہندوستان کی لاش تھی۔
 غریب، اپنے اس ہندوستان کی لاش تھی۔ وہ ہندوستان
 کے لاشوں کی فغان کی آواز تھی۔ ہندوستان کے دوسرے ہندوستان
 کی طرح ہندوستان کی لاش تھی۔ ہندوستان کی لاش تھی۔
 نہ اٹھارہ نہیں ہوا تھا۔ ہندوستان کی لاش تھی۔

واقعات ہوتے۔ بلکہ ہندوستان کی لاش تھی۔
 بھائیوں کی خدمت کرتے تھے۔ اور ان کا لاش تھا اپنے
 غریب اور لڑاؤ تھا۔ ہندوستان کی لاش تھی۔
 غریب سب ہندوستان کی لاش تھی۔ ہندوستان کی لاش تھی۔
 کی زیادتی سے مر جانے والوں کی لاشوں پر آئو ہانے

اور سلمان تلواروں نے پھلنی کر دیا۔ وہ منہ کے بل لاشوں
گر پڑا اور وہ دل جو دونوں جاحقوں کی محبت میں ایک ہی
طرح سے دھڑکتا تھا۔ ہر شے کے لئے ٹھنڈا ہو گیا۔ وہ انھیں
جودہ نولہ جاحقوں کی تباہی پر کیاں آنسو بہاتی تھیں
ان ہی کے ہاتھوں زندگی کا نور کھمبے۔ اور وہ بہادر
ہاتھ جودہ نولہ جاحقوں کی خدمت کرتے تھے ہر شے کے لئے
بے جان اور مرد ہو گئے کران تمام لاشوں کے درمیان
پڑی ہوئی وہ بہادر لاش اب بھی طوحت کا سستی دیری
تھی۔ چاروں طرف سبز لہو سپرہ تھا۔ اس بچے سرخ
خون میں سرکی ٹوٹی اور گانڈھی کیپ ڈوب گئی تھی اور
دور — افق کی سنو سے سرخ سویرا جھانک رہا تھا۔

سجملہ سمیع

اس طرح محو تھا کہ اسے بلوائیوں کے پہنچنے کی خبر اس وقت
ہوئی جبکہ وہ اس کے ہاتھوں قریب پہنچ گئے تھے۔ زرد
چہروں کا ایک جھوم جن کی صورتیں دیوانہ کی بہت تھیں اور
خونریزی کی ہوس سے انتہائی بھیاںک ہو گئی تھیں۔
سروں سے بند بشارتوں میں، برجیاں اور لاشیاں
اور تباہی چھانے گئے لئے بیقرار ہاتھ۔ یکایک دوسری
سمت سے اسی طرح کے چہروں کا ایک جالہ آنسو جگتی
ہوئی تلواروں اور لہرائی ہوئی لاشیوں کا ناچنا ہوا
آنسو۔ — بے تحاشہ دوسرے گروہ پر ٹوٹ پڑا اور وہ
لاشوں پر نئی لاشیں پھینکیں۔ بیدہوشی سے قتل کرنے والوں
نے تھیل کو بھی کھریا اور ایک ساتھ اس کے سینے کو ہندو

تصحیح جولائی و اگست ۱۹۳۷ء کے مشترکہ سبکس میں سمتان دوم کڈا کے مضمون کے تحت صفحہ (۶۷) پر ۱۳
میں سوئیڈور او کی بجائے سوہا را سوئیڈور او چھپ گیا ہے۔ جب تصحیح فرمائی جائے۔

ادارہ

من کی دنیا :- حیدر آباد کے نوجوان افسانہ نگار رشید قریشی کے افسانوں کا نفیس مجموعہ ہے۔ افسانوی ادب سے
آرہ کے نئے ادب سے دلچسپی رکھنے والے اور ترقی پسند نظریوں کے پرستاران افسانوں کے مطالعہ سے ضرور غلط فہمیوں
جو اسباب اور وہ کے جدید ترین افسانوں کا مطالعہ کرنا چاہتے ہیں وہ اس نوجوان مصنف کے ان پرکیت افسانوں سے
ضرور مصلحت اندوز ہوں گے۔

صفحات (۱۶۰) قیمت مجلد (ع)
ملنے کا پتہ :- سبکس کتاب گھر ادارہ ادبیات اردو رفعت نزل
خیرت آباد - حیدر آباد دکن

غریب کا دل

اے ایک ٹھونڈی پانی باریچے نے کراہتے ہوئے کہا۔
اس آواز کے ساتھ ہی سلیمہ تڑپ کر اٹھی ایک پیالے میں تھوڑا سا پانی ڈالا اور پیچھے کے طبق میں دھیرے دھیرے چمکایا۔
بچے کی تحلیف اور بے چینی اس سے کچھ نہ گئی اس کی آنکھوں میں آنسو چمک آئے اور اس کا دل کسی معلوم خوف کی وجہ سے دھڑکنے لگا آج سترہ دن ہوئے کہ اس کا بچہ ہلکا تھا۔
میں مبتلا تھا۔ دو ایک کون پوچھے یہاں تو ضروریات زندگی کے کام لالے پڑے ہوئے تھے۔ اور پھر دیہات کا مقام۔
جہاں عظیم اور ڈاکٹر آباد ہوتے ہیں اور جہاں تو ان کی زبردستی کب انہیں اتنی اجازت دینی ہے کہ غریبوں کا مفت علاج کریں اس میں شک نہیں کہ شہروں کی بنسبت دیہات میں انسانیت اپنے کامل عروج پر پہنچ رہی ہوتی ہے۔ سادہ لوح لیکن ہمدرد و پُر دوسی ہر روز بچے کی تیار داری میں ایسا ہی حصہ لیتے جیسے وہ ان کا اپنا ہی بچہ ہے۔ لیکن صرف ہمدردی ہی اسے گرم نہیں کرتی ہوتے نہیں تو یہ ملک کس ہسپتال انکس مرض کی دوپٹ سب کی بھی تحفہ رائے تھی کہ بچے کو شہر لے جا کر وہاں کے ہسپتال میں شریک کروایا جائے۔ سلیمہ بڑی الجھن میں تھی۔
شہر کے ہسپتال میں کیسے شریک کروائے۔ بیماری اور مطلقے کے اس اہم معاشی مسئلہ کو وہ کیسے حل کرے۔ یہ اس کے دماغ سے باہر تھا۔ وہ ابھی اسی دھڑکنے میں تھی کہ اس شام شہر سے کوئی ٹال گاڑی رام داس نامی آئے۔ یہ شہر کے نہریلے کنارے کا علاج کرنے میں انہیں خاصی مہارت تھی۔
اور ان کا مکان بھی کوئی دور نہیں تھا چار پانچ میل کا فاصلہ تھا چار پانچ میل کا فاصلہ دیہات والوں کے لئے کوئی اہمیت نہیں رکھتا اس فرحت افزا خبر کو سن کر اس کو کتنی مسرت ہوئی اس کا انداز صرف وہی دیکھ سکتے ہیں انہیں خود بھی کبھی اس قسم کا تجربہ ہوا ہو۔ امید کی ایک ہلکی سی کن

اس کے دل میں پیدا ہوئی۔ اور وہ خوش آمد تزیلات میں کھڑی گئی۔ اس کو یک گونہ اطمینان قلب حاصل ہو گیا۔ تمام رات گزری لیکن بچے کی بے چینی بے قرار رہی۔ وہ رات بھر گریں بدلتا رہا۔ آہ! مصمم و مختلف تھی! اس نے زندگی کی ابھی صرف تین ہی بہاریں دیکھی تھیں۔ آج سلیمہ کو وہ رات رہ رہ کر یاد آ رہی تھی جب کہ ندیم اب کی طرح بیمار تھا۔ اس کے سر میں سخت جوش آئی تھی۔ اس وقت قاسم زندہ تھا۔ باریجات کو ان دونوں نے مل کر کس طرح پال لیا تھا۔ کیا ہی بوجھ کیوں نہ ہو اس کو جب وہ آدمی مل کر بائٹ لیتے ہیں تو وہ کتنا ہلکا ہو جاتا ہے۔ آج پڑیٹا ہی کے باوجود بھی وہ ایک دوسرے کو تسلی دیتے جب کبھی سلیمہ مانتا سے مجبور ہو کر زار و فطارتوں سے بھری توہین اسی وقت قاسم اس کی گریہ و زاری کو اس کے خدا پر ایمان اور اعتقاد و کمال کے فقدان پر محمول کرتا۔ عورت کے لئے اس سے بڑھ کر اور کوئی سزا یا نہ نہیں۔ سلیمہ فوراً اپنے ہوش میں آجاتی۔ اور بارگاہ الہی میں ٹھٹھوں سر بسجود ہو کر عافیت کا شکر کرتی۔ لیکن آج ————— آج ————— وہ تنہا تھی۔ اس کا دنیا میں سوائے اس بچے کے اور کوئی نہ تھا۔ آج ایسے ماضی کی ساری باتیں دھیرے دھیرے یاد آ رہی تھیں۔ وہ سوچ رہی تھی کہ میری قسمت میں بھی شاید دکھ لکھا ہوا ہے قسمت کے کچھ کو کون کیا کرے۔ پیدا ہوئی تو ماں کی موت کا فوجی لائی۔ اور ان کے بعد بچے کی زندگی سوتیلی ماں کی موجودگی میں کس عذاب میں گزرتی رہتی ہے وہ ال نظر سے پوشیدہ نہیں۔ دنیا بھر کی محفلیں ہیں۔ مظالم برداشت کئے۔ اب دو سال ہوئے فوراً سکون نصیب ہوا تھا کہ زندگی نے بھر ایک پٹا کھایا۔ گرائی زندگی کے بارے میں ہمارا کچھ نہ آئے ہوئے ابھی میں بس مجھ کو گزرنے آئے تھے کہ شہر میں طاعون کی وبا پھیلی اور اس شدت سے لگا تھا کہ آٹھ دس دس جڑے ہر روز ایک ایک محلے سے غلطے آتے! میرا قاسم بھی اسی خوش ویا کا شکار ہو گیا۔ اور میری

ہندوستان کا معاشی سوال کبھی نہیں تھا۔ ایک نے تو علانیہ سامنے ہی زس بے مخاطب ہو کر (انگریزی میں) اس کی ہیئت کذا فی، مغلطی اور اس کے اپنے ساتھ لے بیٹے کے لئے مصر کوئے پر ہایت ہی نر لیا تہ انداز میں خوب خوب مغلطہ اڑایا۔ اور اس پر زس کے فلک شگفتہ فتنے کو پر ہانگہ کا فادر ہے تھے۔ یہ ایک مسئلہ بات ہے کہ ان کی بھر دی اپنے جنسوں سے زیادہ غریبوں سے وقت ڈولا ہے زیادہ دولت مندوں سے ہوتی ہے۔ ان کے کس کو

ہی نے کیا خوب کہا ہے سے
ہوں جس نے جب میں خند نہ کی تھے
کریں مائل وی فرسوں کی نیر نیاں؟

جی بھاری، مغلطہ ملی کیسے اس کلیہ سے سن سکتی ہو
کتنی سنی۔ اس نے بھی وہی کہ بوس کے جو پندہ کرتے ہیں سلیم
دول اس بدروی سے پاش پاش ہو گیا۔ جبکہ وہ انگریزی
زبان کی بھی لیکن یہ بدیور پہچانی ہی نہ سکتی تھی۔ وہ ایک تیار
شہس قی بتوں قیاد شاس کچھ سلیم ہی پر سو قوت ہیں
برہندوستانی عورت بترن قیاد شاس ہوتی ہے کیونکہ
وہ ایک ایسے احوال میں رہتی ہے جہاں ہر وقت اسے
رہانے کے تیور چھانٹنے ہوتے ہیں۔ لیکن اس پر بھی سلیم
مست نہ باری۔ ایک مرتبہ وہ پھر رام داس کے ہاں ہی
لیکن بھاٹک کے اندر داخل ہونے کے قبل ہی دربان نے
روکا اور غمانہ لہجہ میں پوچھا۔ کون ہے؟ اور پھر سلیم
کو دیکھ کر مغلطہ انداز میں (اسی حالہ) آپ کس واسطے
یہاں تشریف لائی ہیں؟ آؤ ڈاکٹر صاحب کے پاس ہی
ہو۔ پچھلاڑ۔ رکھو ایک جی۔ ہم نصیر علی ڈاکٹر صاحب
تک پہنچے تھے ہیں۔ دیکھتی ہیں ہوں کتنی بیڑ ہے۔ اسی
بیمار میں سے نفس کر جانا کیا آسان کام ہے؟
سلیم نے ان ان نیت موز سولات کو کوئی جواب
نہ دیا اس کی آنکھوں میں اپنی مغلطی اور بجا نہ قیام کی تصویر
چمک کئی۔ آنکھوں میں آنسو بھرائے۔ مگو گریہ وار میں جواب

کتنی حیات کو حوادث کے منہ باری میں چھوڑ کر مصائب و آلام
کے طوفان کا مقابلہ کرنے کے لئے تنہا چھوڑا۔ اس کو
اولاد کو کتنی تساعی؟ لیکن ابھی وہ عہد کی زندگی کی ایک
بہاری دیکھنے نہ پایا تھا کہ موت کی پہلکان وادی میں
سو پوٹ ہو گیا۔
نورم کی پرورش کس طرح ہوگی اور عہد کا بار کون اٹھائے گا۔
یہ دو سوالات تھے جو سلیم کو غمگینوں پریشان کرتے۔ لیکن
سلیم ایک عورت تھی اور عورت معبر و استعجال کا دامن
آزمنہ بھی نہیں چھوڑتی۔ اپنی اگاہیت شادی اور شریک کئی
سے اپنی درجہ بچکی کتنی حیات کو سب مل واد تک پہنچانے
کے لئے عہد کو شال دیتی لیکن اس بیماری سے اس ہلکا
خمار سے اس کو کس طرح بچاتے۔ یہ اس کے سب کاروں نہ
تھا۔ وہ باری میں تو رہے پیہ ہی سے کام چمکا ہے۔
دیہات کے خوش پریش اور غلامانہ زبانون کی رائے بھی
کندیم کو ڈھنگا نہ ہو گیا۔ اسے تھی غدا زودا درودا
اور کیل نام کی سخت ضرورت ہے اور اسے شہر کے کسی
بڑے ہسپتال میں شریک کرنا ناچاہیے۔ لیکن سلیم خوب لکھی
وہ کیا کہے۔ عام بیماری وفاق نزل کی لہ پروانی سے وہ
جونی واقف تھی۔ اور ذاتی طور پر صرف کر کے علاج کروانا اس کے
امکان سے بہرہ تھا۔ ایک مکان اور تین زلیورات اس کی
کل کا ٹاٹ تھی۔ مکان کو تو قرض خواہوں کے تقاضے سے
تنگ کر کے کس ہی غلام کر دیا تھا۔ اور زلیورات وہ بھی
یونی غلغلی کا فادر ہو گئے۔ اب اس کے پاس اگر کچھ تھا تو
عقیدت کے بندہ تھا۔ اور عاجزانہ انتہا میں محبت کا جو بکراں
رام داس کی شہرت سن کر وہ بھی رام داس کے ہاں
گئی۔ لیکن دانے بھری باہر دفعہ ہی جواب ملا کہ ڈاکٹر صاحب
تھر پرائیں ہیں۔ جو بھی باہر گئے ہیں اور جلد واپس ہوئے
تو قے نہیں؟ وہ اور بھی دو تین ڈاکٹروں کے پاس گئی لیکن
سبھوں نے وہی ٹانسا جواب دیا جو بھی کہ آج کل کے ڈاکٹر
اور عیبوں سے تو تیر ہے۔ یعنی وہی فیس کا مسئلہ اور

جس کے لئے اس نے دنیا کے سید و زانہ مظالم سجے تھے اپنے ہی خرد
کا علم و علم بنی تھی۔ آہ وہاں جتنا تھا اس کی زندگی کا کوئی تہہ نہ
شور کی موت کے بعد عورت کی زندگی کا آخری سہارا اس کی اولاد
ہوتی ہے اگر عورت اس کو بھی کھو دے تو وہ خود کو کھینچ کر کے قنور
کیا کرے تاہم کی موت کے بعد اسے کتنے ساہوکار تھیں تو کوئی نے
جب بابر اور اس کی توجہ پر کی طرف مستغفل کروائی تو وہ اپنے چہرے
میں آبی تھی اور بے اختیار ہوا اس سے پیٹ کر اتار دئی کی عرض
وائے بھی بلیغ نہ ہو سکر کہ گئے ہوں کہ لیکن آج وہ کس لئے
نہ رہے۔ کہ دنیا کے لئے ۱۹ دنیا کے لئے جس نے اسے ٹھکرایا

عام سماج پر ایک طنز آمیز ناول، ایک نئے لالہ اور اسی جیسے دیگر
چلے گئے، اچھا، بہت اچھا، اور مختصر ہے۔ آپ اسے دیکھ سکتے ہیں۔
گہراؤ نہیں بھی مختصر ہے، نیچے آتی ہوں۔ یہ کہہ کر وہ ایک ہزار
کے سامنے آئی، موٹر کی رفتار بہت تیز تھی، لیکن سلیوٹر کے دل کی
فشار سے نہیں زیادہ تیز تھی۔ ڈرائیور نے بھی ایک بار دنگ
آخر میں شش کوئی پرتا آیا۔ یہی ہے باقضاء منجھ کے لائیو
گھنٹہ جو سے ہار دیر باہوں سختی کی نہیں، مرنے پر تو نہر
کھا کر نہیں کیوں کو کوئی کے چند سے میں جیسا ہے۔
موٹر پر بیٹھنے والے محفلات سے جو یہ شور وغل سن کر
جما ہوا اور ڈرائیور سے کہا، بھائی یاد رہے تم بھی تھے دو لوگ اور
پہلے وہ بیک کے جو وقت ہو، اگر اسے اپنی جان کی پرواہ ہوگی
تو خود ہی ہٹ جائے گی۔ عموماً عورتیں بہت سخت جان ہوتی
ہیں تو دیکھنا اس کے چوٹ بھی نہ اٹھے گی۔ لیکن انوس کلان
کی پیشین گوئی غلط ثابت ہوئی۔ اور اس بیماری کی رو سے جسے
کے ایک زوردار گھماؤ کے ساتھ ہی نفس غصی سے پرواز لگتی۔
اس میں قوت کی کتنی مسئلہ فائدہ کشی اور سونے پر ہساک
بچنے کی تیار داری اور ریشائی اور اب ایک ہلکی ضرب بھی
اس کے ربط زندگی کا تار نہ کر کے کو کوئی تھی۔ وہ اس بائی نے ہم
وہاں سے جا چکی تھی۔ اپنے معبود تھی کے پاس۔ سختی فرادوڑ کے
لئے۔ کہ اس دنیا میں کسی دیکھا غریب کی موت بھی مرید وادہ
کے لئے لطف ہے۔ وہ اپنے معبود سے اس نا انصافی اور سزا
غلام کر کے، جسکے صاحب کے ساتھ ایک میر صاحب کی زندگی گزار
تھیں جو بیچ کر کے دل و دماغ کے ساتھ ہی ادا لائی کاؤ ایک
سو چلنا کھانے کے پیشہ روزی کمانے کا فائدہ ہونے نہیں زیادہ مخلوق خدا کی خدمت اور سہار دی کا ہے۔ حال ہی میں میری ایک سہیلی نے
مجھے سنانے کی کہ میں سچا کالج جا رہی ہوں۔ ریش نہیں میں ہی دیکھیں ہنکے، اگر کہہ دیتے آپ کو حق خدا کی خدمت کرنے کے قابل یا نہ کہ خود کو

گھر کے جھگڑے

آج کل جہدہ دیکھتے جھگڑے نظر آتے ہیں کہیں مزدور اور سرمایہ دار جھگڑ رہے ہیں تو کہیں مظلوم اور ظالم میں کش مکش جاری ہے۔ ایک طرف حاکم و محکوم میں رسد کشی ہو رہی ہے تو دوسری طرف زبردست و زیردست میں جنگ ہو رہی ہے۔ غرض ہر طاقت و دوسری طاقت سے برسرِ پیکار ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قدرت کا یہ کارخانہ جھگڑوں کا بارد و خسانہ ہے۔ جھگڑوں کا بانی ابلیس ہے جس نے انڈیا میں جھگڑنا شروع کیا، اور شاید دنیا شیطاں کے ہکانے میں آگئی آج کی دنیا جھگڑوں کا گھر ہے لیکن اس وقت دنیا کے جھگڑوں سے زیادہ توجہ کے محتاج گھر کے جھگڑے ہیں۔ آئیے اب ہم اپنی روزمرہ زندگی کا جائزہ لیں۔ جب ہم لوگ اپنی زندگی پر نظر ڈالتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ کہیں میاں بیوی میں سمجھتی ہے تو کہیں ماس بیویں سمجھتی ہیں۔ یہی ہے کسی بگدا دار و دھنچرے میں کھینچاؤ ہے تو کہیں باب میوں میں ان بن ہے۔ ادھر چھوٹے بھائی بیٹوں میں جو بی بیوں پر ہے، ادھر بچہ بیوں میں تو تو میں میں ہو رہی ہے۔ اسی لئے میں جھگڑوں کا خفیہ یا مخفیہ مرکز بن رہا ہے۔ یہ جھگڑے آخر تو کیوں نہیں؟ پھر یہ کیسے شروع ہوتے ہیں اور کہاں ختم ہوتے ہیں۔

اگر ہم ان جھگڑوں کے اسباب پر غور کریں تو ان کی تہ میں انسان کی معمولی کمزوریاں نظر آئیں گی۔ جہالت فساد کی جڑ ہے۔ اسی سے انسان میں غصہ اور نفرت، بدکلامی اور بدسلوکی، غلط فہمی اور بدگمانی پیدا ہوتی ہے۔ پہلے پہل آپ کو یقین نہ آئے گا کہ کیا واقعی جہالت انسان کو اتنا نقصان پہنچا سکتی ہے! آپ نے بڑی بڑی عورتیں عورتوں سے یہ کہاں ضرور سنی ہوگی کہ کس طرح ایک جاہل آدمی نے فیش میں آکر اپنی بیوی بچوں کو قتل کر دیا کہتے ہیں کہ کوئی صاحب مریہوں پر بنا دے پہلے جارہے تھے۔ ان کی اس حرکت کو کسی خان صاحب نے دیکھ لیا۔ کہنے لگے ”کیا ان میں کیا حق ہے کہ میرے آگے مریہوں کو بناؤ دیں“۔ راہ چلتے نے خواب دیا خان صاحب! جس طرح آپ مریہیں رکھ سکتے ہیں ویسے میں بھی مریہیں رکھنے کا حق رکھتا ہوں۔ رہا میرا مریہوں کو بناؤ دینا، یعنی آپ ہی بتائیے اس سے آپ کو کیا نقصان پہنچا؟ اتنی سی بات پر خان صاحب فیش میں آگئے کہنے لگے ”میرے سامنے مریہوں کو بناؤ دینے کی ہمت اگر ہمت ہے تو ڈاؤ، دو دھڑا لڑیں“۔ یہ کہہ کر خان صاحب نے اپنی تلوار میان سے نکال لی۔ ہوشیار راہ گہرے خان صاحب سے کہا ”بھائی! میں آپ کا مقابلہ کرنے کو تیار ہوں، لیکن اگر ہم دونوں میں سے کوئی گٹ مرے تو اس کی بیوی بیوہ اور بچے یتیم ہو جائیں گے۔ اس لئے بہتر ہے کہ پہلے دونوں اپنی اپنی بیویوں اور بچوں کو قتل کر دیں اور اس کے بعد جی کھول کر لڑیں۔ یہ معلوم کرنے کے لئے کہ دونوں نے اپنی بیویوں اور بچوں کو قتل کیا ہے، اٹے یا کاکھل قتل کرنے کے بعد جی پکڑا رنگ لیں“ غرض دونوں اسی مقام پر واپس آئے گا وہ کہہ پل کھڑے ہوئے۔ خان صاحب مذاق پر تھے۔ سیدھے گھر گئے اور آؤ دیکھنا بناؤ بس بے گناہ بیوی اور معصوم بچوں کی جانیں لیں۔ خان صاحب غصہ کی آگ کوٹھ کے دھارے نہ دیکھا کہ اسی مقام پر پہنچے۔ خان صاحب کا طریقہ بھی اس وقت تک آپ کا تھا۔ وہ بڑا چلتا پرزہ تھا۔ اس نے کبوتر کے خون میں کپڑا ڈبوایا اور ادھر ادھر ٹھوٹھ کر بکھروا دیں۔ دونوں نے ایک دوسرے سے پوچھا کہ کیا تم نے اپنی بیوی بچوں کو قتل کر دیا۔ دونوں نے شہادت کے طور پر یحون میں لٹھا ہوا کپڑا کھلایا۔ خان صاحب کو یقین آگیا کہ اس نے بھی میری طرح اپنی بیوی اور بچوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا ہوگا لیکن اس راہ چلتے کو معلوم تھا کہ خان صاحب جو کہتے ہیں کر دکھاتے ہیں۔ ضرور انھوں نے اپنی بیوی اور بچوں کو قتل کر دیا ہوگا۔ اب اس نے خان صاحب سے سوال کیا کہ بھائی یہ تو بتائیے کہ

ہم دونوں میں جھگڑا کس بات کا ہے؟ خان صاحب نے جواب دیا کہ ”مجھے آپ کا موصوفیوں کو ناؤ دینا پسند نہیں! اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے راہ گیر نے خان صاحب سے کہا ”تو لیجئے میں خود اپنی موصوفی بیٹی کے لئے دوپٹا ہوں۔“ اتنی سی بات پر خان صاحب خوش ہو گئے اور سمجھ کر کہ میری جیت ہوئی ہے، راہ چلتے کو چھوڑ دیا۔ اب آپ ہی بتائیے کہ حقیقت میں جیت کس کی ہوئی؟ کیا جہالت نے بیوی بچوں کو قتل نہیں کر دیا؟ کیا جہالت نے غصہ کی آگ کو بھڑکا کر خون سے اپنی پیاس نہیں بجھائی؟ واقعہ یہ ہے کہ ہر جگہ جہالت ہی نے فائدہ اٹھانے کو تباہ و تاراج کیا ہے۔ فسوس تو اس کا ہے کہ بعض تعلیم یافتہ حضرات اور نوآئین میں بھی جہالت پائی جاتی ہے۔ تعلیم ہمارے لئے بعد بھی بعض لوگ اپنے کو برتر اور دوسروں کو کم تر سمجھتے ہیں اور اس احساس برتری سے جھگڑتے ہوئے ہیں۔ تسلیم حاصل کرنے کے بعد جب اولاد والدین کو بچی نظر دے دیکھنے لگے انھوں نے خون پسینہ ایک کر کے قہر دلوائی، تو گھر کے نظام میں انتشار ہونا ضروری ہے۔ تعلیم دوانے والے والدین کو کم تر سمجھنا، جہالت نہیں تو اور کیا ہے؟ اور یہی جہالت جھگڑوں کی بانی ہے۔

جہالت کا ایک لازمی نتیجہ غصہ ہے جس سے جھگڑا پیدا ہونا ضروری ہے۔ جب انسان غصہ میں آتا ہے تو اس کے جذبات ذہن پر غالب آجاتے ہیں عقل سے زیادہ جذبہ کام کرنے لگتا ہے، ایسے وقت انسان اپنا ذہنی توازن کھو بیٹھتا ہے۔ غصہ سے انسان بد مزاج ہو جاتا ہے، وہ ذرا سی بات پر جھگڑنے لگتا ہے۔ غصہ ایک آگ ہے جو گھر کے سکون کو نکلنے کی طرح ناک میں پلا دیتی ہے۔

عام طور پر معمولی باتوں ہی پر جھگڑتے ہوئے ہیں، اکثر گھروں میں دیکھا جاتا ہے کہ میاں بازار سے بڑی محنت کر کے بیوی کے لئے کپڑے خرید کر لایا ہے، لیکن بیوی میاں کی دھڑ دھوپ کی قدر کرنے کی بجائے کپڑوں کو نا پسند کر دیتی اور بلا سوچے سمجھے یہ کہہ دیتی ہے کہ تمھیں تو کبھی مال خریدنا نہ آیا، ظاہر ہے کہ شوہر پر اس کا ردِ عمل برا ہوگا، اور وہ یا تو بیوی کے لئے آئندہ کوئی چیز نہیں خریدے گا، یا اس سے نفرت کرنے لگے گا، جس سے جھگڑوں کا ہونا لازمی ہے۔ اسی طرح اکثر اوقات یہ دیکھا گیا ہے کہ شوہر جب دفتر سے تھکا ماندہ گھر واپس آتا ہے تو بیوی گھر کا دکھڑا شروع کر دیتی ہے کہ فلاں سنے یوں برا بھلا کیا۔ بیڑوس کے بچے نے ان کے بچے کو خوب پیٹا۔ گھر میں بڑے بچے نے چھوٹے بچے کو قہر میں سید کیا، وغیرہ وغیرہ ان تمام دھڑوں کو سن کر میاں کا بد مزاج ہو جانا یقینی ہے۔ یہ بد مزاجی گھر کے سکون کو ختم کر دیتی ہے۔

بعض اوقات گھر کے جھگڑے بے توجہی سے شروع ہوتے ہیں۔ فرض کیجئے کہ میاں گھر سے باہر جا رہے ہیں، ایسے وقت اگر بیوی ان سے پوچھے کہ آپ کہاں جا رہے ہیں؟ اور اگر میاں یہ جواب دے کہ ہم کہیں بھی جا رہے ہیں آپ کو اس سے کیا! تو یہ جیوتی بے توجہی میاں بیوی کے تعلقات کو بری طرح متاثر کرے گی اور دونوں میں بخش پیدا ہونا یقینی ہے۔ اسی طرح اگر ماں بیٹے سے پوچھے کہ ”بیٹا، تم کو کونسی کتاب پڑھ رہے ہو؟“ اور اس کا بیٹا اگر یہ کہہ دے کہ ”یہ کتاب آپ کی سمجھ میں نہیں آئے گی، پھر کیا بتاؤں؟“ تو اس بے توجہی سے جھگڑوں کی بنیاد پڑے گی۔

گھر کے اکثر جھگڑے بدگمانی سے ہوتے ہیں۔ ساس بہو کے جھگڑے اسی بدگمانی کا نتیجہ ہیں۔ اس سمجھتی ہے کہ جب سے بہو آئی ہے، اس کا بیٹا جس کو سنے پال پوس کر رہا کیا، چھن گیا، اس کو یہ گمان ہوتا ہے کہ اب اس کا بیٹا اس سے زیادہ بیوی سے محبت کرتا ہے، اس لئے وہ بہو سے بدگمان ہو جاتی ہے کہ اس نے لگا بھگا کراس کے بیٹے کو اپنا بنالیا، ایک اور وجہ یہ ہے کہ ساس اپنے مقابلے میں بہو کو کم سمجھتا اور کم تر سمجھتی ہے، جس سے بدگمانی پیدا ہوتی ہے۔ بہو دیکھتی ہے کہ نئے گھر میں شوہر کے سوا سب اس کے لئے نئے ہیں، اس لئے وہ شوہر کی آگے اپنے جلعے دل کے پھینک دیتی ہے۔

بعض اوقات شوہر کے زعم پر ہوا، ساس سے بد تو یہی بڑتی ہے جس سے تعلقات روز بروز بگڑتے جاتے ہیں، اگر بہو اپنے شوہر سے زیادہ ساس کی دیکوئی کرے اور اسی طرح ساس بہو کو اپنے بیٹے سے زیادہ چاہنے لگے تو گھر کے جھگڑے بڑی حد تک دور ہو سکتے ہیں۔

گھر کے جھگڑے جھوٹی بڑائی سے بھی ہوتے ہیں، اکثر بیبیاں سسرال میں بڑی ڈینگیں مارتی ہیں جیسے مکے میں وہ مسونے کے جھوٹے بھولے میں بھول رہی تھیں۔ اگر بیوی سسرال کی بجائے میکے کو اپنا گھر سمجھے تو اس گھر میں ضرور جھگڑے ہوں گے، جب بیوی میکے ہی کی بڑائی کرتی ہے تو میاں اس بڑائی سے بچ ہو کر میکے اور بیوی سے بدظن ہو جاتا ہے اور گھر جھگڑوں کا مرکز بن جاتا ہے۔

جھگڑوں کا ایک اور سبب فضول خرچی ہے فضول خرچی انسان کو مقروض بنا دیتی ہے اور قربی انسان کو گھن کی طرح دکھا جاتا ہے۔ اکثر گھروں میں دیکھا جاتا ہے کہ میاں کی آمدنی سو روپے ہے اور ان کی بی بی اپنی آرائش و زیبائش پر فضول خرچی کر رہی ہیں۔ فضول خرچی پہلے پہل برداشت کر لی جاتی ہے اور جب وہ اپنی حد سے گذر جائے تو میاں بیوی کے تعلقات کا بگڑنا یقینی ہے۔

جھگڑوں کا ایک اہم سبب جھوٹ ہے، وہ رانی کا بہاؤ بناتا ہے، جھوٹ، پھوٹ کا گھر ہے۔ لگائی بھجائی اس کا پیشہ ہے، سسرال اور میکے کی لڑائیاں اسی سے شروع ہوتی ہیں، اگر بیوی اپنے ماں باپ کو غلط طور پر یقین دلا دے کہ شوہر اور ساس اس پر ظلم کر رہے ہیں، اور اگر اس کے ماں باپ ان جھوٹی باتوں کو سچ سمجھ لیں تو سسرال اور میکے میں جھگڑے ہونا ضروری ہیں۔

جن گھروں میں جھگڑے ہوتے ہیں وہاں دیکھا گیا ہے کہ لڑکے گھرمیں نہیں رہتے، بلکہ اپنا سارا وقت باہر گزارتے ہیں، غرض جس گھر میں سکون نہیں، وہ گھر نہیں، جہنم ہے۔ سعیدہ سلطانہ

(دلا سکی نشر کا حید آباد سے نشر کیا گیا)

فیض نگاہ

میرے مشتیزی و تسمد دیکھتا ہوں میں
اہل نگاہ ہو کوئی تو حسرت رانی کیا؟
افتادہ قطرہ شبنم کا یہ اثر!؟
سب تیرگی میں نورِ وحود دیکھتے ہیں اور
ہوتے ہیں نگاہِ حقیق بہ طرزِ عام
بہر ہر ایک شے پر اداسے نورِ حسن!
پایاں کا رہی ہو آغاس کا رکیوں؟
غور مستیز بنے ہر گھمن سے آج!
منزل مرے قدم پہ نہ قربان جائے کیوں؟

ات اہل ہند اور مجھے ساتھ اسے مگر
کس پر بڑی ہے تیری نظر دیکھتا ہوں میں

قمر

خواتین کے مسائل

انسانی زندگی کی تکمیل کے لئے قدرت نے مرد اور عورت کو لازم و ملزوم قرار دیا ہے۔ ہماری زندگی کی گاڑی دو فوں کے تعاون پر چلتی ہے۔ مرد اور عورت زندگی کی گاڑی کے دو پہیے ہیں۔ لیکن ہر ایک کی ذمہ داری علیحدہ علیحدہ ہے جس طرح ان کی ذمہ داری مختلف ہے اسی طرح ان کے مسائل بھی جدا جدا ہیں، مرد کے ذمہ روزی حاصل کرنا ہے، جس پر رہنے، کھانے پینے، پہننے اور کھننے، غرض کہ زندگی کی تمام ضرورتوں کو پورا کرنے کا ذمہ دار ہے۔ اگر مرد فکر معاش نہ کریں تو پھر زندگی کے نظام میں خرابی پیدا ہو جائے گی۔ اس لئے مرد اپنا سارا وقت روزی فراہم کرنے میں صرف کرتے ہیں اور ان کے پاس اتنا وقت نہیں ہوتا کہ وہ روزی فراہم کرنے کے علاوہ دوسرے معاملوں پر توجہ کریں، اس لئے خواتین پر یہ اہم ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ مرد کی کمائی کو ایسے سلیطے سے صرف کریں کہ گھر کی اور باہر کی تمام ضرورتیں پوری ہو جائیں۔ یعنی نہ صرف اپنے بچوں اور دوسرے متعلقین کی وقتی ضرورتیں پوری ہوں، بلکہ ناگہانی شلوکوں کو دور، شادی بیاہ، ایسے کاری و بے روزگاری، خیر خیرات وغیرہ کے لئے بھی سب جیست اختیار کر رہے۔ خواتین کی یہ ذمہ داری اس قدر اہم ہے کہ اکثر خاندانوں کی خوش حالی و تباہی، ان کی خوش انتظامی و بد انتظامی میں پوشیدہ ہوتی ہے۔ روزمرہ کے تجربات سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ جو عورتیں اپنی اس ذمہ داری کو پورا کرنے کا طریقہ جانتی ہیں، ان کے مرد اطمینان اور دلچسپی کے ساتھ روزی کمائے کی کوشش کرتے ہیں، اور ظاہر ہے کہ ذوقی اس طرح اپنے کام میں لگتا ہے کہ وہ اپنے پیشے میں کافی ترقی کرتا ہے۔ گھر کے باہر بھی وہ عزت کی نظروں سے دیکھا جاتا اور گھر کے اندر اپنے اہل و عیال کو خوش و خرم دیکھ کر باغ و باغ ہو جاتا ہے۔ ایسے ہی گھر دنیا میں جنت کا نمونہ پیش کرتے ہیں لیکن جو عورتیں اس ذمہ داری کو پورا کرنے کے برخلاف ہیں جتنی ان کی وجہ بوجھ گھڑی چند دنوں میں خالی ہو جاتے ہیں اور ان کے مردوں کی کمائی میں روز بروز کمی ہونے لگتی ہے۔ رفتہ رفتہ بے کاری و بے روزگاری، بے گھریاری، افلاس و محتاجی کا منہ دکھائی دے، اور دوسرے گھر جیسے ہی جنم لے جاتے ہیں۔

خواتین کے مسائل میں سب سے اہم مسئلہ انتظام خانہ داری کا ہے، اور نظام خانہ داری کی درستی ہی سے زندگی خوشگوار بن سکتی ہے۔ اس کی بالکل ذمہ داری خواتین پر عائد ہوتی ہے۔ خواتین کا پہلا فرض ہے کہ وہ اپنے گھر کا ایسا انتظام کریں کہ زندگی خوشگوار بن جائے۔ نظام یہ مسئلہ بہت مشکل معلوم ہوتا ہے، لیکن ذرا سی ہوشیاری اور اصولوں کی پابندی سے کام لیا جائے تو یہ مشکل نہایت آسان ہو جائے گی۔ اس میں شک نہیں کہ گھروالوں کی معیشتیں جدا جدا ہیں، اس لئے گھروں کے انتظام کی دو معیشتیں ہی مختلف ہیں۔ مثلاً جن گھروں میں نوکر چاکر، خادماں، ماماں ہوتی ہیں، ان گھروں کی گھروالوں کی ذمہ داریاں ان گھروالوں سے علیحدہ ہوتی ہیں جن کو گھر کا سارا کام کاج خود کرنا پڑتا ہے۔ اس کے علاوہ بعض گھر ایسے بھی ہیں جن میں صرف میاں بیوی ہیں، اور بعض گھر رشتہ داروں سے بھرے ہوتے ہیں۔ تاہم نظام خانہ داری کی کامیابی چار چیزوں پر منحصر ہے۔ وقت کی پابندی، کفایت شعاری، قناعت، خوش خلقی، یہ گویا نظام خانہ داری کے چار ستون ہیں جن پر خانہ داری کی عظیم الشان عمارت قائم ہے۔ اگر اس میں سے کوئی ایک ستون بھی کمزور ہو گا تو جلد یا بدیر سارا نظام خانہ داری خطرہ میں پڑ جائے گا۔

نظام خانہ داری کی کامیابی کے سلسلہ میں وقت کی پابندی نہایت ضروری امر ہے، لیکن وقت کی پابندی طری

ہوں کو نہایت مشکل معلوم ہوتی ہے جب ہمنوں سے اس کے متعلق کہا جاتا ہے تو اکثر ہمیں کہہ دیتی ہیں کہ "ایک سر ہزار سود ہے" ایک دو کام ہوں تو کوئی دولت کی پابندی کر سکتا ہے، یہاں تو ایک ہمان اور سو کام۔ وقت کی پابندی کی جائے تو کیوں کو؟ یہ بات بظاہر صحیح معلوم ہوتی ہے، لیکن ہماری ہمنوں کو جان لینا چاہیے کہ مختلف کاموں کے لئے اگر وقت کو تقسیم کر دیا جائے تو اس سے نہ صرف سب کام وقت پر تکمیل پائیں گے، بلکہ ضروری آرام کے لئے فرصت بھی مل جائے گی، کٹر کام ایسے ہوتے ہیں کہ اگر وہ وقت پر نہ ہوں تو ان کا ہونا نہ ہونا برابر ہو جاتا ہے، اور عموماً ایسے خطرناک نتائج برآمد ہوتے ہیں کہ گھر کا چرنا اور آرام ہی چھین جاتا ہے۔ مشین کے طور پر یوں سمجھ لیجئے کہ کوئی صاحب کسی دفتر میں ملازم ہیں اور ٹھیک دس بجے دفتر کی حاضری ہے، لیکن بیوی وقت پر کھانا تیار نہیں کرے گی، ایسی صورت میں یا تو وہ صاحب دیر سے دفتر پہنچیں گے یا بھوکے پیٹے جائیں گے۔ اگر دیر سے دفتر پہنچے تو ملازمت پر حشر آئے گا، اور بھوکے پیٹے تو بھوک کی حالت میں کام دینی سے نہ ہوگا، اور اگر یہ صورت مستقل ہوگی تو کیا محب ہے کہ ملازمت ہی سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ اس کے علاوہ اگر شہر ہو مل میں کھانے کا عادی ہو جائے تو نہ صرف وہ رقم جو گھر میں صرف ہونی چاہیے باہر صرف ہوگی، بلکہ صحت پر بھی بازاری کھانے کی وجہ اثر پڑے گا۔ اس لئے پابندی وقت نہ صرف اپنی آسانی و کامیابی کے لئے لازمی ہے بلکہ گھر کی خوش حالی کو برقرار رکھنے اور شوہر کی کمائی کو قائم رکھنے کے لئے ضروری ہے۔

پابندی وقت کے بعد سب سے اہم اور ضروری چیز کفایت شکاری ہے، لیکن کفایت شکاری کے معنی مکمل نہیں۔ بخل اور کفایت شکاری میں بہت بڑا فرق ہے۔ کفایت شکاری کا صحیح مطلب یہ ہے کہ تھیل سے قلیل آمدنی کو اس حد تک سے صرف کیا جائے کہ تمام ضرورتیں پوری ہو جائیں اور کوئی ضرورت باقی نہ رہے پائے۔ روپیہ بجائے کی خاطر زندگی کی ضرورتوں کو پورا نہ کرنا بخل کے لگ بھگ ہے۔ کفایت شکاری میں صرف اس بات کا لحاظ رکھنا چاہیے کہ پیسہ کی چیز سوا پیسہ کا کام دے۔ عام طور پر یہ کہہ سکتے ہیں جس کو ناکارہ سمجھ کر ضائع کر دیا جاتا ہے اگر سمجھو بوجھ سے کام لے کر ان کو کارآمد بنائیں تو بہت کچھ بچت ہو سکتی ہے۔ مثال کے طور پر میں ایک واقعہ بیان کرتی ہوں: ایک بہن کو دیکھا کہ ان کے پاس وضو کرنے کی ایک چوکی پائے بوسیدہ ہونے کی وجہ ٹوٹ گئی تھی۔ خادمہ نے رائے دی کہ اس کو جلا دیا جائے، ناسخ کوڑا جمع کرنے سے کیا فائدہ۔ لیکن انھوں نے کہا کہ اگر کوئی بڑھی ادھر سے گزرے تو بلالینا، چنانچہ انھوں نے اس ٹوٹی ہوئی چوکی کے کارآمد ٹکڑوں سے چراغ رکھنے کی تیاری اور ٹانگوں نہ ہنسنے کے چوکھٹے تیار کر لئے۔ ظاہر ہے کہ اگر خادمہ کے مشورہ پر عمل کیا جاتا تو اس کی لکڑی زیادہ سے زیادہ دو پیسے کے ایندھن کا کام دیتی، لیکن چار بجے آنے خرچ کر کے اسی لکڑی سے کارآمد چیزیں تیار کر لی ہیں۔ غرض اس طرح چیزوں کو بے کار ہونے سے بچانے اور بے کار چیزوں کو کارآمد بنانے کا نام کفایت شکاری ہے۔ اس سلسلے میں، ہماری بہنیں بڑی غفلت برتی ہیں اور بے کار چیزوں کو کارآمد بنانا کمرشان سمجھ کر خواہ اسراف میں مبتلا ہو جاتی ہیں، جس کا اثر مردوں کی آمدنی پر پڑتا ہے، اور وہ ان کی لاپرواہی سے مفروض ہو جاتے ہیں جس کی وجہ ان کو سخت پریشانی اٹھانی پڑتی ہے۔ ہماری ہمنوں کا فرض ہے کہ وہ اپنے شوہروں کو قرض میں مبتلا نہ ہونے دیں اور جو کچھ آمدنی جو اسی کو اس سلیقہ سے صرف کریں کہ گھر کی جملہ ضرورتیں پوری ہو جائیں۔ کفایت شکاری کے بعد قناعت ہی سچی مسرت کی کنجی ہے۔ قناعت کے نہ ہونے سے عورتوں اور مردوں کا اطمینان و سکون نہیں جاتا ہے اور زندگی کا طلع ہی جاتا رہتا ہے۔ اکثر ہمیں اپنے سے زیادہ حیثیت والی عورتیں کو دیکھ کر خود بھی ان عیسیٰ بننے کی آرزو کرتی ہیں، لیکن چونکہ ان کے شوہروں کی آمدنی بڑھیا حیثیت کی چیزیں فراہم

کرنے کے لئے کافی ہوتی ہے، اس لئے ان بیویوں میں بددلی پیدا ہو جاتی ہے اور ان کی بددلی کا اثر گھر کے نظام پر پڑتا ہے، جس کی وجہ اچھے خاصے بنے بنائے گھر بگڑ جاتے ہیں۔ اس لئے ہماری بہنوں کو یہ بات ابھی طرح جان لینا چاہیے کہ دنیا میں کثرت ان لوگوں کی ہے جس کے پاس پیٹ بھرنے کے لئے کھانا اور تن و درتن ڈھانکنے کے لئے کپڑا نہیں اس لئے فکل کا مقام ہے کہ وہ عزت کے ساتھ روکھا سوکھا لپیتی ہیں اور موٹا دھوٹا پہن لپیتی ہیں ہماری بہنوں کا فرض ہے کہ مردوں کی محنت و جان فشانی، اور خود ان کی انتہائی خوش فحش فحش و کفایت شعاری کے بعد جو کچھ انھیں حاصل ہوا ہے اس پر اند کا فکل کریں اور اس بات کو یاد رکھیں کہ دنیا میں ایک سے بڑھ کر ایک ہے، اگر کم حیثیت والی بہنیں بڑی حیثیت والی بہنوں کو دیکھ کر خود بھی حیرت کرے لگیں تو زندگی کی حقیقی لذت جو قناعت میں پوشیدہ ہے مفقود ہو جائے گی۔ لیکن قناعت کے معنی یہ نہیں کہ اپنی حالت کو بہتر بنانے کی کوشش نہ کی جائے۔ بلکہ سچی قناعت تو یہ ہے کہ محنت و کوشش اور کفایت شعاری کے بعد جس حالت میں رہیں اس کو غنیمت سمجھیں۔

پابندی وقت، کفایت شعاری و قناعت کے ساتھ اگر خوش خلقی نہ ہو تو نظام خانہ داری کی کامیابی خطرے میں پڑ جائے گی۔ گو، نظر خوش خلقی کا تعلق خانہ داری سے زیادہ اخلاقیات سے مشروط نظر آتا ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ خوش خلقی نہایت ضروری چیز ہے۔ ہماری بہنوں کو سمجھ لینا چاہیے کہ اگر وہ محنت سے کام کریں، وقت کی پابندی کا خیال رکھیں، کفایت شعاری اور قناعت پر عمل کریں، لیکن اگر مردوں اور گھروالوں کے ساتھ خوش خلقی کے ساتھ پیش قدمی نہ کریں تو ان کا سب کچھ کیا دھواں کا رت ہو جاتا ہے گا کیونکہ ان کی بد خلقی سے مردوں کا اور دوسرے گھروالوں کا دل ٹوٹ جائے گا۔ اور اس کا اثر مرد کی کمائی پر بھی پڑے گا۔ مرد کے ساتھ خوش خلقی سے پیش آنا اور اس کی کجی کرنا اس کو دوسرے دن کی محنت کے لئے تازہ دم کرنا ہے۔ جو ہمیں خوش خلقی برتی ہیں ان سے ذہن ان کے شوہر بلکہ تمام گھروالے اور ملنے جلنے والے، سب ہی خوش ہوتے ہیں اور ہر ایک کو ان سے مل کر مسرت ہوتی ہے۔

(نشر کا دیدار آباد سے پڑھا گیا)

نثر یا جین

نذر ولی اس میں دکن کی چار گوبیٹ خواتین انشا پر واز محترمہ جہاں بانو بیگم صاحبہ محترمہ لطیف النساء بیگم صاحبہ، محترمہ نعیم النساء بیگم صاحبہ اور محترمہ نجم النساء بیگم صاحبہ کے دلچسپ مضامین ہیں جو بابائے ریختہ حضرت ولی اور رنگ آبادی کے حالات زندگی اور خص و صیات کلام پر نہایت دلچسپ اسلوب میں اور جدید ترین نقطہ نگاہ سے لکھے گئے ہیں۔ ان مضامین میں ولی کی معلومات، ان کے تخیل، ان کے فن شعر اور ذوق عرفان کے علاوہ ان کے اسلوبی زبان اور انتخاب الفاظ کے متعلق بھی نہایت مفید اور دلچسپ بحث کی گئی ہے۔ ولی کے متعلق پہلی مستقل اور جامع کتاب ہے اس کا مطالعہ تشنگان ادب کی تسلی کا باعث ہوگا۔

صفحات ۲۴۸ طبعیت و کتابت نفس کاغذی قسم جلد پر دو جگہ سنہری نام و قیمت جلد ۸

حیوان سے انسان تک!

(حیاتیات کی روشنی میں)

آج سے لاکھوں برس پیشتر کا ذکر ہے کہ اس کرۂ ارض پر زندگی کا نام و نشان تک نہ تھا، اور زمین اس قدر گرم تھی کہ اس پر کوئی جاندار زندہ نہ رہ سکتا تھا۔ آہستہ آہستہ زمین سے حرارت کا انتشار ہوتا گیا، اور اس کا درجہ حرارت کم ہو گیا، جس سے اس کی سطح سرد ہو کر سکڑنے لگی، اس لئے اس میں جا بجا شکلات اور دراڑیں پڑ گئیں۔ کچھ مدت کے بعد ہوا سے بخارات نے پانی کی شکل اختیار کر کے ان گڑھوں اور نشیبی جگہوں کو پُر کر دیا۔ اب زمین اس قابل ہو گئی کہ اس پر زندگی کے وجود کا آغاز ہو سکے۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ زندگی پانی کے اندر وجود میں آئی اور اس کی ابتدا اوقیانوس کے سمندروں میں ہوئی، کیونکہ یہی جگہ سب سے پہلے ٹھنڈے ہوئے۔

ماہرین علم ارتقا کا خیال ہے کہ مادہ حیات (نقشہ) مادہ جس سے کہ زندگی وجود میں آئی ہے جان مادہ میں کیمیائی تبدیلیوں کا نتیجہ ہے۔ مادہ حیات دراصل ایک پیچیدہ ترین مرکب ہے جو کاربن، ہائیڈروجن، آکسیجن، نائٹروجن اور گندھک وغیرہ عناصر پر مشتمل ہے۔

ابتداء میں جاندار صرف ایک غلیظ (Slack) پر مشتمل تھے، ان کی شکل و شباهت، بلندی یا باجڑوں کی طرح بعض ایک غلیظ جراثیم جن کی زندگی ہوا، پانی اور پانی میں حل شدہ محلول پر قائم تھی، اپنی ادنیٰ اور ابتدائی حالت سے ترقی کر کے اعلیٰ اور ترقی یافتہ قسم کو معرض وجود میں لائے کا باعث ہوئے، پھر ان میں سبزی پیدا ہوئی، یہی سبز مادہ ہے جس کی وجہ سے درختوں کے پتے سبز رنگ کے دکھائی دیے ہیں۔ مادہ حیات کے کیمیائی عمل سے یہ سبز مادہ ہوا کی کاربن ڈی آکسائیڈ اور پانی میں حل شدہ معدنی اشیاء سے پودوں کی غذا تیار کرتا ہے۔ اس قسم کے ادنیٰ جراثیم سے عالم نباتات وجود میں آیا۔

بعض ایک غلیظ جراثیم کی قسم کے جاندار جن میں سبز مادہ پیدا نہ ہوا، اور جن کے بغیر وہ اپنی خوراک تیار کرنے کی صلاحیت نہ رکھتے تھے، انھوں نے اپنی غذا کا سامان بنالیا، ان سبز مادہ نہ رکھنے والے جراثیم کی قسم کے جانداروں سے عالم حیوانات ظہور پذیر ہوا۔

مسلسل تحقیقات سے پتہ چلتا ہے کہ مادہ حیات کے عناصر کی ترکیب کچھ میں ہوئی یہی وجہ ہے کہ عالم حیوانی میں سب سے پہلی، ابتدائی اور سادہ ترین مخلوق جس کو امیبیا (Amoeba) کہا جاتا ہے، کچھ یا سائن پانی کے ذخیروں میں پیدا ہوتا ہے، اور وہیں نشو و نما پاتا ہے۔

امیبیا کی ساخت برعکس، بالکل ادنیٰ، غیر ترقی یافتہ اور ابتدائی جاندار مخلوق ہے اس کا جسم ایک غلیظ پر مشتمل ہے جو زندگی کو قائم رکھنے کے لئے ہر کام انجام دیتا ہے یعنی حرکت، تغذیہ اور تنفس۔ بے کار مادہ یعنی فضلہ جسم سے خارج کرتا ہے۔ بیرونی اثرات محسوس کرتا ہے، اور تولید یا پیدائش سے اپنی نسل کو بڑھاتا ہے۔ فنا ہر ہے کہ تقسیم کار کا جو بنیادی اصول ترقی یافتہ اور اعلیٰ درجہ کے حیوانات میں پایا جاتا ہے امیبیا اس سے محروم ہے۔ ابتداء میں امیبیا، یا اسی قسم کے بعض دوسرے جاندار اپنی حالت پر قائم رہے، رفتہ رفتہ بعض اپنے ماحول کی تبدیلیوں کے باعث

بدن لگے ہیں ان کے اندر کئی قسم کے جسمانی تغیرات رونما ہوئے۔ گمے، چٹا پڑ، طویل مدت کے بعد ایک غلوی جانداروں سے ایسی مخلوق معرض وجود میں آئی جن میں جسم متعدد غلیوں سے بنا ہوا تھا۔ آئینا کو اگر ایک غلوی جاندار کہا جائے تو یہ کثیر غلوی جاندار ہوئے۔ کثیر غلوی جاندار ایک دوسرے کے ساتھ مل کر مینو بہتیاں بنا کر بنے لگے تاکہ ہر دو خطرات سے محفوظ رہیں اور زیادہ آسانی سے ترقی کے مدارج طے کر سکیں۔ یہ ابتدائی زندگی سا لہا سال نئے نئے تغیرات اور نئی نئی تبدیلیوں کی منزل طے کرتی رہی۔ اس میں طرح طرح کی رنگینیاں اور گونا گوں قسمیں پیدا ہوتی گئیں۔ ایک غلوی ایسا سے بہت کثیر غلوی جاندار حلقہ دار کیجئے اسلج، امونگے، اکیرے، کورے، ریڑھ کی ہڈی والے ادنیٰ اور اعلیٰ حیوانات پیدا ہو گئے اور اپنے اپنے مخصوص ماحول میں زندگی گزارنے لگے۔ ماہرین علم حیاتیات نے یہ متفقہ طور پر تسلیم کر لیا ہے کہ ایسا ہی مختلف مدارج ارتقاء طے کرتا ہوا انسان کی ساخت اختیار کر لیتا ہے۔ گو یا پچھلے ترین ساخت کا جاندار انسان سادہ ترین جاندار ایسا ہی ترقی یافتہ شکل ہے! غور کیا جائے تو سب جانور اپنی اندرونی ساخت کے اعتبار سے دو حصوں میں منقسم ہیں: (۱) جلی یا ریڑھ کی ہڈی والے جانور۔

(۲) غیر جلی یا ریڑھ کی ہڈی کے بغیر جانور۔

”جلیے“ وہ جانور ہیں جن کے جسم میں ریڑھ کی ہڈی ہے، جو پسلیوں کے دھانچہ کا مرکزی مہار اور مجموعہ ہوتی ہے۔ غیر جلی“ وہ جانور ہیں جن کے جسم میں ریڑھ کی ہڈی اور پسلیوں کا دھانچہ نہ ہو۔ علم حیاتیات کے سرسری مطالعہ سے امر پایہ ثبوت کو پہنچ گیا ہے کہ وہ جاندار جن کے جسم ریڑھ کی ہڈی اور دھانچہ کے بغیر ہیں اور جنھوں نے ماضی میں ابتدائی ایام میں فروغ پایا، نہایت ہی حقیر اور بے وقعت تھے۔ ان میں سے اکثر لوٹ گئے کیوں کہ وہ نئے ماحول کے مطابق اپنی زندگی کو نہ کھال سکے، کچھ ایسے سخت جان اور ڈھیلے مزاج بھی ہیں جو اب تک اپنی ابتدائی صورت میں پائے جاتے ہیں بعض نے اپنی اشکال اور ساخت بدل لی تاکہ وہ نئے ماحول میں زندہ رہ سکیں۔ ان جانوروں سے تدریج ریڑھ کی ہڈی والے جانور پیدا ہوئے۔ یہ اپنی بناوٹ اور توانیے جسم کے کھانکے سے فیصلی جانوروں پر فوقیت رکھتے ہیں۔ ریڑھ ان کی ترقی کی ایک نمایاں اور مستقل نشانی ہے۔ پس اس اعتبار سے ترقی یافتہ حیوانات کو پانچ قسموں میں تقسیم کیا گیا ہے۔

- ۱۔ صرف پانی کے اندر رہنے والے جانور، مثلاً مچھلی۔
- ۲۔ خشکی پر اور پانی کے اندر رہنے والے جانور یا جمل، قحلیے، مثلاً مینڈک۔
- ۳۔ خشکی پر رہنے یا پیٹ کے بل چلنے والے جانور، مثلاً چھپکلیاں، سانپ۔
- ۴۔ ہوا میں اڑنے والے جانور یا پرندے، مثلاً گوا، کبوتر۔
- ۵۔ دودھ پلانے والے جانور، یا شیرخوار، مثلاً گائے، بندر، انسان۔

ریڑھ کی ہڈی والے یا صلی جانوروں میں سب سے پہلے جلی جہوریں آئی۔ یہ جانور صرف پانی کے اندر رہے اور یہاں ہی سے زندگی بسر کرے گا سامان پیدا کرتے رہے۔

دقت رفتہ ایک ایسا زمانہ آیا کہ خشکی (زمین) پر نباتات کی بہتات ہوئے لگی تو بعض مچھلیاں پانی سے نکل کر رہنے پر آئیں۔ جب زمین سے ان کا تعلق ہوا تو ان کے اعضا میں تغیر تبدیل ہوئے لگا، اور وہ جانور عالم ظہور میں آئے۔ خشکی اور پانی دونوں میں رہتے ہیں اور جن کو پہلے جلی کہتے ہیں۔ مینڈک ان کی ایک واضح مثال ہے۔ یہ جانور زندگی کے ابتدائی دور پانی میں بسر کرتے ہیں۔ مادہ مینڈک اگر گھوٹوں کے پانی میں اٹدے دیتی ہے، اٹدوں سے بچے پیدا ہوتے ہیں، شروع شروع میں

ان کا جسم بالکل پھیلی طرح ہوتا ہے۔ اس حالت میں اسے غول (Globe) کہتے ہیں۔ غول پھیلی کی مانند گلیمروں سے سانس لیتا ہے، کچھ عرصہ کے بعد غول کی جسمانی حالت میں حیرت انگیز تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں۔ پھیلنے لگتا ہے مگر غلاب ہونے لگتے ہیں، دم خوردک کے طور پر استعمال ہو جاتی ہے۔ اس مقام پر جہاں دم جسم سے جڑی ہوئی ہے، دو چھوٹے چھوٹے اعضا نمودار ہوتے ہیں، یہ پھیلی ٹانگوں کی ابتدا ہے۔ ایک ہفتہ کے اندر اندر یہ اعضا لمبے ہو کر جوڑا بن جاتے ہیں، پھر ان پر انگلیاں نمایاں ہوتی ہیں۔ اس دوران میں اگلے اعضا کی بالیدگی جلد کے نیچے شروع رہتی ہے اور آزادانہ زندگی بسر کرنے کے قابل ہو جاتا ہے، مگر اکثر اوقات خوردک کی تلاش میں یا دشمنوں سے بچاؤ کی خاطر گڑھوں کنسٹوں اور ٹالابوں کے اندر آتی ہوں میں چھپ رہتا ہے۔ یہ جانور اپنی زندگی پانی اور خشکی دونوں جگہوں پر گزار سکتے ہیں، اسی لئے ان کا نام جل پھیلے ہے۔

جل پھیلے جانوروں کے بعد ریٹکے والے جانوروں کا وجود ہوا۔ ان جانوروں کے ہاتھ اور پاؤں اس قدر کمزور اور مختصر ہوتے ہیں کہ ان کی رفتار سے یہ شبہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ پیٹ کے بل ریٹک رہے ہیں۔ ان میں بعض ایسے بھی ہیں جن کے ہاتھ پاؤں نہیں ہوتے، مثلاً سانپ، اور وہ حقیقتاً اپنے پیٹ پر ریٹک کر چلے پھرتے ہیں۔

اب عالم حیوانی کے ارتقائی دور میں ایک طویل مدت ایسی آتی ہے جبکہ ریٹکے والے یا پیٹ کے بل چلنے والے جانور بکثرت ظہور پذیر ہوئے۔ یہ حیوانات دیکھنے میں بے حد خوفناک جسمانی لحاظ سے کچھ دشمن اور عادات کے مطابق بڑے ہی خون خوار اور پتہ نشتے۔ اکثر دریاؤں کے قرب وجوار میں آگے ہوئی سبزی چٹ کر مائے یا سمندروں کے ساحلوں پر پتھرا کی گھاٹ میں پڑے لیٹے رہتے (Pseudoscorpion) یا (Pseudoscorpion) اس وقت کے ریٹکے والے حیوانات کا سردار تھا، اور اپنے جسم کی لمبائی کے لحاظ سے (جو ۷.۵ فٹ سے زیادہ بھی آج تک سب سے طویل قامت حیوان مانا گیا ہے۔ اس کے رکازی ڈھانچے دیکھ کر عقل حیران رہ جاتی ہے۔ یہ حیوان اور اس کے بھائی بند اس قدر عظیم الجثہ تھے کہ موجودہ زمانہ کا سب سے زیادہ جسم حیوان، ہاتھی بھی ان کے سامنے ایک چڑیا سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا۔ ظلم و استبداد کی بے پناہ قوت کے باعث انھوں نے زمین پر ایک قیامت برپا کر رکھی تھی۔ ادنیٰ چھوٹے اور عاجز جانور ہراساں اور پریشانی ہو کر رہ گئے۔ مگر قدرت کا قانون زور اور زبردستی پر مبنی نہیں۔ یہ عظیم الشان جانور اپنی ناقابلِ رشتہ جسامت کے باعث تنازعہ للحقا میں کامیاب نہ ہو سکے، اس لئے معدوم ہو گئے۔ ان کے مقابل میں وہی کمزور اور ناتوان ریٹکے والے جانور مثلاً چھوٹے، گرگٹ اور ننھی ننھی چھپکلیاں جنھوں نے زمانے کے ساتھ مطابقت کی آج بھی روئے زمین پر آرام و عیش کی زندگی بسر کر رہی ہیں۔

پھیلی، جل پھیلے اور ریٹکے والے جانور، سرخون والے جانور کہلاتے ہیں۔ سرخون رکھنے والے جانوروں کا کوئی طبعی یا باقاعدہ درجہ حرارت نہیں ہوتا، بلکہ ان کا درجہ حرارت ان کے گرد و فواح کی ہوا کے مطابق بدلتا رہتا ہے یہی سردیوں میں کم اور گرمیوں میں زیادہ۔ مذکورہ بالا ریشہ کی بدھی والے جانوروں کے بعد پرندوں اور دودھ پلانے والے جانوروں کا ظہور ہوا۔ ان جانوروں کے جسم کا درجہ حرارت سخت اور تند رستی کی حالت میں یکساں رہتا ہے یعنی اس میں کمی یا بیشی واقع نہیں ہوتی۔

زمین اپنے ارتقائی دور میں اس وقت گرم اور مرطوب تھی، ریٹکے والے جانوروں نے اپنے ماحول میں

نورات پائے، ان میں بھی تبدیلیاں ہونے لگیں۔ وہ عظیم اجڑے چھپکلیاں، یعنی *Ursus arctos* جو اب تک زمین پر اپنی کارائی کا سکہ ڈالنے میں جی نہیں آہستہ آہستہ مفقود ہونے لگیں۔ گر چھپکلیوں کی وہ اقسام جن کی جسامت موزوں اور متناسب تھی زندہ بچ رہیں۔ انھوں نے گڑھوں اور بلوں میں چھپ کر یا سوا کر گزارے کا طریق اختیار کیا۔ ان میں سے بعضوں کے پر پھٹنے لگے، چونکہ ان کے جسم ہلکے پھلکے اور کم وزن واقع ہوئے تھے اس لئے ان میں طاقت پر واز جلد آنے لگی۔ ابتدائی پرندوں کی جسمانی ساخت میں، جکینے والے جانوروں کی بہت سی خصوصیتیں موجود تھیں جو بچ نڈاؤ و مگر گت کی طرح، انھیں ناخن دار، پھنکا ڈر کی طرح کا جعلی دار آلہ پرواز اور جبروں میں بڑے بڑے پھٹے دانت تھے۔ اس قسم کے جانوروں نے ترقی کی اور وہ پائندے کہلائے۔

ریگنے والے جانور محض کچھوں پرانے دیتے، مگر بعد ازاں ان سے بے پرواہ ہو جاتے، پرندے اپنے انڈوں کی جید نگہ بھال اور نگرانی کرتے، مادہ اور نر باری باری ان کو سمجھتے ہیں۔ انڈا مہنا بچوں کو دانہ بھرا، پھر ان کو اڑنے کے پتیل سے آگاہ کرنا، وہ بہت ہی جانفشانیاں کا کام ہے۔ انڈوں کی حفاظت، بچوں کی دیکھ بھال اور ان کی تربیت عقل حیوانی کی وہ نشانیاں ہیں جو ابھی تک پختہ نہ ہوئی تھیں۔

زمین پر کش مکش حیات، پوری سرگرمی سے کار فرما تھی۔ اس عہد میں نباتات کی نوعیت عہد حاضر کی نباتات سے بہت قریب ہو گئی۔ پانی کم ہو گیا، خشکی کا رعبہ بڑھ گیا۔ رطوبت پسند نباتات *(Hydrophytes)* اور *(Mosses)* کا ناپید ہونے لگے۔ اس کی جگہ سیلو، *(Silica)* کی پھیل جاتی رہی، بحری چراگاہ میں منظر عام پر آگئیں۔ ان ہی سرسبز میدانوں اور وادیوں میں چھپکلیوں، اگے کوڑوں اور پرندوں کی بستیاں آباد ہو گئیں۔ ماحول کی تبدیلیوں نے بعض ریگنے والے جانوروں میں حیرت انگیز تغیرات پیدا کر دیے۔ اب ان کی ساخت ایسے حیوانات میں منتقل ہونے لگی جو انڈوں کی بجائے بچے جنمے تھے اور انھیں اپنی جھلیوں سے دودھ پلائے تھے۔ یہ حیوانات دودھ پلانے والے یا شیر خوار جانور کہلائے۔ دودھ پلانے والے جانور عالم حیوانی کے سر تاج ہیں۔ یہ حیوانات اپنی جسمانی، دماغی اور قوی کی خوبیوں میں سب سے اعلیٰ ہیں۔ وہ ہلکی، کھنکھرو، دریا کی گھوڑا، سم و ارموشی، کرتے والے چوہے، گوشت خور و درندے، کریم خور، خا پشست، پھنکا ڈر، گت، سہ اور بندر، ناجروانات، مثلاً لنگور، گن، اور رنگ اور چپا نری، ان ترقی یافتہ حیوانات میں شامل ہیں۔

دودھ پلانے والے جانوروں کی خاص شناخت، جوان کو دوسرے جانوروں سے ممتاز رکھتی ہے، ان کے بچے بہا جن کے ذریعہ مادہ اپنے بچوں کو دودھ پر پرورش کرتی ہے اور بچپن میں ان کو ہر قسم کے خطروں سے محفوظ رکھتی ہے۔ دودھ پلانے والے جانوروں کے خون میں حرارت ہوتی ہے۔ ان کے جسم پر بال یا اون کثرت سے موجود ہوتی ہے۔ بالوں کی جگہ بعض جانوروں کے جسم پر سخت اور مضبوط چھلکوں کی ڈھالیں پڑھی ہوئی ہیں۔ امریکی علم حیوانات دانوں کو، ہم کا ایک اہم حصہ مانتے ہیں، کیونکہ دانتوں کی شکل اور ساخت سے ان جانوروں کی خوراک کی نوعیت کا پتہ ڈسائی لگ جاتا ہے۔ شیر خوار جانوروں کے ہاتھ یا پاؤں ان کی ضروریات کے مطابق مختلف شکلوں کے بن گئے ہیں۔ دودھ پلانے والے جانوروں میں اکثر فراور، ادھ کی صورت اور وقع میں بہت کم فرق ہوتا ہے۔ ترکی قدر قدر اور جسامت میں بڑا ہوتا ہے، بعض اوقات نر اور مادہ کے رنگ ایک دوسرے سے ذرا مختلف بھی ہوتے ہیں۔

ان ہی دودھ پلانے والے جانوروں سے ذلت و ذمہ ترقی کے انسانی شکل اختیار کر لی۔ عرصہ دراز تک انسان

غیر متدن رہا۔ اس کی زندگی ان جیسی جانوروں سے کچھ بہتر نہ تھی جیسا کہ یہ شکار کیا کرتا۔ لاکھوں سال تک انسان وحشی جانوروں کی طرح غاروں میں زندگی بسر کرتا رہا۔ ان ہی کی طرح لڑنا، جھگڑنا اور چیتا چلاتا پھرتا رہا۔ غالباً آج سے ایک لاکھ سال قبل انسان میں گفتگو کی قوت پیدا ہوئی۔ اس پر، نہ صرف منصوبے بنائے، اور تدبیریں سوچنے کی صلاحیت پیدا ہوئی بلکہ یہ بھی کدوہ اپنے ساتھیوں سے تباہ و زنیلات کر لے اور اپنا مافی الضمیر ان کو بتا سکے، ان مجموعہ حیات کی بدولت اس کو دنیا کے سب جانوروں پر غیر معمولی نوعیت اور سرفرازی حاصل ہوئی۔ اس کی فطرت نے اب اسے مجبور کر دیا کہ وہ صحیح معاشرتی زندگی اختیار کرے جس سے کہ اس کے ذہنی اور دماغی قوی میں جبرت انگیز ترقی ہوئی اور بالآخر موجودہ دور کے مہذب اور ترقی یافتہ انسان کی عظمت کی تکمیل عمل میں آئی۔

عبدالمجید

اُردو نامہ اس میں اُردو ادب سے متعلق ہندوستان کے بہترین انشائیہ و ازلوں اور تنقید نگاروں کے معلومات آفریں مضامین اور مقالے درج ہیں جو خاص طور پر لکھوائے گئے۔ اکثر و بیشتر مشہور شاعروں کی فیہ مطبوعہ غزلیں اور نظمیں بطور خاص حاصل کر کے شائع کیں ان میں قدیم اور جدید شاعری کے جو نمونے ہیں ان سے اُردو شاعری کے مختلف رجحانات کا پتہ لگایا جاسکتا ہے۔ ہندوستان کی مختلف جامعات کے اُردو کے پروفیسروں کے حالات زندگی اور علمی خدمات سے اہل زبان کو روشناس کرایا گیا ہے جن کی دماغی محنت اور ایشار سے نوخیز ادیبوں انشائیہ و ازلوں اور شاعروں کی صحت بخش تربیت ہوتی ہے۔ مشاہیر اُردو کے فیہ مطبوعہ خطوط کو پہلی دفعہ منظر عام پر لایا گیا ہے۔ یہ خطوط اُردو ادب میں قابلِ تدار اضافہ ہیں۔ اس میں نئی تصویریں بھی ہیں جو یا تو اُردو ادب کے شاعروں، ادیبوں اور محسنوں کی ہیں یا اُردو سے تعلق رکھتی ہیں۔ اُردو ادب کی تاریخ اور ارتقا پر ایک جامع اور مفید کتاب ہے صفحات (۲۰۰) قیام علی بلاغت یہ کتاب ان شعراء انشائے محسن سے متعلق ضروری معلومات پیش کرتی ہے جس کا ہر اہل حصہ خانی و دوسرا بیان اور تفسیر علمِ بدیع سے بحث کرتا ہے۔ یہ کتاب اُردو ادب سے پیش پی رکھنے والوں اور خاص کر اُردو کے طلبہ کے افادے کے لئے مولوی سید کلیم اللہ حسینی صاحب، انشی فاضل، مولوی فیاض، اُردو فیاض سے مرتب کرائی گئی ہے صفحات (۵۶) قیمت صرف (۱۰) روپے

بہمنیہ دور میں زراعت و تجارت کی ترقی

ہندوستان زراعت کے اعتبار سے خاص خوبی اپنے میں رکھتا تھا، اور اس لئے ہر اسلامی فاتح کو ہندوستان سے جو محبت ہوتی تھی وہ محض اس کی زرخیزی کی وجہ سے تھی۔ بہمنیہ سلطنت میں مسلمانوں کی جاگیریں، انعام علی الوقت، انعام التمتع وغیرہ سب اس کی زرخیزی کی شہادتیں ہیں کہ وہ یہاں دل کھول کر زراعت کریں بہمنیہ زمانے کے آثار اور بہمنی دور کی ہر وہ چیز اور زراعت کا مختصر حال یہاں لکھا جاتا ہے تاکہ اس دور میں دکن کی زراعت اور مسلمانوں کی اس سے کچھ سی کا اندازہ ہو سکے۔

حال کے انکشافات سے عربوں کی بیہوشیوں تصانیف کا علم تاریخی دنیا کو ہر بارے کے عربوں نے زراعت پر خوب دل کھول کر محنت کی ہے۔ چنانچہ کتب عامۃ مسلمان فی تاریخ دارالاسلام و قسطنطنیہ سے ایک قیمتی نسخہ کتاب الفلاحت کا عربی اور چھپا جس کا مصنف علامہ ابی ذکریا یحییٰ بن محمد بن احمد اشبیلہ ہے۔ اس کتاب کا ایک ہی ایڈیشن مصر سے نکلا ہی تھا کہ اس کا ترجمہ آپسینی، اطالوی، فرانسیسی زبانوں میں ہو گیا۔ فرانسیسی ترجمہ تو اصل عربی نسخہ ایک کالم میں اور ترجمہ دوسرے کالم میں ہے۔ اس نسخہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اول تو یورپ کے جدید علم زراعت کی دنیا و اسی کتاب پر ہے۔ دوسرے یہ کہ جب ابی ذکریا نے عربی میں یہ نسخہ لکھا تھا تو اس کی نقلیں یا اس کے جیسے اور علمائے زراعت نے ایسی اور کتابیں لکھی ہیں اور جبکہ سلطنت بہمنیہ میں عام زبان عربی ہی تھی اس قسم کی تصنیفات کا شاہی یادوں ہونا خود اس بات کی دلیل ہے کہ مذاق عام اور اشتیاق زمانہ نے یہ سامان یہاں بھی مہیا کر دئے تھے۔ اگرچہ ایک کوئی خاص تصنیف علم فلاحت عہد بہمنیہ کی اس وقت تک شاہی نہیں ہوئی مگر ان عربی رسائل کی موجودگی سے ان علمائے اسلام کا شغف معلوم ہوتا ہے جنہوں نے بہمنیہ سلطنت میں زراعت و فلاحت پر جان سوزی سے کام کیا ہے جس کی کچھ جھلک فرشتہ کے اوراق سے ظاہر ہوتی ہے۔ فرشتہ سلطنت بہمنیہ کی زراعت کی ترقی کے بارے میں بیدر کی سرزمین کی قوت فلاحت بیان کرتا ہے کہ:-

”آب و ہوا میں زمین یہاں کی بہتر ماکن ہندوستان سے ہے۔ میں بلاد معظم ہندوستان کو دیکھا، لطافت و خوبی میں مانند اس مملکت کے نظر نہ آیا۔ زمین اس کی شجر و سودہ کی طرح سرخ ہے اور اکثر میوہ خراسان اور عراق کا یہاں پیدا ہوتا ہے۔“ اور خواجہ محمود گادان خواجہ جہان زعفران اور امروہ و قسم قسم کے انگور اس زمین سے حاصل کئے ہیں۔ ص ۴۱۶

یہ اس امر کا ثبوت ہے کہ علمائے اسلام عہد بہمنیہ میں طریق زراعت و آبپاشی سے واقف تھے اور ان کو اسی قسم کی کتابوں سے مواد ملا تھا جو عربی زبان میں عربوں کے عین زمانہ عروج کی تصنیفات و تحقیقات تھیں۔ اس لئے اس میں شک نہیں ہو سکتا کہ ابی ذکریا کی کتاب جیسی دارالخلافت قسطنطنیہ سے آج پانچ سو برس کے بعد دنیا میں آئی ہے، اس طرح پانچ سو برس پہلے دارالخلافت بیدر کے مسلمانین کے کتب خانہ میں ہو گئی جس کو ضرور محمود گادان خواجہ جہان یا کسی عالم نے دیکھا اور اس پر عمل کیا ہو گا۔ کیونکہ یوسف عادل خان ترکی (شاہزادہ عثمانیہ) خواجہ محمود گادان کا معتمد علمیہ و مشیر عمل و فرزند لطیف تھا جس کے کتب خانہ میں نایاب کتابیں تھیں۔

عراق و خراسان کے میوے بادام، انگور، سیب، ناشپاتی، امروہ، شہتوت، جلیوزہ، لیسے، اخروٹ وغیرہ مشہور ہیں۔ اگرچہ سب سلطنت بہمنیہ میں بولے جاتے تھے تو زراعت کی ترقی کا اس بات سے بہتر کیا ثبوت مل سکتا ہے؟ زعفران کی کاشت سرزمین بیدر کے لئے محض خواجہ جہان کی زراعت سے کچھ سی اور رشتہ کا ثبوت ہے اور

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان حکام اور وزرائے کاشت کاری اور باغبانی کے فن میں کتنی یکجہی لیتے تھے اور اس کو کہاں تک ترقی ہو چکی تھی۔ ان کو اقسامِ فلہ اور سیوہ کی کاشت سے بھی واقفیت تھی اور اس میں کمال رکھتے تھے۔ وہ جانوروں کی پرورش میں بھی ماہر تھے کھیتی کے تجربات کے لئے ہذا گناہ کھیتوں یا فارم کی تیاری سے بھی یہ پورے ماہر معلوم ہوتے ہیں۔

فنِ زراعت سے متعلق کیمیائی ترکیبیں، زمین سے کام لینے کے طریقوں، پرندوں اور چوپایوں کی پرورش اور ان کی بیماریوں کے علاج سے پوری طرح واقف تھے۔

سلطان علاء الدین ثانی بہمنی کا باغ "علائی" جس کی تعریف میں حکیم آرزقی جیسا مشہور شاعر کہتا ہے

گوئی کہ ماہ و مشتری از برج آسمان
تجیل کردہ اند بہ باغ خدا نیکیاں

سلطان فیروز شاہ کا فیروز آباد سنانا اور قلعہ میں دریائے جہلم سے نہریں کاٹ کر لانا اور فیروز آباد میں طرح طرح کے کوٹنگ اور باغات بنوانا، اس کے شوقی فلاحت کا ثبوت ہے جو ہندوستان کے بہت کم بادشاہوں میں بھی پایا ہے۔ درختوں اور ترکاریوں کی کاشت اور ان میں پیوند وغیرہ لگانے کے بھی عجیب عجیب طریقے رائج تھے جن کے

ذریعہ سے شہر میں میوے کو اور زیادہ میٹھا، خوشبودار اور مفید بنایا جاتا تھا، یا ان سے پہلے کی دوائ بنائی جاتی تھی۔

کتاب کے پھول کا رنگ حسب مرضی تبدیل کیا جاتا تھا یعنی زرد، لاجوردی اور سفید رنگ کا پھول بن سکے۔ بے موسم

مسیب کے درخت میں ایسی ترکیب استعمال کی جاتی تھی کہ پھل پیدا ہوں تو ان پر کوئی مہارت یا تصویر برتی ہو۔ ناشپاتی

اور امرود اور سیب کے پھلوں کو اپنی پسند کے مطابق جس شکل کا چاہیں بنا سکتے تھے، انھیں دانے اور بے دانہ کرنا،

ایک خوش میں مختلف رنگ کے دانے پیدا کرنا اور انھیر کی ایک شاخ میں جدا جدا رنگ کے انھیر پیدا کرنا، بلکہ ایک ہی

دانہ انگوٹھ میں مختلف رنگوں کا ہونا، درخت خیری میں کئی رنگ کے پھول لانا وغیرہ مختلف اقسام کی ترکاریوں کا ہونا،

مثلاً مولیٰ، گاجرا، شلج کو بڑے بنائے کئی ترکیب۔ غرض ایسی ہی بہت سی ہیں جن کو پڑھ کر عقل حیران رہ جاتی ہے۔

امد شاہ دلی بہمنی کے خوش محل میں پانچ پانچ ہاتھ کے کھجور کے درخت تھے جو ہر موسم میں رسیدہ ہوتے تھے، اور

حکیم آرزقی نے سلطان کے خوش محل کے لئے چند منٹوں میں ایسے انگور لائے کہ جیسے انگور کھائے اسی قدر دست آئے۔

(ملاحظہ ہو سوانح عمری حکیم آرزقی، مطبوعہ رسالہ حکمت)۔

اب رہ رہ کے یہ خیال ہوتا ہے کہ کیا یہ وہی سرزمین تھی جہاں سلطان احمد شاہ دلی بہمنی کا "خوش محل"

تھا، اور علاء الدین ثانی بہمنی کا باغ "علائی" تھا، اور محمود گکاواں خواجہ جہاں کے وہ زراعتی قطعات اور سیوہ دار

درختوں کا جھنڈ جہاں عراق کے میوے اور زعفران و انگوٹھ پیدا ہوتے تھے۔

(۳)

ہندوستان قدیم کے تجارتی تعلقات اہل فارس سے تھے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایران کی تہذیب و تمدن کا

اثر ہندوستان پر بہت کچھ تھا۔ جب ایران پر عربوں کا قبضہ ہوا تو عربوں اور ایرانیوں نے مل کر اسلامی تہذیب و

تمدن کو آگے بڑھایا۔ اگرچہ ابتداً سندھ، مکران، مکرمان پر قبضہ ہوا، مگر بعد میں زیادہ تر ایرانیوں ہی کا تسلط رہا۔

ہندوستان پر برہمن والدہ سلطان محمود غزنوی کا قبضہ ہوا، اور اس کے بعد جو فاتح ہند، ستان آئے وہ ایران کی

خاک پاک سے حلقی رکھتے تھے، چنانچہ سلاطین بہمنی ایرانی نژاد تھے، اور ایک عرصہ کے رسم و رواج اور تجارتی

تعلقات سے ان کا ملک متاثر ہو گیا تھا، اس لئے ان کے حدود و مملکت میں بھی ایرانی تجارت کا اثر غالب تھا۔ ایران کی بندرگاہوں میں خرمز، بصرہ اور مملکت دکن کی بندرگاہوں میں مصلیٰ آباد، درہل، بلگام، تہامیر، گواشتہ پور تھا جہاں تجارتی جہاز آ یا کرتے۔

اہل فارس ہوامیہ کے ابتدائی زمانے سے تجارت میں بڑے مشتاق ہو گئے تھے اور پانچویں برس کی تجرہ کاری نے جہانیاں جہاں گرد بنا دیا تھا کبھی عماد الدین محمود گرجستانی بیدریں ذاتی جہازوں کا بیڑا اقسام اقسام کے مال سے لدا ہوا لاتے ہیں کبھی عماد الدین محمود گرجستانی کے تجارتی جہازوں کا بیڑا بیدریں بندرگاہوں پر نظر آتے ہیں اور کبھی خود سلاطین ہمنہ کے جہازوں سے درآمد و برآمد شدہ مال اٹنا ہوتا تھا کہ اس کا اندازہ کرنا مشکل ہے۔

ملک البتار خلف حسن بھری کی تجارت کا وہ حال تھا کہ قسطنطنیہ سے لے کر چین تک ان کے جہازوں کا تانتا بندھا رہتا۔

بعض مشہور یورپین اور چینی سیاح نے ہندوستان کی قدیم تجارت پر فوج خوانی کرتے ہوئے اندرون ملک اور ساحل کار و منڈل کی تجارت پر بھی دو آنسو بہائے ہیں جن کا اقتباس اس موقع پر کچھ بیجا نہ ہوگا۔

جب ہندوستان کی تجارت بھی مسلمانوں کے ہاتھ آگئی تو ایران اور ممالک عراق و عرب اس سے بے انتہا فائدہ اٹھانے لگے جس کو دیکھ کر اہل شام و عرب نے اسے اپنے ممالک میں فروغ دینے کی کوشش کی جب مہر و شام غلیفہ کے ہاتھ آگئے تو اسکندریہ کے تاجروں کو روم اور یونان کے ساتھ تجارت کرنے کی ممانعت ہو گئی اور چونکہ مسلمانوں اور یونانیوں کے مابین ہمیشہ جنگ رہا کرتی تھی اس لئے اہل یونان بلکہ ان کے ساتھ اہل اطالیہ بھی ہندوستانی مال سے محروم ہو گئے۔ اس سے کچھ پہلے وہ چین سے تیشی کٹر چرا کر لائے اور ریشم کی تیار کیا کا مال چاشم خود دیکھا تو اپنے بادشاہ کے حکم سے چند سال چین میں رہ کر یہ کام سیکھا اور واپسی کے وقت ایک لکڑی کے اندر چند کیڑے رکھ کر قسطنطنیہ بھیجا۔ یہ وہ زمانہ ہے کہ ابھی آل عثمان کا قبضہ قسطنطنیہ پر نہ ہوا تھا۔ اس وقت شاہ قسطنطنیہ ان پادریوں کی مدد کر کے ریشم کا کارخانہ قائم کر دیا اور وہ مشرقی ریشم کی تجارت سے مستغنی ہو گئے۔ مگر ان پادریوں کو یہ معلوم تھا کہ دریائے چن پر دو شہر ایسے آباد ہیں جو ہندوستان اور چین کے مال کی منڈیاں ہیں چنانچہ بعض الوالہ عزم تاجروں نے ان مقامات میں اپنے آدمی بھیجے اور وہاں کا مال بغیر ٹیکس و دہانہ کے اپنے لیے سرس کے راستے آنے لگا، اور دریائے سرس سے یہ مال جو وسط ایشیاء کے مال سے تبادلہ میں بیکرہ اسوکو کجا تھا اور وہاں کا مال پھر ہندوستان آتا تھا جو اندرون ملک تک پہنچ جاتا تھا اس وقت مسلمانوں کی طاقت بہت بڑھ گئی تھی انھوں نے مالابار میں ایک سیٹی قائم کی اور بنگال، سیام اور چین کے ساتھ بھی تجارتی تعلقات قائم ہو گئے۔ اسلامی طاقت کے اس عروج کو یورپ کے صنایع نہایت حسد کی نگاہ سے دیکھنے لگے۔ دینس قسطنطنیہ اور اسکندریہ کے مابین ابتدائے اسلام سے ہی تجارتی تعلقات قائم ہو گئے تھے چنانچہ دوسری صدی ہجری میں ہندوستان اور چین کو اسلامی قافلہ روانہ ہونے لگے اور پانچویں صدی ہجری میں تو ادویہ، ریشمی مل اور مسالے دیش میں پہنچنے لگے اور رفتہ رفتہ یہ شہر تجارت کی وجہ دولت سے مالا مال ہو گیا۔

خلفائے عباسیہ مصر کے زمانے میں مصر کا راستہ عیسائی اور مسلمانوں کی لڑائیوں کے اختتام پر کھل گیا، اور سابق کی طرح پھر براعظم یورپ ہندوستانی تجارت سے مستفید ہونے لگا۔ دینس سے شہر چینو میں بھی ہندوستانی مال آتا تھا، اگرچہ اس کی مقدار کم ہوئی تھی۔ ان ہر دو مقامات کے باہمی مقابلہ کے زمانہ میں فلورنس ترقی ہوتا تھا اور اس کی تجارت مشرقی ممالک کے ساتھ

برہمچاری تھی۔ جب مصر اور شام سلطان سلیم خان (معاہد سلطان احمد شاہ ولی بہمنی) کے ہاتھ آئے تو وہیں اپنے ہمسایہ شہروں سے بڑھ گیا۔

مشہور جزیرہ نویس مولانا آذری لکھتے ہیں کہ سلطنت بہمنیہ سے جو مال برآمد ہوتا تھا اس میں زیادہ تر چمینٹ، لٹل، لٹبی دھاکے، نیل اور دیگر قسم کے رنگ، الائچی، سیاہ مرچ، ہیرے، موتی، فولاد، ہتھی دانت، ادویات، عطریات شامل تھے۔ بیدری ظروف بھی ایک حد تک ممالک غیر کو بھیجے جاتے تھے، جس کی بڑی قدر دانی ہوتی تھی کبھی کبھی غلاموں یا غلام لڑکیوں کی تجارت ہوتی تھی، جو اشیاء درآمد کی جاتی تھیں ان میں اونی، مٹھی زرین پٹری، قالین، بانات، پوستیں، ہتھیان ہتھیار، عربی گھوڑے، مغزیات، میوہ جات، سونا، چاندی، فیروزہ، عقیق، یشب، ترکی، رومی غلاموں کی تجارت ہوئے لگی۔ ایک اور مشہور سیاح کا بیان ہے کہ آرم، نادرنگیاں، کافور، صندل کی لکڑی بھی یہاں سے برآمد ہوتی تھی۔

دیں کا ایک گراں قدر امیر جو دھیریں صدی کے شروع یعنی سنہ ہجری کے کچھ قبل (عہد محمد شاہ بہمنی شہری) میں ممالک شرقی کی سیر کے لئے دھڑ آیا تو ہندوستان کے مختلف مسالوں کا ذکر کرتا ہے۔

جینو کا سیاح پرتو مہسان سیسٹہ خانو جو سنہ ہجری میں آیا تھا۔ ان قیمتی پتھروں اور مسالوں کا ذکر کرتا ہے جن کی تجارت ہوتی تھی۔ ان قیمتی پتھروں سے وہ ہیرے مراد ہیں جو مملکت بہمنیہ میں گو لکندہ کے ہیروں کے نام سے سارے یورپ میں مشہور تھے، اور بن کی نسبت مارکو پولو اور دیگر سیاحوں نے اپنے سفرا ناموں میں ذکر کیا ہے۔ ایک فرانسیسی مورخ لکھتا ہے کہ سنہ ہجری میں جبکہ بہمنی سلطنت کے تخت قلب شاہ کا پرچم تھکانا اور وسائل مالا باریں لہراتا تھا تو اس وقت غیر ملکیوں کے (۳۰۰) ہزار مسال مالا باریاں پر آتے تھے اس کے علاوہ فرمانروائے کالی کٹ راہہ سامری نے جو خط شاہ پرنگال کو لکھا اس میں یہاں کی اشیاء برآمد و درآمد کا ذکر پایا جاتا ہے۔ لکھا ہے کہ:-

”آپ کے خاندان کا ایک امیر واسکو ڈی گاما میری سلطنت میں آیا اور مجھے اس کی

ملاقات سے خوشی ہوئی۔ میری سلطنت میں الائچی، جانفل، ادراک، سیاہ مرچ اور

قیمتی پتھر کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ آپ کے ملک سے سونا، چاندی، مرجان اور

یاقوت درکار ہے۔“

یہ ظاہر ہے کہ علاقہ راہہ سامری اور ویسے کئی علاقے ڈیڑھ سو برس سے سلطنت بہمنیہ کے زیر نگین تھے اس لئے ان علاقوں کی تجارت دراصل مملکت بہمنیہ کی تجارت تھی۔

(۳)

سلاطین بہمنیہ نے گرائی کی روک تھام کے لئے چند اہم اعتبار کی تھیں ان میں سے ایک کا ذکر یہاں کیا جاتا ہے۔

جب سلطان علاء الدین بہمنی نے اشیاء خورد و نی کی گرائی اور رعایا کی شکایت محسوس کی تو نہ صرف اس مصیبت میں رعایا سے ہمدردی ظاہر کی بلکہ اپنی فیاضانہ طبیعت و رحم دلی سے وہ چند تاجروں کے خاندانے کے لئے کروڑوں انسانوں کو بھوکوں مچھسکا۔

فلمروئے بہمنیہ سے قحط و گرائی معدوم کرنے کی غرض سے سلطان نے اجناس خورد و نی کے نرخ مقرر کر دیئے تاکہ لوگوں کو خریدنے میں دشواری نہ ہو، اور اس بات کی خاص طور پر گرائی رکھی کہ احکام سلطانی سے کوئی شخص سرمو انحراف

ذکر کے جنگ سالی اور کثرت باران سے بعض مقامات کی فصلوں کو جو نقصان پہنچا تھا اس کا بھی عام نرخ پر مطلق اثر نہ پڑتا تھا۔ سلطان نے غلہ کے سرکاری ذخیرے اور گودام بھی خالی کر دیے۔ یہ ذخیرے سلطنت کے ہر حصے اور پرگنوں میں پھیلے ہوئے تھے۔ اس زمانے میں غلہ غیر مالک کو براہ میں کیا جاتا تھا، اس لئے سلطان کو گرانے کے انتظام میں چنداں وقت بھی نہ تھی۔ کاشت کی زمینوں کا مالیہ نقد رقم کی بجائے اجناس کی شکل میں لیا جاتا تھا جو غلہ کے زمانے میں سابق نرخوں پر فروخت کئے جاتے تھے تاکہ تاجروں کو نفع اندوزی کے مواقع حاصل نہ ہو سکیں۔

ایک دفعہ تاجروں نے سلطان فی نرخ پر غلہ فروخت کرنے سے انکار کیا تو سلطان نے حکم دیا کہ کوئی شخص سلطان کے ذخیرے سے سو کسی تاجر سے غلہ نہ خریدے۔ چنانچہ سلطان نے ذخیرے سے تمام رعایا کو ایک ماہ تک ارزاں غلہ خریدتی رہی۔ ادھر تاجروں نے یہ دیکھ کر اگر اور کچھ عرصہ تک یہی کیفیت رہی تو ہمارے غلہ کے ذخائر کو دیکھ چاہ جائے گی اور تجارت کو نقصان پہنچے گا۔ سلطان سے عفو قصوری و رجوعت کی جو اس شرط پر منظور ہوئی کہ پہلے جس نرخ پر فروخت کرنے سے انھوں نے انکار کر دیا تھا اس سے کئی ارزاں نرخوں پر فروخت کرنے کا رضی ہو جائیں۔

ملک نائب نے تمام تاجروں کو طلب کر کے تنبیہ کی کہ سرکاری نرخ سے انحراف کرنے کا نتیجہ اچھا نہ ہوگا۔ مگر فدا اور سرنگر اس حکم کی تعمیل کا ذمہ دار تھا جس کا فرض تھا کہ ان سلطان کے احکام کی پوری پوری تعمیل کرانے کے محتجب نہ بنیں۔ مہتمان بازار و شہداداد اور وفاقہ دار پر لازم تھا کہ روزانہ کے نرخوں سے سلطان کو مطلع کرتے رہیں۔ سلطان نے غلہ طور پر اپنے آدمی بھی بھیج کیفیت کے لئے نہ صرف دار الخلافہ میں بلکہ دور دراز صوبوں اور ملکوں میں متنبین کر رکھے تھے۔ بلکہ ان کا رپرہ داروں پر بھی لگان اور حاسوس مقرر تھے۔

اگر کبھی کوئی بات غلط ٹھہرتی یا کسی فرد بشر کو نرخ معینہ کے مطابق کوئی چیز نہ ملتی تو محتجب و نرنی دونوں قتل کر دیے جاتے تھے یا باقی کے پیر سے بندھو کر شہر میں ان کو گشت کرایا جاتا تھا۔ یہ عبرتناک سزائیں تھیں جو بہت کم دی جاتی تھیں۔ مگر ہمیت و عصب کا وہ سنگ بیٹھا ہوا تھا کہ کوئی شخص کسی طرح کی کوئی سزا یا نہ کرتا خرید بیل تاجروں کو زیادہ قیمت کی توقع سے غلہ ذخیرہ کرنے کی (جس کو احتکار کہتے ہیں جو شرعاً حرام ہے) اجازت نہ تھی اور نہ کوئی شخص سستے داموں خرید کر ہنگاموں بیچنے کا مجاز تھا۔ ایسے شخص کو بھی وہی سزا تھی جو نرنی و محتجب کے لئے مقرر تھی، بلکہ طرفدار اور سرفروخت بھی اس سزا سے نہیں بچ سکتے تھے۔

یہی حکم تھا کہ کوئی تاجر یا جو پارسی فعل کاٹے جانے سے پہلے غلہ نہ خریدے۔ کاشت کاروں پر واجب تھا کہ غلہ کاٹنے کے بعد سب سے پہلے سرکاری محفل کا غلہ ادا کریں اور اپنی ضرورت کا غلہ رکھ کر بقیہ کو قریب ترین بازار میں فروخت کریں۔ غلہ کا ذخیرہ کرنے کی اجازت نہیں تھی۔

سلطان علاء الدین بہمنی نے نہ صرف اسناد و گرانے کا انتظام کیا بلکہ اس بات کا بھی بندوبست کیا کہ تاجر غلہ کے اوزان اور پیمانوں میں کمی نہ پاتی نہ کریں۔ چنانچہ وہ خفیہ طور پر بازار سے اجناس قیماً منگو کر اپنے سامنے ٹکراتا تھا۔ وزن میں جس جتنے چھٹانک کم جوتی تھی اسی قدر گوشت فروشنده کے جسم سے کاٹ لیا جاتا تھا۔

عربی ادب عربی امیہ میں

(سلسلہ گزشتہ)

سے سوا او باطل کیا جا سکتا ہے۔

تاریخ کی تحقیقی ابتدا خلفاء عربی امیہ کے عہد میں ہوئی ہے۔ اس عہد کی تاریخی کتابیں دو نوع کی ہیں۔ پہلی قسم میں مسلمانوں کی فتوحات، غزوات اور بہاؤان اسلام کے سوانح صحابہ کے تذکرے جو اکرتے اور دوسری قسم میں دیگر اقوام کی تاریخ شامل تھیں جو مکہ خلفاء عربی امیہ کو دوسری قوموں کے طرز حکومت سیاست اور حالات جانتے کا یہ شوق تھا اسی لئے وہ انھیں جمع کرتے اور دوسری زبانوں سے ترجمہ بھی کراتے تھے۔

حضرت معاویہ بن سفیان کو تاریخ سے اپنی دلچسپی تھی کہ رات کا بارہ حصہ وہ مورخین کی صحبت میں گزارا کرتے تھے جو انھیں ایام عرب کے علاوہ مشہور ماہان ارباب و یونان و روم کی حد دل گسری اور تذکرہ لکھنے سے مانگتے جنگوں کے واقعات اور فن حرب کی عیادیں کی داستانیں سننے کا بھی انھیں بے حد شوق تھا۔ مشہور سلاطین کی سوانح عمال اور ان کی زندگیوں کے عبرت خیز اخلاقی سنائے کے لئے ان کے پاس متعدد عقلام مقرر تھے جو ان واقعات کو دوسری زبانوں سے مثلاً لاطینی، یونانی اور پہلوی زبانوں سے ترجمہ کر کے انھیں سنایا کرتے تھے۔

دوسری اقوام کی تاریخ سب سے پہلے معاویہ کے اہلکار پر عبید بن شریع نے لکھی جس کا ذکر صاحب الفہرست نے بھی کیا ہے۔ اس کے علاوہ ابن ندیم نے اس قسم کی ایک کتاب کا ذکر کیا ہے جسے ابو محنف الازدی نے لکھا تھا اور عمو معاویہ اور بنی امیہ کے دوسرے خلفاء کی سیرت کو عوامتہ بن الحکم نے جمع کیا تھا لیکن ان میں سے اب کوئی کتاب دستیاب نہیں ہوئی۔

تاریخی علم میں طرک انساب کی ابتدا اس زمانے کے نہایت اہم کارناموں سے ہے۔ مختلف قبائل کے نسب ناموں

قرامہ کی ترتیب کے ساتھ ہی اس نے علامات، حکایت اور اشارات کی طرف بھی توجہ کی لیکن اعراب ابھی ابتدائی حالت ہی میں تھے۔ یعنی اگر کسی لفظ کے حروف پر فتح وغیرہ کسرو ظاہر کرنا ہوتا تو اسے نقاط سے ظاہر کیا جاتا مثلاً فتح ظاہر کرنا ہوتا تو حرف کے سامنے نقطہ لگایا جاتا ضمیر کے اظہار کے لئے نقطہ حرف کے اور نقطہ لگایا جاتا۔ اور اسی طرح کسرو کے لئے نیچے ہوتا۔

ابو الاسود کی یہ ایجاد زیادہ عرصہ تک عالم ظنوت میں نہ رہی بلکہ وقتاً فوقتاً اس میں اضافے ہوا گئے۔ پھر بھی اس کی اصلی ترقی عہد عباسی ہی میں ہوئی۔

عربی حروف تہجی کی اشکال میں بھی اسی زمانے میں تبدیلی ہوئی۔ عربی خط چونکہ سریانی اور بنطی سے پیدا ہوا تھا اسی لئے اس میں حروف تہجی اپنی زبانوں سے لئے گئے تھے۔ اسلامی عہد میں دوسری قوموں کو عربوں کے ان حروف کی تیز کرنے میں وقت چھوٹ گئی۔ اسی لئے عجاج بن یوسف دلی عراقی نے عبد الملک بن مروان کے عہد میں عجمی حروف ابجد سے نقاط وغیرہ مستعار کر کے عربی میں جاری کئے۔ اس سے عربی خط کے سمجھنے میں بڑی آسانی پیدا ہو گئی۔ اور پہلی مرتبہ عربی حروف کی سوچوہ شکل وجود میں آئی۔

تلیخ و جغرافیہ | جاہلیت میں تاریخ و جغرافیہ کا جو عرب کی رزسیہ داستان میں با بعض مقامات کی تفصیلات میں مل جاتی ہیں۔ قبائل کے تعلقات اور املا سلاطین کے گمانے اور ہری بھری چراگاہوں اور غلٹ لاش کی تلاش میں جن جن مقامات پر انھیں جھبہ زن ہونے کے سوانح ملتے تھے ان کی مناظر کشی بس اس حد تک قدیم عربی شاعری

کو جمع کرنے اور نسخوں کی تحقیق کرنے کا شوق اسی زمانے میں ہوا خصوصاً زیادہ ابن ابیہ نے اس کی طرف بہت توجہ کی۔ وہ خود ایک کتب خانہ کا مالک تھا جس کو معلوم ہے کہ اپنی اعانت اور دشمنوں کے مقابلہ کے لئے اپنا بھائی ہونا تسلیم کیا تھا۔

آج نیز فیہ کاظم اس عہد میں بہت سی ابتدائی حالت میں تھا۔ حضرت عمرؓ کو ہر مقام کی حالت آپؓ ہو اور ہاشمندیوں کی کیفیات جاننے کا اثر اس وقت تھا اور وہ خاص طور پر ان مقامات کے تفصیلی حالات منگوایا کرتے جہاں مسلمانوں کے قہم جم چکے تھے۔ مسعودی نے اپنی کتاب "مروج الذهب" میں اس پر کافی طور پر بحث کی ہے۔

علوم و تعلیم
مسلمانوں نے دوسری قوموں سے بڑھ کر عربی میں منتقل کئے بیسیہ یونان، روم، اور فارس و ہند کے متعدد علوم و فنون سے پہلی بار عربی کا نشانہ ہوئے ان میں زیادہ مشہور علم نجوم، فلکیات، علم کیمیا اور طب وغیرہ ہیں۔

غذائے نبی امتیاز ان علوم سے گہری دلچسپی رکھتے تھے اور ان کے حاملوں کی امداد بھی بے دریغ کیا کرتے تھے۔ اس خصوص میں خالد بن ولید کا نام بہت مشہور ہے۔ خالد بن ولید نے معاویہؓ کی وفات کے بعد خلافت حاصل کرنے کی بہت کوشش کی لیکن اس میں ناکام رہا۔

خلافت کے حصول میں ناکام ہونے کے بعد اس علم و فنون کے حامل کرنے کی بجائے خصوصاً اس زمانے میں علم کیمیا، کارگوں کو بڑا شوق تھا۔ اس کے پاس دوسری زبانوں کے علمی عالم موجود تھے جن میں بعض راہب بھی تھے۔ اسلئے اپنا ہر ہمت کی کتابیں یونانی ادب سے ادب مل رہی تھیں منتقل کی گئیں۔ علم نجوم کا بھی یہ براہ راست تھا چنانچہ اس نے نجوم کی

دریافت اور تحقیق کے لئے متعدد آلات تیار کئے تھے۔ طبری بہت سی کتابیں عربی میں ترجمہ کی گئیں جن میں اس فن کی ایک شہرہ کا کتاب کو جو اس زمانے میں مابرجیہ نے عربی میں شہرہ کیا تھا حکومت کے خزانے میں داخل کر دیا گیا جب حضرت عمر بن عبدالعزیز غلیظہ ہوئے تو مسلمانوں کے بعد اصرار پر انھوں نے چالیس دن تک استخارہ دیکھ کر اس کتاب کو عوام کے حوالے کیا کیونکہ اس کتاب کو انصاف کی کتب میں سے سمجھا جاتا تھا اور مسلمانوں کو بھی اتنا شوق تھا کہ اس کو حاصل کئے بغیر نہیں رہے۔

ابن ندیم نے لکھا ہے کہ ہشام بن عبدالملک کے کاتب (سکرٹری) سالہ نے اس سطر کے سال کا ترجمہ عربی میں کیا تھا لیکن اب یہ کتاب آسمان ادب سے پیدا ہو چکی ہے اس زمانہ کی ان مشہور کتابوں سے بہت کم ایسی ہیں جو آج کل دستیاب ہو سکتی ہیں۔

قدیم علوم کا احیاء
عصر اموی کے علوم کی تعلیم کے تحت جہاں ہم نے جدید ادب کے آغاز کا ذکر کیا وہاں ہمیں قدیم

علوم کے حالات بیان کر دینا بھی ضروری ہے۔ بلکہ یہی بہت اہم ہیں کیونکہ جدید ادب ابھی اس فنرل پر نہ پہنچا تھا اس کی تفصیلات کی ضرورت درکار ہوئی۔ یہی قدیم علوم تھے جو ابھی اپنی بہار دکھاتے آ رہے تھے۔ قدیم علوم سے مراد وہ علوم ہیں جو جہات سے مسلسل ملے آتے ہیں ان میں یہاں قابل ذکر لغت، شعر، خطابت اور کتابت ہیں۔

لغت میں اس عہد میں کوئی خاص تبدیلی نہیں ہوئی بلکہ وہی پاناؤ ذکر جاری رہا۔ اس کے علاوہ اس کی آمد سے بعض اصلاحات اہم حاصل ہوئی کا اضافہ ہوا جس کا ذکر غطفانی نے "راشدین کے عہد میں آچکا ہے۔ اب یہاں خطابت اور کتابت کی کچھ تفصیلات۔ بعض مشہور خطیبوں کے حالات اور کاتبین کے واقعات بیان

سبحان و ایل المتونی

قبلہ

دلیل سے سبحان کا تعلق تھا۔ ان کا نام سبحان بن زفر بن ایاد ہے۔ اور تھیلہ کی نسبت سے انھیں سبحان دالین کہا جاتا ہے۔ جاہلیت میں پیدا ہوئے لیکن ظہور اسلام کے ساتھ ہی ایمان لے آئے۔ معاویہ موثق شامی اور مردم شمشا کا میں مدنی رکھتے تھے سبحان کو کام کا آدمی دیکھ کر انھوں نے حبشہ کے لئے اپنے سے متصل کر لیا۔ معاویہ ہی کے عہد میں ۳۳ھ میں ان کا انتقال ہو گیا۔

سبحان نے اپنی لمبائی کی وجہ سے بہت جلد معاویہ پر اپنا اعتماد قائم کر لیا جس طرح شاعری ایک نداداد عطیہ ہے اسی طرح خطابت بھی عبادی کی دین ہے۔ جن اثر شاعر اپنے کلام کے ذریعہ حاضرین پر اپنا اثر کرتا ہے۔ اتنا ہی بلکہ اس نے اس پر مدد کر خلیفہ اپنی جاؤں سے سامعین کے دلوں پر کرتا ہے۔ سبحان خلیفہ کے اثر میں ڈوبے ہوئے الفاظ پھیلنے میں آگے سے زیادہ سریع تیروں سے زیادہ تیز، صبر کی تیز تندہوں کی طرح جیسا کہ ادھلوں کو موہ لینے میں طلب سے بڑھ کر تاخیر رکھتے ہیں۔ سبحان کی خطابت ان تمام خوبیوں سے ملتی تھی۔

سبحان بلا شکان کہنے والے شخص تھے۔ اور پھر عربی یہ کہ ان کی ساری تقریریں جڑ جڑ سے کام کی اور ہر لفظ فصیح و بلیغ ہوا کرتا۔ ان کی تقاریر کا کوئی حصہ مہمل اور بیوقوفانہ نہ تھا۔ اس زمانے کے اکثر موضوعیں اور محصور ادیبوں کی آراء کے بموجب اسی خطابت کسی افاق البشر ہستی کا کارنامہ بھی ہو جاتی تھی۔ ان کے خطابات کے دوران میں سامعین کی سائلوں کی آواز بھی سنائی جاسکتی تھی۔ اور اثر ظاہر خیر مسند کی

کر کے ہم اس عہد کی شاعری کی طرٹ توجہ دیتے ہیں جو نہایت اہم ہے اور جس پر اس باب کا خاتمہ کیا جائے گا۔

خطابت

جس کا اسلام کی آمد نے خطابت میں گویا ایک روح پھونک دی۔ مسلمانوں کے ہر طرٹ پھیل جانے سے دور واز کے مقامات میں اسلام کی دعوت دینے کے لئے پروگوا اور فصیح البیان خطیبوں کی سخت ضرورت تھی۔ دوسرے اس وجہ سے بھی خطیبوں کا دور واز بڑھا کہ وہ اجتماعی روح جو اب تک مسلمانوں میں چلی آ رہی تھی کہیں اس میں تفرقہ نہ پڑ جائے اور ان کا شہرہ اڑے اسی طرح مجتمع رہے۔ علوم کے عام ہو جانے اور ہر کس و نا کس کے علم کی طرٹ توجہ کرنے کی وجہ سے بھی خطیبوں کی تعداد اس عہد میں زیادہ نظر آتی ہے۔ ہر شخص سبحان مقرب بنا جاتا تھا۔ خصوصاً اموی دور میں بعد کی جماعت بندی کے تحت انھیں خطیبوں کی بروقت امداد کا محسوس ہونا پڑا۔ اسلامی تعلیمات اور قرآن و حدیث کے اثر سے اس میں تفرقہ و نبات کی خیر بینی اور جادو سے بچ کر اثر پیدا ہوتا تھا۔ اس عہد کے بعد میں مشہور خطیبوں کے حالات ہم دیکھ کر کہتے ہیں۔ خلفا راشدین کی خطیبانہ قابلیت کو کون نہیں جانتا۔ اسلامی دنیا کا بچہ بچہ آج ان کی سیر و نشین سے زیادہ اثر کرنے والی تقریروں کا ملال ہے۔ ان کے بعد حضرت معاویہؓ بھی کچھ معمولی درجہ کے معزز ہوتے تھے۔ کچھ دوسری سلطنت کے قیام میں جہاں ان کی دوراندیشی مسلم اور سیاست دانی کو دخل تھا، وہیں ہر خطرناک موقع پر حضرت معاویہؓ نے اپنی سحر بیانی سے مدد لینا بھی نہ چھوڑا۔

ان کے بعد سبحان دالین، زیاد ابن ابیہ، جلال ابن یوسف، اور قطری بن العلاء جید شہرہ ہیں۔

کے نزدیک ان کو سونے چاندی میں تلوانا کچھ بڑا کام تھا۔
نصاحت و بلاغت، لہجہ کی دلنشینی، شاعرانہ انداز، سلاست
ان کی خطابت کے ساتھ یوں وابستہ ہے جس طرح شاعری
تخیل کے ساتھ وابستہ ہے۔

زیادہ ابن ابیہ المتوفی ۵۳ھ

ایک نہایت بزرگ اور حسین کثیر مخفی حس کا نام سمیتہ تھا۔ اور
انھیں کے پاس ایک خوش رو و رومی غلام تھا۔ جسے عید کہتے
تھے۔ حادثہ نے ان وہ نون کی شادی کر دی تھی معلوم
ہوتا ہے کہ ابو سفیان اس کمزور و دلکش اداؤں پر
لٹو ہو گئے تھے۔ کثیر نے بھی ممکن ہے ان کا ساتھ
دیا ہو۔ — ہر حال اس شادی کے ایک سال بعد
ایک لڑکا پیدا ہوا جس کا نام زیاد رکھا گیا۔

شریف خون کی آمیزش، اندر عروق صالح کی
کوشش نے زیاد میں اعلیٰ قابلیتوں کے پورے جوہر
ہمایا کر دیئے تھے۔ دن گزرتے گئے اور زیاد سنہ
حسن ظاہری میں بلکہ دولت علیہ سے بھی مالا مال ہو گئے
کئے۔ حتیٰ کہ محصوروں میں اپنی ذاتی لیاقت کی بنا پر
انھوں نے بڑی عزت پیدا کر لی۔

سمیتہ سے ابو سفیان کے تعلقات اس وقت
تھے جب انھوں نے امی اسلام قبول نہیں کیا تھا۔ ہلام
قبول کر کے وہ ان سب چیزوں سے بری الذمہ ہو چکے
تھے۔ اس واقعہ کا اظہار انھوں نے حضرت عمرؓ
کے خوف سے ان کے ہڈ تک کسی سے نہ کیا تھا۔ مدینہ
حضرت عمرؓ ان واقعات پر شرعی سزائیں دینے میں
معلق تامل نہ کرتے گو وہ عمل کفر کے زمانے ہی میں
کیوں نہ کیا گیا۔ ایک مرتبہ ہاجرین اور انصار کے ایک بڑے
مجمع کے آگے زیاد نے ایک نہایت فصیح و بلیغ خطبہ دیا۔
حضرت علیؓ اور حاضرین میں توفیق کے بہت سے
سربراہ اور وہ صحابی بھی موجود تھے۔ عمر بن انعام سے

صلح کی طرح لوگوں کے چہروں سے ظاہر ہوتا۔
ان کی تقاریر کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ سنہ
سے کہتے تھے بلکہ ان کے دل کے گوشوں سے آواز
نکلتی تھی۔ خطابت کی دنیا میں ان کا نام آج بھی ضرب الشیخ
ہے۔ ایک مرتبہ خراسان سے ایک وفد حضرت معاویہؓ
کی خدمت میں حاضر ہوا۔ وفد کی گفتگو کا جواب
دینے کے لئے معاویہؓ نے سبحان کو طلب کیا۔ اتفاقاً
یہ کہیں گئے ہوئے تھے۔ ہر حال کچھ ور بعد جس محل
میں تھے اسی محل میں معاویہؓ کے سامنے پیش ہوئے
معاویہؓ نے حکم دیا کہ وفد کے سامنے اپنے خیالات کا
اظہار کریں۔ انھوں نے ایک عرصہ اٹکا۔ لوگوں نے کہا کہ
عصا لیکر گیا کر گئے جبکہ فرامیر المومنین کے سامنے ہو
انھوں نے فوراً کہا دی کروں گا جو عصا لیکر موسیٰ
نے اپنے خدا کے ساتھ کیا تھا۔ معاویہؓ نے ہنس کر
انھیں عصا دینے کو کہا۔ عصا کے سہارے کھڑے ہو کر
انھوں نے کہنا شروع کیا۔ ظہر کے قبل سے لیکر عصر کی
نماز کے وقت ہوئے تک یہ مکمل کہتے رہے نہ انھوں
نے اس اشار میں کھانا نہ جانی لی اور نہ ذرا بھی وقفہ
لیا۔ — بلا توقف کہتے ہی چلے گئے۔ وفد کے لوگ
اور دیگر حاضرین مبہوت بنے ہوئے تھے۔ بس ان کے
ہونٹوں کی طرف دیکھ رہے تھے جہاں سے ہر وقت
تحد و نہات سے زیادہ خبر گیری لئے ہوئے بے درپے
نکلتا تھا۔

اس شعبہ کو سن کر معاویہؓ نے کہا: پہلے تو
نماز پڑھ کر نماز کا وقت ختم ہو رہا ہے، لیکن سبحان
نے انھیں روکنے سے منع کیا۔ معاویہؓ نے ان کی یہ
حالت دیکھ کر جوش نہ کیا۔ مجمع میں سب سے بڑے
خطیب ہو، اس سبحان نے کہا: نہ صرف عرب بلکہ
عجم اور جن انس سب سے بڑھ کر
سبحان الی و دولت کے شائق نہ تھے۔ وہ نہ معلوم

مثالوں سے لیکھا ہے۔ تاریخ میں یہ مشہور ہے کہ زیادہ حضرت عمر کی تقلید کی اور سختی دکھائی اور حجاج نے زیادہ کی تقلید میں سخت ہزاروں کا خون بہایا۔ یہ یمن اور حبشہ پر سزائیں دیتے تھے۔ علانیہ جرم پر قتل اور عقوبت طعہ پر کرنے والوں کو سزا ملتی۔

ان کے زمانے میں مجرموں کی تعداد بالکل ہی ختم ہو گئی تھی۔ ہر شخص ان کے نام سے سزا تھا۔ اپنی آخر تک انھوں نے یونہی بسر کی۔ چھ مہینے نو فیس رہتے اور چھ مہینے بصرہ میں گزارتے بالآخر سزا میں طاعون سے ان کا انتقال ہوا۔

خطابت میں سبحان و ایل کی طرح ان کا نام بھی ہمیشہ سنانِ شہرت پر ہمدردی کی طرح جلوہ گر رہے گا۔ حکومت کے اثرات لوگوں پر ڈالنے، بغاوتوں کو فرو کرنے اور ارکانِ حکومت کی تالیفِ قلوب کے لئے جتنا انھوں نے اپنی خطابت سے کام لیا ہے اتنا شائد ہی کسی اور نے لیا ہو۔ حجاج بھی اس میں شک نہیں اس معاملہ میں اپنی آتش بیانی سے سبھی باز رہتا۔ لیکن واقعات کے مطالعہ سے ہمیں کہنا پڑے گا کہ حجاج نے زیادہ ہی کی پیروی کی اور ان کے نقش قدم کو اپنا رہنما بنایا۔

خطبہ بقرہ کے نام سے ایک خطبہ تاریخ خطابت

میں حبشہ کے لئے زیادہ کام کے ساتھ وابستہ رہے گا۔ کہتے ہیں کہ اس خطبہ میں انھوں نے نہ خدا کی تعظیم کی تھی اور نہ رسول اکرم کی شہادت۔ ان امور کا اس زمانہ میں اتنا خیال کیا جاتا تھا کہ ان کے اس مشہور خطبہ کو خطبہ بقرہ کہا جاتا ہے جس کے معنی میں باجِ تقریر۔

اس کے زمانے کا ایک مشہور شخص شعی کہتا ہے۔ "نہر پر جب کسی بہترین تقریر کرنے والے کو میں نے کوئی دشمن بات کہتے سنا تو دل ہی چاہتا کہ وہ اس کو بھجے

ان کی پر مغز اور دلکش تقریریں کر کہا کہ۔ کاش یہ نوجوان قرین سے ہو تاکہ عرب اس کے عصا کو چومتے اس پر ابوسفیان سے نہ رہا گیا اور انھوں نے اتنا واقعہ سیکے سامنے بیان کر دیا اور کہا کہ۔ حضرت عمر کے عروج میں نے اب تک اس کا اظہار کسی سے نہ کیا تھا۔

حضرت علی کے زمانہ خلافت میں زیادہ نے انجی غیر معمولی ذہانت اور لیاقت کی بدولت خزانہ کی نگرانی کا عہدہ حاصل کیا۔ یہیں سے ان کی ترقی کا نانا شروع ہوتا ہے۔ حضرت علی بن ابی بکرؓ شہادت اور معاویہ کے سر پر آئے خلافت ہونے کے بعد یہ کہیں سے کہیں پہنچ گئے۔ استاد معاویہ نے انھیں اپنا بھائی کہتے ہوئے پس و پیش کیا۔ بلکہ وہ چاہتے ہی نہ تھے کہ انھیں اپنی نسب میں شریک کر لیں۔ اگر

زیادہ معمولی قابلیت کے انسان ہوتے اور گناہی میں رہتے تو معاویہ سے مجید تھا کہ انھیں بالکل فراموش ہی کر دیں۔ جب معاویہ نے اپنی سلطنت سے استحکام دولت اموی کے قیام کے لئے زیادہ مہینے محنتوں کی امداد کو ناگزیر سمجھا تو اس وقت کہیں وہ انھیں بھائی کہنے اور زیادہ بنانی سفیان کہہ کر خطوط لکھنے سے بھی باز نہیں آئے۔ یہ معاویہ کی مردم شناسی اور سیاست دانی کا نتیجہ تھا۔

معاویہ کے زمانے میں یہ بصرہ اور کوفہ کے گورنر بنائے گئے۔ اس خدمت کو جس عمل کی اور عملی انھوں نے نبھایا ہے اس کی مثال تاریخ میں نہیں ملتی۔ صرف یہ شکرت کی جاتی ہے کہ یہ ذرا سخت گیر تھے۔ لیکن اس زمانے کی حکومت عملی کے لحاظ سے ان کی سخت گیری بالکل بجا تھی۔ یہ کہنا بالکل بجا ہے کہ زیادہ وہ مضبوط ستون اور سنگم بنائے جس پر بنی امیہ کی حکومت کھڑی کی گئی۔

زیادہ نے حکومت کے طریقوں کو حضرت عمرؓ کی

اپنی لشکر کو تنہا کر دے کیونکہ یہ خوف ہونا کہ اس کے بعد وہ انجی عہدہ ہاتھ دے گا۔ لیکن جب زیادہ خطبہ کے لئے کھڑے ہوئے تو دلی ہی چاہتا کہ یہ چوتھے کے ہوتے رہیں۔ کیونکہ انہی کی ہزیمات بھی بابت سے زیادہ شائد از زیادہ نصیح، زیادہ انشیں اور بہت ہی پراثر ہوا کرتی تھی۔ اس سے ان کی خطابت کے خدا داد ملکہ کی غیر معمولی طاقت کا اظہار ہوتا ہے۔

حجاج بن یوسف المتوفی

عمر ۹۵
عمرت میں پیدا ہوا۔ باپ کی سرپرستی میں اس نے ابتدائی تعلیم کا کچھ حصہ طائف میں حاصل کیا لیکن زمانے کی گردش اور غور اس کی فطری تجسس و اضطراب کی وجہ سے بہت جلد دوس گاہ سے ٹھکر کر گئی دنیا میں قدم رکھنا پڑا۔ اس کی ذکاوت اور غور و فکر کو دیکھ کر عرب میں زینباغ جذامی نے جو عبد الملک بن مروان کے محکمہ پولیس کا افسر تھا اسے اپنے محکمہ کے دائرہ ملازمت میں داخل کر لیا۔ موقع شناسی اور دور اندیشی کی وجہ سے حجاج نے بہت جلد اپنا سو رخ پیدا کر لیا۔ ایک مرتبہ فوج کے ایک دستہ نے اطلاع سے انحراف کیا جس سے امام انظام میں بے چینی پھیلنے کا اندیشہ تھا۔ عبد الملک نے اس کی شکایت روح بن زینباغ سے کی اس نے اس کو واقعہ کے رقعہ وضع کرنے کا انظام حجاج کے سپرد کیا اس نے بے غش محکمہ اور حکمت عملی سے نہ صرف محو شدہ فوجوں کو راہ پر لایا بلکہ عسکری نظام میں وہ تجویزی پیدا کی کہ بھی شکایت کا موقع نہ ملتا اس سے اس کی شہرت بہت بڑھ گئی۔ اس کی زندگی کا دور مرا کا زمانہ حضرت عبداللہ بن زبیر کے خلاف کی پرتوجہ کشی کا ہے۔ عبد الملک اپنے تمام مخالفین پر غلبہ پانے کے خیال

حجاج کو حکم دیا کہ حضرت عبداللہ کے ہاتھوں سے چھین لے۔ حجاج کی فطرت اور فنی الطبعی کی شہادت تاریخ سے ملتی ہے۔ وہ بغیر کسی کی پروا کے شہابی کو تار کیا۔ اور قدر کا کل فتح حاصل کر لی۔ اور حضرت عبداللہ کے خون سے اپنے ہاتھ رنگے مگر عبداللہ کے دل میں اس کا رتبہ و جہت بڑھ گیا جو ان میں جھگڑوں کی فتنہ آفرینی اور عارضہ جہل کی تشویش کا حامل سن اور عبد الملک نے وہاں کی گورنری کے لئے حجاج سے زیادہ مناسب آدمی کسی کو نہ پایا لہذا وہاں کا گورنر بن کر حجاج کی تاریخ شام ہے کہ غلطی سختی اور جس قدر ظلم حجاج نے مال عراق پر کیا اس کی مثال تاریخ عالم میں شاید ملے کہ اور پیٹیز نے سوانہ میں لے سکے۔

حجاج نے دست سلطنت میں جی بھری اور چھین نکال اپنی لوگوں کی دھاک دھکیلی بے رحمی فسادوں کی اس نے جگہ کے لئے نوح لئی اور یں بقیہ ساری عمر اس نے عراق ہی میں گزار دی اور سیاسی اغراض کے تحت اس نے جو شہر واسطہ کے نام سے اپنا تختیگا گھر مسقطہ میں مرکوز کیا وہیں دفن ہوا۔

بلحاظ خطرات حجاج کتنا ہی شقی عقیدہ اور سچ ولی تھا۔ کیوں نہ ہو لیکن حکمتی باجوسی کے لئے اس کا کوئی تلافی و تدارک سخت گیری میں اس نے زیادہ کو بھی بچا دیا تھا تاریخ میں حجاج کی شخصیت کے متعلق پوری بھی کہا جائے یہاں بلحاظ ادب۔۔۔۔۔ اور وہ بھی بلحاظ خطابت اس کی ہستی کو محسوس رکھنا ناقص و سہ ہے۔ حجاج کے ابتدائی کارناموں میں سے ایک آخری عمر تک کے امور پر نظر ڈالئے تو اس میں اس کی ذکاوت اور میدان مغربی کے ساتھ ساتھ جاوید بانی اور آتش فشنی کا بھی بڑا حصہ ہے۔ لوگوں کو اپنا بنانے میں وہ ملکہ اسے حاصل تھا اور اپنی تہذیب و نظریہ مخالفین کے گرد و میں کھڑے ہو کر اپنے ولی نہیں تھے۔ ان کی دشمنی کو تبدیل یہ وہ بھی

کلی من یتبع البقیۃ پر چڑھنا۔
مندرجہ بالا ابتدائی اصولوں پر عربوں کے ایک
خیال وحدت پسند و خاموشی نے زیادہ عرصہ ٹیکا لینا
مناسب نہ سمجھا اسی لئے کچھ عرصہ بعد ابتدائے
رسالہ میں حدود شمار کے طبعی الفاظ کا استعمال کیا جاتا
رہا۔ مخاطبات کے طریق بھی بہت بدل گئے۔

سیح اور یسعی یسوی یسوی کی نسبت کی تاریخ میں
اب زمانہ بھی آیا کہ شرا کا اثر نظم سے بڑھ گیا۔ اس
دور کے کاتبین میں سے ہم صرف عبد الحمید بن یحییٰ
کا اجمالی حال بیان کر کے اس کو ختم کرتے ہیں۔

عبد الحمید بن یحییٰ المتوفی ۳۳۵ھ

یہی شام میں پیدا ہوا۔ باعتبار اس نام عرب ہوئے کا
اسے فخر حاصل تھا کہ قبیلہ یحییٰ عامر سے اس کا تعلق فخر
تھا خود اعتمادی اور ذاتی تقدیرت کی وجہ سے اس نے
بڑی ترقی کی اور بشام بن عبد الملک کے پیچھے بھاگی سلام
کا کاتب اور پھر ایٹھ سالہ سلطنت میں گیا۔

ایک زمانے تک اس نے خطاب مملوک کی رہبری
اور ان کے دوس و دھرم کے لئے شہر شہر اور دوس دوس
گھومنا اس کی شخصیت کا علم مردان یمن کو بھی ہو چکا
تھا۔ مردان نے اسے اپنے ہی پاس رکھا۔ اور ان میں
بڑی دوستی ہو گئی جب مردان علیہ ہو تو اس کے
نفسیب بھی جاگ اٹھے اور یہ سلطنت کا سکرٹری
بن گیا۔

سیاحی پرچم گول کی بنا پر رب مردان کے
مستغلاقت پر پہنچی تو نئے نہری تب بھی اس نے
اس کا ساتھ نہ چھوڑا۔ آج جس بات کا خوف تھا
پورا پورا ہوا۔ مردان قتل ہو گیا۔ عبد الحمید نے
اس جملہ کے دوسرے بہترین اشراف و اہل مقتضی
کے پاس بھرتی میں نام لکھی اس کا دلی دوست تھا۔

کرنا یہ معمولی کا زمانہ نہیں عراق میں جہاں اس نے
ہر قسم کے ظلم و ستم کوڑ سے تھکا۔ اس پر تادیبی سے مخالفت
مردان کی تھی۔ وہاں بھی اس کی رائے نفعگو اور
خلفہ کی تعادیر کے آنگے عوام کو گول کی طرح اس کو
تھا کرتے۔ بحث مباحثہ میں اٹھ اڑ ہی کوئی اس سے
بازی لیجاتا ہوگا۔

الکین و نیار کہتا ہے منبر پر جہاں سے زیادہ
مطالب کو واضح کرنا اولیٰ اس نے کسی کو نہ پایا جب
خطبہ میں اہل عراق پر اپنے اسانات اور عیبوں کو
جھانے لگتا اور ان کی طرز و روش کی مذمت میں کرتا
تو ہر ایک یہ سمجھنے پر مجبور ہو جاتا کہ وہ بالکل سچ کہتا
ہے اور اس لئے سامعین سارے دروغ گو ہیں۔

کتابت صدر اسام میں پہلی مرتبہ کتابت اور
ان کی طرف تامل تو جہاں سے

گئی۔ بلکہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ وجود عربی شرا اور اس
خاص مملوک کا آغاز یہیں سے ہوا ہے۔ یہ نظم کے ساتھ
ساتھ اس کی اہمیت کو بھی تسلیم کر لیا۔ تو زمانہ حکومت
اصول و فرائض حضرت کے امور خاص اہل طرز کا ش
کے نہ بھجی تھیں اس دور کی کتابت میں سنے میں واقعہ

کی اس نو ساخت صورت میں اربعوں نے روح بھونکی
تو یہ ایوں اور عجیبوں نے اس کی تراستی اور
پیرائے میں حصہ لیا۔ چونکہ اس کا آغاز یہیں سے
ہوتا ہے اسی لئے اس کا اسلوب بھی آج تک کی عربی
سہ نسبت کچھ مختلف ہے۔ شاید ان الفاظ و دوسری چیزیں
اختصار اور سادگی کا فقدان۔ اس زمانے کی عربی

خاص خصوصیات میں غماز کے استعمال میں ایسی کوئی فرق
نہ تھا۔ جیسے کہ بعد میں متذکر کے لئے نسخ کے سبب متبادل
کئے گئے تھے۔ عوام پر تو یہ کی ابتدا سب سے پہلے
سے کوئی نہ کہ بعد خدا کی حمد ہوئی۔ اٹھارہ
کا اختتام بھی عام طور پر۔ بالسلام یا۔ والسلام

کی داغ بیل ڈالی۔

تنوع مضامین اور جدت تنقید سے اسے مال مال کیا۔ تنقیدات اور خطاطی کی تبدیلیاں بھی اسی کی داغی پیداوار تھیں۔ ابتدائے رسالہ میں خاص طرز کی حواہی تحریر کرنا اور اختتام بھی ایک مخصوص انداز میں کرنا یہ اسی کی جدت تھی۔

عبدالحمید کا انداز بیان نہایت شیریں سلیس ہوا کرتا۔ اس کے الفاظ میں ایک نوع اور دلکشی ہوتی۔ حکیمانہ خیالات اور فلسفیانہ مضامین کی بھی اس کے پاس کمی نہیں۔ اس کی قدرت تحریر کا اندازہ اس واقعے سے بخوبی ہو سکتا ہے کہ ابومسلم خراسانی نے عبدالحمید کی تحریر کو جو مروان کی طرف سے اس کی ہدایت کے لئے بھیجی تھی تبیل جا میں اور اسی خوف سے انھیں آگ کی نذر کر دیا۔ عربی نثر کے آغاز میں عبدالحمید کی شخصیت اتنی گرا نا یہ تھی کہ اسے بعد میں "عربی نثر کا داد آدم" کہنے لگے۔

ابوالفضل

خالفین کی ایک جماعت اس کی تلاش میں یہاں بھی پہنچی جس میں سے بعض لوگ ابن المقفع کے گھر میں ٹھہر گئے۔ عبدالحمید اور ابن المقفع کی انتہائی دوستی کا ثبوت اس واقعہ سے ملتا ہے کہ جب خالفین نے گھر میں داخل ہو کر عبدالحمید کو طلب کیا تو یہ دونوں سامنے ہی موجود تھے ان کی وضع قطع صورت شکل اور چال و چال میں اتنی مشابہت تھی کہ تو اب صحابی معلوم ہوتے تھے۔ اب ان لوگوں کو یہ حیرانی پیش تھی کہ کہیں عبدالحمید کی بجائے دوسرا قتل نہ ہو جائے جب انھوں نے دریافت کیا کہ عبدالحمید کون ہے؟ تو ابن المقفع نے اپنے کو پیش کیا جس پر فوراً عبدالحمید نے آگے بڑھ کر دلی ہی سے ان علامات کو بیان کیا جس کا اس عبدالحمید ہونا ثابت تھا۔ خالفین نے فوراً اسے گرفتار کر کے قتل کر دیا۔

عبدالحمید سے پہلے کتابت بالکل ابتدائی حالت میں تھی اور عوام کے خیال کے بموجب کتابت کوئی شریف اور قابل احترام فن سمجھا نہیں جاتا تھا۔ اس نے از سر نو فن

آریائی زبانیں

یہ کتاب اردو کی ابتدائی تاریخ

اور اس کے ماخذوں کا مستند تذکرہ ہے جس کو ادارہ کے لئے ڈاکٹر سدیشور داس صاحب ایم اے ڈی لٹریچر وغیرہ مسکرت ولسانیات و معد کل ہند انجمن سانیات نے خاص طور پر مرتب کیا۔

صفحات ۱۰۴ قیمت ۷۵

ملنے کا پتہ: سبکدس کتاب گھر غیرت آباد

حیدر آباد دکن

تاریخ ادب اردو اور زبان اردو ادب کی

کئی اچھی تاریخ اب تک نہیں لکھی گئی۔ اگرچہ اس موضوع پر دو چار کتابیں لکھی چکی ہیں لیکن ان سے نہ عالموں کی ضرورتیں پوری ہوتی ہیں اور نہ عوام اور طلبہ کی۔

اس سہولت کے پیش نظر ادارہ نے یہ تاریخ مرتب کرائی ہے۔ یہ تاریخ صرف طلبہ اور عوام کے لئے لکھی گئی ہے۔ اردو صحافت اور ادب سے دلچسپی رکھنے والے علماء و اصحاب کے لئے تاریخی معلومات کا بہترین ذریعہ نہایت ہوگی۔

چھوٹی طبع ۹۷ صفحات قیمت ۷۵

غزل

دیر و حرم کی بنیادوں پر آؤ نئے مینار اجاہیں

صدیوں سے چھپنے والے کو ایک نئی منزل سے پہنچاں

جیری کو بھی پوشیدہ ہے اپنا حرم بھی خوابیدہ ہے

وصواں و صواں ہستی و بلند کی گیتی تین کیسی ہیں

بندوں کو دھمکانے والے کاش کہیں یہ سوچا ہوتا

سانوں کی خیرات کے بدلے ہم دو جگہ بوجہ بہار

پلو جگہ کے بھوکے دیوتاؤں تم ہی کوئی دھنگ بھاؤ

رنگ اجاڑے، روپ بگاڑے، سب کچھ وار، اچھے وار

تند ہواؤں کی شدت کو پل پل بعد بڑھاتے کیوں؟

کب تک کامل گیتی کو ہم بچا کر انسان سوادیں!

وقت ہے اک چکر میں خراماں گھوم گھوم کر لوٹ آئے گا

اڈیں گی گھنگھور گھٹائیں، ہکیں گی بحرِ پربہاریں

کہتے ہیں یہ بے نام اجاڑے، اچھا گیس کے قافلے والے

قلبِ افق میں کوند بن کر ٹوبے پہاڑوں کا بگڑاں

فرشِ ہلدا، فرشِ ہمارا، آؤ خبر آؤ و خیا لو

احمدیم قناری

تو مادل کی رکشن آفتان کو و صرقتی کے ماننے پاتیں

مہر و مہ واجم

بکھڑوں پریش میں عابد روڈ کی ایک دوکان پر قطار میں کھڑا ہوا تھا۔ ابھی میری باری آنے بھی نہ پائی تھی کہ بارش شروع ہو گئی اور قطار میں ٹھٹھکی مچ گئی چناہ کے لئے سب روکائوں کے سائبانوں میں ٹوٹ پڑے۔ میں بھی ایک کتبہ فروش کی دوکان کے برآمدے میں چناہ کے لئے دوڑا جب میں فطارسے ٹھٹھکی کر دوڑا ہاتھ دھو بیلی کے کعبے سے قریب ایک لفافہ پڑا ہوا ملا، جو معلوم ڈاک میں حوالے کئے جانے لگا۔ وہاں کیسے گر گیا تھا میں نے اسے اٹھا لیا تاکہ ڈاک خانہ میں ڈال سکوں۔ سائبان میں جب میں نے لفافے پر نظر ڈالی تو معلوم ہوا کہ سوائے لفافہ ہی کے باقی تمام چیزیں بارش سے دھل گئے ہیں، اور ڈاک میں داخلے سے پہلے صرف لاوارقی غلوہ کے دفتر میں پہنچ کر فٹان ہو جائے گا۔ جب تک بارش ہوتی رہی رہیں بھی چوتھا رہا کہ اس خط کو کیا جائے۔ سہا یہ خیال آبا کو خط کو کھول کر کاتب کے پتے پر واپس کر دیا جائے۔ گو اس خیال پر میرے ملاست بھی کی کہ اور دن کا راز کیوں جان رہے ہو؟ جائے کسی مجھ کو بکھڑا ہو کسی بیوی نے اپنے شوہر کو خط لکھا ہو، یا یہ ہو سکتا ہے کہ کسی صاحب نے اپنے قصدار کو نوٹس دیا ہو، ان لمحوں میں مجھے ان شاعروں کی یاد بہت متاثر ہوئی جو لفافہ دیکھ کر خط کا مضمون بھانپ لیتے تھے۔ جب میں گھڑوٹا نوٹ پہ خط پھر یاد آ گیا، اور مجھے سند باور چاہی والے پیرسم یا کی یاد آگئی۔ چونکہ یہ خط میرے خیالوں پر چھا ہوا تھا اس نے لفافہ جاک کیا۔ انداز تقریر سے صاف پتہ چل رہا تھا کہ کسی لڑکی نے لکھا ہے کسی لڑکے کا خط یا کہ میرے میں ہوا ہوں آج میں ہی ایک لڑکی کی دل کا ذکر کر رہا ہوں اس خط میں پیار کی باتیں ہیں لڑکی راز کی لافا توں کا ذکر کر دکھا، انہ میرے سے آجائے ہیں آئے کے احوال ہیں گئے میں نے جب القاب پڑھے میری یہ خیال آفرینیاں و فتنار فزیر ہو گئیں۔ ایک محبتی ہے چاکو یہ خط لکھا تھا اس خط میں مہر و مہ واجم ہی کا ذکر تھا۔ مہر نے یہ خط لکھا تھا۔

بیجا جان! قدم بوسی اور ہزار احترام!

بہت دنوں سے آپ نے میری خط نہیں لکھا، اور نہ ہماری غیریت معلوم کی۔ اماں کہتی ہیں کہ ہم تنہا بہتیم بہن کا آپ کے سوا اور کون سہارا ہے۔ وہ یہ فرماتی ہیں کہ اس پر وہ کے صرف آپ ہی پرسان حال ہیں۔ لیکن آپ نے بھنی جانے کے بعد سے کوئی خط نہیں لکھا، یہاں گھر والی آمنہ حال نے بتلایا کہ ان کے بھائی کے ہاں آپ کا خط آیا ہے کہ آپ کو بھی میں اچھی ملازمت مل گئی ہے۔ کیا اس غرض تیری کے لئے ہے کہ ہم حق دلا ہیں ہیں۔

مجھے بھی آپ کو یہ سن کر بوجھ ٹھٹھکی ہو گی کہ تہہ کا رسم ٹوٹ گیا۔ اماں اس واقعہ سے اتنی دل گیر ہو گئی ہیں کہ وہ روتا رہیں بیٹہ آجائے اور وہ گھر والی ہوئی و لوٹوں گی کہ باتیں کرتی ہیں۔ گھڑی میں روتی ہیں، گھڑی میں و لوٹوں گی، بیچ، نکلیں میں ٹوٹنا اور فٹان میں ٹھٹھکی بانگہر بھتی رہتی ہیں۔ بہت درد میرے لئے ہے کہ کبھی میں کہہ دیتا ہوں کہ یہ سن کر میرے سینے پر تین پہاڑ ہیں۔ ان تین پہاڑوں نے میرا دم ٹھٹھا جا رہا ہے تو انجم بران ٹھٹھی اور کہنے لگی کہ اماں

اگر آپ کو ہمارا وجود اس قدر معلوم ہوتا ہے تو ہمیں نہ ہر دے دو! انجمن عین ہی سے اٹھی باتیں کرنے کی عادی ہے۔ وہ اماں کی باتیں سمجھ نہ سکتی۔ اس کے اس جلد پر اماں زار زار روئے گئیں، اور انکو اپنے سینے سے لگا لیا۔ کہنے لگیں کہ ”میری کھنکھرتے کچھ کھانہ نہیں، میری بھولی بھی میری کھلی میسی نازک بھی تجھے کیا معلوم! پھر انجمن بھی روئے لگی پرچا جان! اماں کو اس قسم کے ٹوٹ جانے کا سخت ملال ہے۔ کہتی ہیں کہ اس انتظار اور اس بھری کھانہ میں روشنی کی ایک کرن اگر ہی تھی وہ بھی جاتی رہی۔ تھر آپا کے منگیتے پر ہسوں کھلا بھو یا کہ مہر آپا کی عمر بہت زیادہ ہے اس لئے وہ بیاہ نہیں کر سکتے، البتہ انجمن سے بیاہ کرنے تیار ہیں۔ اماں نے بہت دیر سوچنے کے بعد کھلا بیجا کہ یہ ممکن نہیں۔ پھر وہ سمجھ کر اپنے کچھے سے لگا لیں۔ ان کی آنکھوں سے آنسو ٹپک کر ہمارے رخسار اور پیشانی پر پڑے۔

اماں نے کہا کہ انجمن کو اگر بیاہ دوں تو پھر میری دونوں بیویاں تھر و تر کو کون بیاہے گا۔ تم دونوں کے متعلق یہ دنیا کہتے اعتراضات نہیں اٹھائے گی۔ میں تو سمجھتی ہوں کہ یہ جودیم ٹوٹ گیا اچھا ہی ہوتا ہے۔ منگیتے صاحب کو دیکھا ہے نا! سر پر ننگوں کی طرح سفید بال ہو گئے ہیں۔ بندہ سر سے اٹھانک کر سپیدی چھپانا چاہتے ہیں۔ جیانی رنگ کی کوچیں، خضاب مدد کا صاف پتہ دیتی ہیں، لیکن اس کے باوجود یہ چاہتے ہیں کہ انجمن سے بیاہ کر لی۔ تھر آپا کو بھی اس رسم کے ٹوٹنے کا افسوس سرا معلوم ہوتا ہے۔ وہ بھی کچھ بھیجی بھیجی سی اداس ادعا خواست معلوم ہوتی ہیں۔ جب سے شادی کی بات کہی ہوئی تھی ان کا رنگ جیسے فکھ رہا تھا اور وہ خوش خوش دکھائی دے رہی تھیں، لیکن دفعتاً جیسے انھیں بے چہ ہو گیا ہے۔ اماں ہر آپا کو کھلتے کھاتے تنگ آ چکی ہیں کہ اتنی دل گیر نہ ہو، لیکن لڑکی اور شادی کا تصور۔ اس افسوس کو اماں کی باتیں کیسے دیر کر سکتی ہیں، آپ ہی بتائیے نا!

انجمن اس سال بڑی کم کامیاب نہ ہو سکی، وہ دو پرچوں میں ناکام ہو گئی۔ اس سال وہ اسکول نہیں جانتی گئی۔ گھر ہی میں وہ امتحان کی تیاری کر کے خانگی امیدوار کی حیثیت سے شریک ہونا چاہتی ہے۔ بے چاری کا صیاب جو جانی، لیکن اس کے پاس پڑھنے کے لئے کیا رہی بھی نہ تھیں۔ اماں کہتی تھیں کہ امتحان کے قریب کتابیں دلوائیں گی، لیکن مشیت کو ہمارا امتحان لینا مقصود تھا۔ آپ تو جانتے ہی ہیں کہ ہماری گزربس صرف ایک مکان پر ہے، جیسے ہم نے گرا یہ پردے دکھا ہے، اور اس چھوٹے سے مکان میں بھولی کر لیا پر ہیں۔ ہمارے مکان کا چائیس روپے ہو کر آیا ہے اور یہی ہماری نصبت کا آسرا ہے۔ اس مکان میں جیسے کہتی کا جو میٹر تھا وہ ایک ہی رات میں مکان خالی کر کے لائسنسی علم و اطلاع کے معلوم نہیں کہاں چلا گیا۔ ایک ہیٹ کا راز یہ کیا ڈر بازم سب کی دنیا ڈوبی۔ اماں کے ہاتھ میں چاندی کا جواہر آخری کر، تھا روپیچ کر ہمارے ایک ہیٹ کا۔ اگر یہ عاودہ پیش نہ آتا تو کوئی کڑیا دلائی جاتی، اور شاید وہ رب العالمین کے صدقے کا صیاب بھی ہو جاتی، لیکن میں اسے

آپ سے ابھی جو کہا کہ مشیت ہمارا امتحان لینا چاہتی ہے۔ اماں انجمن سے کہہ رہی ہیں کہ ابھی امتحان کو ایک سال باقی ہے، جب تک کسی اسکول میں نوکری کر لے لیکن انجمن اماں کی بات نہیں مانتی۔ وہ کہتی ہے کہ بغیر سند والوں کو نوکری کے لئے سفارش کی ضرورت ہے، اور ہم غریب سفارش کہاں سے لائیں۔ پھر جب وہ ایک مرتبہ ملازم ہو جائے گی تو اس پر میں وہ بیڑک بھی کامیاب ذکر سکے گی۔

آپ کو آخر میں میں خوش خبری سنانا چاہتی ہوں کہ میں نے انٹر میڈیٹ کا امتحان کامیاب کر لیا ہے، اور اب بی۔ اے میں داخل بھی لے لیا ہے، لیکن مجھے کالج جانے سے ڈر سا لگتا ہے، مجھ سے کوئی لڑکی نہیں ملتی، مجھ سے کوئی دوستی نہیں کرتی، سب مجھ سے کٹر کر بھاگتی ہیں۔ آیا میں بھی مجھے نہیں چاہتی ہیں۔ چونکہ میں تیلیار و مال پہنے کالج جاتی ہوں، میرے پاس اچھے کپڑے کہاں؟

بیجا جان! میں نے سنا ہے کہ بمبئی میں جموں کے بازار میں سپید ساریاں وغیرہ سستی ملتی ہیں، اگر آپ سے ہو سکے تو میرے لئے مستقل سستی ساریاں اور ٹھیسوں کے لئے مستار میشی کپڑا بھجوائے، اور مجھے یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ وہاں پر آئے سینڈل اور انانی جو سے بھی فروخت ہوتے ہیں، اگر کوئی سستا جو شامل جائے تو میرے لئے ضرور خریدے۔ برسوں جب میں ننگے پیر کا کچ کچی تھی تو میری جماعت کی لڑکیوں نے بہت بری نظروں سے مجھے دیکھا۔ اگر وہ مجھے اسی طرح دیکھتی رہیں گی تو میں کالج جانا چھوڑ دوں گی۔ جب میں کالج جاتی ہوں تو بوں معلوم ہوتا ہے کہ احساس کتری میرا نکلا دبوچ رہا ہے۔ میری غربت میری مدد کو سلب کر رہی ہے۔ میری بیجا دگی میری شرافت کا خاتمہ کر رہی ہے۔ لیکن یہ غریبی بھی عجیب ہے کہ پھر بھی ہم بچے جاتے ہیں۔

میں نے اتنا طویل خط آپ کو لکھ دیا، لیکن اصل بات لکھنا ہی بھول گئی۔ اماں کہتی ہیں کہ آپ بھی جاتے وقت ان سے جو پاؤ تو لے لی ملانی انگریزی لیکر رہیں گے کہ ان سے تھیں۔ اب ان کو اس انگریزی کی سخت ضرورت ہے۔ چونکہ ہم سب کے کپڑے تازہ مار ہو چکے ہیں۔ آپ کے انتقال کے بعد سے کوئی کپڑے ہم نہ بوائے سکے، اور چار سال تک وہی پرانے کپڑے استعمال کرتے رہے۔ براہ کرم آپ تو مدد فرمائیے، ہم پر احسان ہو گا۔ مجھے امید ہے کہ میرے اچھے چچا کا جلد جواب دیں گے۔ تھرا یا اور انجمن آپ کو تدمبوسی کہتی ہیں۔ اماں آپ کو دعا فرماتی ہیں۔

آپ کی

یہ خط اس لئے میں نے چاک کیا تھا کہ کاتب کے پاس واپس کروں۔ لیکن واپس کرنے کی مجھ میں اب بہت نہیں کہتے۔ ارادے کتنی امیدیں کتنی آرزوئیں اس خط میں ہیں جو یہ خط واپس پہنچ جائے تو تین لڑکیوں اور ایک ضعیف ماں پر

ایک اور بجلی گرے گی۔ یہ خط مہر و مہ و انجم کے حجاب تک بھی پہنچ نہیں سکتا۔ چونکہ بارش کے قطروں سے پتہ وصل چمکا ہے، شاید قدرت کو ان لڑکیوں کا اور امتحان مقصود ہے۔ لیکن اس امتحان میں میں بھی شریک کر لیا گیا ہوں۔ پیاری ستم نصیب لڑکیوں نے نام بھی کتنے اُٹنے رکھ لئے ہیں، مہر و مہ و انجم تینوں کے پاس اندھیرا ہے، اندھیرے میں جا رہی ہیں۔ آئے بھی اندھیرا ہے۔ اس اندھیرے میں وہ اس خط سے نوری کرن کی کتنی امید باندھی ہوئی ہیں اور یہ خط میرے پاس ہے۔

گزشتہ چار روز سے یہ خط میرے پاس ہے اور میری عقل گم ہو گئی ہے کچھ سمجائی نہیں دیتا کہ اس خط کو کیا کروں۔

محبوب حسین جگر

غزل

ان کی الفت میں سب گوارا ہے وہ ہیں پیارے تو نعم بھی پیارا ہے
موت کی جستجو میں نکلا ہوں زیست بے کیوں مجھے پکارا ہے
دیدہ تر سے اشک یوں ٹپکا جیسے ٹوٹا ہوا ستارا ہے
زندگی جس کو لوگ کہتے ہیں نگہ دوست کا اشارا ہے
دل کی کشتی جہاں بھی رک جائے ہم سمجھتے ہیں وہ کتنا ہے
اشک آنکھوں میں ہے نہ خون باقی سسکیوں پر ہی اب گزارا ہے

دو ہی آنسو ظفر ہائے تھے

ایک جگنو ہے ایک تارا ہے

احمد ظفر (راولپنڈی)

محبت

اے وہ طغیانِ محبت! وہ جوشِ جنوں
موج و طوفاں میں بھی جو مرکز سے ہٹ سکتا ہے
عشق کی فطرت ہواؤں سے بدلتی ہے کہیں
صرصرِ ایاک سے افسردہ ہوں غموں کے پھول
عشق کی فطرت حریفِ گردشِ ایام ہے
گرم احساسِ شباب تیز نبضِ کائنات
ایک نشہ، اک تبسم، اک ترمِ صبح و شام
اک سرورِ سرمدی، اک عالمِ کیفِ تمام
وقت بدلے عشق کا عالم بدلتا ہی نہیں
صفحہ فردا کے افسانے پڑھے جاتے بھی ہیں
رُو مہر و ماوے پر ڈاٹھا سکتا ہے کون
آمرے نزدیک او فردوسِ فطرت کی بہا

وقت کے قدموں پہ ہوتا ہی نہیں چرنگِ لکھا
جس کا رخ دریا کا دھارا بھی لپٹ سکتا نہیں
قالبِ شبنم میں ایسی آگِ فصلنی ہے کہیں
تھپتھپے ہو جاؤں طوفانِ حوادثِ لول
عشق جس عالم میں ہے آزادِ صبح و شام ہے
از زمین تا سماں قہرِ آبِ جانِ حیات !!
گریہ فطرتِ دل کے قہقروں کا انتقام!
عشق کیا ہے روح کی مستی میں کھو جانا
وقت کے شعلے میں یہ سونا پگھلتا ہی نہیں
عشق کے پر کیف لٹے جا کے پھرتے بھی ہیں
قسمتِ آدم کی تحریریں مٹا سکتا ہے کون
عشرتِ کونین کر دوں تیرے قدموں کا شمار

لوٹ کر اے دوست پھر عہدِ شباب آنا نہیں

انقلاب آتے ہیں ایسا انقلاب آتا نہیں !!

شور

سوزدروں

و اس انسانے کی تخلیق اپنے وقت سے دو سال پہلے ہوئی ہے اس لئے دو سال بعد پڑھئے اس انسانے کو

وہ ایک اندھیری گلی تھی، جہاں سے کسبہ پر چند انسانی آوازیں آرہی تھیں۔ شام کے دھندلکے میں لائے رام ہی کی کوئی کاجامنی پر چند انسانیت سوز شخصیتیں براہِ رخسار تھیں جنہوں نے صرف سڑی ہوئی نعشوں کو جاشا سیکھا تھا، اور اکیلے دیکھنے کا اندھ بن چکی تھیں کہ کڑواہٹ پڑتی تھیں۔ یہ اس تنگ گلی کے شیر کھلائی تھیں۔ تاریخ گواہ ہے کہ یہی اُنٹ کر دیکھو تو یہ جیلے کہ انھوں نے کیسے کیسے سوزناؤں کو موت کے گھاٹ اتار دیا تھا، جہاں جھلسا پھرنے والا درد بھر تھا، اور ہمیشہ زندگی کو کو سا کر رہے تھے۔ صرف انھوں نے سوزناؤں کی برائیاں کیں بلکہ زمین پر بھونک رہے اس لئے سڑت سی بلندی سے اس پڑھیں ہینک کر پاش پاش کر دیا تھا، ان کی کامیابی کا زور اصل ان کی اپنی جماعت کا ناقابلِ شکست اتحاد تھا، یہ جماعت ہمیشہ لائے رام ہی کی کوئی پر مٹھا کرتی تھی یہیں ساری کامیابیوں کا پھول تھا، یہیں سوڈے کے شیشے کا کچ کے کڑے کے گولے اور پتھر کی گولیاں لے کر کسی ٹھوڑے بھالے، گم کردہ راہِ مسلمان کا انتظار کیا کرتے تھے وہ یہ وہ تنگ و تاریک گلی تھی جہاں سے ہر ایک کا گھر کبھی نہ ہوتا تھا، اور ان کے لیے یہاں سے یہاں کی ناقابلِ توجہ تھی۔۔۔۔۔ اور ناقابلِ توجہ ہوتی تھی، یہیں جبکہ سڑیوں پر جو تھکے تھے اور پھر باقی تھی، اور جو ہے اس کی آمد کا نام مٹنے، تو دم سا دھ کر خاموش ہو رہے۔ بہر حال چہ ہے اپنی جان و مال کو دھری نہ دے جائیں دینے تھے، اور بلی چڑھوں کو موٹا مڑا دیکھ کر باقی تھی۔

نساؤں کا شروع ہونے کو پہلے اندھ رہتے ہوئے تھے، مگر ابھی تک پولیس کیلے کھلے میدانوں میں فساد یوں پر آتش باری کر رہی تھی، مگر نساؤں ہی تھے، کہ اپنے حقوق کو دم کوڑنا دیکھ کر آگ کی چادر اور گولیوں کی دیوار میں ہتھیلیوں میں اپنی جانیں رکھ کر اٹھتے جا رہے تھے۔ ایسے میں ہیبت کا مارا ایک لڑکا جو ان گھبراہٹوں کی جانی پہچانی گلی میں گھس گیا، اور اڑھارے دیکھ کر لمبھان کی ایک سانس لی۔۔۔۔۔ وہ لڑکوں میں سے نہیں تھا۔ اس نے آج تک کبھی اسے انسانیت بخش مٹا ہرے نہیں دیکھے تھے، وہ اپنی زندگی کی ڈور میں ہاتھوں میں گرہ ڈال رہا تھا، مگر اس کو قسم کمانے جگہ تھی جو کہیں انسان کے حقوق سے اُٹھتا ہو، انھوں نے دیکھا جو میدان جنگ سے لے کر ہونے سپاہیوں کی زبانی اس نے صرف مرجِ مسالے کے ساتھ تیز زانو اتھبات سنے تھے، گونسی سناٹی باتیں، آج حقیقت کا روپ کاڑھے جلورے افراد تھیں۔ انسان جو کوئی اب دیکھا میں اُٹھتا بیٹھتا ہے، انسان جو کھاس پھوس کے نرم نرم رستہ پر لیٹا اُٹھتا ہے، مگر کوئی پر نگہ یوں نہ دیکھتا تھا، یہاں وہ انسان میں لٹ پٹ ہاتھ پاؤں مار رہا تھا، جاسے درج اس سے، اور جو رہی تھی، یا غنہ علیہ، ہو رہا تھا، یا ہندوستان غرقہ واریت اور باہمی نفاق پر یہ لاشۂ خدہ زن تھے۔ ہن وستان کو آزادی دلائے دلائے ہاؤر ایک ایک کر کے ختم ہو رہے تھے۔ اگر بھی مڑکوں پر جان دینے والے اور ہر سنگ و خشت سے ٹکر لینے والے نہ ہی فرہاد ہندو مانا کے نام قربان ہوتے تو کیا انھیں آزادی نہیں مل سکتی تھی؟ مگر یہ ہندو! یہ مسلمان! ایک دوسرے کے خون کے پیاسے۔۔۔۔۔ ان میں جوش و خروش کا نام کہاں! جو سمجھتے ہندو مسلمان خون، کوئی ملحد خون نہیں۔ دتو دھت پاس پاس ہوتے ہیں تو ہم تو کر ایک ہو جاتے ہیں، لیکن یہ دونوں آپس میں

لٹے تلے تیل کے پانی کی طرح غلغلہ ہو کر موسیٰ کی فوج کو گزرے کیوں دیتے ہیں، ہوش کی دوا کیوں نہیں کرتے بہت ساری فوجیں گزرتی رہیں، اب فوجوں کی فوج بھی گزرنے لگی ہے۔ کیا ہوا انہیں جو موسیٰ اور فوجوں میں تفریق نہیں کرتے؟ یہ دونوں مل جائیں تو کیا فوجوں کی سادی فوج اور اس کے اپنے سارے دروازوں کا خون نہ بہنے لگے گا؟۔۔۔۔۔

وہ گرم گرم گولیوں کے درمیان سے گھسی نہ گزرا تھا، ہر باجیب گولی اس کے کان پر سے گزر رہا کرتی تھی خاص گولہ گدی کی کچھ قند و قیمت محسوس ہوتی، اس کا سارا جسم پینے سے تر ہوتا تھا، اور ایسا لگ رہا تھا جیسے اس کے ہر عضو سے پینے کے جھرنے بہہ رہے ہیں۔ تقریباً کچھ دن اور ایک سال تک اس نے بحرِ زمین پر مل چلایا تھا، بڑے بڑے پہاڑ ٹکھڑے کر نہیں سکا لیکن سبیل اور گدال لئے پہروں میں کون پر پسینہ بہا یا کیا، پسینہ اس کے ہر سر بال سے بہتا تھا، ہر بال کی جڑ میں پسینے کے چشے ہی چھٹے تھے۔ گردہ پسینہ ہی کیا تھا جو اس کا مقابلہ کرتا، کیا ٹھانا لطافت اور کیا بلحاظ شدت، اس پسینے اور اس پسینے میں عور شید و اختر کا فرق تھا۔ پہلے چون مرق ہو کر بہتا تھا، اور اب ہمت پانی جو بیٹھی تھی، اور یہ مناظر دیکھ کر نقد مرآپ ہی آپ پانی پانی ہو رہی تھی۔ وہ اپنے خیالات کے سہارے بڑھنے لگا، اس گلی میں سے وہ کئی دفعہ گزر چکا تھا، وہ اچھی طرح جانتا تھا، یہی گلی آگے چل کر بڑی شرب میں کھلتی تھی، جہاں سے پڑخانہ بالکل قریب پڑتا تھا، بس یہی کان اور ناک کی مسافت! جہاں تک ہو سکے فوجی کو پوسٹ آفس کو محالمت تمام پہنچ جانا چاہیے تھا، اس لئے کہ ذرا سی آہٹ ہوتی اور اس کا باغیر ادا ہو کر دھبی جبک کی طرٹ اٹھ جاتا تھا، حالانکہ اس کو وہاں کا ڈرہ ڈرہ جانتا اور پہچانتا تھا، وہ وہی دلی کی کچھ گلی ہی تو ہے چند بھان کی کوٹھی، اور یہ جو بارہا میں ہے سیلہ کشی ناراین ہی تو ہے، اور ہاں یہ اونچا مکان سردار بابو کا ہے نا۔۔۔۔۔ یکایک وہ ٹھٹکا، کیا اعتبار اس کو دیا کا۔؟ بابو نے کوئیں بھجھا، موقع پر پہن بھائی، گواہ تھیں دکھاتی ہے۔۔۔۔۔ یہاں تو بند و مسلم بات ہے، وہ قدم قدم پر پیچھے ہوئے انسانیت سوز حال، آزادی کی راہ میں پیچھے ہوئے روڑوں کو دیکھ کر شائے گھر چلا جانا مناسب جانا، اگر اس کے پیش نظر شائے گھر بلو عزت اور بیرونی وقار ہو و چیزیں نہیں، اگر وہ چلا جاتا تو بہت ممکن ہے شائے اس کو چھپا لیتی، مگر اس کے باب کو پتہ چل جاتا تو۔۔۔۔۔ مانے بیٹی کا کیا شہر ہوتا، آخر وہ مسلمان ہی تو تھا اور جو محلے والی کو اس کی خبر ہو جاتی، کیا ایسے نازک موقع پر شائے سر اٹھانے کا قابل بنتی؟ اس کے اپنے مذہب والے اس کی نکال پھینک دیتے۔۔۔۔۔ وہ چہرے کا پسینہ پونچھ لگا، اور خدا کا نام لیکر جلد جلد اس سے قدم اٹھائے، ابھی گلی کی اس تک پہنچ نہ پایا تھا جہاں سے اس کو قوی امید تھی کہ جیون بگھڑی کو بکھرے ہوئے غارِ مخیال کی چیر و دستوں سے محفوظ ایک اچھے مقام پر پہنچا دے گا، عین اس وقت جب وہ رام جی کی کوٹھی سے تھا، لمبا ریس سے ہم پھینکے والوں کی طرح ان لوگوں نے بھی نشانہ اندھ کو ایک دو۔۔۔۔۔ تین چار سلیں غریب بھوسی پر دے ماریں، تیور کا کہاں سے گرتا بس کھڑکھڑا دھن ہو گیا، دسری جگہ سردار اور دول و ملگر کوئی اتنا زہری باقی رہا، وہ ہو کر خیر ہوئی دو تین سلیں اوپر ہی اور پھر اگر دور دور جاؤں گے، کچھ پڑی بجک کر رہ گئی، اور اس کے اوپے اوپے خیالات، بس آرام کی کوئی کسر نہ ہوئے اوپر چلے گئے۔۔۔۔۔ بھگوان کی قسم! بارگاہ کے ستور کی طرح گر پڑا سالے کا بچہ، شفیق القلب حیوان اپنی جو انمردی پر دانت دھلنے لگا۔

ہی۔۔۔۔۔ جی ہی۔۔۔۔۔ جی ہی ہی۔۔۔۔۔

”ہم سے کہیں ٹرے سکتے ہیں ایک قدم بھی یہ“ دوسرا غاندی بہادری کا تذکرہ کرنے لگا۔

”پر ماتا کی قسم کون گن نہ اوروں تو کم میں اپنے ایک باب کا بیٹا نہیں“

ایک ہی وار میں سکھت کی تاب بھی نہ رہی، آیا ہے جاسوسی کرنے، ذرا اس کا دل گڑو تو دیکھو کیسے خطرناک موقع پر

نئے نئے کپڑے پہن رکھے ہیں، بس نئی شہر وانی اس کے حق میں کلن ہو کر رہ گئی۔
 ”سوچ سمجھ کر پہننے ہوں گے اس نے کپڑے غسل بھی کر لیا ہوگا، بدیشاری سے تلاشی لو، کہیں
 اٹھ نہ جائے وہ، اگر کلنوں کی طرح سخت جان ہوتے ہیں بڑے وہ، کچھ مل جائے تو اچھا ہے۔“

دو جین نیچے اتر گئے اور دو چاکر اوپر کے اوپر ہی رہے۔

رضوی نہ جانے کیوں ہر سال ایک ایک ٹوک کر کھانا آیا، اور جب اس نے بائیسویں ٹوک کر کھائی تو گھر کر
 پھر اٹھ نہ سکا۔ اس کو حیدر آباد چھوڑے کچھ دن ادھر ایک سال ہو چکا تھا۔ حیدر آباد میں اس کو کس چیز کی کمی تھی،
 کھاتے پیئے گھر کے کاغذ خوش حال فرد تھا، ذخیال امروز نہ فکر فرما، بس زندگی ہنسی بھیلی ایک ہی مرکز پر دوڑتی تھی۔
 کالج سے گھر سے کالج، انفرسٹ کے اوقات میں سسکتی ہوئی روجوں اور لرزے ہوئے جوں کو، دل سوز، دل نکار
 مناظر کی اس عہد کی سے پُر نازی کر تا کہ الفا کا کی صورت میں تر لاس پھینچی ہوئی تصویریں، ہندوستان کا منظر جڑائی نہیں،
 وہ پُر سوز مناظر دیکھ کر خود کے دل میں بھی جلادینے والے سٹلے محسوس ہوتا تھا، اگر اس کی عائدانی خوش حالی اور دولت نے
 بڑا تھا اس کے دل میں سوز، اور رنج و غم پیدا ہونے کا موقع نہ دیا تھا، لاکھ دولت ہو، لیکن زندگی سدا مسرت و خوشی کا
 ملزا نہیں ہوتی، اس کو اٹھتے ہوئے، بڑے بڑے طوفانوں میں سے بھی گزرنا ہوتا ہے، کئی مرتبہ شکر ہے ہی نہیں بیٹھتی،
 زخموں پر بھی بیٹھ بیٹھ کر زخمی کو تنگ کر دیتی ہے، ہنسی خوشی زندگی کے دن کاٹنے والے خاندان پر کیا کیا عقاب کو ہم سر کر دینے والی
 نظر میں پڑیں، اور رضوی کے بڑے بھائی پر ناگاہاں پاٹ ٹوٹ پڑے اور حکومت نے اس کو حادثہ شاہ منزل کا
 لازم ہمارا حراست میں لے لیا۔ بات فی الحقیقت یہ تھی کہ حکومت کی ذرا سی غلطی پر سید شہید ہو گئی، ہمارا احتجاج بھی
 حکومت کے کان پر جوں نہ رہی، اگر اس کو اپنی غلطی کا علم ہو چکا تھا تو یہ احساس بہت دیر بعد موملا مسلم عوام
 تاخیر کا سبب نہ سمجھ سکے، ان میں مزید تاب صبر نہ تھی، اپنے سر دل پر منڈلاتے ہوئے عقاب کو دیکھ کر پہلے تو گھومنے
 اپنا منہ چھپایا، لیکن جب انھیں یقین ہو گیا کہ بلند پرواز عقاب کے اوپر نہ کر کے اٹھانے والی جلی موجود ہے تو فوراً بغاوت پر
 کمر باندھ لی اور جوش غضب میں صدر راغظم ہمارے گھر کو بھی آگ لگا دی۔

رضوی کے بھائی کی ایک بڑی دکان تھی، اور دکان کا ایک ایک بند ہو جانا تجارتی نقطہ نظر سے
 زبردست خسارہ کا موجب ہوتا ہے۔ بڑے بھائی نے جیل میں بند نہ جانے کا دامن پھیلایا، ورنہ یہ نصیب کس
 زندگی کے نشیب و فراز بھگالے، اور اس دنیا میں زندگی بسر کرنے کے طریقے بتائے۔ رضوی بھائی کی حسرت، بھری
 نظروں سے نظر نہ لاسکا، تقویٰ کے باپ نے بھی بہت دنوں پہلے اپنی آخری سانسوں میں باطل اس طرح دیکھا تھا کہ
 وہ نظر نہ لاسکا، اور بے اختیار ایک ہنسنے لگے تھے۔ بھائی کی گریہ آواز اس کے کانوں میں دھماکے پیدا کر رہی تھی،
 جوہری بم کے دھماکو سے بھی بڑی اور خطرناک آواز، وہ لرزے لگا، اور جی میں آئی کہ کھڑے ہوئے پھر یہ دھماکے
 ایک ایسا پھیر جائے کہ گھر کو خیر کھائے ہوئے گھر کے طرح گہرے اور ریزہ ریزہ بھاگے، اس کے ایک ایسی دورانی لگائے کہ گھبراہٹ
 دم چھوڑ دے، آفران کو کون کو محض شب پر حراست میں رکھنے کا حق کیوں حاصل ہو گیا، وہ جیل کی اونچی اونچی دیواروں کو
 اپنے سر کی ضروروں سے برباد دوسرا کر رہا تھا، اور وہاں سے اپنے بھائی سمیت خود بگیا رہ ہو سکتا تھا، راہ سفر تلاش
 کرتی نظروں پاس ہی کھڑے ہوئے، پھرے والے پڑیں، اور اس کو ایسا لگا کہ آسودوں میں سے گزرتی ہوئی دھندلی
 نظریں پہرے والے کو نہیں چاندنی کو دیکھ رہی ہیں، جو فاصل سے لگی کھڑی تھی، چاندنی ہی کے آگے اس نے ہتھیر

ڈال دیا اور بھائی کی طرف متوجہ ہوا۔ حالانکہ بھائی شروع سے اب تک برابر کہے جا رہا تھا، "موسیٰ نے بھائی کو دلایا دیا اور نعمات پر چڑھا ایسے ہی ممکنہ ہی کا وعدہ کیا، حالانکہ مجلس اتحاد المسلمین "گرتی راں شاہ منزل کو چھڑانے کی کوشش کر رہی تھی، پھر بھی اپنوں کی دُور و دُور معوب قیدی کو ایک نعمت غیر مترقبہ معلوم ہوتی ہے، کافی تسلی اور تسخنی دینے کے بعد اس نے اپنی ساری توانائیاں، دوکان پر صرف کر کے کا پڑ زور وعدہ کیا۔

موسیٰ سے جیسے بھی بن بڑا دہشتہ دکان سنبھالی اور جب بھائی آیا تو چند جمعہ ٹوٹا اور چند چٹوں نے وہ کان بھرے کہ خود بھائی کو بھائی پر شبہ ہونے لگا۔ جب بھائی پر بھائی شبہ کرتا ہے تو دونوں میں اتفاق میسر نہ ہو سکتا، اور جب اتفاق ہی نہ ہوگا تو کھڑکیسے چلے گا، کیا دوسرے اس گھر کی تاک میں نہ لگے رہیں گے، ہندو، مسلمان، کوہنوں بھائی بھائی اگر ہر دو ایک دوسرے کو مشکوک ٹھکا ہوں سے دیکھتے ہیں، کیا ایسی صورت میں اتحاد ممکن ہوگا، کیا وہ اپنا گھر بجائے میں کامیاب ہوں گے؟ بھائی کے جھوٹے ہی خواہوں نے اپنی ہمدردی جتانے کے شوق میں اور اپنے احسان کے دکھانے کی خاطر اتنی دفعہ اتنی دفعہ کہا کہ جھوٹ بھی سچ ہو کر رہ گیا، اور ایک دن بھائی نے موسیٰ سے حساب لینے ہوئے کہا: "تم نے چار سو روپے اپنی ناجائز خواہشات پر صرف کئے ہیں، "موسیٰ بھائی کی زبانی یہ الفاظ سننے کے لئے کسی ہیئت بھی تیار نہ تھا، اب کی گرا و دریا میں ڈال کے معدنِ ماعلہ درمیش تھا، اپنے مذاق کے خلاف اس نے دوکان چلائی تھی، چونکہ دوکان داری اس کے مذاق کی چیز نہ تھی، بہت ممکن ہے کہ نقصان بھی ہوا ہوگا۔ دن بھر غور و فکر کرنے والا، اپنے خیالات میں آپ مست رہنے والا انسان بھلا تجارت کیا خاک کرے گا، یہی وجہ تھی کہ دوکان کا وہ پہلے کا ساز و برگ نہ رہا تھا، لیکن چار سو روپیوں کا اس کی ناجائز خواہشات پر صرف ہونا سراسر ہسٹن تھا، اس نے تھوڑی سی دیر میں جو کچھ فیصلہ کرنا تھا کر لیا، اور بھائی کے لٹکائے ہوئے اہتمام پر جلا بھنا وہاں سے اٹھ گیا۔ سیدھا گھر گیا، کسی سے کچھ کہا نہ کسی کو کچھ بتایا، اپنے افسانوں کے مجموعے کو اٹھایا، اور برسوں کا بھر ہوا سوز لے کر موقعا شعور کی طرح چمک رہا تھا، اپنے کمرے سے باہر نکل گیا۔ بھائی نے پہرے پر بنا گوار فٹکٹیں دیکھیں جن میں سے غم و اندوہ کے بادل، ورنج و غم کی بھیلیاں جھانک رہی تھیں، بس کہ درہیت صاف رہے، والے چہرے پر رنج و غم کی لکیریں شدت کے ساتھ مرتسم ہوئی جا رہی تھیں۔ خلاف معمول چیز دیکھ کر بھائی دنگی، اور بولی: "کیوں بھیا خیر تو ہے؟"

"آج کچھ کھوئے کھوئے سے معلوم ہو رہے ہو؟ بھائی کا فطری جذبہ انگڑائی لینے لگا۔ بھائی اپنے دیور کو بیٹھے بھی زیادہ جاہلی تھی۔
"کھانا کھا لونا بھیا!۔۔۔"

"نہیں بھائی!۔۔۔" وہ کتاب کے اوراق الٹ پلٹ کر رہا تھا، مگر نظریں بہت دُور دیکھ رہی تھیں۔
"جھوک نہیں ہے مجھے"

بھائی کھجکھی، آج کچھ وال میں کالا ضرور ہے۔ اس نے اپنے دیور کی کمزوری سے فائدہ اٹھانا چاہا،

"نہیں آ رہی ہے تجھے فرصت بہت کم ہے گی"
پر داہ نہیں۔۔۔ "وہ حیران رہ گئی، نہ سن سے اتنی دلچسپی رکھنے والا لاکا آج جائے کیوں بھئی بھئی باتیں کر رہا تھا، وہ بکارتی کی بکارتی رہ گئی اور موسیٰ گھر چھوڑ چل دیا۔

جائے جلتے اس سے اس سے وعدہ لیا کہ وہ روز کالج مجبوراً دیا کرے اور گھر پہنچا دیا کرے۔

وہ دن بھر کالج میں اسی رکشا والے کے متعلق سوچتی رہی، کئی دفعہ خواہش ہوئی کہ زبان تک آکر رہے گی ورنہ وہ اپنے پروفیسر کے آگے اپنی قلبی کشش کش اور ذہنی انتشار کا راز کھول کر رکھ دیتی مگر نفسیات سے کچھ لینے والی وہ بین طالبہ جانتی تھی کہ اندرونی غلط فہمی اور دلچسپی میں غلط فہمی کی پیمائش کو دھور کر دیا جائے تو وہ میں کی لذتوں سے یکسر محروم ہو جائے گی تو اپنے قیمتی جذبات کے اظہار کے بعد اب اس کی قیمت ہی کیا رہی؟ اس معاملہ میں پروفیسروں کی مدد کی توقع محض فضول تھی، دارالمطالعے میں نفسیات کی ساری کتابیں کھول کھول کر رکھ دیں مگر ان سے اس معاملہ میں کچھ بھی مدد نہ ملی۔ ڈھیروں کتابیں سارے پڑی تھیں، مگر ان کتابوں میں محض فضولیات اور خرافات کے کچھ نہ دھرائے اس کا ہی پھر کیا غصہ سے پھلنے لگی، تنہا تنہا کتابیں لکھ کر عالمی شہرت کمائے والے، اس کے سامنے بازاری اطفال سے زیادہ وقعت نہ رکھتے تھے، آج یہ پہلا موقع تھا کہ نفسیات کے شہرہ آفاق عالم اور ماہر نفس و خفا شاہ کی طرح سیل جذبات میں رواں دواں تھے۔ ان کی عزت و توقیر ہی کیوں کی جائے، جبکہ یہ اوٹ پٹانگ لکھ کر اپنے نام کا معمول پیٹ لیا کرتے ہیں۔ وہ ان ساری کتابوں کو دیا سلائی دکھا دینا چاہتی تھی مگر بس نہ چلتا تھا۔

تین بجے ہی سے وہ رکشا والے کا انتظار کرنے لگی لیکن وہ ٹھن کر آہوا میں وقت پر جبکہ کالج کی گھنٹی ٹھن ٹھن کر رہی تھی گیٹ کے سامنے پہنچا، وہ دھڑ سے رکشا میں سوار ہو گئی، جیسے اس کے سارے اعضا شدت تفکر کی حالت فہمیل ہو کر رہ گئے، وہ اپنے تقریباً مغلوب اعضا کو دیکھ دیکھ سوچنے لگی، میرے اعضا جاتے کیوں مغلوب ہو رہے ہیں، وہ اپنے بازو میں چوٹی لے کر اعضا کی حساسیت کا پتہ چلائے، اسی اس کے سارے جوڑ اپنے کام میں مصروف تھے اس سے کچھ پوچھنا چاہتی تھی، مگر قوت گویائی جواب دے دیا کرتی تھی، ورنہ وہ تو رکشا والوں کو چھوڑ سوڑ والوں کو پاسائی ڈانٹ لیا کرتی تھی۔ اس کے ننھے سے دل میں ہمدردی دھڑبانی کے جذبات ابھریں لیجئے، وہ بہت دیر تک رکشا والے کی پشت پر کھینچوں اور ڈنڈے کو اپنی گرت میں لئے ہوئے بچوں کو ٹھوڑتی رہی، لیکن وہ قطعی بے جبر تھا، گاجار ہا تھا۔ ادھر ادھر دیکھ بنا۔ وہ اس کی پینڈلیوں کو تکتے لگی، بھاگتے وقت جو جھلی جھلی تھی وہ مزدوروں کی سی نہ تھی اس نے ننھے بچوں کو دیکھا، ایڑی پر قطر پڑے ہی وہ آپ ہی آپ کہنے لگی "شانتا! میں تجھ سے شرمادہ سکتی ہوں، یہ صاف ایڑی رکشا والے اور مزدوروں کی نہیں ہوتی، مزدور دل کی ساری ایڑیاں ہمیشہ پرہیز رہتی ہیں اور گرمی اور شدت سردی کی تاب نہ لا کر بیٹھ بیٹھا جاتی ہیں میں شلو بدھکتی ہوں، بہت بڑی شرط! وہ تیز ہونے لگی، رکشا والے نے رفتار سست کرتے ہوئے کہا کیوں بی بی ہاں اتنا چاہتی ہیں آپ؟ "نہیں! نہیں! وہ مدد دینی" مگر تو ابھی بہت آگے ہے۔ میں ذرا جھکی قسم کی لڑکی ہوں، جاتے وقت بے وقت کیوں بڑبڑاتی ہوں، اس نے اپنی ایک کمزوری کو دوسری کمزوری میں چھپا لیا۔

میں بھی کیسا عقل سے گیا گزرا ہوں سرکار! آپ کی باتیں سمجھ نہ سکا، وہ بھی اپنی کمزوری کا پھانڈا پیوٹے لگا۔ اب کوئی چیز مانجھت خیال نہ تھی کہ کچھ اس نے رکشا والے کے متعلق اپنا خیال باندا تھا سو فیصدی سچ نکلا، اس نے صرف دو باتیں کیں، اور دو باتیں بھی کس لطیف انداز اور کس پیارے پیارے میں! امیروں کی کمزوری کو اس نے اپنی کمزوری میں ڈھکیں کر مجھے سمجھا یا کہ کمزوری ہر فرد بشر میں ہونی ضروری ہے۔

اجہا جب تم موٹر سیکہ جاؤ تو مجھ کو دکاچ پہنایا کرنا، وہاں سے پارک جائیں گے، جب کالج کی لڑکیاں سرکاری طور پر پبلک مٹائے جائیں گی تو ہم بھی اپنی موٹریں وہاں جائیں گے، میں تعارف کروانے کی تمھارا میری ایک بڑی پیاری سہیلی ہے بڑی خوب صورت ہے وہ۔ وہ بیک بکس ہائیں کرنے لگی۔ "رکشائیں چھوڑ دو بہت بُرا اثر پڑتا ہے اس کا صحت پر" رضوی شائنا کو کالج چھوڑ کر دوسری سواری کی فکر میں آگے بڑھ گیا، وہ شائنا کی باتوں پر غور کرنے کے لئے کسی طرح تیار نہ تھا، مگر اس کو رد کر قبض ہوتا تھا، یہ لڑکی اتنی تیز کیوں ہے سمجھتی نہیں، جب بولنے پر اتر آتی ہے تو سب کچھ کہہ جاتی ہے، حیدر آباد میں بھی لڑکیاں رکشادلوں سے ایسی ہی باتیں کرتی ہیں کیا؟ شائنا کدھڑا اور میں کدھڑا لیکن وہ مجھ سے چاہتی کیا ہے یہ نہ شگفتہ کلی جس پر ابھی ابھی باوصہا کے لطیف لطائفوں کے نشانات اترے ہیں، وہ نکلیں گی طعن اپنا ہاتھ کیوں بڑھا رہی ہے۔ وہ سوچنا نہیں چاہتا تھا، گریختا لالتھے کہ وہ کہہ کر آتے تھے، اس کے ملاقاتی رنگ بڑی موٹریں ملے عطر و گلاب میں لیے ہوئے آتے ہیں مگر میں۔۔۔۔۔ میں تو ایک ادنیٰ مزدور ہوں، جس کے سارے جسم سے پیسے کی بو آتی ہے۔

رضوی شائنا کی باتوں میں پچھی لینے لگا، محض اس لئے کہ وہ اخلاقی فرض سے مجبور تھا، مگر بولتے وقت شائنا کہنے لگی، "وہ اس گلی سے چلو، میں اپنی سہیلی سے مل لیتی ہوں۔ بہت دیر دعوپ کے بعد گھر ملا، شائنا کہنے لگی، "خیر ملو ابھی ملتے ہیں اس سے" اب گھر بھی نہیں ہوئی، "رکشادالو اتنی دُور آنے کی وجہ کافی تھک چکا تھا۔ لیکن شائنا کی بیٹی بیٹی بایں ٹھکانٹ کو ایک حد تک کم کر دیتی تھیں، نماز پڑھتے جاتے ہیں، تو قدم قریب قریب ڈال کر خدا کو زاید قدیم دکھاتے ہیں تاکہ معمول نیاز میں ہیں اتنے قدم اٹھانے پڑے۔ شائنا بھی ہی طریقہ اختیار کرنے لگی، گھر ایک طویل پکر کاٹ کر جانا چاہیے۔ شائنا رکشائے اتر کر رکشادالے پر بھرت بھری نظر ڈالتے ہوئے کہتا میں اٹھانے لگی "دیکھو رضوی آج تو تم خوب تھک چکے، آؤ کھانا کھاتے جانا۔"

"ہنس شائنا! وہ کتاب کے ادراقی انٹ پلٹ کر رہی تھی، مگر نظریں بہت دُور دیکھ رہی تھیں "بھوک نہیں ہے مجھے" رضوی کا دھیان یکایک اس جگہ پر بھائی کی طرف ہٹا، وہ کھانا کھانے ملا رہی تھی، بھائی کو اس نے نفی میں جواب دیا تھا، یہ تو شائنا توئی۔۔۔۔۔۔ "آپ بُرا نہ مانتے مجھے بھوک نہیں ہے اس وقت"

شائنا دل گیر ہو گئی، گھر سے اس نے روپیہ منگوایا اور دیتے ہوئے کہنے لگی "رضوی اپنی دل گیر اور آرزوہ شائنا سے اپنا معاوضہ لیتے ہوئے کھارت کرنا، میں تمھیں انعام نہیں تمھارا پنا معاوضہ دے رہی ہوں!" "شش شش۔۔۔۔۔" وہ شکر یہ نہ بول سکا، اس لئے کہ یہ معاوضہ اس کی محنت سے سوا تھا۔

دوہت دفون یک شائنا کو لاتا اور لے جاتا رہا، کبھی دفعہ شائنا کالج جاتے کی بجائے رکشادالے کے ساتھ پارکوں میں پھرتی رہی۔ شائنا کے آگے رضوی ایک وفادار ملازم کی طرح پیش آتا رہا، مگر شائنا کا اصرار تھا وہ اس کو بہت کچھ سمجھتی تھی، دیوانگی نہیں تو رکھتا ہے اس کی شائنا نے دس ہزار بار اپنی تھیں دے کر پوچھا ہوگا، مگر وہ صبر سے انکار کرتا رہا، شائنا کہتی "تم خاصے پڑھے لکھے ہو، طور طریقہ بُرے گھر والے کے معلوم ہوتے ہیں، گفتگو بے انداز رکشادالوں کا سا نہیں۔ تم اپنے آپ کو چھپا رہے ہو، ایک دفعہ میں نے اپنی دوست کے سامنے انگریزی میں تمھیں بُرا بھلا کہا تھا۔ اس وقت میں تمھارا انتہان لے رہی تھی، تم نے ایک دم پلٹ کر غضبناک نظروں سے ہمیں گھورا، جیسے تمھاری خودی پر کسی نے اپنا ذوق پاؤں رکھ دیا تھا، جب میں نے تمھاری رخن غلط فہمی کی خاطر انگریزی ہی میں لڑکی سے کہا "رضوی کو انگریزی خوب آتی ہے۔" اس وقت میں بلاشبہ کہتی ہوں تم بے طرح محبوب

ہوئے تھے۔ رضوی اب نہ چھپاؤ تم، خود کو میرے سامنے، اگر میں نے غلطی کی ہے اس میں تو پھر کچھ میرا غصہ تھا پڑھنا محض فضول ہوگا، صرف تم اٹنا کہو میں آج کل جس آزمائش میں مبتلا ہوں اس میں پوری پوری اتروں گی۔ یہی سوال اور اسی قسم کے بے شمار سوالات اس نے تاروں کی جھاڑوں میں، کھنکشاں تلے، جھبون میں، باغوں میں پوچھے تھے، مگر رضوی جانے کیوں مصرقا، صرف اٹنا کہہ کر شائستگی ستوش میں مسلسل اضافہ نہ کئے جاتا تھا۔ شائستا، میرے برسوں کے زخم کو نہ چھپو، کیا تمہیں مسرت ہوگی میرے زخم کو دو بارہ جو رستا دیکھو گی، میں وہ نہیں ہوں جو تم سمجھتی ہو۔ میں ایک ادنیٰ رشتہ والا ہوں۔ دن بھر سڑکوں پر دوڑتا دوڑتا پھرتا ہوں، کبھی کوئی مرد ہوتا ہے، اور کبھی کوئی عورت لدی لدی پھرتی ہے۔

”رضوی! شائستا بولی اب تم رکشا کھینچنا چھوڑ دو، کچھ اپنی حالت بنا لو، روز بروز گھر سے جا رہے ہو، کل پرسوں میری موٹر آج بلانے لگی، چلانا سیکھ لو۔۔۔۔۔ یہ۔۔۔۔۔ نو۔۔۔۔۔“ شائستا منی بیگ رضوی کو دینے لگی۔

”یہ کیا۔۔۔ رضوی گھبرائے لگا
”رکھو تو تم۔۔۔ کام آئیں گے“

”نہیں شائستا، مجھے شرمندہ نہ کرو“

”رضوی! تم میری بات نہیں مانو گے تو میں سمجھ لو کل تمہیں شائستا کہیں بھی نظر نہ آئے گی“

”شائستا! تم میری سوانح حیات سننا چاہتی ہو تو میری قسم اٹھاتی ہوں کہ لو، پرسوں میں تمہیں اسی پارک میں اپنی کہانی سنائوں گا“ وہ ایک بڑے احسان سے بال بال بچ گیا۔

”رضوی نے اسی دن رکشا واپس کر دیا، کچھ کپڑے سوائے، اور تین برسے روز جمع کئے ہوئے سارے روپیے شہر دانی کی جیب میں رکھے، اور پوسٹ آفس کی طرف جانے لگا، شام کو اسے اپنی۔۔۔۔۔ ودا دینا سنا ہی تھی۔

”رضوی ہلنے بھی نہ پایا کہ جان کھل گئی۔ اس کی جھڑکی تو دہی جیب میں سے چار سو کے نوٹ اور بائیس جیب سے ڈیڑھ سو کے نوٹ، چند خون میں لت پت اور چند پتھر کی ضرب سے چور چور ٹھٹھے۔

لالہ رام جی کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ ایسا بھولا بھلا لڑکا انھوں نے کم از کم اپنی پوری عمر میں کہیں نہیں دیکھا تھا، انھیں قہقہہ ہوتا تھا، کہ یہ پگلا گھر میں اپنی خیر نہیں منا کر اس گلی میں کیوں آکھلا۔ کیا پہچانتا نہیں تھا اس گلی کو وہ؟ لالہ جی کو اس کی موت پر افسوس ہوئے لگا، لالہ جی بہادر تھے، اور ہمیشہ بہادروں کی قدر کرتے تھے۔ انھیں بہت افسوس ہوا، اگر بعد کے پچھتائے سے کیا ہوتا ہے۔ وہ نوٹوں کو پھاڑ دینا چاہتے تھے مگر ہاتھ نہ بڑھتے تھے۔ خدا کی دین ہے۔ خدا کی دیں سے انحراف کرنے والا، پاجی ہوتا ہے، بھگوان میں کو دینا چاہتے ہیں، چھپچھپا کر یا سر ہمو کر بھی دیدیتے ہیں، وہ نوٹوں کی غلامی زور سے وہ ہاتھ دے اپنے بہادروں کی ہمت افزائی کی خاطر بولے۔

”پانچ روپے کی مٹھائی دوڑ کر بھگوان داس کی دوکان سے لے آؤ، ہم سب مل کر کھاؤں گے“

لالہ جی مال غنیمت اپنی جیب خاص میں اتار دے ہوئے لوٹنے کو مٹھائی لائے بیچ رہے تھے، اور اس دوران میں، چیل کی تیز نظر سے پڑسی ہوئی چاندی کی توید پر پڑسی، چھپچھپ کر ضرب سے سینے پر پک پک گئی تھی، پک گئی تو کیا ہوا، چاندی تھی آخر وہ! ایک دوسرے شخص نے لالہ رام جی کی نظریں پھا کر توبہ اتار لی، اگر لالہ جی دیکھ پائے تو وہ بھی ان کی نذر ہو جاتی۔

پٹرول اور مٹی کا تیل چھڑک کر غش کو کچرہ کی کندی میں پھینکا گیا اور دیاسلائی دکھادی۔
جب سب مٹائی کھا چکے تو بیٹھے بیٹھے اس شخص نے تعویذ نکالی اور اس کو کھولا تو غلاب توقع اس میں سے کسی
ناشر کی رسید نکلی:

”مسٹر رضوی سے اُن کے اپنے پندرہ افسانوں کا ایک مجموعہ بعنوان ”درو کی کہانیاں“ وصول ہوا۔۔۔“
سب تعجب کرنے لگے، اور آخر میں یہ فیصلہ کیا گیا کہ مرحوم بلاشبہ پاگل تھا، اور دنیا کا بہت بڑا بے وقوف!

میں نے اس شاعر ہر روز نو بجے ہی سے رکشا والے کا انتظار کرتی ہے، مگر مینوں گزر گئے، وہ (دوسرے ہی نہیں بچے)۔
آخر انتظار سے تنگ آ کر خود ہی بیدل محل پڑتی ہے، باپ موٹر میں جانے کے لئے اصرار کرتا ہے مگر وہ اس کی ایک نہیں مانتی!

سہام مرزا

نذر محمد قلی قطب شاہ

میک فصلِ گل کو کیا جائے نا
گر بیانِ دو امن سیا جائے نا
لگے جو نہ لب سے ترے سا قیا
وہ ساغر تو مجھ سے پیا جائے نا
تری دل رہائی ہے افسوں گری
مجھے دے کے دل پہ لیا جائے نا
یہی زندگی ہے تو مرنا بھلا
یہاں پر تو اک پل جیا جائے نا
تری کل سے ہے رات دن بے گلی
موا جائے نا اور جیا جائے نا
ترے اک اشارہ کے میں منتظر
جو تو چاہے پھر کیا کیا جائے نا
تنتا ہے تجھ سے یہی سا قیا
کہ تم شہر کو رسوا کیا جائے نا

محمّد نقوی

جنازہ

نفسا کی چیریں پر پسینہ ہے غم کا
ہر اشک شرہ آجگینہ ہے غم کا
جوانی کا دامن خربینہ ہے غم کا
یہ دنیا میں کوئی قریبہ ہے غم کا

نفس در نفس شور ماتمہ بیا ہے
یکس اہل دل کا جنازہ پڑا ہے
تری بچن میں!

رنج زندگانی یہ آنسو ہیں رقصاں
کہ کیلائے شب کی ہیں زلفیں پریشان
مشیت بھی چیراں ہے غطرت بھی لڑاں
قبائے محبت کا دامن گر میاں

نفس در نفس شور ماتمہ بیا ہے
یکس اہل دل کا جنازہ پڑا ہے
تری بچن میں!

چراغِ شبتاں کی کو تھر تھرائی
کہ ورت سی آئینہ کُن یہ آئی
ہوئی رنگ ماحول سے غم نمائی
بہت کفر پرور خدا کی دہائی

نفس در نفس شور ماتمہ بیا ہے
یکس اہل دل کا جنازہ پڑا ہے
تری بچن میں!

کرم چاہتا تھا ستم ہو رہا ہے
قیامت کا محیا رکم ہو رہا ہے
وجود اب برنگِ عدم ہو رہا ہے
فرشتوں کو جبریل غم ہو رہا ہے

نفس در نفس شور ماتمہ بیا ہے
یکس اہل دل کا جنازہ پڑا ہے
تری بچن میں!

جبریل

نئی کتابیں

- مرزا سیف علی خاں

تنقید و تبصرہ

تاریخ علم نباتات از پروفیسر محمد سعید الدین، مطبوعہ چشتیہ پریس حیدر آباد۔
 یہ چھوٹی سی کتاب ادارہ اشاعت علوم و فنون کے سلسلہ مطبوعات کی چوتھی کڑی ہے۔
 اس میں جامعہ عثمانیہ کے صدر شعبہ نباتیات نے اس علم کی مختصر سی تاریخ پانچ ابواب میں قلمبند کی ہے۔ سعید الدین صاحب نے
 اردو میں نباتیات کے مختلف پہلوؤں پر اب تک چار پانچ کتابیں لکھی ہیں جن میں سے ایک کتاب ”پودوں کی کہانی“
 بچوں اور طلبہ کے لئے خود پودوں کی زبانی بہت ہی سلیس اور سادہ انداز میں لکھی گئی ہے اور دوسری نظر کتاب جو
 ”تاریخ علم نباتات“ کے عنوان سے چھپی ہے اس کا اسلوب بیان عالمانہ ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ پروفیسر سعید الدین صاحب
 اپنے موضوع پر بڑی خوبی سے واقف ہیں۔ انھوں نے اس کتاب کی تنہید میں علم نباتات کے متعلق گزشتہ زمانوں میں جن
 مصنفین نے اپنی تحریریں چھپوڑی ہیں ان کی طرف اشارہ کیا ہے۔ پھر اصل کتاب کا پہلا باب شروع ہوتا ہے جو
 ۱۳۳۵ھ سے ۱۳۴۱ھ تک اس علم کے جو ماہرین گزرے ہیں اور انھوں نے جو کارنامے اپنی یادگار چھوڑے ہیں
 ان کا ذکر کیا گیا ہے۔ اسی طرح سے ہر باب میں علم نباتات کے سنہ دار ارتقا کو بیان کیا گیا ہے۔
 چونکہ یہ کتاب مشاہیر علماء اور ان کے علمی اور فنی نظریوں کے ناموں اور اصطلاحوں سے
 بہت زیادہ بحث کرتی ہے، اس لئے اس کے سمجھنے کے لئے نباتات سے تھوڑی بہت واقفیت ضروری ہے
 اور اسی نے نباتیات کے طلب اس کتاب سے بطور خاص استفادہ کر سکیں گے۔

حیدر آباد کے جدید دستور پر ایک نظر از جانی پرشاد صاحب۔
 اس کتاب میں حیدر آباد کے جدید دستور کا ایک عمدہ پیرامین
 تعارف کرایا گیا ہے اور اس امر کی کوشش کی گئی ہے کہ جدید دستور کے پس منظر اور اس کی ترتیب و تدوین کی
 منزلوں کو نہایت عموماً سے واضح کیا جائے۔ چونکہ اس کتاب کے مرتب جانی پرشاد صاحب کا انداز بیان نہایت ہی
 شگفتہ اور سلیکھا ہوا ہے اس لئے اس کتاب کے پڑھنے میں وہ ذہنی ہارموس نہیں ہوتا جو بالعموم قانونی اور
 دستوری موضوعوں پر لکھی ہوئی کتابوں کے پڑھنے سے ہوتا ہے۔ ادھر کچھ عرصہ سے حیدر آباد کے رسائل و جرائد میں
 حیدر آباد کے جدید دستور کے متعلق جو بیانات اور مضامین شائع ہوئے رہے ہیں ان کے پیش نظر پڑھنے والے
 اس دستور کی خوبیوں یا خرابیوں کو صحیح طور پر نہیں سمجھ سکتے اور اصل دستور کے پورے خدوخال ٹھیک طور پر واضح
 نہیں ہو سکتے، اس لئے زیر نظر کتاب پر اس قابل ہے کہ اس کے ذریعہ سے حیدر آباد کی جدید دستور کی کشمکش کو سمجھا جائے
 اس میں جانی پرشاد صاحب نے اس موضوع کو بہت ہی دلکش پیرامین میں ذہن نشین کرنے کی کوشش کی ہے اور
 ان کے طرز بیان کی دلکش کتاب کو یک وقت ختم کر لینے کی طرف توجہ دلاتی ہے۔

معروضہ از مولوی محمد الیاس برقی صاحب، مطبوعہ عیسٰی الاسلام پریس حیدر آباد۔
 یہ چھوٹی سی کتاب جس کے دو حصہ اب تک شائع ہو چکے ہیں، مولوی الیاس برقی صاحب کی متفرد شاعرانہ کا
 مجموعہ ہے اور اس کے ہر حصہ کی ابتداء میں مصنف نے جو صفات نشر کے لئے وقف کئے ہیں وہ بھی اپنی معنوی اور ادبی
 خوبیوں کے لحاظ سے مصنف کے شاعرانہ کلام سے کم کچھ نہیں۔ مولوی الیاس برقی صاحب کی تقریر اور تحریر

دولوں کا انداز بیان نہایت شگفتہ اور رنگین ہے۔ ان کو شعر و سخن کا بھی ایک خاص ذوق حاصل ہے۔ چنانچہ اس سے قبل ان کے مرتب کردہ منتخبات نظم کی متعدد جلدوں کے ایک سے زیادہ ایڈیشن شایع ہو کر اردو دنیا میں مقبولیت حاصل کر چکے ہیں، لیکن زیر نظر مجموعہ کلام کی اشاعت سے قبل شاید کسی کو بھی علم نہ تھا کہ برنی صاحب خود بھی شعر لکھتے ہیں۔ ان کے زیر نظر دولوں معدنیہ شاعری کے اعلیٰ نمونوں سے معمور ہیں اور ان کے کلام میں لغت و منقبت کے پاکیزہ مضامین کے علاوہ اتنی رنگینی اور موسیقیت بھی موجود ہے کہ یقین ہے کہ ان کا کلام بہت جلد شاعری کی مجلسوں میں مقبولیت حاصل کرے گا۔ تصوف کا ذوق رکھنے والوں کے لئے تو یہ دولوں کتابیں ایک نعمت کی حیثیت رکھتی ہیں۔

از خود مزید لکھنوی۔ ناشر کتابستان لاہور۔

سلطانہ رضیہ یہ ایک مختصر سا ڈرامہ ہے جس میں ہندوستان کی مشہور جانا زنگ سلطانہ رضیہ کی زندگی کے ڈرامائی پہلوؤں کو دلچسپ اور فنی انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ یہ ڈرامہ فلم کی ضروریات کے پیش نظر قلمبند ہوا ہے اور اس کا پیش لفظ سید احتشام حسین لکھا ہے اور وہ لکھنؤ یونیورسٹی کے لکھا ہے جس میں انھوں نے یہ بھیجے رائے ظاہر کی ہے کہ جب اس ڈرامہ کی فلم تیار کی جائے تو وہ ضرور پسندیدہ ہوگی۔

رضیہ سلطانہ کی زندگی کے متعلق بہت سی غلط فہمیاں عام طور پر رائج ہیں اور لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ رضیہ سلطانہ اور اس کے حبشی غلام یاقوت کے آپس میں عشق و عاشقی کا تعلق تھا۔ اس ڈرامہ کے مصنف نے اس واقعہ کا بڑی خوبی سے ساتھ بطلان کیا ہے اور تاریخی اس تحقیق کو پیش نظر رکھ کر یہ ڈرامہ لکھا ہے کہ یاقوت دراصل ایک وفادار اور علفند غلام تھا، اس لئے رضیہ اس کی عزت اور قدر کرتی تھی اور حقیقت میں اس کو بھٹکے گئے گورنر ملک القونیا سے محبت تھی۔

موجودہ فلمی ڈراموں میں جہاں تاریخی پس منظر پیش کیا جاتا ہے یا تاریخی اشخاص سے متعلق قصہ تیار کیا جاتا ہے تو اس امر کا خیال نہیں رکھا جاتا کہ جو باتیں ڈرامہ میں پیش کی جا رہی ہیں وہ تاریخی نقطہ نظر سے کہاں تک صحیح ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر تاریخی فلموں سے متعلق اخبارات و جرائد میں اعتراضات شایع ہوتے رہتے ہیں۔ ایسے اسلاف کی برائیوں کو اُجاگر کرنا یا ان کے معائب کو نمایاں کر کے دکھانا بجا کے خود بہت بُرا عیب ہے، اور جو برائیاں یا خرابیاں ان میں موجود ہیں انھیں محض ڈرامہ میں دلچسپی پیدا کرنے کی خاطر ان کو زیب و آستان کرنا نہ صرف عیب بلکہ جرم ہے اور اس قسم کے ڈرامے پیش کرنے والی فلم کمپنیوں کے خلاف شاید مقدمے بھی دائر کئے جاسکتے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ فلم کے لئے ڈرامہ تیار کرنے وقت فلم سازی کو فلکینک کی پابندی ضروری ہوتی ہے اور مکالمے اور کہانی میں ایسے پہلو بھی پیدا کر کے بڑھتے ہیں جو فنی کی ضرورت کو پورا کر سکیں ان ضرورتوں کی خاطر کوئی غیور قوم اپنی تاریخی اور اپنی زبان کو تسخیر ہونے کی اجازت نہیں دے سکتی۔ زیر نظر کتاب میں جو مکالمے قلمبند کئے گئے ہیں وہ نہایت برجستہ ہیں۔ اس میں زبان کی ادبیت کو بھی باقی رکھنے کی کوشش کی گئی ہے بعض مشہور تاریخی فلموں کی طرح اس کتاب کے مکالموں اور زبان میں تصنع نظر نہیں آتا، اور واقعہ یہ ہے کہ اگر اس ڈرامہ کے پیش لفظ اور تہمدیں اس امر کی طرف اشارہ نہ کیا جاتا کہ یہ ڈرامہ فلمی ضرورتوں کو پیش نظر رکھ کر لکھا گیا ہے تو زیادہ بہتر ہوتا، اس لئے کہ بحالت موجودہ اردو ادب میں اچھے ڈراموں کی جو کمی ہے اس کو رفع کرنے کے لئے اس قسم کے عمدہ ڈراموں کی بجد ضرورت ہے۔

ہندوستان میں اقلیتوں کا مسئلہ افسانہ نگار اور اعلیٰ تعلیم یافتہ لکچرار دارالعلوم کالج ناشر

عبد حاضر کے ہندوستان میں سب سے زیادہ اہمیت اسی مسئلہ کو حاصل ہو چکی ہے، اور اہل ہند کی قدیمی تنگ نظریوں میں برطانوی راج کی پیدا کردہ تہذیب و ثقافت کے باوجود کسی طرح کی کمی ہوتی نظر نہیں آتی۔ دنیا کے دوسرے ممالک اور خاص کر مصر اور بلقان میں بھی اقلیتوں کا مسئلہ موجود تھا، لیکن وہاں کسی کے اس کو حل کر لیا گیا۔ ہندوستان ہی ایک ایسا بد قسمت خطہ ہے کہ جہاں اس میں روز بروز بڑھتی چلی پیدا ہوتی جا رہی ہیں، اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اگر آئندہ ہندوستان چھوڑ بھی دیں تو اقلیت و اکثریت کے تصور کی جو متعدي بیماری وہ اس ملک میں پھیلا چکے ہیں اس کی سمیت میں اضافہ ہی ہوتا رہے گا۔ زیر نظر کتاب اسی محرک آراء و موضوع سے بحث کرتی ہے۔ اس کے مضامین کو نواد اباب میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلے باب میں مسئلہ اقلیت کا تاریخی پس منظر دکھایا گیا ہے۔ دوسرے باب میں یہ واضح کیا گیا ہے کہ بیسویں صدی کے اوائل میں برطانوی سامراج کو ہندوستان میں کس قسم کے خطرے درپیش ہوئے تھے اور کس طرح فرقہ واریت کی ابتداء کی گئی۔ تیسرے باب میں مسلمانوں کے مطالبات اور مسلمانوں کی اصلاحات پر روشنی ڈالی گئی جو تھا باب ہندوؤں اور مسلمانوں کے سیاسی اتحاد اور اس کے محرکات پر مشتمل ہے اور چھٹوں کے مسئلہ کے پیشق سے بحث کرتا ہے۔ پانچویں باب میں یہ دکھایا گیا ہے کہ ۱۹۱۹ء میں جو اصلاحات نافذ کی گئیں ان میں اقلیتوں کے ساتھ کیا برتاؤ کیا گیا۔ چھٹا باب اس فرقہ واری جدوجہد کو پیش کرتا ہے جو ۱۹۱۹ء سے ۱۹۲۵ء تک کی گئی۔ ساتویں باب میں ۱۹۲۵ء کے قانون حکومت ہند کے ذریعہ فرقہ وارانہ مسائل کے لئے جو تجویزیں نافذ کی گئیں ان کو پیش کیا گیا ہے۔ آٹھواں باب ہندو مسلم اختلافات کے حقیقی اسباب بیان کرتا ہے، اور آخری باب میں مسئلہ اقلیت کی موجودہ صورت حال سے بحث کی گئی ہے بحیثیت مجموعی کتاب پُر از معلومات اور مفید ہے۔ خاص طور پر ان نوجوانوں کو چاہیے کہ اس کا مطالعہ کریں جو سیاسی امور میں حصہ لے رہے ہیں یا اس سے دلچسپی رکھتے ہیں۔

ساکر چند گورکھا

ہمالیہ کی گود میں

۱۱۹ صفحات قیمت ۳۰/- راج محل پبلشرز، جہون کشمیر۔

ساکر چند گورکھا کا نام کسی کتاب کے مصنف کی حیثیت سے پہلی دفعہ سنایا گیا ہے۔ سترہ مجموعے جمع ہوئے ادب پاروں کو انھوں نے ہمالیہ کی گود میں، ساکرا ن نام دیا ہے، کیونکہ ان کے تاثرات وہی ہیں جو ہمالیہ کی گود میں، انھوں نے محسوس کیے۔ انھیں قدرت سے محبت ہے۔ خصوصاً ہمالیہ کے حُسن سے۔ طرز بیان دلچسپ ہے اور راج کی لگا لگی لہریں ہیں۔ مگر ہر مقدمہ پر بجائے خود بے حد مختصر اور تشنہ ہے۔ گورکھا اگر اپنے مشاہدات کو فن کا رانہ تفصیل سے بیان کرتے تو یہی باتیں اور جگہ جاتیں، بہر حال اردو ادب میں یہ ایک نیا تجربہ ہے۔ سپنوں کی دنیا میں وہ لکھتے ہیں کہ اگر ان کے بس میں ہوتا تو وہ ہمالیہ کی چوٹیوں پر چھنے والی برت بن جاتے۔ اس سے زیادہ فطرت سے محبت کا ثبوت اور کیا ہو سکتا ہے۔ کیونکہ والی، پاما، کمز، بہت اچھے انسا چکے ہیں۔ شعلے کی آب و ہوا اچھا طرز ہے۔ ان کے افسانوں کے پس منظر میں کشمیر کی مغلّس و معصوم دیہاتیں مسکراتی ہیں، روتی ہیں اور فطرت سے محبت

کرنے کی دعوت دیتی ہوئی معلوم ہوتی ہیں۔

واجبہ سنگھ بیدی اُردو کے سب سے بلند پایہ ادیب نے مقدمہ لکھا ہے، مگر انھوں نے بجائے گور کھا کے فن پر بحث کرنے کے ان کے ذاتی حالات زیادہ لکھ دیئے ہیں، اس سے صفت کے متعلق معلومات تو حاصل ہوجاتی ہیں مگر ساتھ ہی محسوس ہوتا ہے کہ بیدی نے مقدمہ لکھا تو بے گروہ ان کے فن کے متعلق کچھ لکھنا نہ چاہتے تھے۔

از صائب ماصی۔ (۳۲) صفحے۔ قیمت ۸

شعنی عورت اور سماج پبلشرز یونائیٹڈ، چوک انارکلی لاہور۔ دلتو از بک ڈپاٹ۔ بیرون دہلی دروازہ لاہور۔ اس شعنی میں شاعر نے طوائف کی زندگی پر آنسو بہائے ہیں نتیجہ ہی نکالا ہے کہ مفلسی اور بھوک عصمت کو بھی ویران کر دیتے ہیں جو ہندوستانی عورت اور ہر عورت کا جوہر ہے۔ زبان سحری، طرز بیان دلکش۔

شعنی کا مقدمہ ثریا مین صاحبہ بی۔ اے ناضل نے لکھا ہے جو اس چھوٹی سی شعنی کے لئے مدد گاہ ہے۔ اگر صائب ماصی اسے اپنے دیوان کے لئے بھی محفوظ رکھیں اور استعمال کریں تو اچھا ہے، کیونکہ اس میں ان کی شخصیت اور شاعری کے متعلق نہایت تفصیل سے کام لیا گیا ہے۔

اسلام اور مشاہیر عالم مرتبہ حبیب عبداللہ ابن حسن بالغیبہ۔ (۱۱۶) صفحات، قیمت اور طے کا پتہ درج نہیں۔ اس میں انھوں نے قرآن مجید، پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اور نبوت اسلام کے متعلق ہندو، سکھ، عیسائی، عالموں کے اقوال اور تاثرات جمع کر دیے ہیں جنہیں پڑھ کر معلوم ہوتا ہے کہ دشمنان اسلام بھی جب اسلام کے متعلق کچھ کہتے ہیں تو سوائے تعریف کے کچھ نہیں کہہ سکتے۔

زیر نظر مجموعہ میں راہبندراتا تھ لیگور، سر جینی ناٹھر اور گاندھی جی کے تاثرات بھی موجود ہیں۔

انیسیات مجموعہ کلام انیسہ ہارون شروانیہ۔ ۱۹۲۵ صفحات۔ قیمت عام۔ طے کا پتہ اُردو محل حیدر آباد دکن۔ محترمہ انسہ شروانیہ کی تحفہ لغیں، غزلیں، نعت اور حمد اس مجموعہ کلام میں شامل ہیں ترتیب میں مختلف ادوار کا خیال رکھا گیا ہے جس سے موصوفہ کے فن کی ارتقائی منازل کو سمجھنے میں سہولت ہوتی ہے۔ زبان شیریں اور سلیس ہے۔ ہر شعر خوب دل اور شدت احساس کا آئینہ دار ہے۔ خصوصاً وہ نظمیں جو بارگاہ رسالت میں حج کے موقع پر لکھی گئی ہیں عشق محمدی و عشق خداوندی کی بہترین تفسیر ہیں۔ جہاں جہاں ضرورت ہوئی ہے آسان حدیثوں اور آیاتوں کا حوالہ بھی دیا ہے۔

مرتبہ اقبال سلمانی۔

البیان ختم نبوت نمبر قیمت ۸۔ طے کا پتہ دفتر امت مسلمہ، بیرون دروازہ کھیاں امرتسر۔ سلمانی صاحب نے فرقہ احدیہ کے دعویداروں سے متاثر ہو کر یہ کتاب مرتب کی ہے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مضامین درج کئے ہیں، اور یہ ثابت کر دیا ہے کہ اسلام میں نبوت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ختم ہو گئی، اب ہر دعویٰ باطل ہے۔ مضامین نگاروں میں مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا عبداللہ سندھی، سر محمد اقبال، سید سلیمان ندوی اور مولانا اسلم جیراج پوری کے نام ہی اس بات کے ضامن ہیں کہ مضامین دلائل و براہین کی مدد سے لکھے گئے ہیں کچھ بھی کرنے کی کوشش نہیں کی گئی ہے۔

پنجم مضمون

محمد عمر (نور الہی)

(۲۰۸) صفحات قیمت عاں۔ راج کل پبلشرز۔ جمن کشمیر۔

محمد عمر صاحب کے سات ڈراموں کا مجموعہ ہے۔ ان میں سے اکثر نو دہ ہوں جو مصنف نے عزیزان سے لئے کر ہندوستانی طرز پر اردو میں ڈھالے ہیں۔ اکثر ڈرامے تاریخ سے متعلق ہیں۔ مگر تخت طاؤس کا خاتمہ غیر مکمل ہے جو عہد شاہجہانی سے متعلق ہے۔ عادتہ جو اس مجموعہ کے آخر میں ہے ان کا طبعاً ڈرامہ ہے، مگر یہ ڈرامہ ہے۔ اردو ادب میں ڈرامہ نگاری کے فن نے ترقی نہیں کی، اس لئے یہ قدر کی نظر سے ضرور دیکھے جائیں گے بعض اوقات زبان نقل استعمال کی ہے۔

از سید عبدالقدوس مہاراج کالج میسور۔

ساحلی خاموشی اور دوسرے ڈرامے (۵۶) صفحات قیمت دو روپے بیس ممبروں کی پیشگ ہاؤز۔ شہر منگور۔
ادارہ ادبیات اردو نے اب حیدرآباد سے باہر بھی اشاعت اردو ادب کا کام شروع کر دیا ہے اور اردو میں لکھنے کا شوق پیدا کیا جا رہا ہے۔ چنانچہ یہ کتاب بھی وہاں کے ایک طالب علم کی پہلی ادبی کوشش ہے اس نے قابل قدر ہے۔ تین مختصر ڈرامے شامل ہیں۔ آئینہ، مہار اور بڑھایا جائے۔ کتاب میں فن ڈرامہ نگاری ایک مضمون بھی ہے جو بجا کے خود قابل قدر ہے۔ عبدالقادر سرور سے صاحب اور عبدالواحد صاحب نے دیا چھ اور پیش نظر لکھا ہے۔

ادب لطیف سالنامہ ۱۳۴۶ھ مکتبہ اردو، حجم ۳۲، ۲۴ صفحات۔ سالانہ چندہ پھر دیے۔
سالناموں کو اس قدر حسن ترتیب کے ساتھ پیش کرنا ادارہ ادب لطیف کا ہی حصہ ہے۔ کیا مقالات و منظومات، کیا غزلیات و افسانے، سبھی انتخاب میں۔ تقریباً تمام مشاہیر اہل قلم نے حصہ لیا ہے خصوصاً افسانوں کا مجموعہ تو بے حد اچھا ہے۔ کرشن چندر نے اردو ادب میں اس دفعہ نئی چیز پیش کی ہے۔ پودے جس میں واقعات نگاری کے مابوجود افسانوں کا سا حسن ہے۔ اختر حسین رائے پوری نے اپنے افسانے کے لئے نیا موضوع اختیار کیا ہے۔ "اجندہ سنگھ میدی" "اسوا" کچھ کریشہ کی طرح اپنے آپ کو ممتاز ثابت کر دیا ہے۔ ان کے ہر افسانہ میں کچھ نہ کچھ اٹکھا اچھوتا بن ضرور ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ عزیز احمد، علی عباس، سنی عصمت چغتائی اور ابراہیم حلیس نے اچھے افسانے لکھے ہیں۔ بحیثیت مجموعی پورا شمارہ دلچسپ ہے۔ نئے ادب کے محلیفین کو اسے بڑھنا چاہیے اور سوجنا چاہیے کہ اگر ترقی پسند ادب یہ کچھ ہے تو پھر کیا چاہیے لکھا یا چھپائی ہو۔ ڈرامہ نگار چھلے ہے۔

ماہنامہ بھوبال، چندہ سالانہ چھ۔

افکار بھوپال ہمیشہ سے علمی و ادبی خدمت کے لئے مشہور ہے۔ چنانچہ ترقی پسند رجحانات کا عکاس ایک رسالہ افکار جاری کیا گیا ہے۔ مجلس ادارت میں رشیدی بھوپالی، ضہبیا لکھنوی اور کوثر جانہ پوری کے نام ہیں مگر میاں رکافی چھلے۔ مقالات، نظموں اور افسانوں کا انتخاب اچھا ہے۔ زیر نظر شمارہ میں تسنیم سلیم کا افسانہ بہت اچھا ہے۔

سویت روس اور مسئلہ قومیت مرتبہ تنائی، حجم ۱۶۷ صفحات قیمت اسی روپے کا پتہ نیا حسنا راہا کی پورٹنہ۔
تنائی صاحب مرتبہ کی حیثیت سے کافی مشہور ہیں۔ "زندہ چین" کا انھوں نے ہی ترجمہ کیا تھا۔ روسی مسائل پر چھوٹے چھوٹے مضامین کا ترجمہ کرتے رہتے ہیں۔ چنانچہ اس کتابچہ میں سویت روس میں قومیت کے مسئلہ اور اس کی اہمیت پر روشنی ڈالی ہے۔ عوام کے لئے اس کا مطالعہ صحت بخش اور

معلومات آفریں ہو گا۔

دور دیس کی شہزادی بھائی جان (دفترمیزان) قیمت ۴ روپے حجم (۲۳۵ صفحات)۔ بھائی جان نے بچوں کے لئے ایک انتہائی دلچسپ قصہ لکھا ہے۔ ایسی کہانیاں کہیں میں بھی بڑے بڑوں سے سنتے آئے ہیں۔ لیکن اندیشہ تھا کہ زبان شاید اسے بھلا دے، اس لئے ان کو لکھنا اور محفوظ کر لینا مفید ہے۔ ان شہزادے شہزادیوں کے روپ میں بچے ان کرداروں سے متاثر ہوتے ہیں جو حصول مقصد کے لئے دھکے بھیلے ہیں، زبان کا مقابلہ کرتے ہیں۔ بھائی جان کی زبان صمیم نہیں ہے، اکثر کٹر لکھنوی نے معمولی معمولی غلطیاں کی ہیں۔ اس طرف انھیں زیادہ توجہ دینی چاہیے کیونکہ بچوں پر اس کا بہت اثر پڑتا ہے۔ زبان بھی ہونی چاہیے۔

راجہ مہدی علی خان۔ حجم (۴۸۸ صفحات) قیمت ۶ روپے۔ راج محل پبلشرز۔ جموں کشمیر۔

راجہ مہدی علی خان نے پانچ چھوٹی چھوٹی کہانیاں دیکھیں انداز میں لکھی ہیں۔ زبان عام فہم اور سادہ ہے۔ سرور بھی خوب صورت ہے۔ ان کہانیوں کو پڑھ کر یقیناً بچے خوش ہوں گے۔

بولوں کا قلعہ۔ راجہ مہدی علی خان۔ حجم (۴۷۱ صفحات) قیمت ۶ روپے۔ راج محل پبلشرز۔ جموں کشمیر۔

اس میں بھی پانچ دیکھیں چھوٹی چھوٹی کہانیاں ہیں۔ ”بہادر پشین“ اور ”دوارمین“ ان میں تاریخی ہیں۔ بچوں کے لئے ایسی دیکھیں تاریخی کہانیاں بہت اچھی ثابت ہوں گی، اور دل بہلائی کے ساتھ ساتھ وہ بہت کچھ سیکھیں گے۔

غوث نصاریٰ قیمت ۶ روپے حجم (۵۱۰ صفحات)۔ راج محل پبلشرز۔ جموں کشمیر۔

ہمارے آس پاس بچوں کے لئے سائنس کی عام فہم کتابیں بہت کم لکھی گئی ہیں۔ اس کی بے حد ضرورت ہے۔ انصاری صاحب نے آسان پیرایہ میں بچوں کے لئے اکثر اہم ایجادات کے بارے میں معلومات، ہم پہنچائی ہیں مثلاً ”بک کہانی“ ”برقی قوت کی کہانی“ کیڑے کوڑے وغیرہ۔ کتاب کا انتخاب بچوں کو بہت پسند آئے گا کیونکہ لکھا ہے ”ہمارے مام“ ہر سچے اسے پڑھے اور زبان کی ترقی سے باخبر ہو۔

توافق للبقا۔ نعیم صدیقی (۶۹ صفحات) قیمت ۱۰ روپے۔ دارالاشاعت نشاۃ الثانیہ۔ حیدرآباد دکن۔

یہ کتاب ڈارون کے نظریہ تنازع للبقا، کی ترویج میں لکھی ہے۔ اپنے مضمون کا انھوں نے اچھی طرح مطالعہ کیا ہے۔ انداز اعلیٰ مانہ ہے۔ زبان ادبی استعمال کی گئی ہے۔ باوجود خشک نظریوں سے بحث کرنے کے طرز دیکھپ ہے۔ لکھا ہی چھپا ہی عمدہ۔

ایک کاروباری اور نبوی کا نام ادبی دنیا میں محتاج تعارف نہیں۔ ان کے افسانوں کا پس منظر جنوبی ہند کی فطری دل کشی ہے۔ مگر اس کاروباری کی نفسیات شکاری کرنے کرتے انھوں نے انوکھی چیز پیش کی ہے کہ فطری حسن دل کشی کی بھی قیمت وصول کرنا چاہتا ہے۔ اس کی نفسیاتی الجھنوں کا خوب مطالعہ کیا ہے۔ انجام تو بس ایسا ہے کہ قاریف کے بغیر رہا جائے۔ ”زس“

ادارے کی خبریں شمس العلماء حضرت خواجہ حسن نظامی ضادلہوی کی تہنیت

بتاریخ ۱۸ جنوری ۱۹۳۶ء ۳۳ صفر ۱۳۵۵ھ بروز جمعہ صبح پانچ بجے آنریبل مولوی سید زاہد حسین صاحب صدر المہاجرینس برکات
شمس العلماء مولانا خواجہ حسن نظامی صاحب لہوی ادارہ ادبیات اردو کے معائنہ کے لئے تشریف فرما ہوئے۔ اس موقع پر
ادارے کی مصروفیات معلوم کر کے حضرت خواجہ صاحب اتنے متاثر ہوئے کہ دہلی تشریف لیجانے کے بعد اس گروپ
نوٹوں کو جو اس روز ادارے میں لیا گیا تھا ایک ٹیپ پوسٹر میں شائع کیا۔ اور اس پوسٹر میں حضرت علی جوہارؒ ازراہ قدرتی فوج فرامی رہے ہیں۔

ایوانِ اردو حیدر آباد دکن ادارہ ادبیات اردو

گروپ نوٹ

”آل انبی اولاد علی سیدی الدین قادری زور نے حیدر آباد دکن میں اردو زبان کا یہ ایوان بنایا ہے جس نے
”اعلیٰ درجہ کی علمی اور ادبی کتابیں شائع کی ہیں۔ زور صاحب کی ثقافت میں بڑے بڑے تعلیم یافتہ ہندو
مسلمان بااعتماد اردو زبان کی ترقی کا بہت بڑا کام انجام دے رہے ہیں۔“
جنوری ۱۹۳۶ء کے شروع میں آنریبل مولوی سید زاہد حسین وزیر خزانہ شاہ دکن اور خواجہ حسن نظامی دہلوی کو یہ ایوان اردو
دکھایا گیا۔

ادارہ ادبیات اردو حیدر آباد دکن میں ہندو مسلمان مل جل کر اردو زبان کا وہ شاندار کام کر رہے ہیں
جس کی مثال ہندوستان کے کسی مقام پر نہیں ملتی۔

شمس العلماء حضرت خواجہ حسن نظامی جانشین حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء دہلوی کے لئے ایڈیٹر اخبار
مناد دہلی نے شائع کیا۔ ۳۰ جنوری ۱۹۳۶ء

یہ پوسٹر ہزاروں کی تعداد میں شائع ہوا اور ہندوستان کے مختلف شہروں کے علم دوست اصحاب کی خدمت
میں روانہ کیا گیا۔ اس قدر افزائی کے لئے مستحباب ادارہ حضرت شمس العلماء خواجہ حسن نظامی صاحب کا شکریہ
ادا کیا جاتا ہے۔

مجھے کوئی وقت سکون اور آرام کا نہیں ملتا ہے۔ وہاں نقدور بھی لی گئی۔ مگر رواجی تکلفات بھل نہیں تھے۔ کیونکہ ایک سچے مخلص کا علمی ایوان تھا۔ یکم ستمبر کے منادی میں حضرت خواجہ صاحب کے چار روزہ سفر حیدرآباد کے تاثرات درج ہیں ان میں خواجہ صاحب نے حسب ذیل تاثر ادارہ کے متعلق ظاہر فرمایا۔

ادارہ اوبیات اردو کے بانی

”مولوی سید محمد الدین صاحب قادری زور حیدرآباد کے ان درخشندہ باشندوں میں ہیں جن کے کاموں کی روشنی اب بھی حیدرآباد کو منور کر رہی ہے۔ اور آئندہ بھی صدیوں تک درخشال کیے گی۔ انھوں نے اور ان کے ادارے کے رفیقوں نے اردو زبان کی سب سے نظیر اور قابل عقیدہ خدمات انجام دی ہیں۔ اور مجھے یقین ہے کہ اگر فرصت ملے تو میں ادارہ اوبیات اردو کے ان کاموں کو بار بار دیکھوں جن سے اردو زبان کی خدمت کر سکتا ہے۔ اور انھوں میں علمی نوید پیدا ہوا ہے۔“

شمس العلماء حضرت خواجہ حسن نظامی نے اپنے روزنامے میں جو اخبار منادی مورخہ ۹ دسمبر ۱۹۳۶ء کے ساتھ شائع ہوا ہے۔ ۸ مارچ ۱۹۳۷ء کی تاریخ کے تحت ادارہ اوبیات اردو کا عنوان قائم کر کے اپنے معاندانہ کے حسب ذیل تاثرات نقل کئے ہیں۔

ادارہ اوبیات اردو میں کیا تھا۔ یہاں مولوی ذہیبین صاحب صدر المہام فیضائش تشریف لائے تھے۔ مولوی سید محمد الدین صاحب زبانی ادارہ اوبیات اردو نے اپنے لیے مثال کاموں کو دکھایا۔ اپنی زیادہ خوبیاں یہاں جمع تھیں کہ روزنامے میں ان کی تفصیل لکھوں تو ایک کتاب بن جائے۔ صدر المہام صاحب بھی بہت زیادہ متاثر ہوئے۔ ایسے سائنفلک لکھنے سے اردو کی خدمت معلومات فراہم کی گئی ہیں۔ اور ایسی عجیب غریب خدمت انجام دی گئی ہیں کہ زور صاحب کو اردو پاشا خطاب دینے کو جی چاہتا ہے۔

ایک عجیب کتاب

الواحد تاج شاہ کی تہ کے زمانے میں نقدور راجہ روزنامے لکھتا تھا یا جو معروف شہنشاہ اورنگ زیب کو بیعتا تھا اور جس قسم کے انتظامی جوابات اورنگ زیب کی طرف سے آتے تھے۔ وہ سب اس کتاب میں درج ہیں اور یہ دکن کی تاریخ کا وہ قیمتی خزانہ ہے جو دنیا میں نہیں رہتا۔ نہ آسکے گا اور ایک کتاب حضرت ظہیر سلطان شہید کا روزنامہ ہے اور وہ بھی نہایت بیش قیمت چیز ہے۔ میں نے زور صاحب سے درخواست کی کہ وہ ان دونوں کتابوں کی نقیصں مجھے شائع کرنے کے لئے عنایت فرمائیں اور انھوں نے وعدہ کیا ہے۔ اگر میں اس ارادے میں کامیاب ہو جاؤں تو یہ بھلیاں گا کہ موجودہ سفر دکن بہت کامیاب ہوا جس نے مجھے تھکا دیا ہے۔ کیونکہ رات دن کے ہجوم کی وجہ

اگر وہ امتحانات کے مرکزوں کی روئیاویں

مرکز مجیدی | سالِ نخل اور دارِ ادبیات اردو کے امتحانات
جنہوں اسلام مجیدی کی شان و اعلیٰ میں بانی
ہوئے تھے، یہ سچ ہے کہ امتحان دینے والوں میں
جھوٹے بڑے اور بے طبقہ کے امیدوار شریک تھے۔ امیدوار
کے تعلیمی شوق کا حال سن کر بہت خوشی ہوئی، ان میں
سے اکثر کسی نہ کسی کا رخنامہ، اگر فی ہفتگی ادارہ داران
سے تعلق رکھتے تھے، بعض عمر صحاب بھی امتحان کا
میں نظر آئے جو ادارہ کے امتحانات کے ذریعہ سے نکلنے
پر ہنس کر نکتے سے بہرہ ور ہو رہے ہیں۔ میں نے جہاں
سے گفتگو کی اور معلوم ہوا کہ انھیں زبان سمجھنے، اجازت
ورسا کا یہ سبب اور غلطو الفہم ہے، یہی اشیائیں ہے۔
ادب و وجود ناموں کی محنت و مصروفیت کے وہ کچھ
نہ کچھ وقت اس علمی جھوک اور پیاس بجھانے کے لئے نکال
جاتے ہیں۔

ہم بھی کیے ہیں۔
 ہم بھی کیے ہیں۔ بارش کا شجر ہے اس زمانہ میں یہ آتش
 شباب پر تھی۔ بارش کا سلسلہ امتحان کے دن بھی جاری
 رہا۔ علامہ انیس امتحان کے دن کرتیوں اور کارناموں
 کو نظیل نہ ہونے کی وجہ سے نر ورنہ لوگ متوقع
 تھا وہیں نہ آ سکے۔

ادارہ کی یہ شاخ عبدالرزاق صاحب قریشی
مدظلہ العالی، احسن اسلام ہائی اسکول کی نگرانی میں تعلیم و اخلاق
کا کام انجام دے رہی ہے۔ صاحب موضوعات اس شاخ
کے بانی اور ریزن روائ ہیں۔ صاحب مکتوبات دہلوی
دہلی اور اردو کی نشر و اشاعت سے وابستہ تھاکو
قابل واد ہے۔ قریشی صاحب نہایت مخلص کارکن ہیں
جو نہایت سستہ جی سے کام چلا رہے ہیں۔ ان کے بانیان
کی خدمت میں مصروف رہیں۔ اگر عرصہ پہلے کی طرح تعلیم
بالنحال ادارہ کی شاخ چلی تو اسے نقصان پہنچتا۔

اس کی ہمت افزائی کرے تو بہت آسانی سے اور ایک صبح
پانچا پیر اور دو کی نشرو اشاعت کا انتظام انجام پانچا پیر
پانچا پیر اس سلسلہ پر گئے۔ ہاں ایک علم دوست صاحب
سے تبادلہ خیالات کا موقع ملا۔ قریشی صاحب نے
اس مقصد کے تحت چند حضرات کو چارے پر مدعو کیا تھا۔
اس پارٹی میں تعلیم باغوں اور دو کی نشرو اشاعت
اور ادارہ کے استحضات کے متعلق بات چیت ہوئی۔
ویر تک تبادلہ خیالات کے بعد طے پایا کہ بمبئی کے افسر
تعلیم باغوں سے اس مضمون میں رابطہ پیدا کیا جائے
تاکہ آئیں نیک مقصد کے لئے سرکاری دفاتر و خارج کو
استعمال میں لایا جاسکے۔ اس گفتگو میں شہاب الدین
صاحب دسوی سابق پریس انجمن اسلام آباد اسکول اور
موجودہ پریس صاحب نے بھی نمایاں حصہ لیا۔ دسوی
صاحب دو کے ایک مخلص اور دیرینہ خدمت گزار ہیں۔
آپ بمبئی کی انجمن ترقی اردو کے معتد بھی ہیں۔ ادارہ کے
امکانات سے آپ کو بھرپور فائدہ پہنچ رہا ہے۔ ادارہ سے
آپ کا یہ اشتراک عمل نہ صرف قابل تحسین ہے بلکہ لائق
تقلید بھی۔

میرا قیام بی بی میں کو مختصر ہا لیکن دلچسپ میں سبب
مخصوصی صاحب اور انصار احمد صاحب وارڈن انجمن
اسلام پائل کی عنایت کو فراموش نہیں کر سکتا۔ مصروف
صاحب کا حسن سلوک انصار صاحب کی جہاں نوازی اور
تواضع صاحب کا خلوص میرے لئے ناقابل فراموش ہیں۔ حج
مرکز کا اعلیٰ جاگیر

ایک

ہیں۔ میرے قیام و طعام کا انتظام آپ ہی کے ہاں رہا۔ آپ نے جس عمدگی کے ساتھ مجال نوازی فرمائی ہے میں اس کو کبھی بھی نہ بھلا سکوں گا۔ آپ کی اعلیٰ ظرفی مجھے متاثر کرنے بغیر نہ رہ سکتی۔

شکریہ | مذکور الصد حضرات جن کامیں نے مختصر طور پر ذکر کیا ہے قابل مبارک باد اور انتہائی شکر کے قابل ہیں چنانچہ ہمیشہ صدر مکران کامیں ادارہ اویات اردو کی جانب سے مجھ ان سب حضرات کا شکر ادا کرتا ہوں۔ فیض الہی بجز صاحب کاجی شکر نہ ادا کیا جاتا ہے کہ موصوف نے اپنا قیمتی وقت دیکر ادارہ کی پر خلوص خدمت انجام دی۔ منظر الدین

ہرگز پرہیز | سب اسٹینٹ پرہیز ہو جائے۔ اسٹینٹ پرہیز ہو جائے۔ صاحب مددگار مدرسہ محمدیہ درکن شاخ سابقہ معتد مولوی ابو ظفر محمدی الدین صاحب اور لال خاں صاحب موجود تھے۔ ان کے ہمراہ ادارہ کے دفتر پر ہونے والے ہیں میرے قیام کا انتظام کیا گیا تھا۔ طعام کا انتظام دایمی تک مولوی ابو ظفر محمدی الدین صاحب۔ مولوی شیخ حسین صاحب مولوی شیخ وزیر صاحب معتد شاخ اور مولوی محمد عزرائیل صاحب قریشی سابق نائب صدر نے کیا تھا۔ امتحان گاہ کے انتظامات کی نیت دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ سب کچھ مقامی ادارہ نے کر لئے ہیں۔ چنانچہ میں صبح ۱۰ بجے پہنچ کر امتحان گاہ کا انتظام محفل ہانا امیدواروں کی نشیمن بہت ہی اصولی طریقہ پر جمائی گئیں تھیں۔ انٹاک کی نشستوں کا انتظام ایک محلہ رہسکان میں کیا گیا تھا۔ شرکار امتحان کی تفصیل درج ذیل ہے

اردو عالم (۱)	۱۴
اردو زبان دانی (ذکر)	۱۴
اردو دانی (انٹ)	۳
زبان دانی (ذکر)	۵
اردو دانی (انٹ)	۱
اردو عالم (۲)	۱

اردو عالم (انٹ) ایک

اردو زبان دانی (ذکر) ۱۲

اردو دانی (ذکر) ۲۰

اردو دانی (انٹ) ۹

طبقہ ذکر کی نگرانی مولوی کریم خاں صاحب صدر مدرس فیض آباد مولوی آغا نامک صاحب مدرس ذلیف آباد نے نہایت فائدہ طور پر فرمائی اور طبقہ انٹاک کی نگرانی افضل الناصر صاحب بنت کریم خاں صاحب اردو فاضل نے کی۔ سرپرست شاخ ادارہ مولوی شیخ علی بی بی سی ایل ایل بی ویل ہائیڈرٹ ادارہ کی شاخ کے سرپرست ہیں۔ صاحب موصوف اپنی غیر معمولی مصروفیات کی وجہ اور بگڑاؤ تشریف لے جانے کے چنانچہ واپسی پر اورنگ آباد میں شیخ طاقت کی صاحب موصوف کا خلوص، علمی رجحان اور محنت نے نہ صرف اعلیٰ جاگیر بہ احسان کیا ہے بلکہ مستقر اورنگ آباد میں بھی غیر معمولی شہرت کے مالک ہیں۔

صدر شاخ ادارہ | مولوی محمد حنیف صاحب تحصیلدار مالک جاگیر شاخ ادارہ کے صدر ہیں۔ آپ ہر روز امتحان تشریف لاتے رہتے۔ آپ کا وجود مالک جاگیر کے لئے ایک نعمت سے کم نہیں۔

معتد | مولوی وزیر خاں صاحب شاخ ادارہ کے معتد اور نہایت مرگرم کارکن ہیں۔

ایک بے لوث خدمت گزار | مولوی کریم خاں صاحب صدر ذلیف آباد، فیض آباد رسیہ معلوم ہوتے ہیں مگر آپ کی محنت اور غیر معمولی قابلیت سے میں متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ موصوف کی ان محنت کو نشوں سے ایک خالص دعا ہے کہ مالک جاگیر کے سربراہ مددہ حضرات کی احانت سے انتہائی کامیابی کے ساتھ جاری ہے اور ممکن ہے کہ وہ نہایت جلد فوقانیہ کدر تک پہنچ جائے۔ چنانچہ صاحب موصوف نے اس مدرسہ کا تفصیلی معائنہ کر لیا۔ منظم ہوئیں | مولوی محمد جعفر صاحب مالک جاگیر کے منظم ہیں

مقامی حالات اور دو کی سرگرمی مولوی شاخ ذہیر

صاحب مہر مولوی شیخ حسین صاحب اردو مولوی ابو نعیم علی صاحب اردو زبان کی اشاعت اور ترویج میں سعی و جہد کر رہے ہیں اور مجھے جہاں تک معلوم ہوا مقامی ادارہ نے جو بھی اس وقت تک ترقی کی ہے وہ ان ہی حضرات کی انتہائی دلچسپی کا نتیجہ ہے جو ہمیشہ رہائی کاموں میں سرگرم عمل رہتے ہیں۔ ان حضرات کا وجود باشندگان پرلی کے لئے ایک نعمت غیر مترقبہ ہے۔ ان اصحاب کے دلوں میں اردو کی خدمت کا جتنی جذبہ موجزن ہے۔ اور عام لوگوں کی بھلائی کے لئے جو کام کئے ہیں وہ قابل تحسین ہیں مجھے امید واثق ہے کہ مستقبل میں اس ادارہ کے فارغ طلبہ پرلی میں اردو کی ترقی و ترویج میں سب سے زیادہ حصہ لیں گے۔

مولوی شیخ حسین صاحب دو گاتھانیا واران کی اہم مدرسہ صدر مہملہ مدرسہ نوال نے ہالیان پرلی میں تعلیمی بیداری پیدا کرنے میں جو حصہ لیا ہے وہ قابل تعریف و مبارکباد ہے۔ میں وہاں کے کسٹن طلبہ و طالبات کے علمی شوق کو دیکھتے ہوئے یہ اندازہ لگا تا ہوں کہ وہ آئندہ پرلی کر اردو کی گراں بہا خدمات انجام دیں گے۔ جن حضرات نے ادارہ کے کاموں کو نئے پیمانے پر اپنے قیمتی اور عزیز وقت کو صرف کیا۔ ضروری انتظام اور کاروبار امتحان میں مدد دی ان کے نام حسب ذیل ہیں۔

مولوی شیخ وزیر صاحب مدرسہ دخترانہ

” شیخ حسین صاحب مدو گار ”

” ابو نعیم علی الدین صاحب ”

” محمد ہاشم صاحب کرانی ”

” محمد عزیز الدین صاحب قریشی ”

” لال خاں صاحب ”

” محمد نیاز الدین صاحب مدو گار مدرسہ نوال ”

” صدر مہملہ صاحب مدرسہ نوال ”

ظہیر الدین

مرکز میو

اس وفد مرکز میو میں اردو امتحانات ہمارا کالج میو میں منعقد ہوئے اور میری شخصی نگرانی میں نہایت باضابطگی کے ساتھ تکمیل کو پہنچے۔ نگرانی میں حسب ذیل حضرات نے میرا ہاتھ بٹایا۔

(۱) مولوی غلام حیدر صاحب بی اے آنرز، لکھنؤ، انڈیا کالج، میو۔

(۲) مولوی سید عبدالغفر صاحب اردو فاضل، مستحکم جات مولوی، گورنمنٹ ٹریننگ کالج، میو۔

ان کے علاوہ خواتین امیدواروں کی نگرانی میں محترمہ رحمت النساء بیگم صاحبہ بی اے بی ٹی، صدر اردو زنانہ ماہل اسکول، میو نے حسب سال گزشتہ میرا ہاتھ بٹایا اور خواتین کو امتحانات کے لئے تیار کیا جس کے لئے وہ ادارے کے شکر کی مستحق ہیں۔

ادارہ ادبیات اردو شاخ میو

بات عرض ہے کہ۔

۱۔ یہ شاخ میو میں اردو کی اشاعت کے لئے ممکن ہو کر رہی ہے۔ اردو پڑھو اور پڑھاؤ کا براہ راست پروگرام کیا جا رہا ہے۔ گزشتہ دو سال سے اردو امتحانات کے لئے امیدواروں کو تیار کیا جا رہا ہے جن میں سے اکثر امتحانات میں شریک ہو کر کامیاب بھی ہو رہے ہیں۔ چنانچہ اس سال اردو فاضل کے ایک امیدوار، مسٹر سعید احمد بی اے سی (علیگ) جو اس امتحان میں شریک ہوئے تھے، وہ صرف درجہ اول میں کامیاب ہوئے بلکہ سائے امیدواروں میں اول آئے اور سرٹیفیکٹ جنگ تعلیمی کے مستحق قرار پائے۔

ادارہ میو کی شاخ اشاعت کی جانب سے اس وقت تک حسب ذیل قریبی کتابیں شائع کی گئی ہیں اور چند ذیل ترتیب میں۔

۱۔ مرآۃ المائر، انشاء محمد عبداللہ، جو آج سے دیکھ

متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ ماہ شہرہ میں ہی پریشانی پھیل گئی۔ اور آبادی کا تحلیف ہو گیا۔ شہر پر آج کل تین ماہ تک ادارہ کے کاروبار حالت مشکل میں رہے۔

جلد انتخاب عہدہ داران ارکان | جب ماہ آذر میں لوگ آبادی میں منتقل ہو گئے تو فوراً ہی ضروری انتظامات عمل میں لائے جا کر بعد ازاں علی بابا مولوی سید عزیز الدین صاحب وکیل ہائیکورٹ بلیک ۲۲، ڈرہ ۱۲۵، روز جمعہ انتخاب عہدہ داران کا ایک جلسہ بمقام کمارت مدرسہ منعقد ہوا۔ بقلہ آرا حسب ذیل عہدہ دار منتخب ہو گئے۔

- ۱۔ مولوی سید عزیز الدین صاحب وکیل ہائیکورٹ مندر شاہ و
 - ۲۔ مولوی عبدالغفار صاحب نشی فاضل نائب صدر
 - ۳۔ سید کریم الدین قیام شاہ نشی فاضل مندر غائب
 - ۴۔ سید بدیع الدین احمد صاحب شہتہ نشی فاضل شریک مختار
- علاوہ ان حسب ذیل ارکان انتظامی کا انتخاب بھی عمل میں آیا۔

مولوی شری علی خاں صاحب اڈیشنل امداد باہمی۔
مولوی داؤد خاں صاحب انصاری سب الیکشن کارہی۔
مستر کمارام جی اسٹون کنٹرولر مالواری صاحب (مشافہ)
جنرل مرثیہ۔ مولوی عبدالباری صاحب اردو عالم۔ مولوی مرزا حسن بیگ صاحب مدرس۔ مولوی ابو علی صاحب احمد صیغہ دار۔ مولوی محمد عزیز الدین صاحب صیغہ دار۔ مولوی محمد وہاب الدین صاحب مدرس۔

جلد دوم برائے سباحتہ "تعدیہ تہذیب" یہ جلد خباب صدر علی صاحب کی صدارت میں ۲۳ اگست ۱۹۴۶ء میں منعقد ہوا۔ اس میں ارکان ادارہ کے علاوہ مدرسین اور طلباء مدرسہ نے بھی کثیر تعداد میں حصہ لیا مقررین نے اپنی بحث و تقریر سے یہ ثابت کر دیا کہ انھوں نے اس سباحتہ کی تیاری میں کافی محنت اور دلچسپی سے کام لیا ہے۔ یہ تصفیہ کرنا مشکل ہو گیا تھا کہ کس کو ترجیح دینا ہے۔ بالآخر آرا شمار ہوئی اور

دو سال پہلے عبور کی اردو نثر کا نمونہ ہے میرے حواسی اور مقدس کے ساتھ شائع کی گئی ہے۔
۲۔ سال خاموشی اور دو ڈرامے از سید عبدالغفار بنی اسے آئندہ۔

۳۔ جنتاب سخن۔ لالہ جنتابہ رائے منشی سرکار چید کے اردو و فارسی کلام کا مجموعہ جو میر کی ترتیب اور مقدس کے ساتھ شائع کی گئی ہے۔

عبدالغفار و مولوی
شخص بشیر آباد
بشیر آباد پہلی مرتبہ امتحان اردو و فارسی منعقد ۲۰ نومبر ۱۹۴۶ء

۲۶۔ میرے رفیق کے کارمولوی سید بدیع الدین صاحب شہرت منشی فاضل اردو و فاضل دو گار مدرس اور مختار جیلانی جو صاحبان سید اردو و فاضل محلہ مدرسہ نوال کی کوشش اور دیگر علماء و دست احباب کے تعاون سے یہ کام بخوبی انجام پایا اور امتحان کا نتیجہ (۶۹) فیصد رہا۔

قیام شاہ دارگہ ادبیات اردو | مرکز امتحان کے قیام کے ساتھ قیام شاہ دارگہ اسکول بھی شریک نظر رہا۔ اردو مولوی خواجہ حمید الدین صاحب شاہد ایم آہتم دارگہ کی ترغیب اور وصلہ افزائی سے اس کا قیام بھی عمل میں آیا۔ چنانچہ حسب ذیل نشان (۱۶۴۱) موبہ ورامداد اسکول کے قیام شاہ کی منظوری بھی شرف صدر لائی۔

دوسرا امتحان منعقد ۳۱ مارچ ۱۹۴۶ء | اس امتحان میں اردو و فارسی کے علاوہ زبان فارسی، اردو و عالم اور اردو و فاضل کے امیدواروں نے بھی شرکت کی۔ اردو و فارسی اور اردو و فاضل کا نتیجہ صدفی صدر و زبان و فارسی اور اردو عالم کا نتیجہ (۶۰) فیصد سے زائد رہا جو کہ ارکان ادارہ کی محنت اور دلچسپی کا بین ثبوت ہے۔

شیور معرط طاعون | اگرچہ بشیر آباد ایک اونچے اور پختہ مقام پر واقع ہے۔ مکانات بھی دور دور و واقع ہیں۔ صفائی کا معقول انتظام ہے۔ لیکن گرد و نواح کے کثرت مقامات کے باشندوں کی آمد و رفت کے باعث بشیر آباد بھی

جلد پنجم منعقدہ آستان قدس قیام سال ۱۳۸۵
کتب خانہ و دارالمطالعہ

آخری جلد بصدارت مولوی سید عزیز الدین صاحب
وکیل ہائیکورٹ صدر ادارہ بقام عمارت مدرسہ منعقد
ہوا جب کہ اس کو علم دوست عہدہ دار مولوی حافظ
محمد علی صاحب اولیٰ تعلقہ دار کی سرپرستی کا شرف بھی
حاصل ہو چکا تھا۔ اس جلسہ میں ایک کثیر تعداد نے شرکت
کی۔ مطالعہ کے فوائد و فہم کتب خانہ کی ضرورت پر
پر زور تقاریر ہوئیں۔ آخر میں منتاد ادارہ نے اس کی
اہمیت و ضرورت پر زور دیتے ہوئے ایک موثر تقریر
کی اور کہا کہ کوئی علمی ادارہ کوئی درس گاہ اس وقت
تک ترقی نہیں پاسکتی جب تک کہ اس کو مقامی مقتدر
اور اہل کرم حضرات کی توجہ اور امداد حاصل نہ ہو۔ ہم
کام کرنے تیار ہیں جب تک کہ علم دوست اور فخریہ اصحاب
دوست تعاون اور دست کرم و اذائے فرامیں ہماری
تمام سعی اور ساری کوششیں بیکار و بے سود ثابت
ہو جائیں گی۔

خاتمہ تقریر پر بیشتر اصحاب نے ہاتھ بندھ دیے
کا وعدہ فرمایا۔ صدر ادارہ مولوی سید عزیز الدین صاحب
نے اپنی ملکی اور ذاتی کتب کے علاوہ کتب خانہ مسجد کی
کتابیں بھی ادارہ ہذا کے کتب خانہ کو مستعار دینے کا
 وعدہ فرمایا۔ مسٹر ناگورائوجی جنرل مہنت بشیر آباد نے
بھی اپنے پاس کی تمام کتابیں مستعار دینے کا وعدہ
کیا۔ علاوہ انہیں جب ذیل حضرات نے رسالہ و اخبارات
عطا فرمائے کا وعدہ کیا ہے۔

۱۔ مولوی سید عزیز الدین صاحب صدر ادارہ اخبار ہبر دکن
نئی دہلی۔ ترجمان القرآن۔

۲۔ دیو نکر اڈی صاحب سب الیکٹریسیٹ۔ اخبار میران

۳۔ مسٹر ناگورائوجی جنرل مہنت۔ اخبار مدینہ سکر وڑہ

۴۔ مسٹر ٹکٹ لال جی ساہو۔ اخبار پیام

نجلیہ آراء دیگر کو ترجیح دی گئی۔ آئندہ مباحثہ کے لئے شہری
اور دیہاتی زندگی کا عنوان مقرر کیا جا رہا ہے۔

جلسہ سوم منعقدہ اردو ہیئت قدس
مباحثہ بر عنوان شہری و دیہاتی زندگی۔
اس جلسہ کی صدارت
نے کی۔ اس جلسہ میں مباحثہ کے لئے جو عنوان مقرر تھا، اکثر
مقررین نے شہری زندگی کو پسند کیا۔ بچوں کے مباحثہ کے
وجہ سے جن سے حاضرین بہت ہی محفوظ ہوئے
بالآخر نجلیہ آراء نے دیا کہ شہری زندگی دیہاتی زندگی
سے اچھی ہے۔

جلسہ چہارم منعقدہ شہر کور
انعام تعلیم برائے میران اتھا
مولوی سید عزیز الدین صاحب

صدر ادارہ نے فرمائی۔ اولاً منعقد ادارہ نے صدر صاحب سے
یہ خواہش ظاہر کی کہ ادارہ کی سرپرستی کے لئے علم دوست
عہدہ دار مولوی حافظ محمد علی صاحب سے استدعا کی جائے۔
صدر صاحب نے یہ کام اپنے ذمہ لیا اور بالمشافہ تصفیہ
کر لینے کا وعدہ فرمایا۔

دوسرا مسئلہ اردو امتحانات کے لئے امیدواروں
کی تیاری کا تھا۔ مستقر کے حالات کے پیش نظر یہ ضروری
تھا کہ بلا معاوضہ یا کم سے کم معاوضہ پر کام کرنے والے
مل جائیں۔ چنانچہ اس کا حسب ذیل انتظام رو بہ عمل لایا
گیا۔

برائے اردو عالم وارو و فاضل

۱۔ مولوی محمد علی صاحب انشی فاضل صاحب صدر ادارہ

۲۔ سید کریم الدین فیاض انشی فاضل اردو فاضل منتاد ادارہ

برائے اردو دوائی و زبان دانی

۱۔ مرزا حسن بیگ صاحب مدرس و دکن ادارہ

۲۔ محمد ذاب الدین صاحب مدرس۔

۳۔ محمد بشیر احمد صاحب مدرس

زیادہ تر امیدوار شریک امتحان ہوا کرتے ہیں۔

مستقر پرلی اردو امتحانات کے لئے ایسا بظاہر انتظام ہے اس کام کے انجام دینے کے لئے صاحبانِ صدر منتخب ہیں اور تدریس کا انتظام قاضی محبوب الدین صاحب صدیقی کے دیوانخانے میں ہوا کرتا ہے شاخ ادارہ جناب قاضی صاحب کا بہت سی مضمون ہے کہ موصوف نے ازراہ غایت پسند و یونانی شلح کے لئے وقف کر دیا ہے جہاں تدریس کا کام ہوتا ہے اور شاخ کا کتب خانہ بھی ہے۔

کتب خانہ | شاخ کا کتب خانہ جو مولوی قاضی محبوب الدین صاحب کے دیوانخانے میں قائم ہے روزانہ شاخ میں لوگ کتب کا مطالعہ کر کے مستفید ہوتے ہیں۔ چند اہم اردو کتب پرستیں ہیں جس کے مطالعہ سے لوگوں میں اردو کے تدریس کا حقوق ہو کر امتحانات میں شرکت کا باعث بنتے ہیں۔

اردو امتحانات | ہر سال شاخ ہذا کی کوشش سے پرلی امتحانات کا مرکز ہا کر تہ اور ہر سال تقریباً ۵۰ سے زائد امیدوار مندرجہ بالا امتحانات میں مرکز پرلی سے شرکت و کامیابی حاصل کرتے ہیں مولوی اردو ڈائری، اردو عالم، اکہن ادارہ کی کوششوں سے امتحانات میں ہندو امیدوار بھی شریک ہوتے ہیں۔

نتائج امتحانات | ہر سال مرکز پرلی کے امتحانات کے نتائج شخصی روش پرستوں میں سالگرہ منہ مرکز پرلی سے ۳۰ امیدوار شریک ۲۲ کامیاب مندرجہ فوق مقامات کے حضرات شاخ ادارہ پرلی کی جانب سے عکریہ اوکھٹا ہے جو ہر وقت ادارہ کے لئے دے دے، سنے، اعانت کرتے ہیں۔

پرلی تاجی مولوی محبوب الدین صاحب، بیٹھ جانی بیلان احمد صاحب، ساکرامی بھاکو صاحب، جیدہ شہلی کی، مہتمم صاحب، لاکٹ، مولوی جیدات صاحب، مولوی عبدالحکیم خاں صاحب، مولوی ہتھاب صاحب، انجینئر مولوی سید رسول صاحب گتہ دار۔

سوان بیٹھ، مولوی بنے سبیل صاحب، اجمہر۔
بیل گاؤں مولوی دایت بیل صاحب بیل برونی تاجی بیل صاحب
گھاٹ ڈھندہ، مولوی امین الدین صاحب۔
مکھنکھیر، مولوی اصغر خاں صاحب، ٹوکر، مولوی جت سنگھ، ٹوکر،

۵۔ مولوی محمد عزیز الدین صاحب صفیہ دار، اخبار مدنیہ (اخباری مدت کچھ باقی رہ گئی ہے اس کے بعد آپ دوسرا کوئی اخبار یا رسالہ جاری فرمائیں گے)

۶۔ مشر حکارام جی اسٹون کنڈا اکٹر اخبار عدیت اس کے بعد آئندہ یکم آؤرسٹ ۱۹۷۷ء کو کتب خانہ ادارہ دار المطالعہ کا افتتاحی جلسہ کیا جاتا قرار پایا اور طلبہ کے برخواست کا اعلان کر دیا گیا۔

شاخ پرلی | شاخ پرلی ادارہ ادبیات اردو کے کاروبار مولوی فیض محمد خاں صاحب

بی اے ڈیپ ایڈ صدر مدرس مدرسہ وسطانیہ، پرلی کی عوار میں بحسن خوبی انجام پاتے ہیں ہر سال شاخ ہذا کے موزم رکن مولوی نیر الدین صاحب، مولوی شیخ حسین صاحب، مولوی نواز الدین صاحب، مولوی سعید الدین صاحب

صدیقی کی کوششوں سے اردو کی ترویج اور اردو امتحانات کے ہم کام پورے ہو رہے ہیں۔ سال میں دو مرتبہ شاخ کی جانب سے تقصبات میں وفد بغرض ترویج و اشاعت اردو کی تشہیر کے لئے روانہ کیا جاتا ہے وفد کے ارکان مولوی شیخ حسین صاحب، مولوی سعید الدین صاحب، مولوی ابو ظفر محی الدین صاحب، معلم سٹی کالج (جولہیلیات میں

پرلی آیا کرتے ہیں) ان ہی حضرات کی دہجی اور کوششوں کا نتیجہ ہے کہ شاخ ادارہ ادبیات اردو پرلی قائم اور کامیابی کے ساتھ جاری ہے۔ وفد ہر سال مندرجہ ذیل تقصبات و جہاں جی کا دورہ کر کے سابقہ کامیاب شدہ امیدواروں کے استناد سے

جدید عام تعلیم کے عوام الناس پر اردو امتحانات کی ہیئت کو واضح کرتا ہے اور آئندہ سال کے لئے بالاتر امتحانات میں شرکت کے لئے سنگ گیرندہ امیدواروں کو ترغیب و تحریک کرتا ہے۔ بیل گاؤں، سون چٹہ جاگیر، ہمارا کوشش پر شاؤ، گھاٹ

گھاٹ، ناندورہ جاگیر، ریتا پور، پان گاؤں۔ وفد کا دوسرا دورہ ہر سال ہاتھ تریس فراہمی امیدواران برائے امتحان ادارہ مندرجہ تقصبات میں ہوا کرتا ہے اور ان تقصبات سے

ادارہ ادبیات اردو کی کتابیں

ردیف	نمبر	نام کتاب	تعداد	نمبر	نام کتاب
۴	۳۸	سج کا جادو	۲	۱۲۸	سرگزشت حاتم
۸	۶۸	طبیعیاتی کائنات	۸	۹۴	سرگزشت غالب
۱۲	۱۲۳	مناخ صحن	۶	۳۰	مقام الملک
۱۲	۱۲۲	کیف صحن	۸	۳۳۰	قاریہ گوندہ
۱۲	۱۲۷	باد صحن	۱	۱۶۰	ریڈیو نمبر (۸ تصاویر)
۱۲	۱۵۲	سراج صحن	۱۲	۱۲۰	ارمغان جنپ
۱۲	۱۳۰	ایمان صحن	۴	۳۸	سوہیلی مان
۱۲	۱۳۳	غیش صحن	۲	۱۶	مرید احمد خان
۵	۵۰۰	مربع صحن جلد اول (۵۵ تصاویر)	۶	۳۸	سر سالار جنگ
۵	۳۳۲	مربع صحن جلد دوم (۵۰)	۴	۱۲۵	عربی تصانیف کے اردو تراجم
۱	۱۷۵	نقد صحن	۴	۱۲۲	محبوب کی چھاؤں
۸	۲۳۸	لذرو کی	۴	۲۶۸	اقبال نمبر
۲	۱۹۲	گولیم و تھسم	۱	۱۱۲	سائنس کے کرمی
۱	۱۸۳	شفاغیر فندھار دکن	۳	۲۳۰	شعرا عثمانیہ
۱	۱۴۵	من کی دنیا	۸	۳۰۰	مکتوبات شاہ عظیم آبادی
۸	۱۹۶	مدرس میں اردو	۲	۱۶	داد بھائی
۱	۱۱۲	معصوم نامہ	۲	۲۰۰	اردو نامہ
۳	۱۵۳	ذکر دکن	۱۰	۸۵	حدود آباد
۸	۱۳۰	روح غالب	۶	۴۰	عماد الملک
۴	۲۰۰	عامہ	۶	۵۶	اردو دانی کی پہلی کتاب
۶	۵۶	دبیری معلومات	۶	۵۶	دوسری کتاب
۶	۳۸	آبدوز نقاشی اور سرنگ	۲	۲۰۰	محمد حسین آزاد
۱۲	۱۲۳	اردو مقنونی کا ارتقاء	۴	۱۳۰	کاغذ کی ناؤ
۸	۲۱۶	حدود زندگی	۱۲	۹۲	ہن تفرار
۱۲	۳۰۰	سرگزشت ادارہ	۱	۱۳۲	ہندوستان کی تاریخ دکن
۸	۳۱۲	سیر محمد موسیٰ (۲۳) تصاویر	۸	۱۳۰	ہندوستانی تمدن
۳	۳۲	بقا	۱۰	۸۰	پودوں کی کہانی
۱۲	۱۱۳	خطابات	۱	۱۰۰	سہ لہا
۱	۱۵۰	علم خاتم داری	۶	۳۸	پانی کی کہانی
۸	۱۱۸	چٹوٹی (۱۶) تصاویر	۸	۳۹۰	رسائل طبع
۸	۱۶۸	انوار	۴	۳۰	حکمت گوہر میں
۱۰	۸۰	نہشت دانی (۳) تصاویر	۸	۱۲۲	تاریخ ادب اردو
۴	۱۲۸	گارساں دقاسی	۸	۵۶	اشوک اعظم
۱	۱۶۸	رات کا بھولا	۱	۸۶	ہائیں
۴	۲۳	سکندر جاہ	۸	۲۱	یورپ جنگ سے پہلے
۸	۵۲	بلاغت	۸	۱۷۴	شہنشاہ
۸	۲۰۰	ادارہ علم ۱۹۳۱ء میں	۱	۱۰۱	ایڈیٹری
۴	۲۳	ناصر الدولہ	۴	۳	ظہار علی خان
۴	۳۲	افضل الدولہ	۵	۳۹۰	دکنہ اردو - مضبوط جلد اول
۴	۳۲	نواب مر محبوب علی خان	۱۰	۵۰	عرب اور عربستان

